وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ

سیرت سیّد البشر صلی اللہ علیہ وسلم

حصہ چہارم

پروفیسر چودھری غلام رسول چیمہ

کرنٹ

سیرت سید البشر صلی اللہ علیہ وسلم

حصہ چہارم (جزو ثانی)

(اعتراضات کے جوابات)

مصنف

(پروفیسر) غلام رسول چیمہ

ایم۔اے۔ایل ایل بی

CH GHULAM RASUL & SONS LAHORE Established in 1932

چوہدری غلام رسول اینڈ سنز

الکریم مارکیٹ، اُردو بازار، لاہور۔ فون نمبر: 042-37233909, 37243055

Web: www.cgras.com E-mail: mails@cgras.com
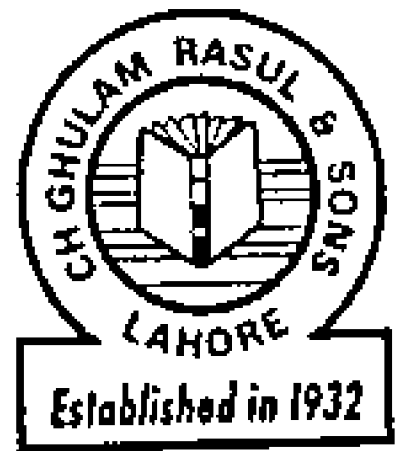
باہتمام: الیاس حمید ملک

کمپوزنگ: محمد لطیف بلوچ، محمد سلیم بلوچ، خواجہ عمیر اکرم

ٹائٹل: عدنان سعید

پرنٹرز: اے۔وائی پرنٹرز

آؤٹ فال روڈ، لاہور۔ فون: 042-37151047

ناشر: چوہدری غلام رسول اینڈ سنز

الکریم مارکیٹ، اُردو بازار، لاہور۔

فون: 042-37233909, 37243055

قیمت: -/900 روپے

انتساب

سابق پرنسپل گورنمنٹ کالج سرگودھا ڈاکٹر عابد علی احمد (مرحوم)

اور

میجر محمد یونس (مرحوم) ولد ڈاکٹر محمد اسماعیل (مرحوم) راولپنڈی کے نام،

استادی المکرّم جناب پرنسل صاحب نے جب مجھے ایڈہاک تقرری کا حکمنامہ لے کر دیا تو دو نصائح کیں

اول سادہ صاف ستھرے کپڑے پہننا

دوم صرف پڑھانا ہی نہیں لکھنا بھی ہے

جب میں گورنمنٹ کالج میانوالی میں تھا۔ تو میجر صاحب کا محبت بھرا خط آیا

جس میں سیرت النبیؐ پر لکھنے کی ترغیب دی۔ اور ایک خاکہ بھی ارسال کیا تھا۔

دونوں اصحاب کی خواہش کو پورا کرنے کی کوشش کی ہے

دعا گو ہوں کہ اللہ تعالیٰ ان دونوں حضرات کے درجات بلند کرے۔

غلام رسول چیمہ

تقدیم

اللہ تعالیٰ کا ہزار ہزار شکر ہے کہ اس نے پُر تقصیر بندہ کو کتاب ''سیرت سید البشر ﷺ'' کی تکمیل کی توفیق دی ہے۔ ویسے تو لفظ ''تکمیل'' سیرت نبی پر استعمال کیا ہی نہیں جا سکتا کیونکہ یہ اتنا وسیع موضوع ہے کہ کوئی احاطہ کر ہی نہیں سکتا، میں نے لفظ تکمیل اپنے منصوبہ کی تکمیل کے لیے استعمال کیا ہے۔

سیرت سید البشر ﷺ چار حصوں پر مشتمل ہے، پہلا حصہ رسول کریم ﷺ کی بعثت سے قبل دنیا اور عرب کی حالت، بعثت کے بعد مکی اور مدنی زندگی، خانگی زندگی، اخلاق نبوی، معجزات اور زندگی کے بعض اہم پہلوؤں پر بحث کی گئی ہے۔ دوسرا حصہ تعلیمات پر تیسرا اور چوتھا حصہ اعتراضات کے جوابات پر مشتمل ہے یہی میرا منصوبہ تھا جو ایک حد تک پایہ تکمیل کو پہنچ گیا ہے۔

فہرست میں اعتراضات کی تعداد تین سو بیان کی گئی ہے۔ تیسرے حصے کے اعتراضات کے جوابات اس کے علاوہ ہیں۔ چوتھے حصہ میں جو اعتراضات درج ہیں وہ کئی کئی اجزاء پر مشتمل ہیں۔ اس طرح تیسرے اور چوتھے حصے میں اعتراضات کی تعداد سات آٹھ سو تک پہنچ جاتی ہے۔ الغرض جتنے اہم اعتراضات تھے۔ ان کے جوابات دئے جا چکے ہیں۔ ان کا علمی اور تحقیقی درجہ کیا ہے اس کا فیصلہ علماء ہی کر سکتے ہیں۔ جوابات دو پہلوؤں پر مشتمل ہیں ایک تو اسلامی نقطہ نگاہ سے جواب دیا ہے اور معترض کی غلط فہمی کو اُجاگر کیا ہے عموماً اعتراض لاعلمی اور محض تعصب کی بناء پر کیا جاتا ہے۔ دوم الزامی جواب بھی دیا گیا ہے جس میں معترض کے مذہب کی تعلیمات کو ہدف تنقید بنایا گیا ہے۔ اعتراضات کے جوابات میں ان دونوں پہلوؤں کو مدنظر رکھا جاتا ہے۔ یہ مناظرے کا اصول ہے۔

اگر معترضین کے تمام اعتراضات کا احاطہ کیا جائے تو ڈیڑھ سو سے زائد اعتراضات نہیں ہیں انہیں اعتراضات کو مخالفین مختلف انداز میں دہراتے چلے آ رہے ہیں۔ اعتراضات تو آغاز اسلام سے لے کر آج تک کئے جا رہے ہیں۔ علماء ان کے جوابات دیتے چلے آ رہے ہیں۔ وہ ان کی کتب میں بکھرے پڑے ہیں۔ خاکسار نے ان کو دو جلدوں میں اپنے انداز میں بیان کر دیا ہے۔ اس کام پر اب بھی کافی گنجائش ہے کاش کوئی مستقل علمی ادارہ ہو جو صرف مستشرقین اور مخالفین کے اعتراضات کے جوابات دے۔ مغرب میں مستشرقین نے اسلام اور بانی اسلام کی خوبصورت تصویر کو نہایت ہی گھناؤنے انداز میں بیان کیا ہے اور کر رہے ہیں۔ اب ضرورت ہے کہ اسلام اور بانی اسلام کی صحیح تصویر لوگوں کے سامنے اُجاگر کی جائے۔

یورپ میں پانچ قسم کے اسلامی ادب کی اشاعت کی ضرورت ہے (۱) مختلف زبانوں میں قرآن مجید کے تراجم (۲) دورِ حاضر کے تقاضوں کے مطابق مختلف موضوعات پر حدیث کے مجموعے (۳) سیرت رسولؐ پر کتب (۴) اسلامی تعلیمات پر کتب (۵) اعتراضات کے جوابات۔

اشاعت اسلام کا بہت وسیع میدان ہے لیکن اس میں بہت کم کام ہو رہا ہے۔ تعلیمی اداروں کو محقق اور مبلغ تیار کرنے چاہئیں جو دورِ حاضر کے تقاضوں کے مطابق اسلامی تعلیمات کی اشاعت غیر مسلموں میں کریں اور مخالفین کے پھیلائے ہوئے غلط اثرات کو زائل کریں۔

آخر میں محترم غلام یزدانی صاحب پروپرائٹر ادارہ چوہدری غلام رسول اینڈ سنز اُردو بازار لاہور کا تہہ دل سے شکر گزار ہوں کہ جنہوں نے اس منصوبے کو حقیقت کا روپ دیا ہے اور سیرت کی کتاب چار حصوں میں طبع ہو گئی ہے۔ آج کل اشاعتی ادارے اس قسم کے لیے غیر منفعت بخش علمی کام کو ہاتھ تک نہیں لگاتے دلی دُعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس ادارہ کو ہر لحاظ سے ترقی دے۔

میں چند دوستوں کا ذکر کئے بغیر نہیں رہ سکتا خاکسار نے طالب علمی کا زمانہ نہایت عسرت میں گزرا ہے۔ اس عسرت کے دور میں جن دوستوں نے میری مدد کی وہ ہیں چودھری محمود انور بھٹی ساکن چک نمبر 98 شمالی سرگودھا، چودھری بشارت احمد گھسن ساکن چک نمبر 98 شمالی، سرگودھا چودھری عنایت اللہ چیمہ بی اے ایل ایل بی ریٹائرڈ سیشن جج آف چک نمبر 36 جنوبی سرگودھا حال لاہور۔ چودھری مبشر احمد باجوہ مرحوم آف فقیر والی ضلع نارووال۔ چودھری منور نصر اللہ آف ڈسکہ، میجر محمد یونس مرحوم آف راولپنڈی اور عبد اللطیف بیگم پوری۔ بیگم پوری کی کوٹھی واقع 43 نسبت روڈ لاہور پر قریباً چار پانچ سال رہائش پذیر رہا اور تعلیم مکمل کر لی۔ اگر ان دوستوں کی معاونت نہ ہوتی تو تعلیم مکمل کرنا مشکل تھا اللہ تعالیٰ نے ان احباب کے ذریعے میری مدد کی۔ صرف شکر گزاری کے لیے ان اصحاب کا ذکر کیا ہے خاکسار نے رسول کریم ﷺ کی حدیث کو عملی شکل میں پورا ہوتا دیکھا کہ رسول کریم ﷺ فرماتے ہیں جب کوئی بندہ علم کے حصول کے لیے باہر نکلتا ہے تو فرشتے اس کی راہ میں پر بچھاتے ہیں۔ سب قارئین کی خدمت میں یہ گزارش کروں گا کہ وہ غلام یزدانی پروپرائیٹر اشاعتی ادارہ اور مذکورہ دوستوں کے لیے دُعا کریں میں تو ان کا صلہ نہیں دے سکتا سوائے دُعا کے۔

خاکپائے محمد۔ غلام رسول چیمہ
15۔ کریم بلاک علامہ اقبال ٹاؤن لاہور
فون: 042-35412759

فہرست اعتراضات

اسلامی تعلیمات پر اعتراضات کے جوابات

بانی اسلام (صلی اللہ علیہ الصلوٰۃ والسلام) پر اعتراضات اور ان کے جوابات 565

قرآن مجید پر اعتراضات کے جوابات

☆☆☆

اسلامی تعلیمات پر اعتراضات اور اُن کے جوابات

پادری فتح مسیح کے اعتراضات کے جوابات

نوٹ:

پادری فتح مسیح متعین فتح گڑھ ضلع گورداسپور نے مولوی عبدالکریم سیالکوٹی کو ایک خط بھیجا جس میں رسول کریم ﷺ کی ذات مبارکہ پر غلط قسم کے اعتراضات کیے۔ یہ اعتراضات اس وقت نظر سے گزرے جب میں سیرت سید البشر کا چوتھا حصہ مکمل کر چکا تھا اور کمپوز شدہ مسودہ کی پروف ریڈنگ ہو رہی تھی۔ بعض اعتراضات وہ تھے جن کے جوابات پہلے ہی لکھ چکا تھا۔ جن جزوی اعتراضات کے جوابات نہیں دیئے گئے تھے ان کے جوابات لکھے جا رہے ہیں۔

دوم: اسی طرح ایک رسالہ بنام حقائق قرآن شائع کردہ کرسچن بک سٹور لدھیانہ ملا ہے۔ جس میں یہ دعویٰ کیا گیا ہے کہ مسیح ابن مریم حضرت محمد ﷺ سے افضل ہیں اس میں ایسے امور بیان کیے گئے ہیں جن کا جواب ضروری ہے۔

سوم: میرے نہایت ہی واجب الاحترام عزیز ڈاکٹر رشید احمد جہانگیری نے امریکہ سے فون کے ذریعے قریب ہی شائع ہونے والے اعتراضات کے متعلق آگاہ کیا ہے۔ جس کا عنوان ہے۔ "Islam: What the west needs to know" ان اعتراضات کے جوابات ڈاکٹر اکرام جہانگیری لکھ رہے ہیں۔ ان اعتراضات کی فہرست ابھی دستیاب نہیں ہوئی۔ جب فہرست مل گئی تو پھر معلوم ہوگا کہ ان اعتراضات میں سے کن کا جواب نہیں دیا گیا اگر کوئی ایسا نیا اعتراض ہوا جس کا جواب کتاب میں مذکور نہیں اس کا جواب بھی لکھ دیا جائے گا۔ بہر حال جب تک زندگی ہے جو نیا اعتراض سامنے آیا اس کا جواب خدا کے فضل سے دے دیا جائے گا۔ پادری فتح مسیح نے پہلا اعتراض حضرت عائشہ کے ساتھ چھوٹی عمر میں شادی کرنے پر عائد کیا ہے اس کا جواب کتاب دیا جا چکا ہے دوسرا اعتراض یہ کیا ہے۔

رسول کریم ﷺ کا اپنی بیوی سودہ کو طلاق دینے کا ارادہ

اعتراض: آنحضرت ﷺ اپنی بیوی سودہ کو پیرانہ سالی کے سبب سے طلاق دینے کے لیے مستعد ہو گئے تھے۔

جواب: یہ اعتراض سراسر غلط اور تاریخی حقیقت کے خلاف ہے۔ کوئی ایسی روایت دستیاب نہیں ہے کہ رسول کریم ﷺ نے کسی شخص کے پاس طلاق دینے کا ارادہ ظاہر کیا ہو۔ کتب معتبر احادیث سے صرف یہ ظاہر ہوتا ہے کہ خود حضرت سودہؓ نے اپنی پیرانہ سالی کی وجہ سے دل میں یہ خوف کیا کہ اب میری حالت قابل رغبت نہیں رہی ایسا نہ ہو کہ رسول کریم ﷺ کہیں مجھ کو طلاق دے دیں ممکن ہے کوئی وسوسہ بھی حضرت سودہ کے دل میں پیدا ہو گیا ہو۔ اس سے طلاق کا اندیشہ دل میں جم گیا ہو۔ کیونکہ عورتوں کے دل میں اس قسم کے وسوسے اور اندیشے پیدا ہوتے رہتے ہیں اس لیے انہوں نے خود بخود رسول کریم ﷺ کو یہ کہہ دیا کہ میں اس کے سوا اور کچھ نہیں چاہتی کہ آپ ﷺ کی ازواج میں میرا حشر ہو۔ چنانچہ نیل الاوطار کے صفحہ ۱۴۰ پر حدیث ہے قَالَتْ السَّوْدَہ بِنت زَمْعَۃ حِیْنَ اَسَنَّتْ وَخَافَتْ اَنْ یُّفَارِقَھَا رَسُوْلَ اللّٰہِ وَ ھَبَتْ یومی عائشَۃَ فقبل ذٰلِکَ منھا و رواہ ایضاً سعد و سعید وابن منصور والترمذی و عبدالرزاق قال الحافظ فی الفتح فتواردت ھذہٖ الروایات علی انھا خشیت الطلاق۔ یعنی سودہ بنت زمعہ کو جب اپنے بڑھاپے کی وجہ سے اس بات کا خوف ہوا۔ کہ اب شاید میں رسول اللہ ﷺ سے جدا ہو جاؤں گی۔ تو انہوں نے کہا یا رسول اللہ میں نے اپنی نوبت عائشہ کو بخش دی۔ آپ ﷺ نے یہ اس کی درخواست قبول فرمائی۔ ابن سعد اور سعید بن منصور اور ترمذی اور عبدالرزاق نے بھی یہی روایت کی ہے اور فتح الباری میں لکھا ہے کہ اس پر

روایتوں کا توارد ہے کہ سودہ کو آپ ہی طلاق کا اندیشہ ہوا تھا۔

اس حدیث سے یہ واضح ہوتا ہے کہ رسول کریم ﷺ نے طلاق کا کہیں اظہار نہیں کیا بلکہ سودہ نے اپنی پیرانہ سالی کی وجہ سے خود یہ فرض کر لیا تھا یہ ہے تاریخ حقیقت جس کو نظر انداز کر کے پادری صاحب نے اعتراض کر دیا ہے۔

اس خط میں حضرت زینب کے ساتھ نکاح پر اعتراض کیا۔ اس کا جواب بھی دیا جا چکا ہے۔

☆......☆

نمازوں کی قضا

اعتراض: خندق کھودنے کے وقت چاروں نمازیں قضا کی گئیں۔

معترض پادری صاحب نے لفظ قضا استعمال کیا ہے یہی اس کی علیست کا پول کھول دیتا ہے۔ کہ قضا نماز ادا کو کہا جاتا ہے ترک نماز کا نام قضا نہیں بلکہ اس کا نام فوت ہے۔ باقی رہا یہ کہ خندق کھودنے کے وقت چار نمازیں جمع کی گئیں۔ دین اسلام میں عُسر (تنگی) نہیں۔ اگر کسی مجبوری کے تحت کوئی فریضہ وقت پر ادا نہیں ہوتا۔ تو اسلام یہ اجازت دیتا ہے کہ اس فریضہ کو دوسرے وقت پر ادا کر لیا جائے۔ یہ یُسر (آسانی) عین فطرت کے مطابق ہے۔ اس اعلیٰ اصول پر اعتراض کرنا محض نادانی ہے۔ اور دین کی روح سے ناواقفیت ہے۔ اسلام میں ضرورت کے وقت نمازوں کے جمع کرنے اور قصر کرنے کا حکم ہے۔ اسی حکم کے مطابق یہ کیا گیا۔

دوم: کسی معتبر حدیث میں چار نمازوں کے جمع کرنے کا ذکر نہیں بلکہ فتح الباری شرح صحیح بخاری میں لکھا ہے کہ واقعہ صرف یہ ہوا تھا کہ ایک نماز یعنی صلوٰۃ العصر معمول سے تنگ وقت میں ادا کی گئی۔ کوئی بھی متفق حدیث نہیں ہے کہ چار نمازیں فوت ہو گئی تھیں ایک ضعیف روایت ضرور موجود ہے کہ ظہر اور عصر اور مغرب اور عشاء اکٹھی کر کے پڑھی گئی تھیں لیکن صحیح حدیثیں اس کو رد کرتی ہیں۔ صرف یہی ثابت ہے کہ عصر تنگ وقت میں پڑھی گئی تھی۔ لہٰذا معتبر احادیث میں صرف یہی درج ہے کہ عصر کی نماز تنگ وقت میں ادا کی گئی ہے۔ اور اعتراض کو صحیح بھی مان لیا جائے تب بھی یہ کوئی اعتراض کی بات نہیں۔ کسی مصیبت کے وقت ایسا کرنا شرعاً جائز ہے۔ یہی دین اسلام کی فضیلت ہے۔

☆......☆

زیادہ بیویاں اور لونڈیاں رکھنے پر اعتراض

اعتراض: معترض نے اس خط میں ایک اعتراض رسول کریم ﷺ کے متعلق زیادہ بیویاں اور لونڈیاں رکھنے پر کیا ہے اس کا جواب دیا جا چکا ہے۔

☆......☆

حضرت عائشہؓ کے بدن سے بدن لگانا اور زبان چوسنا

اعتراض: معترض نے حضرت عائشہ کا نام لے کر یہ اعتراض کیا ہے کہ رسول کریم ﷺ کا بدن سے بدن لگانا اور زبان چوسنا خلاف شرع تھا۔

جواب: حضرت عائشہ رسول کریم ﷺ کی منکوحہ تھیں جائز طریقے سے آپ ﷺ کے عقدہ نکاح میں آئی تھیں۔ اپنی بیوی کے بدن کے ساتھ بدن لگانا اور پھر از راہ محبت زبان چوسنا کس شریعت میں ناجائز ہے رجولیت انسان کی صفت محمودہ ہے۔ میاں بیوی کا باہمی مختلف انداز محبت کے اظہار پر اعتراض کرنا محض بے وقوفی ہے۔ اس قسم کا انداز محبت تو ہر قسم کے جاندار میں پایا جاتا ہے اسلام نے سچے جذبات کے ساتھ اپنی بیویوں سے پیار کرنا جائز قرار دیا ہے یہ انسانی طبیعت کا خاصا ہے۔ علیحدگی میں اس کا اظہار صرف جائز نہیں بلکہ مستحسن ہے۔

☆......☆

تین جگہ جھوٹ بولنے کی اجازت

اعتراض: رسول کریم ﷺ نے تین جگہ جھوٹ بولنے کی اجازت دی ہے اور آپؐ نے دین کو چھپا لینے کے واسطے قرآن میں صاف حکم دے دیا ہے۔ مگر انجیل نے ایمان کو پوشیدہ رکھنے کی اجازت نہیں دی۔

جواب: حقیقت یہ ہے کہ معترض نے اسلام کے ضابطہ اخلاق کا مطالعہ ہی نہیں کیا۔ اسلام نے صدق بیانی پر بہت زور دیا ہے اعتراض کے رد میں چند آیات اور احادیث درج کی جاتی ہیں۔ ارشاد الٰہی ہے۔ هٰذَا يَوْمُ يَنْفَعُ الصّٰدِقِيْنَ صِدْقُهُمْ (مائدہ:۵:۱۱۹) یہ دن (قیامت) ہے کہ سچے بندوں کو ان کا سچ کام آئے گا۔ یعنی قیامت کے دن صدق ہی انسان کی نجات کا باعث ہوگا اور یہاں صدق سے مراد قول اور فعل دونوں کی سچائی مراد ہے اگر قول میں صدق ہے تو فعل میں بھی صدق ہونا چاہیے۔

لِيَجْزِيَ اللّٰهُ الصّٰدِقِيْنَ بِصِدْقِهِمْ (احزاب ۳۳:۲۴) تا کہ اللہ تعالیٰ سچا اترنے والوں کو ان کی سچائی کا بدلہ دے۔

وَالَّذِيْ جَآءَ بِالصِّدْقِ وَ صَدَّقَ بِهٖٓ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ (زمر:۳۹:۳۳)

اور وہ جو سچائی لایا اور اس کی تصدیق کی۔ یہی متقی ہیں۔
مذکورہ آیات صدق کی اہمیت کو واضح کرتی ہیں اور اسلام صدق پر کتنا زور دیتا ہے۔
جنت اور خدا کی رضا حاصل کرنے والوں میں جہاں اور بہت اوصاف حمیدہ پائے جاتے ہیں وہاں صدق بھی ضروری ہے۔ ارشاد الٰہی ہے۔

اَلصّٰبِرِیْنَ وَالصّٰدِقِیْنَ وَالْقٰنِتِیْنَ وَالْمُنْفِقِیْنَ وَالْمُسْتَغْفِرِیْنَ بِالْاَسْحَارِ (آل عمران:۳:۱۷)

صبر کرنے والے اور سچ بولنے والے اور فرمانبردار اور خرچ کرنے والے اور صبح کے وقتوں میں استغفار کرنے والے۔
فرمایا: فَاجْتَنِبُوا الرِّجْسَ مِنَ الْاَوْثَانِ وَاجْتَنِبُوْا قَوْلَ الزُّوْرِ
یعنی بتوں کی پلیدی اور جھوٹ کی پلیدی سے بچو

یٰاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِیْنَ بِالْقِسْطِ شُهَدَآءَ لِلّٰهِ وَلَوْ عَلٰٓی اَنْفُسِكُمْ اَوِ الْوَالِدَیْنِ وَالْاَقْرَبِیْنَ (النساء:۴:۱۳۵)

ایمان والو! انصاف اور سچائی پر قائم ہو جاؤ اور سچی گواہیوں کو للّٰلہ ادا کرو۔ اگر چہ تمہاری جانوں پر ان کا ضرر پہنچے یا تمہارے اقارب ماں باپ اور دیگر رشتے داروں کو نقصان پہنچے۔
فرمایا:

وَاِذَا قُلْتُمْ فَاعْدِلُوْا وَلَوْ كَانَ ذَا قُرْبٰی (انعام:۶:۱۵۲)

جب تم بات کہو تو عدل کرو (سچی بات کرو) اگر چہ قریبی کے خلاف ہو۔
یہ تمام آیات معترض کے اعتراض کو رد کر رہی ہیں، اسلام کسی صورت میں بھی سچائی کا دامن چھوڑنے کی تلقین نہیں کرتا بلکہ یہ زور دیتا ہے کہ ہر حالت میں صدق کا دامن تھامے رکھو۔ خواہ کتنا ہی نقصان ہو۔
رسول کریم ﷺ فرماتے ہیں۔

عَلَیْكُمْ بِالصِّدْقِ فَاِنَّ الصِّدْقَ یَهْدِیْ اِلَی الْبِرِّ وَاِنَّ الْبِرَّ یَهْدِیْ اِلَی الْجَنَّةِ وَمَا یَزَالُ الرَّجُلُ یَصْدُقُ وَ یَتَحَرَّی الصِّدْقَ حَتّٰی یُكْتَبَ عِنْدَ اللّٰهِ صِدِّیْقًا (بخاری کتاب الآداب)

تم سچائی کو لازم پکڑلو۔ کیونکہ سچ بولنا نیکی کی طرف راہنمائی کرتا ہے اور نیکی جنت کی طرف اور آدمی جب ہمیشہ سچ بولتا ہے تو خدا کے ہاں صدیق لکھا جاتا ہے۔ یعنی مقام صدیقیت پر پہنچ جاتا ہے۔
رسول کریم ﷺ کی حدیث کی رو سے صدق (بالقول و بالفعل) ہی نجات کا ذریعہ ہے۔ لہٰذا اسلام کسی موقع پر بھی صدق سے گریز کی تعلیم نہیں دیتا کسی حدیث میں بھی جھوٹ بولنے کی ہرگز اجازت نہیں بلکہ ایک حدیث میں تو یہ لفظ ہیں۔ وَاِنْ قُتِلْتَ وَاُحْرِقْتَ خواہ تو قتل کر دیا جائے یا جلا دیا جائے۔
جب ہم رسول کریم ﷺ کے صحابہ کی زندگیوں کا مطالعہ کرتے ہیں۔ تو مزید واضح ہو جاتا ہے کہ انہوں نے ہر قسم کی اذیتیں اور تکالیف برداشت کیں لیکن اپنے ایمان کو نہیں چھپایا۔ اعلانیہ اظہار کیا۔ حتیٰ کہ اظہار حق کی پاداش میں اپنے گھروں کو چھوڑا۔ حبشہ اور یثرب ہجرت کر گئے۔

توریہ: بعض احادیث میں توریہ کے جواز کی طرف اشارہ پایا جاتا ہے توریہ درحقیقت کذب نہیں (گو کذب کے رنگ میں ہے) محض اضطرار کے وقت کمزور طبع شخص کے واسطے اس کا جواز حدیث میں پایا جاتا ہے مگر پھر بھی یہی لکھا ہے کہ افضل وہی لوگ ہیں جو توریہ سے پرہیز

کرتے ہیں توریہ اصطلاح کا صحیح مفہوم یہ ہے۔ جس کو جاہل معترض سمجھ نہیں پایا توریہ اس کو کہتے ہیں کہ فتنہ وفساد کے خوف سے ایک بات کو مخفی رکھنے کے لیے یا ایک راز کو پوشیدہ رکھنے کے لیے اسے ایسے پیرایوں اور مثالوں سے بیان کیا جائے لیکن سننے والے کا ذہن اصل راز کی حقیقت کی طرف مائل نہ ہو۔ بلکہ دوسری طرف چلا جائے۔ جو متکلم کو مقصود نہیں راز کو مخفی رکھنے میں بھی کذب کی آمیزش نہ ہو اور نہ دل نے کذب کی راہ اختیار کی ہو محض الفاظ اور طرز بیان نے اصل حقیقت کو مخفی رکھا۔ توریہ کی حالت بھی عارضی ہے۔ توریہ اختیار کرنے والے کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ اس جگہ سے ہجرت کر جائے۔

پس توریہ جھوٹ بولنے کا نام نہیں بلکہ اس حقیقت کو الفاظ کے مختلف پیرایوں میں بیان کر کے سامع کے ذہن کو دوسری طرف پھیرنے کا نام ہے۔ یہ بھی اضطرار اور فتنہ اور فساد کے خوف کی وجہ سے ہے اور اسلام نے اس اضطراری حالت کو بھی پسند نہیں کیا لیکن طبائع کی کمزوری کو مدنظر رکھ کر توریہ کی اجازت دی ہے۔

توریہ کذب بیانی کا نام نہیں بلکہ کسی حقیقت کو ایسے پیرائے میں بیان کرنے کا نام ہے جس سے سامع کا ذہن جلد حقیقت اور مخفی راز کی طرف نہ جائے بلکہ کسی دوسرے مفہوم کی طرف چلا جائے یعنی ذو معنی الفاظ استعمال کر کے سامع کا ذہن دوسری طرف پھیر دیا جائے۔ اللہ تعالیٰ نے محض کمزور اور ضعیف قلب والوں کے لیے اس امر کی اجازت دی ہے۔ تقویٰ کی باریک راہوں پر چلنے والوں کے لیے نہیں وہ تو اظہار حق کے لیے اپنی جان قربان کرنے کو تیار رہتے ہیں جیسا کہ صحابہ نے اپنی جانیں قربان کر دیں۔

توریہ کی ایک چھوٹی سی مثال یوں ہے کہ کسی شخص کی شادی چچازاد بہن سے ہوئی ہے میاں بیوی کہیں جا رہے ہوں۔ کوئی اس سے یہ پوچھ لے کہ یہ کون ہے بیوی کے اظہار سے کسی فتنے کا خوف ہو تو وہ کہہ دے یہ میری بہن ہے۔

یہ ہے ایک بات کو دوسرے الفاظ میں بیان کرنا۔ یہ کذب بیانی نہیں اس آدمی کے ساتھ اس عورت کے دو رشتے ہیں ایک چچازاد بہن ہونے کا دوسرا بیوی ہونے کا اس شخص نے بیوی کا رشتہ مخفی رکھ کر بہن کے رشتہ کا اظہار کر دیا ہے۔

لہٰذا معترض نے توریہ کو کذب بیانی سمجھ لی ہے توریہ کی اصطلاح کے مفہوم کو نہیں سمجھ پایا۔ اسلام پر یہ اعتراض کہ یہ دین اسلام چھپانے کا حکم دیتا ہے محض بہتان اور افتراء ہے۔ اسلام جھوٹوں پر لعنت بھیجتا ہے۔

توریہ کی اجازت کے باوجود مقام مدح پر نہیں ہے۔ محض کمزور دلی کی وجہ سے اس کی اجازت ہے۔ سچا مومن وہی ہے جو دین کی گواہی کو نہیں چھپاتا۔

خواہ اس کی جان چلی جائے اس کے برعکس اس ضعیف القلب مومن کو بھی رد نہیں کیا جو فوق الطاقت عذاب کی وجہ سے دین کی گواہی کو چھپاتا ہے لیکن اس کے ساتھ یہ شرط عائد کی ہے کہ آئندہ اس حالت سے الگ ہو جائے۔ اس ملک کو چھوڑ کر کسی دوسرے امن والے ملک میں ہجرت کر جائے۔ اس کے بعد اپنے صدق سے اللہ تعالیٰ کو راضی کر لے۔ یہ وہ اسلامی تعلیم ہے جو اللہ تعالیٰ کی صفت رحمانیت اور رحیمیت اور غفاریت کے عین مطابق ہے۔

☆......☆

قرآن مجید کامل گناہ کے تصور سے خالی ہے

اعتراض: پادری صاحب نے اپنے خط میں یہ بھی لکھا ہے کہ کامل گناہ کا بیان انجیل میں ہی ہے۔ دوسرے الفاظ میں قرآن مجید کامل گناہ کے تصور سے خالی ہے۔

جواب: پادری صاحب کا یہ اعتراض قرآن مجید کا بالکل مطالعہ نہ کرنے کی وجہ سے ہے۔ قرآن مجید نے تو اپنے آغاز میں ہی نزول کی یہ علت غائی قرار دی ہے کہ یہ کتاب انسان کو کامل گناہ سے آگاہ کر کے تقویٰ کی باریک راہوں سے آگاہ کرتی ہے پھر آگاہی کے بعد راہ مستقیم پر چلا کر منزل مقصود تک پہنچاتی ہے۔ ارشاد الٰہی ہے۔

ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ فِيْهِ هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ (البقرہ:۲)

یہ کتاب اس میں شک نہیں متقیوں کے لیے ہدایت ہے یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے جس سے کوئی صاحب عقل انکار نہیں کر سکتا۔ انسان اسی وقت راہ مستقیم پر گامزن ہوگا جب اس کو کامل گناہوں کا علم ہوگا اور اس کو یہ بھی معلوم ہو کہ مناہی و منکرات پر عمل کرنے سے انسان گمراہی کا راستہ اختیار کر لیتا ہے۔ متقی ہوتا ہی وہ شخص ہے جو گناہوں سے اپنا دامن بچا کر نیکیوں کے راستہ پر گامزن ہوتا ہے۔ الغرض اسلام نے باریک سے باریک گناہوں پر اطلاع دی ہے پھر ان سے بچنے کی تعلیم بھی دی ہے اسلام کے نزدیک گناہ صرف ظاہری اعمال سے ہی تعلق نہیں رکھتا۔ بلکہ دل کی پاکیزگی ہی ضابطہ اخلاق کی بنیاد ہے۔ کیونکہ اعمال کا سرچشمہ دل ہے۔ قرآن مجید میں آتا ہے۔

وَلَا تَقْرَبُوا الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ (الانعام:۶:۱۵۱)

اور بے حیائی کی باتوں کے قریب مت جاؤ جو ان میں سے ظاہر ہوں اور جو چھپی ہوئی ہوں۔

اس آیت میں یہ بتایا گیا ہے کہ اخلاق کا تعلق صرف ظاہری اعمال سے ہی نہیں بلکہ ان اعمال سے بھی ہے جن کا مرتکب دل ہوتا ہے گو ان کو معلوم کرنے کا طریقہ لوگوں کے پاس نہیں چونکہ اللہ تعالیٰ علیم وخبیر ہستی ہے جو دلوں کے بھیدوں کو جانتی ہے وہ جانتی ہے کہ انسان کے دل میں کیا کیا خیالات موجزن ہیں وہ کیا کیا برائیاں ہیں جو انسان اپنے دل کے پردوں میں چھپائے ہوئے ہے۔

دوسری جگہ اس موضوع کو اور وضاحت کے ساتھ بیان کیا ہے۔

وَاِنْ تُبْدُوْا مَا فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ اَوْ تُخْفُوْهُ يُحَاسِبْكُمْ بِهِ اللّٰهُ (البقرہ:۲:۲۸۴)

اگر تم ظاہر کرو جو کچھ تمہارے دلوں میں ہے یا اسے چھپاؤ۔ اللہ اس کا تم سے حساب لے گا۔

دوسری جگہ آتا ہے۔

وَلٰكِنْ يُّؤَاخِذُكُمْ بِمَا كَسَبَتْ قُلُوْبُكُمْ (البقرہ:۲:۲۸۵)

اور اللہ مواخذہ کرے گا جو تمہارے دلوں نے کمایا۔

رسول کریم ﷺ فرماتے ہیں۔

اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ (بخاری)

یعنی اعمال کا دار و مدار نیتوں پر ہے۔

اگر ایک انسان عمدہ کام کرتا ہے لیکن اس کی نیت خراب ہے تو وہ اس عمل کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کے نزدیک قابل مواخذہ ہے یہ حدیث ظاہر کرتی ہے کہ کسی عمل کی اچھائی یا برائی کا فتویٰ دل کے خیال پر مبنی ہے۔ اگر خیال اچھا ہے اور اعمال بھی اچھا ہے تو اس عمل پر اجر مرتب ہوگا۔ اگر خیال برا ہے خواہ عمل اچھا ہی ہے تو اس پر اجر مرتب نہیں ہوگا۔ بلکہ وہ عمل قابل مواخذہ ہوگا۔

ایک اور حدیث ہے رسول کریم ﷺ فرماتے ہیں۔

اِنَّ فِی الْجَسَدِ مُضْغَۃٌ اِذَا صَلَحَتْ صَلَحَ الْجَسَدُ کُلُّہٗ وَاِذَا فَسَدَتْ فَسَدَ الْجَسَدُ کُلُّہٗ اَلَا وَھِیَ الْقَلْبُ

(بخاری ومسلم)

جسم میں گوشت کا ایک لوتھڑا ہے جب وہ درست ہو جائے تو سارا جسم درست ہو جاتا ہے اور جب وہ بگڑ جائے تو سارا جسم بگڑ جاتا ہے۔ خبردار وہ دل ہے۔

قرآن مجید میں آتا ہے۔

قَدْ اَفْلَحَ مَنْ تَزَکّٰی (الاعلیٰ ۸۷:۱۴)

جس نے دل کو پاک کیا وہ کامیاب ہو گیا۔

اس مضمون کو دوسری جگہ ان الفاظ میں بیان کیا ہے۔

قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَکّٰھَا (الشمس ۹۱:۹)

یقیناً بامراد وہ شخص جس نے اپنے دل کو پاک کیا۔

جو لوگ دل کی پاکیزگی کی طرف توجہ نہیں دیتے ان کے متعلق اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

قَدْخَابَ مَنْ دَسّٰھَا (الشمس ۹۱:۱۰)

یقیناً ناکام ہو گئے وہ لوگ جنہوں نے اپنے دل کو گناہوں کی میل سے ناپاک کیا۔

اگر کسی کے دل میں ایک لحہ برا خیال آتا ہے لیکن اس کو دبا دیا جاتا ہے اور مجاہدہ اور خدا خوفی سے اس بُرے خیال سے دل کو پاک کر لیتا ہے تو وہ خیال قابل مواخذہ نہیں ہوگا۔ بلکہ قابل تعریف ہوگا وہ شخص اجر کا مستحق ہوگا۔ رسول کریم ﷺ فرماتے ہیں۔

مَنْ ھَمَّ بِسَیِّئَۃٍ فَلَمْ یَعْمَلْھَا کَتَبَ اللّٰہُ عِنْدَہٗ حَسَنَۃٌ کَامِلَۃُ (بخاری)

اگر کسی شخص کے دل میں بُرا خیال پیدا ہوتا ہے اور اس خیال کو عملی جامہ نہیں پہناتا۔ بلکہ دل میں ہی دبا دیتا ہے اللہ اس کے لیے ایک پوری نیکی لکھ دیتا ہے الغرض اسلام کامل گناہ کا ضابطہ صرف برے اعمال ہی قرار نہیں دیتا۔ بلکہ دل میں ان باریک سے باریک بُرے خیالات کو بھی زمرہ سیئات میں شامل کرتا ہے۔ جن پر عمل کرنے کے لیے اس نے عزیمت کر رکھی ہے۔

لہٰذا پادری صاحب نے اسلام کے ضابطہ اخلاق کا مطالعہ نہیں کیا۔ اگر اسلام کے ضابطہ اخلاق پر نگاہ ہوتی تو کبھی یہ اعتراض نہ کرتا کہ اسلام کامل گناہ بیان نہیں کرتا۔

☆......☆

لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ کہنے سے گناہ دور ہو جاتے ہیں

اعتراض: معترض پادری صاحب نے اس وسوسہ کا بھی اظہار کیا ہے کہ حضرت مقدس نبوی کی یہ تعلیم ہے کہ لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ کہنے سے گناہ دور ہو جاتے ہیں۔

جواب: میں پھر یہ بیان کروں گا کہ پادری صاحب نے کلمہ توحید کے فلسفہ اور حکمت کو بالکل سمجھ ہی نہیں پایا۔ یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ جب ایک انسان سچے دل سے اللہ کے ایک ہونے کی گواہی دیتا ہے اور اس کو یقین ہوتا ہے کہ ایک دن وہ اللہ کے سامنے حاضر ہوگا۔ اور اپنے اعمال کا حساب دے گا تو وہ شخص برائیوں سے دور بھاگتا ہے۔ جس طرح ایک شخص کو یہ معلوم ہو کہ شربت میں زہر ملا ہوا ہے وہ شخص اس شربت کو ہرگز نہیں پیئے گا۔ اسی طرح اگر ایک شخص کو یہ علم ہو کہ اس بل میں سانپ ہے وہ اس بل مین ہرگز ہاتھ نہیں ڈالے گا اس طرح جب ایک شخص اللہ تعالیٰ کو ایک جان لینے کے بعد اس کے منکرات اور فواحشات سے واقف ہو جاتا ہے تو وہ شخص ان منکرات اور فواحشات کے قریب تک نہیں پھٹکے گا کیونکہ وہ جانتا ہے کہ ان کے کرنے سے ہلاکت کے گڑھے میں گرے گا۔ یہ ہے کلمہ توحید کا فلسفہ اور حکمت۔ کلمہ توحید انسان کو منکرات اور فواحشات سے آگاہ کر کے ان سے دور رہنے کی تعلیم دیتا ہے۔ محمد رسول اللہ ﷺ کا اقرار کلمہ توحید کے ساتھ لیے لازم ہے کہ اللہ تعالیٰ نے وہ منکرات اور فواحشات حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کے ذریعے بتائے۔

اگر معترض پادری صاحب نے اسلامی تاریخ کا مطالعہ کیا ہوتا تب بھی وہ یہ اعتراض نہ کرتا۔ تاریخ اس بات پر شاہد ہے کہ جو شخص بھی رسول کریم ﷺ کے ہاتھ پر دائرہ اسلام میں داخل ہوتا تھا اور کلمہ توحید کا اقرار کرتا تھا۔ وہ اپنے اندر ایک نئی تبدیلی پاتا اور ایک نئی زندگی اختیار کر لیتا۔ برائیوں کی راہ سے الگ ہو کر نیکیوں کا راستہ اختیار کر لیتا۔ یہ پاکیزگی اسی کلمہ توحید کا نتیجہ ہے۔ جس پر پادری صاحب نے یہ اعتراض کیا ہے کہ لا الہ الا اللہ پڑھنے سے گناہ دور ہو جاتے ہیں۔ صحابہ کلمہ توحید پڑھنے کے بعد برائیوں کی دلدل سے باہر نکل آتے تھے۔ صحابہ کا برائیوں کی راہ کو ترک کر دینا رسول کریم ﷺ کے فرمان کی صداقت کو ظاہر کرتا ہے۔

☆......☆
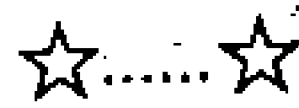
وضو کرنے سے گناہ دور ہو جاتے ہیں

اعتراض: معترض پادری صاحب نے یہ بھی اعتراض کیا ہے۔ وضو کرنے سے گناہ کیوں کر دور ہو سکتے ہیں۔

جواب: وضو اللہ کے حضور باادب کھڑے ہو کر عبادت کرنے کی تیاری کا نام ہے۔ وضو میں یہی فلسفہ ہے کہ وضو کرنے والا جس طرح اپنی ظاہری نجاست اور گندگی کو پانی سے دور کر رہا ہے اسی طرح جب وہ اللہ کے حضور کھڑا ہو۔ تو اس کا دل تمام گناہوں کی پلیدگی سے پاک ہونا چاہیے ظاہر پاکیزگی باطنی پاکیزگی پر دلالت کرتی ہے رسول کریم ﷺ کی حدیث ہے حضرت ابو ہریرہ سے روایت ہے کہ انہوں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا فرماتے ہیں کہ بتاؤ اگر تم مین سے کسی کے دروازے پر نہر ہو اور وہ اس میں روز پانچ دفعہ نہائے تو کیا کہتا ہے اس کی میل سے کچھ چھوڑ دے گا۔ صحابہ نے کہا کہ اس کی میل سے کچھ نہیں چھوڑے گا۔ فرمایا پس یہ پانچ نمازوں کی مثال ہے خدا ان کے ذریعے گناہوں کو مٹا

دیتا ہے۔

قرآن مجید یہی آتا ہے۔

اِنَّ الصَّلٰوۃَ تَنْھٰی عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْکَرِ (العنکبوت:۲۹۔۴۹)

بے شک نماز فحش اور منکر سے روکتی ہے۔

ایک مسلمان بندہ خدا کے حضور تمام دنیاوی کام کاجوں سے الگ ہو کر کھڑا ہوتا ہے اور راہ مستقیم کا ملتجی ہوتا ہے۔ تو یقیناً اللہ تعالیٰ اپنے اس بندے کو تمام گناہوں سے پاک کر کے راہ مستقیم پر چلنے کی توفیق دے گا۔ راہ مستقیم کیا ہے افراط اور تفریط سے پاک راستہ۔ نماز میں ایک بندہ یہی دعا کرتا ہے۔ اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ (ہمیں سیدھے راستہ کی ہدایت کر)

وضو بندگی کی تیاری کا نام ہے جب بندہ اللہ کے حضور کھڑے ہو کر بندگی کی تیاری کے لیے صاف پانی سے اپنے ظاہری اعضاء دھوتا ہے۔ تو اس میں یہ حکمت ہے کہ وہ اپنے باطنی اعضا بھی ظاہری اعضاء کی طرح دھوتا ہے تو اس میں یہ حکمت ہے کہ وہ اپنے باطنی اعضا بھی گناہوں کی پالیدگی سے صاف کرے۔ اس طرح بندہ گناہوں کی میل سے اپنے باطنی اعضاء پاک کر لیتا ہے۔ یہ ہے وہ حکمت جس کو پادری صاحب سمجھ نہیں پائے۔ وضو لازمی طور پر گناہوں کو دور کرتا ہے۔ یہ وہی شخص جان سکتا ہے جو یہ عمل کرتا ہے۔ جو شخص یہ عمل کرتا ہی نہیں وہ اس عمل کا کیا فلسفہ جانے۔

☆......☆
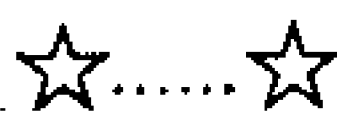
بہشت کی تعلیم محض نفسانی ہے

اعتراض: بہشت کی تعلیم محض نفسانی ہے۔ جس سے ایک خدارسیدہ شخص کو کچھ تسلی نہیں ہو سکتی۔

جواب: یہ واضح حقیقت اور مسلمہ امر ہے کہ جب ایک انسان اس دنیا میں کسی جرم کا یا کسی نیکی کا ارتکاب کرتا ہے۔ تو وہ صرف روح سے ہی کام نہیں کرتا بلکہ روح اور جسم دونوں سے کرتا ہے اور سزا و جزا کا اثر دونوں پر پڑتا ہے یہی کیفیت آخرت میں ہونی چاہیے۔ جزا و سزا کا اثر روح اور جسم دونوں پر ہونا چاہیے۔ عیسائی حضرات تو یہ تسلیم کرتے ہیں کہ قیامت کے دن سزا کا اثر جسم اور روح دونوں پر ہوگا۔ وہ تسلیم کرتے ہیں کہ روح اور جسم دونوں کو جہنم کی آگ میں ڈالا جائے گا۔ اور مختلف قسم کی سزاؤں کے بھی قائل ہیں۔ روح اور جسم دونوں ان سزاؤں کو بھگتیں گے۔ اگر عیسائیوں سے پوچھا جائے کہ جسم کو کیوں آگ میں جلایا جائے تو اس کا جواب یہ دیتے ہیں کہ روح اور جسم دونوں مزدور کی طرح دنیا میں کام کرتے تھے۔ دونوں نے اپنے آقا کے احکام کی خلاف ورزی کی لہٰذا دونوں سزا کے مستحق ٹھہرتے ہیں۔

اگر عیسائیوں کے عقیدے کے مطابق سزا کا اثر روح اور جسم دونوں پر ہوگا۔ تو خدائے رحیم و کریم جزا کے وقت جسم کو فانی کیوں کر چھوڑے گا اللہ تعالیٰ کے نزدیک نیکی کی جزا کا اثر لازمی طور پر جسم اور روح دونوں پر مسلمہ ہے۔ یعنی جزا کا اثر روح اور جسم دونوں پائیں گے۔ اور لطف اندوز ہوں گے۔ اگر گناہ کی سزا میں جسم کو جہنم میں ڈالا جائے گا۔ اور اس کو جلایا جائے گا تو عمل صالح کی وجہ سے جسم کو جزا کے اثر سے کیوں کر دور رکھا جا سکتا ہے لازمی طور پر جسم بھی روح کے ساتھ جزا کا اثر پائے گا۔

پس یہ بدیہی بات ہے کہ جب جسم کو اپنے تمام قویٰ کے ساتھ روح سے ملا دیا جائے وہ جسمانی قویٰ اپنے اعمال کے مطابق جزا

پائیں گے یا سزا پائیں گے اسلام کا یہی جزاوسزا کا فلسفہ ہے۔ جزاوسزا کا اثر جسم اور روح دونوں پر ہوگا۔

☆......☆

جزا یعنی اخروی نعماء کی کیفیت

قرآن مجید میں اخروی نعماء کا جو ذکر کیا گیا ہے ان کا اس دنیا کی نعماء کے ساتھ صرف نام کا اشتراک ہے ابن عباس سے ابن کثیر میں روایت ہے لایشبه فی مما فی الجنة ما فی الدنیا الا فی الاسماء یعنی جو چیزیں جنت میں ہیں وہ دنیا کی کسی چیز سے سوائے نام کے مشابہت نہیں رکھتیں۔ قرآن مجید میں اس کی صراحت کردی گئی ہے ارشاد الٰہی ہے۔ فَلَا تَعۡلَمُ نَفۡسٌ مَّآ اُخۡفِیَ لَهُمۡ مِّنۡ قُرَّةِ اَعۡیُنٍ جَزَآءًۢ بِمَا كَانُوۡا یَعۡمَلُوۡنَ (السجدہ:۳۲۔۱۷) پس کوئی شخص نہیں جانتا کہ ان کے لیے کیسی آنکھوں کی ٹھنڈک چھپا رکھی گئی ہے اس کا بدلہ جو وہ کرتے ہیں۔

صحیح بخاری میں اس آیت کی تفسیر میں رسول کریم ﷺ نے فرمایا: قَالَ اللّٰہُ اَعۡدَدۡتُ لِعِبَادِی الصَّالِحِیۡنَ مَالَا عَیۡنٌ رَاَتۡ وَلَا اُذُنٌ سَمِعَتۡ وَلَا خَطَرَ عَلٰی قَلۡبِ بَشَرٍ (بخاری) اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ میں نے اپنے صالح بندوں کے لیے وہ کچھ تیار کیا ہے جس کو نہ کسی آنکھ نے دیکھا ہے نہ کسی کان نے سنا ہے نہ کسی شخص کے دل پر وہ گزرا ہے۔

بہشت میں سب سے بڑی نعمت دیدار الٰہی ہے۔ یہ وہ سب سے بڑی نعمت ہے جو بہشتی کو بہشت میں ملے گی۔ لہٰذا پادری صاحب کا یہ اعتراض کہ بہشت کی تعلیم محض نفسانی ہے جس سے ایک خدا رسیدہ شخص کو کچھ تسلی نہیں ہوسکتی محض اسلامی جزاوسزا کی حکمت سے ناواقفیت کا نتیجہ ہے۔ قرآن مجید میں یہ واضح ہے۔ فَمَنۡ یَّعۡمَلۡ مِنَ الصّٰلِحٰتِ وَهُوَ مُؤۡمِنٌ فَلَا كُفۡرَانَ لِسَعۡیِهٖ وَاِنَّا لَهٗ كٰتِبُوۡنَ (الانبیاء ۲۱۔۹۵) پس جو کوئی اچھے کام کرے اور وہ مومن ہو۔ تو اس کی کوشش کی ناقدری نہ ہوگی اور ہم اس کے لیے لکھ لیتے ہیں۔

پس اسلامی تعلیم کے مطابق خدا رسیدہ شخص اپنے اعمال حسنہ کا پورا پورا بدلا پائے گا۔ اور اپنی جزا پر مکمل طور پر مطمئن ہوگا۔ جس طرح سزا میں جسم اور روح دونوں شامل ہیں اسی طرح جزا میں جسم اور روح دونوں شامل ہیں۔

انجیل میں جسمانی جزا کی طرف اشارہ ہے متی میں جسمانی جزا کے بارے میں لکھا ہے اور جس نے گھر یا بھائی یا بہن یا باپ یا جورو یا مال یا زمین کو میرے نام پر چھوڑا۔ سو گنا پاوے گا ۱۹ باب ۲۹ آیت میں صریح حکم ہے کہ اس میں یہ بشارت دی گئی ہے کہ اگر عیسائی عورت یسوع کے لیے خاوند چھوڑے تو قیامت کو اسے خاوند ملیں گے۔ جسمانی نعمتوں کا وعدہ کرنا اللہ تعالیٰ کی شان کے خلاف نہیں۔ توریت میں بھی جسمانی نعمتوں کا ذکر ہے توریت خروج ۳ باب ۵ آیت استثناء ۶ باب ۱۳۔ آیت ۱۳ آیت ۷ باب ۱۳، ۸ باب ۱۷ آیت اور قاضی ۹ باب ۱۲ آیت اور استثناء ۳۲ باب ۱۴ آیت، ۱۶ باب ۲ آیت اور احبار ۲۶ باب ۳ آیت، ۲۵ باب اور ایوب ۲۰ باب ۱۵ آیت میں جسمانی نعمتوں کے وعدے دیئے گئے ہیں۔

پس قرآن کی تعلیم کے مطابق بہشت میں جسمانی نعمتیں بھی ہوں گی روحانی نعمتیں بھی جسمانی نعمتیں جسم کے لیے اور روحانی نعمتیں روح کی خوشی کے لیے روح کی خوشی کے لیے سب سے بڑی نعمت دیدار الٰہی ہے۔

☆......☆

محض دلی خیال پر کوئی مواخذہ نہیں صرف گناہ کے ارتکاب پر ہے انجیل میں اس کے خلاف ہے

اعتراض: اسلامی تعلیم میں ہے کہ جب تک کوئی کسی گناہ کا مرتکب نہ ہو جائے تب تک ایسے شخص سے مواخذہ نہ ہوگا اور محض دلی خیالوں پر خدا پرسش نہیں کرے گا۔ مگر انجیل میں اس کے خلاف ہے یعنی دلی خیالات پر بھی عذاب ہوگا۔

جواب: اسلام کے نزدیک مجرم تین قسم کے ہیں۔

ا۔ زبان پر ناپاک کلمے جو دین اور راستی کے خلاف ہوں جاری ہوں۔

۲۔ جوارح کے ذریعے احکام خداوندی کی نافرمانی ہو۔

۳۔ دل میں نافرمانی پُرعزیمت کرے یعنی کسی بدی پر پختہ یقین کرلیا ہو۔

کہ فلاں فعل بد ضرور کروں گا۔ اس کی طرف اشارہ ہے جو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وَلٰكِنْ يُّؤَاخِذُكُمْ بِمَا كَسَبَتْ قُلُوْبُكُمْ یعنی جن گناہوں پر دل میں یہ عزیمت پیدا ہوگئی ہے۔ ان گناہوں کا مواخذہ ہوگا۔

مگر محض خطرات پر مواخذہ نہیں ہوگا۔ وہ انسانی فطرت کے قبضہ میں نہیں اللہ رحیم و کریم ہے کہ وہ اس قسم کے خطرات (دلی خیالات) جو اچانک دل میں آجاتے ہیں اور جو انسان کے بس میں نہیں ہوتے پر مواخذہ نہیں کرتا۔ قرآن مجید نے محض خطرات اور پرعزم خیالات میں فرق کیا ہے۔ جب ایک شخص اپنے قلبی خیالات کی دل کی عزیمت سے پیروی کرتا ہے اگر وہ پُرعزیمت خیالات گناہ پر مبنی ہیں تو ان خیالات کی سزا ملے گی اور اگر وہ پُرعزیمت خیالات نیکی پر مبنی ہیں تو جزا ملے گی۔ صرف پُرعزیمت خیالات قابل مواخذہ ہیں محض خطرات اور خیالات سے دل گناہ گار نہیں ہوتا اور نہ قابل مواخذہ ہے کیونکہ وہ تو انسان کے دل کے بس میں نہیں۔ دل کا کسی گناہ پر پختہ خیال کرلینا قابل مواخذہ ہے۔ اب انسان کی فطرت اور عقل فیصلہ کرسکتی ہے کہ کون سی تعلیم عند العقل قابل قبول ہے۔ انجیل کی تعلیم انسانی فطرت کے ہی منافی ہے اسلام نے عزیمہ اور خطرات میں فرق کیا ہے یہی تعلیم انسانی فطرت کے مطابق ہے اور انجیل کی تعلیم کو انسانی فطرت دھکے دیتی ہے۔

☆......☆

بجز مسلمانوں کے کسی سے محبت نہ کرو

اعتراض :اسلامی تعلیم میں غیر مذاہب والوں سے محبت کرنا کسی جگہ حکم نہیں آیا بلکہ حکم ہے کہ بجز مسلمانوں کے کسی سے محبت نہ کرو۔

جواب: فلسفہ محبت۔قرآن مجید کا فلسفہ محبت یہ ہے کہ جن سے محبت اور پیار ہو۔اس کے نقش قدم پر چلنا اور اس کے اوصاف حمیدہ اپنائے جائیں۔اس کے اخلاق میں رنگین ہونا چاہیے۔جس قدر محبوب سے زیادہ محبت ہوتی ہے اسی قدر انسان بالطبع اس کی طرف کھنچا چلا جاتا ہے۔ اللہ سے محبت ہے۔یہ محبت تقاضا کرتی ہے کہ ہر مسلمان اللہ تعالیٰ کی صفات میں اپنے آپ کو رنگ لے۔اس کے حکم پر عمل کرے۔رسول کریم ﷺ سے محبت ہے تو یہ محبت تقاضا کرتی ہے کہ ہر مسلمان رسول کریم ﷺ کے اسوہ حسنہ کے مطابق زندگی بسر کرے۔مسلم صلحاء سے محبت ہے تو ان کے نقش قدم پر چلنے کی کوشش کی جائے۔سچی محبت کرنے والا اپنے محبوب کے رنگ میں فنا ہو جاتا ہے۔وہ محبوب کی کامل تصویر بن جاتا ہے اس کے برعکس شیطان اور شیطان صفت لوگوں سے محبت نہیں ہو سکتی۔

محبت ایک عربی لفظ ہے اس کے اصل معنی پُر ہو جانا ہے چنانچہ عرب میں مشہور مثل ہے کہ تحبب الحمار۔گدھے کا پیٹ پانی سے بھر گیا۔اسی طرح کہا جاتا ہے شربت الابل حتیٰ تحبب اونٹ نے پانی پیا یہاں تک کہ وہ سیر ہو گیا یعنی اس کا پیٹ پانی سے بھر گیا۔حب دانہ کو کہتے ہیں۔وہ بھی اسی سے نکلا ہے۔یعنی دانہ اپنی تمام کیفیات سے بھر گیا۔(دانہ پودے کے اجزا سے بھرا ہوا ہے) قرآنی اصطلاح میں محبت کا لفظ محبوب اور پسندیدہ شے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے غیر مسلموں کے لیے کون سا لفظ یا الفاظ استعمال کرنے چاہئیں تو ان کے لیے شفقت اور ترحم کے الفاظ استعمال کا حکم ہے۔گویا مسلمان غیر مذاہب والوں کے ساتھ شفقت اور ترحم کا سلوک کریں گے۔

محب اپنے محبوب کے تمام اقوال اور افعال کو بنظر استحسان دیکھتا ہے ان اقوال اور افعال کی پیروی کرتا ہے جب کہ مشفق شخص مشفق علیہ کے ساتھ حالات کے مطابق نرمی اور سختی سے پیش آتا ہے۔اس کی مثال ایک ڈاکٹر کی سی ہے وہ مریض کے مرض کے مطابق علاج کرتا ہے۔لہٰذا اسلام یہ تعلیم دیتا ہے کہ نیکوں اور اخیار کے ساتھ محبت کرو اور غیر مسلموں اور کفار کے ساتھ شفقت کرو۔اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ عَزِيْزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِيْصٌ عَلَيْكُمْ اے کافرو! نبی ایسا شفیق ہے جو تمہارے رنج کو دیکھ نہیں سکتا اور حد درجہ خواہش مند ہے کہ تم کفر سے نجات پا جاؤ۔پھر فرمایا: لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ اَلَّا يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ اے نبی کیا تم اس غم سے اپنے آپ کو ہلاک کر لو گے کہ یہ لوگ کیوں ایمان نہیں لاتے۔

یہ ہے رسول کریم ﷺ کی شفقت اور ترحم کا نتیجہ کہ آپ ﷺ اس وجہ سے رنجیدہ ہیں کہ یہ لوگ کفر سے نجات کیوں نہیں پاتے۔۔ معترضین يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ، يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الْيَهُوْدَ وَالنَّصٰرٰۤى اَوْلِيَآءَ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْا بِطَانَةً مِّنْ دُوْنِكُمْ ۔یعنی یہود اور انصاری سے محبت نہ کرو۔ سے دھوکا کھایا ہے کہ مسلمانوں کو حکماً غیر مذاہب والوں سے محبت کرنے سے منع کیا گیا ہے۔

ان آیات سے صرف محبت کرنے سے منع کیا۔شفقت اور ترحم سے نہیں روکا۔ہر لفظ اپنے محل پر استعمال ہوتا ہے محبت کا لفظ اس ہستی

کے لیے استعمال کیا جاتا ہے جس کے اسوہ کی پیروی مقصود ہو اور شفقت اور ترحم کا لفظ ان لوگوں کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ جو روحانی طور پر مریض ہوں اور ان کی اصلاح مطلوب ہو۔ ہر گروہ سے تعلق پر الگ الگ لفظ استعمال کیا گیا ہے۔

اسلام نے کہیں بھی غیر مذاہب والوں کے ساتھ بے رحمی اور ظلم کی تعلیم نہیں دی۔ کفار بھی اللہ کے بندے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ہر ذی روح اور انسان کے ساتھ رحیمانہ سلوک کی تعلیم دی ہے۔ ارشاد الٰہی ہے۔ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ وَتَوَاصَوْا بِالْمَرْحَمَةِ (البلد:۹۰۔۱۷) کہ ایک دوسرے کو صبر اور رحم کی تلقین کرتے ہیں۔

رسول کریم ﷺ فرماتے ہیں لَا یَرْحَمُ اللّٰہُ مَنْ لَّا یَرْحَمُ النَّاسَ (بخاری باب رحمۃ للناس) جو شخص بندوں پر رحم نہیں کرتا اللہ اس پر رحم نہیں کرتا۔

کتنی واضح اور صاف تعلیم ہے۔ اسلام نے صرف ان لوگوں کے ساتھ لڑائی کرنے کا حکم دیا تھا۔ جو اسلام کو مٹا دینا چاہتے تھے۔ اسلام کی تمام لڑائیاں دفاعی تھیں۔ رفع شر اور حفاظت خود اختیاری کے لیے لڑی گئیں اس موضوع پر مفصل بحث گزر چکی ہے۔ الغرض غیر مذاہب والوں کے ساتھ معاشرتی رشتے کے لیے لفظ شفقت اور ترحم کی اصطلاح استعمال کی ہے جبکہ اخیار ابرار اور مسلمانوں کے لیے محبت کی اصطلاح ہے۔ ہر لفظ کا استعمال موقع اور محل پر ہوتا ہے۔ اسلام نے کہیں بھی غیر مذاہب والوں کے ساتھ ظالمانہ سلوک کی تعلیم نہیں دی۔ ایک مسلمان غیر مذاہب والوں سے دوستی، خیر خواہی، مشفقانہ برتاؤ کر سکتا ہے احسان کر سکتا ہے مگر محبت نہیں کر سکتا۔ یہ ایک باریک اور دقیق فرق ہے جس کو معترضین نہیں سمجھے۔

☆......☆

محمد صاحب نے غیر عورت پر نظر پڑنے پر بیوی سودہ سے خلوت کی

اعتراض: **محمد صاحب کی ایک غیر عورت پر نظر پڑی تو آپ نے گھر میں آ کر اپنی بیوی سودہ سے خلوت کی۔ پس جو شخص غیر عورت کو دیکھ کر اپنے نفس پر غالب نہیں آ سکتا جب تک اپنی عورت سے خلوت نہ کرے اور اپنے نفس کی حرص کو پورا نہ کرے۔ تو فرد اکمل کیوں کر ہو سکتا ہے؟**

جواب: معترض نے جس حدیث پر بنیاد رکھ کر اعتراض کیا ہے وہ صحیح مسلم کی ہے اس کے الفاظ یہ ہیں عَنْ جَابِرٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ ﷺ فَرَاٰی اِمْرَءَ ۃً فَاَتٰی اِمْرَاَتَہٗ زَیْنَبَ وَ ھِیَ تَمْعَسُ مَنِیْئَۃً لَھَا فَقَضٰی حَاجَتَہٗ۔ حضرت جابر سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک عورت کو دیکھا پھر اپنی بیوی زینب کے پاس آئے اور وہ چمڑا کو مالش کر رہی تھی سو آپ ﷺ نے اپنی حاجت پوری کی۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ اس حدیث میں سودہ کا کہیں ذکر نہیں۔ دوم اس حدیث سے یہ بھی ظاہر نہیں ہوتا کہ وہ عورت خوبصورت تھی۔ خوبصورتی کا کہیں ذکر نہیں۔

سوم: یہ بھی کہیں ذکر نہیں کہ وہ عورت جوان تھی یا بوڑھی۔ صرف ایک عام عورت کا ذکر کیا گیا ہے۔

چہارم اس حدیث سے یہ بھی ثابت نہیں ہوتا کہ رسول کریم ﷺ نے آ کر صحبت کی۔ حدیث کے الفاظ میں صرف یہ ہے فقضی حاجتہ۔ یعنی اپنی حاجت پوری کی۔ ”قضی حاجت“۔

لغت عرب میں مباشرت سے خاص نہیں۔ قضاء حاجت پاخانہ پھرنے کو بھی کہتے ہیں اور کئی اور معنوں میں مستعمل ہوتا ہے۔ یہ کہاں سے معلوم ہوا کہ آپ ﷺ نے اپنی بیوی سے صحبت کی۔ ایک عام لفظ کو کسی خاص معنی میں محدود کرنا صریحاً شرارت ہے اور حقائق سے انحراف ہے۔ اس کے علاوہ رسول اللہ ﷺ نے یہ کہیں ذکر نہیں کیا۔ یا دوسرے الفاظ میں یہ حدیث رسول اللہ ﷺ سے مروی نہیں کہ میں نے ایک عورت کو دیکھا پھر گھر جا کر اپنی بیوی سے مجامعت کی۔ صرف صحابی کے الفاظ ہیں اور وہ صحابی رسول کریم ﷺ سے روایت نہیں کر رہا۔

حقیقت یہ ہے کہ رسول کریم ﷺ کی ایک حدیث ہے جس کا ترجمہ یہ ہے کہ اگر تم میں سے کوئی شخص کسی عورت کو دیکھے اور وہ اس کی نظر میں خوبصورت معلوم ہو تو بہتر ہے کہ فی الفور گھر آ کر اپنی بیوی سے صحبت کرے۔ تا کہ کوئی خطرہ بھی دل میں گزر نہ پائے۔

یہ ممکن ہے کہ کسی صحابی کو اس حدیث کے سننے کے بعد یہ معلوم ہوا ہو کہ رسول اللہ ﷺ کے کسی راہ میں کوئی جوان عورت سامنے آ گئی۔ پھر اس کو یہ بھی اطلاع ہو گئی ہو کہ اس وقت کے قریب ہی آپ ﷺ نے اتفاقاً اپنی بیوی سے صحبت کی۔ تو اس نے اس اتفاقی امر پر یہ گمان کر لیا ہو۔ جو اس نے بیان کر دیا ہے۔ یہ محض صحابی کا گمان ہے۔ براہ راست رسول کریم ﷺ سے براہ راست علم حاصل کر کے روایت بیان نہیں کی لہٰذا اس کو حدیث کا درجہ نہیں دیا جا سکتا۔ یہ محض صحابی کا اپنا گمان ہو سکتا ہے۔

اگر فرض بھی کر لیں کہ وہ قول صحابی کا صحیح تھا۔ تو اس سے یہ بدنتیجہ نکالنا خبث باطنی ہے۔ یہ عمل صحابہ کی ہدایت اور تقویٰ کی باریک راہوں پر چلانے کے لیے کیا ہو۔ تا کہ صحابہ زنا جیسے فعل شنیعہ سے باز رہیں۔ انبیاء علیہم السلام کا یہ طریقہ ہدایت ہے کہ بسا اوقات وہ تنزل کے طور پر کوئی ایسا نیکی کا کام بھی کرتے ہیں جس میں محض عملی نمونہ دکھانا منظور ہوتا ہے اور ان کے نفس کو اس کی کوئی ضرورت نہیں ہوتی۔

الغرض صحابی کے گمان کو جس رنگ میں دیکھا جائے اس پر کوئی اعتراض وارد نہیں ہوتا۔ جب کہ یہ اعتراض محض بدگمانی پر مبنی ہے۔ حدیثوں سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ جب عورتیں بیعت کے لیے آتی تھیں تو ان کو دور بٹھا کر زبانی تلقین توبہ کرتے تھے ایسے شخص پر اس قسم کی بدگمانی کرنا صریحاً ظلم اور زیادتی ہے۔

☆......☆

حضرت عیسیٰ علیہ السلام رسول کریم ﷺ سے افضل ہیں

رسالہ بنام حقائق قرآن شائع کردہ کرسچن بک سٹور لدھیانہ

چند اعتراضات اور ان کے جوابات

(نوٹ: ان اعتراضات میں یہ ظاہر کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ قرآنی آیات کی روشنی میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام، رسول کریم ﷺ پر فضیلت رکھتے تھے)

☆......☆

حضرت مسیح کی پیدائش معجزانہ ہے

اعتراض: مسیح کی پیدائش معجزانہ ہونا قرآن سے ثابت ہے۔

جواب: اس کا جواب از روئے انجیل دیا جاتا ہے کہ آیا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش معجزانہ تھی یا عام قانون کے مطابق تھی۔ انجیل سے صاف واضح ہے کہ حضرت مریم کی شادی یوسف نجار سے ہوئی چنانچہ متی ۱:۲۰ میں ہے۔

''کہ خداوند کے فرشتہ نے اسے خواب میں دکھائی دے کر کہا کہ اے یوسف ابن داؤد اپنی بیوی مریم کو اپنے ہاں لے آنے سے نہ ڈر'' اور آگے لکھا ہے کہ اس نے ایسا ہی کیا۔ اور اپنی بیوی کو اپنے ہاں لے آیا اور اس کو نہ جانا جب تک وہ بیٹا نہ جنی۔ (متی ۱:۲۴۔۲۵) یہاں واضح کر دیا گیا ہے وضع حمل کے بعد یوسف اپنی بیوی مریم کے پاس گیا تھا اور اپنی بیوی کو اپنے گھر لے آیا۔

انجیل سے یہ بھی واضح ہوتا ہے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے اور بھی بھائی اور بہنیں تھیں۔ ''جب وہ بھیڑ سے یہ کہہ رہا تھا تو دیکھو اس کی ماں اور بھائی باہر کھڑے تھے۔ کسی نے اس سے کہا دیکھو تیری ماں اور تیرے بھائی باہر کھڑے ہیں۔'' (متی: ۱۲:۶۔۴۷) ماں کے ساتھ بھائیوں کا ذکر واضح کرتا ہے کہ حضرت مسیح کے حقیقی بھائی تھے۔

پھر لوقا ۲:۷ میں ہے ''اس کے جننے کا وقت آپہنچا اور وہ پہلوٹا بیٹا جنی'' اب یہ ظاہر ہے کہ حضرت مریم کے بطن سے اور اولاد نہ ہوتی تو حضرت مسیح کو پہلوٹا بیٹا نہ کہا جاتا بلکہ اکلوتا بیٹا کہا جاتا۔ لفظ ''پلھوٹا'' ظاہر کرتا ہے حضرت مریم کی اور بھی اولاد تھی۔ پھر متی ۱۳:۵۴۔۵۵۔۵۶ میں ہے......اس کو یہ حکمت اور معجزے کہاں سے مل گئے۔ کیا یہ بڑھئی کا بیٹا نہیں اور اس کی ماں کا نام مریم اور اس کے بھائی یعقوب اور یوسف اور شمعون اور یہودا نہیں؟ اور کیا اس کی سب بہنیں ہمارے ہاں نہیں۔'' یہاں بہنوں کے لیے جمع کا صیغہ آیا ہے کہ حضرت مسیح کی کم سے کم تین بہنیں ضرور ہوں گی۔ انجیل خود واضح کر رہی ہے کہ حضرت مریم کا خاوند یوسف نجار تھا۔ اور عام قانون قدرت کے مطابق حضرت مسیح علیہ السلام کی پیدائش ہوئی۔ اس میں کوئی معجزانہ بات نہیں۔ حضرت مریم نے دیگر عورتوں کی طرح دردزہ پایا اور جننے کی تکلیف سے گزریں۔

۲۔ اگر مسلمانوں کے عام مروجہ عقیدہ کو بھی لیا جائے۔ تو بھی حضرت مسیح علیہ السلام کی کوئی فضیلت نہیں ہوتی۔ حضرت مسیح کا بن باپ ہونا یہ کوئی معجزہ نہیں کیونکہ نبی کا معجزہ ہوتا ہے جب اس کی بعثت کے بعد اس کی تائید یا صداقت کے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے خارق عادت امر ظاہر ہو۔ اگر عیسائی بن باپ ولادت کو معجزہ پر مصر ہوں تو پھر آدم کا معجزہ کہ وہ تو بن باپ اور بن ماں پیدا ہوئے۔ عیسائیوں کو بھی علم ہے یہ تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے بھی زیادہ بڑا معجزہ ہے حوا کا معجزہ بھی وہ بھی بغیر باپ اور ماں پیدا ہوئیں۔ اگر بن باپ ولادت فضیلت کی نشانی ہے تو پھر بن باپ اور ماں تو اور بھی سب سے بڑی فضیلت کی علامت ہے لہٰذا حضرت آدم اور حوا حضرت عیسیٰ سے افضل ہوئے۔

پھر ملک صدق سالیم کے بادشاہ کے متعلق انجیل میں یہ الفاظ ہیں۔ یہ بے باپ بے ماں بے نسب نامہ (عبرانیوں ۷:۳) کیا ملک صدق بے باپ اور بے ماں ہونے کی وجہ سے مسیح علیہ السلام سے افضل تھا۔

۳۔ عیسائیوں نے قرآن مجید کے الفاظ اَحْصَنَتْ فَرْجَهَا سے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ حضرت مریم کسی مرد کے پاس کبھی نہیں گئیں۔ محصنات کا لفظ قرآن مجید میں ان عورتوں پر بولا گیا ہے جو عقدہ نکاح میں ہوں اور پاک دامن ہوں۔ لہٰذا کنواری عورت کی پاک دامنی پر یہ لفظ نہیں بولا جاتا یہ الفاظ (احصنت فرجھا) یہودیوں کے اس الزام کے رد میں ہیں جو انہوں نے حضرت مریم پر لگایا۔ جیسا کہ ان الفاظ میں اشارہ ہے وَقَوْلِهِمْ عَلٰى مَرْيَمَ بُهْتَانًا عَظِيْمًا یعنی مریم پر انہوں نے بڑا بہتان تراشا۔ ان کے اس بہتان کی طرف ان الفاظ میں اشارہ پایا جاتا

ہے ماکان ابوك امرء سوء و ما کانت امك بغیاً نہ تیرا باپ برا آدمی تھا اور نہ تیری ماں بدکار۔

یہ قرآن مجید کا عیسائیوں پر احسان ہے کہ اس کتاب نے حضرت مریم کی پاک دامنی پر گواہی دی ہے کہ تاریخ میں یہ واضح کر دیا ہے کہ وہ ایک سچی پاک دامن عورت تھی۔

۴۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اگر حضرت مسیح علیہ السلام کے والد ہوتے تو ان کو ابن مریم کے نام سے کیوں موسوم کیا جاتا۔ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ جہاں ماں زیادہ معزز اور مشہور ہو۔ تو اولاد ماں کی طرف منسوب کر دی جاتی ہے جیسے بنی فاطمہ کہتے ہیں نہ کہ بنی علی۔

دوم: ابن مریم کو آپ کا نام قرار دیا گیا ہے۔ اسمه المسیح عیسیٰ بن مریم۔ اس کا نام المسیح عیسیٰ بن مریم ہے۔ یعنی یہ پورا نام ہے بن مریم نام کا حصہ ہے۔

المسیح عیسیٰ بن مریم نام میں تین اشارے پائے جاتے ہیں لفظ المسیح میں اشارہ ہے آپ کی سیاحت کی طرف، لفظ عیسیٰ آپ کی صلیب کی موت سے بچائے جانے کی طرف اور ابن مریم میں یہ اشارہ ہے کہ آپ کی تعلیم میں عفو درگزر اور محبت کا پہلو غالب ہوگا کیونکہ ماں میں جذبہ محبت کا غلبہ ہوتا ہے۔

☆......☆

مسیح کی پیدائش کی خبر حضرت مریم کو بذریعہ جبرائیل دی گئی

اعتراض: مسیح کی پیدائش کی بشارت حضرت مریم کو حضرت جبرئیل کے ذریعے دی گئی۔ (اس وجہ سے حضرت مسیح افضل ہیں)

جواب: یہ بھی کوئی فضیلت کی نشانی نہیں کہ حضرت مریم کو حضرت جبرئیل نے عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت کی خوشخبری دی۔ لاکھوں کی تعداد میں مسلمان مرد اور عورتیں ہیں جن کو بچے کی ولادت سے پہلے خوشخبری دی گئی یہ بھی عین ممکن ہے کہ دیگر مذاہب کے لوگوں میں بھی یہ شہادت مل سکتی ہے۔ الغرض یہ قبل از ولادت اللہ تعالیٰ کا کسی بچے کی ولادت کی خبر دینا کوئی وجہ فضیلت نہیں۔ ہاں اس سے صرف یہ ظاہر ہو سکتا ہے کہ جس کو ولادت سے قبل بچے کی پیدائش کی خبر دی گئی ہے وہ خدا کے ہاں مقرب ہے۔

یہ خوشخبری زیادہ سے زیادہ قرب الٰہی پر تو دلالت کر سکتی ہے بچے کی کوئی فضیلت نہیں بچے کی فضیلت اس وقت ظاہر ہو گی جب وہ اپنے کسی کارنامے کو وجہ ظاہر کرے اور ایسا عظیم کارنامہ سرزد ہو جو کسی سے بھی سرزد نہ ہوا ہو۔

اگر قبل از وقت کسی کی پیدائش کی فضیلت ظاہر ہو سکتی تو وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیشینگوئی ہے جو آپ نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق کی تھی۔ قرآن مجید میں مسیح کی زبانی فرمایا۔ وَمُبَشِّراً بِرَسُوْلٍ يَاْتِي مِنْۢ بَعْدِي اسْمُهٗٓ اَحْمَدُ ا (الصف 6:61) اور میں خوشخبری دیتا ہوں ایک رسول کی جو میرے بعد آئے گا۔ اس کا نام احمد ہے۔

جب حضرت عیسیٰ کی ولادت کی خوشخبری ایک عورت کو دی جاتی ہے جب حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی خبر ایک نبی نے دی ہے۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق خبر صرف حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے نہیں دی۔ بلکہ تمام مذاہب عالم کی کتب میں پیشینگوئیاں درج ہیں۔ اس موضوع پر علماء نے بہت کام کیا ہے سب سے اعلیٰ کام عبدالحق ودیارتھی کا ہے جنہوں نے اپنی کتاب ''میثاق النبین'' میں تمام

کتب سماوی میں رسول کریم ﷺ کے متعلق پیشینگوئیوں پر سیر حاصل بحث کی ہے۔ رسول کریم ﷺ پر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی فضیلت ظاہر کرنے والوں پر یہ واضح ہو جائے گا کہ دنیا میں صرف ایک ہی موعود ذات ہے وہ ہے حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم جن کے متعلق پہلے انبیاء علیہم السلام نے خبر دی تھی۔

☆......☆

مسیح کی والدہ کی فضیلت تمام دنیا کی عورتوں پر

اعتراض: مسیح کی والدہ حضرت مریم کی فضیلت علی نساء عالمین خود قرآن نے بیان کی ہے اور ان کو صدیقہ کا لقب دیا ہے لیکن حضرت محمد کی والدہ کا نام تک قرآن میں موجود نہیں اور بعض مسلمان ان کے ایماندار ہونے کے بھی قائل نہیں۔

جواب: والدین کے بڑا ہونے سے بچے (اولاد) کا بڑا ہونا لازم نہیں آتا۔ قرآن مجید نے بڑا ہونے کا اصول تقویٰ بیان کیا ہے ارشاد الٰہی ہے اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰكُمْ یعنی سب سے بڑا اور جب تکریم وہ شخص ہے جو سب سے زیادہ تقویٰ والے ہیں۔ حضرت مریم کا نساء العلمین پر افضل ہونے سے مراد صرف اس زمانہ کی عورتیں ہیں۔ جس طرح بنی اسرائیل کے متعلق ایک جگہ آتا ہے فَضَّلْتُكُمْ عَلَى الْعَالَمِيْنَ میں نے تم کو جہانوں پر فضیلت دی آگے فرمایا بَآءَ و بِغَضَبٍ عَلٰى غَضَبٍ وہ غضب پر غضب کے مستحق ہو گئے۔ وہی افضل قوم (بنی اسرائیل) اللہ تعالیٰ کے غضب کا نشانہ بنی۔ باء و بغضب علی غضب کے الفاظ ظاہر کرتے ہیں کہ بنی اسرائیل کو فضیلت صرف ایک مخصوص دور میں اپنے ہم عصر لوگوں پر تھی۔ پس حضرت مریم کی فضیلت بھی صرف ہم عصر عورتوں پر ہے نہ کہ بعد کی آنے والی عورتوں پر بھی۔

ب۔ قرآن مجید میں صدیقہ کا خطاب اس تہمت کے جواب میں ہے جو یہودی آپ پر لگاتے رہے۔ جیسا کہ قرآن مجید میں آتا ہے۔ وَقَوْلِهِمْ عَلٰى مَرْيَمَ بُهْتَانًا عَظِيْمًا انہوں نے مریم پر بہت بڑا بہتان تراشا۔ یہ بہتان حضرت مریم پر نعوذ باللہ زنا کا تھا۔ یا اس دوسرے الزام کا ہے جو انجیل میں آتا ہے کہ آپ کی والدہ آپ پر ایمان نہ لائی تھیں صدیق یا صدیقہ اس کو کہا جاتا ہے جو کسی نبی کی صداقت پر ایمان لائے۔ مگر انجیل میں یہ الفاظ ہیں۔ کہ جب مریم حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے پاس آئیں تو وہ ان الفاظ سے مخاطب ہوئے۔ ''کون ہے میری ماں اور کون ہیں میرے بھائی۔'' اور اپنے شاگردوں کی طرف ہاتھ بڑھا کر کہا۔ دیکھو میری ماں اور میرے بھائی یہ ہیں کیونکہ جو کوئی میرے آسمانی باپ کی مرضی پر چلے وہی میرا بھائی اور بہن اور ماں ہے۔ (متی ۱۲: ۴۸-۵۰) ان الفاظ سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت مریم خدا کی مرضی کے مطابق نہیں چلتی تھیں۔ قرآن مجید کا یہ احسان ہے کہ اس کتاب نے انجیل کے غلط الزام کی تردید کی اور کہا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی والدہ صدیقہ تھیں یعنی حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر ایمان لائی تھیں۔

قرآن مجید میں حضرت مریم کا ذکر اس وجہ سے کیا گیا ہے کہ ان پر یہودیوں نے الزام لگایا تھا۔ بریت کے لیے قرآن مجید میں ان کا ذکر آیا ہے۔ چونکہ رسول کریم ﷺ کی والدہ ماجدہ پر اس قسم کا کوئی الزام نہیں تھا اس وجہ سے ان کے ذکر کی قرآن مجید میں ضرورت نہیں۔ رسول کریم ﷺ کے والد آپ کی پیدائش سے قبل اور والدہ آپ کی چھ سال کی عمر میں وفات پا جاتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ خود آپ کی تربیت کرتے ہیں۔ آپ ﷺ یتیمی میں بھی اعلیٰ اخلاق کے مالک بنے یہ اللہ تعالیٰ کی تربیت کا نتیجہ تھا اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام اپنے والدین کے زیر تربیت رہنے

کے باوجود اس خلق عظیم تک نہیں پہنچے جس بلندی تک رسول کریم پہنچے تھے اسی طرح حضرت مسیح لکھنا پڑھنا جانتے تھے۔ آپ نے توریت اپنے استادوں سے پڑھی۔ جبکہ رسول کریم ﷺ قطعاً لکھنا پڑھنا نہیں جانتے تھے اور نہ کسی معلم کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا اور دنیا کو وہ حکمت کی باتیں سکھا گئے جو کسی نبی نے نہیں سکھائیں۔ یہ ہے فضیلت کا معیار کہ آپ بہترین مزکی تھے اور بہترین معلم اور ایک ایسی جانثار جماعت پیدا کی۔ جنھوں نے آپؐ کے لئے اپنی جانیں قربان کر دیں۔ اپنے اعزہ واقارب کو چھوڑ دیا۔ جبکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حواریوں پر نظر دوڑاتے ہیں تو وہ چند کوڑیوں کے عوض گرفتار کراتے ہیں ان پر لعنت بھیجتے ہیں ان کے منہ پر تھوکتے ہیں۔ حتیٰ کہ حواریوں کی موجودگی میں گرفتار کر کے صلیب پر چڑھائے جاتے ہیں۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی فضیلت کسی پہلو سے بھی حضرت نبی کریم ﷺ پر ظاہر نہیں ہوتی۔ بلکہ تمام انبیاء علیہم السلام پر آپ ﷺ کی فضیلت نیرّ تابان کی طرح ظاہر و باہر ہے۔

یہ بات کہ بعض مسلمان آمنہ کے ایماندار ہونے کے قائل نہیں۔ لایعنی بات ہے قرآن مجید کی کون سی آیت اس پر شاہد ہے۔ جب آپ ﷺ کی عمر چھ برس کی تھی۔ آپ ﷺ کی والدہ ماجدہ فوت ہو گئیں۔ ایمان لانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

☆......☆

(حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش کے وقت خارق عادت امور ظاہر ہوئے)

اعتراض: مسیح کی پیدائش کے وقت خارق عادت امور ظہور میں آئے مثلاً نخل خشک ہرا ابھرا ہو کر پھل لایا۔ ایک چشمہ جاری ہو گیا۔

جواب: قرآن مجید میں یہ کہیں بھی ذکر نہیں۔ خشک نخل ہرا ابھرا اور پھل دار ہو گیا صرف یہ لکھا ہے کہ دردزہ کے وقت حضرت مریم نے ایک کھجور کے تنہ سے سہارا لیا۔ درخت پھل دار تھا۔ بھوک کے وقت اس سے تازہ کھجور کھانے کو مل گئیں۔ کسی جگہ کھجور کا موجود ہونا اور وہاں چشمہ کا ہونا کوئی خارق عادت امر نہیں۔ کئی مسافروں کو سفر میں اس قسم کی سہولتیں دستیاب ہو جاتی ہیں۔

انجیل میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش کا ذکر صرف اتنا ملتا ہے اور اس کو کپڑے میں لپیٹ کر چرنی میں رکھا کیوں کہ ان کے واسطے سرائے میں جگہ نہ تھی۔ (لوقا۔۲:۷) رسول کریم ﷺ ایک معزز گھرانے میں پیدا ہوئے۔ اس لیے آپ ﷺ کی والدہ کو نہ یہ ضرورت پیش آئی کہ بچے کو چرنی میں رکھے نہ ذکر کی کوئی ضرورت تھی۔

☆......☆

مسیح کا مھد میں تکلم اور نبوت اور کتاب کا دیا جانا

اعتراض: مسیح کا تکلم فی المھد اور ایتائے کتاب ونبوت بزبان شیر خوارگی تمام انبیاء پر اس کی فضیلت کی نہایت صاف وصریح دلیل ہے۔

جواب: قرآن مجید میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق تکلم فی المھد کا ذکر آیا ہے۔ وہاں ادھیڑ عمر میں تکلم کا ذکر ہے۔ ادھیڑ عمر میں کلام کرنے کو باعث فضیلت کیوں قرار نہیں دیا جاتا۔ قرآن مجید میں آتا ہے یکلم الناس فی المھد و کھلاً وہ بچہ ہونے کی حالت میں اور ادھیڑ ہونے کی حالت میں وہ لوگوں سے باتیں کرے گا۔ زمانہ مھد کو باعث فضیلت قرار دیا جاتا ہے اور زمانہ ادھیڑ کو چھوڑ دیا جاتا ہے اس آیت کا بڑا واضح مفہوم ہے کہ اللہ تعالیٰ حضرت مریم کو یہ خوشخبری دے رہا ہے کہ اس بچے میں کوئی نقص نہ ہوگا۔ اور بڑی عمر پائے گا۔ یہاں تک کہ وہ بڑھاپے کی عمر کو پہنچ جائے گا۔ یہ واقعہ عیسائیوں کو متنبہ کر رہا ہے کہ جو بچہ پیدا ہوتا ہے۔ پھر جوان ہوتا ہے پھر بڑھاپے میں پیر رکھتا ہے۔ کیا وہ خدا ہوسکتا ہے اس آیت میں جہاں حضرت مریم کو یہ بتایا ہے کہ یہ بچہ ہر نقص سے پاک ہوگا۔ تکلم فی المھد کے الفاظ بچے کا ہر نقص سے پاک ہونے پر دلالت کرتے ہیں اور یہاں تک وہ بڑھاپے کی عمر پائے گا۔ یعنی لمبی عمر پائے گا۔ وہاں یہود کے باطل عقیدہ کا بھی رد کیا ہے کہ مختلف حالتوں میں گزرنے والا شخص خدا نہیں ہوسکتا۔

ایتاء کتاب ونبوت بزبان شیر خوارگی

قرآن میں آتا ہے۔ قَالَ اِنِّیْ عَبْدُ اللّٰہِ اٰتٰنِیَ الْکِتٰبَ وَجَعَلَنِیْ نَبِیًّا وَّجَعَلَنِیْ مُبٰرَکًا اَیْنَ مَا کُنْتُ وَاَوْصٰنِیْ بِالصَّلٰوۃِ وَالزَّکٰوۃِ مَا دُمْتُ حَیًّا وَّبَرًّا بِوَالِدَتِیْ وَلَمْ یَجْعَلْنِیْ جَبَّارًا شَقِیًّا (مریم ۱۹: ۳۰-۳۲) کہا میں اللہ کا بندہ ہوں۔ اس نے مجھے نبی بنایا اور مجھے برکت والا بنایا۔ جہاں کہیں میں رہوں اور مجھے نماز اور زکوٰۃ کا حکم دیا ہے جب تک میں زندہ ہوں اور اپنی ماں سے نیکی کرنے والا ہوں اور اس نے مجھے سرکش بد بخت نہیں بنایا۔

جب ان آیات پر غور کیا جائے تو واضح ہو جاتا ہے یہ تمام کلام زمانہ شیر خوارگی کا نہیں۔ بلکہ زمانہ نبوت کا ہے۔ قرآن مجید کا ایک خاص طرز بیان ہے کہ کوئی واقعہ بیان کیا۔ تو اس واقعہ کے وہی جز و بیان کیے جاتے ہیں جس کا بیان کرنا مفید اور ضروری ہوتا ہے۔ دوسرے اجزا چھوڑ دیئے جاتے ہیں۔ مثلاً حضرت زکریا کو یہ بشارت دی گئی کہ اس کے ہاں لڑکا پیدا ہوگا۔ اب یہ فرما کر کہ تین دن ذکر الٰہی میں بسر کرو۔ یہاں یہ بیان نہیں کیا کہ پھر اس کی بیوی حاملہ ہوگئی۔ پھر وہ بچہ پیدا ہوا۔ پھر بڑا ہوا۔ بلکہ ذکر الٰہی کے حکم کے بعد فوراً فرمایا یا یحییٰ خذ الکتاب بقوۃ۔ اے یحییٰ کتاب کو مضبوطی سے تھام لو۔ بچے کی پیدائش کی خبر دینے کے بعد تین دن ذکر الٰہی کا حکم دیا اس کے بعد یحییٰ کی پیدائش اور بچپن اور جوانی کے دیگر احوال چھوڑ دیئے ہیں۔ یحییٰ کی نبوت کا ذکر کر دیا ہے۔ قرآن مجید کا خاص طرز اسلوب ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے واقعہ میں یہی اسلوب اختیار کیا گیا ہے پیدائش کا ذکر کر کے ان کے عہد نبوت کا ذکر کیا ہے۔ ان آیات میں عہد نبوت کا کلام ہے شیر خوارگی کے زمانہ کا نہیں۔ یہی بات انجیل سے ثابت ہوتی ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر روح القدس تیس سال کی عمر میں نازل ہوا۔ اس وقت انہوں نے یوحنا سے بپتسمہ پایا۔ اور یوحنا کی مریدی میں آئے۔ یوحنا مسیح کو بپتسمہ دیتا ہے تب روح القدس ان پر نازل ہوتا ہے۔ ''اس وقت یسوع

گلیل سے یردن کے کنارے یوحنا کے پاس اس سے بپتسمہ لینے آیا اور یسوع بپتسمہ لے کر فی الفور پانی کے پاس سے اوپر گیا اور دیکھو اس کے لیے آسمان کھل گیا اور اس نے خدا کی روح کو کبوتر کی مانند اترتے دیکھا۔"

انجیل واضح کر رہی ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر روح القدس اس وقت نازل ہوئی جب آپ کی عمر تیس سال کی تھی اور یوحنا سے بپتسمہ لیا۔ یہی بات قرآن مجید میں بیان ہوئی ہے۔ ناسمجھی سے جو کلام شیر خوارگی کا خیال کیا جاتا ہے دراصل وہ زمانہ نبوت کا ہے۔ قرآن مجید میں ولادت کے بعد کے واقعات کو حذف کر کے زمانے نبوت کا ذکر کر دیا ہے۔

کیا کوئی صاحب عقل یہ سمجھ سکتا ہے کہ شیر خوارگی میں اللہ تعالیٰ نے یہ کتاب بھی دے دی ہو۔ نبی بھی بنا دیا ہو اور صاحب برکت بھی بنا دیا ہو۔ نماز اور زکوٰۃ ادا کرنے کا حکم بھی دے دیا ہو۔ پھر شیر خوارگی میں ہی والدہ سے نیک سلوک کرنے کا حکم دے دیا ہو۔

یہ اللہ تعالیٰ کی سنت کے خلاف ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کسی نبی کو کتاب اور نبوت حالت شیر خوارگی میں نہیں دی۔ شیر خوارگی کی عمر میں بچہ مکلف ہی نہیں ہوتا۔ کتاب اور نبوت کا تعلق بلوغت کے ساتھ ہے۔

مزید وضاحت کے لیے چند آیات کی وضاحت کرتا ہوں۔ درحقیقت ان آیات کی وجہ سے بھی آیات ۳۰۔۳۲ کا مفہوم غلط سمجھا ہے۔

فَكُلِي وَاشْرَبِي وَقَرِّي عَيْنًا فَإِمَّا تَرَيِنَّ مِنَ الْبَشَرِ أَحَدًا فَقُولِي إِنِّي نَذَرْتُ لِلرَّحْمَٰنِ صَوْمًا فَلَنْ أُكَلِّمَ الْيَوْمَ إِنسِيًّا ۝ فَأَتَتْ بِهِ قَوْمَهَا تَحْمِلُهُ قَالُوا يَا مَرْيَمُ لَقَدْ جِئْتِ شَيْئًا فَرِيًّا ۝ يَا أُخْتَ هَارُونَ مَا كَانَ أَبُوكِ امْرَأَ سَوْءٍ وَمَا كَانَتْ أُمُّكِ بَغِيًّا ۝ فَأَشَارَتْ إِلَيْهِ قَالُوا كَيْفَ نُكَلِّمُ مَن كَانَ فِي الْمَهْدِ صَبِيًّا ۝ (مریم ۱۹۔۲۶۔۲۹)

سو کھا اور پی اور آنکھیں ٹھنڈی کر پھر اگر تو کسی انسان کو دیکھے تو کہنا میں نے رحمٰن کے لیے روزہ رکھا ہوا ہے اس لیے آج میں کسی انسانی سے کلام نہیں کروں گی۔ پھر اسے سوار کیے ہوئے اپنی قوم کے پاس آئی۔ انہوں نے کہا اے مریم تو ایک عجیب چیز لائی ہے اے ہارون کی بہن تیرا باپ برا آدمی نہیں تھا اور نہ تیری ماں بدکار تھی۔ تو اس نے اس کی طرف اشارہ کیا انہوں نے کہا ہم کس طرح اس کے کلام کریں جو (ابھی کل) جھولے میں لڑکا تھا۔

آیت ۲۶ (اِنّی نذرت...... انسیا) کا تعلق حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت کے ساتھ ہے جب ولادت ہوئی تو اللہ تعالیٰ نے حضرت مریم سے کہا کہ اللہ کے شکرانے کے طور پر رحمٰن کے لیے کسی انسان سے نہ بولنے کا روزہ رکھ۔ اس کے بعد حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا مقام نبوت پر فائز ہونے تک کے واقعات حذف کر دیئے گئے ہیں اور نبوت کے بعد کے واقعات کا ذکر کیا ہے۔ فَأَتَتْ بِهِ قَوْمَهَا...... فِي الْمَهْدِ صَبِيًّا (۲۷ تا ۲۹) یہ واقعات نبوت کے بعد کے ہیں۔ حضرت مریم سوار ہو کر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ساتھ یروشلم میں داخل ہوئیں۔ انجیل متی ۲۱ باب جس میں حضرت مسیح کے یروشلم پہنچنے کا اور گدھی یا گدھی کے بچے یا دونوں پر سوار ہونے کا ذکر ہے۔ "اور گدھی اور بچے کو لا کر اپنے کپڑے ان پر ڈالے اور وہ ان پر بیٹھ گیا۔ (متی ۲۱:۷) اور یہ اس لیے ہوا کہ جو نبی کی معرفت کہا گیا تھا وہ پورا ہو۔ (متی ۲۱:۴)

پس آیت ۲۷ میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا اپنی والدہ کے ساتھ یروشلم میں سوار ہو کر جانے کا ذکر ہے۔ بعض نے اس آیت سے یہ سمجھ رکھا ہے کہ اس آیت میں ولادت کے بعد اپنے بچے کو اپنی قوم کے پاس آنے کا ذکر ہے یہود حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے دو وجوہ کی بناء پر دشمن تھے ایک خدائی دعویٰ کیا ہے۔ دوم: کہتے تھے اپنے وعظوں میں یہود کے علماء کو برا بھلا کہتے تھے۔ "اے سانپ کے بچو! تم برے ہو کر کیوں کر اچھی باتیں کہہ سکتے ہو۔" (متی ۱۲:۳۴) اے ریاکار فقیہو اور فریسیو تم پر افسوس ہے کہ تم سفیدی پھری ہوئی قبروں کی مانند ہو، جو اوپر سے تو خوبصورت دکھائی دیتی ہیں مگر اندر مردوں کی ہڈیوں اور ہر طرح کی نجاست سے بھری ہوئی ہیں۔ اسی طرح تم بھی ظاہر میں تو لوگوں کو راست

باز دکھائی دیتے ہو مگر باطن میں ریا کاری اور بے دینی سے بھرے ہوئے ہو۔ (متی ۲۳۔۲۷:۲۸) اے سانپوا افعی کے بچو (متی ۲۳:۳۳) ان دو وجوہ کی وجہ سے یہود نے حضرت مریم سے کہا کہ تو نے عجیب بچہ جنا ہے جب کہ تیرا باپ برا آدمی نہ تھا اور نہ تیری ماں بدکار تھے وہ تو شریف تھے۔ تمہارے بچے نے اپنے خاندان کی عزت ڈبو دی ہے ایک خدائی دعویٰ کرتا ہے۔ دوم: یہود کے علماء کو بُرا بھلا کہتا ہے۔ حضرت مریم نے یہود کا یہ طعنہ سن کران سے کہا کہ اس کا جواب میرے بچے سے پوچھ لو۔ تو یہود نے کہا ہم اس سے کیا پوچھیں یہ تو ہمارے نزدیک کل کا بچہ ہے۔ یہ ہر زبان کا محاورہ ہے۔ جب بوڑھے کے سامنے کوئی جوان آئے اور بات کرنے لگے تو بوڑھے یہ کہہ دیتے ہیں آپ تو کل کے بچے ہو۔ تم سے کیا بات کریں۔ اسی محاورہ کے مطابق یہ الفاظ بھی قَالُوْا كَيْفَ نُكَلِّمُ مَنْ كَانَ فِي الْمَهْدِ صَبِيًّا (اس سے کیا کلام کریں جو (ابھی کل) جھولے میں لڑکا تھا۔ اس وقت حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے یہ جواب دیا اِنِّي عَبْدُ اللّٰهِ (میں اللہ کا بندہ ہوں) جو تم نے مجھ پر یہ الزام لگایا ہے کہ میں نے خدائی دعویٰ کیا ہے غلط ہے میں تو صرف اللہ کا بندہ ہوں۔ مزید وضاحت کرتے ہوئے کہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے مجھے کتاب دی ہے اور مجھے نبی بنا کر بھیجا ہے۔ تم اس بات کے قائل ہو کہ اللہ تعالیٰ ہدایت کے لئے نبی بنا کر بھیجتا ہے۔ پھر تم کہتے ہو۔ کہ میں منحوس ہوں۔ جواب دیا اللہ تعالیٰ نے بابرکت بنا کر بھیجا ہے اللہ تعالیٰ نے مجھے نماز اور زکوٰۃ ادا کرنے کی بھی تعلیم دی۔ میں اپنی والدہ کا فرمانبردار بیٹا ہوں۔ تم مجھ پر گالیاں دینے کی تہمت لگاتے ہو تو میں نہ سرکش ہوں۔ کہ لوگوں کو بغیر وجہ سب وشتم کروں اور نہ بدبخت ہوں۔ یعنی میں ایک شریف آدمی ہوں۔

یہ تمام باتیں جو غلط فہمی کی وجہ سے پنگوڑے کی باتیں سمجھ رکھی ہیں زمانہ نبوت کے بعد کی ہیں نبوت سے قبل کی باتوں کو قرآن مجید نے حذف کر دیا ہے۔

☆......☆

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی حفاظت کے لئے اللہ تعالیٰ نے آسمان پر اُٹھالیا

اعتراض: ''از روئے قرآن عیاں ہے کہ جس وقت مسیح کو پکڑنا چاہا آسمان سے فرشتے نازل ہوئے اور اسے بجسم عنصری اٹھا کر آسمان پر لے گئے لیکن جب مکہ میں دشمنوں نے محمد صاحب کا محاصرہ کیا تو نہ کوئی فرشتہ ان کو بچانے آیا اور نہ آسمان پر پہنچائے گئے عام لوگوں کی طرح پیادہ چل کر دشت پُر خار سے گزرتے ہوئے دشمنوں کی نظر سے پوشیدہ ہو کر ایک تیرہ وتار غار میں جا چھپے۔ کیا یہ زمین و آسمان کا فرق نہیں؟ دیگر انبیاء کو بھی اگر دشمنوں سے بچایا ہے۔ تو زمین ہی پر آسمانی حفاظت اس امر کی صاف دلیل ہے۔ کہ وہ تمام انبیاء و رسل سے نرالا اور افضل ہے۔

جواب: معترض نے یہ جو کہا ہے کہ جس وقت مسیح کو پکڑنا چاہا۔ آسمان سے فرشتے نازل ہوئے اور اسے بجسم عنصری اٹھا کر آسمان پر لے گئے۔ صریحاً غلط بیانی اور قرآن سے ناواقفیت ہے۔ سب سے پہلے جواب عیسائیوں کے مسلّمات سے دیتا ہوں۔ کہ اناجیل میں کیا لکھا ہے آیا حضرت عیسیٰ علیہ السلام گرفتار ہو کر صلیب پر چڑھائے گئے ہیں یا کہ نہیں۔ جب اناجیل سے یہ ثابت ہو جائے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام گرفتار ہوئے پھر صلیب دیئے گئے۔ پھر شبہہ کی بناء پر زندہ اتار لیے گئے۔ تو عیسائیوں کے اعتراض کی بنیاد ہی ختم ہو جائے گی۔ آیئے دیکھتے ہیں کہ

اناجیل کیا کہتی ہیں۔

اول: حضرت مسیح ایک روایت کے مطابق صلیب پر چھ گھنٹے رہے۔(مرقس ۱۵:۲۵)
اور ایک روایت کے مطابق تین گھنٹے سے بھی کم رہے۔(یوحنا۱۹:۱۴)

دوم: یوحنا۱۹:۳۲ سے ثابت ہے کہ مسیح کے ساتھ جو دو چور صلیب پر لٹکائے گئے جب ان کو اتارا گیا تو ان کی ٹانگیں توڑی گئیں تب ان کی موت واقع ہوئی مسیح بھی ساتھ ہی چڑھائے گئے اور ساتھ ہی اتارے گئے مگر ان کی ٹانگیں نہیں توڑی گئیں۔

سوم: سپاہیوں میں سے ایک نے مسیح کی پسلی بھالے سے چھیدی تو اس سے لہو اور پانی نکلا (یوحنا۱۹:۳۴) یہ زندگی کی نشانی ہے۔

چہارم: جب کسی نے پلاطوس سے جا کر کہا کہ مسیح صلیب پر مرگئے ہیں تو اس نے متعجب ہو کر شبہ کیا کہ اس قدر جلد کس طرح مر گئے۔ (مرقس ۱۵:۴۴) پنجم: مسیح کو دفن نہیں کیا گیا۔ بلکہ ایک کھلی جگہ میں رکھ کر سامنے ایک پتھر رکھ دیا گیا۔ جس سے ہوا اندر جاتی رہی۔(مرقس:۱۵:۴۶) حالانکہ جہاں دفن کیا جاتا ہے اس کے لیے ہوا کے آنے جانے کا راستہ نہیں رکھا جاتا۔ ششم جب تیسرے دن مریم مگدلینی نے مسیح کو دیکھنے کے لیے آئیں تو پتھر کو دروازہ سے ہٹا ہوا پایا۔(مرقس ۱۶:۴) جس سے معلوم ہوا کہ پتھر کو ہٹا کر مسیح کو اندر سے نکالا گیا۔ ہفتم یوحنا۲۰:۱۵ سے ثابت ہوتا ہے کہ مریم مگدلینی نے حضرت مسیح کو دیکھا تو انہیں باغبان سمجھا جس سے معلوم ہوا کہ آپ نے بھیس بدلا ہوا تھا۔ ہشتم کئی دن بعد جب حواریوں نے مسیح کو دیکھا تو اس کے ہاتھوں پر کیلوں کے زخموں کے نشان باقی تھے۔(یوحنا۲۰: ۲۵۔ ۲۸) نہم: لوقا۲۴:۳۹۔۴۴ سے ثابت ہے کہ واقعہ صلیب کے بعد حواریوں کے ساتھ مل کر آپ نے بھونی ہوئی مچھلی اور شہد کھایا۔

یہ تمام واقعات بتاتے ہیں کہ حضرت مسیح علیہ السلام مصلوب نہیں ہوئے لیکن زندہ اتار لیے گئے۔ ان کے زخموں کا علاج کیا گیا۔ آج تک طب کی کتابوں میں مرہم عیسیٰ مشہور ہے۔ جو ان کے زخموں پر لگائی گئی۔

یہ وہ تاریخی واقعات جن کو جھٹلایا نہیں جاسکتا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام یہود کی گرفت میں آئے۔ ان کو صلیب دی گئی۔ وہ صلیب پر نہیں مارے گئے۔ شبہ کی بنیاد پر زندہ اتار لیے گئے۔ ان کو قبر نما گڑھے میں علاج کے لیے رکھا۔ پادری صاحب کا یہ کہنا کہ فرشتے آئے اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو زندہ آسمان پر لے گئے۔ عیسائیوں کی اناجیل کے بیان کے خلاف ہے اناجیل واضح بتا رہی ہیں کہ حضرت مسیح علیہ السلام صلیب پر چڑھائے گئے۔ صلیب کی تکالیف کو برداشت کیا۔

رسول کریم ﷺ کی دشمنوں سے حفاظت کے تمام واقعات تاریخوں میں درج ہیں نبوت کے تیرہویں سال جب کفار نے رسول کریم ﷺ کو قتل کرنے کا منصوبہ بنایا اور رات کو آپ ﷺ کے گھر کا محاصرہ کرلیا۔ دشمن چاروں طرف گھر کا محاصرہ کیے ہوئے ہے۔ گھر سے فرشتوں کی حفاظت میں نکلتے ہیں اور حضرت ابوبکر کے گھر جاتے ہیں۔ عیسائی غور کریں یہ ہے حفاظت فرشتوں کی، رات کے وقت گھر سے نکلتے ہیں لیکن پہرہ دینے والوں کی آنکھوں پر نیند کا اس قدر غلبہ ہو جاتا ہے کہ وہ جان ہی نہ سکے کہ ان کا مطلوب و مقصود ان کی گرفت سے بچ کر نکلا جا رہا ہے۔ حضرت ابوبکر کو ساتھ لے کر غار ثور میں پناہ لیتے ہیں وہاں بھی اللہ تعالیٰ نے خارق عادت حفاظت کا سامان پیدا کر دیا۔ دشمن غار کے منہ تک پہنچ جاتا ہے لیکن رسول کریم ﷺ کو گرفتار کرنے میں ناکام رہتا ہے۔ تین دن کے بعد غار سے نکلتے ہیں یثرب کا راستہ لیتے ہیں سراقہ دیکھ بھی لیتا ہے لیکن پکڑنے میں ناکام و نامراد رہتا ہے۔ آخر کار رسول کریم ﷺ اللہ کی حفاظت کے حصار میں مدینہ پہنچ جاتے ہیں لڑائیوں کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ جنگ احد میں زخمی ہوتے ہیں ہر طرف سے دشمن کی یلغار ہے لیکن دشمن آپ پر غلبہ حاصل نہیں کر پاتا۔ اسی طرح کئی بار دشمنوں نے غلبہ پانے کی کوشش کی لیکن ناکام رہے جنگ حنین میں یہی منظر دیکھنے میں آتا ہے کہ دشمن نے چاروں طرف سے گھیرے میں لے لیا لیکن اللہ تعالیٰ نے بھی وہاں نصرت کی۔ دشمن آپ تک نہ پہنچ سکا۔ یہ بھی ایک مصیبت کی گھڑی تھی۔ اس گھڑی میں بھی اللہ تعالیٰ نے مدد

کی۔ الغرض اللہ تعالیٰ نے اس زمین پر رسول کریم ﷺ کی حفاظت کے سامان پیدا کر دیئے۔

کیا اللہ تعالیٰ اتنا لاچار اور بے بس تھا کہ وہ حضرت مسیح علیہ السلام کی اپنی قدرت کاملہ سے اس زمین پر حفاظت نہیں کر سکتا تھا کہ فرشتے بھیجے اور آسمان پر اٹھا کر لے گیا۔ اللہ تعالیٰ تو عزیز کامل قدرت والا ہے وہ اس زمین پر اپنے بندہ کی حفاظت کرنے پر قادر ہے۔ آسمان پر اٹھا کر لے جانے میں کوئی فضیلت نہیں۔

اب آیئے قرآن کی طرف جس میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے رفع کا ذکر ہے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے رفع کے بارے میں دو مکتبہ فکر ہیں۔ ایک مکتبہ فکر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا رفع روحانی مانتا ہے اور دوسرا مکتبہ فکر جسمانی۔ لہٰذا یہ عقیدہ مسلمانوں کے مسلمات میں سے نہیں۔

پہلے مکتبہ فکر کے نزدیک مسیح کو رفع دینے کے معنی سوائے روحانی بلند درجات کے اور کچھ نہیں۔ اسلام میں رفع، روحانی درجات کی بلندی پر بولا جاتا ہے ایک مسلمان نماز میں بین السجدتین ''وارفعنی'' کی دعا مانگتا ہے۔ اس سے اس کی ہرگز یہ مراد نہیں ہوتی کہ اس کو اللہ تعالیٰ آسمان پر اٹھا لے۔ بلکہ مراد بلندی درجات ہوتی ہے ایسا ہی تواضع کی تمام احادیث میں بار بار آتا ہے **من تواضع للّٰہ رفعہ اللّٰہ** جو شخص اللہ تعالیٰ کے لیے تواضع کرتا ہے اللہ تعالیٰ اسے رفع دیتا ہے۔ بلکہ ایک حدیث میں ہے رَفَعَهُ اللّٰهُ اِلَى السَّمَآءِ السَّابِعَةِ بِالسِّلْسِلَةِ اللہ تعالیٰ اس کو زنجیر کے ذریعے ساتویں آسمان پر اٹھا لیتا ہے جبکہ کسی نے تواضع کرنے والے شخص کو آسمان جاتے ہوئے نہیں دیکھا عربی لغت میں رفع کے معنی روحانی درجات کی بلندی مراد ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ایک نام رافع بھی ہے جس کے معنی تمام اہل لغت نے بالاتفاق یہ کیے ہیں اَلَّذِي يَرْفَعُ الْمُؤْمِنِيْنَ بِالْاَسْعَادِ وَ اَوْلِيَآءَ بِالتَّقَرُّبِ یعنی وہ خدا جو مومن کو سعید بنا کر اور اپنے اولیاء کو قرب عطا فرما کر رفع دیتا ہے۔

اگر دوسرے مکتبہ فکر کے مفہوم کو لیا جائے تو بھی آسمان پر جانا باعث فضیلت نہیں ٹھہرتا۔ اگر مسیح کا آسمان پر جانا باعث فضیلت ہے تو ان کے ساتھ اور بھی شریک ہیں جن کا بائبل میں آسمان پر جانے کا واضح طور پر لکھا ہے دونوں بڑھتے اور باتیں کرتے چلے جاتے تھے تو دیکھ کر ایک آتشی رتھ اور آتشی گھوڑوں نے درمیان آ کر ان دونوں کو جدا کر دیا اور ایلیا بگولے میں ہو کر آسمان پر جاتا رہا۔ (۲ سلاطین ۲:۱۱) اور آگے اسی ساتھی الیسع کے متعلق لکھا ہے۔ ''اور اس نے ایلیاہ کی چادر کو بھی جو اوپر سے گر پڑی تھی اٹھالیا۔'' (آیت ۱۳) اور یہ آسمان سے گری ہوئی چادر ایسی بابرکت ثابت ہوئی کہ الیسع نے دریائے یردن سے پار ہونے کے لیے اسی چادر کو جب پانی پر مارا تو پانی اِدھر اُدھر ہو گیا اور الیسع پار ہوا۔ (آیت ۱۴) اگر حضرت مسیح کا آسمان پر جانا تسلیم کر لیا جائے تو وہ اس فضیلت میں اکیلے ہی نہیں الیاس (ایلیاہ) بھی اسی فضیلت میں شامل ہیں۔ لہٰذا عیسائیوں کا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا آسمان پر اٹھائے جانے کا عقیدہ باعث فضیلت قرار نہیں دیا جا سکتا۔ یہاں بھی فضیلت حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کو حاصل ہے کہ اس زمین پر ہی ایسے حالات پیدا کر دیئے کہ دشمن آپ ﷺ پر غلبہ حاصل نہ کر سکا۔ بلکہ ایک دن وہ آیا جب دشمن گردنیں جھکائے آپ ﷺ کے سامنے کھڑے ہیں اور آپ سے رحم کے ملتجی ہیں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اپنے دشمنوں پر کبھی غلبہ نصیب نہیں ہوا۔

☆......☆

حضرت عیسیٰ بغیر خورد ونوش آسمان پر رہ رہے ہیں

اعتراض: مسیح کا آج تک بجسد عنصری آسمان پر رہنا اور حوائج بشریٰ کا باوجود جسم بشری منفک ہونا یعنی خورد و نوش سے فارغ ہونا باوجود بشریت الان کما کان کا مصداق ہونا مسلمات اسلام سے ہے برخلاف اس کے تمام بنی آدم کی نسبت قرآن میں یوں مرقوم ہے فِیۡهَا تَحۡیَوۡنَ وَ فِیۡهَا تَمُوۡتُوۡنَ وَ مِنۡهَا تُخۡرَجُوۡنَ (الاعراف:۲۵) اگر کوئی شخص بشر کہلا کر بھی آسمان پر رہ سکے تو ماننا پڑے گا۔ کہ وہ تمام بنی آدم سے نرالی بشریت رکھتا ہے۔

جواب: معترض نے نہایت چالاکی اور ہوشیاری سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا آسمان پر بغیر خورد ونوش کے زندہ رہنے کو اسلام کے مسلمات قرار دیا ہے پہلے یہ ذکر کیا جا چکا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے عقیدہ رفع کے بارے میں اسلام میں دو مکتبہ فکر میں ایک مکتبہ فکر روحانی رفع قرار دیتا ہے جبکہ دوسرا رفع جسمانی۔ جب کسی عقیدے کے بارے میں بیّن اختلاف ہو تو اس کو مسلمات میں تسلیم قرار نہیں دیا جا سکتا لہٰذا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا بجسد عنصری آسمان پر جانا اسلام کے مسلمات میں سے نہیں۔

دوم: پہلے یہ ثابت کیا گیا ہے انجیل کی رو سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام صلیب پر چڑھائے گئے۔ پھر شبہ کی بناء پر زندہ اتارے گئے۔ یہ انجیل میں مرقوم شدہ واقعات ہیں۔ لہٰذا عیسائیوں کا یہ عقیدہ اللہ تعالیٰ نے فرشتے بھیج کر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو بجسد عنصری آسمان پر اٹھا لیا۔ بالکل غلط عقیدہ ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو پلاطوس نے گرفتار کیا صلیب پر چڑھایا یہ ایک مسلمہ تاریخی امر ہے۔ اس اعتراض کا جواب گزشتہ اعتراض کے ساتھ وابستہ ہے اس لیے اعادہ کی ضرورت نہیں۔

☆......☆

حضرت مسیح بغیر خورد ونوش آسمان پر زندہ ہیں

اعتراض: پھر تمام انبیاء کے حق میں مرقوم ہے مَا جَعَلۡنٰهُمۡ جَسَدًا لَّا یَاۡکُلُوۡنَ الطَّعَامَ وَ مَا کَانُوۡا خٰلِدِیۡنَ یعنی ہم نے ان کے جسم ایسے نہیں بنائے کہ کھانے پینے کے بغیر ہمیشہ زندہ رہ سکیں جو کوئی باوجود جسد عنصری کھانے پینے کے بغیر زندہ رہ سکے تو وہ تمام دیگر انبیاء سے نرالا اور افضل ہے مسیح جو قریباً دو ہزار سال سے بے خورد ونوش زندہ ہے وہ اس مرسل وانبیاء میں شمار نہیں کیا جا سکتا جن کی زندگی کا دارومدار کھانے پینے پر ہے جب کہ محمد صاحب ان اوصاف سے بالکل خالی ہیں تو کیا یہ صاف ظاہر نہیں کہ مسیح ان سے افضل اور بدرجہا برتر ہے۔

جواب: جیسا کہ پہلے یہ لکھا جا چکا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے رفع کے بارے میں مسلمان علماء کا اختلاف ہے لہٰذا اس کو قرآن مجید کا مسلمہ عقیدہ نہیں سمجھا جا سکتا۔ جس کے متعلق علماء کا اختلاف ہو اس کو مسلمات میں شمار نہیں کیا جا سکتا مسلمانوں کا ایک ایسا طبقہ علماء کا ہے جو

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو دیگر انبیاء علیہم السلام کی طرح وفات شدہ تسلیم کرتا ہے۔

اگر تسلیم بھی کرلیا جائے کہ وہ آسمان پر زندہ ہیں تو عیسائی کیوں کر یہ ثابت کرسکتے ہیں کہ وہ بغیر خورد ونوش رہ رہے ہیں کیا وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے ملاقات کر کے آئے ہیں اور مشاہدے کی بناء پر یہ کہہ کر رہے ہیں کہ وہ بغیر خورد ونوش زندگی بسر کر رہے ہیں ان کا یہ دعویٰ تو ہے لیکن دلیل کوئی نہیں کوئی دعویٰ بغیر دلیل تسلیم نہیں کیا جاسکتا۔

☆......☆

حضرت مسیح کا مُردوں کو زندہ کرنا (باعث فضیلت ہے)

اعتراض: مسیح کا مُردوں کو زندہ کرنا اہل اسلام نے از روئے قرآن تسلیم کیا ہے اور احیائے موتی بشری طاقت سے بالاتر اور فقط الوہیت سے مخصوص ہے اس خاصہ الوہیت میں سوائے مسیح کوئی دوسرا بشر شریک نہیں کیا محمد صاحب یا کسی اور رسول یا نبی نے کبھی مردہ زندہ کیا۔

جواب: مردے دو قسم کے ہوتے ہیں اور دو ہی اشیاء زندہ کرتی ہیں ایک وہ مردے جن کے جسم سے روح کا تعلق الگ ہوجاتا ہے ان کے بارے میں قرآن مجید کا یہ فرمان ہے كَيْفَ تَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ وَكُنْتُمْ اَمْوَاتًا فَاَحْيَاكُمْ (بقرہ:۲۸) تم اللہ کا کیسے انکار کرتے ہو تم مردے تھے پس اس نے تم کو زندہ کیا اور رَبِّي الَّذِي يُحْيِي وَيُمِيْتُ (بقرہ) میرا رب ہی زندہ کرتا ہے اور مارتا ہے۔ روح کا جسم سے الگ ہوجانے کی صورت میں زندہ کرنا صرف اللہ تعالیٰ کا کام ہے۔

دوسرے انبیاء اور کاملین کے ہاتھ سے مردے زندہ ہوتے ہیں ان کی نسبت اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اسْتَجِيْبُوْا لِلّٰهِ وَلِلرَّسُوْلِ اِذَا دَعَاكُمْ لِمَا يُحْيِيْكُمْ (انفال:۲۴) اے ایمان والو! اللہ اور رسول کی فرمانبرداری کرو جب وہ بلاتا ہے تاکہ تم کو زندہ کرے۔

ہر نبی کی بعثت کی غرض ہی روحانی مردوں کو روحانی زندگی عطا کرنا ہے۔ حضرت مسیح کے مردے زندہ کرنے سے وہی مطلب اور منشاء ہے۔ جو ہمارے نبی کریم ﷺ کا تھا۔ دوسری جگہ آتا ہے۔ اَوَمَنْ كَانَ مَيْتًا فَاَحْيَيْنٰهُ (الانعام:۱۲۳) کیا وہ شخص جو مردہ ہو۔ پھر ہم اس کو زندہ کردیں۔ یہاں لفظ میت اور احیاء دونوں موجود ہیں لیکن مراد روحانی مردوں کو زندہ کرنا ہے قرآن شریف میں محاورہ عام استعمال میں ہوا ہے وَلَا يَسْتَوِي الْاَحْيَاءُ وَلَا الْاَمْوَاتُ مردے اور زندہ برابر نہیں ہوسکتے اس سے بھی روحانی مردے اور زندہ مراد ہیں۔

انجیل سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ مسیح کا مردے زندہ کرنے سے مراد روحانی مردوں کو زندہ کرنا تھا۔ چنانچہ ان کے اپنے الفاظ ہیں کہ "میں تم سے سچ سچ کہتا ہوں جو میرا کلام سنتا اور میرے بھیجنے والے کا یقین کرتا ہے ہمیشہ کی زندگی اس کی ہے اور اس پر سزا کا حکم نہیں ہوتا بلکہ وہ موت سے نکل کر زندگی میں داخل ہوگیا ہے۔ تم سے سچ سچ کہتا ہوں کہ وہ وقت آتا ہے بلکہ ابھی ہے کہ مردے خدا کے بیٹے کی آواز سنیں گے اور جو سنیں گے وہ جئیں گے۔ (یوحنا ۵:۲۴-۲۵)

دوسری جگہ ہے۔ تم کتاب مقدس میں ڈھونڈتے ہو۔ کیونکہ سمجھتے ہو کہ اس میں ہمیشہ کی زندگی نہیں ملتی ہے اور یہ وہ ہے جو میری گواہی دیتی ہے پھر بھی تم زندگی پانے کے لیے میرے پاس آنا نہیں چاہتے۔ (۵:۳۹-۴۰) ان انجیلی آیات میں روحانی زندگی مراد ہے۔

پس حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوت قدسیہ کے ذریعے روحانی مردوں کو زندہ کیا تھا۔ احیائے موتی سے مراد روحانی مردے

مراد ہیں۔ یہی نبیوں کا کام ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے وہی کام کیا جو دوسرے نبیوں نے کیا۔ رسول کریم ﷺ نے ان سے بڑھ کر کیا۔

اور جو لوگ وفات پا جاتے ہیں اور دوسرے عالم میں چلے جاتے ہیں ان کے متعلق قرآن مجید میں یہ واضح ہے ان کا جی اٹھنا یوم حشر کو ہوگا۔ ارشاد الٰہی ہے۔ وَمِنْ وَرَآئِهِمْ بَرْزَخٌ اِلٰی یَوْمِ یُبْعَثُوْنَ (المومنون:۱۰۰) ان کے ادھر برزخ ہے اس دن تک کہ وہ اٹھائے جائیں پس موت کے بعد ہر ایک مرنے والے کے لیے حالت برزخ ہے اس برزخ (روک) سے ادھر کوئی واپس نہیں آسکتا پھر فرمایا۔ حَرَامٌ عَلٰی قَرْیَةٍ اَهْلَكْنٰهَا اَنَّهُمْ لَا یَرْجِعُوْنَ یعنی جس بستی کو ہم نے ہلاک کیا۔ اس پر یہ قطعی حرام ہو گیا کہ وہ لوٹ کر واپس نہیں آئے گی۔

پس انبیاء علیہم السلام جن مردوں کو زندہ کرتے ہیں وہ روحانی مردے ہوتے ہیں قرآن مجید میں احیائے موتیٰ سے مراد روحانی مردے مراد ہو۔

نوٹ: معترض نے حضرت مسیح علیہ السلام کی فضیلت ظاہر کرنے کے سلسلہ میں خلق طائر اور اندھوں کی بینائی بہروں کو شنوائی عطا کرنا اور برص کو شفا بخشنے کا ذکر کیا ہے۔ ان معجزات کی وضاحت کی جا چکی ہے لہٰذا اعادہ کی ضرورت نہیں مراد صرف یہ ہے کہ حضرت مسیح علیہ السلام کی محبت میں روحانی مریضوں نے شفا پائی اور وہ روحانی لوگ ہو گئے۔ اور انہوں نے روحانی پرواز کی۔ خدا کے مقرب بن گئے اور خدا سے ہم کلام ہوئے خدا سے وہی ہم کلام ہوتا ہے جو روحانی مریض نہیں ہوتا اور اس کے روحانی قویٰ صحیح سالم ہوتے ہیں۔

☆......☆

حضرت عیسیٰ علیہ السلام صفت عالم غیبی کے مالک تھے

اعتراض: قرآن میں یہ بھی آتا ہے کہ لوگ اپنے گھروں میں جو کچھ جمع کرتے اور کھاتے پیتے تھے مسیح ان کو سب کچھ بتا دیتے تھے۔ یہ صفت عالم الغیبی بھی خدائی خاصہ ہے جس میں صرف مسیح ہی شریک ہے۔

جواب: قرآن مجید کی جس آیت سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی علم الغیبی کا استنباط کیا ہے اس کی وضاحت بعد میں کروں گا۔ پہلے انجیل کی رو سے یہ بات واضح کرنا چاہتا ہوں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام غیب کا علم ہرگز نہیں رکھتے تھے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام خود اقرار کرتے ہیں۔ "لیکن اس دن اس گھڑی کی بابت کوئی نہیں جانتا نہ آسمان کے فرشتے نہ بیٹا مگر باپ (مرقس ۱۲:۳۲) حضرت عیسیٰ علیہ السلام (بیٹا) خود اقرار کر رہا ہے کہ وہ علم غیب میں اللہ تعالیٰ کے شریک نہیں۔

اس کے علاوہ انجیل میں ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام انجیر کے درخت کی طرف دوڑے ہوئے گئے تا کہ انجیر کھائیں۔ حالانکہ اس پر انجیر نہیں تھے۔ اگر وہ عالم الغیب ہوتے تو انجیر کی طرف دوڑے نہ جاتے۔ انجیل کی رو سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی بشریت پر بہت کچھ لکھا جا سکتا ہے۔ لیکن اب صرف اس آیت کی وضاحت کی جاتی ہے جس کی وجہ سے معترض غلط فہمی کا شکار ہوا ہے۔ وہ آیت یہ ہے۔ وَاُنَبِّئُكُمْ بِمَا تَاْكُلُوْنَ وَمَا تَدَّخِرُوْنَ فِیْ بُیُوْتِكُمْ اور میں تم کو خبر دیتا ہوں کہ تم کیا کھاؤ اور کیا اپنے گھروں میں ذخیرہ کرو۔

عربی زبان میں تاکید کے لیے بسا اوقات جملہ خبریہ امر کے لیے آ جاتا ہے اور یہاں امر لینے کے لیے ہم اس لیے مجبور ہیں کہ نبی کا یہ کام نہیں کہ لوگوں کو یہ کہتا پھرے کہ تم نے آج کیا کھایا ہے اور گھر میں کیا جمع رکھا ہوا ہے بلکہ اس کا یہ کام ہوتا ہے کہ وہ یہ تعلیم دیں کہ وہ کیا کھائیں اور کیا جمع کریں۔ انجیل سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے یہی تعلیم دی تھی۔ بالخصوص گھروں میں کچھ نہ جمع کرنے

کی بہت تاکید کی ''اپنے واسطے زمین پر مال جمع نہ کرو۔ جہاں کیڑا اور زنگ خراب کرتا ہے اور جہاں چور نقب لگاتے اور چراتے ہیں بلکہ اپنے لیے آسمان پر مال جمع کرو۔ جہاں نہ کیڑا خراب کرتا ہے نہ زنگ اور نہ وہاں چور نقب لگاتے اور چراتے ہیں کیونکہ جہاں تیرا مال ہے وہیں تیرا دل بھی لگا رہے گا۔'' (متی ۶:۱۹۔۲۱)

پھر فرماتے ہیں: ''تم خدا اور دولت دونوں کی خدمت نہیں کر سکتے اس لیے میں تم سے کہتا ہوں کہ تم اپنی جان کی فکر نہ کرنا کہ ہم کیا کھائیں گے یا کیا پئیں گے۔ اور نہ اپنے بدن کا کہ کیا پہنیں گے۔'' (متی ۶:۲۴) اس کے اخیر میں ہے ''پس کل کے لیے فکر نہ کرو کیونکہ کل کا دن اپنے لیے آپ فکر کرے گا؟''

یہ وہ تعلیم ہے جس کی حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے تعلیم دی تھی اسی لیے نبی دنیا میں بھیجا جاتا ہے۔ قرآن مجید میں اسی تعلیم کو دہرایا گیا ہے۔ جس کی تعلیم حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے دی تھی۔ لہٰذا حضرت عیسیٰ علیہ السلام لوگوں کو یہ نہیں بتایا کرتے تھے کہ تم نے کیا کھایا اور اپنے گھر میں کیا ذخیرہ کر رکھا ہے۔ بلکہ اس دور کے لوگوں کو بے جا دولت سے محبت اور جمع کرنے سے منع کیا ہے اور خدا سے لو لگانے کی تعلیم دی ہے۔

☆......☆

رسول کریم ﷺ کا اپنے گناہوں سے معافی مانگنا

اعتراض: ''قرآن میں تمام انبیاء کے گناہوں کا ذکر ہے اور خصوصاً محمد صاحب کو حکم ملتا ہے اِسْتَغْفِرْ لِذَنْبِكَ یعنی اپنے گناہ کی معافی مانگ علاوہ بریں محمد صاحب کی حالت کو یوں بیان کیا وَجَدَكَ ضَالًّا فَهَدٰی ۝

جواب: اس اعتراض کا جواب دیا جا چکا ہے۔

☆......☆

مسیح دو ہزار سال سے زیادہ عرصہ سے آسمان پر زندہ ہے اور زندہ رہے گا

اعتراض: تیرہ سو سال سے زیادہ عرصہ گزر چکا ہے کہ محمد صاحب نے تریسٹھ یا چونسٹھ سال کی عمر میں وفات پائی اور دیگر مُردوں کی طرح دفن کیے گئے ہیں اور خاک میں مل گئے ہیں لیکن مسیح دو ہزار سال سے بھی زیادہ عرصہ سے آسمان پر زندہ ہے اور زندہ رہے گا۔

جواب: پہلے ایک اعتراض کے جواب میں یہ واضح کیا جا چکا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام از روئے انجیل پیلاطوس کی اسیری میں آئے، صلیب دیئے گئے۔ شبہ کی بناء پر صلیب سے اتار لیے گئے۔ ایک سپاہی نے ان کے پہلو کو بھالے سے زخمی کیا اور وہاں سے خون بھی جاری ہوا۔ پھر قبر نما گڑھے میں رکھا گیا وہاں ان کی والدہ کی بھی ملاقات ہوئی۔ یہ سب باتیں انجیل سے ثابت ہیں۔ حوالوں کے ساتھ یہ باتیں لکھی جا چکی ہیں۔ پھر انجیل سے یہ بھی ثابت کہ ایلیاہ (الیاس) بھی آسمان پر اٹھا کر لے جائے گئے۔ اگر حضرت عیسیٰ علیہ السلام آسمان پر زندہ موجود

ہیں تو انجیل کی رو سے حضرت ایلیاہ بھی آسمان پر موجود ہیں۔ پھر ایلیاہ (الیاس) بھی زندہ اٹھائے جانے کی فضیلت میں شامل ہو جاتے ہیں۔
دوم: پہلے یہ بھی بتایا جا چکا ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے رفع کے بارے میں مسلمان علماء میں اختلاف ہے ایک طبقہ روحانی رفع کا قائل ہے دوسرا جسمانی۔ اگر حضرت عیسیٰ علیہ السلام دو ہزار سال سے آسمان پر بغیر کھائے پیئے زندگی بسر کر رہے ہیں۔ کیا یہ بات باعث فضیلت ہے۔ کہ ایک آدمی بیکار کسی جگہ پڑا زندگی بسر کر رہا ہے۔ کیا بیکار زندگی کسی کے لیے باعث فضیلت ہوسکتی ہے۔ اگر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کسی آسمان پر زندہ ہیں تو عیسائی حضرات سے دریافت کروں گا۔ وہ وہاں کیا کر رہے ہیں۔ کیا آسمان پر بے کار زندگی بسر کرنا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے لیے کیسے باعث فضیلت ہے لہٰذا دو ہزار سے بے کار آسمان پر بیٹھے رہنا کوئی باعث فضیلت بات نہیں۔ اللہ تعالیٰ نبی کو لوگوں کو ہدایت کے لیے بھیجتا ہے۔ آسمان پر بے کار بیٹھے رہنا ان کے منصب کے ہی خلاف ہے۔ لہٰذا آسمان پر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو بٹھائے رکھنے سے کوئی فضیلت ظاہر نہیں ہوتی۔ نا معلوم اس طویل عرصہ کی وجہ سے ان کے جسم پر کیا کیا اثرات نمایاں ہوں گے۔ یہ تو کسی کو علم نہیں۔ حقیقی زندگی ہمارے نبی حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کی ہے۔ دن کا کوئی حصہ نہیں جس میں مسلمان رسول ﷺ پر درود نہ بھیجتے ہوں اور آپ کا ذکر بلند نہ ہو رہا ہو۔ پھر آپ کی حیات طیبہ پر اتنے لکھنے والے ہیں جن کو شمار ہی نہیں کیا جا سکتا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی زندگی کے صرف چند پہلوؤں کا لوگوں کو علم ہے۔ ان کی زندگی کے بے شمار پہلو پردہ اخفا میں ہیں۔ معترضین ذرا غور کریں اور بتائیں کہ کس پہلو سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ پر فضیلت ہے۔ محض حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو آسمان پر بٹھائے رکھنے سے کسی پر فضیلت ظاہر نہیں ہوتی۔ کیا ان کی زندگی میں اپنے دشمنوں پر غلبہ نصیب ہوا یا چھپتے پھرتے زندگی بسر کر دی۔ اگر قرآن مجید یہودیوں کے الزامات کو رد نہ کرتا تو ان کو ایک پاک باز شخص تسلیم نہیں کیا جا سکتا تھا۔ یہ قرآن مجید کا عیسائیوں پر احسان ہے کہ اس نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو یہودیوں کے الزامات سے بری کیا۔ ان کی والدہ کو صدیقہ قرار دیا۔ حواریوں کو برگزیدہ اصحاب قرار دیا اگر کسی عیسائی نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی وفات کے متعلق معلومات حاصل کرنا ہوں تو وہ مولانا عبید اللہ سندھی اور سرسید کی تفسیر کا مطالعہ کرے۔ الغرض مجھے اس نزاع سے کوئی تعلق نہیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام آسمان پر ہیں یا اس زمین میں دفن ہیں میرا یہ موقف ہے کہ آسمان پر بے کار بٹھانے سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی کوئی فضیلت ظاہر نہیں ہوتی۔ اگر دو ہزار سال بے کار بیٹھے رہنے سے کوئی فضیلت ظاہر ہو رہی ہو تو پھر رفع جسمانی پر بحث کی جائے۔ رفع جسمانی کوئی وجہ فضیلت نہیں لہٰذا اعتراض ہی لغو اور باطل ہے۔

☆......☆

کسی اخروی دور میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام بگڑی ہوئی امت محمدیہ کی اصلاح کریں گے

اعتراض: پھر یہ امر بھی مسلمات اسلام سے ہے کہ قیامت سے کچھ عرصہ پہلے سب سے بڑا فتنہ برپا کرنے والا اور کفر و بے دینی پھیلانے والا دجال ظاہر ہوگا اور اسے نیست و نابود کرنے اور بگڑی ہوئی امت محمدی کو راہ راست پر لانے اور دین حق قائم کرنے کے لیے مسیح آسمان سے نازل ہوگا اور تمام اہل کتاب اس پر ایمان لائیں گے۔ جیسا کہ قرآن میں مرقوم ہے اِنْ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اِلَّا لَيُؤْمِنَنَّ بِهٖ (سورہ نساء: رکوع ۲۲) یعنی اہل کتاب میں سے ہر ایک اس پر ایمان لائے گا۔

پس اگر محمد صاحب نبی آخر الزمان اور خاتم النبین ہے تو آخری فتنہ کا فرو کرنے کے لیے اہم امر کے

لیے ان کو قبر سے اٹھا کر بھیجنا کیوں مقرر نہ ہوا؟ آخر کار تمام بے دینی اور خرابی کو دور کر کے دین حق قائم کرنا کیوں مسیح موعود ہی کا کام ٹھہرا اس بزرگی اور شرف کو کیوں اس سے منسوب کیا کہ آخر کار قرب قیامت کے موقعہ پر وہی سب کا ہادی ہو اور سب اسی پر ایمان لائیں اور محمد صاحب کی خاک کو قبر میں ان امور کی خبر تک نہ ہو۔

جواب: جیسا کہ پہلے یہ ذکر کیا ہے کہ حضرت مسیح علیہ السلام کے رفع کے بارے میں مسلمانوں میں اختلاف ہے ایک طبقہ علماء رفع جسمانی تسلیم کرتا ہے جبکہ دوسرا طبقہ رفع روحانی کا قائل ہے۔ اسی طرح نزول مسیح کے بارے میں علماء کا اختلاف ہے۔ معترض نے ان علماء کے نظریہ کو سامنے رکھ کر یہ اعتراض کیا ہے جو جسمانی رفع اور نزول مسیح کے قائل ہیں۔ چونکہ معترض کے اہم اعتراضات میں سے یہ ایک اہم اعتراض ہے اس کا جواب دینا لازمی ہے چھوڑا نہیں جا سکتا اس لیے علامہ شیلتوت مصری کے خیالات کی روشنی میں اعتراض کا جواب دوں گا۔ اس کے علاوہ کوئی دوسرا کوئی جواب بنتا نہیں اس لیے جسمانی رفع کے قائل علماء سے معذرت خواہاں ہوں۔ میرے خیال میں یہی اعتراض وزنی ہے دوم میرے علم میں یہ بھی کوئی بات نہیں آئی کہ جسد عنصری کے ساتھ رفع تسلیم کرنے والے علماء اس کا کیا جواب دیتے ہیں اگر ان کا نقطہ نگاہ مجھے مل جاتا تو اس میں وزن محسوس کرتا تو وہ جواب میں تحریر کر دیتا ہر مصنف کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ معترض کو مسکت جواب دے۔ معذرت کے ساتھ ماتوفیقی الا باللہ۔

معترض نے سب سے پہلے اس غلط بیانی سے کام لیا ہے اور لکھا ہے۔ ''پھر یہ امر بھی مسلمات اسلام سے ہے''۔ یعنی معترض نے جو سوال اٹھایا ہے وہ اسلام کے مسلمات میں سے ہے۔ مذکورہ سوال (اعتراض) جو اٹھایا گیا ہے وہ اسلام کے مسلمات میں شامل نہیں۔ مسلمات وہ ہوتے ہیں جن کا تسلیم کیا جانا ہر شخص پر فرض ہو۔ لہٰذا معترض نے جو سوال اٹھایا ہے وہ ہے ہی غلط، محض مفروضہ ہے۔ جب کہ مسلمانوں کا ایک طبقہ قطعاً تسلیم نہیں کرتا کہ حضرت مسیح آخری دور میں کسی فتنے کو دور کرنے کے لیے نازل ہوں گے اور امت محمدیہ کی اصلاح کریں گے۔ یہ نظریہ مسلمانوں کے مسلمات میں ہرگز شامل نہیں۔ لہٰذا معترض کی یہ تو لاعلمی ہے یا چالاکی اور ہوشیاری۔ لہٰذا نزول مسیح کا عقیدہ مسلمانوں کے مسلمات میں شامل نہیں۔

۲۔ معترض نے قرآن مجید سے کوئی آیت پیش نہیں کی جس سے یہ ظاہر ہو کہ حضرت مسیح علیہ السلام کے بعد صرف ایک نبی آئے گا جس کا نام احمد ہوگا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی یہ پیشگوئی رسول کریم ﷺ کی ذات سے پوری ہوگی ارشاد ہے۔ وَمُبَشِّرًا بِرَسُوْلٍ يَّاْتِيْ مِنْ بَعْدِي اسْمُهٗ اَحْمَدُ (الصف ۶۱:۶) میں ایک رسول کی خوشخبری دیتا ہوں۔ جو میرے بعد آئے گا جس کا نام احمد ہوگا۔ لہٰذا ضروری ہوا کہ رسول کریم ﷺ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بعد تشریف لائیں اور مسیح کا آپ ﷺ کے بعد آنا اس آیت کے صریح منطوق کے خلاف ہے۔ یعنی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بعد صرف ایک ہی رسول کی آمد کی پیشگوئی ہے اس کا نام احمد ہے وہ اس پیشگوئی کے تحت آ چکے۔ قرآن مجید میں کہیں بھی یہ ذکر نہیں کہ رسول کریم ﷺ کی وفات کے بعد حضرت عیسیٰ علیہ السلام امت محمدیہ کی اصلاح کے لیے آئیں گے۔ لہٰذا معترض کا اعتراض قرآن مجید کی رو سے غلط اور باطل ہے۔

۲۔ قرآن مجید میں امت محمدیہ کی اصلاح کے لیے آیت استخلاف میں یہ وعدہ کیا ہے۔

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۖ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِيْنَهُمُ الَّذِي ارْتَضٰى لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ خَوْفِهِمْ اَمْنًا ۚ يَعْبُدُوْنَنِيْ لَا يُشْرِكُوْنَ بِيْ شَيْئًا ۚ وَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ○ (النور ۲۴:۵۵)

اللہ نے تم میں سے ان لوگوں کے ساتھ جو ایمان لائے اور اچھے عمل کرتے ہیں وعدہ کیا ہے کہ وہ انہیں زمین میں خلیفہ بنائے گا جیسا کہ انہیں خلیفہ بنایا۔ جو تم سے پہلے تھے اور وہ ان کے لیے ان کے دین کو جو اس نے ان کے لیے پسند کیا ہے مضبوطی سے قائم کر دے گا اور وہ ان کے لیے ان کے خوف کے بعد بدل کر امن کی حالت کر دے گا۔ وہ میری عبادت کریں گے میرے ساتھ کسی کو شریک نہیں کریں گے۔ جو کوئی اس کے بعد کفر کرے تو وہی نافرمان ہیں۔

اس آیت میں تمکین دین کے لیے اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں سے یہ وعدہ کیا ہے کہ انہیں میں (مسلمانوں میں) اسی طرح خلافت قائم ہو گی جیسا کہ پہلے لوگوں میں جاری تھی (پہلے لوگوں سے مراد بنی اسرائیل ہیں کیونکہ رسول کریم ﷺ کو حضرت موسیٰ علیہ السلام کا مثیل قرار دیا ہے۔ اس کی وضاحت رسول کریم ﷺ نے خود کر دی ہے صحیح بخاری میں حدیث ہے كَانَتْ بَنُو إِسْرَائِيلَ تَسُوسُهُمُ الْأَنْبِيَاءُ كُلَّمَا هَلَكَ نَبِيٌّ خَلَفَهُ نَبِيٌّ وَإِنَّهُ لَا نَبِيَّ بَعْدِي وَسَيَكُونُ خُلَفَاءُ یعنی بنی اسرائیل کی راہنمائی نبی کرتے تھے جب ایک نبی فوت ہو جاتا تو دوسرا اس کا جانشین ہو جاتا اور میرے بعد کوئی نبی نہیں اور خلفاء ہوں گے۔ (وہاں بادشاہت اور نبوت تھی یہاں بادشاہت اور ولایت رہے گی۔)

اللہ تعالیٰ نے تکمیل دین ہونے کی وجہ سے نبوت کا دروازہ ہمیشہ کے لیے بند کر دیا ہے اس کی جگہ خلافت کا نظام جاری کیا ہے۔ خلافت دو کی طرح کی ہے۔ ولایت اور بادشاہت، بنی اسرائیل میں خلافت، بادشاہت اور نبوت پر مشتمل تھی۔ جبکہ تکمیل دین کی وجہ سے نبوت کا دروازہ بند ہو گیا ہے۔ نبوت کی جگہ ولایت ہے۔

آیت استخلاف میں لفظ منکم آیا ہے۔ یعنی امت محمدیہ کی اصلاح اور تجدید کے لیے جو علماء ربانی ہوں گے وہ مسلمانوں میں سے ہی ہوں گے۔ انہی علماء کے متعلق رسول کریم ﷺ نے فرمایا: عُلَمَاءُ أُمَّتِي كَأَنْبِيَاءِ بَنِي إِسْرَائِيلَ میری امت کے علماء بنی اسرائیل کے نبیوں کی طرح ہیں یعنی اسلام کے علماء ربانی بنی اسرائیل کے انبیاء کے قائم مقام اور مثیل ہوں گے۔

قرآن مجید میں کہیں بھی یہ ذکر نہیں آیا کہ جب امت محمدیہ میں فساد اور بگاڑ پیدا ہو گا تو اس کی اصلاح اور تجدید کے لیے حضرت عیسیٰ علیہ السلام آئیں گے۔ یہ نظریہ ہی آیت استخلاف کے خلاف ہے۔ اسلام میں اصلاح اور تجدید کا اپنا ایک نظام ہے وہ ہے قرآنی اصطلاح کے مطابق خلافت علیٰ منہاج نبوت یعنی امت محمدیہ کی اصلاح وہ شخص کرے گا۔ جس کی گردن میں حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کی غلامی کا جوا ہو گا اور آپ کا کامل پیروکار ہو گا۔ لہٰذا امت محمدیہ کی اصلاح کے لیے مسلمانوں سے باہر کسی شخص کا مبعوث ہونا ایک باطل عقیدہ ہے۔ جب بھی کبھی اصلاح کی ضرورت ہوئی تو کوئی رسول کریم ﷺ کا پیروکار ہی ہو گا تاریخ بھی اس پر شاہد ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تمکین دین کے لیے مختلف نوعیت کے علماء پیدا کیے۔ محدث بھی تھے۔ فقہاء بھی تھے متکلم بھی تھے۔ مفسر بھی تھے۔ جس دور میں جس قسم کے عالم ربانی کی ضرورت ہوتی تھی۔ اسی قسم کا عالم یا علماء پیدا ہو جاتے تھے نیز یہ بات بھی یاد رہے کہ رسول کریم نے خلیفہ کے لفظ کو مجدد کے لفظ سے بھی تعبیر کیا ہے جو ہر صدی کے سرے پر آیا کرے گا۔

۳۔ حضرت مسیح کے متعلق تو قرآن مجید میں آتا ہے رسولاً الیٰ بنی اسرائیل یعنی وہ بنی اسرائیل کی طرف رسول بنا کر بھیجے گئے تھے آیت استخلاف کی رو سے بنی اسرائیل کا کوئی نبی امت محمدیہ کی طرف بھیجا نہیں جا سکتا۔ کیونکہ آیت استخلاف میں لفظ منکم ہے یعنی وہ خلیفہ امت محمدیہ میں سے ہو گا۔

۴۔ آیت استخلاف کی مزید وضاحت قرآن مجید میں ایک اور آیت سے بھی ہوتی ہے سورہ جمعہ میں آتا ہے۔

هُوَ الَّذِي بَعَثَ فِي الْأُمِّيِّينَ رَسُولًا مِّنْهُمْ يَتْلُو عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَإِن كَانُوا مِن قَبْلُ لَفِي ضَلَالٍ مُّبِينٍ ○ وَآخَرِينَ مِنْهُمْ لَمَّا يَلْحَقُوا بِهِمْ وَهُوَ الْعَزِيزُ

الْحَكِيْمُ ۝ (الجمعة:٢-٣)

وہی ہے جس نے انہوں کے اندر انہی میں سے ایک رسول بھیجا جو ان پر اس کی آیتیں پڑھتا ہے اور انہیں پاک کرتا ہے اور انہیں کتاب اور حکمت سکھاتا ہے اور وہ پہلے یقیناً کھلی گمراہی میں پڑے تھے اور ان میں سے اوروں کو بھی جو ابھی ان کو نہیں ملے اور وہ غالب حکمت والا ہے۔

اس آیت کی رو سے اولین واخرین کے مزکی اور معلم صرف حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ ہیں۔ پہلوں کا خود تزکیہ فرمایا اور ان کو تعلیم کتاب وحکمت دی۔ اور بعد میں آنے والوں کے لیے جو مزکی اور معلم ہوں گے وہ آپ کے پیروکار ہی ہوں گے۔ یہ آیت اس بات پر قطعی دلیل ہے۔ کہ اس امت کی ہدایت کے لیے کوئی ایسا شخص نہیں آ سکتا جو امت محمدیہ میں سے نہ ہو۔ رسول کریم ﷺ کا کامل پیروکار ہی اصلاح کا کام سر انجام دے گا۔

۵۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی آمد ثانی آیت خاتم النبیین کے خلاف ہے۔ رسول کریم ﷺ پر اللہ تعالیٰ نے ختم نبوت کی مہر ثبت کر دی ہے۔ اگر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی آمد ثانی کو تسلیم کر لیا جائے تو رسول کریم ﷺ خاتم النبیین نہیں ٹھہرتے۔ یہ اللہ کے وعدہ کے ہی خلاف ہے۔

٦۔ بخاری اور مسلم میں جہاں نزول ابن مریم کی حدیث ہے دونوں میں یہ الفاظ موجود ہیں۔ امام منکم وہ تم ہی میں سے تمہارا امام ہو گا۔ یعنی باہر سے نہیں۔

۷۔ حدیث نزول ابن مریم کی وضاحت رسول کریم ﷺ کی اس حدیث کی روشنی میں کی جائے تو مفہوم واضح ہو جائے گا۔ فرمایا علماء امتی کا انبیاء بنی اسرائیل میری امت کے علماء بنی اسرائیل کے نبیوں کی طرح ہوں گے ایک اور حدیث میں حضرت ابوبکر کو مثیل ابراہیم اور حضرت عمر کو مثیل نوح فرمایا۔ علماء امت محمدیہ بنی اسرائیل کے انبیاء کی طرح ہوں گے۔ یعنی ان کے مثیل ہوں گے۔ دوم: حضرت ابوبکر کو مثیل ابراہیم اور حضرت عمر کو مثیل نوح قرار دیا گیا ہے تو یہ واضح ہو جاتا ہے ابن مریم کی آمد سے مراد مثیل ابن مریم ہو گا۔ رسول کریم ﷺ کی یہی روحانی فضیلت ہے کہ آپ کی پیروی سے ایک متبع بنی اسرائیل کے انبیاء کا روپ دھار لیتا ہے رسول کریم ﷺ کا یہ روحانی فیض تا قیامت جاری ہے۔ جب ابن مریم کی آمد ثانی کی وضاحت عُلَمَآءَ اُمَّتِي كَاَنْبِيَاءَ بَنِي اِسْرَائِيلَ کی روشنی میں کی جائے تو مفہوم واضح ہو جاتا ہے۔ اس تشریح سے رسول کریم ﷺ کی ختم نبوت کی مہر بھی ثابت رہتی ہے اور حدیث کو بھی سچا تسلیم کر کے اس کا مفہوم متعین ہو جاتا ہے۔

انجیل کی رو سے جواب

عیسائی اس بات پر زور تو دیتے ہیں کہ حدیثوں میں ابن مریم کے نزول کا ذکر ہے اس لیے خود حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا آنا ضروری ہے۔ حالانکہ انجیل نے اس بات کا خود فیصلہ کر دیا ہے کہ دوبارہ آمد سے مراد کسی مثیل کی آمد ہوتی ہے۔ نہ کہ خود اس شخص کا آنا۔ جس کا ذکر ہے۔ سلاطین ۲:۱۱ میں لکھا ہے کہ ایلیاہ بگولے میں ہو کر آسمان پر جاتا رہا۔ اور ملاکی ۴:۵ میں ہے کہ ”خداوند کے بزرگ اور ہولناک دن کے آنے سے پیشتر میں ایلیاہ نبی کو تمہارے پاس بھیجوں گا۔“ اس سے واضح ہوا کہ مسیح کی صداقت کی علامت یہ تھی وہ ایلیاہ جو ۲ سلاطین کی رو سے آسمان پر چڑھ گیا تھا۔ دوبارہ آئے اور مسیح خود بھی اس کو تسلیم کرتے ہیں۔ چنانچہ متی ۱۷:۱۰-۱۱ میں ہے اس کے شاگردوں نے اس سے پوچھا کہ پھر فقیہہ یہ کیوں کہتے ہیں کہ ایلیاہ کا پہلے آنا ضروری ہے اس نے جواب میں کہا ”ایلیا البتہ آئے گا اور سب کچھ بحال کرے گا۔ مگر وہ ایلیاہ کس طرح آیا حضرت مسیح اس کی وضاحت اس رنگ میں کرتے ہیں۔“ لیکن میں تم سے کہتا ہوں کہ ”ایلیاہ تو آ چکا اور انہوں نے اس کو نہیں پہچانا بلکہ جو چاہا اس کے ساتھ کیا۔ اسی طرح ابن آدم بھی ان کے ہاتھ سے دکھ اٹھائے گا۔“ تب شاگرد سمجھ گئے اس نے ہم سے یوحنا بپتسمہ دینے والے کی

بابت کہا ہے۔ (متی ۱۷:۱۲۔۱۳) یہی قصہ مرقس ۹:۱۱۔۱۳ میں موجود ہے اور لوقا ۱:۱۷ میں یوحنا کے ذکر میں ہے ''اور وہ ایلیاہ کی روح اور قوت میں اس کے آگے آگے چلے گا۔''

اب انجیل نے حضرت مسیح علیہ السلام کے الفاظ میں یہ حقیقت واضح کر دی کہ کسی کی آمد سے مراد اس کا مثیل ہوتا ہے حضرت مسیح کی بعثت سے قبل ایلیاہ کا آنا لازمی قرار دیا گیا ہے جبکہ حضرت مسیح نے یوحنا کو ایلیاہ کا مثیل قرار دے کر واضح کر دیا ہے کہ یوحنا ایلیاہ کے لباس میں آ چکا ہے اور پیشینگوئی پوری ہو چکی ہے۔

حدیث میں جہاں ابن مریم کی آمد ثانی کا ذکر ہے اس سے مراد حضرت عیسیٰ علیہ السلام مراد نہیں بلکہ ان کا مثیل ہے۔ یہی رسول کریم ﷺ کا روحانی فیض ہے جس کی بدولت سلسلہ ولایت جاری ہے کہ رسول کریم ﷺ کے پیروکار بنی اسرائیل کے انبیاء کی مثیل بن جاتے ہیں۔ یہی ولایت محمدیہ ہے۔ یہ خصوصیت کسی مذہب میں نہیں صرف اسلام اور حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کی ہے کاش عیسائی رسول کریم ﷺ کے اس روحانی فیضان کو سمجھیں۔

☆......☆
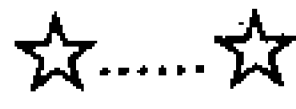
از روئے قرآن محمد صاحب گناہگار اور مسیح بالکل بے گناہ

اعتراض: محمد صاحب از روئے قرآن محض رسول اور گناہگار انسان ثابت ہوتے ہیں لیکن مسیح بالکل بے گناہ اور فَنَفَخْنَا فِيهَا مِنْ رُّوحِنَا کے مطابق الٰہی ذات رکھتا ہے۔ محمد صاحب اس کے مقابل میں بالکل ناچیز ہیں۔

چہ نسبت خاک را با عالم پاک

جواب: رسول کریم ﷺ کے گناہگار ہونے پر مستشرقین نے کثرت سے الزام لگایا ہے۔ کوئی مخالف نہیں جس نے یہ الزام نہ لگایا ہو۔ اس کتاب میں اس کا رد کر دیا گیا ہے اعادہ کی ضرورت نہیں۔ صرف اتنا لکھ دینا ہی کافی ہے کہ رسول کریم ﷺ کی وہ ذات ہے جن کی پیروی سے ہر قسم کی بدیوں میں مبتلا لوگ پاک ہو گئے۔ آپ کی پیروی سے اللہ تعالیٰ کے محبوب بن گئے۔ مشرک عربوں میں ایک روحانی انقلاب برپا کر دیا۔ اس کے ساتھ ہمسایہ اقوام کی نظر میں ذلیل اور مقہور قوم کو تختوں کا وارث بنا دیا۔ اور رسول وہ مزکی تھا جس کی مثال تاریخ عالم میں نہیں ملتی۔ آپ کا وہ روحانی مقام ہے جس کی پیروی سے آپ کے غلام بھی مقام مسیحیت تک پہنچ جاتے ہیں۔ باقی رہا حضرت مسیح کا الٰہی ذات رکھنا۔ جیسا کہ فَنَفَخْنَا فِيهَا مِنْ رُّوحِنَا سے استدلال کیا ہے۔ یہ الفاظ حضرت مریم کی تعریف میں ہیں نہ کہ مسیح کے متعلق اگر مریم کی اولاد اس لیے الٰہی ذات بن جاتی ہے کہ مریم میں اللہ تعالیٰ نے اپنی پاک روح نفخ کی تو اس اصول کے مطابق تمام انسان ہی الٰہی ذات رکھنے والے ہیں کیونکہ آدم کے متعلق اللہ تعالیٰ فرماتا ہے نفخت فیہ من روحی میں نے اپنی روح اس میں پھونکی۔ معترض کے اصول کے مطابق آدم میں روح پھونکا جانے کی وجہ سے آدم کی اولاد ذات الٰہی بن گئی۔

قرآن مجید حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو ایک رسول اور اللہ کا عبد قرار دیتا ہے ارشاد الٰہی ہے مَا الْمَسِيحُ ابْنُ مَرْيَمَ إِلَّا رَسُولٌ دوسری جگہ آتا ہے إِنْ هُوَ إِلَّا عَبْدٌ یعنی حضرت مسیح صرف ہمارا ایک بندہ ہے۔ قرآن مجید نے عقیدہ تثلیث اور عقیدہ الوہیت ابن مریم کو جڑ

سے کاٹ دیا ہے آیئے ذرا انجیل کا مطالعہ کریں کہ اس میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی کیا تصویر ہے۔ایک جگہ ان کی تصویر ان الفاظ میں کھنچی ہے۔دیکھو یہ میرا خادم ہے۔جسے میں نے چنا میرا پیارا جس سے میرا دل خوش ہے۔میں اپنا روح اس پر ڈالوں گا۔(متی ۱۲:۱۸)

یہ الفاظ قرآن کی تصویر کو ہی ظاہر کرتے ہیں انجیل متی میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو خادم قرار دیا ہے۔

باقی رہا لفظ خدا کے بیٹے کا استعمال۔سو یہ لفظ بھی انجیل میں اللہ کے پیاروں کے لیے استعمال ہوا ہے۔چنانچہ ایک جگہ حضرت مسیح فرماتے ہیں۔

''مبارک ہیں وہ جو صلح کراتے ہیں کیونکہ وہ خدا کے بیٹے کہلائیں گے۔''(متی ۵:۹)

پھر فرماتے ہیں ''اپنے دشمنوں سے محبت رکھو اور اپنے ستانے والوں کے لیے دعا مانگو تا کہ تم اپنے باپ کے جو آسمان پر ہے بیٹے ٹھہرو(متی ۵:۴۴۔۴۵) پس انجیل کی اصطلاح میں ''خدا کا بیٹا راست باز اور نیک لوگوں کے لیے استعمال ہوتا ہے۔چنانچہ ایک جگہ حضرت مسیح نے خود اس بات کو قبول کیا ہے۔''یہودیوں نے اسے سنگ سار کرنے کے لیے پتھر اٹھائے یسوع نے انہیں جواب دیا کہ میں نے تم کو باپ کی طرف سے بہتیرے اچھے کام دکھائے ہیں۔ان میں سے کس کام کے سبب مجھے سنگ سار کرتے ہو۔یہودیوں نے اسے جواب دیا کہ اچھے کام کے سبب نہیں بلکہ کفر کے سبب تجھے سنگ سار کرتے ہیں اور اس لیے کہ جو آدمی ہو کر اپنے آپ کو خدا بتاتا ہے۔یسوع نے انہیں جواب دیا کہ تمہاری شریعت میں یہ نہیں لکھا ہے کہ میں نے کہا تم خدا ہو۔جبکہ اس نے انہیں خدا کہا۔جن کے پاس خدا کا کلام آیا اور کتاب مقدس کا باطل ہونا ممکن نہیں آیا تم اس شخص سے جسے باپ نے مقدس کر کے دنیا میں بھیجا کہتے ہو کہ تو کفر بکتا ہے۔اس لیے میں نے کہا میں خدا کا بیٹا ہوں۔''(یوحنا ۱۰:۳۱۔۳۶)

پس انجیل میں الفاظ ''خدا کا بیٹا'' محض مجازی معنی میں استعمال ہوئے ہیں اسی طرح بنی اسرائیل کے بزرگ خدا بھی کہلائے۔انجیل میں مجازات کا استعمال ہے۔ان کو حقیقت کا رنگ دینا محض جہالت ہے۔حضرت مسیح علیہ السلام کا خود اقرار ہے کہ انہوں نے الوہیت کا دعویٰ نہیں کیا۔وہ انجیل اور قرآن کی رو سے ایک بشر اور رسول تھے۔قرآن مجید کی کسی آیت کی رو سے ان کی الوہیت ثابت نہیں ہوتی۔

☆......☆......☆

اسلام کی دوسرے مذاہب کی تعلیم کے ساتھ مماثلت اور اشتراک

(اسلام کی تعلیم دوسرے مذہب سے ماخوذ ہے)

اعتــــراض: اسلام مختلف مذاہب کا اشتراک ہے دوسرے مذاہب کی تعلیم سے مماثلت ہے یہ اعتراض متعدد مستشرقین نے کیا ہے۔

1- H.Krammer, The Christian message in the non christian world.

2- Kielin F.A The Religion of Islam P.21

3- Ibn warraq, why I am not a Muslim P 34-65

4- C.C. Torrey: The Jewish Foundation of Islam P 32,48,50,71,74.

جواب: اسلام پہلا دین ہے جس نے تمام مذاہب اور بانیان مذاہب کی سچائی کا اقرار کیا مزید براں ان پر ایمان لانے کی ہدایت کی۔ کوئی شخص دائرہ اسلام میں داخل نہیں ہوسکتا جب تک تمام انبیاء کرام اور ان کی لائی ہوئی کتب پر ایمان نہیں لاتا۔

قرآن مجید میں آتا ہے

اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَا اُنْزِلَ اِلَیْهِ مِنْ رَّبِّهٖ وَالْمُؤْمِنُوْنَ كُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ لَا نُفَرِّقُ بَیْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ (البقرہ 285:2)

رسول اس پر ایمان لایا ہے جو اس کے رب سے اس کی طرف اتارا گیا اور مومن بھی سب اللہ اور اس کے فرشتوں اور اس کی کتابوں اور اس کے رسولوں پر لاتے ہیں ہم اس کے رسولوں میں سے کسی میں کچھ تفریق نہیں کرتے۔

وَالَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِمَا اُنْزِلَ اِلَیْكَ وَمَا اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ (البقرہ 4:2)

وہ لوگ ایمان لاتے ہیں جو تیری طرف اتارا گیا اور جو تجھ سے پہلے اتارا گیا۔

قُوْلُوْا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَا اُنْزِلَ اِلَیْنَا وَمَا اُنْزِلَ اِلٰٓی اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِیْلَ وَاِسْحٰقَ وَیَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطِ وَمَا اُوْتِیَ مُوْسٰی وَعِیْسٰی وَمَا اُوْتِیَ النَّبِیُّوْنَ مِنْ رَّبِّهِمْ لَا نُفَرِّقُ بَیْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ (البقرہ 136:2)

تم کہو ہم اللہ پر ایمان لائے اور اس پر جو ہماری طرف اتارا گیا اور اس پر جو ابراہیم اور اسماعیل اور اسحٰق اور یعقوب اور اس کی اولاد کی طرف اتارا گیا اور اس پر جو موسیٰ اور عیسیٰ کو دیا گیا اور اس پر جو نبیوں کو اپنے رب کی طرف سے دیا گیا ہم ان میں سے کسی میں تفریق نہیں کرتے۔

شَرَعَ لَكُمْ مِّنَ الدِّیْنِ مَا وَصّٰی بِهٖ نُوْحًا وَّالَّذِیْٓ اَوْحَیْنَآ اِلَیْكَ وَمَا وَصَّیْنَا بِهٖٓ اِبْرٰهِیْمَ وَمُوْسٰی وَعِیْسٰٓی اَنْ اَقِیْمُوا الدِّیْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِیْهِ (الشوری 13:42)

اس نے تمہارے لیے دین کا وہی رستہ مقرر کیا ہے جس کا نوح کو حکم دیا گیا تھا اور جو ہم نے تیری طرف وحی کی اور جس کا ہم نے

ابراہیم اور موسیٰ اور عیسیٰ کا حکم دیا کہ دین کو قائم رکھو اور اس میں تفرقہ نہ ڈالو۔
تاریخ ادیان میں اسلام پہلا مذہب ہے جس نے یہ تعلیم دی کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی صفت ربوبیت کے تحت ہر قوم میں نبی بھیجے ہیں ارشاد الٰہی ہے۔

وَاِنْ مِّنْ اُمَّةٍ اِلَّا خَلَا فِيْهَا نَذِيْرٌ (فاطر 24:35)

یعنی کوئی قوم ایسی نہیں جس میں کوئی ڈرانے والا نہ آیا ہو۔

مذکورہ آیات سے دین اسلام کا یہ اصول واضح ہو جاتا ہے کہ تمام ادیان کا اصل الاصول ایک ہی ہے وہ یہ کہ سب ادیان اللہ کی طرف سے ہیں اور سب ادیان کا سرچشمہ وحی الٰہی ہے جو جبرائیل علیہ السلام ہر نبی پر لے کر اترتا تھا۔ سب انبیاء علیہم السلام صرف ایک ہی دین کو قائم کرنے کے لیے مبعوث ہوئے۔ اس لیے ایک مسلمان سب انبیاء علیہم السلام پر ایمان لاتا ہے کیونکہ وہ سب ایک ہی اصول پر قائم ہیں ایک ہی غرض پورا کرنے کے لیے آئے ہیں۔ مذکورہ ایک آیت (قُوْلُوْٓا اٰمَنَّا...... لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ) میں چار بڑے انبیاء کا ذکر کیا ہے یعنی ابراہیم، اسمٰعیل، اسحاق اور یعقوب پھر سب انبیاء بنی اسرائیل کا مجمل ذکر اسباط کے لفظ سے کیا ہے پھر یہود کے سب سے بڑے نبی موسیٰ علیہ السلام کا ذکر کیا ہے پھر عیسائیوں کے نبی عیسائی کا ذکر کیا پھر ان سب کے بعد اُوْتِيَ النَّبِيُّوْنَ کہہ کر یہ بتا دیا کہ سلسلہ ابراہیمی اور سلسلہ موسوی کے سوائے اور بھی دنیا میں نبی آئے ہیں۔ ان سب کی ایک ہی تعلیم تھی۔

جب قرآن مجید کا مطالعہ کیا جائے تو تمام انبیاء کی تعلیمات کا مرکزی نقطہ بھی سامنے آ جاتا ہے وہ ہے توحید اور اللہ کی عبادت، ارشاد الٰہی ہے۔

لَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا اِلٰى قَوْمِهٖ فَقَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ (الاعراف 59:7)

بے شک ہم نے نوح کو اس کی قوم کی طرف بھیجا سو اس نے کہا اے میری قوم اللہ کی عبادت کرو اور اللہ کے سوا تمہارا کوئی معبود نہیں۔

وَاِلٰى عَادٍ اَخَاهُمْ هُوْدًا قَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ اَفَلَا تَتَّقُوْنَ (الاعراف 65:7)

اور عاد کی طرف ان کے بھائی ہود کو بھیجا۔ اس نے کہا اے میری قوم اللہ کی عبادت کرو تمہارے لیے سوائے اس کے کوئی معبود نہیں پس کیا تم تقویٰ اختیار نہیں کرو گے۔

وَاِلٰى ثَمُوْدَ اَخَاهُمْ صٰلِحًا قَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ (الاعراف 73:7)

اور ثمود کی طرف ان کے بھائی صالح کو بھیجا اس نے کہا اے میری قوم اللہ کی عبادت کرو تمہارے لیے اس کے سوا کوئی معبود نہیں

الغرض اسلام کی رو سے تمام قوموں کی طرف رسول آئے وہ سب ایک ہی سرچشمہ سے سیراب ہوتے تھے اور ایک ہی دین کی تعلیم لے کر آئے اور اس کو قائم کرتے رہے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو وہی تعلیم دی گئی جو پہلے پیغمبروں کو دی گئی ان معنوں میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کوئی نئی دعوت لے کر نہیں آئے بلکہ پرانی تعلیم اور ہدایت کا اعادہ ہے جو دنیا سے مٹ چکی تھی مذاہب کے پیروکاروں نے تحریف سے ہدایت کی حقیقت کو مسخ کر دیا تھا۔ اسلام نے اس مٹی ہوئی تعلیم کو تفصیل اور تکمیل کے ساتھ بیان کر دیا اسی کی طرف یہ آیت اشارہ کرتی ہے۔

اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا (مائدہ 3:5)

آج میں نے تمہارا دین تمہارے لیے کامل کر دیا اور تم پر اپنی نعمت کو پورا کر دیا اور میں تمہارا دین اسلام ہونے پر راضی ہوا۔

جب اسلام سابقہ تمام ادیان کی تعلیمات کا مجموعہ ہے۔ تو لازمی طور پر مختلف مذاہب کی تعلیمات کا اشتراک دین اسلام میں پایا جانا ضروری امر ہے۔ گویا تمام ادیان ایک ہی تنے کی مختلف فروع ہیں اس لیے ان میں مماثلت کا پایا جانا فطری امر ہے۔

جب یہ بات واضح ہوگئی کہ سب ادیان کا سرچشمہ ایک ہی ہے تو پھر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ دیگر ادیان کی موجودگی میں اسلام کی کیا ضرورت تھی اور اسلام کو کیا فضیلت حاصل ہے۔

ادیان کے باہمی متنازعات کا فیصلہ کرنا:

قرآن مجید نے دیگر مذاہب کی موجودگی میں اپنی ضرورت بیان کرتے ہوئے مختلف دلائل دیئے ہیں ان دلائل میں سے ایک دلیل یہ ہے ارشاد الٰہی ہے۔

وَمَا اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ اِلَّا لِتُبَيِّنَ لَهُمُ اخْتَلَفُوْا فِيْهِ وَّ هُدًى وَّرَحْمَةً لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ (النحل 46:16)

اور ہم نے تجھ پر کتاب صرف اس لیے نازل کی ہے تو ان کے لیے وہ باتیں کھول کر بیان کرے۔ جن میں وہ اختلاف کرتے ہیں اور وہ ان لوگوں کے لیے ہدایت اور رحمت ہے جو ایمان لاتے ہیں۔

جب ہم مذاہب عالم کی تاریخ کا مطالعہ کرتے ہیں تو ان کو اختلافات کے بھنور میں پھنسا ہوا پاتے ہیں۔ یہودی مذہب میں فریسیوں کا یہ اعتقاد ہے کہ وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی راست بازی سے راست باز ٹھہر کر نجات پا جائیں گے۔
ارشاد الٰہی ہے۔

وَقَالُوْا لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّآ اَيَّامًا مَّعْدُوْدَةً قُلْ اَتَّخَذْتُمْ عِنْدَ اللّٰهِ عَهْدًا فَلَنْ يُّخْلِفَ اللّٰهُ عَهْدَهٗٓ اَمْ تَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ (البقرہ 80:2)

اور کہتے ہیں کہ سوائے گنتی کے دنوں کے ہمیں آگ نہیں چھوئے گی کہ تم نے اللہ سے کوئی اقرار لیا ہے تو اللہ اپنے اقرار کے خلاف نہیں کرتا بلکہ اللہ پر وہ بات بناتے ہیں جو تم نہیں جانتے۔

اللہ تعالیٰ نے ان کے اس باطل عقیدہ کا رد کرتے ہوئے فرمایا۔

بَلٰى مَنْ كَسَبَ سَيِّئَةً وَّاَحَاطَتْ بِهٖ خَطِيْٓئَتُهٗ فَاُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ (بقرہ 81:2)

ہاں جو بدی کرتا ہے اور اس کی برائیاں اسے گھیر لیتی ہیں وہی آگ والے ہیں۔

اس آیت میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ کسی نبی کی راست بازی سے راست باز ٹھہر کر کوئی نجات نہیں پا سکتا بلکہ نجات کا دارومدار عمل پر ہے اس طرح یہود نے دین کے مرکزی نقطہ یعنی توحید پر ضرب لگائی اور عزیر کو اللہ کا بیٹا بنالیا تو اللہ تعالیٰ نے عقدہ ابنیت کی تردید فرمائی اور کہا۔

وَقَالُوا اتَّخَذَ الرَّحْمٰنُ وَلَدًا لَقَدْ جِئْتُمْ شَيْئًا اِدًّا تَكَادُ السَّمٰوٰتُ يَتَفَطَّرْنَ مِنْهُ وَتَنْشَقُّ الْاَرْضُ وَتَخِرُّ الْجِبَالُ هَدًّا اَنْ دَعَوْا لِلرَّحْمٰنِ وَلَدًا (مریم 19:89:90)

کہتے ہیں کہ رحمٰن نے بیٹا بنایا ہے یقیناً تم ایک خطرناک بات کر گزرے اور قریب ہے کہ اس سے آسمان پھٹ جائے اور زمین شق ہو جائے اور پہاڑ ریزہ ریزہ ہو کر گر جائیں کہ وہ رحمٰن کے لیے بیٹے کا دعویٰ کرتے ہیں۔

یہود نے عزیر کو ابن اللہ قرار دے کر دین کے بنیادی رکن کو منہدم کر دیا تھا۔ قرآن نے اس کی اصلاح کی۔

توریت کا ضائع ہونا:

کسی مذہب کی بنیاد اس کی الہامی کتاب ہوتی ہے۔ یہود کی مذہبی کتاب تورات ہے۔ یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ جب رسول کریم ﷺ پر قرآن مجید کا نزول شروع ہوا۔ تو اس وقت تورات مختلف آسمانی بلاؤں اور بربادیوں سے اپنی اصلی صورت ضائع کر چکی تھی

توریت کی اصل زبان عبرانی تھی ایک عرصہ کے بعد یہود کی زبان آرامی ہوگئی اس تبدیلی زبان کی وجہ سے توریت میں تحریف لازمی تھی۔
توریت کا کوئی نسخہ بھی اصل زبان عبرانی میں موجود نہیں۔
توریت کی بربادی اور تحریف لفظی اور معنوی پر تفصیلی بحث سیرت سید البشر حصہ سوم جز اول میں کی گئی ہے۔ قارئین اس کی طرف رجوع کریں۔
اگر عیسائیت کا مطالعہ کیا جائے تو وہاں بھی اختلافات ہی اختلاف نظر آتے ہیں رومن کیتھولک تین خداؤں کے سوا حضرت مریم کو بھی معبودیت کے تخت پر بٹھاتے ہیں اور پوپ معصُون الخطا گردانتے ہیں پروٹسٹنٹ صرف باپ بیٹا اور روح القدس تک ہی الوہیت کو جائز سمجھتے ہیں اور پوپ کو معصُون عن الخطا نہیں جانتے پھر پروٹسٹنٹ فرقہ کے اندر بے شمار اختلاف ہیں۔
عشاء ربانی کے نظریہ کی رو سے بعض کے نزدیک شراب اور روئی حلق کے نیچے اترتے ہی مسیح کا خون اور گوشت بن جاتی ہے اسی طرح عشاء ربانی میں شامل ہو کر مسیح سے توصل پیدا کرتے ہیں اسی طرح کفارہ کے عقیدہ نے مسیحیوں کو گناہ کی زندگی میں دھکیل دیا ہے۔
اسی طرح دین کے مرکزی عقیدہ توحید سے انحراف کر کے عقیدہ تثلیث کو اپنا لیا۔ قرآن مجید نے عقیدہ تثلیث کو باطل قرار دیا فرمایا۔
فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ وَلَا تَقُوْلُوْا ثَلٰثَةٌ اِنْتَهُوْا خَيْرًا لَّكُمْ اِنَّمَا اللّٰهُ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ (النساء4:171)
پس اللہ اور اس کے رسولوں پر ایمان لاؤ اور مت کہو خدا تین ہیں اس عقیدہ سے باز آجاؤ کہ یہ تمہارے لیے بہتر ہے اور صرف ایک ہی معبود ہے۔
اسی طرح عیسیٰ علیہ السلام اور مریم کے خدا ہونے کی تردید کی۔
وَاِذْ قَالَ اللّٰهُ يٰعِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ ءَاَنْتَ قُلْتَ لِلنَّاسِ اتَّخِذُوْنِيْ وَاُمِّيَ اِلٰهَيْنِ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ (المائدہ5:116)
اور جب اللہ نے کہا اے عیسیٰ بن مریم کیا تو نے لوگوں سے کہا تھا کہ مجھے اور میری ماں کو خدا کے سوا دو معبود بنالو۔
کفارہ کی تردید یوں کی۔
وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى (الزمر39:7)
یعنی کوئی دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھائے گا یہودیت اور عیسائیت کے علاوہ تمام مذاہب ہندومت اور بدھ مت زرتشت اور دیگر مذاہب میں شرک رائج ہو چکا تھا۔ ان کے مشرکانہ عقیدوں کی کئی جگہ پرزور الفاظ میں تردید کی۔ ارشاد الٰہی ہے۔
اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهٖ شَيْئًا وَّلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ (آل عمران3:64)
یہ کہ ہم اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کریں اور نہ اس کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرائیں اور نہ ہم میں سے کوئی کسی کو اللہ کے سوا رب بنائے۔
ایک مکمل سورت توحید پر نازل کر کے شرک کی تمام اقسام کو رد کر دیا۔
قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ اللّٰهُ الصَّمَدُ لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُوْلَدْ وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ (الاخلاص)
کہہ وہ اللہ ایک ہے اللہ بے نیاز ہے نہ اس کا کوئی بیٹا ہے اور نہ وہ کسی کا بیٹا ہے اور اس کا کوئی ہمسر نہیں۔
معترضین دین کے بنیادی رکن یعنی عقیدہ توحید پر غور کر لیں کہ اسلام نے توحید سے بھٹکتے ہوئے لوگوں کو کس طرح توحید کا سبق دیا صرف یہی نہیں کہ توحید کا سبق دیا بلکہ شرک کو رد کر کے نہ صرف عرب میں بلکہ تمام دنیا میں توحید کا پرچار کیا اور لوگوں کو شرک کی دلدل سے نکال کر توحید کی مضبوط اور بلند چٹان پر لا کھڑا کیا دنیا میں صرف توحید کا چراغ ہی گل نہیں ہوا تھا بلکہ توحید کا پیغام لانے والے پیغمبروں کے کردار کو

بھی داغدار کر دیا تھا اسلام نے اس کی اصلاح کی مثلاً بائبل میں لکھا ہے کہ حضرت ابراہیم نے تین جھوٹ بولے حضرت لوط اپنی ہی بیٹیوں سے فعل شنیع کے مرتکب ہوئے (پیدائش باب 19 آیت 31-38) حضرت نوح شراب پی کر برہنہ ہو گئے (پیدائش باب 19 آیت 19-25) حضرت سلیمان بادشاہ فرعون کی بیٹی کے علاوہ بہت سی اجنبی عورتوں سے محبت کرنے لگا (سلاطین اول باب 11 آیت 1-6) حضرت داؤد نے اوریا کی بیوی سے زنا کیا اور وہ حاملہ ہو گئی (سموئیل دوم باب 11۔2-5) حضرت موسیٰ علیہ السلام پر دھوکا دہی کا الزام (خروج باب 11، 36:35:12:3,2) قرآن مجید نے تمام انبیاء کو معصوم عن الخطا قرار دیا، فرمایا۔

مَا كَانَ لِنَبِيٍّ اَنْ يَّغُلَّ (آل عمران 161:3)

کسی نبی کی یہ شان نہیں کہ وہ خیانت کرے۔ الغرض تمام انبیاء کا ذکر انتہائی تعریفی الفاظ میں کیا گیا۔

تاریخ یہ بھی بتاتی ہے تمام ادیان کی کتب تحریف اور تبدل سے اپنی ثقاہت کھو بیٹھی تھیں کوئی ایک مذہب بھی یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ اس کے پاس محفوظ کتاب ہے اسلام آیا اس نے ان تمام خرابیوں کی نشاندہی کی اور تمام سابقہ آسمانی کتب کی مسخ شدہ تعلیم کو ایک نئی شکل میں مزید اضافوں کے ساتھ قرآن مجید میں پیش کیا ارشاد الٰہی ہے۔

فِيْهَا كُتُبٌ قَيِّمَةٌ (البینۃ 3:98)

اس (قرآن) میں قائم رہنے والی کتابیں ہیں۔

اس آیت میں یہ بتایا گیا ہے کہ اس قرآن میں پہلی کتب کی وہ تمام تعلیمات موجود ہیں جو قائم رکھنے کے قابل تھیں۔

اس آیت میں خود اللہ تعالیٰ بیان کرتا ہے کہ قرآن مجید نے پہلی کتب کی بنیادی تعلیم کو جو ہر زمانہ کے لیے ضروری تھی قائم رکھا ہے۔

اب اگر کسی دوسری مذہب کی تعلیم سے مماثلت پائی جاتی ہے تو اس کا اقرار تو قرآن مجید نے خود کر دیا ہے۔ لہٰذا اشتراک تعلیم کا اعتراض بالکل بودا اور لاعلمی پر مبنی ہے۔

دوسری ضرورت تکمیل شریعت:

دین اسلام سے پہلے جس قدر مذاہب آئے تھے وہ سب قومی اور محدود ضروریات کے لیے آئے تھے ان کا پیغام اپنے اندر عالمگیریت نہیں رکھتا قرآن مجید میں نوح علیہ السلام کے متعلق آتا ہے۔

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا اِلٰى قَوْمِهٖ (الاعراف 59:7)

ہم نے نوح کو اس کی قوم کی طرف بھیجا۔

حضرت ہود کے متعلق آتا ہے۔

اِلٰى عَادٍ اَخَاهُمْ هُوْدًا (الاعراف 65:7)

قوم عاد کی طرف ان کے بھائی ہود کو بھیجا۔

حضرت صالح علیہ السلام کے متعلق آتا ہے۔

اِلٰی ثَمُوْدَ اَخَاھُمْ صَالِحًا (الاعراف 73:7)

ثمود قوم کی طرف ان کا بھائی صالح نبی بن کر آیا۔

حضرت شعیب علیہ السلام کے متعلق آتا ہے۔

وَاِلٰی مَدْیَنَ اَخَاھُمْ شُعَیْبًا (الاعراف 85:7)

مدین کی طرف ان کا بھائی شعیب بھیجا۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے متعلق آتا ہے۔

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا مُوْسٰی بِاٰیٰتِنَا اَنْ اَخْرِجْ قَوْمَكَ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَی النُّوْرِ (ابراہیم 5:14)

اور ہم نے موسیٰ کو اپنی نشانیوں کے ساتھ بھیجا کہ وہ اپنی قوم کو اندھیروں سے روشنی کی طرف نکالے۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق فرمایا۔

رَسُوْلًا اِلٰی بَنِیْ اِسْرَآئِیْلَ (آل عمران 49:3)

وہ بنی اسرائیل کی طرف رسول تھے۔

اگر مذاہب عالم کی کتب کا مطالعہ کیا جائے تو یہ بات عیاں ہو جائے گی کہ کسی کتاب نے عالمگیر ہونے کا دعویٰ نہیں کیا پہلے انبیاء علیہم السلام کا پیغام ربانی لے کر صرف ایک ہی قوم کی طرف آنا زمانہ اور فطرت انسانی کے مطابق تھا نزول قرآن مجید سے قبل دنیا کے ممالک ایک دوسرے سے الگ تھلگ تھے ذرائع رسل و رسائل مفقود تھے اس وجہ سے قومیں ایک دوسرے سے بالکل بے خبر تھیں انسان کا ذہن ایک عالمگیر شریعت اٹھانے کے قابل نہ تھا۔ اس وجہ سے اللہ تعالیٰ ضرورت کے مطابق مختلف وقتوں میں پیغام بھیجتا رہا جب دنیا رسل و رسائل اور ذرائع آمد و رفت کی وجہ سے ایک کنبہ کی شکل اختیار کرتی جا رہی تھی۔ تو ایک مکمل شریعت کی ضرورت پڑی جو بنی نوع انسان کی تمام ضرورتوں کو پورا کرے سو اس مقصد کو پورا کرنے کے لیے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو دین اسلام کی تعلیم دے کر بھیجا قرآن مجید نے دعویٰ کیا۔

اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَ اَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ وَرَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا (مائدہ 3:5)

آج میں نے تمہارا دین تمہارے لیے مکمل کر دیا ہے اور اپنی نعمت تم پر پوری کر دی ہے اور اسلام تمہارے لیے بطور دین پسند کیا ہے۔

جب قرآن مجید پر گہری نظر ڈالی جائے تو واضح ہو جاتا ہے کہ اس کتاب میں انسانیت کے لیے ایک مکمل ضابطہ پایا جاتا ہے کوئی ایسی انسانی ضرورت کا پہلو نہیں جو اس میں نہ ہو۔ دوم یہ کتاب ہر دور کی انسانی ضروریات کو پورا کرنے والی ہے۔

مذکورہ بحث سے یہ لازم آتا ہے کہ اسلام ہی وہ دین ہے جس نے تمام مذاہب کو سچا قرار دیا۔ بانیوں اور کتب کی صداقت کی تصدیق کی اور تمام مذاہب کو ایک اصل کی فروع قرار دیا۔ اسلام بھی اسی اصل کی ایک فرع ہے اور اسی حکمت خداوندی کا تسلسل ہے جو اللہ تعالیٰ نے بنی نوع انسان کی ہدایت کے لیے جاری کی تھی۔ لہٰذا اسلام میں دوسرے مذاہب کی تعلیمات کی مماثلت پایا جانا لازمی امر ہے۔ یہی مماثلت اسلام کی سچائی کی دلیل ہے۔ کہ اسلام بھی دیگر مذاہب کی طرح دین الٰہی ہے۔

مستشرقین کو مماثلت اور مشارکت تو نظر آتی ہے لیکن اسلام کے اس پہلو کو نظر انداز کر گئے ہیں۔ کس طرح اسلام نے دیگر مذاہب کی بگڑی ہوئی تعلیمات کی اصلاح کی۔

لہٰذا اسلام کا دیگر مذاہب پر یہ ایک عظیم احسان ہے ایک تو ان کو من جانب اللہ قرار دیا اور صداقت کی تصدیق کی دوم ان کی بگڑی

ہوئی شکل کو اصل حالت میں پیش کیا گویا تمام مذاہب اپنی اصل شکل میں اسلام میں موجود ہیں۔ اسی کا نام تکمیل دین ہے۔ یہی خصوصیت اسلام کو دیگر مذاہب میں ممتاز کرتی ہے۔

......☆......

معراج زرتشت سے ماخوذ ہے

اعتراض: رسول کریم ﷺ کا معراج زرتشت کے دینی ادب سے مستعار ہے۔ (ابن ورّاق)

گو اسلام میں دیگر مذاہب کی تعلیمات کے اشتراک اور مماثلت کا اصولی جواب دیا جا چکا ہے لیکن بعض ایسے پہلو بھی ہیں جن کی مزید وضاحت کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔ ان میں سے ایک معراج ہے۔

ابن وراق نے اپنی کتاب ''میں کیوں مسلمان نہیں ہوں'' کے صفحہ 46,45 پر رسول کریم ﷺ کے معراج کو پہلوی دینی ادب سے مستعار قرار دیا ہے۔ گو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا روحانی سفر زرتشت کے دینی ادب کے مکاشفہ سے خاصی مماثلت رکھتا ہے لیکن رسول کریم ﷺ کے اس روحانی سفر کو زرتشتی دینی ادب کے مکاشفہ سے ماخوذ قرار دینا معراج کی اہمیت اور کیفیت سے لاعلمی کا نتیجہ ہے۔

احادیث میں معراج کی مختصر کہانی یہ ہے کہ رسول کریم بیت اللہ سے بیت المقدس پہنچتے ہیں۔ وہاں تمام انبیاء کی امامت کراتے ہیں براق پر سوار ہو کر حضرت جبرائیل کے ساتھ پہلے آسمان پر جاتے ہیں وہاں حضرت آدم سے ملاقات کرتے ہیں پھر دوسرے آسمان پر جاتے ہیں تو وہاں حضرت یونس علیہ السلام اور عیسیٰ علیہ السلام سے ملاقات ہوتی ہے پھر تیسرے آسمان جاتے ہیں وہاں حضرت یوسف سے ملاقات ہوتی ہے پھر چوتھے آسمان پر حضرت ادریس علیہ السلام سے ملتے ہیں پھر پانچویں آسمان پر جاتے ہیں وہاں حضرت ہارون سے ملاقات ہوتی ہے پھر چھٹے آسمان پر حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ساتویں آسمان پر حضرت ابراہیم علیہ السلام سے ملاقات ہوتی ہے وہاں سے آگے بڑھتے ہیں اور حضرت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اللہ تعالیٰ سے ملاقات ہوتی ہے۔

زرتشتی روحانی علماء نے جب اپنے مذہب کو مردہ اور کمزور دیکھا تو انہوں نے ارتا ویراف کو آسمان پر بھیجا کہ معلوم کریں کہ وہاں کیا ہو رہا ہے سو وہ پہلے آسمان پر گیا پھر دوسرے پھر تیسرے پر آخر میں دوزخ اور جنت دیکھے آخر واپس آیا اور تمام کیفیت لوگوں کو بتائی۔
(Tisdall p80 اختصار)

ابن وراق نے دونوں مکاشفات میں ایک گونہ مماثلت پا کر یہ اعتراض کیا مسلمانوں نے یہ کہانی پہلوی دینی ادب سے لی ہے جو کئی سال پہلے لکھی جا چکی تھی۔ روحانی مکاشفات دینی ادب کا ایک اہم حصہ ہیں اسی دینی ادب سے مابعد طبیعیات کے اسرار و رموز سے پردہ اٹھتا ہے اور لوگ اس مخفی علمی خزانے سے واقفیت حاصل کرتے ہیں۔

یہ روحانی مکاشفے ہر نبی پر وارد ہوئے ہیں۔ انہی مکاشفات سے انبیاء اور اولیاء کے روحانی مقامات کا پتہ چلتا ہے۔

جب انبیاء علیہم السلام کو خلعت نبوت پہنایا جاتا ہے تو اس وقت اللہ تعالیٰ ان کی روح کو ایک روحانی لباس پہناتا ہے اور وہ تمام روحانی منازل طے کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ کے قریب ہو جاتے ہیں یہی معراج ہے۔ گویا انبیاء علیہم السلام کو نبوت کی خلعت معراج کی حالت میں ملتی ہے۔

معراج ایک روحانی مکاشفہ ہوتا ہے جو ہر نبی کو میسر ہوتا ہے جب اپنی قوم کی طرف خدا کا پیغام لے کر آتے ہیں تو وہ پیغام ان کو حالت مکاشفہ میں ملتا ہے پھر یہ روحانی حالت کئی دفعہ نبی پر وارد ہوتی ہے مثلاً جب حضرت نوح علیہ السلام کو کشتی بنانے کا حکم ہوا تو یہ حکم بھی حالت مکاشفہ میں ملا تھا۔ ان کی روح نے روحانی بلندیاں طے کیں اور حکم لے کر واپس آئی اور اس حکم پر عمل کیا۔ اسی طرح جب حضرت لوط کو رات کے اندھیرے میں اپنی بیوی کے ساتھ ہجرت کرنے کا حکم ہوا تو یہ حکم بھی حالت مکاشفہ میں ہوا۔ جب موسیٰ کو وادی طویٰ میں نبوت کی خلعت نصیب ہوئی اور فرعون کی طرف بھیجا تو یہ بھی حالت مکاشفہ تھی۔ ان کی روح نے مختلف روحانی بلندیوں کو طے کیا اور یہ حکم لے کر واپس آئی اور فرعون کے پاس گئے اور بنی اسرائیل کی آزادی کے لیے کہا۔ جب کوہ سینا پر اللہ تعالیٰ سے ہم کلام ہوئے۔ اور بارہ احکام ملے تو وہ بھی حالت مکاشفہ تھی۔ روحانی بلندیوں (آسمانوں) کو طے کیا اور احکام لے کر واپس آئے۔ انبیاء علیہم السلام کی زندگیوں کا مطالعہ کیا جائے تو واضح ہو جاتا ہے۔ یہ حالت مکاشفہ (معراج) کئی دفعہ ان پر وارد ہوتی ہے۔ زرتشت کے مذہبی ادب میں اگر معراج (روحانی کشفی حالت) کا ذکر ہے۔ تو یہ کوئی نئی چیز نہیں یہ تو اللہ تعالیٰ کی سنت ہے کہ اللہ تعالیٰ تمام اپنے نیک بندوں کے ساتھ یہ سلوک کرتا ہے۔ وہ روحانی سفر میں کئی منازل طے کرتا ہوا اللہ کے قرب میں جاتا ہے اللہ تعالیٰ سے ہم کلام ہوتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اپنی قدیم سنت کے مطابق اپنے نبی محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ کے ساتھ بھی وہی سلوک کیا جو پہلے انبیاء علیہم السلام کے ساتھ کیا۔ رسول کریم ﷺ کی تاریخ یہ بتاتی ہے کہ بعثت کے بعد کئی دفعہ اس حالت کشف سے گزرے احادیث میں کئی واقعات کا ذکر ہے جیسا کہ حدیث کسوف میں ذکر ہے کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا کہ مجھے یہاں سب کچھ دکھایا گیا ہے یہاں تک دوزخ اور جنت بھی۔ اسی طرح ایک اور حدیث میں ہے کہ آپ تہجد کے لیے اٹھے نماز پڑھی تب ناگہاں اپنے رب کو احسن صورت میں دیکھا۔ ابن عباس کہتے ہیں کہ ایک دن رسول مقبول ایک قبرستان سے گزر رہے تھے فرمایا کہ ان قبروں میں عذاب ہو رہا ہے عذاب کسی کبیرہ گناہ کی پاداش میں نہیں ہے ایک پیشاب کی چھینٹوں کی پرواہ نہیں کرتا تھا دوسرا اس وجہ سے عذاب میں مبتلا ہے کہ وہ لوگوں کی چغلی کھایا کرتا تھا۔ ایک جہاد میں مسلمانوں کی طرف سے ایک آدمی مارا گیا صحابہ کرام نے فرمایا کہ وہ شہید ہوا ہے رسول کریم ﷺ نے فرمایا نہیں میں نے اس کو دوزخ میں دیکھا ہے کیونکہ اس نے مال غنیمت میں ایک چادر چوری کی تھی۔

احادیث میں ایسے امور کا ذکر ہے کہ جس کو عالم بیداری میں آپ کی روحانی آنکھ نے نورانی جسم کا لبادہ اوڑھ کر مشاہدہ کیا اور ان ظاہری آنکھوں کا دخل نہیں ہوتا تھا۔ معراج کی بھی یہی کیفیت ہے۔

پس معراج ایک روحانی سفر ہوتا ہے۔ جو نبی روحانی منازل طے کرتا ہوا خدا کے قرب میں جا پہنچتا ہے۔ یہ اعلیٰ درجہ کا مکاشفہ رسول کریم ﷺ کو نصیب ہوا وہ مکاشفہ سب انبیاء علیہم السلام کے معراجوں سے افضل اور اعلیٰ ہے۔ رسول کریم ﷺ نے سات روحانی منازل طے کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ کا دیدار کیا اور قاب قوسین کا روحانی مقام حاصل کیا۔ یہ مقام اتصال خداوندی کہلاتا ہے ہر نبی کو معراج ہوا ہے لیکن ان کی روحانی استعداد کے مطابق۔ اسی قسم کے معراج کا ذکر زرتشت کے مذہبی ادب میں ہے۔ اگر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے معراج کی مماثلت زرتشتی (پہلوی) مذہبی ادب میں پائی جاتی ہے تو اعتراض کی بات نہیں یہ تو اللہ تعالیٰ کی سنت مستمرہ ہے۔ جس کا ذکر مختلف دینی ادب میں پایا جاتا ہے یہ بھی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت پر ایک دلیل قاطع ہے کہ آپ ﷺ بھی ان کشفی حالات میں سے گزرے ہیں جن سے دیگر انبیاء گزرا کرتے تھے میں مزید یہ بھی ذکر کروں گا کہ یہ روحانی مکاشفے بند نہیں ہوئے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے کامل متبعین پر بھی وارد ہوتے ہیں۔ اسلام کے تمام اولیاء کرام اس نعمت سے مستفیض ہوئے ہیں۔ جب حضرت حلاج ''انا الحق'' کا نعرہ بلند کرتا تھا تو اس وقت وہ روحانی حالت میں ہوتا تھا اور خدا کی محبت میں فنا ہوتا تھا۔ ابن عربی، مجدد الف ثانی اور تمام دیگر اولیاء عظام کی زندگی ان مکاشفات سے بھری

پڑی ہے یہ اس بات کی دلیل ہے کہ زندہ مذہب صرف اسلام ہی ہے۔ اس کی تعلیم پر چل کر انسان اب بھی خدا تعالیٰ سے ہم کلام ہوتا ہے اور روحانی سفر کی نعمت سے اپنی روحانی استعداد کے مطابق متمتع ہوتا ہے۔ اب یہ نعمت صرف اسلام کے متبعین کو حاصل ہے اس کا ذکر اللہ تعالیٰ نے سورہ فاتحہ میں کیا ہے۔

اِهۡدِنَا الصِّرَاطَ الۡمُسۡتَقِيۡمَ صِرَاطَ الَّذِيۡنَ اَنۡعَمۡتَ عَلَيۡهِمۡ۔ (الفاتحة)

ہمیں سیدھے راستے کی ہدایت دے ان لوگوں کا راستہ جن پر تو نے انعام کیا وہ انعام کیا ہے وہ یہی حالت کشف میں اللہ تعالیٰ سے ہم کلام ہونا اس دعا کی برکت سے اسلام میں ایسے ایسے بزرگ ہو گزرے ہیں اور ایسے ایسے اولیاء پیدا ہوتے رہیں گے۔ جن کو رسول کریم ﷺ کی پیروی میں ان کی روحانی استعدادوں کے مطابق معراج (روحانی مکاشفہ) ہوتا رہے گا۔ یہی اسلام کے سچا اور زندہ دین ہونے کی علامت ہے۔

ابن وراق اور دیگر مستشرقین تو اللہ تعالیٰ کی سنت سے واقف نہیں نہ وہ اس روحانی حالت سے باخبر ہیں۔ نہ وہ اس بات سے واقف ہیں اسلام اب بھی ان روحانی مکاشفات کا دروازہ کھلا رکھتا ہے اور اولیاء کرام اپنی روحانی استعدادوں کے مطابق روحانی سفر (معراج) کی نعمت سے متمتع ہوتے رہتے ہیں۔

یہ بھی ایک معرفت کا نکتہ یاد رکھنا چاہیے کہ جن روحانی نعمتوں سے انبیاء کرام فیض یاب ہوتے رہے ہیں خصوصاً نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم۔ انہی روحانی نعمتوں سے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پیروکار فیض یاب ہوتے ہیں تاکہ ان نعمتوں کی یاد تازہ رہے اور وہ نعمتیں صرف ماضی کی داستانیں ہی معلوم نہ ہوں بلکہ انسان کو اس بات کا علم رہے کہ اللہ تعالیٰ اب بھی اپنے نیک بندوں کو ان روحانی نعمتوں سے فیض یاب کرتا ہے یہی ایک زندہ مذہب کی نشانی ہے تمام روحانی نعمتوں کا دروازہ کھلا ہے صرف وحی نبوت کا دروازہ بند ہو چکا ہے وحی نبوت کی جگہ وحی ولایت جاری و ساری ہے۔ تاکہ اللہ تعالیٰ کی صفت کلام کا اظہار ہوتا رہے۔

......☆......

پل صراط پر اعتراض

اعتراض: ابن وراق نے اسلام کے تصور "پل صراط" پر یہ اعتراض کیا ہے کہ یہ زرتشت کے مذہب سے مستعار لیا گیا ہے۔ زرتشت کے مذہب میں بھی یہی تصور پایا جاتا ہے۔ (Why I am not a Muslim) "میں کیوں مسلمان نہیں ہوں۔" (ص 47)

جواب: پل صراط کا تصور صرف قرآن مجید میں ہی نہیں ہے بلکہ احادیث میں پایا جاتا ہے۔ جیسا کہ پہلے یہ بات ذکر کی جا چکی ہے کہ اسلام پہلے تمام مذاہب کا جامع ہے اور پہلے مذاہب کا ایک تسلسل ہے ارشاد الٰہی ہے۔

فِيۡهَا كُتُبٌ قَيِّمَةٌ (البینة 3:98)

اس میں قائم رہنے والی کتابیں ہیں۔ یعنی پہلی کتب کی تعلیمات کا نچوڑ اور عطر قرآن مجید میں ہے۔

اس لیے اگر پل صراط کا تصور زرتشت یا کسی اور مذہب میں پایا جاتا ہے تو اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں ہے کہ اس حقیقت کو اسلام نے

مستعار لیا ہے۔ بلکہ وہ ایک دائمی حقیقت اور صداقت تھی۔ جس کا اظہار رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی خدا سے وحی پا کر کر دیا۔ سب مذاہب میں ان دائمی حقائق کا تصور پایا جاتا ہے۔

پل صراط کی حقیقت:

ابن وراق اور دیگر تمام مستشرقین مابعد الطبیعیات امور سے ناواقف ہیں ایک اصولی بات یاد رکھنی چاہیے کہ جنت اور دوزخ میں آرام دہ اور عذاب دہ چیزوں کا ذکر کیا گیا ہے اور ان آرام دہ اور عذاب دہ اشیاء کے نام محض استعارے کے طور پر بیان کیے گئے ہیں۔ وہاں کی نعمتیں اور عذاب ہمارے ہی اعمال کا نتیجہ ہوں گے۔ انبیاء علیہم السلام نے اللہ تعالیٰ سے علم پا کر مختلف ناموں کے ساتھ بیان کیا ہے اور تمام انبیاء علیہم السلام کے بیان میں ایک گونہ اشتراک پایا جاتا ہے۔ جو حقیقت پر مبنی ہے۔ مختلف مذاہب میں جنت میں حوروں، ولدان اور مختلف پھلوں وغیرہ کا ذکر پایا جاتا ہے۔ کسی نبی نے بھی کسی دوسرے نبی کے تصور سے مستعار نہیں لیا بلکہ اللہ تعالیٰ نے ہر نبی پر جنت اور دوزخ کی حقیقت کو واضح کیا ہے تا کہ انسانوں میں نیکی کی ترغیب اور بدی سے نفرت پیدا ہو۔

نیکی اور بدی کا تعلق بھی اسی پل صراط سے ہے۔

''پل صراط'' حقیقت میں صراط مستقیم کو ایک تمثیلی زبان میں بیان کیا گیا ہے۔ جو شریعت متعین کرتی ہے۔ صراط مستقیم کیا ہے۔ یہ وہ نیکی کا راستہ ہے جو افراط اور تفریط سے پاک ہوتا ہے۔ جس پر شریعت چلنے کی ہدایت دیتی ہے۔ انسان خدا کی طرف سے اس صراط مستقیم پر چلنے کا پابند ہے۔ جب ہم اس دنیا میں دیکھتے ہیں کہ اس صراط مستقیم پر چلنے کے لیے انسان کو کتنی رکاوٹوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ مادی ترغیبات، نفسانی خواہشات اور شیطانی وسوسے انسان کے سامنے صراط مستقیم پر چلنے کے لیے سد سکندری بنے ہوئے ہوتے ہیں۔ انسان کو اپنی نفسانی خواہشات کی سرکش اونٹنی کو ذبح کرنا ہوتا ہے لیکن انسان اپنی خواہشات کی غلامی سے نجات نہیں پاتا اور افراط اور تفریط کا راستہ اختیار کر لیتا ہے اللہ تعالیٰ کا بتایا ہوا وہ صراط مستقیم روز محشر کو ایک تمثیلی رنگ اختیار کر جائے گا جو حقیقت میں بال سے زیادہ باریک تلوار کی دھار سے زیادہ تیز ہوگا جو لوگ اللہ تعالیٰ کے بتائے ہوئے رستہ پر گامزن ہوئے وہ لوگ اس ''پل صراط'' سے اللہ تعالیٰ کے فضل سے گزر جائیں گے جو لوگ افراط اور تفریط کی راہ پر گامزن ہوئے وہ اس پل صراط سے گزرتے ہوئے دائیں بائیں دوزخ میں گر جائیں گے دراصل ہر انسان کی اسی مادی زندگی کا ایک نقشہ ہے کہ آیا اس نے یہ مادی زندگی خدا کے بتائے ہوئے اصولوں کے مطابق گزاری یا شیطان کی راہ پر چل کر زندگی بسر کی۔

افراط اور تفریط کی وضاحت ایک مثال سے کرتا ہوں۔ مثلاً اللہ تعالیٰ نے انسان کو دولت دی ہے کنجوسی، بخل تفریط ہے جب کہ تبذیر اور اسراف افراط ہے اور سخاوت صراط مستقیم ہے۔

اسی طرح سے انسان کے تمام اعمال کو ناپا تولا جا سکتا ہے کہ آیا اس نے اپنے اعمال میں تفریط کی ہے یا افراط، عمل وہی صحیح ہوگا جو صراط مستقیم یعنی شریعت کے احکام کے مطابق ہوگا۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

اِنَّمَا هِيَ اَعْمَالُكُمْ تَرِدُ اِلَيْكُمْ

یعنی آخرت میں تمہارے اعمال ہی جنت اور دوزخ میں تمثل ہوں گے۔

دوزخ و جنت ہمیں اعمال تست
ہرچہ کاری بدروی اظلال تست

ابن عربی نے پل صراط کی حقیقت ان الفاظ میں بیان کی۔

''پل صراط اخروی کی صفت میں آیا ہے کہ وہ بال سے باریک، تیر اور تلوار سے تیز تر ہے اور ایسا ہی دنیا میں علم شریعت کا حال ہے کہ مسائل میں راہِ راست جو عنداللہ مقبول اور پسندیدہ ہو معلوم نہیں ہوتا پس دنیا میں مسائل کا حکم شرع میں تلوار سے تیز تر اور بال سے باریک تر ہے۔ شریعت میں یہاں صراط مستقیم ہے بندہ نماز کی ہر رکعت میں کہتا ہے۔

اِهْدِ نَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ

(ہمیں سیدھے راستے پر چلا) پس وہ تلوار سے تیز تر اور بال سے باریک تر ہے اور آخرت میں دنیا کی بہ نسبت اس کا ظاہر ہونا واضح تر ہوگا مگر جنہوں نے علیٰ وجہ بصیرت خدا تعالیٰ کی طرف دعوت کی، مثل رسولوں اور ان کے اتباع کے۔ ان کو خدا تعالیٰ کے انبیاء کے درجہ کے ساتھ ملحق کردے گا۔ اور احادیث میں آیا ہے صراط قیامت میں گزرنے والوں کے نور کے موافق ظاہر ہوگی۔

پس وہ ایک گروہ کے حق میں باریک ظاہر ہوگی اور دوسرے گروہ کے حق میں کشادہ ہوگی اس خبر کی تصدیق خدا تعالیٰ کے اس کلام سے ہوتی ہے کہ مومنوں کا نور ان کے آگے اور دائیں طرف دوڑتا ہوا نظر آئے گا۔ اور وہاں صراط مستقیم کے بغیر کوئی راہ نہ ہوگی اور خدا تعالیٰ کے کلام میں جو آیا ہے کہ ان کا نور دائیں طرف دوڑتا ہوگا۔ اس لیے ہے کہ آخرت میں مومن کا کوئی بایاں نہ ہوگا جیسا کہ دوزخیوں کے لیے دایاں نہ ہوگا یہ تو صراط اخروی کے بعض احوال ہیں۔ مگر کتے اور جھپٹے مارنے والے اور نوچنے والے جانور اور کانٹے یہ تو بنی آدم کے عملوں کی صورتیں ہوں گی جو ان کو پل صراط پر چمٹیں گی۔ ابھی بہشت سے دور ہی ہوں گے اور دوزخ میں نہ گرے ہوں گے کہ ان کو شفاعت اور عنایت الٰہی پہنچ جائے گی پس جس نے اس دنیا میں درگزر کیا خدا اس سے درگزر کرے گا اور جو کوئی تنگ دست کو مہلت دے گا خدا تعالیٰ اس کو مہلت دے گا اور جو کوئی معاف کرے گا۔ خدا تعالیٰ اسے معاف کرے گا اور جو کوئی بندوں سے اپنا حق پورا لے گا تو خدا تعالیٰ وہاں اس سے اپنا حق پورا لے گا اور جو کوئی اس امت پر سختی کرے گا خدا تعالیٰ اس پر سختی کرے گا۔ یہ تو تمہارے اعمال ہیں جو تم پر وارد ہوں گے۔''

دوزخ اور جنت کا تصور ہر ایک مذہب میں مشترک ہے مختلف انبیاء علیہم السلام نے قیامت کے دن نیک و بد اعمال کے نتیجہ کو بیان کیا ہے۔ کیونکہ نیک و بد اعمال کے نتائج کی اطلاع اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے اس لیے مذاہب میں ان کی مماثلت اور اشتراک کا پایا جانا لازمی امر ہے یہ تصور کسی سے مستعار نہیں۔ بلکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اپنے نبی پر کشفی رنگ میں اسرار کا اظہار ہے۔

ابن وراق نے اسلام کے تصور دوزخ اور جنت کو بھی مستعار قرار دیا ہے یہاں اس کا بھی جواب آ گیا ہے۔ حقیقت میں ابن وراق اور دیگر مستشرقین دین کے مابعد الطبیعیات حقائق سے ناواقف ہیں عداوت اسلام کی تاریک راہ میں گم گشتہ ہیں اگر وہ تعصب کی پٹی کو اتار کر اسلام کی منور تعلیم پر نگاہ ڈالیں تو ان پر واضح ہو جائے گا کہ اسلام ہی وہ دین متین ہے جو تمام ادیان کی تعلیمات کا جامع ہے اور اس کی تعلیم ہی بنی نوع انسان کو کامیابی سے ہمکنار کرسکتی ہے اور کرتی ہے اور انسانیت کا یہی دین ہے۔

......☆......

حج کی رسومات پر اعتراضات

اعتراض: مستشرقین کی طرف سے یہ عام اعتراض ہے کہ حج مشرکین عرب کی ایک رسم ہے جسے اسلام نے مقامی اثرات کے تحت یا مشرکین عرب کو خوش کرنے کے لیے اپنایا۔

جواب: واٹ رقمطراز ہے۔"جب ایک مذہب دوسرے کی جگہ لیتا ہے تو عموماً اسے پچھلے مذہب کے مقدس مقامات اور مقدس ایام کو اپنانے میں فوائد نظر آتے ہیں لیکن ان ماخوذ چیزوں کو نیا مذہب اپنی تاویلات سے دیتا ہے اسلام میں زمانہ قبل از اسلام مکہ کی زیارت اپنی ظاہری شکل میں اپنالی گئی ہیں انہیں اسلامی اہمیت دے دی گئی ہے۔

(Watt,M. Truth in the religions PP 28,29)

شارٹر انسائیکلو پیڈیا نے ڈوزی کے حوالے سے تمام رسوم حج کو اسرائیلی رسوم سے مماثل قرار دیا ہے۔

(Shorter Encyclopedia of Islam. P 129)

اور مضمون حج میں یہ تاثر دینے کی کوشش کی گئی ہے۔رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا حج کے بارے میں عقیدہ یکساں نہ تھا مکی اور ابتدائی مدنی سورتوں میں حج کے بارے میں کوئی حکم نہیں ملتا۔مزید کہ مدینے میں بھی حج میں دلچسپی بدر کے بعد نظر آتی ہے چونکہ یہود مدینہ کے معاملے میں سخت ناکامی ہوئی اس لیے ان سے مذہبی رشتہ توڑا اس دور میں مذہب ابراہیمی کا تذکرہ سامنے آیا۔"

ہیوز نے بھی اس نظریہ کو اپنی کتاب ڈکشنری آف اسلام میں زیر عنوان کعبہ ان الفاظ میں پیش کیا۔

جب محمد (صلعم) نے اپنے آپ کو مستحکم پایا اور مکہ اور اس کے تمام تاریخی مقامات کے حصول کے لیے اچھے حالات پیدا ہو گئے تو معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے یروشلم اور اس کی متبرک پہاڑیوں کا خیال ترک کر دیا اور مکہ کے گھر پر اس خیال سے کہ وہ تمام بنی نوع انسان کے لیے بنایا گیا ہے نظر جمائی یہود کے تمرد اور سرکش ہونے پر اور اس امر کا بہت کم امکان ہونے کی وجہ سے کہ وہ انہیں اپنا وہ نبی تسلیم کر لیں گے جس کا وعدہ موسیٰ نے دیا تھا تو انہوں نے اپنا قبلہ یروشلم سے مکہ کی طرف بدل لیا اور مکہ کے اس گھر کو لوگوں کے لیے مرجع اور عبادت گاہ بنا دیا۔

دوسرے یورپین مصنفین نے بھی اسی نظریہ کو پیش کیا۔اے۔جے۔ونسنک نے اسے انسائیکلو پیڈیا آف اسلام میں بیان کیا ہے حج کے عنوان کے تحت رقمطراز ہے۔

"محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو حج میں دلچسپی پہلے پہل مدینہ میں پیدا ہوئی اس کی کئی ایک وجوہ تھیں جیسا کہ سنوک ہر گونجے۔" نے اپنی کتاب (Mikkesn's che feest) میں بیان کی ہیں جنگ بدر کی شاندار فتح نے فتح مکہ کے خیالات آپ ﷺ کے دل میں پیدا کر دیئے ایسے اقدام کی تیاریاں اسی صورت میں زیادہ کامیاب ہو سکتی تھیں کہ اب ان کے ساتھیوں کی دنیاوی اور مذہبی دلچسپیوں کو بیدار کیا جاتا۔ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو یہود سے متعلق جو توقعات تھیں وہ فریب دہ ثابت ہوئیں اور یہود کی معاہدہ شکنیوں نے ان کے ساتھ مذہبی قطع تعلق ناگزیر بنا دیا۔مذہب ابراہیمی کے عقیدہ کا آغاز اسی زمانہ کی پیداوار ہے جو یہودیت اور اسلام کا مبینہ اصل نمونہ ہے کعبہ اب بتدریج مذہبی عبادات کا مرکز بنتا جا رہا ہے جو توحید کے باپ (حضرت ابراہیم علیہ السلام) نے اپنے بیٹے اسماعیل کی مدد سے تعمیر کیا تھا اور اب وہ بنی نوع انسان کے اجتماع کی جگہ بننے والا تھا۔اس زمانہ میں ہی کعبہ کو قبلہ بنایا گیا۔یہ سن دو ہجری کے حالات کا نقشہ ہے۔"

عقل کے گھوڑے دوڑا کر یہ بیان کیا ہے کہ عربوں نے طواف کعبہ سیاروں کی گردش سے اخذ کیا ہے۔ میور لکھتا ہے۔

The seven circuits of Kaaba were probably emblematical of revolutions of the planetary bodies (MuirL(1) P.xci)

زویمر لکھتا ہے۔

That the seven circuits of Kaaba three times rapidly and four times slowly were in imitation of inner and outer planets (Zwemer (3) P 158)

مذکورہ حوالہ جات سے حسب ذیل اعتراضات سامنے آتے ہیں۔

الف: کیا طواف سماوی سیاروں کی گردش کی نقل ہے۔

جواب: اگر مستشرقین کعبہ کی تاریخ اور قرآن مجید کا مطالعہ کر لیتے تو وہ عقل کے گھوڑے دوڑا کر حقائق کے خلاف اسلام کے رکن حج پر معترض نہ ہوتے اگر کعبہ کی تاریخ کا علم ہو جائے تو پھر اعتراض خود بخود دور ہو جاتا ہے۔ مورخین نے اپنی علمی تحقیقات سے یہ ثابت کیا ہے کہ حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل علیہما السلام کی تعمیر نو سے پہلے وہاں اللہ کا گھر منہدم شکل میں موجود تھا پہلا اللہ کا گھر تھا اور توحید کی علامت تھا اور لوگ اس گھر کی زیارت اور طواف کے لیے آتے تھے حضرت عباس کی ایک لمبی حدیث میں حضرت ابراہیم کا حضرت اسماعیل علیہ السلام اور ان کی والدہ کو خانہ کعبہ کے نزدیک آباد کرنے کا ذکر بیان کیا گیا ہے۔

خانہ کعبہ اس وقت سطح زمین سے اوپر ایک ٹیلے کی طرح کھڑا تھا اور سیلاب کا پانی اس کے دائیں جانب اور بائیں جانب گزرتا تھا۔

(بخاری کتاب الانبیاء باب 9)

اس حدیث میں بیان کیا گیا ہے کہ بعد از اں حضرت اسماعیل علیہ السلام جوان ہو گئے اور ان کی شادی بھی ہو گی اور حضرت ابراہیم علیہ السلام ان سے ملنے گئے اور ان سے کہا کہ خدا نے ہمیں حکم دیا ہے کہ جہاں سے وہ ایک گھر (خدا کا) تعمیر کریں پھر باپ اور بیٹے دونوں نے خانہ کعبہ کو تعمیر کیا۔ صرف کعبہ مسمار ہی نہیں ہو گیا تھا بلکہ اس جگہ بت بھی رکھے ہوئے تھے اور اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو حکم دیا کہ وہ اس گھر کو بتوں سے پاک صاف کریں۔ ارشاد الٰہی ہے۔

وَعَهِدْنَا إِلَىٰ إِبْرَاهِيمَ وَإِسْمَاعِيلَ أَن طَهِّرَا بَيْتِيَ لِلطَّائِفِينَ وَالْعَاكِفِينَ وَالرُّكَّعِ السُّجُودِ (سورۃ بقرہ 125:2)

ہم نے ابراہیم اور اسماعیل علیہما السلام کو حکم دیا کہ میرے گھر کو طواف کرنے والوں، اعتکاف کرنے والوں اور رکوع کرنے والوں، سجدہ کرنے والوں کے لیے پاک صاف کر دو۔

یہ الفاظ ظاہر کرتے ہیں کہ وہاں کوئی عمارت تعمیر تھی جہاں طواف کرنے والے اعتکاف کرنے والے اور رکوع سجود (عبادت کرنے والے) آتے تھے۔ اس کے ساتھ وہاں بت بھی پڑے ہوئے تھے۔ جن کی تطہیر کا باپ بیٹے کو حکم ہوتا ہے۔

اس گھر کا طواف حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل علیہما السلام کی تعمیر نو سے قبل بھی ہوتا تھا۔ یہ وہ دور ہے جبکہ سائنس نے اتنی ترقی ہی نہیں کی تھی کہ جاہل لوگوں کو سیاروں کی گردش کا بھی علم ہو اور ان کی نقل میں خدا کے گھر کا طواف کرتے۔ بیت اللہ کا طواف نامعلوم قدیم زمانہ سے چلا آ رہا ہے اور اسی رکن کو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جاری رکھا لہٰذا میور اور زویمر کا اعتراض بالکل بودا ہے کہ عربوں نے طواف کا رکن سماوی سیاروں کی گردش سے اختیار کیا ہے تاریخ یہ بتاتی ہے کہ یہ رسم اس وقت سے چلی آ رہی ہے جب کہ مکہ میں سب سے پہلے بیت اللہ بنایا گیا تھا۔ بیت اللہ کے پہلے معمار نبی نے بعض مراسم (طواف وغیرہ) کی تعلیم دی تھی۔ وہی مراسم عربوں میں جاری ہوئے۔

میور بھی صرف کعبہ کی قدامت کا قائل ہی نہیں بلکہ مذہب مکہ کے بڑے بڑے خدوخال کو بھی تسلیم کرتا ہے جس سے بالبداہت مراسم حج مراد ہیں۔ لکھتا ہے "مذہب کے اہم خدوخال (کی تاریخ) کا تعلق نہایت قدیم زمانہ سے متعین کرنا پڑے گا"......

(ڈائی ڈورس سیسولیس) (Dio dorus siculus) لکھتا ہے۔

"اس ملک میں ایک عبادت گاہ ہے جس کی عرب لوگ بڑی عزت کرتے ہیں یہ الفاظ مکہ مقدس گھر کے متعلق ہو سکتے ہیں کیونکہ کوئی دوسری جگہ ہمارے علم میں نہیں ہے جس کو اس قدر عالمگیر عزت اور قبولیت حاصل ہو...... روایات سے ثابت ہوتا ہے کہ مکہ اس زمانہ سے جس کا تصور ناممکن ہے۔ عرب کے تمام حصوں سے حج کا مرکز رہا ہے۔ یمن اور حضرموت سے خلیج فارس کے کناروں سے شام کے صحراؤں اور حرا اور عراق عرب کے گردونواح سے ہر سال لوگ جوق در جوق مکہ میں جمع ہوتے تھے اس قدر وسیع پیمانہ پر اس گھر کی عزت و منزلت اور اس کی مقبولیت کی ابتداء یقیناً نہایت قدیم زمانہ سے رکھتی ہے۔ (لائف محمد صفحہ ایکس سی)

تاریخی شواہد قرآن مجید کے دعویٰ کی تصدیق کرتے ہیں کعبہ، حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل علیہما السلام کی تعمیر نو سے قبل مسمار شکل میں موجود تھا اور لوگ اس کی زیارت کے لیے جوق در جوق آتے تھے اور بیت اللہ کا طواف کرتے تھے۔

(ب) کیا اسلام نے رسوم (مناسک) حج عرب مشرکین سے اخذ کیں؟ جیسا کہ پہلے ذکر ہو چکا ہے کہ بیت اللہ کی زیارت اور دیگر رسوم قدیم زمانے سے چلی آ رہی تھیں۔ تاریخ یہ بھی بتاتی ہے کہ بیت اللہ حادثات زمانہ سے منہدم ہو چکا تھا۔ اللہ تعالیٰ کے حکم سے حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل علیہما السلام نے اس کی از سر نو تعمیر کی۔ قدیم مذہبی رسوم کے ساتھ نئی رسوم (مناسک) مثلاً سعی کی رسم (صفا و مروہ کے درمیان دوڑنا) جو حضرت ہاجرہ کی یادگار ہے جبکہ اپنے پیارے لخت جگر اسماعیل کے لیے پانی کی تلاش میں اِدھر اُدھر بھاگتی پھرتی تھیں) یا قربانی کی رسم (جو حضرت ابراہیم کے اس واقعہ کی یادگار ہے جب آپ کو حضرت اسماعیل کے ذبح کرنے کا حکم دیا گیا تھا اور اس کی تعمیل کے لیے تیار ہو گئے) شامل کر کے حج کی عبادت کا آغاز کیا۔ یہ مناسک حج رسول کریم ﷺ کی بعثت سے قبل موجود تھے وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی سنت پر مبنی تھے۔ جس کی تائید قرآن مجید سے ہوتی ہے ارشاد الٰہی ہے۔

وَاِذْ بَوَّاْنَا لِاِبْرٰهِيْمَ مَكَانَ الْبَيْتِ اَنْ لَّا تُشْرِكْ بِيْ شَيْئًا وَّطَهِّرْ بَيْتِيَ لِلطَّآئِفِيْنَ وَالْقَآئِمِيْنَ وَالرُّكَّعِ السُّجُوْدِ وَاَذِّنْ فِي النَّاسِ بِالْحَجِّ (الحج 27,26:22)

اور جب ہم نے ابراہیم کے لیے (خانہ کعبہ) کی جگہ مقرر کر دی کہ میرے ساتھ کسی کو شریک نہ کرنا اور میرے گھر کو طواف کرنے والوں اور قیام کرنے والوں اور رکوع اور سجدہ کرنے والوں کے لیے پاک کیجیے اور لوگوں میں حج کے لیے پکارو۔

ایک دوسری جگہ حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل کی اس دعا کا ذکر آتا ہے۔

وَاَرِنَا مَنَاسِكَنَا (بقرہ 128:2)

ہمیں عبادت کے طریقے بتائیں اس آیت میں عبادت کے طریقوں کے لیے لفظ مناسک استعمال ہوا ہے۔ تمام احادیث میں یہی لفظ اعمال حج کے لیے استعمال کیا گیا ہے۔

مناسک حج مشرک عربوں کی رسوم نہیں تھیں بلکہ تاریخ شاہد ہے کہ یہ مذہبی رسوم قدیم زمانے سے چلی آ رہی تھیں۔ ان ہی رسوم کی تجدید حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اللہ کے حکم سے کی۔ یہی رسوم رسول کریم ﷺ کی بعثت سے قبل عربوں میں رائج تھیں اور رسول کریم ﷺ نے مکی زندگی میں انہی رسوم کو اپنایا۔ نہ تو مقامی اثرات کے تحت اور نہ عربوں کو خوش کرنے کے لیے اختیار کیا۔

بلکہ مکی زندگی میں بھی ابراہیمی سنت کی پیروی کے لیے اللہ تعالیٰ نے رسول کریم ﷺ کو حکم دیا ارشاد الٰہی ہے۔

ثُمَّ اَوْحَيْنَا اِلَيْكَ اَنِ اتَّبِعْ مِلَّةَ اِبْرَاهِيْمَ حَنِيْفًا وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ (النحل16:123)

پھر ہم نے تیری طرف وحی کی کہ ابراہیم راست کے دین کی پیروی کر اور وہ مشرکوں میں سے نہیں تھا۔

پھر ایک دوسری سورت میں جو مکی زندگی کے آخری ایام سے تعلق رکھتی ہے فرمایا۔

قُلْ اِنَّنِيْ هَدٰنِيْ رَبِّيْ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ دِيْنًا قِيَمًا مِّلَّةَ اِبْرَاهِيْمَ حَنِيْفًا وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ (الانعام6:161)

کہہ بے شک مجھ کو میرے رب نے سیدھے راستے کی طرف ہدایت دی ہے دین صحیح ابراہیم راست رو کے مذہب کی طرف اور وہ مشرکوں میں سے نہ تھا۔

تاریخ یہ بھی بتاتی ہے کہ مسلمان ہجرت کے قبل بھی بیت اللہ کا حج ادا کرتے تھے جس کی تفصیل ایک اور اعتراض کے رد میں آئے گی۔ پس رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مشرکین عرب سے مراسم حج اخذ نہیں کیے بلکہ ابراہیم علیہ السلام کی سنت کی پیروی میں اللہ تعالیٰ کے حکم سے اختیار کیے بلکہ وہ مراسم جو سنت ابراہیمی کے خلاف عربوں میں رائج ہو گئے ان کو دور کیا مثلاً کعبہ اور حج کے دوسرے مقامات پر بت رکھ دیئے گئے تھے اس طرح دو بت اساف اور نائلہ علی الترتیب صفا اور مروہ پر رکھے ہوئے تھے (جامع البیان فی تفسیر القرآن ص2 صفحہ 27-26) خود کعبہ کے اندر 360 بت رکھے ہوئے تھے فتح مکہ میں ان تمام بتوں کو رسول کریم ﷺ نے باہر پھنکوا دیا تھا۔ اس طرح ایک یہ رسم قائم ہوگئی تھی کہ قریش اور کنانہ جو اپنے آپ کو حمس کہتے تھے حج کے مناسک ادا کرتے وقت مزدلفہ ہی میں ٹھہرے رہتے تھے۔ دوسرے حجاج کے ساتھ عرفات کے میدان میں جانا باعث ہتک سمجھتے تھے یہ ایک بدعت تھی۔ اسلام چونکہ طبقاتی امتیازات کے خلاف ہے اس لیے حکم دیا کہ وہ بھی دوسرے حجاج کے ہمراہ عرفات کے میدان میں جایا کریں۔ اس طرح کعبہ کا طواف لوگ ہر مہینہ بھی کیا کرتے تھے اس رسم کو ختم کیا اسی طرح ایک یہ رسم قائم ہوگئی تھی کہ یمن سے لوگ بغیر زادراہ کے حج کے لیے روانہ ہو پڑتے تھے اور راستے میں مانگتے پھرتے تھے اسلام نے اس رسم کو بھی ختم کیا اور فرمایا۔

وَتَزَوَّدُوْا فَاِنَّ خَيْرَ الزَّادِ التَّقْوٰى (بقرہ2:197)

اور زادراہ لے لیا کرو البتہ بہترین توشہ تقویٰ ہے۔

الغرض رسول کریم ﷺ نے نہ صرف ابراہیمی سنت کے مطابق حج کے مراسم ادا کیے بلکہ وہ تمام مراسم جو سنت ابراہیم کے خلاف تھے ان کو رد کیا۔

یہ اعتراض تاریخی حقائق کے قطعاً خلاف ہے غزوہ بدر دو ہجری ماہ رمضان میں ہوا اور یہود سے آخری تنازعہ غزوہ احد کے بعد سن تین ہجری میں ہوا جبکہ کعبہ کو ہجرت سے سولہ ماہ بعد قبلہ بنایا جا چکا تھا۔ (بخاری کتاب التوحید باب 31 التوجہ نحو القبلۃ حیث کان) یعنی غزوہ بدر سے تقریباً تین ماہ قبل۔

ملت ابراہیم کی پیروی:

کعبہ کے تقدس اور اس کو قبلہ بنانے اور حج قائم کرنے کا خیال حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو مدینہ کی طرف ہجرت سے پہلے بھی موجود تھا۔

ملت ابراہیم کی پیروی کا حکم ایک مکی سورت میں آیا جو مکی زندگی کے وسط میں نازل ہوئی تھی ارشاد الٰہی ہے۔

ثُمَّ اَوْحَيْنَا اَنِ اتَّبِعْ مِلَّةَ اِبْرَاهِيْمَ حَنِيْفًا (النحل6:123)

پھر ہم نے تیری طرف وحی کی کہ ابراہیم راست رو کے دین پر چل۔

دوسری جگہ آتا ہے۔

قُلْ اِنَّنِیْ هَدٰىنِیْ رَبِّیْۤ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ دِیْنًا قِیَمًا مِّلَّةَ اِبْرٰهِیْمَ حَنِیْفًا (الانعام 161:6)

کہہ بے شک مجھ کو میرے رب نے سیدھے راستے کی طرف ہدایت دی ہے۔ دین صحیح ابراہیم راست رو کے مذہب (کی طرف)

یہ دونوں آیات مکی ہیں۔ جن میں رسول کریم ﷺ کو دین ابراہیم کی پیروی کا حکم دیا گیا ہے۔ لہٰذا مستشرقین کا یہ خیال کہ رسول کریم ﷺ کو مذہب ابراہیمی کا تصور فتح بدر کے بعد آیا بالبداہت غلط ثابت ہوتا ہے۔ یہ اعتراض تاریخی لحاظ سے غلط ہے۔

مکہ اور کعبہ کا تقدس ابتدائی وحی میں:

تاریخی واقعات کی روشنی میں مستشرقین کا یہ اعتراض بھی باطل ہے کہ رسول کریم نے فتح بدر کے بعد اپنے آپ کو مستحکم پا کر مکہ کو فتح کرنے کے لیے ساتھیوں میں کعبہ کے تقدس کو اجاگر کیا۔ قرآن مجید سے یہ واضح ہے کہ کعبہ کا تقدس ابتدائی وحی میں موجود ہے۔ نہایت ابتدائی سورۃ التین میں مکہ کو هٰذَا الْبَلَدِ الْاَمِیْنِ (آیت 3) (یہ امن والا شہر) بیان کیا گیا ہے اور سورۃ البلد میں اس کو ایک خاص شہر قرار دے کر فرمایا۔

لَاۤ اُقْسِمُ بِهٰذَا الْبَلَدِ وَاَنْتَ حِلٌّۢ بِهٰذَا الْبَلَدِ وَوَالِدٍ وَّمَا وَلَدَ (آیت 1-3)

نہیں میں اس شہر کی قسم کھاتا ہوں اور تو اس شہر میں حرمت سے آزاد کیا گیا ہے اور باپ کی اور جو اس سے پیدا ہوا۔ اس سورت میں البلد سے مراد مکہ ہے۔ مکہ کی تکریم کی وجہ سے قسم کھائی گئی ہے ایک وحی میں کعبہ کو بیت المعمور کہا گیا ہے۔ (سورۃ الطور آیت 4)

جس کے معنی ہیں وہ گھر جس کی زیارت کی جائے۔ ایک اور ابتدائی مکی وحی میں مکہ کے متعلق المسجد الحرام (بنی اسرائیل آیت 1) کے الفاظ آئے ہیں یعنی مقدس مسجد۔

مکہ اور کعبہ کی تحریم وتقدیس کے متعلق سورۃ ابراہیم میں جو مکہ کی وسطی زندگی سے تعلق رکھتی ہے۔ آتا ہے۔

وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهِیْمُ رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا الْبَلَدَ اٰمِنًا وَّاجْنُبْنِیْ وَبَنِیَّ اَنْ نَّعْبُدَ الْاَصْنَامَ...... رَبَّنَاۤ اِنِّیْۤ اَسْكَنْتُ مِنْ ذُرِّیَّتِیْ بِوَادٍ غَیْرِ ذِیْ زَرْعٍ عِنْدَ بَیْتِكَ الْمُحَرَّمِ رَبَّنَا لِیُقِیْمُوا الصَّلٰوةَ فَاجْعَلْ اَفْىِٕدَةً مِّنَ النَّاسِ تَهْوِیْۤ اِلَیْهِمْ وَارْزُقْهُمْ مِّنَ الثَّمَرٰتِ لَعَلَّهُمْ یَشْكُرُوْنَ (ابراہیم 37,35:14)

اور جب ابراہیم نے کہا اے میرے رب اس شہر (مکہ) کو امن والا بنا اور مجھے اور میری اولاد کو اس سے بچا کہ ہم بتوں کی پرستش کریں اے ہمارے رب! میں نے اپنی کچھ اولاد کو تیرے عزت والے گھر کے پاس اس وادی میں بسایا ہے جہاں کھیتی باڑی نہیں مرے رب! تاکہ وہ نماز قائم کریں سو تو کچھ لوگوں کے دلوں کو ان کی طرف مائل کر دے اور ان کو پھلوں سے رزق دے تاکہ وہ شکر کریں۔

مذکورہ تمام قرآنی آیات سے واضح ہوتا ہے کہ ہجرت سے پہلے ہی مکی سورتوں میں بیت اللہ کی تحریم وتکریم کا ذکر موجود ہے اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہجرت سے پہلے ہی قیام مکہ کے آخری دنوں میں مسلمانوں پر حج فرض قرار دے دیا اور مسلمانوں کے دلوں میں فریضہ حج ادا کرنے کی چنگاری سلگتی رہتی تھی اور اکا دکا مسلمان موقع ملنے پر حج کے مناسک ادا کرتے رہتے تھے۔ ابن ہشام اور دیگر علمائے سیر نے بیعت عقبہ ثانیہ کے موقع پر مسلمانوں کی آمد کا مقصد ادائیگی حج بیان کیا ہے ہجرت کے بعد حضرت سعد بن معاذ کعبہ کے طواف میں مصروف تھے کہ ابوجہل سے آمنا سامنا ہو گیا ابوجہل نے اسے دھمکی دی کہ تم لوگوں نے ہمارے مقابلے میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے ساتھیوں کو پناہ دے رکھی ہے اس لیے ہم تم لوگوں کا وجود مکہ میں برداشت نہیں کر سکتے اس کے جواب میں سعدؓ نے فرمایا کہ اگر تم نے ہم لوگوں کو مناسک حج کی ادائیگی سے روکا تو ہم بھی تمہارے تجارتی قافلوں کی آمد ورفت اپنے علاقوں میں روک دیں گے۔

تاریخ میں کئی ایسے واقعات ہیں جن سے واضح ہوتا ہے کہ مسلمان بیت اللہ کی زیارت اور دیگر مناسک حج ادا کرنے کو اپنی سعادت سمجھتے تھے ان کے دلوں میں محض فتح مکہ کرنے کی غرض سے مذہبی بیداری پیدا کرنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔لہٰذا یہ اعتراض کہ بیت اللہ کے تقدس اور حج کے مناسک ادا کرنے کا جذبہ مسلمانوں کے دلوں میں فتح بدر اور یہود سے تعلقات ختم ہونے کے بعد محض فتح مکہ کی غرض سے پیدا کیا گیا تھا بالکل بالبداہت باطل اور غلط ہے۔حج ہجرت سے پہلے ہی فرض قرار دے دیا گیا تھا۔

کیا اسلام نے مناسک حج یہود سے اخذ کیے؟

یہ اعتراض بھی تاریخی حقائق کے منافی ہے۔جیسا کہ پہلے تاریخی لحاظ سے یہ ثابت کیا جا چکا ہے کہ عرب میں بیت اللہ کی زیارت اور دیگر رسوم قدیم عرصہ دراز سے جاری تھے۔عربوں نے اس نبی سے سیکھے جس نے پہلے یہ اللہ کا گھر تعمیر کیا تھا۔آخر کار حادثات زمانہ سے بیت اللہ مسمار ہو گیا۔پھر اللہ کے حکم سے حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت اسماعیل علیہ السلام نے از سر نو تعمیر کیا۔قدیم مذہبی رسوم کے ساتھ مزید رسوم کی تعلیم دی وہ رسوم عرب میں رائج ہو گئیں عربوں میں حج کی وہی رسوم رائج تھیں جو بیت اللہ کے پہلے معمار نبی نے سکھائیں بعد ازاں حضرت ابراہیم نے کچھ مزید اضافہ کے ساتھ عربوں کو تعلیم دی۔انہی رسوم کو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے رائج کیا جو رسوم بدعت تھیں ان کو باطل قرار دیا۔لہٰذا حج کی رسوم (مناسک) یہود سے مستعار نہیں۔

اگر یہود اور اسلام کی رسومات میں کوئی مماثلت پائی جاتی ہے تو اس کی وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ دونوں شاخیں بنو اسماعیل اور بنو اسحاق حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ہیں۔دونوں کا معلم ایک ہی ہے۔لہٰذا دونوں شاخوں میں اس عبادت کی مماثلت پائی جاتی ہے تو فطری امر ہے۔

یہ مفصل بحث ہو چکی ہے کہ تمام ادیان کا سرچشمہ ایک ہے اس لیے اگر مختلف ادیان میں تعلیمات میں کوئی مماثلت اور اشتراک پایا جاتا ہے تو یہ فطری اور لازمی امر ہے۔یہ مذاہب کی سچائی کی علامت ہے کہ تمام مذاہب ایک ہی اصل کی مختلف شاخیں ہیں۔

......☆......

تحویل قبلہ یہود کا رسول کریم ﷺ کو نبی نہ ماننے کی وجہ سے ہوا

اعتراض: تحویل قبلہ، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہود کا نبی نہ تسلیم کرنے کی وجہ سے کیا گیا (ابن وراق ص38)

جواب: ابن وراق کا یہ خیال ہے کہ جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم یہود کی طرف سے (وہ) نبی تسلیم کرنے سے مایوس ہو گئے اور فتح مکہ کے لیے نئے اتحادیوں کی ضرورت پیش آئی۔تو آپ ﷺ نے ایک بہتر موقعہ پایا کہ آپ نے یروشلم کی بجائے بیت اللہ کو قبلہ بنا لیا ابن وراق لکھتا ہے۔

He knew that he had a good chance enventually capturing Macca with all its historic association (38)

یہ اعتراض بھی اسلامی تاریخ اور نبوت کی صحیح روح نہ سمجھنے کی وجہ سے کیا گیا ہے۔مستشرقین اہل قلم نے جو اعتراض جس نظریہ پر قائم کیا ہے وہ بے بنیاد ہے۔نبی وہی کام کرتا ہے جس کا حکم اللہ تعالیٰ کی طرف سے آتا ہے۔اللہ تعالیٰ اپنی حکمت سے اوامر اور نواہی بتدریج نازل

کرتا ہے۔اسی حکمت کے تحت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر احکام نازل ہوئے۔

پہلی یہ بات غلط ہے کہ جب یہود نے رسول کریم ﷺ کو (وہ) نبی تسلیم نہ کیا اور ان کی طرف سے مایوس ہو گئے تو پھر بیت المقدس (یروشلم) کی بجائے بیت اللہ (مکہ) کو قبلہ قرار دے دیا۔جب رسول کریم ﷺ مدینہ آئے تو یہود کے تعاون سے مدنی ریاست میں امن قائم رکھنے کے لیے میثاق مدینہ قائم کیا اور یہود کے ساتھ تعلقات اچھے تھے اور ہجرت کے 16 ماہ بعد تحویل قبلہ بنانے کا حکم آیا۔یہود کے ساتھ تعلقات میں خرابی غزوہ احد کے بعد آنی شروع ہوئی تھی اور تعلقات بگڑتے گئے تاریخ یہ بتاتی ہے کہ اس خرابی کی وجہ بھی خود یہود تھے۔ الغرض یہود سے تعلقات خراب ہونے کی وجہ سے یا یہود کا رسول کریم ﷺ کو نبی نہ تسلیم کرنے کی وجہ سے تحویل قبلہ نہیں ہوا۔ بلکہ ہجرت کے 16 ماہ بعد ہی تحویل قبلہ کا حکم آ گیا تھا۔

تحویل قبلہ کے حکم کا تعلق فتح مکہ سے نہیں ہے۔تحویل قبلہ سے اہل مکہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسم کے کوئی معاون و مددگار نہیں بن گئے تھے کہ رسول کریم ﷺ کے لیے فتح کرنا آسان ہو جاتا۔وہ ویسے ہی دشمن تھے جیسے ہجرت سے پہلے تھے۔تحویل قبیلہ ہجرت کے دوسرے سال ہوتا ہے اس کے بعد کئی غزوات ہوئے۔آخر 8 ہجری کو فتح مکہ ہوا۔لہٰذا تحویل قبلہ کا فتح مکہ سے کوئی تعلق نہیں۔یورپین اہل قلم محض عقل کے گھوڑے دوڑا کر دور کی کوڑی ملاتے ہیں۔

جب اللہ کے حکم سے حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت اسماعیل علیہ السلام نے بیت اللہ از سر تعمیر کیا تھا۔خدا کا یہ ازلی فیصلہ تھا کہ اس قدیم گھر کو عبادت کے لیے قبلہ بنایا جائے۔حضرت اسماعیل علیہ السلام کی نسل سے ایک موعود نبی (حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم) بھیجے۔چنانچہ اس ازلی فیصلہ کے تحت رسول کریم ﷺ مبعوث ہوئے اور اللہ تعالیٰ نے وہ گھر جس کو حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت اسماعیل علیہ السلام نے از سر نو بنایا تھا۔اس کو قبلہ قرار دیا۔

رسول کریم ﷺ کی ابتدائی (مکی) وحی میں بھی بیت اللہ کی تکریم و تحریم کا ذکر موجود ہے بیت اللہ کی تکریم و تحریم کا خیال مدینہ میں پیدا نہیں ہوا تمام عرب اسی گھر کو اپنا ملجا و مامن تسلیم کرتے تھے اس لیے ضروری تھا کہ عبادت کا قبلہ بیت اللہ کو ہی قرار دیا جاتا۔

مکہ میں تحویل قبلہ کا حکم کیوں نازل نہیں ہوا:

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو تحویل قبلہ کا حکم مکہ میں نہیں ملا جب آپ مشرکین کے اندر رہتے تھے۔اس وقت کہا جا سکتا تھا کہ آپ عربوں کو اپنے ساتھ ملانے کا منصوبہ بنا رہے ہیں لیکن مدینہ آنے کے بعد جب یہود کے ساتھ اچھے تعلقات تھے اور مشرکین مکہ کو اپنے ساتھ ملانے کا کوئی امکان نہیں تھا اور کئی جنگیں بھی ہوئیں تو نبی کریم ﷺ پر تحویل قبلہ کا حکم نازل کیا۔آپ اپنی مرضی سے کوئی کام نہیں کرتے تھے۔ جب آپ مکہ میں ہی تھے ان کی خواہش تھی کہ بیت اللہ کو قبلہ بنایا جائے لیکن آپ ﷺ کی خواہش کے مطابق وحی نازل نہیں ہوئی۔یہ اس بات کی دلیل ہے کہ آپ ﷺ پر وحی آپ کی خواہش کے مطابق نازل نہیں ہوتی تھی۔

......☆......

ذبح اسماعیل علیہ السلام (چھری نے کاٹ نہ کی)

اعتراض: ابراہیم کو کہا بیٹا ذبح کر۔ چھری نے کاٹ نہ کی۔ ایک دنبہ بدست جبرائیل بہشت سے بھیج دیا اسماعیل کی گردن تانبہ کی بن گئی یا کٹ جاتی تو پھر مل جاتی یہ دنبہ ہابیل والا تھا جو دوبارہ زندہ ہوا ترک اسلام مصنفہ دھرم پال سوال 64)

جواب: قرآن مجید میں صرف حضرت ابراہیم علیہ السلام کو ذبح کا حکم ہوتا ہے باقی اعتراضات جھوٹ یا لاعلمی پر مبنی ہیں قرآن مجید میں آتا ہے۔

فَلَمَّا بَلَغَ مَعَهُ السَّعْيَ قَالَ يٰبُنَيَّ اِنِّيْٓ اَرٰى فِي الْمَنَامِ اَنِّيْٓ اَذْبَحُكَ فَانْظُرْ مَاذَا تَرٰى قَالَ يٰٓاَبَتِ افْعَلْ مَا تُؤْمَرُ سَتَجِدُنِيْٓ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ مِنَ الصّٰبِرِيْنَ فَلَمَّآ اَسْلَمَا وَ تَلَّهٗ لِلْجَبِيْنِ وَنَادَيْنٰهُ اَنْ يّٰٓاِبْرٰهِيْمُ قَدْ صَدَّقْتَ الرُّءْيَا اِنَّا كَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ اِنَّ هٰذَا لَهُوَ الْبَلٰٓؤُا الْمُبِيْنُ وَفَدَيْنٰهُ بِذِبْحٍ عَظِيْمٍ وَتَرَكْنَا عَلَيْهِ فِي الْاٰخِرِيْنَ سَلٰمٌ عَلٰٓى اِبْرٰهِيْمَ كَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ اِنَّهٗ مِنْ عِبَادِنَا الْمُؤْمِنِيْنَ (الصّفت 37:102-111)

سو جب وہ بلوغت کو پہنچا اس نے کہا اے میرے بیٹے میں نے خواب دیکھا ہے کہ میں تجھے ذبح کرتا ہوں۔ تو دیکھ تیری کیا رائے ہے اس نے کہا اے میرے باپ جو کچھ تجھے حکم دیا جاتا ہے کر، تو مجھے اگر اللہ چاہے صبر کرنے والوں میں سے پائے گا سو جب دونوں نے سر تسلیم خم کیا اور اسے ماتھے کے بل لٹایا اور ہم نے اسے آواز دی کہ اے ابراہیم! تو نے خواب سچ کر دکھایا اسی طرح ہم نیکی کرنے والوں کو بدلہ دیتے ہیں بے شک یہ ایک کھلی آزمائش تھی اور ہم نے ایک بھاری قربانی کا فدیہ دیا اور ہم نے پچھلے لوگوں میں اس (ذکر خیر) کو باقی رکھا ابراہیم پر سلام اس طرح ہم نیکی کرنے والوں کو بدلہ دیتے ہیں وہ ہمارے مومن بندوں میں سے ہے۔

قرآن مجید کے الفاظ "اِنِّيْٓ اَرٰى فِي الْمَنَامِ اَنِّيْٓ اَذْبَحُكَ" بتا رہے ہیں کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے رویا میں بیٹے کو ذبح کرتے ہوئے دیکھا ہے۔ یہ نہیں دیکھا کہ ذبح کر دیا ہے۔ تاریخ سے یہ واضح ہوتا ہے کہ اس وقت حضرت اسماعیل علیہ السلام کی عمر کوئی 13 سال تھی اور حضرت ابراہیم کی عمر ننانوے سال تھی۔ جب حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنی رویا اپنے بیٹے کو سنائی تو اس نے خدا کے حکم کے سامنے سر تسلیم کر دیا اور باپ نے ذبح کرنے کے لیے بیٹے کو ماتھے کے بل لٹایا اور خدا کے حکم کے مطابق ذبح کرنے ہی لگے تھے تو اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو پکارا کہ اے ابراہیم تو نے رویا سچ کر دکھایا ہے اور اس کے بدلے ایک مینڈھا قربان کر دے۔ فدیہ کو عظیم اس وجہ سے کہا کہ وہ یادگار کے طور پر ہمیشہ کے لیے قرار پائی جانے والی تھی یہ واقعہ عرفان سے بھرا ہوا ہے اور پڑھنے والوں کو خدا کے حکم کے سامنے سر تسلیم کرنے کا سبق دے رہا ہے اس پر اعتراض وہی کرتا ہے جس کا دل تعصب سے سیاہ ہو چکا ہو۔ عقل کند ہو چکی ہو۔ ضمیر مردہ ہو چکا ہو۔

قربانی پر بھی اعتراض کیا جاتا ہے اس کا جواب سیرت سید البشر حصہ سوم جز اول ص 179 پر دیا جا چکا ہے مختصراً عرض کر دیتا ہوں۔

تاریخ یہ بتاتی ہے کہ قربانی کا سلسلہ قدیم زمانہ سے چلا آ رہا ہے۔

انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا کی جلد 21 صفحہ 13 انسائیکلو بلیکا جلد 4 صفحہ 4187 تا 4240 میں ہے ایران، ہند، یونان، عرب، افریقہ، قدیم امریکہ اور روما میں قربانی کا عام رواج تھا۔

اسی طرح انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا جلد 1 ص میں ہے کہ کنعانیوں میں جو قدیم باشندے فلسطین کے تھے انسانی قربانی کا رواج تھا۔

قدیم زمانہ سے قربانیاں رضا الٰہی، کفارہ معاصی، ازالہ غضب اصنام کے لیے، غریب کی غربت، شاعر کی قوت بڑھانے اور بیمار کی شفا واسطے ہوا کرتی تھیں۔ بابلی لوگ قیدیوں میں ایک انسان کی قربانی اور افریقہ میں حسین آدمی کی قربانی ہوتی تھی۔

تمام مذاہب کی کتب میں مختلف قسم کی قربانیوں کا ذکر ہے۔ عہد نامہ، گنتی 6 باب 10 اور پیدائش 8 باب 20، 12 باب 8، 2 تاریخ 7 باب 5، اسلاطین 8 باب 5 منوسمرتی باب 5 اکتیسویں سطر۔ مسیحی دین میں مسیح علیہ السلام نے قربانی کی بہت تاکید کی۔

دھرم پال نے جن الفاظ میں اعتراض کیا ہے" چھری نے کاٹ نہ کی۔ ایک دنبہ بدبست جبرائیل بہشت سے بھیج دیا اسماعیل کی گردن تانبہ کی بن گئی یا کٹ جاتی تو پھر مل جاتی یہ دنبہ ہابیل والا تھا جو دوبارہ زندہ ہوا۔ یہ تمام خیال دھرم پال کے اپنے ذہن کے ایجاد کردہ ہیں۔ قرآن اور حدیث میں ان کا کہیں بھی ذکر نہیں۔ یہ دھرم پال کی من گھڑت کہانی ہے۔

......☆......

حجرہ اسود پر اعتراض (لوگوں کے گناہوں کی وجہ سے سیاہ ہو گیا)

اعتراض: ایک اور اعتراض حجر اسود پر کیا جاتا ہے ہند وادب (ترک اسلام مصنفہ دھرم پال سوال نمبر 5) کے علاوہ عیسائی مخالفین اور مستشرقین نے بھی حجر اسود کو ہدف تنقید بنایا ہے (ابن وراق "میں مسلمان کیوں نہیں" ص 41)

ابن وراق نے حجر اسود کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ خانہ کعبہ کے کونے کے نشان کے لیے حضرت اسماعیل علیہ السلام ایک پتھر کی تلاش میں نکلے ان کو جبرائیل ملے۔ انہوں نے حجر اسود دیا۔ اس وقت وہ دودھ سے زیادہ سفید تھا بعد میں اس کو چھونے والے لوگوں کے گناہوں کی وجہ سے سیاہ ہو گیا۔ یہ بھی یہودی ادب سے مستعار ہے۔

جواب: اگر کسی مسلمان مصنف نے حجر اسود کو بوسہ دینے سے لوگوں کے گناہوں کا دور ہونا اور پتھر کا رنگ بسبب گناہوں کے سیاہ ہونا لکھا ہے تو اس تحریر کو سامنے رکھ کر اسلام کو ہدف تنقید بنانا سراسر زیادتی اور علمی غلطی اور کوتاہی ہے۔ قرآن مجید میں نہ حجر اسود کا ذکر ہے اور نہ بوسہ دینے والے گناہگاروں کے گناہوں کی وجہ سے سیاہ ہونے کا ذکر ہے۔ یہ ایک من گھڑت کہانی ہے۔ اسی طرح نہ کوئی ثقہ حدیث پائی جاتی ہے کہ یہ پتھر بہشت سے بھجوایا گیا تھا۔

جس زمانہ سے کعبہ تعمیر ہوا ہے اسی زمانہ سے حجر اسود بھی وہاں موجود ہے حجر اسود بیت اللہ کے زمانے کا پتھر ہے اور حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت اسماعیل علیہ السلام کی از سر نو تعمیر سے پہلے کا موجود ہے۔ لہٰذا یہ کہنا کہ حضرت اسماعیل علیہ السلام کو حضرت جبرائیل نے دیا تھا۔ تاریخی طور پر غلط ہے۔

حجر اسود ایک بن گھڑا پتھر ہے چونکہ عرب میں، ناتراشیدہ پتھروں، درختوں اور ریت کے تودوں کی پرستش کی جاتی تھی اس واسطے بیت اللہ کے کونے میں بن گھڑا پتھر رکھا گیا۔ تاکہ اس کی پرستش کا خیال دل میں نہ آئے تاریخ بتاتی ہے کہ کسی زمانہ میں بھی بیت اللہ اور حجر اسود کی پرستش نہیں کی گئی۔ یہ پتھر دراصل ایک تصویری زبان کی علامت ہے۔ ہر زمانہ میں تصویری زبان کا معمول رہا ہے سکندر اور دارا کے قصے میں تصویری زبان کی گفتگو مشہور ہے عیسائی بھی یہ تسلیم کرتے ہیں یسوع کے بارہ پتھر بارہ حواریوں کی طرف اشارہ کرتے ہیں یہودی قربانی کو مسیح کی پھانسی کی تصویری علامت بتاتے ہیں حتیٰ کہ ختنہ کو بھی عیسیٰ کے قتل کا نشان کہتے ہیں اسی طرح پولا ہلا ناحس کی نسبت احبار 23 باب 10 میں

حکم ہے مسیح کا جی اٹھنا مراد لیتے ہیں۔ لہٰذا حجر اسود کی شکل میں یہ تصویری زبان حضرت مسیح کی اس پیشگوئی کی طرف اشارہ کر رہی ہے وہ پتھر جسے معماروں نے رد کیا کونے کا سرا ہو گیا۔ (زبور 23:118) جس پتھر کو راج گیروں نے ناپسند کیا وہی کونے کا سرا ہوا۔'' (متی: 42:21) پیشگوئی میں اس پتھر سے مراد حضرت اسماعیل تھے جن کو بنی اسرائیل نے رد کیا تھا اس کے کونے کا سرا ہونے میں اشارہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف ہے جو ساری دنیا کے لیے نبی ہوئے۔ پیشگوئی کے الفاظ ''جو کوئی اس پر گرے گا چور چور ہو گا جس پر گرے گا اسے پیس ڈالے گا'' ظاہر کرتے ہیں کہ اس پتھر سے مراد کوئی عظیم ہستی ہے جو اس کی مخالفت میں اٹھے گا وہ تباہ و برباد ہو جائے گا اور جس کی مخالفت میں وہ خود ہتھیار اٹھائے گا وہ بھی تباہ و برباد ہو جائے گا۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی دفاع جنگیں ان الفاظ کی صداقت کو ظاہر کرتی ہیں۔ بیت اللہ کے کونے میں بن گھڑا سیاہ پتھر کی روحانی تعبیر یا تفسیر یہ کی جائے گی کہ نبوت اور رسالت کی عظیم الشان عمارت جو انبیاء نے تعمیر کی تھی اس میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی گرامی ذات کونے کی آخری اینٹ ہے وہ پایہ تکمیل کو پہنچی۔ ان کی بیعت اللہ تعالیٰ بیعت اور ان کی اطاعت اللہ تعالیٰ کی اطاعت ہے جو کچھ وہ بولے گا الٰہی بلانے سے بولے گا رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہی تفسیر فرمائی مشکوٰۃ میں ہے فرمایا۔

مَثَلِي وَمَثَلُ الْاَنْبِيَآءِ كَمَثَلِ قَصْرٍ اَحْسَنَ بُنْيَانُهٗ وَتَرَكَ مِنْهُ مَوْضَعَ اللَّبِنَةِ اِلٰى اَنْ قَالَ فَكُنْتُ اَنَا سَدَدْتُ مَوْضَعَ اللَّبِنَةِ وَفِي رِوَايَةٍ فَاَنَا تِلْكَ اللَّبِنَةُ

یعنی میری اور دوسرے نبیوں کی مثال اس محل کی ہے وہ بہت خوب صورت بنایا گیا اور ایک اینٹ کی جگہ اس میں خالی رکھی گئی پس میں وہی اینٹ ہوں۔

اسلام کی سچائی کی یہ بھی دلیل ہے کہ مخالفین کی طرف سے اسلام پر جب بھی کوئی اعتراض کیا جاتا ہے وہاں حکمت کی باتوں کا خزانہ نکل آتا ہے۔ میں تو یہ کہوں گا کہ معترضین کے اعتراضات کی وجہ سے پوشیدہ معرفت کے نکات ظاہر ہوئے ہیں اور اسلام کے ادب میں اضافہ ہوا ہے۔

......☆......

عقل اور اسلام (اسلام عقل کے خلاف ہے)

اعتراض: ''اسلام عقل کے خلاف ہے'' (ترک اسلام مصنفہ دھرم پال قسم اول) یہی اعتراض متعدد مستشرقین نے بھی کیا ہے۔

جواب: جب ہم اس اعتراض کا قرآن مجید اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال کی روشنی میں جائزہ لیں تو یہ اعتراض محض تعصب، اسلام دشمنی اور کم علمی کا نتیجہ معلوم ہوتا۔ اس کے برعکس حقائق کی روشنی میں اسلام عقل، علم اور سائنس کا مذہب ہے۔

دنیا میں کوئی مذہب ایسا نہیں کہ جس نے عقل اور تفکر سے کام لینے پر اتنا زور دیا ہے جتنا کہ اسلام نے دیا۔ عقل، فہم اور تفکر کے مختلف گوشوں اور پہلوؤں کو قرآن مجید نے مختلف الفاظ میں واضح کیا ہے۔

لفظ عقل سے:

اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ (بقرہ 44:20)

کیا تم عقل سے کام نہیں لیتے۔

لفظ تفکر سے:

اِنَّ فِی ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّتَفَکَّرُوْنَ (الرعد 3:13)

اس میں غور و فکر کرنے والوں کے لیے نشانیاں ہیں۔

لفظ تدبر سے:

اَفَلَا یَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ اَمْ عَلٰی قُلُوْبٍ اَقْفَالُهَا (محمد 24:47)

یہ قرآن پر غور نہیں کرتے؟ کیا دلوں پر تالے پڑے ہیں۔

لفظ شعور سے:

یُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَمَا یَخْدَعُوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَهُمْ وَمَا یَشْعُرُوْنَ (البقرہ 9:20)

وہ اللہ کو اور ان لوگوں کو جو ایمان لائے دھوکا دینا چاہتے ہیں اور سوائے اپنے آپ کے کسی کو دھوکا نہیں دیتے اور وہ نہیں سمجھتے۔

لفظ حکمت سے:

وَیُعَلِّمُکُمُ الْکِتٰبَ وَالْحِکْمَةَ (البقرہ 151:2)

(یہ رسول) تمہیں کتاب اور حکمت و دانائی کی تعلیم دیتا ہے۔

دوسری جگہ آتا ہے۔

یُّؤْتِی الْحِکْمَةَ مَنْ یَّشَآءُ وَمَنْ یُّؤْتَ الْحِکْمَةَ فَقَدْ اُوْتِیَ خَیْرًا کَثِیْرًا (البقرہ 269:2)

جسے چاہتا ہے حکمت دیتا ہے جسے حکمت اور دانائی دی گئی اسے بے شمار بھلائیاں مل گئیں۔

لفظ لب سے:

وَمَا یَذَّکَّرُ اِلَّآ اُولُوا الْاَلْبَابِ (البقرہ 269:2)

اہل عقل ہی نصیحت حاصل کرتے ہیں۔

لفظ بصیرت سے:

اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ (القصص 72:28)

کیا تم بصیرت سے کام نہیں لیتے۔

لفظ فقہ سے:

لَوْ کَانُوْا یَفْقَهُوْنَ (التوبہ 81:9)

کاش وہ سمجھ سے کام لیتے۔

لفظ متوسم سے:

اِنَّ فِی ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ لِّلْمُتَوَسِّمِیْنَ (الحجر 75:15)

اس میں فراست والوں کے لیے نشانیاں ہیں۔

کائنات اور غور وفکر کی دعوت:

اللہ تعالیٰ نے کائنات میں تعقل اور تفکر کی تعلیم دی تا کہ انسان تخلیق کائنات میں غور وفکر کر کے اس کو تسخیر کر سکے۔ کیونکہ تسخیر کائنات میں انسانی ترقی کا راز مضمر ہے۔ ارشاد الٰہی ہے۔

اِنَّ فِی خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَ اخْتِلَافِ الَّیْلِ وَالنَّهَارِ لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی الْاَلْبَابِ الَّذِیْنَ یَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِیٰمًا وَّقُعُوْدًا وَّ عَلٰی جُنُوْبِهِمْ وَیَتَفَكَّرُوْنَ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا (آل عمران 3:190,191)

آسمانوں اور زمین کے پیدا کرنے میں اور رات اور دن کے ایک دوسرے پیچھے آنے میں عقل والوں کے لیے نشانیاں ہیں جو اللہ کو یاد کرتے ہیں کھڑے اور بیٹھے اور اپنے پہلوؤں پر اور آسمانوں اور زمین کی تخلیق میں غور وفکر کرتے ہیں اے ہمارے رب تو نے اسے بے سود نہیں پیدا۔

دوسری جگہ آتا ہے۔

اِنَّ فِی خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّیْلِ وَالنَّهَارِ وَالْفُلْكِ الَّتِیْ تَجْرِیْ فِی الْبَحْرِ بِمَا یَنْفَعُ النَّاسَ وَمَا اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَآءِ مِنْ مَّآءٍ فَاَحْیَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا وَبَثَّ فِیْهَا مِنْ كُلِّ دَآبَّةٍ وَّتَصْرِیْفِ الرِّیٰحِ وَالسَّحَابِ الْمُسَخَّرِ بَیْنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّعْقِلُوْنَ (البقرہ 2:164)

یقیناً آسمانوں اور زمین کے پیدا کرنے میں اور رات اور دن کے ادل بدل میں اور کشتیوں میں جو سمندر میں چلتی ہیں لوگوں کو نفع دینے والی چیزیں لے کر اور پانی میں جسے اللہ نے بلندی سے اتارا اس سے زمین کو اس کی موت (ویرانی) کے بعد زندہ کیا اور اس میں سب قسم کے جانور پھیلا دیئے اور ہواؤں کے پھیرنے میں اور بادل میں جو آسمان اور زمین کے درمیان مسخر ہیں عقل والوں کے لیے نشانیاں ہیں۔

حیوانات میں تعقل اور تفکر:

ارشاد الٰہی ہے۔

وَاِنَّ لَكُمْ فِی الْاَنْعَامِ لَعِبْرَةً نُّسْقِیْكُمْ مِّمَّا فِیْ بُطُوْنِهٖ مِنْ بَیْنِ فَرْثٍ وَّ دَمٍ لَّبَنًا خَالِصًا سَآئِغًا لِّلشّٰرِبِیْنَ (النحل 16:66)

اور یقیناً تمہارے لیے مویشیوں میں ایک نصیحت آموز) سبق ہے ان کے پیٹ سے گوبر اور خون کے درمیان سے ہم تمہیں پاکیزہ دودھ پلاتے ہیں جو پینے والوں کے لیے نہایت خوشگوار ہے پھر فرمایا۔

اَفَلَا یَنْظُرُوْنَ اِلَی الْاِبِلِ كَیْفَ خُلِقَتْ (الغاشیہ 88:17)

تو کیا وہ اونٹ کو نہیں دیکھتے کیسے پیدا کیا گیا۔

نباتات میں تعقل و تفکر:

ارشاد الٰہی ہے۔

وَفِی الْاَرْضِ قِطَعٌ مُّتَجٰوِرٰتٌ وَّ جَنّٰتٌ مِّنْ اَعْنَابٍ وَّزَرْعٌ وَّنَخِیْلٌ صِنْوَانٌ وَّغَیْرُ صِنْوَانٍ یُّسْقٰی بِمَآءٍ وَّاحِدٍ وَنُفَضِّلُ بَعْضَهَا عَلٰی بَعْضٍ فِی الْاُكُلِ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّعْقِلُوْنَ (الرعد 13:4)

اور زمین ایک دوسرے سے متصل خطے ہیں، انگور کے باغات ہیں، کھیتیاں ہیں اور کھجور کے درخت ہیں اکہرے اور دوہرے سب کو

ایک ہی پانی سیراب کرتا ہے مگر مزے میں ہم ایک کو دوسرے سے بہتر بنا دیتے ہیں. یقیناً ان میں نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو عقل سے کام لیتے ہیں۔

هُوَ الَّذِیْ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً لَّكُمْ مِّنْهُ شَرَابٌ وَّمِنْهُ شَجَرٌ فِیْهِ تُسِیْمُوْنَ یُنْۢبِتُ لَكُمْ بِهِ الزَّرْعَ وَالزَّیْتُوْنَ وَالنَّخِیْلَ وَالْاَعْنَابَ وَمِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیَةً لِّقَوْمٍ یَّتَفَكَّرُوْنَ (النحل 16:10-11)

وہی ہے جس نے تمہارے لیے بلندی سے پانی اتارا۔ جس سے پینے کو ملتا ہے اور اس سے درخت پیدا ہوتے ہیں جن میں تم مویشی چراتے ہو اس (پانی) سے تمہارے لیے کھیتی اور زیتون اور کھجور اور انگور اور ہر قسم کے پھل اگاتا ہے۔ یقیناً اس میں غور و فکر کرنے والوں کے لیے نشانی ہے۔

اپنے نفس میں تفکر:

انسان کو اپنے نفس میں غور وفکر کرنے کی دعوت دی گئی ہے کہ وہ اپنی سوچ کے مراحل پر غور وفکر کرے۔ نیز انسانی تاریخ کے اہم واقعات کی بابت سوچے۔ ارشاد الٰہی ہے۔

اَوَلَمْ یَتَفَكَّرُوْا فِیْ اَنْفُسِهِمْ (الروم 30:8)

کیا انہوں نے اپنے نفس کے بارے میں غور وفکر نہیں کیا۔

فَلْیَنْظُرِ الْاِنْسَانُ مِمَّ خُلِقَ خُلِقَ مِنْ مَّآءٍ دَافِقٍ یَّخْرُجُ مِنْۢ بَیْنِ الصُّلْبِ وَالتَّرَآئِبِ (الطارق 86:5-7)

تو انسان یہی دیکھ لے کہ وہ کس چیز سے پیدا کیا گیا ہے جو پیٹھ اور سینے کی ہڈیوں کے درمیان سے نکلتا ہے۔

تاریخ اقوام عالم پر غور وفکر:

اللہ تعالیٰ نے اقوام عالم کے عروج وزوال کی تاریخ پر غور وفکر کرنے کی دعوت دی ہے۔ تاکہ عروج وزوال کے اسباب پر عمل کر کے سیدھے راستے پر گامزن ہو۔ یہی وجہ ہے قرآن مجید میں قوموں کے عروج وزوال پر اصولاً بحث کی گئی ہے۔ ارشاد الٰہی ہے۔

فَسِیْرُوْا فِی الْاَرْضِ فَانْظُرُوْا كَیْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِیْنَ (آل عمران 3:137)

تم زمین میں چلو پھرو اور دیکھو کہ (خدا کے رسولوں کو) جھٹلانے والوں کا کیا انجام ہوا۔

اَلَمْ تَرَ كَیْفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِاَصْحٰبِ الْفِیْلِ (الفیل 105:1)

کیا تو نے نہیں دیکھا کہ تیرے رب نے ہاتھی والوں کے ساتھ کیا۔

اَفَلَمْ یَسِیْرُوْا فِی الْاَرْضِ فَتَكُوْنَ لَهُمْ قُلُوْبٌ یَّعْقِلُوْنَ اَوْ اٰذَانٌ یَّسْمَعُوْنَ بِهَا فَاِنَّهَا لَا تَعْمَى الْاَبْصَارُ وَلٰكِنْ تَعْمَى الْقُلُوْبُ الَّتِیْ فِی الصُّدُوْرِ (الحج: ۴۷)

کیا یہ لوگ زمین (ملکوں) میں چلتے پھرتے نہیں پس ان کے دل ہوتے جن سے وہ سمجھتے یا کان ہوتے جن سے وہ سنتے کیونکہ آنکھیں اندھی نہیں ہوتیں بلکہ دل اندھے ہو جاتے ہیں جو سینوں میں ہیں۔

اس آیت میں بتایا گیا ہے کہ آنکھوں سے تو انسان دیکھتا ہے مگر غور وفکر نہیں کرتا جس کی وجہ سے انسان نقصان اٹھاتا ہے۔

مذکورہ بالا آیات معترضین کے اعتراض کو رد کرتی ہیں کہ قرآن مجید دنیا میں تمام پیدا کی ہوئی اشیا پر غور وفکر کرنے کی دعوت دیتا ہے تاکہ خدا کی بخشی ہوئی عقلی استعداد سے کام لے کر ان سے مستفید ہو۔ دنیا کی ہر چیز میں اللہ تعالیٰ نے انسان کے لیے فائدے رکھے ہوئے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے صرف غور وفکر کرنے کی دعوت ہی نہیں دی بلکہ غور وفکر کی استعداد کو کام میں نہ لانے کو کفران نعمت قرار دیا ہے اور عقل سے کام نہ لینے والوں کی شدید مذمت کی ہے ارشاد الٰہی ہے۔

اِنَّ شَرَّ الدَّوَآبِّ عِنْدَ اللّٰهِ الصُّمُّ الْبُكْمُ الَّذِيْنَ لَا يَعْقِلُوْنَ (الانفال 22:8)

یقیناً اللہ کے نزدیک بدترین جانور وہ بہرے گونگے ہیں جو عقل سے کام نہیں لیے۔

گویا قرآن مجید کی اصطلاح میں بہرے گونگے وہ لوگ ہیں جو عقل سے کام نہیں لیتے۔

یعنی اللہ تعالیٰ فرماتا ہے جو شخص عقل سے کام نہ لے وہ حیوانوں سے بدتر ہے۔

وَيَجْعَلُ الرِّجْسَ عَلَى الَّذِيْنَ لَا يَعْقِلُوْنَ (یونس 100:10)

اور اللہ ان لوگوں پر گندگی ڈال دیتا ہے جو عقل سے کام نہیں لیتے۔

علم کی اہمیت:

غور وفکر کے نتیجہ میں ہی علم کی شمع جلتی ہے۔ قرآن مجید میں جہاں غور وفکر کرنے کی تاکید کی ہے۔ وہاں حصول علم کی طرف توجہ دلائی ہے کیونکہ علم کے بغیر روحانی، مادی اور تمدنی ترقی ناممکن ہے۔ علم ہی وہ روشنی ہے جس سے انسان زندگی کی تاریک راہوں کو روشن پاتا ہے اور اس روشن راہ پر چل کر منزل مقصود تک پہنچ جاتا ہے۔ ارشاد الٰہی ہے۔

قُلْ هَلْ يَسْتَوِى الَّذِيْنَ يَعْلَمُوْنَ وَالَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ (الزمر:9)

کہہ دیجیے کہ علم والے اور نہ جاننے والے (جاہل) برابر ہو سکتے ہیں۔

الَّذِى عَلَّمَ بِالْقَلَمِ عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ (العلق:5،4)

جس نے آدمی کو قلم کے ذریعے علم سکھایا انسان کو وہ باتیں سکھائیں جو اس کو معلوم نہ تھیں۔

وَعَلَّمَكَ مَا لَمْ تَكُنْ تَعْلَمُ وَكَانَ فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكَ عَظِيْمًا (النساء 113:4)

(اے پیغمبر) ہم نے تم کو ان سب چیزوں کی تعلیم دے دی جن کو تم جانتے نہ تھے اور خدا کا فضل آپ پر عظیم ہے۔

وَقُلْ رَّبِّ زِدْنِى عِلْمًا (طٰہٰ 114)

(اے پیغمبر) آپ یہ دعا کیجیے اے پروردگار علم اور زیادہ کر۔

لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِى ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ (آل عمران 163:3)

یقیناً اللہ نے مومنوں پر احسان کیا جب ان میں انہیں میں سے ایک رسول بھیجا جو ان پر آیتیں پڑھتا ہے اور انہیں پاک کرتا ہے اور انہیں کتاب اور حکمت سکھاتا ہے گو وہ پہلے کھلی گمراہی میں تھے۔

اس آیت میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے دیگر فرائض منصبی کے علاوہ گمراہ لوگوں کو کتاب اور حکمت کی تعلیم دینا تھی۔ حکمت، غور وفکر اور علم کے بعد حاصل ہوتی ہے۔ یعنی وہ حکیم بھی ہیں۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کو صرف مفکر، صاحب علم ہی نہیں بنایا بلکہ حکیم بھی بنایا ہے۔

عقل وفکر اور علم کی اہمیت از روئے اقوال محمد مصطفی ﷺ

تَفَكُّرُ سَاعَةٍ خَيْرٌ مِنْ عِبَادَةِ سَبْعِيْنَ سَنَةٍ (کنوز الحقائق حرف التاء)

ایک گھڑی کی سوچ وبچار ساٹھ سال کی عبادت سے افضل ہے۔

اَلْكَلِمَةُ الْحِكْمَةُ ضَالَّةُ الْمُؤمِنِ فَحَيْثُ وَجَدَهَا فَهُوَ اَحَقُّ بِهَا (ترمذی)

حکمت کی بات مومن کی گمشدہ دولت ہے جہاں بھی ملے اس کا وہ زیادہ حق دار ہے۔

خُذِ الْحِكْمَةَ وَلَا يَضُرُّكَ مِنْ اَىِّ وَعَاءٍ خَرَجَتْ (کنوز الحقائق حرف الخاء)

تو حکمت حاصل کر جس برتن سے بھی نکلے تجھے نقصان نہیں ہوگا۔

رسول کریم کا فرمان ہے اَلْعَقْلُ اَصْلُ دِيْنِي میرے دین کی جڑ عقل ہے۔

دِيْنُ الْمَرْءِ عَقْلُهُ وَمَنْ لَا دِيْنَ لَهُ لَا عَقْلَ لَهُ (کنوز الحقائق حرف دال)

انسان کا دین اس کی عقل ہے اور جس کا کوئی دین نہیں اس کو عقل نہیں۔

يَتَفَاضَلُ النَّاسُ بِالْعَقْلِ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ (کنوز الحقائق حرف الیاء)

حسب عقل لوگوں کو دنیا وآخرت میں باہم فضیلت حاصل ہوتی ہے۔

علم کی اہمیت کے بارے میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں۔

تَعَلَّمُوا الْعِلْمَ لِاَنَّهُ مَعَالِمُ الْحَلَالِ وَالْحَرَامِ (جامع بیان العلم)

علم سیکھو اس لیے حلال وحرام میں تمیز سکھاتا ہے۔

فرمایا:

اِنَّ اللّٰهَ عَزَّوَجَلَّ اَوْحٰى اِلَيَّ اَنَّهُ مَنْ سَلَكَ مَسْلَكًا فِي طَلَبِ الْعِلْمِ سَهَّلْتُ لَهُ طَرِيْقَ الْجَنَّةِ وَفَضْلٌ فِي عِلْمٍ خَيْرٌ مِنْ فَضْلٍ فِي عِبَادَةٍ (البیہقی فی شعب الایمان، مشکوٰۃ)

بے شک اللہ عزوجل نے میری طرف وحی کی ہے جو حصول علم کے لیے کسی راستہ پر گامزن ہوتا ہے میں اس لیے جنت کا راستہ آسان کر دیتا ہوں۔ علم میں جو فضیلت ہے وہ عبادت کی فضیلت سے بہتر ہے۔

وَلْيُفْشُوا الْعِلْمَ وَلْيَجْلِسُوا حَتّٰى يُعَلَّمَ مَنْ لَا يَعْلَمُ فَاِنَّ الْعِلْمَ لَا يَهْلِكُ حَتّٰى يَكُوْنَ سِرًّا (صحیح بخاری کتاب العلم)

اور عالموں کو علم پھیلانا چاہیے اور تعلیم دینے کے لیے بیٹھنا چاہیے تا کہ جو لوگ علم سے محروم ہیں ان کو تعلیم دیں اس لیے جہاں علم پوشیدہ ہو بس وہ مٹ گیا۔

اَفْضَلُ الْعِبَادَةِ طَلَبُ الْعِلْمِ (کنوز الحقائق حرف الہمزہ)

اعلیٰ عبادت علم حاصل کرنا ہے۔

فَضْلُ الْعِلْمِ خَيْرٌ مِّنْ فَضْلِ الْعِبَادَةِ وَخَيْرُ دِيْنِكُمُ الْوَرَعُ (اوسط بزار)

عبادت سے علم افضل ہے اور دین میں بہتری تقویٰ ہے۔

طَلَبُ الْعِلْمِ فَرِيْضَةٌ عَلٰى كُلِّ مُسْلِمٍ (سنن ابن ماجہ باب فضل العلماء)

ہر مسلمان پر علم حاصل کرنا فرض ہے۔

اِنَّ الْعُلَمَاءَ وَرَثَةُ الْاَنْبِيَاءِ اِنَّ الْاَنْبِيَاءَ لَمْ يُوَرِّثُوْا دِيْنَارًا وَلَا دِرْهَمًا وَلٰكِنْ وَرَّثُوا الْعِلْمَ فَمَنْ اَخَذَهٗ اَخَذَ بِحَظٍّ وَّافِرٍ (ترمذی، ابوداؤد)

علماء انبیاء کے وارث ہیں۔نبیوں نے درہم اور دینار کی میراث نہیں چھوڑی بلکہ میراث علم چھوڑی ہے جس نے اسے حاصل کر لیا اس نے بہت کچھ لے لیا۔

علوم میں ترقی:

مسلمانوں نے قرآن مجید اور فرامین رسول ﷺ کی ہدایات کی روشنی میں علمی میدان میں قدم رکھا۔علم کی کوئی ایسی شاخ نہیں۔ جس کی آب یاری نہ کی ہو۔خواہ وہ شاخ دینی علم سے تعلق رکھتی ہو خواہ وہ مادی علم سے تعلق رکھتی ہو۔ان تمام علوم پر لکھی ہوئی کتب سے آج بھی کتب خانے بھرے پڑے ہیں اور علم کی مزید راہیں کھل رہی ہیں تاریخ اس بات پر شاہد ہے کہ یورپ میں علم کی شمع انہی مسلمانوں کی علمی مساعی سے روشن ہوئی تھی اور آج یورپ اس علمی روشنی سے جگمگا رہا ہے۔اس دور کی سائنسی ترقی مسلمانوں کی علمی عرق ریزی کی مرہون منت ہے یہ ایک کھلی کتاب ہے افسوس مستشرقین اور مخالفین اسلام نے اپنی آنکھوں پر تعصب کی پٹی باندھی ہوئی ہے اور ان کی آنکھوں سے مسلمانوں کی علمی ترقی اوجھل ہے۔

.....☆.....

اسلام کی ظالمانہ تعلیم ہے

اعتراض: اسلام کی تعلیم وحشیانہ ظالمانہ ہے (ترک اسلام مصنفہ دھرم پال سوال قسم اول) یہ اعتراض مستشرقین نے مختلف انداز میں کیا ہے۔خصوصاً میور نے لائف آف محمد ﷺ میں ایک دوسرے زاویے سے اسلام کی تعلیمات کو تنقید کا ہدف بنایا ہے۔سرسید نے مفصل جواب دے دیا ہے اس کتاب میں مختصر جائزہ لیا جائے گا۔ ما توفیقی الا باللہ

جواب: مذکورہ اعتراض کے جواب میں اسلامی تعلیم کے تمام پہلوؤں پر مختصر تبصرہ ضروری ہے اس لیے قارئین کے سامنے اسلامی تعلیم کا مختصر خاکہ پیش کیا جاتا ہے۔تا کہ معلوم ہو جائے کہ اسلام کی تعلیم خیر و برکت کا مجموعہ ہے۔

عقائد اور اسلام:

اسلام نے دائرہ اسلام میں داخل ہونے کے لیے پانچ عقائد بیان کیے ہیں۔ان عقائد سے تمام امن، اخوت، مساوات، رواداری، اتحاد انسانی اور عمل صالح کا سنہری سبق ملتا ہے۔

ارشاد الٰہی ہے۔

اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَاۤ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مِنْ رَّبِّهٖ وَالْمُؤْمِنُوْنَ كُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ (البقرہ 285:2)

رسول اس پر ایمان لایا جو ان کے رب سے اس کی طرف اتارا گیا اور مومن بھی سب اللہ اور اس کے فرشتوں اور اس کی کتابوں اور اس کے رسولوں پر ایمان لاتے ہیں ہم اس کے رسولوں میں سے کسی میں تفرقہ نہیں کرتے۔

اس آیت میں تمام سماوی کتب اور تمام مذاہب کے رسولوں پر ایمان لانا جزو ایمان قرار دیا ہے۔ اسی اصول سے عالمگیر قیام امن کا پیغام ملتا ہے۔ اسی طرح اللہ پر ایمان لانا تمام مذاہب کی مشترکہ تعلیم ہے۔ اسلام کی یہ تعلیم اس بات کی واضح دلیل ہے کہ اسلام بھی اس سرچشمہ سے جاری ہوا ہے جس سے دوسرے مذاہب جاری ہوئے تھے۔ اس لیے اللہ پر ایمان لانے کی تعلیم بھی ایک عالمگیر اخوت اور مساوات کا سبق دے رہی ہے۔

قیامت پر ایمان لانے کا ذکر دوسری جگہ آیا ہے ارشاد الٰہی ہے۔

مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ (البقرہ 62:20)

یعنی جو ایمان لایا اللہ پر اور آخری دن پر (قیامت کے دن) پر اور نیک کام کیے پس ان کے لیے ان کے رب کے پاس اجر ہے۔

قرآن مجید میں قیامت پر ایمان لانے کا ذکر کثرت سے آیا ہے۔ اللہ تعالیٰ انسانوں کو یہ تعلیم دیتا ہے کہ ایک دن وہ اللہ کے سامنے پیش ہوں گے ان کے اعمال کا حساب کتاب ہوگا۔ نیک اعمال والے خدا کے فضل سے جنت میں جائیں گے اور بُرے اعمال والے دوزخ میں۔ یہ تصور تمام انسانوں کو ظلم کا راستہ اختیار کرنے سے روکتا ہے اور اچھے کام کرنے کی تعلیم دیتا ہے۔ گویا اجزائے ایمان تمام انسانوں کو پُرامن زندگی بسر کرنے اور نیک اعمال بجالانے کے راستہ پر گامزن ہونے کی تعلیم دیتے ہیں۔

دیگر مذاہب سے اسلام کو یہ خاص امتیاز حاصل ہے کہ اسلام خالص توحید کا مذہب ہے جبکہ دوسرے تمام مذاہب توحید سے خالی ہیں۔ قرآن مجید کی تمام تعلیمات کا محور ہی توحید ہے۔ قرآن مجید کے ہر صفحہ پر یہ مضمون پھیلا ہوا ہے اور ایک خالص توحید پر ایک مکمل سورت نازل کی ہے ارشاد الٰہی ہے۔

قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ اَللّٰهُ الصَّمَدُ لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُوْلَدْ وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ (اخلاص 112)

کہہ اللہ تعالیٰ ایک ہے۔ اللہ تعالیٰ بے نیاز ہے نہ اس کا کوئی بیٹا ہے اور نہ وہ کسی کا بیٹا اور اس کا کوئی ہمسر نہیں۔

اس سورت میں توحید کے تمام پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے۔ قرآن مجید میں جہاں توحید پر قائم رہنے کی تعلیم دی وہاں شرک کی تمام اقسام کا رد بھی کیا ہے۔

ارشاد الٰہی ہے۔

اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهٖ شَيْئًا وَّلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ (آل عمران 64:3)

کہ ہم اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کریں اور نہ اس کے ساتھ کسی کو شریک بنائیں اور نہ ہم میں سے کوئی کسی کو اللہ کے سوا رب بنائے۔

اس آیت میں تین قسم کے شرک کی نفی کی ہے اول خدا کے سوا کسی کی عبادت نہ کریں دوم اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرائیں سوم کسی دوسرے آدمی کو اپنا رب تسلیم نہ کیا جائے۔

شرک کی چوتھی قسم سورۂ فرقان میں بیان ہوئی ہے ارشاد الٰہی ہے۔

اَرَاَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰىهُ (43:25)

یعنی کیا تو نے اسے دیکھا جو اپنی خواہشات کو معبود بناتا ہے۔

غرض کہ شرک کی ممانعت سے قرآن مجید بھرا پڑا ہے کیونکہ شرک سے نہ صرف انسان کی روحانی موت ہوتی ہے بلکہ مادی ترقی کے

راستہ میں بھی سنگ گراں ہے قرآن مجید میں اللہ کا صرف ایک ہونا ہی بیان نہیں ہوا ہے بلکہ دوسری ننانوے صفات کا بھی ذکر ہے۔ جن سے اللہ کا تصور مکمل ہوتا ہے یہ وہ تعلیم ہے جو کسی مذہب میں نہیں پائی جاتی۔

قارئین ذرا توجہ کریں کہ عقائد اسلامی میں کون سا ظلم کا پہلو ظاہر ہوتا ہے۔ یہ تعلیم نہ صرف دوسرے مذاہب سے مماثلت رکھتی ہے بلکہ دیگر مذاہب کی تعلیم کی اصلاح بھی کرتی ہے اور ان کے مشرکانہ عقائد کو بھی رد کرتی ہے۔ اسلامی عقائد میں امن۔ اخوت اور مساوات اور رواداری کا درس پایا جاتا ہے۔

عبادت:

اسلام کی دوسری اہم تعلیم عبادت ہے۔ اسلام سے قبل خدا کی عبادت کا تصور ہی مٹ چکا تھا۔ ہر مذہب کے لوگ شرک اور الحاد کی دلدل میں پھنسے ہوئے تھے اور جو شرک سے بیزار تھے وہ آبادیوں کو چھوڑ کر جنگلوں اور ویرانوں میں خدا کی یاد میں دھونی رچائے ہوئے تھے۔ رہبانیت اختیار کر لی ہوئی تھی اسلام نے عبادت کے فرسودہ تصور پر خط تنسیخ کھینچ کر ایک ایسا نظام عبادت پیش کیا جس کے پیچھے انسان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی سنوارنے کے علاوہ روحانی زندگی بہتر بنانے کے لیے ایک عظیم فلسفہ ہے اسی فلسفہ نے مسلمانوں کو بام عروج تک پہنچا دیا۔

عبادت سے کیا مراد ہے۔ اسلام کے نزدیک عبادت احکام الٰہی پر عمل کرنے اور مناہی سے رکنے کا نام ہے۔ قارئین اعتراض کو سامنے رکھیں اور جائزہ لیں کہ خدا کے احکام پر عمل کرنے اور نواہی سے روکنے میں کون سا ظلم کا پہلو ظاہر ہوتا ہے۔

کیا یہ اعتراض محض لاعلمی اور جہالت کو ظاہر نہیں کرتا۔

اسلام نے پانچ عبادات کو فرض قرار دیا ہے اس کا مختصر خاکہ پیش کیا جاتا ہے۔ یہ پانچوں عبادات انسانوں کو یک جہتی، امن، مساوات، اخوت اور رواداری کی تعلیم دیتی ہیں۔ یہی وہ اصول ہیں جن پر عمل کرنے سے انسان اپنی زندگی بہتر بنا سکتا ہے۔

نماز:

قیام نماز پر قرآن مجید میں بہت زور دیا ہے ارشاد الٰہی ہے۔

وَاَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ وَلَا تَکُوْنُوْا مِنَ الْمُشْرِکِیْنَ (روم 31:30)

اور نماز قائم کرو اور مشرکوں میں سے نہ ہو۔

ایک دوسری جگہ مومنوں کی یہ علامت بیان کی ہے۔

وَھُمْ عَلٰی صَلَاتِہِمْ یُحَافِظُوْنَ (انعام 92:6) وہ اپنی نمازوں کی حفاظت کرتے ہیں۔

قرآن مجید میں عبادت کے اس رکن کا ذکر بار بار آیا ہے صرف دو آیات پر ہی اکتفا کیا جاتا ہے۔ اور ان کے ساتھ صرف دو احادیث کا ذکر کر دیا جاتا ہے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز کا فلسفہ بیان کرتے ہوئے فرمایا حضرت ابو ہریرہ روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ فرماتے ہوئے سنا کہ آپ ﷺ نے فرمایا: بتاؤ اگر تم میں سے کسی کے دروازے پر نہر ہو، اور وہ اس میں ہر روز پانچ دفعہ نہائے تو کیا کہتا ہے۔ اس کی میل سے کچھ باقی رہے گا صحابہ نے کہا کہ اس کی میل سے کچھ نہیں چھوڑے گا۔ فرمایا یہی پانچ نمازوں کی مثال ہے خدا اس کے ذریعے گناہوں کو مٹا دیتا ہے۔ (بخاری 9:6)

یہ حدیث اِنَّ الصَّلٰوۃَ تَنْھٰی عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْکَرِ (العنکبوت 49:29) (بے شک نماز ظاہری اور باطنی برائیوں سے روکتی ہے) کی وضاحت ہے جس طرح پانی سے بار بار نہانے سے انسان کے جسم سے میل دور ہو جاتی ہے اور جسم پاک ہو جاتا ہے اسی طرح پانچ دفعہ نماز پڑھنے سے انسان کا دل گناہوں سے پاک صاف ہو جاتا ہے۔

فرمایا:

اِنَّ الصَّلٰوۃَ مِعْرَاجُ الْمُؤْمِنِیْنَ (شرح سنن ابن ماجہ ج1 ص33)

نماز مومن کی معراج ہے۔

تمام احادیث کی کتب میں ایک مستقل باب "کتاب الصلوٰۃ" ہے جس میں نماز کے تمام پہلوؤں پر بحث کی گئی ہے۔

نماز انسانوں میں امن، اخوت، ہمدردی اور مساوات پیدا کرنے کا موجب ہے یہی وجہ ہے نماز کا ایک اہم پہلو با جماعت ادا کرنا ہے تا کہ عوام کو اجتماعی فوائد حاصل ہوں۔

زکوٰۃ:

عبادت کا دوسرا رکن زکوٰۃ ہے زکوٰۃ اپنے مال میں سے اڑھائی فیصد اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کا نام ہے۔ زکوٰۃ کی ادائیگی پر بھی قرآن اور حدیث میں بہت زور دیا گیا ہے ارشاد الٰہی ہے۔

الَّذِیْنَ یُقِیْمُوْنَ الصَّلٰوۃَ وَیُؤْتُوْنَ الزَّکٰوۃَ وَھُمْ رٰکِعُوْنَ (المائدہ 55:5)

جو نماز قائم کرتے ہیں اور زکوٰۃ دیتے ہیں اور رکوع کرنے والے ہیں۔

دوسری جگہ آتا ہے۔

وَاَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتُوا الزَّکٰوۃَ (المزمل 20:73)

اور نماز قائم کرو زکوٰۃ دو۔

نماز کا قیام اور زکوٰۃ کی ادائیگی کو اکٹھا بیان کیا گیا ہے جس کا اسلامی فلسفہ یہ ہے کہ نماز اس وقت تک خدا کے نزدیک قبولیت کا درجہ حاصل نہیں کر سکتی جب تک اپنے مال میں سے خدا کے حکم کے مطابق خرچ نہ کیا جائے۔

گویا قیام صلوٰۃ اور ایتاء زکوٰۃ لازم وملزوم ہیں۔

حضرت ابو ہریرہ کی روایت ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک اعرابی کے استفسار پر عبادت کی ترغیب اور شرک سے اجتناب کی نصیحت فرمائی اور فرمایا:

تُقِیْمُ الصَّلٰوۃَ الْمَکْتُوْبَۃَ وَتُؤَدِّی الزَّکٰوۃَ

کہ تو فرض نماز قائم کر اور زکوٰۃ دے آپ نے سوز دل کا بھی ذکر فرمایا:

حضرت جریر بن عبداللہ کہتے ہیں کہ میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے نماز قائم کرنے اور زکوٰۃ ادا کرنے اور ہر مسلمان سے خیر خواہی پر بیعت کی (بخاری کتاب الزکوٰۃ باب وجوب الزکوٰۃ)

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے عدم ادائیگی زکوٰۃ پر وعید سنائی۔ فرمایا: کوئی انسان جس کے پاس مال ہے وہ اپنے مال کا حق (زکوٰۃ) ادا نہیں کرتا اس کے گلے میں گنجے سر والے سانپ کا طوق ڈال دیا جائے گا۔ (سنن کتاب الزکوٰۃ باب التغلیظ فی حبس الزکوٰۃ)

کتب احادیث میں عدم ادائیگی زکوٰۃ پر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مختلف انداز میں تہدید فرمائی ہے جس سے زکوٰۃ کی اہمیت ظاہر ہو جاتی ہے۔

زکوٰۃ کی فرضیت کے ساتھ مصارف زکوٰۃ کی بھی تعلیم دی ہے۔ اس سے اسلام کی تعلیم کی رحمت کا پہلو واضح ہو جاتا ہے۔ ارشاد الٰہی ہے۔

اِنَّمَا الصَّدَقٰتُ لِلْفُقَرَآءِ وَالْمَسٰکِیْنِ وَالْعٰمِلِیْنَ عَلَیْھَا وَالْمُؤَلَّفَۃِ قُلُوْبُھُمْ وَفِی الرِّقَابِ وَ الْغٰرِمِیْنَ وَفِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ

وَ ابْنِ السَّبِيْلِ فَرِيْضَةً مِّنَ اللّٰهِ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ (التوبہ 60:9)

زکوٰۃ ناداروں کے لیے ہے اور مسکینوں اور اس کے کارکنوں کے لیے اور ان کے لیے جن کی تالیف قلب ضروری ہے اور غلاموں کے آزاد کرنے اور قرض داروں کے لیے اور اللہ کی راہ میں اور مسافروں کے لیے یہ اللہ کی طرف سے ضروری ٹھہرایا گیا ہے اور اللہ جاننے والا حکمت والا ہے۔

انسان کی بے چارگی کا کوئی ایسا پہلو نہیں جس کے لیے زکوٰۃ کے فنڈ سے مدد کرنا ضروری قرار نہ دیا گیا ہو۔ اسی فنڈ سے غلاموں کی آزادی کے لیے حصہ مقرر کیا گیا ہے یہ اس دور کی بات ہے جب دنیا میں غلامی کا عام رواج تھا اور غرباء کا استیصال ہو رہا تھا۔ اسلام نے صاحب حیثیت لوگوں پر ایک ٹیکس فرض قرار دے دیا جس کی ادائیگی ضروری تھی۔ کیا دنیا کے کسی مذہب میں غرباء مساکین کے لیے اس سے بڑھ کر رحمت کی تعلیم ہو سکتی ہے۔ گویا زکوٰۃ انسانی بہود اور فلاح کا ذریعہ ہے کیا یہ ظلم کی تعلیم ہے۔

روزہ (صوم):

روزہ شریعت کی اصطلاح میں صبح صادق سے غروب آفتاب تک ارادۃً کھانے پینے اور مباشرت سے رکے رہنے کا نام ہے۔ ارشاد الٰہی ہے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ (بقرہ 183:2)

اے لوگو! جو ایمان لائے ہو تم پر روزے فرض کیے گئے ہیں جس طرح ان لوگوں پر فرض کیے گئے ہیں جو تم سے پہلے تھے تا کہ تقویٰ اختیار کرو۔

اسلامی عبادات میں روزہ کی اہمیت دو وجہ سے ہے ایک تو اس وجہ سے کہ تمام عبادات ظاہری ارکان پر مشتمل ہیں جن کی ادائیگی سے وہ عبادت تمام ہوتی ہے ظاہری ارکان کی ادائیگی کی وجہ سے عابد کو ہر کوئی دیکھتا ہے لیکن روزہ کا تعلق انسان کے باطن سے ہے سوائے اللہ کے کوئی نہیں جانتا۔

روزہ سے انسان کے بہیمی جذبات دب جاتے ہیں بہیمی جذبات کے محرکات حواس خمسہ ہیں روزہ میں حواس خمسہ کو قابو میں رکھا جاتا ہے جس کی وجہ سے بہیمی جذبات دب جاتے ہیں۔ گویا روزے کے ظاہری اعمال بجا لانے کے علاوہ باطنی بہیمی خواہشات کو قابو رکھنے کا نام روزہ ہے۔ کیا انسان کے کردار کو سنوارنے کے لیے اس سے بہتر کوئی اور طریقہ ہو سکتا ہے۔ اس میں انسان کے کردار کو بہتر بنانے کا طریقہ ہی مضمر نہیں بلکہ روزہ کی وجہ سے انسان بھوک اور پیاس سے دوچار ہوتا ہے تو اس سے غرباء کی بھوک ننگ کا احساس بھی اجاگر ہوتا ہے اور ان کی مدد کے لیے جذبہ بیدار ہوتا ہے۔ یہ ہے روزہ کی رحمت کا پہلو جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اسلام کی ہر تعلیم موجب رحمت ہے۔

حج:

شریعت کی اصطلاح میں حج ضروری عبادات (مناسک) کی بجا آوری کے لیے مخصوص ایام میں بیت اللہ کا قصد کرنا ہے ارشاد الٰہی ہے۔

وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَيْهِ سَبِيْلًا (آل عمران 97:3)

اور لوگوں پر اللہ کے لیے اس گھر کا حج کرنا فرض ہے جو اس تک راہ پا سکیں۔

حج اتحاد، اخوت اور مساوات انسانی کا بہترین ذریعہ ہے۔ تمام لوگ ایک لباس میں ملبوس ہو کر مناسک حج ادا کر رہے ہوتے ہیں یہ انسانی اخوت اور مساوات کا عالمگیر مظہر ہے۔ پھر حج کی آخری رسم ایک جانور کی قربانی ہے جس میں یہ فلسفہ ہے، انسان اپنے نفسانی خواہشات کی سرکش اونٹنی کو ذبح کر دے۔ جب جانور کو ذبح کرنے کے لیے لٹایا جاتا ہے تو اس کا اپنے مالک کے سامنے کوئی انکار نہیں اسی طرح

انسان کو بھی خدا کے احکام کے سامنے اپنا سر جھکا دینا چاہیے کہ خدا کے حکم کی کسی طرح بھی نافرمانی نہ کرے۔ یہ ہے حج میں قربانی کا فلسفہ۔

اب اسلامی عبادات کے ہر پہلو پر نظر دوڑائیے کہ ہر پہلو بنی نوع انسان کے لیے رحمت لیے ہوئے ہے۔ جس پر عمل کرنے سے انسان خوشگوار زندگی بسر کر سکتا ہے۔

جہاد:

ایک عبادت جہاد ہے۔ جس پر مفصل بحث سید البشر کے تیسرے حصے جز اول میں کی جا چکی ہے یہاں صرف یہ لکھنا ضروری ہے کہ اسلامی جہاد پر مخالفین نے اعتراض کیا ہے جو جہاد کے فلسفہ کو نہ سمجھنے کی وجہ سے کیا گیا ہے۔ جہاد تلوار کے ذریعے لوگوں کو قتل کرنے کا نام نہیں جیسے معترضین خیال کرتے ہیں۔ بلکہ اسلام میں جہاد کا یہ فلسفہ ہے کہ انسان پوری کوشش کرے کہ وہ اسلام کی تعلیم کے مطابق زندگی بسر کرے اور اپنے سرکش نفس کو اسلام کی پاکیزہ تعلیم کی چھری سے ذبح کرے اور اپنے تمام جذبات کو خدا تعالیٰ کی صفات میں رنگین کرے اور اللہ تعالیٰ کا اس دنیا میں مظہر بن جائے اور اس دنیا میں پُر امن زندگی بسر کرے اور اپنی ذات سے کسی کو گزند نہ پہنچائے۔ جہاد کا یہ کتنا حسین اور خوبصورت پہلو ہے۔ جو معترضین کی نظر سے اوجھل ہے۔

جہاد کا دوسرا پہلو صرف یہ ہے کہ اگر کوئی سرکش، فساد پیدا کرنے والی قوم دوسری قوم کے ملک پر استیصال کے لیے چڑھ دوڑے تو اس کا تلوار کے ساتھ دفاع کیا جائے تا کہ سرکش قوم زمین میں فساد نہ کر سکے۔ گویا فساد کو دور کرنے کا نام جہاد ہے۔ اس پہلو میں بھی سراسر رحمت کا پہلو مضمر ہے۔

اخلاقی تعلیم:

اسلام نے ایک مکمل ضابطہ اخلاق پیش کیا ہے۔ کسی مذہب نے بھی یہ ضابطہ ہر پہلو سے مکمل پیش نہیں کیا۔ ضابطہ اخلاق ہی کسی معاشرے کے لیے صحیح بنیاد تیار کرتا ہے جس پر معاشرہ کی عمارت تعمیر کی جاتی ہے۔ اگر معاشرہ میں کوئی ضابطہ اخلاق نہیں تو معاشرہ جنگل کی شکل اختیار کر جائے گا جہاں درندوں کی حکومت ہوتی ہے۔ اسلام کا بنی نوع انسان پر بہت بڑا احسان ہے اس نے ایک مکمل ضابطہ اخلاق پیش کیا ہے اسلامی ضابطہ اخلاق کا ایمانیات اور عبادات کے ساتھ گہرا تعلق ہے۔ اسلام میں ایمانیات اور عبادات کا مقصد ہی انسان کے اعمال کو بہتر بنانا ہے۔ ارشاد الٰہی ہے۔

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ (بقرہ82:2)

اور وہ لوگ جو ایمان لائے اور اعمال صالحہ بجا لائے وہی لوگ جنت کے وارث ہیں اس میں ہمیشہ رہیں گے۔

یہ آیت ظاہر کرتی ہے کہ ایمان اور اعمال صالحہ لازم و ملزوم ہیں قرآن مجید نے تمام عبادات کا مقصد تقویٰ بیان کیا ہے یعنی لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ تا کہ تم متقی بن جاؤ۔ تقویٰ تمام اخلاق کی جڑ ہے گویا عبادات کا مقصد تقویٰ قرار دے کر تمام اخلاق فاضلہ کی نشان دہی کر دی ہے جب ایک انسان متقی بن جاتا ہے تو وہ گویا وہ تمام اخلاق حسنہ کا کامل نمونہ ہوتا ہے۔

اسلام نے اخلاق کو دو حصوں میں تقسیم کیا ہے اخلاق حسنہ اور اخلاق سیۂ۔

موٹے موٹے اخلاق حسنہ:

صدق، صبر، شرم، حیاء، احسان، احصان (پاک دامنی) امانت داری، دیانت داری ایفائے عہد، عدل، شکر، عفو، رحم، جود و کرم، ایثار، انکساری، تواضع، رفق و لطف، شجاعت، عزم و استقلال و استقامت، اعتدال، زہد و قناعت، استغناء تقویٰ، خوش کلامی چشم پوشی خدمت خلق۔

اخلاق سیئہ :

کذب، وعدہ خلافی، خیانت، کبر وغرور، حسد، خودستائی، بدظنی، بخل، بہتان طرازی، چغل خوری، ظلم، منافقت (دورخاپن) خوشامد مدح سرائی، فحش گوئی، گالی گلوچ، لعنت، تکفیر، ریا کاری (دکھاوا) حرص وطمع غیظ وغضب عیب لگانا، کاہلی، صرف اسلام نے ضابطہ اخلاق ہی نہیں بیان کیا ہے بلکہ وہ اصول بھی متعین کر دیئے جن پر چل کر انسان اخلاق حسنہ کا مالک بن سکتا ہے۔

قارئین اخلاقی ضابطہ پر بھی نگاہ دوڑائیں کیا کہیں ظلم وتعدی کا کوئی نشان ملتا ہے۔

معاشرتی تعلیم

معاشرہ کی پہلی آکائی خاندان ہے۔ اس لیے اسلام نے خاندان کے لیے ایک مکمل ضابطہ قانون دیا ہے۔ اسلام نے رہبانیت کی بجائے ازدواجی زندگی اختیار کرنا لازمی قرار دیا ہے۔ ارشاد الٰہی ہے۔

وَاَنْكِحُوا الْاَيَامٰى مِنْكُمْ وَالصّٰلِحِيْنَ مِنْ عِبَادِكُمْ وَاِمَآئِكُمْ اِنْ يَّكُوْنُوْا فُقَرَآءَ يُغْنِهِمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ (نور 32:24)

تم میں سے جو مجرد ہیں ان کے نکاح کر دو اور اپنے غلاموں اور لونڈیوں کے بھی جو صلاحیت رکھتے ہوں، اگر وہ محتاج ہوں گے تو اللہ اپنے فضل سے غنی کر دے گا اور اللہ فراخی والا علم والا ہے۔

یہ آیت رشتہ ازدواج کے قیام کی تاکید کرتی ہے تمام مرد اور عورتوں کو شادی کا حکم دیتی ہے سوائے اس کے کہ کوئی خاص وجوہ مانع نہ ہوں۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

يَا مَعْشَرَ الشَّبَابِ مَنِ اسْتَطَاعَ مِنْكُمُ الْبَاءَةَ فَلْيَتَزَوَّجْ (بخاری کتاب النکاح جلد 3 صفحہ 170)

اے جوانوں کے گروہ جو تم سب سے نفقہ و مہر دینے کی طاقت رکھتا ہے اسے نکاح کرنا چاہیے۔

ایجاب وقبول، گواہ اور حق مہر ضروری قرار دے کر قرآن مجید نے نکاح کو میثاق غلیظ قرار دیا ہے۔

عرب، دیگر مذاہب اور ممالک میں نکاح میں آنے والی عورتوں کی کوئی تعداد مقرر نہ تھی اسلام نے ایک حد مقرر کی۔ اگر ملکی یا خاندانی مجبوری ہو تو چار تک شادیاں کی جاسکتی ہیں ارشاد الٰہی ہے۔

وَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تُقْسِطُوْا فِي الْيَتٰمٰى فَانْكِحُوْا مَا طَابَ لَكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ مَثْنٰى وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تَعْدِلُوْا فَوَاحِدَةً (النساء 3:4)

اور اگر تمہیں خوف ہو کہ یتیموں کے بارے میں انصاف نہ کر سکو گے تو ایسی عورتوں سے نکاح کر لو جو تمہیں پسند ہوں دو دو اور تین تین اور چار چار اور اگر تمہیں خوف ہو کہ عدل نہ کر سکو تو ایک ہی۔

یہ آیت ظاہر کرتی ہے کہ ضرورت اور شرائط کے ساتھ چار بیویوں تک اجازت ہے۔ اگر تاریخ کا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہو جاتا ہے کہ بعض اوقات ملک میں ایسے حالات پیدا ہو جاتے ہیں جن کی وجہ سے مردوں کو ایک سے زیادہ شادیاں کرنا پڑ جاتی ہیں۔ مثلاً جنگ ہو، جس میں زیادہ مرد قتل ہو جائیں ملک میں مردوں کی تعداد کم ہو جائے اور عورتوں کی تعداد بڑھ جائے ایسے موقعوں پر ایک سے زیادہ شادیاں کرنا ضروری ہو جاتا ہے اگر ایسا نہ کیا جائے تو ملک میں بدکاری پھیل جائے گی بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ ایک بیوی سے اولاد پیدا نہیں ہوتی۔ یا بیوی بیمار ہو جاتی ہے اور اولاد پیدا کرنا اس کی صحت کے لیے مضر ہے تو خاوند دوسری شادی کر سکتا ہے۔ بہر حال اسلام چار کی اجازت دیتا ہے حکم

نہیں دیتا بغیر ضرورت کے دوسری شادی کرنا اسلام کے نزدیک پسندیدہ عمل نہیں۔

تعدد ازدواج پر اس کتاب میں الگ عنوان کے تحت مفصل بحث آئے گی اسلام نے عائلی جھگڑوں سے بچنے کے لیے معاہدہ نکاح کا اعلان کرنے کا حکم دیا ہے تاکہ لوگوں کو معلوم ہو جائے کہ یہ جوڑا اب شریعت کے مطابق زندگی بسر کرے گا۔ اسلام خفیہ نکاح کو جائز قرار نہیں دیتا۔ مرد اور عورت کا تعلق دوسروں سے مخفی رکھا جائے اس کو زنا اور بدکاری قرار دیا گیا ہے۔ ارشاد الٰہی ہے۔

مُحْصِنِيْنَ غَيْرَ مُسَافِحِيْنَ وَلَا مُتَّخِذِىْ اَخْدَانٍ (مائدہ 5:5)

یعنی نکاح سے یہ غرض ہے کہ تم شرعی پابندی میں رہنے والے ہو۔ نہ کھلی بدکاری کرنے والے اور نہ یارانہ کے طور پر عورتوں کو رکھنے والے۔

اس آیت سے واضح ہو جاتا ہے کہ اسلام میں خفیہ نکاح کی ممانعت ہے جو مرد مخفی نکاح کا مرتکب ہوتا ہے اور لوگوں کی نظر سے اوجھل رکھتا ہے اسلام نے اس کو یارانہ قرار دیا ہے یارانہ زنا کے زمرہ میں آتا ہے۔ اسی لیے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''نکاح کو مشتہر کرو اور نکاح مسجدوں میں کرو۔ یعنی جہاں لوگوں کا اجتماع ہوتا ہے اور اس کے لیے دف بجاؤ تاکہ سب لوگوں کو پتہ لگ جائے۔ (مشکوۃ 4:13 فصل 2)

اسلام نے نکاح کے بعد زوجین پر حقوق اور ذمہ داریاں عائد کی ہیں۔ اسلام پہلا دین ہے جس نے عورتوں کے حقوق مقرر کیے ہیں۔ ارشاد الٰہی ہے۔

وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِىْ عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ (البقرہ 2:228)

اور ان (عورتوں) کے حقوق ویسے ہی ہیں جیسے ان پر (مردوں کے) حقوق ہیں۔

اور عورت کو گھر کے اندر وہی حیثیت دی گئی ہے جو ایک حاکم کو حاصل ہوتی ہے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تم میں سے ہر ایک حاکم ہے اور ہر ایک سے ان کے متعلق جن کی نگرانی اس کے سپرد کی گئی ہے پوچھا جائے گا۔ بادشاہ ایک حاکم ہے اور مرد اپنے گھر کے لوگوں پر حاکم ہے اور عورت اپنے خاوند کے گھر اور اس کی اولاد پر حاکم ہے۔ (بخاری 91:67)

آپ ﷺ نے ایک صحابی کو فرمایا: ''تیرے جسم کا تجھ پر حق ہے اور تیری روح کا تجھ پر ایک حق ہے اور تیری بیوی کا تجھ پر ایک حق ہے۔'' (بخاری 9:67)

اسی طرح مرد پر یہ لازم ہے کہ وہ اپنے ذرائع کے مطابق بیوی کی سکونت اور اخراجات کا انتظام کرے (الطلاق 7,6:65) اسی طرح اس بات پر بہت زور دیا گیا ہے کہ خاوند بیوی کے ساتھ نیک اور محبت کا سلوک کرے۔ ارشاد الٰہی ہے۔

وَعَاشِرُوْهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ (النساء 9:4)

یعنی اپنی بیویوں سے پسندیدہ طور پر میل جول رکھو۔

بعض اوقات میاں بیوی کے جھگڑے اس انتہا تک پہنچ جاتے ہیں کہ ان کا شریعت کے مطابق اکٹھے رہنا محال ہو جاتا ہے ایسی صورت میں بھی یہ حکم ہے کہ اختلافات کو ختم کرنے کی کوشش کی جائے فریقین کی طرف سے حکم مقرر کیے جائیں لیکن پھر بھی اختلافات ختم نہ ہوں تو خاوند بیوی کو طلاق دے سکتا ہے اس طرح بیوی کو بھی یہ حق حاصل ہے کہ وہ خاوند کے ساتھ کسی شرعی مجبوری کے تحت رہنا پسند نہیں کرتی۔ تو وہ خلع لے سکتی ہے اگر خاوند کو بیوی سے علیحدگی اختیار کرنے کا حق ہے تو بیوی کو بھی یہ اختیار دیا گیا ہے کہ وہ بھی خداوند سے الگ ہو سکتی ہے۔

(النساء 4 : 35, 128 البقرہ 2:228,229,230، الطلاق 65:1,2,4,5)

طلاق کے احکام:

طلاق میں فریقین کے لیے یہ سہولت پیدا کر دی گئی ہے کہ دو طلاقوں کے بعد میاں بیوی رجوع کر سکتے ہیں اگر خاوند تین طلاقیں دے دیتا ہے تو پھر حلالہ کے بغیر رجوع نہیں ہو سکتا۔

خلع احکام:

(البقرہ 2:229) احادیث سے یہ ثابت ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں بیوی نے خاوند سے آزادی حاصل کی۔ (بخاری کتاب الطلاق)

اسلام میں نکاح، طلاق اور خلع کے احکام ایسے ہیں جن سے انسانی زندگی میں آسانی پیدا ہوتی ہے اور انسان کے لیے باعث رحمت ہیں۔ ان احکام نے معاشرہ کو بگاڑ اور فساد سے بچایا ہے۔

متعہ حرام ہے:

متعہ عارضی نکاح کا نام ہے اسلام نے اس ظالمانہ فعل سے منع کیا ہے۔ متعہ نہ صرف بدکاری کے پھیلانے کا سبب ہے بلکہ اس سے عورتوں کا استیصال ہوتا ہے۔

حضرت سلمہ بن اکوع فرماتے ہیں کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے غزوہ اوطاس کے موقع پر متعہ کی اجازت تین دن کے لیے مراحمت فرمائی تھی اس کے بعد متعہ کی ممانعت فرما دی۔ (مسلم کتاب النکاح بحوالہ بلوغ المرام)

حضرت علی کا بیان ہے کہ خیبر کے موقع پر رسول کریم ﷺ نے متعہ سے منع فرمایا۔ (بخاری و مسلم کتاب النکاح بحوالہ بلوغ المرام)

حضرت علیؓ سے منقول ہے کہ خیبر کے موقع پر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے عورتوں کے متعہ سے اور پالتو گدھوں کے گوشت سے منع فرمایا۔ (بخاری، مسلم، ترمذی، نسائی، احمد، ابوداؤد، ابن ماجہ کتاب النکاح)

حضرت ربیع بن سبرہؓ اپنے باپ سے روایت بیان کرتے ہیں کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا میں نے عورتوں سے متعہ کرنے کی تم لوگوں کو اجازت دے دی تھی لیکن اللہ تعالیٰ نے اس کو قیامت تک کے لیے حرام فرما دیا ہے لہٰذا تم سب سے جس شخص کے پاس ایسی عورت ہو اپنے سے علیحدہ کر دے اور جو کچھ اس کو دیا ہے وہ واپس نہ لے۔ (مسلم، ابوداؤد، نسائی، ابن ماجہ، احمد کتاب النکاح بحوالہ بلوغ المرام)

اسلام نے صرف میاں بیوی کے حقوق ہی متعین نہیں کیے بلکہ معاشرہ کے بقیہ تمام اعضاء و عناصر مثلاً والدین، اولاد، رشتے دار، ہمسایوں، حاجت مندوں، مہمانوں، میزبانوں آقاؤں اور خدام کے حقوق و فرائض متعین کر دیے ہیں۔

کوئی مذہب ہے جس نے معاشرہ کے تمام اعضاء کو قانون کا پابند کر دیا ہوتا کہ معاشرہ بگاڑ سے بچ سکے۔ اسلام کی تعلیم کا جس پہلو سے بھی جائزہ لیا جائے وہ بنی نوع انسان کے لیے باعث رحمت ہے اسی وجہ سے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو رحمتہ للعالمین کے لقب سے پکارا ہے۔ یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے اسلام باعث رحمت دین ہے۔

ریاست اور اسلام:

معاشرہ کا ایک اہم عنصر اور جز ریاست ہے اسلام نے اس عنصر کے متعلق بھی ایسی ہدایات دی ہیں جو بنی نوع انسان کے لیے باعث رحمت ہیں۔

کوئی ادارہ قانون کے بغیر نہیں چل سکتا۔ اس لیے اسلام نے ریاستی ادارہ کو قانون اور آئین کے تابع قرار دیا ہے۔ قرآن مجید میں آتا ہے۔

یٰدَاوٗدُ اِنَّا جَعَلْنٰكَ خَلِیْفَةً فِی الْاَرْضِ فَاحْكُمْ بَیْنَ النَّاسِ بِالْحَقِّ (ص 26:38)

اے داؤد ہم نے تجھے زمین میں حاکم بنایا ہے سو لوگوں کے درمیان حق کے ساتھ فیصلہ کر۔

اس آیت میں ریاستی ادارہ کو ایک قانون اور ضابطہ کے تحت چلانے کا حکم دیا گیا ہے۔ اگر ریاست میں قانون کی حکمرانی نہ ہو تو ریاستی ڈھانچہ تباہ و برباد ہو جاتا ہے۔ کوئی سلطنت بغیر آئین اور قانون کے دیر پا نہیں چل سکتی۔

پھر فرمایا: وَلَوِ اتَّبَعَ الْحَقُّ اَهْوَآءَهُمْ لَفَسَدَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ وَمَنْ فِیْهِنَّ (المومنون 71:23) اور اگر حق (آئین) ان کی خواہش کے مطابق ہوتا تو آسمان اور زمین اور جو کوئی ان کے اندر ہیں بگڑ جاتے۔

اس آیت میں یہ بتایا گیا ہے کہ کوئی آئین اور قانون کسی انسان کی خواہش کے مطابق نہیں ہونا چاہیے۔ اگر آئین اور قانون حکمران کی اپنی خواہش کے مطابق ہوگا تو فساد برپا ہو جائے گا۔ اس آیت میں یہ بتایا ہے کہ زمین اور آسمان ایک قانون کے ماتحت چل رہے ہیں اسی طرح حکومتی ادارہ بھی ایک آئین اور قانون کے تابع ہونا چاہیے۔ اسلام نے آئین کا مکمل ڈھانچہ دے دیا ہے۔ اس ڈھانچہ پر بے شمار کتب لکھی جا چکی ہیں۔

ایک اور جگہ اللہ تعالیٰ نے رسول کریم ﷺ کو حکم دیا ہے۔

فَاحْكُمْ بَیْنَهُمْ بِمَا اَنْزَلَ اللّٰهُ وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَهُمْ عَمَّا جَآءَكَ مِنَ الْحَقِّ (المائدہ 48:5)

پس تم لوگوں کے درمیان اللہ کے نازل کردہ قانون کے مطابق فیصلہ کرو۔ اس قانون حق کو چھوڑ کر جو تمہارے پاس آیا ہے لوگوں کی خواہشات کی پیروی نہ کرو۔

دوسرا اصل: حکومتی ڈھانچے کے لیے یہ بیان کیا گیا ہے کہ حکومت اہل لوگوں کے سپرد کی جائے۔ ارشاد الٰہی ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ یَاْمُرُكُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰۤى اَهْلِهَا (النساء 58:4)

بے شک اللہ تمہیں حکم دیتا ہے کہ امانتیں (حکومتی عہدے) ان کے اہل کے سپرد کرو۔

تیسرا اصول:

یہ بیان کیا گیا ہے کہ حکمران باہمی مشورہ کے ساتھ فیصلہ کرے ارشاد الٰہی ہے۔

وَشَاوِرْهُمْ فِی الْاَمْرِ (آل عمران 158:3)

تو ان سے (حکومتی) معاملات میں مشورہ کرو۔

فرمایا:

مَاشَاوَرَقَوْمٌ اِلَّا هُدُوْا (طبرانی، کنوز الحقائق حدیث 87)

جس قوم نے باہمی مشورہ کیا اس قوم نے فلاح پائی۔

اسلام نے ریاستی ڈھانچے کے اصول بیان کرنے کے ساتھ حقوق و فرائض بھی بیان کیے ہیں سب سے اہم فریضہ یہ ہے کہ ریاست عوام کے مال جان اور عزت کی حفاظت کرے اور اپنی سرحدوں کو مضبوط بنائے۔

قرآن مجید کی روشنی میں ریاستی حقوق وفرائض پر علماء نے مفصل بحثیں کی ہیں۔ جن کا یہاں ذکر کرنا باعث طوالت ہے۔
یہاں صرف ان موضوعات پر مختصر اَبحث کی جائے گی۔ جن کو مستشرقین اور مخالفین نے خاص طور پر ہدف تنقید بنایا ہے۔
مستشرقین نے اسلامی جہاد کو لوٹ مار کا ذریعہ قرار دیا ہے اس پر بحث کی جا چکی ہے۔
لیکن سلسلہ موضوع جاری رکھنے کے لیے جہاد پر مختصر اَبحث کی جاتی ہے مستشرقین اور مخالفین نے اسلام کے نظریہ جہاد کی روح کو ہی نہیں سمجھا۔ انہوں نے جہاد کو صرف جنگ قرار دیا ہے اور جنگ بھی ایسی جس میں لوٹ مار اور قتل وغارت ہوتی ہے۔
اسلام نے جو نظریہ جہاد پیش کیا ہے اس کے دو (روحانی اور مادی) پہلو ہیں جو انسان کی تمام زندگی پر حاوی ہیں۔

جہاد کا روحانی پہلو:

ارشاد الٰہی ہے۔

وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا وَاِنَّ اللّٰهَ لَمَعَ الْمُحْسِنِيْنَ (عنکبوت 69:29)

جو لوگ ہمارے معاملہ میں جدوجہد کرتے ہیں ہم ان کو اپنے راستہ کی طرف ہدایت دے دیتے ہیں۔ اور بے شک اللہ (تعالیٰ) نیک کاروں کے ساتھ ہے۔ یہ ایک مکی سورت ہے اس آیت میں اللہ تعالیٰ کی محبت اور قرب کے حصول کے لیے کوشش کرنے کی تعلیم دی ہے۔
اللہ تعالیٰ فرماتا ہے جو لوگ اللہ کی محبت اور قرب کے حصول کے لیے کوشاں ہوتے ہیں اللہ تعالیٰ ان کی محنت کو ضائع نہیں کرتا۔ ان کو خود ان رستوں پر چلا دیتا ہے جو محبت الٰہی کے حصول کا موجب بنتے ہیں۔ پھر آیت کے آخری الفاظ۔

اِنَّ اللّٰهَ لَمَعَ الْمُحْسِنِيْنَ

(بے شک اللہ نیک کاروں کے ساتھ)

ظاہر کرتے ہیں جو اللہ کی راہ میں قرب الٰہی کے حصول کے لیے کوشش کرتے ہیں وہی محسنین ہیں اور اللہ ان کے ساتھ ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ جدوجہد کرنے والوں کی محنت کا پھل دے دیتا ہے اور وہ خدا کا قرب حاصل کر لیتے ہیں۔ لہٰذا یہ آیت واضح کرتی ہے جہاد کا ایک روحانی پہلو بھی ہے وہ ہے اللہ کی راہ میں کوشش کرنا تا کہ اس کا قرب حاصل ہو قرآن مجید میں جہاد کے اس تصور کو دوسری جگہ بھی بیان کیا گیا ہے۔
ارشاد الٰہی ہے۔

وَجَاهِدُوْا فِي اللّٰهِ حَقَّ جِهَادِهٖ (الحج 78:22)

اللہ کی راہ میں کوشش کرو جو کوشش کا حق ہے۔
اس آیت میں بھی قرب الٰہی کے حصول کے لیے لفظ جَاهِدُوْا استعمال کیا ہے۔ ''فی اللہ'' (خدا کے بارہ میں) کے الفاظ ظاہر کرتے ہیں۔ یہ عام سمجھ کا آدمی بھی یہ سمجھ سکتا ہے کہ ''فی اللہ'' سے مراد قرب الٰہی کا حصول ہے۔
لوٹ مار وغارت مراد نہیں ہو سکتی۔
ارشاد الٰہی ہے۔

وَلَا تُطِعِ الْكٰفِرِيْنَ وَجَاهِدْهُمْ بِهٖ جِهَادًا كَبِيْرًا (الفرقان 52:25)

پس کافروں کی بات نہ مان اور اس (قرآن) کے ذریعے ان کے ساتھ جہاد کر۔
اس آیت میں بِهٖ کی ضمیر قرآن مجید کی طرف لوٹتی ہے۔

اس آیت میں کفار کو قرآن مجید کے ساتھ دعوت اسلام کی تبلیغ کرنے کا حکم ہے۔ تبلیغ کا اصل ہتھیار صرف قرآن مجید ہے یہ آیت مخالفین کے اس اعتراض کو بھی رد کرتی ہے کہ اسلام بزور شمشیر پھیلا ہے تبلیغ بھی اسلام کا ایک روحانی پہلو ہے۔ قرب الٰہی کا ذریعہ ہے۔ اسلامی تاریخ مبلغین اسلام کی ان مساعی جمیلہ سے بھری پڑی ہے کہ کس طرح انہوں نے دعوت اسلام کے لیے انہوں نے اپنی زندگیاں وقف کیں پھر ان کی زندگیوں سے قرب الٰہی کے نشان بھی ظاہر ہوئے۔ تبلیغ اسلام کی وجہ سے امت مسلمہ کو خیر امت قرار دیا ہے۔

حضرت امام بخاری نے کتاب الجہاد والسیر کے عنوان کے تحت تبلیغ اسلام کے متعلق احادیث لائے ہیں۔ مثلاً

دُعَاءُ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِلَى الْاِسْلَامِ وَالنُّبُوَّةِ وَاَنْ لَا يَتَّخِذَ بَعْضُهُمْ بَعْضًا اَرْبَابًا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ (بخاری 106)

حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا مشرکین کو اسلام کی دعوت دینا اور یہ کہ وہ اللہ کے سوائے کسی اور کو معبود نہ بنائیں۔

حضرت ابوسعید خدری سے روایت ہے کہ کسی نے پوچھا یارسول اللہ لوگوں میں سے کون افضل ہے تو آپ ﷺ نے فرمایا:

مُؤْمِنٌ يُجَاهِدُ فِي سَبِيْلِ اللّٰهِ بِنَفْسِهٖ وَمَالِهٖ (بخاری 2:56)۔

جو خدا کی راہ میں اپنی جان اور مال سے جہاد کرتا ہے۔

مادی پہلو:

جب ہم انسان کی زندگی پر نظر دوڑاتے ہیں تو واضح ہو جاتا ہے کہ اس کی زندگی محنت اور مشقت سے تعبیر ہے کوئی انسان بغیر محنت اور جدوجہد کے ترقی نہیں کر سکتا اس لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

وَاَنْ لَّيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَاسَعٰى (النجم 39:53)

اور یہ کہ انسان کے لیے کچھ نہیں مگر وہی جو وہ کوشش کرتا ہے۔

یہ وہ اصول ہے جس پر انسانی ترقی کا دارومدار ہے جو شخص یا کوئی قوم ترقی کے راستہ پر گامزن ہونا چاہتی ہے اس کو اسی اصول پر عمل کرنا ہوگا۔ قرآن مجید نے روحانی مقام حاصل کرنے کے لیے جہاد ضروری قرار دیا ہے وہاں دنیاوی اور مادی ترقی کے لیے اسی اصول کو بھی لازمی قرار دیا ہے انسان بغیر جہاد کے کامیاب ہو نہیں سکتا۔ جیسا کہ مذکورہ آیت سے ظاہر ہے لہٰذا لفظ جہاد انسانی ترقی کے لیے ایک اہم اصول ہے۔ اسی اصول پر مسلمانوں نے عمل کیا اور تمام دنیا پر چھا گئے۔ لہٰذا قرآن مجید نے لفظ جہاد جنگ وجدل کے لیے استعمال نہیں کیا۔ بلکہ انسانی ترقی کے لیے ایک اہم اصول مقرر کیا ہے۔ انسانی ترقی میں روحانی اور مادی دونوں ترقیاں شامل ہیں اور دونوں ترقیوں کے لیے لفظ جہاد استعمال ہوا ہے۔

جہاد اور قتال:

جہاد اور قتال مترادف نہیں۔ مستشرقین جہاد کے معنی صرف کفار کے ساتھ جنگ کرنے کے لیے ہیں یہ ان کی غلطی ہے۔

جہاد کا لفظ:

نہ قرآن میں، نہ حدیث میں اور نہ لغت میں صرف جنگ کے معنی میں استعمال ہوا ہے جبکہ جنگ کے لیے عربی زبان میں حرب اور قتال کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ لفظ جہاد اپنے اندر وسیع معنی رکھتا ہے۔

اسلام نے مدنی زندگی میں کفار کے ساتھ جہاد کرنے کی تعلیم دی ہے لیکن وہ صرف دفاعی جنگ تھی ارشاد الٰہی ہے۔

اُذِنَ لِلَّذِيْنَ يُقَاتَلُوْنَ بِاَنَّهُمْ ظُلِمُوْا وَاِنَّ اللّٰهَ عَلٰى نَصْرِهِمْ لَقَدِيْرُ ۙ الَّذِيْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ بِغَيْرِ حَقٍّ اِلَّآ اَنْ يَّقُوْلُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّهُدِّمَتْ صَوَامِعُ وَبِيَعٌ وَّ صَلَوٰتٌ وَّمَسٰجِدُ يُذْكَرُ فِيْهَا اسْمُ اللّٰهِ كَثِيْرًا وَلَيَنْصُرَنَّ اللّٰهُ مَنْ يَّنْصُرُهٗ (الحج 40:22)

ان لوگوں کو اجازت دے دی گئی ہے جن سے لڑائی کی جاتی ہے اس لیے کہ ان پر ظلم کیا گیا اور اللہ یقیناً ان کی مدد پر قادر ہے وہ اپنے گھروں سے ناحق نکالے گئے صرف اس وجہ سے کہ وہ کہتے تھے کہ ہمارا رب اللہ ہے اور اگر اللہ لوگوں کی ایک دوسرے کے ذریعے مدافعت نہ کرتا تو یقیناً زاہبوں کی کوٹھڑیاں اور گرجے اور عبادت گاہیں اور مسجدیں جن میں اللہ کا نام بہت ذکر کیا جاتا ہے گرادی جائیں اور اللہ ان کی مدد کرتا ہے جو اس کی مدد کرتے ہیں۔

یہ آیت اس امر پر بین ثبوت ہے کہ مسلمانوں کی جنگیں دفائی تھیں اور ان کو اس وقت اجازت دی گئی جب ان کی بقا اور زندگی خطرے میں تھی کفار مسلمانوں کو صفحہ ہستی سے مٹا دینے پر تلے ہوئے تھے مکہ میں کفار کا ظلم وستم انفرادی طور پر تھا۔ دائرہ اسلام میں داخل ہونے پر ظلم وستم کے پہاڑ ڈھائے جاتے تھے لیکن جب مسلمان مدینہ میں ہجرت کر کے آگئے تو کفار نے لشکر کشی کے ذریعے اسلام کو تباہ کر دینے کا تہیہ کر لیا۔ اس صورت میں بین الاقوامی قانون بھی یہی تقاضا کرتا ہے کہ اپنی قومی بقا کے لیے لڑائی لڑی جاتی۔

آیت 40 اسلامی جنگوں کی غرض وغایت پر روشنی ڈالتی ہے کہ اسلامی جنگیں صرف مسلمانوں کی اپنی مذہبی آزادی کے لیے ہی نہیں بلکہ تمام مذاہب کی آزادی کے لیے تھیں جنگوں کی غرض تمام مذاہب کی عبادت گاہوں کی حفاظت ہے اس لیے کہ عبادت گاہوں کی حفاظت مذہبی تحفظ پر دلالت کرتی ہے اس آیت میں قیام امن کا نہایت ہی سنہری اصول بیان کیا گیا ہے کہ اگر دنیا کے کسی حصے میں کسی مذہب کے ماننے والوں اور ان کی عبادت گاہوں کو دشمن کی طرف سے خطرہ لاحق ہو تو مسلمانوں پر ان کی مدد کرنا فرض ہو جاتا ہے۔

مستشرقین کی سمجھ اور ادراک پر افسوس ہے کہ وہ جنگیں جو قیام امن اور مذہبی آزادی کو برقرار رکھنے کے لیے لڑی گئی تھیں ان کو وہ بے رحمی اور ظلم کی جنگیں کہتے ہیں اور ظالمانہ تعلیم قرار دیتے ہیں۔

سورۃ بقرہ میں آتا ہے۔

وَلَا يَزَالُوْنَ يُقَاتِلُوْنَكُمْ حَتّٰى يَرُدُّوْكُمْ عَنْ دِيْنِكُمْ اِنِ اسْتَطَاعُوْا (بقرہ 217:2)

اور وہ ہمیشہ تم سے جنگ کرتے رہیں گے یہاں تک کہ وہ تمہیں تمہارے دین سے لوٹا دیں اگر وہ طاقت رکھیں۔

یہ آیت اس بات کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ کافر مسلمانوں سے اس لیے جنگ کرتے تھے کہ ان کو دین اسلام سے ہٹا دیں۔ یہ آیت مستشرقین کے اس اعتراض کا رد ہے کہ مسلمانوں نے کفار کو دائرہ اسلام میں داخل کرنے کے لیے جنگیں کی تھیں۔

پھر قرآن مجید میں آتا ہے۔

وَقَاتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَكُمْ وَلَا تَعْتَدُوْا اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ (بقرہ)

اور اللہ کے راستہ میں جنگ کرو اور ان لوگوں سے جو تم سے کرتے ہیں اور حد سے نہ بڑھنا۔ بے شک اللہ حد سے بڑھنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔

اس آیت میں واضح طور پر اسلامی جنگ کا اصول بیان کیا ہے کہ جنگ صرف انہی لوگوں سے جائز ہے جو مسلمانوں کی قومی زندگی کو ختم کرنے کے لیے ہتھیار اٹھائیں اس کے ساتھ ہی اسلام نے مسلمانوں کو یہ اخلاقی تعلیم بھی دی ہے کہ جنگ میں زیادتی نہ کی جائے۔

تاریخ یہ بتاتی ہے کہ مسلمانوں کی جنگیں لوٹ مار کے لیے نہ تھیں بلکہ دفاع اور قیام امن کے لیے تھیں اگر یہ جنگیں لڑی نہ جاتیں تو

ظلم ہمیشہ کے لیے غالب آجاتا اور لوگوں کی زندگی اجیرن بن جاتی۔

اسلام نے نہ صرف ظلم کرنے سے روکا ہے بلکہ مظلوم کی حمایت اور ظالم کو ظلم سے روکنے کی تعلیم دی ہے جب تک دنیا سے ظلم کا قلع قمع نہ کیا جائے تو دنیا میں نہ تو انسانیت کا احترام باقی رہ سکتا ہے اور نہ امن قائم رہ سکتا ہے لہٰذا ظلم کا سد باب کرنا مسلمانوں کا فرض ہے قرآن مجید نے مظلوموں کی حمایت میں جنگ کرنا لازمی قرار دیا ہے۔ ارشاد الٰہی ہے۔

وَمَالَكُمْ لَا تُقَاتِلُوْنَ فِي سَبِيْلِ اللّٰهِ وَ الْمُسْتَضْعَفِيْنَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَاءِ وَالْوِلْدَانِ الَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا اَخْرِجْنَا مِنْ هٰذِهِ الْقَرْيَةِ الظَّالِمِ اَهْلُهَا وَاجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْكَ وَلِيًّا وَاجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْكَ نَصِيْرًا (النساء 4:75)

تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ تم اللہ کے راستہ میں جنگ نہیں کرتے اور کمزور مردوں اور عورتوں اور بچوں کے لیے جو کہتے ہیں اے ہمارے رب ہم کو اس بستی سے نکال جس کے رہنے والے ظالم ہیں اور اپنی جناب سے ہمارا کوئی دوست بنا اور اپنی جناب سے ہمارا کوئی مددگار بنا۔

اس آیت میں اسلامی جنگ کا کتنا بلند اور مقدس مقصد بیان کیا ہے کہ دنیا کے کسی خطے میں مردوں، عورتوں اور بچوں کی پامالی ہو رہی ہو۔ خواہ کسی مذہب سے وہ تعلق رکھتے ہوں مسلمانوں کا یہ مذہبی فریضہ ہے کہ ان مظلوم انسانوں کو درندگی اور بہیمیت کے چنگل سے نجات دلائیں۔

کتنی پیاری تعلیم ہے جس کو مستشرقین نے ہدف تنقید بنایا ہے اس پیاری تعلیم سے رحمت کے سوا کوئی پہلو نکلتا ہی نہیں۔ مستشرقین اور مخالفین نے رحمت سے پُر تعلیم کو ظلم و ستم کی تعلیم قرار دیا ہے۔ یہی مستشرقین اور مخالفین کی جہالت اور کم علمی ہے۔

جہاد کا رحمت والا پہلو:

مستشرقین اور مخالفین اسلام کا سب سے بڑا اعتراض یہ ہے کہ جہاد لوٹ کا نام ہے۔ (Maxime rodinson Mohammad P77) جب مستشرقین اور مخالفین کے اس اعتراض پر تاریخی لحاظ سے غور کرتے ہیں تو یہ اعتراض بھی باطل نظر آتا ہے۔ بلکہ اسلام کا جہاد اپنے اندر رحمت اور بنی نوع انسان سے ہمدردی کا پیغام لیے ہوئے ہے۔

اگر دنیا کی مہذب سے مہذب قوم کی جنگوں کے حالات پڑھیں تو وہاں بھی بربریت اور بہیمیت کے خونچکاں واقعات نظر سے گزریں گے۔ جن کو پڑھ کر رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔

اسلام ایک دین رحمت ہے جس کی رحمت کے سائے زندگی کے ہر شعبہ پر چھائے ہوئے ہیں ہر قوم کی زندگی میں لڑائی ناگزیر ہے اسلام نے لڑائی کے لیے بھی ضابطہ اخلاق مقرر کر دیا ہے جیسا کہ گزشتہ بحث میں بیان کیا جا چکا ہے کہ اسلامی جنگ مدافعت، حفاظت خود اختیاری، مذہبی آزادی اور حمایت مظلومین اور فتنہ کی بیخ کنی کے لیے لڑی گئی تھیں یہ جنگیں بنی نوع انسان کے لیے سراسر رحمت تھیں اور اخلاقی قوانین کے تابع لڑی گئی تھیں اگر کوئی مجاہد اخلاقی قیود کو توڑتا تو وہ قابل مواخذہ ہوتا تھا۔

جنگ کے اسلامی احکام بیان کرنے سے پہلے اہل عرب کے تصور جنگ اور وحشت کاریوں کا ذکر کرنا ضروری ہے یہی تصور اس دور میں تمام دنیا میں رائج تھا۔ اگر غور کیا جائے تو اس دور کی مہذب دنیا میں وہ تصور موجود ہے اور قسما قسم کے مہلک ہتھیار ایجاد ہو چکے ہیں پلک جھپکتے ہی لاکھوں انسان ابدی نیند سو جاتے ہیں۔

عربوں کے جنگ میں انسانیت سوز طریقے:

عرب دشمن کے لیے قسی القلب تھے وہ دشمن کو زندہ آگ میں پھینک دیتے تھے۔ عرب کی تاریخ کا مشہور واقعہ ہے کہ جب منذر بن امراء القیس نے جنگ میں بنی شیبان پر فتح حاصل کر لی تو ان کی مستورات کو زندہ آگ میں پھینک دیا۔

1- عمرو بن ہند کے بھائی نے بنو تمیم پر حملہ کر دیا سوہ بھاگ گئے صرف ایک عورت باقی بچی۔ اس کو گرفتار کر کے آگ کے الاؤ میں پھینک دیا دور سے عمار نامی شخص نے آگ کا دھواں دیکھا اس طرف رخ کیا شاید کھانے کو مل جائے عمرو نے آنے کی وجہ پوچھی اس نے جواب دیا میں کئی دن سے بھوکا تھا دھوئیں کو دیکھ کر آیا ہوں۔ شاید کھانا مل جائے اس سنگ دل عمرو نے حکم دیا کہ اس کو بھی آگ میں پھینک دیا جائے چنانچہ اس کو آگ میں پھینک دیا گیا۔

2- حملہ آور قبیلہ جب مغلوب کے مرد اور عورتیں اور بچے پنجہ اسیری میں لے لیتا تو ان سے ہر قسم کا ناروا سلوک کرتا۔ قتل کر دیئے جاتے۔ جلا دیئے جاتے پہاڑ کی چوٹیوں سے نیچے گرا کر آتش غضب کو بجھایا جاتا منذر بن امراؤ القیس نے بنی شیبان کے جتنے قیدی پکڑے ان سب کو پہاڑ کی چوٹی پر قتل کر دیا۔

احادیث میں عکل اور عرینہ کا واقعہ مذکور ہے کہ یہ لوگ رسول کریم ﷺ کے چرواہوں کو پکڑ کر لے گئے ان کے ہاتھ پاؤں کاٹ دیئے ان کی آنکھوں میں گرم سلائیاں پھیریں انہیں تپتی ہوئی ریت پر پھینک دیا۔ یہاں تک وہ تکلیف اور پیاس سے مر گئے۔

امراؤ القیس کے باپ حجر بن حارث نے بنی اسد پر حملہ کیا ان کے جتنے قیدی ہاتھ آئے ان سب کو ڈنڈوں کی ضربات سے مار دیا۔

3- عرب اپنے جوش غضب کو معصوم بچوں کے خون سے ٹھنڈا کرتے داحس اور غبراء کی لڑائیوں میں قیس نے بنو ذبیان کے پاس اپنے بچے بطور ضمانت رکھے ہوئے تھے حذیفہ رئیس ذبیان ان بچوں کو ایک وادی میں لے جاتا ان کو تیروں کا نشانہ بناتا تھا۔ اس کے قبیلہ کے لوگ اس انسانیت سوز نظارے کو دیکھ کر خوش ہوتے۔

4- عرب لوگ اتنے بے رحم اور سنگ دل تھے جب اپنے حریف کو مار دینے سے بھی ان کی آتش غضب ٹھنڈی نہ ہوئی تو وہ لاشوں کا مثلہ کرتے اور اعضاء کا ہار بنا کر گلے میں پہنتے چنانچہ جنگ احد میں مشہور واقعہ ہے کہ ابو سفیان کی بیوی ہندہ نے سید الشہداء حضرت حمزہ کی لاش کا مثلہ کیا پھر ان کا کلیجہ چبا کر اپنی آتش غضب کو ٹھنڈا کیا کہ عربوں کا کینہ اس قدر سخت ہوتا تھا کہ اپنے دشمن کے متعلق منت مانتے کہ اس کو قتل کر کے اس کی کھوپری میں شراب پئیں گے۔ جنگ احد میں عاصمؓ بن ثابت نے مسافع بن طلحہ اور حلاس بن طلحہ کو قتل کیا تھا۔ ان کی والدہ سلافہ نے قسم کھائی کہ وہ عاصم کی کھوپڑی میں شراب پیئے گی۔

6- عربوں کا دائرہ ظلم صرف مقاتلین تک محدود نہیں ہوتا تھا بلکہ ان کے ظلم و ستم کے آہنی پنجہ سے غیر مقاتلین بھی نہیں بچ سکتے تھے۔ معصوم بچوں کے خون سے زمین کا سینہ رنگ دیا جاتا حاملہ عورتوں کے پیٹوں کو چاک کر دیا جاتا بوڑھوں اور راہبوں کو قتل کر دیا جاتا تھا۔

7- عربوں کی یہ عادت تھی کہ وہ ہمیشہ دشمن پر غفلت کی حالت میں حملہ کرتے تھے تاکہ وہ آسانی سے قابو پا سکیں اور ان کے خون سے آتش انتقام کو ٹھنڈا کر سکیں۔ عربوں کی اصطلاح میں غفلت میں حملہ کرنے کو فتک اور حملہ کرنے والے کو فتاک کہتے ہیں۔ تابط بن شر، سلیک اور حارثہ بن ظالم مشہور فتاک گزرے ہیں۔

8- عرب اپنے ذاتی اغراض کے سامنے معاہدات کو کوئی حیثیت نہ دیتے تھے۔ جب بھی انتقام لینے کا موقع پاتے تو تمام معاہدات کو ردی کی ٹوکری میں پھینک دیتے اور حملہ کر دیتے بد عہدی کی مثالیں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں کثرت سے ملتی ہیں آپ ﷺ نے یہود سے معاہدات کیے انہوں نے ہر بار معاہدہ توڑ دیا اور مسلمانوں کے خلاف کفار سے مل کر ریشہ دوانیاں شروع کر دیں آپ ﷺ نے حدیبیہ کے مقام پر قریش سے معاہدہ کیا انہوں نے اس کا کوئی پاس اور لحاظ نہ کیا مسلمانوں کے حلیف بنو خزاعہ کے خلاف بنو بکر کی مدد کی۔

اسلام کی جنگی اصطلاحات

پہلی اصلاح:

جیسا کہ پہلے ذکر ہو چکا ہے کہ عربوں کی جنگ کا مقصد لوٹ مار، قتل و غارت تھا سب سے پہلے اسلام نے عربوں کے اس مقصد جنگ کی اصلاح کی اسلام نے مسلمانوں کے سامنے جنگ کا مقصد یہ پیش کیا کہ خدا پرستی کو فروغ ہو اور مظلوم کی دست گیری ہو اور انسانیت کا احترام قائم ہو فتنہ کی بیخ کنی ہو جارحیت ختم ہو۔ مقاصد جہاد کے تحت بحث گزر چکی ہے اب جب ایک مجاہد ان مقاصد کو سامنے رکھ کر میدان جنگ میں جائے گا تو لازمی طور پر وہ ان تمام افعال سے اجتناب کرے گا جو انسانیت سوز موجب فساد اور غصب و نہب ہیں۔

دوسری اصلاح:

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے غیر مقاتلین کو قتل کرنے کی ممانعت فرمائی۔ ابو داؤد میں حضرت انسؓ کی روایت ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فوج کو روانہ کرتے وقت فرمایا اللہ کا نام لے کر اللہ کی مدد سے اور اللہ کے رسول کی ملت پر قائم رہتے ہوئے چل پڑو۔ کسی بوڑھے ضعیف، چھوٹے بچے اور عورتوں کو قتل نہ کرنا۔ مال غنیمت میں سے چوری نہ کرنا، جنگ میں جو کچھ ہاتھ میں آئے ایک جگہ جمع کرنا، صلح کی روش اختیار کرنا، احسان کرنا کیونکہ اللہ تعالیٰ احسان کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔

بخاری میں عبد اللہ بن عمر سے روایت ہے ایک دفعہ ایک جنگ میں ایک عورت کی لاش پڑی ہوئی دیکھی تو آپ ﷺ نے عورتوں اور بچوں کو قتل کرنے سے منع فرمایا۔ (بخاری 147:56)

حضرت ابو ایوب فرماتے ہیں کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی مقابلہ میں اجیروں غلاموں اور لونڈیوں کے قتل کرنے سے منع فرمایا۔ (مسند احمد)

اسی طرح ابن عباس کی روایت ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

لَا تَغْدَرُوْا وَلَاتَغُلُّوْا وَلَا تَمَثَّلُوْا وَلَا تَقْتُلُوْا الْوِلْدَانَ وَلَا اَصْحَابَ الصَّوَامِعِ (مسند احمد)

یعنی بدعہدی نہ کرو، مال غنیمت میں سے خیانت نہ کرو۔ مثلہ نہ کرو، بچوں اور خانقاہ نشینوں کو قتل نہ کرو۔

اسلام نے جنگ میں مقاتلین کے متعلق یہ نصائح فرمائیں۔

1- زخمی پر حملہ نہ کیا جائے، بھاگنے والے کا تعاقب نہ کیا جائے، قیدی کو قتل نہ کیا جائے جو اپنے گھر کا دروازہ بند کر لے وہ امان میں ہے (فتوح البلدان لبلازری صفحہ 47)

2- رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے آگ کا عذاب دینے سے منع فرمایا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: آگ کا عذاب دینا صرف خدا کا حق ہے۔

3- آپ ﷺ نے مقتولین کے اعضاء کی قطع و برید اور لوٹ مار سے منع فرمایا عبد اللہ بن یزید انصاری کی روایت ہے۔

نَهَى النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنِ النَّهبى وَ الْمُثْلَةِ

یعنی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے لوٹ مار اور مثلہ (اعضاء کی قطع و برید) سے منع فرمایا۔

اسلام نے صرف ہم مثل سزا دینے کی اجازت دی ہے ارشاد الٰہی ہے۔

وَاِنْ عَاقَبْتُمْ فَعَاقِبُوْا بِمِثْلِ مَاعُوْقِبْتُمْ بِهٖ وَلَئِنْ صَبَرْتُمْ لَهُوَ خَيْرٌ لِّلصّٰبِرِيْنَ (النحل 126:16)

4- قتل میں احتیاط برتنے سے متعلق ارشاد فرمایا اِعَفُ النَّاسِ قِتْلَۃً اَھْلُ الْاِیْمَانِ (ابوداؤد) یعنی اہل ایمان قتل کرنے میں تمام دنیا کے انسانوں سے زیادہ محتاط ہوتے ہیں۔

5- باندھ کر قتل کرنا منع ہے ابوایوب انصاری نے فرمایا:

سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یَنْھٰی عَنْ قَتْلِ الصَّبْرِ (ابوداؤد)

یعنی میں نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے سنا کہ آپ نے باندھ کر قتل کرنے کے منع فرمایا۔

6- رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کفار کے مقتولین کی لاشوں کو گڑھوں میں دفن کروایا علامہ ابویعلی نے ''الاحکام السطانیہ'' میں لکھا ہے کہ لشکر کے رئیس پر یہ فرض ہے کہ وہ کفار کی لاشوں کو گڑھوں میں دفن کرے۔

تیسری اصلاح:

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم غفلت یا نیند کی حالت میں حملہ کرنے سے احتراز کرتے تھے حضرت انسؓ سے روایت ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خیبر پر چڑھائی کی آپ ﷺ رات کے وقت وہاں پہنچے آپ ﷺ کا یہ دستور تھا کہ جب کسی محارب قوم پر رات کے وقت پہنچتے تو آپ ﷺ حملہ نہ کرتے جب تک صبح نہ ہو جاتی۔ (ابوداؤد)

لیکن اگر دشمن قوم کے ساتھ جنگ جاری ہے تو ایسی صورت میں رات کے وقت حملہ کرنا جائز ہے۔

چوتھی اصلاح:

اسلام نے تباہ کاری اور فساد برپا کرنے سے منع فرمایا۔ حضرت ثوبانؓ سے روایت ہے۔

اِنَّہٗ سَمِعَ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یَقُوْلُ مَنْ قَتَلَ صَغِیْرًا اَوْ کَبِیْرًا اَوْ اَحْرَقَ نَخْلًا اَوْ قَطَعَ شَجَرَۃً مُثْمِرَۃً اَوْ ذَبَحَ شَاۃً لِاِھَابِھَا لَمْ یَرْجِعْ کَفَافًا (مسند احمد)

یعنی انہوں نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے سنا کہ جو شخص کسی چھوٹے بچے کو یا معمر آدمی کو قتل کرے گا یا کھجوروں کے درخت جلائے گا یا پھل دار درختوں کو کاٹے گا یا بکری کی محض اس کی کھال حاصل کرنے کے لیے ذبح کرے گا تو وہ جہاد کے ثواب سے تہی دست رہے گا جنگ کی نوعیت، مصلحت اور ضرورت کی بناء پر درخت وغیرہ کاٹنے کی اجازت ہے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بنونضیر کی کھجوریں کٹوائیں اور انہیں جلا دیا۔

پانچویں اصلاح:

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے سفراء اور قاصدوں کو قتل کرنے سے منع فرمایا۔ چنانچہ مسیلمہ کذاب کے دو قاصد آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو آپ نے فرمایا۔

اَمَا وَاللّٰہِ لَوْلَا اَنَّ الرُّسُلَ لَا تُقْتَلُ ضَرَبْتُ اَعْنَاقَکُمَا (ابوداؤد، احمد)

اللہ کی قسم اگر قاصدوں کا قتل ممنوع نہ ہوتا تو میں تمہاری گردن الگ کر دیتا۔

چھٹی اصلاح:

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے معاہدہ کو صرف دنیاوی منفعت کے لیے توڑ دینے سے منع فرمایا کیونکہ یہ بدعہدی قیام امن کے راستہ میں ایک مضبوط دیوار حائل ہے۔ جب تک یہ دیوار کھڑی ہے۔ اس وقت تک دنیا میں امن قائم نہیں ہو سکتا رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم

نے سب سے پہلے قیام امن کے لیے اس دیوار کو گرایا۔

اور عہد کی پابندی پر زور دیا فرمایا: مال غنیمت میں خیانت نہ کرنا، بدعہدی نہ کرنا مثلہ نہ کرنا، بچوں اور عورتوں کو قتل نہ کرنا۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا عمل یہ بتاتا ہے کہ آپ ﷺ نے معاہدات کی پوری طرح حفاظت کی۔ صلح حدیبیہ کا مشہور واقعہ ہے ابو جندل معاہدہ ہو چکنے کے بعد رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پابہ زنجیر حاضر ہوتا ہے اور درخواست کرتا ہے کہ اس کو پنجہ ظلم سے نجات دلائیں آپ ﷺ نے ابو جندل کو فرمایا:

''اے ابو جندل! صبر کر۔'' ہم عہد کی خلاف ورزی نہیں کر سکتے اللہ تعالیٰ تمہارے لیے کوئی اور راستہ نکال دے اور شرط کے مطابق ابو جندل کو اہل مکہ کے حوالے کر دیا۔

یہ اصلاحات ظاہر کرتی ہیں کہ جہاد کا مقصد لوٹ مار یا قتل و غارت نہیں تھا بلکہ ملکی دفاع تھا۔ مزید براں جنگی اصلاحات سے عربوں اور اس دور کی ترقی یافتہ قوموں کے جنگی ظالمانہ اصولوں کو تبدیل کر دیا۔ دور حاضر میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے مجوزہ جنگی اصولوں کی روشنی میں اقوام متحدہ نے جنگ کے دوران غیر محارب عوام کو قتل و غارت اور غصب و نہب سے ممنوع قرار دیا ہے۔ لہٰذا مخالفین کا اسلامی جہاد کو لوٹ مار اور قتل و غارت قرار دینا نہ سمجھی اور حقائق کے منافی ہے۔

ساتویں اصلاح۔ اسیروں سے حسن سلوک:

اسلام سلامتی اور امن کا دین ہے بنی نوع انسان کے لیے رحمت اور سلامتی کا پیغام لے کر آیا ہے اس نے زمانہ جاہلیت کی ان تمام مکروہ اور ظالمانہ رسوم کو مٹا کر رکھ دیا تھا جس سے حرمت انسانیت مجروح ہو چکی تھی زمانہ جاہلیت کی ظالمانہ اور مکروہ رسوم میں سے ایک گھناؤنی رسم اسیران جنگ سے انسانیت سوز سلوک تھا۔ اسلام نے اسیران جنگ کو مستقل طور پر اسیری میں جکڑے رکھنے سے منع فرمایا۔ بلکہ یہ تعلیم دی کہ ان کو احسان کے طور پر یا ان سے فدیہ لے کر رہا کر دو اور جب تک وہ قبضہ میں ہوں ان سے نیک سلوک کیا جائے۔ قرآن مجید میں آتا ہے۔

فَإِذَا لَقِيتُمُ الَّذِينَ كَفَرُوا فَضَرْبَ الرِّقَابِ حَتَّىٰ إِذَا أَثْخَنتُمُوهُمْ فَشُدُّوا الْوَثَاقَ فَإِمَّا مَنًّا بعد وَإِمَّا فِدَاءً حَتَّىٰ تَضَعَ الْحَرْبُ أَوْزَارَهَا (محمد 47:4)

پس جب کافروں سے مٹھ بھیڑ ہو تو پہلے گردنیں مارنا ہے یہاں تک کہ تم ان پر غالب آ جاؤ پھر قید کے بندھن مضبوط کرو۔ اس کے بعد تمہیں اختیار ہے یا تو احسان کے طور پر یا فدیہ لے کر چھوڑ دو یہاں تک کہ لڑائی اپنے ہتھیار رکھ دے۔

دوسری جگہ آتا ہے۔

يُطْعِمُونَ الطَّعَامَ عَلَىٰ حُبِّهِ مِسْكِينًا وَيَتِيمًا وَأَسِيرًا إِنَّمَا نُطْعِمُكُمْ لِوَجْهِ اللَّهِ لَا نُرِيدُ مِنكُمْ جَزَاءً وَلَا شُكُورًا إِنَّا نَخَافُ مِن رَّبِّنَا يَوْمًا عَبُوسًا قَمْطَرِيرًا (دہر 76-9-10)

وہ (مسلمان) اللہ کی محبت کی خاطر مسکینوں، یتیموں اور قیدیوں کو کھانا کھلاتے ہیں ہم صرف اللہ کی رضا کے لیے کھلاتے ہیں ہم نہ تو تم سے بدلہ چاہتے ہیں اور نہ شکریہ ہم اپنے رب سے تنگی اور سختی کے دن کا خوف رکھتے ہیں۔

جنگ بدر میں جو قیدی مسلمانوں کے ہاتھ آئے ان کے ساتھ نہایت ہی نیک سلوک روا رکھا گیا اس سلوک کی وجہ سے قیدی اسلام میں داخل ہو گئے۔ ایک قیدی بیان کرتا ہے کہ وہ جس گھر میں قید تھا گھر والے اس کو اچھا کھانا کھلاتے تھے لیکن خود کھجور کھا لیتے تھے۔ بعض بدری قیدیوں کو فدیہ دے کر آزاد کر دیا گیا بعض ناداروں کو بلا فدیہ رہا کر دیا گیا اور جو قیدی لکھنا پڑھنا جانتے تھے ان کو مدینہ کے دس دس مسلمان بچوں کو تعلیم دینے کی شرط پر چھوڑ دیا گیا۔

جنگ مریسیع میں بنو مصطلق کے ایک سو خاندان پکڑے گئے ان سب کو فدیہ لیے بغیر رہا کر دیا گیا۔
غزوہ حنین میں قبیلہ ہوازن کے چھ ہزار قیدی بطور احسان آزاد کر دیئے گئے۔
جبال تنعیم میں مکہ کے اسی آدمیوں نے اسلامی لشکر پر دھاوا بول دیا سب کے سب گرفتار کر لیے گئے جب ان کو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش کیا گیا تو آپ ﷺ نے از راہ احسان سب کو رہا کر دیا گیا۔
یہ جنگی اصلاحات ظاہر کرتی ہیں کہ اسلامی جہاد کا مقصد لوٹ مار یا قتل وغارت نہیں تھا بلکہ ملکی دفاع تھا۔ مزید براں جنگی اصلاحات سے عربوں اور اس دور کی ترقی یافتہ قوموں (روم، ایران) کے جنگی ظالمانہ اصول کو بدل دیا۔
دور حاضر میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے مجوزہ جنگی اصولوں کی روشنی میں اقوام متحدہ نے جنگ کے دوران غیر متحارب عوام کو قتل وغارت اور لوٹ مار سے ممنوع قرار دیا ہے۔ اسی طرح جنگی قیدیوں سے اچھا سلوک کرنے اور مستقل قیدی نہ بنا رکھنے کا اصول وضع کیا ہے۔

الزامی جواب:

مستشرقین اور مخالفین ہند نے اسلام کی تعلیم کو تو ہدف تنقید بنایا ہے لیکن اپنے مذاہب کی ظالمانہ اور وحشیانہ تعلیم کی طرف توجہ نہیں کی۔ اگر اس کا مطالعہ کر لیتے تو ان کا سر شرم سے جھک جاتا۔ آیئے اختصار کے ساتھ معترضین کے مذاہب کی جنگی تعلیمات کا جائزہ لیں۔

وید:

وید مخالف کو صفحہ ہستی سے مٹا دینے کی تعلیم دیتے ہیں چنانچہ یجر وید کی تعلیم کا خلاصہ سوامی دیانند کے الفاظ میں یہ ہے۔

1- دھرم کے مخالفوں کو زندہ آگ میں جلا دو۔ (یجر وید ادھیاء 13 منتر 12 دیانند بھاش)
2- دشمن کے کھیتوں کو اجاڑ دیعنی گائے، بیل بکری اور لوگوں کو بھوکا مار کر ہلاک کر دو۔ (حوالہ مذکورہ منتر 13)
3- اپنے مخالفوں کو درندوں سے پھڑ واڈالو۔ (یجر وید 19,17,15)
4- ان کو سمندر میں غرق کر دو۔ (18:15)
5- جس طرح بلی چوہے کو تڑپا تڑپا کر مارتی ہے اسی طرح ان کو تڑپا کر مارو۔ (65:16)
6- ان کی گردنیں کاٹ دو۔ (22:5)
7- جائز اور ناجائز طریقہ سے ہلاک کر دو۔ (28:1)
8- مخالفوں کا جوڑ جوڑ اور بند بند کاٹ دو۔ (38:13)
9- ان کو پاؤں نیچے کچل دو اور ان پر رحم نہ کرو۔ (39:17)
10- ان کو تاعمر زنجیروں میں باندھ رکھو۔ (یجر وید 25:1)

تمام ہندو مذہبی کتب میں دشمنوں کو تباہ و برباد کر دینے کی تعلیم ہے صرف نمونہ کے طور پر یجر وید کی تعلیم بطور نمونہ پیش کی۔

یہودی مذہب کے جنگی احکام:

''جب خداوند تیرا خدا اسے (دشمن) تیرے قبضہ میں کر دے تو وہاں کے ہر ایک مرد کو تلوار کی دھار سے قتل کر لیکن ان قوموں کے شہروں میں جنہیں خداوند تیرا خدا تیری میراث کر دیتا ہے کسی چیز کو جو سانس لیتی ہے جیتا نہ چھوڑیو۔'' (استثناء 16:13:20)
''سو تم ان بچوں کو جو لڑکے ہیں سب کو قتل کر دو اور ہر ایک عورت کو جو مرد کی صحبت سے واقف ہو چکی ہو جان مارو اور وہ لڑکیاں جو مرد

کی صحبت سے واقف نہیں ہوئیں ان کو اپنے لیے زندہ رکھو۔" (گنتی باب 17,16:31)

"جب انہوں نے 12000 مرد بہادر روانہ کیے انہیں حکم دیا بیس جلعاد کے باشندوں کو عورتوں اور بچوں سمیت قتل کرو۔"
(قاضیوں کی کتاب 11:12)

خدا کی طرف سے حضرت موسیٰ کو حکم ملتا ہے۔

"جبکہ خداوند تیرا خدا انہیں تیرے حوالے کرے تو تُو انہیں ماریو اور حرم کیجیو، نہ تو ان سے کوئی عہد کریو اور نہ ان پر رحم کریو، نہ ان سے بیاہ کرنا، اس کے بیٹے کو اپنی بیٹی نہ دینا نہ اپنے بیٹے کے لیے ان کی بیٹی لینا۔" (استثناء 33:7,1)

حضرت داؤد علیہ السلام کے متعلق لکھا ہے۔

"اس نے ربہ پر چڑھائی کی اور فتح کرلیا اور اس نے ان لوگوں کو اس میں تھے باہر نکال کر آروں اور لوہے کی گاہن اور آہنی کلہاڑیوں سے روندا اور اینٹوں کے جلتے اووں میں سے گزارا اور اس نے بنی عمون کے تمام شہروں سے یہی کیا۔" (سموئیل دوم 31:12)

"مناخم نے تمام حاملہ عورتوں کے پیٹ پھاڑ ڈالے۔" (سلاطین دوم 16:15)

یہ ہے یہود کی تعلیم کا نمونہ جس میں دشمنوں کے لیے بربادی ہی بربادی ہے رحم اور محبت کی رمق کہیں نظر نہیں آتی اور اعتراض ان جنگوں پر اٹھائے جاتے ہیں جو محض دفاعی تھیں اور جن کا مقصد صرف امن کا قیام تھا۔

مسیحی تعلیم:

متی 8 ب 32 میں آتا ہے "سوروں کے غول کو مسیح نے ہلاک کیا۔"

اب دیکھنا ہے کہ مسیح علیہ السلام نے سور کو اپنے کلام میں کس رنگ میں بیان کیا ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا قول متی 7 باب 6 میں درج ہے۔ "جو پاک ہے کتوں کو مت دو اور اپنے موتی سوروں کے آگے مت پھینکو۔"

معلوم ہوا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام آدمیوں کو کتا اور سور کہہ رہے ہیں اب اسی استعارہ کی رو سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا سوروں کے غول کو ہلاک کرنے سے مراد انسانوں کو ہلاک کرنا ہے۔

متی 24 باب 30 میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام فرماتے ہیں "جب میں آؤں گا دنیا کی ساری قومیں چھاتی پیٹیں گی۔"

متی 16 باب 26 میں فرماتے ہیں "کیونکہ ابن آدم اپنے باپ کے جلال میں اپنے فرشتوں کے ساتھ آوے گا تب ہر ایک کو اس کے کام کے موافق سزا دے گا بعض ابھی موت کا مزہ چکھیں گے۔

انجیل کی یہ آیات مسیح کی حربی اور جلالی شان کو واضح کر رہی ہیں کہ وہ اپنے دشمنوں کو فرشتوں کے جلو میں آ کر تباہ و برباد کر دے گا اور اس وقت دنیا کی ساری قومیں چھاتی پیٹ کر رہ جائیں گی۔

حقیقت یہ ہے کہ حضرت مسیح علیہ السلام کی تعلیم اس وقت تک محبت، پیار، رحم، تحمل و بردباری کی تھی جب تک وہ کمزور اور ضعیف تھے اور ان کے ہاتھ میں طاقت نہ تھی۔ جب طاقت پکڑ لیں گے تو ان کی "بردباری" کے سامنے قومیں چھاتی پیٹیں گی۔

☆

اسلام اور شمشیر (اسلام بزور شمشیر پھیلا ہے)

اعتراض: جہاد پرلوٹ مار اور قتل وغارت کے علاوہ ایک سب سے بڑا اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ اسلام بزور شمشیر پھیلا۔ میور نے اپنی کتاب لائف آف محمد، جو یلیان نے اپنی کتاب فرانس اور ڈاکٹر گلوور نے اپنی کتاب ''تقدم التبشیر العالمی'' (عالمی مشنریوں کی ترقی (1960 نیویارک) میں اسی اعتراض کو بڑے شدومد کے ساتھ بیان کیا ہے صرف انہی مستشرقین نے ہی یہ اعتراض نہیں کیا بلکہ دیگر مستشرقین اور مخالفین اسلام مثلاً ابن وراق نے اپنی کتاب ''میں ایک مسلمان کیوں نہیں'' (Why I am not a Muslim) کے باب ''محمد (صلعم) اور ان کا پیغام'' (Muhammad and his message) اور رابرٹ پنسر نے اپنی کتاب محمد (صلعم) کے متعلق سچائی (The truthe about Muhammad) کے عنوان ''دعوت اسلام'' (Invitation to Islam) میں اس اعتراض پر زور دیا ہے۔ اسی طرح میکڈونلڈ نے انسائیکلوپیڈیا آف اسلام میں اور کلین نے اپنی تصنیف کی ریلجن آف اسلام میں اسی قسم کے خیالات کا اظہار کیا ہے۔

یہ ایک ایسا اعتراض ہے کہ معترض اسلام کی کتاب اس وقت تک مکمل نہیں ہوسکتی جب تک یہ اعتراض نہ کرے۔

جواب: جب اس اعتراض کا جائزہ اسلامی تعلیمات اور تاریخی حقائق کی روشنی میں لیا جائے تو یہ اعتراض بھی دیگر اعتراضات کی طرح بودا اور لاعلمی پر مبنی اور حقائق سے منافی نظر آتا ہے۔ پہلے یہ بات واضح کی جا چکی ہے کہ اسلام کی جنگیں مدافعانہ تھیں مسلمانوں نے حفاظت خود اختیاری کے طور پر لڑیں۔ مذکورہ اعتراض تو اس سے ہی رد ہو جاتا ہے لیکن جب قرآن کے ان محکم اصولوں پر نظر ڈالتے ہیں جو اشاعت اسلام سے متعلق ہیں تو اعتراض کا رد مزید نکھر کر سامنے آجاتا ہے قرآن مجید میں آتا ہے۔

لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ قَدْتَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ (البقرہ2:256)

یعنی دین میں کوئی جبر نہیں کیونکہ ہدایت کی راہ گمراہی کے مقابلہ میں واضح ہو چکی ہے۔

یہ آیت واضح طور پر مذکورہ اعتراض کو رد کرتی ہے۔ دین کو تسلیم کرنے کا معاملہ دل سے ہے۔ اگر دل کسی دین کی صداقت کو قبول نہیں کرتا تو ہزار تلواریں کسی کے گلے پر رکھ دیں تو اس کے دل میں دین کی سچائی داخل نہیں کی جا سکتی۔ اگر جبراً کسی کو دین قبول کرالیا جائے تو وہ شخص اس دین کا حامی نہیں ہوگا۔ بلکہ منافق ہوگا۔ نفاق کسی دین کی مضبوطی کا باعث نہیں بن سکتا۔ نہ جبراً دین کو قبول کرنے والے اس دین کے لیے جان دینے کو تیار ہوتے ہیں جب اسلام کی تاریخ کا مطالعہ کیا جائے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اسلام جان نثاروں کی قربانیوں سے پھیلا ہے کہ کس طرح انہوں نے اسلام کی خاطر جانیں دیں اور ظلم و جبر کے سامنے سر تسلیم نہیں کیا۔ جان دے دی لیکن متاع دین کو ضائع نہیں ہونے دیا۔

دوسری جگہ دعوت اسلام کے لیے حکمت اور موعظہ حسنہ کے اصول مقرر کیے ہیں اور ارشاد الٰہی ہے۔

اُدْعُ اِلٰى سَبِيْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَ جَادِلْهُمْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ (النحل16:125)

اے نبی اپنے رب کے راستہ کی طرف حکمت اور عمدہ نصیحت کے ساتھ دعوت دو اور لوگوں سے احسن طریقہ سے مجادلہ کرو۔

یہ آیت معترضین کے اعتراض پر کاری ضرب ہے اور واضح کرتی ہے کہ اسلام کی تبلیغ حکمت اور موعظہ حسنہ کے ساتھ ہونی چاہیے نہ کہ بزور شمشیر۔

مزعومہ آیت سیف:

معترضین نے سورۃ توبہ کی پانچویں آیت کو آیت سیف قرار دیا ہے۔ گویا اس میں تمام مشرکین اور کفار کو بلا امتیاز قتل کرنے کا عام حکم ہے اس آیت سے غلط فہمی کی وجہ یہ ہے کہ مذکورہ آیت کے الفاظ کو سیاق وسباق سے الگ کر کے پڑھا گیا ہے۔ پانچویں آیت کے الفاظ یہ ہیں۔

فَإِذَا انسَلَخَ الْأَشْهُرُ الْحُرُمُ فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِينَ حَيْثُ وَجَدتُّمُوهُمْ (توبہ 5:9)

پھر جب حرمت والے مہینے گزر جائیں تو ان مشرکوں کو جہاں پاؤ قتل کرو۔

لیکن ایسے ہی الفاظ اسی موضوع پر ایک نہایت ابتدائی وحی میں بھی پائے جاتے ہیں۔

وَاقْتُلُوهُمْ حَيْثُ ثَقِفْتُمُوهُمْ (بقرہ 191:2)

اور جہاں ان کو پاؤ قتل کرو۔

جب ان آیات کے سیاق وسباق پر غور کرتے ہیں تو واضح ہو جاتا ہے کہ یہ حکم ان لوگوں کے متعلق ہے، جنہوں نے مسلمانوں سے معاہدے کیے پھر بد عہدی کر کے ان معاہدوں کو توڑ دیا اور مسلمانوں کو ختم کرنے کے لیے حملہ کرنے میں سبقت کی۔ یہ حکم تمام دنیا کے مشرکین کے متعلق نہیں بلکہ یہ مخصوص حکم صرف بد عہد حملہ کرنے والے مشرکین کے متعلق ہے۔ اگر پانچویں آیت سے ماقبل کی آیت کو پڑھ لیں تو اعتراض خود بخود دور ہو جاتا ہے اس حکم میں وہ مشرکین قبائل شامل نہیں جو اپنے عہد و پیمان پر قائم رہے اور یہ حکم صرف ان مشرک قبائل کے متعلق ہے جنہوں نے بار بار عہد توڑا جیسا کہ سورۃ انفال کی آیت 56 میں مذکور ہے لہٰذا یہ خیال بالکل غلط ہے کہ یہ حکم دنیا کے تمام مشرکین کے لیے ہے یا عرب کے رہنے والے تمام مشرکین کے لیے۔ اس آیت سے ماقبل والی آیت ان مشرکین قبائل کو الگ کرتی ہے جن سے دوستانہ تعلقات قائم تھے ارشاد الٰہی ہے۔

إِلَّا الَّذِينَ عَاهَدتُّم مِّنَ الْمُشْرِكِينَ ثُمَّ لَمْ يَنقُصُوكُمْ شَيْئًا وَلَمْ يُظَاهِرُوا عَلَيْكُمْ أَحَدًا فَأَتِمُّوا إِلَيْهِمْ عَهْدَهُمْ إِلَىٰ مُدَّتِهِمْ إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِينَ (توبہ 4:9)

مگر جن مشرکوں کے ساتھ تم نے عہد کیا پھر انہوں نے تمہارے ساتھ کوئی کمی نہیں کی اور تمہارے خلاف کسی کی مدد نہیں کی۔ تو ان کے ساتھ ان کا عہد ان کی مدت تک پورا کرو اور اللہ متقیوں سے محبت رکھتا ہے۔

اسی طرح آیت 5 کے بعد والی آیت ان لوگوں کو بھی مستثنیٰ قرار دیتی ہے جو مسلمانوں کی پناہ ڈھونڈتے ہیں ارشاد الٰہی ہے۔

وَإِنْ أَحَدٌ مِّنَ الْمُشْرِكِينَ اسْتَجَارَكَ فَأَجِرْهُ حَتَّىٰ يَسْمَعَ كَلَامَ اللَّهِ ثُمَّ أَبْلِغْهُ مَأْمَنَهُ ذَٰلِكَ بِأَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَعْلَمُونَ (توبہ 6:9)

اور اگر ان مشرکوں میں سے کوئی تجھ سے پناہ مانگے تو اس کو پناہ دے دو یہاں تک کہ وہ اللہ کا کلام سن لے پھر اس کو اس کی امن کی جگہ پہنچا دو یہ اس لیے کہ وہ ایسے لوگ ہیں جو جانتے نہیں۔

اس آیت میں واضح طور پر یہ بیان کیا گیا ہے اگر دین اسلام کے متعلق کچھ معلومات دریافت کرنے کے لیے تم سے امن مانگیں تو ان کو امن دو۔ یہاں یہ بیان نہیں کیا گیا جو سن کر دائرہ اسلام میں داخل نہیں ہوتے تو ان کو قتل کر دو بلکہ یہ کہا گیا ہے کہ امن کے ساتھ ان کی قوم کے مقام سکونت میں واپس کر دو یہ آیت ظاہر کرتی ہے کہ کسی معاہد قوم کا کوئی آدمی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے قرآن مجید کی تعلیم سن کر بھی

مسلمان نہیں ہوتا تو ان کو امن کے ساتھ اس کے گھر تک پہنچا دیا جائے سو معترضین نے آیت 5 پر سیاق وسباق کو نظر انداز کر کے اعتراض کیا ہے اور "خاص حکم" کو عام حکم کا درجہ دے دیا ہے۔

صلح کی سفارش:

اگر بزور شمشیر لوگوں کو دائرہ اسلام میں داخل کرنے کا حکم ہوتو پھر جب تک وہ لوگ دائرہ اسلام میں داخل نہیں ہوتے اس وقت تک جنگ جاری رکھنے کا حکم ہونا چاہیے لیکن اس کے برعکس اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ اگر محاربین صلح کی طرف مائل ہوں تو مسلمانوں کو بھی مائل ہو جانا چاہیے۔ یہ ہے امن اور صلح کی تعلیم۔ امن اور صلح کو مقدم رکھا ہے اور جارحانہ اقدام سے منع کر دیا ہے ارشاد الٰہی ہے۔

وَاِنْ جَنَحُوْا لِلسَّلْمِ فَاجْنَحْ لَهَا وَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ وَاِنْ يُّرِيْدُوْٓا اَنْ يَّخْدَعُوْكَ فَاِنَّ حَسْبَكَ اللّٰهُ (انفال 8:61،62)

اگر وہ صلح کی طرف جھکیں تو تُو بھی اس کی طرف جھک جا اور اللہ پر بھروسہ رکھو اور وہ سننے والا جاننے والا ہے اور اگر ان کا ارادہ ہو کہ تجھے دھوکا دیں تو اللہ تجھے کافی بس وہی ہے۔

یہ آیت ظاہر کرتی ہے کہ اسلام صلح کو مقدم کرتا ہے۔ کیا یہ اس دین کی تعلیم ہو سکتی ہے جو تمام دنیا میں بزور شمشیر اسلام پھیلانا چاہتا ہو، یہاں یہ فرمایا ہے اگر وہ تجھ سے دھوکا دینے کا بھی ارادہ رکھتے ہوں تو پھر بھی صلح کی طرف مائل رہیں۔ ان کے دھوکے کے مقابل پر اللہ خود کافی ہے اور مسلمانوں کی مدد کرے گا۔

تاریخ یہ بتاتی ہے کہ دشمنوں نے جب کبھی بھی صلح کی طرف ہاتھ بڑھایا تو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے صلح کی دعوت کا مثبت جواب دیا۔ صلح حدیبیہ کے موقع پر صرف صلح اور امن کی خاطر ایک شکست خوردہ فریق کی حیثیت کو بھی قبول کرنے سے دریغ نہیں کیا جب کہ مسلمانوں نے کفار کو ہر میدان میں شکست دی تھی اور صحابہ نے بدترین حالات میں بھی مقابلہ کرنے کے لیے آپ ﷺ کے ہاتھ پر اپنی جانیں قربان کرنے کی بیعت کر لی تھی۔ جب کفار صلح کی طرف مائل ہوا تو ان کی شرائط پر صلح قبول کر لی۔

یہ ہے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا اُسوہ حسنہ کہ صلح کو جنگ پر ترجیح دی لہٰذا بزور شمشیر اسلام پھیلانے کا نظریہ بالکل باطل اور محض ایک غلط افسانہ ہے۔

جنگ کب ختم ہوگی:

اگر مخالفین کے اعتراض کو سامنے رکھیں تو پھر لوگوں کا دائرہ اسلام میں داخل ہونے سے بھی جنگ ختم نہیں ہونی چاہیے لیکن جب قرآن پر نظر ڈالتے ہیں تو واضح ہو جاتا ہے کہ جب کفار لڑائی سے دست کش ہو جائیں تو مسلمانوں کی طرف سے لڑائی ختم ہو جانی چاہیے ارشاد الٰہی ہے۔

وَقٰتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ لِلّٰهِ فَاِنِ انْتَهَوْا فَلَا عُدْوَانَ اِلَّا عَلَى الظّٰلِمِيْنَ (البقرہ 2:193)

اور ان سے جنگ کرو یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہے اور دین صرف اللہ کے لیے ہو پھر اگر وہ رک جائیں تو سزا ظالموں کے سوا اور کسی کے لیے نہیں۔

اس آیت میں پہلے تو یہ بیان کیا گیا ہے کہ جنگ کا مقصد دفع فتنہ ہے فتنہ کیا ہے امام راغب کے نزدیک عذاب اور دکھ ہے۔ یعنی کفار جو مسلمانوں کے لیے باعث عذاب اور دکھ بنے ہوئے تھے ان کی وہ ایذائیں ختم ہو جائیں یعنی دوسرے الفاظ یہ کہا جا سکتا ہے کہ اسلام کی رو سے جنگ کا مقصد صرف قیام امن ہے دوسرا مقصد یہ بیان کیا ہے دین صرف اللہ کے لیے ہو۔ یعنی دین کے بارے میں کسی طرف سے جبر

نہ رہے۔لوگ اپنے اپنے دین پر برضاورغبت قائم رہیں اور کسی طرف سے جبراً ارتداد کی کارروائی نہ ہو۔تیسری ضروری بات یہ بیان کی ہے اگر دشمن لڑائی سے دست کش ہو جائیں تو پھر لڑائی سے رک جانا چاہیے اگر بزور شمشیر اسلام کی اشاعت لازمی ہوتی تو پھر یہ حکم کیوں ہوتا کہ اگر دشمن لڑائی سے رک جائے تو پھر مسلمانوں کو بھی ہتھیار پھینک دینے چاہیں۔لہٰذا اسلام نے لڑائی کی یہ شرط عائد کردی ہے کہ اگر دشمن لڑائی سے رک جاتا ہے تو مسلمان بھی لڑائی سے رک جائیں۔رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کئی مواقع پر دشمن سے صلح کی اور جب مشرک قبائل نے صلح کرنا چاہی تو آپ ﷺ نے جنگ بند کردی اور جب آپ ﷺ نے کسی قوم پر غلبہ پالیا تو آپ ﷺ نے ان کو کامل مذہبی آزادی دے دی۔جیسا کہ فتح مکہ کے موقعہ پر وقوع میں آیا۔اس طرح رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا آخری معرکہ جنگ تبوک سے واضح ہو جاتا ہے کہ اس مہم کا مقصد صرف دفاع تھا جب رسول کریم ﷺ روم کی سرحد کی طرف تیس ہزار سپاہ کی جمعیت لے کر روانہ ہو گئے اتنے دور دراز اور تکلیف دہ سفر کے بعد سرحد پر پہنچے تو جب معلوم ہوا کہ رومی کسی طرح پر جارحانہ کارروائی کے لیے تیار نہیں تو آپ بغیر حملہ کیے واپس تشریف لے آئے۔یہ رسول کریم کا اُسوہ حسنہ ظاہر کرتا ہے کہ رسول کریم ﷺ کی جنگوں کا مقصد صرف دفاع تھا نہ کہ بزور شمشیر لوگوں کو اسلام میں داخل کرنا۔رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں ایک واقعہ بھی نہیں ملتا۔کہ آپ ﷺ نے کسی قبیلہ یا فرد کو تلوار یا اسلام میں سے کسی ایک کو انتخاب کرنے کی دعوت دی ہے۔اسی طرح خلفاء راشدین کا دور ہے۔

اسلام، جزیہ یا تلوار:

حضرت ابوبکر جب خلیفہ بنے تو عرب میں باغیوں نے سر اٹھایا تو حضرت ابوبکر نے اس بغاوت کو فرد کرنے کی کوشش کی۔تو ایران اور روم دونوں نے باغیوں کی ہر طرح مدد کی تو ملکی سرحدوں کے دفاع کے لیے حضرت ابوبکر نے باغیوں کے خلاف فوجی کارروائی کی اور بغاوت کو فرو کرنے کے لیے یہ ضروری تھا کہ ان ملکوں کے خلاف بھی کاروائی کی جائے جو باغیوں کی مدد کررہے تھے میور جو اسلام کا شدید مخالف ہے اس نے بھی اپنی کتاب ''دی کیلیفٹ صفحہ 461 پر اس بات کی تائید کی ہے وہ لکھتا ہے'' چالڈیا اور جنوبی سیریا فی الحقیقت عرب میں شامل ہیں جو اقوام اس علاقہ میں آباد تھیں ان میں کچھ تو بت پرست اور زیادہ تر (کم از کم برائے (نام) عیسائی تھے۔وہ عرب نسل کا ایک جز ولاینفک تھے اور اس وجہ سے بلا واسطہ نئے مذہب کے حلقہ میں تھے لیکن جب سرحد پر مسلمانوں سے یہ قومیں متصادم ہوئیں تو ان کے اپنے اپنے ہم مذہب حاکموں نے ان کی امداد کی۔مغربی علاقہ میں رہنے والوں کی قیصر نے مدد کی اور مشرقی علاقہ میں رہنے والوں کی مدد خسرو نے کی اس طرح کشمکش زیادہ بڑھ گئی۔''

یہ تھی روم اور ایران کے ساتھ لڑائی کی وجہ۔ان ہر دو سلطنتوں نے عرب باغیوں کی مدد کی۔صرف مدد ہی نہیں بلکہ بغاوت کے لیے اکسایا اور اپنے فوجوں کے ساتھ مدد کی۔مسلمان بین الاقوامی قانون کے تحت محض اپنی حفاظت کے لیے ان بڑی سلطنتوں سے ٹکرا گئے اور اس کے بغیر مسلمانوں کے لیے کوئی چارہ نہیں تھا اور ان کے دلوں میں اسلام بزور شمشیر پھیلانے کا ہرگز خیال نہ تھا۔وہ محض سرحدوں کے دفاع کے لیے کوشش کررہے تھے میور کے نزدیک ایران کی فتح بھی مسلمانوں کا ایک دفاعی اقدام تھا اور جارحانہ حملہ نہ تھا۔چنانچہ وہ لکھتا ہے۔

عمر پر یہ حقیقت واضح ہوگئی پیش قدمی پر جو پابندی لگائی گئی ہے اس کو دور کرنا ضروریات میں سے ہے اپنے دفاع کے لیے خسرو کو پامال کرنے اور اس کی ساری سلطنت پر قبضہ کرنے کے سوائے اور کچھ مدنظر نہ تھا (دی کیلیفٹ ص 172)

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابوبکر اور حضرت عمر کے دور میں روم اور ایران سے جو لڑائیاں لڑی گئیں تو محض دفاعی نقطہ نگاہ سے لڑی گئیں اگر روم اور ایران کی افواج کا مقابلہ مسلمان اپنی سرحدوں سے باہر نکل کر نہ کرتے تو مسلمان اندرونی شورشوں کا شکار رہتے۔

ایک حدیث اور غلط تشریح:

جس طرح سورہ توبہ کی آیت 5 سے غلط نتیجہ نکالا ہے اسی طرح ایک حدیث ہے جس سے غلط نتیجہ اشاعت بزور شمشیر نکالا ہے۔ وہ حدیث یہ ہے۔

عَنِ ابْنِ عُمَرَ اِنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اُمِرْتُ اَنْ اُقَاتِلَ النَّاسَ حَتّٰى يَشْهَدُوْا اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَ اَنَّ مُحَمَّدًا رَسُوْلُ اللّٰهِ وَ يُقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوا الزَّكٰوةَ فَاِذَا فَعَلُوْا ذٰلِكَ عَصَمُوْا مِنِّىْ دِمَاءَ هُمْ وَاَمْوَالَهُمْ اِلَّا بِحَقِّ الْاِسْلَامِ وَ حِسَابُهُمْ عَلَى اللّٰهِ (بخاری کتاب الایمان باب ان تابوا و اقاموا الصلوٰۃ واتوا الزکوۃ فخلوا سبیلھم)

ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں لوگوں سے جنگ جاری رکھوں جب تک کہ وہ گواہی دیں کہ اللہ کے سوائے کوئی معبود نہیں اور کہ محمد اللہ کے رسول ہیں اور نماز قائم کریں اور زکوٰۃ دیں پس جب ایسا کریں تو انہوں نے خونوں اور مالوں کو مجھ سے بچالیا سوائے اسلام کے حق کے اور ان کا حساب اللہ پر ہے۔

پہلے یہ بیان کیا جا چکا ہے کہ قرآن میں واضح طور پر یہ اصول وضع کیا گیا ہے کہ دین میں کوئی جبر نہیں حدیث اس کی تردید کیونکر کر سکتی ہے۔ سو قرآن مجید کے وضع کردہ اصول کی روشنی میں اس حدیث کا جائزہ لینا ہوگا۔

یہ ایک بدیہی امر ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو جو احکام دیئے گئے ہیں وہ سب قرآن مجید میں منضبط ہیں۔ چنانچہ یہ حدیث قرآن مجید کی اس آیت کی طرف اشارہ کرتی ہے ارشاد الٰہی ہے۔

فَاِنْ تَابُوْا وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ فَاِخْوَانُكُمْ فِى الدِّيْنِ (توبہ 11:9)

سو اگر توبہ کریں اور نماز قائم کریں اور زکوٰۃ دیں تو دین میں تمہارے بھائی ہیں۔

حدیث کا نفس مضمون بعینہٖ یہی ہے جو آیت مذکورہ کا ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ الفاظ کا مطلب اور منشا سیاق و سباق کی آیات سے اخذ کیا جائے۔ ارشاد الٰہی ہے۔

(آیت 11) لَا يَرْقُبُوْنَ فِىْ مُؤْمِنٍ اِلًّا وَّ لَا ذِمَّةً وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُعْتَدُوْنَ۔ (توبہ 10:9)

کسی مومن کا لحاظ نہیں کرتے ناطے کا اور نہ ہی عہد کا اور وہ حد سے بڑھے ہوئے ہیں۔

فَاِنْ تَابُوْا وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ فَاِخْوَانُكُمْ فِى الدِّيْنِ وَنُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ (توبہ 11:9)

سو اگر توبہ کریں اور نماز قائم کریں اور زکوٰۃ دیں تو دین میں تمہارے بھائی ہیں اور ہم ان لوگوں کے لیے باتیں کھول کر بیان کرتے ہیں جو علم رکھتے ہیں۔

وَاِنْ نَّكَثُوْا اَيْمَانَهُمْ مِّنْ بَعْدِ عَهْدِهِمْ وَ طَعَنُوْا فِىْ دِيْنِكُمْ فَقَاتِلُوْا اَئِمَّةَ الْكُفْرِ اِنَّهُمْ لَا اَيْمَانَ لَهُمْ لَعَلَّهُمْ يَنْتَهُوْنَ (توبہ 11:9)

اور اگر وہ اپنے عہد کے بعد اپنی قسمیں توڑیں اور تمہارے دین میں عیب لگائیں تو کفر کے سرداروں کے ساتھ جنگ کرو ان کی قسمیں کچھ نہیں، تا کہ وہ باز آئیں۔

ان آیات سے واضح ہوتا ہے کہ بعض قبائل ایسے تھے کہ جنہیں نہ تو رشتے ناطے کا لحاظ تھا اور نہ معاہدوں کا جو انہوں نے کیے تھے انہوں نے مسلمانوں پر حملہ کرنے میں سبقت کی اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو نکالنے کے منصوبہ بناتے رہتے تھے یہ تھے وہ لوگ جن کے خلاف جنگ کرنے کا حکم تھا۔

سورۃ توبہ 9ہجری کی ہے جبکہ قبائل جودر جوق دائرہ اسلام میں داخل ہور ہے تھے ان کے لیے ایسی حالت میں یہ شرط عائد کردی گئی کہ اگر کوئی قبیلہ جو اسلام کا دشمن تھا اور معاہدات کو توڑنے والا تھا اور مسلمانوں سے برسر پیکار رہتا تھا اب اگر اسلام کو قبول کرلے تو اس سے لڑائی ختم کردی جائے کیونکہ اب وہ تمہارے دینی بھائی بن گئے ہیں۔ سابقہ تمام نقصانات کو بھلا دیا گیا اور ان کو اپنا دینی بھائی اقرار دے دیا گیا اور تمام مخاصموں اور مخالفتوں کو بھلا دیا گیا۔

اس حدیث کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ حکم دیا گیا تھا کہ وہ جنگ کو جاری رکھیں جب تک کہ وہ لوگ دائرہ اسلام میں داخل نہیں ہوتے اس کا صرف یہ مفہوم ہے کہ آپ ﷺ کو حکم دیا گیا تھا کہ جیسا کہ قرآن مجید کی آیات سے ظاہر ہے وہ لوگ جو مسلمانوں سے جنگ کررہے تھے اکثر برضا ورغبت خود دائرہ اسلام میں داخل ہو جائیں تو ان سے جنگ بند کردی جائے حتیٰ کہ ان لوگوں کو بھی سزا نہیں دی جائے گی جن کے ہاتھوں سے مسلمانوں کو نقصان پہنچا تھا۔ اس مفہوم اور مطلب کی تائید احادیث سے بھی ہوتی ہے بخاری کتاب 56 الجہاد والسیر باب 28 الکافر یقتل المسلم الخ۔

مقداد ابن عمر الکندی نے حضرت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں بیان کیا۔

''میں جنگ میں کفار میں سے ایک شخص کے مقابلہ میں آتا ہوں اگر ہم ایک دوسرے سے جنگ کریں اور...... وہ اپنی تلوار سے میرا ایک ہاتھ کاٹ دے پھر وہ ایک درخت کی پناہ لے اور کہہ دے کہ اَسۡلَمۡتُ لِلّٰهِ میں خدا کا فرمانبردار بن گیا (یعنی مسلمان ہو گیا) تو یارسول اللہ کیا میں اس کو قتل کرسکتا ہوں جبکہ اس نے ایسے الفاظ بول دیئے ہوں۔ (یعنی اسلام قبول کرنے کا اعلان کردیا)

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اس کو مت قتل کرو۔''

اس نے عرض کیا: ''لیکن یارسول اللہ! اس نے میرا ایک ہاتھ کاٹ ڈالا تھا اور یہ الفاظ اس نے میرا ہاتھ کاٹ ڈالنے کے بعد کہے۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ:

اس کو مت قتل کرو اگر تو اس کو قتل کردے گا تو اس کو تمہارا درجہ مل جائے گا جو اس کے قتل کرنے سے پہلے حاصل تھا اور تمہیں اس کا درجہ مل جائے گا جو اس کو اپنے اس کلمے کے کہنے سے پہلے حاصل تھا۔ (بخاری کتاب المغازی باب 12)

اس سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ نبی کریم کے واضح احکام تھے اور صحابہ کو ان کا علم بھی تھا کہ اگر کوئی قبیلہ یا کوئی شخص دائرہ اسلام میں داخل ہو جائے تو اس سے فوراً جنگ بند کردی جائے۔

پس مذکورہ حدیث کو اسی مفہوم میں لینا چاہیے۔

دوسری حدیث:

ایک دوسری حدیث ہے جس سے غلط نتیجہ اخذ کیا گیا ہے وہ یہ ہے ''جو کوئی اعلائے کلمۃ اللہ کے لیے جنگ کرتا ہے ان الفاظ کو سیاق وسباق سے الگ کر کے غلط مفہوم اخذ لیا گیا ہے کہ ان میں اشاعت اسلام کے لیے جنگ کرنے کی تعلیم دی گئی ہے جب سیاق وسباق کو دیکھا جائے تو ان الفاظ کا مفہوم واضح ہو جاتا ہے یہ حدیث اس طرح ہے ایک صحابی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور اس نے عرض کی۔

''ایک شخص لوٹ مار کے لیے جنگ کرتا ہے دوسرا شہرت کے لیے اور تیسرا بہادری دکھانے کے لیے ان سب سے کون سی جنگ فی سبیل اللہ ہے؟ حضرت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب دیا۔ ''وہ شخص جو اس لیے جنگ کرتا ہے کہ اللہ کا نام بلند ہو اسی کی جنگ فی سبیل اللہ ہے'' (بخاری کتاب 56 الجہاد والسیر باب 15 من قاتل لتكون كلمة هي العلياء)

تمام حدیث کو سامنے رکھا جائے تو مفہوم واضح ہو جاتا ہے کہ جو شخص اللہ کے رستہ میں جہاد کرتا ہے تو اس کو نفسانی خواہشات سے بالاتر ہو کر جنگ کرنی چاہیے۔ جہاد فی سبیل اللہ کا مفہوم پہلے قرآن اور حدیث کی روشنی میں واضح کیا جا چکا ہے کہ اس سے مراد صرف حفاظت خود اختیاری اور سرحدوں کی مدافعت ہے۔ اسی کا نام مذہب کی حفاظت ہے۔ بناء بریں مذہب کی حفاظت اعلائے کلمۃ اللہ کے مترادف ہے۔ قرآن مجید میں یہ الفاظ ہی حضرت نبی کریم ﷺ کی ہجرت کے موقعہ پر استعمال ہوئے ہیں۔ حضرت رسول کریم کا بحفاظت مدینہ میں پہنچ جانے کو کافروں کی بات کو نیچا کرنے اور خدا کی بات کو بلند کرنے سے تعبیر کیا گیا ہے ارشاد الٰہی ہے۔

جَعَلَ كَلِمَةَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا السُّفْلٰى وَكَلِمَةُ اللّٰهِ هِيَ الْعُلْيَا (توبہ: ۴۰)

اور ان لوگوں کی بات کو جو کافر تھے نیچا کر دکھایا اور اللہ تعالیٰ کی بات ہی بلند ہے۔

مستشرقین اور مخالفین نے اس قسم کی احادیث کا غلط مفہوم لیا ہے کہ اسلام وہ دین ہے جس نے جان و مال اور ابرو کی حرمت اور حفاظت پر بہت زور دیا ہے ارشاد الٰہی ہے۔

مَنْ قَتَلَ نَفْسًا بِغَيْرِ نَفْسٍ اَوْ فَسَادٍ فِي الْاَرْضِ فَكَاَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيْعًا وَمَنْ اَحْيَاهَا فَكَاَنَّمَا اَحْيَا النَّاسَ جَمِيْعًا (المائدہ 32:5)

جو کوئی کسی جان کو بغیر جان کے (بدلہ لے) یا زمین میں فساد کے مار ڈالے تو گویا اس نے سب لوگوں کو مار ڈالا اور جو کوئی اس کو زندہ رکھے تو گویا اس نے سب لوگوں کو زندہ رکھا۔

دوسری جگہ آتا ہے۔

وَلَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِي حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ (بنی اسرائیل 33:17)

اور اس جان کو قتل نہ کرو جسے اللہ نے حرام ٹھہرایا ہے مگر حق کے ساتھ۔

اسی تعلیم کی روشنی میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ تعلیم دی، مسلمان وہ ہے جس کی زبان اور ہاتھ سے مسلمان محفوظ رہیں۔ (بخاری 3:2) ایک اور حدیث میں آیا ہے کہ مسلمان وہ ہے جس کی زبان اور ہاتھ سے کسی انسان کو تکلیف نہ پہنچے۔

حجۃ الوداع کے موقع پر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

اِنَّ دِمَاءَكُمْ وَاَمْوَالَكُمْ وَاَعْرَاضَكُمْ حَرَامٌ كَحُرْمَةِ يَوْمِكُمْ هٰذَا (بخاری کتاب الحج)

تمہاری جانیں اور تمہارے مال اور تمہاری ابروئیں ویسی ہی حرمت رکھتی ہیں جیسے آج کے دن کی حرمت ہے (یعنی حج کے دن کی)

اسلام نے صرف جان، مال اور عزت کی حفاظت کی تعلیم ہی نہیں دی۔ بلکہ ہر قسم کے ظلم کے ارتکاب سے منع کیا۔ قرآن مجید میں آتا ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ (بقرہ 190:2)

اللہ ظلم وزیادتی کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔

دوسری جگہ آتا ہے۔

وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ الظّٰلِمِيْنَ (عمران 57:3)

اللہ ظلم کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔

ایک اور موقع پر آتا ہے۔

اِنَّمَا السَّبِيْلُ عَلَى الَّذِيْنَ يَظْلِمُوْنَ النَّاسَ وَيَبْغُوْنَ فِي الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ (شوریٰ 42:42)

وہ لوگ مجرم ہیں جو انسانوں پر ظلم کرتے ہیں اور ناحق بغاوت، فتنہ یا فساد برپا کرتے ہیں۔

اسلام کی اس تعلیم کی موجودگی میں اسلام پر جو بھی لوٹ مار، اشاعت اسلام بزور شمشیر کے اعتراضات لگائے جاتے ہیں باطل ہو جاتے ہیں اور قاری پر یہ واضح ہو جاتا ہے کہ اسلام ہی سلامتی اور امن کا دین ہے اور یہی انسانیت کا مذہب ہے۔

......☆......

اسلام کی اشاعت بزور شمشیر میکڈونلڈ کا غلط تصور

اعتراض: ویسے تو مجموعی طور پر تمام مستشرقین اور مخالفین کا اعتراض ''اسلام کی اشاعت بزور شمشیر'' کا رد قرآن، حدیث اور تاریخ کی روشنی میں کر دیا گیا ہے لیکن میکڈونلڈ نے اپنے اعتراض کو صحیح ثابت کرنے کے لیے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے خطوط بنام والیاں کا حوالہ دیا ہے لکھتا ہے یقیناً اردگرد کی سلطنتوں کو خطوط تحریر کرنے کی کہانی ظاہر کرتی ہے کہ ایسا عالمگیر موقف ان کے دماغ میں پوری طرح جاگزین تھا۔

جواب: جیسا کہ پہلے یہ ذکر کیا جا چکا ہے کہ قرآن مجید اور حدیث میں کہیں بھی بزور شمشیر اشاعت اسلام کا ذکر نہیں تو پھر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ذہن میں یہ تصور کیسے سما سکتا تھا اردگرد کی سلطنتوں کے والیاں کو جو خطوط تحریر کیے گئے تھے۔ ان کی عبارت سے واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ وہ خطوط تبلیغی تھے۔ چونکہ رسول کریم ﷺ کی بعثت عالمگیر تھی (سبا:28) اس لیے ان کے لیے یہ ضروری تھا کہ آپ ﷺ توحید کا پیغام لوگوں تک پہنچاتے اپنے فرض منصبی کی تکمیل کے لیے آپ نے والیان کے نام خطوط تحریر کیجیے۔ ان خطوط میں بزور شمشیر اشاعت اسلام کہیں بھی ذکر نہیں۔ ان میں سے ایک مکتوب کا جو قبطیوں کے بادشاہ کو تحریر کیا تھا۔ اس کا متن ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔ (تمام خطوط انہی الفاظ میں لکھے گئے تھے)

''میں تجھے اسلام کی دعوت دیتا ہوں تو مسلمان ہو اور تو امن میں آ جائے گا اللہ تجھے دو چند اجر دے گا لیکن اگر تو پیٹھ پھیر دے گا تو قبطیوں کا گناہ تجھ پر ہو گا۔

يَآَهْلَ الْكِتٰبِ تَعَالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَآءٍ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهٖ شَيْئًا وَّلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُوْلُوا اشْهَدُوْا بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ (آل عمران ۶۴)

اے اہل کتاب ایک حکم کی طرف آ جاؤ جو ہمارے اور تمہارے درمیان برابر ہے کہ اللہ کے سوا کسی کی پرستش نہ کریں اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرائیں اور نہ ہم میں سے بعض بعض کو اللہ کے سوائے معبود بنائیں اگر پھر جاؤ تو کہہ دو کہ اس بات پر گواہ رہنا کہ ہم مسلمان ہیں۔

یہ مکتوب صرف دعوت اسلام ہے جو آپ نے اپنے فرض منصبی کی تکمیل کے لیے لکھا تھا۔ کیونکہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ حکم تھا۔

بَلِّغْ مَا اُنْزِلَ اِلَيْكَ

جو تجھ پر اتارا گیا ہے اس کو لوگوں تک پہنچا دو۔ سو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے فرض کو پورا کرنے کے لیے والیان کو خطوط لکھے۔ ان میں بزور شمشیر اشاعت اسلام کا کہیں ذکر نہیں۔ کہیں یہ ذکر نہیں اگر تم نے اسلام قبول نہ کیا تو تم پر چڑھائی کر دی جائے گی۔

الغرض میکڈونلڈ نے اپنے مقالہ ''جہاد'' میں بزور شمشیر اشاعت اسلام کا ذکر کیا ہے اور جس تاریخی واقعہ پر اس کی بنیاد رکھی ہے وہ بالکل

غلط ہے۔ دوم قرآن مجید اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تمام زندگی اعتراض کو رد کرتی ہیں۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تمام جنگیں دفاعی تھیں۔ ان جنگوں کی اہم خصوصیت یہ ہے کہ آپؐ نے اس دور کی جنگوں کے مظالم کی عملاً اصلاح کی قتل وغارت اور لوٹ مار سے سختی سے روکا۔

......☆......

جہاد عارضی حکم تھا (ڈرمنگھم)

اعتراض : ڈرمنگھم کے نزدیک جہاد کا حکم صرف رسول کریم ﷺ کی زندگی کے لیے تھا۔ وہ اس حکم کو عام نہیں مانتے۔

جواب :اول تو ڈرمنگھم جہاد کے تصور کو ہی نہیں سمجھا۔ اس نے صرف جہاد کے معنی قتال (لڑائی) لیے ہیں۔ جو اسلام کے تصور جہاد کے منافی ہیں۔ جیسا کہ پہلے یہ ذکر کیا جا چکا ہے کہ جہاد اصلاح نفس، تبلیغ اسلام بالقرآن والقلم اور دفاع کفر کے لیے استعمال ہوا جو شخص بھی خدا کا قرب حاصل کرنے کے لیے کوشش کرتا ہے وہ جہاد ہے لہٰذا اصلاح نفس (69:29) اور تبلیغ اسلام بالقرآن والقلم کا حکم تا قیامت ہے اس لیے یہ کہنا کہ جہاد کا حکم صرف رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی تک محدود تھا غلط ہے۔

جہاں تک لڑائی کا تعلق ہے اس کا حکم بھی عارضی نہیں بلکہ تمام مسلمانوں کو یہ حکم ہے کہ جب دشمن کی طرف سے ان کی ملکی سرحدوں کو خطرہ ہو تو اس کے دفاع کے لیے ہتھیار بند ہو جاؤ۔ ملکی دفاع کا فریضہ مسلمانوں کے لیے دائمی ہے یہ نہیں ہو سکتا کہ دشمن سرحدوں کو پامال کر رہا ہو اور مسلمان ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھے رہیں ارشاد الٰہی ہے۔

وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَا اسْتَطَعْتُمْ مِنْ قُوَّةٍ وَّمِنْ رِبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُوْنَ بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ وَعَدُوَّكُمْ (انفال 60:8)

تم سے جہاں تک ہو سکے دشمن کے مقابلہ کے لیے قوت اور گھوڑے جمع کرو تا کہ تم اس طرح خدا کے دشمن اور اپنے دشمن کو ڈرائے رکھو۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں جو جنگیں لڑی گئی تھیں ان کا ذکر قرآن مجید میں ہے۔ ان کا تعلق بھی صرف رسول کریم ﷺ کے زمانہ تک نہیں بلکہ ان میں بھی مسلمانوں کے لیے عمومی سبق ہے۔ ان میں مسلمانوں کے لیے چشمہ ہدایت ہے جس پر گامزن ہو کر دشمن کے مقابل پر کامیابی حاصل کر سکتے ہیں۔

ڈرمنگھم نے جہاد کا جو تصور پیش کیا دراصل وہ ایک نفسیاتی معاملہ ہے وہ دراصل مسلمانوں کے جذبہ جہاد سے خائف ہے اور اسلام کے تصور جہاد کو رسول کریم کے دور تک محدود کرنا چاہتا ہے۔

......☆......

مرتد کی سزا

اعتراض: مرتد کی سزا قتل (ظالمانہ تعلیم)

یہ وہ اعتراض ہے صرف ایک مستشرق یا مخالف نے نہیں کیا جس طرح جہاد پر مختلف پہلوؤں اور زاویوں سے اعتراضات کیے گئے ہیں اس طرح ارتداد کی سزا کو بھی کثرت کے ساتھ ہدف تنقید بنایا گیا ہے۔ رابرٹ سپنسر کی کتاب۔

The truth about Muhammad founder of the world's most intolerant Religion.
کے صفحہ 147 اور ابن وراق نے اپنی کتاب Why i am not a Muslim کے صفحہ 175 پر اس اعتراض کو بیان کیا ہے اسی طرح جس مخالف نے بھی اسلام کے خلاف قلم اٹھایا ہے اس نے ارتداد کی سزا کا ذکر کیا ہے اور اس کو ظالمانہ تعلیم قرار دیا ہے۔

جواب: اس اعتراض کی اہمیت کے پیش نظر اس کا جواب دینا ضروری ہے اگر اس کا جواب نہ دیا جائے تو یہ کتاب نامکمل سمجھی جائے گی۔

اسلامی اصطلاح میں مرتد اس شخص کو کہا جاتا ہے جو اسلام سے کفر کی طرف لوٹتا ہے ارتداد کے متعلق ایسی ہی غلط فہمی ہے جیسے جہاد کے متعلق۔

یہ غلط فہمی صرف مخالفین کو ہی نہیں بلکہ مسلمان علماء میں سے بھی بعض ایسے ہیں جو اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں۔

جیسا کہ پہلے یہ ذکر کیا جا چکا ہے کہ اسلام بغیر حق کے کسی کی جان لینے کی اجازت نہیں دیتا۔ سلسلہ کلام کو جاری رکھنے کے لیے تکرار سے کام لیتا ہوں۔ ارشاد الٰہی ہے۔

مَنْ قَتَلَ نَفْسًا بِغَيْرِ نَفْسٍ اَوْ فَسَادٍ فِي الْاَرْضِ فَكَاَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيْعًا (المائدہ5:32)

جو کوئی کسی جان کو بغیر جان کے بدلے کے یا زمین میں فساد کے مار ڈالے تو گویا اس نے سب لوگوں کو مار ڈالا۔

دوسری جگہ آتا ہے۔

وَلَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِي حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ (بنی اسرائیل17:33)

بغیر حق اور انصاف کے کسی کی جان نہ لی جائے۔

پھر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے خون کی حرمت کے متعلق اپنے آخری خطبہ میں جس کو منشور حقوق انسانی کہا جاتا ہے۔ فرمایا:

اِنَّ دِمَاءَ كُمْ وَاَمْوَالَكُمْ وَاَعْرَاضَكُمْ حَرَامٌ كَحُرْمَةِ يَوْمِكُمْ هٰذَا (بخاری کتاب الحج)

تمہاری جانیں اور تمہارے مال اور تمہاری عزتیں ویسی ہی حرمت رکھتی ہیں جیسے آج کے دن کی حرمت (یعنی حج کے دن کی)

کسی مذہب کو آزادی سے قبول کرنے کے متعلق ارشاد ہے۔

لَا اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ قَدْ تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ (البقرہ2:256)

دین کے معاملہ میں کوئی جبر نہیں بھلائی اور برائی کو واضح طور پر بیان کر دیا گیا۔

انسانی جان اور قبول مذہب کے بارے میں واضح تعلیم ہے کہ نہ تو کسی جان کو بغیر حق کے لیا جا سکتا ہے اور نہ کسی مذہب کو قبول کرنے کے بارے میں کوئی جبر ہے۔ ہر شخص کو یہ حق حاصل ہے کہ جو چاہے مذہب قبول کرے۔

اسلام کے ان دو مقرر کردہ اصولوں سے مستشرقین اور مخالفین کا اعتراض رد ہو جاتا ہے لیکن جب ہم قرآن اور حدیث پر مزید غور و فکر کرتے ہیں تو واضح ہو جاتا ہے کہ اس اعتراض کی اساس بالکل باطل ہے۔

قرآن مجید میں کہیں بھی اشارۃً یا کنایۃً ارتداد کی سزا قتل قرار نہیں دی ہیفے منگ (Heffe Ming) اپنے مضمون "ارتداد" کو انسائیکلو پیڈیا آف اسلام میں ان الفاظ سے شروع کرتا ہے۔ قرآن مجید میں مرتد کو صرف آخرت میں سزا کا خوف دلایا گیا ہے ارتداد کا ذکر آخری ایک مکی سورت میں اس طرح آیا ہے۔

مَنْ كَفَرَ بِاللّٰهِ مِنْ بَعْدِ اِيْمَانِهٖ اِلَّا مَنْ اُكْرِهَ وَقَلْبُهٗ مُطْمَئِنٌّ بِالْاِيْمَانِ وَلٰكِنْ مَّنْ شَرَحَ بِالْكُفْرِ صَدْرًا فَعَلَيْهِمْ غَضَبٌ مِّنَ اللّٰهِ وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ (النحل16:106)

جوشخص اپنے ایمان کے بعد اللہ کا انکار کرے سوائے اس کے جسے مجبور کیا جائے اور اس کا دل ایمان کے ساتھ مطمئن ہو مگر وہ جس کا سینہ کفر پر کھل جائے تو ان پر اللہ کی طرف سے غضب ہے اور ان کے لیے بڑا عذاب ہے۔

اس آیت میں صریحاً مرتد کے لیے اُخروی عذاب کی وعید دی گئی ہے جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہجرت کر کے مدینہ آجاتے ہیں تو ابتدائی مدنی سورتوں میں سے ایک سورت میں ارتداد کا اس جنگ کے ضمن میں ذکر آتا ہے جو کفار نے جبر کے ساتھ مسلمانوں کو مرتد کرنے کے لیے چھیڑی تھی۔ ارشاد الٰہی ہے۔

وَلَا يَزَالُونَ يُقَاتِلُونَكُمْ حَتّٰى يَرُدُّوكُمْ عَنْ دِينِكُمْ إِنِ اسْتَطَاعُوا وَمَنْ يَرْتَدِدْ مِنكُمْ عَنْ دِينِهِ فَيَمُتْ وَهُوَ كَافِرٌ فَأُولٰٓئِكَ حَبِطَتْ أَعْمَالُهُمْ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ وَأُولٰٓئِكَ أَصْحَابُ النَّارِ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ (بقرہ 217:2)

اور وہ تم سے ہمیشہ جنگ کرتے رہیں گے یہاں تک کہ وہ تمہیں تمہارے دین سے لوٹا دیں اگر ان کو طاقت ہو اور جو شخص تم میں سے اپنے دین سے پھر جائے پھر مر جائے جب کہ وہ کافر ہی ہو۔ سو یہی وہ ہیں جن کے اعمال دنیا اور آخرت میں اکارت گئے اور یہی لوگ آگ والے ہیں اور وہ اسی میں ہی رہیں گے۔

بعض مستشرقین نے مرتد کی سزا قتل ثابت کرنے کے لیے فَيَمُتْ کے یہ معنی کرتے ہیں "پس اسے مار ڈالا جائے" یہ لفظ فعل مضارع معروف ہے جس کے معنی ہیں وہ مر جائے لفظ مَاتَ طبعی موت پر بولا جاتا ہے پس لفظ "فَيَمُتْ" ثابت کرتا ہے کہ مرتد طبعی موت مر جائے۔ لفظ فَيَمُتْ استعمال کر کے یہ بتایا گیا ہے کہ مرتد کی سزا قتل نہیں۔ اگر مرتد کی سزا قتل ہوتی تو لفظ "قتل" استعمال ہونا چاہیے تھا پھر اس کے بعد حَبِطَتْ أَعْمَالُهُمْ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ (ان کے اعمال دنیا اور آخرت میں اکارت ہو گئے) کے الفاظ استعمال کیے ہیں۔ یہ الفاظ ظاہر کرتے ہیں کہ مرتد کے اعمال اس دنیا اور آخرت میں اکارت جاتے ہیں اور وہ بارآور ثابت نہیں ہو سکتے لہٰذا وہ آخرت میں دوزخ میں جائے گا۔

سورہ ال عمران میں جو ہجرت کے تیسرے سال نازل ہوئی بار بار ان لوگوں کا ذکر کیا گیا ہے جو مسلمان ہونے کے بعد کفر کی طرف لوٹ گئے۔ ان کے متعلق ہی فرمایا کہ وہ آخرت میں سزا پائیں گے۔ چنانچہ فرمایا:

كَيْفَ يَهْدِي اللّٰهُ قَوْمًا كَفَرُوا بَعْدَ إِيمَانِهِمْ وَشَهِدُوا أَنَّ الرَّسُولَ حَقٌّ وَجَاءَهُمُ الْبَيِّنٰتُ (آل عمران 86:3)

ان لوگوں کو اللہ تعالیٰ کس طرح ہدایت کرے جو اپنے ایمان کے بعد کافر ہوئے اور وہ گواہ ہیں کہ رسول سچا ہے اور ان کے پاس کھلی دلیلیں بھی آ چکی ہیں۔

پھر اس سے آگے فرمایا:

أُولٰٓئِكَ جَزَاؤُهُمْ أَنَّ عَلَيْهِمْ لَعْنَةَ اللّٰهِ (ال عمران 87:3)

ایسے لوگوں کی سزا یہ ہے کہ ان پر اللہ کی لعنت ہے۔

پھر فرمایا:

إِلَّا الَّذِينَ تَابُوا مِنْ بَعْدِ ذٰلِكَ وَأَصْلَحُوا (آل عمران 89:3)

مگر وہ جنہوں نے اس کے بعد توبہ کی اور اصلاح کی۔

جب مرتد کو قتل کر دیا جاتا ہے پھر توبہ اور اصلاح کا کیا معنی اور مطلب ہے۔ واضح رہے کہ ارتداد کے بعد توبہ اور اصلاح کا موقع ملا یعنی انہوں نے پھر فرمایا:

إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا بَعْدَ إِيمَانِهِمْ ثُمَّ ازْدَادُوا كُفْرًا لَنْ تُقْبَلَ تَوْبَتُهُمْ (آل عمران 90:3)

جو اپنے ایمان کے بعد کافر ہو گئے پھر کفر میں بڑھتے گئے ان کی توبہ قبول نہیں ہوتی۔
اس آیت میں ازاداد کفر سے مراد اصرار علی الکفر ہے کیونکہ جب کفر پر اصرار ہوتا ہے تو کفر بڑھتا رہتا ہے قرآن مجید میں مندرجہ ذیل آیت میں یہود کے ارتداد کے ایک خاص منصوبے کا ذکر کیا گیا ہے جبکہ وہ مدنی حکومت کے تحت رہے تھے۔ قرآن مجید میں آتا ہے۔
وَقَالَتْ طَّآئِفَةٌ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اٰمِنُوْا بِالَّذِيْٓ اُنْزِلَ عَلَى الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَجْهَ النَّهَارِ وَاكْفُرُوْٓا اٰخِرَهٗ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ (آل عمران 72:3)
اور اہل کتاب میں سے ایک گروہ نے کہا کہ دن کی ابتدا میں اس پر ایمان لے آؤ جو ان لوگوں پر اتارا گیا ہے جو ایمان لائے ہیں اور اس کا آخر میں انکار کر دو تا کہ وہ لوٹ آئیں۔
اگر ارتداد کی سزا قتل ہوتی تو ایک اسلامی حکومت کے تحت اسلام کو بدنام کرنے کے لیے ایسا کیسے منصوبہ بنایا جا سکتا ہے۔
سورۃ مائدہ بھی ان سورتوں میں سے ہے جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کے آخری آیام میں نازل ہوئی۔ اس میں بھی مرتد کی سزا قتل قرار نہیں دی۔ ارشاد الٰہی ہے۔
يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَنْ يَّرْتَدَّ مِنْكُمْ عَنْ دِيْنِهٖ فَسَوْفَ يَاْتِي اللّٰهُ بِقَوْمٍ يُّحِبُّهُمْ وَيُحِبُّوْنَهٗٓ (مائدہ 54:5)
اے لوگو! جو ایمان لائے ہو جو کوئی تم میں سے اپنے دین سے پھر جائے تو اللہ ایک قوم لائے گا وہ ان سے محبت رکھے گا اور وہ اس سے محبت رکھیں گے۔
اس آیت میں مرتد کی سزا قتل بیان نہیں کی بلکہ یہ فرمایا کہ اگر مسلمان میں سے کچھ لوگ دین کو چھوڑ جاتے ہیں تو ان کی جگہ ایسے لوگ دائرہ اسلام میں داخل ہو جائیں گے جو اللہ کی رضا پر چلنے والے ہوں گے اور اللہ ان سے راضی ہوگا۔ یہاں مرتدین کو قتل کرنے کا کہیں ذکر نہیں ہے۔
الغرض قرآن مجید میں کہیں بھی ارتداد کی سزا قتل قرار نہیں دی گئی بلکہ مذہب کے قبول کرنے کی آزادی کے متعلق واضح طور پر فرمایا۔
لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ
یہ ہے حقوق انسانی میں سے ایک مذہبی آزادی کا حق جس کو اقوام متحدہ نے بھی اپنے منشور حقوق انسانی میں شامل کر لیا ہے اسلام پر قتل مرتد کا اعتراض بالکل باطل اور لاعلمی پر مبنی ہے۔

حدیث اور ارتداد:

جب قرآن مجید میں کسی بھی مرتد کی سزا قتل تجویز نہیں کی گئی تو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کیسے قرآنی تعلیم کے خلاف تجویز کر سکتے تھے آپ ﷺ کو صرف وحی الٰہی کی پیروی کا حکم دیا گیا ہے۔
دراصل جن احادیث سے "مرتد کی سزا قتل" کا قانون اخذ کیا گیا ہے وہ ایک غلط فہمی کا نتیجہ تھا وہ لوگ جو ارتداد اختیار کر لیتے تھے وہ باغیوں اور محاربین کے ساتھ مل جاتے تھے۔ ان لوگوں کو دین چھوڑنے کی وجہ سے قتل کرنے کا حکم نہیں بلکہ دشمن محاربین سے مل کر جنگ کرنے کی وجہ سے قتل کرنے کا حکم دیا گیا۔ وہ حکومت کے امن کو برباد کرنے والے تھے جیسا کہ صحیح بخاری کے ان دو عنوانات سے واضح ہوتا ہے کتاب المحاربین من اہل الکفر والردۃ یعنی کتاب ان کافروں اور مرتدوں کے احکام میں جو جنگ کرتے ہیں۔
دوسرا عنوان یہ ہے کہ۔
كِتَابُ اِسْتِتَابَةِ الْمُعَانِدِيْنَ وَالْمُرْتَدِّيْنَ وَقِتَالِهِمْ

یعنی کتاب مرتدوں اور باغیوں سے توبہ کا مطالبہ کرنا۔

یہ دونوں عنوانات واضح کرتے ہیں کہ مرتدین کو اس وجہ سے قتل کرنے کا حکم تھا وہ محاربین کے ساتھ مل کر مسلمانوں کے ساتھ جنگ کرتے تھے پھر دوسرے عنوان میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ دوران جنگ بھی ان کو توبہ کرنے کی دعوت دی جائے۔ کہ وہ دائرہ اسلام میں دوبارہ داخل ہو جائیں۔ اگر مرتد کی سزا قتل ہے تو ان کو توبہ کی دعوت دینے کا کیا مطلب۔ دراصل اسلام نے توبہ کا دروازہ کھلا رکھا ہے۔ یہی اسلام کی فضیلت ہے۔

اس وقت ایسے قبائل بھی تھے جو مسلمانوں سے برسرپیکار نہیں تھے اگر کوئی مرتد ان کے ساتھ مل جاتا تو ان سے کسی قسم کا تعرض نہیں کیا جاتا تھا۔ ان لوگوں کی وضاحت قرآن مجید میں ہے ارشاد الٰہی ہے۔

اِلَّا الَّذِیْنَ یَصِلُوْنَ اِلٰی قَوْمٍ بَیْنَکُمْ وَبَیْنَھُمْ مِّیْثَاقٌ اَوْجَآءُوْکُمْ حَصِرَتْ صُدُوْرُھُمْ اَنْ یُّقَاتِلُوْکُمْ اَوْیُقَاتِلُوْا قَوْمَھُمْ وَلَوْشَآءَ اللّٰہُ لَسَلَّطَھُمْ عَلَیْکُمْ فَلَقٰتَلُوْکُمْ فَاِنِ اعْتَزَلُوْکُمْ، فَلَمْ یُقَاتِلُوْکُمْ وَاَلْقَوْا اِلَیْکُمُ السَّلَمَ فَمَا جَعَلَ اللّٰہُ لَکُمْ عَلَیْھِمْ سَبِیْلًا (النساء4:90)

مگر جو ایسی قوم سے جا ملیں کہ تم میں اور ان میں معاہدہ ہے یا تمہارے پاس آئیں اس حال میں کہ ان کے سینے تنگ ہیں کہ تمہارے ساتھ جنگ کریں یا اپنی قوم سے جنگ کریں اور اگر اللہ چاہتا تو ان کو تم پر قابو دے دیتا سو وہ تم سے ضرور لڑتے پس اگر وہ تم سے کنارہ کش ہوں پھر تم سے جنگ نہ کریں اور تم سے صلح کی درخواست کریں تو اللہ نے تمہارے لیے ان کے خلاف کوئی راہ نہیں رکھی۔ (کہ تم ان سے جنگ کرو)

اس آیت میں دو قسم کے مرتدین کا ذکر کیا ہے ایک وہ جو اسلام قبول کرنے کے بعد علی الاعلان کافر ہو گیا مگر ایسی قوم سے جا ملے جس کا مسلمانوں کے ساتھ معاہدہ ہے جیسے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہلال بن عویمر اسلمی سے معاہدہ کر لیا تھا کہ نہ وہ آپ کے ساتھ مل کر قریش سے جنگ کریں گے اور نہ قریش سے مل کر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جنگ کریں پس اگر کوئی مرتد ایسی قوم سے جا ملے تو معاہد قوم کے ساتھ مل جانے کی وجہ سے اس سے کسی قسم کا تعرض نہیں کیا جائے گا۔

دوسرا گروہ وہ ہے جو دین سے پھر کر کسی معاہد قوم میں تو نہیں گیا مگر خود نہ مسلمانوں کے ساتھ جنگ کرنا چاہتا ہے اور نہ اپنی قوم کے ساتھ یعنی کفار کے ساتھ اور مسلمانوں سے صلح کی درخواست کریں تو ایسے لوگوں سے جنگ کرنا بھی جائز نہیں۔

اس سے معلوم ہوا کہ مرتدین کے ساتھ اسی وقت جنگ جائز ہے جب وہ باطل کے ساتھ جا ملیں یا خود مسلمانوں کے خلاف برسرپیکار ہو جائیں اس کے علاوہ کسی صورت میں ان کے خلاف جنگ نہیں کی جا سکتی۔ اگر مرتد پرامن شہری بن کر زندگی بسر کرتا ہے تو اس سے کسی قسم کا تعرض نہیں کیا جا سکتا۔ دین اختیار کرنا اس آدمی کا اپنا ذاتی معاملہ ہے کہ کون سا دین وہ قبول کرے اسلام نے اس کو لا اکراہ فی الدین میں کھلی اجازت دے رکھی ہے۔

مرتدین کی سزا کا صرف ایک واقعہ ہے جو ایک ثقہ حدیث میں بیان کیا گیا ہے قبیلہ عکل کے کچھ لوگوں نے اسلام قبول کر لیا اور مدینہ میں آئے لیکن کچھ عرصہ کے بعد مدینہ کی آب و ہوا موافق نہ ہونے کی وجہ سے رسول کریم ﷺ نے انہیں ایک ایسی جگہ بھیج دیا جہاں حکومت کی دودھ دینے والی اونٹنیاں رکھی جاتی تھیں تاکہ وہ کھلی ہوا میں رہیں اور دودھ پئیں وہاں صحت یاب ہو گئے پھر انہوں نے اونٹوں کے چرواہے کو قتل کر دیا اور اونٹوں کو ہانک کر لے گئے جب آپ ﷺ کو اس واقعہ کا علم ہوا تو حضور نے کچھ آدمی ان کے تعاقب میں بھیجے اور انہیں قتل کر دیا گیا۔ (بخاری کتاب 56 الجہاد والسیر باب 25 اِذَا احْتَرَقَ الْمُشْرِکَ الْمُسْلِمَ ھَلْ یَحْرِقُ)

بعض روایات میں آتا ہے کہ ان لوگوں نے چرواہے کی آنکھیں نکال ڈالیں اور اسے تپتے ہوئے پتھروں پر پھینک دیا اور وہ سسک سسک کر مر گیا۔ ان سے بھی ویسا ہی سلوک کیا گیا۔ (عمدۃ القاری جلد 7 صفحہ 58)

قبیلہ عکل کے ان مرتدین کو سزا ارتداد کی وجہ سے نہیں دی گئی بلکہ چرواہے کو قتل کرنے کی وجہ سے دی گئی اور اسی رنگ میں سزا دی گئی جو انہوں نے چرواہے کو دی تھی۔

پس امام بخاری کے نقطہ نظر کو سامنے رکھا جائے تو صاف معلوم ہو جاتا ہے اور جن مرتدین کو قتل کرنے کا حکم ہے وہ ہیں جو دوران جنگ باغیوں یا محاربین سے جا ملے۔ پس جن احادیث میں مرتدین کو قتل کرنے کا حکم پایا جاتا ہے ان کو قرآن مجید اور حدیث کے بیان کردہ اصول کی روشنی میں ان کی ارتداد کی وجہ سے قتل کرنے کا حکم نہیں دیا گیا بلکہ دوسرے جرائم کے ارتکاب کی وجہ سے قتل کا حکم دیا گیا ہے۔

''مرتد کی سزا قتل'' کے حامی اس حدیث پر بہت زور دیتے ہیں وہ یہ ہے۔

مَنْ بَدَّلَ دِيْنَهٗ فَاقْتُلُوْهُ (بخاری کِتَابُ الدِّيَاتِ بَابُ قَوْلِ اللّٰهِ تَعَالیٰ وَمَنْ يَّقْتُلْ مُؤْمِنًا مُّتَعَمِّدًا فَجَزَاءُهٗ جَهَنَّم)

حقیقت یہ ہے اس حدیث کا مفہوم قرآن مجید اور امام بخاری کی دوسری احادیث کی روشنی میں ہی متعین کیا جا سکتا ہے۔

دوم۔ اس حدیث میں لفظ ''دِيْنَهٗ'' اپنے اندر عمومیت رکھتا ہے یعنی جو کوئی بھی اپنے دین کو بدلے اس کو قتل کر دو۔ یعنی ایک عیسائی اپنا دین بدلتا ہے کیا اس کو بھی تبدیلی دین کی وجہ سے قتل کرنا چاہیے یا کوئی اور شخص اپنے دین کو بدلتا ہے اس حدیث کی روشنی میں اس کو قتل کر دینا چاہیے۔ جب کہ یہ مفہوم بالبداہت غلط ہے۔ اگر اس حدیث کو صحیح قرار دیا جائے تو پھر اس حدیث کی توجیح قرآن مجید اور دیگر احادیث کی روشنی کی جائے گی۔

ایک اور حدیث ہے جس سے ''مرتد کی سزا قتل'' کا قانون اخذ کیا جاتا ہے وہ حدیث یہ ہے کہ مسلمان کی جان صرف تین صورتوں میں لی جا سکتی ہے ان میں سے ایک صورت یہ ہے کہ

''ایک شخص اپنا مذہب چھوڑتا ہے اور اپنی جماعت ترک دیتا ہے (اَلتَّارِكُ لِلْجَمَاعَةِ) (بخاری کتاب الدیات 88 باب قَوْلِ اللّٰهِ تَعَالیٰ اِنَّ النَّفْسَ بِالنَّفْسِ الخ)

دوسری قرأت کے مطابق ''المفارق'' کا لفظ آتا ہے یعنی جو اپنی جماعت سے الگ ہو جاتا ہے۔

اس حدیث میں اپنی جماعت کو ترک کرنا قتل کے لیے ضروری شرط قرار دی ہے گویا کوئی شخص اپنی جماعت کو چھوڑ کر محارب دشمن سے جا ملتا ہے اس کو قتل کرنے کا حکم ہے۔

اصول:

اس قسم کی تمام احادیث کا مفہوم متعین کرنے کے لیے قرآن مجید کے اصول کو مدنظر رکھنا پڑے گا۔ وہ اصول یہ ہے کہ مرتد محارب دشمن سے جا ملے اور مسلمانوں کے خلاف برسرپیکار ہو جائے۔

جب قرآن مجید اور ثقہ احادیث سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ مرتد کی سزا قتل نہیں تو پھر کسی فقہی کے فتویٰ کی کیا حیثیت رہ جاتی ہے۔ اس وجہ سے فقہا کے فتاوی کو نظر انداز کیا جاتا ہے اور زیر بحث نہیں لایا جاتا۔ یہ محض طوالت ہوگی۔

تبدیلی مذہب کی ایک مثال بخاری میں بیان کی گئی ہے وہ یہ ہے کہ ایک اعرابی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اس نے آپ کے ہاتھ پر بیعت کی اور ابھی مدینہ میں تھا کہ وہ بخار میں مبتلا ہو گیا وہ آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور کہنے لگا کہ میری بیعت ختم کر دیجیے آپ ﷺ نے انکار فرمایا مگر وہ پھر آیا اور عرض کی کہ میری بیعت واپس کر دیجیے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے انکار کیا وہ پھر آیا

اور کہنے لگا کہ میری بیعت واپس کر دیجیے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے پھر انکار فرمایا اس پر وہ وہاں سے چلا گیا۔ (بخاری کتاب الاحکام باب 45 بیعۃ الاعراب)

یہ حدیث ظاہر کرتی ہے اس شخص نے اسلام قبول کیا دوسرے دن بخار میں مبتلا ہو جانے کی وجہ سے اس نے خیال کیا یہ بخار اس کو مسلمان ہونے کی وجہ سے ہوا ہے اس لیے وہ آپ کی خدمت میں حاضر ہوا اور اس نے بیعت ختم کر دی۔ یہ ارتداد کی واضح صورت تھی لیکن کہیں بھی یہ ذکر نہیں کہ اس شخص کو قتل کیا گیا بلکہ حدیث یہ ظاہر کرتی ہے کہ وہ امن سے چلا گیا تبدیلی مذہب کی ایک اور مثال ایک عیسائی کی ہے جو مسلمان ہو گیا تھا پھر مرتد ہو کر دوبارہ دائرہ عیسائیت میں چلا گیا لیکن کبھی اس کو قتل نہیں کیا گیا حضرت انسؓ روایت کرتے ہیں کہ:

''ایک عیسائی تھا جو مسلمان ہو گیا اس نے سورۃ بقرہ اور آل عمران پڑھیں وہ رسول کریم ﷺ کے حکم سے قرآن مجید لکھا کرتا تھا مگر وہ پھر عیسائی ہو گیا وہ کہا کرتا تھا کہ محمد (ﷺ) کچھ نہیں جانتے سوائے اس کے جو میں (قرآن مجید) کے لیے لکھتا تھا تب خدا نے اس کو موت دے دی اور انہوں نے اس کو دفن کر دیا۔ (بخاری کتاب المناقب باب علامات النبوۃ فی الاسلام)

حدیث میں یہ بھی ذکر ہے کہ کس طرح زمین نے اس کے جسم کو باہر پھینک دیا اسلامی حکومت قائم تھی یہ مدینہ کا واقعہ ہے اس وقت سورۃ بقرہ اور آل عمران نازل ہو چکی تھیں۔ اس شخص نے ارتداد اختیار کیا لیکن اس کو کوئی سزا نہیں دی گئی۔

......☆......

توہین رسالت کی سزا قتل

اعتراض: **اسلام میں توہین رسالت کی سزا قتل قرار دی ہے مستشرقین نے اس سزا کو ظالمانہ قرار دیا ہے۔**

ابن وراق نے اپنی کتاب ''میں ایک مسلمان کیوں نہیں ہوں'' میں صفحہ 175,176 پر توہین رسالت پر خاصہ تبصرہ کیا ہے۔

اس طرح رابرٹ سپنسر The truth about Muhammad کے صفحہ 145 پر توہین رسالت کی سزا قتل کا ذکر کیا ہے۔

یہ دونوں کتب مغربی دنیا میں بہت پڑھی جاتی ہیں اور اسلام کے سب بڑے نقاد خیال کیے جاتے ہیں۔

جواب :اسلام وہ دین ہے جس نے دائرہ اسلام میں داخل ہونے کے لیے یہ ضروری قرار دیا ہے کہ وہ سب رسولوں کو سچا قرار دے کر ایمان لائے۔ دوم بائبل میں بعض انبیاء علیہم السلام پر فحش الزامات لگائے ہیں اسلام نے تمام انبیاء علیہم السلام کو معصوم عن الخطا قرار دیا ہے۔ اسلام میں نبوت وہ مقام ہے جو شخص اس مقام پر فائز ہو اس سے کسی قسم کی غلطی ہو نہیں سکتی اس مقام پر صرف نبی ہی فائز ہوتے ہیں۔ لہٰذا اسلام حرمت رسالت کا زبردست حامی ہے۔ یہ فضیلت صرف اسلام کو ہی حاصل ہے ناموس رسالت میں صرف رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت ہی مراد نہیں ہے بلکہ اسلام ناموس رسالت میں سب انبیاء علیہم السلام کو شامل کرتا ہے۔ اسلام میں کسی نبی کی توہین بھی اللہ تعالیٰ کے نزدیک قابل مواخذہ ہے۔

سوال یہ ہے کہ ''توہین رسالت کی سزا قتل حدود'' میں شامل ہے یا ملکی قانون (تعزیر) میں شامل کرنا چاہیے۔

قرآن مجید میں کسی آیت میں بھی توہین رسالت کی سزا قتل کا ذکر نہیں۔ بعض آیات قرآنی سے غلط انداز سے یہ استنباط کرنے کی کوشش کی گئی ہے ان کا یہاں ذکر کیا جاتا ہے تا کہ قارئین اندازہ لگا لیں کہ وہ استنباط کہاں تک صحیح ہے ارشاد الٰہی ہے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ يُحَآدُّوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗۤ اُولٰٓئِكَ فِى الْاَذَلِّيْنَ (المجادلہ 20:58)

جو لوگ اللہ اور اس کے رسول کی مخالفت کرتے ہیں وہ سخت ذلیل لوگوں میں سے ہوں ہیں۔

اس آیت میں اللہ اور رسول کے مخالف کو اذلین میں شامل کیا ہے اذل کا لفظ ہرگز ہرگز قتل پر دلالت نہیں کرتا۔ اذل کا لفظ اپنے اندر یہ مفہوم رکھتا ہے کہ جس مقصد کے لیے وہ پیدا کیا گیا ہے۔ اس مقصد کو پا نہیں سکے گا۔ وہ مقصد صرف اللہ اور اس کے رسول کی تعلیم کی پیروی سے حاصل کیا جا سکتا ہے۔ لہٰذا لفظ ''اذل'' انسان کی ناکامی اور نامرادی پر دلالت کرتا ہے۔

وَيَوْمَ يَعَضُّ الظَّالِمُ عَلَى يَدَيْهِ يَقُولُ يَٰلَيْتَنِي اتَّخَذْتُ مَعَ الرَّسُولِ سَبِيلًا يَٰوَيْلَتَىٰ لَيْتَنِي لَمْ أَتَّخِذْ فُلَانًا خَلِيلًا لَقَدْ أَضَلَّنِي عَنِ الذِّكْرِ بَعْدَ إِذْ جَاءَنِي وَكَانَ الشَّيْطَانُ لِلْإِنسَانِ خَذُولًا (الفرقان 25:27 تا 29)

اور جس دن ظالم اپنے دونوں ہاتھ کاٹے گا کہے گا اے کاش! میں نے رسول کے ساتھ رشتہ اختیار کیا ہوتا مجھ پر افسوس! کاش میں نے فلاں کو دوست نہ بنایا ہوتا اس نے مجھے ذکر سے بہکایا اس کے بعد کہ وہ میرے پاس آ گیا تھا اور شیطان (آخر) انسان کو اکیلا چھوڑ دیتا ہے۔

مذکورہ آیات میں گستاخ رسول کو قیامت کے دن سزا کا ذکر ہے کہ گستاخ رسول قیامت کے دن پچھتائے گا کہ کاش وہ رسول پر ایمان لے آتا اور دوست کی باتوں میں نہ آتا۔ لہٰذا ان آیات میں گستاخ رسول کے پچھتاوے کا ذکر ہے۔

قرآن مجید میں منکرین کو اس دنیا میں عذاب دینے کا ذکر ہے وہ عذاب اللہ کی طرف سے آتے تھے لہٰذا اللہ کی یہ سنت ہے کہ وہی اپنے رسولوں کے منکرین اور گستاخوں کو خود عذاب دیتا ہے۔ یہ عذاب دینا اللہ کی سنت مستمرہ ہے۔

بعض مفسرین نے یہاں ظالم سے مراد عقبہ بن ابی معیط لیا ہے اور اگلی آیت میں فلانا سے مراد ابی بن خلف لیا ہے اور یہ واقعہ لکھا ہے عقبہ جو ابی بن خلف کے کہنے پر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے رخ مبارک پر تھوکنے کے لیے تیار ہو گیا تھا جنگ بدر میں قیدیوں میں پکڑا گیا اور قتل کر دیا گیا۔

علماء ربانی کا یہ اصول ہے کہ جب کسی آیت یا حدیث کی تشریح کی جائے تو اس کے سامنے تمام قرآن مجید اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا اسوہ حسنہ سامنے ہونا چاہیے تاکہ تشریح کرتے وقت تضاد پیدا نہ ہو قرآن مجید میں کہیں اختصار سے کام لیا ہے اور اس کی وضاحت دوسری جگہ کر دی ہے اسی طرح احادیث میں ہے۔ بعض جگہ اختصار ہے اور اس کی وضاحت کسی دوسرے موقع پر کر دی۔ لہٰذا تشریح کرتے وقت تمام قرآن مجید اور حدیث کا ادب نگاہ کے سامنے ہونا چاہیے۔ جہاں بھی علماء نے اس اصول کو نظر انداز کیا ہے وہیں ٹھوکر کھائی ہے۔ چنانچہ جنگ بدر میں اسیری کی حالت میں عقبہ کے قتل کرنے کے واقعہ کو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تمام زندگی کی روشنی دیکھنا ہوگا۔ جب ہم رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کا مطالعہ کرتے ہیں کہ آپ ﷺ کی زندگی میں ایک واقعہ بھی نہیں ملے گا کہ آپ ﷺ نے اپنی ذات کے لیے کسی شخص کو قتل کیا ہو یا قتل کرنے کا حکم دیا ہے جہاں بھی کوئی قتل ہوا ہے وہاں کوئی حربی وجہ ہوتی ہے جس کی وجہ سے اس شخص کو قتل کیا گیا ہے۔ یہ تو ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی ذات کی خاطر کسی کو نہ قتل کروایا ہے نہ قتل کیا ہے کیونکہ آپ ﷺ رحمۃ للعالمین بن کر آئے تھے۔ اگر آپ اپنی ذاتی توہین کی وجہ سے کسی کو قتل کرتے ہیں یا کرواتے ہیں تو صفت رحمۃ للعالمین مجروح ہوتی ہے۔ آپ ﷺ کا دل مخلوق کی محبت اور پیار سے بھرا ہوا تھا۔ جو لوگ ایمان نہیں لائے اور ایذائیں دیں ان کے لیے بھی دعا گو تھے آپ کا دل جذبہ رحمت سے لبریز تھا۔ رسول کریم ﷺ کے متعلق یہ کہنا کہ آپ ﷺ نے کسی شخص کو اس کی گستاخی یا ایذا دہی کی وجہ سے قتل کیا ہے یا قتل کروایا ہے وہ آپ ﷺ کی شان رحمۃ للعالمینی سے ناآشنا ہیں آیئے آپ ﷺ کی مکی اور مدنی زندگی کا مطالعہ کریں کہ ہمیں کیا بتاتی ہے۔ حضرت عائشہ ام المومنین فرماتی ہیں کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے معاملہ میں بھی کسی سے بدلہ نہیں لیا جب احکام الٰہی کی خلاف ورزی کی جاتی تو اس کو سزا دیتے۔ (بخاری کِتَابُ الآدَابِ بَابُ قَوْلِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یَسِّرُوْا وَلَا تُعَسِّرُوْا)

ایک بار یہودیوں کی ایک جماعت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئی اور کہا کہ السام علیکم یعنی تم پر موت آئے۔ حضرت عائشہ سمجھ گئیں اور انہوں نے جواب دیا وعلیکم السام واللعنۃ یعنی تم کو موت آئے اور تم پر لعنت ہو۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے سنا تو فرمایا ٹھہر جاؤ خدا تمام کاموں میں نرمی کو پسند کرتا ہے بولیں یا رسول اللہ انہوں نے جو کچھ کہا کیا آپ ﷺ نے نہیں سنا؟ فرمایا میں نے بھی تو کہہ دیا کہ علیکم یعنی تم پر بھی۔ (بخاری کتاب الادب باب الرفق فی کل الامر کلہ)

حضرت عبداللہ بن عمرو روایت کرتے ہیں کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

اَلرَّاحِمُوْنَ يَرْحَمُهُمُ الرَّحْمٰنُ اِرْحَمُوْا اَهْلَ الْاَرْضِ يَرْحَمْكُمُ اللّٰهُ مَنْ فِي السَّمَآءِ (ابوداؤد باب فی الرحمۃ)

رحم کرنے والوں پر خدائے رحیم رحم کرتا ہے رحم کرو تا کہ آسمان پر رہنے والا تم پر رحم کرے۔

جنگ احد میں آپ ﷺ کے دانت مبارک شہید ہو گئے روئے مبارک زخمی ہو گیا آپ گر گئے بعض صحابہ نے فرمایا یا رسول اللہ ان لوگوں پر جنہوں نے خدا کے رسول کو ستایا ہے اور دکھ دیا ہے بددعا کیجیے فرمایا مجھے لعنت کے لیے نہیں بھیجا گیا بلکہ رحمت بنا کر بھیجا ہے آپ ﷺ نے دعا فرمائی۔

''اے خدا! میری قوم کو ہدایت دے کیونکہ وہ نہیں جانتے'' کس قدر دل میں رحم اور عفو کا جوش ہے کہ دشمن ایذا دینے پر تلا ہے اور آپ ﷺ اپنے دشمنوں کے لیے دعا ہدایت اور مغفرت کر رہے ہیں۔

نبوت کے دسویں سال جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اہل طائف کو دعوت اسلام دینے کے لیے گئے بجائے روبرو ہونے کے انہوں نے سنگ باری سے استقبال کیا اور نعلین مبارک خون سے بھر گئیں جب واپس ہوئے تو راستہ میں فرشتہ نے آ کر کہا یا محمد! اگر آپ حکم دیں تو اس پہاڑ کو ان پر الٹ دوں آپ نے جواب دیا کہ میں ان کی ہلاکت نہیں چاہتا بلکہ مجھے امید ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کی پشتوں سے ایسے بندے پیدا کرے گا جو صرف خدا کی عبادت کریں گے اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہیں ٹھہرائیں گے۔ (بخاری)

حضور کی بے نظیر مثال عفو و رحم کی فتح مکہ کے دن تھی وہ دشمن جس نے آپ ﷺ کو ہر قسم کی تکلیف دی، معاشرتی مقاطعہ کر کے شعب ابی طالب میں محصور کر دیا قتل کے منصوبے بنائے شہر سے نکال دیا جب وہ مغلوب ہو کر سامنے آتے ہیں تو سرتاپا حلم و عفو انسان نے لَا تَثْرِيْبَ عليكم اليوم کہہ کر تمام خطا کاروں، گستاخوں، ایذا رسانوں کو معاف کر دیا۔ یہ الفاظ گستاخان رسول کو قتل کرنے کے نظریہ کو رد کر رہے ہیں اگر قرآن مجید میں ان مجرموں کو سزا دینے کا حکم ہوتا ہے تو آپ ﷺ ضرور ان کو سزا دیتے۔ آپ ﷺ نے تمام فیصلے وحی (قرآن) کی روشنی میں کیے تھے۔ غزوہ خیبر کے بعد مشہور جرنیل مرحب کی بہن نے بکرے کے گوشت میں زہر ملا کر پکایا اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں بطور تحفہ پیش کیا رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم گوشت کھانے لگے اور کچھ صحابہ نے کھا لیا رسول کریم ﷺ نے شک گزرنے پر فوراً فرمایا کہ گوشت نہ کھایا جائے چنانچہ حضور ﷺ نے یہودی عورت کو بلا کر دریافت فرمایا تو عورت نے اپنے جرم کا اقرار کر لیا اس عورت نے پوچھا کہ آپ ﷺ کو کیسے علم ہوا۔ آپ ﷺ نے ہاتھ میں دستی کے گوشت کی طرف اشارہ کر کے کہا کہ اس نے بتایا ہے۔ حضور ﷺ نے پوچھا کہ تمہارا مقصد کیا تھا۔ کہنے لگی میں نے خیال کیا کہ اگر آپ ﷺ نبی ہیں تو یہ زہر آپ ﷺ کو نقصان نہیں دے گا اگر نہیں ہیں تو آپ ﷺ سے ہماری جان چھوٹ جائے گی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس عورت کو معاف کر دیا جبکہ حضور ﷺ کا ایک صحابی زہر آلود گوشت کھانے کی وجہ سے شہید ہو چکا تھا۔ (ابوداؤد کِتَابُ الدِّيَاتِ بَابُ فِيْمَنْ سَقٰى رَجُلًا سَمًّا اَوْ اَطْعَمَهٗ)

''مرتد کی سزا قتل'' کی بحث میں ایک حدیث ذکر کی گئی ہے کہ ایک عیسائی دائرہ اسلام میں داخل ہوا لیکن پھر وہ مرتد ہو گیا ارتداد کے علاوہ وہ رسول کریم ﷺ کے خلاف توہین آمیز الفاظ بھی بولا کرتا تھا اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو نعوذ باللہ مفتری کہا کرتا تھا کہ وہ کچھ

نہیں جانتے سوائے اس کے جو آپ کے لیے لکھتا تھا لیکن تاریخ میں جس طرح ارتداد کی سزا قتل حدود میں شامل نہیں اسی طرح توہین رسالت کی سزا قتل کا بھی کوئی ذکر نہیں لہٰذا عقبہ والی روایت کی تشریح رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کے تمام رحم اور عفو کے واقعات کی روشنی میں کرنی چاہیے۔ عقبہ کا قتل لازمی طور پر کسی حربی جرم کی وجہ سے کیا گیا ہے۔

اِنَّمَا جَزٰٓؤُا الَّذِیْنَ یُحَارِبُوْنَ اللّٰہَ وَرَسُوْلَہٗ وَ یَسْعَوْنَ فِی الْاَرْضِ فَسَادًا اَنْ یُّقَتَّلُوْٓا اَوْ یُصَلَّبُوْٓا اَوْ تُقَطَّعَ اَیْدِیْھِمْ وَاَرْجُلُھُمْ مِّنْ خِلَافٍ اَوْ یُنْفَوْا مِنَ الْاَرْضِ ذٰلِکَ لَھُمْ خِزْیٌ فِی الدُّنْیَا وَلَھُمْ فِی الْاٰخِرَۃِ عَذَابٌ عَظِیْمٌ (المائدہ 33:5)

ان کی سزا جو اللہ اور اس کے رسول سے جنگ کرتے ہیں اور ملک میں فساد پھیلانے کی کوشش کرتے ہیں صرف یہی ہے کہ وہ قتل کیے جائیں یا صلیب پر مارے جائیں یا ان کے ہاتھ اور پاؤں مخالف اطراف میں کاٹے جائیں یا ان کو قید کیا جائے یہ ان کے لیے دنیا میں رسوائی ہے اور آخرت میں ان کے لیے بڑا عذاب ہے۔

اس آیت میں اللہ اور اس کے رسول سے محاربین اور فساد فی الارض سے مراد ڈاکا ڈالنے والے ہیں محاربین وہ لوگ ہیں جو تلوار کے زور سے مسلمانوں کو ہستی سے مٹانے کی کوشش کرتے تھے۔ دنیا کے تمام قوانین میں اس قسم کی سزائیں مذکور ہیں لیکن رسول کریم ﷺ نے تو غلبہ حاصل کرنے کے بعد بھی تمام محاربین کو معاف کر دیا تھا۔ لہٰذا جو لوگ اس آیت سے گستاخان رسول کی قتل کی سزا اخذ کرتے ہیں وہ صریحاً غلطی پر ہیں۔

وَاِنْ نَّکَثُوْٓا اَیْمَانَھُمْ مِّنْۢ بَعْدِ عَھْدِھِمْ وَطَعَنُوْا فِیْ دِیْنِکُمْ فَقَاتِلُوْٓا اَئِمَّۃَ الْکُفْرِ اِنَّھُمْ لَآ اَیْمَانَ لَھُمْ لَعَلَّھُمْ یَنْتَھُوْنَ (توبہ 12:9)

اور اگر وہ اپنے عہد کے بعد اپنی قسموں کو توڑیں اور تمہارے دین میں عیب لگائیں تو کفر کے سرداروں کے ساتھ جنگ کرو ان کی قسمیں کچھ نہیں تاکہ وہ باز آئیں۔

اس آیت سے کہیں بھی یہ ظاہر نہیں کہ گستاخ رسول کو قتل کیا جائے بلکہ ان لوگوں سے جنگ کرنے کا حکم ہے جو عہد کی خلاف ورزی کرتے ہیں اور عہد توڑنے کے بعد طعن فی الدین بھی کرتے ہیں جیسا کہ کفار نے معاہدہ صلح حدیبیہ کی خلاف ورزی کی۔ یہ آیت اس قسم کے لوگوں سے جنگ کرنے کی اجازت دیتا ہے۔

آیت میں لفظ فَقَاتِلُوْا آیا ہے، جس کے معنی قتل کرنا نہیں بلکہ جنگ کرنا ہے باب مفاعلہ ہے جس میں اشتراک پایا جاتا ہے لڑائی کی وجہ یہ بیان کی ''تاکہ یہ لوگ باز آجائیں۔''

تاریخ یہ بتاتی ہے کہ معاہدوں کی عدم پابندی ہی لڑائیوں کا سبب بنتی ہے معاہدہ توڑنے والے لوگوں کو سبق سکھانے کے لیے لڑائی کی اجازت دی گئی۔ بین الاقوامی قانون میں معاہدہ توڑنے والوں سے لڑائی کو جائز قرار دیا گیا ہے۔

بعض معاندین کا قتل کیا جانا:

تاریخ میں بعض معاندین (ابوعفک، کعب بن اشرف عبداللہ بن خطل وغیرہ) ایسے ہیں جو قتل کیے گئے ان کا قتل ''گستاخی رسول'' وجہ قرار دیا گیا ہے۔ یہ بھی تاریخی حقائق کے خلاف ہے۔ ابوعفک نام یہودی نے رسول کریم ﷺ کو مارنے کی کوشش کی اور اپنے اشعار میں لوگوں کو نبی عرب کو مار ڈالنے کی ترغیب دی اور لوگوں کو مسلمانوں کے خلاف لڑائی پر اکساتا تھا حقیقت میں معاہد قوم سے تعلق رکھنے کی وجہ سے عہد شکن تھا اور وہ محاربین میں شامل ہوتا تھا اس وجہ سے وہ قتل کیا گیا۔

یہی وجہ کعب بن اشرف کے قتل کی ہے یہ شخص بنونضیر کا سردار تھا بڑا شاعر تھا برخلاف عہد نامہ (جو بنی نضیر سے کیا گیا تھا) بدر کی لڑائی کے بعد قریش مکہ کے پاس پہنچ گیا ان کو اپنے شعروں کے ساتھ بہت غصہ دلایا اور وعدہ بھی کیا کہ وہ مدینہ پر حملہ کریں ان کی مدد کی جائے گی آخر کار قریش کعب بن اشرف کی تقریروں اور شعروں سے متاثر ہو کر مدینہ پر حملہ آور ہوئے اور احد کے مقام پر لڑائی ہوئی۔ نیز کعب نے رسول کریم ﷺ کو قتل کرنے کا منصوبہ بنایا مگر راز کھل گیا۔ ان حربی جرائم کی وجہ سے وہ مارا گیا عبداللہ بن خطل کو بھی اس کو حربی جرم کی وجہ سے قتل کیا گیا۔ اس قسم کے قتلوں کو بین الاقوامی قانون کی روشنی میں دیکھا جائے تو بھی ان کا قتل جائز معلوم ہوتا ہے۔ یہ لوگ معاشرہ اور ملک کے امن کے لیے زہر قاتل ہوتے ہیں ان کا قتل ہی امن وامان کا ذریعہ ہے اگر قتل نہ کیا جائے تو ملک میں امن قائم ہو ہی نہیں سکتا۔

یہ لوگ یَسۡعَوۡنَ فِی الۡاَرۡضِ فَسَادًا (وہ زمین میں فساد کی کوشش کرتے ہیں) کے مصداق ہیں۔ اگر اس قسم کے لوگوں کو نظر انداز کر دیا جائے تو ان کی دیکھا دیکھی اس قسم کے ہزاروں لوگ پیدا ہو جائیں گے اور زمین کے سینہ کو لوگوں کے خون سے سرخ کر دیں گے۔

لہٰذا جن جن لوگوں کو بھی قتل کیا گیا ان پر گستاخی رسول کا الزام نہیں تھا بلکہ وہ حربی مجرم تھے اور انہوں نے اپنے حربی جرم کی معافی بھی نہیں مانگی تھی دنیا میں کوئی ایسا قانون نہیں کہ قانون کی نظر میں مجرم ہو پھر اس کو معاف کر دیا جائے۔ یہ عدل اور انصاف کے خلاف ہے۔

جہاد بالقرآن:

اسلام نے گستاخان رسول کو قتل کرنے کا حکم نہیں دیا کہ ان کے ساتھ جہاد بالقرآن کا حکم دیا ہے ارشاد الٰہی ہے۔

وَجَاهِدۡهُمۡ بِهٖ جِهَادًا كَبِيۡرًا (52:25)

قرآن کے ساتھ ان سے جہاد کر جو بڑا جہاد ہے۔ قرآن مجید کے ساتھ جہاد کا مطلب یہ ہے کہ قرآن مجید کی تعلیم ان تمسخر کرنے والوں، ایذا دینے والوں اور انکار کرنے والوں تک حکمت اور مجادلہ حسنہ سے پہنچا دے اور وہ تعلیم خود ان کے دلوں کو مسخر کرے گی۔ چنانچہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی حکم پر عمل کیا۔ حکمت اور عمل حسنہ سے منکرین تک قرآن مجید کی تعلیم پہنچائی۔ تبلیغ کی وجہ سے لوگ دائرہ اسلام میں داخل ہوئے۔ گویا اسلام نے گستاخان رسول کو قتل کرنے کی تعلیم نہیں دی بلکہ ان کے ساتھ جہاد بالقرآن کی تلقین کی ہے۔ یعنی ان تک قرآن مجید کی روشن تعلیم پہنچا دی جائے۔

خلاصہ:

مذکورہ بحث سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ قرآن مجید میں گستاخ رسول کی سزا قتل مقرر نہیں اس وجہ سے حدود شرعی میں شامل نہیں کیا جا سکتا۔ ہاں ملکی قانون (تعزیرات) میں شامل کیا جا سکتا ہے کیونکہ ہر شخص کو اپنے بانی مذہب سے بہت محبت ہوتی ہے۔

اگر رسول کی توہین کی جائے تو ملک میں فساد برپا ہوتا ہے اس وجہ سے ملکی قانون میں گستاخ رسول کی سزا مقرر کر دی جائے تو ملک مذہبی لڑائی جھگڑے اور قتل وغارت سے بچ جاتا ہے۔

یہ دور گلوبل ولیج کا ہے اگر اقوام متحدہ اپنے حقوق انسانی کے منشور میں حرمت رسالت کو شامل کر لے اور ممبر ملک پر یہ لازم ہو جائے کہ وہ اپنے ملک میں حرمت رسالت کو لازمی قرار دے گا تو اس طرح مذہب کے نام پر جو فساد برپا ہوتا ہے اس سے بچا جا سکتا ہے۔

اسلامی ممالک تعزیر کے طور پر اپنے آئین میں گستاخ رسول کی سزا مقرر کر سکتے ہیں۔ شرعی حد کے طور پر نہیں۔ اسلام نے بعض جرائم کی سزائیں شرعی حدود میں مقرر کر دی ہیں دوسرے جرائم کی سزاؤں کے لیے صاحب اقتدار کو اجازت دی ہے کہ وہ اپنے حالات کو مدنظر رکھ کر سزائیں مقرر کر سکتے ہیں۔ گستاخ رسول کے جرم کو تعزیرات میں رکھنا چاہیے۔

(نوٹ) میں اپنے ناقص علم کی روشنی میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ گستاخ رسول کی سزا حد و شرعی میں نہیں۔ گستاخی رسول ایک سنگین جرم ہے اس لیے اس کی سزا ملکی قوانین میں مقرر کی جانی چاہیے۔ اگر کوئی عالم یہ سمجھتا ہے کہ یہ اجتہاد غلط ہے تو وہ میری اصلاح کر دے شکریہ۔

......☆......

جزیہ اور ذمی (جزیہ قتل کے بچاؤ کا ذریعہ تھا)

اعتراض: یورپین مصنفین نے ایک یہ اعتراض کیا ہے کہ جہاں اسلام نے یہود اور عیسائیوں کے علاوہ دوسرے غیر مسلموں کو "اسلام یا قتل" دونوں صورتوں میں سے ایک کا اختیار دیا تھا۔ وہاں یہود اور عیسائیوں کو کسی قدر بہتر درجہ دیا یہ کہ وہ جزیہ دے کر اپنی جان بچا سکتے ہیں گویا جزیہ قتل کے بچاؤ کا ذریعہ ہے۔

جواب : یہ اعتراض بھی اسلامی تعلیم اور تاریخ سے ناواقفیت کی وجہ سے ہے۔ جزیہ نہ تو قتل کے بچاؤ کا ذریعہ ہے اور نہ مذہبی ٹیکس۔ یہ غیر مسلم اپنی جان کی حفاظت کے لیے دیتا تھا یہ ٹیکس صرف ان غیر مسلموں سے لیا جاتا تھا جو فوجی ذمہ داری سے سبکدوش رہنا چاہتے تھے جو فوج میں شامل ہو کر دفاعی ذمہ داری پورا کرتے تھے اس سے یہ ٹیکس وصول نہیں کیا جاتا تھا۔ اگر بنی تغلب اور اہلیان نجران عیسائی تھے وہ جزیہ نہیں دیتے تھے۔ (انسائیکلوپیڈیا آف اسلام) بنی تغلب نے 13 ھ میں جنگ بویب میں مسلمانوں کے ساتھ جنگ میں حصہ لیا تھا اس وجہ سے ان سے جزیہ نہیں لیا گیا تھا۔

مسلمانوں سے سالانہ زکوٰۃ اور لڑائی کے کے وقت سامان جنگ کے لیے امداد لی جاتی تھی۔ مسلمانوں سے تو اڑھائی فیصد زکوٰۃ وصول کی جاتی تھی جب کہ غیر مسلموں سے قلیل رقم وصول کی جاتی تھی۔ مثلاً لاکھ روپے کا مالدار مسلمان ہے کم از کم اڑھائی ہزار روپے لیے جاتے تھے اور غیر مسلم سے صرف تین روپے۔ اسلامی سلطنت کے فوجی نظم و نسق چلانے کے لیے غیر مسلموں سے یہ ایک جنگی محصول لیا جاتا تھا۔ دنیا میں کوئی ایسی حکومت نہیں جو فوجی اخراجات کے لیے اپنی رعایا پر اس قسم کا بوجھ نہ ڈالے۔

تاریخ میں ایسی نظائر بھی موجود ہیں۔ جن سے یہ ظاہر ہو جاتا ہے کہ جب مسلمان فوج کسی قوم کی حفاظت سے قاصر ہو گئی تو اس نے رقم جزیہ واپس کر دی۔ اسلامی فوج ابو عبیدہ کے زیر قیادت رومی سلطنت سے برسر پیکار تھی تو انہیں حمص سے جس کو پہلے فتح کیا جا چکا تھا لوٹنا پڑا تھا اور حمص کو چھوڑنے کا فیصلہ کیا گیا تو ابو عبیدہ نے وہاں کے روساء کو بلایا اور جزیہ کی وصول کی ہوئی رقم یہ کہہ کر واپس کر دی۔ کہ اسلامی حکومت تمہاری حفاظت کرنے سے معذور ہے۔

جزیہ کا دائرہ عمل:

یہ ٹیکس صرف ان غیر مسلموں سے لیا جاتا تھا جو لڑنے کے قابل ہوتے تھے۔ مستورات، نابالغ اور بوڑھے، معذور اور راہب اس ٹیکس سے مستثنیٰ تھے تاریخ اس بات پر شاہد ہے کہ معذور غیر مسلم کو بیت المال سے زکوٰۃ کے فنڈ سے مدد بھی ملتی تھی۔

......☆......

لفظ کافر گالی ہے

اعتراض: جس طرح تم دوسرے مذہب والوں کو کافر کہتے ہو اسی طرح کیا وہ تم کو کافر نہیں کہتے اور اپنے مذہب کے خدا کی طرف سے تم پر لعنت نہیں بھیجتے پھر بتایئے کون سچا اور کون جھوٹا ہے۔ جب غور سے دیکھتے ہیں تو سب مذہب وملت میں جھوٹ پایا جاتا ہے اور جو سچ ہے وہ سب میں یکساں ہے یہ سب بے وقوفی کے جھگڑے ہیں (سیتارتھ پرکاش باب چودھواں اعتراض 20)

یہ اعتراض اس آیت پر ہے۔

فَلَمَّا جَآءَ هُمْ مَاعَرَفُوْا كَفَرُوْابِهٖ فَلَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الْكَافِرِيْنَ

(پس) جب ان کے پاس آیا جس کو انہوں نے پہچان لیا پھر انکار کر دیا پس انکار کرنے والوں پر اللہ کی لعنت ہے۔

یہی اعتراض دھرم پال نے اپنی کتاب ''ترک اسلام'' میں کیا ہے بلکہ لکھا ہے جو معقول پسند ہے اسلام میں کافر ہے۔

جواب: کافر، کفر کا اسم فاعل ہے کفر لغت میں ستر الشی ء یعنی ایک چیز کو ڈھانپنے کا نام ہے رات کو بھی کافر کہہ دیا جاتا ہے اور کسان کو کافر کہہ دیا جاتا ہے اس لیے کہ وہ بیج کو زمین میں چھپا دیتا ہے۔ کفر نعمت کی ناشکر گزاری ہے اس لیے کہ اس کا شکر ادا نہ کرنا گویا اس کو چھپانا ہے سب سے بڑا کفر انکار توحید یا شریعت یا نبوت ہے۔ (مفردات امام راغب) پس کفر گالی نہیں ہے۔ یہ لفظ محض انکار کے طور پر استعمال ہوا ہے اگر کوئی شخص ہندو دھرم یا عیسائیت کے عقیدہ تثلیث نہیں مانتا تو وہ تثلیث کا کافر ہے۔ اسی طرح جو شخص ہندو عقیدہ تناسخ کا منکر ہے تو وہ اس عقیدہ کا کافر ہے۔ اگر کوئی شخص حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو خدا کا بیٹا نہیں سمجھتا تو وہ عقیدہ ابنیت کا کافر ہے اسی طرح اگر کوئی غیر مسلم اسلام کا انکار کرتا ہے تو وہ کافر ہے۔ کیونکہ اس نے اسلام کا انکار کیا ہے۔ کسی مسلمان نے اسلام کا انکار کرنے والے کو گالی نہیں دی بلکہ اس نے حقیقت کا اظہار کیا ہے قرآن مجید نے تو مسلمانوں کو بھی ''کافر'' انکار کرنے والا قرار دیا ہے۔

ارشاد الٰہی ہے۔

كَفَرْنَا بِكُمْ وَبَدَا بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةُ وَالْبَغْضَاءُ اَبَدًا حَتّٰى تُؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ وَحْدَهٗ

ہم نے تمہارا انکار کیا ہے (ہم نے تمہارے غلط عقیدے سے انکار کیا ہے (اس وجہ سے) اور ہمارے اور تمہارے درمیان ہمیشہ کے لیے عداوت اور بغض ظاہر ہو گیا ہے یہاں تک کہ تم ایک اللہ پر ایمان لے آؤ۔

اس آیت میں کفر کا لفظ مسلمانوں کے لیے استعمال ہوا ہے کہ انہوں نے غیر مسلموں کے عقیدہ شرک ماننے سے انکار کیا ہے گویا جو عقیدہ شرک نہیں مانتا تو وہ بھی کافر ہے۔ (انکار کرنے والا)

غیر مسلم خواہ مخواہ لفظ ''کافر'' کو اپنے لیے گالی سمجھتے ہیں۔ لفظ ایک حقیقت کا اظہار کرتا ہے کہ جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے عقیدہ توحید پیش کیا تو مشرکین نے اس کا انکار کر دیا۔ اب غیر مسلم ہی بتائیں کہ ان مشرکین کو کس لفظ سے پکارا جائے جنہوں نے عقیدہ توحید تسلیم کر لیا وہ مسلم کہلائے یعنی سر تسلیم خم کرنے والے ماننے والے اور جنہوں نے انکار کیا وہ کافر کہلائے یعنی انکار کرنے والے۔

الزامی جواب:

سوامی دیانند مصنف ستیارتھ پرکاش وید کے منکروں کو دہریہ ملحد کہتا ہے۔ اسی طرح تمام ہندو غیر ہندوؤں کو ملیچھ سمجھتے ہیں کیا یہ گالی نہیں۔

☆......☆

قرآن صلح کاری کا مخالف ہے

اعتراض: دھرم پال نے اپنی کتاب ترک اسلام میں قرآن مجید کو صلح کاری کا مخالف قرار دیا ہے۔

جواب: یہ بھی قرآن سے ناواقفیت اور لاعلمی کا نتیجہ ہے قرآن مجید میں صلح کار کے متعلق ارشاد الٰہی ہے۔

اَلصُّلْحُ خَیْرٌ (یعنی صلح بہتر طریقہ زندگی ہے)

دوسری جگہ آتا ہے۔

وَاِنْ جَنَحُوا لِلسَّلْمِ فَاجْنَحْ لَهَا (انفال)

اگر وہ صلح کی طرف مائل ہوں۔ پس تو بھی اس کی طرف مائل ہو جا۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا اسوہ حسنہ ظاہر کرتا ہے کہ آپ ﷺ لڑائی جھگڑے کی نسبت صلح کی طرف مائل ہوتے تھے صلح حدیبیہ تاریخ اسلام میں باہمی صلح کا بہترین معاہدہ ہے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ پر جان نثار صحابی بیعت کر چکے تھے۔ جب کفار کی طرف سے صلح کا پیغام آیا تو بظاہر انصاف سے ہٹی ہوئی شرائط پر کفار سے معاہدہ کر لیا بعض صحابہ کے دلوں میں اس معاہدہ کی ناخوشگواری بھی پائی جاتی تھی۔ لیکن رسول ﷺ کی ژرف نگاہی ہی جانتی تھی کہ اس معاہدہ میں کیا سیاسی، دینی فوائد مضمر ہیں۔ بہر حال رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مضبوط لشکر کی موجودگی کے باوجود قریش سے ان شرائط کے مطابق صلح کر لی۔

یہ ہے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا اسوہ حسنہ جس سے واضح ہوتا ہے کہ اسلام صلح کاری کا حامی ہے۔

......☆......

جمہوریت اور اسلام (اسلام جمہوریت کے خلاف ہے)

اعتراض: اسلام طرز حکومت جمہوریت کا حامی نہیں۔ ہرگرونج نے کہا ہے **Islam has never favoured democrative tendencies** **(بحوالہ ابن وراق صفحہ 172)**

جواب: اسلام پہلا دین ہے جس نے جمہوری طرز حکومت (شوریٰ) کی بنیاد رکھی۔ اسلام سے قبل دنیا کے تمام ممالک میں بادشاہت قائم تھی اور بادشاہ کا ہر لفظ حکم کا درجہ رکھتا تھا۔ بادشاہ کی ذات کو ہی آئین کا درجہ حاصل تھا۔ گویا جو فیصلہ بادشاہ کر دے وہی فیصلہ آئین ہوتا اور اسی پر عمل کیا جاتا۔ اور بادشاہ کی صواب دید ہی حکومتی فیصلوں کا سرچشمہ اور منبع ہوتی تھی اس دور میں اسلام نے جمہوریت (شوریٰ) کو حکومت کے لیے ضروری قرار دیا اور لوگوں کے مشورہ کو حکومتی معاملات کے چلانے میں شامل کیا۔ یہ ایک انقلابی قدم تھا۔ جس کی نظیر دنیا کی تاریخ میں نہیں ملتی۔ افسوس مستشرقین نے اسلام کے اس انقلابی اقدام سے صرف نظر کر کے اسلام پر عدم جمہوریت کا اعتراض کر دیا۔

قرآن مجید میں آتا ہے۔

وَشَاوِرْهُمْ فِی الْاَمْرِ (آل عمران 158:3)
(حکومتی) معاملات میں ان سے مشورہ لے۔
دوسری جگہ مسلمانوں کے اجتماعی تعامل کے متعلق آتا ہے۔
وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰی بَیْنَهُمْ (شوریٰ 38:42)
اور ان (مسلمانوں) کا کام آپس میں مشورہ سے ہوتا ہے۔
رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:
مَاشَاوَرَ قَوْمٌ اِلَّا هُدُوْا (طبرانی، کنوز الحقائق حدیث 87)
جس قوم نے باہمی مشورہ کیا اس قوم نے فلاح پائی۔

حضرت عباس بیان کرتے ہیں کہ جب شوری کا حکم آیا تو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر چہ اللہ اور اس کا رسول شوریٰ سے بے نیاز ہے مگر شوریٰ کا یہ حکم اس لیے ہے تا کہ امت کے لیے رحمت ہو۔ اس کے بعد امت کا جو فرد رائے اور مشورہ طلب کرے گا کبھی اعلیٰ درجہ کی راہنمائی سے محروم نہ ہوگا جو شوریٰ کو ترک کرے گا وہ کبھی غلط راہ سے نہ نکلے گا۔ (بیہقی شعب الایمان عن ابن عباس)

حضرت عمرؓ روایت کرتے ہیں کہ وہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا اگر ہم کوئی چیز کتاب وسنت میں نہ پائیں تو کیا کریں تو رسول کریم ﷺ نے فرمایا کہ قانون جاننے والے عبادت گزاروں سے مشورہ کرو پھر یہ ہدایت فرمائی۔
لَا تَمْضُوْا فِیْهِ رَاْیَ خَاصَّةً
یعنی ایسے قوم پر کسی شخص کی انفرادی رائے کو نافذ نہ کرنا۔ (اعلام الموقعین جلد 1 ص 54)
حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے۔
مَارَاَیْتُ اَحَدًا اَکْثَرَ مَشْوَرَةً لِاَصْحَابِهٖ مِنَ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ
یعنی میں نے کسی شخص کو نہیں دیکھا جو رسول کریم ﷺ سے بڑھ کر اپنے اصحاب سے مشورہ کرتا ہو۔

رسول کریم ﷺ کا اسوہ حسنہ:

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے صرف زبانی کلامی مشورہ کرنے کی ہدایت نہیں کی بلکہ آپ نے اپنے اُسوہ حسنہ سے بھی شوری (جمہوریت) کی اہمیت کو ظاہر کر دیا تاریخ یہ بتاتی ہے کہ ہر لڑائی سے پہلے اور لڑائی کے دوران صحابہ سے مشورہ کیا اور پھر اس پر عمل کیا۔ جنگ اُحد میں تو آپ ﷺ نے اپنی مرضی کے خلاف محض صحابہ کے مشورہ پر عمل کر کے باہر میدان میں جا کر لڑائی لڑی۔ جنگ احزاب میں تو حضرت سلمان فارسی کے مشورہ سے مدینہ کے اردگرد دفاعی نقطہ نگاہ سے خندق کھودی گئی۔

الغرض رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا طرز حکومت جمہوری تھا۔

بزرگان دین کی نظر میں شوری (جمہوریت) کی اہمیت:

ایک مرتبہ حضرت ابوبکرؓ نے حضرت عمرؓ کو لکھا کہ۔
"رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم قانون شوریٰ (جمہوریت) پر عامل تھے تم بھی اس پر عمل کرنا۔ (تفسیر مظہری جلد 2 صفحہ 161)
سقیفہ کے اجلاس شوریٰ میں حضرت عمرؓ نے عوام کو یہ فرمایا۔

فَمَنْ بَايَعَ عَنْ غَيْرِ مَشْوَرَةِ الْمُسْلِمِينَ فَإِنَّهُ لَا بَيْعَةَ لَهُ (سیرہ ابن ہشام ج2 ص273)
اگر مسلمانوں کے مشورہ کے بغیر کسی کو خلیفہ بنایا گیا تو یہ فیصلہ کالعدم ہوگا۔
خلفائے راشدین کا یہی تامل تھا کہ جب کوئی اہم مسئلہ پیش آتا تو لوگوں کو مسجد میں جمع کیا جاتا اور ان کے سامنے پیش آمدہ مسئلہ رکھا جاتا تو ان کی رائے طلب کی جاتی کثرت سے جو طے ہوتا وہی فیصلہ نافذ کیا جاتا علامہ شوکانی یمانی لکھتے کہ
مسلمان اجتماعی نظم کے ساتھ شوریٰ (جمہوریت) سے کام لیتے تھے جلد بازی اور مطلق العنانی کے ساتھ انفرادی رائے سے کام لینا ان کی روایات میں داخل نہیں ہے۔ (فتح القدیر جلد 4 ص526)
ابن خور لکھتا ہے کہ:
''امیر حکومت کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ قانون شوریٰ (جمہوریت) سے قوت حاصل کرے یہ ہوسکتا ہے کہ امیر حکومت کسی معاملہ میں اتنی واقفیت اور مہارت نہ رکھتا ہو۔ جس قدر معاشرہ کے دوسرے افراد رکھتے ہوں اور یہ ممکن ہے کہ کسی قوم پر صورت حال مشکلات سے پُر ہو جائے۔ دونوں صورتوں میں شوریٰ کا انعقاد اور ماہرین علم وفن کی رائے لینا ضروری ہے جنگی معاملات میں فوج کے کمانڈروں سے مصالح عام کے سلسلہ میں عوام کے نمائندوں سے مملکت کے نظم اور تعمیر وترقی کے معاملہ میں اول درجہ کے مدبروں، دفتری حکام انتظامی افسروں اور وزیروں سے شوریٰ میں رائے لینی چاہیے۔ (فتح القدیر جلد 1 ص360)
علامہ قاضی ثناءاللہ پانی پتی لکھتے ہیں۔
''شوریٰ (جمہوریت) کی روح یہ ہے کہ جماعت کے افراد میں سے ہر فرد اپنے علم اور قابلیت کے مطابق اپنی آراء اور خیالات پیش کر دیتا ہے ایک دوسرے کے نظریات آپس میں ملتے ہیں اور اس سے ایک اچھا فیصلہ ہاتھ آ جاتا ہے۔ (تفسیر مظہری آل عمران جلد 2 ص162)
جمہوری طرز حکومت کا اہم وصف آئین کی پاسداری اور اس پر عمل کرنا ہے اسلام پہلا دین ہے جس نے آئین پر عمل کرنے پر زور دیا ہے اور جمہوری طرز حکومت کی اساس کو مضبوط کیا ہے ارشاد الٰہی ہے۔
لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنٰتِ وَاَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَالْمِيْزَانَ لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ (الحدید آیت 25:57)
ہم نے رسولوں کو کھلے دلائل کے ساتھ بھیجا اور ان کے ساتھ کتاب اور میزان اتاری تا کہ لوگ انصاف پر قائم ہیں۔
کتاب اور میزان سے مراد آئین ہے۔ جس کے مطابق لوگوں نے زندگی بسر کرنی ہے۔ بیان کیا گیا ہے کہ یہی طرز زندگی (آئین کے مطابق بسر کرنا) انصاف مہیا کرتا ہے۔
ارشاد الٰہی ہے۔
وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَا اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ (المائدہ 45:5)
اور جو لوگ اللہ کے نازل کردہ قانون (آئین) کے مطابق فیصلے نہ کریں پس وہی ظالم ہیں۔
دوسری جگہ آتا ہے۔
وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَا اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ (المائدہ 44:5)
اور جو لوگ اللہ کے نازل کردہ قانون کے مطابق فیصلے نہ کریں تو ایسے ہی لوگ کافر ہیں۔
حضرت عروہؓ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ حضرت ابو بکرؓ نے خطبہ دیا اول اللہ تعالیٰ کی حمد وثناء بیان کی اور فرمایا میں تمہارا امیر بنا دیا گیا ہوں حالانکہ میں تم سے بہتر نہیں ہوں لیکن قرآن نازل ہوا اور نبی کریم نے اپنی سنت کو بیان فرمایا۔ ہم نے ان کو سیکھا اور ان پر عمل کیا اور بلاشبہ

تمہارے زبردست لوگ میرے لیے اس وقت تک کمزور ہیں جب تک میں ان سے ان پر واجب شدہ حق لے لوں اور تمہارے کمزور لوگ میرے نزدیک اس وقت تک طاقتور ہیں جب تک کہ میں ان کا غصب شدہ حق واپس نہ دلا دوں اے لوگو! میں (قانون اسلام) کا پیروی کرنے والا ہوں میں کسی بدعت کی پیروی کرنے والا نہیں ہوں۔ اگر میں نیکی کی زندگی بسر کروں تو میری مدد کرو اور کجی اختیار کروں تو مجھے سیدھے کر دو میں یہی باتیں کہتا ہوں اور اپنے اور تمہارے لیے خدا سے مغفرت چاہتا ہوں۔ (کتاب الاموال لابی عبید ص366)

یہ ہے اسلام کی جمہوریت (شوریٰ) کے متعلق تعلیم، حکمرانوں کے لیے لوگوں سے مشورہ لینا ضروری قرار دیا ہے پھر جمہوری طرز حکومت کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ آئین پر عمل کرے چنانچہ اسلام نے جمہوری طرز حکومت کی اساس کو مضبوط کرنے کے لیے حکمرانوں پر یہ لازمی امر قرار دیا ہے کہ وہ آئین پر عمل کریں۔ اسلام کی یہ تعلیم صرف نظریاتی ہی نہیں بلکہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے خود بھی اس پر عمل کیا اور خلفاء راشدین نے بھی اگر کوئی مسلمان حکمران غیر جمہوری طرز حکومت اختیار کرتا ہے تو اسلام اس کا ذمے دار نہیں۔ لہٰذا جو معترض اسلام پر یہ اعتراض کرتا ہے کہ اسلام جمہوریت کا حامی نہیں اس نے اسلام کی تعلیم کا مطالعہ ہی نہیں کیا۔ یہ صرف اسلام کی خصوصیت ہے جس نے جمہوری نظام کی بنیاد رکھی۔ اور اب اس دور میں نظام جمہوریت کو ہی پسند کیا جاتا ہے یہ اسلام کی جمہوری تعلیم کا پرتو ہے۔

......☆......

سموئل پی ہنٹنگٹن کے چند اعتراضات

اعتراضات: سموئل پی ہنٹنگٹن (Samuel.p.Huntington) نے اپنی کتاب تہذیبوں کا تصادم (The Clash of Civilization) کے صفحہ (FA, Vol. 72, No.3, 1993) پر ایک ہی پیرہ میں اسلام سمیت مختلف مذاہب پر کئی الزامات عائد کیے ہیں۔ لکھتا ہے۔

Western ideas of individualism, liberalism constitutionalism human rights, equality, liberty, the rule of law, democracy free markets the separation of church and state have little resonance in Islamic, Confucian, Japanese, Hindu, Buddhist or orthodox cultures. 177 بحوالہ ابن وراق ص

دور حاضر کے مغربی تصورات یعنی انفرادیت، حریت انسانی، نظریہ دستور، حقوق انسانی، مساوات آزادی، قانون کی حکمرانی، جمہوریت، آزاد منڈی ریاست سے مذہب کی علیحدگی اسلام، کنفیوشس جاپانی مذہب ہندو دھرم، بدھ ازم اور راسخ العقیدہ کلچر میں نہیں پائے جاتے۔

(Individualism)

(فرد کی کردار سازی اور تعمیر سیرت)

معاشرہ، فرد سے تشکیل پاتا ہے۔ معاشرہ اس وقت اچھے ثمرات پیدا نہیں کر سکتا جب تک فرد کی اصلاح نہ ہو۔ لہٰذا معاشرہ کی فلاح اور بہتری کے لیے فرد کا مہذب اور با اخلاق ہونا ضروری ہے۔ اسلام نے فرد کو با کردار اور مہذب بنانے کے لیے اعلیٰ درجہ کے اصول مقرر کیے۔ انسان حقیقت میں اس وقت تک اعلیٰ کردار کا مالک نہیں بن سکتا جب تک اس کا دل گناہوں سے پاک نہ ہو۔ اس لیے اسلام نے فرد کے

تزکیہ نفس پر زور دیا ہے اور اس کے اصول بھی تعین کیے۔ ان پر عمل کر کے فرد نہ صرف با کردار بن جاتا ہے بلکہ با خدا بھی بن جاتا۔ باطنی تزکیہ نفس کے لیے حسب ذیل اصول ہیں۔

پہلا اصول عقائد:

عقائد سے مراد اللہ پر، فرشتوں پر، نبیوں پر، کتب سماوی پر اور آخرت پر ایمان ہے۔

ایمان باللہ اصول الاصول ہے جو نیکیوں کی جڑ ہے۔ خدا کا تصور ہی انسان کو ہر نیکی کے راستہ پر گامزن ہونے کی ترغیب دیتا ہے اور برائیوں سے باز رکھتا ہے۔ اسلام نے دائرہ اسلام میں داخل ہونے کے لیے یہ ضروری قرار دیا ہے کہ وہ اللہ پر ایمان لائے سورۃ بقرہ کے آغاز میں ہی متقی کے لیے یہ شرائط قرار دیتا ہے وہ اللہ پر ایمان لاتا ہے۔ ارشاد الٰہی ہے۔

يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ (بقرہ2:2)

وہ غیب پر ایمان لاتے ہیں۔

دوسری جگہ آتا ہے۔

مَالَكُمْ لَا تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ (الحدید ۔ ۸)

تمہیں کیا ہوگیا ہے کہ تم اللہ پر ایمان نہیں لاتے۔

جس طرح اللہ پر ایمان تعمیر سیرت کے لیے ضروری ہے اسی طرح دوسرے ضمنی عقائد ضروری ہیں فرشتوں پر ایمان لانا اس لیے ضروری ہے وہ انسان کے دل میں نیکی کی تحریک پیدا کرتے ہیں۔ انبیاء علیہم السلام لوگوں کے لیے ضابطہ حیات لاتے ہیں۔ جس پر عمل کر کے انسان فلاح کی راہ پاتا ہے تمام کتب سماوی کا مطالعہ کیجیے ان میں تعمیر سیرت کی تعلیم پائی جاتی ہے یوم آخرت پر ایمان انسان کے اندر محاسبے کا شعور پیدا کرتا ہے کہ ایک دن مرنے کے بعد اللہ کے سامنے اپنے اعمال کا حساب دینا ہے اس لیے اس کو اللہ تعالیٰ کے احکام کے مطابق زندگی بسر کرنی چاہیے احکام خداوندی پر عمل کرنا ہی تعمیر سیرت کا موجب ہے اور یہی انسانی فلاح ہے۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں جہاں اللہ پر ایمان لانے کا ذکر ہے وہیں اعمال صالحہ کا ذکر ہے گویا ایمانیات اور اعمال صالحہ لازم وملزوم ہیں۔

دوسرا اصول عبادات:

اللہ تعالیٰ نے انسان (فرد) کی تعمیر سیرت کے لیے دوسرا اصول عبادت مقرر کیا ہے اللہ تعالیٰ نے انسان کی پیدائش کی غرض وغایت ہی عبادت قرار دی ہے۔ ارشاد الٰہی ہے۔

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ (الذاریات56:51)

میں نے جن وانس کو اس لیے پیدا کیا ہے تاکہ میری عبادت کریں۔

دوسری جگہ آتا ہے۔

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّكُمُ الَّذِىْ خَلَقَكُمْ وَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ (البقرہ2:21)

اے لوگو! اپنے رب کی عبادت کرو جس نے تمہیں پیدا کیا اور انہیں بھی جو تم سے پہلے تھے تاکہ تم متقی ہو۔

اس آیت میں عبادت اور تزکیہ نفس کو لازم وملزوم قرار دیا ہے۔ آسمانی ضابطہ حیات کے مطابق زندگی گزارنا عمومی عبادت میں شامل ہے لیکن اسلام نے چار مخصوص عبادتیں مقرر کی ہیں جو عمومی عبادت کے قائم مقام ہیں وہ ہیں نماز زکوۃ روزہ اور حج ان چاروں عبادات کا

ایک ہی ہدف ہے وہ ہے تعمیر سیرت اور حصول تقویٰ اسلام میں تقویٰ وہ وصف ہے جو تمام نیکیوں کی جڑ ہے اور اسی جڑ سے تمام نیکیاں نمو پاتی ہیں اور یہی تعمیر سیرت ہے۔

مذکورہ عبادات کے علاوہ بھی تزکیہ نفس کے لیے چند اصول مقرر کیے ہیں وہ ہیں دعا، استغفار، توبہ مجاہدہ اور استقامت۔

تیسرا اصول: ضابطہ اخلاق

تعمیر سیرت کے لیے تیسرا اصول ایک مکمل ضابطہ اخلاق مقرر کیا ہے اس ضابطہ میں ایسے اعمال بھی ہیں، جن کو اپنانا ضروری ہے وہ اخلاق حسنہ کہلاتے ہیں اور ایسے اعمال کا بھی ذکر ہے جن سے اجتناب لازمی ہے۔ اس طرح یہ ضابطہ اخلاق حسنہ اور اخلاق سیئہ پر مشتمل ہے۔ جب تک انسان اس ضابطہ پر عمل نہیں کرتا وہ معاشرہ کا ایک اچھا ممبر نہیں بن سکتا۔

وہ ضابطہ اخلاق یہ ہے۔

اخلاق حسنہ، صدق، صبر، شرم وحیا، احسان، احصان (پاک دامنی) امانتداری، دیانت داری، ایفائے عہد، عدل وانصاف، شکر، عفو، رحم (شفقت ورحمت) جود وکرم، ایثار، انکساری، تواضع، رفق ولطف (رقیق القلبی) شجاعت، عزم واستقلال واستقامت، اعتدال، زہد و قناعت، واستغنا، تقویٰ، توکل، خوش کلامی، چشم پوشی، خدمت خلق (خیر خواہی)۔

اخلاق سیئہ:

کذب، وعدہ خلافی، خیانت، کبر وغرور، حسد، خودستائی، غیبت، بدظنی، بخل، بہتان طرازی، چغل خوری، ظلم، منافقت مدح سرائی، فحش گوئی، گالی، لعنت وتکفیر، ریاکاری ودکھاوا، حرص وطمع، غیظ وغضب، عیب جوئی، عاجزی وکاہلی۔

آداب:

فرد کی اعلیٰ تربیت کے لیے چند آداب بھی مقرر کر دیئے ہیں۔ تا کہ اس کا اخلاقی ڈھانچہ مزید استوار اور مضبوط ہو۔ وہ آداب یہ ہیں۔ طہارت کے آداب، کھانے کے آداب، مجلس کے آداب، کلام کے آداب، ملاقات کے آداب، باہر نکلنے کے آداب، چلنے پھرنے کے آداب، سفر کے آداب، لباس کے آداب، اسلام کے آداب۔

معاشرتی حقوق وفرائض:

اسلام نے معاشرہ بہتر بنانے کے لیے ہر فرد پر حقوق وفرائض مقرر کر دیئے ہیں۔

جان کی حفاظت:

اللہ تعالیٰ نے انسان کو جان (روح) امانت کے طور پر ودیعت کی ہے۔ اس کی حفاظت لازمی ہے۔ اسلام نے ہر فرد کو اس کی جان کی حفاظت کی ضمانت دی ہے اور کسی کی جان لینا سخت جرم قرار دیا ہے۔ ارشاد الٰہی ہے۔

وَلَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِي حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ (بنی اسرائیل 33:17)

اور اس جان کو قتل نہ کرو جسے اللہ نے حرام ٹھہرایا ہے مگر حق کے ساتھ۔

مال کی حفاظت:

ہر فرد اپنی عائلی ضروریات پورا کرنے کے لیے محنت سے مال ودولت کماتا ہے اس لیے دولت انسان کو بہت عزیز ہے اللہ تعالیٰ ہر

فرد کی دولت اور مال کی حفاظت کی ضمانت دیتا ہے۔ارشاد الٰہی ہے۔

وَلَا تَاْکُلُوْا اَمْوَالَکُمْ بَیْنَکُمْ بِالْبَاطِلِ (البقرہ 188:2)

اور اپنے مالوں کو آپس میں ناجائز طور پر نہ کھاؤ۔

آبرو کی حفاظت:

انسان اشرف المخلوقات ہے اور ابرو اس کا زیور ہے اگر کسی کی آبرو پر کوئی دھبہ لگ جائے اور اس کا لباسِ عزت تار تار ہو جائے تو انسانی معاشرہ میں ذلیل و خوار ہو جاتا ہے۔اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے معاشرہ کے ہر فرد کی عزت کی حفاظت ضروری قرار دی ہے۔اسی وجہ سے اسلام میں کسی فرد پر جھوٹا الزام لگانا جرم قرار دیا ہے۔اگر کوئی کسی پر جھوٹا الزام لگاتا ہے اور وہ اپنے الزام کو ثابت نہ کر سکے تو اس کے جھوٹ کی وجہ سے ہمیشہ کے لیے عدالت میں گواہی سے محروم کر دیا جاتا ہے۔ارشاد الٰہی ہے۔

وَالَّذِیْنَ یُؤْذُوْنَ الْمُؤْمِنِیْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ بِغَیْرِ مَا اکْتَسَبُوْا فَقَدِ احْتَمَلُوْا بُھْتَانًا مُّبِیْنًا (الاحزاب 58:33)

تم میں سے جو مومن مرد یا عورت کو تکلیف دیتا ہے غلط الزام لگاتا ہے تو وہ بہت بڑا گناہ اپنے سر اٹھاتا ہے۔

دوسری جگہ آتا ہے۔

یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا یَسْخَرْ قَوْمٌ مِّنْ قَوْمٍ عَسٰٓی اَنْ یَّکُوْنُوْا خَیْرًا مِّنْھُمْ وَلَا نِسَآءٌ مِّنْ نِّسَآءٍ عَسٰٓی اَنْ یَّکُنَّ خَیْرًا مِّنْھُنَّ وَلَا تَلْمِزُوْٓا اَنْفُسَکُمْ وَلَا تَنَابَزُوْا بِالْاَلْقَابِ بِئْسَ الْاِسْمُ الْفُسُوْقُ بَعْدَ الْاِیْمَانِ (الحجرات 11:49)

اے ایمان والو! کوئی شخص دوسرے کا تمسخر نہ کرے۔ممکن ہے کہ وہ تم سے بہتر ہو اسی طرح کسی عورت کو یہ روا نہیں کہ وہ کسی دوسری عورت کا تمسخر اڑائے، نہ آپس میں ایک دوسرے کو عیب لگاؤ اور نہ ایک دوسرے کو بُرے ناموں سے پکارو۔ایمان کے بعد بُرا نام کیا ہی برا نام ہے۔

اِجْتَنِبُوْا کَثِیْرًا مِّنَ الظَّنِّ اِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ اِثْمٌ (الحجرات 12:49)

بدگمانی سے بچو بعض وقت بدگمانی بڑا جرم ہو جاتی ہے۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع کے موقع انسانی حقوق کا منشور پیش کیا اس میں فرمایا:

اِنَّ دِمَآءَکُمْ وَاَمْوَالَکُمْ وَاَعْرَاضَکُمْ حَرَامٌ کَحُرْمَۃِ یَوْمِکُمْ ھٰذَا (بخاری کتاب الحج)

تمہاری جانیں اور تمہارے مال اور تمہاری ابروئیں ویسی حرمت رکھتی ہیں جیسی آج کے دن کی حرمت۔

حصول علم کا حق:

علم ہی اشرف انسانیت کا ذریعہ ہے اور انسان کے لیے زیور ہے علم کی وجہ سے آدم مسجود و ملائکہ بنا اسلام نے ہر انسان کو حصول علم کا مستحق ٹھہرایا ہے۔اس لیے ہر اسلامی حکومت پر یہ فرض ہے کہ ہر فرد کے لیے حصول علم کا بندوبست کرنے۔ارشاد الٰہی ہے۔

قُلْ ھَلْ یَسْتَوِی الَّذِیْنَ یَعْلَمُوْنَ وَالَّذِیْنَ لَا یَعْلَمُوْنَ (الزمر 9:39)

کہ کیا عالم اور جاہل برابر ہو سکتے ہیں۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں۔

طَلَبُ الْعِلْمِ فَرِیْضَۃٌ عَلٰی کُلِّ مُسْلِمٍ (سنن ابن ماجہ باب فضل العلماء)

علم حاصل کرنا ہر مسلمان کا فرض ہے۔

کسب کی آزادی:

اسلام نے ہر فرد کے لیے کسب کی آزادی دے رکھی ہے جو چاہے پیشہ اختیار کرے۔ کسب کی آزادی کے ساتھ بعض ایسی پابندیاں لگادی ہیں۔ جو معاشرہ میں اقتصادی ناہمواریوں سے روکتی ہیں۔

ارشاد الٰہی ہے۔

فَاِذَا قُضِيَتِ الصَّلٰوةُ فَانْتَشِرُوْا فِى الْاَرْضِ وَابْتَغُوْا مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ (الجمعہ 10:62)

پس جب نماز ختم کرلو تو زمین میں پھیل جاؤ اور اللہ کا فضل (رزق) تلاش کرو۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں۔

اِسْعَوْا اِنَّ اللّٰهَ كَتَبَ عَلَيْكُمُ السَّعْىَ (مسند امام احمد، کنوز الحقائق)

کوشش کرو کیونکہ اللہ نے تم پر حصول رزق کے لیے کوشش کرنا فرض کر دیا ہے۔

نجی زندگی کا تحفظ:

اسلام نے ہر فرد کی نجی زندگی کا تحفظ دیا ہے۔ یہ وہ تحفظ ہے جو کسی مذہب نے کسی فرد کو نہیں دیا ارشاد الٰہی ہے۔

يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَدْخُلُوْا بُيُوْتًا غَيْرَ بُيُوْتِكُمْ حَتّٰى تَسْتَاْنِسُوْا (النور 27:24)

اے لوگو! جو ایمان لائے ہو اپنے گھروں کے سوائے دوسرے گھروں میں داخل نہ ہو جب تک اجازت نہ لے لو۔

آزادی سکونت:

قرآن مجید میں آتا ہے۔

سِيْرُوْا فِى الْاَرْضِ (العنکبوت 20:29)

زمین چلو پھرو۔

مذہبی آزادی:

ہر فرد کو یہ حق حاصل ہے کہ جس مذہب کو چاہے اختیار کرے اور جسے چاہے ترک کر دے ارشاد الٰہی ہے۔

لَاۤ اِكْرَاهَ فِى الدِّيْنِ قَدْ تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ (البقرہ 256:2)

دین میں کوئی جبر نہیں ہدایت کی راہ گمراہی سے واضح ہو چکی ہے۔

مظلوم کو فریاد کرنے کا حق:

اسلام ہر مظلوم کو آئینی طور پر فریاد کرنے اور ظالم سے بدلہ لینے کا اختیار دیتا ہے ارشاد الٰہی ہے۔

لَا يُحِبُّ اللّٰهُ الْجَهْرَ بِالسُّوْٓءِ مِنَ الْقَوْلِ اِلَّا مَنْ ظُلِمَ وَكَانَ اللّٰهُ سَمِيْعًا عَلِيْمًا (النساء 148:4)

اللہ بُری بات کے مشہور کرنے کو پسند نہیں کرتا سوائے اس کے جس پر ظلم کیا گیا ہو اور اللہ سننے والا جاننے والا ہے۔

دوسری جگہ آتا ہے۔ ”جو کوئی اپنے اوپر ظلم کے بعد بدلہ لیتا ہے تو ان لوگوں پر الزام کا راستہ نہیں۔ الزام صرف ان لوگوں پر ہے لوگوں پر ظلم کرتے ہیں اور زمین میں ناحق زیادتی کرتے ہیں۔ انہی کے لیے دردناک دکھ ہے۔“ (الشوریٰ 42,41:42)

ہجرت کرنے کا حق:

اسلام ہر شخص کو یہ آزادی دیتا ہے جس جگہ چاہے سکونت اختیار کرے۔

اَرْضُ اللّٰہِ وَاسِعَةً فَتُھَاجِرُوْا فِیْھَا (النساء4:97)

اللہ کی زمین وسیع ہے کہ تم اس میں ہجرت کر جاؤ۔

مساوی حق:

معاشرہ میں ہر فرد برابر کا حق رکھتا ہے کوئی طبقاتی تقسیم نہیں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع کے موقع پر فرمایا۔

اَیُّھَا النَّاسُ اَلَا اِنَّ رَبَّکُمْ وَاحِدٌ وَّ اِنَّ اَبَاکُمْ وَاحِدٌ اَلَا لَا فَضْلَ لِعَرَبِیٍّ عَلٰی عَجَمِیٍّ وَلَا لِعَجَمِیٍّ عَلٰی عَرَبِیٍّ وَلَا لِاَحْمَرَ عَلٰی اَسْوَدَ وَلَا لِاَسْوَدَ عَلٰی الْاَحْمَرَ اِلَّا بِتَقْوٰی (مسند احمد)

اے لوگو! ہاں بے شک تمہارا رب ایک ہے تمہارا باپ ایک ہے یاد رکھو کسی عربی کو عجمی پر اور کسی عجمی کو عربی پر، کسی سرخ رنگ والے کو سیاہ رنگ والے پر اور کسی سیاہ رنگ والے کو سرخ رنگ والے پر کوئی فضیلت نہیں مگر تقویٰ ہے۔

گویا تقویٰ وجہ فضیلت قرار دیا ہے۔ ذات پات رنگ نسل ہر قسم کی طبقاتی تقسیم کو ختم کیا ہے۔

انصاف وعدل:

اسلام ہر فرد کو انصاف دیتا ہے قانون کی نظر میں سب برابر ہیں ارشاد الٰہی ہے۔

اِذَا حَکَمْتُمْ بَیْنَ النَّاسِ اَنْ تَحْکُمُوْا بِالْعَدْلِ (النساء4:58)

جب لوگوں کا انصاف کرو تو انصاف سے فیصلہ کرو۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کا ایک مشہور واقعہ ہے۔ ایک دفعہ ایک مخزومیہ عورت نے چوری کی ایک بڑے خاندان کا فرد ہونے کی وجہ سے بعض لوگوں کو یہ خیال ہوا اگر اس عورت کو سزا ہو گئی تو خاندان کا وقار خاک میں مل جائے گا۔ بعض صحابہ نے حضرت اسامہ کو آمادہ کیا۔ کہ وہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر سفارش کریں۔ چنانچہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر درخواست کی۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے سن کر فرمایا:

اِنَّمَا ھَلَکَ مَنْ کَانَ قَبْلَکُمْ فَھُمْ کَانُوْا یُقِیْمُوْنَ الْحَدَّ عَلَی الْوَضِیْعِ وَیَتْرُکُوْنَ الشَّرِیْفَ وَالَّذِیْنَ نَفْسِی بِیَدِہٖ لَوْفَاطِمَةُ فَعَلَتْ لَقَطَعْتُ یَدَھَا (بخاری اقامۃ الحد علی الوضیع والشریف)

تم سے پہلے والے اس وجہ سے ہلاک ہوئے کہ وہ نیچ قوم کے لوگوں کو سزا دیتے اور بڑوں کو چھوڑ دیتے تھے قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ میں میری ذات ہے اگر فاطمہ بھی یہ کام کرتی تو اس کا ہاتھ کاٹ دیتا۔

اسلام نے فرد کے صرف معاشرتی حقوق وضع نہیں کیے بلکہ معاشرہ کے تمام مستضعفین کی ہر قسم کی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے ایک فنڈ (زکوٰۃ) امراء پر فرض قرار دے دیا ہے کہ امراء سے لے کر ان غرباء کی مدد کی جائے۔

ارشاد الٰہی ہے۔

اِنَّمَا الصَّدَقٰتُ لِلْفُقَرَاءِ وَالْمَسٰکِیْنِ وَالْعٰمِلِیْنَ عَلَیْھَا وَالْمُؤَلَّفَةِ قُلُوْبُھُمْ وَفِی الرِّقَابِ وَالْغٰرِمِیْنَ وَفِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ وَابْنِ السَّبِیْلِ فَرِیْضَةً مِّنَ اللّٰہِ وَاللّٰہُ عَلِیْمٌ حَکِیْمٌ (التوبہ 9:60)

زکوٰۃ صرف ناداروں کے لیے ہے اور مسکینوں اور اس کے کارکنوں کے لیے اور جن کے دل مائل کرنا ہے اور غلاموں کے آزاد کرنے اور قرض داروں کے لیے اور اللہ کی راہ میں اور مسافر کے لیے یہ اللہ کی طرف سے ضروری ٹھہرایا گیا ہے اور اللہ جاننے والا حکمت والا ہے۔

مختلف قسم کے محتاجوں کا ذکر اس آیت میں کر دیا گیا ہے۔ یہ اسلام کی ہی فضیلت ہے کہ اس نے معاشرہ کے ہر فرد کے حقوق مقرر کر دیئے ہیں۔

یہ موضوع نامکمل رہے گا اگر معاشرہ کے افراد کے فرائض بیان نہ کیے جائیں جہاں حقوق مقرر کیے ہیں وہاں ان پر فرائض بھی عائد کیے ہیں۔

فرائض:

ہر فرد کا یہ فرض ہے کہ وہ اولوالامر (حاکم) کی اطاعت کرے۔ ارشاد الٰہی ہے۔

اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ (النساء4:59)

اطاعت کرو اللہ کی، رسول کی اور ان لوگوں کی جو تم میں سے صاحب امر (حاکم) ہیں۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں ہر مسلمان پر امراء کی اطاعت ضروری ہے جب تک وہ برائی کا حکم نہ دے۔ جب برائی کا حکم دے تو پھر نہ سننا ہے نہ ماننا۔ (بخاری کتاب الاحکام)

قانون کی پابندی:

قانون کی پیروی ہر فرد پر لازم ہے ارشاد الٰہی ہے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ يُحَآدُّوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗۤ اُولٰٓئِكَ فِي الْاَذَلِّيْنَ (المجادلہ58:20)

جو لوگ اللہ اور اس کے رسول کے مقرر کردہ قوانین کے خلاف کرتے ہیں وہ ذلیل ترین لوگ ہیں۔

تعاون:

ہر فرد کا یہ فرض ہے کہ وہ حکومت کے ہر آئینی امور پر تعاون کرے۔ ارشاد الٰہی ہے۔

تَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى (المائدہ5:2)

نیکی اور تقویٰ پر تعاون کرو۔

مالی قربانی، حکومت کا انتظام چلانے کے لیے ضروری ہے تاکہ حکومت مالی لحاظ سے مستحکم ہو۔ ہر حکومت خرچ پورا کرنے کے لیے ٹیکس لگاتی ہے ہر شہری کا فرض ہے کہ وہ ٹیکس ادا کرے ارشاد الٰہی ہے۔

وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ (البقرہ2:3)

جو ہم نے ان کو دیا ہے خرچ کرتے ہیں۔

دوسری جگہ آتا ہے۔

يَسْئَلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ قُلِ الْعَفْوَ (البقرہ2:219)

وہ تم سے پوچھتے ہیں کہ وہ کیا خرچ کریں کہ جو ان کی ضرورت سے بچ جائے وہ سب خرچ کرے۔

فوجی خدمت:

ہر شہری پر یہ فرض ہے کہ ملکی دفاع کے لیے اپنی خدمات حکومت کے سپرد کر دے ارشاد الٰہی ہے۔

وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ وَّمِنْ رِّبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُوْنَ بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ وَعَدُوَّكُمْ (انفال 8:60)

اور جو کچھ طاقت اور گھوڑوں کے سرحدوں پر باندھ رکھنے سے تم سے ہو سکے ان کے لیے تیار رکھو تم اس کے ساتھ اللہ کے دشمن اور اپنے دشمن کو خوف زدہ رکھو۔

دوسری جگہ آتا ہے۔

مَالَكُمْ اِذَا قِيْلَ لَكُمُ انْفِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اثَّاقَلْتُمْ اِلَى الْاَرْضِ (توبہ 9:38)

تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ جب تم کو خدا کی راہ میں نکلنے کے کہا جائے تو تم زمین پر جم جاتے ہو۔

یہ ہے مختصر سا خاکہ کہ جو اسلام نے ایک فرد کے لیے بیان کیا ہے جس کے مطابق فرد اپنی زندگی بسر کرتا ہے اس کے لیے راستہ متعین ہے جس پر چل کر وہ منزل مقصود تک پہنچ جاتا ہے اسلام فرد کی صرف مادی زندگی سے تعلق نہیں رکھتا بلکہ اس کی روح کی پاکیزگی کے لیے بھی راہنمائی کرتا ہے۔ اسلام ہر فرد کی تکمیل سیرت پر زور دیتا ہے اور تکمیل سیرت کے لیے اصول بھی مقرر کیے ہیں جن پر چل کر ہر فرد اپنی سیرت کی تکمیل کر سکتا ہے۔ فرد معاشرہ کا پہلا جزو ہے۔ اگر جزو (فرد) بہتر ہو گا تو کل (معاشرہ) خود بخود بہتر ہو جائے گا۔ اس لیے اسلام نے فرد کی اصلاح کی طرف خاص توجہ دی ہے۔

یہ اعتراض بھی اسلام کی تعلیم سے ناواقفیت اور لاعلمی کی وجہ سے کیا گیا ہے۔

......☆......

آزادی اور اسلام (اسلام میں آزادی کا تصور نہیں پایا جاتا)

اعتراض: اسلام میں آزادی کا رجحان (تصور) نہیں پایا جاتا:

جواب : یہ اعتراض بھی اسلام پر عدم تدبر و تفکر کا نتیجہ ہے۔ اسلام نے اس وقت انسانی آزادی کا اعلان کیا جب تمام دنیا میں غلامی کا رواج تھا۔ اسلام پہلی دینی تحریک ہے جس نے انسانی آزادی کے ہر پہلو کو اجاگر کیا۔ صرف تعلیم ہی نہیں دی بلکہ دنیا سے غلامی کے ہر پہلو کو ختم کیا۔ آیئے اس موضوع پر قرآن مجید اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اُسوہ حسنہ کی روشنی میں بحث کریں۔

اسلام کا اعلان آزادی:

مفکرین نے آزادی کے مفہوم کو متعین کرنے میں افراط و تفریط کی راہ اختیار کی ہے اسلام نے جو دین فطرت ہے راہ اعتدال اختیار کر کے آزادی کی صحیح حدود متعین کی ہیں۔ اسلام انسان کو ان افعال میں بھی بے لگام نہیں چھوڑتا جن کا دوسروں پر اثر نہیں پڑتا۔ اسلام ان تمام افعال پر پابندی عائد کرتا ہے جو انسان کی اپنی ذات اور دوسروں کے لیے نقصان دہ ہوں کیونکہ معاشرہ اور فرد کا باہمی تعلق نہایت ہی گہرا ہے۔ جب فرد کی صحیح نشوونما نہیں ہوگی تو معاشرہ میں لازمی طور پر بگاڑ پیدا ہوگا۔ اس وجہ سے اسلام انسان کے ان افعال پر پابندی لگاتا ہے جو دوسروں کے لیے نقصان دہ ہیں وہاں ان افعال سے بھی روکتا ہے جو انسان کی اپنی ذات کو مجروح کریں۔ ارشاد الٰہی ہے۔

وَالَّذِيْنَ اِذَا فَعَلُوْا فَاحِشَةً اَوْ ظَلَمُوْا اَنْفُسَهُمْ ذَكَرُوا اللّٰهَ فَاسْتَغْفَرُوْا لِذُنُوْبِهِمْ (آل عمران 135:3)

اور وہ جس وقت کوئی برا کام کرتے ہیں اور اپنی جانوں پر ظلم کر بیٹھتے ہیں۔ اللہ کو یاد کرتے ہیں۔ پھر اپنے قصوروں کے لیے بخشش مانگتے ہیں۔

دوسری جگہ آتا ہے۔

لَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ اِنَّمَا يَاْمُرُكُمْ بِالسُّوْٓءِ وَالْفَحْشَآءِ (البقرہ 2:168,169)

شیطان کے قدموں کی پیروی نہ کرو۔ وہ یقیناً تم کو برائی اور بے حیائی کا حکم دیتا ہے۔

سوء سے مراد وہ افعال ہیں جو انسان کی اپنی ذات سے تعلق رکھتے ہوں اور اس کی ذات کے لیے نقصان دہ ہوں۔

فحشاء سے مراد وہ بُرے افعال ہیں جو دوسروں پر بداثرات مرتب کرتے ہوں۔

اسلام نے دونوں قسم کے افعال کو شیطان کی طرف منسوب کیا ہے اور ان سے باز رہنے کی تلقین کی ہے۔

آزادی کا اعلان:

اسلام ہی ایک ایسا مذہب ہے جس نے انسان کی گردن کو ہر قسم کی غلامی سے نجات دی ہے اور ہر قسم کی آزادی کی نعمتوں سے نوازا ہے قرآن مجید میں آتا ہے۔

وَيَضَعُ عَنْهُمْ اِصْرَهُمْ وَالْاَغْلٰلَ الَّتِيْ كَانَتْ عَلَيْهِمْ (الاعراف 7 : 57)

اور وہ انسانوں کی گردنوں کو ہر قسم کی غلامی اور پھندے سے نجات دیتا ہے۔

اس آیت کریمہ میں باریک سے باریک قسم کی غلامی سے آزادی کا اعلان کیا ہے۔

قرآن مجید کا یہ اعلان اس وقت ہوا جب لوگ حقوق انسانی سے بھی ناواقف تھے یہ وہ پہلی آواز ہے جو عرب کے ریگستان سے اٹھی اور دنیا کے چاروں گوشوں میں گونج اٹھی آج اسی آسمانی آواز سے متاثر ہو کر مفکرین آزادی، آزادی پکار رہے ہیں دنیا کی سب سے بڑی انجمن ''اقوام متحدہ'' نے انسانی حقوق کا عالمی منشور شائع کیا تو اس میں اعلان کیا کہ (دفعہ 3) ہر شخص کو اپنی جان کی آزادی اور ذاتی تحفظ کا حق حاصل ہے۔

دفعہ (4) کوئی شخص غلام اور لونڈی بنا کر نہ رکھا جائے گا غلامی اور بردہ فروشی چاہے اس کی کوئی شکل بھی ہو۔ ممنوع قرار دی جائے گی۔

(دفعہ 18) ہر انسان کو آزادی فکر، آزادی ضمیر اور آزادی مذہب کا پورا حق ہے اس حق میں مذہب یا عقیدے کو تبدیل کرنے اور پبلک میں نجی طور پر تنہا یا دوسروں کے ساتھ مل کر عقیدے کی تبلیغ عمل عبادات اور مذہبی رسمیں پوری کرنے کی آزادی بھی شامل ہے۔

(دفعہ 19) ہر شخص کو اپنی رائے رکھنے اور اظہار رائے کی آزادی کا حق حاصل ہے۔ اس حق میں یہ امر حق بھی شامل ہے کہ وہ آزادی کے ساتھ اپنی رائے قائم کرے اور جس ذریعے سے چاہے بغیر ملکی سرحدوں کا خیال کیے علم و خیالات کی تلاش کرے انہیں حاصل کرے اور ان کی تبلیغ کرے۔

(دفعہ 29(2)) اپنی آزادیوں اور حقوق سے فائدہ اٹھانے میں ہر شخص صرف ایسی حدود کا پابند ہوگا جو دوسروں کی آزادیوں اور حقوق کو تسلیم کرنے اور ان کا احترام کرنے کی غرض سے یا جمہوری نظام میں اخلاق امن عامہ اور فلاح و بہبود کے مناسب لوازمات کو پورا کرنے کے لیے قانون کی طرف سے عائد کیے گئے ہیں۔

عالمی منشور کی یہ دفعات دراصل اس آسمانی آواز کی بازگشت ہیں جو آج سے چودہ سو سال بیشتر ایک بے آب و گیاہ وادی سے اٹھی جب دنیا غلامی کی زنجیروں میں جکڑی ہوئی تھی۔ اس تاریک دور میں ایک اُمّی نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ہر قسم کی غلامی سے مخلوق خدا کو آزاد کر کے کامل حریت کا سبق پڑھایا۔ جن میں سے چند مشتے نمونہ از خروارے مجملاً بیان کرتا ہوں۔

سیاسی آزادی (سیاسی غلامی سے نجات):

دنیا میں ہزار ہا سال سے بادشاہ کی مطلق العنانی کا دور چلا آ رہا تھا۔ اس کا ہر حکم قانون تصور کیا جاتا تھا اور وہ خود کسی قانون کے ماتحت نہیں ہوتا تھا۔ اس طرح بادشاہ ظلم و ستبداد کا مرقع اور رعایا غلامی کی بدترین تصویر بنی ہوئی تھی۔ اسلام نے نسل انسانی کو اس غلامی کی لعنت سے نجات دلائی۔ قانون کی بالادستی کو قائم کیا۔ حاکم اور عوام دونوں کو قانون کی نظر میں برابر قرار دیا جس طرح ایک عام آدمی قانون شکنی کی وجہ سے قابل مواخذہ ہے اس طرح اگر حاکم قانون کو اپنے ہاتھوں میں لیتا ہے وہ بھی سزا کا مستحق ہے قرآن مجید فرماتا ہے۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَ اَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَ اُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِيْ شَيْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ (النساء 4:59)

اے لوگو! جو ایمان لائے ہو اللہ کی اطاعت کرو اور رسول کی اطاعت کرو اور ان لوگوں کی جو تم میں سے صاحب امر (حاکم) ہیں پھر اگر تم میں کسی چیز میں باہم اختلاف ہو جائے تو اس کو اللہ اور رسول کی طرف پھیر دو یعنی قانون کی طرف یہاں اللہ اور رسول قائم مقام قانون کے ہیں کیونکہ قانون (شریعت) کا ماخذ اللہ اور رسول ہی ہیں۔

دوسری جگہ آتا ہے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ يُحَآدُّوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗۤ اُولٰٓئِكَ فِي الْاَذَلِّيْنَ (المجادلہ 58:20)

جو لوگ اللہ اور اس کے رسول کے مقرر کردہ قوانین کے خلاف کرتے ہیں وہ ذلیل ترین لوگوں میں سے ہیں۔

ایک اور موقع پر فرمایا:

وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَا أَنْزَلَ اللَّهُ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الظَّٰلِمُونَ (المائدہ 5:45)

اور جو لوگ اللہ کے نازل کردہ قانون کے مطابق فیصلے نہ کریں پس وہی ظالم ہیں۔

فرمایا:

لَقَدْ أَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنَٰتِ وَأَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتَٰبَ وَالْمِيزَانَ لِيَقُومَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ (الحدید 57:25)

ہم اپنے رسولوں کو کھلے دلائل کے ساتھ بھیجا اور ان کے ساتھ کتاب اور میزان اتاری تا کہ لوگ انصاف پر قائم رہیں۔

اللہ تعالیٰ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتا ہے۔

وَلَا تَتَّبِعْ أَهْوَاءَهُمْ عَمَّا جَاءَكَ مِنَ الْحَقِّ (المائدہ 5:48)

اس قانون کو چھوڑ کر جو تمہارے پاس آیا ہے لوگوں کی خواہشات کی پیروی نہ کرو۔

اس آیت میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو قانون کے تابع بنا دیا ہے۔

الغرض اسلام پہلا دین ہے کہ جس نے بادشاہ سے لے کر رعایا کے ہر فرد پر یہ لازم قرار دیا ہے کہ وہ قانون کی پیروی کریں۔ یہی وہ سیاسی آزادی ہے جس کا اعلان اسلام نے کیا اور اس کی پیروی پیغمبر اسلام نے بھی کی۔

تمدنی آزادی (تمدنی غلامی سے آزادی):

اسلام سے قبل ہر قوم اپنی آبائی تقلید کی غلامی میں پھنسی ہوئی تھی جس سے تمام علمی، ذہنی ترقیاں مسدود ہو چکی تھیں قرآن مجید نے آبائی تقلید اور معاشرے کے رواج کی غلامی سے نجات دلانے کے لیے فرمایا:

أَوَلَوْ كَانَ آبَاؤُهُمْ لَا يَعْقِلُونَ شَيْئًا وَلَا يَهْتَدُونَ (البقرۃ۔۱۷۰)

یعنی کیا اگر ان کے آباؤ اجداد نہ کچھ عقل رکھتے ہوں اور نہ ہدایت پر ہوں۔

اس آیت کریمہ میں بیان فرمایا کہ ضروری نہیں کہ باپ دادا جو کریں وہ صحیح ہو۔ یہ بھی ممکن ہے کہ باپ دادا غلطی پر ہوں۔ اس وجہ سے آباؤ اجداد کی پیروی کرنے سے پہلے یہ دیکھ لینا چاہیے کہ ان کے باپ دادا کہیں غلطی پر تو نہ تھے۔

غرض کہ قرآن مجید نے آبائی کورانہ تقلید اور سوسائٹی کے رسم ورواج کی غلامی سے نجات دلا کر علمی اور ذہنی ترقیات کی راہیں کھول دی ہیں اسی راستہ پر چل کر انسان تہذیب نو کی عمارت تعمیر کر سکتا ہے آج دنیا میں علم کی جو راہیں کھلی ہوئی دیکھتے ہیں یہ اسلام کی مرہون منت ہیں جس نے آباؤ اجداد کی رسوم کہن کی عمارت کو منہدم کیا اور اس کی جگہ علم و اجتہاد کی عمارت کو تعمیر کیا معاشرتی آزادی (معاشرتی غلامی سے نجات) کی بنیاد رکھی اسلام سے قبل عورت گھر میں ایک غلام کی حیثیت رکھتی تھی۔ تمام معاشرتی حقوق سے محروم تھی۔ وہ محض مرد کے رحم وکرم پر زندگی بسر کرتی تھی۔ اسلام نے عورت کو اس غلامی سے نجات دلائی اور عورت کی حیثیت میں ایک زبردست انقلاب برپا کیا۔ سب سے پہلے اسلام نے انسان ہونے کے لحاظ سے عورت کو مرد کے ساتھ مساوی حیثیت دی اور ان دونوں کو ایک ہی اصل کی دو شاخیں قرار دیا ارشاد الٰہی ہے۔

يَٰأَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوا رَبَّكُمُ الَّذِي خَلَقَكُمْ مِنْ نَفْسٍ وَاحِدَةٍ وَخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِيرًا وَنِسَاءً وَاتَّقُوا اللَّهَ الَّذِي تَسَاءَلُونَ بِهِ وَالْأَرْحَامَ إِنَّ اللَّهَ كَانَ عَلَيْكُمْ رَقِيبًا (نساء 4:1)

اے لوگو اپنے رب کا تقویٰ اختیار کرو جس نے تم کو ایک ہی اصل سے پیدا کیا اور اسی سے اس کا جوڑا پیدا کیا۔ اور ان دونوں سے بہت سے مرد اور عورتیں پھیلائیں اور اللہ کے حقوق کی جس کے ذریعے سے تم ایک دوسرے سے سوال کرتے ہو اور رحموں کی نگہداشت کرو اللہ

تم پر نگہبان ہے۔

اسلام نے عورت کے بیٹی ہونے کی حیثیت سے بیوی ہونے کی حیثیت سے، ماں ہونے کی حیثیت سے علیحدہ علیحدہ حقوق مقرر کر دیئے ہیں تاکہ عورت معاشرہ میں معزز فرد کی حیثیت سے زندگی بسر کرے اسی طرح اسلام نے تمام اعضاء معاشرہ کے حقوق وفرائض متعین کر دیئے ہیں اسی طرح حقوق وفرائض کے دائرہ میں تمام اراکین معاشرہ آزاد ہیں۔

اقتصادی آزادی (اقتصاد غلامی سے نجات):

اسلام سے قبل غرباء سرمایہ داروں کی غلامی کی زنجیروں میں بُری طرح جکڑے ہوئے تھے غلامی کی وہ مضبوط زنجیر سود در سود تھی اسلام نے سود کو حرام قرار دے کر غرباء کو سرمایہ داروں کے چنگل سے نجات دی اور اس کے ساتھ ان کے ساتھ ہمدردانہ سلوک کی تعلیم دی۔

قرآن مجید میں آتا ہے۔

يَآَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَاْكُلُوا الرِّبٰوٓا اَضْعَافًا مُّضٰعَفَةً (آل عمران 3:130)

اے ایمان والو! تم بڑھا بڑھا کر سود نہ کھاؤ۔

دوسری جگہ آتا ہے۔

وَاَحَلَّ اللّٰهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبٰوا (البقرہ 2:275)

اللہ نے خرید وفروخت کو حلال کیا ہے اور سود کو حرام کیا ہے۔

سود کو حرام قرار دے کر غرباء ومقروضوں کی پہلی زنجیر کو توڑا پھر اسلام نے غرباء کو امراء کے مال میں حق دار قرار دے دیا۔ اب ایک سرمایہ دار اپنے مال کو اپنا اقرار نہیں دے سکتا جب تک وہ غرباء کا حق نہیں نکالتا۔ اگر وہ نہیں نکالتا تو وہ قانون کی نظر میں مجرم ہے اور اس کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے نزدیک بھی گناہ گار ارشاد الٰہی ہے۔

وَفِيْٓ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ (الذاریات 59:19)

ان کے مالوں میں سوالی اور نہ مانگنے والوں کا حق ہے۔

اسلام نے غرباء کو اقتصادی غلامی سے نجات دلانے کے لیے امراء کے مال پر ایک ٹیکس لازمی قرار دے دیا ہے امراء پر وہ ٹیکس لازمی قرار دیا ہے اور اس کو ارکان خمسہ کا ایک رکن قرار دیا ہے اسلام نے اس کا نام زکوٰۃ رکھا ہے۔

ارشاد الٰہی ہے۔

خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَكِّيْهِمْ بِهَا (التوبہ 9:103)

ان کے مال سے زکوٰۃ لے تاکہ تو انہیں پاک وصاف کرے۔

پھر اقتصادی ناہمواریوں سے بچنے کے لیے حرام اور ناجائز طریقے سے کسی کا مال کھانے سے منع کر دیا۔ ارشاد الٰہی ہے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ اِلَّآ اَنْ تَكُوْنَ تِجَارَةً عَنْ تَرَاضٍ مِّنْكُمْ (النساء 4:29)

اے لوگو! جو ایمان لائے ہو آپس میں ایک دوسرے کے مال ناحق طور پر مت کھاؤ بجز اس کے کہ وہ مال تجارت ہو اور باہمی رضامندی پر مبنی ہو۔

اسلام نے کئی سو سال قبل اقتصادی غلامی سے نجات دلانے کے لیے ایک مفصل اقتصادی پروگرام دیا جس سے منصفانہ تقسیم دولت کی راہیں کھلیں اور لوگ اقتصادی غلامی سے نجات پا گئے۔ رسول کریم ﷺ کا عہد حکومت اس امر پر ایک واضح دلیل ہے۔

جہالت کی غلامی سے نجات:

اسلام سے قبل جہالت کی وجہ سے لوگ اوہام باطلہ کی دلدل میں پھنسے ہوئے تھے اسلام نے تمام اوہام باطلہ اور جاہلانہ رسم ورواج کو ملیامیٹ کر کے انسان کی عقل کو جہالت کی غلامی سے نجات بخشی ارانسان کو علم کی ترغیب دی۔ اسلام نے انسان کو بتایا کہ اس کو تمام مخلوق پر حتیٰ کہ ملائکہ پر بھی علم کی وجہ سے فضیلت حاصل ہے جیسا کہ سورۃ بقرہ کے آغاز میں ہی قصہ آدم بیان کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے بیان فرمایا:

عَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا ثُمَّ عَرَضَهُمْ عَلَى الْمَلٰٓئِكَةِ فَقَالَ اَنْۢبِـُٔوْنِىْ بِاَسْمَآءِ هٰٓؤُلَآءِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ قَالُوْا سُبْحٰنَكَ لَا عِلْمَ لَنَآ اِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا اِنَّكَ اَنْتَ الْعَلِيْمُ الْحَكِيْمُ (البقرہ 2:32,31)

اور آدم کو سب نام سکھائے پھر ان چیزوں کو فرشتوں کے سامنے پیش کیا اور کہا کہ مجھے ان کے نام بتاؤ اگر تم سچے ہو اور انہوں نے کہا تو پاک ہے ہمیں کوئی علم نہیں مگر وہی جو تو نے ہمیں سکھایا ہے بے شک تو علم والا حکمت والا ہے۔

اس آیت میں بنی آدم کو یہ تعلیم دی ہے کہ اس کی خلافت علم پر مبنی ہے حصول علم کے ساتھ ہی اس کی ترقی وابستہ ہے دوسری جگہ فرمایا:

قُلْ هَلْ يَسْتَوِى الَّذِيْنَ يَعْلَمُوْنَ وَالَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ (الزمر 9:39) کہہ کیا عالم اور جاہل برابر ہو سکتے ہیں۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں۔

طَلَبُ الْعِلْمِ فَرِيْضَةٌ عَلٰى كُلِّ مُسْلِمٍ (سنن ابن ماجہ باب فضل العلماء)

ہر مسلمان پر علم حاصل کرنا فرض ہے۔

تَفَكُّرُ سَاعَةٍ خَيْرٌ مِنْ عِبَادَةِ سَبْعِيْنَ سَنَةٍ (کنوز الحقائق حرف التاء)

ایک گھڑی فکر کرنا ستر سال کی عبادت سے بہتر ہے۔

یہ ہے اسلام کی تعلیم انسان کو جاہلیت کی تاریکی سے علم کی روشنی میں لانے کی یہ بھی ہر شخص جانتا ہے کہ جاہلیت کی غلامی سے بڑھ کر اور کوئی غلامی نہیں جب تک اس غلامی سے انسان کو نجات نہیں دلائی جاتی انسان ترقی کے راستہ پر گامزن نہیں ہو سکتا جب انسان اس غلامی سے نجات پا جاتا ہے تو اس کے بعد خود بخود دوسری غلامی کی زنجیریں ٹوٹ جاتی ہیں لہٰذا اسلام نے سب سے پہلے جاہلیت کی غلامی سے نجات دلائی۔

فکر وعقیدہ کی آزادی:

اسلام پہلا دین ہے جس نے حریت اعتقاد کو تسلیم کیا ہے ہر فرد کو یہ آزادی بخشی ہے کہ وہ اپنی عقل اور فکر سے جو عقیدہ چاہے اختیار کرے۔ ارشاد الٰہی ہے۔

لَآ اِكْرَاهَ فِى الدِّيْنِ قَدْ تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَىِّ (البقرہ 2:256)

یعنی دین میں کوئی زبردستی منوانا نہیں ہدایت کی راہ گمراہی سے الگ ہو چکی ہے۔

ایک اور جگہ فرمایا:

لَكُمْ دِيْنُكُمْ وَلِىَ دِيْنِ (الکافرون 109:6)

تمہارے لیے تمہارا دین ہے اور میرے لیے میرا دین ہے۔

رائے کی آزادی:

اسلام نے رائے کے اظہار کرنے پر کسی قسم کی قدغن نہیں لگائی خواہ وہ دینی ہو یا غیر دینی۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں۔ ”ہر مجتہد کو اجر ملتا ہے اگر اس نے اجتہاد میں غلطی کی تو اسے ایک اجر ملے گا اگر اس نے صحیح اجتہاد کیا تو اسے دو اجر ملیں گے۔“

عقبہ بن عامر سے مروی ہے کہ ایک مرتبہ میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس تھا کہ آپ کے پاس دو شخص آئے آپ ﷺ نے فرمایا: تم ان دونوں کے درمیان فیصلہ کرو۔ میں نے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آپ ﷺ پر میرے ماں باپ قربان ہوں آپ کے سامنے میں یہ جرأت نہیں کر سکتا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: تم فیصلہ کرو۔ میں نے عرض کیا کیسے فیصلہ کروں آپ ﷺ نے فرمایا: اجتہاد کرو اگر تم صائب الرائے رہے تو دس نیکیاں ملیں گی اور اگر غلطی کی تو ایک۔ تاریخ اس بات پر شاہد ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں صحابہ کھل کر آپ ﷺ کے سامنے اپنی رائے کا اظہار کرتے تھے اور پھر آپ ﷺ اس رائے پر عمل بھی کرتے تھے۔

آزادی سکونت:

قرآن مجید میں آتا ہے۔

سِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَانْظُرُوْا كَيْفَ بَدَاَ الْخَلْقَ (العنکبوت 20:29)

کہ زمین میں چلو پھر دیکھو کس طرح اس نے پہلی بار پیدا کیا۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں۔ ”تم جہاں چاہو رہو اور ہمارے اور تمہارے درمیان یہ شرط ہے کہ نہ تم خون ریزی کرو اور نہ تم رہزنی کرو اور نہ کسی پر ظلم کرو۔“ (نیل الاوطار جلد 7 ص 139)

روحانی آزادی:

یہ وہ آزادی ہے جو دنیا کے کسی خطے میں نہیں پائی جاتی۔ یہ آزادی غیر اللہ کی محبت سے نجات دلاتی ہے اور صرف واحدہ لاشریک کی محبت کی غلامی کا سبق دیتی ہے۔ حقیقی معنوں میں یہی حقیقی آزادی ہے اسی غرض کے لیے اس کی تخلیق ہوئی۔ ارشاد الٰہی ہے۔

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ (الذاریات 56:51)

میں نے جنوں اور انسانوں کو اپنی عبادت کے لیے پیدا کیا ہے۔

جب بندہ اللہ کے سوا کسی اور کی دہلیز پر سر رکھے گا۔ تو وہ غیر اللہ کا غلام ہو جائے گا۔ غیر اللہ کا غلام ہونا سب سے بڑی توہین انسانیت ہے اسی غلامی کے بندھنوں کو توڑنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو حکم دیا ہے۔

يٰاَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّكُمُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ وَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ (البقرہ 32:2)

اے لوگو! اپنے رب کی عبادت کرو جس نے تم کو پیدا کیا اور ان لوگوں کو جو تم سے پہلے تھے تاکہ تم متقی بن جاؤ۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو غیر اللہ کی غلامی سے نجات دلا کر یہ وہ کام کیا ہے جس کے لیے اللہ تعالیٰ نے تمام انبیاء علیہم السلام کو اس دنیا میں بھیجا۔ تمام انبیاء علیہم السلام کی بعثت کی غرض ہی یہ تھی کہ انسانوں کو غیر اللہ کی غلامی سے نکال کر اللہ کی محبت کا جوا ان کی گردنوں پر رکھ دیں۔ حقیقت میں اسی غلامی میں تمام آزادیاں پنہاں ہیں جس نے اللہ کی غلامی اختیار کر لی گویا اس نے تمام غلامیوں سے نجات حاصل کر لی۔

معترضین کو اس باریک نکتہ کا علم نہیں ہر قسم کی غلامی سے نجات کس نقطہ سے شروع ہوتی ہے۔ گویا اسلام نے غلامی کی جڑ کو پکڑا اور اس کو اکھاڑ کر رکھ دیا۔

اب میں اس غلامی کی نجات کو زیر بحث لاتا ہوں۔ جو معترضین کے قلب وذہن پر مسلط ہے اور سمجھتے ہیں کہ اسلام میں آزادی کا تصور نہیں پایا جاتا یعنی انسان دیگر اشیاء کی طرح دوسرے انسان کی ملکیت میں ہوتا ہے اور اس کا اپنا کوئی اختیار نہیں ہوتا وہ دوسروں کے رحم وکرم پر زندگی بسر کرتا ہے اس غلامی کے خلاف بھی سب سے پہلے اسلام نے آواز بلند کی۔ اور اس توہین آمیز رسم کو ہمیشہ کے لیے ختم کر دیا اس رسم کے خاتمہ کے لیے اسلامی تعلیم کو دو حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

اول:

مستقبل میں ہمیشہ کے لیے غلامی کو ختم کرنے کے متعلق تعلیم۔

دوم:

غلامی کے ساتھ حسن سلوک اور ان کو ختم کرنے کے متعلق تعلیم۔

غلاموں کے ساتھ حسن سلوک اور ان کی آزادی کا انتظام:

قرآن مجید آتا ہے۔

وَاعْبُدُوْا اللّٰهَ وَلَا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْئًا وَّبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا وَّبِذِى الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَالْجَارِ ذِى الْقُرْبٰى وَالْجَارِ الْجُنُبِ وَالصَّاحِبِ بِالْجَنْۢبِ وَابْنِ السَّبِيْلِ وَمَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ (النساء 36:4)

اور اللہ کی عبادت کرو اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرو ماں باپ کے ساتھ احسان کرو اور قریبیوں کے ساتھ بھی اور یتیموں اور مسکینوں اور قریبی پڑوسی اور دور کے پڑوسی اور پاس والے ساتھی اور مسافر اور ان سے جن کے تمہارے داہنے ہاتھ مالک ہوئے۔ (غلام)

اس آیت کریمہ میں غلاموں کے ساتھ معاشرہ کے دیگر افراد کی طرح حسن سلوک کی تعلیم دی ہے۔

حدیث میں آتا ہے۔

اِخْوَانُكُمْ خَوَلُكُمْ جَعَلَهُمُ اللّٰهُ تَحْتَ يَدِهٖ فَلْيُطْعِمْهُ مِمَّا يَاكُلُ وَلْيُلْبِسْهُ مِمَّا يَلْبَسُ وَلَا تُكَلِّفُوْا مَا يَغْلِبُهُمْ فَعِيْنُوْهُمْ (بخاری کتاب العتق باب قول النبی العبید اخوانکم فاطعموهم مما یاکلون)

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ تمہارے غلام تمہارے بھائی ہیں خدا نے ان کو تمہارے ماتحت کر دیا ہے تو جس کے تحت بھائی بہن کو اللہ اس کے ماتحت کر دے اس کو چاہیے کہ جیسا کہ وہ خود کھاتا ہے ویسا ہی ان کو کھلائے اور جیسا خود پہنتا ہے ویسا ہی ان کو پہنائے۔ اپنے غلاموں کو ایسا کام نہ دو جو ان کی طاقت سے باہر ہو اور اگر کبھی ایسا کام دو تو پھر اس کام میں خود ان کی مدد کرو۔

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا لوگو! میں تم کو بتاؤں کہ بدترین آدمی کون ہے وہ جو تنہا کھاتا ہے اپنے غلام کو تازیانہ لگاتا ہے مگر اس کو دیتا کچھ نہیں۔ (مشکوٰۃ باب النفقات علی المملوک)

وسائل حریت:

اسلام نے غلاموں کی آزادی کے لیے دو طریقے اختیار کیے ہیں۔ (1) طوعی (2) جبری

طوعی طریقہ:

قرآن مجید میں آتا ہے۔

وَمَا اَدْرٰكَ مَا الْعَقَبَةُ فَكُّ رَقَبَةٍ (البلاد 90:12-13)

اور تجھے کیا خبر کہ اونچی گھاٹی کیا ہے کسی گردن کو آزاد کرنا۔

وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالْكِتٰبِ وَالنَّبِيّٖنَ وَاٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ ذَوِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ وَالسَّآئِلِيْنَ وَفِي الرِّقَابِ (البقرہ 2:177)

لیکن بڑا نیک وہ ہے جو اللہ اور آخرت کے دن اور فرشتوں اور کتاب اور نبیوں پر ایمان لاتا ہے اور اس کی محبت کے لیے غریبوں اور تیموں اور مسکینوں اور مسافروں اور سوالیوں کو مال دے اور غلام آزاد کرنے میں مدد کرے۔

اس آیت میں یہ واضح طور پر بیان کیا ہے کہ صاحب استطاعت لوگ غلاموں کی آزادی کے لیے اپنے مال کیسے خرچ کریں۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں۔

مَنْ اَعْتَقَ النِّسَمَةَ اَعْتَقَ اللّٰهُ لِكُلِّ عُضْوٍ مِنْهَا عُضْوًا مِنَ النَّارِ (متفق علیہ)

جو شخص کسی ایک نفس کو آزاد کرے گا۔ اللہ تعالیٰ اس کے ہر عضو کو غلام کے ہر ہر عضو کے بدلے دوزخ کی آگ سے آزاد کرے گا۔

حضرت براہ سے روایت ہے۔ کہ ایک عربی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور کہنے لگا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مجھے آپ کوئی ایسا عمل بتا دیجیے جو جنت میں داخل کر دے۔ آپ ﷺ نے فرمایا تم نے لفظ تو مختصر کہے ہیں مگر بات بہت بڑی دریافت کی ہے۔ (جنت میں داخل کرنے والا عمل یہ ہے)

یعنی غلام کو آزاد کرو اگر اکیلے آزاد نہ کر سکو تو دوسروں کے ساتھ مل کر آزاد کرو بیہقی شعب الایمان بحوالہ مشکوٰۃ کتاب العتق) اس ترغیب کا یہ نتیجہ ہوا کہ صحابہ کثرت سے غلام آزاد کرتے تھے شرح بلوغ المرام میں چند صحابہ کرام کے آزاد کردہ غلاموں کی تعداد بیان کی گئی ہے وہ درج ذیل کی جاتی ہے گو یہ فہرست یقیناً نامکمل ہے لیکن یہ بات کھل کر سامنے آجائے گی کہ صحابہ کرام غلاموں کو آزاد کرانے میں کس قدر مشتاق تھے۔

1- آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے 63 غلام آزاد کیے۔
2- حضرت عائشہ نے 67۔
3- حضرت عباس نے 70۔
4- حضرت حکیم بن حزام نے 100
5- حضرت عبداللہ بن عمر نے ایک ہزار
6- حضرت عبدالرحمان بن عوف نے تین ہزار
7- حضرت عثمان بن عفان نے بتیس صرف ایک دن میں جو ان کی شہادت کا دن تھا۔ ویسے ان کی مجموعی تعداد بہت زیادہ ہے۔
8- ذوالکلاح الحمیری نے آٹھ ہزار صرف ایک دن میں (سبل المرام شرح بلوغ المرام کتاب العتیق)

جبری طریقہ:

اسلام نے غلاموں کو آزاد کرنے کے لیے بعض گناہوں کے کفارہ میں غلام آزاد کا حکم دیا۔ کفارہ قتل خطا (4:92) کفارہ ظہار (58:43) کفارہ یمین (5:89) روزہ کے توڑنے کے کفارہ میں غلام آزاد کرانے کی تعلیم دی۔

احادیث سے یہ بات ثابت ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے معمولی معمولی گناہوں کے کفارہ میں غلام آزاد کرنے کا حکم دیا

ہے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں۔

مَنْ لَطَمَ مَمْلُوْكًا اَوْضَرَبَهٗ فَكَفَّارَتُهٗ اَنْ يُّعْتِقَهٗ (ابوداؤد)

جوکوئی اپنے غلام کوتھپڑ مارے یا مارے تو اس کا کفارہ یہ ہے کہ غلام آزاد کر۔

مکاتبت:

اسلام کی طرف سے غلاموں کے مالکوں پر یہ وہ جبری نظام ہے جس سے غلام خود بخود آزادی حاصل کر سکتے ہیں۔ اس نظام کے تحت مالک اس بات پر مجبور ہوتا ہے کہ اگر غلام اس کے پاس رہنا پسند نہیں کرتا تو اسے یہ حق حاصل ہے کہ وہ اس سے مناسب رقم ادا کرنے کی شرط پر آزادی حاصل کرے قرآن مجید میں آتا ہے۔

اَلَّذِيْنَ يَبْتَغُوْنَ الْكِتٰبَ مِمَّا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ فَكَاتِبُوْهُمْ (نور 24:33)

اور جن کے تمہارے داہنے ہاتھ مالک ہیں ان میں سے جو آزادی کی تحریر مانگیں تو انہیں دو۔

اگر ایک غلام کی ملکیت میں کئی آدمی شریک ہوں تو ایک شخص آزاد کرتا ہے تو اس صورت میں وہ حصہ ہی نہیں بلکہ پورا غلام آزاد ہو جائے گا اگر آزاد کرنے والا شخص مالدار ہے تو اس پر دوسرے شرکاء کے حصوں کو آزاد کرنا ضروری ہے۔ ورنہ غلام کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ کسب کر کے دوسرے شرکاء کو قیمت ادا کرے اس کے بعد وہ آزاد ہو جائے گا۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں۔

مَنْ اَعْتَقَ نَصِيْبًا اَوْشَقْصًا فِىْ مَمْلُوْكٍ فَخَلَاصُهٗ عَلَيْهِ فِىْ مَالِهٖ اِنْ كَانَ لَهٗ مَالٌ وَّالَّا قُوِّمَ عَلَيْهِ فَاسْتُسْعِىَ بِهٖ غَيْرَ مَشْقُوْقٍ عَلَيْهِ۔ (ابوداؤد فی العتق علی الشرط)

جس شخص نے کسی مشترک غلام میں اپنا حصہ آزاد کر دیا پس اگر وہ مال دار ہے تو اس پر واجب ہے کہ اپنے شرکاء کے حصوں کے بقدر مال ادا کر کے اس کو آزاد کرے۔ ورنہ اس کی قیمت مقرر کر لی جائے اور اس غلام سے بغیر کسی محنت مشقت کے اس سے سعی وکسب کرایا جائے۔

غلاموں کی آزادی کے لیے بیت المال میں حصہ:

اسلام نے صرف آزاد کرنے کی ترغیب نہیں دی بلکہ بیت المال میں غلاموں کی آزادی کے لیے ایک مستقل فنڈ مقرر کر دیا ہے ارشاد الٰہی ہے۔

اِنَّمَا الصَّدَقٰتُ لِلْفُقَرَآءِ وَالْمَسٰكِيْنِ وَالْعٰمِلِيْنَ عَلَيْهَا وَالْمُؤَلَّفَةِ قُلُوْبُهُمْ وَفِى الرِّقَابِ وَالْغٰرِمِيْنَ وَفِىْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَابْنِ السَّبِيْلِ فَرِيْضَةً مِّنَ اللّٰهِ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ (توبہ 9:60)

زکوٰۃ صرف ناداروں کے لیے ہے اور مسکینوں اور اس کے کارکنوں کے لیے اور جن کے دل مائل کرنا ہے اور غلاموں کے آزاد کرنے اور قرض داروں کے لیے اور اللہ کی راہ میں اور مسافروں کے لیے یہ اللہ کی طرف سے ضروری ٹھہرایا گیا ہے اور اللہ جاننے والا حکمت والا ہے۔

زکوٰۃ فنڈ میں ایک مستقل مصرف غلاموں کی آزادی کے لیے مقرر کر دیا گیا ہے۔

ہمیشہ کے لیے غلامی کو ختم کرنے کی تعلیم:

اسلام سے قبل غلام بنانے کے دو طریقے تھے۔

اول: جنگ کے دوران میں فاتح قوم مفتوح قوم کے مرد و زن کو غلام بنا کر ان کی متاع آزادی کو سلب کر لیتی تھیں۔

دوم: جنگ نہ ہوتب مختلف حربوں سے طاقتور کمزوروں کی آزادی کو چھین لیتے تھے مثلاً چوری چھپے یا اعلانیہ ڈاکا ڈال کر مردوزن اور بچوں کو لے بھاگنا یا چھین لینا یا خرید لینا۔

اسلام نے نسل انسانی کو غلام بنانے کے تمام طریقوں سے نجات دلائی اور غلامی کو صفحہ ہستی سے حرف غلط کی طرح مٹا دیا۔

غلام بنانا حرام فعل ہے۔طریقہ دوم یعنی طاقت ور کا کمزور لوگوں کو چوری چھپے یا اعلانیہ ڈاکا ڈال کر یا خرید وفروخت کے ذریعے غلام بنا لینے کے متعلق حدیث میں آتا ہے۔

قَالَ اللّٰهُ تَعَالیٰ ثَلَاثَةٌ اَنَا اَخْصَمُهُمْ یَوْمَ الْقِیَامَةِ رَجُلٌ اَعْطٰی بِیْ ثُمَّ غَدَرَ وَرَجُلٌ بَاعَ حُرًّا فَاَکَلَ ثَمَنَهٗ وَرَجُلٌ اسْتَاجَرَ اَجِیْرًا فَاسْتَوْفٰی مِنْهُ وَلَمْ یُعْطِ اَجْرَهٗ (بخاری کتاب الاجارہ)

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اللہ تعالیٰ فرماتا ہے تین قسم کے آدمی ہیں جن سے میں قیامت کے دن جھگڑا کروں گا ایک وہ شخص جس نے مجھ کو اپنا عہد دیا اور پھر غداری کی اور ایک وہ شخص جس نے ایک آزاد خریدا پھر (اس کو غلام بنا کر) اس کی قیمت کو کھاتا ہے ایک وہ شخص جس نے کسی کو اجرت پر کام لیا اور پورا کام کرالیا مگر اس کو اس کی اجرت نہ دی۔

حضرت ابن عمر نے روایت کی کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے فرمایا کہ تین قسم کے لوگ ہیں جن کی نماز قبول نہ کی جائے اور میں ان سے قیامت کے دن لڑوں گا۔

اول: وہ شخص جو میرا واسطہ دے کر کسی کے ساتھ کوئی عہد باندھتا ہے اور پھر بدعہدی کرتا ہے۔

دوم: وہ جو اسے غلام بناتا ہے جسے خدا نے آزاد رکھا ہے۔

سوم: وہ جو مزدور سے تو پورا کام لیتا ہے اور پھر اس کی مزدوری نہیں دیتا (ابوداؤد بروایت فتح الباری جلد 4 ص 246)

قرآن مجید میں بھی چوری چھپے یا اعلانیہ ڈاکا ڈال کر کسی کو آزادی سے محروم کردینا ناجائز قرار دیا گیا ہے۔ارشاد الٰہی ہے۔

مَا کَانَ لِنَبِیٍّ اَنْ یَّکُوْنَ لَهٗ اَسْرٰی حَتّٰی یُثْخِنَ فِی الْاَرْضِ تُرِیْدُوْنَ عَرَضَ الدُّنْیَا وَاللّٰهُ یُرِیْدُ الْاٰخِرَةَ وَاللّٰهُ عَزِیْزٌ حَکِیْمٌ لَوْلَا کِتٰبٌ مِّنَ اللّٰهِ سَبَقَ لَمَسَّکُمْ فِیْمَا اَخَذْتُمْ عَذَابٌ عَظِیْمٌ (الانفال 8:67,68)

ایک نبی کے لیے شان شایان نہیں کہ اس کے قبضے میں قیدی ہوں۔جب تک کہ وہ زمین میں جنگ کر کے غالب نہ آ جائے۔تم دنیا کا مال چاہتے ہو اور اللہ تمہارے لیے آخرت کو چاہتا ہے اور اللہ غالب حکمت والا ہے۔اور اللہ کی طرف سے پہلے حکم نہ ہو چکا ہوتا تو تم کو اس بارے میں جو تم کرنے لگے تھے بھاری عذاب پہنچ کر رہتا۔

ہجرت کے بعد جب کفار مکہ مسلمانوں کی تباہی کے منصوبے تیار کرنے لگے تو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ والوں کے حالات معلوم کرنے کے لیے ایک چھوٹی سی جماعت بھیجی۔انہیں کفار مکہ کے تین آدمی مل گئے جن پر مسلمانوں نے حملہ کر دیا اور ایک کو قتل کر دیا اور دو کو گرفتار کر کے مدینہ لے آئے۔رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حملہ پر ناپسندیدگی کا اظہار فرمایا مقتول کا تو خون بہا ادا کیا اور قیدیوں کو رہا کر دیا۔اس طرح جب مسلمان جنگ بدر کے لیے نکلے تو اسلامی فوج میں بعض مسلمانوں کا خیال ہوا۔کہ فوج سے نبرد آزما ہونے کے بجائے قافلہ پر حملہ کر دیا جائے ان وجوہ کی بناء پر یہ آیات نازل ہوئیں کہ سوائے جنگ کے اور کسی طریقے سے قیدی نہیں بنائے جاسکتے۔اللہ تعالیٰ نے جنگ کے سوا دوسرے طریقے کے ذریعے غلام بنانے کو ''عرض الدنیا'' کہا ہے اور

لَوْلَا کِتٰبٌ مِّنَ اللّٰهِ سَبَقَ لَمَسَّکُمْ فِیْمَا اَفَضْتُمْ فِیْهِ عَذَابٌ عَظِیْمٌ

کے الفاظ میں تنبیہ کی ہے کہ اب وہ زمانہ گزر چکا ہے کہ جب طاقت ور محض دنیاوی اغراض کے لیے آزاد انسانوں کو متاع آزادی سے محروم کر دیتے تھے جنگ کے سوا اور کسی طریقے سے قیدی بنانا عذاب عظیم کا موجب ہے۔

پس ان آیات میں جنگ کے ذریعے کمزور قوموں کو غلام بنانے کے طریقے کو ہمیشہ کے لیے مسدود کر دیا۔
اب ایک سوال باقی رہ جاتا ہے کہ وہ یہ کہ اگر جنگ چھڑ جائے اور جنگ میں قیدی پکڑے جائیں کیا وہ ہمیشہ کے لیے متاع آزادی سے محروم ہو جائیں گے اور فاتح قوم کے غلام بن جائیں گے۔

اسلام نے اس کا جواب نہایت ہی عمدہ پیرائے میں دیا ہے جس سے رسم غلامی ہمیشہ کے لیے ختم ہو جاتی ہے۔ ارشاد الٰہی ہے۔
فَإِذَا لَقِيتُمُ الَّذِينَ كَفَرُوا فَضَرْبَ الرِّقَابِ حَتَّىٰ إِذَا أَثْخَنتُمُوهُمْ فَشُدُّوا الْوَثَاقَ فَإِمَّا مَنًّا بَعْدُ وَإِمَّا فِدَاءً حَتَّىٰ تَضَعَ الْحَرْبُ أَوْزَارَهَا (محمد 4:47)

اور جب تمہاری کافروں سے مڈبھیڑ ہو جائے تو گردنیں مارنا ہے یہاں تک کہ تم ان پر غالب آ جاؤ۔ تو قید میں مضبوط باندھ لو۔ پھر بعد میں یا تو احسان کے طریقہ پر یا فدیہ لے کر چھوڑ دو۔ یہاں تک کہ لڑائی اپنے ہتھیار رکھ دے۔
اس آیت میں قیدیوں کے متعلق واضح حکم دے دیا ہے کہ یہ قید عارضی ہوگی جب جنگ ختم ہو جائے گی تو ان قیدیوں کو فدیہ لے کر چھوڑ دینا ہوگا یا احسان کے طور پر۔ احسان کو مقدم رکھا ہے جس میں یہ اشارہ کیا گیا ہے کہ جنگ کے قیدیوں کو احسان رکھ کر چھوڑ دینا چاہیے۔
اس آیت نے قطعی فیصلہ دے دیا ہے کہ جنگی قیدی محض عارضی قیدی ہیں جنگ کے اختتام پر ان کو چھوڑنا لازمی ہے۔
متذکرہ بالا بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ جنگ کے سوا غلام بنانا مستوجب عذاب عظیم ہے اگر دفع شر کے لیے جنگ ناگزیر ہو جائے تو اگر جنگ میں قیدی پکڑے جائیں تو ان کی قید عارضی ہوگی۔ جنگ کے اختتام پر یا تو ان قیدیوں کو احسان رکھ کر چھوڑ دینا ہوگا یا فدیہ لے کر۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا طرز عمل:

جب اسلامی غزوات پر نظر دوڑاتے ہیں تو یہ بات کھل کر سامنے آ جاتی ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسیران جنگ کو یا تو احسان رکھ کر چھوڑ دیا یا فدیہ لے کر۔ غزوہ بدر میں جتنے قیدی ہاتھ آئے بعض سے معاوضہ لے کر رہا کر دیا جن کو بلا معاوضہ رہائی دی گئی تھی ان میں سے ابوعزہ عمرو الجحی بھی تھا جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں گستاخانہ نظمیں لکھا کرتا تھا۔
غزوہ حنین میں چھ ہزار قیدی رہا کیے تھے۔ غزوہ بنی المصطلق میں چھ سو قیدی گرفتار ہوئے اور سب کو دفعتاً آزاد کر دیا گیا۔
فتح مکہ کے دن ان تمام کفار کو جو آپ ﷺ کے جانی دشمن تھے اور مسلمانوں کو صفحہ ہستی سے مٹانے کے لیے مدینہ پر کئی مرتبہ حملے کر چکے تھے لاتثریب علیکم الیوم کہہ کر معاف کر دیا۔ انہی میں سے ہندہ بھی تھیں جس نے حضرت کے حمزہ کا کلیجہ نکال کر چبایا تھا۔ ابوجہل کا بیٹا عکرمہ، عبداللہ بن ابی سرح اور کعب بن زبیر بھی جو اسلام دشمنی میں سرخیل کفار تھے معاف کر دیئے تھے۔
غزوہ طائف میں جتنے قیدی آپ کے پاس آئے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے سب کو آزاد کر دیا حضرت ابن عباس کے الفاظ یہ ہیں۔

أَعْتَقَ صلی اللہ علیہ وسلم يَوْمَ الطَّائِفِ كُلَّ مَنْ خَرَجَ إِلَيْهِ مِنْ رَقِيقِ الْمُشْرِكِينَ
یعنی طائف کے دن مشرکوں کے جتنے غلام، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے آپ نے سب کو آزاد کر دیا۔
پس اسلام کی اس تعلیم نے غلامی کی رسم کو ہمیشہ کے لیے ختم کر دیا اور ان تمام طریقوں کو کلیتہً بند کر دیا جن کے ذریعے غلام بنائے جا سکتے ہیں۔

آزاد شدہ غلاموں کا اسلامی سوسائٹی میں مقام:

اسلامی سوسائٹی میں آزاد شدہ غلام ویسے ہی معزز و مکرم سمجھے جاتے تھے۔ جیسے دوسرے آزاد شہری اور ان کو وہی حقوق حاصل تھے جو دوسروں کو حاصل تھے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے آزاد کردہ غلام زید بن حارثہ اور ان کے بیٹے حضرت اسامہ کو جنگی مہموں میں سپہ

سالار مقرر کیا اور جلیل القدر اور صاحب عزت صحابیوں کو ان کے ماتحت رکھا۔ اس سے بڑھ کر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی حقیقی پھوپھی زاد بہن زینب بنت جحش کو حضرت زیدؓ کے نکاح میں دے دیا۔ سالم بن معقل مولیٰ ابی حذیفہ جلیل القدر صحابہ میں شمار ہوتے ہیں یہ ان چار قاریوں میں شمار ہوتے ہیں جن کو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن مجید کی تعلیم کے لیے مقرر کیا تھا۔ حضرت عمرؓ، حضرت بلالؓ کو ہمیشہ ''سیدنا'' کے لفظ سے پکارتے تھے۔

غلاموں کو یک لخت کیوں آزاد نہ کیا گیا:

غلاموں کی بتدریج آزادی حکمت بالغہ پر مبنی تھی۔ فوری آزادی صرف آقاؤں کے لیے ہی باعث مضرت نہ تھی۔ بلکہ غلاموں کے لیے بھی نقصان دہ تھی اور معاشرہ کے تمدن اور اخلاق کے لیے تباہ کن تھی۔ وہ لوگ جو پشتوں سے غلامی کی زندگی بسر کرتے چلے آ رہے تھے ان میں نہ صرف آزادی کی روح فوت ہو چکی تھی بلکہ ان کے قوائے عملیہ بھی مضمحل ہو چکے تھے اگر ان کو خالی ہاتھ رہا کر دیا جاتا تو لاکھوں مرد و زن بے خانماں ملک میں پھرتے۔ ان کا کوئی معاش نہ ہوتا نتیجہ یہ نکلتا کہ وہ گدائی کی زندگی بسر کرتے یا ڈاکہ زنی سے بسر اوقات کرتے اس طرح ملک کا تمدن اور اخلاق تہ و بالا ہو جاتا ان قباحتوں سے بچنے کے لیے غلاموں کی اصلاح اور انسداد غلامی کے لیے تین طریقے اختیار کیے۔

(1) فوری اصلاح (2) بتدریج اصلاح (3) مستقل غلامی کا خاتمہ

فوری اصلاح:

یہ کہ غلام کے مرتبہ کو بلند کر دیا آقاؤں کو یہ حکم دیا کہ جو وہ کھائیں وہی غلاموں کو کھلائیں جو خود پہنیں وہی ان کو پہنائیں، ان کی بساط سے بڑھ کر کام نہ دیں اگر وہ کام میں مشقت محسوس کریں تو ان کا ہاتھ بٹائیں آقا اور غلام کے درمیان ایک کامل اخوت قائم کر دی اور وہ پستی جو غلامی کی وجہ سے ان کی روح میں رچی ہوئی تھی رفعت اور عزت میں تبدیل ہو گئی وہ اپنے آپ کو معاشرہ کا باعزت رکن سمجھنے لگے۔

دوسری اصلاح بتدریج تھی یعنی جیسے جیسے غلام سوسائٹی کے مفید رکن بنتے چلے جائیں ان کو مکاتبت کے ذریعے یا گورنمنٹ کے خزانے سے یا صاحب ثروت حضرات کی مالی امداد سے آزادی بخشی جائے۔ قرآن اور حدیث سے اس امر کا ثبوت ملتا ہے۔

ارشاد الٰہی ہے۔

وَالَّذِيْنَ يَبْتَغُوْنَ الْكِتٰبَ مِمَّا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ فَكَاتِبُوْهُمْ اِنْ عَلِمْتُمْ فِيْهِمْ خَيْرًا وَّاٰتُوْهُمْ مِّنْ مَّالِ اللّٰهِ الَّذِيْٓ اٰتٰكُمْ (النور 33:24)

اور جن کے تمہارے داہنے ہاتھ مالک ہیں ان میں سے جو آزادی کی تحریر مانگیں تو انہیں لکھ دو۔ اگر تم ان میں بھلائی جانتے ہو اور ان کو اللہ کے مال سے دو جو اس نے تم کو دیا ہے۔ اس آیت کی تفسیر میں یحییٰ بن کثیر روایت بیان کرتے ہیں۔

قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَكَاتِبُوْا اِنْ عَلِمْتُمْ فِيْهِمْ خَيْرًا قَالَ اِنْ عَلِمْتُمْ فِيْهِمْ حِرْفَةً وَّلَا تُرْسِلُوْهُمْ كَلًّا عَلَى النَّاسِ (ابوداود، بحوالہ تفسیر ابن کثیر زیر آیت مکاتبت)

یعنی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو قرآن شریف میں آتا ہے اگر تم غلاموں میں بھلائی پاؤ تو ان سے مکاتبت کرو بھلائی سے مراد پیشہ وغیرہ کی اہلیت ہے اور فرمایا تم ان کو ایسی حالت میں مت چھوڑو کہ وہ لوگوں پر بوجھ ہوں۔

حضرت ابوذر فرماتے ہیں کہ میں نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا۔

اَيُّ الرِّقَابِ اَفْضَلُ

یعنی آزاد کرنے کے لیے کون سا غلام سب سے افضل ہے فرمایا جو سب سے زیادہ گراں قیمت ہو۔

''مالک کے نزدیک سب سے زیادہ قابل قدر ہو'' ان الفاظ میں غلاموں کو یہ تعلیم دی کہ وہ اپنے آپ کو مفید اور قیمتی فرد بنائیں تا کہ

ان کی آزادی کے لیے راہ ہموار ہو سکے کیونکہ آزادی کا سب سے پہلے وہی غلام آزادی کا مستحق ہے جو مفید ہو۔

اسلامی بیت المال میں غلاموں کے لیے ایک حد مقرر کر دی تاکہ وہ آزادی حاصل کر سکیں ماوردی لکھتے ہیں۔

زکوٰۃ میں پانچواں حصہ غلاموں کا ہے اور ابو حنیفہ اور امام شافعی کے نزدیک کاتبین کو رقم دی جائے جس سے خود کو آزاد کر لیں۔ امام مالک فرماتے ہیں کہ غلام خرید کر آزاد کیے جائیں۔(الاحکام السلطانیہ ص183)

اسلام نے انسانوں کو مستقل غلامی کی زنجیروں میں جکڑے رکھنے اور ان کی خرید و فروخت کو حرام قرار دے کر ہمیشہ کے لیے غلامی کا خاتمہ کر دیا پس عہد نبوی میں غلامی کی اصلاح اور خاتمہ اسیری کے یہی تین طریقے تھے جو اسلام نے اختیار کیے ان طریقوں سے ایک تو غلامی کی رسم ہمیشہ کے لیے مٹ گئی دوسرا سوسائٹی کا انتظام اور اخلاق بھی تباہ نہ ہوا۔

سموئیل پی۔ ہنٹنگٹن نے اپنی کتاب تہذیبوں کے تصادم میں دو الفاظ ”لبرل ازم“، لبرٹی استعمال کیے ہیں۔

دونوں الفاظ (سیاسی اصطلاحات) میں باریک فرق تمیز کیے بغیر اعتراض کی روح کو سامنے رکھ کر اسلام کا نظریہ حریت بیان کر دیا ہے اس میں آزادی کے تمام پہلوؤں پر بحث کی گئی ہے مجھے امید ہے سعید روحیں اس سے فائدہ اٹھائیں گی۔ یہ ایک مسلمہ تاریخی حقیقت ہے کہ صرف اسلام ہی ایک مذہب ہے جس نے لبرل ازم اور لبرٹی کے ہر پہلو پر روشنی ڈالی ہے اور اور پھر اس کو عملی شکل دی اور لوگوں نے آزادی کی نعمت کو محسوس کیا۔

الزامی جواب:

جب یہود اور عیسائیوں کے مذہبی ادب کا مطالعہ کیا جائے تو وہاں آزادی کا تصور ہی نہیں۔ جب بائبل کا مطالعہ کیا جائے تو اس میں قیدی (غلام) پر جس جور و ستم کا ذکر پایا جاتا ہے اس کو پڑھ کر انسان کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں کہ اپنے قیدی غلاموں پر اس قسم کا ظلم۔ کبھی قیدیوں کے اعضاء کاٹ دیئے جاتے تھے۔ (قاضیوں 6:1) مفتوح بادشاہوں کی گردنوں پر پاؤں رکھے جاتے ہیں پھر ان کو مار کر درختوں پر لٹکا دیا جاتا ہے۔ (یشوع 10:24-26)

حضرت داؤد کے متعلق لکھا ہے اس نے ربہ پر چڑھائی کی اور فتح کر لیا اور اس نے ان لوگوں کو جو اس میں تھے باہر نکال کر آروں اور لوہے کے گاہن اور آہنی کلہاڑوں سے روندا اور اینٹوں کے پزاووں سے گزارا اور اس نے بنی عمون کے تمام شہروں سے یہی کیا۔ (سموئیل دوم 12:31)

یہودی بادشاہ فتح کے بعد حاملہ عورتوں کے پیٹ پھاڑ دیتے تھے۔ (سلاطین دوم 15:16 یسعیاہ 13:16)

جب اسلام سے قبل کی دنیا پر نگاہ ڈالتے ہیں تو وہاں بھی قیدیوں کی تجارت عروج پر نظر آتی ہے اور ان بے چاروں کا کوئی پرسان حال نہیں اور مظلومیت کی زندگی بسر کرتے نظر آ رہے ہیں اس دور کی متمدن اور ترقی یافتہ حکومت ایران کی تھی۔ تاریخ یہ بتاتی ہے کہ ”اہل ایران غلاموں کی کثرت کی وجہ سے صاحب وجاہت اور امارت خیال کرتے تھے۔ غلاموں کی حالت زار کا یہ عالم تھا کہ ان کو آرام و راحت نصیب نہیں ہوتا تھا دوبارہ غلطی کرنے اور عادت کی اصلاح نہ کرنے پر اس کی زندگی کو ختم کر دیا جاتا تھا چنانچہ ہیرودوٹ کہتا ہے کہ کسی ایرانی کو یہ جائز نہیں کہ وہ اپنے غلام کو کسی ایک گناہ پر ایسی سزا دے جو شدت اور درشتگی کی حد کو پہنچ چکی ہو لیکن جب غلام کسی گناہ کا دوبارہ ارتکاب کرے تو اس کے آقا کو حق حاصل ہے کہ اس کی زندگی کا خاتمہ کر دے یا اس کو ہر قسم کا عذاب دے جو تصور میں سما سکتا ہے (اسلام کا نظام حیات مصنفہ عبدالوہاب ظہوری ص 203)

مصر:

مصر میں غلامی کا عام رواج تھا غلام بادشاہوں کے محلوں، کاہنوں اور سپہ سالاروں کے گھروں میں موجود رہتے جنگ میں جو قیدی

بنائے جاتے وہ حکومت کے غلام متصور ہوتے سب کی ضرورتوں کے مطابق کام انجام دیتے یا ملک کی آرائش اور اس کے حسن کی تشکیل کے متقاضی فرائض کی تکمیل کیا کرتے تھے۔ اس کے علاوہ قومی مصلحتوں اور عام حاجتوں کو بھی پورا کرتے تھے۔

آقاؤں کو غلاموں پر ہر طرح کا تسلط و تغلب حاصل تھا زندہ رکھیں یا قتل کر دیں۔

یونان:

اس دور میں یونان اپنے علم اور تمدن کی وجہ سے سب سے آگے تھا وہاں بھی غلامی کا عام رواج تھا یونان کے بڑے بڑے فلاسفہ بھی غلامی کے بارے میں رائے عامہ کے ہم خیال تھے ارسطو اکثر کہا کرتا تھا کہ غلام ایک آلہ ہے مگر ذی روح اور ایک کھلونہ ہے مگر جان دار یونان میں دو طبقے تھے۔ احرار اور غلام، پھر غلام دو قسم کے تھے ایک وہ جن پر زبردستی استیلا حاصل کر لیا گیا تھا۔ دوسری قسم ان غلاموں کی تھی جن کو بازار سے خریدا گیا تھا۔ پہلی قسم کے غلام محض نام کے غلام تھے اور ان کو زمینوں کے تابع سمجھا جاتا تھا۔ زمینوں کے ساتھ ان کی بھی خرید و فروخت ہوتی تھی۔

دوسری قسم کے غلام اپنے آقاؤں کے رحم و کرم پر ہوتے تھے آقا معمولی معمولی خطاؤں پر غلاموں کو سنگین سزا دیتے تھے۔

ہندوستان:

یہاں تو شودر مستقل غلامی کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے تھے۔ جن کو کوئی معاشرتی حق حاصل نہیں تھا۔ (تفصیل کے لیے البیرونی کی کتاب الہند کا مطالعہ کیجیے)

یہ ہے مختصر سا خاکہ اس دور کی مہذب اور متمدن حکومتوں میں غلاموں کی حالت زار کا اس دور میں عرب کی بے آب و گیاہ وادی مکہ سے حریت انسانی کی آواز بلند ہوتی ہے۔ جس نے انسانی آزادی کا مکمل منشور دیا پھر اس پر عمل کر کے دنیا سے غلامی کی ہر قسم کا خاتمہ کر دیا۔ اسلام پر یہ اعتراض کہ اس میں آزادی کا تصور نہیں پایا جاتا محض کم علمی اور بے سمجھی کا نتیجہ ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ اسلام ہی وہ دین متین ہے جس نے غلامی کے خاتمے کا چارٹر دیا۔ پھر اس پر عمل کر کے غلامی کی ہر قسم کو ختم کر دیا تو بجا ہوگا۔

لبرل ازم:

اسلام فراخ قلبی، وسعت ذہنی اور ازادی رائے کی تعلیم دیتا ہے حتیٰ کہ کسی مذہب اور عقیدہ کو قبول کرنے پر قطعاً قدغن نہیں لگاتا ہر شخص کو یہ حق حاصل ہے کہ جس عقیدے اور مذہب کو قبول کرنا چاہے اختیار کرے۔ ارشاد الٰہی ہے۔

لَاۤ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ (بقرہ2:256) دین میں کوئی جبر نہیں۔

دوسری جگہ فرمایا:

قُلِ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكُمْ فَمَنْ شَآءَ فَلْيُؤْمِنْ وَّمَنْ شَآءَ فَلْيَكْفُرْ (الکھف18:29) اور کہہ دو کہ حق تمہارے رب کی طرف سے ہے پس جو چاہے اس کو مانے اور جو چاہے انکار کر دے۔

فرمایا لَكُمْ دِيْنُكُمْ وَلِيَ دِيْنِ (الکفرون109:6) تمہارا دین تمہارا اور میرا دین میرا یعنی ہر شخص کو اپنی اپنی رائے رکھنے کا حق ہے۔

اسلام نے مسائل کے حل کے لئے اجتہاد ضروری قرار دیا ہے نظریہ اجتہاد لبرل ازم کا دوسرا نام ہے یعنی ازادی رائے اسلام سوچ پر پابندی عائد کرتا ہی نہیں۔

......☆......

دستور اور اسلام (اسلام میں نظریہ دستویت کا تصور نہیں)

(Constitutionalism)

اعتراض: سموئیل نے ایک یہ اعتراض کیا ہے کہ اسلام میں نظریہ دستوریت کا تصور نہیں:

جواب: دیگر اعتراضات کی طرح یہ اعتراض بھی عدم علم اور ناسمجھی پر مبنی ہے اسلام وہ دین ہے جس نے زندگی کے ہر شعبہ کے لیے قانون سازی ہے۔ اور آئین کا ایک مکمل ڈھانچہ دیا ہے اور اس کے مطابق زندگی بسر کرنے کی تلقین کی ہے۔

قرآن مجید میں آتا ہے۔

فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَا أَنْزَلَ اللّٰهُ وَلَا تَتَّبِعْ أَهْوَآءَهُمْ عَمَّا جَآءَكَ مِنَ الْحَقِّ (المائدہ 48.5)

پس تو (اے رسول) لوگوں کے درمیان فیصلہ کر جو اللہ تعالیٰ نے اتارا ہے اور اس قانون حق کو چھوڑ کر جو تمہارے پاس آیا ہے لوگوں کی خواہشات کی پیروی نہ کر۔

ارشاد ہے۔

إِنَّ الَّذِيْنَ يُحَآدُّوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ أُولٰٓئِكَ فِي الْأَذَلِّيْنَ (المجادلہ 20:58)

جو لوگ اللہ اور اس کے رسول کے مقرر کردہ قوانین کے خلاف کرتے ہیں وہ ذلیل ترین لوگوں میں سے ہے۔

لَقَدْ أَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنٰتِ وَأَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَ الْمِيْزَانَ لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ (الحدید 25:57)

ہم نے اپنے رسولوں کو کھلے دلائل کے ساتھ بھیجا اور ان کے ساتھ کتاب اور میزان اتاری تا کہ لوگ انصاف پر قائم رہیں۔

اس آیت میں المیز ان سے مراد قانون ہے اور یہ بتایا گیا ہے کہ ہر رسول پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے قانون نازل ہوا ہے۔ اس کے ساتھ ہی لوگوں میں انصاف قائم رہ سکتا ہے۔

وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَا أَنْزَلَ اللّٰهُ فَأُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ (المائدہ 45:5)

اور جو لوگ اللہ کے نازل کردہ قانون کے مطابق فیصلہ نہ کریں پس وہی ظالم ہیں۔

وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَا أَنْزَلَ اللّٰهُ فَأُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ (المائدہ 44:5)

اور جو لوگ اللہ کے نازل کردہ قانون کے مطابق فیصلے نہ کریں تو ایسے لوگ کافر ہیں۔

قانون کی پابندی نہ کرنے اور عوام کی خواہشات کی پیروی کرنے کا نتیجہ بیان کرتے ہوئے فرمایا۔

وَلَوِ اتَّبَعَ الْحَقُّ أَهْوَآءَهُمْ لَفَسَدَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْأَرْضُ وَمَنْ فِيْهِنَّ (المومنون 71:23)

اگر حق (قانون) ان کی خواہشات کے مطابق ہوتا تو آسمان اور زمین اور جو کوئی ان کے اندر ہیں بگڑ جاتے۔

اس آیت میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ قانون کی پیروی نہ کرنے کی وجہ سے زمین میں بگاڑ پیدا ہوتا ہے۔ اس وجہ سے معاشرہ کی بہتری کے لیے آئین کی پابندی لازمی اور لابدی ہے۔

يٰدَاوٗدُ إِنَّا جَعَلْنٰكَ خَلِيْفَةً فِي الْأَرْضِ فَاحْكُمْ بَيْنَ النَّاسِ بِالْحَقِّ وَلَا تَتَّبِعِ الْهَوٰى فَيُضِلَّكَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ (ص

38 آیت 26)

اے داؤد ہم نے تم کو زمین پر خلیفہ (حاکم) بنایا ہے پس لوگوں میں انصاف کے ساتھ فیصلہ کر اور کبھی بھی نفسانی خواہشات کی پیروی نہ کرنا وہ خدا کے مقرر کردہ انصاف کے راستے سے تم کو بھٹکا دے گا۔

تاریخ اس بات پر شاہد ہے کہ جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہجرت کر کے مدینہ گئے اور وہاں آپ کو مدنی ریاست کا حاکم اعلیٰ منتخب کر لیا گیا تو حکومتی نظام کو چلانے کے لیے میثاق مدینہ تحریر کیا جس میں آبادی کے تمام سٹیک ہولڈرز میثاق تیار کرنے میں شامل تھے۔ ایک آئینی دستاویز تحریر کی گئی۔ اور وہ دنیا کی پہلی آئینی دستاویز کہلاتی ہے۔ محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی وہ ذات ہے جس نے ایک تحریری آئین کی بنیاد رکھی۔

جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی فات کے بعد حضرت ابوبکر خلیفہ منتخب ہوئے تو انہوں نے کہا۔

میں نے تم کو بے بوجہ تکلیف نہیں دی بلکہ اس لیے جمع کیا کہ آپ میری اس امانت میں شرکت کریں جو ان امور سے تعلق رکھتی ہے جس کا بوجھ آپ نے میرے کندھوں پر ڈالا ہے بلاشبہ میں بھی تمہاری طرح ایک فرد ہوں اور تم آج حق کا اعلان کرو گے جس کو مجھ سے اختلاف ہے وہ صاف صاف اپنی رائے سے ظاہر کرے اور جس کو واقعی اتفاق ہے وہ اتفاق ظاہر کرے میں ہرگز یہ نہیں چاہتا کہ آپ میری رائے اور خواہش کی پیروی کریں اس لیے کہ تمہارے پاس خدا کی دی ہوئی کتاب (قرآن آئین) ہے جو حق کے لیے ناطق ہے بخدا میں اگر کوئی بات کہتا ہوں تو میرا ارادہ اس گفتار میں حق کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا۔ (کتاب الخراج)

ایک خطبہ میں فرمایا: "اے لوگو میں (قانون) کا پیرو ہوں کسی بدعت کا موجد نہیں۔ (کتاب الاموال ابی عبید ص 366)

مذکورہ حوالہ جات سے واضح ہوتا ہے کہ حضرت ابوبکر بھی اس آئین کے تابع تھے جس کے رسول کریم صلعم تابع تھے وہ آئین اللہ کا دیا ہوا ہے جس کی تشریح رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کی۔ پھر علماء ربانی پر یہ فرض قرار دیا کہ وہ قرآن مجید اور رسول کریم ﷺ کے فرمودات کی روشنی میں اپنے اپنے دور کے مسائل کو حل کریں۔ علماء ربانی نے اس اہم دستوری تقاضوں کو اجتہاد کے ساتھ پورا کیا اور پورا کرتے چلے آرہے ہیں۔

اسلام سے ماقبل:

جب اسلام سے ماقبل تاریخ کا مطالعہ کیا جائے تو نظریہ دستوریت کا نام و نشان نہیں ملتا۔ بادشاہ کا ہر لفظ قانون ہوتا ہے اور اس کی ذات ہی دستور کا سرچشمہ تھی جو وہ کہتا وہی ہوتا۔ ہر شخص کو بادشاہ کے الفاظ کی پیروی کرنا لازمی تھی۔ اس تناظر میں اسلام کا مطالعہ کیا جائے تو اسلام کی ایک بڑی فضیلت سامنے آجاتی ہے کہ یہ پہلا دین ہے جس نے دستوری نظام کو رائج کیا۔ آج اسی اسلامی مثال کو سامنے رکھ کر دنیا کے تمام ممالک نے اپنے اپنے حالات کے مطابق دستور بنائے ہیں۔

......☆......

حقوق انسانی

(Human rights)

اعتراض: ہنٹنگٹن اور بعض دوسرے مستشرقین نے یہ اعتراض کیا ہے کہ اسلام میں حقوق انسانی نہیں ہیں۔

جواب: یہ اعتراض بھی اسلام کا کما حقہ مطالعہ نہ کرنے کی وجہ سے کیا گیا ہے اگر معترضین اسلام ماقبل دنیا کی بادشاہتوں کا مطالعہ کر لیتے تو یہ اعتراض نہ کرتے۔ آج سے چودہ سو سال قبل اسلام نے جو حقوق انسانی کا چارٹر دنیا کے سامنے پیش کیا تھا دور حاضر کے تمام مدبرین مل کر بھی اس سے بہتر تیار نہیں کر سکتے اسلامی چارٹر کی سب سے بڑی خوبی یہ بھی ہے کہ اس کے پیش کرنے والے رسول ﷺ نے منشور کے ہر آرٹیکل پر خود عمل کر کے دیکھا۔

جان کی حفاظت:

ارشاد الٰہی ہے۔

وَلَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِي حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ (بنی اسرائیل 33:17)

اور اس جان کو قتل نہ کرو جسے اللہ نے حرام ٹھہرایا ہے مگر حق کے ساتھ۔

مال کی حفاظت:

ارشاد الٰہی ہے۔

وَلَا تَاْكُلُوْا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ (البقرہ 188:2)

اور اپنے مالوں کو آپس میں ناجائز طور پر نہ کھاؤ۔

ابرو کی حفاظت:

وَلَا تَقْرَبُوا الزِّنٰى اِنَّهٗ كَانَ فَاحِشَةً وَسَآءَ سَبِيْلًا (بنی اسرائیل 33:7)

اور زنا کے قریب نہ جاؤ کیونکہ وہ بے حیائی کی بات ہے اور بری راہ ہے۔

يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا يَسْخَرْ قَوْمٌ مِّنْ قَوْمٍ عَسٰى اَنْ يَّكُوْنُوْا خَيْرًا مِّنْهُمْ (الحجرات 11:49)

اے ایمان والو! کوئی شخص دوسرے شخص کا تمسخر نہ اڑائے ممکن ہے کہ وہ تم سے بہتر ہو۔

وَلَا تَلْمِزُوْا اَنْفُسَكُمْ وَلَا تَنَابَزُوْا بِالْاَلْقَابِ (الحجرات 11:49)

اور نہ ایک دوسرے کو عیب لگاؤ اور نہ ایک دوسرے کو برے ناموں سے پکارو۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حجتہ الوداع کے موقع پر فرمایا:

اِنَّ دِمَآءَكُمْ وَاَمْوَالَكُمْ وَاَعْرَاضَكُمْ حَرَامٌ كَحُرْمَةِ يَوْمِكُمْ هٰذَا (بخاری کتاب الحج)

تمہاری جانیں اور تمہارے مال اور تمہاری ابروئیں ایسی حرمت رکھتی ہیں جیسی آج کے دن کی حرمت ہے۔

ذاتی ملکیت کا حق:

اسلامی معاشرہ میں ہر فرد اپنی محنت اور کسب کا ثمرہ پانے کا مستحق ہے۔

ارشاد الٰہی ہے۔

وَوُفِّيَتْ كُلُّ نَفْسٍ مَا عَمِلَتْ (الزمر 70:39)

اور ہر نفس کو جو اس نے کیا ہے پورا پورا دیا جائے گا۔

دوسری جگہ آتا ہے۔

لَيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى (النجم 39:53)

انسان کسب معاش کے لیے جو بھی کوشش کرتا ہے اس کا ثمرہ پانے کا مستحق ہے۔

كُلُّ امْرِئٍ بِمَا كَسَبَ رَهِيْنٌ (الطور 21:52)

ہر آدمی اپنے کیے کا پھل پانے کا حق دار ہے۔

حریت:

ہر انسان پیدائشی طور پر آزاد ہے اور کوئی انسان دوسرے کو غلام اور محکوم نہیں بنا سکتا رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں۔

اِنَّ مِنْ شَرَارِ النَّاسِ الَّذِيْنَ يَبِيْعُوْنَ النَّاسَ (بخاری، کنوز الحقائق)

وہ لوگ بہت برے ہیں جو آدمیوں کو فروخت کرتے ہیں۔

شَرَارُ النَّاسِ يَشْتَرُوْنَ النَّاسَ وَيَبِيْعُوْنَهُمْ (ترمذی، کنوز الحقائق)

وہ لوگ برے ہیں جو لوگوں کی خرید وفروخت کرتے ہیں۔

فرمایا:

ثَلَاثَةٌ اَنَا اَخْصَمُهُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ رَجُلٌ اَعْطٰى بِىْ ثُمَّ غَدَرَ وَرَجُلٌ بَاعَ حُرًّا فَاَكَلَ ثَمَنَهٗ وَرَجُلٌ اَسْتَجَارَ اَجِيْرًا فَاسْتَوْفٰى مِنْهُ وَلَمْ يُعْطِهٖ اَجْرَهٗ (بخاری کتاب الاجارہ)

تین قسم کے آدمی ہیں جن سے میں قیامت کے دن جھگڑا کروں گا ایک وہ شخص جس نے مجھ کو اپنا عہد دیا پھر غداری کی اور ایک وہ شخص جس نے آزاد کو غلام بنا کر فروخت کیا پھر اس کی قیمت کھائی اور ایک وہ انسان جس نے کسی شخص سے اجرت پر کام لیا اور پورا کام کرایا پھر اس کو پوری اجرت نہ دی۔

مذہبی آزادی کا حق:

ہر شخص کو یہ حق حاصل ہے کہ جس مذہب کو چاہے اختیار کرے جسے چاہے ترک کر دے۔ ارشاد الٰہی ہے۔

لَا اِكْرَاهَ فِى الدِّيْنِ قَدْ تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ (بقرہ 256:2)

دین میں کوئی جبر نہیں ہدایت کی راہ گمراہی سے واضح ہو چکی ہے۔

وَقُلِ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكُمْ فَمَنْ شَآءَ فَلْيُؤْمِنْ وَّمَنْ شَآءَ فَلْيَكْفُرْ (الکہف 29:18)

اور کہہ دو حق تمہارے رب کی طرف سے ہے سو جو کوئی چاہے اس کو مانے جو کوئی چاہے انکار کر دے۔

کسب کی آزادی:

اسلام نے ہر شخص کو یہ آزادی دے رکھی ہے جو چاہے وہ پیشہ اختیار کرلے لیکن اس کے ساتھ جو ذرائع معاش معاشرہ کے بگاڑ کا باعث ہیں۔ اور اقتصادی ناہمواری کا موجب ہیں وہ حرام اور ناجائز ہیں۔ جس کا ذکر قرآن اور حدیث میں موجود ہے۔

کسب کی آزادی کے متعلق ارشاد الٰہی ہے۔

فَإِذَا قُضِيَتِ الصَّلٰوةُ فَانْتَشِرُوْا فِي الْاَرْضِ وَابْتَغُوْا مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ (الجمعہ 10:62)

پس جب نماز ہو چکے تو زمین میں پھیل جاؤ اور اللہ کا رزق تلاش کرو۔

اِسْعَوْا فَإِنَّ اللّٰهَ كَتَبَ عَلَيْكُمُ السَّعْيَ (مسند امام احمد، کنوز الحقائق)

کوشش کرو کیونکہ اللہ تعالیٰ نے تم پر کوشش کرنا فرض کر دیا ہے۔

طَلَبُ كَسْبِ الْحَلَالِ فَرِيْضَةٌ بَعْدَ الْفَرِيْضَةِ (کنز العمال)

فریضہ عبادت کے بعد حلال کمائی کی تلاش کرنا بھی ایک فرض ہے۔

حصول علم کا حق:

علم ہی شرف انسانیت کا ذریعہ ہے اور علم کی وجہ سے آدم مسجود ملائکہ ہے اسلام نے ہر انسان کو حصول علم کا مستحق ٹھہرایا ہے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں۔

طَلَبُ الْعِلْمِ فَرِيْضَةٌ عَلٰى كُلِّ مُسْلِمٍ (مشکوٰۃ)

علم حاصل کرنا ہر مسلمان پر فرض ہے۔

(اس حدیث میں مسلم سے مراد مسلم مرد اور عورت دونوں ہیں بعض احادیث میں لفظ مُسْلِمَةٌ کا بھی آیا ہے۔

قرآن مجید میں آتا ہے۔

قُلْ هَلْ يَسْتَوِي الَّذِيْنَ يَعْلَمُوْنَ وَالَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ (الزمر 9:39)

کیا جاننے والے اور نہ جاننے والے برابر ہیں۔

ملکیت میں دوسروں کا حق:

یہ وہ حق ہے کہ اس مہذب اور متمدن دور میں بھی کسی انجمن نے انسانی حقوق میں نہیں رکھا۔ اسلام وہ پہلا دین ہے جس نے اقتصادی ناہمواریوں کو دور کرنے کے لیے امراء کی دولت میں غرباء کو حق دار قرار دیا ہے۔

ارشاد الٰہی ہے۔

وَفِيْ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ (الذاریات 19:51)

اور ان کے اموال میں سائل اور مفلس افراد کا بھی حق ہے۔

حدیث میں ہے حضرت علیؓ سے روایت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے دولت مند لوگوں پر ان کے اموال میں اتنی مقدار مقرر کی ہے جو غرباء کے لیے کافی ہو سکے۔ اس کے باوجود اگر وہ بھوکے ننگے اور تنگ دست ہوں تو یہ صرف دولت مندوں کی عدم توجہ اور بخل کی وجہ سے ہو سکتا ہے اور اللہ تعالیٰ نے اپنے لیے ضروری قرار دیا ہے کہ ان امراء سے قیامت کے دن محاسبہ کرے گا۔ (اخرج البیہقی سعد بن منصور)

اس کے علاوہ امراء کے مال پر ایک لازمی ٹیکس عائد کر دیا ہے اس کا نام زکوۃ ہے یہ ٹیکس اسلام کی عمارت کا ایک رکن ہے جس کا ادا کرنا ہر صاحب ثروت مسلمان پر فرض ہے۔

نجی زندگی کا تحفظ:

انسان کے بنیادی حقوق میں سے اہم حق اس کی نجی زندگی کا تحفظ ہے اسلام ہر فرد کو یہ حق دیتا ہے۔

ارشاد الٰہی ہے۔

یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَدْخُلُوْا بُیُوْتًا غَیْرَ بُیُوْتِکُمْ حَتّٰی تَسْتَاْنِسُوْا (النور27:24)

اے ایمان والو اپنے گھروں کے سوائے دوسرے گھروں میں داخل نہ ہو۔ جب تک اجازت نہ لے لو۔

مزدور کا حق:

ہر دور میں مزدور اپنے حق کے لیے آوازیں بلند کرتے رہے ہیں اور وہ اپنے حقوق سے محروم تھے۔ اسلام سے پہلے، تو غلام ہی مزدوروں کا کام سرانجام دیتے تھے۔ اجرت کے مستحق ہوتے ہی نہیں تھے۔ دور حاضر ایک سائنسی اور ترقی یافتہ دور کہلاتا ہے اس دور میں بھی مزدور تحریکیں اٹھیں۔ ان کی آواز کو طاقت کے ساتھ دبا دیا گیا۔ یکم مئی شکاگو کا واقع تاریخ میں مشہور ہے اس دن مزدوروں کی آواز کو جبر کے ساتھ دبانے کی کوشش کی گئی کئی مزدور مارے گئے۔ مزدور تحریکوں کو اس واقعہ سے تقویت ملی۔ کسی دور میں بھی مزدور کو اس کا حق نہیں دیا گیا حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم پہلے راہنما ہیں جنہوں نے مزدور کا پورا پورا حق ادا کرنے کی تلقین کی۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ تین قسم کے انسان ایسے ہیں جن سے میں قیامت کے دن جھگڑا کروں گا اور جس سے میں جھگڑا کروں گا اس کو مغلوب کر کے چھوڑوں گا ان میں سے ایک وہ شخص ہے جو مزدور سے کام تو پوری طرح لیتا ہے اور اس کی پوری اجرت نہیں دیتا۔ (بیہقی کتاب الاجارہ)

پھر فرمایا:

اُعْطُوا الْاَجِیْرَ اَجْرَہٗ قَبْلَ اَنْ یَّجِفَّ عَرَقُہٗ (ابن ماجہ باب الاجارہ)

مزدور کی اجرت اس کا پسینہ خشک ہونے سے پہلے ادا کرو۔

پناہ لینے کا حق:

ارشاد الٰہی ہے۔

وَاِنْ اَحَدٌ مِّنَ الْمُشْرِکِیْنَ اسْتَجَارَکَ فَاَجِرْہُ (توبہ 6:9)

اگر کوئی تم سے پناہ مانگے تو اسے پناہ دو۔

ہجرت کا حق:

ارشاد الٰہی ہے۔

اَلَمْ تَکُنْ اَرْضُ اللّٰہِ وَاسِعَةً فَتُھَاجِرُوْا فِیْھَا (النساء97:4)

کیا اللہ کی زمین وسیع نہیں ہے تم اس میں ہجرت کر جاؤ۔

حکومت میں شرکت کا حق:

اسلام پہلا دین ہے جس نے ہر فرد کو ریاست کے کاموں میں شریک کیا ہے۔اس کی شرکت اس سے مشاورت ہے۔رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ نے یہ حکم دیا کہ امور سلطنت مشاورت سے سرانجام دیئے جائیں۔ارشاد الٰہی ہے۔

وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ (آل عمران3:158)

(ریاستی) امور میں ان سے مشورہ لے۔

دوسری جگہ آتا ہے۔

وَأَمْرُهُمْ شُورَىٰ بَيْنَهُمْ (الشوریٰ24:28)

اور ان کا کام آپس میں مشورہ سے ہوتا ہے۔

رسول کریم ﷺ فرماتے ہیں۔

مَاشَا وَرَقَوْمٌ اِلَّا هَدُوْا (طبرانی، کنوز الحقائق حدیث 87)

جس قوم نے باہمی مشورہ کیا اس قوم نے فلاح پائی۔

عدل وانصاف کا حق:

اسلام ہر انسان کے لیے عدل وانصاف کا حق لازمی قرار دیتا ہے۔ارشاد الٰہی ہے۔

اِذَا حَكَمْتُمْ بَيْنَ النَّاسِ اَنْ تَحْكُمُوْا بِالْعَدْلِ (النساء45:58)

جب لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو تو انصاف سے فیصلہ کرو۔

تکریم انسانیت:

اسلام سے قبل تمام متمدن اور مہذب اور ترقی یافتہ ممالک میں معاشرتی تفریق تھی۔ایک ادنیٰ طبقہ بھی پایا جاتا تھا۔جس کی کوئی توقیر اور عزت نہ تھی۔اسلام نے طبقاتی تقسیم کو ختم کیا اور تکریم انسانیت کی تعلیم دی۔

ارشاد الٰہی ہے۔

وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْ اٰدَمَ (بنی اسرائیل17:40)

اور ہم نے آدم کے بیٹوں کو واجب التکریم بنایا ہے۔

برابری ومساوات کا حق:

یہ وہ انسانی حق ہے جو قبل از اسلام دنیا کے کسی ملک میں نہیں پایا جاتا تھا۔اور اس دور میں بھی جب کہ ہر طرف سے انسانی حقوق کی بات کی جاتی ہے۔اس حق کا فقدان ہے اور صرف اسلام ہی وہ دین ہے جس نے اس حق کا اعلان کیا اور تمام طبقاتی تقسیم کو ختم کر دیا۔

ارشاد الٰہی ہے۔

يٰاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِنْ ذَكَرٍ وَّاُنْثٰى وَجَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّقَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا (الحجرات49:13)

اے لوگو! ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا ہے پھر مختلف قومیں اور مختلف قبائل بنائے تا کہ ایک دوسرے کی شناخت ہو۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع کے موقع پر فرمایا: ''اے لوگو! ہاں بے شک تمہارا رب ایک ہے اور تمہارا باپ ایک ہے

ہاں عربی کو عجمی پر اور عجمی کو عربی پر سرخ کو سیاہ پر اور سیاہ کو سرخ پر کوئی فضیلت نہیں مگر تقویٰ کے سبب (مسند احمد)

مظلوم کو فریاد کا حق:

اسلام مظلوم کو فریاد کرنے اور ظالم سے بدلہ لینے کا حق دیتا ہے ارشاد الٰہی ہے۔

لَا یُحِبُّ اللّٰہُ الْجَھْرَ بِالسُّوْءِ مِنَ الْقَوْلِ اِلَّا مَنْ ظُلِمَ وَ کَانَ اللّٰہُ سَمِیْعًا عَلِیْمًا (النساء4:148)

اللہ بُری بات کے مشہور کرنے کو پسند نہیں کرتا سوائے اس کے جس پر ظلم کیا گیا ہو اور اللہ سننے والا جاننے والا ہے۔

رائے کی آزادی:

اس دور میں رائے کی آزادی کے حق کو بہت اہمیت دی جاتی ہے یہ بھی حقیقت ہے کہ آزادی رائے سے مسائل کے حل میں نئی نئی راہیں کھلتی ہیں اسلام نے سب سے پہلے آزادی رائے کا حق دیا۔

ارشاد الٰہی ہے۔

لَآ اِکْرَاہَ فِی الدِّیْنِ (البقرہ2:256)

دین میں کسی قسم کا جبر نہیں۔

دوسری جگہ آتا ہے۔

لَکُمْ دِیْنُکُمْ وَلِیَ دِیْنِ (الکفرون109:6)

تمہارا دین تمہارا اور میرا دین میرا یعنی ہر شخص کو اپنی اپنی رائے رکھنے کا حق ہے۔

رسول کریم ﷺ کے دور مسعود میں ہر صحابہ کو اپنی رائے کے اظہار کی مکمل آزادی تھی۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سیاسی امور میں صحابہ سے رائے طلب بھی کرتے اور وہ کھل کر اپنی رائے کا اظہار کرتے تمام جنگوں سے قبل رسول کریم ﷺ نے صحابہ سے رائے طلب کی۔ پھر ان کی رائے پر عمل بھی کیا۔

حقوق انسانی دور حاضر کا ایک اہم موضوع ہے اقوام متحدہ نے بھی اپنا چارٹر پیش کیا ہے۔ اگر کسی ملک میں انسانی حقوق کی پامالی کی جا رہی ہو تو اقوام متحدہ اس کا تدارک کرتی ہے۔ جب اسلام کی تعلیم کا مطالعہ کیا جائے تو سب سے پہلے اسلام نے حقوق انسانی کا منشور پیش کیا حتیٰ کہ رسول کریم ﷺ کا آخری خطبہ حقوق انسانی کا شاہکار ہے۔ اسلام پر یہ اعتراض کرنا کہ اس میں حقوق انسانی کا رجحان نہیں پایا جاتا سراسر عدم واقفیت کا نتیجہ ہے۔

......☆......

مساوات

(Equality)

اعتراض: اسلام میں مساوات نہیں۔ (ہنٹنگٹن کتاب تہذیبوں کا تصادم بحوالہ ابن وراق ص 177)

جواب: حقوق انسانی پر بحث کرتے ہوئے اسلامی مساوات پر بحث کی جا چکی ہے لیکن اس وصف کو مزید اجاگر کرنے کے لیے قبل از اسلام دنیا کے مختلف ممالک میں جو طبقاتی تفریق تھی اس کو سامنے رکھ کر اس پر مزید روشنی ڈالی جاتی ہے۔ تاکہ نہ صرف اعتراض کا رد ہو بلکہ اسلام کی

حقانیت اور فضیلت بھی سامنے آجائے اور معلوم ہو جائے کہ معترضین اسلام کی تعلیم سے کتنے ناواقف ہیں۔

جب ہم اسلام کا مطالعہ کرتے ہیں تو حقیقت کھل کر واضح ہو جاتی ہے کہ اسلام ہی وہ دین ہے جو دنیا میں مساوات کا جان فزا پیغام لے کر آیا تھا۔ قرآن مجید میں آتا ہے۔

وَمَا كَانَ النَّاسُ اِلَّآ اُمَّةً وَّاحِدَةً (یونس 19:10)

اور سب لوگ ایک ہی گروہ ہیں۔

پھر فرمایا:

يٰاَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمُ الَّذِىْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ (النساء 1:4)

اے لوگو! اپنے رب کا تقوی اختیار کرو جس نے تم کو ایک اصل سے پیدا کیا۔

فرمایا:

يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّ اُنْثٰى وَجَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّ قَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰكُمْ (الحجرات 13:49)

اے لوگو! ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا پھر مختلف قومیں اور قبائل بنائے تا کہ ایک دوسرے کی شناخت کر سکو، اللہ کے نزدیک تم میں سے بڑا قابل احترام وہ ہے جو سب سے زیادہ پرہیز گار ہو۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

اَلنَّاسُ كُلُّهُمْ بَنُوْ اٰدَمَ وَ اٰدَمُ مِنْ تُرَابٍ (مشکوۃ باب المفاخر والعصبیۃ ص 417)

لوگ آدم کے بیٹے ہیں اور آدم مٹی سے ہے۔

حجۃ الوداع کے موقع پر اقوام عالم کے درمیان مساوات اور برابری سے متعلق خطبہ دیا اور فرمایا:

لَا فَضْلَ لِعَرَبِيٍ عَلٰى عَجَمِيٍ وَلَا فَضْلَ لِعَجَمِيٍ عَلٰى عَرَبِيٍّ وَلَا لِاَبْيَضَ عَلٰى اَسْوَدَ وَ لَا لِاَسْوَدَ عَلٰى اَبْيَضَ اِلَّا بِتَقْوٰى (زاد المعاد جلد 4 ص 22)

(بعض احادیث میں ابیض کی جگہ احمر کا لفظ آیا ہے) کسی عربی کو عجمی پر اور کسی عجمی کو عربی پر اور کسی سفید کو سیاہ پر اور کسی سیاہ کو کسی سفید پر کوئی فضیلت نہیں مگر تقوی کی بناء پر۔ آیات اور احادیث سے صاف واضح ہوتا ہے کہ اسلام بین الاقوامی مساوات کا حامی ہے۔ رنگ نسل یا کسی علاقہ کی بناء پر کوئی تفریق نہیں۔ ہاں فضیلت کی وجہ تقوی بیان کیا ہے کہ اللہ کے نزدیک صاحب فضیلت وہ شخص ہے جو متقی ہے۔

یہ اس دور کی پکار ہے جب متمدن دنیا میں عدم مساوات پائی جاتی تھی اور تمام معاشرہ مختلف طبقوں میں بٹا ہوا تھا۔

رومہ:

جسٹی نین نے رومی قانون کی تدوین کی تھی وہ قانونی نقطہ نگاہ سے سماج کو تین حصوں میں تقسیم کرتا ہے۔

1- ہنسٹرس (Honestiores):

یعنی ملک کا اعلیٰ ترین طبقہ جو امراء پر مشتمل تھا بغاوت کے علاوہ اس طبقہ کے کسی فرد کو کسی بھی جرم میں سزائے موت نہیں دی جا

سکتی تھی۔

2-ہمولرس(Humiliores):

اس طبقہ کو غیر معمولی حالات میں موت کی سزادی جاسکتی تھی۔ورنہ عموماً قید کی سزادی جاتی تھی۔

3-سروی(Servi):

سب سے نیچا طبقہ تھا۔جس کے افراد کو معمولی معمولی جرائم کی پاداش میں قتل کی سزادی جاتی تھی آگ میں جلا دیا جاتا تھا درندوں کے سامنے پھینک کر ہڈیاں چبوادی جاتی تھیں۔(Cambridge Medieval History vol 11 PP 106,107)

وادی دجلہ وفرات:

معاشرہ چھ طبقوں میں تقسیم تھا فرماں روا، کاہن و پجاری، امراء، اہل ہنر و پیشہ، زرعی مزدور و کاشت کار، غلام۔

ایران:

ایران کی سوسائٹی چار حصوں میں منقسم تھی۔

(1) آذرواں (مذہبی طبقہ) (2) ارتشیاراں (فوجی طبقہ) (3) دبیران (عمال طبقہ) (4) استر پوشان دہتخشاں (عوام پیشہ ور لوگ اور کاشت کار (ایران بعہد ساسانیاں از پروفیسر ارتھر کرسٹن ترجمہ ڈاکٹر محمد اقبال ص 126)

ہندوستان:

ہندوستان کا سماجی نظام بھی مختلف طبقوں میں تقسیم تھا جس کی تقسیم علی الترتیب مندرجہ ذیل چار ذاتوں پر تھی۔

برہمن، چھتری، ویش اور شودر

ان چار ذاتوں کے علاوہ عوام کا شمار تھا۔جن کو انتیجا (Antiaja) ہدی (Hadi) ڈومہ (Doma) چنڈالہ (Chandala) بدھاتو (Badhatu) وغیرہ نام دیئے گئے تھے (تفصیل کے لیے البیرونی کی کتاب کتاب الہند کا مطالعہ کیا جائے)

مصر:

مصر کا سماج تین طبقات پر مشتمل تھا۔(1) شاہی افراد (2) پروہت (3) عوام

یونان:

یونان میں غلامی کا رواج تھا اور غلام معاشرہ کا بدنصیب طبقہ تھا۔جس کو کسی قسم کے حقوق حاصل نہیں تھے۔یونان کے بڑے بڑے فلاسفہ بھی غلامی کے بارے میں رائے عامہ کے ہم خیال تھے ارسطو کہا کرتا تھا کہ "غلام ایک آلہ ہے مگر ذی روح ایک کھلونا ہے مگر جان دار، یونان میں دو طبقے تھے احرار اور غلام پھر غلاموں کی دو قسمیں تھیں الغرض قبل از اسلام دنیا کے تمام ممالک میں سماجی تقسیم تھا۔جس کی مضبوط جڑیں تھیں۔اس کی بیخ کنی ایک مشکل ترین کام تھا۔اسلام آیا اس نے طبقاتی تقسیم کو ختم کیا اور کامل مساوات کا درس دیا۔اور اسلامی معاشرہ میں اس کو عملی شکل دی۔

اسلام پر عدم مساوات کا اعتراض حقائق کی روشنی میں باطل اور لایعنی معلوم ہوتا ہے۔

سیرت سید البشر حصہ دوم کے صفحات 548 تا 551 پر مساوات کے مختلف پہلوؤں پر بحث کی گئی ہے مزید مطالعہ کے لیے قارئین ان صفحات کا مطالعہ کریں۔

قانون کی حکمرانی (اسلام میں قانون کی حکمرانی کا تصور نہیں)

(Rule of Law)

اعتراض: ہنٹنگٹن نے اسلام پر یہ اعتراض کیا ہے کہ اسلام میں قانون کی حکمرانی کا تصور نہیں۔

جواب: ہنٹنگٹن نے یہ اعتراض (اور دوسرے اعتراضات بھی) جو اس کی کتاب ''تہذیبوں کا تصادم'' میں ایک ہی پیرا میں اسلام کے خلاف مذکور ہیں اور ان کے جوابات تحریر کر دیئے گئے ہیں سیاسیات کی اصطلاحات استعمال کر کے ایک مہذب طریقہ اختیار کیا ہے جب کہ بعض دوسرے مستشرقین نے اسی اعتراض کو مختلف بھونڈے اور کھردرے الفاظ میں بیان کیا ہے مثلاً اسلام جنگی ٹولے کا باضابطہ اخلاق ہے۔

(Bryan's. Turner weberan Islam P1)

اسلام ''لوٹ مار'' (Maxime Rodinson: Mohammad , P.77)

اسلام بزور شمشیر رائج کیا گیا۔ (متعدد مخالفین)

اس قسم کے تمام اعتراضات کی اصل ایک ہی ہے وہ ہے اسلام سے بغض وعناد یہ تمام اعتراضات اسی اصل کی مختلف فروع ہیں۔
جب یہ کہا جائے گا کہ اسلام میں قانون کی حکمرانی نہیں ہے تو اس کا دوسرا مطلب یہ ہے کہ وہاں جنگل کا قانون ہے کوئی ضابطہ اخلاق نہیں۔ طاقت ہی قانون ہے۔ اس کو ''لوٹ مار''، ''جنگی ٹولے کا ضابطہ اخلاق'' اور ''اسلام بزور شمشیر رائج ہوا'' کا نام دیا جاتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ مخالفین نے اسلام کو پڑھا ہی نہیں۔ اسلام ایک مکمل ضابطہ حیات ہے زندگی کے ہر شعبہ کو ایک ضابطے میں ڈھالا ہے اسلام ہی وہ دین ہے جس نے حکمرانی کے تمام اصولوں پر روشنی ڈالی ہے انہی اصولوں میں سے ایک قانون کی حکمرانی کا اصول ہے۔ جس سے کوئی بھی مستثنیٰ نہیں ہے۔

چھوٹا ہو بڑا۔ غریب ہو یا امیر۔ حاکم ہو یا عوام ہر فرد قانون کی حکمرانی کے تحت زندگی بسر کرنے کا پابند ہے۔ قرآن مجید میں آتا ہے۔

فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَا أَنْزَلَ اللّٰهُ وَلَا تَتَّبِعْ أَهْوَاءَهُمْ عَمَّا جَاءَكَ مِنَ الْحَقِّ (المائدہ 48:5)

سو ان کے درمیان اس کے مطابق فیصلہ کرو جو اللہ نے اتارا ہے اور اس کو چھوڑ کر جو تیرے پاس حق آیا۔ ان کی خواہشات کی پیروی نہ کرو۔

إِنَّ الَّذِينَ يُحَادُّونَ اللّٰهَ وَرَسُولَهُ أُولٰئِكَ فِي الْأَذَلِّينَ (المجادلہ 20:58)

جو لوگ اللہ اور اس کے رسول کے مقرر کردہ قوانین کے خلاف کرتے ہیں وہ ذلیل ترین لوگوں میں سے ہیں۔

وَمَنْ لَمْ يَحْكُمْ بِمَا أَنْزَلَ اللّٰهُ فَأُولٰئِكَ هُمُ الْكٰفِرُونَ (المائدہ 44:5)

اور جو لوگ اللہ کے نازل کردہ قانون کے مطابق فیصلے نہ کریں تو یہ لوگ کافر ہیں۔

وَمَنْ لَمْ يَحْكُمْ بِمَا أَنْزَلَ اللّٰهُ فَأُولٰئِكَ هُمُ الظّٰلِمُونَ (المائدہ 45:5)

اور جو لوگ اللہ کے نازل کردہ قانون کے مطابق فیصلے نہ کریں وہ ظالم ہیں۔

يٰٓأَيُّهَا الَّذِينَ اٰمَنُوٓا أَطِيعُوا اللّٰهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ وَأُولِي الْأَمْرِ مِنْكُمْ فَإِنْ تَنَازَعْتُمْ فِي شَيْءٍ فَرُدُّوهُ إِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُولِ (النساء 59:4)

اے لوگو! جو ایمان لائے ہو اللہ کی اطاعت کرو اور رسول کی اور اپنے سب سے صاحب امر (حاکم) کی اطاعت کرو پھر اگر کسی چیز میں باہم جھگڑا کرو تو اسے اللہ اور رسول کی طرف لے جاؤ۔

فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ الرَّسُوْلِ

(اس کو اللہ اور رسول کی طرف لے جاؤ) سے مراد دستور ہے اور قانون ہے یعنی حاکم اور عوام میں کسی معاملہ میں اختلاف پیدا ہو جائے تو اس کا فیصلہ دستور اور قانون کے مطابق فیصلہ کرنا ہوگا۔

قرآن مجید اور احادیث میں اطاعت اللہ اور اطاعت رسول سے مراد ہی دستور کی پابندی ہے۔ جو دستور کی پابندی نہیں کرتا وہ قرآنی فیصلہ کے مطابق اذل (ذلیل ترین) کافر (انکار کرنے والے) اور ظالم ہیں۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد کا مشہور واقعہ ہے کہ خاندان بنی مخزوم کی ایک عورت نے چوری کی تو قریش کی عزت کے لحاظ سے لوگ چاہتے تھے کہ وہ سزا سے بچ جائے اور معاملہ دب جائے۔ حضرت اسامہ بن زید کو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس سفارش کے لیے بھیجا آپ نے ناراضی کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا کہ بنی اسرائیل اس کی بدولت تباہ ہوئی کہ وہ غرباء پر حد جاری کرتے تھے اور امراء سے درگزر کرتے تھے۔ (صحیح بخاری)

حضرت ابوبکر کا پہلا خطبہ خلافت مشہور ہے جس میں آپ نے قانون کی پاسداری کا اقرار کیا اور کہا اگر میں قانون کے مطابق چلوں تو ان کا ساتھ دینا یہ بھی ایک تاریخی حقیقت ہے کہ وہی قومیں ترقی کی راہ پر گامزن ہوتی ہیں جو قانون کے مطابق زندگی بسر کرتی ہیں۔ اسی اصل کی روشنی میں جب مسلمانوں کی تاریخ پر نظر دوڑائیں تو مسلمانوں کی شاندار ترقی ایک مسلمہ امر ہے کوئی مورخ مسلمانوں کی ترقی سے انکار نہیں کرسکتا۔ کس طرح ایک بے آب و گیاہ وادی سے اٹھ کر دنیا کے چار سو پر حکمران بن گئے۔ کیا دنیا میں کوئی ایسی مثال مل سکتی ہے قوم تو ہو شتر بے مہار قانون سے آزاد لوٹ مار کی عادی اور ایک جنگی ٹولہ جن کا کوئی ضابطہ اخلاق نہیں لیکن وہ معمورہ دنیا پر غالب آجائے۔ کیا دنیا کی تاریخ میں مسلمانوں سے بڑھ کر کوئی قوم بام عروج پر پہنچی ہے؟ تاریخ یہی جواب دے گی کہ ماضی میں کوئی ایسی مثال نہیں ملتی۔ جس سے یہ ظاہر ہو کہ کوئی قوم مسلمانوں سے بڑھ کر عروج پر پہنچی ہو مسلمانوں کا شاندار ماضی اس بات پر شاہد ہے کہ مسلمان کے پاس ایک مکمل ضابطہ حیات ہے اس کے مطابق وہ زندگی بسر کرتے ہیں۔

......☆......

آزاد منڈی (کا تصور نہیں)

(Free Market)

اعتراض: اسلام میں آزاد منڈی کا تصور نہیں۔ (ہنٹنگٹن)

جواب: ''آزاد منڈی'' دور حاضر کے ماہرین اقتصادیات کی ایک وضع کردہ اصطلاح ہے جس سے تجارت کو آزادانہ فروغ دینا مقصود ہے۔ اسلام نے چند پابندیوں کے ساتھ تجارت کو فروغ دینے کی راہنمائی کی ہے آزادانہ تجارت پر پابندیاں اقتصادی ناہمواریوں سے بچنے کے لیے عائد کی ہیں تاکہ معاشرہ میں بگاڑ پیدا نہ ہو۔ وہ پابندیاں یہ ہیں سود، اکتناز، احتکار اور بیع کی وہ شکلیں جو بائع اور مشتری کے لیے باعث نقصان ہوں۔ جبکہ آزاد منڈی کے نظریہ میں اس قسم کی پابندیاں تجارت کی روح کے منافی ہیں۔ اس وجہ سے آزاد منڈی نے ایک استیصالی طبقہ پیدا کر دیا ہے۔ جس سے غریب ممالک کو کساد بازاری کا شکار ہونا پڑا ہے۔ بہر حال اسلام میں آزادی منڈی کا تصور موجود ہے لیکن آزاد منڈی سے جو نقصان پہنچنے کا اندیشہ تھا اس کو بھی دور کر دیا ہے۔

قرآن مجید میں ہے۔

لَيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَاسَعٰى (النجم 39:53)

انسان کسب معاش کے لیے جو بھی کوشش کرے وہ اس کا پھل پانے کا حق دار ہے۔

دوسری جگہ آتا ہے۔

كُلُّ امْرِیءٍ بِمَا كَسَبَ رَهِيْنٌ (الطور 21:52)

ہر آدمی اپنے کیے کا پھل پانے کا حق دار ہے۔

اسلام نے کسب کے ساتھ حلال کی شرط عائد کی ہے ارشاد الٰہی ہے۔

يٰاَيُّهَا النَّاسُ كُلُوْا مِمَّا فِى الْاَرْضِ حَلٰلًا طَيِّبًا (البقرہ 2 : 168)

اے لوگو! جو چیزیں زمین میں موجود ہیں ان میں سے حلال پاک چیزیں کھائیں۔

حلال روزی کے متعلق رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں۔

اَفْضَلُ الْاَعْمَالِ الْكَسْبُ الْحَلَالُ (المدینہ والسلام)

بہترین عمل حلال روزی ہے۔

فرمایا:

طَلَبُ الْحَلَالِ مَثَلُ مَقَارِعَةِ الْاَبْطَالِ فِى سَبِيْلِ اللّٰهِ وَمَنْ بَاتَ تَعْبًا مِنْ طَلَبِ الْحَلَالِ بَاتَ اللّٰهُ عَنْهُ رَاضٍ (المدینہ والسلام)

حلال طلب کرنا ایسا ہے جیسے خدا کی راہ میں بہادروں سے لڑنا اور جو شخص حلال روزی حاصل کرنے کی کوشش کر کے رات کو تھک ہار کر سو جائے تو خدا اس سے راضی ہے۔

فرمایا:

طَلَبُ الْحَلَالِ فَرِيْضَةٌ عَلٰى كُلِّ مُسْلِمٍ (المدینہ والسلام فرید وجدی)

حلال طریقے سے کمانا ہر مسلمان پر فرض ہے۔

تجارت کی اہمیت بیان کرتے ہوئے رسول کریم ﷺ نے فرمایا:

لَوْلَا هٰذِهِ الْبُيُوْعُ لَصِرْتُمْ عَالَةً عَلَى النَّاسِ (کنز العمال)

اگر تجارت نہ ہوتی تو تم دوسروں کے لیے بوجھ بن جاتے۔

تِسْعَةُ اَعْشَارِ الرِّزْقِ فِي التِّجَارَةِ (کنز العمال)

روزی 9/10 حصے تجارت میں ہیں۔

مِنْ فِقْهِ الرَّجُلِ اَنْ يَصْلِحَ مَعِيْشَةً لَيْسَ مِنْ حُبِّ الدُّنْيَا طَلَبُ مَا يُصْلِحُكَ (بیہقی شعیب الایمان)

سمجھدار انسان وہ ہے جو اپنی معیشت درست کرے وہ کام جس سے اس کی حاجت روائی ہو دنیا کی محبت سے نہیں ہے۔

آزاد منڈی کے تصور کے تمام مضرات کو بھی چند پابندیوں سے دور کر دیا ہے۔

اقتصادیات کے دو اہم رکن ہیں، کسب اور صرف، دونوں ارکان میں سب کو آزادی حاصل ہے لیکن اقتصادی ناہمواریوں کو دور کرنے کے لیے چند اخلاقی پابندیاں بھی عائد کر دی ہیں۔ انہی پابندیوں کی وجہ سے اسلام کا اقتصادی نظام دوسرے نظاموں سے بہتر اور انسانی [illegible] ح کا باعث ہے۔

☆

ریاست سے مذہب کی علیحدگی کا مسئلہ

(Separation of church and state)

اعتراض: اسلام میں ریاست سے مذہب کی علیحدگی کا تصور نہیں۔ (ہنٹنگٹن)

جواب: معترض نے مذہب کی روح کو نہ سمجھنے کی وجہ سے یہ اعتراض کیا ہے مغرب میں عیسائیت کے غلط تصور اور پادریوں کی بدعملی کی وجہ سے ریاستوں کا امن اور عوام کی جان و مال وعزت داؤ پر لگا ہوا تھا۔ ریاستی امن اور عوام کی جان، مال اور عزت اس بات کے متقاضی تھے کہ پادریوں کے مذہبی عمل دخل کو ریاست کے کاروبار سے الگ کر دیا جائے۔ آخر کار مغربی ریاستیں عوام کی معاونت سے چرچ کے غلط اثر و رسوخ سے نجات پا گئیں۔ تو مغرب کے مفکرین نے ایک قاعدہ کلیہ کے طور پر یہ فکر دی۔ کہ مذہب کو ریاست سے الگ رکھا جائے اور اس کا نام سیکولر رکھا اور اسی اصول کو ریاست کے کاروبار کے لیے بہتر جانا۔

اگر سیکولر طرز حکومت کو عوام کی بہتری اور بھلائی تصور کیا جاتا ہے تو اسلام بھی حکومت کا مقصد فلاح انسانی قرار دیتا ہے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفاء راشدین کے ادوار میں ہر فرد کو مذہبی آزادی حاصل تھی۔ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ عہد نبوی میں مذہبی جبر و اکراہ کی ایک مثال بھی نہیں ملتی۔

حقیقت الامر یہ ہے کہ دور حاضر میں جو بعض مسلم ریاستوں میں مذہبی جبر واکراہ پایا جاتا ہے اس کا تعلق اسلام کے ساتھ ہرگز نہیں۔ یہ سب کچھ مسلمان علماء کا اپنا اجتہاد ہے۔ اس اجتہاد کو کوئی نص قرآنی درست قرار نہیں دیتی یہ آیت

لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ (البقرہ 256:2) (دین میں کوئی جبر نہیں) ان علماء کے فکر کو جھٹلا رہی ہے۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہجرت کے بعد جب مدنی ریاست کے سربراہ منتخب ہوئے تو یہود اور دیگر قبائل کے ساتھ جو میثاق قائم کیا وہ آزادی مذہب کے ساتھ دیگر تمام حقوق انسانی کو قائم کرتا ہے۔ یہ میثاق، اسلام کا پہلا ریاستی دستور تھا۔ اس دستور کو کہیں بھی اسلام کے نام کے ساتھ منسلک نہیں کیا گیا لیکن اس میں کامل طور پر اسلامی روح مضمر ہے یعنی ریاست میں امن وسلامتی۔ مزید براں مدنی ریاست کو بھی اسلام کا نام نہیں دیا گیا لیکن مسلمان اسلامی دستور کے مطابق زندگیاں بسر کرتے رہے اور ترقی کی راہ پر گامزن رہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اسلام کے اصول حکمرانی وہ ہیں جن پر عمل پیرا ہو کر عوام پُر امن اور خوش حالی کی زندگی بسر کرتے ہیں۔ جب دور حاضر میں مغرب کی ترقی یافتہ ریاستوں کی طرز حکمرانی پر غور کرتے ہیں تو یہ ریاستیں انہی اصولوں پر عمل پیرا ہیں۔ جو اسلام تعلیم دیتا ہے۔

اسلام نے طرز حکمرانی کے اصول مرتب کیے ہیں۔ یہ وہی اصول ہیں جو کم وبیش ہر غیر مسلم ریاست میں رائج ہیں۔ مثلاً اسلام پہلا دین ہے جس نے ریاست کا مقصد فلاح انسانی قرار دیا ہے۔ آج کل کی تمام سیکولر حکومتیں اس مقصد کے حصول کے لیے کوشاں ہیں۔ جب اسلام کے طرز حکمرانی اور سیکولر طرز حکمرانی کا ایک ہی مقصد ہے تو پھر اعتراض کیسا۔ اسلام مذہبی جبر واکراہ کا سخت مخالف ہے۔ یہی وجہ ہے بعض اسلامی ممالک میں جہاں مذہبی جبر واکراہ کی لہر پائی جاتی تھی وہاں اس لہر کو دبانے کے لیے سیکولر طرز حکومت اختیار کر لی ہے مثال کے طور پر بنگلہ دیش ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ انہوں نے اسلام کو ترک کر دیا ہے۔ ان کی حکومت بھی اسلام کے اصولوں پر قائم ہے حقوق انسانی کے منشور پر عمل ہوتا ہے صرف دین کے نام پر جو جبر واکراہ کی لہر ملک میں پائی جاتی تھی۔ جو حقوق انسانی کے منافی تھی اس کو ختم کیا ہے۔

چونکہ اسلام، دین کے نام پر جبر واکراہ کا شدید مخالف ہے اور ہر شخص کو مذہبی آزادی دیتا ہے اور اسلام یہ لازمی قرار نہیں دیتا کہ ریاست کا نام اسلام پر رکھا جائے۔ اسلام صرف یہ کہتا ہے کہ ان اصولوں پر عمل کیا جائے جو انسانی فلاح کے لیے لازمی ہیں اور یہ وہی اصول ہیں جو قرآن میں پائے جاتے ہیں اور سیکولر حکومتیں بھی انہی اصولوں پر عمل پیرا ہیں تو اعتراض کیسا۔ صرف اسلام کے طرز حکمرانی کے اصولوں کو سمجھا نہیں گیا اور اگر اسلام کے ان اصولوں کو سمجھا جاتا جن پر خود سیکولر حکومتیں عمل پیرا ہیں تو اعتراض نہ کیا جاتا۔

......☆......

عورت کے حقوق (اسلام عورت کے حقوق کا حامی نہیں)

اسلام میں عورت کا درجہ اور حیثیت:

اعتراض: ابن وراق نے اپنی کتاب ''میں مسلمان کیوں نہیں'' کے صفحہ 181 پر "Schacht" کے حوالہ سے اسلام میں ''عورت کے حقوق'' پر اعتراض کیا ہے۔

الف۔ مرد سے فروتر (Infenior to man)

ب۔ مذہبی لحاظ سے بعض حقوق وفرائض کے لحاظ سے مرد سے فروتر مثلاً خون بہا (Blood money) گواہی (Evidence) ورثہ (Inheritance) شادی (marriage) طلاق (Divorce)۔

ج۔ مرد کا عورت کو بعض صورتوں میں مارنا (beat her in certain cases)

(Schacht (1) PP 126,127)

جواب: عورت مرد سے فروتر نہیں (مساوات)

اسلام میں عورت انسانی سوسائٹی کا ایک اہم جزو ہے جس کے بغیر سوسائٹی کی تشکیل پا ہی نہیں سکتی افزائش نسل انسانی کے لیے دونوں لازم و ملزوم ہیں اسلام نے عورت کا درجہ دو حیثیتوں سے متعین کیا ہے ایک عمومی حیثیت سے اور دوسری خصوصی حیثیت سے۔ عمومی حیثیت کے لحاظ سے عورت کو انسانیت کا وہی درجہ دیا ہے جو مرد کو حاصل ہے۔

ارشاد الٰہی ہے۔

يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّ اُنْثٰى (الحجرات 13:49)

اے لوگو! ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا ہے۔

اس آیت کریمہ میں تخلیق نسل انسانی میں مرد اور عورت دونوں کو برابر کا شریک قرار دیا گیا ہے۔

يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ (النساء 1:4)

اے لوگو! اپنے رب سے ڈرو جس نے تم کو ایک جان سے پیدا کیا۔

اس آیت میں نفسِ واحدۃ سے مراد مرد اور عورت دونوں مراد ہیں مرد اور عورت کو ایک اصل قرار دے کر دونوں کو انسانیت میں مساوی درجہ دیا ہے۔

اعلیٰ روحانی مدارج کے حصول کے لحاظ سے برابری:

روحانی اور اخلاقی میدان میں مرد اور عورت میں کامل مساوات ہے جس طرح مرد جدوجہد اور عبادت گزاری سے اللہ کا قرب حاصل کرسکتا ہے اسی طرح عورت بھی اعلیٰ مدارج تک پہنچ سکتی ہے۔

ارشاد الٰہی ہے۔

مَنْ يَّعْمَلْ مِنَ الصّٰلِحٰتِ مِنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَاُولٰٓئِكَ يَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ وَلَا يُظْلَمُوْنَ نَقِيْرًا (النساء 124:4)

اور جو نیک کام کرے خواہ مرد ہو یا عورت اور وہ مومن ہو تو یہی جنت میں ہوں گے اور ان پر ذرہ بھر ظلم نہ کیا جائے گا۔

دونوں (مرد اور عورت) اعلیٰ روحانی زندگی سے لطف اندوز ہوں گے۔

وَمَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَنُحْيِيَنَّهٗ حَيٰوةً طَيِّبَةً (النحل 97:16)

جو کوئی اچھا عمل کرتا ہے مرد ہو یا عورت اور وہ مومن ہے، ہم یقیناً اسے ایک پاک زندگی میں زندہ رکھیں گے۔

قرآن مجید بتاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ حضرت مریم اور ام موسیٰ سے ہم کلام ہوا اور بلند روحانی مقام پر فائز کیا۔ ارشاد الٰہی ہے۔

وَاِذْ قَالَتِ الْمَلٰٓئِكَةُ يٰمَرْيَمُ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰكِ وَطَهَّرَكِ وَاصْطَفٰكِ عَلٰى نِسَآءِ الْعٰلَمِيْنَ (آل عمران 42:3)

اور جب فرشتوں نے کہا اے مریم اللہ نے تجھے برگزیدہ کیا اور تجھے پاک بنایا ہے اور جہانوں کی عورتوں میں سے تجھے چن لیا ہے۔

وَاَوْحَيْنَآ اِلٰٓى اُمِّ مُوْسٰٓى اَنْ اَرْضِعِيْهِ فَاِذَا خِفْتِ عَلَيْهِ فَاَلْقِيْهِ فِي الْيَمِّ وَلَا تَخَافِيْ وَلَا تَحْزَنِيْ (القصص 7:28)

اور موسیٰ کی ماں کو ہم نے وحی کی کہ اسے دودھ پلا پھر جب اس کے متعلق تجھے خوف ہو تو اسے دریا میں ڈال دے اور نہ ڈرنا اور نہ غم کرنا۔

یہ آیات واضح کرتی ہیں کہ جس طرح ایک مرد اللہ کا قرب حاصل کر کے اللہ سے ہم کلام ہوسکتا ہے اسی طرح ایک عورت بھی اللہ سے ہم کلامی کا شرف حاصل کر سکتی ہے۔

حق ملکیت میں برابری:

مادی لحاظ سے بھی عورت کو مرد کے مساوی درجہ دیا ہے۔جس طرح مرد روپیہ کما سکتا ہے اسی طرح عورت کو اجازت ہے قرآن مجید میں آتا ہے۔

لِلرِّجَالِ نَصِيبٌ مِّمَّا اكْتَسَبُوا وَلِلنِّسَآءِ نَصِيبٌ مِّمَّا اكْتَسَبْنَ (النساء 32:4)

مردوں کا حصہ ہے جو وہ کمائیں اور عورتوں کے لیے حصہ ہے جو وہ کمائیں۔

عورت کو اپنی ملکیت میں تصرف پر پورا حق حاصل ہے چنانچہ ارشاد الٰہی ہے۔

وَاٰتُوا النِّسَآءَ صَدُقٰتِهِنَّ نِحْلَةً فَاِنْ طِبْنَ لَكُمْ عَنْ شَیْءٍ مِّنْهُ نَفْسًا فَكُلُوْهُ هَنِيْٓئًا مَّرِيْٓئًا (النساء 4:4)

اور عورتوں کو ان کے مہر بلا بدل دو پھر اگر وہ خوشی سے اس میں سے کچھ تمہارے لیے خود دے دیں تو اسے مزے سے خوش گزاری سے کھاؤ۔

اس آیت میں یہ بتایا گیا ہے کہ مہر کی مستحق صرف عورت ہے اگر وہ اپنی مرضی اور خوشی سے خاوند سے نہ لے تو پھر مرد اس رقم کو اپنی مرضی سے جہاں چاہے، خرچ کر سکتا ہے۔اصل میں مہر پر تصرف کا حق صرف عورت کو حاصل ہے۔

عورت سے دیا ہوا مال لینے کی ممانعت:

اگر کوئی امیر شخص اپنی بیوی کو بطور مہر ڈھیروں ڈھیر دے تو وہ واپس لینے کا مجاز نہیں۔ارشاد الٰہی ہے۔

وَّاٰتَيْتُمْ اِحْدٰهُنَّ قِنْطَارًا فَلَا تَاْخُذُوْا مِنْهُ شَيْـًٔا (النساء 20:4)

اور اگر تم (ان عورتوں) میں سے کسی کو سونے کے ڈھیر دے چکے ہو تو اس میں سے کچھ واپس نہ لو۔

عورت کا خصوصی حیثیت سے مقام:

عورت کی مختلف خصوصی حیثیتیں ہیں وہ بیوی بھی ہے ماں بھی ہے اور بیٹی بھی ہے ہر حیثیت سے اسلام نے عورت کو ذلت کے گڑھے سے نکال کر عزت و تکریم کے مقام پر کھڑا کیا ہے۔

بیوی کی حیثیت سے:

بیوی سکون قلب کا ذریعہ ہے۔اسلام کا بیوی کو ذریعہ سکون قلب قرار دینا اس کی تکریم کا اظہار ہے یہ ایک طبعی امر ہے جو چیز انسان کے دل کو سکون دے وہی اس کو محبوب ہوتی ہے۔

ارشاد الٰہی ہے۔

وَمِنْ اٰيٰتِهٖٓ اَنْ خَلَقَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا لِّتَسْكُنُوْٓا اِلَيْهَا وَجَعَلَ بَيْنَكُمْ مَّوَدَّةً وَّرَحْمَةً (الروم 21:30)

خدا کی نشانیوں میں سے ایک یہ ہے کہ اس نے تمہاری جنس سے تمہاری بیویاں پیدا کیں تا کہ ان کے پاس سکون قلب پاؤ اور تمہارے درمیان محبت اور رحم پیدا کیا۔

قرآن مجید نے مرد اور عورت میں حقوق کی تقسیم بطور اصول یہ بیان کی ہے۔

وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِي عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوفِ (البقرہ2:228)

اور عورتوں کے لیے پسندیدہ طور پر ویسے ہی (حقوق) ہیں جیسے ان پر مردوں کے (حقوق) ہیں۔

پھر گھر کے حقوق اور ذمہ داریاں ہیں حدیث میں اس کی حیثیت ایک راعیہ (حاکم) کی بیان کی گئی ہیں۔ تم میں سے ہر ایک حاکم ہے اور پھر ہر ایک اپنی رعایا کے متعلق پوچھا جائے گا امیر (بادشاہ) اپنی رعایا پر حاکم ہے اور مرد اپنے گھر والوں پر حاکم ہے اور عورت اپنے خاوند کے گھر اور اس کے بچوں پر حاکم ہے سو ہر ایک تم میں سے حاکم ہے اور ہر ایک اپنی رعایا کے متعلق پوچھا جائے گا۔ (بخاری کتاب النکاح باب 19 المرأة راعية فی بیت زوجها)

یہ حدیث ظاہر کرتی ہے کہ عورت کو گھر میں ایک حاکم کی حیثیت حاصل ہے اور گھر اس کی سلطنت ہے نکاح کے بعد اس کو ایک بلند مقام حاصل ہو جاتا ہے۔ وہ صرف مرد کی تسکین قلب کا موجب ہی نہیں بلکہ اس کو گھر میں ایک راعیۃ کی حیثیت حاصل ہوگئی ہے اور راعیۃ ہونے کے ساتھ اس کے نئے حقوق قائم ہو گئے ہیں اور اس پر نئی ذمہ داریاں بھی عائد ہوگئی ہیں۔

تقسیم عمل:

اسلام نے میاں بیوی کے کام اور ذمہ داریاں الگ الگ مقرر کردی ہیں تا کہ اپنے دائرہ کار میں رہ کر ان ذمہ داریوں کو پورا کریں۔ تقسیم کار کی وجہ سے گھر کے نظام کو بہتر بنایا جا سکتا ہے۔ یہ تقسیم کار مرد اور عورت کی جسمانی ساخت کو مدنظر رکھ کر کی گئی ہے مرد جسمانی ساخت کے لحاظ سے مضبوط ہے اس وجہ سے اس کے سپرد محنت اور مشقت والے کام کیے ہیں۔ اس مقصد کے لیے انسان کو پیدا کیا گیا ہے اور عورت کے سپرد وہ کام ہے جو محبت اور شفقت کا متقاضی ہے۔ یعنی بچوں کی دیکھ بھال ہی تقسیم طبعی اور قدرتی ہے یہ تقسیم کسی کو فوقیت اور برتری دینے کی وجہ نہیں۔ بلکہ یہ ایک طبعی تقسیم ہے نسل انسانی کی ترقی اس میں مضمر ہے۔

یہ تقسیم محض ایک عام کلیہ کے طور پر ہے اس کا مقصد یہ نہیں کہ عورت زندگی کی دوسری سرگرمیوں میں حصہ نہیں لے سکتی اسلامی تاریخ یہ بتاتی ہے کہ عہد رسول کریم ﷺ میں عورتیں اسلامی جماعت کے ساتھ تمام قومی سرگرمیوں میں حصہ لیا کرتی تھیں۔ تاریخ یہ بتاتی ہے کہ عورتوں نے میدان جنگ میں بھی مجاہدین کے ساتھ مل کر مختلف قومی کاموں کو سرانجام دیا بیماروں کی دیکھ بھال کی۔ (بخاری کتاب الجهاد والسیر باب 67 مَدَاوَةُ النِّسَاء الجَرحٰی فِي الْغَزْوِ)

اشیاء خوردنی میدان جنگ میں لے جاتیں (بخاری کتاب الجهاد والسیر باب 66 حَمْلُ النِّسَاءِ القُرْبِ اِلَى النَّاسِ فِي الغَزْوِ)

زخمیوں کو اور مقتولین کو میدان جنگ میں سے اٹھا کر لے جاتیں (بخاری کتاب الجهاد والسیر باب۔66 ردالنساء الجرحی والقتلی)

جب کبھی ضرورت پیش آئی تو شمشیر بکف ہو کر میدان جنگ میں اتر آئیں۔ (بخاری کتاب الجهاد والسیر باب 62 جہاد النساء و باب 63 غزو المرأة فی النحرا باب 65 غزو النساء مع الرجال) رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک زوجہ حضرت زینبؓ کھالیں تیار کیا کرتی تھیں اور ان سے جو آمد ہوتی تھی وہ خیراتی کاموں میں صرف کرتی تھیں۔ (فتح الباری جلد 3 صفحہ 228) عورتیں زراعت میں اپنے خاوندوں کی مدد کیا کرتی تھیں (بخاری کتاب النکاح باب 108 الخیرہ) ضیافت کے موقع پر مرد مہمانوں کو کھانا وغیرہ دیتی تھیں۔ (بخاری کتاب النکاح باب 78 قِيَامُ الْمَرْأَةِ عَلَى الرِّجَالِ فِي الْعُرْسِ وَ خِدْمَتِهِمْ بِالنَّفْس) اور تجارت کا کام کرتی تھیں۔ (بخاری کتاب الجمعہ باب 40)۔

قول اللّٰہ تعالیٰ فَإِذَا قُضِيَتِ الصَّلٰوةُ فَانْتَشِرُوا فِي الْأَرْضِ الخ (الاحکام 136/2)

حضرت عمرؓ نے ایک عورت شفا نامی کو مدینہ کی سبزی منڈی میں مقرر کیا تھا۔ تاریخ اس امر پر شاہد ہے کہ حضرت عائشہؓ نے حضرت

عثمانؓ کے خون کا بدلہ لینے لیے لشکر کی کمان کی۔

اسلام نے جہاں عورت پر بچوں کی دیکھ بھال اور پرداخت کی اہم ذمہ داری عائد کی ہے تو اس کو زندگی کے دوسرے شعبوں سے نکال نہیں دیا بچوں کی دیکھ بھال اس کا اصل کام ہے لیکن ضرورت پڑنے پر زندگی کے دوسرے کام بھی انجام دے سکتی ہے۔

ماں کی حیثیت سے مقام:

اسلام نے ماں کو عظمت اور احترام کے بلند مقام پر کھڑا کیا ہے اس عظمت کا اندازہ اس امر سے لگایا جاسکتا ہے کہ توحید الٰہی کے بعد دوسرا درجہ والدین کی اطاعت ہے ارشاد الٰہی ہے۔

وَاِذْ اَخَذْ نَا مِيْثَاقَ بَنِيْ اِسْرَآئِيْلَ لَا تَعْبُدُوْنَ اِلَّا اللّٰهَ وَبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا (البقرہ2:83)

جب ہم نے بنی اسرائیل سے عہد کیا۔ کہ سوائے اللہ کے تم کسی کی عبادت نہ کرنا اور ماں باپ کے ساتھ نیک سلوک کرنا۔

دوسری آیت ہے۔

تَعَالَوْا اَتْلُ مَا حَرَّمَ رَبُّكُمْ عَلَيْكُمْ اَلَّا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْئًا وَّبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا (انعام - 156:6)

کہ آؤ میں پڑھ کر سناؤں جو تمہارے رب نے حرام کیا ہے کہ تم پر واجب ہے کہ تم اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرو اور والدین کے ساتھ نیک سلوک کرو۔

حضرت ابو ہریرہ سے روایت ہے کہ ایک آدمی نے عرض کیا یا رسول اللہ! میرے حسن سلوک کا سب سے زیادہ حق دار کون ہے آپ ﷺ نے فرمایا: تیری ماں پھر بولا پھر کون؟ فرمایا تیری ماں، بولا پھر کون؟ فرمایا تیری ماں بولا پھر کون؟ فرمایا تیرا باپ۔ (مشکوۃ المصابیح باب البر والصلۃ ص 419 متفق علیہ) حضرت مغیرہ کی روایت ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے چند ناپسند باتوں کو حرام قرار دیا ان میں سے ایک ماں کی نافرمانی ہے۔ (مشکوٰۃ المصابیح باب البر والصلۃ صفحہ 419)

بیٹی کی حیثیت سے:

اسلام نے بیٹی کے ساتھ حسن سلوک اور شفقت سے پیش آنے کی تعلیم دی ہے اور اس کی اچھی تعلیم تربیت کرنے کو دوزخ کی آگ سے نجات کا ذریعہ ٹھہرایا ہے حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص دو لڑکیوں کی پرورش کرے۔ یہاں تک کہ وہ جوان ہو جائیں تو قیامت کے دن میرا اس کے ساتھ (انگلیوں کو ملا کر فرمایا) اس طرح ہوگا۔ (مسلم کتاب البر والصلہ والادب باب فَضْلُ الْاِحْسَانِ اِلَى الْبَنَاتِ)

مسلم کی روایت ہے کہ جو شخص لڑکیوں کی پیدائش میں مبتلا ہو گیا اور اس نے ان کی پوری پرورش اور دیکھ بھال کی تو وہ لڑکیاں اس کے لیے دوزخ سے نجات کا باعث بن جائیں گی۔ (مسلم بَابُ فَضْلُ الْاِحْسَانِ اِلَى الْبَنَاتِ)

شوہر اور بیوی کے حقوق:

اسلام نے عائلی نظام کو چلانے کے لیے شوہر اور بیوی دونوں کے حقوق و فرائض مقرر کر دیئے ہیں۔ شوہر کنبہ کے نان ونفقہ کے لیے روزی کمائے اور عورت کا یہ فرض ہے کہ وہ گھریلو امور کا انتظام اور بچوں کی پرورش کرے۔ لہٰذا دونوں کے حقوق و فرائض انہی دو امور میں مرکوز ہیں اس سے بہتر گھریلو زندگی کا انتظام چلانے کے لیے کوئی اور نظام نہیں ہوسکتا روزی کمانے کی وجہ سے اسلام نے خاوند کو قوام کہا ہے کسی برتری کی وجہ سے نہیں اور نہ عورت کو فروتر قرار دینے کی وجہ ہے۔ خاوند کو اس طبعی اور قدرتی برتری کی وجہ سے قوام کہا گیا ہے جو جسمانی طور پر اس کو

حاصل ہے وہ طبعی اور قدرتی برتری روزی کمانا ہے۔ اس سے عورت کی کسی طور پر بھی تنقیص نہیں پائی جاتی۔ بلکہ اس لحاظ سے فضیلت بھی پائی جاتی ہے کہ اس کو گھریلو اخراجات پورے کرنے کے لیے مستثنیٰ قرار دیا ہے اور یہ فرض صرف مرد کو سپرد کیا ہے۔ ارشاد الٰہی ہے۔

لِيُنْفِقْ ذُوْسَعَةٍ مِّنْ سَعَتِهٖ وَمَنْ قُدِرَ عَلَيْهِ رِزْقُهٗ فَلْيُنْفِقْ مِمَّآ اٰتٰهُ اللّٰهُ (الطلاق 7:65)

چاہیے کہ وسعت والا اپنی وسعت کے مطابق خرچ کرے اور جس پر اس کی روزی تنگ ہے تو چاہیے کہ وہ اس سے خرچ کرے جو اللہ نے اسے دیا ہے۔

اَسْكِنُوْهُنَّ مِنْ حَيْثُ سَكَنْتُمْ مِنْ وُّجْدِكُمْ (الطلاق 6:65)

انہیں اپنی حیثیت کے مطابق وہیں رکھو جہاں تم رہتے ہو۔ یہ دونوں آیات ظاہر کرتی ہیں کہ نان ونفقہ وسکنی کے اخراجات پورا کرنا خاوند پر فرض ہے۔ اس میں خاوند کی فضیلت ظاہر نہیں ہوتی بلکہ اس کی ذمہ داری کو بیان کیا گیا ہے۔

خون بہا (Blood Money):

اسلام نے جن جرائم کی سزا مقرر کردی ہے ان میں مرد اور عورت مساوی سزا کے مستحق ہیں کہیں بھی تفریق نہیں اسلام نے سزا کا ایک عام اصول بیان کردیا ہے وہ یہ ہے۔

وَجَزٰٓؤُا سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا فَمَنْ عَفَا وَاَصْلَحَ فَاَجْرُهٗ عَلَى اللّٰهِ (الشوریٰ 40:42)

اور بدی کا بدلہ اس کی مثل سزا ہے۔ پھر جو کوئی معاف کرے اور اصلاح کرے اس کا اجر اللہ پر ہے اس آیت کریمہ میں تمام تعزیرات کا خلاصہ بیان کردیا گیا ہے۔ یعنی برائی کا بدلہ اس کی مثل سزا ہے یہی تمام سزاؤں کی اصل بنیاد ہے سوائے قتل زنا اور ڈاکا چوری کے، ان میں بھی ایک حد تک امام کی رائے پر چھوڑا۔ باقی تمام سزاؤں کے لیے ایک ہی اصول بیان کردیا ہے اس میں دو مزید باتوں کا ذکر کردیا گیا۔ عفا اور اصلح، مستغیث معاف کردے اور سزا ساقط ہوجائے گی دوم۔ بغیر سزا دینے کے اصلاح ہوجانے کی امید ہو جو تعزیرات کی اصل غرض ہے تو بھی امام سزا کو ساقط کرسکتا ہے۔

دوسری جگہ آتا ہے۔

فَمَنِ اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ فَاعْتَدُوْا عَلَيْهِ بِمِثْلِ مَا اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ (البقرہ 194:2)

پس جو کوئی تم پر زیادتی کرے تو تم اس کو اسی کے مطابق سزا دو جو اس نے تم پر زیادتی کی ہے۔

دونوں آیات میں تعزیری قوانین کی بنیاد رکھ دی ہے اس کے ساتھ سزا ساقط کی ''دفعہ'' بھی رکھ دی۔

قتل میں یہ حد مقرر کی ہے کہ قاتل کو مقتول کے بدلہ میں قتل کیا جائے۔

ارشاد الٰہی ہے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ فِى الْقَتْلٰى اَلْحُرُّ بِالْحُرِّ وَالْعَبْدُ بِالْعَبْدِ وَالْاُنْثٰى بِالْاُنْثٰى فَمَنْ عُفِىَ لَهٗ مِنْ اَخِيْهِ شَىْءٌ فَاتِّبَاعٌۢ بِالْمَعْرُوْفِ وَاَدَآءٌ اِلَيْهِ بِاِحْسَانٍ ذٰلِكَ تَخْفِيْفٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَرَحْمَةٌ فَمَنِ اعْتَدٰى بَعْدَ ذٰلِكَ فَلَهٗ عَذَابٌ اَلِيْمٌ وَلَكُمْ فِى الْقِصَاصِ حَيٰوةٌ يّٰٓاُولِى الْاَلْبَابِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ (البقرہ 179,178:2)

اے لوگو! جو ایمان لائے ہو مقتولوں کے بارے میں تم پر قصاص مقرر کیا گیا ہے آزاد کے بدلہ آزاد، غلام کے بدلے غلام اور عورت کے بدلے عورت مگر جس کو اپنے بھائی کی طرف سے کچھ معافی دی گئی ہو تو عمدگی سے پیروی کرنی چاہیے اور نیکی کے ساتھ اسے ادا کیا جائے۔ یہ تمہارے لیے تمہارے رب کی طرف سے آسانی اور بڑی مہربانی کی گئی ہے پھر جو کوئی اس کے بعد زیادتی کرے اس کے لیے دردناک عذاب

ہے تمہارے لیے قصاص میں زندگی ہے اے عقل والو تا کہ تم تقویٰ کی راہ پہ چلو۔

سورۃ بقرہ کی آیت 178 میں جہاں قصاص کا ذکر آتا ہے وہاں یہ الفاظ آتے ہیں۔

اَلْحُرُّ بِالْحُرِّ وَالْعَبْدُ بِالْعَبْدِ وَالْاُنْثٰی بِالْاُنْثٰی (البقرہ۔ ۱۷۸)

یعنی آزاد کے بدلے آزاد غلام کے بدلے غلام اور عورت کے بدلے عورت۔

یہ الفاظ ظاہر کرتے ہیں کہ اگر قاتل آزاد ہے تو آزاد قتل کیا جائے اس کے بدلے دوسرا کوئی قتل نہیں کیا جا سکتا علیٰ ھذا القیاس۔

اس آیت میں مرد اور عورت کے جرم کی صورت میں کسی کو تخفیف حاصل نہیں ہے ہر مجرم اپنے جرم کی سزا پائے گا۔

اس آیت میں مقتول کے ورثاء کی مرضی کو بھی شامل کر لیا گیا ہے اگر وارث، قاتل کو معاف کر دے اور خون بہا پر راضی ہو جائے تو یہ قاتل کے لیے رعایت ہے وہ قتل سے بری کر دیا جائے گا۔

قتل کی سزا میں کسی کو بھی خواہ وہ مرد ہے یا عورت کوئی چھوٹ حاصل نہیں۔ دونوں سزا کے مستحق ہیں۔

جہاں خوں بہا کا تعلق ہے اس چھوٹ میں مرد اور عورت دونوں فائدہ حاصل کر سکتے ہیں یہ چھوٹ مقتول کے وارث کی صواب دید پر ہے لہٰذا خون بہا (Blood money) سے جہاں مرد فائدہ حاصل کر سکتا ہے وہاں عورت بھی۔ دونوں میں کوئی تمیز نہیں رکھی گئی۔

......☆......

عورت کی گواہی (دو عورتوں کی گواہی ایک مرد کے برابر)

عورت کی گواہی:

سورۃ بقرہ کی آیت 282 میں قرض کے لین دین کے معاملہ میں گواہی کے ذکر میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ اگر دو مرد گواہ دستیاب نہ ہوں تو ایک مرد اور دو عورتیں گواہ مقرر کر لی جائیں۔ مستشرقین نے اس امر کو ہدف تنقید بنایا ہے یہ اعتراض بھی اسلامی تعلیم کی حکمت کو نہ سمجھنے کی وجہ سے کیا گیا ہے۔ قرآن مجید میں جہاں ایک مرد دو عورتوں کی گواہی کا ذکر ہے وہ لین دین کا معاملہ ہے چونکہ عورتوں کو لین دین کے معاملات میں کم واسطہ پڑتا ہے اس وجہ سے ان کو اس قسم کے معاملات کی سمجھ بوجھ نہیں ہوتی اور اچھی طرح یاد نہیں رکھ سکتیں یہ ایک طبعی امر ہے کہ جب کسی شخص کو کسی معاملہ میں پوری طرح سمجھ بوجھ اور تجربہ نہ ہو تو اس کے بھولنے کا زیادہ احتمال ہوتا ہے۔ اسلام نے اس کمی کو پورا کرنے کے لیے احتیاطاً یہ بات رکھ دی ہے کہ اگر دو مرد نہ دستیاب ہوں تو ایک مرد کے ساتھ دو عورتیں بطور شاہد مقرر کر دیں۔ یہی بات انصاف کے قریب ہے۔

اکیلی عورت کی شہادت نا قابل قبول ہونے کا ذکر کہیں بھی نہیں۔ بلکہ لعان کے معاملہ میں جو وزن مرد کی چار مرتبہ شہادت (قسم) کو دیا ہے وہی وزن عورت کی چار مرتبہ شہادت کو دیا ہے گویا مرد اور عورت کی شہادت میں کوئی فرق نہیں رکھا۔ اسی طرح ولادت بکارت وغیرہ معاملات میں فقہاء نے عورت کی شہادت کو ہی پورا وزن دیا ہے۔

جہاں دو عورتوں کی شہادت کو ایک مرد کی شہادت کے برابر قرار دیا ہے وہ زندگی کا صرف ایک شعبہ (لین دین) ہے۔ جہاں عورت کو کوئی تجربہ نہیں ویسے دیگر معاملات میں کہیں بھی فقہاء نے مرد اور عورت کی شہادت میں کوئی فرق قرار نہیں دیا۔ یہ محض مستشرقین کی ناسمجھی کا نتیجہ ہے۔

ورثہ میں عدم مساوات:

مستشرقین نے اسلام کے ضابطہ ورثہ کو بھی تنقید کا ہدف بنایا ہے کہ عورت کو مرد کی نسبت ترکہ سے کم حصہ ملا ہے۔ یہ اعتراض سراسر لاعلمی کا نتیجہ ہے۔

اسلام پہلا دین ہے جس نے عورتوں کو ورثہ میں حق دار قرار دیا ہے ارشاد الٰہی ہے۔

يُوْصِيْكُمُ اللّٰهُ فِيْٓ اَوْلَادِكُمْ لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْاُنْثَيَيْنِ فَاِنْ كُنَّ نِسَآءً فَوْقَ اثْنَتَيْنِ فَلَهُنَّ ثُلُثَا مَا تَرَكَ وَاِنْ كَانَتْ وَاحِدَةً فَلَهَا النِّصْفُ (النساء:4:11)

اللہ تمہاری اولاد کے متعلق تمہیں تاکیدی حکم دیتا ہے مرد کے لیے دو عورتوں کے حصہ کے برابر ہو پھر اگر اولاد سے دو یا اس سے اوپر عورتیں ہوں تو ان کے لیے اس کی دو تہائی ہے جو چھوڑا اور اگر اکیلی ہو تو اس کے لیے نصف ہے۔

تاریخ انسانیت کا مطالعہ کیا جائے پہلا موقع ہے کہ اسلام نے عورتوں کو ورثہ می حق دار ٹھہرایا ہے۔

مذکورہ آیت سے پہلے آیت 7 میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے۔

لِلرِّجَالِ نَصِيْبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدٰنِ وَالْاَقْرَبُوْنَ وَلِلنِّسَآءِ نَصِيْبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدٰنِ وَالْاَقْرَبُوْنَ مِمَّا قَلَّ مِنْهُ اَوْ كَثُرَ نَصِيْبًا مَّفْرُوْضًا (النساء ـ ۷)

مردوں کے لیے ایک حصہ ہے جو ان کے والدین اور قریبی چھوڑیں اور عورتوں کے لیے اس سے ایک حصہ ہے جو ان کے ماں باپ اور قریبی چھوڑیں خواہ وہ تھوڑا ہو یا بہت مقرر حصہ۔

عرب میں خواہ لڑکے ہوں یا لڑکیاں میراث سے حصہ نہ دیا جاتا تھا جیسا کہ ابن عباس سے روایت ہے کہ عرب کے لوگ کہتے تھے۔

لَا يَرِثُ اِلَّا مَنْ قَاتَلَ عَلٰى ظُهُوْرِ الْخَيْلِ

کوئی ورثہ نہیں لے سکتا مگر وہ جو گھوڑے کی پیٹھ پر سوار ہو کر جنگ کرتا ہے۔

چنانچہ جب ام کحت نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے شکایت کی کہ اس کے خاوند اوس بن ثابت کے ترکہ میں سے اس کی بیٹیوں کو کوئی حصہ نہیں ملا اور کل پر اس کے بھائی قابض ہو گئے ہیں تو انہوں نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے یہی عرض کیا۔

يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ وَلَدُهَا لَا يَرْكَبُ فَرَسًا وَلَا يَحْمِلُ كَلًّا وَلَا يَنْكِي عَدُوًّا

یارسول اللہ اولاد نہ گھوڑے پر سوار ہوتی ہے اور نہ بوجھ اٹھاتی ہے اور نہ دشمن کو مارتی ہے پس اس آیت نے ایک نہایت قدیم رسم کو موقوف کیا اور ترکہ میں مرد اور عورت بڑے چھوٹے جنگ میں شریک ہونے والے یا نہ ہونے والے سب ترکہ میں حصے دار ہیں۔

یہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی قوت قدسی کا کمال ہے ہزاروں سالوں کی دیرینہ رسم کو ایک آن میں ختم کر دیا جب عورتوں کا ورثہ میں حق دار ہونے کا حکم آیا تو سب صحابہ نے اس کو بطیب خاطر قبول کر لیا۔ سب کی گردنیں جھک گئیں ہزاروں سال کی پرانی رسم کو ختم کر دینا کوئی آسان کام نہیں بہر حال اسلام نے عورتوں کو ورثہ میں حق دار ٹھہرا کر مردوں کے برابر قرار دے دیا۔

مسئلہ عدم مساوات کا:

مستشرقین نے یہ اعتراض کیا ہے کہ اسلام نے ورثہ میں ایک بیٹے کو دو لڑکیوں کے برابر کیوں قرار دیا ہے۔

ورثہ میں دو لڑکیوں کو ایک بیٹے کے برابر قرار دینے میں دونوں صنفوں کی ذمہ داریوں کو ملحوظ رکھا گیا ہے۔ بیٹا عموماً خاندان کا کفیل ہوتا ہے اسی پر خاندان کا بوجھ پڑتا ہے تو اس ظاہری عدم مساوات کی تہ میں حقیقی انصاف اور حقیقی مساوات کی روح جلوہ گر ہے۔

شادی (نکاح)

شادی:

شاخت (Schacht) نے شادی کے کس پہلو پر اعتراض کیا ہے اس کا ذکر نہیں کیا۔ جب اسلام کے ماقبل عہد کے ضابطہ شادی کا مطالعہ کیا جائے تو عورت کی بے بسی، بے چارگی اور مظلومیت کی الم ناک داستان سامنے آتی ہے اسلام نے نکاح کو ایک مقدس رشتہ قرار دے کر عورت کے مقام کو بہت بلند کیا ہے عرب معاشرہ میں عورت تسکین ہوس کا آلہ سمجھی جاتی تھی عورت کے کئی خاوند ہوتے تھے ایک مرد جس قدر چاہتا شادیاں کر لیتا دو حقیقی بہنوں سے ایک ساتھ نکاح کرنے کا عرب میں عام رواج تھا باپ مرجاتا تو اس کی کل بیویاں سوائے حقیقی ماں کے بیٹوں کے تصرف میں آتیں۔ اوران کی جائز بیویاں سمجھی جاتیں۔

عرب میں استبضاع کی رسم تھی۔ اس کی تشریح اہل لغت نے یہ کی ہے کہ عورت خواہش اولاد کے لیے اپنے خاوند کے سوائے دوسرے شخص کے ساتھ تعلق پیدا کرلے بلکہ لکھا ہے مرد اپنی بیوی اور لونڈی کو کہہ دیتا تھا۔

ارسلی الی فلان فاستبضعی

فلاں کو کہلا بھیجو اس سے اولاد پیدا کرنے کے لیے تعلق پیدا کرے یہ تھی اس وقت عرب میں ایک عورت سے شادی کی رسم۔

اسلام نے ان بد رسوم کو ختم کر کے شادی کو ایک مقدس حیثیت دی۔ میاں بیوی کے درمیان ایک معاشرتی میثاق قرار دیا جس میں مرد اور عورت کے آئینی اور اخلاقی اصول مقرر کیے۔ زوجین کے لیے لازمی قرار دیا کہ وہ اسلامی ضابطہ کے تحت زندگی بسر کریں۔

نکاح (شادی) کے قواعد وضوابط:

نکاح اعلانیہ کیا جائے۔ عارضی اور پردہ (چوری چھپے) میں نکاح ناجائز ہے۔ ارشاد الٰہی ہے۔

غَیْرَ مُسٰفِحِیْنَ وَلَا مُتَّخِذِیْٓ اَخْدَانٍ (المائدہ:5:5)

نہ عارضی نکاح کرنے والے اور نہ چھپی دوستی رکھنے والے ان الفاظ میں عارضی نکاح اور چوری چھپے جنسی تعلقات کو ناجائز قرار دیا گیا ہے۔

ولی کی منظوری:

اسلام نے زوجیت کے بندھن میں آنے والے جوڑے کے سرپرستوں کی باہمی رضامندی لازمی قرار دیا ہے۔ نکاح صرف دو افراد کے درمیان تعلقات استوار نہ کرے بلکہ دو خاندانوں کو آپس میں ملائے۔ دو خاندانوں کے تعلقات معاشرہ میں حسن، یکجہتی اور محبت کی فضا پیدا کرتے ہیں۔ اگر میاں بیوی کے درمیان اختلاف پیدا ہو جائے تو دونوں خاندانوں کے سربراہ اور بااثر افراد اس اختلاف کو دور کر دیں۔

مہر:

نکاح میں مہر ضروری ہے قرآن مجید کی طرف سے مہر ایک عطیہ ہے جو نکاح کے موقع پر خاوند بغیر کسی معاوضہ کے بیوی کو دینے کا وعدہ کرتا ہے قرآن مجید میں آتا ہے۔

فَاٰتُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ فَرِیْضَةً (النساء:24:4)

ان کے مقرر شدہ مہر دو۔

نکاح کی عمر:

قرآن مجید نکاح کی عمر بلوغت قرار دیتا ہے ارشاد الٰہی ہے۔

وَابْتَلُوا الْيَتٰمٰى حَتّٰى إِذَا بَلَغُوا النِّكَاحَ (النساء 6:4)

اور یتیموں کا امتحان لیتے رہو یہاں تک کہ جب وہ شادی کی عمر کو پہنچ جائیں۔ بلوغت کی عمر کی حد پر فقہاء کا اختلاف ہے۔ اگر بلوغت سے قبل شادی کر دی جائے تو مرد اور عورت دونوں کو یہ اختیار ہے کہ وہ نکاح کو قائم رکھیں یا ایک دوسرے سے الگ ہو جائیں۔

نکاح میں اکفا:

اسلام نے نکاح میں اکفا کو مستحسن قرار دیا ہے۔ نکاح تو غیر کفو سے جائز سمجھا جائے گا لیکن مستحسن نہیں۔ ہم کفو ہونا عائلی زندگی کے لیے بہتر ہے تاریخ اسلام میں کئی ایسے واقعات مشہور ہیں۔ کہ ہم کفو نہ ہونے کی وجہ سے عائلی زندگی میں قباحتیں پیدا ہوئیں اور طلاق تک نوبت پہنچ گئی۔

اسلام نے محرم اور غیر محرم رشتوں سے بھی آگاہ کر دیا ہے۔ اسلام سے قبل یہ ضابطہ نہیں تھا۔ اس کی تفصیل سورہ النساء کی آیت 23 میں درج ہے ارشاد الٰہی ہے۔

حُرِّمَتْ عَلَيْكُمْ أُمَّهٰتُكُمْ وَبَنٰتُكُمْ وَأَخَوٰتُكُمْ وَعَمّٰتُكُمْ وَخٰلٰتُكُمْ وَبَنٰتُ الْأَخِ وَبَنٰتُ الْأُخْتِ وَأُمَّهٰتُكُمُ الّٰتِيْ أَرْضَعْنَكُمْ وَأَخَوٰتُكُمْ مِّنَ الرَّضَاعَةِ وَأُمَّهٰتُ نِسَآئِكُمْ وَرَبَآئِبُكُمُ الّٰتِيْ فِيْ حُجُوْرِكُمْ مِّنْ نِّسَآئِكُمُ الّٰتِيْ دَخَلْتُمْ بِهِنَّ فَإِنْ لَّمْ تَكُوْنُوْا دَخَلْتُمْ بِهِنَّ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ وَحَلَآئِلُ أَبْنَآئِكُمُ الَّذِيْنَ مِنْ أَصْلَابِكُمْ وَأَنْ تَجْمَعُوْا بَيْنَ الْأُخْتَيْنِ إِلَّا مَا قَدْ سَلَفَ إِنَّ اللّٰهَ كَانَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا (النساء 23:4)

تم پر یہ عورتیں حرام کی گئی ہیں تمہاری مائیں اور تمہاری بیٹیاں اور بہن کی بیٹیاں اور تمہاری وہ مائیں جنہوں نے تم کو دودھ پلایا اور تمہاری رضاعی بہنیں، تمہاری بیویوں کی مائیں اور تمہاری پالی ہوئی لڑکیاں جو تمہاری حفاظت میں ہوں ان عورتوں کے بطن سے جن پر تم داخل ہو چکے ہو اور اگر تم ان پر داخل نہیں ہوئے ہو تو تم پر کوئی گناہ نہیں اور تمہارے ان بیٹوں کی بیویاں جو تمہاری پیٹھوں سے ہوں اور یہ کہ تم دو بہنوں کو اکٹھا کرو مگر جو گزر چکا اللہ بخشنے والا رحم کرنے والا ہے۔

وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ النِّسَآءِ (النساء 24:4)

ان عورتوں سے بھی شادی کرنا حرام ہے جو کسی دوسرے کے نکاح میں ہوں۔

وَلَا تَنْكِحُوْا مَا نَكَحَ اٰبَآؤُكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ (النساء 22:4)

اور ان عورتوں سے نکاح نہ کرو۔ جن سے تمہارے باپ نکاح کر چکے ہیں۔

وَلَا تَنْكِحُوا الْمُشْرِكٰتِ حَتّٰى يُؤْمِنَّ (بقرہ 22:2)

اور مشرک عورتوں سے نکاح نہ کرو یہاں تک کہ وہ ایمان لائیں۔

اس آیت سے مشرکہ سے مراد وہ عورتیں ہیں جن کے پاس آسمانی کتاب نہیں اسلام نکاح کو پختہ عہد قرار دیتا ہے اس وجہ سے اسلام نکاح میں انتخاب کی اجازت دیتا ہے۔ ارشاد الٰہی ہے۔

فَانْكِحُوْا مَا طَابَ لَكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ (النساء 3:4)

ایسی عورتوں سے شادی کرو جو تمہیں پسند ہوں۔ رسول کریم ﷺ نے یہ حکم دیا ہے کہ جب تم میں سے کوئی شخص کسی عورت سے شادی کرنے کی تجویز کرے تو اسے دیکھ لینا چاہیے حضرت امام بخاری نے ایک باب کا یہ عنوان باندھا ہے۔

اَلنَّظْرُ اِلَی الْمَرْاَۃِ قَبْلَ التَّزْوِیْجِ۔

یعنی نکاح سے قبل عورت کو دیکھنا۔

رسول کریم ﷺ سے ایک حدیث مروی ہے مغیرہ بن شعبہ نے ایک عورت سے شادی کرنے کا ارادہ کیا تو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے دریافت کیا کہ تم نے اس عورت کو دیکھ لیا ہے مغیرہ نے جواب دیا یا رسول اللہ نہیں جس پر حضور صلی اللہ علیہ نے فرمایا:

فَانْظُرْ اِلَیْھَا فَاِنَّہٗ اَحْرٰی اَنْ یُّوْدَمَ بَیْنَکُمَا (مشکوٰۃ کتاب النکاح بَابَ النَّظْرِ اِلَی الْخُطُوْبَۃِ الْفَصْلِ الثَّانِی)

اسے دیکھ لو کیونکہ اس سے زیادہ محبت اور یگانگت ہونے کی توقع ہے۔

الغرض اسلام نے نکاح کے ایسے ضوابط مقرر کر دیئے ہیں جن سے وہ تمام خرابیاں دور ہو گئی ہیں جن کی وجہ سے عائلی زندگی میں فساد اور بگاڑ پیدا ہوتا تھا۔ زوجیت کے بندھن میں آنے والا جوڑا شادی سے قبل پوری آزادی رکھتا ہے اسی لیے نکاح کے وقت مرد اور عورت دونوں کا ایجاب وقبول ضروری ہے۔ دونوں "ہاں" اور "نہ" کرنے کے مجاز ہیں۔

نکاح اس وقت پایہ تکمیل کو پہنچے گا جب دونوں طرف سے ایجاب وقبول ہو جائے۔

آزاد محبت:

یورپ میں نکاح کی بجائے آزاد محبت کا رواج عام ہے۔ مرد اور عورت بغیر نکاح اکٹھے بحیثیت میاں بیوی زندگی بسر کرتے رہتے ہیں اس کو وہ آزاد محبت کا نام دیتے ہیں۔ اس آزاد محبت کو معیوب نہیں سمجھا جاتا۔ نکاح سے گریز اس وجہ سے کیا جاتا ہے کہ اس سے فریقین پر کچھ آئینی ذمہ داریاں عائد ہو جاتی ہیں۔ ان ذمہ داریوں سے بچنے کے لیے آزاد محبت سے جنسی خواہش پوری کر لی جاتی ہے دراصل یہ ایک حیوانی زندگی ہے۔ اس آزاد محبت سے مغربی معاشرہ میں فساد برپا ہوتا جا رہا ہے۔ اس جنسی بے راہ روی کی وجہ سے معاشرہ میں عام بیماریاں پیدا ہو گئی ہیں۔ اس آزادی کی وجہ سے بچیاں بلوغت تک پہنچنے سے پہلے ہی جنسی لذت سے آشنا ہو جاتی ہیں۔ یہ آزادی اس قسم کی ہے کہ والدین اپنی اولاد پر کوئی اخلاقی دباؤ نہیں ڈال سکتے۔ اخلاقی دباؤ ڈالنا اور ڈانٹ ڈپٹ مغربی تصور آزادی کے منافی ہے۔

اگر آزاد محبت سے اولاد پیدا ہو جائے اور فریقین سے کوئی بھی ایک دوسرے سے جنسی لحاظ سے سیر ہو جائے تو وہ اولاد کو کسمپرسی کی حالت میں چھوڑ کر چلے جاتے ہیں۔ اس طرح اولاد والدین کی محبت سے محروم ہو جاتی ہے ایسی بھی حالت آجاتی ہے کہ بچے گورنمنٹ کے سپرد کر دیئے جاتے ہیں۔ وہ گورنمنٹ کی نگرانی میں تربیت پاتے ہیں۔ ان کو اپنے والدین تک کا علم نہیں ہوتا۔

آزاد محبت فریقین کو خود غرض بنا دیتی ہے کیونکہ ان کے درمیان کوئی آئینی اور اخلاقی رشتہ نہیں جب چاہیں ایک دوسرے کو چھوڑ سکتے ہیں اس جنسی آزادی نے سوسائٹی کو بگاڑ کر رکھ دیا ہے۔ اب مغرب کے مفکر اس جنسی آزادی کے خلاف آواز اٹھا رہے ہیں اور مغرب میں بے لگام آزادی کا تصور اس انتہا تک پہنچ گیا ہے۔ عوام کو ذمہ داری کے بندھن میں آنا دشوار محسوس ہوتا ہے۔ اسی وجہ سے مغرب کا معاشرہ زوال پذیر ہوتا جا رہا ہے۔

اسلام نے اس جنسی آزادی کو غیر مسافحین اور ولا متخذی اخدان کے الفاظ سے روک دیا۔ اسی روک اور پابندی کی وجہ سے مستشرقین اسلام کے نظریہ نکاح کو ہدف تنقید بناتے ہیں اور اس کو انسانی آزادی کے خلاف قرار دیتے ہیں۔

اگر عمیق اور دقیق نظر سے دیکھا جائے تو اسلام کے نظریہ نکاح کے قواعد وضوابط اور پابندیاں ہی فریقین کے لیے بہتری کا سبب ہیں۔انہی قواعد وضوابط سے ہی عائلی زندگی میں حسن پیدا ہوتا ہے وہی قواعد وضوابط معاشرہ میں یگانگت اور محبت کی روح پھونکتے ہیں آزاد محبت کے تناظر میں اسلامی فلسفہ نکاح کا جائزہ لیا جائے تو اسلام بنی نوع انسان کے لیے ایک رحمت کا پیغام ثابت ہوتا ہے۔

طلاق:

دنیا کے ہر معاشرے میں خاوند کو اپنی بیوی سے الگ ہونے کا حق ہے۔یہودیت میں بھی طلاق کا اختیار خاوند کو حاصل ہے جب چاہے ادنیٰ وجوہ کی بناء پر طلاق دے سکتا ہے کیونکہ یہودیت میں عورت کی حیثیت محض ایک مملوکہ شے کی ہے مرد مالک اور مختار، شریعت کے تمام احکام اسی مرکزی محور کے گرد گھومتے ہیں چنانچہ تورات میں لکھا ہے ''اگر کوئی مرد عورت لے لے اس سے شادی کرلے اور بعد میں ایسا ہو کہ وہ اس کی نگاہ میں عزیز نہ ہو اس سبب سے کہ اس نے اس میں کچھ پلید بات پائی ہو وہ اس کا طلاق نامہ لکھ کر اس کے ہاتھ میں دے اور اسے اپنے گھر کے باہر کردے۔(استثناء 1:24)

قانون طلاق عیسائیوں میں:

فریسیوں نے حضرت حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے سوال کیا ''کیا جائز ہے کہ مرد ایک سبب سے اپنی بیوی کو طلاق دے دے۔(متی 3:19)

آپ نے فرمایا: ''جسے خدا نے ملایا اسے انسان جدا نہ کرے۔'' (متی 6:19)

ایک لمبے عرصہ تک مسیحی دنیا اس قانون پر عامل رہی جب عملی زندگی میں میاں بیوی کے درمیان تفریق نہ ہونے کی وجہ سے دشواریاں پیدا ہوئیں تو یہ قانون وبال جان بنا تو مشرقی کلیسا نے بعض حالتوں میں طلاق کو جائز قرار دیا مگر مغربی کلیسا نے اس کو تسلیم کرنے سے انکار کردیا۔

چنانچہ 1910ء میں انگلستان میں طلاق اور نکاح کے مسائل پر غور کرنے کے لیے ایک کمیٹی تشکیل دی گئی اس نے سفارش کی کہ ''باب طلاق کے اعتبار سے مرد اور عورت دونوں کو مساوی قرار دیا جائے یعنی جن وجوہ کی بناء پر مرد طلاق کی ڈگری پانے کا مستحق ہے انہی وجوہ کی بناء پر عورت بھی طلاق کرنے کی مستحق ہے۔1923ء کے قانون میں یہ شامل کرلیا گیا کہ مرد اگر ایک مرتبہ بھی زنا کا ارتکاب کرے تو عورت، مرد سے طلاق لے سکتی ہے۔

ہندو مذہب:

ہندو مذہب میں طلاق کا قانون، غیر انسانی اقدار پر مبنی ہے صرف عورت کو طلاق لینے کے حق سے محروم ہی نہیں رکھا گیا بلکہ عورت کو مرد کے ہاتھ میں قیدی بنا دیا گیا ہے۔

جاہلیت میں طلاق کا قانون:

اس سے پہلے جاہلیت میں یہ دستور تھا کہ مرد عورتوں کو متعدد طلاقیں دیتا اور رجوع کرلیتا اور اس طرح برسوں عورتوں کو ستاتا رہتا تھا۔حضرت عائشہ کا بیان ہے کہ ایک شخص اپنی بیوی کو طلاق دیتا اور عدت کے اندر رجوع کرلیتا جس کا نتیجہ یہ تھا کہ عورت اس مرد کی زوجیت سے نکل نہیں سکتی تھی ایک مرد سو سے اوپر تک طلاق دیا کرتا تھا۔

اسلام کے قانون طلاق میں اعتدال:

اسلام نے جو طلاق کا قانون پیش کیا ہے وہ افراط اور تفریط سے پاک اور اعتدال پر مبنی ہے اس قانون میں مرد اور عورت دونوں کو یہ حق دیا ہے کہ وہ ایک دوسرے سے علیحدگی اختیار کر سکتے ہیں لیکن یہ حق مخصوص حالات کے تابع ہے اگر میاں بیوی دیکھیں کہ وہ ایک دوسرے کے حقوق وفرائض ادا نہیں کر سکتے ان کے اکٹھے رہنے سے اولاد اور دوسرے رشتہ داروں پر برا اثر پڑتا ہے نکاح کی روح مجروح ہوتی ہے تو اس وقت میاں بیوی کو ایک دوسرے سے علیحدگی اختیار کر سکتے ہیں ارشاد الٰہی ہے۔

لَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ اِنْ طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ (البقرہ 236:2)

یعنی تم پر کوئی گناہ نہیں اگر تم اپنی عورتوں کو طلاق دے دو۔

خلع کے بارہ میں آتا ہے۔

فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا يُقِيْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا فِيْمَا افْتَدَتْ بِهٖ (البقرہ 229:2)

پس اگر انہیں یہ ڈر ہو کہ وہ دونوں اللہ کی حدود کو قائم نہ رکھ سکیں گے تو پھر ان پر اس بارے میں کچھ گناہ نہیں جو عورت فدیہ دے دے۔

حدیث سے یہ بھی ظاہر ہے کہ عہد نبوی میں عورت نے اپنے خاوند سے آزادی حاصل کی تھی۔

ثابت بن قیس کی بیوی کا واقعہ ہے کہ وہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئی اور عرض کی یا رسول اللہ میں ثابت بن قیس کے اخلاق اور دین داری پر کوئی عیب نہیں لگاتی مگر میں اس سے نباہ نہیں کر سکتی اس پر حضور نے فرمایا کیا تو اس باغ (جو اس نے بطور مہر دیا تھا) واپس کر دے گی؟ ثابت بن قیس کی بیوی نے کہا ''ہاں'' حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ثابت کو بلوا بھیجا اور اسے حکم دیا کہ اپنا باغ واپس لے لو اور اپنی بیوی کو طلاق دے دو۔ (بخاری کتاب الطلاق باب 12 الخلع وکیف الطلاق فیہ)

پس معلوم ہوا کہ اسلام میں عورت کو بھی یہ حق حاصل ہے کہ وہ بعض وجوہ کی بناء پر مرد سے الگ ہو سکتی ہے۔

اسلام نے جہاں بعض شرائط کے ساتھ مرد کو حق دیا ہے کہ وہ عورت سے الگ ہو جائے تو وہاں عورت کو بھی یہ حق حاصل ہے کہ وہ مرد سے علیحدگی اختیار کرے طلاق دینے اور خلع حاصل کرنے کی شرعی اجازت کے باوجود رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے علیحدگی کو ناپسند قرار دیا ہے آپ نے فرمایا:

لَا خَلَقَ اللّٰهُ شَيْئًا عَلٰى وَجْهِ الْاَرْضِ اَبْغَضَ اِلَيْهِ مِنَ الطَّلَاقِ (مشکوۃ المصابیح کتاب الطلاق ص 284)

اللہ تعالیٰ نے روئے زمین پر طلاق سے بڑھ کر کوئی چیز مبغوض پیدا نہیں کی۔

اسی وجہ سے مستقل طور پر علیحدگی اختیار کرنے سے پہلے مرد اور عورت کے درمیان مصالحت کرانے کا حکم بھی ہے ارشاد الٰہی ہے۔

وَاِنْ خِفْتُمْ شِقَاقَ بَيْنِهِمَا فَابْعَثُوْا حَكَمًا مِّنْ اَهْلِهٖ وَحَكَمًا مِّنْ اَهْلِهَا اِنْ يُّرِيْدَا اِصْلَاحًا يُّوَفِّقِ اللّٰهُ بَيْنَهُمَا اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيْمًا خَبِيْرًا (النساء 35:4)

اگر تم کو دونوں (میاں بیوی) میں باہم دشمنی کا ڈر ہو تو ایک فیصلہ کرنے والا اس مرد کے لوگوں میں سے، ایک فیصلہ کرنے والا اس عورت کے لوگوں میں سے مقرر کرو اگر دونوں اصلاح چاہیں گے تو اللہ ان میں موافقت کر دے گا بے شک اللہ جاننے والا خبردار ہے۔

پس اسلام میں عورت کو طلاق دینا کوئی زیادتی اور ظلم نہیں۔ جہاں مرد کو علیحدگی اختیار کرنے کا حق ہے وہاں عورت کو بھی حق حاصل ہے طلاق اور خلع دونوں عائلی زندگی کے لیے ضروری ہیں اگر ایک دوسرے سے علیحدگی کی اجازت نہ ہوتی تو عائلی زندگی ایک جہنم کی صورت اختیار کر لیتی۔ لہٰذا اسلام نے بعض وجوہ کی بناء پر ایک دوسرے سے الگ ہونے کی اجازت دے کر ہر قسم کے شر سے محفوظ کر دیا ہے گویا طلاق اور خلع دونوں اپنے اندر رحمت کا پہلو لیے ہوئے ہیں۔

عورت کو مارنا

اعتراض: مرد کا عورت کو بعض صورتوں میں مارنا شاخت (Schacht)، (ترک اسلام دھرم پال سوال 99)

جواب: اسلام بیوی سے حسن سلوک کی تعلیم دیتا ہے ارشاد الٰہی ہے۔

وَعَاشِرُوْهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ (النساء 19:4)

ان سے اچھا سلوک کرو۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم عورتوں سے حسن سلوک اور بھلائی کی وصیت کرتے ہوئے فرمایا۔

اِسْتَوْصُوْا بِالنِّسَاءِ خَيْرًا فَاِنَّهُنَّ خُلِقْنَ مِنْ ضِلَعٍ وَاِنَّ اَعْوَجَ شَیْءٍ فِی الضِّلَعِ اَعْلَاهُ فَاِنْ ذَهَبْتَ تُقِيْمُهٗ كَسَرْتَهٗ وَاِنْ تَرَكْتَهٗ لَمْ يَزَلْ اَعْوَجَ فَاسْتَوْصُوْا بِالنِّسَآءِ (بخاری باب الوصاۃ بالنساء)

تم کو عورتوں سے بھلائی کی وصیت کرتا ہوں۔ کیونکہ وہ پسلی سے پیدا کی گئی ہے اور پسلی میں سب سے ٹیڑھا حصہ اوپر والا ہے۔ لہٰذا تم اس کو سیدھا کرنا چاہو گے تو توڑ ڈالو گے اگر چھوڑ دو گے تو ہمیشہ کے لیے کجی رہ جائے گی اس لیے عورتوں کے متعلق نصیحت قبول کرو۔

فرمایا:

اَكْمَلَ الْمُؤْمِنِيْنَ اِيْمَانًا اَحْسَنُهُمْ خُلُقًا وَخِيَارُكُمْ لِنِسَآئِهِمْ (ترمذی باب مَاجَآءَ فِی حَقِّ الْمَرْاَةِ عَلٰی زَوْجِهَا)

ایمان میں سب سے کامل ترین وہ ہے جو اپنے اخلاق میں سب سے اچھا ہو اور تم میں بہترین وہ ہے جو اپنی بیوی کے لیے اچھا ہو۔

فرمایا:

خَيْرُكُمْ خَيْرُكُمْ لِاَهْلِهٖ (مشکوٰۃ المصابیح کتاب النکاح فی عشرۃ النکاح الفصل الثانی)

تم میں بہترین وہ شخص ہے جو اپنی بیویوں سے نیک سلوک کرے۔ اسلام نے جہاں بیویوں سے اچھا سلوک کرنے کی تعلیم دی ہے وہاں ظلم وتعدی کرنے سے بھی روکا ہے۔ ارشاد الٰہی ہے۔

يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اِنَّ مِنْ اَزْوَاجِكُمْ وَ اَوْلَادِكُمْ عَدُوًّا لَّكُمْ فَاحْذَرُوْهُمْ وَاِنْ تَعْفُوْا وَتَصْفَحُوْا وَتَغْفِرُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ (التغابن 14:64)

اے لوگو! جو ایمان لائے ہو تمہاری بیویوں میں سے اور تمہاری اولاد میں سے بعض تمہارے دشمن ہیں سو ان سے بچتے رہو اگر تم معاف کرو اور درگزر کرو اور بخش دو تو اللہ بخشنے والا رحم کرنے والا ہے۔

قرآن مجید نے جہاں تک تحمل و بردباری سے کام لینے کی تعلیم دی ہے کہ اگر ان کی بعض حرکات ناپسند بھی ہوں تب بھی تحمل سے کام لینا چاہیے ارشاد الٰہی ہے۔

فَاِنْ كَرِهْتُمُوْهُنَّ فَعَسٰۤى اَنْ تَكْرَهُوْا شَيْئًا وَّ يَجْعَلَ اللّٰهُ فِيْهِ خَيْرًا كَثِيْرًا (النساء 19:4)

اگر تم انہیں ناپسند کرتے ہو تو ہوسکتا ہے کہ تم ایک چیز کو ناپسند کرو اور اللہ اسی میں بہت سی بھلائی رکھ دے۔

قرآن مجید میں جہاں عورتوں کو طلاق دینے کا ذکر ہے وہاں مردوں کو ہدایت کی ہے کہ عورتوں پر ظلم وتعدی نہ کی جائے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

وَلَا تُمْسِكُوْهُنَّ ضِرَارًا لِّتَعْتَدُوْا وَمَنْ يَّفْعَلْ ذَالِكَ فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَهٗ وَلَا تَتَّخِذُوْا اٰيَاتِ اللّٰهِ هُزُوًا (البقرہ2:231)

اوران کودکھ دینے کے لیے نہ روک رکھوتا کہ تم زیادتی کرواور جوایسا کرتا ہے وہ اپنی جان پر ظلم کرتا ہے۔اللہ کی باتوں سے ہنسی نہ کرو۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں۔

لَا يَجْلِدُ اَحَدُكُمْ اِمْرَاَتَهٗ جَلْدًا اَمَتَكَ ثُمَّ يُجَامِعُهَا فِي الْيَوْمِ الْاٰخِرِ (بخاری باب ما یکرہ من ضرب النساء)

تم میں سے کوئی اپنی بیوی کواس طرح نہ پیٹنا شروع کردے جس طرح غلام کو پیٹا جاتا ہے پھر دوسرے دن جنسی میلان کو پورا کرنے کے لیےاس کے پاس پہنچے۔

لَا تَضْرِبَنَّ ظَعِيْنَتَكَ ضَرْبَكَ اَمَتَكَ (مشکوٰۃ۔ص282)

اپنی بیوی کولونڈی کی طرح ہرگز نہ پیٹو۔

لَا تَضْرِبِ الْوَجْهَ وَلَا تُقَبِّحْ وَلَا تَهْجُرْ اِلَّا فِي الْبَيْتِ (مشکوٰۃ باب عشرۃ النساء)

نہ ان کے چہرے پر مارواور نہ برا بھلا کہواور نہ علیحدگی اختیار کرواگراس کا موقع بھی آئے تو یہ گھر ہی میں ہو۔

یہ ہے بیوی سے حسن سلوک کرنے کی تعلیم لیکن اگر بیوی سے ایسی حرکت سرزد ہو جائے جو اخلاقی لحاظ سے ٹھیک نہ ہوتو ایسی حالت میں اسلام نے اصلاح کے لیے سرزنش کی ضرور ہدایت کی ہے ارشاد الٰہی ہے۔

وَالّٰتِيْ تَخَافُوْنَ نُشُوْزَهُنَّ فَعِظُوْهُنَّ وَاهْجُرُوْهُنَّ فِي الْمَضَاجِعِ وَاضْرِبُوْهُنَّ (النساء4:34)

اور جن عورتوں کی سرکشی کا تمہیں ڈر ہو۔توان کونصیحت کرواورخواب گاہوں میں ان کوالگ کردواوران کو مارو۔

عورت کے نشوز (سرکشی) کی صورت میں تین علاج بیان کیے ہیں اول اول جب نشوز ظاہر ہو۔صرف وعظ ونصیحت پر اکتفا کیا جائے اگر نصیحت سے قائل نہ ہوتو پھر کسی قدر سختی کا برتاؤ کرنا چاہیے۔اس کی صورت یہ بیان کی ہے کہ ان کواپنی خواب گاہوں سے الگ کر دیا جائے۔یعنی اظہار محبت کے طریقے چھوڑ دیئے جائیں۔اگر وہ اس صورت سے بھی اپنی اصلاح نہیں کرتی اور اپنی غیر اخلاقی حرکات سے باز نہیں آتی تو پھر عائلی زندگی کو بہتر بنانے کے لیے اس کو مارنا ضروری ہو جاتا ہے۔ایسی احادیث موجود ہیں جن سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ بدنی سزا کی اجازت صرف اس صورت میں جب کہ بیوی کا چلن مشتبہ ہو۔یہ سزا صرف عفت کی حفاظت کے لیے ہے عورت کا جوہر اس کی عفت ہے اس کی حفاظت از بس ضروری ہے۔اگر بیوی عفیفہ نہ ہوتو اولاد کا چلن تباہ ہو جاتا ہے۔اگر اولاد کا چلن خراب ہو یہ صرف اس خاندان کے لیے ہی تباہی کا باعث نہیں بلکہ تمام معاشرہ میں اس کے بداثرات سرایت کر جاتے ہیں۔لہٰذا بیوی کا بدچلن ہونا صرف اس کی اپنی ذات کے لیے ہی مضر نہیں ملک تمام معاشرہ متاثر ہوتا ہے۔

مستشرقین کا یہ اعتراض سماجی علم سے عدم واقفیت کا نتیجہ ہے۔معاشرہ کی اصلاح کے لیے سزائیں مقرر کی جاتی ہیں۔تاکہ لوگ ان سزاؤں کی وجہ سے ایسی حرکات نہ کریں جن کی وجہ سے معاشرہ میں بگاڑ پیدا ہو سکتا ہے۔دنیا کے ہر خطے میں سزائیں مقرر ہیں۔وہ سزائیں ظلم نہیں بلکہ ان سزاؤں کا مقرر کرنا بڑے بگاڑ سے بچنے کے لیے ضروری ہے عورت کو ضرب (مارنا) اسی زمرہ کی سزاؤں میں شامل ہے۔جو دنیا کے ہر خطے میں رائج ہیں۔

دھرم پال نے اپنی کتاب ترک اسلام میں یہ اعتراض ان الفاظ میں کیا ہے"اگر کوئی عورت بدکاری کرے تو اس کو پیٹو اور گھر میں قید رکھو کہ مر جائے بدکار مرد کو عورت جوتے کیوں نہ لگائے۔عورت غلاموں کی طرح ملکیت تصور کی گئی ہے۔(ترک اسلام سوال 99)

اس سوال کا جواب اصولی طور پر دیا جا چکا ہے۔مذکورہ سوال پر مزید عرض یہ ہے۔قرآن مجید میں آتا ہے۔

وَالّٰتِي يَأْتِينَ الْفَاحِشَةَ مِنْ نِّسَآئِكُمْ فَاسْتَشْهِدُوْا عَلَيْهِنَّ اَرْبَعَةً مِّنْكُمْ فَاِنْ شَهِدُوْا فَاَمْسِكُوْهُنَّ فِي الْبُيُوْتِ حَتّٰى يَتَوَفّٰهُنَّ الْمَوْتُ اَوْ يَجْعَلَ اللّٰهُ لَهُنَّ سَبِيْلًا ۞ وَالَّذٰنِ يَاْتِيٰنِهَا مِنْكُمْ فَاٰذُوْهُمَا فَاِنْ تَابَا وَاَصْلَحَا فَاَعْرِضُوْا عَنْهُمَا اِنَّ اللّٰهَ كَانَ تَوَّابًا رَّحِيْمًا (النساء4:15,16)

اور تمہاری عورتوں میں سے جو بے حیائی کا ارتکاب کریں تو اپنے میں سے چار گواہ ان کے خلاف لاؤ سو اگر وہ گواہی دیں تو ان کو گھر میں روکے رکھو جہاں تک کہ ان کو موت آ جائے یا اللہ ان کے لیے کوئی راہ نکال دے اور جو دو تم میں سے اس کا ارتکاب کریں تو ان کو سزا دو پھر اگر وہ توبہ کریں اور اصلاح کریں تو ان دونوں سے اعراض کرو اللہ توبہ قبول کرنے والا رحم کرنے والا ہے۔

اس آیت میں الفاحشہ سے مراد مبادی فاحشہ ہے کیونکہ زنا کی سزا سورہ نجم میں سو کوڑے مقرر ہیں۔ یہاں عورت کو جو فحش کی وجہ سے گھر میں روکے رکھنے کا حکم دیا ہے یہاں الفاحشہ سے مراد مبادیات زنا ہے۔ عربی میں الفاحشہ کا لفظ زنا کے علاوہ بھی کسی ناگوار فعل یا قول پر بولا جا سکتا ہے ایک حدیث میں ہے جب حضرت عائشہ نے ان یہودیوں کو جنہوں نے رسول کریم ﷺ سے توہین آمیز الفاظ کہے کچھ سخت الفاظ کہے تو حضرت رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔

لان اللہ لا یحب الفحش

اللہ تعالیٰ فحش کو پسند نہیں کرتا یہاں فحش سے مراد صرف سخت گوئی ہے۔ لہٰذا آیت مذکورہ میں الفاحشہ سے مراد صرف مبادی الفاحشہ (زنا) ہے۔

اس آیت میں ایسی عورت جس سے مبادی زنا کا ارتکاب ہو تو اس کے لیے سزا مقرر کی ہے کہ اس کو گھر میں روکے رکھو جب تک وہ اپنی اصلاح نہ کرے اسلام نے عورتوں کو دیگر تمام مذاہب اور تہذیبوں کے مقابلے میں زیادہ حقوق دیئے ہیں اور ان کا رتبہ بحیثیت انسانیت مرد کے برابر قرار دیا ہے اس آیت میں ایک مسلمان عورت پر ایک اہم ذمہ داری عائد کی ہے کہ وہ عفت اور پاک دامنی میں دوسری تمام عورتوں سے بڑھ کر ہو۔ اس عفت اور پاک دامنی کی حفاظت کے لیے گھر میں روک رکھنے کا حکم دیا گیا ہے۔ یہ اس کے لیے سزا نہیں ہے بلکہ ذمہ داری کا احساس پیدا کرنے کے لیے یہ حکم دیا گیا ہے عورت کی سب سے بڑی ذلت اس کی عفت پر سیاہ دھبہ لگنا ہے اسلام نے اس کی حفاظت کی پھر یہ حکم دائمی نہیں بلکہ اصلاح کے ساتھ مشروط کر دیا اگر عورت اصلاح کر لے تو اس سے یہ پابندی اٹھا لی جائے گی گھر میں روکے رکھنے کی پابندی اس وجہ سے بھی سزا نہیں کہلا سکتی کہ عورت کا دائرہ کار ہی گھر ہے۔ اس کو اس کے دائرہ کار میں رکھنا کوئی سزا نہیں۔

دھرم پال نے اس ضمن میں یہ اعتراض بھی اٹھایا ہے کہ اگر مرد بدکاری کرے تو عورت مرد کو جوتیاں مارے کہنے کا مقصد یہ ہے کہ اسلام نے عورت کو تو سزا دی ہے لیکن مرد سے فحش ظاہر ہو تو اس کی سزا مقرر نہیں کی۔ اسلام نے اگلی آیت نمبر 16 میں اس اعتراض کو دور کر دیا ہے ارشاد الٰہی ہے۔

وَالَّذٰنِ يَاْتِيٰنِهَا مِنْكُمْ فَاٰذُوْهُمَا

اور جو دو تم میں سے اس کا ارتکاب کریں تو ان کو سزا دو۔

لہٰذا اسلام نے مرد اور عورت دونوں کے لیے سزا مقرر کر دی ہے عورت کی سزا تو مقرر کر دی ہے لیکن مرد کی سزا کی کیفیت بیان نہیں کی اور وہ حالات پر چھوڑ دی گئی ہے۔ سزا اس مرد کو بھی ملے گی جس سے مبادی فحش ظاہر ہوگا۔ اس کو سزا اس کے حالات کے مطابق دی جائے گی۔ گھر میں روکے رکھنے کی سزا مرد کے لیے اس لیے تجویز نہیں کی۔ کیونکہ مرد نے گھر کے نان ونفقہ کے لیے کسب ومحنت کرنی ہے۔

آخر میں دھرم پال نے اسلام پر یہ اعتراض کیا ہے کہ اسلام میں عورت کو غلاموں کی طرح ملکیت تصور کیا گیا ہے۔ اسلام عورت کو

غلاموں کی طرح ملکیت تصور نہیں کرتا۔ بلکہ مرد کے برابر حقوق دیئے ہیں پھر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بیوی کو گھر کی راعیہ (مالکہ) کا مرتبہ دیا ہے۔ اس سے بڑھ کر اور کیا رتبہ ہوسکتا ہے پھر مرد کو حسن سلوک کی تلقین کی۔ ارشاد الٰہی ہے۔

عَاشِرُوْهُنَّ بِالْمَعْرُوْف

ان سے بہتر سلوک کرو

آیئے ذرا معترضین کے گھر کی خبر لیں کہ ان کے مذاہب میں عورت کو کیا رتبہ دیا گیا ہے۔

دیانند جی نے مرد اور عورت کی باہمی جنسی تعلق کا ایک طریقہ بتایا ہے وہ نیوگ ہے نیوگ یہ ہے کہ اگر کسی عورت کا شوہر مر جائے تو اس بیوہ کو دوسرا نکاح کرنے کی اجازت نہیں ہے اگر وہ چاہے تو کوئی غیر مرد سے ہم بستر ہو کر اولاد پیدا کر لے اور اپنی شہوت کو تسکین دیتی رہے اس حکم کو یہیں تک محدود نہیں کیا بلکہ ایک شوہر والی عورت کو بھی اجازت دے دی ہے کہ اگر اس کے شوہر سے اولاد پیدا نہ ہو تو وہ کسی غیر مرد سے ہم بستر ہو کر نطفہ لے لے اور اولاد حاصل کر لے وہ عورت دس مردوں سے علیحدہ علیحدہ ہم بستر ہو کر نطفہ لے سکتی ہے اس طرح جو اولاد پیدا ہو گی وہ اس خاوند کی ہو گی جس کی ہم بستری سے اولاد پیدا نہیں ہوئی۔ (تفصیل کے لیے دیکھیے ستیارتھ پرکاش صفحہ 138,137)

ہندو دھرم میں عورت کے لباس عفت کو اس طرح تار تار کیا ہے۔ نیوگ کی تعلیم کو پڑھ کر ایک سلیم مزاج پر ناگواری اور کراہت کے آثار ظاہر ہو جاتے ہیں۔

عورت معاشرہ کا ایک اہم ترین رکن ہے وید نے اس کو قعر مذلت میں گرا کر اس سے تمام معاشرتی حقوق چھین لیے ہیں چنانچہ رگوید منڈل 10 سوکت 95 منتر 15 میں لکھا ہے۔ ''عورتوں کے ساتھ محبت نہیں ہوسکتی عورتوں کے دل فی الحقیقت بھیڑیوں کی بھٹ ہیں۔''

دوسری جگہ آتا ہے۔

''اندر (آریوں کے ایشور) نے خود یہ کہا ہے کہ عورت کا دل استقلال سے خالی ہے اور وہ عقل کی رو سے ایک نہایت ہلکی چیز ہے۔ (رگ وید منڈل سوکت 33 منتر 17)

عورت کا وجود صرف اس لیے ہے کہ بچے دیں۔ ان کی پرورش کریں اور ہر روز خانہ داری کے کام میں مصروف رہے۔ (منو نواں باب 27)

''کسی لڑکی یا نوجوان عورت یا بڈھی عورت کو کبھی گھر میں بھی کام اپنے اختیار سے نہیں کرنا چاہیے۔ طفولیت میں عورت کو باپ کا تابع رہنا چاہیے اور جوانی میں شوہر یا بیٹوں کا اگر وہ انہیں چھوڑ کر چلی جائے تو اپنے اور اپنے شوہر دونوں کے خاندان پر بدنامی کا دھبہ ڈالے گی۔ (منو شاستر پانچواں باب 148,147)

ہندو بغیر کسی شرم و حیا کے شریف عورتوں کو سوشیر دنی اور پرتھوشرونی (خوبصورت اور فربہ سرین والی) کہہ کر پکارتے تھے ماں اپنی بیٹی کو اس نام سے پکارتی تھی شری سوت۔ ''قدیم زمانہ میں جب دیوتاؤں اور اسروں کی جنگ ہوئی دیوتاؤں نے دیتی کے سب بیٹے مار ڈالے۔ تب دیتی نے نہایت حسرت و غم سے اپنی بیٹی سے کہا ''پتر آرتھا تو سوشرونی نیتا نیتے اندریا اے سوشرونی'' تو ایک بیٹے کے پیدا کرنے کی تمنا کر کے ریاضت کرنے کے لیے جنگل میں چلی جا۔

عورت کے بارے میں اسلام کی تعلیم اختصار کے ساتھ بیان کی جا چکی ہے ہندو دھرم کی تعلیم بھی پیش کر دی ہے قارئین اندازہ لگا سکتے ہیں کہ کس مذہب نے عورت کو بلند رتبہ دیا ہے اور کس مذہب نے عورت سے تمام حقوق چھین لیے ہیں اور غلامی کی زندگی بسر کرنے کا حکم دیا ہے۔

موسوی شریعت:

موسوی شریعت نے عورتوں کو مردوں کا ہمیشہ محکوم اور غلام بنایا ہے۔ چنانچہ لکھا ہے۔

''اور خدا نے کہا کہ میں تیرے دردِ حمل کو بڑھاؤں گا تو درد کے ساتھ بچہ جنے گی اور تیری رغبت اپنے شوہر کی طرف ہوگی اور وہ تجھ پر حکومت کرے گا۔'' (پیدائش باب 3)

شادی سے پہلے عورت اپنے باپ یا ولی کی ملکیت ہوتی تھی اس وجہ سے لڑکی کو اغوا کرنے والا قانوناً لڑکی کو جرمانہ ادا کرتا تھا چنانچہ خروج 16:22 میں لکھا ہے۔

''اگر کوئی ایک چھوکری کو جو اس کی منگیتر نہیں فریب دے کر اس سے مباشرت کرے وہ البتہ اس کی قیمت دے کر اس سے نکاح کرے اگر اس کا باپ ہرگز راضی نہ ہو کہ اسے کو دے تو وہ کنواریوں کے اجر کے موافق اسے نقدی دے۔''

اس کی وضاحت کتاب استثناء 29,28,22 میں کی گئی ہے۔

اگر کوئی آدمی کنواری کو پاوے جو کسی کی منگیتر نہ ہو اور اسے پکڑ کے اس سے ہم بستر ہو اور وے پکڑے جاویں تو وہ مرد اس کے ساتھ ہم بستر ہوا لڑکی کے باپ کو پچاس مثقال چاندی دے اور وہ اس کی جورو ہو کیونکہ اس نے اسے رسوا کیا اور اپنی زندگی بھر اسے طلاق نہ دے۔

اگر معترضین نے اپنے مذہبی ادب کا مطالعہ کر لیا ہوتا تو وہ کبھی بھی اسلام کی مقدس تعلیم پر ہرگز اعتراض نہ کرتے۔ اسلام وہ دین ہے جس نے عورت کو رتبہ ذلت سے اٹھا کر رتبہ شرف پر لا کھڑا کیا اور انسانیت کے لحاظ سے مرد اور عورت دونوں کو ایک ہی مقام عطا کیا۔ آج دورِ حاضر میں نسوانی حقوق کی آواز سنی جاتی ہے۔ دراصل یہ اسی آواز کی بازگشت ہے جو اسلام نے آج سے چودہ سو سال پہلے بلند کی تھی اور عملی رنگ میں عورتوں کو وہ حقوق عطا کر دیئے تھے۔ اسلام نے حقوق و فرائض کا تعین کیا۔ نہ ان میں افراط ہے اور نہ تفریط۔ اعتدال کی راہ اختیار کی۔ جس سے معاشرہ میں لگاڑ نہیں پیدا ہو سکتا۔

......☆......

پردہ

اعتراض: عورتیں پردہ کریں مرد کیوں نہ کریں (دھرم پال ترک اسلام سوال 2 پر) دیانند نے بھی اپنی کتاب ستیارتھ پرکارش کے باب چودھویں سوال 127 میں کیا ہے لکھتا ہے۔ ''یہ تو ظلم ہے کہ عورت کو گھر میں قید کر کے رکھا جائے اور مرد کھلے پھریں۔ کیا عورتوں کا دل نہیں چاہتا ہوگا کہ یہ صاف ہوا میں سانس لیں فراخ جگہ پھریں اور جہاں اس سوال میں نکاح پر اعتراض کیا ہے۔ اس اعتراض کا جواب الگ دیا جائے گا۔ جہاں تعدادِ ازدواج کے اعتراض پر جواب دیا جائے گا وہاں ہی حضرت زینب کی شادی پر بحث کریں گے۔

پردہ پر اعتراض متعدد مستشرقین نے بھی کیا ہے۔

جواب: دھرم پال، دیانند اور دیگر معترضین نے پردہ صرف عورتوں کے لیے قرار دیا ہے۔ پردہ کے بعض ایسے بھی پہلو ہیں جس میں مرد اور عورت دونوں شامل ہیں۔ پردہ کا مقصد مرد اور عورت دونوں کی عفت کے جوہر کی حفاظت ہے تاریخ اس بات پر شاہد ہے جب معاشرہ میں

فحاشی پھیل جاتی ہے تو معاشرہ میں بگاڑ پیدا ہو جاتا ہے اس بگاڑ اور فساد کے انسداد کے لیے پردہ کے احکام نازل ہوئے وہ احکام جن میں مرد اور عورت دونوں شامل ہیں۔

غض بصر (آنکھوں کو نیچا رکھنا) سب سے پہلا حکم مردوں اور عورتوں کو دیا ہے وہ غض بصر (آنکھوں کو نیچے رکھنا) ہے ارشاد الٰہی ہے۔

قُلْ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ يَغُضُّوْا مِنْ اَبْصَارِهِمْ وَيَحْفَظُوْا فُرُوْجَهُمْ ذٰلِكَ اَزْكٰى لَهُمْ (نور 30:24)

مومنوں کو کہہ دو اپنی نظریں نیچی رکھیں اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کیا کریں یہ ان کے لیے زیادہ پاکیزہ ہے۔

عورتوں کے لیے آتا ہے۔

قُلْ لِّلْمُؤْمِنٰتِ يَغْضُضْنَ مِنْ اَبْصَارِهِنَّ وَيَحْفَظْنَ فُرُوْجَهُنَّ (نور 31:24)

اور مومن عورتوں کو کہہ دیجیے کہ وہ اپنی آنکھیں نیچے رکھیں اور اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کریں۔

مذکورہ آیات میں مرد اور عورت دونوں کو غض بصر اور حفاظت فروج (شرم گاہوں) کا حکم دیا گیا ہے غض بصر سے انسان کے اندر ایسی قوت پیدا ہو جاتی ہے پھر اگر بدی کے لیے بڑی ترغیب بھی ہو تو وہ اس کا مقابلہ کر سکتا ہے گویا عفت کی حفاظت کی قوت پیدا کرنے کا پہلا ذریعہ ہے جب انسان اپنی نگاہ نیچے رکھے گا تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ شہوت کی نظر سے عورتوں کے دیکھنے سے بچ جائے گا اور اس کے اندر عفت کی قوت مضبوط سے مضبوط تر ہوتی جائے گی۔

پردہ کے اس پہلو میں مرد اور عورت دونوں شامل ہیں۔

لباس اور ستر کے احکام:

پردے کا ایک پہلو لباس اور ستر ہے اس پہلو میں مرد اور عورت دونوں شامل ہیں۔ اسلام نے لباس اور ستر کے احکام کے ذریعے برہنگی اور عریانی کا خاتمہ کیا ہے مرد اور عورت دونوں کے لیے ستر کی حدود مقرر کر دی ہیں عرب جاہلیت میں غسل اور قضائے حاجت میں پردہ کرنا غیر ضروری تھا کعبہ کا طواف مرد اور عورتیں برہنہ کیا کرتی تھیں۔ ابن عباس مجاہد، طاؤس اور زہری کی متفقہ روایت ہے کہ عرب کعبہ کا طواف برہنگی کی حالت میں کیا کرتے تھے مسلم کتاب التفسیر میں عرب کی یہ رسم بیان کی گئی ہے کہ ایک عورت برہنہ ہو کر طواف کرتی پھر حاضرین سے کہتی کہ کون مجھے ایک کپڑا دیتا ہے کہ میں اس سے اپنا بدن ڈھانکوں اس طرح سائلہ کو ایک کپڑا دینا کار ثواب سمجھا جاتا۔

اسلام نے انسان کو ثقافت کا درس دیا ارشاد الٰہی ہے۔

يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ قَدْ اَنْزَلْنَا عَلَيْكُمْ لِبَاسًا يُّوَارِيْ سَوْاٰتِكُمْ وَرِيْشًا (الاعراف 26:7)

اے آدم کی اولاد ہم نے تم پر لباس اتارا جو تمہارے عیبوں کو ڈھانکے اور زینت ہو۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ملعون وہ جو اپنے بھائی کے ستر پر نظر ڈالے (احکام القرآن للجصاص) پھر فرمایا کوئی مرد کسی مرد اور کوئی عورت کسی عورت کو برہنہ نہ دیکھے (مسلم باب تحریم النظر الی العورات) پھر فرمایا ''اللہ کی لعنت ہے ان عورتوں پر جو لباس پہن کر بھی ننگی رہیں۔'' حضرت عمر کا ارشاد ہے کہ اپنی عورتوں کو ایسے کپڑے نہ پہناؤ جو جسم پر اس طرح چست ہوں کہ سارے جسم کی ہیئت نمایاں ہو جائے (المبسوط کتاب الاستحسان)

تخلیہ (علیحدگی اور لمس (چھونا) کی ممانعت:

اسلام میں بیوی کے علاوہ کسی مرد اور عورت کو ایک تخلیہ (علیحدگی) اور لمس (چھونے) کی اجازت نہیں دیتا کیونکہ تخلیہ اور لمس دونوں بدکاری کا رستہ ہیں حدیث میں آتا ہے عقبہ بن عامر روایت بیان کرتے ہیں۔

اِنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ قَالَ اِیَّاکُمْ وَالدُّخُوْلَ عَلَی النِّسَآءِ فَقَالَ رَجُلٌ مِنَ الْاَنْصَارِ یَارَسُوْلَ اللّٰہِ اَفَرَاَیْتَ الْحَمْوَ قَالَ الْحَمْوُ الْمَوْتُ (ترمذی)

کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا خبردار عورتوں کے پاس تنہائی میں نہ جاؤ۔

انصاری میں سے ایک شخص نے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! دیور اور جیٹھ کے متعلق کیا حکم ہے فرمایا ''وہ موت'' ہے تخلیہ میں عورت اور مرد دونوں ایک ہی حکم میں آتے ہیں۔

فرمایا شوہروں کی غیر موجودگی میں عورتوں کے پاس نہ جاؤ کیونکہ شیطان تم میں سے کسی کے اندر خون کی طرح گردش کر رہا ہے۔
(ترمذی باب کراھیۃ الدخول علیٰ المغیبات)

عمرو بن عاص کی روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم کو عورتوں کے پاس ان کے شوہروں کی اجازت کے بغیر جانے سے منع فرمایا۔(ترمذی باب فی النھی عن الدخول علیٰ النساء الا باذن ازواجھن)

یہ پردے کا وہ پہلو ہیں جن میں مرد اور عورت دونوں شامل ہیں معترضین یہ ذہن نشین کریں کہ انہوں نے حجاب (پردہ) کے مفہوم کو محدود کر کے صرف عورت کے لیے متعین کر دیا ہے۔

(عورتوں کے بارے میں احکام حجاب) حجاب کی بعض صورتیں ایسی ہیں جو صرف عورتوں کے لیے مختص ہیں وہ یہ ہیں۔

اصلی جگہ اس کا گھر ہے:

عورت کا دائرہ کار اس کا گھر ہے اور وہ گھر کی مالکہ ہے اس لیے سب سے پہلے عورت کو یہ حکم دیا ہے وہ بلا ضرورت اپنے گھروں سے باہر نہ نکلیں۔ارشاد الٰہی ہے۔

وَقَرْنَ فِیْ بُیُوْتِکُنَّ (الاحزاب 33:33)

اور وہ اپنے گھروں میں ٹھہری رہیں۔

اس حکم سے یہ ہرگز مراد نہیں کہ عورتیں گھر میں ہی مقید بن کر رہ جائیں اور وہ باہر نہیں جا سکتیں۔احادیث سے یہ واضح ہے کہ عہد رسول کریم ﷺ میں عورتیں گھر کے کاموں کے علاوہ وہ زندگی کے دوسرے کاموں میں بھی حصہ لیتی تھیں۔

عہد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں عورتیں مسجد میں نماز ادا کرنے جاتی تھیں۔(کتاب الاذان باب 162 خُرُوْجُ النِّسَآءِ اِلَی الْمَسَاجِدِ بِالَّیْلِ الْغَلَسِ وَ بَابُ صَلٰوۃِ النِّسَآءِ خَلْفَ الرِّجَالِ)

میدان جنگ میں جا کر اور سپاہیوں کے ساتھ مل کر مختلف قومی کاموں کو سرانجام دیا مثلاً میدان جنگ میں وہ کھانے پینے کی چیزیں لے جاتیں۔(بخاری کتاب 56 الجہاد والسیر باب 66 حمل النساء القرب الی الناس فی الغزو)

بیماروں کی خبرگیری اور زخمیوں کی مرہم پٹی کرتی۔(بخاری کتاب الجہاد والسیر باب 67 مداوۃ النساء الجرحی فی الغزو)

زخمیوں اور مقتولین کو میدان جنگ میں سے اٹھا کر لے جاتیں۔(بخاری کتاب 56 الجہاد والسیر باب 68 رد النساء الجرحی والقتلی)

جب ضرورت پڑتی تو خود ہاتھ میں تلوار لے کر میدان جنگ میں نبرد آزما ہو جاتیں۔(بخاری کتاب 56 الجہاد والسیر باب 62 جہاد النساء و باب 62 غزوہ المراۃ فی النحر و باب 65 غزوہ النساء مع الرجال)

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بیوی حضرت زینب کھالیں تیار کرتی تھیں اوران سے جو آمدن ہوتی تو ان کو خیراتی کاموں میں خرچ کر دیتی تھیں۔(فتح الباری جلد 3 صفحہ 228)

عورتیں اپنے خاوندوں کی امداد کے لیے کھیتی باڑی کا کام بھی انجام دیتی تھیں۔(بخاری کتاب 67 النکاح باب 108 باب الخیرۃ۔
ضیافت کے موقعہ پر مرد مہمانوں کو کھانا بھی دیتی تھیں۔(بخاری کتاب النکاح باب 78 قیام المراۃ علی الرجال فی العرس و خدمتهم بالنفس)

تجارت میں بھی حصہ لیتی تھیں۔(بخاری کتاب الجمعۃ باب 40 قول اللہ تعالیٰ فاذا قضیت الصلوٰۃ فانتشروا فی الارض وابتغوا من فضل اللہ)

مردوں سے بیع وشرا کرتیں۔(بخاری کتاب 34 کتاب البیوع و الشراء مع النساء)

یہ حدیثیں ظاہر کرتی ہیں "قَرْنَ فِي الْبُيُوْتِ" کا حکم ہونے کے باوجود عورتیں عہد نبوی میں زندگی کے دیگر شعبوں میں مردوں کے ساتھ شامل ہوتیں اور کام انجام دیتیں گویا گھر میں ٹھہرنے سے ہرگز یہ مراد نہیں کہ وہ تمام زندگی گھر میں ہی مقید ہو کر رہ جائیں۔

قَرْنَ فِی بُیُوْتِكُنَّ

(گھر میں ٹھہریں) کے حکم میں صرف عورتوں کا مخصوص دائرہ کار گھر ٹھہرایا ہے ان کا اصل گھر میں ٹھہر کر بچوں کی دیکھ پرداخت اور افراد خانہ کے لیے کھانا وغیرہ تیار کرنا ہے لیکن ضرورت کے وقت گھر سے باہر جا کر زندگی کے دوسرے شعبوں میں شریک ہوسکتی ہیں۔

معترضین غور کریں کتنی طبعی اور فطرتی تقسیم ہے کہ اول عورت گھر میں کام کریں اور مرد نان ونفقہ کے لیے محنت اور کسب کرے۔ لیکن ضرورت کے وقت عورت زندگی کے دوسرے شعبوں میں شامل ہوسکتی ہیں اگر اس تقسیم کار میں غور وفکر کریں تو واضح ہو جائے گا یہی تقسیم عائلی زندگی کے لیے بہتر ہے۔

معترضین نے جو اسلام پر عورت کو گھر میں مقید کر رکھنے کا اعتراض کیا ہے سراسر غلط اور باطل ہے۔

گھر سے باہر کا پردہ:

جیسا کہ اوپر بیان کیا ہے کہ کبھی عورت کو عائلی معاشرتی، معاشی مسائل یا دیگر وجوہ کی بناء پر گھر سے بھی باہر جانا پڑتا ہے تو اسلام نے گھر سے باہر نکلنے کے آداب سکھائے ہیں اور اظہار محاسن سے منع کیا ہے اور ستر (حجاب) کا حکم دیا ہے ارشاد الٰہی ہے۔

وَلْيَضْرِبْنَ بِخُمُرِهِنَّ عَلٰى جُيُوْبِهِنَّ وَلَا يُبْدِيْنَ زِيْنَتَهُنَّ (النور 24:31)

اور چاہیے کہ اپنی اوڑھنیاں اپنے سینوں پر ڈالیں اور اپنی زینت کو (اور کسی کے سامنے) ظاہر نہ کریں۔

دوسری جگہ آتا ہے۔

يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِّاَزْوَاجِكَ وَبَنٰتِكَ وَنِسَآءِ الْمُؤْمِنِيْنَ يُدْنِيْنَ عَلَيْهِنَّ مِنْ جَلَابِيْبِهِنَّ ذٰلِكَ اَدْنٰٓى اَنْ يُّعْرَفْنَ فَلَا يُؤْذَيْنَ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا (الاحزاب 33:59)

اے نبی! اپنی بیویوں اور اپنی بیٹیوں اور مومنوں کی عورتوں سے کہہ دے کہ اپنی چادریں اپنے اوپر اوڑھ لیا کریں یہ زیادہ قریب ہے کہ وہ پہچانی جائیں تو انہیں ایذا نہ دی جائے اور اللہ بخشنے والا رحم کرنے والا ہے۔

عورت کا ستر یہ ہے کہ اپنے چہرے اور ہاتھوں کے سوا تمام جسم کو اوڑھنی سے لوگوں سے چھپائیں۔

نقاب یا برقع:

ایک اہم سوال یہ ہے کہ کیا عورتوں کو یہ حکم ہے کہ جب وہ اپنی ضروریات کے لیے باہر جائیں تو نقاب یا برقعے اوڑھ لیا کریں۔ باہر جانے کی ضروریات دینی بھی ہوسکتی ہیں اور دنیوی بھی۔ دینی ضروریات میں نماز کا ادا کرنا مسجد میں اور فریضہ حج ادا کرنا ہے۔ احادیث بتاتی ہیں ان ہر دو مواقع پر نقاب یا برقعہ نہیں پہنا جاتا تھا۔ نماز کی حالت میں یہ حکم ہے کہ عورت کا سارا جسم سوائے ہاتھ اور چہرہ کے ڈھکا ہوا ہونا چاہیے۔ (ہدایہ جلد 1 صفحہ 88) شروط الصلوٰۃ میں یہ بھی لکھا ہے کہ ان دو حصوں کے استثناء کی وجہ یہ ہے کہ ان کا کھلا رہنا ضروریات سے ہے۔

حج کے متعلق حدیث میں واضح حکم ہے کہ کوئی عورت دوران حج میں نقاب یا برقع نہ پہنے۔ (بخاری کتاب المناسک باب 23 مایلبس المحرم من الثیاب والاردیۃ الخ)

نقاب اوڑھنا بڑے گھرانوں کی عظمت اور بڑائی کی نشانی سمجھا جاتا ہے اس بڑائی کی نشانی کو ختم کیا گیا ہے ہر ملک کی آبادی کا تقریباً نوے فیصد محنت اور مزدوری پر گزارہ کرتی ہے جس میں عورتوں کو بھی حصہ لینا پڑتا ہے اس لیے ان کے لیے نقاب اوڑھ کر کام کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ لہٰذا اسلام نے نقاب اوڑھنے کی ہرگز تعلیم نہیں دی اسلام عالمگیر مذہب ہے اور قیامت تک لوگوں کی راہنمائی کرنے والا مذہب ہے وہ ایسی تعلیم نہیں دے سکتا جو کسی وقت بھی ساقط کی جاسکے اور ضرورت کے منافی سمجھی جائے۔ نقاب یا برقع محنت کرنے والی عورتوں کی ضروریات کے منافی ہے اس لیے اسلام نے نقاب یا برقع پہننے کی تعلیم نہیں دی۔ یہ صرف بڑے گھرانوں کی عورتوں کی بڑائی کی نشانی ہے اسلام نے اس کو مٹایا ہے یہی اسلام کی فضیلت ہے۔

عورت کے پردہ میں مزید اور بھی کچھ بندشیں لگائی ہیں۔ جو عورت کی عفت کی حفاظت کے لیے ضروری ہیں لیکن دوسرے کاروبار میں کوئی باعث رکاوٹ نہیں وہ یہ ہیں کہ جب عورت گھر سے باہر نکلے تو وہ بناؤ سنگھار کر کے نہ نکلے ارشاد الٰہی ہے۔

وَلَا تَبَرَّجْنَ تَبَرُّجَ الْجَاهِلِيَّةِ الْأُولَىٰ (الاحزاب 33:33)

پہلی جاہلیت کی طرح بناؤ سنگھار نہ دکھاتی پھریں عورتوں کو ایسے انداز سے گفتگو کرنے سے روکا ہے جو فتنہ کا موجب بن سکتا ہے۔

اتَّقَيْتُنَّ وَلَا تَخْضَعْنَ بِالْقَوْلِ فَيَطْمَعَ الَّذِي فِي قَلْبِهِ مَرَضٌ وَقُلْنَ قَوْلًا مَعْرُوفًا (الاحزاب 33:33)

اگر تقویٰ اختیار کرو نرم آواز میں بات نہ کرو ایسا نہ ہو کہ وہ جس کے دل میں بیماری ہے طمع کرے اور نیکی کی بات کہو۔

بعض اوقات زبان تو خاموش ہوتی ہے لیکن عورت اپنے انداز رفتار سے دوسروں کو اپنی طرف جذب کر لیتی ہے۔ اسلام نے اس قسم کے انداز رفتار سے منع فرمایا ہے۔ ارشاد الٰہی ہے۔

وَلَا يَضْرِبْنَ بِأَرْجُلِهِنَّ لِيُعْلَمَ مَا يُخْفِينَ مِنْ زِينَتِهِنَّ (النور 31:24)

اپنے پاؤں کو اس طرح زمین پر نہ ماریں کہ ان کی چھپی ہوئی زینت معلوم ہو جائے اسی طرح خوشبو لگا کر باہر نکلنے سے منع کیا گیا ہے حدیث میں آتا ہے۔

اِذْ شَهِدَتْ اِحْدَاكُنَّ الْمَسْجِدَ فَلَا تَمَسَّنَ طِيْباً (موطا مالک)

جب تم میں سے کوئی عورت مسجد میں جائے تو خوشبو نہ لگائے۔

عریانی و برہنگی:

زمانہ جاہلیت میں عورتیں مردوں کی نظر کا مرکز بننے کے لیے نیم برہنہ لباس زیب تن کرتیں جس طرح آج کل یورپ میں بھی ہے اسلام نے اس عریانی کو اسلامی ستر کے خلاف قرار دیا ہے۔ رسول کریم ﷺ فرماتے ہیں جو عورتیں کپڑے پہن کر بھی ننگی ہیں اور دوسروں کو

رجھائیں اور خود دوسروں پر رجھیں اور بختی اونٹ کی طرح ناز سے گردن ٹیڑھی کر کے چلیں وہ بہشت میں ہرگز داخل نہ ہوں گی نہ اس کی بُو پائیں گی۔(مسلم بَابُ النِّسَاءِ الكَاسِيَاتِ العَارِيَاتِ)

معترضین کی خدمت میں یہ عرض ہے ''پردہ'' عورت کو گھر میں قید رکھنے کا نام نہیں بلکہ عورت کی عفت اور پاک دامنی کی حفاظت کا حصن ہے۔ وہ تمام ذرائع جن سے عفت داغدار ہونے کا اندیشہ تھا۔ان کا سد باب کیا ہے۔دوم پردہ عورتوں کے لیے ہی نہیں بلکہ مردوں کے لیے بھی ہے لیکن دونوں کی نوعیت اور کیفیت میں فرق ہے عورت کی عفت کی حفاظت کے جو ذرائع اسلام نے بیان کیے ہیں۔اسلام پر معترض دیانند نے بھی کچھ بندشیں اپنی کتاب ستیارتھ پرکاش میں لگائی ہیں۔رقمطراز ہے لڑکوں اور لڑکیوں کے پاٹھ شالا ایک دوسرے سے دو کوس دور ہونی چاہیے جو معلّمہ یا معلم یا نوکر چاکر ہوں لڑکیوں کے مدرسہ میں سب عورتیں اور مردانہ مدرسہ میں مرد ہوں زنانہ مدرسہ میں پانچ برس کا لڑکا اور مردانہ پاٹھ شالا میں پانچ برس کی لڑکی بھی نہ جانے پاوے یعنی وہ برہم چاری یا برہم چارنی رہیں تب تک عورت و مرد کے باہمی دیدار، مس، اکیلا رہنے بات چیت کرنے شہوتی کھانے باہم کھیلنے شہوت کا خیال اور شہوتی صحبت ان آٹھ قسم کی زنا کاری سے الگ رہیں۔

دیانند نے مرد اور عورت کے آزادانہ میل جول اور مبادی زنا کاری سے روکا ہے اگر باریک بینی سے دیکھا جائے تو یہ اسلام کے ''نظریہ عفت'' سے سرقہ ہے سب سے پہلے اسلام نے ہی ان تمام مبادات ''زنا کاری سے روکا ہے۔اگر پردہ کی رسم جو اسلام نے قائم کی ہے ختم کر دی جائے تو ان آٹھ قسم کے زنا میں دیدار اور شہوت کے خیال کا کیا حال ہوگا۔

تصویر کا دوسرا رخ:

پردے کا دوسرا رخ بے لگام آزادی نسواں ہے جس پر اہل مغرب فخر کرتے ہیں۔عورتوں کی اس بے لگام آزادی پر مفکرین نے بہت کچھ لکھا ہے اور اس بے لگامی کی وجہ سے مغرب کے معاشرے میں جو بیماریاں پیدا ہوئی ہیں جن سے عائلی اور معاشرتی زندگی تباہ ہوئی ہے۔ان کا ذکر کتب میں موجود ہے۔یہ ایک طویل موضوع ہے صرف تصویر کا دوسرا رخ ظاہر کرنے کے لیے چند حوالہ جات پر اکتفا کیا جاتا ہے۔اس تقابلی مطالعہ سے ہی قارئین کے سامنے اسلام کی حقانیت ظاہر ہو جائے گی۔

ڈاکٹر ایڈتھ ہوکر Edith Hooker اپنی کتاب Law of sex میں لکھتی ہے کہ

''نہایت مہذب اور دولت مند طبقوں میں بھی یہ کوئی غیر معمولی بات نہیں ہے کہ آٹھ برس کی لڑکیاں اپنے ہم عمر لڑکوں سے عشق و محبت کے تعلقات رکھتی ہیں جن کے ساتھ بسا اوقات مباشرت بھی ہو جاتی ہے۔''

اس کا بیان ''ایک سات سال کی چھوٹی سی لڑکی جو ایک نہایت شریف خاندان کی چشم و چراغ تھی خود اپنے بڑے بھائی اور اس کے چند دوستوں سے ملوث ہوئی اور ایک دوسرا واقعہ یہ ہے کہ پانچ بچوں کا ایک گروہ جو دو لڑکیوں اور تین لڑکوں پر مشتمل تھا اور جن کے گھر پاس پاس واقع ہوئے تھے۔باہم شہوانی تعلقات میں وابستہ پائے گئے اور انہوں نے دوسرے کم سن بچوں کو بھی اس کی ترغیب دی ان میں سب سے بڑے بچے کی عمر دس سال کی تھی۔ایک اور واقعہ ایک نو سال کی بچی کا ہے جو بظاہر بڑی حفاظت سے رکھی جاتی تھی اس بچی کو ''متعدد عشاق'' کی منظور نظر ہونے کا فخر حاصل تھا۔(پردہ صفحہ 85 مولانا مودودی صاحب)

انگلستان کے مصنف جارج رائیلی اپنی کتاب تاریخ الفحشاء (History of prostitiution) میں لکھتا ہے۔

''ان عورتوں کی بسر اوقات کا واحد ذریعہ یہی ہے کہ اپنے جسم کو کرایہ پر چلا کر روزی کمائیں ان کے علاوہ ایک بڑی تعداد ان عورتوں کی بھی ہے (اور وہ روز بروز زیادہ ہو رہی ہے) جو اپنی ضروریات زندگی حاصل کرنے کے لیے دوسرے ذرائع رکھتی ہیں اور حتمی طور پر اس کے ساتھ فاحشہ گری بھی کرتی ہیں تاکہ آمدنی میں کچھ اور اضافہ ہو جائے یہ پیشہ اور فاحشات سے کچھ بھی مختلف نہیں ہیں مگر اس کا اطلاق ان پر کیا

نہیں جاتا ہم ان کو غیر پیشہ ور فاحشہ (Amateur prostituets) کہہ سکتے ہیں (بحوالہ پردہ صفحہ 97)

مذکورہ حوالہ جات سے بے لگام آزادی کا یہی نتیجہ ہے کہ معاشرہ میں فحش کاری کی وبا پھیل جاتی ہے پھر اس کا روکنا مشکل ہو جاتا ہے آج مغرب کے لیے یہی مشکل ہے کہ وہ بے لگام آزادی پر قدغن نہیں لگا سکتا۔ اس سے واضح ہو جاتا ہے قرآن مجید نے مرد اور عورت کے درمیان طبعی اختلافات کو مدنظر رکھ کر عورت کے جوہر عفت کی حفاظت کا بندوبست کیا ہے وہی صحیح اور طبعی ہے اسلام نے عورت کو آزادی بھی دی ہے اس پر کچھ پابندیاں بھی عائد کی ہیں تاکہ آزادی بے راہ روی اختیار نہ کر جائے۔

مسلمان لڑکوں کی شہوت پرستی:

اس اعتراض میں پنڈت دیانند نے مسلمان لڑکوں پر آوارہ گردی اور شہوت پرستی کا لزام لگایا ہے۔

مسلمان لڑکوں کی کتاب یعنی قرآن مجید ان کو صراط مستقیم کی تعلیم دیتا ہے ارشاد الٰہی ہے۔

"اِهۡدِنَا الصِّرَاطَ الۡمُسۡتَقِيۡمَ ۙ صِرَاطَ الَّذِيۡنَ اَنۡعَمۡتَ عَلَيۡهِمۡ ۙ غَيۡرِ الۡمَغۡضُوۡبِ عَلَيۡهِمۡ وَلَا الضَّآلِّيۡنَ" (الفاتحة ۵،۷)

(ہمیں سیدھا راستہ دکھا ان لوگوں کا راستہ جن پر تیرے انعام ہوئے نہ ان لوگوں کا جن پر تیرا غضب ہوا اور گمراہ ہوئے) اگر گناہ سرزد ہو جائے تو استغفار کی ہدایت کرتا ہے اور مسلمان لڑکے کو قرآن مجید قیامت کے دن گناہوں کے محاسبے کی بھی یاد دہانی کراتا ہے کہ ایک دن خدا کے سامنے حاضری ہوگی۔ اعمال کا حساب کتاب ہوگا۔ اچھے اعمال والوں کو جنت ملے گی اور بُرے اعمال والوں کو دوزخ۔ یہ یاد دہانی گناہوں سے باز رکھتی ہے الغرض مسلمان لڑکوں کی کتاب ایک ایسا ضابطہ اخلاق بیان کرتی ہے جس پر عمل پیرا ہو کر ایک مسلمان لڑکا با اخلاق زندگی بسر کرتا ہے۔

الزامی جواب: اس کے برعکس جب وید پڑھا جائے تو وہ ہندو لڑکوں کو ان تمام چیزوں سے آگاہ کرتا ہے جن سے جنسی شہوت بھڑکتی ہے۔

ویدوں میں واجی کرن شیپ ہرشن (قوت باہ اور طلاء) کے نسخے، حب اور تسخیر کے منتر موجود ہیں۔

پھر آریہ لڑکوں کی شادی کے موقعہ پر جو منتر پڑھنا وید شاستر اور سنسکار ودھی میں سکھایا گیا ہے وہ مخرب اخلاق ہے۔ اس منتر کے متعلق پنڈت گنگا پرشاد ایم اے اور بابو شیام سندر بی اے وکیل ہائی کورٹ وغیرہ آریوں نے گندہ اور مخرب اخلاق ہونے پر احتجاج کیا ہے اور سوامی سوتنتر انند جی نے اپنی سنسکار ودھی میں سے نکال دیا ہے اس منتر سے معلوم ہوتا ہے کہ آریہ لڑکے لڑکیاں اور پنڈت شہوت پرست ہوتے ہیں۔

......☆......

روزہ پر اعتراض

اعتراض: رمضان میں رات کو کھایا کرو۔ چرند پرند اور کیڑے رات کو آرام کرتے ہیں مگر روزہ دار کو پیٹ کی پڑی۔ عرب میں تو یہ قانون چل گیا مگر قطب شمالی و جنوبی میں کیا کیا جائے گا۔ (ترک اسلام مصنفہ دھرم پال سوال 82)

جواب: معترض کو یہ معلوم ہونا چاہیے کہ روزہ (صوم) وہ اسلامی عبادت ہے۔ جو پہلے تمام مذاہب میں ادا کی جاتی تھی۔ گویا یہ عبادت صرف اسلام کی ہی نہیں بلکہ تمام مذاہب کی مشترکہ عبادت ہے چنانچہ انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا میں لکھا ہے۔

''اس کے طریقے اوراس کی اغراض آب وہوا قوم ونسل اور تہذیب وتمدن اور دوسرے حالات کے پیش نظر سب کچھ مختلف ہیں لیکن کسی ایسے قابل ذکر مذہبی سلسلے کا نام لینا مشکل ہے جس میں روزہ سے کلیتہً انکار کرلیا گیا ہو اور اسے تسلیم نہ کیا گیا ہو۔(انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا مضمون روزہ Fast)

تاریخ بتاتی ہے کہ برہمن ہر ہندی مہینہ کی گیارہ بارہ تاریخ کو روزہ رکھتے تھے اسی طرح کا تک کے مہینہ میں دوشنبہ کو روزہ رکھتے ہندو جوگی چالیس دن تک فاقہ کشی کرتے۔چالیس دن کا روزہ ہوتا تھا پارسی مذہب کے مذہبی پیشواؤں کے لیے پنج سالہ روزہ ضروری تھا یہود میں روزہ کی عبادت تھی۔(خروج 27,26:34)عیسائیت میں بھی روزہ تھا(متی 2:4)

مذاہب عالم میں روزہ کی عبادت میں افراط اور تفریط تھی اسلام نے راہ اعتدال اختیار کرکے صبح صادق سے لے کر غروب آفتاب تک کھانے پینے اور مباشرت سے منع کردیا۔پھر معذوروں بوڑھوں وغیرہ سے روزہ ساقط کردیا۔

قرآن نے آج سے چودہ سو سال پہلے یہی کہا۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا كُتِبَ عَلَيۡکُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِيۡنَ مِنۡ قَبۡلِکُمۡ لَعَلَّکُمۡ تَتَّقُوۡنَ (سورۃ بقرہ 183:2)

اے لوگو! جو ایمان لائے ہو تم پر روزے فرض کیے گئے ہیں جس طرح ان لوگوں پر فرض کیے گئے تھے جو تم سے پہلے تھے تاکہ تم تقویٰ اختیار کرو۔

معترض کا یہ اعتراض بالکل حقیقت سے دور ہے کہ مسلمان کو رمضان میں رات کو کھانے کا حکم دیا گیا ہے پھر معترض از راہ تمسخر یہ کہتا ہے کہ چرند، پرند اور کیڑے رات کو آرام کرتے ہیں مگر روزہ دار کو پیٹ کی پڑی۔

معترض کو یہ علم ہونا چاہیے کہ روزہ دار رات کو کھا کر روزہ نہیں رکھتا بلکہ اس وقت روزہ رکھنے کے لیے اٹھتا ہے جب چرند پرند بھی بیداری کی انگڑائیاں لے رہے ہوتے ہیں اور عبادت گزار اٹھ کر خدا کے سامنے سجدہ ریز ہوتے ہیں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو ماہ رمضان میں یہ حکم دیا ہے کہ وہ کم از کم ایک ماہ رات کی تاریکی میں سفید دھاری پھوٹنے سے قبل بیدار ہوں۔نماز تہجد ادا کریں دعا مانگیں پھر سفید دھاری ظاہر ہونے سے قبل کھانا کھائیں دن بھر غروب آفتاب تک کھانے پینے اور مباشرت سے باز رہیں۔اس کے ساتھ روح کی بالیدگی کے لیے ہر قسم کی اخلاقی برائیوں سے اجتناب کریں۔یہ ہے مسلمانوں کا روزہ جس کی تعلیم اسلام نے دی ہے۔

روزہ بھوکا رہنے کا نام نہیں بلکہ ایک ماہ ہر قسم کی برائیوں سے مجتنب رہنے کی ریاضت کا نام ہے اور پھر یہ حکم ہے کہ اس ریاضت اور مشق کو اپنی زندگی کا حصہ بنالیا جائے کہ بقیہ گیارہ ماہ بھی برائیوں سے دور رہیں گے۔گویا روزہ تعمیر سیرت کا دوسرا نام ہے۔

تعمیر سیرت کے ساتھ ساتھ ایک روزے دار مسلمان کو یہ بھی حکم ہے کہ وہ غرباء کی بھوک کا بھی احساس کرے۔ گرمی کا موسم ہو۔ روزے دار بھوک اور پیاس میں مبتلا ہو۔یہ بھوک اور پیاس غرباء کی بھوک اور پیاس کے احساس کو اجاگر کرتی ہے۔تو روزے دار کے دل میں غرباء کے لیے جذبہ مواسات پیدا ہوتا ہے۔

فلسفہ صوم پر حکماء اسلام نے بہت کچھ لکھا ہے خاکسار نے بھی سیرت سید البشر حصہ دوم میں فلسفہ صوم پر بحث کی ہے قارئین اس پر ایک نظر ڈال لیں تو واضح ہو جائے گا کہ روزہ کی عبادت میں کیا کیا حکمتیں پنہاں ہیں۔

الزامی جواب:

معترض نے اپنے ہی دینی ادب کا مطالعہ کیا ہوتا تو بھی اسلام کی عبادت روزہ پر اعتراض نہ کرتا۔

رگوید یہ آدی بھاش بھومکا 184 میں لکھا ہے کہ جو شخص اتی راتر برت کو پرایہ یینہ یگیہ کا جزو ہے پورا کرکے اشنان کرتا ہے اسے تیرتھ

کہتے ہیں سوم یگیہ کے موقعہ پر آدھی رات کے قریب یگیہ سے فارغ ہو کر دودھ وغیرہ پینے کو کہتے ہیں یہ آدھی رات کو دودھ وغیرہ پینا کیسا ہے۔

قطب شمالی اور قطب جنوبی اور صوم:

وہ خطے جہاں لمبے دن اور رات ہونے کی وجہ سے مہینوں کی تقسیم نہیں ہوتی اس کے بارے میں قرآن مجید میں وضاحت کردی گئی ہے ارشاد الٰہی ہے۔

فَمَنْ شَهِدَ مِنكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ (البقرہ 185:2)

یعنی جو کوئی اس مہینے کو پائے تو چاہے کہ اس کے روزے رکھے شَهِدَ مِنكُمُ الشَّهْرَ کے الفاظ نے ان تمام مقامات کو خارج کردیا جہاں دن رات بہت لمبے ہونے کی وجہ سے مہینوں کی تقسیم نہیں ہوتی کئی کئی دن تک کئی مہینوں تک سورج نہیں نکلتا۔ یا غروب نہیں ہوتا۔ کیونکہ وہاں مہینہ ہی نہیں اگر لوگ وہاں روزہ رکھنا چاہیں تو پھر کسی علاقے سے مطابقت پیدا کر کے روزہ رکھنے اور افطار کرنے کا وقت مقرر کرلیں۔ گویا قطب شمالی اور قطب جنوبی میں لمبے دن اور رات کی وجہ سے مہینوں کی تقسیم ہی نہیں ہوسکتی اس لیے وہاں روزے ساقط ہو جاتے ہیں۔ اگر رکھنا چاہیں تو پھر لمبے دن لمبی رات کو کسی دوسرے علاقہ سے مطابقت پیدا کر کے رمضان کے مہینے کو متعین کرنا ہوگا۔ پھر اس مہینے میں افطار اور روزہ رکھنے کا وقت تعین کیا جائے گا۔ یہ صورت بھی طوعی ہے شرعی صورت حال یہ ہے کہ ایسی جگہوں پر روزے کا شرعی حکم لاگو ہی نہیں ہوتا۔ گویا جہاں ماہ رمضان نہیں وہاں روزہ بھی نہیں۔

سوامی دیانند مصنف سیتارتھ پرکاش کا روزے پر اعتراض:

وہ لکھتا ہے "یہ تحقیق ہوتا ہے کہ جب مسلمانوں کا مذہب جاری ہوا تب یا اس سے پہلے کسی نے کسی پورانک (ہندو) سے پوچھا ہوگا کہ چاندرائن برت جو ایک مہینہ بھر کا ہوتا ہے اس کا طریق بیان کرو۔ شاستر کا طریق یہ ہے کہ چاند کی کلاون (ساعتیں) کے گھٹنے بڑھنے کے مطابق لقموں کا گھٹانا بڑھانا اور دوپہر کے وقت کھانا کھانا چاہیے اس کو نہ سمجھ کر پورانک نے کہا ہوگا کہ چاند کو دیکھ کر کھانا کھانا چاہیے اس پر مسلمانوں نے عمل درآمد شروع کردیا لیکن برت میں مجامعت منع ہے پر قرآن کے خدا نے پورانوں سے بڑھ کر یہ حکم دے دیا کہ تم رات کو مجامعت بھی کیا کرو اور رات میں جتنی دفعہ چاہو کھاؤ، بتایئے یہ برت کا کون سا طریق ہے؟ دن کو نہ کھایا رات کو کھاتے رہیے یہ تو قانون قدرت کے خلاف ہے کہ دن میں نہ کھانا اور رات کو کھانا۔ (سوال نمبر 34)

جواب: سوامی دیانند نے اپنی لاعلمی کا اظہار اس رنگ میں کیا ہے کہ ان کو یہ معلوم ہونا چاہیے ہندو مذہب تو اپنے پیروکاروں کو تو سمندر پار جانے نہیں دیتا۔ پورانک (ہندو) عہد رسول کریم ﷺ میں عرب کیسے پہنچ گئے اور اسلام کے بانی نے ان سے پوچھ کر روزوں کا ناقص تصور دے دیا۔

سوامی صاحب نے کہا کہ کسی سناتنی پنڈت سے پوچھ کر چاندرائن برت کی نقل کی ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے چاندرائن کے روزے کیا چیز ہیں سوامی جی کی مسلمہ منوسمرتی میں اس کی تفصیل موجود ہے وہ یہ ہے کہ برہمن اگر اگنی پوجا جان بوجھ کر نہ کرے یا کوئی اپنے گرو کی بیوی سے زنا کرے یا آریہ ہو کر سرکہ پی لے تو گاؤں کے سور، گدھے، اونٹ، گیدڑ، بندر اور کوے کا پیشاب اور بیٹ بھی کھا کر چاندرائن کا روزہ رکھے۔ (منوسمرتی ادھیاء 11 شلوک 41 اور 106 وغیرہ)

یہ ہے ہندو کا چاندرائن برت۔ اب روزہ عبادت کی تفصیل پر نظر دوڑایئے پھر چاندرائن برت کی کیا کوئی مماثلت ہے۔ چاندرائن برت تو گندھ کا ڈھیر ہے۔ جس کو سلیم فطرت دھکے دیتی ہے سوامی جی کہتے ہیں کہ یہ چاندرائن برت کی نقل ہے نعوذ باللہ من ہذہ الخرافات دن کو

نہ کھانا اور رات کو کھانا خلاف قدرت ہے۔سوامی صاحب قانون قدرت کو ہی نہیں سمجھے کہ قانون قدرت ہے کیا چیز۔دنیا کا پورا نظام جس طریق پر چل رہا ہے اس کا نام قانون قدرت ہے۔اگر یہ قانون وضع نہ کیا جاتا تو نظام کائنات نہ چل سکتا اسی طرح اس دنیا میں انسان کو پیدا کیا اس کی زندگی کو بہتر بنانے کے لیے ایک ضابطہ مقرر کیا یہ ضابطہ بھی قانون قدرت میں شامل ہے۔علی ہذا القیاس۔

رات کو کھانا اور دن کو نہ کھانا نظام قدرت میں شامل ہی نہیں۔اللہ تعالیٰ نے کسی مذہب میں بھی یہ مقرر نہیں کیا کہ کب کھایا جائے اور کب نہ کھایا جائے کھانے پینے کا تعلق بھوک سے ہے۔اس لیے انسان نے خود کھانے پینے کے اوقات مقرر کر لیے ہیں۔کھانے پینے کے اوقات تمدن سے تعلق رکھتے ہیں لہٰذا کھانے پینے کے اوقات کا تعلق قانون قدرت سے ہرگز نہیں۔یہ سوامی جی کی لاعلمی اور نا سمجھی ہے۔

دوم دن کو نہ کھانا ہمیشہ کے لیے نہیں یہ تو ایک ماہ کی پابندی ہے اس میں بھی حکمت کی باریکیاں ہیں۔ایک روزے دار گھر میں بیش نعماء اور خوبصورت بیوی کی موجودگی میں خدا کے حکم سے بھوک پیاس ہونے کے باوجود ان نعماء کی طرف آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھتا۔اسی طرح جذبہ شہوت ہونے کے باوجود بیوی سے لمس نہیں کرتا۔وہ صرف الٰہی حکم کی پابندی سے رکتا ہے۔جب ایک روزے دار حکم خداوندی سے حلال چیزوں سے باز رہتا ہے تو حرام کاری اور حرام خوری سے کس قدر بچے گا۔

سوامی جی نے اپنے اعتراض میں ایک نکتہ اٹھایا ہے کہ برت میں مجامعت منع ہے جبکہ قرآن کے خدا نے حکم دے دیا ہے کہ تم روزے کی رات کو مجامعت بھی کیا کرو۔اسلام نے صبح صادق سے لے کر غروب آفتاب تک کے وقت کو برت کہا ہے۔اس عرصہ میں روزے دار پر کھانا پینا اور مباشرت کرنا حرام ہے۔رات کو برت میں شامل نہیں کیا۔اس وجہ سے صائم کے لیے کھانا پینا اور مجامعت جائز اور حلال ہے اسلام اعتدال کا مذہب ہے۔اس نے روزہ کی عبادت کو افراط وتفریط سے پاک رکھا ہے۔

رمضان کے مہینے میں روزہ رکھنے کے قبل مجامعت سے روکنا افراط میں شامل ہے اس لیے روزے دار کو رات کے وقت مجامعت کی اجازت ہے یہ اجازت عین فطرت کے مطابق ہے۔

......☆......

مردار، خون اور سور کا گوشت (حرام قرار دینے پر اعتراض)

اعتراض: **مردار، سور اور خون حرام ہے۔(1) مردار کی تعریف کہ جس کی روح الگ ہو گئی تو گوذبح ہو۔(2) خون حرام ہے تو گوشت کیوں حلال ہے تمام جسم کی بالیدگی خون سے ہوتی ہے۔(3) مادہ کے رحم میں نطفہ مادہ کے خون سے بنتا ہے اسی سے پرورش پاتا ہے۔(4) سور کیوں حرام ہے۔(ترک اسلام مصنفہ دھرم پال سوال نمبر 44)**

خون حرام ہے گوشت بھی منجمد خون ہے وہ کیوں حلال ہوا۔(ترک اسلام سوال 45)

جواب: اسلام وہ دین ہے جس نے انسان کی روحانی اور مادی زندگی کے لیے ضابطہ حیات دیا ہے۔وہ اسی پر گامزن ہو کر دین اور دنیا میں فلاح پا سکتا ہے۔انسان کی روحانی اور مادی زندگی کے لیے مشروبات ضروری اشیاء ہیں۔اس لئے اسلام نے ماکولات ومشروبات کی حلت

اور حرمت کے واضح اصول مقرر کر دیئے ہیں دور حاضر سائنس کا دور ہے۔ حلت اور محرمات کے جو اصول اسلام نے مقرر کیے ہیں سائنس نے بھی ان کی تصدیق کر دی ہے۔ اسلام کی حرام کردہ تمام اشیاء پر سائنس نے مہر ثبت کی ہے کہ وہ ماکولات اور مشروبات انسان کی صحت کے لیے نقصان دہ ہیں اور مختلف بیماریوں کا سبب ہیں۔ عمرانی علوم نے یہ بھی ثابت کر دیا ہے کہ حرام چیزوں کا صرف انسانی صحت پر ہی اثر نہیں پڑتا بلکہ اس کا اخلاق پر بھی اثر پڑتا ہے۔

اسلام نے محرمات کے چار اصول مقرر کیے ہیں۔

المیتۃ (مردار) مصنف نے مردار کی جو تعریف کی ہے وہ سراسر غلط اور باطل ہے۔ میتۃ (مردار) حیوانات میں سے وہ ہے جس کی روح بغیر ذبح کرنے کے نکل جائے (مفردات امام راغب) خواہ وہ اپنی موت سے مرے یا گلا گھونٹ سے یا چوٹ سے یا گر جانے سے یا سینگ مارنے سے۔ (تاج العروس)

قرآن مجید نے اس کی وضاحت سورہ مائدہ آیت 3 میں کر دی ہے۔

مردار اس وجہ سے حرام قرار دیا گیا ہے اس سے خون نہیں نکلتا۔ خون میں تیس سے زیادہ زہریں ہوتی ہیں۔ وہ زہریں نہ نکلنے کی وجہ سے مردار کے اندر ہی رہ جاتی سب انسان کی مختلف بیماریوں کا سبب بنتی ہیں۔ دوم مردار انسانی اخلاق پر برا اثر ڈالتا ہے۔ مردار خور لوگ مثال کے طور پر چوہڑوں، بھنگیوں، سانسیوں، اگھوریوں کے بدنوں، چمڑوں اور زبان کی درشتگی اور کرختی پر اور بداخلاقی پر غور کریں۔ یہ حیوانگی اور بداخلاقی مردار خوری کی وجہ سے ہے ان میں شائستگی اور تہذیب کا نشان تک نہیں مردار خور انسانوں سے اتر کر باز کی شکل چیل، کرگس اور مردار خور سیاہ کوے کو دیکھو کیسے بدشکل دون ہمت، سست اور کاہل ہیں۔

خون:

خون میں تیس سے زائد قسم کی زہریں ہیں جو پیشاب کے ذریعے خارج ہوتی ہیں منجملہ ان کے کاربانک ایسڈ اور ٹومین تو عام طور پر مشہور ہیں جن سے فالج اور تشنج پیدا ہوتا ہے یوریا جب یہ خارج نہ ہو تو مرض یوریمیا پیدا کرتا ہے۔ اکثر گردوں کی بیماری میں جب پیشاب سے خارج نہیں ہوتا یہی بیماری موت کا سبب بنتی ہے۔ ماہرین طب نے بے شمار زہروں کے نام بیان کیے ہیں جو مختلف بیماروں کے سبب بنتے ہیں۔ خون کھانے سے بہت سے قوی تباہ ہو جاتے ہیں۔ عمرانی علوم کے جاننے والے یہ بات بخوبی جانتے ہیں کہ مردار خور اور خون خور لوگوں کی عقل اور ذہنی قوی کثیف ہوتے ہیں۔ وہ تہذیب و تمدن کے موٹے موٹے اصولوں سے بھی نابلد ہوتے ہیں ان میں اور حیوانوں میں زندگی گزارنے میں کوئی فرق نہیں وہ اپنے کردار کے لحاظ سے حیوان نما انسان ہیں۔

الخنزیر (سور) کا گوشت حرام قرار دینے کی وجہ بھی یہی ہے اس کے کھانے سے نہ صرف اس سے اخلاق پر برا اثر پڑتا ہے بلکہ گوشت کئی بیماریوں کا سبب بھی ہے۔

سور نر سے جماع کرتا ہے اس واسطے سور خور قوموں میں لواطت کی بد رسم رائج ہے۔ (2) سور جماع کا بہت حریص اور خواہش مند ہوتا ہے اس کا گوشت کھانے والے زیادہ تر زانی اور شہوت پرست ہوتے ہیں۔ (3) گند سے اسے محبت ہے۔ اسی واسطے اسلام نے گند خور جانور حرام قرار دیئے ہیں۔ (4) ہاگ کالرا کی جڑ ہے۔ (5) سور اپنے بچوں اور سانپ کو بھی کھا جاتا ہے۔ (6) بڑا حریص ہے۔

مختلف بیماریوں کا سبب:

(1) ٹی نیا سولیم یعنی کدو دانے (2) ٹی نیا سپائی ریلس یہ ایک قسم کا کیڑا ہے جو سور کے گوشت کے ساتھ پیٹ میں چلا جاتا ہے اور

انتڑیوں میں انڈے بچے دیتا ہے اور اس کی نسل پھیل جاتی ہے بچے اور خود کیڑے بھی امعاء (انتڑیوں) کی دیواروں میں سوراخ کر کے شریانوں میں گھس جاتے ہیں اور خون کے ساتھ عضلات میں چلے جاتے ہیں اور وہاں بڑے ہو جاتے ہیں اور اپنے اوپر تھیلی بنا لیتے ہیں اس سبب سے عضلات خراب اور کمزور ہو جاتے ہیں اور امعا (انتڑیوں) میں جریان خون اور جگر میں چربی پیدا ہو جاتی ہے عضلات میں درد اور تکلیف رہتی ہے اگرچہ امعا کے کیڑے جلاب سے دور بھی ہو سکتے ہیں مگر جو عضلات تک پہنچ چکے ہیں ان کا کچھ علاج نہیں سوائے اس کے کہ خود ہی مر جائیں۔

(3) ہائی ڈے ٹڈاف دی لِوَرْ جگر کی رسولی جس میں ٹی نیائی کائی نوکاکس کا کیڑا جگر میں گھر بنا لیتا ہے اس کیڑے کا اصل تخم بھیڑ یا سور میں پایا جاتا ہے پھر وہاں سے منتقل ہو کر کتے میں آتا ہے اور کتے سے نکل کر اگر انسان میں داخل ہو جائے تو یہ جگر رسولی پیدا کرتا ہے۔ (تحقیق حکیم نورالدین بھیروی، کتاب نورالدین ص160)

سور کے گوشت کی ممانعت:

عہد نامہ عتیق میں لکھا ہے ''اور سور نہ کھانا کیونکہ اس کے پاؤں الگ اور چرے ہوئے ہیں ہر چند وہ جگالی نہیں کرتا وہ تمہارے لیے ناپاک ہے تم ان کا گوشت نہ کھانا اور ان کی لاشوں کو بھی نہ چھونا وہ تمہارے لیے ناپاک ہیں۔ (احبار 8,7:11)

بائبل کی کتاب استثناء میں لکھا ہے ''سور تمہارے واسطے اس لیے ناپاک ہے کہ اس کے پاؤں تو چرے ہوتے ہیں مگر وہ جگالی نہیں کرتا تم ان کا گوشت کھانا نہ ان کی لاش کو چھونا۔ (استثناء 8:14)

گوشت منجمد خون نہیں ہے۔ یہ بالکل لاعلمی اور نہ سمجھی کا نتیجہ ہے۔ اگر معترض کسی ماہر طبیب سے دریافت کر لیتا تو اعتراض نہ کرتا۔

آپ کے قول کے مطابق جس طرح گوشت خون سے بنتا ہے اسی طرح دودھ بھی خون سے بنتا ہے جو انسان کے لیے خدا کی طرف سے بہت بڑی نعمت ہے۔ اسی دودھ سے بچے کی پرورش ہوتی ہے۔

کیا معترض اس دودھ کو بھی جو خون سے نکلا ہے حرام قرار دے گا اور چونکہ دودھ خون سے نکلا ہے اس لیے اس کو کیوں حلال قرار دیا گیا ہے۔

الزامی جواب:

ویدوں سے معلوم ہوتا ہے کہ جل (پانی) آگ سے بنا ہے ہندو جل تو پیتے ہیں آگ کو کیوں نہیں کھاتے۔

اسلام نے بتوں کے نام پر ذبح کی ہوئی چیزوں کو حرام قرار دیا ہے۔ ان کے کھانے سے روحانی اور اعتقادی قوتیں تباہ ہوتی ہیں ارشاد الٰہی ہے۔

مَاذُبِحَ عَلَى النُّصُبِ (مائدہ 3:5)

دوسری جگہ آتا ہے۔

وَلَا تَاْكُلُوْا مِمَّا لَمْ يُذْكَرِ اسْمُ اللّٰهِ عَلَيْهِ وَاِنَّهٗ لَفِسْقٌ (الانعام 121:6)

اور اس سے مت کھاؤ جس پر اللہ کا نام نہیں لیا گیا اور یہ یقیناً نافرمانی ہے۔

جب اسلام کے حرام کردہ اشیاء کے ضابطے پر غور کیا جائے۔ تو وہاں حکمتوں کا ایک خزانہ ملے گا اور یہ واضح ہو جائے گا کہ حرام کردہ اشیاء کے استعمال میں انسان کو کیا کیا نقصان ہیں۔ معترض کو پہلے طبی سائنس کا مطالعہ کرنا چاہیے تھا اس پر اسلام کی حرام کردہ اشیاء کے طبی

نقصانات کا خود بخود اندازہ ہو جاتا۔

سوامی دیانند کا اعتراض:

سوامی دیانند جی نے ستیارتھ پرکاش کے چودھویں باب کے سوال نمبر 33 میں اسلام کی حرام کردہ اشیاء پر اعتراض کیا ہے لیکن اس کی نوعیت کچھ مختلف ہے رقمطراز ہے۔

"جائے غور ہے کہ کوئی جانور خواہ خود بخود مرا ہو یا کسی کے مارنے سے دونوں حالتوں میں وہ مردار ہے ہاں ان میں کچھ فرق بھی ہے تو بھی موت میں کچھ فرق نہیں جب صرف سؤر کی ممانعت ہے تو کیا انسان کا گوشت ناروا ہے کیا یہ مناسب ہے کہ خدا کے نام پر سے دشمن وغیرہ کو عذاب دے کر اس کی جان لی جاوے کیا اس سے خدا کا نام بدنام نہیں ہو جاتا بتلاؤ کہ خدا نے پچھلے جنم کے گناہوں کے بغیر جانداروں کو مسلمانوں کے ہاتھ سے عذاب کیوں دلایا؟ گائے وغیرہ مفید جانوروں کے مارنے کی ممانعت نہ کرنے سے خدا دنیا کو نقصان پہنچانے والا ثابت ہوتا ہے اور خون کے گناہ کا مرتکب ہو کر بدنام بھی ہو جاتا ہے ایسی باتیں خدا اور کلام اللہ کی کبھی نہیں ہو سکتیں"۔

جواب: اسلام کے چار محرمات کا ذکر اوپر ہو چکا ہے۔ اسلام کی حرام کردہ اشیاء کا فلسفہ بیان کر دیا گیا ہے۔ دیانند کے اعتراض میں کچھ نئے پہلوؤں کا ذکر ہے اس لیے اس کا جواب دینا بھی ضروری ہے۔

ذبیحہ اور مردار میں فرق:

دیانند جی مردار اور ذبیحہ کو ایک ہی گردانتے ہیں حالانکہ دونوں میں بڑا فرق ہے۔ اسلام میں ذبیحہ وہ ہے جس پر اللہ کا نام لے کر گردن سے کسی تیز آلہ سے شاہ رگ کاٹی جائے اور اس کا خون بہہ جائے۔ جبکہ مردار وہ ہے جو خود مر جائے یا چوٹ سے مر جائے یا گر کر مر جائے یا سینگ لگنے سے مر جائے اور خون نہ بہے یہ مردار ہے خون میں بیماریوں کے جراثیم ہوتے ہیں جب خون کے بہنے سے جراثیم نکل جاتے ہیں تو گوشت ان جراثیم کے اثرات سے پاک صاف ہو جاتا ہے اور انسانی صحت کے لیے مفید بن جاتا ہے اس لیے اسلام نے ذبیحہ کو حلال قرار دیا ہے اور مردار کو حرام کیونکہ مردار خون کے نہ بہنے سے صاف نہیں ہوا۔ وہ طبی لحاظ سے انسانی صحت کے لیے مضر ہے اس لیے مردار کو حرام قرار دیا ہے۔

یہ ہے وہ فرق مردار اور ذبیحہ میں۔ مردار طبی لحاظ سے مضر ہے جبکہ ذبیحہ طبی لحاظ سے مفید ہے۔

اسلام نے بطور اصول یہ بیان فرمایا:

كُلُوْا مِنَ الطَّيِّبٰتِ پاکیزہ چیزیں کھاؤ۔

دوسری جگہ یہ فرمایا۔

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ كُلُوْا مِمَّا فِي الْاَرْضِ حَلٰلًا طَيِّبًا (البقرہ 16:2)

اے لوگو! اس سے جو زمین میں ہے حلال اور پاکیزہ کھاؤ۔

طیب اور حلال چیزیں دو قسم کی ہیں پاک بلحاظ صحت جسمانی۔

دوم صحت اخلاق یعنی وہ چیزیں کھائی جائیں جو جسمانی اور اخلاقی صحت کے لیے ضروری ہیں مردار چونکہ انسان کی صحت اور اخلاق دونوں کے لیے نقصان دہ ہے اس لیے مردار کو حرام قرار دیا ہے۔

سور کے گوشت کی ممانعت:

پہلے ذکر گزر چکا ہے۔ اسلام نے انسانوں کے گوشت کو ناروا اور ناجائز قرار دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو مکرم اور محترم پیدا کیا ہے

اور اللہ کا نائب ہے۔اس لیے اسلام میں انسان کا گوشت اس کی فضیلت کی وجہ سے حرام قرار دیا گیا ہے اسی وجہ سے اسلام وہ دین ہے جس نے انسانی قربانی پر پابندی عائد کی۔جبکہ دوسرے مذاہب میں انسانی قربانی کو جائز قرار دیا گیا ہے اسلام کا انسانیت پر یہ بہت بڑا احسان ہے۔

الزامی جواب:

انسانی قربانی اور انسان کا گوشت کھانے کا رواج آج تک مصنف کے تانترک بھائیوں میں موجود ہے وید میں شنہ شیپ رشی کی تضرع اور آہ و بکا قربانی سے بچنے کے لیے مذکور ہے شنہ شیپ ،اجی گرت رشی کا بیٹا تھا ظالم باپ نے اسے قربانی کے لیے فروخت کر دیا تھا۔

دشمن کی جان لینا:

معلوم نہیں کہ سوامی جی نے اسلام کی کس تعلیم سے یہ اخذ کیا ہے کہ دشمن کی جان لینا جائز ہے۔اسلام رحمت کا مذہب ہے۔رسول کریم ﷺ کی سیرت ہمارے سامنے ہے کہ آپ نے کس طرح فتح مکہ کے دن دشمنوں کو معاف کیا۔دنیا اس کی مثال پیش نہیں کر سکتی۔

مفید جانور گائے کا گوشت کھانا:

گوشت اللہ تعالیٰ کی ایک نعمت ہے۔انسان کی صحت کے لیے ضروری جزو ہے اگر گوشت جیسی نعمت نہ ہوتی تو انسان کے مزاج میں یہ اعتدال پیدا ہی نہ ہوتا۔تاریخ بتاتی ہے سبزی خور قوموں میں بہادری اور شجاعت کم ہوتی ہے۔ان میں مسکنت اور عاجزی پائی جاتی ہے۔یہ قومیں اپنے دشمن سے بھی اپنا دفاع نہیں کر پاتیں۔گوشت انسان کے اندر شجاعت جیسا خلق پیدا کرتا ہے۔جو انسان کے دفاع کے لیے نہایت ضروری ہے۔

نرکت میں بھی گوشت کی تعریف کی گئی ہے چنانچہ لکھا ہے مانس (گوشت) کو مانس اس لیے کہتے ہیں کہ اس میں من یعنی دل خوب لگتا ہے یا جو مانی (عزت کے قابل) ہو اس کے لیے بنایا جاتا ہے۔(نرکت 3:4)

ویدوں میں بھی گوشت خوری کا ذکر موجود ہے۔(یجروید ادھیاء 24 اور منوسمرتی باب 5) راجہ رام چندر جی مہاراج، شری کرشن جی اور تمام کشتری راجے شکار کھیلتے تھے جانور مارتے تھے اور گوشت کھاتے تھے۔

گائے کے مفید ہونے کا مسئلہ:

ہندو گائے اس وجہ سے ذبح نہیں کرتے وہ سمجھتے ہیں کہ یہ کاشتکاری کے لیے ایک مفید جانور ہے ہندوستان ایک زرعی ملک ہے یہاں کے ہندو باشندوں نے اس کی اس افادیت کی وجہ سے گائے کو نہ ذبح کرنے کا ایک مذہبی عقیدہ بنا لیا۔پہلی بات تو یہ ہے صرف گائے یا بیل ہی کاشتکاری کے مفید نہیں ہیں بلکہ دوسرے جانور بھینسا اونٹ اور دیگر جانور بھی کاشت کاری کے کام آتے ہیں۔اونٹ سے بھی کاشتکاری ہو سکتی ہے۔اب تو دور حاضر میں بیلوں کی ضرورت ہی نہیں رہی اس لیے اس کی افادیت کی وجہ سے مذہبی عقیدہ نہیں بنایا جا سکتا۔نہ ہی تہذیب کا حصہ بنایا جا سکتا ہے۔

یہ جانور صرف کاشتکاری کے لیے مفید جانور نہیں بلکہ خوراک کے لیے بھی ضروری ہے۔خوراک بھی انسانی ضروریات میں سے ہے اس کو پورا کرنا ضروری ہے۔

دوم۔گائے بیل جس کی ملکیت ہے اس نے یہ بھی دیکھنا ہوتا ہے آیا اس کی ملکیت گائے بیل خوراک کی کمی پوری کرنے کے لیے ضروری ہے یا کاشتکاری کے لیے۔اگر خوراک کے لیے ضروری ہے تو لازمی طور پر اس پر یہ پابندی عائد نہیں کی جا سکتی کہ وہ اس سے صرف کاشتکاری کی خدمت لے اور خوراک کی کمی پورا نہ کرے۔

اللہ تعالیٰ نے گائے بیل کو صرف کاشتکاری کے لیے ہی پیدا نہیں کیا بلکہ خوراک کے لیے بھی پیدا کیا ہے۔ لہٰذا خوراک کی کمی کو پورا کرنے کے لیے گائے بیل کا ذبح کرنا ضروری ہے۔ دور حاضر میں کاشتکاری کے لیے گائے بیل کا وجود بے کار ہو گیا ہے۔ اب اس سے صرف خوراک کا کام ہی لیا جا سکتا ہے۔

قرآن مجید نے ماکولات اور مشروبات میں جو حلال اور محرمات کا اصول دیا ہے اور جو اس اصول میں حکمتیں اور فلسفہ چھپا ہوا ہے اس سے واضح ہوتا ہے کہ یہ کسی انسان کا بنایا ہوا ضابطہ اور اصول نہیں بلکہ اس ہستی کا ہے جو علیم وخبیر ہے۔ معترض کی نظر سے وہ حکمتیں پوشیدہ ہیں اس وجہ سے اسلام کے ضابطہ ماکولات پر معترض ہوا ہے۔

......☆......

قربانی پر اعتراض

اعتراض: قربانی لغو حرکت ہے جس کا گلا کاٹ دیا جاوے وہ باعث آرام کیونکر ہو سکتا ہے (دھرم پال، ترک اسلام سوال 43)

جواب: (1) قربانی صرف دینی ہی مسئلہ نہیں بلکہ ہم دیکھتے ہیں کہ ہر ادنیٰ چیز اعلیٰ چیز پر قربان ہو رہی ہے اور یہی قانون قدرت ہے اس کے بغیر نظام کائنات ہی نہیں چل سکتا آکسیجن ہر متنفس میں انسانی آرام کے لیے قربان ہوتی ہے۔ اگر نظام قدرت میں یہ قربانی نہ ہو۔ تو انسان زندہ نہیں رہ سکتا۔ کاربن درختوں کے لیے قربان ہوتی ہے۔

ہزاروں درختوں کو حصول ایندھن کے لیے کاٹا جاتا ہے۔ ان میں روح پائی جاتی ہے۔ درختوں کو انسان کے لیے قربان کیا جا رہا ہے جب مزید غور کریں تو حیوانی قربانی کا سلسلہ وسیع نظر آتا ہے ایک انسان کو ''ویدان'' کا مرض ہوتا ہے تو اس کے علاج کے لیے ہزاروں دوائیں ہیں جن کو استعمال کر کے ان جانوروں کی قربانی ایک مریض کی شفا کے لیے کی جاتی ہے اور ایک مریض کو شفا دینے کے لیے ہزاروں جانور ہلاک کیے جاتے ہیں۔ اس دنیا میں جب عملی حالت دیکھتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ انسان اپنی ضرورت اور آرام کے لیے کس قدر جانوں کو قربان کرنا ضروری اور لابد سمجھتا ہے۔

جب سیاست دان پر غور کریں وہاں بھی ادنیٰ آدمی اعلیٰ کے لیے قربانی دیتا ہوا نظر آتا ہے سپاہی جرنیل کے لیے جرنیل شاہ کے لیے قربانی دیتا ہے۔ اس قسم کی قربانی سے فرار ہی نہیں۔

اگر قربانی کے وسیع مفہوم پر غور کیا جائے تو پھر ہر شعبہ زندگی میں قربانی پائی جاتی ہے اس سے زندگی قائم ودائم ہے۔

قربانی کا عام رواج:

جب دنیا کی تاریخ کا مطالعہ کیا جائے تو واضح ہو جاتا ہے کہ دنیا کے اکثر ممالک میں قربانی کا عام رواج تھا چنانچہ انسائیکلو پیڈیا براٹانیکا کی جلد 21 صفحہ 13 اور انسائیکلو پیڈیا ببلیکا جلد 4 صفحہ 4187 تا 4240 میں ہے ایران، انڈیا، یونان، روم، عرب، افریقہ قدیم امریکہ اور روما میں قربانی کا عام رواج تھا اور قربانیاں رضا الٰہی کفارہ معاصی، ازالہ غضب اصنام کے لیے غریب کی غربت، شاعر کی قوت بڑھانے بیمار کی شفا کے واسطے کی جاتی تھیں۔

عبرانیوں میں شکریہ، کفارہ اور حمد الٰہی کے لیے لڑکے کے تولد، ختنہ، شادی پر اور مہمانوں کے آنے پر فتح مندی، زمین کے جوتنے، کنوئیں کی بناء، بنیاد عمارت، باہمی معاہدہ، مردہ کی سالانہ رسم، شکار کے بعد اور جب کسی کا جانور پہلا بچہ دے تو قربانی کی جاتی تھی بابلی لوگ قیدیوں میں ایک انسان کی قربانی اور افریقہ میں حسین آدمی کی قربانی ہوتی تھی۔

بابلیوں میں ہرن کی قربانی اور عبرانیوں میں بادشاہ اور رعایا کی طرف سے شاہی قربانی چھ لیلے اور ایک دنبہ ضروری تھا سوختنی قربانی بھی اگنی دیوتا کے لیے ہوتی تھی اور اس کو عولی کہتے تھے حضرت سلیمان نے جب ہیکل تیار کی تو قربانیوں کی نوبت لاکھوں تک پہنچ گئی۔

روما میں سور کی، یونان میں شراب کی قربانی بھی معمول تھا۔ مکسیکو میں تین منزلہ مندر میں سبز پتھر پر قربانی ہوتی تھی۔

(برٹانیکا جلد 16-210 ملاحظہ کیجیے دعا اور قربانی لازم ولمزدم جلد 24-300)

ڈاہومی میں بادشاہ کی وفات پر دو ہزار آدمی کی قربانی ہوتی تھی انگلستان میں ایڈسن قوم میں قربانی تھی انڈیا کی تمام اقوام میں۔ جلد 29-280 سے معلوم ہوتا ہے کہ دنیا میں قربانیاں ہوتی تھیں۔

تمام انبیاء علیہم السلام قربانی کے موید تھے حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے قربانی کی تعلیم دی۔ ابتداء میں مسیحی لوگ قربانیاں کرتے رہے۔ حقیقت میں عیسائیوں کی نجات ہی قربانی پر ہے ان کا عقیدہ ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام ان کے گناہ کا بوجھ اپنے کندھوں پر اٹھا کر صلیب پر قربانی دی۔ کیا کوئی عیسائی کفارہ سے انکار کرسکتا ہے۔ کفارہ کیا ہے۔ انسانی قربانی انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا میں عقیدہ کفارہ کی تشریح ان الفاظ کے ساتھ کی ہے۔ ''عیسائی علم عقائد میں کفارہ سے مراد یسوع کی وہ قربانی ہے جس کے ذریعے ایک گناہ گار انسان یکلخت خدا کی رحمت کے قریب ہو جاتا ہے۔ (انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا ص 651 مقالہ کفارہ Atonement)

ہندو دھرم اور قربانی:

یجن (قربانی) ویدوں کی روح ہے یہ منتروں سے بھی زیادہ قدیم ہے کیونکہ منتر ان کی بجا آوری کے لیے بنائے گئے وشنو اور اندر نے یہ وسیع جہان قربانی کے لیے بنایا (رگوید ہفتم 4:99) اور مخلوقات کے خداوند (پرجاپتی) نے شروع میں قربانی کو داخل کیا جس کے وسیلے اس نے جہاں کو بنایا۔ منو نے طوفان کے بعد کشتی سے اتر کر پہلا یہی کام کیا کہ قربانی چڑھائی۔ قربانی جہان کے پہیے کی ڈھیری ہے اور وہ ساری چیزوں کے خلق کرنے کی قوت (رگوید اول 34:64)

دیوتا اور انسان دونوں قربانی چڑھاتے ہیں۔ (رگ وید دہم 130:83)

انسانی قربانی کا ذکر وید کے قدیم منتروں میں آیا ہے لیکن یہ انسانی قربانی عام نہیں تھی۔ رگ وید کے دسویں منڈل کے نوے منتر میں پرش کا ذکر ہے جس کے ٹکڑے ٹکڑے کیے گئے اور دیوتاؤں کے آگے اس کی قربانی چڑھائی گئی۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ انسان کی قربانی قدیم آریاؤں کو معلوم تھی۔

برہمن میں انسانی قربانی کا ذکر بار بار آتا ہے ''سب کچھ انسانی قربانی ہے سب کچھ حاصل کرنے کے لیے سب کچھ پانے کے لیے'' اس قربانی کے ذریعے قربانی چڑھانے والا سب کچھ حاصل کرتا ہے پرش نارائن ساری چیزوں پر سبقت لے گیا اور پرش میدھ کی قربانی کے ذریعے سب کچھ ہو گیا اس لیے کچھ تعجب نہیں کہ یہ کہا گیا '' بے شک انسان قربانی کے جانوروں میں سے پہلا ہے۔ (ستھ پتھ ہفتم 18,1:2) ستھ پتھ برہمنا کے مطابق کیاپرن سانکانیادہ آخری شخص تھا جس نے انسانی قربانی کے لیے مذبح کھڑا کیا۔

قربانی کی اقسام:

ویدوں کی قربانیاں دو قسم کی ہیں۔

سُتیا یعنی دائمی قربانیاں یہ لازمی ہوتی تھیں خاص اوقات اور موقع پر ان کو چڑھانا فرض تھا۔

انتیا یعنی اختیاری قربانیاں چڑھانے والے کی مرضی پر موقوف تھیں کسی منت کے لیے یا کسی خواہش کے لیے پورا ہونے پر۔

رگ وید میں ذکر ہے کہ دن میں تین دفعہ دعائیں اور قربانیاں ادا کی جاتی تھیں صبح، دو پہر اور تیسرے سہ پہر کو (رگ وید سوئم 28)

مذکورہ قربانی کی تاریخی حیثیت سے واضح ہو جاتا ہے کہ قربانی قدیم دنیا سے جاری ہے یہی قرآن مجید نے ہابیل اور قابیل کے ذکر میں بیان کیا۔ دونوں بھائیوں نے قربانی کی اور اللہ تعالیٰ نے ہابیل کی قربانی قبول کر لی اور قابیل کی قربانی قبول نہ کی گئی۔ قابیل نے اپنے بھائی قابیل کو قتل کر دیا۔ ہابیل اور قابیل حضرت آدم کے بیٹے تھے گویا قربانی کی رسم آدم سے ہی شروع ہو گئی تھی۔ معلوم ہوتا ہے کہ اسی سے دنیا کی تمام اقوام میں قربانی رائج ہو گئی۔

معترض کے اپنے مذہب میں بھی قربانی کا ذکر ہے تو پھر اسلام کے نظریہ قربانی پر اعتراض کیسا۔ معلوم ہوتا ہے کہ معترض قربانی کی تاریخ سے نابلد ہے۔

قربانی کی تاریخ:

قربانی کی تاریخ سے یہ واضح ہوتا ہے کہ اقوام عالم میں انسانی قربانی کا بھی رواج تھا اسلام کا انسانیت پر یہ احسان ہے کہ قربانی کے غلط پہلو کو منسوخ کیا اور قربانی کا ایک نیا فلسفہ بیان کیا۔

اسلام کا نظریہ قربانی:

اسلام کے نظریہ قربانی کا پس منظر یہ ہے کہ حضرت ابراہیم نے رویا میں دیکھا کہ وہ اپنے بیٹے اسماعیل کو ذبح کر رہے ہیں۔ اس وقت حضرت اسماعیل سن بلوغت کو پہنچ چکے تھے۔ باپ نے اپنے بیٹے کو رویا سے آگاہ کیا تو فرمانبردار بیٹے نے باپ سے کہا **اِفْعَلْ بِمَا تُؤْمَرُ** اے باپ جس امر کا اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے اس کو بجا لائیے۔ باپ بیٹے کو ذبح کرنے کو جب تیار ہو گئے اور بیٹے نے اپنی گردن زمین پر رکھ دی تو اللہ تعالیٰ کا دوسرا حکم یہ ہوا کہ بیٹے کی جگہ ایک جانور ذبح کر دیں۔ اس وقت سے ملت ابراہیمی میں ایک جانور کی قربانی کی رسم چلی آ رہی ہے اسی رسم کو اسلام نے جاری رکھا۔

فلسفہ قربانی:

اسلامی نقطہ نگاہ سے قربانی صرف کسی جانور کو ذبح کرنے کا نام نہیں ہے بلکہ نفسانی خواہشات کی سرکش اونٹنی کو ذبح کرنے کا نام ہے اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں قربانی کے فلسفہ کو اس آیت میں بیان کیا ہے۔

لَنْ يَّنَالَ اللّٰهَ لُحُوْمُهَا وَلَا دِمَاۗؤُهَا وَلٰكِنْ يَّنَالُهُ التَّقْوٰى مِنْكُمْ (الحج 22:37)

اللہ کو جانور کا گوشت اور اس کا خون نہیں پہنچتا بلکہ اللہ تعالیٰ کو تمہارا تقویٰ پہنچتا ہے۔

تقویٰ احکام الٰہی کے تابع زندگی بسر کرنے کا نام ہے۔

پس اسلام میں قربانی کا یہ تصور ہے کہ جس طرح جانور انسان کی چھری کے نیچے اپنی گردن رکھ دیتا ہے اور اس کا اپنا کوئی اختیار نہیں

رہتا اسی طرح انسان اللہ تعالیٰ کے احکام کے تابع اپنی زندگی بسر کرے اور انسان کی مرضی اللہ کی مرضی کے تابع ہو جائے اور نفس امارہ کو اللہ تعالیٰ کے احکام کا پابند بنا کر نفس مطمئنہ بنائے۔ جب ایک انسان کلی طور پر اللہ تعالیٰ کی ذات میں گم ہو جاتا ہے تو وہ اس وقت اللہ کی رضا اور قرب پالیتا ہے کسی مذہب نے اس سے بڑھ کر قربانی کا تصور نہیں دیا گویا اسلام میں قربانی اللہ کا قرب حاصل کرنے کا نام ہے۔

دوم اسلام نے قربانی کے تصور میں وسعت دی ہے۔ جب ایک انسان ظالم کا مقابلہ کرتے ہوئے اپنے ملک کی سرحدوں کی حفاظت کرتا ہے اور جان دے دیتا ہے یہ بھی قربانی کا ایک شاندار پہلو ہے ارشاد الہٰی ہے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِيْنَ هَاجَرُوْا وَجَاهَدُوْا فِىْ سَبِيْلِ اللّٰهِ

اس آیت میں جَاهَدُوْا سے مراد جنگ ہے۔

ملکی دفاع میں جان دینا یہ بھی قربانی ہے۔ اسی قربانی سے قومیں اپنی سرحدوں کی حفاظت کرتی ہے اور اسی قربانی سے ملک میں امن قائم ہوتا ہے یہ بھی قربانی کا ایک اعلیٰ تصور ہے۔

انسان کو اپنی جان کے علاوہ مال سے بہت محبت ہے اسلام نے دائرہ اسلام میں داخل ہونے والے کے لیے مال کی قربانی بھی فرض کی ہے۔ ارشاد الہٰی ہے۔

لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ (آل عمران 92:3)

تم نیکی (راست بازی) کو ہرگز حاصل نہ کرو گے یہاں تک کہ اس سے خرچ کرو جس سے تم محبت کرتے ہو۔

قوموں کی زندگی مال کی اس قربانی سے ہے اگر کوئی قوم اس قربانی کی عادی نہیں وہ قوم صفحہ ہستی پر قائم نہیں رہ سکتی۔ اسلام نے انفاق فی سبیل اللہ دو طرح کا مقرر کیا ہے لازمی اور طوعی۔ لازمی اڑھائی فیصد ہے جس کو اسلامی اصطلاح میں زکوٰۃ کہا جاتا ہے اور طوعی کی حد یہ مقرر کی ہے جو انسان کی ضرورت سے زائد ہے وہ اللہ کی راہ میں خرچ کر دے ارشاد الہٰی ہے۔

يَسْئَلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ قُلِ الْعَفْوَ (البقرہ 219:2)

وہ تجھ سے سوال کرتے ہیں کہ کیا خرچ کریں کہہ جو زائد از ضرورت ہو۔

اسلام نے جہاں انسانی قربانی موقوف کی ہے وہاں ان تمام قربانیوں کو ممنوع اور حرام قرار دیا ہے جن قربانیوں میں بت پرستی اور شرک ہو کیونکہ شرک میں مبتلا شخص حقیقی اسباب کو ترک کر کے اپنے بتوں، دیوی دیوتاؤں سے کامیابی کا امیدوار ہوتا ہے اس لیے حقیقی کامیابی سے محروم رہتا ہے۔ شرک میں انسانی گراوٹ ہے اس لیے اللہ تعالیٰ نے بتوں کی قربانیوں کو حرام قرار دیا ہے۔

اسلام نے انسانی قربانی اور بتوں کی قربانی کو حرام قرار دے کر ایسی قربانی کو رائج کیا ہے۔ جس میں انسانیت کی روحانی اور مادی ترقی کا راز مضمر ہے۔

افسوس اسلام کے اس اعلیٰ اور مقدس نظریہ قربانی پر اعتراض کر کے معترض نے اپنی کم سمجھی اور لاعلمی کا اظہار کیا ہے۔

......☆......

عورت کو زیادہ خاوند رکھنے کی اجازت کیوں نہیں؟

اعتراض : مرد ایک وقت میں دو دو تین تین چار چار کرے اور عورتیں ایک ہی وقت میں دو دو تین تین چار چار خاوند کیوں نہ کریں۔ (دھرم پال سوال نمبر 101)

جواب : اسلام ایک فطری مذہب ہے۔ اس کے اصول وہ نہیں ہو سکتے جو فطرت کے خلاف ہوں۔ انسانی فطرت یہ تقاضا نہیں کرتی کہ ایک عورت کے کئی خاوند ہوں۔ خاوند بیوی کے معاملے میں کسی کی شراکت برداشت نہیں کرتا۔ شراکت بے غیرتی کی علامت ہے جب کسی قوم میں غیرت ختم ہو جاتی ہے تو وہ قوم صفحۂ ہستی سے مٹ جاتی ہے تاریخ اس بات پر شاہد ہے وہ قومیں صفحۂ ہستی سے مٹ گئیں جن میں بے غیرتی بڑھ گئی۔

مادہ کے متعلق غیرت تو جانوروں میں پائی جاتی ہے۔ کہ وہ بھی شراکت کو برداشت نہیں کرتے امام بخاری نے عمرو بن میمون کے حوالے سے بندروں کا ایک واقعہ لکھا ہے حافظ ابن حجر نے فتح الباری میں اسے تفصیل سے ذکر کیا ہے عمرو بن میمون کہتے ہیں کہ میں یمن میں ایک ٹیلے پر اپنے خاندان کی بھیڑ بکریاں چرا رہا تھا ایک بندر اور بندریا وہاں آئے بندر بندریا کا بازو سرہانہ بنا کر سو گیا۔ اسی دوران ایک اور بندر آیا اس نے بندریا کو بہکایا اور اس کو ساتھ لے چلا تھوڑی دور جا کر انہوں نے میل کیا پھر بندریا واپس آ گئی اور اپنا ہاتھ بندر کے سر کے نیچے داخل کرنا چاہا تو بندر جاگ اٹھا۔ اس نے اسے سونگھا اور چلانے لگا۔ کئی بندر جمع ہو گئے اور وہ مسلسل چلاتا رہا اور اس بندریا کی طرف اشارہ کر رہا تھا بندر اِدھر اُدھر گئے اور اس بندر کو پکڑ لائے جس نے اس بندریا سے میل کیا تھا۔ انہوں نے ان دونوں کے لیے ایک گڑھا کھودا اور انہیں رجم کر دیا۔ (فتح الباری 202/7 حدیث 3859 سور کے علاوہ ہر جانور میں یہ غیرت پائی جاتی ہے تو ایک انسان کیونکر اپنی شریک حیات میں دوسروں کو شریک کر سکتا ہے۔ ایک عورت کے کئی خاوندوں کا اشتراک غیر طبعی اور غیر فطرتی ہے۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ اگر ایک عورت کے کئی خاوند ہوں تو بچہ کی ماں کا تو علم ہوتا ہے لیکن باپ کا پتہ نہیں چل سکتا۔ اس اشتباہ کی وجہ سے بچے کے والد کا تعین کرنا مشکل ہوتا ہے۔ جب ایک بچے کو اپنے باپ کا علم نہیں تو لازمی طور پر ذہنی اور قلبی الجھنوں میں مبتلا ہو جاتا ہے اس طرح کئی امراض کا شکار ہو سکتا ہے اور معاشرہ میں اس کا کوئی مقام نہیں ہوتا۔

خاندان معاشرہ کی ایک اہم اکائی ہے۔ خاندان میاں بیوی کے اشتراک اور اجتماع سے بنتا ہے اور اولاد اس گھر کے لیے باعث رونق اور زینت ہوتی ہے۔ جب عورت کے کئی خاوند ہوں گے تو یہ ابتدائی اکائی (خاندان) ختم ہو جاتی ہے۔ یہ اکائی میاں بیوی کے حقوق و فرائض کی بجا آوری سے زندہ ہوتی ہے۔ ایک ہی بیوی کے بطن سے جب کئی مردوں کی اولاد پیدا ہوگی تو اولاد کی پرورش کا ذمہ دار کون ہوگا؟ ہر خاوند اپنے سر ذمہ داری لینے سے انکار کرے گا۔ وہ جنسی لذت میں شریک ہوگا لیکن عائلی ذمہ داری سے پہلو تہی کرے گا۔ ایک بیوی کے کئی خاوند ہونے کا یہ ایک لازمی نتیجہ ہے۔ اس سے خاندان میں یکجہتی اور یگانگت ختم ہو جاتی ہے۔

تیسری وجہ یہ ہے کہ اگر ایک عورت کے کئی خاوند ہوں تو بیوی کا مختلف بیماریوں کا شکار ہونا لازمی امر ہے۔ عموماً یہ دیکھنے میں آیا ہے کہ فاحشہ عورت مختلف طبی بیماریوں کی شکار ہوتی ہے اس کی سب سے بڑی وجہ اس عورت کا کئی مردوں سے ہم بستری کرنا ہے۔

قحبہ خانوں کی عورتیں خطرناک آتشک سوزاک جیسی امراض میں مبتلا ہوتی ہیں۔ جو مرد بیمار عورت سے ہم بستری کرتا ہے تو وہ بھی بیماری کا شکار ہو جاتا ہے۔ یہ جنسی بیماریاں ایسی ہیں جن سے موت سے پہلے چھٹکارا پایا ہی نہیں جا سکتا۔

چوتھی وجہ یہ ہے کہ اگر عورت ایک خاوند سے میل کر رہی ہے تو اگر دوسرے اور تیسرے خاوند میں جنسی خواہش جاگ اٹھی۔ ہے تو

عورت ایک شخص کی جنسی خواہش پوری کرنے کے بعد دوسرے تیسرے یا چوتھے خاوند کی جنسی خواہش پوری کرنے کے قابل نہیں رہے گی تو اس طرح ایک ہی گھر میں جنسی خواہش پورا نہ ہونے کی وجہ سے لڑائی جھگڑا پیدا ہو جائے گا یا عورت پر جنسی تشدد کیا جائے گا جو عورت کی صحت کے لیے نقصان دہ ہے۔ کیا پھر خاوند اپنی اپنی باریاں مقرر کریں گے۔ یہ کتنا غیر فطری اور غیر طبعی عمل ہے۔

پانچویں وجہ یہ ہے مرد اور عورت کی تخلیق کا ایک مقصد ازدواجی زندگی اختیار کرنا ہے۔ اس ازدواجی زندگی سے معاشرہ میں بدکاری کو ختم کیا جاسکتا ہے۔ جنسی میل کرنا عورت اور مرد کی فطرت میں شامل ہے اگر عورت کے کئی خاوند ہوں گے تو اس طرح مرد اپنی جنسی خواہش کو پورا نہیں کرسکتا۔ اس جنسی تسکین کے لیے اسلام نے مرد کو ایک سے زیادہ شادیاں کرنے کی اجازت دی ہے تا کہ مرد اپنی جنسی تسکین دوسری بیوی سے پوری کرلے اور غیر عورتوں کی طرف نہ جائے اور معاشرہ میں بدکاری نہ پھیلے۔ اگر ایک عورت کے کئی خاوند ہوں گے تو لازمی طور پر مرد کی جنسی تسکین نہ ہونے کی وجہ سے دوسری عورتوں سے رابطہ قائم کرے گا اور فحاشی پھیلے گی۔

چھٹی وجہ یہ ہے کہ ورثہ اور ترکہ کی تقسیم میں جھگڑے پیدا ہوں گے جب اولاد کے والد کی پہچان ہی نہیں تو وراثت کیسے چلے گی۔

تلخ جواب:

قدیم اقوام میں ہندو دھرم ہی ایک ایسی تہذیب کا حامل ہے جس میں ایک بیوی کے کئی خاوند ہو سکتے ہیں۔ ایک تو ان میں نیوگ کا عقیدہ ہے جس کی رو سے خاوند خود اپنی بیوی سے کہتا ہے کہ اولاد حاصل کرنے کے لیے کسی دوسرے سے میل کرے۔ اس طرح ایک عورت حصول اولاد کے لیے کئی مردوں سے میل پیدا کرسکتی ہے۔ یہ عقیدہ بھی ایک عورت کے کئی خاوند ہونے کو ظاہر کرتا ہے۔

اسی طرح جب راجہ دشرتھ نے اپنی قسم پوری کرنے کے لیے بے گناہ رام کو 14 برس کا بن باس دے دیا اس قسم کی وجہ سے دروپدی پانچ پانڈوؤں کی اکیلی بیوی بن گئی۔

ویدوں میں نہ صرف ایک خاوند کی کئی بیویوں کا بلکہ ایک عورت کے بہت سے مہاتما اور رشی خاوندوں کا ذکر بھی ہے۔ (اتھروو وید کانڈ 14 سوکت 2 منتر 4,3) جب ایک بھائی کسی عورت سے شادی کرتا ہے تو اس کے تمام بھائی بھاوج کے شریک خاوند ہوتے تھے بلکہ مختلف ذاتوں کے کئی ایک خاوند بھی شریک ہوسکتے تھے۔ (اتھروید کانڈ 5 سوکت 17 منتر 9,8)

ویدک راجیہ میں ہے اگر کسی عورت کے دس غیر برہمن خاوند موجود ہوں پھر بھی ایک برہمن اس عورت کا ہاتھ پکڑ لیتا ہے تو وہی برہمن اس عورت کا خاوند ہے۔

یہ وہ تہذیب ہے جو ہندو دھرم کی مقدس کتب پیش کرتی ہیں کیا اس تہذیب کو دور حاضر میں اپنایا جاسکتا ہے اگر اپنایا جائے تو اس کے کیا اثرات مرتب ہوں گے کیا ایک سلیم الطبع شخص اس تہذیب کو پسند کرسکتا ہے یہ تہذیب سراسر بے غیرتی اور حیا باختگی کی تہذیب ہے جس کو عقل سلیم کوسوں دھکے دیتی ہے۔ اسلام ایک فطری مذہب ہے وہ اس قسم کی تعلیم نہیں دے سکتا کہ ایک عورت کے کئی خاوند ہوں۔ یہ انسانی غیرت کے خلاف ہے۔

......☆......

مکہ میں غیر مسلموں پر نہ جانے کی پابندی

اعتراض: غیر مسلموں کو مکہ جانے کی اجازت کیوں نہیں؟

جواب: یہ تو اعتراض فلسفہ توحید نہ جاننے کی وجہ سے ہے۔ قرآن مجید میں آتا ہے کہ ہم نے اپنی امانت زمین و آسمان پر پیش کی۔ اس نے اس امانت کو اٹھانے میں انکار کر دیا سوائے انسان کے۔ کیونکہ وہ مظلوم اور جھول ہے۔ یہاں ظلوم اور جہول مقام مدح میں استعمال ہوئے ہیں۔ ان دونوں الفاظ میں انسان کی تابعداری کا مفہوم مضمر ہے یعنی کہ باوجود اس امانت کے تمام تقاضوں کو پورا کرنے کی کما حقہ صلاحیت نہ تھی پھر بھی اس نے اس امانت کے اٹھانے کا وعدہ کر لیا۔ وہ امانت توحید تھی۔ یعنی توحید کے تقاضوں کو پورا کرنے کا وعدہ کیا قرآن مجید کی یہ آیت بھی اسی طرف اشارہ کر رہی ہے۔

ارشاد الٰہی ہے۔

وَاِذْ اَخَذَ رَبُّكَ مِنْۢ بَنِىْٓ اٰدَمَ مِنْ ظُهُوْرِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ وَ اَشْهَدَهُمْ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ قَالُوْا بَلٰى شَهِدْنَا (الاعراف 7:172)

اور جب تیرے رب نے بنی آدم سے یعنی ان پیٹھوں سے ان کی نسل نکالی اور ان کو اپنے وجود پر گواہ کے طور پر ٹھہرایا کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں۔ انہوں نے کہا ضرور ہم گواہ ہیں۔

دوسری جگہ آتا ہے۔

وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ (العنکبوت 29:61)

اگر تو ان سے پوچھے کس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا ہے اور سورج اور چاند کو کام میں لگایا ہے تو وہ ضرور کہیں گے (وہ) اللہ ہے۔

یہ آیات ظاہر کرتی ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی ہستی کا احساس انسان کی فطرت میں داخل ہے یہی وہ امانت ہے جس کے اٹھانے کا اللہ تعالیٰ سے وعدہ کیا تھا۔ اسی توحید کو اجاگر کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے اپنے نمائندے انبیاء علیہم السلام کو اس دنیا میں بھیجے۔ اللہ تعالیٰ نے توحید کی نشانی کے لیے ایک گھر بنایا۔ یہ گھر قدیم زمانے کی ایک عمارت ہے۔ بعض مورخ کا کہنا ہے کہ یہ پہلے نبی یعنی حضرت آدم نے بنایا تھا یہ گھر دست دھر سے متاثر رہا آخر اللہ تعالیٰ کے حکم سے حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل علیہما السلام نے انہی بنیادوں پر از سر نو تعمیر کیا۔ دراصل یہ گھر بیت التوحید ہے۔ بعثت رسولؐ سے قبل عربوں نے بیت التوحید کو بیت الشرک بنا دیا۔ رسول کریم ﷺ نے فتح مکہ کے بعد اس گھر کو بتوں سے پاک صاف کیا اور توحید کے تمام تقاضے اس وقت تک پورے نہیں ہو سکتے جب تک ان لوگوں کو بھی بیت اللہ کی حدوں میں داخل ہونے سے منع نہ کیا جائے جو مشرک ہیں سو اللہ تعالیٰ کے حکم سے ان تمام لوگوں کو اس گھر کی حدود میں داخل ہونے سے منع کر دیا ہے جو مشرک ہیں، لا الہ الا اللہ کا یہی تقاضا تھا اور ہے۔

اس میں مشرک لوگوں کو یہ ہدایت دی ہے کہ اس امانت کے تقاضوں کو پورا کریں جس کا تم نے اللہ تعالیٰ سے پورا کرنے کا عہد کیا ہے دراصل مشرکوں کو اس وجہ سے اس گھر کی حدود میں داخل ہونے سے روکا ہے کہ وہ شرک کو ترک کریں اور توحید پر قائم ہوں یہ رکاوٹ اور بندش صرف توحید اور اس کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے ہے۔

بیت اللہ اور اس کی مقرر کردہ حدود لا الہ الا اللہ (توحید) کا مظہر ہیں اس لیے اس کے لیے یہ لازمی قرار دیا ہے کہ اس میں وہی شخص داخل ہو سکتا ہے جو توحید کا اقرار کرنے والا ہو۔

دنیا کے ہر ملک میں کئی ایسی جگہیں ہوتی ہیں۔ وہاں داخلے کے لیے مخصوص شرائط ہوتی ہیں جب تک ان شرائط کو پورا نہ کیا جائے وہاں ہر شخص داخل نہیں ہوسکتا۔

پھر بیت اللہ کو امن کی جگہ قرار دیا ہے وہاں نہ کسی شخص کو مارا جاتا ہے نہ درخت گھاس کاٹی جاتی ہے یہ تمام شرائط انسان کو پرامن زندگی گزارنے کی تلقین کرتی ہیں۔ گو بیت اللہ تمام دنیا کو یہ پیغام دیتا ہے کہ توحید کا عقیدہ اختیار کر کے پرامن زندگی بسر کی جائے۔ یہ کتنا اعلیٰ سبق ہے۔

دوسری حکمت یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے توحید قائم رکھنے کے لیے ایک گھر کی تعمیر کروائی تو اس کی حفاظت کا ذمہ دار موحد قوم کو قرار دیا ہے یہ ایک مسلمہ امر ہے کہ صرف اسلام ہی کامل توحید کا سبق دیتا ہے۔ اس لیے ضروری تھا کہ اسلام کے ماننے والوں کو ہی اس گھر کی حفاظت کا ذمہ دار قرار دیا جائے۔ چنانچہ مسلمان ہی اس گھر کی حفاظت کے ذمہ دار ہیں اور اسلام کا یہ مرکز غیر مسلموں کے تصرف میں کبھی نہ آنے پائے گا۔ یہ علم کمال علم الٰہی پر دلالت کرتا ہے جن کا انکشاف اللہ تعالیٰ نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر کیا یہ ایک زبردست پیشگوئی ہے کہ دورِ حاضر میں یاجوج ماجوج نے اپنی قہری عسکری طاقت سے ہر مسلمان مسلک کو زیر کرلیا۔ لیکن خدا کا گھر یاجوج ماجوج کی یلغار سے محفوظ رہا ہے۔

پس بیت اللہ اور اس کی حدود حرم میں غیر مسلم کا دو وجہ سے داخلہ ممنوع قرار دیا گیا ہے ایک وجہ کعبہ بیت التوحید ہے اس لیے یہ شرط عائد کردی گئی کہ اس گھر میں وہی داخل ہو جو خدا کی امانت یعنی توحید کا حامل ہے۔ جس کا عہد انسان نے اللہ تعالیٰ سے کیا تھا۔

دوم اس کی حفاظت کے لیے ضروری تھا کہ کوئی غیر مسلم یہاں داخل ہی نہ ہو۔ تا کہ وہ کسی رنگ میں بھی کعبہ پر غلبہ حاصل نہ کر پائیں۔ غلبہ کے تمام امکانات ختم کرنے کے لیے یہ شرط عائد کردی کہ کوئی غیر مسلم داخل نہ ہو۔ قرآن مجید میں آتا ہے۔

يَآ أَيُّهَا الَّذِينَ اٰمَنُوْٓا اِنَّمَا الْمُشْرِكُوْنَ نَجَسٌ فَلَا يَقْرَبُوا الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ بَعْدَ عَامِهِمْ هٰذَا (التوبہ 9:28)

اے لوگو! جو ایمان لائے ہو مشرک ضرور پلید ہیں سو اپنے اس سال کے بعد وہ مسجد حرام کے پاس نہ آئیں۔

نجس سے مراد ظاہر پلیدی نہیں بلکہ باطنی ناپاکی ہے وہی روحانی نجاست ہے اس نجاست سے جس کا قلب ناپاک ہو چکا ہے اس کا کوئی حق نہیں کہ وہ بیت التوحید میں داخل ہو۔ بیت اللہ میں داخلہ کے لیے موحد ہونا ضروری ہے۔

سوم: کعبہ اللہ کا گھر ہے اس لیے اس کی حفاظت ضروری ہے کہ اس پر وہ لوگ غلبہ حاصل نہ کرلیں جو اس گھر کی قدر و قیمت نہیں جانتے وہ غلبہ حاصل کر کے وہاں فساد برپا کریں گے۔ یہ وہ وجوہ ہیں جن کی وجہ سے ایک غیر مسلم کو کعبہ اور اس کی مقررہ حدود میں داخل ہونے سے منع کردیا گیا ہے لہٰذا ہر وہ شخص جو لا الہ الا اللہ اور اس گھر کے تقدس کا قائل ہے اس کے لیے اس گھر کے دروازے کھلے ہیں اور دوسروں کے لیے بند۔ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰه کا مظہر صرف بیت اللہ ہی ہے اس کے علاوہ زمین کا کوئی خطہ اس کا مظہر نہیں بن سکتا۔ نہ ہی لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰه کی تفسیر بن سکتا ہے یہ خصوصیت صرف بیت اللہ کو ہی حاصل ہے۔

......☆......

قرآن اساطیر الاولین ہے

اعتراض: قرآن مجید اساطیر الاولین کا مجموعہ ہے۔

(محمدؐ کے متعلق سچائی دنیا کے بدترین عدم رواداری والے مذہب کا بانی مصنفہ رابرٹ سپنسر ص 50)

The Truth abont Muhammad Founder of the World's most Intolerant Religion P.50)

یہ وہ اعتراض ہے صرف موجودہ دور کے متعدد مخالفین نے ہی نہیں لگایا بلکہ کفار نے بھی قرآن مجید کو اساطیر الاولین کہا تھا ارشاد الٰہی ہے۔

لَقَدْ وُعِدْنَا نَحْنُ وَاٰبَآؤُنَا هٰذَا مِنْ قَبْلُ اِنْ هٰذَآ اِلَّآ اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ (المومنون 83:23)

ہمیں اور ہمارے باپ دادوں کو پہلے سے یہی وعدہ دیا جاتا رہا ہے یہ کچھ نہیں مگر پہلوں کی کہانیاں ہیں۔

یہی اعتراض الانعام 25:6 اور الفرقان 5:25 میں دہرایا گیا ہے۔

جرمن ہرشفیلڈ نے اپنی کتاب نیو ریسرچز یعنی نئی تحقیقات میں یہی اعتراض کیا ہے اس کا یہ خیال ہے کہ بائبل کے اس قدر مضامین قرآن شریف کے اندر بھرے ہوئے ہیں کہ ضرور ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کتاب کو پڑھ کر ضروری مضامین کے نوٹ اپنے پاس رکھ لیے ہوں اور پھر انہی نوٹوں کو گاہے بگاہے قرآن مجید میں داخل کر دیا۔ کریمر نے (The Christian message in the Non Christian world) میں لکھا ہے کہ اسلام مختلف مذاہب کا اشتراک ہے۔

جواب: اصولی طور پر اس کا جواب پہلے دیا جا چکا ہے کہ قرآن مجید کی جو تعلیمات دیگر مذاہب کی تعلیمات سے ملتی جلتی ہیں وہ سرقہ نہیں بلکہ یہ وہ دائمی صداقتیں ہیں جو ہر نبی اپنے ساتھ لایا تھا انہی تعلیمات کو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے نئے ضابطوں کے ساتھ پایہ تکمیل تک پہنچایا۔ یہ وہ ضابطہ حیات ہے جو رہتی دنیا تک لوگوں کی ہدایت کا موجب ہے۔

قرآن مجید نے خود اس بات کا اقرار کیا ہے کہ اس کتاب میں پہلی کتب کی تعلیمات موجود ہیں۔ ارشاد الٰہی ہے۔

فِيْهَا كُتُبٌ قَيِّمَةٌ (البینۃ 3:98)

یعنی اس قرآن میں پہلی سماوی کتب کی دائمی اور قائم رہنے والی صداقتیں موجود ہیں۔ یہ آیت ظاہر کرتی ہے کہ اسلام پہلی شرائع کا تسلسل ہے اور پہلی دائمی صداقتوں اور مزید لازوال ضابطوں کے ساتھ شریعت کو مکمل کیا ہے وہ دائمی اور قائم رہنے والی صداقتیں کیا ہیں۔ وہ ہیں ایمانیات، عبادات اخلاق اور معاشرتی تعلیم دائمی صداقتوں کے یہ چند اہم عنوانات ہیں۔ پہلی کتب میں یہ صداقتیں موجود ضرور تھیں لیکن زنگ آلود اور بگڑی ہوئی شکل میں اسلام نے ان دائمی صداقتوں کو از سر نو صیقل کر کے دنیا کے سامنے پیش کیا جہاں ان صداقتوں میں انسانی باطل خیالات کی میل شامل ہو گئی تھی اس کو صاف کیا مثلاً مسئلہ توحید ہے۔ تمام مذاہب کا مشترکہ محور ہے لیکن ہندو دھرم۔ عیسائیت، یہودیت دیگر تمام

مذاہب کے ماننے والوں نے توحید کے آب زلازل کو شرک کی ملونی سے ناپاک کر دیا تھا۔ اسلام نے توحید کے تصور کو تمام نقائص سے پاک کر کے دنیا کے سامنے پیش کیا یہی حالت دیگر عنوانات کی ہے۔ اسلام نے سب صداقتوں کو تمام نقائص سے صاف کر دیا یہ ہے اساطیر الاولین (پہلوں کی کہانیاں) کی حقیقت ہے۔

اگر قرآن مجید کی تعلیم اساطیر الاولین (پہلے قصے کہانیاں) ہوتی تو پہلے قصے کہانیوں کے لیے لوگ جانیں قربان نہ کرتے۔ صحابہ نے قرآن مجید کی تعلیم کے لیے جس قدر تکالیف برداشت کیں۔ اس کی مثال کہیں نہیں ملتی کوئی شخص بھی بوسیدہ اور پرانے تصورات پر جان نہیں دیتا ہے۔ انسان انہی تصورات کے لیے جان دیتا ہے جس میں اپنی نجات اور فلاح سمجھتا ہے۔

قرآن مجید ایک معجزہ ہے۔ مخالفین کو یہ چیلنج کیا ہے کہ اس کی مثل بنالاؤ لیکن عربوں میں بڑے بڑے فصحاء و بلغاء موجود ہونے کے باوجود کسی نے بھی اس چیلنج کو قبول نہ کیا۔ اگر قرآن مجید اساطیر الاولین کا مجموعہ ہوتا تو وہ اعجاز نہیں ہوسکتا تھا قرآن مجید کا معجزہ ہونا یہ بات ظاہر کرتی ہے کہ مذاہب عالم کی مشترکہ تعلیم کو نئے ضابطوں کے ساتھ ایک ایسا اعجازی رنگ دیا ہے جس کی وجہ سے تمام قرآن ایک معجزہ بن گیا۔ جس کی نظیر کوئی شخص نہیں لاسکتا۔

الزامی جواب:

قرآن مجید نے جہاں مذاہب عالم کی دائمی صداقتوں کو تمام انسانی ملونی سے پاک کر کے اختیار کیا وہاں ان کے باطل عقائد کا رد بھی کیا ہے۔

ہندومت:

تریمورتی (تین بڑے خدا براہمہ، شیوا اور وشنو) کا رد۔ ویدوں کے ظالمانہ احکام۔ عورتوں سے ناانصافی، طبقاتی تقسیم اور معاشرہ کی درجہ بندی، برہمن، کشتری، ویش شودر، غلامی کا رواج، مادہ و روح کا ازلی ابدی ہونا، تناسخ۔

یہودیت:

ابنیت (حضرت عزیر کو خدا کا بیٹا بنانا) مختلف انبیاء علیہم السلام پر سنگین الزامات، غلاموں، لونڈیوں اور جنگی قیدیوں کے متعلق ظالمانہ احکام۔

عیسائیت:

تثلیث (تین خدا ہیں باپ، بیٹا اور روح القدس) کفارہ (حضرت عیسیٰ علیہ السلام اپنے ماننے والوں کے تمام گناہوں کا بوجھ لے کر صلیب پر چڑھ گئے۔)

مختلف مذاہب کے اندر مذکورہ باطل عقائد رائج تھے۔ جن کی اصلاح اسلام نے کی۔ یہ عقائد بھی اساطیر الاولین میں شامل تھے۔ اسلام نے ان اساطیر الاولین کو اختیار کرنے کی بجائے ان کا رد کیا۔ ان کی جگہ خالص توحید پیش کی۔ حقوق انسانی کا مکمل ضابطہ دیا۔ غلامی کی رسم کو ہمیشہ کے لیے ختم کیا۔ عورتوں کے حقوق بحال کیے۔ ہر شخص کو اپنے اعمال کا ذمہ دار قرار دیا۔ مادہ روح کو مخلوق قرار دیا۔ تمام باطل عقائد کو رد کرنے کے باوجود یہ اعلان بھی کیا۔

فِيهَا كُتُبٌ قَيِّمَةٌ (البينة)

کہ اس میں قائم رہنے والی کتب موجود ہیں۔

یعنی وہ تمام دائمی صداقتیں جو انبیاء علیہم السلام لائے تھے وہ تمام صداقتیں اس قرآن مجید میں موجود ہیں۔ یہ اسلام کی صداقت کی

دلیل ہے کہ یہ وہی دین ہے جس کی تبلیغ پہلے انبیاء علیہم السلام کرتے چلے آئے ہیں۔ یہ پہلے انبیاء کا دین ہے۔
یہی وہ نکتہ ہے جس کو معترضین نہ سمجھ سکے۔

☆......☆
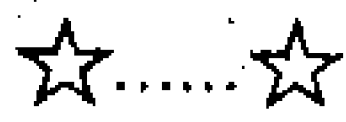
حقوق الذمیین پر اعتراض

اعتراض: حضرت عمر نے ذمیوں کے حق میں یہ حکم دیا کہ وضع اور لباس وغیرہ میں کسی طرح مسلمانوں کا تشبہ نہ کر پائیں کمر میں زنار نہ باندھیں، لمبی ٹوپیاں پہنیں، گھوڑوں پر کاٹھی کسیں، نئی عبادت گاہیں نہ بنائیں، شراب اور سور نہ بیچیں، ناقوس نہ بجائیں۔ صلیب نہ نکالیں۔ بنو تغلب کو یہ بھی حکم دیا یہ اپنی اولاد کو اصطباغ نہ دیں۔ مزید براں حضرت عمرؓ نے عرب کی وسیع آبادی میں ایک یہودی اور عیسائی کو نہ رہنے دیا اور بڑے بڑے قدیم خاندان جو سینکڑوں برس سے عرب میں آباد تھے۔ جلاوطن کر دیئے۔

اس اعتراض کو متعدد مخالفین نے اپنی اپنی کتب میں دہرایا ہے ابن وراق نے اپنی تصنیف "میں کیوں ایک مسلمان نہیں" کے صفحہ 182 پر لکھا ہے۔

جواب: اس اعتراض کو تین حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلے میں اسی اعتراض کا روبیان کرتا ہوں۔ تا کہ قاری کے سامنے اعتراض کی حقیقی نوعیت سامنے آجائے دوم رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں ذمیوں کے ساتھ حسن سلوک، کیونکہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا اسوہ حسنہ ہی مسلمان حکمرانوں کے لیے واجب الاتباع ہے۔
حضرت عمرؓ نے معاہدات کرتے وقت غیر مسلموں کو کس قدر برابری کے حقوق عطا کیے۔ گو پچھلے دو حصوں کو جواب میں شامل کرنا ضروری نہیں۔ چونکہ متعدد مخالفین نے یہ اعتراض کیا ہے اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ اسلام میں دیگر مذاہب کے متعلق کوئی رواداری اور برابری کا سلوک نہیں پایا جاتا۔

صلیب اور ناقوس:

ذمیوں کو نئی عبادت گاہیں، شراب بیچنے، صلیب نکالنے، ناقوس پھونکنے اور اصطباغ دینے سے روکنے کے متعلق یہ گزارش ہے یہ احکام حضرت ابوبکر اور حضرت عمر نے جن قیدیوں کے ساتھ جاری کیے تھے وہ بالکل مناسب تھے لیکن بعد کے آنے والے مورخوں نے ان قیدیوں کا ذکر چھوڑ دیا۔ اس وجہ سے عام غلط فہمی پھیل گئی صلیب کی نسبت معاہدے میں جو شرط تھی وہ یہ تھی کہ۔

وَلَا تَرْفَعُوا فِي نَادِي اَهْلِ الْاِسْلَامِ صَلِيْباً (کتاب الخراج ص 80)
کہ مسلمانوں کی مجلس میں صلیب نہ نکالیں۔

زنار:

زنار سے فقہا نے غلطی کھائی ہے انہوں نے زنار سے مراد ایک انگل برابر موٹا ایک قسم کا جینو مراد لیا ہے۔ یہ تحقیر کے لیے کوئی نشان نہیں تھا۔ بلکہ یہ ایک پیٹی تھی جس کو عربی میں منطقہ بھی کہا جاتا ہے اس لیے زنار اور منطقہ مراد ہیں۔ یہ لباس ذمیوں کا قدیم لباس تھا۔ خلیفہ منصور نے اپنے دربار کے لیے جو لباس قرار دیا تھا وہ قریب قریب یہی لباس تھا۔ جو حضرت عمر نے ذمیوں کے لیے مقرر کیا تھا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ لباس کسی کی تحقیر کے لیے نہ تھا اگر وہ ایک غلامی کی علامت ہوتا تو خلیفہ منصور وہ لباس اپنے درباریوں کے لیے قطعاً پسند نہ کرتے۔ زنار بھی عجمیوں کی تہذیبی نشانی تھی۔

لباس:

حضرت عمرؓ نے غیر مسلموں کو اسی لباس کے پہننے کی پابندی کی تاکید کی تھی وہ وہی لباس تھا جس کو قدیم سے پہنتے چلے آرہے تھے حضرت عمر نے تحقیر کی بنا پر وہ لباس تجویز نہیں کیا تھا۔ وہ عجمیوں کا قدیم لباس تھا۔ حضرت عمر کا معاہدہ جس کو کنز العمال وغیرہ نے نقل کیا ہے راویوں نے اس میں کمی بیشی کردی ہے۔ وہاں ذمیوں کا یہ اقرار بھی مذکور ہے کہ ہم فلاں فلاں لباس نہ پہنیں گے وہاں یہ الفاظ بھی مذکور ہیں۔

وَاَنْ نَلْزِمَ زِيْنَاً حَيْثُ مَا كُنَّا (کنز العمال جلد دوم ص 202)

یعنی ہم وہی لباس پہنیں گے جو ہم ہمیشہ پہنتے چلے آئے تھے یہ الفاظ واضح کرتے ہیں کہ حضرت عمر نے جس لباس کے پہننے کا حکم دیا تھا وہ وہی تھا جو وہ قدیم سے پہنتے چلے آرہے تھے۔

اس فرمان میں عجمیوں کے تمدن کی حفاظت کا پہلو بھی نکلتا ہے لباس تہذیب وتمدن کا حصہ ہے۔ حضرت عمر نے ان کو مجبور نہیں کیا۔ کہ وہ مسلمانوں کا لباس نہ پہنیں۔ بلکہ ان کے لیے یہ لازم قرار دے دیا کہ اپنی تہذیب کے مطابق اپنا پرانا لباس ہی پہنے رکھیں عموماً یہ دیکھا جاتا ہے کہ حاکم قومیں اپنی مفتوحہ رعایا کا ذہن محکوم کرنے کے لیے ان کا لباس بدل دیتی ہیں۔ حضرت عمر نے یہ کام نہیں کیا۔ بلکہ ان کے تمدن کو قائم رکھا۔

ناقوس:

ناقوس کی نسبت آتا ہے۔

يَضْرِبُوا نَوَاقِيْسِهِمْ فِي اَىّ سَاعَةٍ شَآؤ امِنْ لَيْلٍ وَ نَهَارٍ اِلاَّفِي اَوْقَاتِ الصَّلٰوةِ (کتاب الخراج ص 86)

یعنی دن رات جس وقت چاہیں ناقوس بجائیں بجز نماز کے اوقات۔

سور:

سور کے متعلق آتا ہے۔

وَلَا يَخْرِجُوا خَنْزِيْراً مِنْ مَنَازِلِهِمْ اِلىٰ اَفْنِيَةِ الْمُسْلِمِيْنَ

یعنی ذمی سور کو مسلمانوں کے احاطہ میں نہ لے جائیں معاہدے کی شرائط ظاہر کرتی ہیں صلیب نکالنے، ناقوس بجانے کی بندش مخصوص جگہ اور وقت کے لیے تھی۔ یہ عمومی حکم نہ تھا کہ وہ کسی صورت میں نہ صلیب نکال سکتے ہیں اور نہ ناقوس بجا سکتے ہیں سور کے لیے یہ شرط عائد کی ہے کہ وہ مسلمانوں کے احاطہ سے دور رکھا جائے۔

یہ بندشیں تو دور حاضر میں بھی ہیں اور ہونی چاہئیں۔ تاکہ معاشرہ میں امن قائم رہے اور لڑائی جھگڑے سے بچا جائے۔ یہ دل آزاری سے بچنے کی تدابیر ہیں۔ جن کو معترضین نے ہدف تنقید بنالیان ہے۔

اصطباغ سے منع کرنا:

اس کا پس منظر یہ ہے یہ بنوتغلب کے ان لوگوں کے متعلق ہے جو مسلمان ہوئے ہو گئے اور فوت ہو گئے اور اپنے پیچھے نابالغ اولاد چھوڑ گئے۔

ان کے لیے یہ شرط عائد کی علامہ طبری نے جہاں بنوتغلب کے واقعہ کا ذکر کیا ہے وہاں شرائط صلح میں یہ الفاظ ہیں۔

عَلٰیٓ اَنْ لَّا یَنْصُرُوْا اَوْلَادُھُم اِذَا اَسْلَمَ اٰبَآءُ ھُم (طبری 23,23)

کہ وہ اپنی اولاد کو عیسائی نہ بنائیں جب ان کے باپ مسلم ہو گئے ہوں۔

حضرت عمرؓ کے پاس اس قسم کے واقعات آئے کہ باپ مسلمان ہو گیا تھا اور مرتے وقت اپنے پیچھے نابالغ بچے چھوڑ گیا۔ تو بچوں کی پرورش اور تربیت کا مسئلہ پیش آیا۔ تو اس قسم کے واقعات کے لیے یہ شرط عائد کر دی گئی کہ اس قسم کے بچوں کو اصطباغ نہ دیا جائے۔ بالغ ہونے پر جو چاہیں مذہب اختیار کر لیں۔ یہ شرط صرف بنوتغلب کے ان لوگوں کے متعلق ہے جو دائرہ اسلام میں داخل ہو گئے اور فوت ہو گئے اور اپنے پیچھے نابالغ اولاد چھوڑ گئے۔ یہ کوئی عمومی حکم نہ تھا۔ یہ حکم دور حاضر کے بین الاقوامی قانون کے مطابق ہے کہ نابالغ بچوں پر کوئی مذہب ٹھونسا نہیں جا سکتا۔

قارئین مذکورہ شرائط سے اندازہ لگا لیں۔ امن عامہ میں خلل نہ واقع ہونے کے لیے عیسائیوں کو یہ حکم دیا گیا کہ وہ مسلمانوں کی مجلس میں صلیب اور سور نہ لے جائیں نماز کے وقت ناقوس نہ بجائیں اور نومسلم عیسائیوں کی اولاد کو اصطباغ نہ دیں اس میں کون سی شرط ہے جو حقوق انسانی کے خلاف ہے اور مذہبی تعصب کو ظاہر کرتی ہے معاشرہ میں امن کا مسئلہ ہوتا ہے اس مسئلہ کو حل کرنے کے لیے یہ شرائط عائد کی گئی تھیں یہ کسی بین الاقوامی کے قانون سے متصادم نہیں۔

عیسائیوں کے جلاوطنی کا مسئلہ:

یہودیوں اور نصرانیوں کو اس وجہ سے ان کے علاقوں سے جلاوطن کیا گیا وہ اندرونی سازشوں سے باز نہیں آتے تھے۔ حضرت عمرؓ کے دور میں یہودیوں کی سازشیں اور شرارتیں اپنی انتہا کو پہنچ چکی تھیں حضرت عبداللہ بن عمر کو ایک دفعہ بالا خانہ سے دھکیل دیا جس سے ان کے ہاتھ میں زخم آیا۔ مجبوراً حضرت عمر نے ایک عام مجمع میں ان کی سازشوں شرارتوں اور قوانین شکنی کا ذکر کیا پھر ان کو عرب سے نکال دیا۔ (فتوح البلدان صفحہ 25 کتاب الخراج ص 29)

نجران کے عیسائی یمن اور اس کی اطراف میں آباد تھے۔ انہوں نے جنگی تیاریاں شروع کر دیں۔ حضرت عمرؓ نے ان کو یہ حکم دیا کہ وہ یمن کو چھوڑ کر عراق چلے جائیں۔ (کتاب الخراج صفحہ 43)

الغرض تاریخ اس امر پر شاہد ہے کہ یہودیوں اور نصرانیوں کو ان کی شرارتوں کی وجہ سے جلاوطن کیا گیا۔ اگر جلاوطن نہ کیے جاتے تو ملک میں فساد برپا ہو جاتا۔ یہ قومیں اپنے مذہبی جنون کی وجہ سے پرامن نہ رہتی تھیں۔ لوگوں کو ان کی شرارتوں سے محفوظ رکھنے کے لیے یہ ضروری تھا کہ ان کو جلاوطن کیا جاتا۔ جلاوطنی کے وقت ان کا مال اسباب اور اراضی کا پورا پورا معاوضہ دیا گیا۔ بڑی سہولت کے ساتھ ان کو جلاوطن کیا گیا۔ جلاوطنی بھی اسلامی علاقے میں تھی یہ جلاوطنی نہیں کہنا چاہیے بلکہ انتقال مکانی کہنا چاہیے بھرپوری سہولت کے ساتھ پُرامن طریقے کے ساتھ۔ سلطنتیں شرارتی اور فسادی لوگوں کے لیے اس قسم کی سزائیں مقرر کر دیتی ہیں یہ کوئی بے انصافی نہیں۔ یہ بے انصافی اس وقت کہی جا سکتی تھی جب یہودیوں اور عیسائیوں کو زبردستی ان کے گھروں سے نکال دیا جاتا۔ اور ان کے مال و اسباب اور اراضی کو زبردستی چھین لیا جاتا۔ ان کو تو ہر سہولت کے ساتھ صرف نقل مکانی کے لیے کہا گیا۔ وہ بھی ان کی مبینہ شرارتوں اور قانون شکنی کی وجہ سے۔ مسلم ریاست کی طرف سے یہ حکم کیا جاتا ہے "عراق یا شام جہاں یہ لوگ جائیں وہاں کے عمال ان کی آبادی اور زراعت کے لیے ان کو زمین دیں جس مسلمان کے پاس یہ کوئی

فریاد لے جائیں وہ ان کی مدد کرے چوبیس مہینے تک ان سے مطلقاً جزیہ نہ لیا جائے۔"

قاضی ابو یوسف نے کتاب الخراج میں اس معاہدے کو نقل کیا ہے۔ (صفحہ 41) کیا کوئی ایسی تاریخی مثال دے سکتا ہے کہ باغی اور فسادی لوگوں کو اس قسم کی رعایتیں دی گئی ہوں جو مسلمانوں نے دی تھیں حضرت عمرؓ کے سامنے صرف ان کو ان شرارتوں سے باز رکھنا مقصود تھا۔ یہ ہر حکومت کا فرض ہوتا ہے فرض کی ادائیگی کو مذہبی تعصب اور سزا نہیں کہا جا سکتا۔

الزامی جواب:

بائبل کا یہ حکم ہے "جب خداوند تیرا خدا اسے تیرے قبضہ میں کر دے تو وہاں کے ہر ایک مرد کو تلوار کی دھار سے قتل کر لیکن ان قوموں کے شہروں میں جنہیں خداوند تیرا خدا میراث کر دیتا ہے کسی چیز کو جو سانس لیتی ہے جیتا نہ چھوڑیو (استثناء 16,13:20)

بائبل کے اس حکم کو سامنے رکھا جائے پھر حضرت عمر کے حکم "نقل مکانی" کا اندازہ لگا لیا جائے کہ کون سا حکم ظالمانہ ہے اور کون سا حکم عادلانہ حضرت عمر پر تاریخی پس منظر سامنے نہ رکھنے کی وجہ سے مستشرقین اور مخالفین نے اعتراض کیا ہے۔

دوسرا حصہ

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مفتوح لوگوں کو حسب ذیل حقوق دیئے۔

1- باہر کے دشمن کے حملے کے وقت ان کی طرف سے مدافعت کی جائے گی۔ (فتوح البلدان ص 59) الفاظ یہ ہیں یمنعوا (فتوح البلدان ص 59)

2- مذہب کے بارے میں کوئی جبر نہیں ہوگا۔ لا یفتنوا عن دینھم۔

3- جزیہ کی ادائیگی کے لیے ان کو محصل کے پاس نہ جانا پڑے گا۔

4- جان کی حفاظت کی ذمہ داری۔

5- مال کی حفاظت کی ذمہ داری۔

6- ان کے قافلوں اور کاروانوں (تجارت) کی حفاظت کی ذمہ داری۔

7- ان کی اراضی محفوظ رہے گی۔

8- ان کی تمام مملوکہ اشیاء بحال رہیں گی۔

9- پادری، رہبان اور گرجوں کے پجاری اپنے عہدوں سے برطرف نہیں کیے جائیں گے۔

10- صلیبوں اور مورتیوں کو نقصان نہیں پہنچایا جائے گا۔

11- ان سے عشر نہیں لیا جائے گا۔

12- ان کے ملک میں فوج نہیں بھیجی جائے گی۔

13- ان کا مذہبی عقیدہ بدلوایا نہیں جائے گا۔

14- ان کا کوئی حق جو ان کو پہلے سے حاصل تھا زائل نہیں کیا جائے گا۔

15- جو لوگ اس وقت حاضر نہیں ہیں یہ احکام ان کو بھی شامل ہوں گے۔

پہلے اور دوسرے حقوق کے علاوہ دوسرے حقوق فتوح البلدان ص 65، کتاب الخراج میں درج ہیں۔

تیسرا حصہ

حضرت عمرؓ کا معاہدہ بیت المقدس:

یہ معاہدہ اس وجہ سے اہم ہے کہ حضرت عمرؓ نے خود بیت المقدس جا کر معاہدہ کیا تھا۔

''یہ وہ امان ہے جو خدا کے غلام امیر المومنین عمرؓ نے ایلیا کے لوگوں کو دی۔ یہ امان ان کی جان مال گرجا، صلیب، تندرست بیمار اور ان کے تمام مذہب والوں کے لیے ہے اس طرح پر کہ ان کے گرجاؤں میں نہ سکونت کی جائے گی۔ نہ وہ ڈھائے جائیں گے۔ نہ ان کو اور نہ ان کے احاطہ کو کچھ نقصان پہنچایا جائے گا۔ نہ ان کی صلیبوں اور ان کے مال میں کچھ کمی کی جائے گی۔ مذہب کے بارے میں ان پر جبر نہ کیا جائے گا نہ ان میں سے کسی کو نقصان پہنچایا جائے گا۔ ایلیا میں ان کے ساتھ یہودی نہ رہنے پائیں گے۔ ایلیا والوں پر یہ فرض ہے کہ اور شہروں کی طرح جزیہ دیں اور یونانیوں کو نکال دیں۔ ان یونانیوں میں سے جو شہر سے نکلے گا اس کی جان اور مال کو امن ہے تا کہ وہ جائے پناہ میں پہنچ جائے اور جو ایلیا ہی میں رہنا اختیار کرے تو اس کو بھی امن ہے اور اس کو جزیہ دینا ہوگا اور ایلیا والوں میں سے جو شخص اپنی جان اور مال لے کر یونانیوں کے ساتھ چلا جانا چاہے تو ان کو اور ان کے گرجاؤں کو اور صلیبوں کو امن ہے۔ یہاں تک کہ وہ اپنی جائے پناہ تک پہنچ جائیں۔ اور جو کچھ اس تحریر میں ہے اس پر خدا کا رسول خدا کے خلفاء کا اور مسلمانوں کا ذمہ ہے بشرطیکہ یہ لوگ جزیہ مقررہ ادا کرتے رہیں اس تحریر پر گواہ ہیں خالد بن ولید اور عمرو بن العاص اور عبدالرحمن بن عوف اور معاویہ بن ابی سفیان اور 15ھ میں لکھا گیا (تاریخ طبری فتح بیت المقدس ص 125)

اس معاہدہ میں عیسائیوں کے جان مال اور مذہب کی حفاظت کی ضمانت دی گئی ہے۔

بیت المقدس سے یہودیوں کو جانے کی شرط اس وجہ سے عائد کی گئی تھی کہ یہودیوں نے حضرت عیسیٰؑ کو بیت المقدس میں صلیب دی تھی۔ اس دور میں یہود اور نصرانیوں کے درمیان شدید نفرت تھی۔ شہر کو پرامن بنانے کے لیے یہ ضروری تھا کہ یہود کو اس شہر سے نکال دیا جائے۔ پھر نکالا بھی پوری عزت اور سہولت کے ساتھ۔ عیسائیوں کے مذہبی جذبات کی خاطر یہود کو ایلیا (بیت المقدس) سے نکالا گیا تھا۔

ذمیوں کی جان و مال کو مسلمانوں کی جان و مال کی طرح قرار دیا گیا اگر مسلمان عیسائی قتل کر دیتا تو قاتل کو سزائے قتل دی جاتی۔ معاملات ملکی میں ذمیوں سے مشورہ لیا جاتا۔ ایک دفعہ کسی سفر میں حضرت عمرؓ نے دیکھا کہ چند ذمیوں کو جزیہ نہ دینے کی وجہ سے ایذا دی جا رہی ہے وجہ دریافت کی تو معلوم ہوا کہ وہ نادار اور مفلس ہیں حضرت عمرؓ نے ان کو چھوڑنے کا حکم دیا۔ نادار ذمیوں کو بیت المال سے وظیفے دیے جاتے۔ مسلمان فاتح ہونے کے باوجود عیسائیوں کی دل آزار بات کو بھی برداشت کر لیتے ایک دفعہ ایک عیسائی نے غرفہؓ صحابی کے سامنے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو علی الاعلان گالی دی۔ صحابی نے عیسائی کو تھپڑ دے مارا۔ عیسائی نے حضرت عمرو بن العاصؓ سے شکایت کی صحابی نے کہا کہ یہ اپنے گرجا میں جو چاہیں کہیں لیکن علی الاعلان نازیبا لفظ کہنے کا مجاز نہیں رسول کریم ﷺ کے لیے دشنام سن کر ایک صحابی کا عیسائی کی طرف ایک تھپڑ مارنا بتاتا ہے کہ مسلمانوں میں کس قدر مذہبی رواداری تھی۔ جزیہ جمع کرنے میں بھی محصل ذمیوں پر زبردستی اور سختی نہیں کر سکتا تھا۔ حضرت عمرؓ باقاعدہ ان سے چار دفعہ بتاکید قسم لیا کرتے تھے کہ جزیہ کے وصول کرنے میں سختی تو نہیں کی۔ وفات سے دو تین دن پہلے کا واقعہ ہے کہ منتظمین بندوبست مال گزاری کو بلایا اور جزیہ جمع کرنے کے متعلق ان سے دریافت کیا اور بار بار دریافت کرتے رہے کہ جمع جزیہ میں سختی تو نہیں کی۔ (کتاب الخراج ص 21)

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے قبل متمدن ترقی یافتہ ممالک کی حربی ثقافت کا مطالعہ کیجیے تو یہ بات تاریخی لحاظ سے ثابت ہو جاتی ہے جب مفتوحہ قوم کسی فاتح کے زیر ہو جاتی تو پھر وہ غلامی کی زنجیروں میں جکڑی جاتی اور تمام حقوق انسانی سے محروم ہو جاتی۔ ذلت اور

اہانت کی زندگی بسر کرتی۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پہلے حکمران ہیں جنہوں نے ذلت آمیز جنگی قواعد کی اصلاح کی اور مفتوحہ قوم کو انسانی حقوق سے محروم نہیں کیا۔ ان کی جان، مال اور عزت کو ویسے ہی واجب الاحترام گردانا جو ایک مسلمان کو حاصل تھا۔ امور سلطنت میں برابر کے شریک تھے۔ ان سے مشورہ لیا جاتا ان کو کلیدی عہدے دیئے جاتے اور وہ اپنے آپ کو باعزت شہری سمجھتے۔ حضرت عمرؓ کے معاہدے کو بالکل غلط رنگ دیا جاتا ہے۔ حضرت عمر نے غیر مسلموں (ذمیوں) کی عمرانی ثقافت کی حفاظت کی تھی۔ نہ کہ ان کی توہین اور تحقیر کی۔ پرانی ثقافت کو اپنانا ذمیوں کی اپنی مرضی تھی۔ جیسا کہ یہ الفاظ ظاہر کرتے ہیں۔

وَاَن نَلْزِمَ زِیْنَا حَیْثُ مَا کُنَّا

یعنی ہم وہی لباس پہنیں گے جو ہمیشہ پہنتے آتے ہیں۔

☆......☆
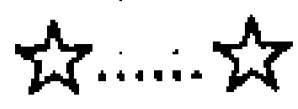
ذوالقرنین کا سورج کو دلدل میں غروب ہوتے دیکھنا

اعتراض :ذوالقرنین نے مغرب میں جا کر دیکھا کہ سورج دلدل میں غروب ہوتا ہے۔(ترک اسلام سوال نمبر 79) دیانند نے بھی سیتارتھ پرکاش میں یہی اعتراض کیا ہے۔سوال نمبر 106۔

جواب:ذوالقرنین کون تھا اور وجہ تسمیہ:

مادہ اور فارس کے بادشاہوں میں سے دارائے اول (521 تا 548 قبل از مسیح) وہ شخص ہے جس پر قرآن مجید کا یہ بیان جو ذوالقرنین کے متعلق ہے صادق آتا ہے چنانچہ جیوش انسائیکلو پیڈیا میں اس کے متعلق لکھا ہے کہ دارا ایران کی شہنشاہیت کی تنظیم کرنے والا تھا اس کی فتوحات نے اس کی سلطنت کی حدود کو ارمیبا اور کوہ قاف اور ہندوستان اور تورانی پہاڑوں اور وسط ایشیا کے مرتفع میدانوں میں درست کر دیا۔"

انسائیکلو پیڈیا بری ٹانیکا میں دارا کو زردشت کا مذہب کا پیروکار اور ایک مدبر بادشاہ قرار دیا ہے جس نے پانٹک اور ارمیبا کے پہاڑوں کی وحشی اقوام کو زیر کیا تھا اور ایران کی سلطنت کی حدود کو کوہ قاف تک وسیع کیا اور اس نے ساسی اور تورانی قوموں سے بھی لڑائی کی۔

وجہ تسمیہ:

قرن کے معنی شجاعت اور قوت کے ہیں جانوروں کے سینگ کو بھی قرن اسی لیے کہتے ہیں وہ ان کی قوت میں مدد دیتے ہیں۔ دارا کے ماتحت مادہ اور فارس کی دو مملکتیں تھیں ان کی قوت کا باعث تھیں اس لیے اس کو ذوالقرنین کہا گیا ہے اس عقدہ کا حل بائبل نے کیا ہے جہاں دانیال کی رؤیا میں دو سینگ والے مینڈھے کا ذکر ہے اور اس کی تعبیر کا بھی وہیں ذکر ملتا ہے" وہ مینڈھا جسے تو نے دیکھا کہ اس کے دو سینگ ہیں سو مادہ اور فارس کے بادشاہ ہیں۔(دنیال 20:8)

پس ذوالقرنین سے مراد دارائے اول بادشاہ ایران ہیں جن کے ماتحت مادہ اور فارس کی دو عظیم مملکتیں تھیں۔

سورج کو دلدل میں غروب ہوتے پانا:

ذوالقرنین (دارائے اول) نے اپنی سلطنت کے دور دراز ملکوں کا سفر اختیار کیا۔ اس کے مغرب کی طرف دلدلیں کنارہ ہائے بحیرہ خضر تھیں۔ جب ذوالقرنین اپنے ملک کی آخری سرحد پر پہنچا تو اس کے آگے بحیرہ خضر تھا۔ اس کا ذکر قرآن مجید میں آتا ہے معترض نے اعتراض کیا ہے۔

حَتّٰۤی اِذَا بَلَغَ مَغْرِبَ الشَّمْسِ وَجَدَ هَا تَغْرُبُ فِیْ عَیْنٍ حَمِئَةٍ (الکہف 18:86)

یہاں تک کہ جب وہ ادھر پہنچا، جدھر سورج ڈوبتا تھا اسے سیاہ کیچڑ والے پانی میں غائب ہوتا ہوا پایا۔

مغرب الشمس سے مراد اس کے اپنے ملک کی مغربی سرحد ہے جہاں تک وہ جا سکتا ہے اس کے آگے بحیرہ وہاں اس کی آنکھ نے محسوس کیا کہ سورج دلدل میں غائب ہو رہا ہے۔ غرب سے مراد ڈوبنا نہیں بلکہ غائب ہونا ہے۔ اس قسم کا نظارہ ہر روز ہماری آنکھ کرتی ہے جب ہم کسی جنگل میں ہوں تو ہماری آنکھ دیکھتی ہے کہ سورج درختوں کے پیچھے غائب (غروب) ہو رہا ہے۔ یعنی نظر سے اوجھل ہو رہا ہے اس طرح جب سمندر میں سفر کر رہے ہوں تو سورج کو پانی میں ڈوبتے دیکھتے ہیں۔ یہ صرف آنکھ کے نظارے ہیں۔ جو ہم اپنی زبان میں بولتے ہیں۔ یہاں علم ہیئت کی بات نہیں ہو رہی بلکہ محض آنکھ کا نظارہ بیان کرنا مقصود ہوتا ہے کہ سورج آنکھ سے اوجھل ہو گیا ہے۔ اس کلام کی تصدیق آج بھی سمندر کے کنارے کھڑے ہو کر کر سکتے ہیں صرف سورج کو سمندر میں غروب ہوتا ہوا پائیں گے۔

معترض نے عربی کی زبان کی اس باریکی کو نہیں سمجھا جو "تغرب" میں پائی جاتی ہے وہاں مراد صرف آنکھ سے اوجھل ہونا ہے نہ کہ غروب ہونا۔ اس قسم کے نظارے ہم ہر روز دیکھتے ہیں اور بیان کرتے ہیں یہ ہر روز آنکھ سے دیکھے ہوئے نظارے کا بیان ہے۔ علم ہیئت کا ذکر نہیں کہ واقعی سورج دلدل میں غروب ہو رہا تھا۔ ایسے بدیہی نظاروں پر اعتراض کرنا اپنی جہالت اور کم علمی کا اظہار ہے۔

الزامی جواب:

وید میں تو صاف لکھا ہے کہ سورج سمندر سے نکلتا ہے وید کے الفاظ "شہسر شرنگو ورکھبو یہ سمدرات یعنی ہزار سینگوں والا بیل (سورج) سمندر سے طلوع ہوتا ہے۔

کیا اس وید کے منتر سے یہ سمجھ لیا جائے کہ سورج سمندر سے طلوع ہوتا ہے۔

☆......☆

ذوالقرنین کا یاجوج ماجوج کو سمندر میں قید کرنا

اعتراض :ذوالقرنین نے یاجوج ماجوج کو آہنی دیوار سے سمندر کے بیچ میں قید کر دیا۔ (دھرم پال ترک اسلام سوال 80)

سوامی دیانند جی نے سیتارتھ پرکاش میں یہ اعتراض کیا ہے۔ "اور دیکھیے خدا کا انصاف خود ہی وہ دنیا کا خالق حاکم اور انصاف کنندہ ہے اور خود ہی یاجوج ماجوج کو فساد کرنے پر آمادہ کرتا ہے کیا یہ اس کی خدائی کے شایان ہے ایسے خدا پر جنگلی لوگ ہی یقین کر سکتے ہیں۔" (سوال 106)

جواب: یاجوج ماجوج دو قوموں کے وصفی نام ہے یہ دو قومیں دور حاضر کے مورخین کے نزدیک مسلمہ طور پر روس اور اہل برطانیہ ہیں مورخین

اپنی اس تحقیق کی بنیاد بائبل پر رکھتے ہیں۔انگلستان میں یاجوج ماجوج کے دو بت گلڈ ہال کی دیوار کے دو زاویوں پر رکھے ہوئے ہیں۔یہ دو بت دو قوموں کے نشان کے طور پر رکھے ہوئے ہیں یہ بت کپتان رچرڈ ساؤنڈرس نے بنائے تھے۔اپنی کارگری کے عوض ستر پونڈ حاصل کیے۔

سد سکندر:

تاریخ اس بات کی شاہد ہے کہ وہ قومیں جو ارمینیا اور اذر بائیجان کے پہاڑوں کے درمیان رہتی تھیں وہ اپنے شمالی ہمسایوں یعنی یاجوج ماجوج سے ہمیشہ تکلیف اٹھاتی رہتی تھی۔ان پر حملے ہوتے رہتے تھے چنانچہ انسائیکلو پیڈیا بری ٹانیکا میں ہے وہی سیتھین قومیں جنہیں ماجوج قرار دیا گیا ہے میدہ پر 28 سال تک حکمران رہے اور 512 قبل مسیح کے قریب دارائے اول نے حملہ کر کے ان کو شکست دی۔اس جنگ کا مقصد یہ تھا کہ تورانی قوموں پر عقب کی طرف سے حملہ کر کے سلطنت کی شمالی سرحد کو پُر امن بنایا جائے اس سے قرآن مجید کے اس بیان کی تائید ہوتی ہے جو ذوالقرنین کے سفر شمال کے متعلق ہے نیز اس کی کہ کوہ قاف سے شمال کی طرف رہنے والی قوموں کی طرف سے ایران کی شمالی سرحد کی قوموں پر حملے ہوتے رہتے تھے۔ان حملوں کے بچاؤ کے لیے ذوالقرنین (دارائے اول) نے ایک دیوار تعمیر کی۔یہ وہ دیوار ہے جو دربند پر بحیرہ خضر کے کنارے واقع ہے بنی ہوئی ہے مسلمان جغرافیہ نویسوں نے اس دیوار کا ذکر کیا ہے چنانچہ مراصد الاطلاع میں اس کا ذکر ہے۔انسائیکلو پیڈیا بری ٹانیکا میں اس دیوار کا حسب ذیل ذکر ہے۔دربند ایران کا ایک شہر ہے جو علاقہ قاف میں داغستان کے صوبہ میں ہے اور بحیرہ خضر کے مغربی کنارہ پر ہے...... یہ سمندر کے ساتھ ہی ایک تنگ قطعہ زمین پر واقع ہے جہاں سے یہ ڈھلوان بلندیوں پر خشکی کے اندر کو اونچا چلا گیا ہے...... اور جنوب کی طرف دیوار قاف کا سمندر کی طرف کا سرا واقع ہے جو پچاس میل لمبی ہے اور جسے سد سکندر کہتے ہیں جس کی وجہ سے باب حدید یا باب خضر کا تنگ درہ رکھا گیا ہے یہ دیوار جب سالم تھی تو 29 فٹ اونچی تھی اور موٹائی میں تقریباً دس فٹ تھی اور اپنے لوہے کے دروازوں اور بے شمار حفاظت کے برجوں کے ساتھ سرحد ایران کا نہایت قیمتی استحکام تھی۔اس دیوار کا شمالی سرحد پر ایران کی حفاظت کا ذریعہ ہونا جسے یہاں تسلیم کیا گیا ہے بالکل قرآن مجید کے بیان کے مطابق ہے۔یہی دربند کی دیوار ہے جو قاف کی شمالی قوموں کو ایران پر حملہ آور ہونے سے روکنے کے لیے بنائی گئی تھی۔یہی وہی قومیں ہیں جن کو یاجوجِ ماجوج کہا گیا ہے اور مورخین نے بھی انہیں یاجوج ماجوج کہا ہے یاجوج ماجوج صفاتی نام ہے جس کا مطلب آگ سے کام لینے والی اقوام۔

دیواروں کا تعمیر کیا جانا قدیم دور میں عام رواج تھا۔جن کا ذکر آج بھی تاریخوں میں موجود ہے۔

سد سبا 97-81

سد مارب 97-96

سد یاجوج ماجوج 206

اور نام دربند صفحہ 35 اور نام حصن ذوالقرنین 93

تقویم البلدان

کتاب البلدان میں صفحہ 301,298,71 اور مراصد الاطلاع کے صفحہ 111 میں ہے دیکھو مراصد الاطلاع باب الباء والالف طبع فرانس جلد اول اور اس کی تائید آثار الباقیہ سے بھی ہوتی ہے صفحہ 41 کہ باب الابواب ایک شہر ہے۔بحر طبرستان پر جس کو لوگ بحر خزر کہتے ہیں اور وہ جبل قبق کے بہت دروں میں سے ایک درہ ہے اس درہ میں ایک دیوار کو انوشیروان (یہ نیا انوشیرواں نہیں پرانا ہے) نے قوم خزر کے حملوں سے بچنے کے لیے بنوایا تھا کیونکہ خزر قوم فارس پر (یہ وہی فارس ہے جو میدیا کا جزو ہے) ایسے حملے کرتے تھے کہ ہمدان اور موصل تک پہنچ

جاتے تھے۔

الغرض ذوالقرنین نے یاجوج ماجوج کے حملوں کو روکنے کے لیے دیوار بنائی گئی جس سے یاجوج ماجوج کے حملوں کی روک تھام ہو گئی جس کا ذکر قرآن مجید میں ہے۔ جس کی تصدیق دور حاضر کے مورخ بھی کرتے ہیں۔ معترض نے تو اپنی جہالت سے اعتراض کر دیا ہے حقیقت میں ایک اُمی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ذوالقرنین اور یاجوج ماجوج کا ذکر کرنا اس بات پر دلالت کرتا ہے۔ اس اُمی کو علیم وخبیر ہستی نے ہی ان غیبی امور کے متعلق مطلع کیا ہے۔ عرب کے ایک اُمی کو کیسے ان غیبی خبروں کا علم ہو سکتا ہے۔ کہاں ذوالقرنین اور یاجوج ماجوج کے تاریخی واقعات کہاں عرب کا اُمی۔ آج تاریخ وہی بات دہرا رہی ہے جس کا ذکر قرآن مجید میں آیا ہے۔ یہی غیب کی خبریں ہیں جن کا انکشاف حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم پر ہوا تھا۔

دیانند کے اعتراض کا جواب:

سوامی جی نے قرآن مجید کا ترجمہ ہی غلط کیا ہے۔ قرآن مجید کی آیت سے یہ ہرگز معلوم نہیں ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یاجوج ماجوج کو فساد پر امادہ کیا تھا۔ قرآن مجید کی آیت یہ ہے۔

قَالُوْا یٰذَا الْقَرْنَیْنِ اِنَّ یَاْجُوْجَ وَمَاْجُوْجَ مُفْسِدُوْنَ فِی الْاَرْضِ (الکہف 18:80)

انہوں نے کہا اے ذوالقرنین! یاجوج اور ماجوج اس ملک میں فساد کرنے والے ہیں۔

اس آیت میں کہاں یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یاجوج اور ماجوج کو فساد کے لیے امادہ کیا تھا۔ بلکہ ذوالقرنین کو اطلاع دی گئی ہے کہ یاجوج ماجوج ان کے علاقہ میں فساد برپا کرنے والے ہیں اب تاریخ بھی ثبت کرتی ہے کہ ایران کی شمالی سرحد کی اقوام ان سے تنگ تھیں اور ان پر حملے ہوتے رہتے تھے۔ اس آیت میں یاجوج ماجوج کے مفسد ہونے کا ذکر ہے۔

.......☆.......

عقیدہ توحید مستعار لیا گیا ہے

اعتراض: محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہودیت اور عیسائیت سے عقیدہ توحید کو مستعار لے کر مذہب اسلام کی داغ بیل ڈالی (سیوری ترجمہ قرآن)

جواب: سیوری (Savery) نے 1752 میں قرآن کا فرانسیسی ترجمہ پیش کیا اس میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی مختصر اُسوانح بھی لکھی۔ گو اس میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق مستشرقین کا پرانا نہج ترک کر کے کچھ نرم لہجہ اختیار کیا آپ کو ایک تاریخ ساز شخصیت بھی قرار دیا مگر از منہ وسطی کے متعصبانہ نظریات سے اپنے آپ کو آزاد نہ کر سکا۔ اس لیے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو سچا نبی تسلیم کرنے سے انکار کر دیا اور قدیم نظریہ کی تائید کی کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے یہودیت اور عیسائیت سے عقیدہ توحید مستعار لے کر ایک نئے دین کی بنیاد رکھ دی۔

یہ اعتراض دور حاضر میں بھی مستشرقین کرتے چلے آرہے ہیں بروکلمان اپنی کتاب الادب العربی میں قرآن کے باب میں لکھتے ہیں کہ قرآن کے بنیادی اصول نصرانیت سے ماخوذ ہیں لیکن گولڈ زہیر کا یہ خیال ہے کہ اسلام کا ماخذ یہودیت ہے بعض کا یہ خیال ہے دونوں مذاہب (یہودیت سے نصرانیت) سے ماخوذ ہے۔ ان کے خیال کے مطابق مکی سورتیں نصرانیت سے اور مدنی یہودیت سے تاثر کا نتیجہ ہے۔

اس اہم اعتراض کا اصولی جواب دیا جا چکا ہے کہ تمام مذاہب کا سرچشمہ ایک ذات یعنی اللہ تعالیٰ ہے تمام مذاہب یکساں تعلیم کی

سلک میں منسلک ہیں اس لیے ان میں تعلیم کا مشترک ہونا لازمی امر ہے سیوری نے توحید کے عقیدہ کو یہودیت اور عیسائیت سے ماخوذ قرار دیا ہے۔ اس لیے یہاں اسی عقیدے کے تناظر میں بحث کی جائے گی۔ اور واضح کیا جائے گا کہ جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے دعویٰ نبوت کیا اس وقت یہودیت اور عیسائیت عقیدہ توحید سے خالی تھیں اور شرک کی دلدل میں پھنسی ہوئی تھیں۔

عقیدہ ابنیت:

یہودیت اور عیسائیت دونوں مذاہب نے عقیدہ ابنیت اختیار کر لیا ہوا تھا۔ یہودی حضرت عزیر کو اور عیسائی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو خدا کا بیٹا مانتے تھے قرآن مجید میں آتا ہے۔

وَقَالُوا اتَّخَذَ اللّٰهُ وَلَدًا سُبْحٰنَهٗ بَلْ لَّهٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (البقرہ 2:116)

اور وہ کہتے ہیں کہ اللہ نے بیٹا بنا لیا ہے وہ پاک ہے بلکہ جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے اُسی کا ہے۔

دوسری جگہ آتا ہے۔

وَقَالُوا اتَّخَذَ الرَّحْمٰنُ وَلَدًا لَقَدْ جِئْتُمْ شَیْئًا اِدًّا تَكَادُ السَّمٰوٰتُ یَتَفَطَّرْنَ مِنْهُ وَتَنْشَقُّ الْاَرْضُ وَ تَخِرُّ الْجِبَالُ هَدًّا اَنْ دَعَوْا لِلرَّحْمٰنِ وَلَدًا (مریم 19:89-91)

اور کہتے ہیں رحمٰن نے بیٹا بنایا یقیناً تم ایک خطرناک بات کر گزرے قریب ہے کہ آسمان اس سے پھٹ جائے اور زمین شق ہو جائے اور پہاڑ ریزہ ریزہ ہو کر گر جائیں کہ وہ رحمٰن کے لیے بیٹے کا دعویٰ کرتے ہیں۔

ارشاد الٰہی ہے۔

بَدِیْعُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اَنّٰى یَكُوْنُ لَهٗ وَلَدٌ وَّلَمْ تَكُنْ لَّهٗ صَاحِبَةٌ وَخَلَقَ كُلَّ شَیْءٍ وَهُوَ بِكُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ (الانعام 6:101)

آسمانوں اور زمین کا پیدا کرنے والا اس کا بیٹا کس طرح ہو سکتا ہے اس کی بیوی نہیں اور اس نے ہر ایک چیز کو پیدا کیا اور وہ ہر چیز کو جاننے والا ہے۔

فرمایا:

قَالُوا اتَّخَذَ اللّٰهُ وَلَدًا سُبْحٰنَهٗ هُوَ الْغَنِیُّ (یونس 10:68)

کہتے ہیں اللہ نے بیٹا بنا لیا ہے وہ (اس سے) پاک ہے وہ بے نیاز ہے۔

تثلیث:

عیسائیوں نے عقیدہ ابنیت کے ساتھ تثلیث کا عقیدہ بھی اختیار کر لیا ہوا تھا۔ تثلیث تین اقانیم (Persons) سے مرکب ہے باپ بیٹا روح القدس۔

قرآن مجید نے اس عقیدہ کی تردید کی ہے ارشاد الٰہی ہے۔

فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ وَلَا تَقُوْلُوْا ثَلٰثَةٌ اِنْتَهُوْا خَیْرًا لَّكُمْ اِنَّمَا اللّٰهُ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ (النساء 4:171)

پس اللہ اور اس کے رسولوں پر ایمان لاؤ اور مت کہو تین (خدا) ہیں اس عقیدہ سے رک جاؤ تمہارے لیے بہتر ہے اللہ صرف ایک ہی ہے۔

جب بائبل کا مطالعہ کیا جائے تو اس میں قومی خدا کا تصور پایا جاتا ہے ہر جگہ اللہ تعالیٰ خداوند اسرائیل کے نام سے پکارا ہے ان الفاظ سے خدا کی ذات کا مفہوم محدود ہو کر رہ جاتا ہے بائبل میں لکھا ہے۔ ''اے خداوند اسرائیل کے خدا تجھ سا کوئی خدا نہ اوپر آسمان میں ہے نہ نیچے زمین میں۔'' (سلاطین اول 23:8)

''تیرے سوا جہاں تک کہ ہم نے اپنے کانوں سے سنا کوئی خدا نہیں اور دنیا میں تیری قوم اسرائیل کی مانند ایک قوم کون ہے کہ جس کے بچانے کو خدا آپ گیا تا کہ اسے اپنی قوم آپ بنائے۔ (سموئیل دوم 23,22:7)

غضبناک خدا کا تصور:

عہد عتیق میں غضب ناک خدا کا تصور ہے وہ ایک ایسی ہستی ہے جو انسان کی سرکشی اور بغاوت کی وجہ سے آپے سے باہر ہو جاتا ہے پھر غصہ میں آ کر ایک قوم بلکہ اس کے ساتھ چرند پرند اور حیوانات کو بھی ہلاکت کی بھٹی میں جھونک دیتا تھا یہ فعل کر گزرنے کے بعد وہ دل گیر ہوتا اور پچھتا تا بھی ہے جیسا کہ ایک انسان جلد بازیؑ سے کوئی فعل کرنے کے بعد پچھتا تا ہے چنانچہ پیدائش 8:7:6 کی بناء پر انسان کی بدی کو دیکھ کر اس کے پیدا کرنے پر پچھتا تا ہے اور دل گیر ہوتا ہے حالانکہ پیدائش ,26:1 ,22:5 ,1:5 ,6:9 زبور 3:100، واعظ 29:7 اعمال 26:17، 29:28 قرنتیوں اول 7:11، افسیون 24:4، قلیلوں 10:3 نامہ یعقوب 9:3 کی بناء پر خدا نے انسان کو اپنی صورت پر بنایا۔ تاہم غصہ میں آ کر تمام انسانوں کو مع چرند، پرند، کیڑوں مکوڑوں کے ہلاک کر دیا۔ پیدائش 23,21:7 مگر اس کے بعد 21:8, 11:9 میں خدا اپنے فعل پر پچھتایا توبہ کی اور آسمان پر قوس قزح کی کمان رکھ کر انسان سے عہد باندھا کہ پھر ایسا نہیں کروں گا۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے وقت میں فرعون کے پلوٹھے سے لے کر جانوروں تک کے پلوٹھے مار ڈالے۔ (خروج 92:14)

ذیل کے حوالہ جات میں خداوند کا غصہ قوموں کو نیست و نابود کرنے اور بعد میں افسوس کرنے کا ذکر ہے۔

خروج 12,11,10:32

گنتی 35,31:16,10,9:12-11,8,6:25-6:21-23,1:11

سموئیل اول 19:6 سموئیل دوم 16,1:24,7:6- احبار 2:10 تواریخ اول 15:21- یرمیاہ 3:26 وغیرہ مگر اس کے بعد حزقیل باب 21,20 میں بڑا غضبناک اور قتل عام پر امادہ نظر آتا ہے۔

خدا کا بدی کرنا خروج 14:82

خدا کا دھوکہ کی نہر ہونا یرمیاہ 18:15

خدا کا پیٹ سے ہوتا بچہ کو دلیتا بوڑھا ہونا یسعیاہ 4,3:46- خدا کا یعقوب سے کشتی لڑنا پیدائش 32:24-29

خدا کی دو بیویاں (ہولہ اہولبہ سمرون زانیہ تھیں)

یرمیا باب 3 حزقیل 6 اور 23

خدا کی بے وفائی عہد شکنی کرنا یرمیا 21:14-4:18 ,10 2 31:26

خدا کا غصہ میں قسم کھانا۔ گنتی 23:11-30:28، زبور 11:95

نامہ عبرانیوں 18,11:3-5,3:4- گنتی 11:32

یہ ہے وہ خدا کی تصویر جو یہودیت اور عیسائیت کی کتب میں ملتی ہے لیکن اسلام نے اللہ تعالیٰ کا تصور رب العالمین ہونے کا دیا ہے وہ صرف کسی ایک قوم کا خدا نہیں بلکہ تمام جہانوں کا خدا ہے ان کی مادی اور روحانی ضروریات پورا کرتا ہے۔

اسلام نے تمام تعلیمات کا محور توحید قرار دیا ہے یعنی اللہ تعالیٰ کو اس کی ذات صفات اور افعال میں یکتا، بے مثل اور بے عدیل قرار دیا ہے۔

قرآن مجید میں آتا ہے۔

وَلِلّٰهِ الْمَثَلُ الْاَعْلٰى وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ (النحل 60:16)

اللہ کی صفت نہایت بلند ہے وہ غالب حکمت والا ہے۔

وَلِلّٰهِ الْاَ سْمَآءُ الْحُسْنٰى فَادْعُوْهُ بِهَا (اعراف 180:7)

اور اللہ کے سب نام اچھے ہیں اور ان کے ساتھ اس کو پکارو۔

شَهِدَ اللّٰهُ اَنَّهٗ لَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ وَالْمَلٰٓئِكَةُ وَاُولُوا الْعِلْمِ قَآئِمًا بِالْقِسْطِ لَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ (ال عمران 18:3)

اللہ گواہی دیتا ہے کہ اس کے سوا کوئی معبود نہیں اور فرشتے اور صاحب علم بھی انصاف پر قائم ہو کر گواہی دیتے ہیں اس کے سوا کوئی معبود نہیں غالب حکمت والا ہے۔

اَللّٰهُ لَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْحَيُّ الْقَيُّوْمُ (البقرہ 255:2)

اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں وہ زندہ قائم رہنے والا ہے۔

ارشاد الٰہی ہے۔

وَاِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِيْمِ (البقرہ 162:2)

تمہارا معبود ایک ہی معبود ہے اس کے سوا کوئی معبود نہیں وہ رحمان رحیم ہے۔

اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ سے فرمایا۔

اِنَّنِيْ اَنَا اللّٰهُ لَا اِلٰهَ اِلَّا اَنَا فَاعْبُدْنِيْ (طٰہٰ 14:20)

صرف میں ہی اللہ ہوں میرے سوا کوئی معبود نہیں پس میری عبادت کرو۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے فرمایا:

فَاعْلَمْ اَنَّهٗ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ (محمد 19:48)

پس جان لے کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں ہے۔

هُوَ اللّٰهُ الَّذِيْ لَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ عَالِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ هُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِيْمُ (الحشر 22:59)

وہی اللہ ہے جس کے سوا کوئی معبود نہیں وہ غیب اور حاضر جاننے والا ہے وہی بے انتہا رحم والا بار بار رحم کرنے والا۔

قرآن مجید میں توحید پر جامع مانع الفاظ میں ایک پوری سورۃ اخلاص ہے۔

قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ اَللّٰهُ الصَّمَدُ لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُوْلَدْ وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ (اخلاص 1-4)

کہہ دیجیے وہ اللہ ایک ہے بے نیاز ہے نہ وہ کسی کا باپ ہے اور نہ بیٹا اور کوئی بھی اس کا ہمسر نہیں۔

حدیث میں اسلام کی عمارت کے پانچ ستونوں میں پہلا ستون لا الہ الا اللہ (اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں) قرار دیا ہے۔

الغرض اسلام نے توحید کے ہر پہلو کو اجاگر کیا ہے۔ اس کے ساتھ شرک کا بھی رد کیا ہے۔ ارشاد الٰہی ہے۔

اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيْمٌ (لقمان 13:31)

یعنی شرک بہت بڑا ظلم۔

وَمَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدِ افْتَرٰى اِثْمًا عَظِيْمًا (النساء4:48)

اور جس نے اللہ کا شریک ٹھہرایا اس نے بہت بڑا جھوٹ گھڑا۔

اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ (النساء4:48)

بے شک اللہ اس جرم کو معاف نہیں کرتا کہ کسی کو اس کا شرک ٹھہرایا جائے اور اس کے علاوہ جس قدر گناہ ہیں وہ جس کے لیے چاہے معاف کر دیتا ہے۔

شرک کے تمام پہلوؤں کو رد کیا ہے قرآن مجید میں آتا ہے۔

اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهٖ شَيْئًا وَّلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ (آل عمران3:64)

کہ ہم اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کریں اور نہ اس کے ساتھ کسی کو شریک بنائیں اور نہ ہم میں سے کوئی کسی کو اللہ کے سوا رب بنائے اس آیت میں شرک کی تین صورتیں بیان کر کے ان کی نفی اور تردید کی ہے۔

1- خدا کے سوا اور کسی کی عبادت نہ کی جائے۔

2- خدا کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرایا جائے۔

3- کسی دوسرے کو اپنا رب نہ ٹھہرایا جائے۔

شرک کی چوتھی صورت سورۃ فرقان میں بیان ہوئی ہے کہ انسان اپنی خواہشات کو معبود نہ بنائے ارشاد الٰہی ہے۔

اَرَاَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰىهُ (الفرقان25:43)

کیا تو نے اسے دیکھا جو اپنی خواہش کو معبود بناتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کے 99 صفات قرآن مجید میں بیان کی گئی ہیں ان صفات کا مطالعہ کیا جائے تو اللہ کی صفت رحم تمام صفات پر حاوی ہے۔ ارشاد الٰہی ہے۔

وَرَحْمَتِيْ وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ (اعراف)

اور میری رحمت تمام چیزوں پر چھائی ہوئی ہے۔ دوسری جگہ آتا ہے۔

نَبِّئْ عِبَادِيْٓ اَنِّيْٓ اَنَا الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ (الحجر15:46)

میرے بندوں کو خبر دے دو کہ میں معاف کرنے والا رحم کرنے والا ہوں۔

قارئین کے سامنے یہودیت، عیسائیت اور اسلام کا نظریہ توحید بیان کر دیا گیا ہے۔ کہیں بھی یہودیت اور عیسائیت کے مروجہ نظریہ توحید کی جھلک اسلام کے نظریہ میں نہیں پائی جاتی۔ گو اس میں شک نہیں کہ تمام انبیاء علیہم السلام توحید کا پیغام لے کر آئے تھے لیکن جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے دعویٰ نبوت کیا تو اس وقت نہ صرف یہودیت اور عیسائیت توحید کو چھوڑ چکی تھی بلکہ تمام دنیا کے مذاہب کا دامن اس سچی تعلیم سے خالی تھا۔ اسلام نے توحید کے تمام پہلوؤں کو اجاگر کر کے تمام دنیا کو بھولا ہوا سبق یاد دلا دیا۔ یہ اسلام کا تمام مذاہب پر احسان ہے کہ اس نے دین کے مرکزی نقطہ اور محور کی طرف توجہ دلائی۔

......☆......

مسئلہ تقدیر پر اعتراض

اعتراض :ابن وراق نے اپنی کتاب ''میں ایک مسلمان کیوں نہیں'' ص 123 پر میکڈونلڈ کے حوالے سے مسئلہ تقدیر پہ اعتراض کیا ہے کہ اس دنیا میں جو کچھ ہوتا ہے وہ اللہ کی مرضی سے ہوتا ہے انسان کی مرضی کا کوئی دخل نہیں۔ دنیا میں جو کچھ اس دنیا میں ہونا ہے وہ لوح محفوظ پر لکھا ہوا ہے۔

اسی طرح سر ولیم میور کہتے ہیں کہ اسلام میں اللہ کا رشتہ دنیا کے ساتھ اس طرح ہے کہ انسان کا اختیار اور ارادہ ختم ہو گیا ہے امید اور توقع اللہ کے آہنی شکنجہ میں ہلاک ہو جاتی ہے۔

یہ اعتراض متعدد پادریوں اور مخالفین نے کیا ہے۔

جواب: معترض نے مسئلہ تقدیر کو سمجھا ہی نہیں۔ جس عقیدے کو ترقی میں روک سمجھتا ہے دراصل وہی عقیدہ انسانی ترقی کا راستہ کھولتا ہے اور صحیح راستہ اختیار کرنے کی تعلیم دیتا ہے۔

تقدیر کے معنی حسب لغت اور محاورہ قرآن کسی چیز کا اندازہ لگانا اور حق دار ٹھہرانا ہے۔ جیسا کہ قرآن مجید میں آتا ہے۔

وَخَلَقَ كُلَّ شَيْءٍ فَقَدَّرَهٗ تَقْدِيْرًا (الفرقان 2:25)

اس نے ہر چیز کو پیدا کیا پھر اس کے لیے ایک اندازہ ٹھہرایا۔

اِنَّا كُلَّ شَيْءٍ خَلَقْنٰهُ بِقَدَرٍ (القمر 49:54)

ہم نے ہر چیز کو ایک انداز سے پیدا کیا۔

وَكُلُّ شَيْءٍ بِمِقْدَارٍ (الراعد 8:14)

ہر ایک چیز اس کے ہاں اندازہ سے ہے۔

سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْاَعْلَى الَّذِيْ خَلَقَ فَسَوّٰى وَالَّذِيْ قَدَّرَ فَهَدٰى (الاعلیٰ 87:1-3)

اپنے رب بہت بلند کے نام کی تسبیح کر جس نے پیدا کیا پھر ٹھیک بنایا جس نے اندازہ لگایا اور راہ دکھائی۔

قَدْ جَعَلَ اللّٰهُ لِكُلِّ شَيْءٍ قَدْرًا (الطلاق 3:65)

اللہ نے ہر چیز کے لیے ایک اندازہ مقرر کر رکھا ہے۔

ان تمام آیات سے واضح ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر چیز کو اپنی تقدیر کے تحت پیدا کیا ہے اور وہ چیز اس دائرہ میں رہ کر کام کر رہی ہے اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں بعض اجرام فلکی اور موجودات ارضی کا ذکر کیا ہے جو تقدیر کے بندھن میں جکڑی ہوئی ہے ارشاد الٰہی ہے۔

وَالشَّمْسُ تَجْرِيْ لِمُسْتَقَرٍّ لَّهَا ذٰلِكَ تَقْدِيْرُ الْعَزِيْزِ الْعَلِيْمِ وَالْقَمَرَ قَدَّرْنٰهُ مَنَازِلَ حَتّٰى عَادَ كَالْعُرْجُوْنِ الْقَدِيْمِ لَا الشَّمْسُ يَنْۢبَغِيْ لَهَآ اَنْ تُدْرِكَ الْقَمَرَ وَلَا الَّيْلُ سَابِقُ النَّهَارِ وَكُلٌّ فِيْ فَلَكٍ يَّسْبَحُوْنَ (یٰس 36:38-40)

اور سورج اپنے مقرر راستے پر چلتا رہتا ہے یہ غالب علم والے کا اندازہ ہے اور چاند کے لیے ہم نے کئی منزلیں مقرر کر دیں یہاں تک

کہ وہ پھر پرانی سوکھی ٹہنی کی طرح ہو جاتا ہے نہ تو سورج کی قدرت ہے کہ وہ چاند کو پالے اور نہ رات دن سے آگے نکلنے والی ہے اور سب اپنے اپنے دائرے میں چل رہے ہیں۔

جَعَلَ فِيهَا رَوَاسِيَ مِنْ فَوْقِهَا وَبَارَكَ فِيهَا وَقَدَّرَ فِيهَا أَقْوَاتَهَا (حم السجدہ 10:41)

اور اس نے اس کے اوپر پہاڑ بنائے اور اس سے برکت دی اور اس کی خوراک کا اندازہ کیا۔

وَأَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَاءِ مَاءً بِقَدَرٍ فَأَسْكَنَّاهُ فِي الْأَرْضِ (المومنون 18:23)

ہم نے بادلوں سے ایک اندازہ سے پانی اتارا پھر اسے زمین میں ٹھہرایا۔

وَاللَّهُ يُقَدِّرُ اللَّيْلَ وَالنَّهَارَ (المزمل 30:70)

اور اللہ تعالیٰ رات دن کا اندازہ کرتا ہے۔

فَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّتِ اللَّهِ تَبْدِيلًا وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّتِ اللَّهِ تَحْوِيلًا (فاطر 43:25)

سو تو اللہ کے طریق (آئین) میں کوئی تبدیلی نہ پائے گا اور نہ تو اللہ کے طریق (آئین) کو ٹلتا ہوا پائے گا۔

یہی محکم قانون (آئین) تقدیر مبرم ہے جس کے تحت نظام فلکی اور نظام ارضی چل رہے ہیں اگر یہ تقدیر (قانون) ٹل جائے یا تبدیلی واقع ہو جائے تو نظام کائنات درہم برہم ہو جائے گا قرآن مجید کی زبان میں اسی عالمگیر محکم قانون (آئین) کو تقدیر کیا گیا ہے اگر یہ محکم قانون (آئین) نہ ہو تو کائنات کا نظام ہی نہیں چل سکتا یہ ایک مسلمہ امر ہے کہ کوئی نظام بھی کسی آئین کے بغیر چل نہیں سکتا دور حاضر میں تو اس کی اہمیت واضح ہے کہ دنیا کا کوئی ایسا ملک نہیں جہاں آئین نہ ہو جس کی روشنی میں اس ملک کا نظام چلایا جاتا ہے پس اللہ تعالیٰ نے اس کائنات کو پیدا کیا۔ تو اس کے نظام کے لیے ایک محکم قانون وضع کیا اسی قانون کو اللہ تعالیٰ نے تقدیر اور سنت کے لفظ سے تعبیر کیا ہے۔

قرآن مجید سے ہی یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ محکم قانون (تقدیر) دو قسم کا ہے ایک تقدیر مبرم اور تقدیر معلق۔

تقدیر مبرم:

وہ تقدیر (محکم قانون) جسے کوئی ٹال نہیں سکتا نہ اس میں کمی بیشی کی جا سکتی ہے جیسا کہ فَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّتِ اللَّهِ تَبْدِيلًا کے الفاظ سے ظاہر ہے۔ اللہ تعالیٰ نے آگ کو پیدا کیا اس میں تقدیر (الٰہی قانون) کام کر رہی ہے کہ وہ جلائے پانی پیدا کیا اس میں یہ تقدیر کام کر رہی ہے کہ وہ پیاس بجھائے حیوانات اور نباتات کی باعث زندگی کے لیے سورج پیدا کیا اس میں یہ تقدیر کام کر رہی ہے کہ وہ روشنی دے اور گرمی پہنچائے غرض کہ دنیا کی ہر تخلیق میں اللہ کی تقدیر کام کر رہی ہے یہ وہ تقدیر ہے جس کو تقدیر مبرم کہتے ہیں یعنی اٹل قانون اگر یہ قانون اٹل نہ ہوتے تو دنیا کا تمام نظام درہم برہم ہو جاتا مثلاً کبھی آگ جلاتی اور کبھی نہ جلاتی پانی کبھی پیاس بجھاتا کبھی نہ بجھاتا۔ کبھی سورج گرمی دیتا اور کبھی نہ دیتا تو اس طرح دنیا کا نظام ہی ختم ہو جاتا یہ ایک عالمگیر تقدیر (قانون الٰہی) ہے جو دنیا کی تمام اشیاء میں جاری و ساری ہے۔

کیا معترض کو اس تقدیر پر کوئی اعتراض ہے۔ یہ تو ایک سائنسی مسئلہ ہے جس کا انکار کیا ہی نہیں جا سکتا۔ وہی انکار کرے گا جس کی عقل جواب دے چکی ہو۔ یہی تقدیر انسانوں کی زندگی پر اثر انداز ہوتی ہے۔ اسی تقدیر نے انسانوں کو یہ ہدایت کی ہے کہ وہ بھی اپنے نظام کو چلانے کے لیے قانون وضع کریں اور اس کے مطابق زندگی بسر کریں۔ قرآن مجید نے اس محکم قانون کے ضمن میں انسانوں کو یہی ہدایت کی ہے اس ہدایت کو صرف وحشی قوم ہی نظر انداز کر سکتی ہے۔ ہر متحدن قوم نے اس مبرم تقدیر (الٰہی محکم قانون) کی روشنی میں اپنے لیے قانون وضع کیے ہیں۔

تقدیر معلق:

تقدیر معلق سے مراد وہ تقدیر ہے جو ٹل سکے مطلب یہ ہے اللہ تعالیٰ نے پہلے یہ اندازہ اور قاعدہ بنا دیا ہے کہ انسان جب کبھی صحیح اسباب استعمال کرے گا تو نتیجہ صحیح نکلے گا اگر غلط اسباب سے کام لے گا تو نتیجہ غلط نکلے گا۔ اسی اندازہ (اصول، قاعدہ) کا نام تقدیر معلق ہے اسی (تقدیر قانون) کے تحت سعی وعمل وترقیات کا ظہور ہے قرآن مجید میں آتا ہے۔

وَاَنْ لَّيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَاسَعٰى وَاَنَّ سَعْيَهٗ سَوْفَ يُرٰى (نجم 40,39,53)

اور کہ انسان کے لیے کچھ نہیں مگر وہی جو وہ کوشش کرتا ہے اور کہ اس کی کوشش دیکھی جائے گی۔

دوسری جگہ آتا ہے۔

وَمَنْ يَّعْمَلْ سُوْٓءًا اَوْيَظْلِمْ نَفْسَهٗ (نساء 110:4)

اور جو شخص بدی کرے (قانون توڑے) یا اپنی جان پر ظلم کرے۔

صحیح رستہ (قانون) اختیار کرنے والے کے متعلق فرمایا۔

مَنْ عَمِلَ صَالِحًا فَلِنَفْسِهٖ (حم السجدہ 46:41)

جو کوئی نیک عمل کرتا ہے (جو صحیح قانون پر چلتا ہے) تو وہ اپنی جان کی بھلائی کے لیے ہے۔

وَمَنْ اَسَآءَ فَعَلَيْهَا وَمَا رَبُّكَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيْدِ (حم السجدہ 46:41)

جو کوئی برا کرتا ہے (غلط راستہ اختیار کرتا ہے) تو اس کا وبال اس پر اور تیرا رب بندوں پر کچھ بھی ظلم کرنے والا نہیں۔

اس تقدیر (قانون) کو معلق اس لیے کہتے ہیں کہ اس کا ٹل جانا سعی، اسباب کی کیفیات پر مبنی ہے مثلاً ایک بیمار ہے اس کا علاج غلط ہو رہا ہے تو وہ موت کے منہ میں چلا جائے گا اگر اس کا صحیح علاج ہو رہا ہے تو صحت یاب ہو جائے گا یا کوئی شخص اپنے مقصد کے حصول کے لیے صحیح راستے پر گامزن ہے تو وہ اپنے مقصد کو پالے گا جو غلط راستے پر ہے وہ اپنے مقصد کو کھو دے گا یہ ایک تقدیر ہے جو اسباب اور سعی کے ساتھ وابستہ ہے۔ جب صحیح اسباب مل گئے۔ صحیح راستہ پر چلنے کی کوشش کی۔ تو تقدیر ٹل گئی اگر غلط اسباب ہیں یا غلط راستہ اختیار کیا گیا تو نہ ٹلی۔ ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔

اللہ تعالیٰ کی تقدیر مبرم کا انسان کے افعال سے کوئی تعلق نہیں صرف تقدیر کا تعلق ہے کہ کامیابی اور حصول مقصد کے لیے صحیح راستہ اختیار کرے اللہ تعالیٰ نے صحیح راستہ کی بھی نشاندہی انبیاء علیہم السلام کی معرفت کر دی۔ انسان کو کلی اختیار دیا۔ کہ چاہے صحیح راستہ اختیار کرے چاہے غلط جزا وسزا انہی راستوں پر گامزن ہونے میں ہے اگر صحیح راستہ اختیار کرے گا تو جزا کا مستحق ہوگا۔ ارشاد الٰہی ہے۔

فَمَنْ تَبِعَ هُدَاىَ فَلَاخَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ (بقرہ 38:2)

جو میری ہدایت پر چلا نہ ان کو ڈر ہے اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔

دوسری جگہ آتا ہے۔

فَمَنِ اتَّبَعَ هُدَاىَ وَلَا يَضِلُّ وَلَا يَشْقٰى (طٰہٰ 123:20)

جو کوئی میری ہدایت کی پیروی کرے گا وہ نہ گمراہ ہوگا اور نہ تکلیف میں پڑے گا۔

اگر غلط راستہ اختیار کرے گا تو سزا پائے گا ارشاد الٰہی ہے۔

وَالَّذِیْنَ کَفَرُوْا وَکَذَّبُوْا بِاٰیٰتِنَآ اُولٰٓئِکَ اَصْحٰبُ النَّارِ ھُمْ فِیْھَا خٰلِدُوْنَ (بقرہ 39:2)

اور جنہوں نے انکار کیا اور ہماری باتوں (قانون) کو جھٹلایا وہی لوگ آگ والے ہیں وہ اس میں رہیں گے۔

وَمَآ اَصَابَکَ مِنْ سَیِّئَۃٍ فَمِنْ نَّفْسِکَ (النساء 79:4)

جو دکھ تجھے پہنچتا ہے وہ تیرے ہی نفس سے ہے۔

قرآن مجید میں اس موضوع کو کثرت سے بیان کیا گیا ہے۔ کہ انسان کو جو کچھ نقصان پہنچتا ہے وہ اس کے اپنے عمل کا نتیجہ ہوتا ہے اور عمل کرنے میں وہ مختار ہے۔ ارشاد الٰہی ہے۔

مَنْ شَآءَ فَلْیُؤْمِنْ وَّمَنْ شَآءَ فَلْیَکْفُرْ (الکہف 29:18)

سو جو کوئی چاہے ایمان لائے اور جو کوئی چاہے انکار کرے۔

دوسری جگہ آتا ہے۔

وَاَمَّا ثَمُوْدُ فَھَدَیْنٰھُمْ فَاسْتَحَبُّوا الْعَمٰی عَلَی الْھُدٰی (حم السجدہ 17:41)

اور رہے ثمود تو ہم نے انہیں راستہ دکھایا پر انہوں نے اندھا رہنے کو ہدایت پر ترجیح دی۔

معترضین مسئلہ تقدیر پر اعتراض کرتے ہوئے یہ کہتے ہیں کہ اس عقیدہ نے مسلمانوں کو بے اختیار، بے دست و پا کر دیا ہے۔ اس سے آزادی چھین لی ہے جو کچھ ہونا ہے وہ تو لوح محفوظ پر ثبت ہے جو کچھ ہوتا ہے اللہ کی مرضی سے ہوتا ہے۔ یہ غلط ہے۔ اور اللہ کی مرضی (تقدیر) نہ سمجھنے کی وجہ سے ہے۔ انسان شرعی احکام کے بجالانے میں آزاد ہے وہ ان پر عمل کرے یا نہ کرے اللہ تعالیٰ نے انسان کو راہ ہدایت پر چلنے کے لیے دو اہم اسباب دیئے ہیں۔ ایک انبیاء علیہم السلام پر نازل کردہ شرعی احکام دوم عقل شرعی احکام عین عقل کے مطابق ہیں۔ اب انسان کو اختیار دیا ہے کہ وہ ان پر عمل کرے یا نہ کرے۔ دین میں کوئی جبر نہیں۔ اگر وہ راہ ہدایت پر چلتا ہے تو خوشگوار زندگی پائے گا۔ اگر شرعی احکام کو نظر انداز کرے اپنا کوئی راستہ اختیار کرتا ہے تو وہ اس کا بد انجام پائے گا۔

تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ جن اقوام نے سیدھا اور صحیح راستہ اختیار کیا انہوں نے ہی ترقی کی اور جن نے غلط راستہ اختیار کیا وہ تباہی کے گڑھے میں گر گئیں۔ صحیح راستے کی تعبیر بھی واضح ہے اور غلط راستے کی بھی۔ صحیح راستہ وہی ہے جو اللہ تعالیٰ نے انبیاء علیہم السلام کی معرفت بتایا ہے۔

دوسرا ضمنی اعتراض:

معترضین اس ضمن میں یہ بھی اعتراض کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے خود ہی انسانوں کے دلوں پر مہر لگا دی ہے تو اس میں ان کا کیا قصور۔

دراصل اس قسم کی غلط فہمی قرآن مجید کے اسلوب کو نہ جاننے کی وجہ سے ہوتی ہے دراصل مہر کا لگنا انسان کے اپنے ہی افعال سیّہ کا نتیجہ ہے جب انسان اتنی برائیاں کرتا ہے اور اس کے دل سے برائی کا احساس ہی ختم ہو جاتا ہے تو اس کے نتیجہ میں قرآنی محاورہ کے مطابق کہا جاتا ہے کہ اس کے دل پر مہر لگ گئی ہے حقیقت میں مہر لگنا اس کے اپنے اعمال رذیلہ کے نتیجہ میں ہے اس کی وضاحت دوسری جگہ کر دی ہے ارشاد الٰہی ہے۔

بَلْ طَبَعَ اللّٰہُ عَلَیْھَا بِکُفْرِھِمْ (النساء 155:4)

ان کے کفر کی وجہ سے ان پر مہر لگا دی۔ یعنی مہر کا سبب کفر ہے۔

دوسری جگہ آتا ہے۔

كَلَّا بَلْ رَانَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ مَّا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ (مطففین 14:83)

ہرگز نہیں بلکہ ان کے دلوں پر ان کے عملوں کا زنگ ہے۔

حضرت ابو ہریرہ کی روایت ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے اس آیت کے متعلق دریافت کیا گیا تو آپؐ نے فرمایا کہ بندہ ایک گناہ کرتا ہے تو ایک سیاہ نقطہ اس کے دل پر پیدا ہو جاتا ہے پھر اگر اس سے توبہ کرے تو اس کا دل صاف ہو جاتا ہے اگر پھر گناہ کرے تو ایک اور نقطہ لگ جاتا ہے یہاں تک کہ آخر کار دل سیاہ ہو جاتا ہے۔ پس تقدیر الٰہی کا فلسفہ ہی یہ ہے کہ انسان ان تمام اسباب کو استعمال میں لایا جائے جو اللہ تعالیٰ نے انسان کی ترقی کے لیے پیدا کیے ہیں گویا عقیدہ تقدیر انسان کے لیے ہر قسم کی ترقی کے راستے کھولتا ہے۔ گویا تقدیر پر ایمان لانے کا یہ مطلب ہے کہ انسان ان اسباب پر عمل پیرا ہو جو اللہ تعالیٰ نے اس کی بھلائی کے لیے مقرر کیے ہیں۔ ان اسباب پر عمل پیرا ہونے میں انسان مختار کل ہے اس پر کوئی جبر نہیں۔

معترض نے مسئلہ تقدیر کے تمام پہلوؤں پر غور نہیں کیا۔ اگر اس کے سامنے تقدیر معلق کا تصور واضح ہوتا تو وہ اعتراض نہ کرتا۔

عہد عتیق، جدید اور مسئلہ تقدیر

الزامی جواب:

جن آیات کو سامنے رکھ کر معترض نے اعتراض کیا ہے اسی مفہوم کی آیات عہد عتیق اور جدید میں پائی جاتی ہیں۔ معترض اس کا کیا جواب دے گا۔

اور خداوند نے موسیٰ کو کہا کہ جب تو مصر میں داخل ہوئے تو دیکھو سب معجزے جو میں نے تیرے ہاتھ پر رکھے ہیں فرعون کے آگے دکھائیو لاکن میں اس کے دل کو سخت کر دوں گا کہ وہ ان لوگوں کو جانے نہ دے گا۔ (خروج 4 باب 21)

اس آیت میں فرعون کے دل کو سخت کرنے والا اللہ خود ہے۔

اور اس نے فرعون کے دل کو سخت کر دیا۔ (خروج 2 باب 3)

پر خداوند نے فرعون کے دل کو سخت کر دیا۔ (خروج 1 باب 20)

لاکن خداوند نے تم کو وہ دل جو سمجھے اور وے آنکھیں جو دیکھیں اور وے کان جو سنیں آج تک نہ دیئے۔ (استثناء 29 باب 4)

کیونکہ یہ خداوند کی طرف سے تھا کہ ان کے دل سخت ہو گئے تھے تاکہ وے جنگ کے لیے اسرائیل کا مقابلہ کریں تاکہ وہ ان کو حرم کرے کہ تاکہ وہ مورد رحم کے نہ رہیں بلکہ وہ ان کو نیست و نابود کر دیوے۔ (یشوع 11 باب 20)

اس نے ایک تقدیر مقرر کی جو ٹل نہیں سکتی۔ (48 زبور)

کیا پیسے کی دو چڑیاں نہیں بکتیں اور ان میں سے ایک بھی تمہارے باپ کی بے مرضی زمین پر نہیں گرتی۔ (متی 10 باب 29)

قارئین قرآن مجید کے الفاظ خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ (اللہ نے ان کے دلوں پر مہر لگا دی) سامنے رکھیں پھر عہد نامہ عتیق اور جدید کی آیات کو سامنے رکھیں۔ یہ تمام آیات اسی مفہوم کو ظاہر کرتی ہیں جو خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ میں پایا جاتا ہے۔

اسی طرح جو اعتراض عقیدہ تقدیر سے انسان کی بے بسی اور آزادی سے محرومی کا اخذ کیا گیا ہے وہی اعتراض مذکورہ بالا آیات سے اخذ ہوتا ہے فرعون کا دل اللہ تعالیٰ نے سخت کر دیا تھا۔ تو فرعون کا کیا قصور کیا کوئی یہودی اور عیسائی فرعون کو بے قصور مانتا ہے۔

تمام الہامی کتب کا ایک طرز بیان ہے جس کو نہ سمجھنے کی وجہ سے اعتراض کر دیا جاتا ہے۔ دراصل تمام مذاہب کی رو سے انسان کو شرعی احکام پر عمل کرنے میں آزادی ہے۔ اس پر کوئی پابندی نہیں وہ بے بس نہیں وہ بااختیار ہے چاہے ان شرعی احکام پر عمل کرے یا نہ کرے۔ اگر عمل کرتا ہے تو اس میں اس کا فائدہ ہے اگر نہیں کرتا تو اس کا نقصان ہے یہی تقدیر الٰہی ہے۔ انسان کے دل پر مہر لگنا یا سخت ہو جانا یہ اس کے بداعمال کا نتیجہ ہے۔

یہ مناسب ہوگا جن آیات قرآنیہ کے نہ سمجھنے کی وجہ سے معترضین نے اعتراضات کیے ہیں ان کی بھی وضاحت کر دی جائے تا کہ مسئلہ تقدیر کے تمام پہلو واضح ہو جائیں۔

پہلی آیت......

خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَعَلٰى سَمْعِهِمْ وَعَلٰى اَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ (بقرہ 7:2)

اللہ نے ان کے دلوں اور ان کی کانوں پر مہر لگا دی اور ان کی آنکھوں پر پردہ ہے۔

وضاحت:

اللہ نے اسی مہر کی وضاحت دوسرے مقامات پر کی ہے۔

ارشاد الٰہی ہے۔

وَقَوْلِهِمْ قُلُوْبُنَا غُلْفٌ بَلْ طَبَعَ اللّٰهُ عَلَيْهَا بِكُفْرِهِمْ (نساء 155:4)

ان کا کہنا ہمارے دل پردوں میں ہیں بلکہ اللہ نے ان کے کفر کی وجہ سے ان پر مہر لگا دی۔

یعنی اللہ نے مہر نہیں لگائی بلکہ ان کے دلوں پر پردہ ان کے کفر کی وجہ سے ہے۔ یعنی فاعل اللہ نہیں بلکہ انسان خود ہے۔

كَلَّا بَلْ رَانَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ مَّا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ (مطففین 14:83)

کوئی نہیں ان کے دلوں پر زنگ ہے جو وہ کماتے ہیں۔

یہ آیت بھی ظاہر کر رہی ہے کہ مجرموں کے دلوں کا زنگ آلود ہونا ان کے اپنے بداعمال کی وجہ سے۔

دوسری آیت:

فَرِيْقًا هَدٰى وَفَرِيْقًا حَقَّ عَلَيْهِمُ الضَّلٰلَةُ (اعراف 30:7)

ایک فریق کو ہدایت دی اور ایک فریق پر گمراہی ٹھہری۔

اس کا جواب بھی اسی آیت کے آگے موجود ہے۔

اِنَّهُمُ اتَّخَذُوا الشَّيٰطِيْنَ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَيَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ مُّهْتَدُوْنَ (اعراف 30:7)

انہوں نے اللہ کو چھوڑ کر شیاطین کو اپنا دوست بنا لیا اور گمان کرتے ہیں کہ وہ ان کو ہدایت دینے والے ہیں۔

یہ آیت ظاہر کرتی ہے کہ جن لوگوں کے دلوں پر گمراہی وارد ہوئی ہے اس کی وجہ وہ خود ہیں کہ انہوں نے اللہ کے بتائے ہوئے راستہ کو چھوڑ دیا اور شیاطین کا راستہ اختیار کر لیا۔ اللہ کا راستہ ہی گمراہی سے بچاتا ہے۔ جب انہوں نے خود ہی گمراہی کا راستہ اختیار کر لیا تو ان پر گمراہی کا وارد ہونا ضروری ہے۔ برائی کا نتیجہ ہمیشہ برا ہوتا ہے۔ اس آیت سے واضح ہوتا ہے کہ وہ خود ہی گمراہی کا سبب ہیں۔

تیسری آیت:

لَقَدْ حَقَّ الْقَوْلُ عَلٰٓی اَکْثَرِھِمْ فَھُمْ لَا یُؤْمِنُوْنَ (یٰس 7:36)

ان کے بہتوں پر بات ثابت ہو چکی ہے پس وہ نہیں مانیں گے (ایمان نہیں لائیں گے)

وضاحت:

مذکورہ آیت کی وضاحت یہ آیت کرتی ہے۔ ارشاد الٰہی ہے۔

وَوَقَعَ الْقَوْلُ عَلَیْھِمْ بِمَا ظَلَمُوْا فَھُمْ لَا یَنْطِقُوْنَ (نمل 85:27)

اور ان پر بات پڑ چکی ہے اس واسطے انہوں نے ظلم کیا سو وہ کچھ نہیں بولتے یعنی مجرموں پر جو سزا اور عذاب وارد ہوا ہے وہ بحسب قانون قدرت ان کے بداعمال کا نتیجہ ہے۔

اللہ تعالیٰ نے ان کی بداعمالی کی وجہ سے ان پر سزا وارد کی۔

اسی مضمون کو اس آیت میں بھی بیان کیا گیا ہے ارشاد الٰہی ہے۔

وَکَذٰلِکَ حَقَّتْ کَلِمَۃُ رَبِّکَ عَلَی الَّذِیْنَ کَفَرُوْٓا اَنَّھُمْ اَصْحٰبُ النَّارِ (مومن 7:36)

تیرے رب کی بات (سزا، عذاب) منکروں پر پوری ہو چکی ہے بے شک وہی لوگ آگ والے ہیں۔

اس آیت میں بھی سزا کی وجہ کفر ہے۔ اس کفر کے نتیجہ میں ان لوگوں پر عذاب وارد ہوا۔

چوتھی آیت:

فَمَنْ شَآءَ ذَکَرَہٗ وَمَا یَذْکُرُوْنَ اِلَّآ اَنْ یَّشَآءَ اللّٰہُ (56,55:74)

سو جو کوئی چاہے یاد کرے اور وہ یاد نہیں رکھتے سوائے اس کے کہ اللہ چاہے۔

اس مضمون کی ایک دوسری آیت ہے۔

لِمَنْ شَآءَ مِنْکُمْ اَنْ یَّسْتَقِیْمَ وَمَا تَشَآءُوْنَ اِلَّآ اَنْ یَّشَآءَ اللّٰہُ رَبُّ الْعٰلَمِیْنَ (التکویر 29,28:81)

اس کے لیے جو تم میں سے سیدھی راہ پر چلنا چاہے اور تم نہیں چاہتے سوائے اس کے کہ اللہ جہانوں کا رب چاہے۔

پانچویں آیت:

وَقَیَّضْنَا لَھُمْ قُرَنَآءَ فَزَیَّنُوْا لَھُمْ مَّا بَیْنَ اَیْدِیْھِمْ وَمَا خَلْفَھُمْ وَحَقَّ عَلَیْھِمُ الْقَوْلُ فِیْٓ اُمَمٍ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِھِمْ مِّنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ اِنَّھُمْ کَانُوْا خٰسِرِیْنَ (حم السجدہ 25:41)

اور ہم نے ان کے لیے ساتھی مقرر کر رکھے ہیں سو وہ انہیں جو کچھ ان کے آگے اور ان کے پیچھے ہے اچھا کر کے دکھاتے ہیں اور خدا کی بات ان پر صادق آئی ان قوموں میں (داخل ہوتے ہوئے) جو جنوں اور انسانوں سے ان سے پہلے گزر چکے ہیں وہ نقصان اٹھانے والے ہوئے۔

وضاحت:

اس آیت کا اشکال خود قرآن مجید نے حل کر دیا ہے۔ ارشاد الٰہی ہے۔

وَمَنْ یَّعْشُ عَنْ ذِکْرِ الرَّحْمٰنِ نُقَیِّضْ لَہٗ شَیْطٰنًا فَھُوَ لَہٗ قَرِیْنٌ (زخرف 36:43)

اور جو کوئی رحمٰن کی یاد سے منہ پھیر لے ہم اس کے لیے ایک شیطان مقرر کر دیتے ہیں اور وہ اس کا ساتھی ہو جاتا ہے۔

شیطان کے مقرر کرنے کی وجہ بیان کی گئی ہے کہ وہ بدی میں یہاں تک بڑھ گئے تھے کہ وہ اپنی بداعمالی کو بھی اچھا سمجھنا شروع ہو گئے جب ایک انسان بدی کو بھی اچھا سمجھنا شروع کر دیتا ہے تو یہ بدی کی انتہا ہوتی ہے جہاں سے اس کا واپس آنا ممکن نہیں ہوتا۔

ان پر شیطان کا مسلط ہونا ان کی بدی کا نتیجہ ہے۔ قرآن کا یہ ایک طرز استدلال ہے۔ اچھائی اور برائی کا جو نتیجہ ظاہر ہوتا ہے اس کو اللہ تعالیٰ اپنی طرف منسوب کر لیتا ہے یعنی اچھائی اور برائی کے نتیجہ میں جو جزا و سزا وارد ہوتی ہے اس کو اللہ تعالیٰ اپنی طرف منسوب کر لیتا ہے اس قسم کا محاورہ ہر زبان میں پایا جاتا ہے۔ مثلاً یہ کہا جاتا ہے کہ فلاں ممتحن نے اتنے لڑکے فیل کر دیئے۔

ممتحن نے لڑکے فیل نہیں کیے ہوتے وہ طلباء کی نالائقی کا نتیجہ ہے۔ نتیجہ ''فیل'' کو ممتحن کی طرف منسوب کر دیا۔ یہ ادب کا ایک خوبصورت پہلو ہے۔ اس قسم کی نزاکتیں اور تمثیلات ادب کا حسن ہوتی ہیں۔ ادب کی نزاکتوں کو نہ سمجھنے والا ٹھوکر کھاتا ہے اور غلط مفہوم لے لیتا ہے۔ لہٰذا شیطان اللہ نے مقرر نہیں کیا تھا بلکہ بداعمالی کا نتیجہ ہے کہ وہ شیطان کے قبضے میں آ گئے۔

چھٹی آیت:

وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَآ اَشْرَكُوْا (انعام6:107)

اگر اللہ چاہتا وہ شرک نہ کرتے۔

وَلَوْ شَآءَ رَبُّكَ مَا فَعَلُوْهُ (انعام6:112)

اور اگر تیرا رب چاہتا تو وہ ایسا نہ کرتے۔

یہ جملہ شرطیہ ہے اور اس کا مطلب صاف ہے کہ اگر ہم چاہتے تو ایسا کر سکتے تھے لیکن اللہ تعالیٰ نے علی العموم لوگوں کو ہدایت محض اور ضلالت محض پر مجبور نہیں کیا اور نہ حکمت ایزدی اس امر پر متقاضی ہو سکتی تھی۔ قرآن مجید میں ہدایت کے متعلق بھی اپنی مشیت کا اظہار کیا ہے ارشاد الٰہی ہے۔

لَوْ شَآءَ لَهَدٰىكُمْ اَجْمَعِيْنَ (الانعام6:149)

سو اگر اللہ چاہتا تو تم سب کو ہدایت دیتا۔ یہاں بھی اللہ کی مشیت سے سب ہدایت یافتہ نہیں ہو گئے۔ پس اللہ کی مشیت نہ تو لوگوں کو شرک پر مجبور کرتی ہے اور نہ ہدایت پر اللہ تعالیٰ نے انسان کو مختار پیدا کیا ہے خواہ احکام شریعت کا پابند ہو جائے خواہ وہ ان کو پس پشت ڈال دے اس میں اس کا امتحان ہے اس پر اس کی جزا و سزا مرتب ہوتی ہے۔ اس میں اس کا شرف اور پستی مضمر ہے۔ اگر وہ اللہ کی مشیت کے مطابق کام کرتا ہے تو پھر انعام کیسا اور سزا کیسی۔

یہ بھی الہامی کتب کا ایک طرز بیان ہے۔ جس کو لوگ سمجھتے نہیں۔

ساتویں آیت:

وَتَمَّتْ كَلِمَةُ رَبِّكَ لَاَمْلَئَنَّ جَهَنَّمَ مِنَ الْجِنَّةِ وَ النَّاسِ اَجْمَعِيْنَ (ھود11:119)

اور تیرے رب کی بات پوری ہو گئی میں دوزخ کو جنوں اور انسانوں سے بھر دوں گا۔

وضاحت:

اللہ کی بات کا پورا ہونا (تَمَّتْ كَلِمَةُ رَبِّكَ) جہنمیوں کی بداعمالی کے بعد کا نتیجہ ہے جب جہنمیوں نے شیطانی راستہ اختیار کیا تو

اس کے بعد ان کو ان کی بداعمالی کے نتیجہ میں جہنم کے عذاب کی سزا دی گئی۔ گویا ان کا جہنم میں جانا ان کے اپنے بداعمال کا نتیجہ ہے۔ اسی بات کو دوسری ایک آیت میں وضاحت کر دیا گیا ہے۔ ارشاد الٰہی ہے۔

لَاَمْلَئَنَّ جَهَنَّمَ مِنْكَ وَمِمَّنْ تَبِعَكَ مِنْهُمْ اَجْمَعِيْنَ (ص85:38)

میں ضرور جہنم کو تجھ سے اور ان سے جو تیری پیروی کریں گے بھر دوں گا۔

اس آیت نے ھود کی آیت 119 کی وضاحت کر دی۔ جہنمیوں کو دوزخ میں داخل کرنے کی وجہ شیطان کی پیروی ہے یعنی جہنمیوں نے اللہ تعالیٰ کا راستہ چھوڑ کر شیطانی راستہ اختیار کر لیا تھا۔ یعنی شیطانی راستہ کیا ہے، خدا سے بغاوت اور خدا کے احکام کی حکم عدولی اور ان کو پس پشت ڈالنا۔ گویا خدا کا حکمِ سزا شیطانی راستہ اختیار کے بعد ہوا۔

آٹھویں آیت:

يُضِلُّ بِهٖ كَثِيْرًا وَّيَهْدِيْ بِهٖ كَثِيْرًا وَّمَا يُضِلُّ بِهٖٓ اِلَّا الْفٰسِقِيْنَ (بقرہ26:2)

وہ بہتروں کو اس سے گمراہ ٹھہراتا ہے اور بہتروں کو اس سے ہدایت دیتا ہے اور وہ اس سے سوائے فاسقوں کے کسی کو گمراہ نہیں ٹھہراتا۔

وضاحت:

اس آیت کی وضاحت خود آیت میں موجود ہے۔ یہ وضاحت وَمَا يُضِلُّ بِهٖٓ اِلَّا الْفٰسِقِيْنَ سے ہوئی یعنی جن کو گمراہ ٹھہرایا گیا ہے وہ فاسق ہیں فاسق وہ ہوتا ہے جو شریعت کے احکام سے خروج کرتا ہے۔ گویا گمراہی فسق کا نتیجہ ہے۔ یہ خدائی طرف سے نہیں۔ یہ گمراہی فسق اور بدعہدی کا نتیجہ ہے۔

نویں آیت:

اَتُرِيْدُوْنَ اَنْ تَهْدُوْا مَنْ اَضَلَّ اللّٰهُ وَمَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَلَنْ تَجِدَ لَهٗ سَبِيْلًا (نساء88:4)

کیا تم چاہتے ہو کہ اسے ہدایت کرو جسے اللہ نے گمراہ ٹھہرایا اور جس کو اللہ گمراہ چھوڑ دے تو تُو اس کے لیے کوئی راستہ نہ پائے گا۔

وضاحت:

کافروں کی گمراہی احکام الٰہیہ کو جھٹلانے اور بداعمالی کے ارتکاب کا نتیجہ ہے۔ اس کی وضاحت کئی دوسرے مقامات پر کی گئی ہے۔ ارشاد الٰہی ہے۔

وَاللّٰهُ اَرْكَسَهُمْ بِمَا كَسَبُوْا (النسآء ۔ ۸۸)

اللہ نے ان کو ان کے کاموں کی وجہ سے الٹ دیا۔ یعنی ان کی گمراہی ان کے اپنے کاموں کا نتیجہ ہے۔ الفاظ بِمَا كَسَبُوْا (جو ان نے کمایا) سے ظاہر ہوتا ہے۔

دوسری جگہ آتا ہے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ثُمَّ كَفَرُوْا ثُمَّ اٰمَنُوْا ثُمَّ كَفَرُوْا ثُمَّ ازْدَادُوْا كُفْرًا لَّمْ يَكُنِ اللّٰهُ لِيَغْفِرَ لَهُمْ وَلَا لِيَهْدِيَهُمْ سَبِيْلًا (نساء137:4)

بے شک وہ لوگ جو ایمان لائے پھر کافر ہوئے پھر ایمان لائے پھر کافر ہوئے پھر کفر میں بڑھ گئے تو اللہ یہ نہیں کہ ان کو بخشے اور نہ یہ کہ ان کو راہ پر سیدھا چلائے۔

بار بار ایمان لانا پھر رشتہ ایمان کو توڑنا بدعہدوں اور گمراہوں کا اپنا فعل ہے اللہ تعالیٰ نہ ایمان لانے پر مجبور کرتا ہے اور نہ گمراہی کے راستہ پر چلاتا ہے۔ انسان کا اپنا اختیار ہے جیسا کہ آیت ظاہر کرتی ہے جب انسان گمراہی سے ہدایت کی طرف آنے کو پسند ہی نہیں کرتا اور گمراہی کو ہی ہدایت سمجھنے لگتا ہے اس وقت اللہ تعالیٰ اپنا حکم صادر کرتا ہے۔ یہ آیت، نساء کی آیت 88 کی وضاحت کرتی ہے۔ کہ اللہ نے جو گمراہی کی مہر ثبت کی ہے وہ گمراہوں کی اپنی گمراہی کے نتیجہ پر ثبت کی ہے۔

ایک اور موقع پر اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَظَلَمُوْا لَمْ يَكُنِ اللّٰهُ لِيَغْفِرَ لَهُمْ وَلَا لِيَهْدِيَهُمْ طَرِيْقًا اِلَّا طَرِيْقَ جَهَنَّمَ خَالِدِيْنَ فِيْهَا اَبَدًا (نساء 168:4)

وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا اور ظلم کیا اللہ ایسا نہیں کہ ان کو بخش دے اور نہ یہ کہ ان کو راہ دکھائے۔ مگر دوزخ کی راہ اس میں ابد تک رہیں گے۔

یہ آیت واضح کر رہی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کفار کے کفر اور ظلم کے نتیجہ میں ان پر اپنی سزا وارد کی ہے۔ دنیا میں بھی یہی قانون ہے کہ قانون کے باغی کو سزا دی جاتی ہے یہ سزا اس کے اپنے ہی عمل کا نتیجہ ہے۔

دسویں آیت:

وَلَيَزِيْدَنَّ كَثِيْرًا مِّنْهُمْ مَّا اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ طُغْيَانًا وَّكُفْرًا وَاَلْقَيْنَا بَيْنَهُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَآءَ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ (المائدہ 64:5)

اور وہ جو تیرے رب سے تیری طرف اتارا گیا ضرور ان میں سے بہتوں کو سرکشی اور کفر میں بڑھائے گا اور ہم نے ان کے درمیان قیامت کے دن تک دشمنی اور بغض ڈال دیا ہے۔

وضاحت:

مذکورہ مائدہ کی آیت کی وضاحت یہ آیت کرتی ہے۔

ارشاد الٰہی ہے۔

وَمِنَ الَّذِيْنَ قَالُوْا اِنَّا نَصٰرٰى اَخَذْنَا مِيْثَاقَهُمْ فَنَسُوْا حَظًّا مِّمَّا ذُكِّرُوْا بِهٖ فَاَغْرَيْنَا بَيْنَهُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَآءَ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ (مائدہ 14:5)

اور ان سے جو کہتے ہیں ہم نصرانی ہیں ہم نے ان سے عہد لیا مگر وہ اس کا ایک حصہ بھول گئے جو انہیں نصیحت کی گئی تھی سو ہم نے ان کے درمیان قیامت کے دن تک دشمنی اور بغض ڈال دیا۔

یہ آیت واضح کرتی ہے کہ القاء عداوت اور ازدیاد طغیان و کفر کی علت نصاریٰ کا اس عہد کو بھول جانا ہے جو انہوں نے باندھا تھا۔ علت و معلول اور سبب اور مسبب کا سلسلہ ہے غور کرنے پر ابہام نہیں رہتا۔

آیت گیارہویں:

مَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَلَا هَادِيَ لَهٗ (الاعراف 186:7)

جس کو اللہ گمراہ قرار دے اس کے لیے کوئی ہادی نہیں۔

آیت بارہویں:

فَإِنَّ اللّٰهَ يُضِلُّ مَنْ يَّشَآءُ وَيَهْدِي مَنْ يَّشَآءُ (فاطر 8:35)

سو اللہ جسے چاہتا ہے گمراہی میں چھوڑتا ہے اور جسے چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے۔

وضاحت:

ارشاد الٰہی ہے۔

إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوْا وَظَلَمُوْا لَمْ يَكُنِ اللّٰهُ لِيَغْفِرَ لَهُمْ وَلَا لِيَهْدِيَهُمْ طَرِيْقًا (نساء 168:4)

وہ لوگ جنہوں نے انکار کیا اور ظلم کیا اللہ ایسا نہیں کہ ان کو بخش دے اور نہ یہ کہ ان کو راہ دکھائے۔

كَذٰلِكَ يُضِلُّ اللّٰهُ مَنْ هُوَ مُسْرِفٌ مُّرْتَابٌ الَّذِينَ يُجَادِلُوْنَ فِيْ اٰيٰتِ اللّٰهِ بِغَيْرِ سُلْطٰنٍ اَتٰهُمْ كَبُرَ مَقْتًا عِنْدَ اللّٰهِ وَعِنْدَ الَّذِينَ اٰمَنُوْا كَذٰلِكَ يَطْبَعُ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ قَلْبِ مُتَكَبِّرٍ جَبَّارٍ (مومن 35,34:40)

اسی طرح اللہ اسے گمراہی میں چھوڑتا ہے جو حد سے گزرنے والا شک کرنے والا ہے جو اللہ کی آیتوں کے بارے میں جھگڑتے ہیں بغیر کسی دلیل کے جوان کے پاس آئی (یہ) اللہ کے نزدیک اور اس کے نزدیک جو ایمان لائے بڑا ہی بیزاری (کی بات) ہے اسی طرح اللہ ہر متکبر سرکش کے دلوں پر مہر لگاتا ہے۔

جَعَلْنَا بَيْنَكَ وَبَيْنَ الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ حِجَابًا مَّسْتُوْرًا (بنی اسرائیل 45:17)

تو ہم تیرے اور ان لوگوں کے درمیان جو آخرت پر ایمان نہیں لاتے ایک چھپا ہوا پردہ ڈال دیتے ہیں۔

یہ آیات ظاہر کرتی ہیں کہ کفر، ظلم، اسراف، ارتیاب، اللہ کی آیات میں مجادلہ اور آخرت پر ایمان نہ لانا گمراہی کے اسباب ہیں۔

یہی حالت ہدایت یافتہ لوگوں کی ہے کہ ان کا منعم علیہم ہونا اللہ پر ایمان لانے احکام شریعت پر عمل کرنے کی وجہ سے ہے ارشاد الٰہی ہے۔

فَمَنِ اتَّبَعَ هُدَايَ فَلَا يَضِلُّ وَلَا يَشْقٰى (طٰہٰ 123:20)

سو جو کوئی میری ہدایت کی پیروی کرے گا وہ نہ گمراہ ہوگا اور نہ تکلیف میں پڑے گا۔

پس گمراہی اور ہدایت کا معاملہ انسان کے اپنے اعمال سے ہے۔ وہ مختار ہے چاہے گمراہی کا راستہ اختیار کرے خواہ ہدایت کا اس پر کوئی جبر نہیں انسان کے اعمال کے مطابق نتیجہ نکلے گا۔

تیرہویں آیت:

وَإِذَا فَعَلُوْا فَاحِشَةً قَالُوْا وَجَدْنَا عَلَيْهَا اٰبَآءَنَا وَاللّٰهُ اَمَرَنَا بِهَا قُلْ إِنَّ اللّٰهَ لَا يَاْمُرُ بِالْفَحْشَآءِ (الاعراف 28:7)

اور جب وہ کوئی بے حیائی کا کام کرتے ہیں کہتے ہیں ہم نے اپنے باپ دادوں کو ایسا کرتے پایا اللہ نے ہم کو اس کا حکم دیا ہے کہہ اللہ (کبھی) بے حیائی کا حکم نہیں دیتا۔

وَقَالُوْا لَوْ شَآءَ الرَّحْمٰنُ مَا عَبَدْنٰهُمْ مَا لَهُمْ بِذٰلِكَ مِنْ عِلْمٍ إِنْ هُمْ إِلَّا يَخْرُصُوْنَ (الزخرف 20:43)

اور کہتے ہیں کہ اگر رحمٰن چاہتا تو ہم ان کی عبادت نہ کرتے انہیں اس کا کچھ علم نہیں وہ محض اٹکلیں دوڑاتے ہیں۔

سَيَقُوْلُ الَّذِينَ اَشْرَكُوْا لَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا اَشْرَكْنَا وَلَا اٰبَآؤُنَا وَلَا حَرَّمْنَا مِنْ شَيْءٍ كَذٰلِكَ كَذَّبَ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ حَتّٰى ذَاقُوْا بَاْسَنَا قُلْ هَلْ عِنْدَكُمْ مِّنْ عِلْمٍ فَتُخْرِجُوْهُ لَنَا إِنْ تَتَّبِعُوْنَ إِلَّا الظَّنَّ وَإِنْ اَنْتُمْ إِلَّا تَخْرُصُوْنَ قُلْ فَلِلّٰهِ الْحُجَّةُ الْبَالِغَةُ فَلَوْ شَآءَ لَهَدٰكُمْ اَجْمَعِيْنَ (الانعام 149-148:6)

جنہوں نے شرک کیا اب وہ کہیں گے کہ اگر اللہ چاہتا تو نہ ہم شرک کرتے اور نہ ہمارے باپ دادا اور نہ ہم کوئی چیز حرام کرتے اسی طرح وہ لوگ جھٹلاتے رہے جو ان سے پہلے تھے یہاں تک کہ ہماری سزا کا مزا چکھا کہہ کیا تمہارے پاس کوئی علم ہے تو اس کو ہمارے لیے نکالو تو تم صرف ظن کی پیروی کرتے ہو اور تم تو اٹکلیں دوڑاتے ہو کہہ دے تو اللہ کی دلیل ہی فیصلہ کن ہے سو اگر وہ چاہتا تو تم سب کو ہدایت دیتا۔

وضاحت:

وہ لوگ جو اپنے آپ کو مجبور سمجھتے تھے اور کہتے تھے کہ اگر اللہ چاہتا تو ہم شرک نہ کرتے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو کیسے سخت جواب دیئے بلکہ یہ بھی کہہ دیا کہ وہ جھوٹ بولتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو ایک یہ جواب دیا ہے کہ اگر ہم انسانوں کو مجبور کرتے تو ہم ان سب کو ہدایت کی نعمت سے نوازتے۔ جیسا کہ یہ الفاظ ظاہر کرتے ہیں۔

فَلَوْ شَآءَ لَهَدٰكُمْ اَجْمَعِيْنَ

(یعنی اگر وہ چاہتا تو سب کو ہدایت دے دیتا) لیکن اللہ تعالیٰ نے ایسا نہیں کیا۔ اللہ تعالیٰ نے نہ کسی کو برائی پر مجبور کیا اور نہ کسی کو ہدایت پر۔ بلکہ انسانوں کو طاقت اور قدرت دی ہے اور تکلیفات شرعیہ پر یہ کہا ہے۔

لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا

کہ ہم کسی کی اس کی طاقت اور وسعت سے بڑھ کر مکلف شرعیہ نہیں کرتے۔

فرمایا:

فَمَنْ شَآءَ فَلْيُؤْمِنْ وَّمَنْ شَآءَ فَلْيَكْفُرْ (کہف 29:18)

سو جو کوئی چاہے ایمان لائے اور جو کوئی چاہے انکار کرے۔

وَاَمَّا ثَمُوْدُ فَهَدَيْنٰهُمْ فَاسْتَحَبُّوا الْعَمٰى عَلَى الْهُدٰى (حم السجدہ 17:41)

اور رہے ثمود تو ہم نے انہیں رستہ دکھایا پر انہوں نے اندھا رہنے کو ہدایت پر ترجیح دی۔

مذکورہ آیات ظاہر کرتی ہیں کہ ہدایت یافتہ یا گمراہ ہونا انسان کے اپنے اختیار میں ہے اس میں اللہ کا کوئی جبر نہیں۔ اللہ تعالیٰ ہدایت یا گمراہی اختیار کرنے پر جزا و سزا دیتا ہے۔ ایک قاعدہ کلیہ کے طور پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے۔

تُوَفّٰى كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ (البقرہ 281:20)

پھر ہر شخص کو جو اس نے کمایا (اس کا بدلہ) پورا پورا دیا جائے گا اور انہیں نقصان نہیں پہنچایا جائے گا۔

پس تقدیر اللہ تعالیٰ کا قانون ہے۔ اللہ کی ایک تقدیر مبرم ہے جو اٹل ہے اسی پر نظام کائنات چل رہا ہے دوسری تقدیر معلق ہے جس کا انسان سے تعلق ہے۔ اس میں انسان مختار ہے۔ کہ وہ کون سا رستہ اختیار کرتا ہے۔ جو رستہ بھی اختیار کرے گا اسی کے مطابق اس کو بدلا دیا جائے گا۔ جو اس نے کمایا۔ مستشرقین نے اسلام پر اعتراض کیا ہے کہ عقیدہ تقدیر کی وجہ سے انسان بے بس اور بے اختیار ہے بالکل غلط اور عقیدہ تقدیر کو نہ سمجھنے کا نتیجہ ہے۔ مسئلہ تقدیر علم کلام کا ایک نہایت پیچیدہ مسئلہ ہے۔ جب تک اس کے تمام پہلو نظر کے سامنے نہ ہوں یہ مسئلہ سمجھ میں نہیں آتا۔ کوشش کی گئی ہے کہ مسئلہ تقدیر کے تمام پہلوؤں پر بحث کی جائے تاکہ قارئین اس مسئلہ کی حقیقت کو سمجھ سکیں دوم ان آیات کی بھی وضاحت کر دی گئی ہے۔ جن پر قرآن مجید کا طرز بیان نہ سمجھنے کی وجہ سے اعتراض کیا گیا ہے کہ اللہ ہی انسانوں کو گمراہ کرتا ہے یہ طریقہ بیان صرف قرآن مجید کا ہی نہیں بلکہ عہد نامہ عتیق اور جدید کا بھی ہے۔ یہ طرز بیان ادب کا ایک حسن ہے۔ جس کو ادب کی باریکیاں نہ سمجھنے والے غلط فہمی کا شکار ہو جاتے ہیں۔

مسئلہ نجات پر اعتراض

اعتراض :انسان کی نجات قیامت کے روز کیوں کر ہوگی آیا صرف اعمال حسنہ کے سبب یا کسی شفیع کی شفاعت سے یا اعمال حسنہ اور شفاعت شفیع کے اجتماع سے۔

سراج الدین عیسائی نے مسئلہ نجات کو سامنے رکھ کر یہ سوال اٹھایا ہے عیسائی عقائد کے مطابق مسیح کا مشن اس دنیا میں بنی نوع انسان کی محبت کے لیے آنا تھا اور نوع انسانی کی خاطر اپنے تئیں قربان کر دیا تھا کیا بانی اسلام کا مشن ان دونوں میں ظاہر ہو سکتا ہے یا نہیں؟ یا محبت اور قربانی کے علاوہ کسی اور بہتر الفاظ میں اس مشن کو ظاہر کر سکتے ہیں۔

اس سوال میں سراج الدین پادری یہ کہنا چاہتا ہے کہ یسوع اس دنیا میں گنہگاروں سے محبت کر کے ان کے گناہوں کا بوجھ لے کر مصلوب ہوئے اور تمام ماننے والوں کے لیے نجات کا باعث بن گئے۔ سراج الدین کہتا ہے کہ کیا اسلام میں بھی اس سے بہتر کوئی راستہ بتایا گیا ہے وہ یہ بھی سوال کر رہا ہے کہ اسلام میں نجات حاصل کرنے کا کیا طریقہ ہے۔

الغرض دونوں سوالوں کا مفہوم ایک ہی ہے کہ اسلام میں طریقہ نجات کیا ہے۔

جواب: ہر مذہب میں نجات کا مسئلہ بہت ہی اہم ہے اسلام کی رو سے اسی غرض کے لیے اللہ تعالیٰ نے انبیاء علیہم السلام کو دنیا میں بھیجا۔ پھر اسلام یہ بھی کہتا ہے کہ ہر قوم کی طرف نبی آئے۔ پھر یہ بھی کہتا ہے تمام انبیاء علیہم السلام کی تعلیمات میں کچھ صداقتیں دائمی اور مستقل تھیں ان میں تمام انبیاء علیہم السلام کی تعلیمات کا اشتراک ہے نجات کا حصول ہر شخص کا مسئلہ ہے تا قیامت رہے گا اسی لیے نجات کے حصول کے ذرائع یکساں ہی ہیں لیکن مرور زمانہ سے اسلام سے قبل تمام مذاہب میں حصول نجات کے ذرائع میں قسما قسم کے نظریات داخل ہونے شروع ہو گئے اور اس طرح حصول نجات کے ذرائع میں اختلاف پیدا ہوتا چلا گیا۔ اب ہندومت میں نجات کا ایک الگ نظریہ ہے عیسائیت میں الگ اسی طرح دوسرے مذاہب کا حال ہے دوسرے دیگر مذاہب کا نظریہ نجات اسلام کے نظریہ نجات کی وضاحت کے بعد بیان کیا جائے۔

اسلام کا نظریہ نجات:

اسلام نے گناہوں سے پاک اور اعلیٰ روحانی زندگی کے حصول کو نجات یا مکتی نہیں کہا بلکہ اعلیٰ روحانی ترقی کے مقام کا نام فلاح رکھا ہے جیسا کہ ارشاد الٰہی ہے۔

وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ (البقرہ 5:2)

اور یہی لوگ کامیاب ہونے والے ہیں۔

دوسری جگہ آتا ہے۔

قَدْ اَفْلَحَ مَنْ تَزَكّٰى (الاعلیٰ 14:87)

وہ شخص جس نے اپنے نفس کو پاک کیا وہ کامیاب ہو گیا۔

فلح کے اصل معنی شق کرنا ہے زمین میں ہل چلانے پر بھی بولا جاتا ہے اس لیے کسان کو فلاح کہتے ہیں فلاح کے معنی ہیں ظفر و ادراک بغیۃ یعنی کامیابی اور مطلوب کو پالینا جس طرح ہل چلانے سے زمین کی مخفی قوتیں اور جوہر باہر نکل آتے ہیں یہی حال انسانی قوئ کا ہے ان کے مخفی جوہروں اور استعدادوں کا باہر نکل آنا ہی انسان کی حقیقی کامیابی ہے مثلاً ایک بیج کو جب زرخیز زمین میں بویا جاتا ہے تو اس بیج سے کونپلیں نکل آتی ہیں پھر بڑھتا چلا جاتا ہے آخر کار وہ پھل وغیرہ دینا شروع کر دیتا ہے یہ ہے اس بیج کی کامیابی اسی طرح اسلام کی تعلیمات پر عمل کرنے سے انسان کی مخفی استعدادیں جاگ اٹھتی ہیں انہی مخفی استعدادوں کا اظہار انسان کی کامیابی ہے۔ اگر انسانی مخفی استعدادیں ظاہر نہ ہوں تو انسانی معاشرہ اور جانوروں کا جنگل میں زندگی بسر کرنے میں کوئی فرق نہیں۔

معترض اور سوال کرنے والے کو معلوم ہونا چاہیے اسلام نے انسان کی کامیابی کے لیے لفظ فلاح استعمال کیا ہے۔

فلاح کا لفظ نجات سے زیادہ وسیع اور اعلیٰ مفہوم اپنے اندر رکھتا ہے چونکہ معترض یا سوال کرنے والے نے لفظ نجات استعمال کیا ہے عوام بھی عام بول چال میں یہی لفظ استعمال کرتے ہیں اس لیے نجات کو فلاح کا مترادف سمجھ لیجیے علی العموم اس کا استعمال قیامت کے دن کے لیے ہوتا ہے۔

قیامت کے روز نجات کا ذریعہ:

بندگان خدا کی نجات قیامت کے روز محض اللہ تعالیٰ کے فضل سے ہوگی اور صرف اس کے رحم سے ہی نجات پائیں گے۔ اسلام میں فضل الٰہی لوگوں کی نجات کا ذریعہ ہے۔ ارشاد الٰہی ہے۔

وَوَقٰهُمْ عَذَابَ الْجَحِيْمِ فَضْلًا مِّنْ رَّبِّكَ ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ (الدخان 57,56:44)

اس نے انہیں دوزخ کے عذاب سے بچایا تیرے رب کی طرف سے فضل ہے یہی بڑی کامیابی ہے۔

دوسری جگہ آتا ہے۔

سَابِقُوْٓا اِلٰى مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَجَنَّةٍ عَرْضُهَا كَعَرْضِ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ اُعِدَّتْ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ (حدید 21:51)

اپنے رب کی مغفرت کی طرف سبقت کرو اور اس جنت کی طرف جس کی وسعت آسمان اور زمین کی وسعت کی طرح ہے وہ ان لوگوں کے لیے تیار کی گئی ہے جو اللہ اور اس کے رسولوں پر ایمان لاتے ہیں یہ اللہ کا فضل ہے وہ جسے چاہتا ہے دیتا ہے اور (اللہ تعالیٰ) بڑے فضل والا ہے۔

ایک غلطی کا ازالہ:

جب یہ کہا جاتا ہے کہ نجات محض فضل الٰہی سے ہے تو ایک غلط فہمی پیدا ہو جاتی ہے کہ اسلام عمل کا قائل نہیں۔ یہ ایک بڑی غلط فہمی اور ناسمجھی کا نتیجہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فضل الٰہی جذب کرنے کے کچھ ذرائع بھی قرآن مجید میں بیان کیے ہیں۔ جب کوئی انسان ان ذرائع کو اختیار

کرتا ہے تو پھر وہ اللہ تعالیٰ کے فضل کو جذب کرتا ہے اور فضل الٰہی کا مستحق ٹھہرتا ہے وہ ذرائع دو ہیں ایمان اور اعمال صالحہ۔ جب تک ان دو ذرائع کو اختیار نہیں کیا جاتا انسان فضل الٰہی کا مستحق نہیں ہوسکتا۔ قرآن مجید میں ایمان اور اعمال کا ذکر بار بار آتا ہے ایمان جڑ ہے اور اعمال صالحہ اس کی شاخیں گویا ایمان اور اعمال صالحہ لازم وملزوم ہیں۔

ایمان باللہ:

ارشادالٰہی ہے۔

یُؤْمِنُوْنَ بِالْغَیْبِ (البقرہ2:2)

(متقی یا اللہ کا فضل حاصل کرنے والے وہ ہیں) جو غیب پر ایمان لاتے ہیں غیب سے مراد وہ ہستی ہے جو حواس ظاہرہ سے پوشیدہ ہے۔

یٰاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ (النساء136:4)

اے لوگو! جو ایمان لائے ہو اللہ پر ایمان لاؤ۔

ایک اور جگہ آتا ہے۔

وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ اُولٰٓئِكَ هُمُ الصِّدِّیْقُوْنَ وَالشُّهَدَآءُ عِنْدَ رَبِّهِمْ (الحدید19:57)

اور جو اللہ اور اس کے رسولوں پر ایمان لائے وہ اپنے رب کے نزدیک صدیق اور شہید ہیں۔

صدیق اور شہید دو روحانی مقام ہیں۔ مقام صدیقت اور مقام شہادت پانے کے لیے اللہ پر ایمان لانا ضروری ہے۔

ایک مقام پر اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَمَا لَكُمْ لَا تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ (الحدید8:57)

اور تمہیں کیا ہوا ہے تم اللہ پر ایمان نہیں لاتے۔

اسلام کے نزدیک ایمان باللہ کے ساتھ کچھ ضمنی ایمانیات بھی ہیں جو بنیادی عقائد کہلاتے ہیں ارشادالٰہی ہے۔

وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالْكِتٰبِ وَالنَّبِیّٖنَ (البقرہ177:2)

بلکہ نیک وہ ہے جو اللہ کو اور یوم آخرت کو اور فرشتوں کو (سماوی) کتابوں اور نبیوں کو مانے۔

اس آیت کریمہ میں ایمان باللہ کے ساتھ چند ضمنی ایمانیات کا ذکر کر دیا ہے ایمان باللہ اس وقت تک کامل نہیں ہوتا جب تک دوسرے ضمنی ایمانیات (آخرت، ملائکہ، کتب سماوی اور نبیوں) پر یقین نہیں رکھا جاتا۔

اعمال صالحہ:

اعمال صالحہ ایمانیات کا ثمر ہے۔ گویا ایمان جڑ ہے اور اعمال صالحہ اس کا ثمر جب تک درخت کی جڑیں زمین میں پیوست نہ ہوں اس وقت تک درخت نہ ہرا بھرا رہ سکتا ہے نہ اس کو پھل لگ سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید میں کثرت کے ساتھ جہاں ایمان باللہ کا ذکر کیا ہے اس کے ساتھ ہی اعمال صالحہ بجالانے کا ذکر کیا ہے ارشادالٰہی ہے۔

مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَلَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَلَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ (بقرہ 63:2)

جو اللہ اور آخری دن پر ایمان لائیں اور نیک اعمال بجالائیں ان کے لیے ان کے رب کے پاس اجر ہے ان کو نہ کوئی خوف ہے اور نہ

وہ غمگین ہوں گے۔

دوسری جگہ آتا ہے۔

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ (بقرہ82:2)

اور وہ لوگ جو ایمان لائے اور اعمال صالحہ بجالائے وہی لوگ جنت کے وارث ہوں گے اس میں ہمیشہ رہیں گے۔

ان آیات سے واضح ہوتا ہے کہ ایمان اور اعمال صالحہ لازم وملزوم ہیں۔

اعمال صالح کی تشریح:

اعمال صالحہ کی تین شاخیں ہیں۔عبادت،اخلاق (اخلاق فاضلہ کا ارتکاب اور اخلاق سیہ سے اجتناب) اور معاملات۔

عبادات:

اسلام کے نزدیک انسان کی پیدائش کی غرض وغایت ہی عبادت بجالانا ہے۔ارشاد الٰہی ہے۔

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ (الذاریات56:51)

میں نے جن وانس کو اس لیے پیدا کیا ہے تاکہ میری عبادت کریں۔

دوسری جگہ آتا ہے۔

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّكُمُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ وَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ (البقرہ21:2)

اے لوگو اپنے رب کی عبادت کرو جس نے تمہیں پیدا کیا اور انہیں بھی جو تم سے پہلے تھے تاکہ تم متقی بنو۔

اس آیت میں عبادت کا نتیجہ بھی بیان کر دیا وہ ہے تقویٰ اور تقویٰ ہی تمام نیکیوں کی جڑ ہے۔

اسلام میں عبادت کا مفہوم بہت وسیع ہے لیکن چار عبادتیں لازمی قرار دی ہیں۔نماز، زکوٰۃ، روزہ اور حج، ان چاروں عبادات کا مقصود تقویٰ ہے۔قرآن مجید جب مذکورہ کسی عبادت کی ادائیگی کا ذکر آتا ہے تو اس کا نتیجہ تقویٰ بیان کیا جاتا ہے گویا چاروں عبادتیں تقویٰ کے حصول کا ذریعہ ہیں۔جو اللہ کا فضل جذب کرنے کا ذریعہ ہے۔

اخلاق:

ارشاد الٰہی ہے۔

صِبْغَةَ اللّٰهِ وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ صِبْغَةً (البقرہ138:2)

اللہ کا رنگ اختیار کرو اس رنگ سے اچھا کوئی اور رنگ ہے۔

صبغۃ سے مراد اسماء حسنی ہیں جو شخص اسماحسنی کے رنگ میں اپنے آپ کو رنگ لیتا ہے وہ اللہ کے فضل کو پالیتا ہے۔

معاملات:

اس شاخ میں معاشرتی اور مالی حقوق کی ادائیگی شامل ہے مالی حقوق میں انفاق فی سبیل اللہ کو بہت اہمیت دی گئی ہے جو شخص اللہ کی عطا کردہ نعمتوں میں سے انسانوں کی بھلائی کے لیے خرچ نہیں کرتا وہ قابل مواخذہ ہے۔حضرت ابو ہریرۃ سے روایت ہے کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا اللہ جسے مال دے اور وہ اس مال کی زکوٰۃ نہ دے تو اس کا مال قیامت کے دن اس کے لیے اژدھا سانپ کی شکل اختیار کرے گا جس کے سر میں دو چتیاں ہوں گی وہ سانپ اس کا طوق بن جائے گا جو اس کے دونوں جبڑوں کو ڈسے گا اور کہے گا میں تیرا مال ہوں

تیرا خزانہ ہوں پھر آپ نے اس آیت کی تلاوت کی۔ (کتاب الزکوۃ بخاری)

وہ آیت یہ ہے۔

وَلَا يَحْسَبَنَّ الَّذِينَ يَبْخَلُونَ بِمَا آتَاهُمُ اللَّهُ مِن فَضْلِهِ هُوَ خَيْرًا لَّهُم بَلْ هُوَ شَرٌّ لَّهُمْ سَيُطَوَّقُونَ مَا بَخِلُوا بِهِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَلِلَّهِ مِيرَاثُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَاللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ خَبِيرٌ (آل عمران 180:3)

اور وہ لوگ جو اس میں بخل سے کام لیتے ہیں جو اللہ نے انہیں اپنے فضل سے دیا ہے یہ خیال نہ کریں کہ یہ ان کے لیے اچھا ہے بلکہ وہ ان کے لیے بُرا ہے قیامت کے دن وہی ان کے گلے کا طوق بنایا جائے گا جس میں وہ بخل کرتے ہیں اور آسمانوں اور زمین کی میراث اللہ ہی کی ہے اور جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اس سے خبردار ہے۔

اللہ تعالیٰ نے ایمان اور اعمال صالحہ (عبادات، اخلاق اور معاملات) کے علاوہ کچھ مزید ضمنی اصول بھی بیان کیے ہیں جو جاذب فضل الٰہی ہیں وہ ہیں دعا، توبہ، استغفار مجاہدہ اور استقلال۔

دعا:

ارشاد الٰہی ہے۔

اُدْعُونِي أَسْتَجِبْ لَكُمْ (المومن 60:40)

تم دعا کرو میں قبول کروں گا۔

دعا کیا ہے۔ دعا کرنا اپنے اوپر ایک موت وارد کرنا ہے جب ایک انسان کی ارضی اور سفلی خواہشات اللہ کی محبت کی آگ میں بھسم ہو جاتی ہیں اور انسان کی روح آستانہ الوہیت پر پانی کی طرح بہہ نکلتی ہے جب انسان پر یہ حالت وارد ہوتی ہے اس وقت انسان محفوظیت کی مستحکم چٹان پر کھڑا ہو جاتا ہے اور شیطان اس آدمی کو گناہ کے راستے پر چلانے سے بالکل مایوس ہو جاتا ہے۔

توبہ و استغفار:

توبہ عربی میں رجوع کرنے کو کہتے ہیں اس وجہ سے قرآن مجید میں خدا کا نام تواب ہے یعنی بہت رجوع کرنے والا ہے اس کے معنی ہیں جب انسان اپنے گناہوں سے دستبردار ہو کر اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم کی چادریں لپیٹ لیتا ہے اپنے بندے کے گناہ معاف کر دیتا ہے۔

استغفار:

استغفار غفر سے مشتق ہے۔ جس کے معنی ہیں کہ اللہ سے یہ درخواست کرنا کہ بشریت کی کمزوری ظاہر نہ ہو، دوسرے الفاظ میں استغفار کے معنی استمداد اور استقامت کے ہیں۔

ارشاد الٰہی ہے۔

وَأَنِ اسْتَغْفِرُوا رَبَّكُمْ ثُمَّ تُوبُوا (ہود 3:11)

یعنی تم اپنے رب سے استغفار کرو اور اسی کی طرف رجوع کرو۔

مجاہدہ:

ارشاد الٰہی ہے۔

وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا (العنکبوت69:29).

اور جو لوگ ہمارے لیے محنت اٹھاتے ہیں ہم یقیناً انہیں اپنے راستوں پر چلائیں گے۔

استقامت:

استقامت یہ ہے کہ اگر انسان ہر قسم کے مصائب اور تکلیف میں گھر جائے کوئی بھی مونس اور معاون نہ ہو اس حالت میں بھی ان کی زبان اور اس کے جوارح سے کسی قسم کی بے چینی اور اضطراب ظاہر نہ ہو۔ ارشاد الٰہی ہے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا تَتَنَزَّلُ عَلَيْهِمُ الْمَلٰٓئِكَةُ اَلَّا تَخَافُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَبْشِرُوْا بِالْجَنَّةِ الَّتِيْ كُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ نَحْنُ اَوْلِيٰٓؤُكُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِي الْاٰخِرَةِ (حم السجدہ31,30:41)

یعنی وہ لوگ جنہوں نے کہا کہ ہمارا رب اللہ ہے پھر استقامت اختیار کی (یعنی ہر قسم کی تکلیف اور آزمائش کے وقت ثابت قدم رہے) ان پر فرشتے نازل ہوتے ہیں اور کہتے ہیں کہ تم مت ڈرو اور مت غمگین ہو، جنت اور دائمی خوشی کی بشارت پاؤ جس کا تمہیں وعدہ دیا گیا ہے ہم دنیا اور آخرت کی زندگی میں تمہارے دوست ہیں۔

پس فضل الٰہی جذب کرنے کے لیے استقامت ضروری ہے۔

پس فضل الٰہی کے حصول کے لیے اللہ تعالیٰ نے یہ لائحہ عمل اختیار کرنے کی تلقین کی ہے اس کے نتیجہ میں اللہ تعالیٰ اپنے فضل کی رداء اپنے بندے کو پہنا دیتا ہے۔ اس سے بہتر کسی مذہب نے بھی نجات کے حصول کا طریقہ بیان نہیں کیا۔

نجات اور گناہ:

اگر کوئی شخص گناہوں کا ارتکاب کرتا ہے اس کے متعلق اسلام کیا کہتا ہے۔ قرآن مجید بیان کرتا ہے کہ گناہ تین قسم کے ہیں اول شرک، دوم کبائر گناہ، سوم صغائر۔

شرک کے متعلق ارشاد الٰہی ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ وَمَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًا بَعِيْدًا (النساء 116:4)

اللہ یہ نہیں بخشتا کہ اس کے ساتھ شریک ٹھہرایا جائے جو اس کے سوا ہو جسے چاہتا ہے بخشتا ہے اور جو شخص اللہ کے ساتھ شریک ٹھہراتا ہے وہ گمراہی میں دور نکل گیا۔

یہ آیت ظاہر کرتی ہے جس شخص کی موت شرک پر ہو یعنی وہ مشرک ہو۔ وہ اللہ کے فضل سے محروم رہے گا۔ دوسری بات یہ بیان کی ہے کہ شرک کے علاوہ جن گناہوں کو چاہے معاف کر دیتا ہے وہ گناہ کبائر اور صغائر دونوں ہیں۔ کبائر کیا ہیں صغائر کیا ہیں۔ صغائر وہ گناہ ہیں جو کبائر گناہ کی مبادیات ہوتی ہیں مثلاً جو شخص زنا کا مرتکب ہوا ضروری ہے کہ ارتکاب زنا سے پہلے وہ اس نظر بازی کا مرتکب ہو جو زنا کے ارتکاب تک لے جاتی ہے۔ آزادانہ میل ملاپ، بھوسا کنار وغیرہ۔ یہ واضح ہے یہ کارروائیاں زنا سے کمتر ہیں۔ ایسے کبائر کی نسبت قرآن فرماتا ہے۔

اِنْ تَجْتَنِبُوْا كَبَآئِرَ مَا تُنْهَوْنَ عَنْهُ نُكَفِّرْ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ وَنُدْخِلْكُمْ مُّدْخَلًا كَرِيْمًا (النساء31:4)

اگر تم ان بڑی بدیوں سے بچتے رہو جن سے تم کو روکا جاتا ہے کہ ہم تمہاری برائیاں تم سے دور کر دیں گے اور تم کو عزت کی جگہ داخل کریں گے۔

زنا بڑا گناہ ہے اور اس کی مبادیات چھوٹے گناہ ہیں۔ دونوں گناہ توبہ اور استغفار سے دور ہو جاتے ہیں۔ توبہ اور استغفار کی ایک یہ شرط ہے کہ جب بندہ اپنے کبیرہ گناہ سے توبہ کر لیتا ہے تو پھر اس گناہ کا دوبارہ ارتکاب نہ کرے۔ اگر دوبارہ گناہ ارتکاب کر لیتا ہے تو پھر بھی توبہ کا دروازہ کھلا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے بندے پر توبہ کا دروازہ ہمیشہ کے لیے کھلا رکھا ہے۔ بہتر یہی ہے کہ توبہ کے بعد دوبارہ کبیرہ گناہ کا ارتکاب نہ کرے۔ بہر حال اللہ تعالیٰ نے موت سے پہلے گناہوں سے توبہ کا دروازہ کھلا رکھا ہے۔ یہ بھی اللہ کا فضل اور کرم ہے۔

نیکی اور بدی کا فلسفہ یہ ہے کہ نیکی ایمان کا ثمر ہے اور بدی کفر کا جب انسان بدی کا ارتکاب کرتا ہے تو گویا وہ کفر کے دائرہ میں داخل ہوتا ہے۔ کفر اللہ کے فضل کو جذب نہیں کرتا۔ اللہ تعالیٰ نے پھر بھی اپنے بندے کے لیے توبہ کا دروازہ کھلا رکھا ہے وہ کسی وقت توبہ کے دروازہ میں داخل ہو کر اللہ کے فضل اور رحم کا مستحق بن سکتا ہے۔

ایک اہم اور دقیق مسئلہ:

اگر بندے کے اعمال نامے میں نیکیاں بھی ہیں اور بدیاں بھی۔ اس کے متعلق اللہ تعالیٰ کا کیا حکم ہے قرآن مجید میں آتا ہے۔

وَاٰخَرُوْنَ اعْتَرَفُوْا بِذُنُوْبِهِمْ خَلَطُوْا عَمَلًا صَالِحًا وَّ اٰخَرَ سَيِّئًا عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّتُوْبَ عَلَيْهِمْ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ (توبہ 102:9)

اور کچھ اور ہیں جنہوں نے اپنے قصور (گناہ) تسلیم کر لیے ایک نیک کام اور دوسرا بُرا ملایا۔ قریب ہے کہ اللہ ان کی توبہ قبول کرے اللہ بخشنے والا رحم کرنے والا ہے۔

انسان کے اعمال نامے میں نیکیوں اور بدیوں کا اختلاط ہو تو اس صورت میں بدیوں کے بد اثرات کو توبہ سے دور کیا جا سکتا ہے جب نیک اعمال کثرت سے نہیں اور ایمانی قوت کا قوی ہونا ثابت نہیں ہوتا۔ اس وقت چھوٹا ایمان خدا کے بڑے فضل کو کھینچ نہیں سکتا فضل کے حصول کے سبب میں کمزوری ہوتی ہے اس وقت اللہ تعالیٰ جو ارحم الراحمین اور غفار ہے اپنے رحم و کرم سے اس چھوٹے ایمان کے ساتھ کسی شفیع کی شفاعت اور دعا کو ملا دیتا ہے۔ اسی کمزور ایمان کو اس ذریعے سے قوت دے کر اپنے فضل و کرم کا مستحق بنا دیتا ہے۔ شفیع کی شفاعت اور داعی کی دعا اللہ کے اذن سے ہوگی یہ بھی اللہ تعالیٰ کا اپنے بندوں کو بخشنے کا ایک ذریعہ ہے۔ کیونکہ اللہ کی رحمت تمام چیزوں پر حاوی ہے۔

ارشاد الٰہی ہے۔

وَلَوْ اَنَّهُمْ اِذْ ظَّلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ جَآءُوْكَ فَاسْتَغْفَرُوا اللّٰهَ وَاسْتَغْفَرَ لَهُمُ الرَّسُوْلُ (نساء 64:4)

اگر وہ اس وقت جب اپنی جانوں پر ظلم کیا تھا تیرے پاس آتے تو پھر اللہ کی بخشش سے مانگتے اور رسول ان کے لیے استغفار کرتا۔

ایک تو رسول کریم ﷺ نے اس دنیا میں خطا کاروں کے لیے دعا کی۔ اسی طرح روز محشر اللہ تعالیٰ کے اذن سے رسول کریم اور فرشتے خطا کاروں کے گناہوں کی بخشش کے لیے دعا کریں گے۔ یہ دعا اللہ کے فضل کو جذب کرے گی اور خطا کاروں کے گناہ معاف کر دیئے جائیں گے۔ صرف اللہ کے فضل و کرم کو جذب کرنے کا ایک ذریعہ ہے اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو اپنے فضل سے جنت کی نعمتوں کا وارث بنانے کے لیے مختلف ذرائع اور طریقے بیان کیے ہیں ان میں سے ایک شفاعت بھی ہے۔

عہد نامہ جدید میں ہے پولوس کہتا ہے پھر اگر فضل سے ہے تو اعمال سے نہیں۔ نہیں تو فضل نہ رہے گا اور اگر اعمال سے ہے تو پھر فضل کچھ نہیں۔ نہیں تو عمل عمل نہ رہے گا (نامہ رومیاں 11 باب 6) عہد نامہ جدید کے اس حوالہ سے واضح ہو جاتا ہے کہ نجات اللہ کے فضل سے ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فضل کو جذب کرنے کے مختلف ذرائع بیان کیے ہیں پادری صاحب کا سوال کہ نجات اعمال سے ہے یا شفاعت سے ایک کمزور سوال ہے نجات نہ اعمال سے ہے نہ شفاعت سے نجات صرف اللہ کے فضل سے ہے۔ اعمال اور شفاعت اللہ کے فضل کو جذب کرنے کا ذریعہ ہیں۔ یہی وہ دقیق مسئلہ ہے جس کو اسلام نے کھول کر بیان کر دیا ہے۔

عیسائیت میں نجات کا ذریعہ:

عیسائیوں کا یہ عقیدہ ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اس دنیا میں آئے۔ گنہگاروں سے محبت کر کے ان کے گناہوں کی لعنت اپنے سر لے لی اور پھر ان گناہوں کی وجہ سے مصلوب ہوئے اور گناہ گاروں کے گناہ معاف کر دیئے۔ قرآن مجید کہتا ہے۔

لَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰی

یعنی ایک کا بوجھ دوسرا نہیں اٹھائے گا عقیدہ کفارہ عقل کے برخلاف ہے عقل یہی کہتی ہے ہر شخص اپنے کیے کا خود ہی ذمے دار ہو لہٰذا نجات کی بنیاد کفارہ پر رکھنا بے عقلی کی دلیل ہے۔ اور فحاشی کے فروغ کا ذریعہ ہے۔

تناسخ:

ہندوؤں کا یہ عقیدہ ہے کہ روح انسان کے اپنے اعمال کے مطابق مختلف روپ اختیار کر لیتی ہے۔ جب اس کی روح مختلف روپوں میں تبدیل ہو کر اپنے کردہ گناہوں سے پاک صاف ہو جاتی ہے تو وہ مکتی (نجات) حاصل کر لیتی ہے۔

مختلف روپ اختیار کرنے کا مطلب یہ ہے کہ روح اپنے گناہوں کے مطابق کبھی بندر، کبھی سور، کبھی کتا کبھی کوئی شکل اختیار کر لیتی ہے۔

ہندوؤں کے اس نظریہ نجات کو عقل تسلیم قبول کرنے کو تیار نہیں۔ الغرض دنیا کے تمام مذاہب کا مطالعہ کیجیے نجات کے عجیب عجیب طریقے اور ذریعے بیان کیے ہیں جن کو عقل تسلیم کرنے کو تیار نہیں۔ صرف اسلام ہی ایک ایسا مذہب ہے جس نے نجات کا ایسا ذریعہ بیان کیا ہے جس میں اللہ تعالیٰ کی عظمت قدوسیت، رحیمیت، رحمانیت اور بندوں سے محبت اور پیار ظاہر ہوتا ہے اور عقل تسلیم کرتی ہے یہی طریقہ نجات بہتر ہے اس ذریعہ میں ایک طرف اللہ کا فضل نمایاں ہوتا ہے تو دوسری طرف انسان کے اعمال کی بھی اہمیت ظاہر ہوتی ہے۔ اللہ کے فضل کو حاصل کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے ایک ضابطہ مقرر کیا ہے جس کو اپنانے سے خدا کا فضل جوش میں آ جاتا ہے جو ذریعہ نجات بن جاتا ہے۔

......☆......

شفاعت پر اعتراض

اعتراض: شفاعت کیا ہے شفاعت کی ضرورت کیا ہے۔

شفیع کون ہیں۔ قرآن سے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے شفیع ہونے کا ثبوت ہر شفاعت صغریٰ و کبریٰ کی تعریف اور مراد کیا ہے (متعدد مخالفین) ترک اسلام کے مصنف دھرم پال نے مسئلہ شفاعت پر اس رنگ میں اعتراض کیا ہے۔ خدا کے ہاں سفارش منظور نہیں پھر کہا بعض کی منظور ہے۔ سفارش اور گناہ کا کیا تعلق ہے۔ (ترکِ اسلام سوال نمبر 21)

"قرآنی خدا مطلق العنان ہے قیدی لائے جاتے ہیں وزیر سپارش کر رہا ہے اور اورنگ زیبی دربار لگا ہوا ہے۔"

جواب: شفاعت بھی ان مسائل میں سے ایک مسئلہ ہے۔ جس پر متعدد معترضین نے اعتراض کیا ہے اور تمام اعتراضات کو یکجا کر کے جواب دیا

جارہا ہے۔ اسی طرح یہ وہ کلامی مسئلہ ہے جس میں علماء کا بھی بہت اختلاف ہے بعض عقلیت پسندوں نے اس مسئلے کا انکار ہی کر دیا ہے اور مختلف تاویلات سے کام لیا ہے شفاعت کے متعلق علماء ربانی کی تشریحات اور توضیحات سے جو کچھ سمجھا ہوں وہ بیان کرتا ہوں ماتوفیقی الا باللہ۔

شفاعت کیا ہے:

شفاعت شفع سے مشتق ہے جس کے معنی ہیں ایک چیز کو ایسا بنانا کہ وہ جوڑے کا ایک جزو بن جائے (تاج العروس) یا ایک چیز کو اس کے مشابہ سے ملا دینا (امام راغب) اور شفاعت کا مفہوم ہے کہ ایک شخص کو دوسرے شخص سے جو اس کا مددگار ہو ملا دینا بالخصوص جب کہ ایک جو اعلیٰ منصب اور عزت کا مالک ہو اپنے آپ کی ادنیٰ حیثیت کے شخص سے ملا دے۔ (امام راغب)

اسلام میں شفاعت کا مفہوم:

یہ اللہ تعالیٰ کی شان کریمی ہے کہ اس نے انسان کی پیدائش سے قبل ہی اپنی صفت رحمانیت کے تحت اس کی مادی اور روحانی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے ہر قسم کا سامان پیدا کر دیا تھا۔ کائنات اور مافیہا اس کی مادی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لئے تخلیق کی گئی انبیاء علیہم السلام کا سلسلہ روحانی اور معاشرتی امور سے آگاہ کرنے کے لیے جاری کیا گیا اگر یہ سلسلہ جاری نہ ہوتا تو انسان اپنی عقل سے اپنے روحانی اور معاشرتی امور کی گتھیاں نہ سلجھا سکتا گمراہیوں اور اندھیروں میں بھٹکتا پھرتا۔ ارشاد الٰہی ہے۔

اَللّٰهُ وَلِيُّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يُخْرِجُهُمْ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ (بقرہ 257:2)

اللہ ان لوگوں کا ولی ہے جو ایمان لائے وہ ان کو اندھیرے سے نکال کر روشنی کی طرف لاتا ہے۔

یہی انبیاء روشنی کے مینار تھے۔ جنہوں نے لوگوں کو ہدایت پر چلایا اور اللہ کے حضور ان کے گناہوں کی بخشش کے لیے رات کے اندھیروں میں اٹھ کر دعائیں کیں یہی دعا شفاعت ہے جس کا آغاز اس دنیا سے ہوتا ہے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے قبل انبیاء علیہم السلام قومی نبی تھے ایک خاص قوم کے لیے آئے۔ لہٰذا ان کی شفاعت محدود تھی۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت عالمگیر تھی لہٰذا آپ ﷺ کی شفاعت، شفاعت کبریٰ تھی۔ آپ ﷺ کی شفاعت کا آغاز بھی اس دنیا سے شروع ہو گیا تھا۔ ارشاد الٰہی ہے۔

وَلَوْ اَنَّهُمْ اِذْ ظَّلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ جَآءُوْكَ فَاسْتَغْفَرُوا اللّٰهَ وَاسْتَغْفَرَ لَهُمُ الرَّسُوْلُ لَوَجَدُوا اللّٰهَ تَوَّابًا رَّحِيْمًا

(النساء 64:4)

اور اگر وہ اس وقت جب اپنی جانوں پر ظلم کیا تھا تیرے پاس آتے پھر اللہ کی بخشش مانگتے اور رسول ان کے لیے استغفار کرتا تو یقیناً وہ اللہ کو توبہ قبول کرنے والا رحم کرنے والا پاتے۔

اَسْتَغْفَرَ لَهُمُ الرَّسُوْلُ (رسول نے ان کے لیے استغفار کی) کے الفاظ ظاہر کر رہے ہیں کہ حضور ﷺ نے اپنے پیروکاروں کے گناہوں کی بخشش کی دعائیں کیں امت کے لیے جو جو دعائیں کیں ان کا ذکر احادیث میں موجود ہے یہی دعا پیروکاروں کے لیے شفاعت ہے جس کا آغاز اس دنیا سے شروع ہو گیا تھا گویا شفاعت کا تعلق خاص قیامت کے ساتھ ہی نہیں بلکہ اس دنیا سے اس کا آغاز ہو جاتا ہے۔

حساب کے دن شفاعت:

جب قیامت کے دن حساب کتاب ہوگا تو پھر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم گناہ گاروں کے لیے اللہ کے اذن سے شفاعت کریں گے۔ یہ شفاعت (دعا) اللہ کی صفت رحمانیت، غفوریت، ستاریت اور شان کریمی کا عملی اظہار ہے۔ یہ فضل الٰہی کا ایک پہلو ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں سے بہت محبت کرتا ہے اس نے اپنے گناہ گار بندوں کے گناہوں کو معاف کرنے کا ایک وسیلہ اختیار کیا ہے۔

وہ کون سے گناہ گار بندے ہیں جن کی شفاعت کی جائے گی:

یہ ایک حقیقت ہے جن بندوں کا میزان عدل میں پلڑا بھاری ہوگا وہ تو جنتی ہوں گے ارشاد الٰہی ہے۔

فَمَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِيْنُهٗ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ (اعراف 8:7)

سو جس کی نیکیاں بھاری ہوں گی تو وہی کامیاب ہونے والے ہیں۔

لہٰذا ان لوگوں کے لیے تو شفاعت کی ضرورت نہیں سو ان کا تو اللہ کے فضل سے بیڑا پار ہو گیا۔

ایک وہ گروہ ہے جن کے گناہ اللہ معاف نہیں کرے گا وہ مشرک ہیں ارشاد الٰہی ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَ يَغْفِرُ مَادُوْنَ ذٰلِكَ (نساء 116:4)

اللہ یہ نہیں بخشتا کہ اس کے ساتھ شریک بنایا جائے جو اس کے سوا ہو جسے چاہتا ہے بخش دیتا ہے۔

گو شرک نا قابل معافی گناہ ہے۔ شرک کے علاوہ دوسرے گناہوں کو وہ معاف کر دے گا۔

مَادُوْنَ ذَالِكَ

(جو اس کے سوا ہیں) میں دو قسم کے گناہ گار شامل ہیں۔

شفاعت کی ضرورت:

انسان اپنی فطرت میں نہایت کمزور ہے۔ جب اللہ تعالیٰ نے اس کو شریعت کا بوجھ اٹھانے کے لیے کہا تو اس نے تسلیم کر لیا اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے اس کو ظلوم اور جہول کہا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اوامر و نواہی کا ایک مکمل ضابطہ اس کے لیے مقرر کیا ہے تا کہ اس کے مطابق زندگی بسر کرے۔ اس کی فطرت میں یہ بات داخل ہے کہ وہ بعض احکام کے بجالانے میں قاصر رہ سکتا ہے۔ بعض اوقات اس پر نفس امارہ کی سفلی خواہشات غلبہ پا لیتی ہیں اور وہ گناہ کا ارتکاب کر جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کی اس طبعی کمزوری کو مدنظر رکھ کر اس کی بخشش کا سامان پیدا کیا ہے۔ ایک تو توبہ و استغفار ہے عاصی اس دنیا میں خدا سے توبہ و استغفار کر کے گناہ معاف کرا لیتا ہے۔ موت کے بعد عمل کا سلسلہ ختم ہو جاتا ہے تو حساب کتاب کے دن اللہ تعالیٰ نے بعض گناہ گاروں کے گناہوں کو معاف کرنے کے لیے شفاعت کبریٰ کا وسیلہ مقرر کیا ہے کہ رسول کریم ﷺ اللہ کے اذن سے اللہ کے حضور اُن گناہ گاروں کی شفاعت کریں گے یہ شفاعت، دنیا کی شفاعت کا تسلسل ہے یہ کوئی نئی بات نہیں اس دنیا میں بھی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے گناہ گاروں کے گناہوں کی بخشش اللہ تعالیٰ سے مانگی تھی اور آخرت میں بھی اللہ کے اذن سے شفاعت (دعا) کریں گے۔ ارشاد الٰہی ہے۔

مَنْ ذَالَّذِی يَشْفَعُ عِنْدَهٗ اِلَّا بِاِذْنِهٖ (البقرہ 225:2)

کون ہے وہ ایسا جو اللہ کے پاس اس کے اذن کے بغیر شفاعت کرے۔

فرمایا: يَوْمَ يَقُوْمُ الرُّوْحُ وَالْمَلٰٓئِكَةُ صَفًّا لَّا يَتَكَلَّمُوْنَ اِلَّا مَنْ اَذِنَ لَهُ الرَّحْمٰنُ (النباء 38:78)

جس دن روح اور فرشتے صف باندھ کر کھڑے ہوں گے وہ کوئی بات نہ کر سکیں گے سوائے اس کے جسے رحمان اجازت دے۔

اس آیت کے آخری الفاظ ہیں۔

وَقَالَ صَوَابًا (آیت 38)

اور (شفیع) درست بات کہے گا۔

اس آیت میں لفظ الرحمٰن آیا ہے۔ رحمان وہ ہستی ہے جو انسانوں کو ان کے اعمال کے بغیر اپنے فضل و کرم سے نوازتا ہے۔ گویا

شفاعت کا عمل صفت رحمانیت کے تحت ہے۔ یہی اللہ کا فضل ہے۔ جس کی وجہ سے گناہگاروں کے ہلکے پلڑے بھاری ہو جائیں گے اور وہ جنت کے وارث بن جائیں گے۔

شفیع کون ہے؟:

قرآن مجید کی رو سے شفیع چار ہیں اللہ فرشتے، انبیاء اور مومن حقیقی شفیع اللہ تعالیٰ کی ذات ہے جو ارحم الراحمین ذات انسانوں کے لیے اس قدر رحیم وکریم ہے کہ وہ ان عاصیوں کو بھی ایک مغفرت کی چادر میں لپیٹ لے گا۔ جنہوں نے کبھی بھی کوئی نیکی کا کام نہیں کیا۔ حدیث میں آتا ہے۔

شَفَعَتِ الْمَلٰٓئِكَةُ وَشَفَعَ النَّبِيُّوْنَ وَشَفَعَ الْمُؤْمِنُوْنَ وَلَمْ يَبْقَ اِلَّآ اَرْحَمُ الرَّاحِمِيْنَ فَيَقْبِضُ قَبْضَةً مِّنَ النَّارِ يُخْرِجُ مِنْهَا قَوْمًا لَمْ يَعْمَلْ خَيْرًا قَطُّ

یعنی اللہ تعالیٰ فرمائے گا کہ فرشتوں نے بھی شفاعت کی۔ نبیوں نے بھی شفاعت کی۔ مومنوں نے بھی شفاعت کی۔ سوائے ارحم الراحمین کے کوئی باقی نہ رہا۔ پس وہ آگ میں سے ایک مٹھی بھرے گا اور ایسے لوگوں کو باہر نکالے گا جنہوں کبھی بھلائی نہ کی۔

یہاں تین شفاعتوں کا ذکر ہے ملائک، انبیاء اور مومن۔

ملائکہ کی شفاعت:

ملائکہ کی شفاعت یہ ہے کہ وہ لوگوں کے دلوں میں نیکی کی تحریک پیدا کرتے ہیں۔ دوم اہل ارض کے لیے دعائیں مانگتے ہیں۔ ارشاد الٰہی ہے۔

اَلَّذِيْنَ يَحْمِلُوْنَ الْعَرْشَ وَمَنْ حَوْلَهٗ يُسَبِّحُوْنَ بِحَمْدِ رَبِّهِمْ وَيُؤْمِنُوْنَ بِهٖ وَيَسْتَغْفِرُوْنَ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا رَبَّنَا وَسِعْتَ كُلَّ شَيْءٍ رَّحْمَةً وَّ عِلْمًا فَاغْفِرْ لِلَّذِيْنَ تَابُوْا وَاتَّبَعُوْا سَبِيْلَكَ وَقِهِمْ عَذَابَ الْجَحِيْمِ (المومن 7:40)

اور وہ عرش اٹھاتے ہیں اور جو کوئی اس کے اردگرد ہیں اپنے رب کی حمد کے ساتھ تسبیح کرتے ہیں اور اس پر ایمان لاتے ہیں اور ان کے لیے جو ایمان لائے استغفار کرتے ہیں ہمارے رب تیری رحمت اور علم ہر چیز پر حاوی ہے سو انہیں بخش جو توبہ کرتے ہیں اور تیرے راستے کی پیروی کرتے ہیں اور انہیں دوزخ کے عذاب سے بچا۔

اس آیت میں فرشتوں کی شفاعت کا ذکر ہے وہ خاص کر مومنین کے لیے خدا سے حفاظت اور رحم کی التجا کریں گے۔

مومنوں کی شفاعت:

مومنوں کی شفاعت اس نوعیت کی ہے کہ وہ مومنین جو تقویٰ اور قرب الٰہی کے بلند مقام پر کھڑے ہیں وہ اپنی مخلصانہ دعاؤں اور اپنے اسوہ حسنہ سے ان مومنین کی شفاعت کریں گے جو ان سے کم درجہ پر ہیں نمونہ سے شفاعت کرنے کا ذکر قرآن مجید میں صراحت کے ساتھ آتا ہے۔

مَنْ يَّشْفَعْ شَفَاعَةً حَسَنَةً يَّكُنْ لَّهٗ نَصِيْبٌ مِّنْهَا (النساء 85:4)

اور جو کوئی بھلی بات کی سفارش کرے اس کو اس سے حصہ ملے گا۔

یہاں لفظ شفاعت مستعمل ہوا ہے اس کے معنی ہیں کہ جب ایک شخص کوئی اچھا نمونہ پیش کرتا ہے جس کی پیروی دوسرے کرتے ہیں اور اس سے فائدہ حاصل کرتے ہیں تو اس کو اس کا ثواب ملتا ہے اس آیت میں نیک راستہ دکھانے کو بھی شفاعت کے لفظ سے تعبیر کیا ہے کیونکہ

جو شخص بھی بتائے ہوئے نیک رستے پر گامزن ہوگا تو راستہ بتانے والا عمل کرنے والے کے لیے شفیع ہوگا۔

انبیاء کی شفاعت:

خدا کا فضل ورحم انبیاء علیہم السلام کے توسط سے بھی ظاہر ہوتا ہے۔ یہ انسانوں کے لیے شفاعت ہے۔ یہ نظریہ غلط ہے کہ انبیاء علیہم السلام کی شفاعت قیامت کے دن ہوگی اور صرف فوت شدگان کے لیے ہی محدود ہے نبی کی شفاعت اس روحانی انقلاب میں نظر آتی ہے جب وہ گناہوں میں گری ہوئی قوم میں آتا ہے تو وہ اپنی دعاؤں اور قوت قدسیہ سے اس قوم میں حیات نو پیدا کر دیتا ہے ان کو روحانی اور مادی ترقی کی راہ پر ڈال دیتا ہے سو اس معیار کو سامنے رکھ کر جب ہم موسیٰ علیہ السلام پر نظر ڈالتے ہیں تو وہ بھی شفیع ثابت ہوتے ہیں کیونکہ انہوں نے بارہا اُترتا ہوا عذاب دعا سے ٹال دیا اس کی توریت گواہ ہے اسی طرح بنی اسرائیل فرعون کی غلامی کی زنجیروں میں جکڑی ہوئی تھی ذلت کی انتہا تک پہنچی ہوئی تھی تو حضرت موسیٰ علیہ السلام کی رات کی دعاؤں اور قوت قدسیہ سے فرعون کی غلامی سے نجات دلائی اور فرعون کو دریا میں غرق کیا یہ تھی حضرت دموسیٰ علیہ السلام کی شفاعت۔ اسی طرح تمام انبیاء علیہم السلام نے اپنی اپنی قوم کو گناہوں کی دلدل سے نکالا۔ اور خدا سے ہم کلام کیا۔

حضرت محمد مصطفیٰ کی شفاعت کبریٰ:

جب ہم رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد کا مطالعہ کرتے ہیں تو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعت کا عمل جو مادی، اخلاقی، علمی اور روحانی انقلاب برپا کرتا ہے اتنا عظیم الشان ہے کہ تمام انبیاء علیہم السلام کی شفاعت آپ کی شفاعت کے مقابل پر ماند پڑ جاتی ہے آپؐ نے چند سالوں میں ہی ہر قسم کی برائیوں میں پھنسی ہوئی قوم کو نیکی کے راستہ پر چلا کر باخدا قوم بنا دیا اس گناہ گار قوم نے رات کی تاریکیوں میں اٹھ کر آستانہ الوہیت پر سر جھکا دیئے۔ منکرات کی ظلمت کا لباس اتار کر نیکیوں اور خیرات کا نورانی لباس پہن لیا۔ تھوڑے ہی عرصہ میں ان کے دلوں کو ایسا بدل کر رکھ دیا کہ وہ جہالت کے بعد معارف دینی سے مالا مال ہو گئے اور دنیا کی محبت سے ایسا دل اچاٹ ہوا خدا کی خاطر اپنے گھروں، اپنے مالوں، اپنے عزیزوں اور اپنی جان کے آراموں کو چھوڑ دیا۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی دعاؤں اور قوت قدسیہ سے ایک عظیم انقلاب برپا ہوا اور آپ کی دعاؤں اور آپ کی شفاعت کا ہی اثر تھا کہ آپؐ نے غریب اور بے گھر صحابہ کو تختوں کا مالک بنا دیا قیصر و کسریٰ کے تاج اور خزانے ان کے قدموں کے نیچے تھے یہ شفاعت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے دور اول کی ہے دوسرے دور یعنی روز محشر میں شفاعت کا کیا نظارہ ہوگا اس کا ذکر ایک حدیث میں ہے اس سے آپ کا شفاعت کبریٰ کا منصب واضح ہو جائے گا۔

قرآن مجید کی رو سے انسان کی ترقی اس دنیا تک محدود نہیں بلکہ حیات بعد الموت تک جاری ہے روز محشر وہ بڑا دن ہے جب اعمال کا حساب کتاب ہوگا رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اس دن کی شفاعت کو بڑی اہمیت دی گئی ہے اس کو اس قدر فوقیت دی گئی ہے کسی دوسرے نبی کو یہ خصوصی حق حاصل نہیں۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے شفیع ہونے کا ثبوت قرآن مجید سے:

قرآن مجید سے دونوں قسم (صغریٰ و کبریٰ) کی شفاعت (سفارش) رسول کریم ﷺ کے حق میں ثابت ہے۔

چھوٹی شفاعت (سفارش):

وَلَوْ أَنَّهُمْ إِذْ ظَلَمُوْا أَنْفُسَهُمْ جَآءُوكَ فَاسْتَغْفَرُوا اللّٰهَ وَاسْتَغْفَرَ لَهُمُ الرَّسُوْلُ لَوَجَدُوا اللّٰهَ تَوَّابًا رَّحِيْمًا (النساء 64:45)

اور اگر وہ اس وقت جب اپنی جانوں پر ظلم کیا تھا تیرے پاس آتے پھر اللہ کی بخشش مانگتے اور رسول ان کے لیے استغفار کرتا تو یقیناً

وہ اللہ کو توبہ کرنے والا رحم کرنے والا پاتے۔

خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَكِّيهِمْ بِهَا وَصَلِّ عَلَيْهِمْ اِنَّ صَلٰوتَكَ سَكَنٌ لَّهُمْ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ (توبہ 103:9)

ان کے مالوں سے زکوٰۃ لے لے تاکہ اس سے تو انہیں پاک اور صاف کرے اور ان کے لیے دعا کر کیونکہ تیری دعا ان کے لیے تسکین ہے اور اللہ سننے والا جاننے والا ہے۔

ان آیات میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اپنے پیروکاروں کے لیے دعا کا ذکر ہے یہی دعا متبعین کی ترقی کا باعث تھی اور اسی کا دوسرا نام شفاعت ہے۔ جس کا آغاز اس دنیا سے شروع ہو گیا تھا۔ شفاعت کبریٰ کا ظہور لازمی طور پر قیامت کے روز ہو گا جب تمام عاصی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں شفاعت کے لیے آئیں گے۔ تو آپ اللہ کے اذن سے شفاعت کریں گے۔

مذکورہ بحث سے شفاعت کا مفہوم یہی واضح ہوتا ہے کہ اصل غرض اللہ تعالیٰ کا عاصیوں پر رحم کرنا مقصود ہے جس کے لیے اللہ تعالیٰ نے ایک یا دوسرا سامان پیدا کیا ہے الغرض شفاعت صرف فرشتوں، مومنوں اور انبیاء علیہم السلام کی ان دعاؤں کا نام ہے جو بنی نوع انسانوں کی نجات اور بخشش کے لیے کرتے ہیں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس دنیا میں کی اور صحابہ کی زندگی بدل دی اور ایک مادی، روحانی اور علمی انقلاب برپا ہو گیا اور یہی دعا آپ اللہ کے اذن سے روز محشر اللہ کے حضور کریں گے۔

اسلام عیسائیوں والی شفاعت پیش نہیں کرتا کہ صلیب اور کفارہ پر ایمان لے آؤ اور نجات پا جاؤ گے خواہ زندگی کتنی ہی گناہوں سے بھری ہوئی ہو اس کے سوا کوئی شخص نجات حاصل نہیں کر سکتا۔

نوٹ: شفاعت کا لفظ اس بات کو بھی ظاہر کرتا ہے کہ کس قسم کے گناہ گاروں کی بخشش ہو گی۔ یہ وہ قصوروار اور گناہ گار ہیں کہ نفس کی شامت سے قصور تو ہو گیا اس پر نادم اور شرمندہ ہیں رات دن ڈرتے ہیں اپنے تئیں قصوروار سمجھتے ہیں لائق سزا جانتے ہیں۔ تو اس قسم کے گناہ گاروں کی شفاعت ہو گا۔

دھرم پال کا اعتراض:

سپارش اور گناہ کا کیا تعلق ہے؟ سپارش (سفارش) اور گناہ کا یہ تعلق ہے۔ گناہ مواخذہ کا موجب ہے جب کہ سفارش کنندہ کی سفارش اس کے نیک اعمال کے باعث الٰہی عفو کا ذریعہ اور سفارش کنند کے لیے باعث اعزاز و امتیاز ہے شفاعت، ایک دعا بلکہ دعا سے بڑھ کر ایک درجہ کی خدا کے حضور ایک التجا ہے خدا کے سامنے اس کے اذن سے گناہ گاروں کے گناہوں کے عفو کی درخواست اور التجا کرنا کوئی موجب اعتراض نہیں۔ یہ بھی اللہ کے فضل کو جذب کرنے کا ذریعہ ہے۔

......☆......

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم گناہ گار تھے (نعوذ باللہ)

اعتراض: کوئی گناہگار گناہگار کو بہشت میں داخل نہیں کر سکتا اور قرآن اور حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ محمدؐ صاحب گناہگار ہیں اس لیے وہ اس لائق نہیں کہ وہ شفاعت صغریٰ اور شفاعت کبریٰ کرنے کا اختیار پاویں بلکہ صاف آشکارا ہے کہ وہ خود بھی نہ نجات نہ پائیں گے۔ (متعدد)

وَاسْتَغْفِرْ لِذَنْبِكَ (محمد 19:47)

(اپنے قصور کے لیے حفاظت مانگ)

جواب: مذکورہ آیت کو سامنے رکھ کر معترضین نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات بابرکات پر اعتراض کیا ہے مستزاد یہ بھی کہا ہے کہ قرآن مجید عقیدہ عصمت انبیاء کی تائید نہیں کرتا۔

یہ اعتراض استغفار کے معانی نہ سمجھنے کی وجہ سے کیا گیا ہے جس کے معنی عام طور پر گناہوں سے معافی مانگنے کے لیے جاتے ہیں مگر اس کا مفہوم وسیع ہے۔

استغفار کا مادہ غفر ہے جس کے معانی ہیں کسی چیز کو ایسی چیز سے ڈھانکنا جو اس کو گرد و غبار سے محفوظ کرے۔ (مفردات امام راغب) لسان العرب میں ہے کہ غفر کے معنی ہیں تغطیۃ اور ستر یعنی ڈھانکنا۔ غفر اللّٰہ ذنوبہٗ کا مطلب ہے اللہ نے اس کے گناہوں کو ڈھانک لیا (لسان العرب) مِغفر خود کو کہتے ہیں وہ حفاظت کے کام آتا ہے۔ لہٰذا استغفار کے معنی صرف کسی ڈھانکنے یا حفاظت کرنے والی چیز کا طلب کرنا ہے۔

قرآن مجید میں اس کا استعمال دو طرح سے ہوا ہے۔ ایک انسان اور گناہ کے درمیان پردہ دوم انسان اور اس کے گناہ کی سزا کے درمیان پردہ قسطلانی نے بھی بخاری کی شرح میں اسی مفہوم کو ظاہر کیا ہے۔ لکھا ہے کہ غفر کے معنی ستر کے ہیں جو خواہ انسان اور اس کے گناہوں کے درمیان ہو خواہ گناہ اور اس کی سزا کے درمیان ہو (قسطلانی جلد 1 صفحہ 85) جب یہ بات واضح ہے کہ قرآن کی رو سے جملہ انبیاء علیہم السلام معصوم عن الخطا ہیں تو لہٰذا جب استغفار کا لفظ ان کے لیے استعمال ہوگا تو ان کا مطلب ہوگا۔ ممکنہ گناہوں کے ارتکاب سے حفاظت، نہ کہ گناہ کی سزا سے حفاظت۔ اس استغفار سے انبیاء اور مقربین، خدا کی محبت کو اپنے دل میں مستحکم کر کے ممکنہ گناہوں کے ارتکاب سے بچنے کے لیے مدد کے طلبگار رہتے ہیں۔ یہی استغفار اللہ کی محبت کا اسیر بنا دیتا ہے۔ گویا انبیاء اور مقربین کے استغفار سے مراد گناہوں کی سزا سے بچنا نہیں بلکہ ممکنہ گناہوں کے ارتکاب نہ کے درمیان محبت اور عشق کی مضبوط روک پیدا کرنا ہے۔ یہی محبت انبیاء علیہم السلام کو مقام عصمت پر متمکن کرتی ہے۔

ایک حدیث میں آتا ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم دن میں سو بار استغفار کرتے تھے یعنی ہر لحہ اور ہر آن حفاظت کے لیے رجوع الی اللہ کرتے تھے تاکہ اللہ کی مرضی اور رضا کے خلاف کوئی قدم نہ اٹھائیں پس نبیوں کا استغفار اعلیٰ رحانی مدارج کے حصول کے لیے خدا کی مدد طلب کرنے کا نام ہے۔

اہل جنت کے متعلق آتا ہے۔

رَبَّنَآ اَتْمِمْ لَنَا نُوْرَنَا وَاغْفِرْ لَنَا اِنَّكَ عَلٰى كُلِّ شَىْءٍ قَدِيْرٌ (التحریم 8:66)

اے ہمارے رب ہمارا نور ہمارے لیے کامل کر۔ ہماری مغفرت فرما تو ہر چیز پر قدرت رکھنے والا ہے۔

بہشت میں تو وہ لوگ جاتے ہیں جو تمام گناہوں کی ہر قسم کی آلائش سے پاک ہوں۔اس بات پر ہر شخص کو اتفاق ہے جنتی وہی ہوتے ہیں جو ہر قسم کے گناہ سے پاک صاف ہوتے ہیں جب وہ جنت میں اللہ تعالیٰ سے مغفرت کی دعا کریں گے تو اس سے مراد گناہ کی بخشش نہیں ہو گی بلکہ غیر متناہی مدارج کے حصول کی التجا ہے۔پس معلوم ہوا کہ استغفار اور غفر کے معنی گناہوں کی سزا سے حفاظت ہی مراد نہیں بلکہ اعلیٰ روحانی مدارج کے حصول کے لیے مدد طلب کرنا بھی ہے ایک دوسری جگہ مغفرت کو بہشت کی ایک نعمت قرار دیا ہے ارشاد الٰہی ہے۔

لَهُمْ فِيهَا مِنْ كُلِّ الثَّمَرَاتِ وَمَغْفِرَةٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ (محمد 15:47)

اور ان کے لیے اس سے ہر قسم کے پھل اور ان کے رب کی طرف سے مغفرت ہے۔

یہ آیت ظاہر کرتی ہے کہ مغفرت نعمائے الٰہی میں سے ایک نعمت عظمیٰ ہے۔جس سے بہشتی جنت میں بہرہ اندوز ہوں گے پس معترض نے اسلامی ادب میں استغفار اور غفر جس وسیع مفہوم میں استعمال کیا گیا ہے اس کو سمجھا ہی نہیں یہی قرآن مجید کا اعجاز ہے۔ایک لفظ ہے جو مختلف مواقع پر استعمال کرنے سے مختلف معنی اور مفہوم ادا کرتا ہے۔عربی زبان کی باریکیوں کو جاننے والے ہی اس کو جانتے ہیں۔

دوسرا نکتہ جو معترض نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو نعوذ باللہ گناہگار ٹھہرا کر اٹھایا ہے وہ یہ ہے کہ اسلام انبیاء علیہم السلام کو معصوم عن الخطا نہیں گردانتا۔

قرآن مجید کی رو سے یہ اعتراض بھی سراسر کم فہمی اور اسلامی تعلیم سے عدم واقفیت کا نتیجہ ہے۔قرآن مجید کے نزدیک تمام انبیاء علیہم السلام کی بعثت کا مقصد ہی لوگوں کی اصلاح ہے۔ان کا یہ منصب عالیہ ہی اس بات کا مقتضی ہے کہ وہ گناہوں کی آلائشوں سے پاک ہوں اللہ تعالیٰ نے جس شخص کو نبی بنانا ہوتا ہے وہ اللہ کی نگرانی میں پرورش پاتا ہے وہ قولاً اور فعلاً اللہ تعالیٰ کے کسی حکم کے خلاف قدم نہیں اٹھاتا یہی مقام عصمت ہے قرآن مجید میں آتا ہے۔

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا نُوْحِيْٓ اِلَيْهِ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا فَاعْبُدُوْنِ وَقَالُوا اتَّخَذَ الرَّحْمٰنُ وَلَدًا سُبْحٰنَهٗ بَلْ عِبَادٌ مُّكْرَمُوْنَ لَا يَسْبِقُوْنَهٗ بِالْقَوْلِ وَهُمْ بِاَمْرِهٖ يَعْمَلُوْنَ (الانبیاء21:25-27)

اور تجھ سے پہلے ہم نے کوئی رسول نہیں بھیجا۔مگر اس کی طرف ہم وحی کرتے ہیں کہ میرے سوا کوئی معبود نہیں سو میری ہی فرمانبرداری کرو اور کہتے ہیں کہ رحمٰن نے بیٹا بنا لیا ہے وہ پاک ہے بلکہ وہ معزز بندے ہیں اور بات میں اس سے آگے نہیں بڑھتے اور اس کے حکم کے مطابق عمل کرتے ہیں۔

پھر دوسری جگہ آتا ہے۔

مَا كَانَ لِنَبِيٍّ اَنْ يَّغُلَّ (آل عمران3:161)

اور کسی نبی کی یہ شان نہیں کہ وہ خیانت کرے۔

اس آیت کریمہ میں ''غَلّ'' وسیع معنی میں استعمال ہوا ہے''غل'' صرف مال کی خیانت کرنے پر ہی بولا نہیں جاتا بلکہ اللہ تعالیٰ نے جو انسان کو استعدادیں دی ہیں ان کو غلط استعمال پر بھی یہ لفظ بولا جاتا ہے گویا کسی نبی کی یہ شان نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے جو اس کو استعدادیں دے رکھی ہیں ان کو غلط جگہ پر استعمال کر کے گناہ کا مرتکب ہو گویا اسلام تمام انبیاء علیہم السلام کو معصوم گردانتا ہے اور ان کی معصومیت کو جزو ایمان قرار دیتا ہے۔

الزامی جواب:

جب بائبل کا مطالعہ کیا جائے تو انبیاء علیہم السلام پر جس قسم کے سنگین الزامات لگائے ہیں ان کو پڑھ کر انسان کی روح کانپ جاتی

ہے۔حضرت نوح علیہ السلام نے مے پی لی اور اسے نشہ آیا اور وہ اپنے ڈیرہ میں برہنہ ہوگیا۔(پیدائش باب 19 آیت 19 تا25)

حضرت لوط کی دونوں بیٹیاں اپنے باپ سے حاملہ ہوئیں۔(پیدائش باب 19 آیت 31-38)

حضرت داؤد علیہ السلام نے اوریا کی بیوی سے ہم بستری کی اور وہ حاملہ ہوگئی۔(سموئیل دوم باب 11 5:2)

حضرت سلیمان کے متعلق لکھا ہے وہ بادشاہ فرعون کی بیٹی کے علاوہ بہت سی اجنبی عورتوں سے یعنی موآبی، عمونی، ادومی، صیدانی اور حتی عورتوں سے محبت کرنے لگا......اس کی بیویوں نے اس کے دل کو غیر معبودوں کی طرف مائل کر دیا اور اس کا دل خداوند کے ساتھ کامل نہ رہا۔(سلاطین اول باب 11 آیت 1-6)

حضرت ابراہیم علیہ السلام پر جھوٹ بولنے کی تہمت۔(پیدائش 19:12)

حضرت اسحاق علیہ السلام پر جھوٹ بولنے کی تہمت۔(پیدائش 9:29)

حضرت یعقوب علیہ السلام کا جھوٹ بول کر بڑے بھائی کی برکت خود لے لینا۔(پیدائش 27) حضرت یعقوب کا اپنے سسر کو پے در پے دھوکے دینا اور مال اور زیور ہتھیانا۔(پیدائش باب 25:30 تا 43 اور باب 31)

حضرت موسیٰ علیہ السلام پر دھوکہ دہی کا الزام خروج (باب 11:32 - 12:35,36)

چند مختصر حوالے دیئے ہیں۔

......☆......

عدل ورحم کے تقاضے اوران کا پورا کرنا

(کیا قرآن میں خدا کا قدوس رحیم وعادل ہونا ثابت ہے)

اعتراض :عیسائیوں کا یہ اعتراض سوال کی صورت میں عموماً ہوتا ہے خدا عادل ہے۔عدل یہ تقاضا کرتا ہے کہ گناہگار کو سزا دے اور اس کے ساتھ خدا رحیم ہے۔صفت رحم تقاضا کرتی ہے کہ گناہ گار بندے کو چھوڑ دے۔ اللہ نے عدل اور رحم کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے اپنے بیٹے حضرت یسوع مسیح کو دنیا میں بھیجا اس نے صلیب پر چڑھ کر اپنی موت سے اپنے تمام گناہ گار پیروکاروں کے گناہ کا بوجھ اٹھالیا۔تا کہ خدا کے عدل اور رحم میں فرق نہ آوے سو گناہگار بے سزا بہشت کا جاودانی آرام پا گئے۔کیا قرآن کے لفظوں میں خدا کا قدوس رحیم وعادل ہونا ثابت ہے۔

دوسرے الفاظ میں اسلام پر یہ اعتراض ہے کہ اسلام میں کوئی ایسا طریقہ نہیں بیان کیا گیا ہے کہ عدل کا تقاضا کہ گناہ گار کو اس کے گناہ کی سزا اور رحم کا تقاضا بغیر سزا دیئے گناہ گار کو جنت میں جاودانی آرام دینا پورا ہو جائے۔

عیسائیت میں گناہ گاروں کے گناہوں کا بوجھ اٹھا کر مصلوب ہونے کا نام کفارہ رکھا گیا ہے۔

جواب :اصولی طور پر اس کا جواب پہلے دیا جا چکا ہے کہ اسلام میں نجات کا کیا طریقہ ہے۔مختصراً پھر اس کا اعادہ کر دیا جاتا ہے کہ اسلام میں نجات کا طریقہ فضل الٰہی ہے اور فضل الٰہی کو جذب کرنے کے لیے ایمان اور اعمال صالحہ بجالانے کی تلقین کی ہے۔مزید براں توبہ اور استغفار

کرنے پر زور دیا گیا ہے۔ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ نے گناہگاروں کے گناہوں کی بخشش کے لیے شفاعت (دعا) ایک ذریعہ مقرر کر دیا ہے۔ یہ شفاعت بھی فضل الٰہی کو جذب کرنے کا ایک ذریعہ ہے جو خدا نے صفت رحمانیت رحیمیت اور قدوسیت کے تحت عطا کیا ہے۔

یہ سب خدا کے گناہگاروں کے گناہوں کو معاف کرنے کے ذریعے ہیں۔ اسلام کسی کو ملعون بنا کر بخشنے کا اصول وضع نہیں کرتا۔ بلکہ ایک اصول مقرر کر دیا کہ کوئی کسی کے اعمال کا بوجھ نہیں اٹھاتا۔ ہر شخص اپنے کیے کا خود ذمہ دار ہے۔

گناہ گاروں کو اسلام کی خوش خبری:

اسلام گناہ گاروں کو یہ خوشخبری دیتا ہے۔ اگر کسی بندے سے طبعی کمزوری کی وجہ سے اللہ کے احکام کی نافرمانی ہوگئی ہے اس سے گناہ سرزد ہوگیا ہے تو وہ اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرے۔ اپنے کردہ گناہ کی معافی طلب کرے۔ دوبارہ اس سے باز رہے اور بچنے کی کوشش کرتا رہے اور مستقل مزاجی دکھائے تو اللہ تعالیٰ اس بندے کا گناہ معاف کر دیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے گناہ گار بندوں سے کہتا ہے۔

نَبِّئْ عِبَادِیْ اَنِّیْ اَنَا الْغَفُوْرُ الرَّحِیْمُ (حجر 49:15)

میرے بندوں کو خبر دے کہ میں بخشنے والا رحم کرنے والا ہوں۔

یعنی خدا کی مغفرت، صفت غفوریت اور رحیمیت کے تحت ہے۔

دوسری جگہ آتا ہے۔

قُلْ یٰعِبَادِیَ الَّذِیْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰی اَنْفُسِهِمْ لَاتَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ اِنَّ اللّٰهَ یَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِیْعًا اِنَّهٗ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِیْمُ (زمر 53:39)

کہہ اے میرے بندو! جنہوں نے اپنی جانوں پر زیادتی کی ہے اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہو۔ اللہ سبھی گناہ بخش دیتا ہے ہاں وہ بخشنے والا رحم کرنے والا ہے۔

یہ آیت رحمت الٰہی کی وسعت بے پایاں کو ظاہر کرتی ہے تمام گناہ گاروں کو خوشخبری سنائی گئی ہے کہ وہ اپنے کردہ گناہوں کی وجہ سے مایوس نہ ہوں۔ اللہ کی بخش کا دروازہ ہر وقت کھلا ہے۔ جو بھی توبہ اور استغفار سے اس کے رحمت کے دروازہ میں داخل ہوگا۔ اللہ تعالیٰ اس کے تمام گناہ معاف کر دے گا۔ اس آیت میں بھی صفت غفوریت اور رحیمیت کا ذکر کیا ہے معلوم ہوتا ہے کہ گناہوں کی معافی صفت غفوریت اور رحیمیت سے وابستہ ہے نہ کہ کفارہ سے جو عیسائیوں کا عقیدہ ہے جس کو انسانی عقل دھکے دے کر جھٹلاتی ہے اگلی آیت میں صراحت سے بیان کر دیا۔

وَاَنِیْبُوْا اِلٰی رَبِّکُمْ وَاَسْلِمُوْا لَهٗ (الزمر 54:39)

اور اپنے رب کی طرف رجوع کرو اور اس کی فرمانبرداری کرو۔

پھر فرمایا:

وَرَحْمَتِیْ وَسِعَتْ کُلَّ شَیْءٍ (اعراف 156:7)

میری رحمت ہر شے پر حاوی ہے۔

یہاں بھی اللہ کی رحمت بے پایاں کا ذکر ہے اس نے ہر چیز کو اپنے احاطہ میں لیا ہوا ہے۔

اس مضمون کو سورہ انعام میں ان الفاظ میں بیان کیا ہے۔

کَتَبَ رَبُّکُمْ عَلٰی نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ (انعام 54:6)

تمہارے رب نے اپنے اوپر رحمت کو لازم کرلیا ہے۔

پھر فرمایا:

اَنَّهٗ مَنْ عَمِلَ مِنْكُمْ سُوْٓءًۢا بِجَهَالَةٍ ثُمَّ تَابَ مِنْۢ بَعْدِهٖ وَاَصْلَحَ فَاَنَّهٗ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ (انعام 54:6)

کہ جو کوئی تم سب سے نادانی سے برائی کر بیٹھے پھر اس کے بعد توبہ کرلے اور اصلاح کرے تو وہ بخشنے والا رحم کرنے والا ہے۔

پہلے اللہ تعالیٰ نے اپنی صفت رحم بے پایاں کا ذکر کیا ہے پھر گناہگاروں کو یہ خوشخبری دی ہے کہ اگر وہ نادانی اور جہالت سے گناہ کا ارتکاب کرلیتا ہے تو وہ اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرے اور اپنے کیے پر نادم اور پشیمان ہو اور اپنی اصلاح کرے تو اللہ تعالیٰ اپنی صفت غفوریت اور رحیمیت کے تحت اس کو بخش دے گا یہاں گناہ کے بعد رجوع الی اللہ کی تعلیم دی ہے جس کو اسلامی اصطلاح میں توبہ کہا جاتا ہے۔

ارشاد الٰہی ہے۔

وَمَا رَبُّكَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيْدِ (حم السجدہ 46:41)

اور تیرا رب بندوں پر کچھ بھی ظلم کرنے والا نہیں۔

قانون قدرت اور رحم و عدل:

قانون قدرت اللہ تعالیٰ کا فعل ہے اور شریعت اللہ تعالیٰ کی مکتوبہ تحریر۔ شرعی قانون، قانون قدرت کی سچی تصویر ہے۔ قانون قدرت میں ہم دیکھتے ہیں کہ ایک شخص عمداً یا سہواً قانون قدرت کی خلاف ورزی کرکے کسی مرض میں مبتلا ہو جاتا ہے عدل نے قانون قدرت کی خلاف ورزی کی وجہ سے پکڑ لیا۔ اس کے ساتھ ہی قانون قدرت نے اس مرض کے علاج کے لیے لاکھوں دوائیاں پیدا کردیں۔ تو رحم نے ان دوائیوں کے اثر سے بیماری کے اثر زائل کردیا۔ وہ مریض صحت یاب ہو گیا گویا اس کائنات کے قانون میں عدل و رحم دونوں پائے جاتے ہیں۔ بندے کو قانون قدرت کی خلاف ورزی کی وجہ سے عدل گرفت کرتا ہے۔ ساتھ ہی قانون قدرت میں اس کا علاج بھی موجود ہے جو رحم کے زیر ہے قانون قدرت کی خلاف ورزی کے بد اثرات کو زائل کر دیتا ہے۔ یہی صورت شرعی قانون کی ہے۔ ایک بندہ شرعی قانون کی خلاف ورزی کرتا ہے۔ وہ اپنے اس گناہ کی وجہ سے خدا سے دور ہو جاتا ہے خدا کی ناراضگی کا سبب بن جاتا ہے۔ مستوجب سزا ہو جاتا ہے۔ اس کے ساتھ رحم الٰہی نے معاً سچی توبہ اور انابت اس کے لیے مہیا کردی۔ وہ استانہ الوہیت پر گر جاتا ہے۔ تو اللہ کا فضل اس گناہ گار بندے کے تمام گناہ دھو ڈالتا ہے اور اللہ کے فضل کا دروازہ ہر وقت وا ہے۔ جو بھی اس میں داخل ہو گا اس کے گناہ معاف ہو جائیں گے گناہ کی وجہ سے اللہ کا عدل حرکت میں آیا گناہگار اللہ سے دور ہو گیا اور مستوجب سزا ٹھہرا۔ اس کے ساتھ ہی رحمت الٰہی نے گناہگار بندے کو توبہ کی طرف مائل کردیا۔ تو توبہ سے اس کی دوری، قرب میں بدل گئی۔

اب کائنات میں قانون قدرت کا مشاہدہ کیجیے پھر خدا کے ضابطہ شریعت کا مطالعہ کیجیے تو دونوں میں موافقت پائی جائے گی۔ گویا قانون قدرت (جو خدا کا فعل ہے) اور قانون شریعت (جو خدا تعالیٰ کا قول ہے) میں کلی طور پر مطابقت اور موافقت پائی جاتی ہے۔ اسلام کسی شخص کو مصلوب دے کر بندوں کی نجات کا وسیلہ قرار نہیں دیتا بلکہ فضل کو وہ وسیلہ نجات قرار دیتا ہے۔ جو صفت رحم کی عملی شکل ہے۔ عیسائیوں کے وسیلہ نجات یعنی کفارہ نے تمام نیکیوں اور قوائے فطرت کی اصلی مقتضیات کی جڑ ہی کاٹ دی ہے اور دنیا میں بدی کا راستہ وا کردیا ہے۔

قرآن مجید خدا کی صفات قدوسیت، رحیمیت اور عدالت سے بھرا پڑا ہے قرآن مجید کا مطالعہ کیجیے۔ اللہ تعالیٰ کی ان صفات کا خاکہ آپ کے سامنے آجائے گا جس سے اللہ تعالیٰ کی شان رحیمیت اور قدوسیت ظاہر ہو جائے گی۔ خدا کی صفت عدالت بھی اس دنیا میں جاری ہے اس کے ساتھ صفت رحیمیت بھی کام کر رہی ہے۔ اسی طرح دونوں صفات کا اظہار آخرت میں ہوگا۔ مسلمانوں کو کفارہ کی ضرورت نہیں۔ کفارہ خدا کی صفات کے ہی خلاف ہے۔

مستحق کو نہ بخشنا اور غیر مستحق کو بخشنا (کیا یہ اللہ کا عدل ہے)

اعتراض : کیا بخشش کے مستحق کو نہ بخشنا اور غیر مستحق کو بخشنا بے عدل بادشاہ کا سا کام نہیں ہے؟ اگر خدا جسے چاہے بد اور جسے چاہے نیک بناتا ہے تو آدمیوں کو ثواب و عذاب نہ ہونا چاہیے جس صورت میں خدا نے آدمی کو ایسا بنایا کہ جیسا اس نے چاہا تو آدمی کو رنج و راحت نہ ہونی چاہیے مثلاً اگر سپہ سالار کے حکم سے کوئی سپاہی کسی کو مار ڈالے تو اس کا ذمہ سپہ سالار ہوگا نہ کہ سپاہی۔ (سیتارتھ پرکاش سوال 45)

یہ اعتراض اس آیت پر ہے

یَغْفِرُ لِمَنْ یَّشَآءُ وَیُعَذِّبُ مَنْ یَّشَآءُ وَ اللّٰهُ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ

جس کو چاہے بخش دے اور جس کو چاہے عذاب دے کیونکہ وہ سب چیزوں پر قادر ہے۔

جواب :اس کتاب میں مسئلہ نجات (بخشش) کے اصول از روئے قرآن بیان کئے گئے ہیں۔ وہاں یہ بیان کیا ہے کہ اسلام میں بخشش محض اللہ کے فضل سے ہے اللہ کے فضل کے حصول کے لیے ایمان اور اعمال صالحہ ضروری ہیں۔ استغفار توبہ اور شفاعت بھی حصول نجات کے وسائل ہیں۔

اللہ تعالیٰ ارحم الراحمین ہستی ہے وہ اپنے بندوں پر کسی قسم کا ظلم نہیں کرتی ظلم صفت عدل کے خلاف ہے۔ ارشاد الٰہی ہے۔

مَا یُبَدَّلُ الْقَوْلُ لَدَیَّ وَمَآ اَنَا بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِیْدِ (ق 29:50)

میرے پاس بات بدلی نہیں جاتی اور نہ میں بندوں پر کچھ بھی ظلم کرنے والا ہوں۔

مَا یُبَدَّلُ الْقَوْلُ لَدَیَّ (ق 29 - 50)

میرے پاس بات بدلی نہیں جاتی۔

میں اٹل قانون کا ذکر ہے یعنی اللہ تعالیٰ جو قانون بنا دیتا ہے وہ اٹل ہوتا ہے وہ بدلا نہیں جاتا۔ بندوں پر ظلم نہ کرنا بھی ایک اٹل قانون ہے۔

دوم ''بخشش کے مستحق کو نہ بخشنا اور غیر مستحق کو بخشنا'' قرآن مجید میں کہیں ذکر نہیں۔

قرآن مجید میں کئی مرتبہ یہ آیا ہے کہ اللہ نیکی کرنے والوں کے اجر کو ضائع نہیں کرتا۔

اسی طرح اللہ تعالیٰ نہ کسی کو بد بناتا ہے اور نہ کسی کو نیک۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کے سامنے ایک ضابطہ حیات بیان کر دیا ہے۔ اس کا اختیار بندے کو ہے چاہے اس پر عمل کرے اور چاہے نہ عمل کرے۔ عمل کرنے والا نیکی کما رہا ہے جب کہ عمل نہ کرنے والا بدی کے راستہ پر گامزن ہے ہر بندہ شریعت کے احکام پر عمل کرنے میں مختار ہے۔ گویا نیک اور بد ہونا انسان کے اپنے اختیار میں ہے۔ ارشاد الٰہی ہے۔

وَقُلِ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكُمْ فَمَنْ شَآءَ فَلْیُؤْمِنْ وَّمَنْ شَآءَ فَلْیَكْفُرْ (الکہف 29:18)

اور کہہ حق تمہارے رب کی طرف سے سو جو کوئی چاہے ایمان لائے اور جو کوئی چاہے انکار کرے۔

یہ آیت واضح کرتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے لوگوں کی ہدایت کے لیے حق (ضابطہ حیات، قرآن مجید) نازل کیا ہے اب اس کا ماننا یا نہ ماننا انسان کے اختیار میں ہے۔سزا ان کے اعمال کے مطابق دی جائے گی۔جزا و سزا کے اصول کو اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں مختلف انداز اور مختلف الفاظ میں کئی جگہ بیان کیا ہے ارشاد الٰہی ہے۔

وَاَنْ لَّيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَاسَعٰى وَ اَنَّ سَعْيَهٗ سَوْفَ يُرٰى (نجم 40,39:53)

اور کہ انسان کے لیے کچھ نہیں مگر وہی جو وہ کوشش کرتا ہے اور کہ اس کی کوشش دیکھی جائے گی۔

اسلام نے یہ وہ زریں اصول مقرر کر دیا ہے کہ جس پر دین اور دنیا کا دارومدار ہے یعنی سعی سے انسان اچھے ثمرات حاصل کر سکتا ہے مگر جو دنیا کے فوائد حاصل کرنے کے لیے سعی کرتا ہے تو اس کا نتیجہ بھی پالیتا ہے۔اگر آخرت میں اچھے پھل حاصل کرنے کے لیے احکام الٰہی پر عمل کیا ہے تو وہ اس کا پھل پالے گا۔اچھے اور برے پھل پانے کا اصول سعی اور کوشش ہے۔کسی فرد یا قوم کی ترقی کا دارومدار سعی اور جدوجہد پر ہے۔

وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا (العنکبوت 69:29)

اور جو لوگ ہمارے لیے محنت اور مشقت اٹھاتے ہیں ہم یقیناً انہیں اپنے راستوں پر چلائیں گے۔

وَلَوْ يُؤَاخِذُ اللّٰهُ النَّاسَ بِمَا كَسَبُوْا (فاطر 45:35)

اگر اللہ لوگوں کو اس پر پکڑتا جو وہ کرتے ہیں۔

یہ آیت ظاہر کرتی ہے کہ انسان کے عمل کی وجہ سے ہی اللہ تعالیٰ گرفت کرتا ہے۔

لَهَا مَا كَسَبَتْ وَعَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ (البقرہ 286:2)

اسی کے لیے ہے جو وہ (اچھی) کمائی کرے اور اسی پر ہے جو وہ (بری) کمائی کرے۔

یہ آیت ظاہر کرتی ہے کہ اچھا اور برا پھل پانا انسان کے اپنے عمل پر منحصر ہے۔

وَمَنْ يَّعْمَلْ سُوْٓءًا اَوْ يَظْلِمْ نَفْسَهٗ (النساء 110:4)

اور جو شخص بدی کرے یا اپنی جان پر ظلم کرے۔

مَنْ عَمِلَ صَالِحًا فَلِنَفْسِهٖ وَمَنْ اَسَآءَ فَعَلَيْهَا وَمَا رَبُّكَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيْدِ (حم السجدہ 46:41)

جو کوئی نیک عمل کرتا ہے تو اپنی جان کی بھلائی کے لیے ہے اور جو کوئی برا کرتا ہے تو اس کا وبال اس پر ہے اور تیرا رب بندوں پر کچھ بھی ظلم کرنے والا نہیں یہ آیت معترض کے اعتراض کو واضح طور پر رد کر دیتی ہے کہ انسان اپنے کردہ اعمال کا ہی پھل پاتا ہے۔اللہ کی مغفرت انہی اصولوں کے مطابق ہے جو اس نے مقرر کر دیے ہیں۔

قرآن مجید میں یہ کہیں بھی بیان نہیں ہوا کہ اللہ جس کو چاہے بد بنا دے اور جس کو چاہے نیک بنا دے۔معترض نے اپنے ذہن کی اختراع اسلام کی طرف منسوب کر دی ہے۔جیسا کہ اوپر بیان کیا جا چکا ہے کہ نیکی و بدی کا انحصار بندے کے اپنے اعمال پر ہے اگر بندے کے اعمال احکام شریعت کے مطابق ہیں تو وہ نیکی ہے اگر احکام شریعت کے خلاف ہیں تو وہ بدی ہے۔نیکی اور بدی کمانا انسان کے اپنے اختیار میں ہے۔

یہ آریوں کا رب ہے جس نے چار ذاتیں پیدا کیں شودر بے چارے کو صرف دکھ اٹھانے کے لیے پیدا کیا ہے۔منو کہتا ہے شودر کو نیک صلاح بھی نہیں دینی چاہیے۔(منو 80:4)

تناسخ کی رو سے اگر کسی نے شودر کی جون اختیار کر لی۔شودر کو وید پڑھنے کی اجازت نہیں۔قصور شودر کا نہیں یہ تو آریوں کے ایشور کا قصور ہے جس نے کسی آریا کو نئی جون میں شودر پیدا کر دیا۔تو سزا ایشور کو ہونی چاہیے جس نے دوسری جون میں شودر بنا دیا۔

مسلمانوں کے لیے جنت اور دوسروں کے لیے دوزخ

اعتراض: مسلمان بہشت میں اور دیگر لوگوں کے دوزخ میں جانے کا کیا ثبوت ہے واہ جی واہ اگر خدا منافقوں کے فریب میں آجاتا ہے اور دوسروں کو فریب دیتا ہے تو ایسا خدا ہم سے دور رہے وہ دھوکے بازوں سے جا کر ملے اور دھوکے باز اسے ملیں کیونکہ جیسے کو تیسا ملے تب ہی گزارہ ہوتا ہے جن کا خدا دھوکے باز ہے اس کے معتقد دھوکے باز کیوں نہ ہوں؟ کیا بدکار مسلمانوں سے دوستی اور غیر مذہب کے اچھے لوگوں سے دشمنی کرنا کسی کو واجب ہے۔(ستیارتھ پرکاش سوال 61)

جواب: معترض کو مسلمان کا مفہوم اپنے ذہن میں رکھنا چاہیے کہ مسلمان کون ہے۔ مسلمان کی تعریف رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ کی ہے۔

اَلْمُسْلِمُ مَنْ سَلِمَ الْمُسْلِمُوْنَ مِنْ لِسَانِهٖ وَيَدِهٖ

مسلم وہ ہے جس کی زبان اور ہاتھ سے مسلمان محفوظ رہیں۔

اور مومن کی تعریف یہ کی۔

اَلْمُؤْمِنُ مَنْ اَمِنَهُ النَّاسُ عَلٰی دِمَائِهِمْ وَاَمْوَالِهِمْ

ایمان دار وہ ہے جس سے لوگ اپنے جان اور مال کو محفوظ سمجھیں۔

گویا مسلم اور مومن خدا کا فرمانبردار ہونے کے علاوہ دوسرے لوگوں کے حقوق کی بھی نگہداشت کرتا ہے جو شخص اللہ کا بھی فرمانبردار ہو لوگوں کی جان و مال اور عزت اور حقوق انسانی کا بھی محافظ ہو اور ان کو اپنا بھائی سمجھتا ہو، انصاف سے کام لیا جائے تو ہر شخص کا کانشس یہی جواب دے گا یہی لوگ خدا کی نعماء کے وارث ہو سکتے ہیں اللہ تعالیٰ نے صرف دائرہ اسلام میں داخل ہو کر نام کے مسلمان کے لیے کسی جگہ بھی اللہ کی نعمتوں کا وارث اور بہشتی قرار نہیں دیا۔ بہشت میں جانے کے لیے ہر شخص کے لیے ایمان اور اعمال صالحہ بجالانے ضروری ہیں۔ جن لوگوں کے ایمان اور اعمال صالحہ کا وزن، میزان عدل کے پلڑے میں بھاری ہوگا وہی لوگ جنت میں جائیں گے۔ ارشاد الٰہی ہے۔

فَاَمَّا مَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِيْنُهٗ فَهُوَ فِيْ عِيْشَةٍ رَّاضِيَةٍ وَاَمَّا مَنْ خَفَّتْ مَوَازِيْنُهٗ فَاُمُّهٗ هَاوِيَةٌ (القارعۃ 101:6-9)

سو جس کی نیکیاں بھاری ہوں گی وہ خوشی کی زندگی میں ہوگا اور جس کی نیکیاں ہلکی ہوں گی تو اس کا ٹھکانہ ہاویہ ہے۔

پس اللہ تعالیٰ نے جنت میں داخل ہونے کے اصول وضع کر دیئے ہیں جو ان اصولوں پر کاربند ہوگا وہی بہشت میں جانے کا مستحق ہوگا۔ کوئی سلیم الفطرت آدمی انکار نہیں کر سکتا اسلام کہتا ہے صرف ایک ہی اللہ پر ایمان لاؤ اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراؤ۔ یہی تمام مذاہب کا نظریہ ہے اسلام نے کوئی نئی بات نہیں کہی۔ توحید الٰہی ہی تمام ادیان کا محور ہے اسلام نے اسی طرف دعوت دی ہے پھر کہا صرف ایک نبی پر ایمان نہ لاؤ۔ بلکہ دنیا میں جتنے انبیاء علیہم السلام مبعوث ہوئے ہیں۔ ان پر ایمان لاؤ تمام دنیا کو یکجہتی کی لڑی میں منسلک کرنے کے لیے ان سب پر ایمان لانے کی تلقین کرتا ہے کیا تمام انبیاء علیہم السلام کو سچا ماننا اور ان پر ایمان لانا خلاف عقل ہے اور اس میں کوئی زیغ یا کجی ہے دنیا کے تمام انسانوں میں اُخوت کا رشتہ قائم کرنے کے لیے کتنا عمدہ سنہری اصول ہے۔ پھر تمام سماوی کتب پر ایمان لانا ضروری قرار دیتا ہے کتب سماوی اللہ کے احکام کا خزانہ ہیں، یہی وہ احکام ہیں جن کی وجہ سے دنیا کی تہذیب وتمدن نے نشوونما پائی ہے۔ ان احکام میں شمع ہدایت

ہے جس کی روشنی میں نیکی اور بدی میں تمیز کی جاتی ہے۔ ملائکہ پر ایمان لانا اس لیے ضروری قرار دیا ہے یہ اللہ کے کارندے ہیں جو اللہ کے حکم کے مطابق نظام کائنات چلا رہے ہیں اور دلوں میں نیکی کی تحریک پیدا کرتے ہیں یوم آخرت پر ایمان اس لیے ضروری ہے تاکہ انسان کو یہ معلوم ہو کہ ایک دن خدا کے سامنے پیش ہونا ہے۔ اپنے اعمال کا حساب کتاب دینا ہے اس طرح یوم آخرت پر ایمان لانے سے انسان کے اندر ذمہ داری کا احساس پیدا ہوتا ہے اور اپنی زندگی کو ایک مقصد کے تحت بسر کرتا ہے۔ یہ وہ ایمانیات ہیں جن کو تسلیم کرنا ضروری قرار دیا گیا ہے ایک بھی جزو ایمان ایسا نہیں جو انسانی عقل کے خلاف ہو۔ دوم یہ وہ تمام عقائد ہیں جن کا ماننا تمام مذاہب میں لازمی قرار دیا گیا ہے اسلام نے کوئی بات نہیں کہی جو پہلے مذاہب میں نہ ہو۔ انہی باتوں کو ایک اچھے اور علمی انداز میں بیان کر دیا ہے اس کے بعد اعمال صالحہ ہیں اعمال صالحہ ایمان کا جزو ہیں جہاں ایمان ہو گا وہاں اعمال صالحہ ہوں گے جہاں کفر ہو گا وہاں بداعمالیاں ہوں گی۔ یہ سچ ہے بیج اپنے ثمر سے پہچانا جاتا ہے۔ بیج اچھا ہے تو پھل بھی اچھا ہو گا۔ اسی طرح ایمان ہے تو اعمال صالحہ بھی ہیں۔

ایمان اور اعمال صالحہ لازم و ملزوم ہیں ایک دوسرے سے الگ نہیں کیے جا سکتے۔

ایمان اور اعمال صالحہ ہی بہشت کے لیے لازمی قرار دیئے گئے ہیں اس قاعدہ کلیہ سے کسی کو اختلاف نہیں۔ پھر اعتراض کیسا۔ معترض بتائے کہ آخر بہشتی بننے کے لیے کیا ضروری ہے؟ اس کی سماوی کتاب کچھ نہ کچھ بتاتی ہو گی۔ حقیقت یہ ہے کہ بہشت میں داخل ہونے کے لیے اسلام کا ہی بہترین اصول ہے۔ جب ایک انسان ایمان اور اعمال صالحہ کے وزن کے ساتھ اللہ کے حضور جائے گا۔ تو ایمان اور اعمال صالحہ اللہ کے فضل کو اپنی طرف کھینچیں گے تو وہ شخص اللہ کے فضل سے جنت میں چلا جائے گا۔

خدا کا دھوکا دینا اور کھانا

معترض کے اعتراض کا دوسرا حصہ یہ ہے کہ اللہ دوسرے لوگوں کے دھوکا میں آتا ہے اور وہ خود دوسروں کو دھوکا دیتا ہے۔

قرآن کی یہ آیت ہے جس پر اعتراض کیا گیا ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ جَامِعُ الْمُنَافِقِيْنَ وَالْكَافِرِيْنَ فِي جَهَنَّمَ جَمِيْعًا وَ اِنَّ الْمُنَافِقِيْنَ يُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ

معترض نے مذکورہ آیت سے جو معنی سمجھے ہیں وہ نہیں ہیں۔ "يُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ" میں اللہ سے پہلے مضاف حذف ہے۔ وہ مضاف رسول ہے۔ معنی یوں ہو گا۔ يُخٰدِعُوْنَ رَسُوْلَ اللّٰهِ وہ اللہ کے رسول کو دھوکا دینے کی کوشش کرتے ہیں۔

یہ قرآن مجید کا طرز بیان ہے بعض جگہ بعض کلمات کو حذف کر دیا جاتا ہے عام فہم ہوں یا پہلے کوئی قرینہ موجود ہو جس سے بالصراحت سمجھ لیا جائے کہ یہاں یہ کلمہ محذوف ہے۔ یہاں مضاف "رسول" کو حذف کر دیا گیا ہے۔ قرینہ واضح ہے کہ منافق اپنی منافقت سے رسول کو دھوکا دینا چاہتے تھے۔ اللہ کو کیا دھوکا دینا ہے۔

قرآن مجید میں کئی جگہ مضاف کو حذف کیا گیا ہے قرآن مجید میں آتا ہے جَاهِدُوْا فِي اللّٰهِ یہاں "سبیل" کا لفظ محذوف ہے یعنی جَاهِدُوْا فِي سَبِيْلِ اللّٰهِ قرآن مجید میں کئی جگہ فی سبیل اللہ کے الفاظ آئے ہیں اس لیے یہاں عام فہم بات ہونے کی وجہ سے "سبیل" کا لفظ حذف کر دیا ہے یہ صرف طرز بیان ہی نہیں بلکہ فصاحت و بلاغت کی بھی نشانی ہے۔

معترض کو نہ تو قرآن مجید کے طرز بیان سے واقفیت ہے اور نہ قرآن مجید کے اعجازی بیان کی۔

هُوَ خَادِعُهُمْ کے یہ معنی نہیں کہ اللہ ان کو دھوکا دیتا ہے بلکہ اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ ان کے دھوکے کو انہی پر لوٹا دیتا ہے یہ ان کے دھوکے کی سزا ہے جب انہوں نے اللہ کے رسول کو دھوکا دینے کی کوشش کی تو رسول ان کے دھوکے میں نہ آیا وہ دھوکا انہی پر لوٹ جائے گا۔ غور

کیجیے کہ منافقوں کا دھوکا کیا تھا وہ جو دل میں بے ایمان تھے۔ زبان سے اظہار ایمان اس لیے کرتے تھے کہ رسول ان کے ایمان کو خالص سچا سمجھ لے گا۔ اور ان پر اعتماد کرے گا تو نازک موقع پر وہ دھوکا دے کر رسول کو نقصان پہنچائیں گے کیا رسول ﷺ نے ان کے ایمان کو خالص سمجھا تھا تاریخ بتاتی ہے کہ رسول کریم ﷺ نے ان کے ایمان کو سچا نہیں سمجھا تھا اس وجہ سے وہ دھوکا نہ دے سکے۔ قرآن مجید میں بھی منافقوں کے متعلق یہ آتا ہے۔ وَمَا هُمْ بِمُؤْمِنِيْنَ یہ لوگ ایمان دار نہیں گویا رسول کریم ﷺ نے ان کو ایمان دار نہیں سمجھا۔ اب نتیجہ واضح ہو جاتا ہے کہ وہ رسول کریم ﷺ کو دھوکا دینا چاہتے تھے رسول کریم ﷺ دھوکے میں نہ آئے۔ تو اس کا یہی نتیجہ نکلے گا کہ وہ منافق اپنے آپ کو ہی دھوکا دے رہے تھے قرآن مجید میں آتا ہے۔

وَمَا يَخْدَعُوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَهُمْ (بقرہ)

یعنی وہ خود ہی دھوکا خوردہ ہیں۔

دوسری توضیح يُخٰدِعُوْنَ خدع اس کا مادہ ہے جس کے معنی دھوکا دینا ہیں یعنی ظاہر کچھ کرنا اور دل میں دوسری بات چھپا رکھنا اس ارادہ سے کہ دوسرے کو نقصان پہنچائے اور خادع کسی کو دھوکا دینے کے قصد پر بھی بولا جاتا ہے۔ (تاج العروس) یہاں یہی معنی مراد ہیں کہ وہ اللہ کو دھوکہ دینے کی کوشش کرتے تھے۔ پھر اللہ نے خود ہی جواب دے دیا۔

وَمَا يَخْدَعُوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَهُمْ وَمَا يَشْعُرُوْنَ○ (بقرہ)

وہ خود ہی دھوکا خوردہ ہیں اور وہ غلط سمجھے ہوئے ہیں۔

منافقت کی وجہ سے جو نقصان رسول کریم ﷺ کو پہنچانے کا ارادہ رکھتے تھے اس میں سے ناکام رہیں گے۔

قرآن مجید میں کہیں بھی یہ ذکر نہیں کہ اللہ دوسروں کو دھوکا دیتا ہے۔ اور خود دھوکا کھاتا ہے۔ بلکہ دوسری آیت ہے کہ خدا نہ کسی کو دھوکا دیتا ہے اور نہ کسی کے دھوکا میں آتا ہے۔

تاریخ اس بات پر شاہد ہے کہ منافق اپنے ارادوں میں ناکام ہوئے ان کی منافقت ظاہر ہوگئی۔

لہٰذا قرآن مجید میں کہیں بھی یہ ذکر نہیں کہ اللہ دوسروں کو دھوکا دیتا ہے اور خود دھوکا کھاتا ہے دھوکا دینا اور دھوکا کھانا عیب ہے اللہ کی ذات ہر عیب سے مبرا ہے۔

......☆......

غیر مسلموں کو قتل کرنا بہشت کا باعث ہے

اعتراض: کیا خوب یک طرفہ ڈگری دی گئی ہے جو مسلمان نہ ہو جہاں پاؤ مار ڈالو۔ اور مسلمان کو مت مارو۔ غلطی سے بھی مسلمانوں کو مارنے میں دوزخ اور دوسرے کو مارنے میں بہشت ملے گا۔ ایسی تعلیم کنویں میں پڑے قرآن جیسی کتاب میں محمد صاحب جیسے رسول قرآنی اللہ جیسے خدا اور دین اسلام جیسے مذہب سے دنیا کو سراسر نقصان ہے ان کا نہ ہونا ہی اچھا ہے اس قسم کے بیہودہ مذاہب سے کنارہ کش ہو کر داناؤں کو وید کے احکام تسلیم کرنا چاہیے کیونکہ وہ لچر پوچ باتوں سے بالکل پاک ہے تم کہتے ہو کہ جو مسلمان کو مارے وہ دوزخ میں جائے گا اور دوسرے مذاہب والے کہتے ہیں کہ مسلمان کو مارنے سے بہشت نصیب ہوگی اب کس کو سچا مانیں اور کس کو جھوٹا؟ حق تو یہ ہے کہ ایسے ایسے فضول مذاہب کو چھوڑ کر سب کو ویدک دھرم کا پیرو ہونا چاہیے کیونکہ یہی دھرم ہی نوع انسان کے قابل تسلیم ہے اس میں "آریہ" نیک آدمیوں کے رستہ پر چلنا اور "دسیو" بدوں کے راستہ سے بچنے کی تعلیم دی گئی ہے جو ہر طرح اچھی ہے۔ (ستیارتھ پرکاش سوال 58)

جواب: یہ اعتراض حسب ذیل آیت کے سیاق وسباق نہ سمجھنے کی وجہ سے کیا گیا ہے۔

فَاِنْ تَوَلَّوْا فَخُذُوْهُمْ وَاقْتُلُوْهُمْ حَيْثُ وَجَدْتُّمُوْهُمْ وَلَا تَتَّخِذُوْا مِنْهُمْ وَلِيًّا وَّلَا نَصِيْرًا (النساء 4:89)

اگر وہ پھر جائیں تو ان کو پکڑو اور ان کو قتل کر دو جہاں کہیں انہیں پاؤ اور ان سے نہ کسی کو دوست اور نہ مددگار بناؤ۔

سیاق وسباق سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ حکم ان منافقوں کے متعلق ہے جو پہلے در پردہ مسلمانوں سے عداوت رکھتے تھے لیکن کسی محارب دشمن سے مل کر مسلمانوں کے خلاف برسر پیکار نہیں تھے لیکن اب وہ علانیہ محارب دشمن سے مل کر میدان جنگ میں آ گئے ہیں۔ ان کے لیے اب وہی حکم ہے جو محارب دشمن کا ہے ایسے لوگ مدینہ کے گرد ونواح میں تھے جب مسلمانوں کا غلبہ دیکھتے تو اظہار اسلام کرتے پھر مسلمانوں پر بیرونی دباؤ دیکھ کر اسلام سے انحراف کر کے مسلمانوں کو نقصان پہنچاتے۔ جیسا کہ عرینہ نے کیا جنہوں نے اسلامی چراگاہ پر ڈاکہ مار کر مویشی لوٹ لیے اور محافظوں کو قتل کر دیا اس قسم کے کئی واقعات رونما ہوئے پس جو منافق محارب دشمن کے ساتھ مل کر مسلمانوں سے جنگ کرتے ہیں۔ یہ حکم ان کے متعلق ہے کہ جہاں کہیں بھی وہ پائے جائیں ان کو لڑاکا دشمن سمجھ کر قتل کر دیا جائے۔

دنیا کا کون سا قانون ہے۔ کہ دشمن ملک کی سلیت اور امن عامہ سے کھیل رہا ہو اور ریاست اس کے خلاف کوئی کارروائی نہ کرے۔

دور حاضر کا بین الاقوامی قانون بھی یہی تعلیم دیتا ہے۔ ملکی سرحدوں اور امن عامہ کی حفاظت کے لیے اس قسم کے دشمن کو سختی سے کچل دیا جائے۔

یہ حکم عام نہیں ہے بلکہ ان منافقوں کے متعلق ہے جو دشمن کے ساتھ میدان جنگ میں آ چکے ہیں۔

اس آیت کے بعد منافقوں کے ایک ایسے گروہ کا ذکر کیا گیا ہے جو اسلام ترک کرنے کے بعد علی الاعلان دائرہ کفر میں داخل ہو گئے ہیں مگر ایسی قوم کے ساتھ جا ملے ہیں جس کا مسلمانوں کے ساتھ معاہدہ ہے جیسے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہلال بن عویمر سے معاہدہ کر لیا

کہ وہ نہ تو مسلمانوں کے ساتھ مل کر قریش کے خلاف جنگ لڑیں گے اور نہ قریش کے ساتھ مل کر مسلمانوں کے خلاف جنگ میں حصہ لیں گے پس کوئی شخص ایسی قوم سے جا ملے تو گو بوجہ عہد کی خلاف ورزی کے قتل کا مستحق ہے۔ مگر معاہد قوم میں چلے جانے سے اس کے بھی وہی حقوق ہوں گے جو معاہد قوم کے ہیں۔

دیکھیے آیت نمبر 90 النساء۔

اسلام معاہد قوم سے بھی یہ نہیں کہتا کہ ان کا دشمن ان کے حوالے کرو۔ بلکہ معاہدہ کی پاسداری کرتے ہوئے دشمن کو بھی وہی حقوق دے دیئے ہیں جو معاہد قوم کو حاصل تھے۔

اسلام میں جان کی حفاظت کی ذمہ داری:

اسلام نے محاربین کے علاوہ عام لوگوں کی جان لینے کو بالکل ناجائز اور حرام قرار دیا ہے۔ ارشاد الٰہی ہے۔

وَلَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِي حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ (بنی اسرائیل 33:17)

اور بدوں حق و انصاف کے کسی کی جان نہ لی جائے۔

دوسری جگہ آتا ہے۔

مَنْ قَتَلَ نَفْسًا ۢ بِغَيْرِ نَفْسٍ اَوْ فَسَادٍ فِي الْاَرْضِ فَكَاَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيْعًا وَمَنْ اَحْيَاهَا فَكَاَنَّمَا اَحْيَا النَّاسَ جَمِيْعًا (المائدہ 32:5)

کسی کی ناحق جان لینا یا زمین میں فساد برپا کرنا قتل عام کی طرح ہے کسی کی جان کی حفاظت کرنا سب انسانوں کو زندہ کرنے کے برابر ہے۔

ان آیات کی موجودگی میں اسلام پر یہ اعتراض کرنا کہ اسلام غیر مسلموں کو قتل کرنے کا حکم دیتا ہے سراسر جہالت اور لاعلمی کی علامت ہے۔ اسلام ایک شخص کے ناجائز قتل کو انسانیت کا قتل اور ایک شخص کی زندگی کی حفاظت کو بقائے انسانیت قرار دیتا ہے۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے انسانی حقوق کا عالمی منشور جاری کرتے ہوئے فرمایا:

اِنَّ دِمَآءَكُمْ وَاَمْوَالَكُمْ وَاَعْرَاضَكُمْ حَرَامٌ كَحُرْمَةِ يَوْمِكُمْ هٰذَا (بخاری کتاب الحج)

تمہاری جانیں اور تمہارے مال اور تمہاری آبروئیں ویسی ہی حرمت رکھتی ہیں جیسے آج کے دن کی حرمت اور عزت ہے یعنی حج کے دن کی۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا نمونہ سامنے ہے کہ فتح مکہ کے دن ان دشمنوں کو جن کے ہاتھوں سے غریب مسلمان قتل ہوئے ان کو معاف کر دیا۔ یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ اسلام سے بڑھ کر کوئی مذہب بھی کسی جان کا محافظ نہیں۔ جان خدا کی طرف سے انسان کو امانت ملی ہے۔ انسان کا اپنا بھی یہ فرض ہے کہ اس امانت کی حفاظت کرے۔

اسی وجہ سے اسلام نے خودکشی کو حرام قرار دیا ہے۔ یہ اس امانت کی حفاظت کا ذریعہ ہے۔ ریاست پر یہ فرض عائد کیا ہے کہ وہ ہر انسان کی جان کی حفاظت کو یقینی بنائے۔ گویا اسلام انسان کی جان کا محافظ ہے۔

جنگی ظالمانہ افعال کی اصلاح:

اسلام سے قبل دنیا میں جنگ کے ظالمانہ اصول رائج تھے۔ اسلام نے ان سب کو منسوخ کیا واضح حکم دیا کہ غیر محاربین مردوں

عورتوں اور بچوں کو ہرگز قتل نہ کیا جائے آج ان اصولوں پر دنیا گامزن ہے۔ جس کی تعلیم حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم نے دی تھی۔ اسلام نے جو جنگی اصلاحات جاری کی تھیں ان کا ذکر جہاد کے زیر عنوان سیرت سید البشر کے حصہ سوم میں کر دیا گیا ہے اعادہ کی ضرورت نہیں۔

الزامی جواب:

معترض نے اپنے ویدک دھرم کو بہتر قرار دیا ہے اس لیے یہی ضروری ہے کہ وید کی تعلیم قارئین کے سامنے پیش کی جائے۔ گو اس کا ذکر جہاد کے ضمن میں کیا جا چکا ہے۔ یہاں ویدک دھرم کی اس تعلیم کا اعادہ ضروری ہے۔

ہندوؤں کے جنگی احکامات:

''اے بہادر اندر ان دونوں داس اور آریہ دشمنوں کو مار جیسے بن کو تیز کلہاڑے سے کاٹتے ہیں۔ (بھیہ رگ رید6-33-3)

اے بہتوں سے تعریف کیے ہوئے جو آریہ داس ہمیں جنگ میں للکارتا ہے ہم سے اچھی طرح دبائے جائیں تیری مدد سے ہم ان دشمنوں کو جنگ میں ماریں۔ (رگ وید10 4:38)

''اے بہادروں کے مالک ان دشمنوں آریوں اور داسوں کو ماریں۔ (رگ وید6 6:6)

''اے اندر اور وُرن تم نے داس اور آریہ کو مارا اور سُدا اس کو بچایا۔'' (رگ وید7 1:83)

''اے اندر تو نے سرجوندی کے پار ارنا چتر تھ دو آریوں کو فوراً مار ڈالا۔'' (رگ وید4 8:3)

''ان کو زندہ آگ میں جلا دو۔'' (یجروید ادھیاء13، منتر12)

''دشمنوں کے کھیتوں کو اجاڑ کر گاؤں جلا دو۔'' (یجروید3 13:3)

''ان کو درندوں سے ٹکڑے کرا دو۔'' (یجروید15 16:15)

''درندوں سے چروا دو۔'' (یجروید15 19:15)

''ان کی بستیوں کو آگ لگا دو۔'' (یجروید11 23:11)

''ان کو ایسے تڑپا تڑپا کر مارو جیسے بلی کے منہ میں چوہا۔'' (یجروید16 65:16)

''ان کی گردنیں کاٹ دو۔'' (یجروید5 62:5)

''ان کو تاعمر زنجیروں میں باندھ رکھو۔'' (یجروید1 25:1)

''جائز اور ناجائز طریقوں سے ہلاک کر دو۔'' (یجروید1 28:1)

''ان کا قتل عام کر دو۔'' (یجروید17 4:17)

''ان کو درختوں کی طرح کاٹ ڈالو۔'' (یجروید16 51:16)

''مست سانڈ کی طرح دشمنوں کو مارتے جاؤ۔'' (یجروید 22:17)

اگر اتھروید کا مطالعہ کیا جائے تو اس میں بھی یہی جنگی ظالمانہ تعلیم پائی جاتی ہے۔ تفصیل کے لیے سیرت سید البشر حصہ سوم ص 202 مطالعہ کیجیے۔ صرف اختصار کے ساتھ یجروید کے حوالے درج کر دیئے گئے ہیں۔

جینیوں پر ظلم:

جینی (جن کے ساتھ آریوں سے مناظرے ہوئے) بالعموم بے خوف اور معصوم یتی (مرتاض) ہوا کرتے تھے جو انضباط نفس کی

مجسم تصویر بنے ہوئے سامنے آتے تھے دوسرا مخالف گروہ (آریہ) ان کے برعکس تھا وہ رقابت اور حسد کی آگ میں مشتعل رہتا تھا۔ جب اس کا کوئی داؤ پیچ چلا کھسیانا ہو گیا تو سب کی زبان سے متفقہ فتویٰ برآمد ہوا کہ ان کو کھولتے ہوئے تیل کے کڑاہوں میں ڈال کر جلادو۔ ان کی تمام کتابیں چھین کر غرق کردو...... ملک کے اس سرے سے اس سرے تک بے تمیزی کا آتش کدہ مشتعل ہو گیا یہ سنا کرتے تھے کہ اکثر لوگ دشمنوں کو زندہ درگور کردیا کرتے تھے یہاں نئی اپج کی سوجھی معصوم، انسانی ہمدرد، تمام موجودات کی محبت کا دم بھرنے والے انسان زندہ درآتش کر کے خشک ایندھن کی طرح جلادیئے گئے۔ یہ بھی کوئی دھرم ہے کیا یہ ایشور کا آئین ہے کیا یہ انسانیت ہے۔ (جین دھرم مصنفہ شیو برت لعل وارمن ایم اے)

خود سوامی دیانند جی نے بھی ہندوؤں کے اس مذہبی تعصب کا قرار کیا ہے۔

''اب جتنے بت جینیوں کے نکلتے ہیں وے شنکر آریہ کے وقت میں ٹوٹے تھے اور جو بغیر ٹوٹے نکلتے ہیں وے جینیوں نے خود زمین گاڑ دیئے تھے کہ توڑے نہ جائیں۔ (سیتارتھ پرکاش)

گویا جینیوں کے بتوں کو توڑنے اور ان کی کتابوں کو دریا برد کرنے اور ان کو زندہ جلا دینے کا اقرار موجود ہے۔

دراوڑی اور اچھوتوں پر ظلم:

آریوں نے دراوڑی قوم اور اچھوتوں پر ظلم ڈھائے تاریخ اس پر شاہد ہے۔ ان مظالم کی داستانیں کوئی چھپی ڈھکی نہیں۔ جس کا اقرار آریہ اور غیر آریہ خود بھی کرتے ہیں کیا رام چندر جی نے شمبوک شودر کو خدا کی عبادت کرنے کے جرم میں قتل نہیں کردیا۔ کیا دنیا کی تاریخ میں اس سے بڑھ کر کوئی ظلم ہوسکتا ہے کہ اس شخص کو خدا کی عبادت کرنے کے جرم میں قتل کی سزا دی گئی ہو۔

......☆......

اسلام مذہب نہیں

اعتراض: اسلام مذہب ہی نہیں (Bryan s.Tumer, Weber and Islam P1)

بحوالہ اسلام، پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم اور مستشرقین مغرب کا انداز فکر مصنفہ ڈاکٹر عبدالقادر جیلانی مرتب آصف اکبر)

جــواب: اسلام کو مذہب کی صف سے نکال دینا یہ انتہائی درجہ کا بیہودہ، لغو اور بعید از عقل اعتراض ہے۔ یہ اعتراض محض ادیان عالم کے بنیادی اصولوں سے عدم واقفیت کا نتیجہ ہے۔ اگر معترض نے ادیان عالم کا مطالعہ کیا ہوتا تو اس کے سامنے ادیان کے اصول سامنے آجاتے تو جب وہ دین اسلام کا مطالعہ کرتا تو لازمی طور پر ان تمام اصولوں کو احسن اور سائنسی انداز میں اسلام میں پاتا۔ اس لیے لازمی ہے کہ پہلے سابقہ ادیان کے اصول بیان کیے جائیں تو پھر دیکھا جائے کیا وہ اصول دین اسلام میں پائے جاتے ہیں یا کہ نہیں۔

مذاہب عالم میں خدا کا تصور:

جب مذاہب عالم کا مطالعہ کیا جائے تو یہ بات کھل کر سامنے آتی ہے کہ ہر مذہب میں خدا کا تصور پایا جاتا ہے۔ صرف مشہور مذاہب کی مقدس کتب سے حوالے دیئے جاتے ہیں۔ گو مرور زمانہ سے مذاہب میں نظریہ توحید میں ملونی آگئی لیکن کسی نہ کسی رنگ میں توحید کی کرن

ضرور نظر آتی ہے۔

ہندومت:

یجروید، یجروید کا ایک جملہ یہ ہے۔ ''اس کا کوئی عکس نہیں'' (یجروید 32:3) وہ بے جسم اور خالص ہے۔ (یجروید 40:8) ''کیا میں اس روح برترین کو جان سکتا ہوں جو سب کچھ ہے اور تاریکی سے پرے ہے صرف اسی کو جان کر کوئی موت عظیم پا سکتا ہے نجات کے لیے کوئی دوسرا رستہ نہیں۔ (18/31)

''اے خدا تو ہمارا باپ ہے ہمارا بھائی ہے ہمارا دوست ہے۔'' (سام وید 18:41)

اتھر وید ''وہ ایک ہے تنہا ایک اس میں تمام معبود ایک ہو جاتے ہیں۔'' (13)

''اے دوستو! اس کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو صرف وہی ایک خدا ہے۔'' (رگ وید کتاب 8:1:1)

Rigveda Samhiti vol ix page 1

ہندو ویدانت کی براہما سُترا میں درج ہے۔

خدا صرف ایک ہی ہے کوئی دوسرا نہیں، ہرگز نہیں، ہرگز نہیں، معمولی حد تک بھی نہیں۔

یہ ایک مسلمہ امر ہے کہ ہندومت کی کتب مقدسہ میں خدا کا تصور پایا جاتا ہے لیکن مرور زمانہ سے شرک کی ملونی آ گئی ہے۔ اگر باریک بینی سے ہندو کتب کا مطالعہ کیا جائے تو توحید کی کرنیں نظر آ جاتی ہیں۔

سکھ مذہب:

''مل منترا'' سکھوں کے بنیادی عقائد کے مجموعہ کو کہتے ہیں اسے گرو گرنتھ صاحب کے آغاز میں درج کیا گیا ہے سری گرنتھ صاحب کی جلد اول جپجی جی کا پہلا شعر ہے۔

''صرف ایک خدا کا وجود ہے جو حقیقتاً تخلیق کرنے والا ہے وہ خوف اور نفرت سے عاری ہے وہ کسی سے پیدا نہیں ہوا مگر لافانی ہے وہ خود سے وجود رکھنے والا، عظیم اور رحیم ہے۔''

بدھ مت:

جب گوتم بدھ کو درخت دانش کے نیچے بدھ کا رتبہ ملا۔ تو وہ پکار اٹھے۔

''اے کالبد خاکی کے بنانے والے جب تک میں نے تجھے نہیں پایا تھا مجھے بہت سی حیات و ممات میں گزرنا پڑتا تھا اور وہ سب درد انگیز حالتیں تھیں میں نے تجھے دیکھ لیا مجھے امید ہے تو اس کالبد خاکی کو پھر نہ بنائے گا دل نے دولت نروان حاصل کی۔ تمام خواہشیں فنا ہو گئیں۔ (دھرم پد 153:5)

پرنسپ جو کہ اشوک کے کتبوں کا پہلا پڑھنے والا محقق ہے جب ستونی کتبہ ہفتم اور دھولی کتبہ دستیاب ہوئے تو ان کتبوں میں تین جگہ ایسانا (Isana) کا ذکر آتا ہے جس کے معنی ایشور کے ہیں پرنسب نے واضح طور پر ایسانا پڑھ کر اس کے معنی خدا کے لیے ہیں اس نے کتبہ دھولی کو یوں پڑھا۔

''خدا (ایسانا) پر ایمان لاوے اور اس کی ہستی کا اقرار کرو کیونکہ وہی اس بات کا سزاوار ہے کہ اس کی اطاعت اور فرمانبرداری کی جائے۔ (دھولی کا پہلا کتبہ)

پارسی مذہب:

زرتشت پکا موحد تھا ان کے خدا کا نام اہورامزدا تھا اہور کے معنی مالک اور مزدا کے معنی دانا کے ہیں۔یعنی دانا مالک زرتشت اللہ تعالیٰ کے متعلق فرماتے ہیں ''تو ہی خدا ہے یہ میں جانتا ہوں۔اے قادر مطلق تو ہی اول تھا جب زندگی نے جنم لیا، انسان کے ہر خیال قول اور فعل کا پھل ہے جس طرح تیرے ابدی قانون میں مرقوم ہے کہ برائی کا انجام برا ہے اور اچھائی کا انجام اچھا ہے قیامت تک تیری مصلحت کے تحت یہ بات مقرر ہو چکی ہے۔

وساتیر میں یہ صفات بیان کی گئی ہیں۔

زرتشت فرماتے ہیں ''خدا ایک ہے مگر اس کی توحید عددی نہیں بلکہ احدیت ہے۔(وساتیر صفحہ 69)

اس کا کوئی ہمسر نہیں (وساتیر 69)

اس کی کوئی مثل نہیں (وساتیر 69)

وہ آغاز، انجام، شریک، دشمن، مانند، دوست، ماں، بیوی، اولاد، جگہ جسم راحت، جسمانیت اور رنگ و بو کے بغیر ہے۔(وساتیر 3)

ہر چیز کو ہست کرنے والا ہے۔(وساتیر 3)

نہ اسے آنکھ پا سکتی ہے اور نہ خیال میں گرفت میں لایا جا سکتا ہے۔(وساتیر 68)

الغرض وساتیر اللہ کی صفات سے بھرا ہوا ہے صرف چند صفات کا ذکر دیا ہے۔

یہودیت:

سنو اے بنی اسرائیل! ہمارا مالک خدا ہے وہ ایک مالک ہے۔(کتاب مقدس ثنائیہ 6:4)

''میں اور میں ہی مالک ہوں، میرے سوا بچانے والا کوئی نہیں۔'' (کتاب مقدس عیسائیہ 43:11)

میں ہی خدا ہوں اور کوئی نہیں تیرے سوا کوئی خدا نہیں۔(کتاب مقدس عیسائیہ 46:9)

میرے علاوہ کوئی خدا نہیں تمہیں چاہیے کہ میری کوئی تصویر کشی نہ کرو مجھ سے کسی کی مشابہت نہیں ہے نہ آسمان پر اور نہ زمین پر اور نہ پانی کے نیچے لہٰذا تم کسی اور کے سامنے نہ جھکو ان کی طرف نہ دیکھو، میں ہی تمہارا خدا ہوں۔'' (کتاب مقدس خروج 20:3)

عیسائیت:

حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے خالص توحید کی تعلیم دی ''پھر ابلیس (یسوع کو) ایک اونچے پہاڑ پر لے گیا اور دنیا کی سب سلطنتیں اور ان کی شان و شوکت اسے دکھائی اور اس سے کہا کہ اگر تو جھک کر مجھے سجدہ کرے تو یہ سب کچھ تجھے دے دوں گا یسوع نے اس سے کہا اے شیطان دور ہو کیونکہ لکھا ہے کہ تو خداوند اپنے خدا کو سجدہ کر اور صرف اسی کی عبادت کر۔(متی باب 4 آیات 11,10)

اور جو الفاظ تم سنتے ہو وہ میرے نہیں ہیں بلکہ اس باپ کے ہیں جس نے مجھے بھیجا۔(یوحنا 14:24)

جب یہ ثابت ہو جائے کہ تمام مذاہب میں نظریہ توحید مشترک ہے تو دوسری تعلیمات میں یکسانیت کا پایا جانا ضروری ہو جاتا ہے۔ کیونکہ مذاہب کا سرچشمہ ایک ہی ہے۔جب ہم مذاہب کے دوسرے اہم امور پر غور کرتے ہیں تو ان میں ایمان بالآخرت، عبادت اور اخلاق حسنہ بجالانے اور اخلاق سیّہ سے بچنے کے احکام ملیں گے۔گویا تمام مذاہب تین امور پر مشتمل ہیں۔ہستی باری، عبادت، معاملات، مذاہب عالم مذکور موضوعات پر ناقص، جزدی اور ادھوری تعلیم دیتے ہیں لیکن کچھ نہ کچھ ان موضوعات پر اشارے سے ضرور مل جاتے ہیں۔

لیکن جب اسلام کا مطالعہ کرتے ہیں تو بلا شک وشبہ ان موضوعات پر مفصل ہدایت پاتے ہیں اسی وجہ سے اسلام کو ایک کامل دین کہا جاتا ہے۔

توحید:

قرآن مجید میں خالص توحید پر ایک مکمل سورت میں ہے جو توحید کے ہر پہلو کو نمایاں کرتی ہے ارشاد الٰہی ہے۔

قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ اَللّٰهُ الصَّمَدُ لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُوْلَدْ وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ (سورہ اخلاص)

کہہ دیجیے کہ وہ اللہ ایک ہے اللہ بے نیاز ہے نہ وہ کسی کا باپ ہے اور نہ بیٹا اور کوئی بھی اس کا ہمسر نہیں۔

اس سورہ میں توحید کی وضاحت کی ہے اور شرک کی ہر قسم کا رد کیا ہے۔

پھر فرمایا۔

وَاِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِيْمُ (البقرہ 162:2)

تمہارا معبود ایک ہی معبود ہے اس کے سوا کوئی معبود نہیں وہ رحمان رحیم ہے۔

عبادت:

تمام مذاہب عالم میں عبادت کا تصور بھی مشترک ہے سب انبیاء علیہم السلام نے اپنے پیروکاروں کو عبادت کا حکم دیا ہے۔ اسی کی تجدید اسلام نے کی۔ پہلے مذاہب کے لوگ خدا کی عبادت کی بجائے بتوں اور مظاہر قدرت کی عبادت میں لگ گئے تھے۔ اسلام نے پہلے انبیاء علیہم السلام کے اس پیغام کو شرک سے پاک کر کے خوبصورت اور اعلیٰ رنگ میں پیش کیا۔ ارشاد الٰہی ہے۔

يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّكُمُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ وَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ (البقرہ 21:2)

اے لوگو! اپنے رب کی عبادت کرو جس نے تم کو پیدا کیا اور ان لوگوں کو جو تم سے پہلے تھے تا کہ تم متقی بن جاؤ۔

بلکہ اسلام نے عبادت بجالانے کا صرف حکم ہی نہیں دیا بلکہ یہ کہا کہ انسان کی زندگی کا مقصد ہی عبادت الٰہی ہے ارشاد الٰہی ہے۔

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ (الذاریات 56:51)

میں نے جنوں اور انسانوں کو اپنی عبادت کے لیے پیدا کیا ہے۔

پھر چار علامتی عبادتیں مقرر کیں۔ جو انفرادی اور اجتماعی زندگی کے لیے راہنما اصول متعین کرتی ہیں۔

معاملات:

معاملات میں خاص طور پر چار موضوعات شامل ہیں۔ اخلاق معاشرت سیاست اور اقتصادیات، ان چاروں موضوعات کو اپنی وسعت اور ہمہ گیری کی وجہ سے بیان کرنا مشکل ہے۔ ان موضوعات پر سیرت سید البشر کے دوسرے حصے میں بحث کی جاچکی ہے۔

یہ مسلمہ حقیقت ہے کہ اسلام ہی وہ دین ہے جس نے ان موضوعات کے تمام پہلوؤں پر بحث کی ہے۔

اسلام دوسرے ادیان سے کوئی الگ دین نہیں۔ بلکہ پہلے ادیان کا تسلسل اور آخری کامل دین ہے۔ تمام ادیان کا مطالعہ کر لیجیے کسی دین اور پیغمبر نے اپنے علاوہ کسی دوسرے دین کی نہ اطلاع دی اور نہ تائید اور تصدیق کی۔ اسلام وہ دین ہے جس نے یہ اطلاع دی کہ دنیا میں ہر قوم کی طرف نبی آئے۔ انہوں نے روشنی کے چراغ جلائے۔

ارشاد الٰہی ہے۔

اِنْ مِّنْ اُمَّةٍ اِلَّا خَلَا فِیْهَا نَذِیْرٌ (فاطر 14:35)

ایسی کوئی قوم نہیں جس میں کوئی نہ کوئی ڈرانے والا نہ آیا ہو۔

دوسری جگہ آتا ہے۔

وَلِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ (الرعد 7:13)

ہر قوم کی طرف رہنما آیا۔

اسلام نے پہلے انبیاء کی اطلاع کے ساتھ ان پر اور ان کے لائے ہوئے پیغام (کتاب) پر ایمان لانا بھی ضروری قرار دیا۔ یہ ہے وہ مضبوط دلیل اسلام کے ایک دین ہونے کی۔ اگر اسلام دین نہ ہوتا تو پہلے ادیان کی تصدیق نہ کرتا اور نہ ہی ان کے بانیوں اور کتب پر ایمان لانے کو ضروری قرار دیتا۔ ارشاد الٰہی ہے۔

اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَا اُنْزِلَ اِلَیْهِ مِنْ رَّبِّهٖ وَالْمُؤْمِنُوْنَ كُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ لَا نُفَرِّقُ بَیْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ (البقرہ 285:2)

یعنی رسول اس پر ایمان لایا جو اس کے رب کی طرف سے اس پر اتارا گیا اور تمام مومن بھی اللہ پر اور اس کے فرشتوں پر اور اس کی کتابوں اور اس کے رسولوں پر ایمان لاتے ہیں ہم کسی میں کچھ تفریق نہیں کرتے۔

دوسری جگہ آتا ہے۔

یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَ الْكِتٰبِ الَّذِیْ نَزَّلَ عَلٰی رَسُوْلِهٖ وَالْكِتٰبِ الَّذِیْٓ اَنْزَلَ مِنْ قَبْلُ وَمَنْ یَّكْفُرْ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًا بَعِیْدًا (النساء 136:4)

اے لوگو! جو ایمان لائے ہو۔ اللہ پر ایمان لاؤ اور اس کے رسول پر اور اس کی کتاب پر جو اس نے اپنے رسول پر اتاری اور اس کتاب پر جو پہلے اتاری اور جو شخص اللہ اور اس کے فرشتوں اور اس کی کتابوں اور اس کے رسولوں اور پچھلے دن کا انکار کرتا ہے وہ گمراہی میں دور نکل گیا۔ اس آیت میں پہلے یہ بیان کیا گیا ہے رسولوں اور ان کی کتب پر ایمان لاؤ۔ مزید تاکید کے ساتھ یہ بھی بیان کر دیا جو ان کا انکار کرتا ہے۔ وہ کھلی کھلی گمراہی میں ہے۔

اسلام کے دین ہونے کی یہ ہی بڑی دلیل ہے کہ اس نے تمام ادیان کے متعلق یہ گواہی دی ہے کہ وہ من جانب اللہ تھے پھر تمام رسولوں اور ان کی کتب پر ایمان لانا ضروری قرار دیا ہے۔

اب سوال پیدا ہوتا ہے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سچا ہونے کی دلیل کیا ہے؟ آپ ﷺ کا من جانب اللہ ہونے کی دلیل قرآن مجید ہے۔ آپ ﷺ کو یہ ایک ایسا معجزہ دیا گیا ہے جس کی نظیر نہیں ملتی۔ رسول کریم ﷺ نے اپنی صداقت قرآن مجید کا بے مثل ہونا قرار دیا ہے۔

ارشاد الٰہی ہے۔

قُلْ لَّئِنِ اجْتَمَعَتِ الْاِنْسُ وَالْجِنُّ عَلٰٓی اَنْ یَّاْتُوْا بِمِثْلِ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لَا یَاْتُوْنَ بِمِثْلِهٖ وَلَوْ كَانَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ ظَهِیْرًا (بنی اسرائیل 88:17)

کہہ اگر انسان و جن جمع ہو جائیں اور کوشش کریں کہ اس قرآن کی مثل بنا لائیں تو وہ ہرگز اس کی مثل نہ لا سکیں گے خواہ وہ ایک

دوسرے کے مددگار بن جائیں۔

قرآن مجید علمی لحاظ سے، امور محتاج الاصلاح کے لحاظ سے فصاحت و بلاغت کے لحاظ سے قوت تاثیر کے لحاظ سے عدم اختلافات کے لحاظ سے غیب کی خبروں کا اعلان کرنے کے لحاظ سے قوت دلائل کے لحاظ سے ایک معجزہ ہے۔ نزول سے لے کر آج تک کوئی شخص اس کتاب کی مانند کوئی کتاب نہیں لا سکا۔

قرآن مجید کامل مجموعہ ہدایت ہے۔ ارشاد الٰہی ہے۔

مَافَرَّطْنَا فِي الْكِتٰبِ مِنْ شَيْءٍ (الانعام 38:6) ہم نے کتاب (قرآن) میں کسی چیز کی کمی نہیں چھوڑی

یعنی اس کتاب (قرآن مجید) میں کوئی دینی اور مادی ضرورت باہر نہیں رہی بلکہ جمیع حقائق اور ضروریات انسانیہ اور معارف دینیہ پر مشتمل ہے۔

ایک اور جگہ آتا ہے۔

وَنَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ (النحل 89:16)

یعنی ہم نے یہ کتاب (قرآن مجید) تجھ پر نازل کی۔ تمام (مادی اور روحانی) امور کھول کر بیان کرتی ہے۔ یعنی تمام انسانی امور سے متعلق تعلیمات کھول کر بیان کرتی ہے۔

اسلام صرف دین ہی نہیں بلکہ تمام سابقہ ادیان کا جامع ہے اسلام کے آنے کے ساتھ ہی دوسرے ادیان کی صداقت ظاہر ہوئی ہے۔ اس کے ساتھ جو ان میں اختلاف پیدا ہو گئے تھے ان کو دور کیا اور ان کے غلط عقائد کی اصلاح کی۔

تیسری دلیل

عظیم روحانی و مادی انقلاب:

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے قبل اہل عرب شرک کی دلائل میں پھنسے ہوئے تھے۔ ہر قبیلے کا اپنا اپنا بت تھا۔ بیت اللہ میں تین سو ساٹھ بت تھے۔ بتوں کے متعلق ان کا یہ عقیدہ تھا کہ وہ ہر قسم کی حاجت روائی کرتے ہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ نے مختلف کاموں کی انجام دہی مختلف بتوں کے سپرد کر رکھی ہے جیسا کہ ابوجہل مسلمانوں سے پہلی لڑائی لڑنے کے لیے نکلا۔ تو کعبہ میں گیا اور بتوں سے فتح کی دعا مانگی ان کا عقیدہ تھا کہ ان کی عبادت سے خدا کا قرب حاصل ہوتا ہے۔

قرآن مجید میں آتا ہے۔

مَا نَعْبُدُهُمْ اِلَّا لِيُقَرِّبُوْنَآ اِلَى اللّٰهِ زُلْفٰى (زمر 3:39)

ہم ان بتوں کو صرف اس وجہ سے عبادت کرتے ہیں کہ وہ ہمیں اللہ کے نزدیک کر دیں۔ بتوں کے علاوہ سورج، چاند، ستارے اور کائنات کی دیگر اشیاء کی عبادت کا رواج تھا جب خدا کی ہستی کا تصور ہی دلوں سے معدوم ہو چکا تھا تو اخلاق کے زیور سے کب آراستہ رہ سکتے تھے کوئی ایسی برائی نہ تھی جو عربوں میں نہ پائی جاتی ہو۔ قتل و غارت، غصب و نہب، زنا، قمار بازی، بادہ نوشی، چوری چکاری، ڈاکے جیسے اخلاق سیہ ان کی گھٹی میں رچ بس گئے تھے سب سے بڑا گناہ جو عرب میں پایا جاتا تھا وہ تھا بچیوں کو زندہ در گور کرنا غلامی کا عام رواج تھا عورتوں کو ایک ذلیل مخلوق سمجھا جاتا تھا۔ وہ صرف جنسی ہوس کی تکمیل کا ذریعہ سمجھی جاتی تھی۔

یہ تھی عرب کی حالت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے قبل جب دنیا کے دیگر ممالک کی طرف نظر دوڑاتے ہیں تو وہاں بھی شرک بری طرح رائج تھا۔ عرب کے مشرق میں ایک طرف ہندوستان ہے جس میں توہمات کے ایسے سیاہ بادل چھائے ہوئے تھے مرد کی شرم گاہ جسے لنگ کہتے ہیں اور عورت کی شرم گاہ جسے بھگ کہتے ہیں پوجی جاتی تھی۔ دوسری طرف ایران ہے جس میں آگ کی پرستش، سیاروں کی معبودیت اور نور وظلمت دو خداؤں کی سلطنت پر اعتقاد تھا شمال ومغرب اور عین وسط میں عیسائیت تثلیث پر ایمان رکھتی تھی۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور حضرت مریم کو خدائی درجہ دے رکھا تھا۔ یہود نے عزیر کو خدا کا بیٹا بنا رکھا تھا۔ اس طرح تمام دنیا گناہوں کی دلدل میں پھنسی ہوئی تھی۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم ایسے حالات میں کھڑے ہوئے اور کہا مجھے خدا نے رسول بنا کر بھیجا ہے تمام عرب آپ ﷺ کا دشمن ہو گیا۔ گھر سے نکال دیا آپ ﷺ کو اور آپ کے ماننے والوں کو ہستی سے مٹا دینے کا عزم لیے ہوئے تھے آخر وہی لوگوں کی نظر میں کمزور شخص تیئس سال کے عرصہ میں تمام عرب پر غالب آ گیا اور آپ کی اتباع کی برکت سے ہی بگڑے ہوئے عرب باادب پھر بااخلاق ہوئے پھر باخدا، دل خدا کے نور سے منور ہو گئے سینے خدا کی رضا کے لیے کھل گئے وہ عرب جو گناہوں میں لذت محسوس کرتے تھے اب وہی عرب برائیوں سے نفرت کرنے لگے خدا کی عبادت میں لذت اور سرور پانے لگے ہر دم خدا کی یاد میں رہتے دنیا میں رہتے ہوئے انقطاع عن الدنیا تھے۔ ہر لحہ دل ودماغ متوجہ الی اللہ تھا اس روحانی قرب کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہم کلامی کی نعمت سے متمتع تھے یہ تھا وہ روحانی انقلاب جو آپ کی پیروی سے رونما ہوا آج تک نہ زمین نے اس قسم کا انقلاب دیکھا اور نہ دیکھے گا نہ آسمان نے دیکھا۔

دنیاوی برکات:

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس وقت کثرت امت کا دعویٰ کیا جب آپ ﷺ کے ساتھ چند آدمی تھے وہ ایک حجرہ میں سما سکتے تھے۔ انگلیوں پر گنے جا سکتے تھے جن کو چند آدمی ہلاک کر سکتے تھے۔ ان کا مقابلہ بڑے بڑے جابر لوگوں کے ساتھ تھا اپنے ہی قبیلے کے لوگ آپ ﷺ کو قتل کرنا چاہتے تھے پھر خدا کے اذن سے مکہ چھوڑا مدینہ میں مقیم ہوئے۔ پھر بھی دشمنوں نے تعاقب کیا آخر کار دشمنوں نے ذلت آمیز شکستوں کا سامنا کیا۔ بظاہر آپ ﷺ کمزور اور ناتواں شخصیت تھے۔ آپ ﷺ اس کمزوری کے دور میں اپنی کامیابی وکامرانی کا دعویٰ کرتے تھے تیئس سال کے بعد وہی کمزور اور ناتواں اور بے بس شخصیت تمام عرب پر غالب آ جاتی ہے لوگ جوق در جوق، فوج در فوج دین الٰہی میں داخل ہو رہے ہیں قرآن مجید میں آتا ہے۔

اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَالْفَتْحُ وَرَاَيْتَ النَّاسَ يَدْخُلُوْنَ فِىْ دِيْنِ اللّٰهِ اَفْوَاجًا (النصر 2,1:110)

جب اللہ کی مدد پہنچی اور فتح اور تو نے لوگوں کو اللہ کے دین میں فوج در فوج داخل ہوتے دیکھ لیا۔

وہی منتشر قوم جو بیرونی دنیا میں ذلت کی نگاہ سے دیکھی جاتی تھی اور حکمرانی کے آداب سے ناآشنا تھی۔ وہی قوم قیصر وکسریٰ کے تختوں کی وارث ہوئی معمورہ ارض کا ربع ان کے قدموں کے نیچے تھا جس طرف رخ کرتے فتح ان کے قدم چومتی یہ انقلاب بھی اس سے پہلے کسی کی نظر سے نہیں گزرا اور نہ دیکھے گا۔ چنانچہ انسائیکلو پیڈیا بری ٹانیکا میں لفظ قرآن کی بحث کے نیچے یہ اعتراف کیا ہے۔ ''دنیا کی تمام شخصیتوں میں سب سے زیادہ کامیاب حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔''

کیا یہ معجزہ اب تک دنیا میں ظاہر ہوا۔ عیسائی مذہب کا رب اور ان کا خدا کیا نظیر ہو سکتا ہے جو بقول عیسائیوں کے قوم سے مارا پیٹا گیا جس کے منہ پر اس کے حواری نے تھوکا اور لعنت بھیجی۔ موسیٰ کب نظیر ہو سکتا ہے جس نے خود بھی وہ ملک نہ دیکھا جس کی امید پر مصر سے قوم لے کر چلا تھا وید کے ماننے والے کیا دکھائیں گے جن کے مقدس مکان دوسروں کے قبضوں میں نظر آتے ہیں زرتشتی کیا نظیر دکھائیں گے جن کو اپنے ملک میں سر چھپانے کی جگہ نہیں ملی۔ اسی طرح حضرت ابراہیم اور حضرت یعقوب کے ساتھ خدا کا وعدہ کنعان کی ابدی وراثت کی بابت

اور پارسیوں کے ہادیوں کی الہامی دعائیں بھی فراموش کرنے کے قابل نہیں کیا دنیا میں کوئی بھی مصلح اور نبی، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم جیسا گزرا ہے جس نے اپنے مولد اور مسکن میں نہایت بے بسی میں زندگی گزاری ہو، پھر جان بچا کر ہجرت کی ہو ہجرت کے بعد بھی دشمنوں نے آپ ﷺ کو تباہ و برباد کرنے کا عزم کر رکھا ہو اور آخر کار دشمن پردہ فنا میں چلے گئے اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کامیابی کے آسمان پر چمکنے لگے۔ یہ ہے وہ زبردست دلیل اسلام کے دین الٰہی ہونے کی۔ اس قسم کا روحانی اور مادی انقلاب دین الٰہی ہی برپا کر سکتا ہے۔ جس کے پیچھے اللہ تعالیٰ کی قوت ہوتی ہے اگر معترض تعصب کی پٹی اپنی آنکھوں سے اتار کر اسلام کا مطالعہ کرے تو نہ صرف اسلام کی حقانیت اس پر ظاہر ہو جائے گی بلکہ یہ بھی واضح ہو جائے گا کہ صرف اسلام ہی لوگوں کو فلاح کا راستہ دکھا سکتا ہے اور تمام دنیا کے مسائل کا حل اسی دین الٰہی میں ہے۔

چوتھی دلیل

موعود اقوام عالم:

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم ایک ایسی واحد اور یکتا شخصیت ہیں جس کا ذکر پہلی کتب سماوی میں پایا جاتا ہے۔ تورات میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق یہ پیشگوئی ہے ”میں ان کے لیے ان کے بھائیوں میں سے تجھ سا ایک نبی برپا کروں گا اور اپنا کلام اس کے منہ میں ڈالوں گا اور جو کچھ میں اسے کہوں گا سب ان میں سے کہے گا اور ایسا ہوگا کہ جو کوئی میری باتوں کو جنہیں وہ میرا نام لے کر کہے گا نہ سنے گا تو میں اس کا حساب اس سے لوں گا۔ جس کے کہنے کا میں نے اسے حکم نہیں دیا یا اور معبودوں کے نام سے کہے تو وہ نبی قتل کیا جائے گا اگر تو اپنے دل میں کہے کیونکر جانوں کہ یہ بات خداوند کی کہی ہوئی نہیں تو جان رکھ کہ جب نبی کچھ خداوند کے نام سے کہے اور وہ جو اس نے کہا ہے نہ ہو یا واقع نہ ہو تو وہ بات خداوند نے نہیں کہی بلکہ اس نے گستاخی سے کہی ہے تو اس سے مت ڈر۔ (استثناء باب 18 آیات 17-19)

یہ توریت کی پیشگوئی ہے جو حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا کسی پر چسپاں نہیں ہو سکتی حضرت موسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل کو بتا رہے ہیں کہ ان کے بھائیوں میں سے ایک نبی آئے گا بنی اسرائیل کے بھائی بنی اسماعیل تھے۔ بنی اسرائیل حضرت اسحاق سے ہیں جبکہ بنی اسماعیل حضرت اسماعیل کی نسل سے ہیں حضرت اسحاق اور حضرت اسماعیل دونوں بھائی تھے۔

دوسری بات جو اس بشارت میں بیان کی گئی ہے کہ جو نبی برپا ہوگا وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے مانند ہوگا وہ نبی ایک مستقل شریعت لانے [illegible] سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے مانند ہوگا یہ خصوصیت حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا کسی میں نہیں پائی جاتی کیونکہ آپ سے پہلے بنی اسرائیل میں جو نبی آئے وہ ایک مستقل شریعت کے حامل نہ تھے بلکہ شریعت موسوی کے پیروکار تھے لیکن وقت کے تقاضوں کے ساتھ شریعت موسوی میں خدا سے حکم پا کر اضافے کرتے رہے دوم بعض احکام وقتی طور پر منسوخ کرتے رہے دراصل ان کا سلسلہ موسوی تھا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد صرف رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ایسی ذات ہے۔ جس نے مثیل ہونے کا دعویٰ کیا ہے جیسا کہ پیش گوئی کے الفاظ ہیں۔

”ان کے بھائیوں میں سے تجھ سا ایک نبی برپا کروں گا۔

خدا کا کلام اس کے منہ میں ہوگا اور جو کچھ اللہ تعالیٰ اس سے فرمائے گا وہ سب کچھ کہہ دے گا جو کوئی اس کی مخالفت کرے گا اور کہا نہ سنے گا وہ سزایاب ہوگا۔ اگر وہ نبی اللہ کے حکم کے بغیر کچھ کہے تو وہ مارا جائے گا۔ وہ نبی توحید کا واعظ اور غیر معبودوں کی پرستش کا مانع ہوگا اگر وہ غیر معبودوں کے نام سے کچھ کہے گا تو وہ مارا جائے گا اس نبی کی پیشگوئیاں پوری ہوں گی۔ جبکہ جھوٹے نبی کی پیشگوئی پوری نہیں ہوتی۔

قرآن مجید میں آتا ہے۔

اِنَّآ اَرْسَلْنَآ اِلَيْكُمْ رَسُوْلًا شَاهِدًا عَلَيْكُمْ كَمَآ اَرْسَلْنَآ اِلٰى فِرْعَوْنَ رَسُوْلًا (المزمل 15:73)

یعنی ہم نے تمہاری طرف ایسا رسول بھیجا ہے جو تم پر گواہ ہے جیسا کہ فرعون کی طرف بھیجا۔

پیشگوئی کے الفاظ ''تجھ سا'' اور قرآن کا لفظ ''کما'' (کی طرح) پر غور کیجیے تو یہ بات واضح ہو جائے گی کہ تورات کی پیشگوئی کے مصداق صرف رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔

دوسری پیش گوئی:

خداوند سینا سے آیا اور سعیر سے ان پر طلوع ہوا فاران ہی کے پہاڑ سے وہ جلوہ گر ہوا۔ دس ہزار قدسیوں کے ساتھ آیا اس کے داہنے ہاتھ میں ایک آتشی شریعت ان کے لیے تھی (استثناء 2:33)

سینا سے آنا حضرت موسیٰ علیہ السلام کا ظہور جو سینا سے نکلا۔ سعیر سے جس کے پاس بیت لحم اور ناصرہ ہے۔ حضرت مسیح علیہ السلام ظہور ہوئے وہ کون سا فاران ہے جس میں خدا ظاہر ہوا۔ جہاں سے حضرت مسیح علیہ السلام کے بعد رسول نکلا۔ اس پر روشن شریعت نازل ہوئی وہ کون سا دین ہے جو فاران سے نکلا تمام دنیا میں پھیل گیا وہ مکہ کی وادی غیر ذی زرع ہے جہاں ایک اُمی نبی پر خدا کی آخری مقدس شریعت نازل ہوئی اور تمام دنیا میں پھیل گئی۔ دس ہزار قدوسیوں کے ساتھ آنے والا ایک ہی انسان دنیا کی تاریخ میں ہے یعنی حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم جو دس ہزار مقدس انسانوں کے ساتھ فاتحانہ شان میں مکہ میں داخل ہوا۔

انجیل کی پیشگوئی:

اب وہ پیشگوئی جو انجیل یوحنا میں مسلسل باب 14 سے 16 تک منقول ہے درج کی جاتی ہے۔

''اور میں باپ سے درخواست کروں گا تو وہ تمہیں دوسرا مددگار بخشے گا کہ ابد تک تمہارے ساتھ رہے یعنی روح حق جسے دنیا حاصل نہیں کر سکتی کیونکہ نہ اسے دیکھتی ہے نہ جانتی ہے تم اسے جانتے ہو کیونکہ وہ تمہارے ساتھ رہتا ہے اور تمہارے اندر ہے۔ (17-16:14)

میں نے یہ باتیں تمہارے ساتھ رہ کر تم سے کہیں لیکن مددگار یعنی روح القدس جسے باپ میرے نام سے بھیجے گا وہی تمہیں سب باتیں سکھائے گا اور جو کچھ میں نے تم سے کہا ہے وہ سب تمہیں یاد دلائے گا۔ (26,25:14)

''اس کے بعد میں تم سے بہت باتیں نہ کروں گا۔ کیونکہ دنیا کا سردار آتا ہے اور مجھ میں اس کا کچھ نہیں۔ (30:14) لیکن جب وہ مددگار آئے گا جس کو میں تمہارے پاس باپ کی طرف سے بھیجوں گا یعنی سچائی کی روح جو باپ سے صادر ہوتا ہے تو وہ میری گواہی دے گا۔ (26:15)

لیکن میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ میرا جانا تمہارے لیے سودمند ہے کیونکہ میں نہ جاؤں تو وہ مددگار تمہارے پاس نہ آئے گا لیکن اگر جاؤں گا تو اسے تمہارے پاس بھیج دوں گا۔'' (17:16)

''مجھے تم سے اور بھی بہت سی باتیں کہنا ہیں۔ مگر اب تم ان کو برداشت نہیں کر سکتے لیکن جب وہ یعنی سچائی کی روح آئے گا تو تم کو تمام سچائی کی راہ دکھائے گا اس لیے وہ اپنی طرف سے نہ کہے گا لیکن جو کچھ سنے گا۔ وہی کہے گا اور تمہیں آئندہ کی خبریں دے گا۔ وہ میرا جلال ظاہر کرے گا اس لیے مجھ ہی سے حاصل کر کے تمہیں خبریں دے گا۔ جو کچھ باپ کا ہے وہ سب میرا ہے اس لیے میں نے کہا کہ وہ مجھ سے ہی حاصل کرتا ہے اور تمہیں خبر دے گا۔'' (15-12:16)

مرقس انجیل میں ہے ''کیا تم نے یہ نوشتہ نہیں پڑھا کہ وہ پتھر جسے معماروں نے رد کیا وہ کونے کا سرا ہوا۔ یہ خدا کی طرف سے ہوا اور

ہماری نظروں میں عجیب ہے۔(مرقس 11:12)

جو اس پتھر پر گرے گا چور ہو جائے گا پر جس پر وہ گرے گا اس سے پیس ڈالے گا۔(متی 25,24:21)

''پھر وہ کیا ہے؟ جو لکھا ہے کہ وہ پتھر جسے راج گیروں نے رد کیا۔ وہی کونے کا سرا ہوا۔ ہر ایک جو اس پتھر پر گرے گا چور ہوگا اور جس پر وہ گرے گا اسے پیس ڈالے گا۔''(لوقا 18,17:20)

اناجیل کی تمام آیات پر غور کیجیے تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ ان میں ایک آنے والے نبی کی چند خصوصیات بیان کی جارہی ہیں وہ دنیا کا سردار ہوگا۔(2) ابد تک رہے گا۔(3) سچائی کی تمام راہیں دکھائے گا۔(4) وہ کونے کا پتھر ہوگا۔(5) جو اس پتھر پر گرے گا چُور چُور ہو جائے گا۔

یہ تمام خصوصیات سوائے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا کسی میں نہیں پائی جاتیں۔

قرآن مجید میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ''سردار'' ''خاتم النبیین'' کے الفاظ کے ساتھ بیان کیا ہے۔ دوسری خصوصیت بیان ہوئی ہے ''وہ ابد تک رہے گا'' ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا وجود اور ان کی شریعت ابد تک رہے گی۔ کبھی منسوخ نہیں ہو ہوگی۔(3) ''سچائی کی تمام راہیں دکھائے گا'' اس فقرہ میں یہ بیان کیا گیا ہے جو وہ شریعت لائے گا وہ زندگی کے تمام شعبوں کے لیے راہنمائی کا سبب ہوگی جیسا کہ قرآن مجید میں آتا ہے۔ ''ھدی للناس'' کہ قرآن مجید لوگوں کی ہدایت ہے یعنی قرآن مجید وہ مجموعہ احکام ہے جن پر انسان چل کر منزل مقصود تک پہنچ جاتا ہے۔(4) ''وہ کونے کا پتھر ہے'' اس فقرہ میں اس تمثیل کا ذکر ہے جس میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے آپ کو نبوت کی عمارت کی آخری اینٹ قرار دیا ہے کونے کے پتھر میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا وجود نبوت کی عمارت کا آخری پتھر ہوگا ان کے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا۔(5) ''جو اس پتھر پر گرے گا وہ چُور چُور ہو جائے گا'' اس پیشگوئی میں یہ بیان کیا گیا ہے وہ شخص خدا کے دشمنوں پر غالب آئے گا دشمن ابتر، ناکام و نامراد رہیں گے۔ یہ پیشگوئی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات سے پوری ہوتی ہے آپ ﷺ ہی کی وہ ذات ہے جس سے سچائی کے دشمنوں نے آپ کا مقابلہ کیا آپ ﷺ کو نیست و نابود کرنے کے منصوبے بنائے لیکن ناکام و نامراد رہے آخر کار فتح مکہ کے بعد تمام مخالف آپ ﷺ کے سامنے اپنے کیے پر نادم کھڑے تھے رحم کے خواستگار تھے۔

خلاصہ:

اسلام کے دین الٰہی ہونے کے چار دلائل ہیں۔

اسلام اور دیگر ادیان میں بنیادی تعلیمات کا اشتراک ہے صرف اشتراک ہی نہیں بلکہ اسلام میں تعلیمات کے تمام شعبے واضح اور کامل صورت میں ہیں اور دیگر مذاہب میں جو غلط عقائد و رسوم رائج ہو گئی تھیں۔ ان کی بھی اصلاح کی۔

دوسری دلیل دین اسلام کا چشمہ ہدایت یعنی قرآن مجید ایک ایسا معجزہ ہے جس کی نظیر اب تک نہیں پائی جاتی تا قیامت یہ کتاب معجزہ ہی رہے گی۔

تیسری دلیل اسلام نے دنیا میں ایک روحانی اور مادی انقلاب برپا کیا جس کی نظیر دنیا میں نہیں پائی جاتی۔

چوتھی دلیل رسول کریم موعود اقوام عالم ہیں جن کے متعلق پہلے تمام انبیاء علیہم السلام نے پیش گوئیاں کی تھیں وہ پیش گوئیاں آپ کے ذات کے ساتھ پوری ہوئیں انہی پیش گوئیوں میں دین اسلام کا بھی ذکر ہے۔ کہ محمد ﷺ ایک ایسا دین لائے گا جو قیامت تک قائم رہے گا اور لوگوں کی ہدایت کا موجب ہوگا۔

دنیا میں صرف ایک دین ہے وہ ہے اسلام جس کی سچائی کے براہین پائے جاتے ہیں۔ دوسرا کوئی مذہب نہیں جو اپنی صداقت کی دلیل رکھتا ہو۔ اسلام کا ان پر یہ احسان ہے کہ تمام مذاہب کو من جانب اللہ قرار دیتا ہے اور ان کی سچائی پر گواہی دیتا ہے۔ افسوس وہی دین ہدف تنقید ہے۔

اسلام مذاہب سے جدا ہے

اعتراض: اسلام مذاہب سے جدا ہے اس لیے عمرانیات مذاہب سے خارج ہے

(Bryan's Tumers weber and Islam P.1)

(بحوالہ مستشرقین مغرب کا انداز فکر مصنفہ ڈاکٹر عبدالقادر جیلانی صفحہ 212)

جواب: پچھلے سوال کے جواب میں یہ وضاحت کی جا چکی ہے اسلام دین الٰہی ہے اور پہلے مذاہب کا تسلسل ہے انہی تعلیمات کا حامل ہے۔ (توحید، عبادات اور معاملات) جو پہلے مذاہب دیتے چلے آئے ہیں۔ ہر مذہب کا عمود ہستی باری تعالیٰ ہے۔ یہی اسلام کا ہے۔ بلکہ جس رنگ میں اسلام نے ہستی باری تعالیٰ کا تصور پیش کیا ہے کسی مذہب نے نہیں پیش کیا۔ پھر مذاہب عالم کی کتب میں انبیاء علیہم السلام نے خدا کا تصور پیش کیا تھا وہ بھی انسانی ملونی سے دھندلا چکا تھا۔ توحید کی جگہ شرک نے جگہ لے لی تھی۔ اسلام نے خالص توحید پیش کر کے تمام مذاہب کے تصور الٰہ کو پھر صاف کر دیا۔ یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے جب ''تصور الٰہ'' میں فساد اور بگاڑ پیدا ہو جائے تو عبادت الٰہی کا عمل بھی خراب ہو جاتا ہے ایک خدا کی عبادت کی بجائے کئی معبودوں کی پرستش کی جانے لگتی ہے۔ اسلام سے قبل تمام مذاہب کی یہی حالت تھی۔ ہندومت، بدھ مت، جین مت، عیسائیت اور یہودی کی تاریخ کا مطالعہ کیجیے۔ تو صاف واضح ہو جائے گا کہ ان تمام مذاہب میں توحید کی جگہ شرک نے لے لی تھی۔ اسلام نے تمام مشرکانہ عقائد کی اصلاح کی خالص نظریہ توحید پیش کیا اسلام کو مذاہب کی صف سے الگ کرنے والے ذرا تعصب اور عداوت کی پٹی اپنی آنکھوں سے ہٹا کر دیکھیں تو دنیا میں صرف ایک ہی مذہب پائیں گے جو دین کہلانے کا مستحق ہے تمام مذاہب تو اپنی اصل تعلیم کی روشنی ہی کھو بیٹھے ہیں نہ ان میں خالص توحید کا تصور پایا جاتا ہے اور نہ ایک خدا کی عبادت کا تصور۔ دور حاضر میں اگر کوئی دین، دین الٰہی کہلانے کا مستحق ہے وہ صرف اسلام ہے کیونکہ اس میں صرف ایک خدا اور صرف اس کی عبادت کا تصور پایا جاتا ہے۔

دور حاضر کے ایک عظیم مفکر جارج برنارڈ شا کا ایک حوالہ قارئین کے سامنے پیش کرتا ہوں۔ وہ حوالہ ہی معترض کے اعتراض کا کافی رد ہے۔ رقمطراز ہیں۔

''اگر کوئی ایسا مذہب جو نہ صرف انگلستان بلکہ تمام یورپ پر چھا سکے گا وہ صرف اسلام ہی ہو سکتا ہے میں نے ہمیشہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے مذہب کی تعظیم کی ہے کیونکہ اس میں حیران کن حرارت ہے میرے نزدیک یہ واحد مذہب ہے جس میں ایسی گنجائش ہے جو زندگی کے بدلتے ہوئے حالات کے مطابق رکھتی ہو اور ہر زمانہ کے تقاضوں کو پورا کرے۔''

میں اس شخص (محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم) کا بغور مطالعہ کیا میری دانست مین وہ نوع انسان کے نجات دہندہ ہیں۔ کجا کہ انہیں (العیاذ باللہ) دجال کہا جائے...... میں سمجھتا ہوں کہ اگر ان (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) جیسا کوئی شخص موجود دنیا کا حاکم بن جائے تو وہ تمام مشکلات کو اس طرح حل کرے گا کہ امن اور خوشی کا دور دورہ ہو جس کو دنیا ترس رہی ہے میں یہ پیشگوئی کر چکا ہوں کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کا دین کل کے یورپ کو بھی اسی طرح قابل قبول ہوگا جیسا کہ اسے آج کے یورپ نے اپنانا شروع کر دیا ہے۔

(The genius of Islam Vol 1 P.8 1936)

عمرانیات مذاہب سے جدا ہے:

معترض کا عمرانیات کا مذاہب سے جدا ہونے کا کیا مطلب ہے وہ تو وہی جانے۔ عمرانیات مذہب میں شامل ہے۔ عمرانیات ہی بنی

نوع انسان کو ترقی کے راستے پر چلاتی ہے۔اسلام مذاہب کے اس عمرانی مقصد کو ہر رنگ میں پورا کرتا ہے اسلام صرف ترقی کے راستے پر چلاتا ہی نہیں بلکہ منزل مقصود تک پہنچاتا ہے۔قرآن مجید میں اس عمرانی مقصد کے لیے لفظ ہدایت کا استعمال ہوا ہے ایک جگہ ھدی للمتقین ہے (متقیوں کے لیے ہدایت کا ذریعہ ہے) اور دوسری جگہ ہدی للناس (لوگوں کے لیے ہدایت) آیا ہے عربی لغت میں ہدایت کے معنی یہ ہے کہ صحیح راستہ پر چلا کر منزل مقصود تک پہنچانا۔مسلمانوں کی تاریخ اس صداقت کی دلیل ہے کہ گمراہ عربوں کو گمراہی سے نکال کر صراط مستقیم پر چلایا پھر وہی گمراہ لوگ روحانی اور مادی ترقیوں کی انتہا کو پہنچے۔تمام عمرانی پہلوؤں کو بام عروج تک پہنچایا۔

......☆......

اسلام دنیاوی مذہب ہے نجات کا ذریعہ نہیں

اعتراض: اسلام دنیاوی مذہب ہے اسلام مذہب نجات نہیں۔

P. Hardy; Muslim of British India P 175.

بحوالہ مستشرقین مغرب کا انداز فکر مصنفہ ڈاکٹر عبدالقادر جیلانی۔

جواب: معترض کا اسلام کو دنیاوی مذہب قرار دینا محض اسلام کی تعلیمات سے عدم واقفیت کا نتیجہ ہے۔انسان دو چیزوں سے مرکب ہے روح دوم جسم، روح کی تربیت کے تقاضے الگ ہیں اور جسم کی ضروریات کی تکمیل کے تقاضے الگ ہیں۔انسان کی ان دو ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے دین کی تعلیم کو دو حصوں میں تقسیم کیا ہے (1) تزکیہ نفس (2) مادی ضروریات کی تکمیل کے لیے راہنمائی۔اسلام میں ہر دو پہلوؤں پر مفصل ہدایات ہیں۔جو کسی دوسرے مذاہب میں نہیں۔اسلام نے تزکیہ نفس کے لیے اصول بیان کیے ہیں وہ یہ ہیں ایمانیات (اللہ پر ایمان، فرشتوں پر ایمان، نبیوں پر ایمان، کتب سماوی پر ایمان اور آخرت پر ایمان) عبادات (نماز روزہ زکوٰۃ اور حج) تیسرا اعمال صالحہ، بجا لانا یعنی ضابطہ اخلاق پر عمل کرنا۔ان اصولوں کو بجا لانے کے علاوہ اسلام نے دعا، استغفار توبہ اور مجاہدہ کی ترغیب دی ہے حقیقت میں دعا، استغفار، توبہ اور مجاہدہ عبادات کا ہی حصہ ہیں۔

یہی وہ اصول ہیں جن پر عمل پیرا ہو کر گمراہ، ضالّ، بے دین، مشرک اور ہر قسم کی بدیوں میں مبتلا عرب قوم با خدا بنی۔ان کے اندر ایک روحانی انقلاب برپا ہوا۔صرف عہد رسول ﷺ کی بات نہیں بلکہ ہر دور میں جو بھی ان اصولوں پر عمل کرتا ہے وہ با خدا بن جاتا ہے اللہ اس سے ہم کلام ہوتا ہے۔اسلام کے دین الٰہی ہونے کا سب سے بڑا ثبوت یہی ہے کہ اس کی تعلیم پر عمل کر کے انسان ایک زندہ خدا کو پا لیتا ہے اور منعمین میں شامل ہو جاتا ہے۔صرف دین اسلام ہی وہ دین ہے جس کا یہ دعویٰ ہے کہ یہی دین انسان کو اعلیٰ رحانی مدارج تک پہنچاتا ہے۔

جب اسلام ہر دور میں با خدا انسان پیدا کرتا رہا ہے اور اب یہ اعتراض کرنا کہ اسلام دنیاوی مذہب ہے انسان کی روحانی ضرورتوں کو پورا نہیں کرتا۔محض لاعلمی اور جہالت ہے بلکہ ہر مسلمان دعویٰ سے کہہ سکتا ہے کہ صرف اسلام ہی وہ دین ہے جو انسان کی روحانی ضرورت کو پورا کرتا ہے روحانی ضرورت کو پورا کرنے کے لیے موحد ہونا ضروری ہے خالص توحید صرف اسلام میں ہے۔

اسلام نجات کا مذہب نہیں:

اس پر مفصل بحث ہو چکی یہ کہ ثابت کیا گیا ہے کہ نجات کا مذہب صرف اسلام ہی ہے۔اسلام نے نجات کے لیے لفظ فلاح استعمال کیا ہے لفظ فلاح ''نجات'' کی نسبت اپنے اندر زیادہ وسیع مفہوم رکھتا ہے۔مراد وہی ہے جو معترض کے ذہن میں نجات سے ہے۔نجات سے

مراد بھی بامراد زندگی پانا ہے جب کہ فلاح کا مطلب بھی یہی ہے۔
قرآن مجید کے آغاز میں ہی فلاح (نجات) کے حصول کے ذرائع بیان کر دیئے ہیں۔افسوس معترض کی نظر ان اصولوں سے اُلجھ رہی ہے۔ارشاد الٰہی ہے۔
الٓمّٓ ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ فِيْهِ هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ وَيُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ وَالَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ وَبِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ اُولٰٓئِكَ عَلٰى هُدًى مِّنْ رَّبِّهِمْ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ (البقرہ 2:1-5)
میں اللہ کامل علم رکھنے والا ہوں۔یہ کتاب اس میں کوئی شک نہیں۔متقیوں کے لیے ہدایت ہے جو غیب پر ایمان لاتے ہیں۔نماز قائم کرتے ہیں اور اس سے جو ہم نے ان کو دیا خرچ کرتے ہیں اور جو اس پر ایمان لاتے ہیں جو تیری طرف اتارا گیا اور جو تجھ سے پہلے اتارا گیا اور آخرت پر یقین رکھتے ہیں یہی اپنے رب کی طرف سے ہدایت پر ہیں اور یہی فلاح (نجات) پانے والے ہیں۔

فلاح (نجات،مکتی) کے حاصل کرنے کا پہلا وسیلہ:

الکتاب،فلاح (نجات،مکتی،نروان) حاصل کرنے کے لیے سب سے پہلے الٰہی تعلیم اور کتاب کی ضرورت ہے جو تحریف و تبدل سے پاک ہو جو ہر قسم کے نقص سے مبرا ہو۔دنیا میں کوئی ایسی کتاب نہیں دعویٰ سے کہا جاسکے کہ وہ تحریف و تبدل سے پاک ہے۔توریت انجیل، وید الغرض تمام مذاہب کی کتب مرور زمانہ سے انسانی دستبرد سے تبدیلی کا شکار ہو چکی ہیں۔صرف اسلام ہی ایک دین ہے جس کا ضابطہ حیات یعنی قرآن مجید لفظی اور معنوی رنگ میں محفوظ ہے۔اسی لیے شروع میں ہی یہ دعویٰ کر دیا گیا ہے کہ یہ وہ کتاب ہے جس کی صداقت میں کوئی شک و شبہ نہیں۔یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ آئین ہی انسان کی کامیابی اور نجات کا ذریعہ ہو سکتا ہے۔محفوظ کتاب (ضابطہ حیات، آئین انسانیت) صرف مسلمانوں کے پاس ہے اس لیے بانگ دہل کہا جاسکتا ہے کہ اسلام ہی ذریعہ فلاح اور نجات ہے۔

دوسرا وسیلہ فلاح (ایمان بالغیب):

وہ لوگ جو روحانی بلند چوٹی پر چڑھنا چاہتے ہیں ان کو چاہیے کہ وہ غیب پر ایمان لائیں یعنی وہ ہستی جو انسانی ظاہری حواس سے ماورئی ہے۔اس کو حق جان کر مانا جائے۔یہ وہ ہستی ہے جو تمام خوبیوں کی جامع اور ہر نقص سے مبرا ہے۔غیب میں ہستی باری تعالیٰ کے علاوہ ملائکہ اور یوم آخرت بھی آجاتا ہے۔تمام مذاہب کا اس بات پر اتفاق ہے کہ انسان کے اندر خدا کی ہستی کے بارے میں جتنی زیادہ معرفت ہوگی اتنا ہی انسان برائیوں سے دور رہے گا۔گویا معرفت الٰہی ہی انسان کو نیکیوں کے راستہ پر گامزن کرتی ہے اور برائیوں سے دور رکھتی ہے۔اگر کسی شخص کو زہر آلود خوراک کا علم ہو خواہ وہ خوراک کتنی ہی لذیذ کیوں نہ ہو نہیں کھائے گا اسی طرح انسان کے اندر معرفت الٰہی بدی کے بداثرات سے آگاہ کر دیتی ہے تو انسان بدی سے دور رہتا ہے اور نیکیوں کے بجالانے میں اس کا قدم تیز ہو جاتا ہے۔اسلام نے فلاح کے حصول کا دوسرا وسیلہ ایمان بالغیب بیان کیا ہے۔

فلاح کا تیسرا وسیلہ:

قیام صلوٰۃ اور انفاق فی سبیل اللہ قرار دیا ہے۔قیام صلوٰۃ اور انفاق فی سبیل (اللہ کی راہ میں خرچ کرنا) لازم و ملزوم ہیں۔اگر ایک شخص اللہ تعالیٰ کی عبادت کرتا ہے لیکن مخلوق کے لیے خرچ نہیں کرتا تو اس کی نماز (عبادت) بے کیف اور بے مغز ہے۔نماز انسان کو اللہ تعالیٰ کے احکام کی پیروی کا سبق دیتی ہے اور احکام الٰہی پر عمل کرنے سے ہی انسان بدیوں سے دور ہوتا ہے۔قرآن مجید میں آتا ہے۔

اِنَّ الصَّلٰوۃَ تَنْھٰی عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنْکَرِ (العنکبوت 49:29)

بے شک نماز بے حیایوں اور برائیوں سے روکتی ہے۔

حدیث میں آتا ہے۔حضرت ابو ہریرہ سے روایت ہے انہوں نے رسول کریم ﷺ سے سنا فرماتے ہیں بتاؤ اگر تم میں سے کسی کے دروازے پر نہر ہو اور وہ اس میں ہر روز پانچ دفعہ نہائے تو کیا کہتا ہے اس کی میل سے کچھ چھوڑ دے گا۔صحابہ نے کہا اس کی میل سے کچھ نہیں چھوڑے گا فرمایا پس یہ پانچ نمازوں کی مثال ہے خدا ان کے ذریعے گناہوں کو مٹا دیتا ہے۔(بخاری 6:9)

اللہ تعالیٰ نے خدا کے سامنے جھکنے والے کو یہ بھی ہدایت کی ہے کہ جو کچھ اللہ تعالیٰ نے انہیں دیا ہے اس میں سے مستحق اشخاص کو دیا جائے۔اللہ کے انسانوں سے ہمدردی کرنا اللہ کو بہت پسند ہے اسی لیے اللہ تعالیٰ کی رضا کے حصول کے لیے انفاق بہت ضروری ہے۔

چوتھا وسیلہ (سماوی کتب اور قرآن مجید پر ایمان):

کتب سماوی اللہ تعالیٰ کی ہدایت کا مخزن ہیں۔اللہ تعالیٰ نے انسانوں کی ہدایت کے لیے انبیاء علیہم السلام پر احکام نازل کیے۔یہ الٰہی احکام ہی اسلام کی اصطلاح میں کتب کہلاتی ہیں۔انبیاء اس تعلیم پر عمل پیرا ہوتے ہیں اور لوگوں کے لیے عملی نمونہ بنتے ہیں۔ارشاد الٰہی ہے

یُؤْمِنُوْنَ بِمَا اُنْزِلَ اِلَیْکَ وَمَا اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِکَ

''وہ ایمان لاتے ہیں جو تیری طرف اتارا گیا اور جو تجھ سے پہلے اتارا گیا۔''

میں صرف کتب سماوی پر ایمان لانا ہی مراد نہیں بلکہ جن پر وہ کتب اتاری گئیں ان پر بھی ایمان لانا ضروری ہے۔کیونکہ کتب سماوی اور انبیاء علیہم السلام لازم و ملزوم ہیں۔پس نجات کے لیے کتب سماوی اور انبیاء علیہم السلام پر ایمان لازمی قرار دیا گیا ہے نجات حاصل نہیں ہو سکتی جب تک ان احکام پر عمل نہ کیا جائے جو اللہ تعالیٰ نے اپنے انبیاء علیہم السلام پر نازل کیے تھے ان تمام احکام کا جامع قرآن مجید ہے۔

ارشاد الٰہی ہے۔

فِیْھَا کُتُبٌ قَیِّمَۃٌ (البینۃ 3:98)

جس میں قائم رہنے والی کتابیں ہیں اس آیت میں اشارہ ہے کہ اس قرآن مجید میں پہلی تمام کتب کی تعلیم موجود ہے جو قائم رکھنے کے قابل تھی۔

اسلام نے رسول کریم ﷺ اور قرآن مجید کو ہی صرف ذریعہ نجات قرار نہیں دیا بلکہ پہلے تمام کتب سماوی اور انبیاء علیہم السلام کو برحق تسلیم کرنا لازمی قرار دیا ہے کیونکہ تمام کتب سماوی ایک ہی چشمے سے جاری ہوئی تھیں اور تمام انبیاء علیہم السلام ایک ہی چشمہ صافی سے سیراب ہوئے تھے۔یعنی اللہ کی ذات سے۔یہ ایک منطقی نتیجہ ہے۔جو اللہ تعالیٰ کی ذات سے جاری ہونے والے چشمے سے سیراب ہو گا وہی فلاح (نجات) پائے گا۔

پانچواں وسیلہ:

وَبِالْاٰخِرَۃِ ھُمْ یُوْقِنُوْنَ وہ آخرت پر یقین رکھتے ہیں۔ایمان بالآخرۃ انسان کے اندر احساس ذمہ داری اور اپنے کردہ اعمال کے محاسبے کا شعور پیدا کرتا ہے۔انسان جو اعمال بجا لاتا ہے۔اس کا حساب قیامت کے دن دینا ہے۔اچھے اعمال کا پھل اچھا ملے گا اور برے اعمال کا نتیجہ برا ملے گا جب ایک انسان کو یہ علم ہو کہ ایک دن اس نے خدا کے سامنے پیش ہونا ہے اور اس کے اعمال کا حساب کتاب ہو گا۔تو وہ شخص برے کاموں سے اجتناب کرے گا اور نیک کام بجا لائے گا۔ایمان بالآخرۃ انسان کو یہ سبق دیتا ہے جو وہ اعمال کر رہا ہے وہ محفوظ ہیں ان

کا میزان ہوگا۔ اگر نیک اعمال کا وزن بھاری ہے تو وہ فلاح (نجات) پا جائے گا۔ اگر اس کے اعمال کا وزن ہلکا ہے تو اس کو علاج کے لیے جہنم (روحانی ہسپتال) میں بھیجا جائے گا۔ جب اس کی اصلاح ہو جائے گی تو پھر وہ نجات یافتہ ہو جائے گا اور جنتیوں میں بھیج دیا جائے گا۔

یہ وہ پانچ وسائل ہیں جن کے اختیار کرنے سے انسان اعلیٰ روحانی مراتب (نجات وفلاح) حاصل کر سکتا ہے اس لیے اسلام ان لوگوں کے بارے میں جو یہ وسائل اختیار کرتے ہیں فرماتا ہے

أُولَٰئِكَ عَلَىٰ هُدًى مِّن رَّبِّهِمْ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ (بقرہ 5:2)

یہی لوگ اپنے رب کی طرف سے ہدایت پر ہیں اور یہی فلاح (نجات) پانے والے ہیں۔

پس اسلام نے نجات (فلاح) پانے کے لیے وہ اصول مقرر کیے ہیں۔ جو کسی مذہب میں نہیں پائے جاتے۔

ایک عرض یہ بھی کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ اسلام جہاں فلاح (نجات) کے وسائل بیان کرتا ہے وہاں یہ بھی تعلیم دیتا ہے کہ ہر دور میں نجات دہندہ (انبیاء علیہم السلام) آئے۔ انہوں نے لوگوں کو راہ نجات پر چلایا۔ وہ لوگ نجات یافتہ ہو گئے۔ نجات صرف ایک ہی مذہب کے ساتھ وابستہ نہیں بلکہ ہر مذہب کا بانی راہ نجات دینے کے لیے مبعوث ہوا۔ یہ وہ نظریہ ہے جو کسی مذہب نے بیان نہیں کیا۔ گویا نجات صرف ایک مذہب کے ساتھ وابستہ نہیں اس لیے قرآن مجید میں یہ آیا ہے۔

وَلِكُلِّ أُمَّةٍ رَّسُولٌ (یونس 47:10)

یعنی ہر امت کے لیے رسول بھیجا گیا۔

دوسری جگہ آتا ہے۔

إِن مِّنْ أُمَّةٍ إِلَّا خَلَا فِيهَا نَذِيرٌ (فاطر 24:35)

ہر امت میں ڈرانے والا گزر چکا ہے۔

جب تک وہ لوگ اپنے نبی کی تعلیم پر عمل پیرا رہے وہ نجات یافتہ ہوئے۔ یہ وہ نظریہ ہے جو کسی مذہب نے پیش نہیں کیا بلکہ نجات کا خود ہی ٹھیکہ دار بن گیا ہے۔

عیسائیوں کی تاریخ بتاتی ہے کہ ابتدائی دو صدیوں میں تزکیہ نفس اور اخلاقی پاکیزگی نجات اخروی کے لیے لازمی شرط تھی اور جس شخص سے کوئی برا عمل سرزد ہو جاتا تو اس کو گرجا جانے سے روک دیا جاتا اور ایک مقرر وقت تک جو گناہ کی نوعیت اور کیفیت کے مطابق مقرر کیا جاتا۔ گناہگار کو اپنی بیوی کے پاس جانا، اچھا لباس پہننا، اچھا کھانا کھانا غرض کہ جمیع لذات دنیاوی کو اپنے لیے حرام قرار دے لیتا۔ سخت سے سخت ریاضتیں اختیار کی جاتیں اور میعاد کے آخری دن اسے تمام مسیحیوں کے ساتھ سر منڈائے۔ چہرہ پر خاک ڈالے جسم کو بورے سے ڈھانپے ہوئے پادری کے پاس حاضر ہونا پڑتا ہے اور پادری کے قدموں میں اپنے آپ کو گرا دیتا اور پکار پکار کر اپنے گناہ کا اقرار کرتا تھا۔ صرف یہی نہیں بلکہ تمام عیسائی برادری اس سے معاشرتی مقاطعہ کر لیتی اور اس سے رشتہ تعلقات توڑ لیتی وہ اکیلا اور تنہا ذہنی کلفت میں دن بسر کرتا۔ یہ ہے گناہوں کو معاف کرانے کا طریقہ عیسائیت میں لیکن اسلام کہتا ہے کہ وہ گناہگار جس نے اپنے نفس پر ظلم کیا ہے۔ وہ خدا کی طرف رجوع کرے۔ اس کے آستانہ پر گر کر تضرع وخشوع سے توبہ کرے اللہ معاف کر دے گا۔ ارشاد الٰہی ہے۔

قُلْ يَا عِبَادِيَ الَّذِينَ أَسْرَفُوا عَلَىٰ أَنفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوا مِن رَّحْمَةِ اللَّهِ إِنَّ اللَّهَ يَغْفِرُ الذُّنُوبَ جَمِيعًا إِنَّهُ هُوَ الْغَفُورُ الرَّحِيمُ (زمر 53:39)

کہہ دے اے میرے بندو! جنہوں نے اپنی جانوں پر ظلم کیا ہے اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہو اللہ سبھی گناہ معاف کر دیتا ہے ہاں وہ بخشنے والا رحم والا ہے۔

اسی طرح عیسائیوں نے اپنی نجات کا ذریعہ کفارہ قرار دے دیا ہے کہ حضرت یسوع مسیح ان کے گناہوں کا بوجھ اٹھا کر مصلوب ہوئے ہیں۔ اے معترض! کیا عقل سلیم یہ تسلیم کرتی ہے کہ ایک بے گناہ دوسروں کے گناہوں کا بوجھ اٹھا کر صلیب پر چڑھ جائے تو صلیب پر ایمان لانے والوں کے گناہ معاف ہو جاتے ہیں کیا یہ طریقہ مزید برائیوں کی طرف رغبت نہیں دلاتا کہ گناہ تو کفارہ کی وجہ سے بخشے ہی جانے ہیں دل کھول کر گناہوں کا ارتکاب کر لیں۔

قارئین اسلام کے بیان کردہ وسائل نجات اور عیسائیوں کا طریقہ نجات کا عقلی لحاظ سے موازنہ کیجیے تو واضح ہو جائے گا۔ اسلام کی تعلیم وہ تعلیم ہے جس کے ذریعے سے نجات حاصل ہو سکتی ہے۔

معترض نے دنیاوی مذہب کیوں قرار دیا؟

معترض نے اسلام کو ایک دنیاوی مذہب قرار دیا ہے۔ یہ دین اسلام کو کلی طور پر نہ جاننے کی وجہ سے کیا ہے معترض کے نزدیک مذہب صرف چند عقائد اور عبادت کا مجموعہ ہے۔ چونکہ اسلام میں زندگی کے ہر شعبہ کے متعلق ہدایت پائی جاتی ہے۔ خواہ معاشرت کا ہو۔ خواہ ریاست کا ہو خواہ اقتصادیات کا ہو کوئی ایسا پہلو نہیں جس کے متعلق اسلام نے واضح ہدایت نہ دی ہو پھر رسول کریم ﷺ حکمران بھی رہے۔ لڑائیاں بھی لڑیں فتوحات بھی حاصل کیں۔ چونکہ یہ پہلو دنیاوی امور سے تعلق رکھتے ہیں اس لیے معترض نے اسلام کو ایک دنیاوی مذہب قرار دے دیا یہی تو اسلام کی جامعیت اور ہمہ گیری ہے۔ کہ اس نے زندگی کے ہر پہلو کے متعلق ہدایت دی ہے اسی کا نام اکملیت ہے یہی اسلام کی خوبی ہے اسی لیے مفکرین کی یہ رائے ہے کہ دنیا میں صرف ایک ہی مذہب ہے وہ ہے اسلام جو دنیا کے تمام مسائل کو حل کر سکتا ہے اسلام نے نجات کس طرح دلائی؟

اسلام کے نزدیک نجات کا مسئلہ صرف آخرت سے ہی تعلق نہیں رکھتا بلکہ نجات کا تعلق اس دنیا سے بھی ہے جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم دنیا میں مبعوث ہوئے تو ارض و بحر فساد و بگاڑ سے پُر تھے۔ لوگ شرک میں مبتلا تھے۔ اور بدی کے ارتکاب پر فخر کرتے تھے۔ دنیا میں طبقاتی تقسیم پائی جاتی تھی۔ حقوق انسانی پامال ہو رہے تھے غلامی کا عام رواج تھا۔ عورتیں جنسی ہوس کی تسکین کا آلہ سمجھی جاتی تھیں بچیوں کو زندہ درگور کر دیا جاتا تھا۔ بعثت کے وقت عرب کی ابتر حالت تاریخوں درج ہے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک عظیم انقلاب برپا کیا۔ لوگ شرک کو چھوڑ کر موحد بن گئے۔ بدی میں لذت لینے والے آستانہ الوہیت پر کر گئے۔ حقوق انسانی پامال کرنے والے محافظ حقوق انسانی بن گئے۔ قتل و غارت کے عادی امن پسند ہو گئے۔ عورتوں کو جنسی ہوس کی تسکین کا آلہ سمجھنے والے ان کو گھر کی مالکہ سمجھنے لگے۔ اپنی شہرت پر خرچ کرنے والے اللہ کی راہ میں خرچ کرنے لگے۔ غرباء و مساکین محتاجوں کے مکفل بن گئے۔ یہ ہے نجات کا نظارہ جو رسول کریم ﷺ کے ذریعے دنیا میں رونما ہوا ہے۔ اسلام کے نزدیک نجات کا آغاز اس دنیا سے ہوتا ہے اور آخرت میں اس کی تکمیل ہوتی ہے یہ ہے اسلام میں نجات کا تصور۔ کیا دنیا میں کوئی مذہب ہے جو اس نجات کا منبع ہو۔ اگر یہ کہا جائے کہ دنیا میں صرف اسلام ہی ایک ایسا مذہب ہے جو انسانوں کو نجات دیتا ہے تو بالکل یہ حق ہوگا۔

قرآن مجید میں نجات یافتہ لوگوں کا ذکر ملتا ہے۔

ارشاد الٰہی ہے۔

وَعِبَادُ الرَّحْمٰنِ الَّذِيْنَ يَمْشُوْنَ عَلَى الْاَرْضِ هَوْنًا وَّاِذَا خَاطَبَهُمُ الْجَاهِلُوْنَ قَالُوْا سَلَامًا وَالَّذِيْنَ يَبِيْتُوْنَ لِرَبِّهِمْ سُجَّدًا وَّقِيَامًا۔ (الفرقان 25:63,64)

وَالَّذِيْنَ اِذَا اَنْفَقُوْا لَمْ يُسْرِفُوْا وَلَمْ يَقْتُرُوْا وَكَانَ بَيْنَ ذَالِكَ قَوَامًا وَالَّذِيْنَ لَا يَدْعُوْنَ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ وَلَا يَقْتُلُوْنَ النَّفْسَ الَّتِيْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ وَلَا يَزْنُوْنَ (الفرقان 25:67,68)

اور وہ اللہ کے بندے جو زمین پر نرمی اور انکساری سے چلتے ہیں اور جب جاہل ان کو مخاطب ہوں تو کہہ دیتے ہیں سلام اور وہ لوگ سجدہ قیام سے اپنے رب کے سامنے رات گزارتے ہیں۔

اور جب یہ لوگ خرچ کرتے ہیں تو نہ اسراف سے کام لیتے ہیں اور نہ بخل سے۔اس کے درمیان میانہ روی اختیار کرتے ہیں اور وہ لوگ اللہ کے سوا کسی کو نہیں پکارتے اور کسی جان کو جسے اللہ نے حرام قرار دیا ہے قتل نہیں کرتے سوائے اس کے کہ انصاف چاہے اور نہ زنا کرتے ہیں۔

پھر فرمایا:

وَالَّذِيْنَ لَا يَشْهَدُوْنَ الزُّوْرَ وَاِذَا مَرُّوْا بِاللَّغْوِ مَرُّوْا كِرَامًا (الفرقان 25:72)

یعنی وہ جھوٹی گواہی نہیں دیتے اور جب کسی لغو اور بیہودہ بات سے گزرتے ہیں تو شرافت سے گزر جاتے ہیں۔(بیہودہ بات کی طرف توجہ ہی نہیں کرتے)

یہ ہے ان بدیوں میں ڈوبے ہوئے لوگوں کی بدلی ہوئی حالت کا نقشہ جو قرآن میں کھینچا گیا ہے۔یہ ہے بدیوں میں مبتلا لوگوں کی نجات جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی قوت قدسیہ کے ذریعے رونما ہوئی۔کوئی ہے ایسا مذہب جس نے یہ عظیم انقلاب برپا کیا ہو۔پستی اور ذلت میں گرے ہوئے لوگوں کو بام عروج تک پہنچا دیا ہو۔گناہوں میں لذت محسوس کرنے والوں کو باخدا بنایا ہو اور وہ خدا سے ہم کلام ہوئے۔ایک مسلمان گناہوں سے نجات حاصل کر کے روحانی ترقی کی انتہا تک پہنچتا ہے روحانی ترقی کی انتہا دیدار الٰہی ہے۔لقا الٰہی ہے۔خدا سے ہم کلامی ہے یہی وہ معراج ہے جہاں اسلام اپنے بندے کو لے جانا چاہتا ہے اے صرف کفارہ پر تکیہ کرنے والو! اسلام کی طرف آؤ۔یہی راہ فلاح ہے یہی حقیقی روحانی معراج تک پہنچاتا ہے۔

......☆......

پستی اور اسلام

(کیا پستی کا ذمہ دار اسلام ہے؟)

اعتراض: مسلمانوں کی پستی کا ذمہ دار اسلام ہے۔(متعدد)

جواب: یہ وہ اعتراض ہے جو ہر مخالف اور مستشرق اسلام پر کرتا ہے۔اس کا مختصر جواب تو یہ ہے کہ اسلام وہ تحریک ہے جو انسانوں کو راہ راست پر چلا کر بام عروج تک پہنچانے والی ہے اور اس کے لیے اصول اور قانون بھی مقرر کیے ہیں۔ان اصولوں پر گامزن ہو کر مسلمانوں نے روحانی اور مادی ترقی کی۔کوئی مؤرخ اس ترقی کو جھٹلا نہیں سکتا۔اگر کوئی قوم ان اصولوں کو چھوڑ دے اور پستی کی اتھاہ گہرائیوں میں گر جائے تو اسلام کے ان وضع کردہ اصولوں کا کیا قصور۔یہ تو قصور اس قوم کا ہے کہ جس نے ترقی کے اصولوں کو چھوڑ دیا ہے۔چونکہ یہ اعتراض متعدد مستشرقین اور مخالفین نے کیا ہے اس لیے اس پر مفصل بحث کرنا ضروری ہے۔

قرآن......قوم کی ترقی کے اسباب:

اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید کو روح کہا ہے۔جیسا کہ قرآن مجید میں آتا ہے۔

وَكَذٰلِكَ اَوْحَيْنَا اِلَيْكَ رُوْحًا مِّنْ اَمْرِنَا۔ (الشوریٰ 52:42)

اور اس طرح ہم نے تیری طرف اپنے حکم سے روح (قرآن) وحی کیا قرآن مجید کو اس وجہ سے روح کہا ہے کہ یہ شخصی اور قومی ترقی اور زندگی کا باعث ہے دیکھنا یہ ہے کہ قرآن مجید کسی قوم کو زندہ رہنے اور ترقی کے لیے کیا اصول مقرر کرتا ہے۔

پہلا اصول (اتحاد و اتفاق):

قوم کی ترقی کے لیے اتحاد اور اتفاق اور یکجہتی بنیادی شرط ہے اسی وجہ سے قرآن مجید نے اتحاد پر بہت زور دیا ہے۔

قرآن مجید میں آتا ہے۔

وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّ لَا تَفَرَّقُوْا (آل عمران 102:3)

اور سب کے سب اللہ کی رسی کو تھامے رکھو اور تفرقہ نہ کرو۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

اَلْمُسْلِمُ لِلْمُسْلِمِ كَالْبُنْيَانِ الْمَرْصُوْصِ يَشُدُّ بَعْضُهٗ بَعْضًا

کہ ایک مسلم دوسرے مسلم کے لیے ایک چونا گچ عمارت کی طرح ہے جس طرح اس کی ایک اینٹ دوسری اینٹ کے لیے مضبوطی کا باعث ہوتی ہے اسی طرح ایک مسلمان دوسرے مسلمان کے لیے مضبوطی کا باعث ہے۔

دوسرا اصول (اطاعت امیر):

امیر کی اطاعت قوم کی ترقی کے لیے نہایت ضروری امر ہے۔قرآن مجید میں آتا ہے۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِى الْاَمْرِ مِنْكُمْ فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِىْ شَىْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ (النساء 59:4)

اے لوگو! جو ایمان لائے ہو اللہ کی اطاعت کرو اور رسول کی اطاعت کرو اور اپنے میں سے اولوالامر (حاکم) کی اطاعت کرو۔اگر تمہارا کسی امر پر (حاکم سے) اختلاف ہو جائے تو اس کو اللہ اور اس کے رسول کی طرف لوٹا دو۔(اللہ اور اس کے رسول کی تعلیم کے مطابق فیصلہ کرلو۔)

اس آیت میں اللہ اور رسول کی اطاعت کے ساتھ اولوالامر (حاکم) کی اطاعت کو بھی واجب قرار دیا ہے ہاں اگر امیر کے ساتھ کسی معاملہ میں اختلاف ہو جائے تو اختلاف کو رفع کرنے کے لیے اللہ اور اس کے رسول کی تعلیم کسوٹی ہونی چاہیے۔

بخاری میں آتا ہے۔

اِسْمَعُوْا اَطِيْعُوْا وَاِنْ اسْتُعْمِلَ حَبْشِيٌّ كَاَنَّ رَاْسَهٗ زَبِيْبَةٌ (بخاری 54:10)

سنو اور اطاعت کرو اگرچہ ایک حبشی حاکم بنایا گیا ہے جس کا سر گویا کشمش کا دانہ ہے۔

پھر فرمایا:

اَلسَّمْعُ وَالطَّاعَةُ حَقٌّ مَالَمْ يُؤْمَرْ بِالْمَعْصِيَةِ فَاِذَا اُمِرَ بِمَعْصِيَةٍ فَلَا سَمْعَ وَلَا طَاعَةَ (بخاری 108:56)

سننا اور فرمانبرداری کرنا ضروری ہے جب اللہ کی نافرمانی کا حکم دیا جائے تو نہ سننا ہے اور نہ فرمانبرداری کرنا ہے اس حدیث میں اطاعت حاکم کی شرط عائد کردی ہے۔ اگر اللہ اور اس کے رسول کی ہدایت کے خلاف کوئی حکم دے تو پھر حاکم کی اطاعت ضروری نہیں۔

تیسرا اصول (اصلاح نفس):

افراد کی اصلاح ہی قوموں کی ترقی کا بنیادی پتھر ہے۔ قرآن مجید میں آتا ہے۔

يَاۤ اَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا عَلَيْكُمْ اَنْفُسَكُمْ (المائدہ 105:5)

اے لوگو جو ایمان لائے ہو تم اپنے نفسوں کی اصلاح کی فکر کرو۔

عرب کی تاریخ ہمارے سامنے ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے قبل عرب قوم ہر قسم کی برائی میں مبتلا تھی جب آپ ﷺ نے اس گری ہوئی قوم کو برائی سے نکال کر نیکی کے راستہ پر چلایا تو وہ قوم پستی سے نکل کر ترقی کی منازل طے کرنے لگی۔

آج تمام مفکر اس بات پر متفق ہیں کہ ترقی کا دارومدار افراد کی اصلاح پر ہے۔

ڈاکٹر لیبان کہتا ہے۔ ''ہر قوم میں انقلاب و تغیرات صرف اخلاق کے ذریعے ہوئے ہیں اور وہی ان کے مستقبل کا سنگ بنیاد رکھتے ہیں...... قومی زندگی کی بنیاد صرف اخلاق کے ستون پر قائم ہے عقل اور دماغ کا حصہ ان میں بہت کم ہے...... جب کسی قوم کا شیرازہ اخلاق درہم برہم ہوجاتا ہے تو وہ مرجاتی ہے اور اخلاقی اوصاف میں اسی قدر تنزل ہوتا ہے جس قدر قوم عقل اور دماغ میں ترقی کرتی ہے...... جماعت انسانی کا نظام، مذہب کی بنیاد، سلطنتوں کا معیار صرف اخلاق کی سطح پر قائم ہے عقل کو اس میں کوئی دخل نہیں ہے...... عقلی انقلابات میں ذہانت دوسرے درجہ کا انقلاب ہے۔ اصلی سنگ بنیاد صرف اخلاق ہے لیکن وہ کارخانوں اور کتابوں کے اوراق سے نہیں ملتا۔ بلکہ اس کی تحصیل کے لیے دفتر کے دفتر الٹنا پڑتے ہیں اور مختلف قوموں سے واقفیت حاصل کرنا ہوتی ہے۔

پھر ڈاکٹر صاحب نے اپنے دعویٰ کے ثبوت میں مختلف قوموں کی مثالیں پیش کی ہیں مثلاً رومن قوم اپنے تنزل وانحطاط کے زمانہ میں عقلی حیثیت سے اپنے اباؤ اجداد کی نسبت زیادہ طاقتور تھی۔ تاہم چونکہ اپنی آبائی وراثت اقوام عزم، شجاعت، جانبازی غرض ان تمام اوصاف کو جن کے ذریعے ان کے اباؤ اجداد نے ترقی کی وہ کھو چکی تھی اس لیے بالآخر تنزل کے غار میں گر گئی۔

ہندوستان کے تیس کروڑ باشندوں کو ساٹھ ہزار انگریزوں نے محض اخلاق کی استواری کی بناء پر غلام بنالیا۔ حالانکہ عقلی حیثیت سے ہندوستان میں بہت سے لوگ ہیں جو انگریزوں کے دوش بدوش کھڑے ہوسکتے ہیں بلکہ بعض کو فلسفیانہ مباحث میں ان پر ترجیح دی جاسکتی ہے۔ (انقلاب امم ص 9-83,54,52)

علامہ ابن خلدون کہتا ہے۔ ''قوموں کی ترقی نہ مادی طاقت کی فراوانی سے ہوتی ہے اور نہ صرف عقل اور دماغ کی ترقی سے بلکہ اس کے لیے قومی عصبیت اور اخلاق کی ضرورت ہے۔ (مقدمہ ابن خلدون)

قرآن مجید میں آتا ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ (الرعد 11:13)

اللہ کسی قوم کی حالت کو نہیں بدلتا جب تک کہ وہ اپنی حالت کو (نہ بدلیں)

چوتھا اصول انفاق فی سبیل اللہ (اللہ کی راہ میں خرچ کرنا):

قرآن مجید نے خرچ کرنے پر بہت زور دیا ہے قرآن مجید میں آتا ہے۔

وَيُقِيمُونَ الصَّلٰوةَ وَ مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنفِقُونَ (بقرہ 3:2)

(مومن وہ ہیں) جو نماز قائم کرتے ہیں اور جو کچھ ہم نے ان کو دیا ہے اس میں سے خرچ کرتے ہیں۔

اللہ کی راہ میں خرچ کرنے سے دولت قوم میں کثرت سے گردش کرتی ہے جس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ گردش دولت کی وجہ سے ہر آدمی فائدہ حاصل کرتا ہے قرآن نے انفاق مال کو بیج بونے سے تشبیہ دی ہے جس سے ایک دام سے سات سو دانے بنتے ہیں بلکہ اس سے دوگنا اور کئی گنا زیادہ یہاں تک کہ بغیر حساب رزق بھی اسی انفاق کا نتیجہ ہے قرآن مجید میں آتا ہے۔

مَثَلُ الَّذِينَ يُنفِقُونَ أَمْوَالَهُمْ فِي سَبِيلِ اللّٰهِ كَمَثَلِ حَبَّةٍ أَنۢبَتَتْ سَبْعَ سَنَابِلَ فِي كُلِّ سُنۢبُلَةٍ مِّائَةُ حَبَّةٍ وَاللّٰهُ يُضٰعِفُ لِمَن يَشَاءُ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيمٌ (البقرہ 261:2)

ان لوگوں کی مثال جو اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں ایک دانہ کی مثال ہے جو سات بالیں اگائے ہر ایک بالی میں سو دانے ہوں اور اللہ جس کے لیے چاہتا ہے کئی گنا کر کے دیتا ہے اور اللہ بہت دینے والا جاننے والا ہے۔

قرآن مجید میں اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کو قوم کی ترقی کا ذریعہ بیان کیا گیا ہے۔ سورہ بقرہ میں حضرت حزقیل کا ایک رویاء بیان ہوا ہے کہ وہ ایک تباہ حال بستی (یروشلم) پر سے گزرے اس کو دیکھ کر حضرت حزقیل نے اللہ تعالیٰ سے کہا کہ یہ بستی کب آباد ہوگی۔ کب اس کے رہنے والے ترقی کریں گے اللہ تعالیٰ نے ان کو رویاء میں بتایا کہ یہ بستی سو سال کے بعد آباد ہوگی۔ اس رکوع میں حضرت ابراہیم علیہ السلام اللہ تعالیٰ سے احیاء موتی کی کیفیت کا سوال کرتے ہیں اس رکوع کے بعد انفاق فی سبیل اللہ کا ذکر آتا ہے تباہ حال بستی اور احیاء موتی کا ذکر کے معاً بعد اللہ کی راہ میں خرچ کا بیان یہ ظاہر کرتا ہے کہ انفاق فی سبیل اللہ کا تباہ حال بستی کی آبادی اور احیاء موتی کے ساتھ گہرا تعلق ہے۔

تاریخ اس بات پر شہادت دیتی ہے کہ وہی قوم دنیا کے نقشہ پر ترقی کے ساتھ ابھرتی ہے جو قومی، ملّی مفاد کی خاطر خرچ کرنا جانتی ہے آغاز اسلام میں مسلمان کم پرسی اور غربت کی حالت میں تھے انہوں نے اس حالت میں بھی ملّی اور قومی مفاد کے لیے خرچ کرنے سے دریغ نہیں کیا۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کسی ملّی ضرورت کے لیے چندہ کی اپیل کرتے تو صحابہ اپنے گھروں کا اثاثہ لا کر پیش کر دیتے تھے اگر کسی کے پاس کچھ نہیں تو وہ مزدوری کر کے چند ٹکے کما کر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش کر دیتا تھا آخر اس مالی قربانی کے نتیجہ یہ مسلمان اللہ کے فضلوں کے وارث بنے اور بڑی بڑی حکومتیں ان کے قدموں میں آ گریں۔

پانچواں اصول علم:

علم وہ نور ہے جس کے ذریعے ترقی کے راستے روشن ہوتے ہیں اسی وجہ سے قرآن مجید کے اوراق علم و حکمت کے حصول کی ترغیب میں بھرے ہوئے ہیں ارشاد الٰہی ہے۔

قُلْ هَلْ يَسْتَوِي الَّذِينَ يَعْلَمُونَ وَالَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ (الزمر 9:39)

کہہ کیا جاننے والے اور نہ جاننے والے برابر ہیں۔

يَرْفَعِ اللّٰهُ الَّذِينَ آمَنُوا مِنكُمْ وَالَّذِينَ أُوتُوا الْعِلْمَ دَرَجَاتٍ (المجادلہ 11:58)

اللہ ان لوگوں کے درجات بلند کرتا ہے (ترقی دیتا ہے) جو تم میں سے ایمان لائے اور وہ جنہیں علم دیا گیا۔

رَّبِّ زِدْنِي عِلْمًا (طٰہٰ 114:20)

اے میرے رب میرے علم کو بڑھا

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں۔

طَلَبُ الْعِلْمِ فَرِيْضَةٌ عَلٰى كُلِّ مُسْلِمٍ (مشکوٰۃ 2 بروایت بیہقی)

علم کا حاصل کرنا ہر مسلمان پر فرض ہے۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر پہلی پانچ آیات نازل ہوئی تھیں وہ علم کے متعلق تھیں۔ رسول کریم ﷺ نے صحابہ کو حصول علم کی طرف ترغیب دی۔

قوموں کی تاریخ یہ بتاتی ہے جن قوموں نے اپنے دامن کو علم کے جواہر پاروں سے بھرے وہی دنیا میں ابھریں مسلمانوں کی ترقی کا راز بھی اسی میں پنہاں ہے۔

علم سے مراد صرف دینی علم مراد نہیں بلکہ علم کی تمام شاخیں مراد ہیں۔

چھٹا اصول عمل اور جدوجہد:

اگر اقوام کے عروج وزوال کی تاریخ کا مطالعہ کیا جائے تو یہ معلوم ہوگا کہ عمل، جدوجہد اور سعی بلیغ سے ہی کسی قوم میں زندگی کے آثار پیدا ہوتے ہیں، غفلت، سستی اور کاہلی کی وجہ سے ان پر موت طاری ہوئی ہے اسی لیے اسلام نے مسلمانوں کو سعی بلیغ کی ترغیب دی ہے محنت اور جدوجہد کو عزت کا موجب قرار دیا ہے۔ قرآن مجید میں آتا ہے۔

وَاَنْ لَّيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى وَاَنَّ سَعْيَهٗ سَوْفَ يُرٰى ثُمَّ يُجْزٰهُ الْجَزَآءَ الْاَوْفٰى (النجم 53:39-41)

اور کہ انسان کے لیے کچھ نہیں مگر وہی جو وہ کوشش کرتا ہے اور اس کی کوشش دیکھی جائے گی پھر اسے پورا پورا بدلہ دیا جائے گا۔

وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا (العنکبوت 29:69)

اور جو لوگ ہمارے لیے محنت اٹھاتے ہیں ہم یقیناً انہیں اپنے راستوں پر چلائیں گے۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام کو جدوجہد اور محنت کی تعلیم دی۔ بخاری کی روایت ہے اگر تم میں سے ایک شخص ایک رسہ لے اور ایندھن کا ایک گٹھا اپنی پیٹھ پر اٹھا کر لے آئے اور پھر اسے فروخت کر دے جس سے اللہ اس کی عزت بچائے تو یہ اس کے لیے بہتر ہے بہ نسبت اس کے کہ لوگوں سے سوال کرتا پھرے پھر اسے دیں نہ دیں۔ (بخاری 24:50)

ساتواں اصول استقامت وصبر:

استقامت یہ ہے کہ اگر انسان یا قوم ہر قسم کے مصائب اور تکالیف میں گھر جائے۔ کوئی بھی مونس اور معاون نہ ہو اس حالت میں بھی بے چارگی کا اظہار نہ کرے۔ اس وجہ سے اسلام نے استقامت اور صبر کی بہت تلقین کی ہے۔ استقامت اور صبر سے ہی ترقی کے راستے وا ہوتے ہیں ارشاد الٰہی ہے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا تَتَنَزَّلُ عَلَيْهِمُ الْمَلٰٓئِكَةُ

بے شک وہ لوگ جنہوں نے کہا ہمارا رب اللہ ہے پھر استقامت اختیار کی ان پر فرشتے نازل ہوں گے۔

استقامت کے وقت فرشتوں کا نزل اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اللہ تعالیٰ مدد کرتا ہے اور کامیابی اور ترقی کے راستے کھول دیتا ہے جیسا کہ یہ الفاظ ظاہر کرتے ہیں۔ وَاَبْشِرُوْا بِالْجَنَّةِ (جنت کی بشارت پاؤ) جنت کامیابی کی علامت ہے۔ یعنی جب کوئی شخص یا قوم استقامت کا ثبوت دیتی ہے وہ کامیابی اور ترقی پالیتی ہے۔

صبر کے متعلق ارشاد الٰہی ہے۔

اِسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ (بقرہ 45:2)

صبر اور نماز سے مدد حاصل کرو اسلام کے نزدیک استقامت اور صبر ترقی کی کلید ہے اور وہی قومیں ترقی کے راستہ پر گامزن ہوتی ہیں جو استقامت اور صبر کے زیور سے آراستہ ہوتی ہیں۔

آٹھواں اصول اسامیوں پر اہل افراد کی تقرری:

کلیدی اسامیوں پر افراد کی تقرری صلاحیت کی وجہ سے ہونی چاہیے نہ کہ خاندانی اور ذاتی مفاد کی خاطر جب بھی اہم عہدوں پر نااہل آجاتے ہیں تو وہ قوم کی تباہی کے باعث بنتے ہیں قرآن مجید میں آتا ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰٓى اَهْلِهَا (النساء 58:4)

اللہ تمہیں حکم دیتا ہے کہ امانتیں ان کے اہل کو ادا کرو۔

نواں اصول مشاورت:

اسلام نے سلطنت کی بقا اور ترقی مشاورت اور جمہوریت کے ساتھ وابستہ قرار دی ہے۔ جب حکومتی معاملات میں عوام کی شرکت ہوگی تو وہ سلطنت کبھی تنزل کی طرف نہیں جائے گی۔ یہ وہ اصول ہے جس کی ہدایت سب سے پہلے اسلام نے دی تھی۔ اسلام سے قبل بادشاہت تھی۔ اور بادشاہ کا ہی حکم جاری وساری ہوتا تھا۔ اسلام نے طرز حکومت ہی بدل دیا اور مشاورت کا حکم دیا۔ ارشاد الٰہی ہے۔

وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ (الشوریٰ 38:42)

اور ان کا حکم آپس میں مشورہ سے ہوتا ہے۔

دوسری جگہ آتا ہے۔

شَاوِرْهُمْ فِى الْاَمْرِ (عمران 158:3)

(حکومتی) کام میں ان کا مشورہ لیتے رہو۔

دسواں اصول (عدل وانصاف):

کوئی معاشرہ اور کوئی حکومت عدل وانصاف کے بغیر قائم نہیں رہ سکتا۔ اسلام نے عدل وانصاف پر بہت زور دیا ہے۔ ارشاد الٰہی ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ وَاِيْتَآئِ ذِى الْقُرْبٰى (النحل 90:16)

اللہ عدل اور احسان اور قریبیوں کو دینے کا حکم دیتا ہے۔

وَاِنْ حَكَمْتَ فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِالْقِسْطِ (مائدہ 43:5)

اگر تو فیصلہ کرے تو ان کے درمیان انصاف سے فیصلہ کر۔

وَاِذَا حَكَمْتُمْ بَيْنَ النَّاسِ اَنْ تَحْكُمُوْا بِالْعَدْلِ (النساء 58:45)

جب لوگوں میں فیصلہ کرو تو انصاف سے قائم کرو۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں۔

اُمِرْتُ لِاَعْدِلَ بَيْنَكُمْ

مجھے یہ حکم دیا گیا کہ میں تمہارے درمیان عدل سے فیصلہ کروں۔

یہ وہ دس اصول ہیں جو قوموں کی ترقی کا ذریعہ ہیں مسلمانوں نے انہی اصولوں پر عمل کر کے ترقی کی اور زندگی کے ہر شعبہ میں آگے بڑھتے چلے گئے جب انہوں نے ان اصولوں کو چھوڑ دیا تو وہ پستی میں جا گرے۔

اعتراض کا جواب تشنہ رہے گا۔ جب تک یہ نہ بیان کیا جائے کہ مسلمانوں نے کن کن شعبوں میں ترقی کی اور کارہائے نمایاں دکھائے۔

روحانی ترقی:

جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے دعویٰ نبوت کیا تو اس وقت عرب برائیوں کی وجہ سے روحانی اخلاقی اور معاشرتی لحاظ سے مردہ تھے۔ زنا استبضاع، شراب خوری، قمار بازی، قتل و غارت، غصب و نہب، لڑکیوں کو زندہ در گور کرنا، ماؤں کا باپ کی وفات کے بعد اولاد کی وراثت میں آنا، انتشار و افتراق، جھوٹ فریب دغا، حرص و طمع، شہرت کے لیے اسراف دولت، غرض کہ کوئی ایسی برائی نہیں تھی جو ان عربوں میں پائی نہ جاتی تھی۔ جب یہی بگڑے ہوئے لوگ اتباع رسول میں آتے ہیں ان کی حالت ہی بدل جاتی ہے۔ وہی برائیوں میں لذت محسوس کرنے والے تاریک شب میں اٹھ کر آستانہ الوہیت پر گر جاتے ہیں اور خدا کے قرب کی راہیں پاتے ہیں اور خدا کی عبادت میں لذت اور سرور پاتے ہیں ہر دم خدا کی یاد میں رہتے ہیں دنیا میں رہتے ہوئے انقطاع عن الدنیا ہو گئے ہر لمحہ دل و دماغ متوجہ الی اللہ تھا۔ یہی بداعمال عرب باادب پھر بااخلاق ہوئے پھر باخدا بن گئے۔ خدا سے ہم کلام ہونے لگے۔ معاشرتی لحاظ سے صحرا کی ریت کی طرح منتشر تھے۔ وہی اتحاد کی لڑی میں منسلک ہو گئے۔ قتل و غارت کرنے والے ایک دوسرے کے مونس اور ہمدرد بن گئے۔ ناتواں، ضعیفوں، بوڑھوں کے ملجا و ماویٰ بن گئے۔ عورتوں کو آلہ جنسی ہوس سمجھنے والے ان کے رکھوالے بن گئے اور وہی ذلیل سمجھی جانے والی عورت گھر کی مالکہ بن گئی بچیوں کی تربیت کو کار ثواب سمجھنے لگے۔ غلامی کے بندھن ٹوٹ گئے یہ ہے وہ روحانی انقلاب جو اسلام نے برپا کیا۔ دنیا کی تاریخ میں اس سے بڑھ کر روحانی انقلاب دیکھنے میں نہیں آیا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم کو لڑائی کے لیے کہا۔ تو قوم نے کہا تو اور تیرا رب جائے لڑائی لڑے ہم تو لڑائی کے لیے نہیں نکلیں گے۔ کوہ طور پر جاتے ہیں پیچھے وہی قوم بچھڑے کی پرستش میں مبتلا ہو گئی۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے اپنے ہی حواری نے چند کوڑیوں کے بدلے اپنے مرشد کو یہودیوں کے ہاتھ اسیر کرا دیا اور منہ پر تھوکا بھی۔ سب حواری اپنے مرشد کو چھوڑ کر بھاگ گئے۔

معترض بنی اسرائیل کے نبیوں کی زندگی کا مطالعہ کرے پھر دیکھے ان نبیوں نے اپنے متبعین کی زندگیوں میں کیا روحانی انقلاب برپا کیا۔ پھر رسول کریم ﷺ کی زندگی کا مطالعہ کرے پھر دیکھے آپ نے اپنے متبعین کی زندگیوں میں کیا روحانی انقلاب برپا کیا۔ تو معترض کو خود معلوم ہو جائے گا صرف اسلام ہی ایک ایسا دین ہے جس نے آغاز میں لوگوں کو روحانی ترقی کے راستہ پر چلایا اور منزل مقصود تک پہنچایا اور ہر دور میں اسلام کے اصولوں پر چلنے والے روحانی مدارج حاصل کرتے ہیں۔ وہ صرف چند نہیں بلکہ ان گنت لوگ ہیں جو روحانی معراج اور روحانی منازل حاصل کرتے ہیں کوئی مذہب نہیں جو اپنے ماننے والے کو روحانی معراج تک پہنچا دے۔

دنیوی برکات:

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس وقت کثیر امت کا دعویٰ کیا جب آپ ﷺ کے ساتھ چند آدمی تھے وہ ایک حجرہ میں سما سکتے تھے۔ انگلیوں پر گنے جا سکتے تھے جن کو چند آدمی ہلاک کر سکتے تھے ان کا مقابلہ بڑے بڑے جابر لوگوں کے ساتھ تھا اپنے ہی قبیلہ کے لوگ قتل کر دینا چاہتے تھے پھر خدا کے اذن سے مکہ چھوڑا مدینہ میں مقیم ہوئے پھر بھی دشمنوں نے تعاقب کیا آخر کار دشمنوں نے ذلت آمیز شکستوں کا سامنا کیا بظاہر آپ ﷺ کمزور ناتواں شخصیت تھے۔ آپ ﷺ اس کمزوری کے دور میں اپنی کامیابی و کامرانی کا دعویٰ کرتے تھے۔ تئیس سال کے بعد وہی کمزور اور ناتواں اور بے بس لوگ تمام عرب پر غالب آ گئے لوگ جوق در جوق، فوج در فوج دائرہ اسلام میں داخل ہوئے کیا یہ دنیاوی ترقی

نہیں پھر مسلمانوں کے قدم صرف عرب میں ہی محدود نہیں رہے۔ وہی منتشر قوم جو بیرونی دنیا میں ذلت کی نگاہ سے دیکھی جاتی تھی حکمرانی کے آداب سے نا آشنا تھی۔ وہی قومی قیصر وکسریٰ کے تختوں کی وارث بنی معمورہ ارض کا ربع ان کے قدموں کے نیچے تھا۔ جس طرف رخ کرتے فتح ان کے قدم چومتی۔ اس قسم کا انقلاب بھی اس سے پہلے کسی کی نظر سے نہیں گزرا اور نہ دیکھے گا۔ چنانچہ انسائیکلو پیڈیا بری ٹانیکا میں لفظ قرآن کی بحث کے نیچے یہ اعتراف کیا ہے ''دنیا کی تمام مذہبی شخصیتوں میں سب سے زیادہ کامیاب حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔''

علمی ترقی:

اسلام وہ دین ہے جس نے ظلمت وجہالت میں علم کی روشنی کا چراغ جلایا اور تمام دنیا کو علم کی روشنی سے اجالا کر دیا۔ کوئی شعبہ علم ایسا نہیں جس میں مسلمانوں نے کارہائے نمایاں سرانجام نہ دیئے ہوں یہ وہ موضوع ہے جس پر ضخیم کتب لکھی جا چکی ہیں اور مسلمان خراج تحسین حاصل کر چکے ہیں۔ یہاں صرف چند علم کے شعبوں کا ذکر کروں گا۔

علوم شرعیہ

علم القرأت:

اس کا آغاز عہد رسول ﷺ سے شروع ہوا تھا۔ بنوامیہ کے عہد میں القرأت ایک فن کی حیثیت اختیار کر گیا جس کے مباحث قرأت کے اختلافات، حروف کے مخارج اور دیگر محاسن ترتیل، وصل، وقف، مد، قصر، ادغام، اظہار، اخفاء، امالہ وغیرہ امور پر مشتمل ہو گئے اور کئی قرأتیں مشہور ہوئیں اس فن میں سب سے پہلے ابو منصور محمد بن احمد نے 220ھ میں کتاب تصنیف کی قاضی ابو عبیدہ قاسم بن بغدادی نحوی کی کتاب القرأت میں پچیس قرأتوں کا ذکر ہے امام ابو حاتم سہل بن محمد بن عثمان سجستانی نحوی مقری بصری نے کتاب القرأت میں پچیس قرأتوں کا ذکر کیا ہے امام ابن جریر نے کتاب الجامع میں بیس سے زیادہ قرأتیں لکھی ہیں۔

علم تفسیر:

یہ وہ علم ہے جس میں مسلمان علماء نے کمال کر دکھایا ہے ہر زبان میں اتنی شروح، تفاسیر اور تراجم ہو چکے ہیں جن کا احاطہ کرنا مشکل ہے۔ ہر صدی کی مشہور تفاسیر کا ذکر کتب میں پایا جاتا ہے۔ یہ تفسیری ادب اپنے اندر علمی خزانے لیے ہوا ہے۔ تفسیر کی چند اقسام کا ذکر کیا جاتا ہے۔

آثاری تفسیر:

اس قسم میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات اور صحابہ کرام کے آثار جمع کر دیئے گئے ہیں اس طرز پر لکھی ہوئی تفسیر، تفسیر ابن جریر ہے۔

فقہی تفسیر:

اس میں صرف ان آیات کو ایک جگہ جمع کیا ہے جن میں کوئی فقہی مسئلہ مستنبط ہوتا ہے۔ مثلاً احکام القرآن اسماعیل بن اسحاق، احکام القرآن قاضی یحییٰ بن اکثم، احکام القرآن ابو بکر رازی۔

ادبی تفسیر:

اس قسم کی تفاسیر میں قرآن مجید کا فصاحت وبلاغت کے اعتبار سے بے مثل ہونا ثابت کیا ہے سب سے پہلے جاحظ (م255ھ)

نے اس موضوع پر قلم اٹھایا عبدالقادر جرجانی (م 474ھ) اور قاضی ابوبکر باقلانی نے اعجاز القرآن کے نام پر تفسیر قرآن لکھیں۔

کلامی تفسیر:

جس میں اسلامی عقائد کو عقل کی روشنی میں لکھا گیا ہے۔ اس طرز پر سب سے عمدہ لکھی ہوئی تفسیر تفسیر کشاف مصنفہ علامہ زمخشری کی ہے۔

متصوفین کی تفسیر:

امام قشیری کی تفسیر تصوف کے طریقہ پر لکھی گئی ہے۔ اس قسم میں صرف قرآن مجید کی روح اور مقاصد کو سامنے رکھ کر آیات کی تشریح کی جاتی ہے۔

تاریخی تفسیر:

اس قسم میں قرآن مجید کے تاریخی پہلوؤں کو اجاگر کیا جاتا ہے۔ قصص القرآن مصنفہ حفظ الرحمٰن اس موضوع پر بہترین کتاب ہے۔ عربی میں فتح المنان فی بیان مشاہیر الرسل فی القران۔ مولفہ احمد السجاعی (م 1197ھ)

نحوی تفسیر:

جس میں قرآن مجیدؐ کے نحوی مسائل کے متعلق بحث کی گئی ہے۔ مثلاً اعراب القرآن مصنفہ رازی۔

لغوی تفسیر:

جس میں قرآن مجید کے مفرد الفاظ کے معانی اور ان کی تحقیق پر بحث ہوتی ہے۔ مثلاً لغات القرآن ابوعبیدہ اور مفردات امام راغب مشہور تصانیف ہیں۔

کونی تفسیر:

جس میں سائنس کی ایجادات کو قرآن کی آیات سے مطابقت دینے کی کوشش کی گئی ہے جیسا کہ تفسیر طنطاوی

تقلیدی:

اس قسم کی تفسیر کی بنیاد کسی پہلے گزرے ہوئے محدث یا متکلم کی تفسیر پر ہوتی ہے۔ مثلاً ابن کثیر کی تفسیر ابن جریر کی تفسیر کا ہی چربہ ہے۔

تجدد پسندانہ تفسیر:

بعض مفسرین نے بیرونی مروجہ افکار اور نظریات سے متاثر ہو کر چند ایک مخصوص نظریات قائم کیے ان نظریات کی بنیاد پر قرآن مجید کی تفسیر مرتب کی ہے اس طریقہ کے بانی ہندوستان میں سرسید احمد اور مصر میں علامہ طنطاوی ہیں۔ سرسید ہندوستان میں جدیدیت کے بانی ہیں اب اس جدیدیت کی لہر سے دوسرے اسلامی ممالک کے مفکر بھی متاثر ہیں۔

علوم قرآنی:

علماء نے صرف قرآن مجید کی صرف شروح اور تفاسیر ہی تصنیف نہیں کی بلکہ قرآن مجید کے ہر شعبہ کے متعلق اتنے علوم بھی مدون کیے ہیں ان کا حصر مشکل ہے۔ جن علوم و تصانیف کا پتہ ملتا ہے وہ حسب ذیل ہیں۔

رسوم القرآن، تجوید القرآن، اعراب القرآن، مصادر القرآن، افراد القرآن، جمعہ، مفردات القرآن، غرائب القرآن، معانی القرآن، اعجاز القرآن، مجاز القرآن، تشبیہ القرآن، امثال القرآن، امثلۃ القرآن، بدیع القرآن، اسباب النزول، مبہمات القرآن، متشابہ

القرآن، اقسام القرآن، مناسبۃ الایات والسور، مطالع القرآن ومقاطعہ وفواتح السور، اعلام القرآن، ناسخ القرآن ومنسوخہ، مشکلات القرآن، حجج القرآن، احکام القرآن، جوہر القرآن، نجوم القرآن، جوامع علوم القرآن کا پہلا مصنف علی بن ابراہیم الحوفی (م 430ھ) ہیں۔ جن کی تصنیف کا نام علوم القرآن ہے۔ دوسری اہم کتاب جلال الدین سیوطی (م 910ھ) کی الاتقان فی علوم القرآن ہے جس میں 80 ابواب کے تحت علوم القرآن کے متعلق 300 سے زائد مباحث ہیں۔ یہ وہ علمی کارنامے ہیں جو معترضین کی نظر سے اوجھل ہیں۔ جن کی عدم واقفیت کی وجہ سے یہ اعتراض کر دیتے ہیں کہ اسلام ایک جامد مذہب ہے۔

علم حدیث:

یہ وہ علم ہے جو رسول کریم ﷺ کے اقوال و افعال اور احوال پر روشنی ڈالتا ہے۔ یہ وہ علم ہے جس میں مسلمان علماء نے اپنی زندگیاں صرف کر دیں پھر اسی علم سے ہی بے شمار دیگر علوم متفرع ہوئے۔ آج انہیں علوم کی کتب سے دنیا کی لائبریریاں بھری پڑی ہیں۔

اس علم کا آغاز عہد رسول ﷺ سے شروع ہو گیا آخر مختلف مراحل طے کرتا ہوا عہد عباسیہ میں کتب حدیث کی شکل اختیار کر گیا اور اہل سنت کی چھ کتب منصۂ شہود پر آئیں وہ یہ ہیں صحیح بخاری مصنفہ ابوعبداللہ اسماعیل (م 256ھ)

صحیح مسلم مولفہ حافظ مسلم بن حجاج (م 261ھ) سنن ابی داؤد مولفہ ابوداؤد سلیمان بن اشعث البجستانی (م 275ھ) جامع ترمذی مولفہ ابوعیسیٰ محمد بن موسیٰ (م 279ھ) سنن ابن ماجہ مولفہ ابوعبداللہ محمد بن یزید قزوینی (م 273ھ) نسائی مولفہ عبدالرحمٰن بن شعیب (م 303ھ)

ان کے علاوہ موطا امام مالک (م 179ھ) مسند امام ابوحنیفہ (م 150ھ) مسند امام شافعی محمد بن ادریس (م 204) مسند احمد بن حنبل سنن دارمی (مولفہ عبداللہ بن عبدالرحمٰن (م 255ھ) معجم کبیر، اوسط، صغیر (مولفہ سلطان بن احمد طبرانی (م 360ھ)

سنن دارقطنی مولفہ علی بن محمد دارقطنی (م 385ھ) مستدرک حاکم مولفہ ابوعبداللہ محمد بن عبداللہ الحاکم (م 405ھ)

پھر علماء نے کتب احادیث کو مختلف اقسام میں تقسیم کیا ہے۔ پھر ان کتب کی شروح لکھیں۔ جن کا احاطہ کرنا اور بیان کرنا باعث طوالت ہے۔ فرقہ شیعہ نے بھی کتب حدیث مرتب کیں۔ الکافی مولف ابوجعفر محمد بن یعقوب الکلینی (م 329ھ) من لا یحضرہ الفقیہ مولفہ محمد بن علی بن الحسین بن موسیٰ بن بابویہ القمی (م 381ھ) تہذیب الاحکام والاستبصار مولفہ ابوجعفر محمد بن علی طوسی (م 460ھ)

علماء نے علم حدیث کو کئی علوم میں تقسیم کیا ہے۔ ان علوم میں سب سے اہم دو ہیں علم المصطلحات ہے (اس علم میں حدیث کی اصطلاحات پر بحث کی جاتی ہے) اور علم اسماء الرجال ہے (اس علم میں راویوں کے حالات زندگی بیان کیے گئے ہیں) جرمن کے مشہور مستشرق ڈاکٹر سپرنگر جس نے حافظ ابن حجر کی کتاب کی تصحیح کی ہے اصابہ کے دیباچہ میں رقمطراز ہے "نہ کوئی قوم دنیا میں ایسی گزری ہے نہ آج موجود ہے جس نے مسلمانوں کی طرح اسماء الرجال سا عظیم الشان فن ایجاد کیا ہو۔ جس کی بدولت آج پانچ لاکھ اشخاص کا حال معلوم ہو سکتا ہے۔ اس فن پر کئی کتب معرض وجود میں آئیں جن میں یہ مشہور کتب ہیں الکمال فی معرفۃ الرجال مصنفہ حافظ عبدالغنی بن عبدالواحد المقدسی (م 600ھ)

تہذیب الکمال فی معرفۃ الرجال مصنفہ جمال الدین یوسف بن زکی المزی (م 722ھ) میزان اعتدال فی نقد الرجال (تین جلد) مصنفہ شمس الدین ابوعبداللہ محمد بن احمد الذہبی (م 748ھ)

تہذیب التہذیب (بارہ جلد) مصنفہ حافظ ابوالفضل احمد بن علی بن محمد بن علی بن حجر العسقلانی (م 852ھ) اصابہ فی معرفۃ الصحابہ (دس جلد) مصنف ابن حجر عسقلانی (م 852) استیعاب فی معرفۃ الاصحاب (دو جلد) مصنفہ ابوعمر و یوسف بن عبداللہ بن محمد بن البر القرطبی (م 463ھ) اسد الغابہ فی معرفۃ الصحابہ (پانچ جلد) مصنفہ ابن اثیر (م 630)

علم فقہ:

قرآن مجید اور احادیث کی روشنی میں قوم کی طبعی خصوصیات کے مطابق ضمنی قواعد مرتب کرنے کا نام ہے علم فقہ آج کل کی زبان میں بائی ''لاز'' کہا جاتا ہے اس علم کی بنیاد رسول کریم ﷺ کے عہد میں پڑ چکی تھی۔ عہد عباسیہ میں یہ علم اپنی انتہا کو پہنچ گیا۔ تاریخ میں چار مشہور مکاتب فقہ ہیں۔ مذہب حنفی بانی امام ابوحنیفہ نعمان بن ثابت (م 150ھ) مذہب مالکی اس مسلک کے بانی حضرت امام مالک ہیں۔ (م 179ھ) مذہب شافعی بانی مسلک امام محمد بن ادریس (م 204) مذہب حنبلی بانی ملک امام ابوعبداللہ احمد بن حنبل (م 241ھ)

علم الوعظ:

علماء کی ایک جماعت قرآن کریم کی حکمتوں، تمثیلوں اور اس کی نصائح کی طرف مائل ہوئی انہوں نے وعد، وعید تحذیر اور تبشیر موت، معاد حشر نشر، حساب کتاب جنت و دوزخ وغیرہ کے بیانات کو انتخاب کیا اور مواعظ مرتب کیے زجر و توبیخ کی باتوں کے اصول مقرر کیے اور اس ڈھنگ کی کتب مرتب کیں۔

علم الرویاء:

خوابوں کی تعبیر کے اصول قرآن مجید سے اخذ کیے گئے ابن سرین اس علم پر شہرت عام رکھتا ہے۔

علم المیراث:

علماء کرام نے قرآن مجید میں بیان میراث کی آیات میں سہام اور ان کے حق داروں اور مستحقوں کا ذکر دیکھ کر علم الفرائض کی بنیاد رکھی نہایت ہی قیمتی کتب کا سرمایہ چھوڑا۔

علم السیرت:

رسول کریم ﷺ کی حیات مبارکہ پر کتب مرتب کیں ان کا احاطہ کرنا مشکل ہے چند مشہور کتب میں کتاب المغازی مولفہ موسیٰ بن عقبہ (م 141ھ) کتاب سیرت مولفہ محمد بن اسحاق (م 150ھ) سیرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مولفہ عبدالملک بن شام (م 213/18ھ) تاریخ کامل مولفہ علی ابن اثیر (م 630ھ) زاد المعاد فی ہدی خیر العباد مولفہ ابن القیم الجوزیہ (م 751ھ) السیرۃ النبوۃ مولفہ ابن کثیر (774ھ) الخصائص الکبری (جلال الدین سیوطی (م 911ھ) کتب سیرت صرف عربی میں ہی مدوّن نہیں ہوئیں بلکہ ہر زبان میں لکھی گئی ہیں اردو میں مولانا شبلی اور مولانا سلیمان ندوی کی کتاب سیرۃ النبی مشہور ہے۔ سال 1978,1974 میں حکومت پاکستان نے کتب سیرت پر بین الاقوامی نمائش کرائی جس میں صرف چودھویں صدی ہجری میں لکھی جانے والی کتب سیرت رکھی گئی تھیں جن کی تعداد چار ہزار سے متجاوز تھی۔

علم کلام:

اسلامی عقائد کو عقلی رنگ میں بیان کرنے کا نام علم کلام ہے مشہور کتب حسب ذیل ہیں مقالات الاسلامین مصنفہ امام ابوالحسن اشعری، ملل ونحل مولفہ قاضی ابوبکر محمد بن الطیب باقلانی (م 403ھ) ملل ونحل مولفہ ابومنصور عبدالقادر بن طاہر بغدادی (م 429ھ) الفصل فی الملل والنحل مصنفہ علامہ علی بن احمد ابن حزم ظاہری (م 456ھ) ملل ونحل مصنفہ امام محمد بن عبدالکریم شہرستانی (م 548ھ)

مذکورہ کتب کے علاوہ حضرت امام غزالی، امام رازی اور دیگر مفکرین نے اس موضوع پر قیمتی خزانہ چھوڑا ہے۔ سب کا ذکر کرنا باعث طوالت ہے صرف چند کتب پر اکتفا کیا گیا ہے۔

علوم لسانیہ:

مسلمان علماء نے علوم لسانیہ کی طرف توجہ کی اور قیمتی خزانہ چھوڑ گئے ہیں۔

علم اللغت:

علماء نے بے شمار تعداد میں لغات مرتب کیں صرف چند کتب کے نام درج کیے جاتے ہیں۔

اساس البلاغۃ (دو جلد) زمخشری المصباح المنیر (دو جلد) احمد بن محمد، القاموس (چار جلد) مجد الدین محمد بن یعقوب فیروز آبادی، تہذیب اللغۃ (دس جلد) ابو منصور محمد بن احمد زہری، محیط (دس جلد) صاحب بن عباد وزیر، لسان العرب (بیس جلد) جلال الدین محمد بن جلال الدین افریقی، تاج العروس (چوبیس جلد) سید محمد بن محمد حسینی واسطی المعروضۃ سید المرتضیٰ زبیری) الایک الغصون (سو جلد) ابو العلامعری۔

علم المعانی والبیاں والبدیع:

اس فن پر مشہور کتب مختصر معانی اور مطول ہیں۔

علم النحو والصرف:

ابن سیبویہ نے اس علم پر بہت کام کیا ہے مسلمان علماء نے صرف علوم شرعیہ اور علوم لسانیہ پر ہی کام نہیں کیا بلکہ دیگر علوم مثلاً (علم تاریخ، علم جغرافیہ، علم ریاضی، علم مناظرہ، علم الاقتصاد، علم سیاست، عمرانیات (سوشیالوجی وغیرہ) پر قیمتی خزانہ چھوڑا ہے۔

علوم کونی (سائنس) (کیمیا، طبیعات، نباتات، حیوانات، طب، ہیئت وغیرہ) پر وہ قیمتی سرمایہ چھوڑا ہے جو آج بھی محققین کے لیے شمع راہ تحقیق ہے علم کی ان تمام شاخوں پر بحث کرنا باعث طوالت ہے۔ معترضین کے لیے جو کچھ بیان کیا جا چکا ہے وہی کافی ہے۔

الغرض اسلام ہی وہ دین اسلام ہے جس کے اصولوں پر عمل کر کے انسان زندگی کے ہر شعبہ پر ترقی کر سکتا ہے۔ معترض اس بات کو ذہن میں رکھے کہ اسلام الٰہی قوانین کا نام ہے وہ صرف مسلمانوں کے لیے ہی نہیں بلکہ دنیا کی ہر قوم اور ہر فرد کے لیے ہیں جو بھی ان اصولوں پر عمل کرے گا۔ وہی ترقی کے راستہ پر گامزن ہوگا کوئی شخص یا قوم یہ دعویٰ نہیں کر سکتی کہ یہ اصول اسی کے لیے ہیں ارحم الراحمین ہستی نے وہ قوانین رسول کریم پر لوگوں کی ہدایت کے لیے نازل کیے۔ دنیا میں صرف یہی قوانین اور اصول ہیں جن پر عمل کر کے ترقی کی جا سکتی ہے اسی لیے اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید کو ھدًی للناس کہا ہے۔

......☆......

مابعد الطبیعاتی مسائل۔ عالم برزخ (پر اعتراض)

اعتراض: **عالم برزخ یعنی عذاب وثواب قبر کی کیا حقیقت ہے (ملاحدہ اور عقلیت پسند اور متعدد مخالفین کی طرف سے اہم اعتراض)**

جواب: برزخ، عالم قبر کو کہتے ہیں، برزخ لغت مرب میں اس چیز کو کہتے ہیں جو دو چیزوں کے درمیان میں واقع ہو چونکہ یہ زیادہ عالم انشاء (موجودہ دنیا) اور عالم بعث (دوسری دنیا آخرت) کے درمیان واقع ہے اس لیے اس کا نام برزخ ہے برزخ مرکب ہے زخ اور بر سے جس کے معنی یہ ہیں کہ طریق کسب اعمال ختم ہو گیا اور مخفی حالت میں پڑ گیا۔ برزخ کی حالت وہ حالت ہے جب روح جسم سے الگ ہو جاتی ہے جسم

کو کسی گڑھے میں ڈال دیا جاتا ہے اور روح بھی ایک قسم کے گڑھے میں پڑ جاتی ہے جس پر لفظ برزخ دلالت کرتا ہے کیونکہ افعال کسب خیر وشر پر قدرت نہیں رکھتی جو جسم کے تعلقات سے صادر ہوتے تھے۔ عالم برزخ میں ثواب اور عذاب کی نوعیت اور کیفیت مسائل مابعد الطبیعات یعنی عالم برزخ اور عالم بعث میں جزا وسزا کی کیفیت اور نوعیت بیان کرنے سے پہلے یہ ضروری ہے کہ یہ بیان کیا جائے کہ انسانی زندگی کا اعلیٰ اور ارفع مقصد کیا ہے اس اعلیٰ اور ارفع مقصد سمجھنے کے بعد ان دو جہانوں کی جزا وسزا کا فلسفہ سمجھ میں آ جائے گا۔

اسلامی نقطۂ نگاہ سے انسان کو ایک اعلیٰ اور ارفع مقصد کے لیے پیدا کیا گیا ہے اس ارفع مقصد کی وجہ سے ہی اس کو خلیفۃ اللہ کہا گیا ہے اس اعلیٰ اور ارفع مقصد کے حصول کے لیے اللہ تعالیٰ نے انسان کو عقل سے نوازا ہے اور اس کی ہدایت کے لیے انبیاء علیہم السلام دستور الٰہی لے کر آتے رہے ہیں تاکہ اس کا قدم صراط مستقیم پر جما رہے اور روحانی منازل طے کرتا چلا جائے اس لیے دستور الٰہی میں انسان کو بار بار یقین دہانی کرائی گئی ہے اس کی پیدائش عبث نہیں بلکہ وہ اعلیٰ روحانی مقصد کے لیے پیدا کیا گیا ہے اور اس کی توجہ اسی طرف ہونی چاہیے ارشاد الٰہی ہے۔

اَیَحۡسَبُ الۡاِنۡسَانُ اَنۡ یُّتۡرَکَ سُدًی (القیمۃ 36:75)

کیا انسان خیال کرتا ہے کہ وہ مہمل چھوڑ دیا جائے گا۔

یہی وجہ ہے اس آیت کے بعد اللہ تعالیٰ نے یہ بتایا ہے کہ اس نے اس کو اعلیٰ مقام دینے کے لیے پیدا کیا گیا ہے اسی طرح اس مقصد کے حصول کے لیے موت کے بعد دوبارہ زندہ کیا جائے گا۔ ارشاد الٰہی ہے۔

اَلَیۡسَ ذٰلِکَ بِقٰدِرٍ عَلٰۤی اَنۡ یُّحۡیِ الۡمَوۡتٰی (القیمہ 40:75)

کیا وہ اس بات پر قادر نہیں کہ مردوں کو زندہ کرے۔

دوسری جگہ مزید وضاحت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔

لَقَدۡ خَلَقۡنَا الۡاِنۡسَانَ فِیۡۤ اَحۡسَنِ تَقۡوِیۡمٍ ثُمَّ رَدَدۡنٰہُ اَسۡفَلَ سٰفِلِیۡنَ اِلَّا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَلَہُمۡ اَجۡرٌ غَیۡرُ مَمۡنُوۡنٍ (التین 95:4-6)

یقیناً ہم نے انسان کو بہترین صورت پر پیدا کیا پھر ہم نے اسے ذلیل سے ذلیل حالت کی طرف لوٹا دیتے ہیں مگر جو ایمان لائے اور اچھے کام کرتے ہیں تو ان کے لیے ایسا اجر ہے جو ختم نہیں ہوتا۔

الفاظ احسن تقویم میں انسان کی دوسری مخلوقات کے مقابل صرف اچھی ساخت ہی مراد نہیں بلکہ وہ استعداد بھی مراد ہے جو انسان میں تعلق باللہ (اعلیٰ روحانی مقام) کے لیے رکھی گئی ہے جو کسی دوسری مخلوق میں نہیں ہے جو شخص اس استعداد کو بروئے کار نہیں لاتا وہ اسفل سافلین کے مقام پر گر جاتا ہے جو اس استعداد کو کام میں لا کر ایمان اور اعمال صالحہ کے زیور سے اپنے آپ کو آراستہ کرتا ہے اس کے لیے غیر منقطع اجر ہے۔

گویا عالم برزخ اور عالم اخروی کا تعلق انسانی کی روحانی تکمیل کے لیے ہے۔ اگر اس کو ان دو جہانوں میں سزا دی جائے گی تو وہ بھی روحانی اصلاح کے لیے ہوگی۔

جب انسان اس دنیا سے گزر کر عالم برزخ میں پہنچتا ہے تو اس کے اعمال حسنہ اور اعمال سیئہ کی تاثیرات کا ظہور شروع ہو جاتا ہے کیونکہ موت کے بعد جو کچھ انسان کی حالت ہوتی ہے وہ کوئی نئی نہیں ہوتی۔ بلکہ وہ اس دنیا میں اپنے کردہ اعمال کا ظل ہوتی ہے۔ اس عالم میں ہمارے اعمال کے نتائج کھل کر سامنے آنے لگتے ہیں اگر کسی نے اسی دنیا میں ظلم کیے ہیں اور قوت سبعیت کا اظہار کیا ہے تو اس کو درندے کاٹتے نظر آئیں گے اگر کوئی بخیل ہے تو اس کو سانپ بچھو کاٹتے ہوئے دکھائی دیں گے۔

یہ اس کے اپنے کردہ گناہوں کا ہی نتیجہ ہے۔ جیسا کہ رسول کریم فرماتے ہیں۔

اَلْمُؤْمِنُ فِی قَبْرِہٖ فِی رَوْضَۃٍ خَضْرَاءِ وَیَرْحَبُ لَہٗ قَبْرُہٗ سَبْعُوْنَ ذِرَاعًا یُضِیءُ حَتّٰی یَکُوْنَ کَالْقَمَرِ لَیْلَۃَ الْبَدْرِ وَقَالَ عَذَابُ الْکَافِرِ فِی قَبْرِہٖ یُسَلَّطُ عَلَیْہِ تِسْعَۃٌ وَتِسْعُوْنَ تِنِیْنًا ھَلْ تَدْرُوْنَ مَا التِّنِیْنُ (ھی) تِسْعَۃٌ تِسْعُوْنَ حَیَّۃً لِکُلِّ حَیَّۃٍ سَبْعَۃُ رُؤسٍ یَخْدِشُوْنَہٗ وَیَلْھَسُوْنَہٗ یُنْفِخُوْنَہٗ فِی جِسْمِہٖ

مومن کو جب قبر میں رکھا جاتا ہے تو اس سبز باغ میں داخل کیا جاتا ہے اور اس کی قبرستر گز کشادہ کی جاتی ہے اس میں چودھویں رات کے چاند کی طرح روشنی ہو جاتی ہے اور فرمایا کہ کافر پر اس قبر میں ننانوے اژدھے مسلط کر دیئے جاتے ہیں تم جانتے ہو کہ اژدھا کیا ہے وہ ننانوے سانپ ہیں ہر ایک سانپ کے سات سر ہوتے ہیں اس کو کاٹتے ڈستے اور اس کے جسم میں پھنکاریں یوم حشر تک مارتے رہتے ہیں۔

مومن کو سبز باغ میں داخل کرنا اور اس کی قبر کا کشادہ اور روشن ہونا اس کے اعمال حسنہ کا نتیجہ ہے۔ اسی طرح سانپ اور بچھو اخلاق مذمومہ کی شکلیں ہیں۔ سانپوں کی اس خاص تعداد سے بھی تعجب نہیں کرنا چاہیے کیونکہ ان سانپوں اور بچھوؤں کی تعداد اخلاق سیئہ کبر، حسد، کذب، نفاق وغیرہ کی تعداد کے موافق ہوتی ہے۔ یہ صفات اصول ہیں اور ان کے فروعات بھی ہیں جن کی تقسیم ان صفات کے مطابق ہوتی ہے وہی اصول اور فروعات سانپ اور بچھو ہو جاتی ہیں جس شخص میں جو صفت زیادہ شدت سے پائی جائے گی اس کا ڈسنا اژدھا کی مانند ہوتا ہے ہر جو کمزور صفت ہو اس کا کاٹنا بچھو کی طرح ہوتا ہے جو درمیانی قوت کی صفت ہو گی اس کا دکھ سانپ کے کاٹنے کی طرح ہو گا۔ یہ سب انسان کے اپنے اعمال کے نتائج ہیں کہیں باہر سے نہیں آئے بلکہ دل میں ہی اخلاق سیئہ کے آثار جمے ہوئے ہیں، وہ اپنی اشکال پر سانپ اور درندے بن کر عالم برزخ میں اس کی روح کو کاٹتے ہیں اور ان سے اس کے جسم و روح کو دکھ پہنچتا ہے۔ جس کے اعتقادات درست اور اعمال اچھے ہیں وہ سکھ اور راحت میں ہوں گے انسان کو اس کا تجربہ اس زندگی میں بھی ہوتا ہے وہ خواب میں خوش کن باتوں سے راحت اور لذت محسوس کرتا ہے اور ایذا رسانی باتوں سے دکھ محسوس کرتا ہے اسی طرح برزخی ایذا اور راحت اس انداز سے ہے اللہ تعالیٰ نے امور غیب پر اطلاع پانے کے لیے انسان کو مختلف راستوں کی اطلاع دی ہے انہی میں سے ایک خواب کی حالت میں دکھ اور سکھ پانا ہے اسی طرح رسول کریم ﷺ کے بے شمار مکاشفات ہیں جن میں حضور نے عالم برزخ میں دکھ اور سکھ کی کیفیات کو دیکھا اور صحابہ کو بتایا اسی طرح بے شمار صلحاء نے بھی عالم برزخ کے مکاشفات میں نظارے دیکھے ہیں ان کو تسلیم کر لینا ہی انسان کی بہتری ہے۔

عالم برزخ میں انسان اپنی بدعملی کی وجہ سے مختلف قسم کی اذائیں اٹھاتا ہے یہ اس کی روح کو پاکیزہ کرنے کا ذریعہ ہے جس طرح ایک بیمار شخص ہسپتال میں داخل ہوتا ہے۔ مرض کے دور ہو جانے سے وہ ہسپتال سے فارغ کر دیا جاتا ہے۔ اسی طرح عالم برزخ میں گناہگار کو جو دکھ پہنچتا ہے۔ وہ اس کی روح کو پاکیزہ کرنے کا موجب ہے جب اس کی روح پاکیزہ ہو جاتی ہے تو ایذا رسانی ختم ہو جاتی ہے اور روحانی لذتیں محسوس کرنے لگ جاتا ہے۔ روح کو پاک کرنے کا یہ ایک ذریعہ ہے۔

عالم حشر:

اس عالم میں ارواح اس وقت جائیں گی جب عالم برزخ سے ارواح کا حشر ہو گا۔ وہاں بھی ارواح اپنے اعمال حسنہ اور اعمال سیئہ کی جزا و سزا اٹھائیں گی۔ اسی جزا و سزا کو اسلامی اصطلاح میں جنت اور جہنم کہا جاتا ہے مراد یہی ہے کہ جزا پانے والی ارواح جنت میں جائیں گی اور سزا پانے والی ارواح جہنم میں ملیں گی جنت میں بھی ارواح مزید روحانی منازل طے کریں گی اور دیدار الٰہی سے فیض یاب ہوں گی۔ جہنم میں بھی ارواح کی صفائی اور پاکیزگی کی جائے گی گویا بہشت اور دوزخ اس دنیا کے ایمان اور اعمال کے اظلال اور اثار ہیں بہشت انسان کے اس دنیا کے ایمان اور عمل صالحہ کا نتیجہ اور ظل ہے اور دوزخ انسان کے اعمال سیئہ کا ظل اور نتیجہ گویا اعمال حسنہ اور اعمال سیئہ متشکل ہو کر سامنے آ

جاتے ہیں یہی (بہشت) جنت دوزخ (جہنم) ہیں قرآن مجید میں آتا ہے۔

وَبَشِّرِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اَنَّ لَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ (البقرة)

یعنی جو لوگ ایمان لاتے ہیں اور نیک عمل بجالاتے ہیں ان کے لیے جنت ہیں جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے ایمان کو باغ سے مشابہت دی ہے اور نہروں کو اعمال صالح سے جس طرح جو تعلق باغ کا نہروں سے ہے کوئی باغ پانی کے بغیر نہ پھل دیتا ہے اور نہ سر سبز رہ سکتا ہے اسی طرح ایمان اور اعمال حسنہ کے درمیان رشتہ ہے ایمان بغیر اعمال صالحہ کے زندہ ایمان نہیں اور نہ اعمال صالحہ بغیر ایمان کے کوئی حیثیت رکھتے ہیں ایمان اس وقت فائدہ مند ہے جب اس کے ساتھ اعمال صالحہ ہوں اسی طرح اعمال صالحہ اس وقت مثمر ہوں گے جب اس کے ساتھ ایمان کی دولت ہو بہتر نتیجہ حاصل کرنے کے لیے ضروری ہے ایمان کے ساتھ اعمال صالحہ ہوں اور اعمال صالحہ کے ساتھ ایمان ہو۔ متقیوں کو بہشت میں نعماء الٰہی دودھ شہد اور ہر قسم کے پھل، حور و غلمان دیا جانے کا وعدہ ہے بلکہ قرآن مجید میں آتا ہے جس چیز کی خواہش کریں گے ان کو مل جائے گی قرآن مجید میں آئندہ زندگی کے متعلق بیان کیا گیا ہے وہ محض بطور مثال کے بیان کیا گیا ہے۔ قرآن مجید میں آتا ہے۔

مَثَلُ الْجَنَّةِ الَّتِيْ وُعِدَ الْمُتَّقُوْنَ فِيْهَا اَنْهٰرٌ مِّنْ مَّآءٍ غَيْرِ اٰسِنٍ وَاَنْهٰرٌ مِّنْ لَّبَنٍ لَّمْ يَتَغَيَّرْ طَعْمُهٗ وَاَنْهٰرٌ مِّنْ خَمْرٍ لَّذَّةٍ لِّلشّٰرِبِيْنَ وَاَنْهٰرٌ مِّنْ عَسَلٍ مُّصَفًّى وَلَهُمْ فِيْهَا مِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ وَمَغْفِرَةٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ (محمد 15:47)

اس جنت کی مثال ہے جس کا وعدہ متقیوں کو دیا جاتا ہے جس میں پانی کی نہریں ہیں جو بگڑ کر بدبودار نہیں ہوتا اور دودھ کی نہریں جس کا مزہ نہیں بدلتا اور شراب کی نہریں ہیں جو پینے والوں کے لیے باعث لذت ہے صاف کیے ہوئے شہد کی نہریں ہیں اور ان کے لیے اس میں ہر قسم کے پھل ہیں اور ان کے رب کی طرف سے مغفرت ہے۔

مذکورہ آیت میں لفظ مثل ظاہر کرتا ہے کہ جنت کی نعماء بطور مثال بیان ہوئی ہے جنت کی نعماء اور اس دنیا کی نعماء میں صرف نام کا اشتراک ہے ابن عباس سے ابن کثیر میں روایت ہے۔

لَا يُشْبِهُ شَيْءٌ مِّمَّا فِي الْجَنَّةِ وَمَا فِي الدُّنْيَا اِلَّا فِي الْاَسْمَآءِ

یعنی جو چیزیں جنت میں ہیں وہ دنیا کی کسی چیز سے سوائے نام کے مشابہت نہیں رکھتیں۔

قرآن مجید میں اس کی صراحت کر دی گئی ہے ارشاد الٰہی ہے۔

فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّآ اُخْفِيَ لَهُمْ مِّنْ قُرَّةِ اَعْيُنٍ (السجدہ 17:32)

بس کوئی شخص نہیں جانتا کہ ان کے لیے کیسی آنکھوں کی ٹھنڈک چھپا کر رکھی گئی ہے۔

صحیح بخاری میں اسی آیت کی تفسیر میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

قَالَ اللّٰهُ اَعْدَدْتُ لِعِبَادِيَ الصَّالِحِيْنَ مَا لَا عَيْنٌ رَاَتْ وَلَا اُذُنٌ سَمِعَتْ وَلَا خَطَرَ عَلٰى قَلْبِ بَشَرٍ (بخاری)

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ میں نے اپنے صالح بندوں کے لیے وہ کچھ تیار کیا ہے جس کو نہ کسی آنکھ نے دیکھا ہے اور نہ کسی کان نے سنا ہے نہ کسی شخص کے دل پر وہ گزرا۔

سورہ محمد کی آیت میں نعماء جنت کی جو کیفیت بیان کی گئی ہے وہ بھی ظاہر کرتی ہے کہ صرف ناموں میں اشتراک ہے کیفیت اور اوصاف میں نہیں ہے۔

دوزخ میں ایذا اور دکھ دینے والی مختلف چیزوں کا جو ذکر کیا گیا ہے وہ بھی انسان کے اعمال سیئہ اور بداعتقادات کے آثار اور شکلیں ہوں گی، دوزخ اور دنیا کی ایذا اور دکھ دینے والی چیزوں میں بھی ناموں کا اشتراک ہے کیفیت اور وصف میں نہیں قرآن مجید اور احادیث سے یہ واضح ہے کہ جس قسم کا عمل سیئہ اور بدعقیدہ ہوگا اسی کی مناسبت سے اس کو سزا دی جائے گی۔

دنیا میں ہم دیکھتے ہیں کہ جس قسم کی بیماری ہوتی ہے اس بیماری کی مناسبت سے علاج کیا جاتا ہے وہی علاج اس بیماری کو شفا دیتا ہے اسی طرح آخرت میں جس قسم کی بدعملی اور بداعتقادی کا مرض ہوگا اسی کی مناسبت سے اس کا علاج کیا جائے گا۔ یہی وجہ ہے قرآن مجید اور احادیث میں دکھ دینے والی چیزوں کو مختلف ناموں سے بیان کیا گیا ہے کہیں آگ میں ڈالنے کا ذکر ہے کہیں ابلتا ہوا اور کہیں شدید ٹھنڈا پانی پلانے کا ذکر ہے کہیں اژدھا سانپ اور بچھوؤں کے ڈسنے کا ذکر ہے کہیں پیپ اور دھونی اور زقوم بطور خوراک دیئے جانے کا کہیں گردن میں طوق اور پاؤں میں بیڑیاں پہنائے جانے کا یہ تمام مختلف ایذا رساں چیزیں انسان کے مختلف روحانی امراض کا علاج ہے۔

یہ بات بھی یاد رکھنی چاہیے۔ بہشت اور دوزخ کی ابتداء اس دنیا سے شروع ہو جاتی ہے جیسا کہ قرآن مجید میں آتا ہے۔

وَلِمَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ جَنَّتٰنِ (الرحمٰن 55:46)

اور جو خائف ہے اس کے لیے دو بہشت ہیں (ایک اس دنیا میں دوسرا آخرت میں)

دوزخیوں کے متعلق آتا ہے۔

وَمَنْ كَانَ فِي هٰذِهٖۤ اَعْمٰى فَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ اَعْمٰى وَاَضَلُّ سَبِيْلًا

جو شخص اس دنیا میں (روحانی) اندھا ہے پس وہ آخرت میں بھی (روحانی) اندھا ہوگا یہ دونوں آیات ظاہر کرتی ہیں کہ بہشت اور دوزخ کی بنیاد اخلاق حسنہ اور اخلاق سیئہ کی روشنی میں اس دنیا میں پڑ جاتی ہے گویا بہشت اور دوزخ اس دنیا کے ایمان اور اعمال کے اظلال اور آثار ہیں۔ ایمان اور اعمال کے اظلال اور آثار اسی دنیا میں شروع ہو جاتے ہیں۔ نیک اور بد اپنے ایمان اور اعمال کی فصل کا پھل اسی دنیا میں پانا شروع ہو جاتے ہیں اعلیٰ زندگی کا شعور اس دنیا میں پیدا ہونا شروع ہو جاتا ہے عالم برزخ میں وہ شعور اس دنیا کے شعور سے بڑھ جاتا ہے۔ اخلاق حسنہ اور اخلاق سیئہ کے آثار اور اظلال کچھ نمایاں حالت میں ظاہر ہو جاتے جبکہ عالم آخرت میں وہ شعور کامل طور پر اجاگر ہو جاتا ہے۔

عالم برزخ کی مدت:

عالم برزخ کی مدت کیا ہے۔ دوسری دنیا سے متعلق تمام امور پیچیدہ ہیں۔ وہاں کی جس قدر چیزیں ہیں ہم ان کو اپنے حواس ظاہری سے محسوس نہیں کر سکتے وہ غوائض اور اسرار ہیں وہ اللہ ہی جانتا ہے موت کے بعد ہی اس کا علم ہوگا۔

نوٹ: (جنت میں نعماء الہیہ دودھ شہد حور وغلمان والدان وغیرہ کی وضاحت سیرت سید المبشر کے حصہ سوم میں کی جا چکی ہے)

......☆......

اعضا کا بولنا

(اعضا کا بولنا ایک ڈھکوسلا ہے)

اعتراض:

شَهِدَ عَلَيْهِمْ سَمْعُهُمْ وَاَبْصَارُهُمْ وَجُلُوْدُهُمْ نَخْتِمُ عَلٰى اَفْوَاهِهِمْ

بڑی عجیب بات ہے کہ آدمی کے ہاتھ پاؤں وغیرہ وغیرہ زبان کا کام دیں گے یہ ڈھکوسلا ہے قرآنی بہشت خانہ خراب ہے۔(ترک اسلام سوال 35) یہ اعتراض دیانند سرسوتی نے بھی سیتارتھ پرکاش میں کیا ہے۔

جواب: شہادت تحریری بھی ہوتی ہے اور تقریری بھی اور تقریر زبان سے بھی، ایماء و کنایہ سے بھی۔اسی طرح کلام بھی دو طرح سے ہوتا ہے ایسا ہی نطق بھی دو قسم کا ہوتا ہے ایسے ہی شہادت، تحدیث اور قول کے اقسام بھی ہوتے ہیں۔

قیامت کے دن انسان کے اعضاء ان بدیوں کے متعلق زبان حال سے گواہی دیں گے جن سے انسان نے ارتکاب کیا۔قرآن مجید میں یہ طرز بیان استعارہ کے رنگ میں بیان کیا گیا ہے۔استعارہ اور کنایہ فصاحت و بلاعت کی اہم قسم ہے اس سے عبارت میں حسن وخوبی پیدا ہوتی ہے۔معلوم ہوتا ہے معترض کا ادبی ذوق ہی نہیں۔اگر اس میں ذوق سلیم ہوتا۔تو قطعاً اعتراض نہ کرتا معترض کو یہ یاد رکھنا چاہیے کہ جب ایک سوزاک آتشک میں مبتلا شخص ایک طبیب حاذق کے سامنے آجاتا ہے اس کے اعضاء کی کیفیت معلوم کر کے بیماری کا کھوج لگالیتا ہے گویا آتشک کے مریض کے اعضاء نے بول کر طبیب کو مرض سے آگاہ کر دیا ہے۔اسی طرح ہر بیماری کی علامات اعضاء سے ظاہر ہو جاتی ہے۔ اعضاء پر ان علامات کا ظاہر ہونا اعضاء کا بولنا ہے۔ماہر طبیب وہی ہوتا ہے جو علامات سے بیماری کا پتا لگالے۔اسلام کا خدا تو علیم و خبیر ہستی ہے کیا علیم و خبیر ہستی حواس خمسہ کے ذریعے کردہ گناہوں کو معلوم نہیں کر سکتی۔استعارہ کی زبان میں یہ کہا گیا ہے کہ حواس خمسہ اللہ کے سامنے گواہی دیں گے۔جب اعضاء گواہی دیں گے تو انسان کی کیا مجال کہ وہ اپنے کردہ گناہوں سے انکار کرے دراصل اعضاء کے کلام کو انسان کے کردہ گناہوں کے خلاف شہادت کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔

مزید وضاحت کے لیے ایک اور مثال پیش کر دیتا ہوں اگر کوئی شخص کسی امیر کے گھر جائے تو اس کی جائے آرائش کی ہر چیز اس کی امارت کے متعلق زبان حال سے گواہی دے رہی ہے تو یہی کہا جائے گا کہ جائے رہائش کا ذرہ ذرہ بول رہا تھا۔اسی طرح کسی غریب آدمی کی جھونپڑی میں داخل ہوں تو اس جھونپڑی کی ہر چیز غربت کے متعلق گواہی دے رہی ہوتی ہے۔یہ ایک بلیغ اشارہ ہے جس کو ادبی ذوق نہ رکھنے والے نہیں سمجھ سکتے۔

قرآن مجید ایک فصاحت و بلاعت کا ایک اعجازی نمونہ ہے اسی قسم کے استعارات کنایات وغیرہ کی وجہ سے معجزہ قرار دیا گیا ہے۔

......☆......

اعمال کا تولنا

(کیا خدا قیامت کے دِن ترازو لے کر بیٹھا ہوا ہوگا)

اعتراض: خدا ترازو لے کر بیٹھے گا۔ خدا کو تکڑی بٹے کی کیا ضرورت پڑی۔ اعمال کو مادی چیزیں (ترک اسلام سوال 30)

جواب: اعمال کے حساب کتاب کے لیے قرآن مجید میں لفظ المیزان بھی استعمال کیا گیا ہے ارشاد الٰہی ہے۔

وَنَضَعُ الْمَوَازِيْنَ الْقِسْطَ لِيَوْمِ الْقِيٰمَةِ (الانبیاء 47:21)

اور ہم قیامت کے دن کے لیے انصاف کی میزانوں کو قائم کرتے ہیں۔

ساتھ ہی الموازین القسط کی وضاحت کر دی۔

فَلَا تُظْلَمُ نَفْسٌ شَيْئًا وَاِنْ كَانَ مِثْقَالَ حَبَّةٍ مِّنْ خَرْدَلٍ اَتَيْنَا بِهَا وَكَفٰى بِنَا حٰسِبِيْنَ (الانبیاء 47:21)

پس کسی شخص پر کچھ بھی ظلم نہ کیا جائے گا اگر ایک رائی کے دانے کے برابر بھی عمل ہوگا ہم اسے لے آئیں گے اور ہم حساب کرنے والے کافی ہیں۔

یعنی اللہ کے نزدیک اعمال کا حساب کتاب ایسا ہوگا اور ایسا انصاف ہوگا رائی کے دانے کے برابر بھی کوئی بھی عمل حساب کتاب سے باہر نہیں رہے گا گویا انسانوں کے وزن سے مراد انصاف ہے۔ دوسری جگہ یہ بیان ہے۔

اَلْوَزْنُ يَوْمَئِذِ ِ الْحَقُّ (الاعراف 8:7)

اور وزن اس دن حق ہے۔

ان الفاظ کی مزید وضاحت کر دی۔

فَمَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِيْنُهٗ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ وَمَنْ خَفَّتْ مَوَازِيْنُهٗ فَاُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ بِمَا كَانُوْا بِاٰيٰتِنَا يَظْلِمُوْنَ (الاعراف 9,8:7)

پس جس کی نیکیوں کا پلڑا بھاری ہوگا پس وہی کامیاب ہونے والے ہیں اور جس کی نیکیوں کا پلڑا ہلکا ہوگا پس وہی لوگ جنہوں نے اپنے آپ کو گھاٹے میں ڈالا اور وہ ہماری آیتوں کے بارے میں ناانصافی کرتے تھے۔

قرآن مجید میں ''الوزن'' ''المیزان'' کے الفاظ وسیع معنی میں استعمال ہوئے ہیں، رسولوں کے بارے میں آتا ہے۔

اَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَالْمِيْزَانَ

ہم نے ان کے ساتھ کتاب اور میزان اتاری۔

دوسری جگہ آتا ہے۔

وَالسَّمَآءَ رَفَعَهَا وَوَضَعَ الْمِيْزَانَ

آسمانوں کو بلند کیا اور میزان رکھی۔

ان دونوں مقامات میں کسی مفسر نے وہ ترازو مراد نہیں لیا جس سے اشیاء تولی جاتی ہیں بلکہ ہر جگہ اس کے معنی الگ الگ ہیں اسی طرح اعمال کے ساتھ جہاں المیز ان کا لفظ آیا ہے تو اس سے مراد عدل ہے جو روز محشر کو ہوگا عدل وانصاف کی تعبیر وتفسیر لفظ المیز ان سے کی ہے اس موضوع کو قرآن مجید میں ان الفاظ میں بیان کیا ہے۔

فَمَنْ يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَرَهُ وَمَنْ يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَرَهُ (الزلزال 8:7)

جو کوئی رائی کے دانہ کے برابر نیکی کرے گا اس کے نتیجہ کو دیکھ لے گا اور جو کوئی رائی کے دانے کے برابر بدی کرے گا اس کو دیکھ لے گا۔

يَوْمَ تَجِدُ كُلُّ نَفْسٍ مَّا عَمِلَتْ مِنْ خَيْرٍ مُّحْضَرًا وَمَا عَمِلَتْ مِنْ سُوْءٍ تَوَدُّ لَوْ اَنَّ بَيْنَهَا وَبَيْنَهٗٓ اَمَدًا بَعِيْدًا (آل عمران 30:3)

جس دن ہر شخص جو کچھ اس نے نیکی کی ہے موجود پائے گا اور جو کچھ اس نے بدی کی ہے آرزو کرے گا کہ اس کے اور اس (بدی) کے درمیان لمبا فاصلہ ہوتا۔

یہی موضوع اعمال کے حساب کتاب کا ہے لیکن بیان کرنے کا پیرایہ الگ ہے ان آیات میں بھی عدل وانصاف کرنا مراد ہے۔ گویا اللہ تعالیٰ نے اپنی صفت عدل کے ساتھ ہر شخص پر اس کے اعمال نیک و بد کی مقدار ظاہر کر دے گا پس اس صفت عدل کو میزان اور وزنِ اعمال سے تعبیر کیا۔

عموماً ہر ملک میں بڑی عدالتوں کا نشان ترزو (المیز ان) ہوتا ہے کیا منصف ترازو لے کر بیٹھے ہوئے ہوتے ہیں جہاں لوگوں کے مقدمات کو تول رہے ہوتے ہیں۔ ترازو نشان کا مطلب صرف یہی ہے کہ عدالتوں میں منصف انصاف سے کام لیں گے فیصلہ سچائی کے ساتھ کیا جائے گا۔ عدالتوں کا نشان ترازو انصاف کے لیے ایک استعارہ ہے۔ یہی استعارہ انصاف کے لے قرآن مجید میں بیان کیا گیا ہے۔

یہی اصطلاح (المیز ان) ریاضی میں بھی استعمال ہوتی ہے جمع کی میزان، تفریق کی میزان، ضرب کی میزان اور تقسیم کی میزان۔ کیا جب ریاضی میں یہ اصطلاح استعمال ہوتی ہے تو کیا معترض اس سے مراد ترازو لیتا ہے جس سے دکاندار چیزوں کا وزن کرتا ہے۔ ریاضی میں استعمال کرنے والوں کے نزدیک اس اصطلاح کا مفہوم اور ہوتا ہے وہ دکان داروں والا نہیں۔

الغرض مختلف مذاہب کے بانیوں نے نیکی اور بدی اور ان کے نتائج واثرات کو مختلف انداز اور استعارات کے رنگ میں بیان کیا ہے۔ یہ استعارے انسان کو سمجھانے کے لیے ہیں۔ اسلام نے بھی نیکی اور بدی اور ان کے نتائج اور اثرات کو مختلف طریقوں سے بیان کیا ہے۔ بتانا یہ مقصود ہے کہ انسان جو عمل کرتا ہے اس کا نتیجہ حق کے ساتھ ظاہر ہوگا۔ اللہ تعالیٰ کی عدالت میں کسی سے بے انصافی نہیں ہوگی۔
اسلام نے نیکی اور بدی اور ان کے اثرات اور نتائج کو جس رنگ میں بیان کیا ہے اس سے بہتر کوئی اور بیان نہیں ہوسکتا۔

......☆......

نفخ فی الصور پر اعتراض

اعتراض :ایک دن نرسنکھا پھونکا جائے گا اور لوگ مرجائیں گے۔ سوالات کس جگہ، کس طرح آواز پہنچے گی۔ کیونکر مریں گے۔ یہ واقعات کب ہوں گے۔ کیا خدا معطل ہو جائے گا۔ (ترک اسلام دھرم پال سوال 26)

جواب :صور میں پھونکنا ایک استعارہ ہے جس کا مقصد انسانوں کو اٹھانا اور جمع کرنا ہے۔ تمام دنیا میں صور کا پھونکا جانا لوگوں کو ایک جگہ جمع

کرنے کی علامت ہے۔فوجوں میں سپاہیوں کو ایک جگہ جمع کرنے کے لیے صور پھونکا جاتا ہے۔گویا بعث بعد الموت کو استعارہ کے رنگ میں نفخ فی صور کے الفاظ سے تعبیر کیا گیا ہے اللہ تعالیٰ کی مشیت ''کن فیکون'' کی یہ عملی تفسیر ہے موجودہ عالم کو نیست و نابود کرنے اور ایک نیا عالم معرض وجود میں لانے کے لیے اللہ تعالیٰ فرشتے کے ذریعے حکم صادر کرے گا تو ایک نیا عالم وجود میں آ جائے گا یہ نفخ صور پرانی دنیا کو بدل کر ایک نیا عالم لانے کا نشان ہے انقلاب عظیم کے وقت کائنات کا ذرہ ذرہ اس باطنی بگل کی آواز ہے۔

☆

کیا دیدار الٰہی یا لقا باللہ ممکن ہے؟

اعتراض: دیدار الٰہی (رویئت باری تعالیٰ۔لقاء اللہ) ممکن نہیں (ملاحدہ)

جواب :آخرت میں دیدار الٰہی (رویئت باری تعالیٰ۔لقاء اللہ) پر بھی ملاحدہ اعتراض کرتے ہیں۔یہ کیسے ممکن ہے ایک طرف خدا کو جسم کے بغیر تعلیم کرنا پھر یہ کہنا کہ اس بغیر جسم ہستی کو عالم قیامت میں دیکھا جائے گا۔قرآن مجید میں آتا ہے۔

يَاَيُّهَا الْاِنْسَانُ اِنَّكَ كَادِحٌ اِلٰى رَبِّكَ كَدْحًا فَمُلٰقِيْهِ (الانشقاق 6:84)

اے انسان تو سخت کوشش کر کے اپنے رب کی طرف پہنچنے والا پھر اسے ملنے والا ہے۔

یہ آیت ظاہر کرتی ہے کہ اتصال باللہ (رویئت باری تعالیٰ۔لقاء اللہ دیدار الٰہی) ایک محنت طلب معاملہ ہے اور مجاہدہ کی ضرورت ہے۔ارشاد الٰہی ہے۔

وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَيَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا (عنکبوت : 79)

جو لوگ ہمارے راستہ میں جہاد کرتے ہیں (اللہ سے ملنے کی کوشش کرتے ہیں) ہم ان کو اللہ تک پہنچنے کے راستہ کی راہنمائی کر دیتے ہیں اس آیت میں بھی اللہ تعالیٰ سے روحانی تعلق قائم کرنے کے لیے مجاہدہ کو ضروری قرار دیا ہے ایک اور مقام پر رویئت باری تعالیٰ کے متعلق آیا ہے۔

وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ نَّاضِرَةٌ اِلٰى رَبِّهَا نَاظِرَةٌ (القيمة: 24:23)

یعنی قیامت کے دن جنتیوں کے چہرے تر و تازہ ہوں گے وہ اپنے رب کی طرف دیکھ رہے ہوں گے۔

ملاحدہ اور دیگر معترضین کو یہ امر یاد رکھنا چاہیے کہ بہشت اور دوزخ کی جزا و سزا کا آغاز اس دنیا سے شروع ہو جاتا ہے۔احادیث یہ ظاہر کرتی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے دیدار الٰہی کیا صرف رسول کریم ﷺ نے ہی نہیں بلکہ اولیاء کرام نے بھی اس نعمت عظمیٰ (دیدار الٰہی) کو پایا۔حضرت امام ابو حنیفہ کی نسبت مروی ہے کہ آپ نے فرمایا کہ میں نے اللہ تعالیٰ کو ننانوے دفعہ خواب میں دیکھا۔اس کے بعد ایک دفعہ دیکھا جس سے سو دفعہ دیکھنا پورا ہو گیا اس طرح احمد بن حنبل کی نسبت مروی ہے کہ آپ نے فرمایا کہ میں نے اللہ تعالیٰ کو رویاء میں دیکھا۔

باریک نکتہ:

اللہ تعالیٰ نے جس طرح حواس خمسہ دیئے ہیں انسان ان سے دیکھتا ہے۔سنتا ہے چکھتا ہے محسوس کرتا ہے اسی طرح اللہ تعالیٰ نے انسان کو باطنی حواس خمسہ دیئے ہیں۔انسان ان حواس سے وہی سنتا ہے ظاہر دیکھتا، چکھتا اور محسوس کرتا ہے جس طرح حواس ظاہری سے۔ ظاہری حواس اور باطنی حواس میں ایک گہرا تعلق ہے اگر یہ تعلق قائم رہے تو ظاہری حواس خارج سے علم حاصل کر سکتے ہیں ورنہ نہیں مثلاً قلب کا

نظام خراب ہو جائے تو انسان کی آنکھ دیکھ رہی ہوتی ہے چونکہ قلب کا نظام خراب ہو چکا ہے اس وجہ سے انسان کی آنکھ نے جو کچھ دیکھا ہے اس کو قلب میں منتقل نہیں کیا یا دیکھی ہوئی چیز کا شعور قلب میں منتقل نہیں ہوا اس وجہ سے انسان باوجود یکہ وہ خارج میں کسی چیز کو دیکھ رہا ہے لیکن اس کا شعور ذہن میں منتقل نہ ہونے کی وجہ سے وہ علم کا درجہ نہیں پاتا اسی طرح خارج سے آواز سن رہا ہے لیکن قلب میں منتقل نہ ہونے کی وجہ سے وہ شعور علم کا درجہ حاصل نہیں کر رہا یہ مرض ہے ہزاروں مریض ایسے دیکھے جا سکتے ہیں کہ وہ دیکھ اور سن رہے ہوتے ہیں لیکن ان کو شعور نہیں ہوتا کہ وہ کیا دیکھ اور کیا سن رہے ہیں بعض ایسے آدمی بھی ہیں جو رنگوں میں تمیز نہیں کر پاتے اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کی وہ قلبی قوت مردہ ہو چکی ہے جو رنگوں میں تمیز کرتی ہے اسی طرح ایسے آدمی بھی پائے جاتے ہیں۔ جو ذائقہ میں تمیز نہیں کر سکتے۔ اس کو بھی یہی بیماری ہے۔ الغرض ظاہری حواس اور باطنی حواس میں ایک گہرا واسطہ ہے اس سے ہی انسان اعلیٰ زندگی بسر کر رہا ہے۔ یہ بات آج سائنس نے بھی ثابت کر دی ہے اس لیے باطنی حواس کا انکار محض جہالت ہے۔

رویت باری تعالیٰ (دیدار الٰہی، لقاء اللہ وغیرہ) کا تعلق حواس باطنی سے ہے انسان ظاہری آنکھ سے مادی اشیاء دیکھتا ہے اور باطنی آنکھ سے روحانی نظارے کرتا ہے۔ رویت باری تعالیٰ (دیدار الٰہی) ایک روحانی نظارہ ہے جس کو انسان کی باطنی (روحانی) آنکھ دیکھ رہی ہوتی ہے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے معراج میں اللہ تعالیٰ کو دیکھا۔ اسی طرح رسول کریم ﷺ نے کئی بار رویاء میں دیکھا۔ یہ سب روحانی نظارے ہیں۔ ان روحانی نعمتوں کا آغاز اسی دنیا میں شروع ہو جاتا ہے وہی پوری شان اور مکمل صورت میں قیامت کے دن ظہور میں آئیں گی قیامت کے روز دیدار الٰہی روحانی بصارت سے کرے گا۔ اسلامی اصطلاح میں اسی کو لقاء الٰہی، رویت باری تعالیٰ کہا گیا ہے۔ جنت اللہ تعالیٰ کی ملاقات کی جگہ ہے اور دوزخ اللہ تعالیٰ کی ملاقات سے محرومی کی جگہ معترض کو یہ بھی علم ہونا چاہیے کہ مرنے کے بعد اس کی روح اس جسد خاکی سے جدا ہو جاتی ہے تو اس کو اللہ تعالیٰ اس کے اعمال حسنہ یا اعمال سیئہ کے مطابق ایک جسم عطا کرے گا اعمال حسنہ کا جسم نوری ہوگا اور اعمال سیئہ کا جسم ناری ہوگا۔ جس طرح اللہ تعالیٰ نے روح کو اس دنیا میں اس کی مناسبت سے ایک جسم عطا کیا ہے اسی طرح آخرت میں بھی وہاں کی دنیا کے مطابق عطا کرے گا۔ اس دنیا کا عطا کردہ جسم رویت باری تعالیٰ کرنے کا اہل ہوگا۔ یہ دقیق اور باریک نکات عقل سے حل نہیں ہوتے۔ ان کو سمجھنے کے لیے انبیاء علیہم السلام کی تعلیم کا جاننا ضروری ہے اس کے ساتھ وہ راستہ بھی اختیار کرنا چاہیے جس پر چل کر انسان نفسانی اور سفلی جذبات پر موت طاری کر لیتا ہے اور دل میں اللہ تعالیٰ کی محبت کی آگ روشن ہو جاتی ہے جو ہوا و ہوس اور غیر اللہ کی محبت کو بھسم کر دیتی ہے ایک نئی روحانی زندگی شروع ہو جاتی ہے انسان اپنی روحانی بصارت سے دیدار الٰہی کر لیتا ہے کوئی نبی ایسا نہیں جو دیدار الٰہی سے محروم رہا ہو۔ تمام مذاہب کا متفقہ مسئلہ ہے۔

......☆......

اعمال کا لکھا جانا

اعتراض: کیا اللہ تعالیٰ یا اس کے فرشتے قلم و دوات لے کر انسانوں کے اعمال لکھ رہا ہے (ملاحدہ اور دیگر معترضین)

جواب: یہ اعتراض بھی ویسے ہی لایعنی اور عربی زبان کے رموز کو نہ سمجھنے کی وجہ سے ہے۔ ارشاد الٰہی ہے۔

أَمْ يَحْسَبُونَ أَنَّا لَا نَسْمَعُ سِرَّهُمْ وَنَجْوَاهُم بَلَىٰ وَرُسُلُنَا لَدَيْهِمْ يَكْتُبُونَ (الزخرف 80:43)

کیا وہ سمجھتے ہیں کہ ہم ان کی چھپی ہوئی باتوں اور ان کی سرگوشیوں کو نہیں جانتے اور ہمارے بھیجے ہوئے ان کے پاس لکھتے ہیں۔

دوسری جگہ آتا ہے۔

هَٰذَا كِتَٰبُنَا يَنطِقُ عَلَيْكُم بِالْحَقِّ إِنَّا كُنَّا نَسْتَنسِخُ مَا كُنتُمْ تَعْمَلُونَ (الجاثیہ 29:45)

یہ ہماری کتاب تمہارے خلاف حق کے ساتھ بولتی ہے ہم لکھتے ہیں جو کچھ تم کر رہے ہو۔

قرآن مجید میں اعمال نامے کے ساتھ مختلف الفاظ استعمال کیے ہیں کہیں لکھا جانے کا لفظ ہے اور کہیں اعمال کا وزن کیا جانا کہیں اِقْرَءْ كِتَٰبَكَ، کے الفاظ آئے ہیں کہیں ہے کہ اعمال نامے کو گویائی دی جائے گی۔ ایک جگہ ہے کہ انسان کی گردن کے ساتھ چمٹائے جائیں گے۔ ارشاد الٰہی ہے۔

وَكُلَّ إِنسَٰنٍ أَلْزَمْنَٰهُ طَٰٓئِرَهُۥ فِى عُنُقِهِۦ وَنُخْرِجُ لَهُۥ يَوْمَ الْقِيَٰمَةِ كِتَٰبًا يَلْقَىٰهُ مَنشُورًا (بنی اسرائیل 13:17)

ہر انسان کے اعمال کو ہم نے اس کی گردن میں چمٹایا ہے اور ہم اس کے لیے قیامت کے دن ایک کتاب نکالیں گے جسے وہ کھلا ہوا پائے گا۔

کہیں اس اعمال نامے کے پڑھنے کے لیے دوسروں کو بلایا جائے گا۔ ارشاد الٰہی ہے۔

هَآؤُمُ اقْرَءُوا كِتَٰبِيَهْ (الحاقۃ 19:69)

میری کتاب پڑھو۔

انسان کے اندر ہی اس کے اعمال سے ایک باطنی وجود تیار کیا جاتا ہے یہی وجود ہی اعمال نامہ ہے یہ ایک کتاب ہے جس میں اس کے تمام اعمال محفوظ ہوتے جاتے ہیں جس میں ہر عمل کا نتیجہ ثبت ہو جاتا ہے مذکورہ تمام قرآنی آیات میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ اعمال کی یہ کتابت (باطنی تحریر) اس دنیا میں انسان کی آنکھ سے پوشیدہ ہے قیامت کے روز ایک کھلی کتاب بن جائے گی۔ اسی مضمون کو ایک دوسری آیت میں بیان کیا گیا ہے۔

اِقْرَأْ كِتَابَكَ كَفَىٰ بِنَفْسِكَ الْيَوْمَ عَلَيْكَ حَسِيبًا (بنی اسرائیل 14:17)

اپنی کتاب پڑھ آج تو خود ہی اپنا حساب لینے کے لیے کافی ہے۔

بالفاظ دیگر انسان کے اعمال کے نتائج اس قدر واضح اور بدیہی ہو جائیں گے کسی بیرونی محاسبے کی ضرورت ہی نہیں رہے گی ہر انسان اپنا اعمال نامہ خود ہی پڑھ لے گا اور ہر انسان اپنے اعمال نامے کی وجہ سے جنت اور دوزخ میں جائے گا۔ ارشاد الٰہی ہے۔

إِنَّ كِتَٰبَ الْفُجَّارِ لَفِى سِجِّينٍ (المطففین 7:83)

یعنی بدکاروں کے اعمال نامے قید خانے میں ہیں۔

إِنَّ كِتَابَ الْأَبْرَارِ لَفِى عِلِّيِّينَ (المطففین 18:83)

نیکوں کی کتاب بلند مقام پر ہے۔

قرآن مجید میں جہاں اعمال نامے کے لکھے جانے کا ذکر ہے اس سے مراد انسان کے اعمال کی حفاظت ہے کہ انسان کے اعمال ایسے محفوظ ہیں گویا ان کو لکھ لیا گیا ہے۔ یہ قرآن مجید کا اعجازی طرز بیان ہے ادبی ذوق کی محرومی کی وجہ سے ملاحدہ اور دیگر معترضین نے یہ اعتراض کیا ہے۔ اس قسم کا اظہار بیان ہر زبان میں پایا جاتا ہے۔

قرآن مجید میں تمام مابعد الطبیعات مسائل استعارہ کی زبان میں بیان ہوئے ہیں۔ ایک تو ان مسائل کو قرآن مجید کی دوسری آیات کی روشنی میں سمجھنا چاہیے۔ قرآن مجید کہیں اختصار سے کوئی مسئلہ بیان کرتا ہے پھر اسی موضوع کو دوسری جگہ مزید وضاحت سے بیان کر دیتا ہے اس طرح ایک ہی موضوع کو مختلف انداز میں مختلف جگہوں پر بیان کر دیا جاتا ہے اور کوئی ابہام نہیں رہتا معترضین اس اصول کو سامنے نہیں رکھتے اور اپنی لاعلمی سے اعتراض کر دیتے ہیں۔ اعمال کی کتاب کا موضوع بھی ایسا ہی ہے اس موضوع کو مختلف انداز میں بیان کیا گیا ہے اگر تمام آیات کو سامنے رکھا جائے تو اعتراض خود بخود دور ہو جاتا ہے۔

......☆......

قبر میں فرشتوں کے سوالات

اعتراض: فرشتگان قبر کے سوالات کس زبان میں ہوں گے۔

جواب: تمام زبانیں اللہ تعالیٰ نے سکھائی ہیں پھر کیا خدا کا فرستادہ ہر زبان سے قاصر رہ سکتا ہے وہ ہر زبان بول سکتا ہے۔ دوم یہ روحانی حالتیں ہیں جن کا اظہار قرآن مجید یا احادیث میں کیا گیا ہے۔ انسان کو یہ بتایا گیا ہے کہ اس کے اعمال محفوظ ہیں عالم برزخ اور عالم حشر میں اس کے اعمال کے نتائج اور اثرات واضح ہوں گے۔ انسان کے اعمال کے نتائج کو مختلف انداز میں بیان کیا گیا ہے۔

قبر میں منکر و نکیر کے آنے کا راز اور ان کے ناموں کی وجہ تسمیہ۔

عالم قبر اس عالم دنیا میں کردہ افعال کے اظلال اور نتائج کا نام ہے جن کا واضح شکل میں ظہور ہو گا جو انسان اس دنیا میں اللہ کے احکام کو پس پشت ڈال دیتا ہے اور اللہ کی یاد سے غافل اور لاپرواہ رہتا ہے۔ اور دنیاوی مشاغل میں تمام زندگی بسر کر دیتا ہے تو عالم قبر (برزخ) میں اس کو دو خوفناک اور مہیب فرشتے نظر آئیں گے۔ اگر کوئی انسان احکام الٰہی کے مطابق زندگی بسر کرتا ہے اور اس کا دل یاد الٰہی سے منور ہے تو فرشتے خوش شکل میں آتے ہیں جو اس سے دریافت کرتے ہیں۔

مَنْ رَّبُّكَ وَمَادِيْنُكَ وَمَا قَوْلُكَ فِي النَّبِيِّ صلی اللہ علیہ وسلم

یعنی تیرا پروردگار کون ہے؟ تیرا دین کیا ہے؟ حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق تیری کیا رائے ہے۔ اگر انسان کے بد اعمال ہیں تو اس کے پاس منکر و نکیر کا آنا ڈراونی شکل میں ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے نام برائے تنبیہ و عبرت منکر و نکیر ٹھہرے ہیں ورنہ نیک اور صالح انسان پر خوش شکل فرشتوں کا نزول ہوتا ہے۔ گویا انسان پر فرشتے اس کے اعمال کے موافق شکلوں میں ظاہر ہوتے ہیں اور وہ ایسے مواقع پر ظاہر ہو کر انسان کو آرام یا دکھ پہنچاتے ہیں اور انسان اپنی آنکھ سے ان فرشتوں کو دیکھتا ہے۔ گویا عالم برزخ میں انسان کے اپنے کردہ اعمال کی جزا و سزا کا ظہور ہے۔ ترمذی شریف میں لکھا ہے۔

عَنْ اَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا اُقْبِرَ الْمَيِّتُ اَوْقَالَ اَحَدُكُمْ اَتَاهُ مَلَكَانِ اَسْوَدَانِ اَزْرَقَانِ يُقَالُ لِاَحَدِهِمَا الْمُنْكَرُ وَلِلْاٰخِرِ النَّكِيْرُ فَيَقُوْلَانِ مَاكُنْتَ تَقُوْلُ فِي هٰذَ الرَّجُلِ فَيَقُوْلُ مَاكَانَ يَقُوْلُ هُوَ عَبْدُ اللّٰهِ وَرَسُوْلُهُ اَشْهَدُ اَنْ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهُ وَرَسُوْلُهُ فَيَقُوْلُوْنَ قَدْ كُنَّا نَعْلَمُ اَنَّكَ تَقُوْلُ هٰذَا ثُمَّ يُفْسَحُ لَهُ فِي قَبْرِهِ سَبْعُوْنَ ذِرَاعًا فِي سَبْعِيْنَ ثُمَّ يُنَوَّرُ لَهُ فِيْهِ ثُمَّ يُقَالُ نَمْ فَيَقُوْلُ اَرْجِعُ اِلٰى اَهْلِي فَاُخْبِرُهُمْ فَيَقُوْلَانِ نَمْ كَنَوْمَةِ الْعَرُوْسِ الَّذِي لَا يُوْقِظُهُ اِلَّا اَحَبُّ اَهْلِهِ اِلَيْهِ حَتّٰى يَبْعَثَهُ اللّٰهُ مِنْ مَضْجَعِهِ ذٰلِكَ وَاِنْ كَانَ مُنَافِقًا

قَالَ سَمِعْتُ النَّاسَ يَقُوْلُوْنَ فَقُلْتُ مِثْلَهٗ لَا اَدْرِي فَيَقُوْلَانِ قَدْ كُنَّا نَعْلَمُ اِنَّكَ تَقُوْلُ ذَالِكَ لَا دَرَيْتَ وَلَا تَلَيْتَ فَيُقَالُ لِلْاَرْضِ الْتَامِي عَلَيْهِ فَتَلْتَامُ عَلَيْهِ فَتَخْتَلِفُ اَضْلَاعُهٗ فَلَا يَزَالُ فِيْهَا مُعَذَّبًا حَتّٰى يَبْعَثَهُ اللّٰهُ مِنْ مَضْجَعِهٖ ذٰلِكَ ۔

یعنی حضرت ابو ہریرہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ کہ میت دفن کی جاتی ہے یا فرمایا کوئی تم میں سے۔ تو اس کے پاس دو فرشتے سیاہ رنگ کیری آنکھوں والے آتے ہیں ایک کو منکر اور دوسرے کو نکیر کہتے ہیں پھر وہ دونوں اس کو کہتے ہیں کہ تو اس مرد کے بارے میں کیا کہتا ہے پس اگر وہ شخص نیک بندہ ہو تو وہی کہتا ہے جو کچھ دنیا میں وہ کہتا تھا کہتا ہے کہ وہ اللہ کا بندہ ہے اور اس کا رسول ہے گواہی دیتا ہوں میں اس امر کی کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور حضرت محمد اس کے بندے اور رسول ہیں پس وہ فرشتے کہتے ہیں کہ ہم جانتے تھے کہ تو یہی بات کہے گا۔ پھر اس کی قبر میں ستر در ستر گز فراخی کی جاتی ہے اور اس کی قبر میں اس کے لیے روشنی کی جاتی ہے پھر اس کو کہا جاتا ہے کہ تو سورہ پس وہ کہتا ہے کہ تو سورہ۔ پس وہ کہتا ہے کہ میں اپنے گھر والوں کے پاس جاتا ہوں اور ان کو خبر دوں وہ دونوں اس کو کہتے ہیں کہ اس دلہن کی طرح سورہ کہ اس کو کوئی نہیں جگاتا مگر وہ جو اس کے اہل میں سے اس کو زیادہ پیارا ہو یہاں تک کہ اس کو اللہ تعالیٰ اس کے لیٹنے کی جگہ سے اٹھائے اگر وہ منافق ہو تو وہ کہتا ہے۔ کہ میں نے لوگوں سے سنا تھا کہ وہ اس طرح کہتے تھے پس میں بھی اسی طرح کہتا تھا۔ میں کچھ نہیں جانتا پس وہ فرشتے کہتے ہیں کہ ہم جانتے تھے تو یہی کہے گا پھر زمین کو کہا جاتا ہے کہ اس پر مل جا۔ پس وہ اس پر مل جاتی ہے اس کی پسلیاں ادھر کی ادھر ہو جاتی ہیں اور اس کو قیامت تک اس عذاب میں رکھا جاتا ہے۔

اس حدیث میں الفاظ لَا دَرَيْتَ وَلَا تَلَيْتَ ایک دوسری حدیث سے نقل کیے گئے ہیں جس کے معنی ہیں کہ وہ فرشتے اس کو کہتے ہیں تو نے حق کو نہ جانا اور نہ تو نے قرآن کی تلاوت کی قرآن ہی انسانوں کی ہدایت کا ذریعہ ہے اور انسان کے دل کی میل کو دور کرتا ہے اور دل میں روشنی پیدا کرتا ہے۔ جو شخص تلاوت قرآن نہیں کرتا وہ گویا احکام قرآن کو پس پشت ڈال رہا ہے۔

عقل اور مابعد الطبیعیاتی مسائل

مابعد الطبیعیاتی دقیق مسائل پر بحث ختم کرنے سے پہلے ایک قاعدہ کلیہ بیان کیا جاتا ہے تا کہ معترضین کو دقیق مسائل سمجھنے میں آسانی ہو۔ اللہ تعالیٰ نے حقائق الاشیاء معلوم کرنے کے لیے مختلف طریقے رکھے ہیں بعض خواص آنکھ کے ذریعے معلوم کیے جاتے ہیں اور بعض صداقتوں کا علم کان سے ہوتا ہے۔ بعض ایسے حقائق بھی ہیں جن کو حس مشترکہ سے معلوم کیا جاتا ہے بعض ایسی بھی سچائیاں ہیں جن کو مرکزی قویٰ یعنی دل سے معلوم کیا جاتا ہے۔ بعض ایسی چیزیں ہیں جن کا تعلق قوت ذائقہ سے ہے۔ بعض کا قوت سامعہ سے تعلق ہے۔ الغرض مختلف حقائق کے جاننے کے لیے مختلف قوتیں ہیں۔ اگر قوت باصرہ سے معلوم کی جانے والی حقیقت کو قوت سامعہ سے معلوم کرنے کی کوشش کی جائے تو یہ جہالت ہوگی تو انسان اصل حقیقت کو جاننے سے قاصر رہے گا مثلاً نمک کا ٹکڑا کانوں پر رکھیں تو اس کا ذائقہ معلوم کرنے کی کوشش کی جائے تو اس کا مزہ معلوم نہیں کر سکیں گے اسی طرح آم کا مزہ آنکھ سے معلوم کرنا چاہیں تو اس کا مزہ معلوم نہیں کر سکیں گے۔ آم کے گودے کو زبان پر رکھیں گے تو مزہ معلوم ہوگا۔ اس قاعدہ کلیہ کو ہر شخص جانتا ہے۔ جو حقیقت قوت ذائقہ سے معلوم کی جانے والی ہے اس کو قوت ذائقہ سے ہی معلوم کریں گے جو قوت شامہ سے معلوم کی جانے والی چیز ہے تو اس کو قوت شامہ سے معلوم کیا جائے گا۔ جو قوت باصرہ سے معلوم کرنے والی صداقت ہے اس کو قوت باصرہ سے معلوم کیا جائے گا جو عقل کے ذریعے معلوم کی جانے والی صداقت ہے اس کو عقل سے معلوم کیا جائے گا۔ مابعد الطبیعاتی مسائل کا بھی یہی معاملہ ہے حکماء نے ان مسائل کو عقل کے ذریعے معلوم کرنے کی کوشش کی ہے تو انہوں نے قدم قدم پر ٹھوکریں کھائی ہیں۔ ان مسائل کا حل عقل کے پاس نہیں۔ یہ کشفی آنکھ کا کام ہے جس کے پیچھے نور نبوت کام کر رہا ہے۔ الغرض تمام مابعد الطبیعاتی

مسائل کو اللہ تعالیٰ نے انبیاء علیہم السلام کی باطنی (روحانی) آنکھ پر وارد کیے۔ انہوں نے ان کا مشاہدہ کیا پھر انہوں نے انسانوں کے سامنے پیش کیا۔ یہ اَن دیکھی صداقتیں ہیں۔ جن کو صرف باطنی (روحانی) آنکھ ہی اللہ کے نور سے دیکھتی ہے اور وہی ان رازوں کو افشا کرتی ہے۔ یہ مسائل عقل کے ذریعے حل نہیں کیے جاسکتے۔ یہی قاعدہ کلیہ ہے کہ ہر صداقت اور حقیقت کو اس کی قوت سے جانچنے کی کوشش کی جانی چاہیے لہٰذا اَن دیکھی حقیقتوں کو نور نبوت سے معلوم کیا جائے تو انسان پر اس کی حقیقت واضح ہو جائے گی محض عقل کی ٹامک ٹوئیوں سے معلوم نہیں کی جا سکتیں۔ کیونکہ معترضین نور نبوت سے محروم ہیں اور ان کی روحانی بینائی ضائع ہو چکی ہے۔ وہ ان مسائل کو کب سمجھیں گے۔

☆......☆

دوزخ اور بہشت کا مقام (کہاں ہے)

اعتراض: دوزخ اور بہشت کا مقام کہاں ہے۔ (ملاحدہ)

جواب: دوزخ اور بہشت کا آغاز اس دنیا سے ہی شروع ہو جاتا ہے جیسا کہ دوزخ کے متعلق قرآن مجید میں آتا ہے۔

نَارُ اللّٰهِ الْمُوْقَدَةُ الَّتِیْ تَطَّلِعُ عَلَی الْاَفْئِدَةِ (الھمزہ 104:6,7)

اللہ کی جلائی ہوئی آگ جو دلوں پر چڑھتی ہے۔

مَنْ كَانَ فِیْ هٰذِهٖۤ اَعْمٰی فَهُوَ فِی الْاٰخِرَةِ اَعْمٰی (بنی اسرائیل 17:72)

جو اس دنیا میں (روحانی) اندھا ہے وہ آخرت میں بھی اندھا ہوگا دوزخ اور جنت کا آغاز تو اس دنیا سے شروع ہو جاتا ہے۔

باقی رہا سوال دوزخ اور جنت کا مقام کہاں ہے۔ کدھر ہے اس سوال کا جواب روئے عقل سے نہیں دیا جاسکتا۔ ایک قاعدہ کلیہ ہے عدم علم سے عدم شے لازم نہیں آتی۔ یعنی اگر کسی چیز کا علم نہ ہو تو یہ نہیں کہا جاسکتا کہ وہ چیز ہے نہیں۔ دنیا میں بے شمار چیزیں موجود ہیں ہزارہا مقامات ایسے ہیں جن کا ہمیں علم نہیں ان کا علم نہ ہونے سے یہ استدلال نہیں کیا جاسکتا کہ ان کا وجود ہی نہیں۔

......☆......

رہبانیت اور اسلام (اسلام رہبانیت کا سبق دیتا ہے)

اعتراض: اسلام کا تصور حیات، دنیا سے روگردانی کی تعلیم دیتا ہے۔

(فون در بنادم) بحوالہ مستشرقین اور اسلام حصہ دوم ص 89 دار المصنفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ)

جواب: اسلام وہ دین ہے جس نے دین اور دنیا کے درمیان حسین امتزاج پیدا کیا ہے کلی طور پر دین کی طرف جھک جانے کو ناجائز قرار دیا ہے اور اسی طرح خدا کی یاد سے غافل ہو کر دنیا کے امور میں ہی منہمک اور مشغول ہو جانے کو بھی روحانی موت قرار دیا ہے۔ اسلام نے دنیا کے تمام امور خدا کے احکام کے تحت سرانجام دینے کو عبادت قرار دیا ہے۔ ترک دنیا کو ناجائز اور انسان کی پیدائش کی غرض وغایت کے خلاف قرار دیا ہے۔ قرآن مجید میں آتا ہے۔

وَرَهْبَانِيَّةَ ۨ ابْتَدَعُوْهَا مَا كَتَبْنٰهَا عَلَيْهِمْ اِلَّا ابْتِغَآءَ رِضْوَانِ اللّٰهِ فَمَا رَعَوْهَا حَقَّ رِعَايَتِهَا (الحدید 57:27)

اور رہبانیت (ترک دنیا) انہوں نے خود تراش لیا۔ ہم نے ان پر لازم نہیں کیا مگر اللہ کی رضا کو حاصل کرنے کے لیے (نکالی) پر اس کی وہ نگہداشت نہ کرسکے جو اس کی نگہداشت کا حق تھا۔

اس آیت کریمہ میں اسلام سے قبل امتوں کا ذکر کیا ہے کہ انہوں نے خدا کی رضا کی خاطر دنیا سے منہ موڑ کر رہبانیت اختیار کر لی۔ جس کا انبیاء علیہم السلام نے حکم نہیں دیا تھا۔ انہوں نے یہ بدعت خود اختیار کی ہے۔

اسلام نے نفلی عبادات کی بجا آوری کو اس حد تک جائز قرار دیا ہے کہ دوسرے دنیاوی فرائض کی بجا آوری میں مخل نہ ہو۔ مذہب کا تو مقصد ہی یہ ہے کہ انسان میں بہتر اور عمدہ زندگی بسر کرنے کی صلاحیت پیدا ہو۔ بخاری میں ابو درداء اور سلمان کا واقعہ درج ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ابو درداء اور سلمان میں مواخات قائم کی۔ سلمان حضرت ابو درداء سے ملاقات کے لیے ان کے گھر گئے اور دیکھا کہ ان کی بیوی خستہ حالت میں بیٹھی ہوئی ہے جب اس نے دریافت کیا تو اس نے کہا کہ ابو درداء تارک الدنیا ہو گیا ہے جب ابو درداء گھر آئے تو کھانا رکھا گیا تو اس نے روزہ کی وجہ سے کھانے سے انکار کر دیا حضرت سلمان نے کہا کہ میں کھانا نہیں کھاؤں گا جب تک ابو درداء نہیں کھائیں گے چنانچہ انہوں نے روزہ (نفلی) افطار کر لیا جب رات ہوئی اور ابو درداء تھوڑا سا آرام کرنے کے بعد بیدار ہو گئے تو حضرت سلمانؓ نے ان سے کہا کہ ابھی سو رہیں اور جب رات کا آخری حصہ آیا تو دونوں نے نماز تہجد ادا کی۔ تب سلمانؓ نے ابو درداء سے کہا کہ یقیناً تیرے خدا کا تجھ پر حق ہے تیرے نفس کا تجھ پر حق ہے تیری بیوی بچوں کا تجھ پر حق ہے جب یہ واقعہ رسول کریم ﷺ کی خدمت مین بیان کیا گیا تو آپؐ نے فرمایا سلمان نے درست کہا ہے۔ (بخاری کتاب الصوم بَابُ مَنْ اَقْسَمَ عَلٰی اَخِیْهِ لِیُفْطِرَ فِی التَّطَوُّعِ) ابو درداء کے عمل میں غلو اور تعمق تھا اس وجہ سے رسول کریم ﷺ نے سلمان کی نصیحت کو درست قرار دے کر ابو درداء کو اس عمل سے منع فرما دیا جس سے زندگی کے دوسرے فرائض میں خلل پڑتا تھا عبداللہ بن عمر کہتے ہیں کہ حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو میرے اس ارادہ کی خبر دی گئی کہ میں تا دم مرگ دن بھر روزہ رکھوں گا اور رات بھر عبادت کے لیے جاگا کروں گا جب مجھ سے دریافت کیا گیا تو میں نے اقرار کیا کہ فی الواقعہ میں نے ایسا کہا تھا اس پر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تو اس کی تاب نہیں لا سکے گا۔ اس لیے روزہ بھی رکھ اور روزہ نہ بھی رکھ جاگ بھی اور نیند بھی کر۔ اور مہینہ میں صرف تین دن تک نفلی روزے رکھ۔ کیونکہ نیکی کا بدلہ دس گنا ہے اور تیرا یہ عمل ہر روز کے روزہ رکھنے کے برابر ہو گا۔ میں نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ میں اس سے زیادہ کی طاقت رکھتا ہوں آپؐ نے فرمایا کہ پھر ایک دن روزہ رکھ اور دو دن افطار کر۔ میں نے عرض کی یا رسول اللہ! میں اس سے بھی زیادہ کی طاقت رکھتا ہوں اس پر حضورؐ نے فرمایا کہ پھر ایک دن روزہ رکھ اور ایک دن چھوڑ دے اور داؤد علیہ السلام اسی طرح روزہ رکھا کرتے تھے اور یہ نفلی روزوں کا بہترین طریق ہے میں نے پھر عرض کیا کہ یا رسول اللہ میں اس سے زیادہ طاقت رکھتا ہوں۔ آپؐ نے فرمایا:
''کہ بس اس سے بہتر طریق اور کوئی نہیں۔'' (بخاری کتاب الصوم باب الصوم الدھر)

قرآن مجید میں آتا ہے۔

یُرِیْدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْیُسْرَ وَلَا یُرِیْدُ بِكُمُ الْعُسْرَ (البقرہ 2:185)

اللہ تمہارے لیے آسانی چاہتا ہے اور تمہارے لیے تنگی نہیں چاہتا۔

ترک دنیا اقتضائے فطرت کے خلاف ہے اس لیے موجب عسر ہے۔ اسلام نے انسان کو ترک دنیا کی ہرگز تعلیم نہیں دی۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی بھی اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ اس دنیا میں رہ کر احکام الٰہی کے مطابق زندگی بسر کی اور کسب دنیا کو بھی نیکی اور رضا الٰہی کا ذریعہ قرار دیا اور صحابہ کو کسب دنیا کی ترغیب اور تلقین کی۔

لَا یَقْعُدُ اَحَدُكُمْ عَنْ طَلَبِ الرِّزْقِ وَیَقُوْلُ اللّٰهُمَّ ارْزُقْنِیْ فَقَدْ عَلِمْتُمْ اِنَّ السَّمَآءَ لَا تَمْطُرُ ذَهَبًا وَّلَا فِضَّةً

(المدینۃ والاسلام فرید وجدی)

تم میں سے کسی کو (بیکار) بیٹھ جانا اور رزق کی نہ تلاش کرنا اور یہ کہتے رہنا چاہیے کہ اللہ مجھے رزق عطا فرما کیونکہ تم جانتے ہو کہ آسمان تو سونا چاندی برساتا نہیں۔

حضرت عبداللہ بن عمر سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

مَا يَزَالُ الرَّجُلُ يَسْئَلُ النَّاسَ حَتّٰى يَاتِيَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ لَيْسَ فِي وَجْهِهٖ مُزْعَةُ لَحْمٍ (بخاری کتاب الزکوٰۃ)

جو شخص لوگوں سے مانگتا رہتا ہے اس کے چہرے پر قیامت کے دن گوشت کی بوٹی بھی نہ ہوگی۔

لَيْسَ خَيْرُكُمْ مَنْ تَرَكَ دُنْيَاهُ لِاٰخِرَةٍ وَلَا اٰخِرَةُ لِدُنْيَاهُ بَلْ خَيْرُكُمْ مَنْ اَخَذَ مِنْ هٰذِهٖ وهٰذِهٖ (المدینۃ الاسلام فرید وجدی)

دنیا کو آخرت کے لیے ترک کرنے والا اچھا ہے نہ آخرت کو دنیا کے لیے ترک کرنے والا بلکہ وہ شخص اچھا ہے جو آخرت کو بھی اختیار کرے اور دنیا کو بھی۔

فرمایا:

اَفْضَلُ الْاَعْمَالِ الْكَسْبُ الْحَلَالُ (المدینۃ والاسلام)

سب سے افضل عمل حلال کمانا ہے۔

رافع بن خدیجہ سے روایت ہے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا۔

اَيُّ الْكَسْبِ اَطْيَبُ وَقَالَ عَمَلُ الرَّجُلِ بِيَدِهٖ وَكُلُّ بَيْعٍ مَبْرُوْرٌ (احمد کبیر، بزار اوسط)

اے اللہ کے رسول کون سی کمائی سب سے زیادہ پاک ہے۔ فرمایا آدمی کا اپنے ہاتھوں سے کام کرنا اور ہر وہ تجارت جس میں تقویٰ ہو یعنی جائز۔

فرمایا:۔

تِسْعَةُ اِعْشَارِ الرِّزْقِ فِي التِّجَارَةِ (کنز العمال)

روزی کے 9/10 حصے تجارت میں ہیں۔

الغرض رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کو ہر پیشہ (حرفت صنعت تجارت، علم، حکمرانی وغیرہ) اختیار کرنے کی ہدایت کی۔ صحابہ اور بعد میں آنے والے مسلمانوں نے ہر پیشہ اختیار کیا اور اس میں کمال حاصل کیا کیا کوئی تارک الدنیا بھی صنعت کار، تاجر، عالم، حکمران بنا ہے اگر مسلمانوں نے علم کی شمع جلائی نہ ہوتی تو اہل یورپ سپین کے علم کدوں میں جا کر مسلمان علماء سائنس دانوں کے سامنے زانوئے تلمذ طے نہ کیا ہوتا اور واپس آ کر اس روشنی کو پھیلایا نہ ہوتا تو آج یورپ ظلمت کدہ ہوتا۔ آج دنیا کے گوشے گوشے سے علم کی جو روشنی نظر آ رہی ہے وہ مسلمانوں کی جلائی ہوئی علم کی شمع ہے۔ یہ کام تارک الدنیا کا نہیں ہے مسلمانوں نے زندگی کے ہر شعبہ میں کارہائے نمایاں انجام دیئے۔ لہٰذا اسلام اس دنیا میں زندگی کے ہر شعبہ میں عمل کی تعلیم دیتا ہے ترک دنیا سے منع کرتا ہے۔ حتیٰ کہ اسلام عبادات میں بھی اس غلو سے روکتا ہے جو زندگی کے کاموں میں روک بنتا ہو۔

......☆......

بعث بعد الموت (ممکن ہے)

اعتراض: کیا بعث بعد الموت ممکن ہے (ملاحدہ) ترک اسلام سوال نمبر 28)

جواب: یہ سوال اس دور کے ملاحدہ کا ہی نہیں جب قرآن مجید کا نزول شروع ہوا تھا تو اس دور میں بھی اسی قسم کے ملاحدہ نے یہ سوال کیا تھا اور اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں اس کا جواب دیا تھا کہ وہ خالق اکبر وہ قادر مطلق جو اس وسیع کائنات کو نیست سے ہست میں لایا۔ کیا وہ دوبارہ اس دنیا کو نیست کر کے وجود میں نہیں لا سکتا؟ انسان کی پیدائش کا ذکر کیا گیا ہے وہ کس طرح وہ ایک قطرہ منویہ سے مادر رحم میں مختلف مدارج طے کر کے ایک خوبصورت شکل اختیار کر جاتا ہے۔ اگر قادر مطلق منویہ کی ایک بوند سے ایک شخص کی پیدائش کرنے پر قادر ہے تو وہ دوبارہ نیستی سے ہستی کیوں نہیں کر سکتا۔ اللہ تعالیٰ ایک نئی خلق پر اپنی قدرت تامہ کے متعلق فرماتا ہے۔

اَفَعَيِيۡنَا بِالۡخَلۡقِ الۡاَوَّلِ بَلۡ هُمۡ فِىۡ لَبۡسٍ مِّنۡ خَلۡقٍ جَدِيۡدٍ (ق 15:50)

تو کیا ہم پہلی پیدائش میں تھک گئے ہیں بلکہ وہ نئی پیدائش کے متعلق شبہ میں ہیں۔

یہ آیت واضح کرتی ہے پہلی پیدائش جو نیستی سے ہستی کرنا تھا اس میں اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ عاجز نہیں آئی تو دوبارہ نیستی کے بعد نئی پیدائش کے متعلق یہ کیوں شک وشبہ کیا جاتا ہے۔ کہ وہ کس طرح ہوگی؟ یہ اعتراض اور شک وشبہ صحیح نہیں اللہ، ایک قادر مطلق ہستی ہے وہ اس بات پر قدرت کاملہ رکھتی ہے۔

دوسری پیدائش کو خلق جدید کہا ہے۔ اس میں یہ بات واضح کی گئی ہے کہ نئی پیدائش میں ہمارا یہ جسم پھر نہیں ہوگا بلکہ ایک نئی پیدائش ہو گی۔ روح کو انسان کے اعمال کے مطابق ایک نیا جسم دیا جائے گا۔

دوسری جگہ آتا ہے۔

وَقَالُوۡۤا ءَاِذَا كُنَّا عِظَامًا وَّرُفَاتًا ءَاِنَّا لَمَبۡعُوۡثُوۡنَ خَلۡقًا جَدِيۡدًا قُلۡ كُوۡنُوۡا حِجَارَةً اَوۡ حَدِيۡدًا اَوۡ خَلۡقًا مِّمَّا يَكۡبُرُ فِىۡ صُدُوۡرِكُمۡ فَسَيَقُوۡلُوۡنَ مَنۡ يُّعِيۡدُنَا قُلِ الَّذِىۡ فَطَرَكُمۡ اَوَّلَ مَرَّةٍ (بنی اسرائیل 17:49-51)

اور کہتے ہیں کیا ہم جب ہڈیاں اور چورا چورا ہو جائیں گے تو کیا نئی پیدائش کے لیے اٹھائیں گے کہہ پتھر ہو جاؤ یا لوہا۔ یا کوئی اور مخلوق جو تمہارے دلوں میں بڑی (سخت) معلوم ہوتی ہے پس وہ کہتے ہیں ہمیں کون اٹھائے گا کہہ جس نے تمہیں پہلی مرتبہ پیدا کیا۔

ملاحدہ اور مادہ پرستوں نے ہمیشہ از سر نو جی اٹھنے کو استعجاب کی نظر سے دیکھا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جواب دیا ہے کہ وہ چورا چورا ہو جائیں یا اس سے بھی سخت پتھر اور لوہا بن جائیں جس قادر مطلق خدا نے پہلی مرتبہ نیست سے ہست کیا ہے وہ اب بھی ایک نئی پیدائش پر قدرت کاملہ رکھتا ہے اللہ تعالیٰ کی ایک صفت رب ہے جو ہر چیز کو ایک اعلیٰ صورت اور ارتقاء کی طرف لے جا رہی ہے ہر شئے ایک اعلیٰ شکل اختیار کرنے کے لیے ترقی کے مراحل سے گزر رہی ہے دور حاضر میں سائنس نے یہ بات ثابت کر دی ہے انسان بھی ترقی کے مراحل میں ہے۔ موت انسان کی (روحانی) ترقی میں مانع نہیں بلکہ اس کی مزید ترقی کا ایک راستہ ہے۔ جب انسان مرتا ہے تو اس کی روح کو ایک نئی خلقت (پیدائش) دی جاتی ہے۔ اگر اس نے اس دنیا میں برے کام کیے ہیں بداعمالیوں میں زندگی بسر کی ہے۔ خدا سے غافل رہا ہے تو اس کی روح کو گناہوں کی آلائشوں سے پاک کرنے کے لیے دوزخ میں رکھا جائے گا۔ یہ جائے عقوبت نہیں بلکہ جائے معالجہ ہے۔

گویا دوزخ ہسپتال ہے، جہاں بیمار روح کا علاج کیا جائے گا۔ آلائشوں سے پاک ہو جانے کے بعد اس کو اعلیٰ مقام یعنی جنت میں

جگہ دی جائے گی گویا دوزخ کا عذاب اس کی روحانی ترقی کا سبب ہے۔

جو روحیں جنتی ہیں وہ مزید روحانی ترقی پائیں گی۔

انسان کی روحانی ترقی یا معراج دیدار الٰہی ہے تمام انسانی ارواح کو دیدار الٰہی نصیب ہوگا۔ یہی انسان کی پیدائش کا مقصد ہے۔ دیدار الٰہی کے لیے ہی انسانی روح کو نیا جسم دیا جاتا ہے۔

جس طرح کائنات کی ہر شے ترقی کے راستہ پر گامزن ہے اسی طرح جب انسان اس دنیا میں آتا ہے تو اس کا روحانی ترقی کا سفر شروع ہو جاتا ہے اور موت کے بعد بھی جاری رہتا ہے۔ آخر کار ترقی کی منازل طے کرتا ہوا دیدار الٰہی حاصل کر لیتا ہے۔ گویا بعث بعد الموت دور حاضر کے سائنسی علوم کے عین مطابق ہے۔ وہ ہے ہر شے کا ترقی کے راستہ پر گامزن ہونا۔

بعث بعد الموت کی کیفیت اور نوعیت سے ناواقف لوگ یہ بھی اعتراض کر دیتے ہیں جن لوگوں کو شیر کھا جائے۔ آگ میں جل جائیں ان کا حشر کیسے ہوگا۔ حشر روح کا ہوتا ہے جس کو اللہ تعالیٰ ایک نیا جسم دیتا ہے۔ قبر سے مراد اس دنیا کی قبر مراد نہیں وہ اللہ کی اپنی بنائی ہوئی قبر ہے جس میں روح اپنے جسم کے ساتھ قیام کرتی ہے۔

......☆......

روح کا نیا جسم (کیا ہوگا؟)

اعتراض: روح کو کون سا جسم ملے گا؟ (ملاحدہ)

جواب: ملاحدہ یہ سوال کرتے ہیں۔ مادی جسم تو گل سڑ جاتا ہے تو پھر روح کو کون سا جسم ملے گا؟ جیسا کہ پہلے یہ وضاحت کی جا چکی ہے کہ انسان کے اعمال محفوظ کر لیے جاتے ہیں قرآن مجید میں مذکور ہے کہ انسان کے نیک اور بد اعمال کو لکھنے کے لیے ملائکہ مقرر ہیں سورہ رعد میں آتا ہے۔

اِذَا كُنَّا تُرٰبًا وَّ اِنَّا لَفِیْ خَلْقٍ جَدِیْدٍ (الرعد 5:13)

کیا جب ہم مٹی ہو جائیں گے تو پھر ایک نئی پیدائش میں آئیں گے۔

اس کا جواب اللہ تعالیٰ یہ دیتے ہیں۔

سَوَآءٌ مِّنْكُمْ مَّنْ اَسَرَّ الْقَوْلَ وَمَنْ جَهَرَ بِهٖ وَمَنْ هُوَ مُسْتَخْفٍۭ بِالَّیْلِ وَسَارِبٌۢ بِالنَّهَارِ لَهٗ مُعَقِّبٰتٌ مِّنْۢ بَیْنِ یَدَیْهِ وَمِنْ خَلْفِهٖ یَحْفَظُوْنَهٗ مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ (الرعد 11,10:13)

برابر ہے تم میں جو چھپ کر بات کرے اور جو اسے پکار کر کہے اور جو رات کو چھپ رہا ہو اور جو دن کو چل رہا ہو اس کے لیے اس کے آگے اور پیچھے (اعمال کا) پیچھا کرنے والے ہیں جو اللہ کے حکم سے محفوظ کر لیتے ہیں۔

ان آیات میں یہ بیان کیا گیا ہے۔ کہ انسان کی ظاہری اور مخفی باتوں کو اللہ خوب جانتا ہے اور پھر کراماً کاتبین کے ذریعے ہر اچھی اور بری بات کو محفوظ کر لیتا ہے۔ انہی اعمال سے انسان کے اندر ایک باطنی کیفیت پیدا ہوتی رہتی ہے۔ یہی باطنی کیفیت موت کے بعد ایک شکل اختیار کر لیتی ہے پہلے برزخ میں پھر قیامت کے دن جسم کی شکل میں ظاہر ہوتی ہے روح کو موت کے بعد جسم ملنا اس لیے ضروری ہے کہ روح بغیر جسم کے رہ نہیں سکتی روح کے لیے جسم ضروری ہے دوم دکھ اور سکھ بغیر جسم کے روح محسوس نہیں کر سکتی۔

روحانیت کا جسمانیات میں متبدل ہو جانے کا ذکر قرآن مجید اور احادیث میں بکثرت ملتا ہے لیکن یہ مجسم ہونا اس طرح نہیں جس

طرح اس دنیا میں مانا جاتا ہے بلکہ ترقی کر کے نئی دنیا کا جسم ہوتا ہے مثلاً وہ لوگ جو اس دنیا میں ایمان کی روشنی سے ہدایت پاتے ہیں وہی ایمان کی روشنی ان کے آگے پیچھے دوڑتی نظر آئے گی۔ جیسا کہ قرآن مجید میں آتا ہے۔

يَوْمَ تَرَى الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ يَسْعٰى نُوْرُهُمْ بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَبِاَيْمَانِهِمْ (الحدید 12:57)

جس دن تو مومن مردوں اور مومن عورتوں کو دیکھے گا ان کا نور ان کے آگے پیچھے دوڑ رہا ہوگا۔ اس دنیا کا نور ہدایت قیامت کے دن مومنوں کے آگے پیچھے دوڑتا ہوا نظر آئے گا اور اس دنیا کا نور ہدایت ایک روشنی کی شکل اختیار کر جائے گا۔ وہ تمام امور جو اس دنیا میں روحانی تھے جسمانی طور پر متمثل ہوں گے۔ اس کی کیفیت معلوم کرنا انسانی عقل سے بالاتر ہے اس کو کشفی آنکھ سے دیکھا جا سکتا ہے کشفی بصارت نور نبوت سے ملتی ہے۔ ملاحدہ اسی وجہ سے ٹھوکر کھاتے ہیں وہ نور نبوت سے محروم ہوتے ہیں۔

......☆......

دوزخ میں اللہ کا قدم رکھنا

اعتراض: دوزخ سے پوچھے گا کہ کیا تو اتنے آدمی اور پتھر کھا کر سیر ہوئی ہے کہ نہیں پیٹو جہنم بولے گی کیا کچھ اور بھی ہے یعنی اگر کچھ اور باقی ہے تو دیجیے مفسر کہتے ہیں خدا اپنے دونوں پاؤں دوزخ میں ڈال دے گا اور جہنم کو سیر کرے گا۔ (ترک اسلام مصنفہ دھرم پال سوال 87)

جواب: قرآن مجید میں اس قدر ہے۔

يَوْمَ نَقُوْلُ لِجَهَنَّمَ هَلِ امْتَلَأْتِ وَ تَقُوْلُ هَلْ مِنْ مَّزِيْدٍ (قٓ 30:50)

جس دن ہم دوزخ سے کہیں گے کیا تو بھر گئی ہے اور وہ کہے گی کیا کچھ اور بھی ہے۔

بخاری میں حضرت انس سے روایت ہے۔

قَالَ يُلْقٰى فِي النَّارِ وَتَقُوْلُ هَلْ مِنْ مَّزِيْدٍ حَتّٰى يَضَعُ اللّٰهُ قَدَمَهٗ فَتَقُوْلُ قَطْ قَطْ

یعنی لوگ آگ میں ڈالے جائیں گے اور دوزخ کہے گی کچھ اور بھی ہے۔ یہاں تک کہ اللہ اپنا قدم اس میں رکھے گا وہ کہے گی بس بس۔

عربی زبان میں قدم کے معنی ردع اور قمع کے ہیں یعنی باز رکھنا اور ذلیل کرنا۔ تو یہ معنی ہوں گے کہ اللہ کا امر آگے آئے گا اور دوزخ کو مزید طلب سے روک دے گا۔

جیسا کہ حدیث میں آتا ہے۔ رسول کریم ﷺ نے حجۃ الوداع کے موقع پر فرمایا۔

دِمَآءُ الْجَاهِلِيَّةِ مَوْضُوْعَةٌ تَحْتَ قَدَمِي

جاہلیت کے خون میرے قدم کے نیچے ہیں یعنی ان کو منسوخ کیا جاتا ہے۔

یہاں موضوعۃ تحت قدمی میں پرانے خونوں کا قصاص لینے سے منع کیا گیا ہے۔

مذکورہ حدیث میں دوزخ میں قدم رکھنے سے مراد صرف دوزخ مذکور کی مزید طلب کو روکنا اور ختم کرنا ہے۔ یعنی اب دوزخ میں مزید لوگ نہیں ڈالے جائیں گے۔

بعض نے قدم سے مراد اللہ کا وہ وعدہ لیا ہے جو وہ پہلے سے کر چکا ہے وہ ہے۔

سَبَقَتْ رَحْمَتِي عَلٰى غَضَبِي (تفسیر غرائب القرآن)

میری رحمت غضب پر غالب آ گئی ہے گویا دوزخ میں قدم رکھنے سے یہ مراد ہے کہ اللہ کی رحمت جوش میں آ جائے گی۔ دوزخیوں کی سزا ختم ہو جائے گی۔

حدیث میں آتا ہے۔

يَاْتِي عَلٰى جَهَنَّمَ زَمَانٌ لَيْسَ فِيهَا اَحَدٌ نَسِيْمُ الصبا تُحَرِّكُ اَبْوَابَهَا

یعنی دوزخ پر ایک ایسا وقت آئے گا کہ اس میں کوئی بھی نہ ہوگا اور نسیم صبا اس کے دروازے ہلا دے گی۔

پس اللہ کے وضع قدم سے مراد یہ ہے کہ کفار اور فجار جہنم کے عذاب میں رہ کر آخر اللہ کے وعدہ کے مطابق رحمت الٰہی سے حصہ لیں گے اور ان کو دوزخ سے نکال لیا جائے گا اور دوزخ کی سزا ختم ہو جائے گی۔

دوزخیوں کی سزا منسوخ اور ختم کرنے کو کس خوبصورت انداز میں بیان کیا گیا ہے یہی ادبی حسن ہے۔ جس کو کور ذوق نہیں سمجھتے۔

......☆......

دوزخ میں لوگ جن اور پتھر (پتھروں نے کیا گناہ کیا)

اعتراض: دوزخ کو آدمیوں، جنوں، پتھروں سے بھرے گا معلوم نہیں جن کون ہیں پتھروں نے کیا گناہ کیا ہے۔ کسی نے سچ کہا ہے کہ خدا ہر ایک چیز کا سامان اس کے ساتھ رکھتا ہے۔ (ترک اسلام سوال نمبر 88)

جواب: قرآن مجید کی اس آیت پر اعتراض کیا گیا ہے۔

فَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِي وَقُوْدُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ اُعِدَّتْ لِلْكٰفِرِيْنَ (البقرہ 24:2)

پس اس آگ سے بچو جس کا ایندھن انسان اور پتھر ہیں۔ یہ کافروں کے لیے تیار کی گئی ہے۔

معترض نے آدمیوں اور پتھروں کے ساتھ جن کا لفظ بھی استعمال کیا ہے الناس سے مراد عام لوگ ہیں۔ جن سے مراد معاشرہ کے با اثر اور بڑے لوگ مراد ہیں جو اپنی بڑائی اور اعلیٰ مقام رکھنے کی وجہ سے عموماً لوگوں کی نظر سے اوجھل رہتے ہیں عام آدمیوں کی رسائی ان تک مشکل ہوتی ہے۔ الحجارہ (پتھر) سے مراد ایسے لوگ ہیں جو حق قبول کرنے میں ایسے سخت دل ہیں جیسے پتھر اسی کی طرف یہ آیت فَهِيَ كَالْحِجَارَةِ اَوْ اَشَدُّ قَسْوَةً (البقرہ 74:2) اشارہ کرتی ہے۔

سو وہ پتھروں کی طرح ہیں بلکہ سختی میں اس سے بڑھ کر۔ عربی میں بڑے ہیبت ناک آدمی کو بھی حجر کہا جاتا ہے۔ جس پر دوسرے کی بات کا اثر نہیں ہوتا پس یہاں وہ قسی القلب آدمی مراد ہیں جن پر حق و صداقت نے کوئی اثر نہیں کیا۔

پتھروں سے مراد معبودان باطل بھی ہیں پس الحجارہ (پتھر) سے مراد ظاہری پتھر نہیں ہیں بلکہ مراد قسی القلب اور ہیبت ناک انسان مراد ہیں۔ جن پر قرآن مجید جیسی فصیح و بلیغ اور پُر اثر کتاب کا بھی اثر نہیں ہوا۔ قرآن مجید نے قسی القلب انسانوں کو الحجارۃ (پتھر) سے تشبیہ دی ہے۔ یہی قرآن مجید کی فصاحت ہے جس کے سامنے عرب کے فصحا و بلغاء عاجز آ گئے تھے۔

......☆......

فرشتوں کا اللہ کا کارندہ ہونا (کیا اللہ فرشتوں کا محتاج ہے)

اعتراض :اللہ تعالیٰ کو فرشتوں سے کام لینے کی کیا حاجت ہے کیا اس کی بادشاہی بھی انسانی سلطنتوں کی طرح عملہ کی محتاج اور اس کو بھی فوجوں کی ضرورت ہے۔(ملاحدہ، عقلیت پسند)

جواب :انسان جسم اور روح سے مرکب ہے۔جسم کی پرورش کرنے کے لیے خارج میں وسائل اور وسائط پیدا کیے ہیں ان وسائل سے انسان کے جسم پر اثرات مرتب ہوتے ہیں اور وہ نشوونما پاتا ہے یہ اللہ کا اٹل قانون ہے کہ ہمارے قویٰ اور اجسام کو اللہ کا فیض کسی توسط سے پہنچتا ہے اس قانون سے کسی کو انکار نہیں مثلاً ہماری آنکھوں کو روشنی بخشتی ہے مگر وہ روشنی سورج کے توسط سے ملتی ہے ہمارے کان شنوائی کے لیے ہوا کے محتاج ہیں جو آواز کو ہمارے کانوں تک پہنچاتی ہے پھر اللہ تعالیٰ نے ہمارے قوی میں فیض کے قبول کرنے کی استعدادیں بھی بخشی ہیں لہٰذا یہ ثابت ہوا کہ ہمارے قویٰ کو چلانے کے لیے خارجی معاونین کی ضرورت ہے ان کے بغیر قویٰ کام نہیں کر سکتے۔

اسی طرح اللہ تعالیٰ نے انسان کی روحانی پرورش کے لیے ایک روحانی (باطنی) نظام قائم کیا ہے۔اسی روحانی نظام کو چلانے کے لیے ملائکہ کو بطور وسائط مقرر کیا ہے۔یہ تمام وسائط اللہ تعالیٰ کے ہاتھ پیر ایک کل کی طرح ہیں جس کو اللہ کا ہاتھ چلا رہا ہے۔وہ وسائط نہ کوئی اپنا ارادہ رکھتے ہیں نا کوئی تصرف۔وہ یَفْعَلُوْنَ مَایُؤْمَرُوْنَ (وہ وہی کرتے ہیں جو حکم دیا جاتا ہے) کے مصداق ہیں۔

ملائکہ کا وجود تسلیم کرنے کے لیے یہ کافی دلیل ہے اور یہ بات فیصل شدہ ہے کہ ہماری جسمانی پرورش اور تربیت کے لیے دنیا میں شمس و قمر ستارے، ہوا اور دیگر اجسام کام کر رہے ہیں۔ہمارے تمام قوی اور تمام طاقتوں کی تکمیل کے لیے خارجی عناصر کی ضرورت ہے اسی طرح ہماری روحانی پرورش کے لیے بھی خارج میں ایسی طاقتیں اور ان دیکھی صداقتیں کام کر رہی ہیں جن کے بغیر ہماری روحانی پرورش نہیں ہو سکتی یہی باطنی قوتیں ملائکہ ہیں۔

ان مادی عناصر (سورج چاند ستارے ہواؤں وغیرہ) کے پیچھے بھی یہی قوتیں کام کر رہی ہیں اور مادی عناصر سے مطلوبہ افعال صادر ہو رہے ہیں۔اسی طرح ہماری روحانی پرورش کے لیے ملائکہ کو بطور وسائط مقرر کر رکھا ہے اور ان سے ہماری روح روحانی غذا حاصل کر رہی ہے۔اللہ تعالیٰ کا یہ ایک اٹل قانون ہے کہ وہ اپنے وسائط سے ہی کام لیتا ہے۔اسی میں اللہ تعالیٰ کی شان ہے۔تمام کائنات کا نظام ہی ایک اٹل قانون کے مطابق خارجی وسائط سے چل رہا ہے اور یہی قانون ہماری روح کی پرورش پر منطبق ہوتا ہے اگر معترض کو کائنات کا نظام چلانے کے لیے مادی وسائط پر اعتراض نہیں ہے تو روحانی نظام چلانے کے لیے خارجی وسائط یعنی ملائکہ پر کیوں اعتراض ہے جب ہم نے ظاہری قانون کو تسلیم کر لیا ہے تو باطنی قانون کو بھی مان لینا چاہیے۔

......☆......

دوزخ کے سات اور بہشت کے آٹھ دروازے

اعتراض: دوزخ کے سات دروازے ہیں اور بہشت کے آٹھ۔

جواب :جو انسان کے وہ اعضاء جن سے نیکی اور بدی سرزد ہوتی ہے وہ سات ہیں وہ دو دو جہیں ہیں مثلاً آنکھ، کان، منہ، ہاتھ، پاؤں، شرمگاہ اور دماغ۔تمام احکام شریعت کا تعلق انہیں کے ساتھ ہے آنکھ میں یہ قوت ہے۔کہ خدا کی قدرت کا مشاہدہ کرے اور اس کے سامنے جھک

جائے اور یہ بھی قدرت ہے کہ کسی عورت کو شہوت بھری نظر سے دیکھے۔ قدرت کا مشاہدہ کر کے خدا کے سامنے جھک جانا نیک اور شہوت بھری نظر سے دیکھنا گناہ، کان میں بھی یہی قوت ہے کہ خدا کی حمد وستائش سنے اور یہ بھی ہے کہ کسی کی چغلی غیبت اور بری بری باتیں سنے۔ زبان میں یہ قوت ہے کہ خدا کی حمد کے گیت گائے یا کسی کی بدی کرے یا کسی کو برا کہے اور برے خیالات لوگوں میں پھیلائے۔ غرض کہ مذکورہ ساتوں اعضاء میں دوہری قوتیں ہیں ان اعضاء کی مناسبت سے دوزخ کے سات اور بہشت کے آٹھ دروازے ہیں۔ بہشت کا آٹھواں دروازہ خدا کے فضل ورحمت کا دروازہ ہے یہ ساتوں اعضا ہیں جو دوزخ اور بہشت کے دروازے ہیں ان ساتوں اعضاء سے نیکی کرنا گویا بہشت کے دروازوں میں داخل ہونا ہے۔ جو شخص ان اعضاء کو اللہ کی رضا کے حصول میں لگا دیتا ہے تو اللہ تعالیٰ ان سات دروازوں کا وارث بنا دیتا ہے آٹھواں دروازہ اپنے فضل اور رحمت کا رکھا ہے۔ اللہ راضی ہو کر آٹھویں دروازے کا بھی وارث بنا دیتا ہے اگر ان سات اعضاء سے بدی کا ارتکاب کیا جائے گا تو دوزخ کے ساتوں دروازے اس پر کھل جائیں گے۔ ان اعضاء کی بدیوں کے بداثرات کو توبہ استغفار اور نیکیوں کے ارتکاب سے دور کیا جاسکتا ہے۔ ارشاد الٰہی ہے۔ اِنَّ الْحَسَنَاتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّئَاتِ کہ نیکیاں بدیوں کے اثرات کو مٹا دیتی ہیں۔

علماء ربانی نے دوزخ اور بہشت کے سات سات دروازوں کا سر یہ بھی بیان کیا ہے کہ اصل جرائم بھی سات ہیں اور نیکیوں کے اصول بھی سات ہیں بہشت کا جو آٹھواں دروازہ ہے وہ اللہ کے فضل اور رحمت کا دروازہ ہے سات اصول جرائم میں ایک بدظنی ہے دوسرا تکبر ہے۔ تیسرا جہالت ہے چوتھا اتباع ہوا (خواہشات) پانچواں کورانہ تقلید وغیرہ۔ یہ سب اصول قرآن مجید سے مستنبط ہوتے ہیں۔ اس طرح نیکیوں کے بھی سات اصول ہیں ان کی مناسبت سے دوزخ اور جنت کے سات سات دروازے مقرر کیے گئے ہیں بہشت کا آٹھواں دروازہ خدا کے فضل کا ہوگا۔

مابعد الطبیعات کے مسائل کی کیفیت اور نوعیت کا سمجھنا عقل سے بالا ہے لیکن عقل کے منافی نہیں۔ ان کی کیفیت اور نوعیت نورانی آنکھ سے معلوم کی جاسکتی ہے اس نورانی آنکھ کے پیچھے نور نبوت ہو جائے جو نورانی آنکھ میں وہ چمک پیدا کرتا ہے۔ جس سے ان مسائل کی کیفیت کسی حد تک معلوم کی جاسکتی ہے احادیث میں ان مسائل کی کیفیت اور نوعیت کا ذکر پایا جاتا ہے۔ وہ سب رسول کریم ﷺ نے حالت کشف میں دیکھے تھے۔

......☆......

عورتیں تمہاری کھیتی ہیں

اعتراض: عورتیں تمہاری کھیتی ہیں آدمیوں کے برابر ان کے حقوق نہیں۔ (ترک اسلام سوال نمبر 98)

دیانند سرسوتی نے اپنی کتاب ستیارتھ پرکاش کے باب چودھویں میں یہی اعتراض ان الفاظ میں کیا ہے۔

ایام حیض میں مجامعت نہ کرنے کا حکم تو اچھا ہے لیکن عورتوں کو کھیت سے مشابہت دینا اور یہ حکم دینا جس طرح چاہو ان کے پاس جاؤ انسان کی شہوت بھڑکانے کا موجب ہے اگر خدا بیہودہ قسموں سے تمہیں نہیں پکڑتا تو کیوں نہ سب جھوٹ بولیں گے اور عہد توڑیں گے اس طرح تو خدا ہی جھوٹ کا بانی مبانی ہو جائے گا۔

(اعتراض 38)

جواب: قرآن مجید کی اس آیت پر اعتراض کیا ہے۔

نِسَاءُ كُمْ حَرْثٌ لَكُمْ فَأْتُوا حَرْثَكُمْ أَنّٰى شِئْتُمْ (البقرہ 223:2)

تمہاری عورتیں تمہارے لیے کھیتی ہیں پس جب چاہو اپنی کھیتی میں جاؤ۔

معترض نے اَنّٰی کے معنی نہ سمجھنے کی وجہ سے یہ مفہوم لیا ہے "جس طرح چاہو ان کے پاس جاؤ "اَنّٰی" وقت کے لیے آیا ہے یعنی جس وقت چاہو اپنی بیوی کے پاس جا سکتے ہو ابن عباس۔

اَنّٰى شِئْتُمْ مِنَ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ

جب چاہو رات کو یا دن کو اسی طرح مشہور مفسر ضحاک سے اَنّٰی کے معنی مَتٰی مروی ہیں۔

حرث:

قرآن مجید میں عورت کو کھیتی سے تشبیہ دی ہے حرث زمین میں بیج ڈالنے اور اس کو زراعت کے لیے تیار کرنے کو کہتے ہیں اور جو چیز اس طرح ڈالی جائے یعنی کھیتی اس کو بھی حرث کہتے ہیں استعارۃً یہ لفظ عورت پر بھی استعمال ہوا ہے یعنی جس طرح دانے کا بقا زمین میں بونے میں ہے اسی طرح نوع انسانی کا بقا عورت سے ہے عورتوں کو "حرث" کھیتی کہنے کی غرض یہ ہے کہ اول یہ کہ عورت سے خلاف وضع فطرت عمل نہ کیا جائے دوم اس سے بہ کثرت جماع نہ کیا جائے۔ سوم اس کا اور اس کے حمل کی ہمیشہ حفاظت ہو۔ چہارم جن کے بچے گر جاتے ہیں یا مر جاتے ہیں وہ اس تشبیہ سے یہ فائدہ اٹھائیں کہ ایک سال صحبت ترک کر دیں جس طرح زمین ترک (خالی رکھنے) سے مضبوط اور زرخیز ہو جاتی ہے اسی طرح وہ عورت حمل رکھنے کے قابل ہو جائے گی (پنجم) اپنے کھیت میں دوسرے کا بیج پڑنے نہ دیا جائے اس سے فساد پیدا ہوگا۔

یہ قرآن مجید کا اعجازی رنگ ہے کہ اس میں مرد اور عورت کے نزدیک تعلقات کو اس رنگ میں بیان کیا ہے کہ قاری کی طبع سلیم پر کسی قسم کی ناگواری پیدا نہیں ہوتی۔ بائبل میں ایسے مضامین محض قصوں کے رنگ میں ہیں جن کو انسان پڑھ نہیں سکتا۔ اور پڑھ کر شرم میں ڈوب جاتا ہے اس تہذیب کے دور میں سوامی جی نے جو کچھ نیوگ کے بارہ میں ستیارتھ پرکاش کے چوتھے باب میں لکھا ہے پھر اسی باب کی دفعہ 43 میں جن خیالات کا اظہار گر بھادان سنسکار کے نیچے کیا ہے وہ مرد اور عورت کے تعلقات میں ایسے عریاں الفاظ ہیں جن کو کسی مہذب مجلس میں استعمال نہیں کیا جا سکتا انہی تعلقات کو عرب کے ایک اُمی نے کن شاندار الفاظ میں بیان کیا ہے طبع سلیم پر کسی قسم کی ناگواری پیدا نہیں ہوتی پھر لفظ "حرث" اپنے اندر معانی کا ایک سمندر لیے ہوئے ہے۔

اسلام ہی ایک وہ مذہب ہے جس میں مردوں اور عورتوں کو حقوق میں مساوی قرار دیا ہے۔ اس پر مفصل بحث پہلے گزر چکی ہے اعادہ کی ضرورت نہیں۔

کسی مذہب نے عورت کو وہ حقوق نہیں دیئے جو اسلام نے دیئے ہیں منوادھیائے 5 شلوک 148,147 عورت نابالغ ہو یا جوان یا بڈھی ہو گھر میں کوئی کام خود مختاری سے نہ کرے۔

148 عورت لڑکپن میں اپنے باپ کے اختیار میں ہے اور جوانی میں اپنے شوہر کے اختیار میں اور بعد وفات شوہر کے اپنے بیٹوں کے اختیار میں رہے خود مختار ہو کر کبھی نہ رہے۔

منوادھیائے 9 شلوک 3 صفحہ 327، لڑکپن میں باپ اور جوانی میں شوہر اور بڑھاپے میں بیٹا عورتوں کی حفاظت کرے کیونکہ عورتیں

خود مختار ہونے کے لائق نہیں۔

منو 9، ادھیائے شلوک 15، 18 صفحہ 329، عورت تدبیر نیک سے محفوظ بھی ہو۔ تاہم اپنی بداطواری وتلون طبعی و بے وفائی و عادات بد، ان باتوں سے شوہر کو رنجیدہ کرتی ہے اور قدرت نے کیا مرد اور عورت میں مساوات رکھی ہے بچہ کے پیٹ میں رکھنے جننے اور پرورش کرنے میں کیا عورت مرد مساوی ہیں ہرگز نہیں۔

الزامی جواب:

سوامی دیانند نے ستیارتھ پرکاش میں عورت کو کھیت سے ہی تشبیہ دی ہے۔ دیانند کا قول ہے ''جو کوئی اس قیمتی چیز کو بیگانی عورت، رنڈی یا برے مردوں کی صحت میں کھوتے ہیں وے بڑے بے عقل ہوتے ہیں۔ کیونکہ کسان یا مالی جاہل ہو کر بھی اپنے کھیت یا باغیچہ کے سوا اور کہیں بیج نہیں بوتے جبکہ معمولی بیج اور جاہل کا ایسا دستور ہے تو جو شخص سب سے اعلیٰ انسانی جسم کے درخت کے بیج کو برے کھیت میں کھوتا ہے وہ بھاری بے وقوف کہلاتا ہے کیونکہ اس کا پھل سب کو نہیں ملتا۔ (ستیارتھ پرکاش 156)

منوادھیا 10 کے شلوک 70 میں بحث کی گئی ہے کہ اولاد میں اثر ماں کا ہوتا ہے یا باپ کا اور 71 میں کہا ہے اس زمین میں جو بیج پڑتا ہے وہ برباد ہو جاتا ہے اور کھیت اچھا ہے مگر اس میں بیج نہیں تو وہ صرف چبوترہ ہے۔

دیکھیں اس شلوک میں کھیت سے تشبیہ کیسی دی ہے۔

منوادھیائے 9 شلوک 49 تا 51 میں عورت کو کھیت اور مرد کو بیج قرار دیا ہے۔ جس طرح گئو، گھوڑا، اونٹ، لونڈی، بھینس، بکری، بھیڑ انہوں میں بچہ پیدا کرنے والا کا مالک بچہ کو نہیں پاتا اسی طرح دوسرے کی عورت میں تخم ڈالنے والا اولاد نہیں پاتا۔

49۔ دوسرے کے کھیت میں تخم ڈالنے والا اس تخم کے ثمر کو کبھی نہیں پاتا۔

50۔ دوسیر کی گئو میں دوسیر کا بیل بچھڑا پیدا کرے تو گئو کا مالک ان بچھڑوں کو پاتا ہے اور بیل کا نطفہ بے فائدہ جاتا ہے۔

51۔ اسی طرح دوسرے کے کھیت میں بیج بونے والا کھیت والے کا مطلب کرتا ہے آپ پھل کو نہیں پاتا ہے۔

ہندومت کی کتب میں عورت کو کھیت سے تشبیہ دی گئی ہے لیکن جس حسن اور خوبصورتی کے ساتھ قرآن مجید میں عورت کو کھیت (حرث) سے تشبیہ دی گئی ہے اس کی مثال نہیں ملتی۔

یہ اعتراض صرف ہندوؤں کی طرف سے ہی نہیں کیا گیا بلکہ دیگر معترضین نے جہالت کی وجہ سے یہ اعتراض کیا ہے اعتراض کی وجہ لفظ انّٰی ہے۔

اسلام نے عورت کو ''حرث'' کھیتی سے تشبیہ دے کر عورت کی بے حرمتی نہیں کی۔ بلکہ عورت کو نسل انسانی کی پیدائش کا ذریعہ قرار دے کر ''حرث'' کھیتی سے تشبیہ دی ہے۔ اس سے بڑھ کر عمدہ تشبیہ ہو ہی نہیں سکتی لیکن جب قدیم ہندو تہذیب کا مطالعہ کیا جائے تو عورتوں کو فحش کلمات سے خطاب کیا گیا ہے۔ شریف عورتوں کو بغیر کسی شرم وحیا کے سوشرونی اور پرتھوشرونی (خوبصورت اور فربہ سرین والی) کہہ کر پکارا جاتا تھا۔ ماں اپنی بیٹی کو شری سوت کے نام سے پکارتی تھی۔

''قدیم زمانہ میں جب دیوتاؤں اور اسروں کی جنگ ہوئی۔ دیوتاؤں نے دیتی کے سب بیٹے مار ڈالے تب دیتی نے نہایت حسرت وغم سے اپنی بیٹی سے کہا۔

اے ''سوشرونی'' تو ایک بیٹے کو پیدا کرنے کی تمنا کر کے ریاضت کرنے کے لیے جنگل میں چلی جا۔

رانی درو پدی اپنی بہو کی تعریف ''وردرُدھا (عمدہ.........والی) کہہ کر کہتی ہے (مہابھارت ادیوگ پبھر وادھیاء 138 شلوک 19)

شری کرشن بھی اپنی بہن سو بھدرا کی وردرُدھا (عمدہ...........والی) نام لے کر تعریف کرتے ہیں وید میں بھی اندر اپنی اندرانی کی تعریف "اے موٹی موٹی رانوں" سے کرتا ہے۔ (اتھرو20-126:18)

اس کے جواب میں اندرانی نے اپنے خاوند کی تعریف کی ہے وہ اسی قدر فحش ہے اس کا ترجمہ نہیں کیا جا سکتا۔ (دیکھو حوالہ مذکور کا منتر 15) یہ ہے ہندو مذہب کی مذہبی کتب کی تہذیب کے نمونے جبکہ اسلام کی تعلیمات میں کہیں بھی عریانی نہیں ملے گی۔ بلکہ یہ کہا جائے گا۔ کہ اسلام نے تہذیب کہن کو مٹا کر ایک عمدہ تہذیب کی بنیاد رکھی ہے۔ دور حاضر میں انسانی حقوق میں عورتوں کے حقوق اور عزت واحترام کو اولیت دی جا رہی ہے۔ اسی تہذیب کا اثر ہے جس کی بنیاد ایک اُمی رسول حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم نے رکھی تھی۔ یہ اسلام کا بنی نوع انسان پر عظیم احسان ہے۔

قرآن مجید کی اس آیت۔

لَا يُؤَاخِذُكُمُ اللّٰهُ بِاللَّغْوِ فِيْٓ اَيْمَانِكُمْ (البقرہ2:225)

اللہ تمہاری بلا ارادہ قسموں پر تمہیں نہیں پکڑتا۔

لغو قسم کیا ہے:

لغو قسموں سے مراد وہ قسمیں ہیں جو انسان معمولی معمولی باتوں پر عادت کے طور پر کھا جاتا ہے عرب کے لوگ بات بات پر اس قسم کی قسمیں کھاتے تھے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اس قسم کی قسموں پر مواخذہ نہیں ہوگا۔

دوم۔ بعض اوقات ایک شخص یہ قسم کھا لیتا ہے کہ میں اب کسی سے نیکی نہیں کروں گا میں فلاں آدمی سے کبھی نہیں ملوں گا وغیرہ یہ بھی لغو قسموں میں شامل ہے۔ اگر اس قسم کی قسموں کو توڑا جائے تو اس پر سزا نہیں۔ بلکہ کوئی نیکی نہ کرنے کی قسم کھائی ہے تو قسم کی وجہ سے وہ نیکی نہیں کرتا تو قسم کھانے والا قابل مواخذہ ہے۔ اسلام نے جہاں یہ فرمایا ہے کہ لغو قسمیں قابل مواخذہ نہیں وہاں یہ بھی تعلیم ہے کہ لغو قسمیں نہ کھاؤ یہ تقویٰ کے خلاف ہیں ارشاد الٰہی ہے۔

وَالَّذِيْنَ هُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُوْنَ (المومنون23:3)

اس میں ہر لغو بات اور فعل سے روکا ہے۔

وہ قسمیں جو کسی معاہدے کے تحت آتی ہیں یا جن کا اثر انسانی زندگی پر پڑتا ہے اس کے متعلق آتا ہے۔

وَ احْفَظُوْٓا اَيْمَانَكُمْ (المائدہ5:89)

اپنی قسموں کی حفاظت کرو۔

اسلام نے لغو قسموں کے توڑنے کو قابل مواخذہ قرار نہیں دیا جب سنجیدہ اور بامعنی اور بامقصد قسمیں کھانے کی حفاظت پر زور دیا ہے۔ اگر اس قسم کی قسمیں توڑی جائیں تو معاشرہ میں بداعتمادی اور بگاڑ پیدا ہو جائے گا۔

ہندو تاریخ میں ایک مشہور واقعہ ہے راجہ دشرتھ نے (لغو) قسم (پرتگیا) پوری کرنے کے لیے بے گناہ رام کو 14 برس کا بن باس دے دیا اور پرتگیا (لغو قسم) کی وجہ سے دروپدی پانچ پانڈوں کی اکیلی بیوی بنی اگر ان بے ہودہ قسموں کو توڑ دیا جاتا اور قرآن کی تعلیم پر عمل ہوتا تو نہ رام کو 14 سال بن باس دیا جاتا اور نہ دروپدی پانچ پانڈوں کی اکیلی بیوی بنتی یہ ہے ایک لغو قسم کھانے کا نتیجہ اسلام ایک فطرتی مذہب ہے اس نے ایسی تعلیم دی ہے جس میں یسر (آسانی) ہے۔

......☆......

کیا رسول کریم، عیسیٰ کی طرح روشنی ہیں

اعتراض: مسیح نے اپنی نسبت یہ کلمات کہے میرے پاس آؤ تم جو تھکے ماندے ہو کہ میں تمہیں آرام دوں گا اور یہ کہ "میں روشنی ہوں اور میں راہ ہوں میں زندگی اور راستی ہوں" کیا بانی اسلام نے یہ کلمات کہے یا ایسے کلمات کی جگہ اپنی طرف منسوب کیے ہیں۔ (سراج الدین عیسائی کے چار سوالوں میں چوتھا سوال)

جواب: اسلام پہلا دین ہے جس نے یہ اعلان کیا کہ اللہ تعالیٰ نے انسانوں کی ہدایت کے لیے ہر دور میں اپنے رسول اور نبی بھیجے اور جبرائیل علیہ السلام کے ذریعے ان پر احکام نازل کیے تاکہ لوگ ان احکام کے مطابق زندگی بسر کر کے فلاح پائیں وہ احکام روح کی تربیت اور پرورش کے لیے بھی تھے اور مادی امور کو سنوارنے کے لیے بھی۔ صرف گزشتہ انبیاء علیہم السلام کی بعثت اور نزول احکام (کتاب) کا ہی ذکر نہیں کیا بلکہ ان پر ایمان لانا ضروری قرار دیا ہے۔ تمام انبیاء علیہم السلام لوگوں کے لیے چراغ اور ہادی ہوتے ہیں۔ یہ اسلام کا تمام مذاہب پر احسان ہے کہ اس نے تمام مذاہب کے بانیوں کی صداقت پر مہر ثبت کی ہے یہ اسلام کا اساسی قاعدہ کلیہ ہے۔ مسلمان کسی نبی کی تنقیص کو ناجائز اور گناہ تصور کرتے ہیں۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام خدا کے نبی تھے برحق نبی تھے۔ وہ ہادی تھے۔

اسلام کا اساسی قاعدہ کلیہ بیان کرنے کے بعد معترض کے اعتراض کی طرف آتے ہیں۔

قرآن مجید میں آتا ہے۔

قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِىْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ

(آل عمران 31:3)

کہو اگر تم اللہ سے محبت کرتے ہو تو میری پیروی کرو۔ اللہ تم سے محبت کرے گا اور تمہارے لیے تمہارے گناہوں کو معاف کر دے گا اللہ بخشنے والا رحم کرنے والا ہے۔

دوسری جگہ آتا ہے۔

وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ (آل عمران 132:3)

اور اللہ اور رسول کی اطاعت کرو کہ تم پر رحم کیا جائے۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے بھی اپنے آپ کو نجات دہندہ قرار دے کر بنی اسرائیل کو اپنی طرف بلایا۔ اسی طرح رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی۔ تاریخ کے تناظر میں دیکھنا ہے کہ کس کی آواز نے لوگوں میں ایک روحانی انقلاب برپا کیا۔ بات الفاظ کی نہیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اپنے متعلق یہ کہا کہ میں روشنی ہوں اور میں راہ ہوں۔ میں زندگی ہوں اور میں راستی ہوں دیکھنا یہ ہے کہ کس داعی کی آواز نے ایک روحانی انقلاب برپا کیا۔

حواریوں کی ایمانی حالت بروئے اناجیل:

جب اناجیل کا مطالعہ کریں تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حواریوں کی ایمانی حالت قاری پر واضح ہو جاتی ہے۔ یہوداہ اسکریوطی نے تیس روپے کی رقم لے کر اپنے مرشد حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو گرفتار کرا دیا تھا یوحنا باب 13 آیت 27,26 میں لکھا ہے۔

''حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے نوالہ ڈبویا اور یہوداہ کو دیا اور اس نوالہ کے بعد شیطان اس میں سما گیا شیطان یا لالچ نے اس کو اس بات پر آمادہ کیا کہ تھوڑی سی رقم لے کر اپنے آقا کو گرفتار کرادے۔

اسی طرح پطرس کو حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے مخاطب فرما کر کہا۔''اے شیطان! میرے سامنے سے دور ہو جا۔''(مرقس باب 18 آیت 23)

پطرس نے بھی اپنے آقا سے غداری کی اور لعنت بھیج کر یہ کہا کہ وہ اس شخص کو نہیں جانتا انجیل میں لکھا ہے۔

پطرس لعنت کرنے اور قسم کھانے لگا کہ میں اس آدمی کو جس کا تم ذکر کرتے ہو نہیں جانتا۔(مرقس باب 14 آیت 71)

پھر ان گیارہ کو بھی جب کھانا کھانے بیٹھے تھے یسوع دکھائی دیا اور اس نے ان کی بے اعتقادی اور سخت دلی پر ان کو ملامت کی۔ (مرقس باب 19 آیت 14)

تمام حواریوں کو مخاطت کر کے کہا۔

''اے کم اعتقادو تم آپس میں کیوں چرچا کرتے ہو کہ ہمارے پاس روٹی نہیں۔(متی باب 16 آیت 8)

''یسوع نے شاگردوں سے جواب میں کہا۔''اے بے اعتقادو اور کج رو قوم! میں کب تمہارے ساتھ رہوں گا اور تمہاری برداشت کروں گا۔''(لوقا باب 9 آیت 41)

انجیل کے ان حوالہ جات سے حضرت مسیح علیہ السلام کے حواریوں کی ایمانی حالت ظاہر ہو جاتی ہے کہیں چند کوڑیوں کے بدلے اپنے آقا کو گرفتار کروا رہے ہیں کہیں ان کو پہچاننے سے انکار کر رہے ہیں اور کہیں ہدف ملامت بنا رہے ہیں اور ان کے ضعف ایمان اور کج روی کی وجہ سے حضرت مسیح علیہ السلام ان کو بے اعتقاد اور کج رو قرار دے رہے ہیں۔

حضرت یسوع علیہ السلام نے بنی اسرائیل کو راہ ہدایت کی طرف بلایا۔ ان کی دعوت کا کیا اثر ہوا۔ کیا ان کی دعوت سے روحانی انقلاب برپا ہوا۔ تاریخ نفی میں جواب دیتی ہے۔ یہاں تک کہ یہود نے صلیب پر چڑھا دیا۔ اس کے برعکس جب ہم رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت الی الخیر کا مطالعہ کرتے ہیں تو روحانی اور مادی انقلاب کی ایک روشنی پاتے ہیں تو دونوں داعی الی اللہ کی قوت قدسیہ کا موازنہ ہو جاتا ہے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے دعویٰ کے وقت عرب کسی مذہب کے پابند نہ تھے نہ کسی کتاب پر ایمان رکھتے تھے۔ شجر، حجر، شمس، قمر، ستاروں اور بھوت و پریت کی پوجا کرتے تھے جزا و سزا کے منکر سیاست وتمدن سے ناآشنا، چوری، قمار بازی، جنگ وجدل، بغض وعناد، جہالت، فخر اور کبر ان کے اوصاف تھے وہ چوپایوں کی سی زندگی بسر کر رہے تھے۔

وہی عرب جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے دست مقدس پر بیعت کر لیتے تھے تو تمام برائیوں کو چھوڑ کر آستانہ الوہیت پر گر جاتے ہیں وہ خدا کی صفات میں رنگین ہو جاتے ہیں اس دھرتی پر چلتے پھرتے فرشتے نظر آتے ہیں قرآن مجید ان کے بارے میں فرماتا ہے۔

وَالَّذِينَ يَبِيتُونَ لِرَبِّهِمْ سُجَّدًا وَقِيَامًا (الفرقان 64:25)

یعنی رات دن نمازوں میں گزارنے والے ہو گئے۔

جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہجرت کر کے مدینہ آ گئے تو کفار مکہ نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو تباہ و برباد کرنے کے لیے مدینہ پر عسکری حملے کرنا شروع کیے آپؐ نے صحابہ سے دشمن کے دفاع کے متعلق مشورہ طلب کیا۔ تو تمام صحابہ آپ ﷺ کے پیچھے بنیان مرصوص بنے ہوئے نظر آتے ہیں۔ آپ ﷺ کی حفاظت کے لیے اپنا دھن، من قربان کر دیا۔ جس کی نظیر ملنا مشکل ہے۔ جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اس دنیا سے جاتے ہیں تو تمام عرب آپ ﷺ کے زیر نگیں تھا یہ ہیں رسول کریم ﷺ کی قوت قدسیہ کے اثرات جب حضرت عیسیٰ علیہ

السلام کی زندگی کا مطالعہ کرتے ہیں تو ان کی زندگی اس قسم کی کامیابیوں سے خالی نظر آتی ہے۔

مذکورہ بالا سطور میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے دور حیات کا ذکر کیا گیا ہے کہ وہ کس طرح تمام انبیاء علیہم السلام میں ایک نمایاں روشن مینار نظر آتے ہیں۔ لیکن رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی قوت قدسیہ کا غیر منقطع دائمی فیض اب بھی جاری ہے۔ یہ وہ وصف ہے جو کسی نبی میں نہیں پایا جاتا۔ یہ روحانی فیض صرف آپ کی ذات سے وابستہ ہے وہ روحانی فیض یہ ہے کہ آپ کی کامل پیروی سے انسان اللہ تعالیٰ سے ہم کلام ہوتا ہے اور روحانی لذتیں محسوس کرتا ہے۔ روحانی اموراس پر منکشف ہوتے ہیں گویا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قوت قدسیہ کے فیوض غیر منقطع اور دائمی ہیں۔ یہ صرف رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی کامل پیروی سے ملتے ہیں۔

اگر معترض کے قول کے مطابق حضرت یسوع روشنی ہیں۔ تو اللہ تعالیٰ نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی نور کہا ہے۔

ارشاد الٰہی ہے۔

قَدْ جَآءَ كُمْ نُوْرٌ مِّنَ اللّٰهِ (المائدة:15)

یعنی تمہارے پاس اللہ کا نور آیا ہے۔

یہ جملہ کہ تم جو تھکے اور درماندے ہو میرے پاس آجاؤ میں تمہیں آرام دوں۔ یہ جملہ ہی بے معنی اور لغو ہے کیا انسان اس دنیا میں آرام کرنے کے لیے آیا ہے۔ انسان کی زندگی ہی محنت سے عبارت ہے۔ قرآن مجید میں آتا ہے۔

وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِ يَنَّهُمْ سُبُلَنَا (العنکبوت 69:29)

اور جو لوگ ہمارے لیے محنت اٹھاتے ہیں ہم یقیناً انہیں اپنے راستوں پر چلائیں گے۔

جب ایک شخص دائرہ اسلام میں داخل ہوتا ہے تو اسلام یہ کہتا ہے کہ پانچ وقت مسجد میں باجماعت نماز ادا کرے۔ رات کو اٹھ کر تہجد پڑھے۔ جب رمضان کا مہینہ آئے تو روزے رکھے۔ اگر صاحب استطاعت ہے تو مکہ کا حج کرنے کے لیے سفر کرے حقوق العباد ادا کرے۔ خدا کی رضا حاصل کرنے کے لیے ہر قسم کی برائی سے دور رہے اور ہر نیکی کے راستہ پر گامزن رہے اس کا کوئی قدم احکام الٰہی کے خلاف نہ اٹھے۔ الغرض اللہ تعالیٰ کی صفات کا مظہر بن جائے۔ انسان کلمہ توحید پڑھتے ہی اللہ کی راہ میں جہاد شروع کر دیتا ہے۔ حقیقت میں یہی اصلی زندگی ہے اسی میں لذت ہے۔

حضرت یسوع علیہ السلام نے تھکے ماندوں کو کون سا آرام دیا وہ معترض ہی جانتا ہے۔ اسلام نے تو نفسانی خواہش ترک کر کے احکام الٰہی کے مطابق زندگی بسر کرنے کی تعلیم دی ہے اس تعلیم پر عمل پیرا ہونا ہی جہاد ہے۔ یہ جہاد ہی خدا کا قرب بخشتا ہے جس سے عیسائی بے نصیب ہیں ان کے دل مردہ ہو چکے ہیں اور سچے خدا سے ناواقف ہیں۔

......☆......

اسلام عیسائیت کی بگڑی ہوئی شکل ہے

اعتراض: اسلام عیسائیت کی بگڑی ہوئی شکل ہے اگر عیسائیت نہ ہوتی تو اسلام بھی نہ ہوتا (کارلائل Hero and here worship)۔

جواب: کارلائل یورپ کا ایک مشہور دانشور اور مفکر ہے اس نے تقریباً ڈیڑھ صدی قبل رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی پر 8 مئی 1840 کو لندن کے ایک ہال میں لیکچر دیا تھا جو ان کی کتاب Hero and hero worship میں دوسرے لیکچر کے طور پر شامل ہے اس کا عنوان ہے (The hero as prophet) اس مختصر کتاب کے اردو زبان میں تراجم ہوئے ایک ترجمہ پروفیسر اعظم خان لیکچرار جامعہ عثمانیہ حیدر آباد دکن نے ''سید الانبیاء'' کے نام سے کیا۔ اس ترجمے کا دیباچہ قائداعظم محمد علی جناح نے لکھا تھا اور اسے ''مرد عاقل'' کے نام سے پکارا یہ دیباچہ جناح صاحب نے 26 اگست 1944 کو مالا بار ہل بمبئی میں رقم کیا تھا۔

کارلائل نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق جن خیالات کا اظہار کیا ان سے مسیحی دنیا میں ضرور ایک انقلاب برپا ہوا۔ مسیحی پادری جس قسم کے گھٹیا اعتراضات رسول کریم ﷺ کی ذات پر کرتے تھے۔ ان کے لئے یہ کتاب ایک لمحہ فکریہ تھی۔ گو کارلائل نے مسیحی پادریوں کے لیے نئی فکر کے دروازے کھولے۔ لیکن کارلائل نے اپنے لیکچر میں بعض مقامات پر جارج سیل کے قرآن مجید کے انگریزی ترجمہ پر بنیاد رکھنے کی وجہ سے ٹھوکر کھائی ہے اس کی وضاحت اور تصحیح کرنا ضروری ہے۔ کارلائل مسیحیت کو اسلام سے بہتر مذہب قرار دیتا ہے۔ بلکہ اسلام کو عیسائیت کی بگڑی ہوئی شکل قرار دیتا ہے۔ اس قسم کے مفکر کے لیے یہ بھی ضروری تھا کہ اپنے دعویٰ کو دلائل سے ثابت کرتا لیکن کارلائل نے اپنے دعویٰ میں کوئی دلیل نہیں دی۔ ہر شخص کو اپنے مذہب کو برتر قرار دینے کا حق ہے لیکن دلائل کے ساتھ۔

کارلائل کی لاعلمی اور بے خبری:

کارلائل اللہ تعالیٰ کی دنیا میں رسول مبعوث کرنے کی حکمت بالغہ سے بالکل ناواقف اور تہی عقل ہیں۔ اگر وہ اللہ تعالیٰ کی اس حکمت کو سمجھتے ہوتے تو کبھی مذکورہ بالا اعتراض نہ کرتے اللہ تعالیٰ نے دنیا کی ہر قوم کی طرف روحانی اور مادی ترقی کے لیے نبی بھیجے ہیں۔

ارشاد الٰہی ہے۔ وَلِكُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلٌ (یونس 47:10) یعنی ہر امت کے لیے رسول بھیجا ہے۔

دوسری جگہ آتا ہے۔ اِنْ مِّنْ اُمَّةٍ اِلَّا خَلَا فِيْهَا نَذِيْرٌ (فاطر 24:35) ہر امت میں ڈرنے والا گزر چکا ہے۔

وَلِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ (الرعد 7:13) ہر قوم کی طرف رہنما آیا۔

یہ تمام انبیاء ایک ہی گروہ ہیں اور یہ ایک چشمہ الوہیت سے سیراب ہو کر دنیا کو راہ ہدایت کی طرف بلاتے تھے۔ ارشاد الٰہی ہے۔ اِنَّ هٰذِهٖۤ اُمَّتُكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّ اَنَا رَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْنِ (الانبیاء 92:21) یہ تمہاری امت ایک ہی جماعت ہے اور میں تمہارا رب ہوں سو تم میری ہی عبادت کرو۔

تمام انبیاء علیہم السلام ایک ہی پیغام لائے ارشاد الٰہی ہے۔ وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِيْ كُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلًا اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوْتَ (النحل 36:16) اور البتہ ہم نے ہر امت کے لیے ایک رسول بھیجا اور یہ پیغام دیا کہ اللہ کی عبادت کرو اور طاغوت کی بندگی سے بچو۔

جب تمام انبیاء علیہم السلام ایک ہی جماعت ہیں اور ایک ہی پیغام لے کر آئے۔ تو اس وجہ سے اسلام نے رسولوں کے درمیان تفریق کو کفر قرار دیا ہے۔ ارشاد الٰہی ہے لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ (البقرہ 2 تا 136) ہم ان سب سے کسی میں تفریق نہیں کرتے یہ تاریخی حقیقت

نہ کسی نبی نے بتائی اور نہ کسی مذہب کی کتاب میں ہے۔اس تاریخی حقیقت کو صرف اسلام نے واضح کیا ہے اور سب انبیاء کو ایک جماعت قرار دے کر سب پر ایمان لانا ضروری قرار دیا ہے اور اس کے ساتھ یہ بھی بیان کیا کہ سب انبیاء ایک چشمہ الوہیت سے سیراب ہوتے تھے اور سب کا ایک ہی پیغام ہوتا تھا اور اس حقیقت کو بھی واضح کیا ہے کہ قرآن مجید وہ کتاب ہے جس میں تمام سماوی تعلیمات کا عطر ہے۔ارشاد الٰہی ہے۔
فِيهَا كُتُبٌ قَيِّمَةٌ (البینۃ 3:98) اس میں قائم رہنے والی کتابیں ہیں۔
اس آیت میں واضح بتایا گیا ہے کہ اس قرآن میں پہلی کتابوں کی تمام وہ تعلیم موجود ہے جو قائم رکھنے کے قابل تھی۔مزید براں قرآن مجید میں ان تمام امور کو اصولاً بیان کر دیا گیا ہے جو بنی نوع انسان کی مادی اور روحانی زندگی کے لیے ضروری ہیں لہٰذا اسلام عیسائیت کی بگڑی ہوئی شکل نہیں بلکہ تمام مذاہب کی اصلی تعلیمات کو اپنے اندر لیے ہوئے ہے اور تمام مذاہب کی تصویر ہے اس کے ساتھ مذاہب عالم کے باطل عقائد کی بھی تصحیح کرتا ہے یہ بھی اسلام کا تمام مذاہب پر احسان ہے کہ ان کے نبیوں اور کتب کو من جانب قرار دے کر ان کے غلط عقائد کو درست کیا عیسائیت میں جو بگاڑ پیدا ہو گیا تھا۔اس کی بھی اصلاح کی یہی اسلام کی برتری اور فضیلت ہے۔

اسلام اور عیسائیت کا موازنہ:

اصولی بحث کرنے کے بعد اسلام اور عیسائیت کا موازنہ کیا جاتا ہے تاکہ کارلائل کے اعتراض کا بوداپن ظاہر ہو سکے۔

حضرت یسوع مسیح کی بعثت:

انجیل سے یہ واضح ہوتا ہے کہ یسوع مسیح ایک مخصوص قوم کی اصلاح کی طرف مبعوث ہوئے تھے اور آپ کے مخاطب بنی اسرائیل تھے۔
آپ خود فرماتے ہیں۔
''میں اسرائیل کے گھرانے کی کھوئی ہوئی بھیڑوں کے سوا اور کسی کے پاس نہیں بھیجا گیا۔'' (متی باب 15 آیت 24)
جب آپ نے اپنے بارہ حواریوں کو تبلیغ کے لیے روانہ کیا تو ان کو یہ ہدایت فرمائی کہ:
''غیر قوموں کی طرف نہ جانا اور سامریوں کے کسی شہر میں داخل نہ ہونا بلکہ اسرائیل کے گھرانے کی کھوئی ہوئی بھیڑوں کے پاس جانا۔'' (متی باب 10 آیت 6)
کنعانی قوم کی ایک عورت نے حضرت یسوع سے اپنی بیمار بیٹی کے علاج کی التجا کی تو آپ نے جواب دیا۔
''لڑکوں کی روٹی لے کر کتوں کو ڈال دینا اچھا نہیں۔'' (متی باب 15 آیت 26)
مذکورہ حوالہ جات سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی بعثت صرف بنی اسرائیل کی طرف تھی۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت:

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت ساری دنیا کی طرف تھی۔اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔
قُلْ يَاَيُّهَا النَّاسُ اِنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ جَمِيْعًا (الاعراف 158:7)
کہہ دیجیے کہ اے لوگو! میں تم سب لوگوں کی طرف اللہ کا رسول بنا کر بھیجا گیا ہوں۔
دوسری جگہ آتا ہے۔وَمَا اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ (سبا 28:34)
اور ہم نے تجھے تمام انسانوں کی طرف بھیجا۔
ایک اور مقام پر ارشاد الٰہی ہے۔ وَاَرْسَلْنٰكَ لِلنَّاسِ رَسُوْلًا (النساء 79:4)

ہم نے تجھے بنی نوع انسان کے لیے رسول بنا کر بھیجا۔

ایک اور موقع پر ارشاد الٰہی ہے۔ وَمَا اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ (الانبیاء 21:107)

اور ہم نے تجھے سب جہانوں کے لیے رحمت بنا کر بھیجا؟

حضرت یسوع مسیح تو خود اپنی بعثت صرف بنی اسرائیل کی گم شدہ بھیڑوں کی طرف قرار دیتے ہیں اور وہ تھے بھی بنی اسرائیل کے نبی بلکہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی بعثت تمام بنی نوع انسانوں کی طرف قرار دی ہے آپ فرماتے ہیں۔ فُضِّلْتُ عَلَى الْاَنْبِيَاءِ بِسِتٍّ (مسلم جلد اول ترمذی ج ا باب الغنیمۃ) کہ چھ باتوں کی وجہ سے مجھے دوسرے انبیاء علیہم السلام پر فضیلت دی گئی ہے ان میں سے ایک یہ فرمائی۔ كَانَ النَّبِيُّ يُبْعَثُ اِلٰى قَوْمِهٖ خَاصَّةً وَبُعِثْتُ اِلَى النَّاسِ كَافَّةً مجھ سے پہلے نبی اپنی قوم کی طرف بھیجے گئے لیکن میں تمام لوگوں کی طرف بھیجا گیا ہوں۔ پھر فرمایا۔ اِلَى الْاَحْمَرِ وَالْاَسْوَدِ۔ میں گورے اور کالے سب کی طرف بھیجا گیا ہوں۔

مصلحت الٰہی کا یہ تقاضا تھا کہ جس وقت نسل انسانی مختلف ملکوں میں علیحدہ علیحدہ زندگی گزار رہی تھی اور قوموں کے میل جول کے ذرائع اور وسائل محدود تھے تو اللہ تعالیٰ نے ہر قوم کی ہدایت اور اصلاح کے لیے ایک ایک نبی بھیجا اس کے ساتھ ہی انسانوں کی تنگ نظری اور تنگ ظرفی کی وجہ سے یہ خیال ہر قوم میں پیدا ہو گیا کہ وہی خدا کی محبوب قوم ہے اور اس کی نعمتوں اور فضلوں کی وارث ہے ہر قوم اپنے سوا دوسری قوم کو ہیچ سمجھنے لگی جب قوموں کے باہمی میل جول کے وسائل کی محدودیت ختم ہو گئی تو انبیاء علیہم السلام کے آخر میں اللہ تعالیٰ نے ایک ایسا رسول بھیجا جس کی بعثت تمام قوموں کی طرف تھی تاکہ دنیا کو ایک پلیٹ فارم پر اکٹھا کرے۔ ان میں لونی، لسانی، مذہبی اور علاقائی تعصب ختم کرے اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ پیغام دیا ''اے لوگو! اپنے رب سے ڈرو جس نے تم کو ایک جان سے پیدا کیا۔'' (النساء 4:1)

محفوظ تاریخ اور کامل نمونہ:

دنیا کی تمام مذہبی کتب کا مطالعہ کیجیے اور تاریخ عالم کا مطالعہ کر لیجیے صرف ایک ہی نبی ہے جس کا یہ دعویٰ ہے کہ اس کی بعثت ساری دنیا کی طرف ہے وہ ہے حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم۔

تاریخ مسیح:

حضرت مسیح علیہ السلام کی پیدائش کا زمانہ، ابتدائی عمر، تبلیغ اور مصلوب کیے جانے کے صحیح اور مستند واقعات کا علم نہ تو یہودیوں کی کتب سے ہوتا ہے اور نہ ہی اس زمانہ کے بت پرست اقوام کے نوشتے اس پر روشنی ڈالتے ہیں۔ صرف اناجیل ہیں جن سے حضرت یسوع مسیح کے کچھ حالات مل جاتے ہیں لیکن انجیل کی تاریخی کمزوری اور متضاد بیانات کی وجہ سے محققین نے حضرت مسیح علیہ السلام کی ہستی سے انکار کر دیا 1835ء میں جرمنی کے ایک مشہور مذہبی عالم ڈاکٹر سٹراس (Stress) نے اپنی کتاب سیرا مسیح (Life of Jesus) میں یہ ثابت کیا ہے کہ اناجیل میں جو سوانح یسوع کے درج ہیں وہ تمام تر اصنام پرستوں کے مذہبی خرافات سے ماخوذ ہیں تولین (Tulane) یونیورسٹی کے پروفیسر ڈریوز (Drews) فرانسیسی ڈاکٹر کوچو (Couchow) پراسپر الفاریق (Prosper Alfaric) ڈٹوریس ماشیورو (Vuttoris Machioro) وغیرہ محققین نے یسوع مسیح کی ہستی کو محض ایک فرضی ہستی قرار دیا ہے۔ قرآن مجید کا یہ احسان ہے کہ اس میں حضرت مسیح علیہ السلام کی جیتی جاگتی تصویر بیان کی گئی ہے جس سے ایک نمایاں ہستی ظاہری ہوتی ہے۔ مسیحیت میں سب سے بڑا نقص یہی ہے کہ اس کے بانی کے حالات ہی دستیاب نہیں ہیں۔

جب حضرت یسوع مسیح کی زندگی انسانوں کے لیے اُسوہ نہیں اگر کوئی بچہ نوجوان اور بوڑھا ان کی زندگی سے نمونہ حاصل کرنا چاہے تو ان

کے لیے ان کی زندگی نمونہ سے سراسر خالی ہے۔اسی طرح اگر کوئی حاکم نمونہ حاصل کرنا چاہے وہ ان سے کوئی نمونہ اور ہدایت حاصل نہیں کر سکتا اس لیے کہ حضرت مسیح علیہ السلام حکمران نہیں تھے اسی طرح کوئی سپہ سالاران کی زندگی سے روشنی حاصل کرنا چاہے تو وہاں اندھیرا ہی اندھیرا ہے کیونکہ انہوں نے کبھی جنگ کی ہی نہیں۔اسی طرح اگر کوئی تاجران کی زندگی سے نور ہدایت حاصل کرنا چاہے تو ہدایت سے محروم رہے گا کیونکہ حضرت مسیح علیہ السلام نے کبھی تجارت کی ہی نہیں الغرض انسان کو مختلف شعبوں سے گزرنا پڑتا ہے۔اگر مختلف شعبوں والے حضرات حضرت مسیح علیہ السلام کی زندگی سے راہنمائی حاصل کرنا چاہیں تو وہ یکسر مایوس ہوں گے۔کیونکہ حضرت مسیح علیہ السلام کو زندگی کے ان شعبوں میں واسطہ ہی نہیں پڑا۔

الغرض حضرت مسیح کی زندگی لوگوں کے لیے نمونہ اور مشعل راہ نہیں۔

اس کے برعکس جب ہم رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کا مطالعہ کرتے ہیں تو پیدائش سے لے کر وفات تک ایک ایک لمحہ کی تاریخ اوراق میں درج ہے۔اس لیے بغیر کسی تعصب کے پورے علم اور یقین کے ساتھ یہ کہہ سکتے ہیں کہ تمام انبیاء علیہم السلام اور پیشوایان مذاہب میں سے صرف محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات ایسی ہے جن کی زندگی کا لمحہ لمحہ محفوظ اور مصئون ہے۔اسی وجہ سے دنیا میں ایک ہی ذات ہے جو بنی نوع انسان کے لیے زندگی کے ہر شعبہ میں اُسوہ حسنہ ہے وہ رسول کریم ﷺ کی ذات مبارک ہے۔اسی وجہ سے قرآن مجید میں آتا ہے۔

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ (الاحزاب 33:31)

تمہارے لیے اللہ کے رسول کی ذات میں بہترین نمونہ ہے۔

یہ صرف دعویٰ ہی نہیں۔آپ بچوں کے لیے بھی نمونہ ہیں آپ بڑوں کے لیے بھی نمونہ ہیں آپ غرباء کے لیے بھی نمونہ ہیں آپ دولت مندوں کے بھی نمونہ ہیں آپ محکوموں کے لیے بھی نمونہ ہیں آپ حاکموں اور بادشاہ کے لیے بھی نمونہ ہیں آپ متاہل لوگوں کے لیے بھی نمونہ ہیں آپ محکوموں کے لیے نمونہ ہیں آپ سپہ سالاروں کے لیے بھی نمونہ ہیں آپ معلمین کے لیے بھی نمونہ ہیں آپ منصفین کے لیے بھی نمونہ ہیں آپ والدین کے لیے بھی نمونہ ہیں آپ تاجروں کے لیے بھی نمونہ ہیں آپ ہمسایوں کے لیے بھی نمونہ ہیں آپ رشتہ داروں کے لیے بھی نمونہ ہیں۔آپ اولاد کے لیے بھی نمونہ ہیں آپ دشمنوں کے لیے بھی نمونہ ہیں۔

الغرض زندگی کے کسی شعبہ سے تعلق رکھنے والا شخص آپ کی زندگی سے نور ہدایت حاصل کرنا چاہے تو آپ کی زندگی سے روشنی پا سکتا ہے یہ وہ فضیلت ہے جو صرف آپ کی ذات میں پائی جاتی ہے۔یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ مسیح علیہ السلام اس خوبی اور فضیلت سے بالکل تہی دامن ہیں۔

کیا وہ نبی ہو سکتا جس کی زندگی کے حالات ہی محفوظ نہ ہوں۔دوم جس کی زندگی لوگوں کے لیے مشعل راہ ہی نہ ہو اس نبی سے افضل ہو سکتا ہے جس کی زندگی کا لمحہ لمحہ محفوظ ہو پھر اس کی زندگی کھلی کتاب ہو پھر اس کی زندگی ہر شخص کے لیے نور ہدایت ہو۔

لہٰذا یہ کہنا کہ اسلام مسیحیت کا چربہ ہے یا بگڑی ہوئی شکل ہے۔اسلام کی تعلیم سے عدم واقفیت کا نتیجہ ہے۔

محفوظ کتاب:

(انجیل کا نام اس کی تدوین اور ترتیب) جب عیسائیوں کی کتاب انجیل کا تاریخی مطالعہ کیا جائے تو یہ بات صاف معلوم ہو جاتی ہے کہ ان کی مذہبی کتاب محفوظ نہیں۔حضرت عیسیٰ علیہ السلام اپنے بعد کوئی ایسی لکھی ہوئی کتاب چھوڑ کر نہیں گئے تھے جس کی حواری اشاعت کرتے عہد نامہ جدید میں لفظ انجیل استعمال ہوا ہے لیکن ہر جگہ اس سے مراد خوشخبری ہے نہ کہ کتاب۔(متی 5:11,33:4,14:1

مرقس 16,15:1، لوقا 12,10:25)

ان حوالہ جات میں انجیل بمعنی خوشخبری استعمال ہوا ہے اور ترجمہ بھی خوشخبری کیا گیا ہے۔

لفظ انجیل کتاب کے طور پر حضرت مسیح علیہ السلام سے 150 سال بعد استعمال ہونے لگا انسائیکلو پیڈیا میں لکھا ہے۔

چنانچہ دوسری صدی کے وسط تک اس لفظ (انجیل) نے کتاب کے معنی اختیار کر لیے اور اس کے بعد دوسری صدی کے اختتام تک اپنے انہی معنوں میں استعمال ہوتا رہا۔ (انسائیکلو پیڈیا ببلیکا ص 1889) گویا لفظ انجیل بمعنی کتاب حضرت مسیح علیہ السلام کے 150 سال بعد استعمال کیا جانے لگا۔ اگر حضرت مسیح علیہ السلام اپنے بعد کوئی لکھی ہوئی کتاب چھوڑ جاتے تو لازمی طور پر ان کی زندگی میں ہی اس کتاب کا نام مشہور ہو جاتا تھا۔ کتاب کا نام مشہور نہ ہونا یہ ظاہر کرتا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اپنے بعد کوئی لکھی ہوئی چیز چھوڑ کر نہیں گئے۔

حضرت مسیح علیہ السلام کے بعد جعل سازی:

حضرت مسیح علیہ السلام کے بعد ہی جعل سازی، فریب کاری اور جعلی تصانیف کا بازار گرم ہو گیا تھا۔ پولوس کے زمانہ سے جھوٹے مدعیان رسالت کا سلسلہ جاری ہو گیا جس کا اسکاٹ صاحب نے رومن تفسیر مطبوعہ الہ آباد 1860 کے صفحہ 186 پر اقرار کیا ہے۔

جھوٹے مدعیان رسالت کے علاوہ دیندار عیسائیوں نے دین کے معاملات میں کذب بیانی کا شیوہ اختیار کر لیا تھا۔ اس بات کی تائید پولوس کی تحریر سے ملتی ہے انہوں نے ایک خط رومیوں کو بھیجا جو مجموعہ عہد جدید میں شامل ہے اس کے باب 3 آیت 8,7 میں لکھا ہے ''پھر اگر میرے جھوٹ کے سبب خدا کی سچائی اس کے جلال کے لیے زیادہ ظاہر ہوئی تو مجھ پر کیوں گناہ گار کی طرح حکم ہوتا ہے اور ہم کیوں برائی نہ کریں تا کہ بھلائی نکلے چنانچہ یہ تہمت ہم پر لگائی بھی جاتی ہے۔''

ہارن صاحب اپنی تفسیر کی دوسری جلد کے صفحہ 331 پر لکھتے ہیں۔ ''بلاشبہ بعض خرابیاں (تحریفین) جان بوجھ کر ان لوگوں نے کی ہیں جو کہ دیندار مشہور تھے اس کے بعد اپنی خرابیوں کو ترجیح دی جاتی تھی تا کہ اپنے مطلب کو قوت دیں یا اعتراض اپنے پر نہ آنے دیں۔''

عیسائی مصنفین کے نزدیک جعلی تصنیفات کی وجوہ حسب ذیل ہیں۔

1- عیسائیوں کے ہر فرقہ نے اپنے مسلک کی تائید میں کسی حواری یا خادم حواری یا کسی بڑے شخص کے نام پر کتب لکھ کر شائع کر دیں۔
2- جعلی مسیح اور جھوٹے مدعیان رسالت کی کثرت جعلی تصانیف میں اضافہ کا باعث ہوتی رہی۔
3- دیندار لوگوں نے بھی دین کے معاملات میں جھوٹ بولنا جائز سمجھ لیا۔ اس بات کا اعتراف پولوس کو بھی ہے۔

ترتیب وتدوین کا نرالہ طریقہ:

جب مسیح فرقوں کے اصولی اختلاف اور انتشار کی وجہ جعلی اناجیل کا رواج عام ہو گیا تو 325ء میں فلسطین اعظم نے 300 پادریوں کی ایک کونسل بلائی کہ وہ اصل انجیل اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے صحیح عقائد کا فیصلہ کرے۔

چنانچہ انہوں نے تاریخی اور عقلی دلائل کی روشنی میں اصل انجیل اور حضرت مسیح علیہ السلام کے صحیح عقائد کی تدوین کی بجائے ایک عجیب اور نرالا طریقہ اختیار کیا اور وہ یہ کہ ''کونسل میں جو اناجیل پیش کی گئی تھیں انہوں نے ان کو ایک بے ترتیب ڈھیر کی طرح گرجا کے اندر عشاء ربانی کی میز کے نیچے رکھ دیا اور خداوند سے درخواست کی کہ ان میں سے الہامی نوشتے چھلانگ کر میز پر آ جائیں اور جعلی نسخے میز کے نیچے پڑے رہیں چنانچہ ایسا ظہور میں آ گیا۔ (The Apocryphal new testament 14)

چنانچہ فلسطین اعظم نے چار اناجیل کے علاوہ باقی سینکڑوں نسخہ کو جعلی قرار دے کر جلا دینے کا حکم دے دیا یہاں تک کہ حکم دے دیا کہ جو

شخص ایسی تحریر چھپا رکھے گا یا جلا نہ دے گا یا وہ بادشاہ کی خدمت میں پیش نہ کرے گا اسے سزائے موت دی جائے گی اس طرح سینکڑوں نسخے جلا دیئے گئے۔

موشیم چرچ ہسٹری میں لکھتا ہے۔

''یہ احکام اس قدر ظالمانہ اور نامعقول تھے کہ بعد میں خود بادشاہ کو پچھتانا اور پشیمان ہونا پڑا اس کونسل میں ایریس (Areis) فرقہ کے متعلق بادشاہ نے ان کی تحریرات جلا دینے اور ان کو جلاوطن کر دینے کا حکم دیا مگر اس کے چند سال بعد 320ء میں جب بادشاہ کی بہن نے اپنے بستر مرگ پر کہا کہ ''ایریس کے خلاف فیصلہ ظالمانہ تھا اور یہ فیصلہ اس کے دشمنوں کے تعصب کی وجہ سے ہوا نہ کہ صداقت کی بناء پر اس پر شہنشاہ نے اپنا حکم واپس لے لیا مگر یہ حکم پہنچنے سے پہلے ہی ایریس فوت ہو چکا تھا۔ (ص126 باب 72 فصل 5)

یہ ہے سینکڑوں اناجیل میں سے چار اناجیل کا انتخاب۔

کیا موجودہ اناجیل الہامی ہیں؟ مولفین اناجیل نے یہ دعویٰ نہیں کیا کہ انہوں نے جو کچھ لکھا ہے اللہ تعالیٰ کے الہام اور وحی سے لکھا ہے اور وہ خدا کا کلام ہے۔ بلکہ لوقا نے اپنی انجیل کی ابتداء میں یہ وضاحت کر دی ہے کہ وہ جو کچھ اپنی انجیل میں لکھ رہے ہیں وہ اپنی تحقیق کی بناء پر لکھ رہے ہے نہ کہ الہام اور وحی کی بناء پر۔ لکھتا ہے ''چونکہ بہتوں نے اس پر کمر باندھی کہ جو باتیں ہمارے درمیان واقع ہوئیں ان کو ترتیب وار بیان کریں جیسا کہ انہوں نے جو شروع سے خود دیکھنے والے اور کلام کے خادم تھے ان کو ہم تک پہنچایا اس لیے اے معزز تھیفلس میں نے بھی مناسب جانا کہ سب باتوں کو سلسلہ وار شروع سے ٹھیک ٹھیک دریافت کر کے ان کو تیرے لیے ترتیب سے لکھوں۔ تاکہ جن باتوں کو تو نے تعلیم پائی ہے ان کی پختگی تجھے معلوم ہو جائے۔ (لوقا 1-4/1)

اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ لوقا نے ان باتوں کو جمع کیا ہے جو حضرت عیسیٰ کی طرف منسوب تھیں۔ گو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے اقوال ہیں۔ جو بعد کے مولفین نے جمع کیے۔ ان کی تاریخی حیثیت کیا ہے ان اقوال کے جانچ پڑتال کا کیا طریقہ تھا۔ جن راویوں سے ان اقوال کو سنا وہ کہاں تک ثقہ تھے اسی طرح کے بے شمار سوالات جنم لیتے ہیں ان اناجیل کی ثقاہت اتنی بھی نہیں ہے جتنی مسلمانوں کی احادیث کی ہے۔ مورخین نے ایک ایک روایت کی چھان پھٹک کی۔ روایت کے پرکھنے کے اصول مرتب کیے۔ راویوں کے حالات زندگی معلوم کیے پھر کہیں جا کر حدیث کو قبول کیا جاتا۔

الغرض موجودہ اناجیل حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی لکھی ہوئی نہیں ہیں۔ بلکہ مولفین نے ان اقوال کو جمع کیا جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی طرف منسوب کیے جاتے تھے۔ جیسا کہ پہلے یہ ذکر کیا گیا ہے۔ جعل سازی کا بھی بازار گرم تھا۔ یہ بھی معلوم نہیں کہ جو بات انجیل میں درج ہے وہ جعل سازی کی ہے یا حضرت مسیح علیہ السلام کی۔ موجودہ اناجیل کی تاریخی ثقاہت کی ہمارے پاس کوئی کسوٹی نہیں۔ لہذا اناجیل کے متون شک و شبہات کی رداء میں لپٹے ہوئے ہیں۔

اندرونی اختلافات:

اناجیل میں جو اندرونی اختلافات پائے جاتے ہیں وہ بھی اس امر پر بیّن ثبوت ہے کہ موجودہ اناجیل الہامی نہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ کے کلام میں اختلاف نہیں ہو سکتا متی نے اپنی انجیل میں یسوع ابن داؤد بن ابرہام کا نسب نامہ کے زیر عنوان لکھا کہ ''مریم جن سے یسوع پیدا ہوا اس کا شوہر یوسف یعقوب کا بیٹا تھا۔'' اور اس کا سلسلہ نسب حضرت داؤد کے بیٹے حضرت سلیمان سے ملتا ہے مگر لوقا نے اپنی انجیل میں یوسف کو عیلی کا بیٹا قرار دیا ہے پھر اس کا سلسلہ نسب حضرت داؤد علیہ السلام کے بیٹے سے ملایا ہے۔

یسوع مسیح نے اپنے شاگردوں کو تبلیغ کے لیے بھیجا تو متی لکھتا ہے کہ اس نے ان کو حکم دے کر کہا کہ "نہ سونا اپنے کمر بند مین رکھنا نہ چاندی نہ پیسے راستہ کے لیے نہ جھولی لینا نہ دو دو کُرتے نہ جوتیاں نہ لاٹھی۔" (متی 10:10)

مگر مرقس لکھتا ہے۔ "حکم دیا کہ راستہ کے لیے لاٹھی کے سوا کچھ نہ لو نہ روٹی نہ جھولی نہ اپنے کمر بند مین پیسے مگر جوتیاں پہنو اور دو کُرتے نہ پہنو۔" (مرقس 8:6)

متی کے قول کے مطابق یسوع مسیح شاگردوں کو حکم دیتا ہے کہ اپنے ساتھ لاٹھی بھی نہ لو۔ لیکن مرقس کے قول کے مطابق مسیح نے اپنے شاگردوں سے کہا کہ لاٹھی لے لو۔ ان دونوں بیانوں میں سے ایک ضرور غلط ہے۔

متی لکھتا ہے کہ جب مسیح بیت لحم میں پیدا ہوئے تو وہیں "خداوند نے یوسف کو خواب میں دکھائی دے کر کہا۔ اٹھ بچے اور اس کی ماں کو ساتھ لے کر مصر بھاگ جا اور جب تک کہ میں تجھ سے نہ کہوں وہیں رہنا۔ کیونکہ ہیرودیس اس بچے کی تلاش کرنے کو ہے تا کہ اسے ہلاک کرے۔ پس وہ اٹھا اور رات کے وقت بچے اور اس کی ماں کو ساتھ لے کر مصر کو روانہ ہو گیا اور ہیرودیس کے مرنے تک وہیں رہا۔ (متی 14,13:12)

مگر لوقا لکھتا ہے کہ "جب یسوع مسیح بیت لحم میں پیدا ہوئے تو جب آٹھ دن پورے ہوئے اور اس کے ختنہ کا وقت آیا تو اس کا نام یسوع رکھا گیا پھر جب موسیٰ کی شریعت کے موافق ان کے پاک ہونے کے دن پورے ہو گئے تو وہ اس کو یروشلم میں لائے تا کہ خداوند کے آگے حاضر کریں......اور جب وہ خداوند کی شریعت کے مطابق سب کچھ کر چکے تو گلیلی میں اپنے شہر ناصرہ کو پھر گئے اور وہ لڑکا بڑھتا اور قوت پاتا گیا اور حکمت سے معمور ہوتا گیا اور خدا کا فضل اس پر تھا اس کی ماں باپ ہر برس عید فسح پر یروشلم کو جایا کرتے تھے اور جب وہ بارہ برس کا ہوا تو وہ عید کے دستور کے موافق یروشلم کو گئے۔

(لوقا 2:21,22-39 تا 42)

متی کے بیان کے مطابق یوسف یسوع کی پیدائش کے بعد اسے اور اس کی والدہ کو بیت لحم سے مصر لے گئے اور ہیرودیس کی وفات تک مصر میں رہا لیکن لوقا کے بیان کی رو سے یسوع مسیح کی پیدائش کے بعد اس کے ماں باپ اسے بیت لحم سے یروشلم لے گئے اور شریعت موسوی کے مطابق قربانی وغیرہ کی رسوم ادا کیں۔ وہاں سے گلیلی شہر ناصرہ میں چلے گئے اور بارہ برس تک یسوع وہیں رہا بس متی اور لوقا کے بیانوں میں سے ایک بیان ضرور غلط ہے۔ صرف اناجیل کا ہی باہمی اختلاف نہیں بلکہ انجیل کا عہد قدیم کی کتب سے بھی اختلاف ہے طوالت سے بچنے کے لیے صرف ایک اختلافی بیان درج کیا جاتا ہے۔

انجیل متی 1:11 میں لکھا ہوئے کہ یوسیاہ سے یکونیاہ پیدا ہوا۔ لیکن عہد قدیم کی کتاب یرمیاہ 28:4 اور 1 تواریخ 16:3 میں لکھا ہے کہ یکونیاہ کا باپ یہویقیم تھا اور یوسیاہ اس کا دادا تھا۔ پس انجیل کا بیان غلط ہے کیونکہ عہد قدیم کی کتابوں سے مختلف ہے۔

یہ ایک تاریخی حقیقت ہے موجودہ اناجیل حضرت یسوع مسیح کی مرتب شدہ کتب نہیں انہوں نے اپنے بعد کوئی لکھی ہوئی تحریر نہیں چھوڑی۔ بعد کے مولفین نے موجودہ اناجیل کو مرتب کیا ان کی ثقاہت کی بھی کوئی کسوٹی نہیں۔ سوم اناجیل میں اختلاف پائے جاتے ہیں اسی طرح انجیل، عہد نامہ قدیم سے بعض بیانات میں اختلاف رکھتی ہے۔ لہٰذا حضرت مسیح علیہ السلام جو پیغام یا تعلیمات لے کر آئے تھے وہ ہم تک من وعن نہیں پہنچا۔ وہ انسانی دست برد سے خالی نہیں اس کے برعکس جب ہم اسلام کی کتاب قرآن مجید کی تاریخی حیثیت دیکھتے ہیں تو واضح ہو جاتا ہے کہ قرآن وہی صحیفہ ہے جو رسول کریم ﷺ پر نازل ہوا رسول کریم ﷺ نے کاتبان وحی سے لکھوایا دوم رسول کریم ﷺ کی زندگی میں ہی بے شمار صحابہ کو زبانی یاد تھا۔ وہی مکتوبہ صحیفہ نسلاً بعد نسلٍ ہم تک محفوظ طریقے سے پہنچا۔ صرف کتابی شکل میں ہی نہیں بلکہ ہر دور میں

مسلمانوں نے اس کو یاد کر کے اپنے سینوں میں محفوظ رکھا۔ حفاظت کے دو ہی طریقے ہوتے ہیں یا کسی چیز کو ضبط تحریر میں لایا جائے یا زبانی یاد کر لیا جائے قرآن مجید کو حفاظت کے دونوں طریقے میسر تھے۔ اس لیے مستشرقین بھی اس بات کے قائل ہیں۔ کہ قرآن مجید ایک محفوظ کتاب ہے چنانچہ میور لکھتا ہے ''اس بات کی تسلی بخش اور قابل اطمینان اندرونی اور بیرونی شہادت موجود ہے کہ قرآن اس وقت بھی ٹھیک اسی شکل وصورت میں محفوظ اور مصؤن ہے۔ جس حالت میں (حضرت) محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اسے دُنیا کے سامنے پیش کیا تھا (دیباچہ لائف آف محمد (صلی اللہ علیہ وسلم ص 25) جرمن کے مشہور مستشرق نولڈ یکی نے لکھا ہے۔

''یورپ کے جن جن مصنفین نے اب تک اس امر کی زبردست کوشش کی ہے کہ قرآن مجید میں تحریف ثابت کریں وہ اپنی سعی اور جدوجہد میں حیرت انگیز طور پر نا کام ثابت ہوئے ہیں۔'' (انسائیکلو پیڈیا برٹینیکا زیر لفظ قرآن)

جب حضرت یسوع مسیح کی تعلیم ہی غیر محفوظ ہو جن کتب میں وہ تعلیم موجود ہے وہ تاریخی ثقاہت کے معیار پر نہیں اترتیں۔ قرآن مجید کی محفوظ تعلیم کو غیر محفوظ تعلیم کی بگڑی ہوئی شکل قرار دینا صریحاً ظلم اور اسلام کی روشن تعلیم سے ناواقفیت کا ثبوت ہے۔

قرآن اور انجیل کی تعلیمات کا موازنہ:

1-انجیل: کہ صرف بدنظری اور شہوت کے خیال سے نامحرم عورتوں کو مت دیکھ اور بجز اس کے دیکھنا حلال ہے۔

قرآن: بدنظری سے اور نہ نیک نظری سے دیکھ یہ سب تیرے لیے باعث ٹھوکر اور گمراہی ہے بلکہ چاہیئے کہ نامحرم کے مقابلہ کے وقت تیری آنکھ خواب دیدہ رہے اس کی صورت کی کچھ بھی خبر نہ ہو۔

2 انجیل اتنی شراب مت پیو کہ مست ہو جاؤ۔

قرآن: شراب ہرگز نہ پی۔ ورنہ تجھے خدا کی راہ نہیں ملے گی اور خدا تجھ سے ہم کلام نہیں ہوگا اور نہ ناپاکیوں اور گندیوں سے پاک کرے گا۔ یہ شیطان کی ایجاد ہے تم اس سے بچو۔

انجیل کہتی ہے کہ اپنے بھائی پر بے سبب غصہ مت کر۔

قرآن یہ کہتا ہے کہ نہ صرف اپنے غصہ کو ہی تھام بلکہ کہتا ہے کہ تواصو بالرحمۃ پر بھی عمل کر یعنی دوسروں کو بھی کہہ وہ ایسا کریں نہ صرف خود رحم کر بلکہ اپنے تمام بھائیوں کو بھی وصیت کر کہ وہ بنی نوع انسان سے محبت کریں۔

انجیل کہتی ہے کہ بجز زنا کے اپنی بیوی کی ہر ایک ناپاکی پر صبر کرو اور طلاق مت دو۔

قرآن کہتا ہے الطیبات للطیبین (پاک عورتیں پاک مردوں کے لیے) قرآن کا یہ منشا ہے کہ ناپاک پاک کے ساتھ رہ نہیں سکتا پس اگر تیری بیوی زنا تو نہیں کرتی مگر شہوت کی نظر سے غیروں کو دیکھتی ہے اور ان سے بغل گیر ہوتی ہے اور زنا کے مقدمات اس سے صادر ہوتے ہیں گو ابھی تکمیل نہیں ہوئی اور غیر کو اپنی برہنگی اور عریانی دکھلاتی ہے اور مشرکہ اور مفسدہ ہے اور جس پاک خدا پر تو ایمان رکھتا ہے اس سے وہ بیزار ہے تو اگر وہ باز نہ آئے تو تُو اسے طلاق دے سکتا ہے کیونکہ وہ اپنے اعمال سے تجھ سے علیحدہ ہو گئی ہے اب تیرے جسم کا ٹکڑا نہیں رہی۔ پس تیرے لیے جائز نہیں ہے کہ تو دیوثی سے اس کے ساتھ زندگی بسر کرے۔ کیونکہ اب وہ تیرے جسم کا حصہ نہیں ایک گندہ اور متعفن عضو ہے۔ جو کاٹنے کے لائق ہے ایسا نہ ہو کہ وہ باقی عضو کو گندہ کر دے۔ اور تو روحانی موت مر جائے انجیل کہتی ہے کہ ہرگز قسم نہ کھا۔

قرآن بیہودہ قسموں سے روکتا ہے کیونکہ بعض صورتوں میں قسم فیصلہ کرنے کے لیے ایک ذریعہ ہے اور خدا کسی ذریعہ ثبوت کو ضائع کرنا نہیں چاہتا۔ کیونکہ اس سے اس کی حکمت تلف ہوتی ہے۔ یہ طبعی امر ہے کہ جب کوئی انسان ایک متنازعہ فیہ امر میں گواہی نہ دے تب فیصلہ کے لیے خدائی گواہی کی ضرورت ہے اور قسم خدا کو گواہ ٹھہراتا ہے۔

انجیل کہتی ہے ہر جگہ ظالم کا مقابلہ نہ کرو۔ اگر کوئی ایک گال پر تھپڑ مارے تو دوسرا بھی آگے کردے۔

قرآن کہتا ہے۔ جَزٰٓؤُا سَیِّئَةٍ سَیِّئَةٌ مِّثْلُهَا فَمَنْ عَفَا وَاَصْلَحَ فَاَجْرُهٗ عَلَى اللّٰهِ یعنی بدی کا بدلہ اسی قدر بدی ہے جو کی گئی ہو لیکن جو شخص درگزر کرے اور گناہ بخش دے اور اگر درگزر (عفو) سے اصلاح پیدا ہوتی ہو نہ کوئی خرابی تو خدا اس سے راضی ہے اور اسے اس کا بدلہ دے گا پس قرآن کی رو سے نہ ہر ایک جگہ انتقام پسندیدہ ہے اور نہ ہر جگہ عفو قابل تعریف ہے بلکہ محل شناسی کرنی چاہیے اور چاہیے کہ انتقام اور عفو موقع محل کے مطابق ہو۔

انجیل کہتی ہے کہ اپنے دشمنوں سے پیار کرو۔

قرآن کہتا ہے کہ نفسیاتی رنگ میں تیرا کوئی دشمن نہ ہو اور تیری ہمدردی ہر ایک کے لیے عام ہو۔ مگر جو تیرے خدا کا دشمن تیرے رسول کا دشمن اور کتاب اللہ کا دشمن ہو۔ وہی تیرا دشمن ہوگا سو تو ایسوں کو بھی دعوت اور دعا سے محروم نہ رکھ اور چاہیے کہ تو ان کے اعمال سے دشمنی رکھے نہ ان کی ذات سے اور کوشش کرے کہ وہ درست ہو جائیں اور اس بارے میں فرماتا ہے۔ اِنَّ اللّٰهَ یَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ وَاِیْتَآئِ ذِی الْقُرْبٰى یعنی خدا تم سے کیا چاہتا ہے بس یہی کہ تم تمام نوع انسان سے عدل کے ساتھ پیش آیا کرو پھر اس سے بڑھ کر یہ ہے۔ کہ ان سے بھی نیکی کرو۔ جنہوں نے تم سے کوئی نیکی نہیں کی۔ پھر اس سے بڑھ کر یہ ہے کہ تم مخلوق خدا سے ایسی ہمدردی کے ساتھ پیش آؤ کہ گویا تم ان کے حقیقی رشتے دار ہو۔ جیسا کہ مائیں اپنے بچوں سے پیش آتی ہیں کیونکہ احسان میں ایک خودنمائی کا مادہ بھی مخفی ہوتا ہے اور احسان کرنے والا کبھی اپنے احسان کو جتلا بھی دیتا ہے لیکن وہ جو ماں کی طرح طبعی جوش سے نیکی کرتا ہے وہ کبھی خودنمائی نہیں کرسکتا۔ پس آخری درجہ جو نیکیوں کا طبعی جوش ہے جو ماں کی طرح ہو اور یہ آیت نہ صرف مخلوق کے متعلق ہے بلکہ خدا کے متعلق بھی ہے خدا سے عدل یہ ہے کہ اس کی نعمتوں کو یاد کرکے اس کی فرمانبرداری کرنا اور خدا سے احسان یہ ہے کہ اس کی ذات پر ایسا یقین کرلینا کہ گویا اس کو دیکھ رہا ہے اور خدا سے ایتاء ذی القربیٰ یہ ہے کہ اس کی عبادت نہ تو بہشت کے طمع سے ہو اور نہ دوزخ کے خوف سے بلکہ اگر فرض کیا جائے کہ نہ بہشت ہے اور نہ دوزخ ہے تب بھی جوش محبت اور اطاعت میں فرق نہ آئے۔

انجیل کہتی ہے کہ جو لوگ تم پر لعنت کریں ان کے لیے برکت چاہو۔

قرآن کہتا ہے کہ تم خود کچھ بھی نہ کرو تم اپنے دل سے جو خدا کی تجلیات کا گھر ہے۔ فتویٰ پوچھو کہ ایسے شخص کے ساتھ کیا معاملہ چاہیے اگر پس خدا تمہارے دل میں ڈالے کہ یہ لعنت کرنے والا قابل رحم ہے اور آسمان میں اس پر لعنت نہیں تو تم بھی لعنت نہ کرو۔ خدا کے مخالف نہ ٹھہرو لیکن اگر تمہارا کانشس اس کو معذور نہیں ٹھہراتا اور تمہارے دل میں ڈالا گیا ہے کہ آسمان پر اس شخص پر لعنت ہے تو تم اس کے لیے برکت نہ چاہو۔ جیسا کہ شیطان کے لیے کسی نبی نے برکت نہیں چاہی اور کسی نبی نے اس کو لعنت سے آزاد نہیں کیا مگر کسی کی نسبت لعنت میں جلدی نہ کرو۔ کہ بہتیری بدظنیاں جھوٹیاں ہیں اور بہتیری لعنتیں اپنے ہی پر پڑتی ہیں۔ سنبھل کر قدم رکھو اور خوب پڑتال کرکے کوئی کام کرو اور خدا سے مدد مانگو کیونکہ تم اندھے ہو ایسا نہ ہو کہ عادل کو ظالم ٹھہراؤ اور صادق کو کاذب خیال کرو۔ اسی طرح تم اپنے خدا کو ناراض کردو اور تمہارے سب نیک اعمال حبط ہو جائیں۔

انجیل میں کہا گیا ہے کہ تم اپنے نیک کاموں کو لوگوں کے سامنے دکھانے کے لیے نہ کرو۔

قرآن کہتا ہے کہ تم ایسا مت کرو کہ اپنے سارے کام لوگوں سے چھپاؤ بلکہ تم حسب مصلحت بعض اپنے نیک اعمال پوشیدہ طور پر بجالاؤ جب کہ تم دیکھو کہ پوشیدہ کرنا تمہارے نفس کے لیے بہتر ہے اور بعض اعمال دکھلا کر بھی کرو جب کہ تم دیکھو کہ دکھلانے میں عام لوگوں کی بھلائی ہے تا تمہیں دو بدلے ملیں اور تا کمزور لوگ کہ جو ایک نیکی کے کام پر جرأت نہیں کرسکتا وہ بھی تمہاری پیروی اور دیکھا دیکھی سے اس نیک کام کو کر

لیں۔ غرض خدا نے جو اپنے کلام میں فرمایا ہے۔ سِرًّا وَّعَلَانِيَةً یعنی پوشیدہ بھی خیرات کرو اور دکھا کر بھی ان احکام کی حکمت اس نے خود فرما دی ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ نہ صرف قول سے لوگوں کو سمجھاؤ بلکہ فعل سے بھی تحریک کرو۔ کیونکہ ہر ایک جگہ قول اثر نہیں کرتا بلکہ اکثر جگہ نمونہ کا بہت اثر ہوتا ہے۔

انجیل میں ہے کہ جب تو دعا مانگے تو اپنی کوٹھری میں جا۔

قرآن سکھاتا ہے کہ اپنی دعا کو ہر ایک موقعہ پر پوشیدہ مت کرو۔ بلکہ تم لوگوں کے روبرو اور اپنے بھائیوں کے مجمعے کے ساتھ بھی کھلے طور پر دعا کیا کرو تا کہ اگر کوئی دعا منظور ہو تو اس مجمع کے لیے ایمان کی ترقی کا موجب ہو اور تا دوسرے لوگ بھی دعا میں رغبت کریں۔

انجیل میں ہے کہ تم اس طرح دعا کرو کہ اے ہمارے باپ کہ جو آسمان پر ہے تیرے نام کی تقدیس ہو، تیری بادشاہت اوے تیری مرضی جیسی آسمان پر ہے زمین پر آوے ہماری روزانہ روٹی آج ہمیں بخش اور جس طرح ہم اپنے قرض داروں کو بخشتے ہیں تو اپنے قرض کو ہمیں بخش دے اور ہمیں آزمائش میں نہ ڈال بلکہ برائی سے بچا کیونکہ بادشاہت اور قدرت اور جلال ہمیشہ تیرے ہی ہیں۔

قرآن کہتا ہے کہ یہ نہیں کہ زمین تقدیس سے خالی ہے بلکہ زمین پر بھی خدا کی تقدیس ہو رہی ہے نہ صرف آسمان پر جیسا کہ وہ فرماتا ہے وَاِنْ مِّنْ شَیْءٍ اِلَّا یُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ (ہر چیز اس کی حمد کے ساتھ تسبیح کرتی ہے) یُسَبِّحُ لِلّٰهِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ یعنی ذرہ ذرہ زمین کا اور آسمان کا خدا کی تحمید و تقدیس کر رہا ہے اور جو کچھ ان میں ہے وہ تحمید اور تقدیس میں مشغول ہیں اور بہت راست باز اس کے ذکر میں مشغول ہیں اور جو شخص دل اور زبان کے ساتھ اس کے ذکر میں مشغول نہیں اور خدا کے آگے فروتنی نہیں کرتا اس سے طرح طرح کی شکنجوں اور عذابوں سے قضا و قدر الٰہی فروتنی کرا رہی ہے اور جو کچھ فرشتوں کے بارے میں خدا کی کتاب میں لکھا ہے کہ وہ نہایت درجہ اطاعت کر رہے ہیں۔ یہی تعریف زمین کے پات پات اور ذرہ ذرہ کی نسبت قرآن شریف میں موجود ہے کہ ہر ایک چیز اس کی اطاعت کر رہی ہے۔ ایک پتہ بھی بجز اس کے امر کے گر نہیں سکتا اور بجز اس کے حکم کے نہ کوئی دوا شفا دے سکتی ہے اور نہ کوئی غذا موافق ہو سکتی ہے اور ہر ایک چیز نہایت درجہ کی تذلل اور عبودیت سے خدا کے آستانہ پر گری ہوئی ہے اور اس کی فرمانبرداری میں مستغرق ہے پہاڑوں اور زمین کا ذرہ ذرہ اور دریاؤں اور سمندروں کا قطرہ قطرہ اور درختوں اور بوٹیوں کا پات پات اور ہر ایک جز ان کا اور انسان اور حیوانات کے کل ذرات خدا کو پہچانتے ہیں اور اس کی اطاعت کرتے ہیں اور اس کی تحمید اور تقدیس میں مشغول ہیں اسی واسطے اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے۔ یُسَبِّحُ لِلّٰهِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِی الْاَرْضِ یعنی جسے آسمان پر ہر ایک چیز خدا کی تسبیح و تقدیس کر رہی ہے ویسے ہی زمین پر بھی ہر ایک چیز اس کی تسبیح و تقدیس کرتی ہے کیا زمین پر خدا کی تحمید و تقدیس نہیں ہوتی ایسا کلمہ ایک کامل عارف کے منہ سے نہیں نکل سکتا بلکہ زمین کی چیزوں میں سے کوئی چیز تو شریعت کے احکام کی اطاعت کر رہی ہے اور کوئی چیز قضا و قدر کے احکام کے تابع ہے اور کوئی دونوں کی اطاعت میں کمربستہ ہے کیا بادل کیا ہوا کیا آگ کیا زمین سب خدا کی اطاعت اور تقدیس میں محو ہیں اگر کوئی انسان انہی شریعت کے احکام کا سرکش ہے تو الٰہی قضا و قدر کے حکم کے تابع ہے ان دونوں حکومتوں سے باہر کوئی نہیں۔ کسی نہ کسی آسمانی حکومت کا جوا ہر ایک کی گردن پر ہے۔ مگر انجیل کہتی ہے کہ زمین خدا کی تقدیس سے خالی ہے اس کا سبب اس انجیل کی دعا کے اگلے فقرہ میں بطور اشارہ بیان کیا گیا ہے اور وہ یہ کہ ابھی اس میں خدا کی بادشاہت نہیں آئی۔ اس لیے حکومت نہ ہونے کی وجہ سے نہ کسی اور وجہ سے خدا کی مرضی ایسے طور سے زمین پر نافذ نہیں ہو سکی۔ جیسا کہ آسمان پر نافذ ہے مگر قرآن کی تعلیم سراسر اس کے خلاف ہے۔ قرآن مجید کہتا ہے جیسا کہ خدا کی تقدیس و تحمید آسمان پر ہے ویسے ہی تحمید و تقدیس زمین پر ہے جیسا کہ خدا کی حکومت آسمان پر ہے ویسے ہی حکومت زمین پر ہے قرآن مجید میں آتا ہے۔ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ یعنی زمین پر بھی خدا کی بادشاہت ہے اور آسمان پر بھی دوسری جگہ آتا ہے اِنَّمَاۤ اَمْرُهٗۤ اِذَاۤ اَرَادَ شَیْـًٔا اَنْ یَّقُوْلَ لَهٗ كُنْ فَیَكُوْنُ یعنی تمام زمین و آسمان اس کی اطاعت کر رہی ہے جب ایک

کام کو چاہتا ہے تو کہتا ہے کہ ہو جا تو فی الفور وہ کام ہو جاتا ہے پھر فرمایا ہے وَاللّٰهُ غَالِبٌ عَلٰٓی اَمْرِهٖ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ یعنی خدا اپنے ارادہ پر غالب ہے مگر اکثر لوگ خدا کے قہر اور جبروت سے بے خبر ہیں۔

انجیل کی دعا میں تو ہر روز روٹی مانگی جاتی ہے جیسا کہ کہا ہے کہ "ہماری روزانہ روٹی آج ہمیں بخش" مگر تعجب کہ جس کی ابھی تک زمین پر بادشاہت نہیں آئی وہ کیونکر روٹی دے سکتا ہے ابھی تک تو تمام کھیت اور تمام پھل نہ اس کے حکم سے بلکہ خود بخود پکتے ہیں اور خود بخود بارشیں ہوتی ہیں۔ اس کا کیا اختیار ہے کہ کسی کو روٹی دے۔ جب بادشاہت زمین پر آ جائے گی تب اس سے روٹی مانگنی چاہیے، ابھی تک وہ ہر ایک زمینی چیز سے بے دخل ہے جب اس جائیداد پر قبضہ پالے گا تب کسی کو روٹی دے سکتا ہے اس وقت تو اس سے مانگنا بھی نازیبا ہے۔

پھر اس کے بعد یہ قول کہ جس طرح ہم اپنے قرض داروں کو بخشتے ہیں تو اپنے قرض کو ہمیں بخش دے اس صورت میں یہ بھی صحیح نہیں ہے کیونکہ زمین کی بادشاہت ابھی اس کو حاصل نہیں اور ابھی عیسائیوں نے کچھ اس کے ہاتھ سے لے کر کھایا نہیں پھر قرضہ کون سا ہوا۔ پس ایسے ہی دست خدا سے قرضہ بخشوانے کی کیا ضرورت ہے نہ اس سے خوف ہے کیونکہ زمین پر ابھی اس کی بادشاہت نہیں۔

اس کے برعکس قرآن مجید ہمیں سکھاتا کہ زمین پر ہر وقت اللہ کا اقتدار ہے اس کے اقتدار سے کوئی باہر نہیں نکل سکتا۔

اب اس تمام تحقیقات سے انجیل کی دعا اور قرآن مجید کی دعا میں فرق ظاہر ہو گیا کہ انجیل تو خدا کی بادشاہت آنے کا وعدہ کرتی ہے مگر قرآن بتاتا ہے کہ خدا کی بادشاہت اس زمین پر موجود ہے بلکہ عملی طور پر تم پر اس کا فیض جاری ہے غرض انجیل میں تو صرف ایک وعدہ ہی ہے مگر قرآن نہ محض وعدہ بلکہ قائم شدہ بادشاہت اور اس کے فیوض دکھارہا ہے قرآن مجید کی فضیلت اس سے ظاہر ہے کہ وہ اس خدا کو پیش کرتا ہے جو اس زندگی میں کل راست بازوں کا منجی اور آرام دہ ہے اور کوئی نفس اس کے فیض سے خالی نہیں بلکہ ہر ایک نفس پر اس کی ربوبیت رحمانیت اور رحیمیت کا فیض جاری ہے مگر انجیل اس خدا کو پیش کرتی ہے جس کی ابھی بادشاہت اس دنیا میں نہیں آئی۔ صرف وعدہ ہے اب عیسائی معترض سوچ لے کہ عقل سلیم کس تعلیم کا ساتھ دیتی ہے انجیل میں حلیموں، غریبوں اور مسکینوں کی تعریف کی گئی ہے یہ تعریف اس لیے ہے کہ وہ مقابلہ نہیں کرتے۔

مگر قرآن صرف یہی نہیں کہتا کہ تم ہر وقت مسکین بنے رہو اور شر کا مقابلہ نہ کرو بلکہ کہتا ہے حلم، مسکینی اور غربت اور ترک مقابلہ اچھا ہے مگر اگر بے محل استعمال کیا جائے تو برا ہے پس تم محل اور موقعہ کو دیکھ کر ہر ایک نیکی کرو۔ کیونکہ وہ نیکی بدی ہے جو محل اور موقعہ کے برخلاف ہے ہمارا مشاہدہ ہے ایک ہی سرد غذا یا گرم غذا کی مداومت سے صحت قائم نہیں رہتی بلکہ صحت بھی قائم رہے گی جب موقعہ اور محل کے موافق کھائی جائے۔ پس اسلام ہر نیکی کو موقعہ اور محل پر کرنے کی تعلیم دیتا ہے اسلام اعلیٰ درجہ کا حلیم اور خلیق بننے کی تعلیم دیتا ہے لیکن موقعہ اور محل پر۔ شر کا مقابلہ ترک کرنے کی تعلیم دیتا ہے مگر موقعہ اور محل پر۔ شر کا مقابلہ کرنے کی تعلیم دیتا ہے مگر موقعہ اور محل پر۔

اسلام ایک اور معرفت کا نکتہ بیان کرتا ہے۔ جس سے انجیل یکسر خالی ہے وہ یہ ہے کہ حقیقی اخلاق فاضلہ جن کے ساتھ نفسانی اغراض کی کوئی زہریلی آمیزش نہیں وہ خدا کی طرف سے بذریعہ روح القدس آتے ہیں سو تم ان اخلاق فاضلہ کو محض اپنی کوششوں سے حاصل نہیں کر سکتے جب تک وہ خدا کے فضل سے حاصل نہ ہوں۔ بعض اوقات اخلاق فاصلہ کی تہ کے نیچے نفسانی خواہشات کا گند چھپا ہوتا ہے ذرا سے ہوا کے جھونکے سے گند تہہ سے اوپر آ جاتا ہے ذرا سے حالات تبدیل ہونے سے نفسانی خواہشات کا گند ظاہر ہو جاتا ہے۔ تو اخلاق فاضلہ کی حقیقت ظاہر ہو جاتی ہے لیکن جو اخلاق فاضلہ روح القدس کی تائید سے حاصل ہوتے ہیں وہی نفسانی خواہشات کی مسموم ملونی سے پاک ہوتے ہیں۔ الغرض سچے اور پاک اخلاق راست بازوں کا معجزہ ہیں جن میں کوئی غیر شریک نہیں۔ یہ پاک اخلاق اللہ تعالیٰ سے ربط قائم کرنے سے حاصل ہوتے ہیں۔ پس اسلام کا بیان کیا ہوا ضابطہ اخلاق ہی بہتر ہے۔ اس کے مقابل پر کسی دوسرے مذہب کا کوئی ضابطہ اخلاق مکمل نہیں۔

تثلیث:

عیسائی مذہب تثلیث (تین اقانیم Persons) کا قائل ہے باپ بیٹا اور روح القدس)۔یعنی باپ بیٹا اور روح القدس مل کر ایک خدائی وحدت تیار کرتے ہیں جو اپنی ماہیت اور حقیقت کے اعتبار سے ایک نا قابل تقسیم ہے۔اس وجہ سے عیسائی کہتے ہیں۔ یہ تین خدا نہیں بلکہ ایک خدا ہے۔ بہر حال تین کو ایک اور ایک کو تین کہنا عیسائی ہی اس فلسفہ کو سمجھ سکتے ہیں۔ یہ فلسفہ غیر عیسائی کی سمجھ سے بالا ہے۔ کہ تین ایک کیسے ہو سکتے ہیں اور ایک تین کیسے ہوسکتا ہے تثلیث کو جس رنگ میں چاہیں بیان کریں یہ واضح شرک فی الذات ہے۔

قرآن مجید ایک خدا کی تعلیم دیتا ہے۔قرآن مجید میں ایک مکمل سورت توحید باری تعالیٰ پر ہے جس میں توحید کے تمام پہلوؤں کو اجاگر کیا ہے۔

ارشاد الٰہی ہے۔ قُلْ هُوَاللّٰهُ اَحَدٌ اَللّٰهُ الصَّمَدُ لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُوْلَدْ وَ لَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ (الاخلاص) کہہ اللہ ایک ہے سب اسی کے محتاج ہیں نہ اس کا لڑکا ہے اور نہ باپ اور نہ اس کا کوئی ہمسر ہے۔

قرآن مجید نے توحید باری تعالیٰ کے ساتھ ساتھ ہر قسم کے شرک کی تردید بیان کی ہے کیونکہ شرک اللہ تعالیٰ کو نہایت ہی ناپسندیدہ ہے۔ قرآن مجید میں آتا ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَ يَغْفِرُ مَادُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ (النساء4:48) اللہ تعالیٰ اس کو نہیں بخشے گا۔ جو اس کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہراتا ہے جو اس کے علاوہ ہے وہ جسے چاہتا بخش دیتا ہے۔

دوسری جگہ آتا ہے۔ اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيْمٌ (لقمان 13:31) شرک یقیناً بڑا بھاری ظلم ہے۔

سورہ مریم میں جہاں اللہ تعالیٰ عیسائیوں کے عقیدہ ابنیت کی تردید کرتا ہے وہاں اس مشرکانہ عقیدہ کی سنگینی ان الفاظ میں بیان کرتا ہے۔

تَكَادُ السَّمٰوٰتُ يَتَفَطَّرْنَ مِنْهُ وَتَنْشَقُّ الْاَرْضُ وَ تَخِرُّ الْجِبَالُ هَدًّا اَنْ دَعَوْا لِلرَّحْمٰنِ وَلَدًا۔ یعنی قریب ہے کہ آسمان اس سے پھٹ جائے اور زمین شق ہوجائے اور پہاڑ ریزہ ریزہ ہوجائیں کہ وہ رحمان کے لیے بیٹا ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں۔

عناصر قدرت کی پرستش کی ممانعت میں آتا ہے۔ لَا تَسْجُدُوْا لِلشَّمْسِ وَلَا لِلْقَمَرِ وَاسْجُدُوْا لِلّٰهِ الَّذِيْ خَلَقَهُنَّ (حم السجدہ 41:37) یعنی نہ سورج کو سجدہ کرو اور نہ چاند کو اور اللہ کو ہی سجدہ کرو جس نے انہیں پیدا کیا۔

سورہ ال عمران میں آتا ہے۔ اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهٖ شَيْئًا وَّلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ (ال عمران 3:63) کہ ہم اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کریں اور نہ اس کے ساتھ کسی کو شریک بنائیں اور نہ ہم میں سے کوئی کسی کو اللہ کے سوا رب بنائے۔

اس آیت میں تین قسم کے شرک کی نفی کی گئی ہے اول خدا کے سوا کسی کی عبادت نہ کریں دوم اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرائیں سوم کسی دوسرے آدمی کو رب تسلیم نہ کریں۔

شرک کی چوتھی قسم سورۃ فرقان میں بیان ہوئی ہے۔ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰهُ (الفرقان 25:43) یعنی تو نے اسے دیکھا جو اپنی خواہش کو اپنا معبود بناتا ہے۔

الغرض قرآن مجید میں جہاں توحید باری تعالیٰ کو مختلف انداز اور پیرائے میں بیان کیا گیا ہے اور اس کی برکات سے اطلاع دی ہے وہاں شرک کی ہر قسم کا رد کیا ہے اور شرک کے بداثرات اور نتائج سے آگاہ کیا ہے۔

جب کہ عیسائیت صرف حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو خدا کا بیٹا . نتے بلکہ تثلیث (تین خدا) کے قائل ہیں اور تثلیث عیسائی مذہب کا بنیادی پتھر ہے جبکہ اسلام کی تعلیم کا محور صرف توحید باری تعالیٰ ہے۔ یہ نظریہ تمام انبیاء کا مشترکہ ہے اور انبیاء کی بعثت کی غرض ہی توحید کو قائم کرنا ہے لہٰذا توحید کا مذہب تثلیث کے مذہب کی بگڑی ہوئی شکل نہیں ہوسکتا۔

کفارہ:

عیسائیوں کا یہ عقیدہ ہے کہ ہر انسان پیدائشی گناہ گار ہے آدم اور حوا نے جو گناہ کیا وہ وراثتاً ہر شخص کی فطرت میں چلا آ رہا ہے جس کی وجہ سے ہر شخص گناہ گار ہے عیسائیوں کے نزدیک نیک اعمال نجات کا موجب نہیں ہو سکتے اگر اللہ تعالیٰ بندے کے گناہ توبہ اور استغفار سے معاف کر دے تو اس کا یہ رحم اس کے عدل کے خلاف ہے خدا رحیم ہے اس کا رحم چاہتا ہے کہ انسان سزا سے بچ جائے پھر وہ عادل بھی ہے۔ عدل کا یہ تقاضا ہے کہ ضرور سزا دی جائے رب کا رحم اور عدل ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتے بندے کی نجات کا ہونا ضروری ہے بندوں کی نجات دلانے کے لیے ایک صورت یہ نکالی کہ خدا کا بیٹا یسوع مسیح کو جو تمام گناہوں سے پاک اور معصوم ہے لوگوں کے تمام گناہوں کو اپنے اوپر لے کر جان کی قربانی دے اور سارے لوگوں کے لیے نجات کا ذریعہ بنے۔

انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا میں عقیدہ کفارہ کی تشریح ان الفاظ کے ساتھ کی گئی ہے۔

''عیسائی علم عقائد میں کفارہ سے مراد یسوع کی وہ قربانی ہے جس کے ذریعے ایک گناہ گار انسان یک لخت خدا کی رحمت کے قریب ہو جاتا ہے اس عقیدہ کی پشت پر دو مفروضے کارفرما ہیں ایک تو یہ کہ آدم کے گناہ کی وجہ سے انسان خدا کی رحمت سے دور ہو گیا تھا دوسرے یہ کہ خدا کی صفت کلام بیٹا (یسوع مسیح) اس لیے انسانی وجود میں آئی تھی کہ وہ انسان کو دوبارہ خدا کی رحمت سے قریب کر دے۔ (انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا ص 651۔ مقالہ کفارہ Atonement)

اسلام:

عیسائیت کا عقیدہ ہے کہ انسان پیدائشی اور فطرتاً گناہ گار ہے یہ عقیدہ اسلام کی تعلیم کے خلاف ہے۔ اسلام انسان کو خدا کا خلیفہ قرار دیتا ہے ارشاد الٰہی ہے۔ اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً (بقرہ 30:2) میں زمین میں خلیفہ بنانے والا ہوں پھر بیان کیا لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْ اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ (التین 4:95) ہم نے انسان کو تقویم احسن میں پیدا کیا ہے۔ پھر فرمایا: وَلَقَدْ کَرَّمْنَا بَنِیْ اٰدَمَ (بنی اسرائیل 70:17) اور ہم نے نوع انسان کو قابل تکریم بنایا ہے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں۔ کُلُّ مَوْلُوْدٍ یُوْلَدُ عَلَی الْفِطْرَةِ فَاَبَوَاہُ یُھَوِّدَانِہٖ اَوْ یُنَصِّرَانِہٖ اَوْ یُمَجِّسَانِہٖ (حدیث) یعنی ہر بچہ فطرت صحیحہ پر پیدا ہوتا ہے اس کے والدین اس کو یہود یا عیسائی یا مجوسی بنا دیتے ہیں۔

گویا اسلام کے نزدیک انسان فطرت صحیحہ پر پیدا ہوتا ہے اور قرآن مجید کے نزدیک انسان خدا کا خلیفہ ہے۔ خدا کا خلیفہ (جانشین) پیدائشی طور پر گناہ گار نہیں ہو سکتا۔ جب وہ اس دنیا میں آتا ہے وہ معصوم فطرت لے کر پیدا ہوتا ہے۔

عقیدہ کفارہ کی رو سے اللہ تعالیٰ نے اپنے معصوم بیٹے (یسوع مسیح) کو انسانوں کے گناہ بخشنے کے لیے صلیب پر مارا۔ اسلام کہتا ہے۔

وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰی (الانعام 164:6) اور کوئی بوجھ اٹھانے والا دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھاتا۔

یہ عقیدہ عقل کے خلاف ہے کہ کوئی دوسرا کسی کے گناہوں کا بوجھ اٹھائے۔ اسلام کی رو سے ہر شخص اپنے گناہوں کا بوجھ خود ہی اٹھائے گا اور اپنے کردہ گناہوں کا جواب خود ہی دے گا اگر کوئی شخص کسی دوسرے کی تقلید میں کوئی گناہ کرتا ہے تو مقلد کو ہی پوچھا جائے گا اور مقلد ہی اپنے عمل کا جواب دہ ہوگا۔ بہر حال یہ عقیدہ نہ صرف عقل کے خلاف ہے بلکہ اللہ تعالیٰ کے ابدی قانون کے ہی خلاف ہے اللہ تعالیٰ کا ابدی قانون یہ ہے۔ عامل ہی اپنے عمل کا جواب دہ ہے اسلام کا خدا ایک زندہ خدا ہے وہ غفور و رحیم ہے وہ انسانوں کے گناہ توبہ اور استغفار کرنے سے بخش دیتا ہے۔ شرک کے علاوہ ہر گناہ بخش دیتا ہے۔ ارشاد الٰہی ہے۔ اِنَّ اللّٰہَ لَا یَغْفِرُ اَنْ یُّشْرَکَ بِہٖ وَ یَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِکَ لِمَنْ یَّشَآءُ (116:4) یعنی اللہ تعالیٰ اس شخص کو نہیں بخشتا جو اس کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہراتا ہے جو اس کے علاوہ ہے وہ جسے چاہتا ہے بخش دیتا ہے۔

اسلام کا خدا بہت وسیع رحمت والا ہے اس کی چادر کی رحمت ہر چیز کو ڈھانپے ہوئے ہے ارشاد الٰہی ہے۔ کَتَبَ عَلٰی نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ (الانعام 12:6) یعنی اس نے اپنے اوپر رحم کو مقدم کر لیا ہے پھر فرمایا: رَبُّكُمْ ذُوْ رَحْمَةٍ وَّاسِعَةٍ (الانعام 14:6) تمہارا رب وسیع رحمت والا ہے۔

پھر فرمایا: وَ رَحْمَتِيْ وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ (لاعراف 156:7) میری رحمت سب چیزوں پر حاوی ہے

سب سے بڑھ کر عقیدہ کفارہ (دوسرے گناہ گاروں کے گناہوں کی بخشش کے لیے یسوع مسیح اور صلیب پر چڑھنا) عدل کے ہی خلاف ہے۔ صفت عدل صرف یہ تقاضا کرتی ہے کہ قیامت کے دن کسی شخص سے بے انصافی نہیں ہوگی ہر شخص کے گناہوں کا موازنہ بالکل صحیح ترازو سے کیا جائے گا اگر کوئی دوسرا شخص کسی کے گناہ کے عوض پکڑا جائے تو یہ بالکل عدل کے خلاف ہے۔

پس کفارہ ذریعہ نجات نہیں ہے صرف اللہ کا فضل انسان کی نجات کا ذریعہ ہے۔ اللہ تعالیٰ کے فضل کا سبب ایمان باللہ اور اعمال صالحہ ہیں۔ جب ایک انسان اللہ تعالیٰ پر ایمان لاتا ہے اور اس کے ساتھ اعمال صالحہ بجالاتا ہے تو وہ خدا کے فضل کا وارث بن جاتا ہے۔ ارشاد الٰہی ہے۔ وَبَشِّرِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اَنَّ لَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ (البقرہ 25:2) یعنی خوشخبری دے ان لوگوں کو جو ایمان لائے اور اچھے عمل کیے ان کے لیے باغات ہیں جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں ایک اور جگہ آتا ہے۔ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ (البقرہ 62:2) یعنی جو اللہ پر اور آخری دن پر ایمان لایا اور نیک عمل کیے پس ان کے لیے ان کا اجر ان کے رب کے پاس ہے۔

انجیل: شریعت لعنت ہے اللہ تعالیٰ نے متعدد شرائع نازل کیں تجربہ سے یہ ثابت ہوا کہ انسان شریعت پر عمل نہیں کر سکتا اس لیے شریعت لعنت ثابت ہوئی کیونکہ آدم کے ارتکاب گناہ کی وجہ سے انبیاء علیہم السلام بھی بے گناہ نہ نکلے۔

اسلام: اسلام شریعت کو هُدًى لِلنَّاس کہتا ہے اللہ تعالیٰ نے شریعت بنی نوع انسان کے لیے ہدایت اور رحمت کے طور پر نازل فرمائی۔ اللہ تعالیٰ کا کوئی حکم حکمت کے خلاف نہیں ہو سکتا اس نے کوئی ایسا حکم نازل نہیں کیا جس پر انسان عمل نہ کر سکتا ہو ارشاد الٰہی ہے۔ لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا (البقرہ 282:2) یعنی اللہ تعالیٰ کسی نفس کو اس کی طاقت سے زیادہ تکلیف نہیں دیتا۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے شریعت میں کوئی ایسا حکم نازل نہیں کیا جس پر وہ عمل نہ کر سکتا ہو اسلام کے نزدیک شریعت عین فطرت انسانی کے مطابق ہے قرآن مجید میں ہے۔ فَاَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّيْنِ حَنِيْفًا فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِيْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا لَا تَبْدِيْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ وَ لٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ (روم 30:30) پس اپنا منہ دین حنیف کی طرف کر۔ یہ وہ خدا کی فطرت ہے جس پر اللہ نے انسانوں کو پیدا کیا اللہ کی پیدا کی ہوئی حالت کوئی تبدیل نہیں کر سکتا پس قائم رہنے والا یا رہنے والا دین ہے لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔

اس آیت میں دین حنیف کو اللہ کی فطرت قرار دیا ہے اسی پر انسان کو پیدا کیا ہے۔ گویا شریعت عین فطرت انسانی کے مطابق ہے۔

دوم: عیسائیوں کا یہ عقیدہ اس وجہ سے بھی عبث ہے۔ شریعت کا بھیجنا اللہ تعالیٰ کا کام ہے اور اللہ کا کوئی کام عبث نہیں ہو سکتا۔ اللہ تعالیٰ نے ہر زمانہ، ہر ملک اور ہر قوم میں نبی بھیجے۔ بعض ایسی بھی قومیں ہیں جن میں پے در پے نبی بھیجے جیسا کہ بنی اسرائیل ہے۔ ان پر لوگوں کی ہدایت کے لیے شریعت نازل کی اگر عیسائیوں کے عقیدے کے مطابق یہ لغو کام تھا۔ تو پھر خدا کو چند نبی بھیج کر یہ پتہ نہ لگ گیا کہ بندوں کے لیے شریعت بھیجنا لغو امر ہے وہ تو اس پر چل نہیں سکتے جب انسان اللہ کی شریعت پر عمل ہی نہیں کر سکتے۔ تو بلا وجہ انسانوں کو اس قدر مصیبت میں ڈال دیا اور ان پر تکلیف مالا یطاق ڈالی۔ اس عقیدہ کی رو سے سارا الزام ہی اللہ تعالیٰ پر آتا ہے پہلے اللہ تعالیٰ نے انسان کو اتنا کمزور ضعیف پیدا کیا کہ وہ اس کی نازل کردہ شریعت پر عمل ہی نہیں کر سکتا۔ دوم پھر انسان کے لیے شریعت نازل کرتا جاتا ہے۔

پس عیسائیوں کا یہ عقیدہ سراسر باطل اور عقل کے خلاف ہے۔

انجیل سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ حضرت یسوع مسیح نے اپنی ماں سے کوئی ایسا اچھا سلوک نہیں کیا۔ بلکہ ان کے الفاظ سے ذلت اور ہتک محسوس ہوتی ہے۔ ایک شادی کے موقعہ پر اپنی والدہ ماجدہ کو مخاطب کر کے کہا تھا ''اے عورت! مجھے تجھ سے کیا کام ہے۔'' (یوحنا باب 2 آیت 4) ظاہر ہے اس کلام میں عزت وتکریم کا فقدان ہے اس سے بڑھ کر تکلیف دہ اور دل آزار وہ الزام ہے جو حضرت عیسیٰ نے اپنی والدہ اور اپنے دوسرے رشتے داروں پر لگایا اور کہا تھا کہ چونکہ تم لوگ خدا کی مرضی پر نہیں چلتے اس لیے میرا اور تمہارا رشتہ منقطع ہے میرے رشتہ دار وہ ہیں جو میرے پیروکار ہیں۔ انہوں نے فرمایا: ''کون ہے میری ماں اور میرے بھائی اور اپنے شاگردوں پر نگاہ ڈال کر کہا یہ ہیں میرے بھائی اور میری بہنیں اور میری ماں۔'' (متی باب 12 آیت 48 ومرقس باب 3 آیت 35، لوقا باب 8 آیت 21)

حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اپنے الفاظ میں واضح کر دیا کہ ''میری ماں اور میرے رشتہ دار میری تعلیمات کو رد کرتے ہیں اس لیے میرا ان سے کوئی قلبی تعلق نہیں۔''

اسلام: قرآن مجید اپنے والدین کے ساتھ ہر حالات میں نرمی اور محبت سے پیش آنے کی تعلیم دیتا ہے۔

وَقَضٰی رَبُّكَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ وَبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا اِمَّا يَبْلُغَنَّ عِنْدَكَ الْكِبَرَ اَحَدُهُمَآ اَوْ كِلٰهُمَا فَلَا تَقُلْ لَّهُمَآ اُفٍّ وَّلَا تَنْهَرْهُمَا وَقُلْ لَّهُمَا قَوْلًا كَرِيْمًا وَاخْفِضْ لَهُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ مِنَ الرَّحْمَةِ وَقُلْ رَّبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيٰنِيْ صَغِيْرًا (بنی اسرائیل 24,23:17)

تیرے رب نے فیصلہ کر دیا ہے کہ اس کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو اور ماں باپ سے نیکی کرو اگر تیرے سامنے دونوں میں سے ایک یا دونوں ہی بڑھاپے میں پہنچ جائیں تو ان کو اف تک نہ کہہ نہ ان کو ڈانٹ اور ان دونوں سے ادب سے بات کر اور ان دونوں کے آگے رحم کے ساتھ عاجزی کا بازو جھکا دو اور کہہ دے اے میرے رب تو ان پر رحم کر جس طرح انہوں نے مجھے چھوٹے ہوتے پالا۔

عیسائیت میں عورت کی حیثیت:

مرد عورت کے لیے نہیں بلکہ عورت مرد کے لیے پیدا ہوئی۔ (1- کرنتھیوں 19/11)

عورت معلمہ نہ بنے۔ (1- تمیتھیس 2:11-13)

مرد کے لیے اچھا ہے کہ وہ عورت کو نہ چھوئے۔ (1- کرنتھیوں 8:7,1:7)

شادی کرنے سے شادی نہ کرنا بہتر ہے۔ (1- کرنتھیوں 29,28,8:7)

عورتیں کلیسا میں نہ بولیں۔ (1- کرنتھیوں 34:14)

عورتیں سر نہ گوندھیں۔ سنگار نہ کریں۔ اچھے اور قیمتی کپڑے نہ پہنیں۔ (1- پطرس 3/3 و 1- تمیتھیس 2:8-10)

اسلام: اسلام نے عورت کو ایک بلند مقام دیا ہے ارشاد الٰہی ہے۔ عَاشِرُوْهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ۔ (النساء 20:4) ان (عورتوں) سے اچھا سلوک کرو۔

هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ وَاَنْتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ۔ (البقرہ 188:2) وہ (عورتیں) تمہارے لیے لباس ہیں اور تم ان کے لیے لباس ہو۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں۔ اَلْجَنَّةُ تَحْتَ اَقْدَامِ اُمَّهَاتِكُمْ (حدیث) جنت تمہاری ماؤں کے قدموں کے نیچے ہے

اسلام نے عورت کو ہر لحاظ سے ایک بلند مقام دیا ہے اور معاشرہ کا ایک بہتر فرد قرار دیا ہے۔

مادی لحاظ سے عورت کے حقوق مرد کے برابر قرار دیئے ہیں وہ بھی مردوں کی طرح کما سکتی ہے اور جائیداد کی ملک مالکہ بن سکتی ہے ارشاد الٰہی ہے۔

لِلرِّجَالِ نَصِيْبٌ مِّمَّا اكْتَسَبُوْا وَلِلنِّسَآءِ نَصِيْبٌ مِّمَّا اكْتَسَبْنَ (النساء 32:4) مردوں کا حصہ ہے جو وہ کمائیں اور عورتوں کا حصہ ہے جو وہ کمائیں۔

عورتوں کو مردوں کی طرح ورثہ کا حق دار ٹھہرایا ہے۔ قرآن مجید میں آتا ہے۔ لِلرِّجَالِ نَصِيْبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدٰنِ وَالْاَقْرَبُوْنَ وَ لِلنِّسَآءِ نَصِيْبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدٰنِ وَالْاَقْرَبُوْنَ (النساء 7:4)

مردوں کے لیے اس سے ایک حصہ ہے جو ان کے والدین اور قریبی رشتے داروں نے چھوڑا اور عورتوں کے لیے اس سے ایک حصہ ہے جو اس کے ماں باپ اور قریبی رشتے دار چھوڑیں۔

ایک مستشرق اسلام میں عورت کے رتبہ کے بارہ میں لکھتا ہے آپ ﷺ نے عورت کو مملوکیت کے درجہ سے نکال کر مالکیت کا درجہ بخشا اور اس کو پہلا شرعی وارث قرار دیا جس کے اغراض کی حفاظت قانون اسلام پر واجب ہے۔

جہاں اسلام نے مادی لحاظ سے عورت کو مرد کے برابر قرار دیا وہاں روحانی حیثیت سے بھی برابر قرار دیا ہے۔ ارشاد الٰہی ہے۔ وَمَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَاُولٰٓئِكَ يَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ (المومن 40:40) جو نیک عمل کرتا ہے مرد ہو یا عورت اور وہ مومن ہو وہ جنت میں داخل ہوں گے۔

دوسری جگہ آتا ہے۔ اَنِّیْ لَآ اُضِيْعُ عَمَلَ عَامِلٍ مِّنْكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى بَعْضُكُمْ مِّنْ بَعْضٍ (آل عمران 195:3) میں تم میں سے کسی عمل والے کا عمل ضائع نہیں کرتا مرد ہو یا عورت تم سب ایک دوسرے سے ہو۔

انجیل میں خلاف عقل مشاہدہ ہے۔ خرگوش جگالی کرتا ہے (احبار 6:11)

یہ خلاف مشاہدہ ہے کہ خرگوش جگالی نہیں کرتا۔

یربوع جنگلی چوہا جگالی کرتا ہے۔ (خلاف مشاہدہ)

باپ سے بیٹا دو سال بڑا: یہورام بادشاہ کا باپ چالیس سال کی عمر میں مرا (2 تواریخ 5:21) تو اس کا بیٹا 41 سال کی عمر میں تخت پر بیٹھا۔ (2 تواریخ 2,1:22)

انجیل کا یسوع مسیح:

یہ جزو صرف سلمان رشدی، ابن وراق، ہربرٹ سپنسر جیسے مستشرقین کے لیے صرف الزامی جواب کے طور پر لکھ رہا ہوں کہ انجیل نے یسوع مسیح کی تصویر کس رنگ میں پیش کی ہے۔ مسلمان تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو ایک سچا معصوم اور برگزیدہ نبی مانتے ہیں اور ان پر ایمان لاتے ہیں۔ ان پر ایمان نہ لانے سے دائرہ اسلام سے خارج سمجھا جاتا ہے۔

جب یسوع مسیح کا یہود نے صلیب دینے کے لئے گھیرا تنگ کر لیا۔ تو یسوع مسیح اپنے حواریوں کے ساتھ ویرانوں میں جاتے اور اللہ سے صلیب کا پیالہ ٹالنے کے لیے دعائیں کرتے تو ان دعاؤں اور التجاؤں سے حضرت یسوع مسیح کی اندرونی کیفیت ظاہر ہو جاتی ہے جبکہ ایک نبی اس قسم کی آزمائشوں کی پروا نہیں کرتے۔ اس قسم کی جو آزمائش بھی آئے وہ خدا کی طرف سے سمجھ کر بطیب خاطر قبول کرتے ہیں۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی مثال ہمارے سامنے ہے کہ جب ایران کے بادشاہ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو گرفتار کرنے کے لیے سپاہی بھیجے تو کس

اطمینان سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تمہارے بادشاہ کو میرے خدا نے قتل کرا دیا ہے چنانچہ وہ بادشاہ اپنے ہی بیٹے کے ہاتھ سے قتل ہو گیا اور اس کے لڑکے نے اپنے باپ کو قتل کر کے اپنے باپ کا حکم واپس لے لیا۔ جنگ حنین میں جب اسلامی لشکر کفار کی تیراندازی کی وجہ سے بھاگ کھڑا ہوا تو دشمن کے تیر بارش کی طرح برس رہے تھے آپ صلی اللہ علیہ وسلم تن تنہا یہ کہتے ہوئے دشمن کی طرف بڑھتے چلے جاتے تھے انا النبی لا کذب انا ابن المطلب یعنی میں جھوٹا نبی نہیں ہوں میں عبدالمطلب کا بیٹا ہوں۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو یقین کامل تھا کہ اللہ تعالیٰ اس مشکل گھڑی میں میری مدد کرے گا۔

سب سے مشکل گھڑی تو وہ تھی جس رات رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہجرت کرنی تھی دشمنوں نے مکان کو گھیرے میں لیا ہوا ہے رات کی تاریکی میں دشمنوں کے درمیان سے گزر کر حضرت ابوبکر کے گھر جاتے ہیں پھر غار ثور میں پناہ لیتے ہیں دشمن غار کے منہ پر آ گیا ہے حضرت ابوبکر دشمنوں کے پیروں کو دیکھ کر غم و حزن میں ڈوب جاتے ہیں ابوبکر کے غم کے آثار دیکھ کر فرماتے ہیں۔ لَا تَحْزَنْ إِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا غم نہ کیجیے اللہ ہمارے ساتھ ہے۔ کوئی گھبراہٹ نہیں کوئی پریشانی نہیں۔ جب ہم انجیلی یسوع مسیح کو مصیبت کے وقت میں دیکھتے ہیں تو بہت ہی کم ہمت دکھائی دیتے ہیں چنانچہ متی 42:39:26 و مرقس 36:33:14 میں یہ الفاظ ہیں "اور وہ گھبرائے اور بہت اداس ہونے لگا اور ان سے کہا میری جان کا غم موت کا سا ہے تم جہاں ٹھہرو اور جاگتے رہو وہ تھوڑا آگے جا کر زمین پر گرا اور دعا مانگی کہ اگر ہو سکے تو یہ گھڑی مجھ سے ٹل جائے اور کہا اے ابا اے باپ، سب کچھ تجھ سے ہو سکتا ہے، اس پیالے کو مجھ سے ٹال دے لیکن نہ وہ جو میں چاہتا ہوں بلکہ جو تو چاہتا ہے۔

شاگردوں کو مخاطب کرتے ہوئے یہ بھی کہا۔ "روح تو مستعد پر جسم سست ہے۔ (لوقا 22:42-45) میں دعا کے یہ الفاظ ہیں۔

"اے باپ اگر تو چاہے تو یہ پیالہ مجھ سے دور کر لے لیکن میری مرضی نہیں بلکہ تیری مرضی کے موافق ہو اور آسمان سے ایک فرشتہ اس کو دکھائی دیا جو اسے قوت دیتا تھا اور وہ جان کنی میں پھنس کے بہت گڑگڑا کے دعا مانگتا تھا اور اس کا پسینہ لہو کی بوند ہو کر زمین پر گرتا تھا"۔

آخری الفاظ جو یسوع مسیح کے منہ سے صلیب پر نکلے وہ یہ ہیں۔ "نویں گھنٹے کے قریب یسوع نے بڑے شور سے چلا کر کہا ایلی ایلی لما سبقتانی اے میرے خدا تو نے کیوں مجھے چھوڑ دیا"۔ (متی 47:26)

اسی طرح مرقس 15:44 میں لکھا ہے "اور نویں گھنٹے یسوع بڑی آواز سے چلا کر بولا "ایلی ایلی لما سبقتانی" میرے خدا اے میرے خدا تو نے مجھے کیوں چھوڑا"۔

یہ الفاظ اللہ پر بے اعتمادی کم ہمتی پر دلالت کرتے ہیں۔ جبکہ نبی نہ تو کم ہمت ہوتا ہے نہ بزدل نہ ہی کبھی اس کا اعتماد خدا سے اٹھتا ہے۔ اس کے پاؤں میں بڑی سے بڑی مصیبت کے وقت بھی کبھی لغزش اور جنبش نہیں آتی وہ ایمان کی مستحکم چٹان کھڑا رہتا ہے۔ ہمارے نبی کی مثالیں تاریخ میں موجود ہیں۔

بدکار عورتیں اور انجیلی یسوع مسیح:

1- اس کے پاؤں پر ایک بدچلن عورت نے عطر ڈالا (لوقا 7:27) ب عطر ڈالنے والی بدچلن عورت کا نام مریم تھا جو مرتھا اور لعزر کی بہن تھی۔ (یوحنا 11:1,3 12:26) ج۔ یسوع اس بدچلن عورت سے محبت رکھتا تھا۔ (یوحنا 11:5)۔ د۔ اس بدچلن کو بھی یسوع سے محبت تھی۔ (لوقا 4:47)۔ ر۔ وہ بدچلن عورت روئی تو یسوع بھی گھبرا کر رونے لگا۔ (یوحنا 11:35)۔ د۔ یفسوع اس بدچلن عورت کے گھر گیا اور اس سے تنہائی میں باتیں کرتا رہا۔ (لوقا 7:37 تا 50)۔ ز۔ اس کے ساتھ عورتیں رہتی تھیں۔ (لوقا 8:2730:55)۔ ایک بدچلن سامری عورت سے جو کئی خاوند کر چکی تھی یسوع نے تنہائی میں معنی خیز گفتگو کی۔ (یوحنا 14:17)۔ ص۔ اتنے میں اس کے شاگرد آ گئے اور تعجب کرنے

لگے کہ وہ عورت سے باتیں کر رہا ہے پس عورت اپنا گھڑا چھوڑ کر شہر کو چلی گئی۔ (یوحنا 28,27:4)

انجیل سے یسوع مسیح کی بدکلامی اور درشت گوئی کی کئی مثالیں ملتی ہیں۔ 1- گالیاں دینا زنا کار لوگ (متی 39:12) اے سانپو! افعی کے بچو (متی 33:23) اے بدکارو (متی 23:7) اندھو (متی 17 تا 23,19) انجیل میں یسوع مسیح کی ان الفاظ میں تصویر کھینچی گئی ہے کیا کوئی شخص انجیلی یسوع مسیح کو سچا نبی قرار دے سکتا ہے یہ اسلام کا عیسائیوں پر احسان ہے کہ قرآن مجید میں حضرت مسیح علیہ السلام کو ایک سچا نبی قرار دیا اور حضرت مریم کو جب مسیح علیہ السلام کی پیدائش کے متعلق بشارت دی گئی تو اس میں بتایا گیا کہ وہ وجیھاً فی الدنیا و والآخرۃ و من المقربین ہوگا۔ اسے کتاب اور حکمت سکھائی جائے گی۔ ان کی ماں (مریم) کو صدیقہ (یعنی سچی) قرار دیا گیا یہ بھی بتایا گیا ہے کہ حضرت مریم سے اللہ تعالیٰ ہم کلام ہوتا تھا اور وہ خدا کی برگزیدہ عورتوں میں سے تھی۔ وہ حواری جن کو انجیل میں مرتد بے ایمان لعنتی اور یسوع مسیح کو چند کوڑیوں کے بدلے پکڑوانے والے قرار دیا ہے ان کو حضرت مسیح کے مخلص مرید قرار دیا گیا ہے اور ان کے ایمان کی تعریف کی گئی ہے حضرت مریم اور حضرت مسیح علیہ السلام پر جو یہودی الزام لگاتے تھے ان سے بری قرار دیا ہے افسوس ان مستشرقین پر جو اسلام، رسول کریم ﷺ اور قرآن مجید پر بے بجا اعتراضات کرتے ہیں۔

کارلائل کا اعتراض ایک طویل جواب کا طالب تھا۔ اعتراض کے جواب میں دونوں مذاہب عیسائیت اور اسلام کی تعلیم کا موازنہ کرنا ضروری تھا اختصار کے ساتھ دونوں مذاہب کی تعلیمات کا موازنہ کیا ہے۔ اسی طرح دونوں مذاہب کی کتب پر مختصراً تبصرہ کیا ہے۔ یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ مروجہ عیسائیت کی تعلیمات کا کوئی پہلو بھی اسلام کی تعلیم میں شامل نہیں سب سے بڑھ کر مروجہ عیسائیت کی بنیاد ہی شرک پر ہے جبکہ اسلام خالص توحید کا پیغام دیتا ہے۔ لہٰذا کارلائل کے اعتراض میں کوئی وزن نہیں۔ موصوف نے دونوں مذاہب کی تعلیمات کا جائزہ تک نہیں لیا۔

......☆......

اعمال کا لکھا جانا اور گردن کے ساتھ چمٹا ہونا

اعتراض: اگر کافر وہی ہیں جو قرآن پیغمبر اور قرآنی خدا ساتویں آسمان اور نماز وغیرہ کو نہیں مانتے اور انہیں کے واسطے دوزخ ہے تو یہ بات محض طرف داری کی ہے۔ کیا قرآن ہی کے ماننے والے سب اچھے اور باقی سب برے بھی ہو سکتے ہیں۔ یہ تو لڑکپن کی بات ہے کہ ہر ایک کی گردن میں عمل نامہ ہوگا۔ ہم تو کسی ایک کی گردن میں نہیں دیکھتے اگر اس سے مراد اعمال کا بدلہ دینا ہے تو پھر انسانوں کے دلوں آنکھوں وغیرہ پر مہر لگانا اور گناہوں کا معاف کرنا کیا کھیلکی باتیں ہیں؟ قیامت کی زات کو خدا کتاب نکالے گا۔ تو اب وہ کتاب کہاں ہے؟ کیا دکانداروں کے روزنامچہ کی مانند خدا لکھتا رہتا ہے۔ یہاں پر غور کرنا چاہیے کہ اگر پہلا جنم ہی نہیں ہے تو روحوں کے اعمال کہاں سے آگئے اور اعمال نامچہ کہاں سے بن سکے گا؟ اور اگر بغیر اعمال کے لکھا گیا تو خدا نے

ان پر ظلم کیا۔ نیک و بداعمال کے بغیران کو رنج وراحت کیوں دیا؟ اگر کہو کہ خدا کی مرضی تو بھی ان سے ظلم کیا۔ بے انصافی اسی کو کہتے ہیں۔ بلا لحاظ نیک و بداعمال کے دکھ سکھ کا کم وبیش دینا اور کیا اس وقت خدا ہی کتاب پڑھے گا یا کوئی سررشتہ دار سنادے گا۔ اگر خدا ہی نے مدت کی پڑی ہوئی روحوں کو بلاقصور ہلاک کر دیا تو وہ ظالم ہوگیا جو ظالم ہے وہ خدا ہی نہیں ہوسکتا۔ (ستیارتھ پرکاش اعتراض 102)

جواب: اس اعتراض کا مرکزی نقطہ ''کتاب، اعمال اور اس کا گردن کے ساتھ چمٹا ہونا ہے''۔ قرآن مجید کی اس آیت پر اعتراض کیا گیا ہے۔ وَكُلَّ اِنسَانٍ اَلْزَمْنٰهُ طٰٓئِرَهٗ فِىْ عُنُقِهٖ وَنُخْرِجُ لَهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ كِتٰبًا يَّلْقٰهُ مَنْشُوْرًا اِقْرَاْ كِتٰبَكَ كَفٰى بِنَفْسِكَ الْيَوْمَ عَلَيْكَ حَسِيْبًا (بنی اسرائیل 14,13:17) اور ہر انسان کے عملوں کو ہم نے اس کی گردن میں ڈالا اور ہم اس کے لیے قیامت کے دن ایک کتاب نکالیں گے جسے وہ کھلا ہوا پائے گا اپنی کتاب پڑھ آج تو خود ہی اپنا حساب لینے کے لیے کافی ہے۔

دنیا کے تمام مذاہب میں قیامت کے دن اعمال کے حساب کتاب کا ذکر ہے اور ان اعمال کے مطابق ہی جزا وسزا دی جائے گی۔ اس حساب کتاب کو مختلف مذاہب میں مختلف انداز میں بیان کیا گیا ہے لیکن بنیادی نقطہ انسان کے اعمال کا حساب کتاب ہے قرآن مجید میں اعمال کے حساب کتاب کو مختلف انداز میں بیان کیا گیا ہے کہیں یہ ذکر کیا گیا ہے کہ میزان قائم کیا جائے گا گویا اعمال کا وزن ہوگا کہیں اس اعمال نامہ کے پڑھنے کے لیے دوسروں کو بلایا جائے گا هَآؤُمُ اقْرَءُوْا كِتٰبِيَهْ (کہے گا لو میری کتاب پڑھو (الحاقۃ 19:69) کہیں یہ ہے کہ انسان کا نفس ہی حساب کرے گا۔

جو چیزیں دوسرے عالم سے تعلق رکھتی ہیں ان کو اس عالم پر قیاس نہیں کرنا چاہیے۔ صرف سمجھانے کے لیے ان الفاظ کو استعمال کیا گیا ہے جو یہاں کی چیزوں پر بولے جاتے ہیں۔ قیامت کے دن حساب کتاب کس رنگ میں ہوگا۔ وہ اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔ انبیاء علیہم السلام نے محض انسان کو سمجھانے کے لیے ایک خاص طرز بیان اختیار کیا ہے تا کہ انسان کسی قدر اس حقیقت کو سمجھ سکے۔

معترض نے کتاب سے مراد قلم ودوات سے لکھی ہوئی چیز مراد لے لی ہے کتاب سے مراد صرف محفوظ کرنا ہے۔ بتانا یہ مقصود ہے کہ جس طرح ایک چیز جب احاطہ تحریر میں آجاتی ہے۔ اور وہ محفوظ ہو جاتی ہے۔ اسی طرح جب یہ کہا جاتا ہے کہ تمہارے اعمال لکھے جاتے ہیں تو وہاں یہ بتانا مقصود ہے کہ اعمال کو محفوظ کرلیا گیا ہے اسی لیے قرآن مجید میں اعمال کے لکھے جانے کا ذکر بار بار آتا ہے۔

ارشاد الٰہی ہے۔ هٰذَا كِتٰبُنَا يَنْطِقُ عَلَيْكُمْ بِالْحَقِّ اِنَّا كُنَّا نَسْتَنْسِخُ مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ (الجاثیہ 29:45) یہ ہماری کتاب تمہارے بارے میں حق کے ساتھ بولتی ہے، ہم لکھ لیتے ہیں جو کچھ تم عمل کرتے ہو۔

دوسری جگہ آتا ہے۔ اَمْ يَحْسَبُوْنَ اَنَّا لَا نَسْمَعُ سِرَّهُمْ وَ نَجْوٰهُمْ وَ بَلٰى وَرُسُلُنَا لَدَيْهِمْ يَكْتُبُوْنَ (الزخرف 80:43) کیا وہ سمجھتے ہیں کہ ہم ان کی چھپی ہوئی باتوں اور سرگوشیوں کو نہیں جانتے ہاں اور ہمارے بھیجے ہوئے ان کے پاس لکھتے جاتے ہیں۔

فَمَنْ يَّعْمَلْ مِنَ الصّٰلِحٰتِ وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَا كُفْرَانَ لِسَعْيِهٖ وَ اِنَّا لَهٗ كٰتِبُوْنَ (الانبیاء 94:21) جو کوئی کچھ اچھے کام کرے اور وہ مومن ہو تو اس کی کوشش کی ناقدری نہ ہوگی ہم اس کے لیے لکھ لیتے ہیں۔

یہ آیات ظاہر کرتی ہیں کہ ہر شخص کے اعمال محفوظ کیے جارہے ہیں ان کے نتائج اخروی زندگی میں ظاہر ہو جائیں گے اس سے ہرگز وہ کتاب مراد نہیں جسے ہم اس دنیا کی اصطلاح میں کہتے ہیں یعنی ایسی کتاب جو قلم اور دوات سے مرتب ہوتی ہے۔

ان آیات کے مطالعہ سے جن میں اعمال کے لکھے جانے یا اعمال ناموں کا ذکر ہے واضح ہو جاتا ہے کہ اس سے مراد وہ نتائج ہیں جو ان اعمال اور افعال سے پیدا ہوتے ہیں۔

اعمال کا گردن کے ساتھ چمٹا ہونا:

معترض نے اعمال کا گردن کے ساتھ چمٹا ہونے پر اعتراض بھی کیا ہے قرآن مجید کے الفاظ ہیں۔ وَكُلَّ اِنْسَانٍ اَلْزَمْنٰهُ طٰٓئِرَهٗ فِیْ عُنُقِهٖ کہ ہر انسان کے عملوں کو ہم نے اس کی گردن میں ڈالا ہے۔ اس سے ہرگز مراد نہیں ہے کہ کوئی مکتوبہ چیز انسان کی گردن میں ڈال دی جائے گی۔ یہ ایک محاورہ کے طور پر یہ بیان کیا گیا ہے کہ ہر عمل کا ذمہ دار انسان خود ہے جو کچھ بھی وہ کرتا ہے وہ اس کے گلے (گردن) کا ہار بن جاتا ہے۔ انسان اپنے کیے کے نتائج سے بچ نہیں سکے گا۔ اپنے اعمال کے نتائج دیکھے گا۔ قرآن مجید نے اپنے اعمال کے نتائج کی ذمہ داری کی وضاحت نہایت اعلیٰ اور عمدہ طریقہ سے کی ہے۔ کہ جب کوئی شخص کوئی عمل کرتا ہے تو اس پر اس کا مستقل نقش باقی رہ جاتا ہے اس کا اظہار مذکورہ آیت میں کیا گیا ہے۔

......☆......

خدا کا اپنے ہاتھ سے زمین و آسمان بنانا (لفظ کُن سے بنالیتا)

اعتـــــراض :خدا نے زمین و آسمان کو اپنے ہاتھ سے بنایا اور خدا کو تکان نہ ہوئی ہاتھ سے بنانے کی کیا ضرورت تھی کُن سے بناتا وغیرہ وغیرہ۔ (ترک اسلام سوال 83)

جواب:یہ اعتراض قرآن مجید کی آیات وَالسَّمَآءَ بَنَيْنٰهَا بِاَيْدٍ وَّاِنَّا لَمُوْسِعُوْنَ (الذاریات 47:51) اور آسمان کو ہم نے ہاتھ سے بنایا اور ہم وسیع قدرت والے ہیں۔

دوسری آیت ہے۔ وَمَا مَسَّنَا مِنْ لُّغُوْبٍ (ق 38:50) اور تکان نے ہمیں نہیں چھوا۔

پہلی آیت الذاریات کی 47 میں لفظ اید پر اعتراض کیا ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے آسمان ہاتھ سے کیوں بنایا وہ لفظ کُن (ہو جا) سے بھی بنا سکتا تھا۔

عربی زبان مین لفظ اید صرف ہاتھ پر ہی نہیں بولا جاتا بلکہ قوت اور طاقت پر بولا جاتا ہے۔ اس سے مراد یہ نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے ہاتھ سے آسمان بنایا بلکہ مراد یہ ہے کہ اپنی قدرت اور قوت سے بنایا لفظ اید اللہ تعالیٰ کی صفت قدرت پر دلالت کر رہا ہے۔

قرآن مجید نے اید کو قوت کے معنی میں بھی استعمال کیا ہے۔ ارشاد الٰہی ہے۔ وَاذْكُرْ عَبْدَنَا دَاوٗدَ ذَا الْاَيْدِ اِنَّهٗۤ اَوَّابٌ (ص 17:38) ہمارے قوت والے بندے داؤد کو یاد کرو کہ وہ اللہ کی طرف رجوع کرنے والا تھا اس آیت میں حضرت داؤد کی طاقت اور قوت کا ذکر کیا گیا ہے یعنی وہ ایک طاقتور حکومت کا مالک تھا۔

پس وہ آسمان کو اپنے ہاتھ سے بنانے سے مراد اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ مراد ہے ہاتھ مراد نہیں۔

اسی طرح ید کے معنی ملک اور تصرف کے بھی ہیں ارشاد الٰہی ہے۔ اَوْ يَعْفُوَا الَّذِیْ بِيَدِهٖ عُقْدَةُ النِّكَاحِ (بقرہ 237:2) وہ شخص

جس کے ہاتھ میں نکاح کی گرہ ہے (اپنا حق) معاف کردے۔

عام انسانی بول چال میں لفظ ''ہاتھ'' ان سب معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔

پس اللہ کا ہاتھ سے مراد اس کی طاقت اور قدرت کاملہ مراد ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کی تشبیہی صفت ہے۔ اس قسم کی صفات کے معانی محکم آیات کے تحت بیان کیے جاتے ہیں۔

......☆......

محبت الٰہی (۱)

قرآن مجید میں خدا کی انسان کے ساتھ محبت کرنے کے بارے میں کون سی آیات ہیں

اعتراض قرآن میں انسان اور خدا کے ساتھ محبت کرنے کے بارے میں اور خدا کی انسان کے ساتھ محبت کرنے کے بارے میں کون سی آیتیں ہیں جن میں خالص محبت یا حب کا فعل استعمال کیا گیا ہے۔ (سراج الدین کے چار سوالات) میں سے تیسرا سوال۔

جواب: عیسائیوں کی طرف سے کثرت سے یہ خصوصی امتیاز اٹھایا جاتا ہے کہ ان کا مذہب محبت کا مذہب ہے۔ عیسائیت جو محبت کی تعلیم دیتی ہے اس سے بڑھ کر اور کوئی مذہب نہیں جو اس قسم کی محبت کی تعلیم پیش کرے۔ ان کا عقیدہ ہے کہ خدا کا بیٹا یسوع مسیح انسانوں کی محبت کی خاطر مصلوب ہوئے۔ الغرض عیسائی اپنے مذہب کی بنیاد محبت پر رکھتے ہیں اسی کو سامنے رکھ کر سراج الدین نے اسلام پر مذکورہ اعتراض کیا ہے۔ یہ اعتراض اسلام کی تعلیم سے عدم واقفیت کی وجہ سے ہے۔

جز اول: انسان اور خدا کے ساتھ محبت کرنے کے بارے میں تعلیم:

جب قرآن مجید کی پہلی سورت الفاتحہ کا مطالعہ کرتے ہیں۔ اس کا آغاز ہی انسان اور خدا کے باہمی رشتہ محبت کے بارے میں ہوتا ہے سورہ فاتحہ میں پہلی صفت رب العالمین بیان کی گئی ہے یعنی تمام دنیا کا پالن ہار ہے۔ اللہ تعالیٰ کا رب ہونا یہ ہے کہ وہ ہر ایک مخلوق کو اپنے دائرہ کے اندر کمال تک پہنچاتی ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ وہ ہستی ہے جس نے جو انسان کی روحانی اور جسمانی پرورش کے لیے ہر قسم کا سامان پیدا کر رکھا ہے روحانی پرورش کے لیے سلسلہ نبوت و رسالت اور وحی جاری کر رکھا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انبیاء علیہم السلام کی معرفت اپنی پہچان اور رضا کے دروازے وا کر دیئے ہیں انبیاء علیہم السلام کے بتائے ہوئے رستوں پر چل کر انسان خدا تک پہنچ جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی محبت کا اظہار کیا ہے۔ پھر جسمانی پرورش کے لیے دنیا میں ہر قسم کی اشیاء پیدا کر دی ہیں۔ شعوری اور غیر شعوری طور پر انسان ان چیزوں سے فائدہ حاصل کر رہا ہے۔ دوسری صفت رحمانیت کی ہے۔ رحمانیت کا مادہ رحم ہے۔ رحمانیت وہ ذات ہے جس نے انسان اور دیگر جان دار اشیاء کی طلب کے بغیر وہ

چیزیں پیدا کردی ہیں جو ان کی ضرورت کے لیے تھیں۔ ہوا، روشنی، پانی، چاند ستارے، سورج زمین دریا سمندر پہاڑ اور دیگر اشیاء انسان کی طلب کے بغیر اس کے لیے پیدا کردی ہیں کیا اس صفت سے محبت کا اظہار نہیں ہو رہا۔

تیسری صفت رحیمیت ہے۔ اس صفت کا مادہ بھی رحم ہے۔ قرآن کی رو سے رحیم وہ ذات ہے جو انسان کو اس کی محنت کا اچھا بدلہ دینے والا ہے۔ یہ صفت بھی اللہ کی محبت کو ظاہر کرتی ہے وہ کلمہ شہادت جس پر اسلام کی بنیاد ہے اس کا پہلے جز میں لفظ الٰہ ہے۔ اِلٰـــــہٗ و لاہ سے مشتق ہے ایسا محبوب جس کی پرستش کی جائے۔ یعنی اسلام کا اللہ ایسی محبوب ہستی ہے۔ اس کی پرستش بھی ایسی ہونی چاہیے جس میں کسی شرک کی ملونی نہ ہو۔ محبوبیت کے لحاظ سے اس کی ذات سب سے بلندتر ہونی چاہیے جیسی محبوب ہستی ہے ویسی ہی اس کی پرستش کی جائے۔ کوئی ہستی اس کے برابر نہ ہو۔

یہ وہ کلمہ ہے جو پانچ وقت مسجد کے مناروں سے بلند آواز سے کہا جاتا ہے۔ اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰـهَ اِلَّا اللّٰـهُ یعنی میں گواہی دیتا ہوں ہمارا محبوب اللہ کے سوا کوئی دوسرا نہیں گویا مسلمان پانچ دفعہ اس بات کا اعلان کرتے ہیں کہ ہمارا محبوب سوائے اللہ کے اور کوئی نہیں۔ مسلمانوں کا کلمہ شہادت ہی خدا کی محبوبیت کا اظہار کر رہا ہے۔

لفظ اسلام کا مفہوم بھی محبت پر دلالت کرتا ہے۔ خدا کے سامنے سر تسلیم خم کر دینا اور اپنے آپ کو خدا کی خاطر قربان کر دینے کا نام اسلام ہے خدا کے آستانہ پر سر رکھ دینا اور اپنی جان مال ابرو قربان کر دینے کے لیے تیار رہنا محبت اور عشق کی علامت ہے۔ اس لفظ میں صدق، اخلاص اور محبت کے معنی کوٹ کوٹ کر بھرے ہیں۔ خدا کی محبت کے بارے میں فرماتا ہے۔ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ یعنی سچے مومن وہ ہیں جو اللہ تعالیٰ سے محبت رکھتے ہیں۔

پھر فرمایا: فَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَذِكْرِكُمْ اٰبَآءَكُمْ اَوْ اَشَدَّ ذِكْرًا یعنی اللہ کو ایسا یاد کرو جیسا کہ تم اپنے باپوں کو یاد کرتے ہو بلکہ اس سے زیادہ اور انتہائی درجہ کی محبت کے ساتھ یاد کرو۔

پھر فرمایا: قُلْ اِنَّ صَلَاتِيْ وَ نُسُكِيْ وَ مَحْيَايَ وَ مَمَاتِيْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ کہہ دے میری نماز اور میری قربانی اور میری زندگی اور میرا مرنا سب اللہ تعالیٰ کے لیے ہے۔

ایک اور جگہ فرمایا: وَ يُطْعِمُوْنَ الطَّعَامَ عَلٰى حُبِّهٖ مِسْكِيْنًا وَّ يَتِيْمًا وَّ اَسِيْرًا اِنَّمَا نُطْعِمُكُمْ لِوَجْهِ اللّٰهِ لَا نُرِيْدُ مِنْكُمْ جَزَآءً وَّلَا شُكُوْرًا۔ اور اسیروں کو کھانا کھلاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم تو محض خدا کی محبت اور اس کے مونہہ کے لیے تمہیں کھلاتے ہیں۔ ہم تم سے کوئی بدلہ نہیں چاہتے اور نہ شکر گزاری چاہتے ہیں۔

خدا کے رحم اور عدل اور محبت اور اس کی قدوسیت سے تمام قرآن بھرا پڑا ہے۔ قرآن مجید کے جس صفحہ پر نظر دوڑاؤ وہاں خدا کی صفات رحم اور عدل نظر آئے گی چند آیات درج کی جاتی ہیں۔ هُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِيْمُ هُوَ اللّٰهُ الَّذِيْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ اَلْمَلِكُ الْقُدُّوْسُ السَّلٰمُ الْمُؤْمِنُ الْمُهَيْمِنُ الْعَزِيْزُ الْجَبَّارُ الْمُتَكَبِّرُ (الحشر 22:59) وہ بے انتہا رحم والا بار بار رحم کرنے والا ہے وہی اللہ ہے اس کے سوا کوئی معبود نہیں بادشاہ پاک سلامتی والا امن دینے والا نگہبان غالب بگڑے کو بنانے والا سب بڑائیوں کا مالک ہے۔

دوسری جگہ آتا ہے۔ نَبِّئْ عِبَادِيْٓ اَنِّيْٓ اَنَا الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ (حجر 49:15) میرے بندوں کو خبر دے دو کہ میں بخشنے والا رحم کرنے والا ہوں۔

قُلْ يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ اِنَّ اللّٰهَ يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِيْعًا اِنَّهٗ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ (زمر 53:39) کہہ اے میرے بندو! جنہوں نے اپنی جانوں پر زیادتی کی ہے اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہوں۔ اللہ سبھی گناہ بخش دیتا ہے۔ ہاں وہ بخشنے والا رحم کرنے والا ہے۔

یہ آیت اللہ کی رحمت کی وسعت بے پایاں کو ظاہر کرتی ہے تمام دوسری کتابیں اس سے خالی ہیں انجیل تو کوئی تھکے ماندوں کو آرام کی خوشخبری دیتی ہے لیکن قرآن تمام قسم کے گناہوں کی بخشش کی خوشخبری سناتا ہے یہ اسلامی تعلیم کا کمال ہے کہ تمام رجوع کرنے والوں کے لیے رحمت الٰہی کا دروازہ وا کر دیا ہے۔

فرمایا: وَرَحْمَتِي وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ (اعراف 156:7) میری رحمت ہر شے پر حاوی ہے۔

قرآن مجید اللہ تعالیٰ کی اُس رحمت بیکراں کی خبر دیتا ہے جو دنیا کی تمام اشیاء پر حاوی ہے جس میں مسلم، کافر، فرمانبردار اور گناہگار سب آ جاتے ہیں۔

فرمایا: كَتَبَ رَبُّكُمْ عَلَىٰ نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ (انعام 54:6)

تمہارے رب نے اپنے اوپر رحمت کو لازم کر لیا ہے۔

فرمایا: وَمَا رَبُّكَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيدِ (حٰمٓ السجدہ 46:41)

اور تیرا رب بندوں پر کچھ بھی ظلم کرنے والا نہیں۔

رحم اور عدل کی یہ وہ تعلیم ہے جو کسی مذہبی کتاب میں موجود نہیں اگر اللہ تعالیٰ کا رحم اور عدل شریعت کے قوانین میں جاری ساری ہے تو وہی رحم و عدل عملی شکل میں اس کائنات میں جاری ہے اس رحم و عدل کی تعلیم رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے دی ہے۔ اس وجہ سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو رحمۃ للعالمین کہا ہے یعنی اے رسول! تم تمام دنیا کے لیے رحمت بنا کر بھیجے گئے ہو عالمین میں کافر بے ایمان اور فاسق سب داخل ہیں گویا رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا وجود تمام لوگوں کے لیے باعث رحمت ہے۔

تیسری جز: اس سوال کی تیسری جز یہ ہے کہ قرآن مجید میں کہاں لکھا ہے کہ انسان کے ساتھ محبت کرے۔

اسلام نے تمام بنی نوع انسانوں کو مساوات کی سطح پر کھڑا کر کے ان سے رحم عدل اور شفقت سے پیش آنے کی تعلیم دی ہے۔

ارشاد الٰہی ہے۔ يَا أَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوا رَبَّكُمُ الَّذِي خَلَقَكُم مِّن نَّفْسٍ وَاحِدَةٍ (النساء 1:4) اے لوگو اپنے رب سے ڈرو جس نے تم کو ایک جان سے پیدا کیا۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں۔ اَلْخَلْقُ كُلُّهُمْ عِيَالُ اللّٰهِ فَاَحَبُّ عِنْدَ اللّٰهِ مَنْ اَحْسَنَ اِلٰى عِيَالِهٖ (طبرانی، بیہقی) ساری مخلوق اللہ کا کنبہ ہے اور اس کے نزدیک سب سے زیادہ پسندیدہ مخلوق وہ ہے جو اس کے کنبہ کے ساتھ بھلائی کرتا ہے۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع کے موقع پر فرمایا: اَيُّهَا النَّاسُ اَلَا اِنَّ رَبَّكُمْ وَاحِدٌ وَّاِنَّ اَبَاكُمْ وَّاحِدٌ اَلَا لَا فَضْلَ لِعَرَبِيٍّ عَلٰى عَجَمِيٍّ وَلَا لِعَجَمِيٍّ عَلٰى عَرَبِيٍّ وَلَا لِاَحْمَرَ عَلٰى اَسْوَدَ وَلَا لِاَسْوَدَ عَلَى الْاَحْمَرِ اِلَّا بِتَقْوٰى (مسند احمد) اے لوگو! ہاں بے شک تمہارا رب ایک ہے ہاں عربی کو عجمی پر، عجمی کو عربی پر، سرخ کو کالے پر اور کالے کو سرخ پر کوئی فضیلت نہیں مگر تقویٰ کے سبب۔

یہ وہ مساوات ہے جس کا سبق اسلام نے دیا ہے۔ اسلام نے ایک انسان کا دوسرے انسان کے ساتھ کیسا سلوک ہونا چاہیے۔ اس موضوع پر ہر پہلو سے وضاحت کی ہے اور کوئی پہلو تشنہ نہیں چھوڑا۔ صرف چند آیات اور احادیث پر ہی اکتفا کیا جائے گا۔ ارشاد الٰہی ہے۔ اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ وَاِيْتَاءِ ذِي الْقُرْبٰى (النحل 90:16) اللہ تمہیں عدل اور احسان اور قریبیوں کو دینے کا حکم دیتا ہے۔

فرمایا: تَوَاصَوْا بِالْحَقِّ وَتَوَاصَوْا بِالْمَرْحَمَةِ یعنی مومن وہ ہیں جو حق اور رحم کی وصیت کرتے ہیں۔

فرمایا: وَالَّذِيْنَ فِيْ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ مَّعْلُوْمٌ لِّلسَّائِلِ وَالْمَحْرُوْمِ (المعارج 25,24:70) اور جن کے مالوں میں ایک مقرر حق ہے سوال کرنے والے اور محروم کے لیے۔

وَاِذَا حَکَمۡتُمۡ بَیۡنَ النَّاسِ اَنۡ تَحۡکُمُوۡا بِالۡعَدۡلِ (النساء 58:4) جب لوگوں میں فیصلہ کروتو انصاف سے کرو۔
وَاِذَا قُلۡتُمۡ فَاعۡدِلُوۡا وَلَوۡ کَانَ ذَاقُرۡبٰی (الانعام 15:2) جب تم بات کہوتو عدل کرواگر چہ قریبی ہو۔
رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں۔ تَرَی الۡمُؤۡمِنِیۡنَ فِی تَرَاحُمِھِمۡ وَتَوَادِّھِمۡ وَ تَعَاطُفِھِمۡ کَمَثَلِ الۡجَسَدِ اِذَاشۡتَکٰی عُضۡواً تَدَاعٰی لَہٗ سَائِرُ الۡجَسَدِ بِالسَّھۡرِ وَالۡحُمّٰی (بخاری ومسلم کتاب البر والصلہ والادب باب تراحم المومنین) مسلمانوں کوایک دوسرے سے محبت کرنے رحم کرنے شفقت کرنے کی مثال ایک جسم کی طرح ہے جب ایک عضو کو کوئی تکلیف ہوتی ہے تو سارا جسم بےخوابی اور بخار میں مبتلا ہو جاتا ہے۔

فرمایا: اَلۡمُؤۡمِنُ لِلۡمُؤۡمِنِ کَالۡبُنۡیَانِ یَشُدُّ بَعۡضُہٗ بَعۡضًا ثُمَّ شَبَّکَ بَیۡنَ اَصَابِعِہٖ (بخاری ومسلم باب تراحم المومنین) ایک مومن دوسرے مومن کے لیے عمارت کی طرح ہے جس کا ایک حصہ دوسرے کو مضبوط کرتا ہے پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک ہاتھ کی انگلیاں دوسرے ہاتھ کی انگلیوں میں ڈال کر دکھایا۔

اسلام نے جہاں باہمی محبت پیار سے رہنے کی تعلیم دی ہے وہاں ان تمام باتوں سے منع کر دیا ہے جو محبت پیار کے خلاف ہیں مثلاً کسی کو حقیر جانا۔ (لقمان 18:31) عیب لگانا اور برے لقب سے پکارنا۔ (الحجرات 11:49) دوسروں کے عیبوں کی ٹوہ میں لگا رہنا۔ (الحجرات 11:49) غیبت کرنا۔ (الحجرات 13:49)

دنیا میں صرف اسلام ہی ایک ایسا مذہب ہے جس نے معاشرہ کے تمام اعضا اور اراکین کے حقوق وفرائض بیان کیے ہیں اس موضوع پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے خاکسار نے بھی سیرت سید البشر کے دوسرے حصے میں حقوق انسانی پر تفصیلاً بحث کی ہے قارئین اس سوال کے تناظر میں کتاب کے اس حصہ کو بھی پڑھا جا سکتا ہے قارئین پر خود واضح ہو جائے گا کہ معترض اسلامی تعلیم سے کتنا ناواقف ہے۔

☆......☆

محبت الٰہی (۲) (قرآن مجید میں خدا کا تصور ڈراؤنا ہے)

اعتراض: عیسائی محققین، مبلغین اور مستشرقین محبت الٰہی کے تناظر میں اسلام پر ایک یہ اعتراض کرتے ہیں کہ اسلام نے خدا کا جو تصور اپنے پیروؤں کے سامنے پیش کیا ہے کہ وہ ایک قہار جبار ذوانتقام غضب ناک صاحب جلال وجبروت ذات ہے جس سے بندوں کو اس سے ڈرتے رہنا چاہیے اسی کا اثر اسلام کے احکام پر نمایاں نظر آتا ہے۔ برخلاف عیسائی مذہب اللہ تعالیٰ کی ذات کو محبت، رحمت اور شفقت کا ایک پیکر کے طور پر پیش کرنا ہے اس لیے اس کو باپ کے نام سے پکارتا ہے۔ اس کا یہ نتیجہ ہے کہ عیسائیت کی نصائح میں نرمی اور رحم و پیار کا جذبہ جھلکتا ہے۔ اسلام کے اس تصور کی وجہ سے مستشرقین اسلام کو ایک جنگجو اور مخالفین کو قتل کرنے کا مذہب قرار دیتے ہیں۔

جواب: اس اعتراض کا جواب گو بنیادی طور پر پہلے اعتراض کے جواب میں آ گیا ہے لیکن یہاں جواب قرآن میں اللہ تعالیٰ کی صفات حسنہ کو

سامنے رکھ کر دیا جائے گا۔

قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کی جن ننانوے (99) صفات کا ذکر آیا ہے انہی صفات کا ظہور اس کائنات میں ہے کہیں صفت ربوبیت کا ظہور ہے اور کہیں صفت رحمانیت اور صفت رحیمیت کا ظہور ہے کہیں صفت غفاریت جلوہ گر ہے اور کہیں صفت رووفیت جلوہ افروز ہے۔ تمام کائنات کی پیدائش خالقیت اور بدیعت کی عکس ہے اور کہیں اللہ تعالیٰ کی جلالی صفات بھی جلوہ گر ہیں گویا اللہ تعالیٰ کی صفات، ایک آئین کا درجہ رکھتی ہیں جس کے تحت یہ نظام کائنات چل رہا ہے۔ انہی صفات کے تحت معرفت الٰہیہ ہوتی ہے یہی وجہ ہے اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں ننانوے اسماء کا بار بار ذکر کیا ہے تا کہ انسان اللہ تعالیٰ کے حُسن و احسان پر اطلاع پائے اور اس کے دل میں خدا کی محبت پیدا ہو، کیونکہ انسان کی فطرت میں ہے جب کوئی حسین چیز دیکھتا ہے تو اس کا دل اس کی طرف مائل ہو جاتا ہے اسی طرح جب کسی انسان پر کسی کا احسان ہوتا ہے تو انسان طبعی طور پر اپنے محسن سے محبت کرنا شروع کر دیتا ہے۔ قرآن مجید میں تین قسم کی صفات بیان کی گئی ہیں صفات جمالی، صفات جلالی اور صفات کمالی۔

جمالی وہ صفات ہیں جن سے اللہ تعالیٰ کا رحم و کرم اور عفو ہونا ظاہر کرتا ہے۔ مثلاً الرحیم بار بار رحم کرنے والا الوَدُود بہت پیار کرنے والا۔ الرحمٰن بے حد رحم کرنے والا بغیر مانگے اور بغیر محنت عطا کرنے والا۔ رب پرورش کرنے والا۔ الوہاب۔ عطا کرنے والا وغیرہ وغیرہ۔

صفات جلالی جن سے اللہ تعالیٰ کا جلال جبروت حکومت اور غلبے کا اظہار ہے مثلاً الجبار: جبروت والا۔ العزیز: غالب جس پر کوئی بھی دسترس حاصل نہ کر پائے۔ المنتقم: سزا دینے والا برائیوں کی جزا دینے والا شدید العقاب سخت سزا والا۔ انہی صفات کی وجہ سے مستشرقین اور مخالفین نے اسلام پر اعتراض کیا ہے۔ اس کے متعلق یاد رکھنا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ خود فرماتا ہے۔

فرمایا: رَحْمَتِيْ وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ (اعراف 156:7) میری رحمت ہر شے پر حاوی ہے۔

قرآن مجید اللہ تعالیٰ کی اس رحمت بیکراں کی خبر دیتا ہے جو دنیا کی تمام اشیاء پر حاوی ہے جس میں مسلم، کافر، نافرمان، فرمانبردار، گناہگار سب آجاتے ہیں۔

فرمایا: كَتَبَ رَبُّكُمْ عَلٰى نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ (الانعام 54:6) تمہارے رب نے اپنے اوپر رحمت کو لازم کر لیا ہے۔

اللہ تعالیٰ کی جلالی صفات بھی اپنے اندر احسان کا پہلو لیے ہوئے ہیں یہ صفات انسان کو بدی کے ارتکاب سے روکتی ہیں کیونکہ بعض طبائع ایسی ہوتی ہیں جو خوف سے مانتی ہیں دنیا میں جتنے بھی دستور ہیں ان سب میں قانون توڑنے والوں کے لیے سزائیں مقرر کی ہیں اگر سزائیں مقرر نہ کی جائیں تو دنیا فساد کا گھر بن جائے۔ جرائم روکنے کے لیے ضروری ہے کہ سزائیں مقرر کی جائیں اسی طرح اللہ تعالیٰ نے ان انسانوں کو جو اللہ کے قوانین کو توڑتے ہیں انہیں جلالی صفات سے ڈرایا ہے۔ اس طرح یہ صفات بھی اپنے اندر رحمت اور محبت کا پیغام لیے ہوئے ہیں۔

صفات کمالی جن صفات سے اللہ تعالیٰ کی تنزیہہ بلندی کمالات کی جامعیت اور ہر قسم کے اوصاف حسنہ اور محامد عالیہ کا ثبوت ملتا ہے مثلاً اَلْوَاحِدُ (ایک) اَلْاَحَدُ (ایک) اَلْحَیُّ (ہمیشہ زندہ اور دوسروں کو زندگی بخشنے والا) الباقی (جس کو ہمیشہ بقا ہو) الحکیم (حکمت والا)

قرآن مجید ہی وہ کتاب ہے جس نے اللہ تعالیٰ کی ہر قسم کی صفات بیان کی ہیں اور جن سے اللہ تعالیٰ کی معرفت تامہ حاصل ہوتی ہے اگر اللہ تعالیٰ کی وہ جلالی صفات جن پر مستشرقین نے اعتراض کیا ہے بیان نہ کی جاتیں تو خدائی صفات میں کمی اور خامی رہ جاتی تھی۔ انجیل میں صفات الٰہیہ بیان کی گئی ہیں لیکن یہی کمی اور خامی رہ گئی ہے اگر انجیل میں جلالی صفات بیان نہیں کی گئیں تو یہ انجیل کی تعلیم کا نقص ہے۔ مستشرقین صفات الٰہیہ کا کامل علم نہ رکھنے کی وجہ سے اسلام پر اعتراض کر رہے ہیں۔

قرآن مجید کی چند آیات کا مزید ذکر کر دیا جاتا ہے۔ جن سے اللہ تعالیٰ کی محبت کا اظہار ہوتا ہے۔ جس رنگ میں انسانوں سے محبت کا اظہار کیا گیا ہے۔ وہ انجیل میں کہیں بھی نظر نہیں آتا۔

ارشادِ الٰہی ہے۔ هُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِيْمُ هُوَ الَّذِىْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْمَلِكُ الْقُدُّوْسُ السَّلَامُ الْمُؤْمِنُ الْمُهَيْمِنُ الْعَزِيْزُ الْجَبَّارُ الْمُتَكَبِّرُ (الحشر 23,22:59) وہ بے انتہا رحم کرنے والا بار بار رحم کرنے والا وہی اللہ ہے اس کے سوا کوئی معبود نہیں بادشاہ، پاک سلامتی والا امن دینے والا، نگہبان، غالب بگڑے کو بنانے والا، سب بڑائیوں کا مالک ہے۔

دوسری جگہ آتا ہے۔ نَبِّئْ عِبَادِىْ اَنِّىْ اَنَا الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ (حجر 49:15) میرے بندوں کو خبر دے دو کے میں بخشنے والا رحم کرنے والا ہوں۔

فرمایا: قُلْ يٰعِبَادِىَ الَّذِيْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰى اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ اِنَّ اللّٰهَ يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِيْعًا اِنَّهٗ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ (زمر 53:39) کہہ اے میرے بندو جنہوں نے اپنی جانوں پر ظلم کیا ہے اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہوں اللہ سبھی گناہ بخش دیتا ہے ہاں وہ بخشنے والا رحم کرنے والا ہے۔

مذکورہ آیات انسانوں سے اللہ تعالیٰ کی محبت اور پیار کو اس رنگ میں ظاہر کرتی ہیں جس کی مثل دنیا کی کسی سماوی کتب میں نہیں پائی جاتی۔ اس کے علاوہ بے شمار آیات ہیں جن میں انسانوں سے محبت کا اظہار کیا گیا ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ (مائدہ) اللہ نیکی کرنے والوں سے پیار کرتا ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ التَّوَّابِيْنَ (بقرہ) خدا توبہ کرنے والوں سے پیار کرتا ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَوَكِّلِيْنَ (ال عمران) خدا توکل کرنے والوں کو پیار کرتا ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ (مائدہ) اللہ انصاف کرنے والوں سے محبت کرتا ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِيْنَ (توبہ) اور پرہیزگاروں سے پیار کرتا ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَ فِىْ سَبِيْلِهٖ (صف) اور ان لوگوں سے پیار کرتا ہے جو اس کے راستہ میں لڑتے ہیں۔

اَللّٰهُ يُحِبُّ الصَّابِرِيْنَ (ال عمران) اللہ صبر کرنے والوں سے پیار کرتا ہے۔

وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُتَطَهِّرِيْنَ (توبہ) اور اللہ پاک لوگوں سے پیار کرتا ہے۔

قرآن مجید میں صرف انذاری (جلالی) صفات کا ہی ذکر نہیں جلالی (انذازی) صفات میں بیشتر رحمت اور محبت کا پہلو مضمر ہے) بلکہ اللہ کی محبت کا ذکر بھی مختلف پیرایوں میں کیا گیا ہے سورہ فاتحہ جو قرآن مجید کی پہلی سورت ہے اس کا آغاز ہی رب العالمین الرحمان الرحیم کے ساتھ کیا گیا ہے۔

گویا قرآن مجید اللہ کی محبت اور پیار کی آیات سے بھرا پڑا ہے کوئی ایک صفحہ بھی نہیں جہاں خدا کی محبت کا اظہار نہ ملتا ہو۔ اللہ تعالیٰ کی صفات کا ضابطہ اس وقت تک مکمل نہیں ہو سکتا جب تک جلالی (انذازی) صفات کا ذکر نہ ہو۔

☆......☆

محبت الٰہی (۳)

اعتراض: عیسائی عقائد کے مطابق مسیح کا عشق اس دنیا میں بنی نوع انسان کی محبت کے لیے آنا اور نوع انسان کی خاطر اپنے تئیں قربان کر دینا تھا کیا بانی اسلام کا عشق ان دونوں معنوں میں ظاہر ہو سکتا ہے یا نہیں؟ یا محبت اور قربانی کے علاوہ کسی اور بہتر الفاظ میں اس مشن کو ظاہر کر سکتے۔ (سراج الدین عیسائی کے چار سوالوں میں سے پہلا سوال)

جواب: عیسائی مشینری محبت الٰہی کو سامنے رکھ کر مختلف انداز اور مختلف پیرایوں میں عیسائیت کی خصوصی امتیازات اور خوبیوں کا اظہار کر کے اسلام کی تعلیم کی تنقیص کرتے ہیں دو انداز پہلے بیان کیے جا چکے ہیں یہ تیسرا انداز ہے۔ اس اعتراض کا تجزیہ عیسائیت کے عقیدہ کفارہ کو مدنظر رکھ کر کیا جائے۔ تو اس سوال کا مفہوم یہ ہے کہ یسوع مسیح اس دنیا میں اس لیے آیا تھا کہ عاصیوں، گناہ گاروں سے محبت کرے ان کے گناہوں کا بوجھ اپنے سر پر لے پھر ان ہی گناہوں کی وجہ سے صلیب دیا جائے۔ کیا اس قسم کی قربانی کا نمونہ گناہ گاروں کی نجات کے لیے قرآن مجید نے کوئی پیش کیا ہے اگر نہیں تو کیا اس سے بہتر طریق انسانوں کی نجات کے لیے قرآن نے پیش کیا ہے۔

عیسائیوں کے عقیدہ کے مطابق اس طریقہ نجات کو کفارہ کہا گیا ہے لہٰذا پہلے عقیدہ کفارہ پر مختصراً بحث کی جائے گی تا کہ قارئین پر اس اعتراض کا بودا پن واضح ہو جائے۔

کفارہ: کفارہ موجودہ عیسائیت کی عمارت کا بنیادی پتھر ہے اس اصطلاح کا مفہوم یہ ہے کہ یسوع مسیح نے صلیب پر جان دے کر تمام اپنے پیروکاروں کے گناہوں کا بوجھ اٹھا لیا ہے اور ان کے لیے نجات کا موجب بن گئے ہیں۔

عیسائیوں کے نزدیک انسان پیدائشی گناہ گار ہے آدم اور حوا نے جو گناہ کیا وہ وراثتاً ہر شخص کی فطرت میں چلا آ رہا ہے جس کی وجہ سے ہر شخص گناہ گار ہے عیسائیوں کے نزدیک نیک اعمال نجات کا موجب نہیں ہو سکتے اگر اللہ تعالیٰ بندے کے گناہ توبہ اور استغفار سے معاف کر دے تو اس کا رحم اس کے عدل کے خلاف ہے خدا رحیم ہے اس کا رحم چاہتا ہے کہ انسان سزا سے بچ جائے پھر وہ عادل بھی ہے عدل کا یہ تقاضا ہے کہ سزا ضرور دی جائے اب رحم اور عدل ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتے۔ بندے کی نجات کا ہونا ضروری ہے بندوں کو نجات دلانے کے لیے ایک صورت یہ نکالی کہ خدا کا بیٹا یسوع مسیح جو تمام گناہوں سے پاک اور معصوم ہے لوگوں کے تمام گناہوں کو اپنے اوپر لے کر جان کی قربانی دے اور سارے لوگوں کے لیے نجات کا ذریعہ ہے۔

عیسائیت کے عقیدہ کی رو سے یسوع مسیح نے گناہ گار انسانوں کے گناہوں کا بوجھ اپنے کندھوں پر لے کر صلیب پر اپنی جان قربان کر دی۔ تا کہ صلیب پر ایمان لانے والے نجات پا جائیں۔ قرآن مجید اس قسم کی کوئی قربانی پیش نہیں کرتا کہ ایک معصوم دوسروں کے گناہوں کا بوجھ اپنے کندھوں پر لے کر لعنتی موت مرے۔

لَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى (الزمر 7:39) یعنی ایک کا بوجھ دوسرا نہیں اٹھاتا۔ عیسائی بات تو عدل کی کرتے ہیں لیکن یہ عقیدہ ہی عدل کی روح کے خلاف ہے کہ ایک معصوم انسان دوسروں کے گناہوں کا بوجھ کیسے اٹھا سکتا ہے۔ جس شخص نے کوئی گناہ کیا ہے عدل کی روح

سے وہی شخص سزا کا مستحق ہوسکتا ہے دوسرا نہیں لہٰذا اسلام نے جو مذکورہ اصول مقرر کیا ہے وہی صحیح اور عین فطرت کے مطابق ہے۔

الٰہیات کا یہ ایک مسلمہ اصول ہے کہ گناہ ایک سم قاتل ہے جب گناہ کا اثر کسی کے دل پر غالب آجائے تو وہ شخص اللہ کی محبت سے محروم ہو جاتا ہے اور خدا کی رحمت سے دور ہو جاتا ہے عیسائیت نے اس سم قاتل کو زائل کرنے کے لیے کفارہ کا عقیدہ گھڑا ہے۔ جو نہ صرف فطرت انسانی کے خلاف ہے بلکہ میزان عدل کے بھی خلاف ہے۔

سراج الدین عیسائی مسلمانوں سے یہ دریافت کرتا ہے کہ اسلام نے کیا طریقہ نجات کا بیان کیا ہے۔

اسلام کا خدا ایک زندہ قادر مطلق عزیز غالب ذات ہے اس زندہ خدا نے قرآن مجید میں بنی نوع انسان کو مخاطب کر کے فرمایا ہے۔

نَبِّئْ عِبَادِیْٓ اَنِّیْٓ اَنَا الْغَفُوْرُ الرَّحِیْمُ (حجر 49:15) میرے بندوں کو خبر دے دو کہ میں بخشنے والا بار بار رحم کرن ے والا ہوں۔

دوسری جگہ آتا ہے۔ قُلْ یٰعِبَادِیَ الَّذِیْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰٓی اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ اِنَّ اللّٰهَ یَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِیْعًا اِنَّهٗ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِیْمُ (زمر 53:39) کہہ اے میرے بندو جنہوں نے اپنی جانوں پر ظلم کیا اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہوں اللہ سبھی گناہ بخشے دیتا ہے ہاں وہ بخشنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔

پھر فرمایا: کَتَبَ رَبُّكُمْ عَلٰی نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ (الانعام 54:6) تمہارے رب نے اپنے اوپر رحمت کو لازم کر لیا ہے۔

فرمایا: وَمَا رَبُّكَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِیْدِ (حم السجدہ 46:41) تیرا رب بندوں پر کچھ بھی ظلم کرنے والا نہیں۔

یہ وہ آیات ہیں جو انسانوں کے ساتھ اللہ کی محبت ظاہر کرتی ہیں۔

قرآن مجید کی مذکورہ آیات میں گناہ گار بندوں کی نجات کا ایک عمدہ اصول یہ مقرر کیا ہے کہ جب کوئی شخص فطری کمزوری کی وجہ سے کسی گناہ کا ارتکاب کرے تو وہ اپنے کردہ گناہ پر نادم اور پشیمان ہو کر آستانہ الوہیت پر گر جائے اور اپنے گناہوں کی معافی خدا سے مانگے تو اللہ تعالیٰ اپنی صفت غفوریت کے تحت اس کے گناہ بخش دے گا گناہوں کی بخشش کا کتنا عمدہ طریقہ توبہ اور استغفار بیان کیا ہے۔ غرض گناہ کے دور کرنے کا علاج صرف توبہ اور استغفار ہے۔ جب ایک انسان سچے دل سے خدا کے آستانہ پر گر جاتا ہے تو اللہ تعالیٰ غفاریت کی چادر میں لپیٹ لیتا ہے۔ تو اس کے گناہ کا زہر زائل ہو جاتا ہے تو انسان از سر نو ایک نئی زندگی پاتا ہے اور خدا کی راہ پر گامزن ہو جاتا ہے اور خدا کا قرب حاصل کر لیتا ہے۔ قرآن مجید نے گناہوں کے زہر کو دور کرنے کا ایک طریقہ یہ بیان کیا ہے۔

اِنَّ الْحَسَنَاتِ یُذْهِبْنَ السَّیِّئَاتِ کہ نیکیاں بدیوں کے زہر کو دور کر دیتی ہے یعنی جب انسان نیکیوں کے رستہ پر گامزن ہوتا ہے اور اعمال صالحہ بجا لاتا ہے تو یہ اعمال صالحہ برائیوں کے بد اثرات کو دور کر دیتے ہیں۔ حدیثوں میں اس کی کئی مثالیں پائی جاتی ہیں ایک دفعہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ایک کسبی کو اللہ تعالیٰ نے ایک پیاسے کتے کو پانی پلانے کی وجہ سے معاف کر دیا۔ پیاسے کتے کو پانی پلانے کی نیکی نے اس کسبی عورت کے تمام گناہوں کی میل سے صاف کر دیا۔

اسی طرح پانچ نمازوں کو نہر میں پانچ دفعہ نہانے سے تشبیہ دی ہے اگر ایک شخص جاری نہر میں دن میں پانچ دفعہ غسل کرے تو اس کے جسم پر میل نہیں رہتی اسی طرح جب ایک شخص پانچ دفعہ نماز ادا کرتا ہے تو اس کے گناہوں کی میل دھل جاتی ہے۔ (بخاری 6:9)

......☆......

موحد لوگوں سے جہاد کیوں کیا گیا ہے؟

اعتـــراض :اگر اسلام کا مقصد توحید کی طرف آدمیوں کو رجوع کرنا ہے تو کیا وجہ ہے کہ آغاز اسلام میں یہودیوں کے ساتھ جن کی الہامی کتابیں توحید کے سوا اور کچھ نہیں سکھاتیں جہاد کیا گیا؟ یا کیوں آج کل یہودیوں یا توحید کے ماننے والوں کی نجات کے لیے مسلمان ہونا ضروری سمجھا جائے۔(سراج الدین عیسائی کے چار سوالوں میں سے دوسرا سوال)

جواب :جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے دعویٰ نبوت کیا تو اس وقت یہود کیا تمام مذاہب توحید سے دور جا پڑے تھے۔عیسائیوں کے نقش قدم پر چل کر عزیر کو خدا کا بیٹا بنا لیا تھا۔قرآن مجید نے یہودیوں پر توحید سے برگشتہ ہونے کا یہی الزام لگایا تھا۔ارشاد الٰہی ہے۔ وَقَالَتِ الْيَهُودُ عُزَيْرٌ ابْنُ اللَّهِ (توبہ 30:9) یہود نے کہا کہ عزیر اللہ کا بیٹا ہے۔اس کے ساتھ وہ درویشوں اور راہبوں کی بھی پوجا کرتے تھے اور ان کو اربابًا من دون اللہ بنا رکھا تھا۔الٰہیات کا یہ ایک مسلمہ اصول ہے کہ جب انسان کا دل خدا کی توحید سے خالی ہو جائے تو وہ شیطانی غلبہ کے نیچے آ جاتا ہے پھر وہ گناہوں کی دلدل میں اس قدر پھنس جاتا ہے جس سے نکلنا مشکل ہو جاتا ہے یہی وجہ ہے یہود صرف توحید سے ہی محروم نہیں تھے بلکہ وہ ہر قسم کے گناہ میں مبتلا تھے۔کوئی معاشرتی برائی ایسی نہ تھی جو ان میں نہ پائی جاتی تھی۔مکر وفریب دنیا پرستی اور جاہ طلبی میں حد سے بڑھ چکے تھے ریا کاری ان کی فطرت ثانیہ تھی یہ ایک مسلمہ تاریخی حقیقت ہے کہ یہودیوں کے دل توحید سے خالی تھے۔

توحید کے علاوہ دوسرا مرض یہود میں یہ پیدا ہو چکا تھا کہ وہ خدا کا اصل نام ہی بھول گئے تھے کیونکہ بابلی طالمود کی رو سے اس کی تلاوت منع کر دی گئی تھی۔سو یہاں تک کہ کاہن برکت دیتے وقت بھی خدا کا نام نہیں لے سکتا یعنی 270 ق۔م سے نہایت سختی سے اس پر عمل درآمد ہوا۔(طالمود یوروشلم یوم 7:3) یہود خدا کے اصل نام کی بجائے اودنئی یا ایلوہیم کے الفاظ پڑھتے تھے یہی وجہ ہے یہود میں صحیح تلفظ میں شدید اختلاف ہے۔یَھَوَوَہ، یَھْوِ، یَھَوَ انسائیکلوپیڈیا ببلیکا میں اس کا صحیح تلفظ یَھْوِ بتایا ہے۔لفظ یَھْوِ ایوالڈ (Ewald) کے خیال میں یَا ھُوَ کی مختصر شکل ہے۔(اے وہ جو ہے)

جب یہود خدا کا اصل نام ہی بھول چکے تھے تو ان کے دل میں خدا کی عظمت اور خوف کا مٹ جانا لازمی تھا۔خوف الٰہی نہ ہونے کی وجہ سے یہود ہر برائی میں مبتلا ہو گئے تھے۔

لہٰذا سراج الدین عیسائی کا یہ کہنا کہ یہودیوں کے ساتھ جن کی الہامی کتابیں توحید کے سوا کچھ نہیں سکھاتیں غلط ہے۔یہود، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد نبوت کے وقت توحید سے دور جا پڑے تھے۔یہاں تک کہ وہ خدا کا نام بھی بھول چکے تھے۔

ہر مذہب کی آسمانی کتاب ہی اس کی تعلیم کا اصل ماخذ ہوتی ہے وہیں سے ہر کوئی روشنی حاصل کرتا ہے۔جب یہود کی کتاب تورات کا تاریخی مطالعہ کیا جائے تو تاریخ بتاتی ہے کہ تورات مختلف ادوار میں سات دفعہ تلف ہوئی اور مرتب کی گئی۔جب تورات ہی اصل شکل میں موجود نہیں۔تو وہ توحید کا کیا سبق دے گی۔

تورات جس زبان میں نازل ہوئی اس زبان کا نسخہ کسی کے پاس موجود نہیں اس کے ساتھ جب موجود بائبل کا مطالعہ کیا جائے تو انبیاء

علیہم السلام پر اس قسم کے گندے اور فحش الزام لگائے گئے ہیں جن کا مطالعہ ذوق سلیم پر گراں گزرتا ہے۔

حضرت نوح علیہ السلام کے متعلق آتا ہے کہ ''اور نوح کاشتکاری کرنے لگا اور اس نے ایک انگور کا باغ لگایا اس نے اس کی مے پی اور اسے نشہ آیا اور وہ اپنے ڈیرہ میں برہنہ ہو گیا۔'' (پیدائش باب 9 آیات 19 تا 25)

حضرت لوط علیہ السلام کے متعلق آتا ہے۔

''اور لوط ضغر سے نکل کر پہاڑ پر جا بسا اور اس کی دو بیٹیاں اس کے ساتھ تھیں کیونکہ اسے ضغر میں بستے ڈر لگا اور وہ اس کی دونوں بیٹیاں غار میں رہنے لگے تب پلوٹھی نے چھوٹی سے کہا کہ ہمارا باپ بوڑھا ہے اور زمین پر کوئی مرد نہیں جو دنیا کے دستور کے مطابق ہمارے پاس آئے ہم اپنے باپ کو مے پلائیں اور اس سے ہم آغوش ہوں تا کہ اپنے باپ سے نسل باقی رکھیں سو انہوں نے اسی رات اپنے باپ کو مے پلائی اور پلوٹھی اندر گئی اور اپنے باپ سے ہم آغوش ہوئی۔ پھر اس نے نہ جانا کہ وہ کب لیٹی اور کب اٹھ گئی۔ اور دوسرے روز یوں ہوا۔ پہلوٹھی نے چھوٹی سے کہا کہ دیکھ کل رات کو میں اپنے باپ سے ہم آغوش ہوئی آؤ آج بھی ہم اس کو مے پلائیں اور تو بھی اس سے جا کر ہم آغوش ہو۔ تا کہ ہم اپنے باپ سے نسل باقی رکھیں سو اس رات بھی انہوں نے اپنے باپ کو مے پلائی اور چھوٹی گئی اور اس سے ہم آغوش ہوئی پر اس نے نہ جانا کہ وہ کب لیٹی اور کب اٹھ گئی۔

سو لوط کی دونوں بیٹیاں اپنے باپ سے حاملہ ہوئیں اور بڑی کے ایک بیٹا پیدا ہوا اور اس نے اس کا نام موآب رکھا وہی موابیوں کا باپ ہے جو اب تک موجود ہیں اور چھوٹی کے بھی ایک بیٹا پیدا ہوا۔ اس کا نام عمی رکھا وہی بن عمیوں کا باپ ہے جو اب تک موجود ہیں۔ (پیدائش 19:31 تا 38)

حضرت داؤد پر اوریا کی بیوی سے زنا کا الزام ہے۔ (سموئیل دوم باب 11:2-5)

حضرت سلیمان، فرعون کی بیٹی کے علاوہ اجنبی عورتوں سے محبت کرتا تھا اور اس کی بیویوں نے اس کے دل کو غیر معبودوں کی طرف مائل کر دیا۔ سلیمان نے خداوند کے آگے بدی کی اور اس نے خدا کی پوری پیروی نہ کی۔ (سلاطین اول باب 11 آیات 1 تا 6 سلاطین اول باب 11 آیات 9,10)

حضرت ابراہیم علیہ السلام پر جھوٹ بولنے کی تہمت پیدائش (19:12)

حضرت اسحاق علیہ السلام پر جھوٹ بولنے کی تہمت (پیدائش۔ 9:26)

جب مقدس انبیاء علیہم السلام پر اس قسم کے سنگین الزامات لگائے گئے ہیں تو یہود کی توحید کہاں رہ گئی۔ کیا کوئی موحد نبیوں پر اس قسم کے الزامات عائد کر سکتا ہے۔ غرض کہ جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے دعویٰ نبوت کیا تو یہود توحید کی نعمت سے بالکل خالی تھے۔ اس دور کے عیسائیوں کا بھی یہی حال تھا کہ ایک کی بجائے تین خدا مانتے تھے۔ یعنی باپ بیٹا اور روح القدس۔ اس عقیدہ کو تثلیث کیا جاتا ہے۔ چنانچہ عقیدہ تثلیث کی تعبیر انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا میں ان الفاظ میں کی گئی۔

''تثلیث کے عیسائی نظریے کو ان الفاظ میں اچھی طرح تعبیر کیا جا سکتا ہے کہ باپ خدا ہے بیٹا خدا ہے اور روح القدس خدا ہے لیکن یہ مل کر تینوں خدا نہیں بلکہ ایک ہی خدا ہے اس لیے کہ عیسائی نظریئے کے مطابق ہم جس طرح ان تینوں میں سے ہر ایک اقنوم کو خدا اور آقا سمجھنے پر مجبور ہیں اسی طرح ہمیں کیتھولک مذہب نے اس بات کی ممانعت کر دی ہے کہ ہم ان کو تین خدا یا تین آقا سمجھنے لگیں۔''

جب دل توحید سے خالی ہو گا تو دل لازمی طور پر شیطان کی گرفت میں آئے گا۔ اسی وجہ سے عیسائیوں کی اخلاقی اور معاشرتی حالت دگر گوں تھی۔

یہی حال ہندومت بدھ مت، زرتشی مذاہب کا تھا۔ سب توحید سے خالی تھی۔ اس وقت رسول کریم ﷺ اس دنیا میں تشریف لائے اور لوگوں کو توحید کا سبق دیا لہٰذا رسول کریم ﷺ کے عہد مبارک میں کوئی اہل مذہب بھی توحید پرست نہ تھا۔ سب شرک کی دلدل میں پھنسے ہوئے تھے آسمانی رزق سے بکلی بے نصیب تھے۔ اسلام کی آمد بروقت تھی اور اس کا پیغام (توحید) بروقت تھا۔ اس دور کے حالات یہی تقاضا کرتے تھے اسلام نے اس دور کے تقاضوں کو پورا کیا مشرکوں کو موحد بنایا۔ وہی بت پرست آسمانی رزق سے لطف اندوز ہونے لگے۔ خدا سے ہم کلام ہونے لگے۔

دوسرا جزو: اسی اعتراض کا دوسرا اجزو یہ ہے کہ جب یہود موحد تھے تو ان سے جہاد کیوں کیا گیا؟

معترض اسلامی جہاد کی روح سے ناواقف ہے۔ اسلام نے دفاعی جنگیں لڑی ہیں۔ جب کفار نے مسلمانوں کو مکہ سے نکال دیا اور وہ مدینہ میں پناہ گزیں ہوگئے تو کفار کو مسلمانوں کی پناہ گزینی پسند نہ آئی اور وہ یہ برداشت نہ کرسکے کہ مسلمان پرامن زندگی کیوں بسر کررہے ہیں تو ان پر جنگ مسلط کردی۔ رسول کریم ﷺ کو مسلمانوں کی جان، مال اور عزت وآبرو کی حفاظت اور مدنی ریاست کی سرحدوں کے تحفظ کے لیے تلوار اٹھانی پڑی۔ تاریخ بتاتی ہے کہ مسلمانوں نے جنگوں کی پہل نہیں کی۔ بلکہ سب دفاعی جنگیں لڑی ہیں لہٰذا مسلمانوں نے یہود کے ساتھ کوئی لڑائی نہیں لڑی۔ ان پر جنگیں مسلط کردی گئی تھیں اسلام بزور شمشیر عقیدہ منوانے کا حامی نہیں ہے **لا اکراہ فی الدین** کی واضح تعلیم ہے اس تعلیم کے ہوتے ہوئے ایک مسلمان طاقت کے زور سے اپنا عقیدہ پھیلا نہیں سکتا لہٰذا اسلام نے یہود سے مذہب کے نام پر کوئی لڑائی لڑی ہی نہیں۔ سو یہ خیال کرنا ایک فریب اور دھوکا ہے کہ اسلام نے توحید کی اشاعت کے لیے لڑائیاں لڑیں لڑائیاں اس وقت لڑی گئیں جب دشمنوں نے پرامن مسلمانوں پر ظلم کی انتہا کردی۔

تیسرا جزو : رہا سوال کہ یہودیوں کو مسلمان کرنے کی کیا ضرورت تھی وہ تو پہلے ہی موحد ہیں۔ پہلے یہ واضح کیا جاچکا ہے کہ یہود موحد نہ تھے۔ حضرت عزیر کو خدا کا بیٹا تسلیم کرتے تھے تاریخی طور پر یہ واضح ہے کہ یہود کا خدا کو ایک ماننا تو کجا وہ تو خدا کا نام تک بھول چکے تھے۔ ان کی کتاب تحریف وتبدل ہوچکی تھی مزید براں توریت کی تعلیم نامکمل تھی۔ بائبل میں مقدس انبیاء علیہم السلام پر گندے الزامات لگائے گئے تھے اسی طرح توریت میں خدا کا تصور عجیب قسم کا تھا۔ لہٰذا اس دور کے یہودیوں کو توحید کی طرف بلانا ضروری تھا۔ اس دور کے یہودی موحد نہ تھے بلکہ مشرک تھے رسول کریم ﷺ پر مشرکوں کو توحید کا سبق دینا فرض تھا۔ اس لیے رسول کریم ﷺ نے یہود کو اسلام کی دعوت دی۔ تاکہ وہ شرک کی دلدل سے نکل کر توحید کی راہ پر گامزن ہوں۔ اور خدا کا قرب حاصل کریں کیونکہ خدا کا قرب مشرک حاصل نہیں کرسکتا۔

......☆......

انجیل کی موجودگی میں قرآن کیوں نازل کیا؟

اعتراض: اگر عیسیٰ بھی خدا کا رسول ہے تو اس کی تعلیم کے برعکس خدا نے قرآن کیوں نازل کیا اور قرآن کے برعکس انجیل کیوں اتاری پس ثابت ہوا کہ یہ دونوں کتابیں کلام اللہ نہیں (ستیارتھ پرکاش سوال نمبر 138)

جواب : پہلے یہ جواب دیا جاچکا ہے کہ دیگر مذاہب کی موجودگی میں اسلام کی کیوں ضرورت ہوئی۔ یہ اعتراض بھی تقریباً اسی نوعیت کا ہے معترض نے یہ بیان کیا ہے۔ چونکہ قرآن اور انجیل ایک دوسرے کے خلاف ہیں دونوں دعویٰ کرتی ہیں وہ خدا کی طرف سے ہیں پھر تضاد کیوں۔ جبکہ تضاد واضح ہے کہ لہٰذا دونوں کتب خدا کی طرف سے نہیں۔

معترض کو پہلے یہ جان لینا ضروری ہے حضرت عیسیٰ علیہ السلام خدا کے پیغمبر تھے۔ ان پر وحی نبوت نازل ہوئی۔ جس کو قرآن مجید نے انجیل کا نام دیا ہے۔ انجیل حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر نازل ہوئی اور حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم پر قرآن مجید نازل ہوا ان دونوں میں کوئی اختلاف نہیں حضرت عیسیٰ علیہ السلام بھی توحید کا پیغام لے کر آئے تھے اور حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم بھی توحید کا پیغام لے کر آئے تھے۔

فرق صرف یہ ہے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تعلیم اس دور کے تقاضوں کے مطابق تھی اور مکمل نہیں تھی۔ وہ تعلیم ہر دور کے تقاضوں کو پورا نہیں کرتی تھی۔ دوم: حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا پیغام صرف بنی اسرائیل کے لیے تھا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام خود فرماتے ہیں۔ غیر قوموں کی طرف نہ جانا اور سامریوں کے کسی شہر میں داخل نہ ہونا بلکہ اسرائیل کے گھرانے کی کھوئی ہوئی بھیڑوں کے پاس جانا۔ (متی 6,5:10) جبکہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا پیغام عالمگیر تھا۔ ارشاد الٰہی ہے۔ اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ لِّلْعٰلَمِيْنَ یہ کتاب (قرآن مجید) سب جہانوں کے لیے نصیحت ہے۔

دوسری جگہ آتا ہے۔ وَمَا اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا (سبا34:28) اے رسول ہم نے تجھے تمام جہانوں کے لیے بشر اور نذیر بنا کر بھیجا ہے۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں۔ كَانَ النَّبِيُّ يُبْعَثُ اِلٰى قَوْمِهٖ خَاصَّةً وَبُعِثْتُ اِلَى النَّاسِ عَامَّةً (كَافَّةً) (صحیح بخاری و صحیح مسلم) مجھ سے پہلے نبی صرف اپنی قوم کی طرف بھیجے گئے لیکن میں تمام لوگوں کی طرف بھیجا گیا ہوں۔

گو تمام انبیاء علیہم السلام ایک ہی سرچشمہ سے سیراب ہوتے تھے۔ خدا کے ہی رسول ہوتے تھے لیکن ان کا پیغام قومی ہوتا تھا اور وہ صرف مخصوص قوم کے لیے ہوتا تھا۔ اور ہر دور کے تقاضوں کو پورا کرنے والا نہیں تھا اس لیے ایک ایسے پیغام کی ضرورت تھی جو ہر لحاظ سے مکمل ہو اور وہ پیغام سب لوگوں اور سب جہانوں کے لیے ہو۔ صرف اسلام ہی ایک ایسا مذہب ہے جس نے اپنی تعلیم کو ہر لحاظ سے مکمل کہا ہے۔ ارشاد الٰہی ہے۔ اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَ اَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَ رَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا (المائدہ3:5) آج کے دن میں نے تمہارے لیے تمہارا دین مکمل کر دیا ہے اور تم پر اپنی نعمت پوری کر دی اور اسلام کو دین کی حیثیت سے میں نے تمہارے لیے پسند کیا ہے۔

قرآن مجید کے اس عقیدہ کے مطابق دین عہد بعہد دنیا کی عمر کے ساتھ مختلف انبیاء علیہم السلام کے ہاتھوں مکمل ہوتا رہا اور یہ دین رسول کریم ﷺ کے ہاتھ سے اپنے کمال کو پہنچا ہے۔

لہٰذا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا اپنے وقت پر آنا بھی درست تھا اور ان کا پیغام بھی درست تھا اور اس کے ساتھ رسول کریم ﷺ کا اپنے وقت میں آنا ضروری تھا۔ اور ان کا پیغام بھی صحیح ہے حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے توحید اور معاشرتی اور اخلاقی تعلیم دی لیکن صرف اس دور کے مطابق تھی۔ اس میں عالمگیریت نہ تھی۔ جب رسول کریم ﷺ آئے تو بنی نوع انسان کے ہر دور کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے ایک مکمل ضابطہ حیات لائے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور انجیل کی موجودگی کے باوجود ایک نئی شریعت کی ضرورت تھی کیونکہ پہلی کتب اپنے ہی پیروکاروں کے ہاتھوں سے تحریف و تبدل ہو چکی تھیں محرف اور مبدل شریعت لوگوں کی ضرورت کو پورا نہیں کر سکتی تھی اس لیے ایک ایسی شریعت کی ضرورت تھی جو محفوظ ہو اور تا قیامت محفوظ رہے سو اس ضرورت کو اسلام نے پورا کیا ہے۔ قرآن مجید صرف مکمل ضابطہ حیات ہی نہیں بلکہ ہر لحاظ سے محفوظ ہے۔

اسلامی تعلیم نے مسلمانوں کو بے رحم بنایا ہے؟ بہشت میں دودھ کی نہریں

اعتراض: اسی تعلیم نے مسلمانوں کو غدر مچانے والا سب کو ایذا پہنچانے والا خود غرض اور بے رحم بنایا ہے اگر مسلمانوں سے غیر مذاہب والے ویسا ہی سلوک کریں جیسا کہ انہوں نے غیر مذاہب والوں سے روا رکھا ہے تو مسلمانوں کے دلوں پر کیا گزرے اور خدا کی طرف داری اس سے عیاں ہے کہ خدا نے ان لوگوں کو جنہوں نے محمد صاحب کو جلا وطن کیا تھا ہلاک کر ڈالا تھا۔ اگر بہشت میں صاف پانی، دودھ، شراب، شہد کی نہریں ہیں تو وہ کس بات میں دنیا سے افضل ہیں اور کبھی دودھ کی نہریں بھی ہو سکتی ہیں؟ دودھ تو تھوڑی دیر میں بھی پھٹ جاتا ہے اسی سبب سے دانا آدمی دین اسلام کو تسلیم نہیں کرتا۔ (ستیارتھ پرکاش باب چودھواں اعتراض نمبر 140)

جواب: اسلام سراسر رحمت، محبت، احسان اور اخوت کا نام ہے۔ یہی وہ دین ہے جس نے ہر قسم کی غلامی کی زنجیروں کو توڑا اور حریت کا سبق دیا۔ انسانی حقوق کا منشور جاری کیا۔ طبقاتی تقسیم کو توہین انسانیت قرار دیا اسلام نے کسی مذہب پر ظلم کو روا نہیں رکھا۔

اسلام بحیثیت رحمت کے:

قرآن مجید میں آتا ہے۔ ثُمَّ كَانَ مِنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ وَتَوَاصَوْا بِالْمَرْحَمَةِ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْمَيْمَنَةِ (البلد 18,17:90) پھر وہ ان لوگوں میں سے جو ایمان لاتے ہیں اور ایک دوسرے کو صبر کی نصیحت کرتے ہیں اور ایک دوسرے کو رحم کی نصیحت کرتے ہیں۔ یہ خوش نصیب ہیں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں۔ لَا تُنْزَعُ الرَّحْمَةُ اِلَّا مَنْ شَقِيٍّ (ترمذی باب رحمتہ الناس) جس شخص کے دل سے رحم ہٹایا جاتا ہے وہ یقیناً بد بخت ہے۔

فرمایا: اَلرّٰحِمُوْنَ يَرْحَمُهُمُ الرَّحْمٰنُ اِرْحَمُوْا اَهْلَ الْاَرْضِ يَرْحَمُكُمُ اللّٰهُ مَنْ فِي السَّمَآءِ (ابوداؤد اور باب فی الرحمتہ) رحم کرنے والوں پر خدائے رحیم رحم کرتا ہے زمین کے رہنے والوں پر رحم کرو آسمان پر رہنے والا تم پر رحم کرے۔

فرمایا: اِنَّمَا يَرْحَمُ اللّٰهُ مِنْ عِبَادِهِ الرُّحَمَآءَ (نسائی باب الامر بالاحتساب) کہ اللہ تعالیٰ ان بندوں پر رحم کرتا ہے جو اوروں پر رحم کرتا ہے۔

فرمایا: لَا يَرْحَمُ اللّٰهُ مَنْ لَا يَرْحَمُ النَّاسَ (بخاری باب رحمتہ الناس) جو شخص بندوں پر رحم نہیں کرتا خدا اس پر رحم نہیں کرتا۔

اسلام میں رحم کی تعلیم صرف انسانوں تک محدود نہیں بلکہ ہر ذی روح رحم کے دائرہ میں شامل ہے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''اگر کوئی شخص ذبیحہ جانور پر بھی رحم کرے گا تو اللہ تعالیٰ روز قیامت اس پر رحم کرے گا۔'' (ادب المفرد باب رحمتہ البھائم)

ایک شخص نے آپ کی خدمت میں عرض کی کہ میں بکری کو ذبح کرتا ہوں تو مجھے اس پر ترس آتا ہے یا یہ کہ مجھے اس پر ترس آتا ہے کہ بکری ذبح کروں۔ فرمایا اگر تم بکری پر رحم کرتے ہو تو اللہ تعالیٰ بھی تم پر رحم کرے گا۔ (ادب المفرد باب رحم من فی الارض)

بخاری میں حضرت ابو ہریرہ سے ہے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں۔ ''ایک شخص کو سخت پیاس لگی وہ کنویں میں نیچے اترا پانی

پیا باہر نکلا تو ایک کتا دیکھا جو پیاس کی وجہ سے ہانپ رہا تھا۔ اور گیلی مٹی چاٹنے کی کوشش کر رہا تھا اس نے سوچا کہ یہ بھی میری طرح پیاسا ہے تو اس نے پانی سے اپنا موزہ بھرا منہ سے پکڑا اور کنویں سے باہر آ کر کتے کو پانی پلایا۔ اللہ تعالیٰ نے اس کے اس فعل کی قدر کی اور مغفرت فرما دی۔ لوگوں نے کہا یا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) جانوروں کے ساتھ ہمدردی سے بھی ہمیں ثواب ملتا ہے فرمایا ہر زندہ جگر والی چیز (کے ساتھ شفقت و رحم) میں اللہ تعالیٰ کے ہاں اجر ہے۔

اسلام احسان کا مذہب ہے۔ قرآن مجید میں آتا ہے۔ اِنَّ اللّٰهَ یَاۡمُرُ بِالۡعَدۡلِ وَالۡاِحۡسَانِ وَاِیۡتَآیِٔ ذِی الۡقُرۡبٰی (النحل 16:90) اللہ انصاف کا اور احسان کرنے کا اور قریبی رشتہ داروں کو دینے کا حکم دیتا ہے۔

ارشاد الٰہی ہے۔ وَاَحۡسِنۡ کَمَاۤ اَحۡسَنَ اللّٰهُ اِلَیۡكَ (قصص 28:77) اور جس طرح اللہ تیرے ساتھ احسان کیا ہے تو بھی دوسروں کے ساتھ احسان کر۔

وَالۡکٰظِمِیۡنَ الۡغَیۡظَ وَالۡعَافِیۡنَ عَنِ النَّاسِ وَاللّٰهُ یُحِبُّ الۡمُحۡسِنِیۡنَ (آل عمران 3:134) اور غصے کو دبانے والے اور لوگوں سے درگزر کرنے والے اور اللہ احسان کرنے والوں سے محبت کرتا ہے۔

هَلۡ جَزَآءُ الۡاِحۡسَانِ اِلَّا الۡاِحۡسَانُ (رحمان 55:60) بھلائی کا بدلہ سوائے بھلائی کے کچھ نہیں۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں۔ اَلۡخَلۡقُ عِیَالُ اللّٰهِ فَاَحَبُّ الۡخَلۡقِ اِلَی اللّٰهِ مَنۡ اَحۡسَنَ اِلٰی عِیَالِهٖ (البیہقی فی شعب الایمان)

ساری مخلوق اللہ تعالیٰ کا کنبہ ہے پس اللہ کو اپنی مخلوق میں زیادہ محبت ان سے ہے جو اس کے کنبے (مخلوق) سے احسان برتاؤ کرتے ہیں۔

اسلام نے دوسروں کے ساتھ رحم اور احسان کا برتاؤ کرنے کے لیے ان تمام امور سے منع کیا ہے جو دوسروں کی دل آزاری اور ذہنی کوفت کا سبب ہوتے ہیں مثلاً حقیر جاننا۔ (لقمان 31:18) عیب لگانا اور برے لقب سے پکارنا۔ (الحجرات 49:11) غیبت کرنا۔ (الحجرات 49:12) وغیرہ۔

دنیا میں صرف اسلام ہی ایک ایسا دین ہے جس نے تمام دنیا کے افراد کو اخوت کی لڑی میں منسلک کیا ہے۔ یہ وہ بلند راز ہے جو صرف اللہ تعالیٰ نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے دل پر منکشف کیا۔ ارشاد الٰہی ہے۔ یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ اتَّقُوۡا رَبَّکُمُ الَّذِیۡ خَلَقَکُمۡ مِّنۡ نَّفۡسٍ وَّاحِدَةٍ وَّخَلَقَ مِنۡهَا زَوۡجَهَا وَبَثَّ مِنۡهُمَا رِجَالًا کَثِیۡرًا وَّنِسَآءً (النساء 4:1) اے لوگو اپنے رب سے ڈرو جس نے تم کو ایک ہی اصل سے پیدا کیا اور اسی سے اس کا جوڑا پیدا کیا اور ان دونوں سے بہت سے مرد اور عورتیں پھیلائیں۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں۔ اِنَّ الۡعِبَادَ کُلَّهُمۡ اِخۡوَةٌ (بخاری) انسان سب آپس میں بھائی ہیں۔

اس تعلیم کی موجودگی میں اسلام پر دوسرے مذاہب والوں کے ساتھ ظلم و جور سے پیش آنے کا الزام وہی لگا سکتا ہے جو اسلامی تعلیم سے ناآشنا ہو اسلام ایک امن و آشتی کا مذہب ہے۔ اس کی تعلیم پر گامزن ہو کر دنیا امن کا راستہ تلاش کر سکتی ہے۔ اسلام نے صرف اس وقت دشمن کو قتل کرنے کا حکم دیا ہے جب میدان جنگ میں مسلمان دشمن فوج کے آمنے سامنے ہوں۔ ارشاد الٰہی ہے۔ فَاِذَا لَقِیۡتُمُ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا فَضَرۡبَ الرِّقَابِ حَتّٰۤی اِذَاۤ اَثۡخَنۡتُمُوۡهُمۡ فَشُدُّوا الۡوَثَاقَ فَاِمَّا مَنًّۢا بَعۡدُ وَاِمَّا فِدَآءً حَتّٰی تَضَعَ الۡحَرۡبُ اَوۡزَارَهَا (محمد 47:4) سو جب تمہاری کافروں سے مڈبھیڑ ہو جائے تو گردنیں مارنا ہے یہاں تک کہ جب تم ان پر غالب آ جاؤ تو قید میں مضبوط باندھ لو پھر بعد میں یا تو احسان کے طریق پر یا فدیہ لے کر چھوڑ دو یہاں تک کہ لڑائی اپنے ہتھیار رکھ دے۔ (لڑائی ختم ہو جائے)

اس آیت میں کسی کو قتل کرنے کی صرف ایک ہی صورت بیان کی گئی ہے کہ لڑائی میں دشمن کے ساتھ مڈبھیڑ ہو یہ صورت بین الاقوامی

قانون کے عین مطابق ہے۔ یہ قتل حفاظت خود اختیاری میں آتا ہے جب لڑائی میں غلبہ حاصل ہو جائے جو قیدی ہاتھ میں آئیں تو اس کی دو صورتیں بیان کی گئی ہیں یا احسان کے ساتھ یا فدیہ لے کر چھوڑ دیا جائے۔ قیدی کو قتل کرنا اسلام جائز قرار نہیں دیتا۔

معترض نے ایک جھوٹ بولا ہے وہ یہ کہ جنہوں نے محمد صاحب کو جلاوطن کیا تھا۔ خدا نے ان کو ہلاک کر دیا۔

تاریخ اس بات پر شاہد ہے کہ کفار مکہ نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی مکی زندگی میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ اور صحابیات پر کیا کیا ظلم کیے حتیٰ کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی قتل کرنے کا منصوبہ بنایا تو رسول کریم ﷺ نے ہجرت فرمائی۔ اگر ان دشمنوں کو جنگی جرائم کی وجہ سے قتل بھی کر دیا جاتا تو عین انصاف تھا۔ مگر انہیں ہلاک نہیں کیا گیا۔ جب مکہ فتح ہوا وہی دشمن رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے سرنگوں کھڑے تھے تو آپ نے لَا تَثْرِيبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ (تم پر کوئی گرفت نہیں) کہہ چھوڑ دیا یہ وہ رحیمانہ سلوک ہے جس کی نظیر دنیا کی تاریخ میں نہیں ملتی۔

معترض نے قرآن مجید کی آیت کا ترجمہ غلط رنگ میں بیان کیا ہے صحیح ترجمہ یہ ہے۔

''اور کتنی بستیاں تھیں جو تیری اس بستی سے جس نے تجھے نکالا طاقت میں بڑھ کر تھیں ہم نے ان بستیوں کو ہلاک کر دیا پھر ان کا کوئی مددگار نہ ہوا''

جنت کی نعمتیں:

جنت کی نعماء ''دودھ کی نہریں اور شہد کی نہریں وغیرہ'' پر مفصل بحث سیرت سید البشر حصہ سوم کے صفحہ 340 پر کر دی گئی ہے۔ اعادہ کی ضرورت نہیں۔

دنیا میں بھی دودھ اور شہد ایک نعمت غیر مترقبہ ہے جنت میں بھی جنتیوں کو یہ نعمتیں ملیں گی۔ صرف ناموں میں اشتراک ہے اور کیفیت اور نوعیت ایک جیسی نہیں۔ جنت کا پانی دودھ وغیرہ ابدالاباد تک خراب نہیں ہوگا اور نہ وہ مضر صحت ہوگا وہاں کی شراب میں سرور اور خوشی تو ہوگی لیکن اس کے پینے سے بے ہوشی طاری نہیں ہوگی۔

قرآن مجید میں آتا ہے۔ مَثَلُ الْجَنَّةِ الَّتِي وُعِدَ الْمُتَّقُونَ فِيهَا أَنْهَارٌ مِّن مَّاءٍ غَيْرِ آسِنٍ وَأَنْهَارٌ مِّن لَّبَنٍ لَّمْ يَتَغَيَّرْ طَعْمُهُ وَأَنْهَارٌ مِّنْ خَمْرٍ لَّذَّةٍ لِّلشَّارِبِينَ وَأَنْهَارٌ مِّنْ عَسَلٍ مُّصَفًّى وَلَهُمْ فِيهَا مِن كُلِّ الثَّمَرَاتِ وَمَغْفِرَةٌ مِّن رَّبِّهِمْ (محمد 15:47) اس جنت کی ایک مثال ہے جس کا وعدہ متقیوں کو دیا جاتا ہے اس میں پانی کی نہریں ہیں جو بگڑ کر بدبودار نہیں ہوتا اور دودھ کی نہریں ہیں جس کا مزہ نہیں بدلتا شراب کی نہریں ہیں جو پینے والوں کے لیے باعث لذت ہے صاف کیے ہوئے شہد کی نہریں اور ان کے لیے اس میں ہر قسم کے پھل ہیں اور ان کے رب کی طرف سے مغفرت ہے۔

مذکورہ آیت میں لفظ مثل ظاہر کرتا ہے کہ جنت کی نعماء بطور مثال بیان ہوئی ہیں جنت کی نعماء اور اس دنیا کی نعماء میں صرف نام کا اشتراک ہے حضرت ابن عباس سے ابن کثیر روایت کرتے ہیں لَا يَشْبَهُ فِي مِمَّا فِي الْجَنَّةِ مَافِي الدُّنْيَا إِلَّا فِي الْأَسْمَآءِ یعنی جو چیزیں جنت میں ہیں وہ دنیا کی کسی چیز سے سوائے نام کے مشابہت نہیں رکھتیں۔

قرآن مجید میں اس کی صراحت کر دی گئی ہے ارشاد الٰہی ہے۔ فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّا أُخْفِيَ لَهُم مِّن قُرَّةِ أَعْيُنٍ (السجدہ 17:32) بس کوئی شخص نہیں جانتا کہ ان کے لیے کیسی آنکھوں کی ٹھنڈک چھپا کر رکھی گئی ہے۔

صحیح بخاری میں اس آیت کی تفسیر میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ قَالَ اللّٰهُ أَعْدَدْتُ لِعِبَادِي الصَّالِحِينَ مَالَا عَيْنٌ

رَأَتْ وَلَا اُذُنٌ سَمِعَتْ وَلَا خَطَرَ عَلٰی قَلْبِ بَشَرٍ (بخاری) اللہ تعالیٰ نے کہا ہے میں نے اپنے نیک بندوں کے لیے ایسی نعمتیں تیار کی ہیں جس کو نہ کسی آنکھ نے دیکھا ہے نہ کسی کان نے سنا ہے نہ کسی شخص کے دل میں اس کا خیال گزرا ہے۔ ایک مرتبہ فرمایا: **مالم یسمعه ملكٌ مقربٌ** انسان تو کجا کسی بڑے سے بڑے مقرب فرشتہ نے بھی ان بہشتی نعمتوں کا سنا تک نہیں۔

پس دنیا کی نعمتوں اور آخرت کی نعمتوں میں صرف نام میں اشتراک ہے۔ ان کی کیفیت اور نوعیت بالکل الگ ہے۔ بہشت کے باغ نہریں وغیرہ ایسے نہیں جو اس دنیا میں ہیں وہ بالکل الگ چیزیں ہیں اور ان کی کیفیت اور ہے۔

درحقیقت بات یہ ہے کہ جس چیز کو انسان نے کبھی دیکھا تک نہ ہو اسے سمجھانے کے لیے دیکھی ہوئی چیزوں کی مثال دینی پڑتی ہے خواہ وہ مثال کتنی ہی ناقص کیوں نہ ہو۔

اس لیے معترض کا اعتراض بودا ہے۔ اس نے جنت کی نعمتوں کو دنیا کی نعمتوں پر قیاس کر کے اعتراض کر دیا ہے۔

الزامی جواب: اہل ہندو دھرم نے دراوڑی قوموں اور اچھوتوں پر جو مظالم وید کے زمانے سے لے کر اب تک کیے ہیں تاریخ عالم میں اس کی مثال نہیں ملتی۔ یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس کا اقرار نہ صرف آریہ بلکہ غیر آریہ سب نے کیا ہے کیا رام چندر جی نے شمبوک شودر کو خدا کی عبادت کرنے کے جرم میں قتل نہیں کیا تھا۔ وید ظالمانہ احکام سے بھرے پڑتے ہیں۔ چند حوالے ملاحظہ کیجیے۔

دھرم کے مخالفوں کو زندہ آگ میں جلا دو۔ (یجر وید ادھیا 13 منتر دیانند بھاش)

دشمنوں کے کھیتوں کو اجاڑ و یعنی گائے بیل بکری اور لوگوں کو بھوکا مار کر ہلاک کر دو۔ (حوالہ مذکور منتر 13)

اپنے مخالفوں کو درندوں سے پھڑوا ڈالو۔ (یجر وید 19,17,15)

جس طرح بلی چوہے کو تڑپا تڑپا کر مارتی ہے اسی طرح ان کو تڑپ کر مارو۔ (یجر وید 65:16)

اے اندر دیوتا! تو غیر ویدک دھرمیوں کو کب یوں کچل کر تباہ کرے گا جیسے چھتری وار پھول کو پاؤں سے کچل کر تباہ کر دیا جاتا ہے اے اندر تو کب ہماری ان دعاؤں کو سنے گا۔ (سام وید اترارچک ادھیائے 10 منتر 3)

ویدوں پر اعتراض کرنے والوں کو ملک سے باہر نکال دو (ادھیائے اشلوک 11) ہندو دھرم میں سب سے ظالمانہ تعلیم معاشرتی طبقاتی تقسیم ہے جس کی رو سے معاشرہ کو چار طبقوں میں تقسیم کیا گیا ہے برہمن، کشتری، ویش اور شودر، شودر کو سب انسانی حقوق سے محروم کر دیا گیا ہے اور اس کا ایک ہی یہ فرض ہے کہ تینوں ذاتوں کی خدمت کرے۔ شودر ہندو معاشرہ میں ذلیل ترین طبقہ ہے ان کے لیے مندر سکول کنویں اور چشمے الگ کر دیئے گئے اور اس راہ پر نہیں چل سکتے جس راہ پر اعلیٰ ذات کا ہندو چل رہا ہے۔

......☆......

قرآن کی تعلیم طبعی اصولوں کے خلاف ہے دوم جنت اور دوزخ پر تمسخر اڑایا گیا ہے

اعتراض: قرآن کے مصنف کا تماشہ دیکھیے زمین تو ہمیشہ حرکت کرتی ہے اور آئندہ حرکت کرتی رہے گی قرآن کا مصنف اسے ساکن سمجھتا ہے بھلا پہاڑ کیا جانوروں کی مانند اڑیں گے؟ اگر پہاڑوں کے ٹکڑے چھوٹے چھوٹے کیڑے بن جائیں گے تو پھر بھی ان کا لطیف جسم قائم رہے گا۔ پھر ان کا دوسرا جنم کیوں نہیں مانتے اور خدا بھی مجسم معلوم ہوتا ہے ورنہ کسی کا اس کے دائیں بائیں کھڑے ہونا کیا معنی رکھتا ہے۔ جڑاؤ تختوں کی موجودگی ظاہر کرتی ہے کہ

بہشت میں بڑھئی اور سنار بھی ہوں گے اور رات کو کھٹمل کاٹتے ہوں گے اور بہشتیوں کو سونے نہ دیتے ہوں گے کیا وہاں لوگ تکیئے لگا کر بیکار بیٹھے رہتے ہیں یا کچھ کیا کرتے ہیں اول الذکر صورت میں کھانا ہضم کیوں کر ہوگا اور بیمار ہو کر جلدی مر بھی جاتے ہوں گے۔ آخر الذکر حالت میں بہشت بھی اس دنیا کی مانند ہو جاتا ہے۔ اس میں کچھ خصوصیت نہیں رہتی جیسے یہاں سخت مزدوری کی جاتی ہے ویسے ہی وہاں کرنی پڑتی ہے جوڑے وہاں رہتے ہیں ان کے ماں باپ اور ساس سسر بھی وہیں رہتے ہوں گے۔ تب تو بہت بھاری آبادی ہوگی۔ اور بول و براز کی کثرت سے بیماری بھی از حد ہوتی ہوگی اور پرندوں اور جانوروں کا گوشت بھی وہاں کھایا جاتا ہے اس لیے وہاں جانور بھی ذبح کیے جاتے ہوں گے اور جا بجا ہڈیاں پڑی ہوں گی اور قصابوں کی دکانیں بھی ہوں گی۔ واہ صاحب! آپ کے بہشت کی تعریف زبان سے باہر ہے ملک عرب سے عجیب تر بہشت کا نظارہ ہے اور چونکہ گوشت شراب کا استعمال کر کے لوگ وہاں مست رہتے ہوں گے اس لیے اچھی اچھی عورتیں اور لونڈے بھی ضرور چاہئیں ورنہ نشہ بازوں کے سر میں گرمی چڑھ جائے اور سودا پیدا کر دے بہت سے مرد و زن کے بیٹھنے اور سونے کے لیے بڑے بڑے بچھونے بھی ضروری ہیں خدا جب کنواریوں کا بیاہ تو یہاں سے گئے ہوئے امیدواروں سے ہوگا مگر کنوارے لڑکوں کے بیاہ کا انتظام خدا نے کچھ بھی نہ کیا، کیا وہ بھی کنواریوں کے ساتھ مذکورہ بالا امیدواروں کے ہی حوالہ کیے جائیں گے اس بارہ میں خدا کی طرف سے کسی حکم کا نہ ہونا خدا کی غلطی پر دلالت کرتا ہے اور عورتوں اور مردوں کا ہم عمر ہونا بھی مناسب نہیں کیونکہ (علم طب کی رو سے) مرد کی عمر عورت کی نسبت دگنی یا اڑھائی گنی ہونی چاہیے۔ یہ تو بہشت کا تذکرہ ہوا اب دوزخ کا بیان کرتے ہیں وہاں رہنے والوں کو تھوہر کا درخت کھا کر پیٹ بھرنا ہوگا۔ پس کانٹے دار درختوں کی موجودگی دوزخ میں ثابت ہوگئی اور گرم پانی بھی وہاں ہوگا کیونکہ دوزخی وہی پیئیں گے اس قسم کے عذاب دوزخ میں ہوں گے۔ چونکہ قسم کھانا عموماً جھوٹوں کا کام ہے سچوں کا نہیں اس لیے خدا کی قسم کھانا خدا کو جھوٹا ثابت کرتا ہے۔ (ستیارتھ پرکاش اعتراض 141 دیانند نے یہ اعتراض الواقعہ کی آیات 4 تا 9 اور 15 تا 23 آیات 34 تا 37 اور آیات 53 تا 54 پر کیا ہے)

جواب: معترض دیانند سرسوتی نے زمین کے ساکن ہونے کا اعتراض کیا۔ جبکہ زمین حرکت کرتی ہے اور آئندہ بھی حرکت کرتی رہے گی۔ قرآن مجید میں کہیں بھی زمین کے ساکن ہونے کا ذکر نہیں کیا قرآن مجید کی جس آیت سے زمین کے ساکن ہونے کا استنباط کیا ہے وہ سرسوتی صاحب کا عربی زبان سے ناواقف ہونے کا نتیجہ ہے۔

قرآن مجید کی یہ آیت ہے۔ اِذَا رُجَّتِ الْاَرْضُ رَجًّا (الواقعہ 4:56) جب زمین سخت حرکت سے ہلے گی رج کے معنی کسی چیز کو ہلانا اور اسے اضطراب دینا ہے۔ اس آیت کریمہ سے کیسے یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ زمین ساکن ہے۔ زمین متحرک ہے اس کی حرکت کے باوجود جب طبعی طور پر زلزلہ آتا ہے تو زمین کے اوپر کی تہہ میں زبردست جنبش آ جاتی ہے اور زمین تہ و بالا ہو جاتی ہے کیا اس طبعی حرکت سے یہ نتیجہ نکالا

جا سکتا ہے کہ زمین ساکن تھی۔ زمین کے حرکت کے باوجود زلزلہ آیا۔ زمین ہل گئی۔ بعض اوقات اس ہلنے سے بہت مالی اور جانی نقصان بھی ہو جاتا ہے۔ لہٰذا زمین کی طبعی حرکت سے یہ نتیجہ نہیں نکالا جا سکتا کہ زمین ساکن ہے اس آیت میں کسی وقت زمین کے زبردست ہلنے کا ذکر کیا ہے اس قسم کی طبعی تبدیلیاں آتی رہتی ہیں۔

معترضین کی توجہ ''ارض'' کے لغوی معنی کی طرف دلاتا ہوں۔ عربی زبان میں ارض کے مصدری معنی الراعدة یعنی کانپنا یا الدوار یعنی چکر کھانا آتے ہیں۔ (تاج العروس) اور ارض کے مصدری معنی خود اس بات کو واضح کرتا ہے کہ زمین حرکت یا چکر کھاتی ہے۔ زمین کو عربی زبان میں یونہی ارض نہیں کہا گیا۔ بلکہ اس کو ایک محور کے ارد گرد چکر لگانے کی وجہ سے ہی لفظ ارض سے پکارا گیا ہے۔

جب رگ وید کو پڑھا جائے تو وہاں یہ ضرور معلوم ہوتا ہے کہ زمین ساکن ہے ''تیرے حکم سے آسمان زمین اور پہاڑ ساکن ہیں۔ (رگ وید منڈل 3 سوکت 3 منتر 4)

اگر دیانند صاحب زمین کے کانپنے اور ہلنے کو گردش زمین کے خلاف سمجھتے ہیں یہی مضمون وید منتر میں موجود ہے۔ ''اے اندر تم روشن ہو تمہارے پیدا ہونے پر آسمان تمہارے غصہ کے ڈر سے کانپ گیا اور زمین بھی ہل گئی۔'' (رگ وید منڈل 4 سوکت 17 منتر 2) یہ بھی عجیب نکتہ ہے منتر میں لفظ ریجت آیا جبکہ قرآن مجید میں رُجَّت کا لفظ آیا ہے۔

پہاڑوں کا اڑنا:

قرآن مجید میں پہاڑوں کے اڑنے کا ذکر ہے کہ پہاڑ اس طرح اڑیں گے جیسے ایک زبردست زلزلہ یا آتش فشانی سے اڑا کرتے ہیں۔ قرآن مجید کے الفاظ ہیں۔ وَبُسَّتِ الْجِبَالُ بَسًّا فَكَانَتْ هَبَآءً مُّنْبَثًّا (الواقعہ 6,5:56) اور پہاڑ ٹوٹ کر ٹکڑے ٹکڑے ہو جائیں گے پس وہ اڑتا ہوا غبار ہو جائیں گے۔

قرآن مجید میں کہیں یہ ذکر نہیں ہے پہاڑوں کے جانور یا کیڑے بن جائیں گے کسی عظیم واقعہ سے پہاڑوں کا ریزہ ریزہ ہو جانے کا ذکر ہے۔ یہ عین ممکن ہے کہ دور حاضر میں جس زبردست طاقت کے بم تیار کیے گئے ہیں کسی ملک کے پہاڑ پر گرایا جائے تو وہ پہاڑ ریزہ ریزہ ہو جائے۔ لہٰذا پہاڑوں کا کسی طبعی واقعہ یا بم باری سے ریزہ ریزہ ہو جانا عین ممکن ہے۔

دنیا میں سبھی واقعات ہوتے رہتے ہیں آخر یہ پہاڑ کسی طبعی واقعہ کا نتیجہ ہیں اور کسی طبعی واقعہ سے ریزہ ریزہ بھی ہو سکتے ہیں جس قادر مطلق کے حکم سے یہ پہاڑ کھڑے کیے گئے ہیں اسی طرح اس کے حکم سے ریزہ ریزہ بھی ہو سکتے ہیں۔

تیسرا جزو جنت کی نعماء:

معترض نے جنت کی نعماء کو اس دنیا کی نعمتوں پر قیاس کر لیا ہے اس کی وضاحت سیرت سید البشر حصہ سوم میں بھی کی ہے پچھلے اعتراض کے جواب میں بھی اختصار کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے۔ کہ جنت کی نعمتوں اور اس دنیا کی نعمتوں میں صرف نام میں اشتراک ہے۔ جنت کی نعمتوں کی کیفیت اور نوعیت کو کوئی نہیں جانتا۔ تمام مذاہب کے بانیوں نے جنت کی نعمتوں کے مفہوم کو لوگوں کے دل و دماغ میں بٹھانے یا قریب ترلانے کے لیے اس دنیا کی نعمتوں کے ساتھ تشبیہ دی ہے۔

دائیں اور بائیں ہاتھ والوں اور جنت کے تختوں سے مراد:

قرآن مجید اپنی فصاحت و بلاغت کے لحاظ سے اسی وجہ سے بے مثل ہے کہ وہ اپنے مضمون میں اعلیٰ امثلہ سے واضح کرتا ہے۔ قرآن مجید میں برکت والوں کو اصحاب الْمَيْمَنَة کہا ہے جب بد بخت لوگوں کو اصحاب المشئمة کہا ہے۔ قرآن مجید میں کہیں بھی خدا کے دائیں بائیں

کھڑے ہونے کا ذکر نہیں۔ معترض کے ذہن کی اپنی اختراع اور کم علمی ہے۔

جس طرح جنتیوں کے لیے بہشت میں ہر قسم کی نعمتیں ہوں گی اسی طرح دوزخ میں دوزخیوں کے لیے اذیت دینے والی چیزیں ہوں گی تھوہر کا درخت اور ابلتا ہوا پانی اس سے مراد روحانی امراض کا علاج ہے۔ وجہ تشبیہ یہ ہے کہ جس طرح تھوہر سے تیار کردہ دوا اور ابلتا ہوا پانی فحش اور جنسی خطرناک بیماریوں کا علاج ہے اسی طرح وہاں روحانی بیماریوں کا علاج اذیت ناک اشیاء سے ہوگا کیونکہ علاج میں دکھ اور تکلیف کا ہونا ضروری ہے۔ معترض نے جنت میں کھٹل اور بول و براز کا ذکر کیا ہے۔ سوامی صاحب کو یہ یاد رکھنا چاہیے کہ جنت اور دوزخ کا قانون اس دنیا کے قانون کی طرح نہیں ہے۔ جس طرح دنیا میں اللہ تعالیٰ نے قانون مقرر کیے ہیں اسی طرح دوسری دنیا میں اللہ تعالیٰ کے دیگر قوانین ہوں گے جس کے تحت دوسری دنیا کا نظام چلے گا۔ وہ کیا قانون ہوں گے وہ اللہ ہی جانتا ہے۔ اُس دنیا کے قوانین کو اس دنیا کے قوانین پر قیاس نہیں کرنا چاہیے۔ اللہ ہی بہتر جانتا ہے دوسری دنیا کی زندگی کے کیا قوانین ہوں گے۔ وہاں بیاہ شادی وغیرہ نہیں ہوں گی جس سے نسل انسانی چلتی ہے صاحب عقل کے لیے یہی مناسب ہے کہ وہ آخرت کی زندگی کی کیفیت اور نوعیت کے بارے میں غور و فکر نہ کرے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے انبیاء علیہم السلام کی معرفت جتنا علم دیا ہے وہی کافی ہے۔ اس سے آگے نہیں بڑھنا چاہیے۔ جن چیزوں کی نوعیت اور کیفیت کا انسانی عقل احاطہ نہیں کر سکتی۔ ان کو ویسے ہی تسلیم کر لینا چاہیے۔ جس طرح انبیاء علیہم السلام نے خدا سے علم و معرفت پا کر بتایا ہے۔

......☆......

نطفہ کی پیدائش پر اعتراض

نطفہ خصیے میں پیدا ہوتا ہے

اعتراض: نیچرل فلاسفی کے ڈاکٹر صاف صاف دکھا سکتے ہیں کہ منی خصیے میں پیدا ہوتی ہے یہ بات غلط ہے کہ منی باپ کی پیٹھ اور ماں کے سینے میں ہو۔ جیسے قرآن میں ہے۔

جواب: یہ اعتراض قرآن مجید کی سورۃ الطارق کی اس آیت پر کیا گیا ہے۔ فَلْيَنظُرِ الْإِنسَانُ مِمَّ خُلِقَ خُلِقَ مِن مَّاءٍ دَافِقٍ يَخْرُجُ مِن بَيْنِ الصُّلْبِ وَالتَّرَائِبِ (الطارق 86:5-7) پس انسان دیکھے کہ وہ کس چیز سے پیدا کیا گیا ہے وہ اچھلتے ہوئے پانی سے پیدا ہوا ہے وہ پیٹھ اور پسلیوں کے بیچ میں سے نکلتا ہے۔

یہ آیت ظاہر کرتی ہے نطفہ صلب اور ترائب کے بیچوں بیچ سے آتا ہے صلب سخت کو کہتے ہیں اور بلحاظ سختی کے پیٹھ کی ہڈی کو صلب کہا جاتا ہے جمع اصلاب ہے ترائب جمع ہے تریبہ کی سینے کی ہڈی۔

یہ طبی تحقیق ہے کہ نطفہ اور منی شریانی خون سے بنتی ہے اور وہ شریان دل سے نکلتا ہے اور دل صعب اور ترائب کے بیچ بیچ ہے۔ یہ تو ہوا معترض کے اعتراض کا جواب کہ قرآن مجید کا بیان موجودہ طبی تحقیق کے مطابق ہے۔ اگر معترض ان آیات کے سیاق و سباق پر نظر دوڑا لیتا تو اس کو سمجھ آ جاتی کہ قرآن مجید متکبر انسانوں کو کس رنگ میں نصیحت کر رہا ہے اللہ تعالیٰ نے متکبر انسان کے عُجب کو توڑنے کے لیے یہ کہا ہے کہ وہ ذرا خالی الذہن ہو کر یہ تو سوچے کہ اس کی خلقت کس چیز سے ہوئی ہے اسی حقیر نطفہ سے پیدا ہو کر تکبر اور عُجب کرنا اس کو زیب نہیں دیتا۔ بعث بعد الموت کو خلاف عقل قرار دینے والے کو یہ سمجھایا ہے کہ انسان کی پہلی خلقت میں کیا کم قدرت کا نظارہ ہے کہ نطفہ کی ایک بوند سے رحم مادر میں

ایک خوبصورت انسان کی شکل تیار ہوگئی ہے کیا وہ قادر مطلق دوبارہ پیدا نہیں کرسکتا۔ کس بلیغ انداز سے انسان کی اصلیت کو ظاہر کر کے اس کو وعظ و پند کیا ہے اور اس کو تکبر کی برائی اور بعث بعد الموت پر ایمان لانے کی تلقین کی ہے۔

......☆......

کیا نبی اور ولی پرستش کیے جانے کی وجہ سے دوزخ میں جائیں گے؟

اعتراض :سورہ صافّات 2 رکوع گناہگار اور ان کی جورواں اور جو کچھ وہ اللہ کے سوا پوجتے ہیں مع ان کے دوزخ میں جائیں گے سب پر روشن ہے بہت لوگ انبیاء اور اولیاء کی پرستش کرتے ہیں تو کیا یہ سب اور مسیح دوزخی ہیں۔

جواب:سورہ صافات کی یہ آیت ہے جس پر اعتراض کیا گیا ہے۔ اُحْشُرُوا الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا وَاَزْوَاجَهُمْ وَمَا كَانُوْا يَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَاهْدُوْهُمْ اِلٰى صِرَاطِ الْجَحِيْمِ (الصفات 23,22:37) اکٹھا کرو انہیں جو ظلم کرتے تھے اور ان کے ساتھیوں کو اور انہیں جن کی وہ اللہ کے سوائے عبادت کرتے تھے۔ پھر انہیں دوزخ کے رستہ کی طرف لے جاؤ۔

اس اعتراض کے دو جزو ہیں پہلا جزو اَزْوَاجَهُمْ ہے معترض نے اپنی لاعلمی کی وجہ سے اس کے معنی ''جورواں'' (بیویاں) لیے ہیں۔ قرآن مجید میں لفظ ازواج صرف ''جورواں'' (بیویاں) کے معنی میں ہی استعمال نہیں ہوا بلکہ القرناء (ساتھی) کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔

سُبْحَانَ الَّذِيْ خَلَقَ الْاَزْوَاجَ كُلَّهَا مِمَّا تُنْۢبِتُ الْاَرْضُ وَمِنْ اَنْفُسِهِمْ وَمِمَّا لَا يَعْلَمُوْنَ (یٰس 36:36) بے عیب ذات ہے جس نے سب جوڑے پیدا کیے اس سے جو زمین اگاتی ہے اور ان کی اپنی جانوں سے اور اس سے جو وہ نہیں جانتے۔

ثَمٰنِيَةَ اَزْوَاجٍ مِنَ الضَّاْنِ اثْنَيْنِ وَمِنَ الْمَعْزِ اثْنَيْنِ (الانعام 143:6) آٹھ نر اور مادہ دو بھیڑوں میں سے اور دو بکریوں میں سے۔

وَاٰخَرُ مِنْ شَكْلِهٖ اَزْوَاجٌ (ص 58:38) اور کچھ اور اسی شکل کا طرح طرح کی چیزیں۔

لَا تَمُدَّنَّ عَيْنَيْكَ اِلٰى مَا مَتَّعْنَا بِهٖ اَزْوَاجًا مِنْهُمْ (حجر 88:15) تو اپنی آنکھوں کو اس طرف نہ لگا۔ جو ہم نے ان میں سے کئی قسم کے لوگوں کو چند روز سامان دیا ہے۔

فَاَخْرَجْنَا بِهٖ اَزْوَاجًا مِنْ نَبَاتٍ شَتّٰى (طٰہٰ 52:20)

پھر ہم نے اس کے ساتھ مختلف سبزیوں کے جوڑے پیدا کرتے ہیں۔

مذکورہ آیات میں ازواج کے معنی جورواں معنی کرنا ہرگز صحیح نہیں یہاں ہر جگہ ازواج کے معنی ساتھ والے (ساتھی) کے ہیں۔ ابن عباس نے اِتْبَاعَهُمْ وَمَنْ اَشْبَهَهُمْ مِنَ الظَّلَمَةِ یعنی اس سے مراد ان کے پیرو ہیں جو ظالموں میں سے ان کے مشابہ ہیں اور حضرت عمر سے اس کے معنی امثالھم مروی ہیں یعنی ان کی مثل۔

پس معترض نے ازواج کے معنی جورواں غلط کیے ہیں۔ مذکورہ آیت میں ازواج کے معنی ساتھی ہیں جو ان کے مثل اور مشابہہ ہیں لہٰذا اس آیت کا مطلب صاف ہے کہ بڑے بڑے ظالم بدکار اور ان کی جنس کے ساتھی سب کو دوزخ میں لے جاؤ۔

جزو ثانی: جو انبیاء اور اولیاء کی پرستش کرتے ہیں یہ سب اور مسیح دوزخی ہیں۔ وَمَا يَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ کی وضاحت قرآن مجید

میں دوسری جگہ کردی۔ کہ مشرک کس کی پوجا کرتے ہیں۔

ارشاد الٰہی ہے۔ اِنْ یَّدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖۤ اِلَّا شَیْطٰنًا مَّرِیْدًا یعنی وہ اللہ کے سوا سرکش شیطان کو پکارتے ہیں۔

شیطان کے فرمان کے مطابق اس کی عبادت کرتے ہیں قرنتیون کو خط 10 باب 20 غیر قومیں قربانی شیطان کے لیے کرتی ہیں نہ خدا کے لیے اور میں نہیں چاہتا کہ تم شیاطین کے شریک ہو جاؤ تم خداوند کا پیالہ اور شیاطین کا پیالہ پی نہیں سکتے۔

معترض کو یہ سمجھ لینا چاہیے کہ جو لوگ مسیح انبیاء اور اولیاء کرام کی پرستش کرتے ہیں وہ درحقیقت شیطان کی پرستش کرتے ہیں۔ انبیاء اور اولیاء کی مرضی کے خلاف شیاطین کو اپنا معبود بنائے بیٹھے ہیں۔ جن کے کہنے پر ماسوی اللہ کی جو عبادت کر رہے ہیں وہی مشرکوں کے ساتھ دوزخ میں جائیں گے یہ لوگ مسیح یا انبیاء یا اولیاء کے کہنے پر غیر اللہ کی عبادت نہیں کر رہے بلکہ شیطان کے فرمان پر غیر اللہ کی پرستش کر رہے ہیں۔ انبیاء اور اولیاء تو ان کے مشرکانہ فعل سے بیزار ہیں۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور دیگر انبیاء و اولیاء اس شرک سے بالکل بری ہیں اس لیے ان پر کوئی سزا نہیں۔ قرآن مجید میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی بریت کا ذکر ہے۔

وَاِذْ قَالَ اللّٰهُ یٰعِیْسَی ابْنَ مَرْیَمَ ءَاَنْتَ قُلْتَ لِلنَّاسِ اتَّخِذُوْنِیْ وَ اُمِّیَ اِلٰهَیْنِ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ قَالَ سُبْحٰنَكَ مَایَكُوْنُ لِیْۤ اَنْ اَقُوْلَ مَالَیْسَ لِیْ بِحَقٍّ اِنْ كُنْتُ قُلْتُهٗ فَقَدْ عَلِمْتَهٗ تَعْلَمُ مَافِیْ نَفْسِیْ وَلَاۤ اَعْلَمُ مَافِیْ نَفْسِكَ اِنَّكَ اَنْتَ عَلَّامُ الْغُیُوْبِ مَا قُلْتُ لَهُمْ اِلَّا مَاۤ اَمَرْتَنِیْ بِهٖۤ اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ رَبِّیْ وَ رَبَّكُمْ وَ كُنْتُ عَلَیْهِمْ شَهِیْدًا مَّادُمْتُ فِیْهِمْ (مائدہ 117,116:5) اور جب اللہ نے کہا اے عیسیٰ ابن مریم کیا تو نے لوگوں سے کہا تھا کہ مجھے اور میری ماں کو خدا کے سوا دو معبود بنا لو (عیسیٰ نے) کہا تو پاک ہے مجھے کہاں شایاں تھا کہ میں وہ کہوں جس کا مجھے حق نہیں۔ اگر میں نے ایسا کہا ہوتا تو تجھے ضرور اس کا علم ہوتا تو جانتا ہے جو کچھ میرے جی میں ہے میں نہیں جانتا جو تیرے جی میں ہے تو ہی غیب کی باتوں کو جاننے والا ہے۔ میں نے ان سے کچھ نہیں کہا مگر وہی جس کا تو نے مجھے حکم دیا کہ اللہ کی عبادت کرو جو میرا رب اور تمہارا رب ہے میں ان پر گواہ تھا۔

قرآن مجید نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو شرک اور کفر سے بری کر دیا ہے کیونکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے تو صرف ایک خدا کی عبادت کا حکم دیا تھا۔ اسی طرح دیگر انبیاء علیہم السلام اور اولیاء کرام نے صرف ایک خدا کی عبادت کی تعلیم دی ہے۔ ان کی تعلیم کے برعکس شیطان کی پیروی میں ماسوی اللہ کی عبادت کی ہے۔ اس وجہ سے مشرک اور شیطان ہی دوزخ کے مستحق ہیں وہی دوزخ میں جائیں گے۔

......☆......

خدا کی کرسی اور اس کا محدود ہونا

اعتراض: جو آسمان و زمین میں چیزیں ہیں وہ سب جانداروں کے آرام کے لیے خدا نے پیدا کی ہیں اپنے لیے نہیں کیونکہ اسے کسی چیز کی ضرورت نہیں جب خدا کی کرسی ہے تو وہ ایک خاص جگہ پر رہنے والا ہوا۔ جو صرف ایک جگہ محدود ہے وہ خدا نہیں کیونکہ خدا تو دیا پک (حاضر و ناظر) ہے (سیتارتھ پرکاش سوال نمبر 41)

اس اعتراض کے بھی دو اجزا ہیں جز و اول میں یہ اعتراض کیا ہے کہ دنیا و مافیہا سب چیزیں جو پیدا کی گئی ہیں وہ تو سب جانداروں کے فائدہ کے لیے پیدا کی گئی ہیں۔ اپنے لیے تو پیدا کی ہی نہیں کیونکہ اللہ کو کسی چیز کی

ضرورت نہیں جبکہ قرآن مجید میں آتا ہے۔ لَهٗ مَافِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اسی (خدا) کے لیے ہے جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے۔ گویا اللہ تعالیٰ کو ان پیدا کردہ چیزوں کی ضرورت ہے۔

یہ اعتراض بھی معترض کی نافہمی اور قرآن مجید سے عدم واقفیت کا نتیجہ ہے قرآن مجید کا یہ اصول ہے کہ کسی جگہ اختصار کے ساتھ کوئی مضمون بیان کرتا ہے پھر اس کی تفسیر دوسری جگہ کر دیتا ہے۔ قرآن مجید نے لَهٗ مَافِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ کی تشریح اس آیت سے کر دی ہے۔ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ آسمانوں اور زمینوں کا مالک ہے جو کچھ آسمانوں اور جو کچھ زمین میں ہے سب اسی کے لیے یعنی اس کی ملکیت ہے وہ سب کا مالک ہے یہاں اللہ کی ضرورت کا ذکر نہیں بلکہ اللہ کی ملکیت کا اظہار کیا گیا ہے۔ عربی میں لام ملکیت کے لیے آیا ہے چنانچہ کہا جاتا ہے ہذا المال لزید یعنی یہ مال زید کے لیے ہے۔

ہندو دھرم کی کتب یہ ظاہر کرتی ہیں کہ اس دنیا میں جو کچھ بھی پیدا کیا گیا ہے وہ سب برہمن کا ہے اور دوسرے لوگ طفیلی طور پر کھاتے ہیں۔ (منو 101:1) منہ جیسے اصلی عضو سے پیدا ہونے کے باعث سردار ہونے اور وید رکھنے سے برہمن تمام دنیا کا مالک ہے۔ (منوا:93) دنیا میں جس قدر اشیاء ہیں وہ سب برہمن کے لیے ہیں چونکہ برہمن جنم سے افضل ہے اس لیے وہ ان تمام اشیاء کا مالک ہے۔ (100:1) اتھر وید میں بھی ہے کہ برہمن کی وجہ سے تمام دنیا کی خیرات برکات اور نعمتیں ہیں اور برہمن بلکہ اس کی بیوی کی بددعا اور دکھ سے دنیا کی سب مصیبتیں ہیں۔ (اتھرو کانڈ 4)

جب ہندو دھرم کی مقدس کتب سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ دنیا میں جو کچھ ہے وہ سب برہمن کا ہے۔ اس کے طفیل دوسروں کو ملتا ہے گویا وہی تمام چیزوں کا مالک ہوا لیکن تاریخ بتاتی ہے کہ آریوں سے خدا نے ملک چھین لیا۔ تمام آریا نان جویں کے محتاج ہو گئے برہمنوں سے ان کی نعمتیں چھین لی گئیں۔ تاریخ میں آریوں کی محکومی کی داستانیں مذکور ہیں۔ ہندوستان کی تاریخ میں بھی آریاؤں کی محکومی کی داستانیں موجود ہیں۔ گویا دنیا اور مافیہا میں جو چیزیں پیدا ہیں اگر وہ برہمن کی حقیقی ملکیت ہوتیں تو ان سے اللہ تعالیٰ نہ چھینتا۔ برہمنوں سے چھن جانا یہ

ظاہر کرتا ہے وہ چیزیں ان کی ملکیت نہیں وہ سب اللہ تعالیٰ کی ہیں۔ لہٰذا جو کچھ زمین اور آسمان میں ہے وہ اللہ کی ہی ملکیت ہیں۔

جزو ثانی :اعتراض کا دوسرا جزو یہ ہے جب خدا کی کرسی ہے تو وہ خدا نہیں کیونکہ خدا تو دیا پک (حاضر و ناظر) ہے۔ قرآن مجید میں آتا ہے۔ وَسِعَ كُرْسِيُّهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ۔ معترض نے کرسی کوئی مادی چیز سمجھ لی ہے اس وجہ سے اعتراض کر دیا یہ بھی کم علمی اور جہالت کا ثبوت ہے لفظ کرسی کے معنی علم کے ہیں حضرت ابن عباس نے یہی معنی کیے ہیں۔ (تفسیر بیضاوی 255:2)

ابن جریر کے نزدیک کرسی کا اصل مفہوم علم ہے۔ جس صحیفہ میں علم کی بات لکھی ہوئی ہو اس کو کراسیہ کہا جاتا ہے اس وجہ سے علماء کو کراسی (کرسی کی جمع) کہا جاتا ہے زمخشری نے قطرب سے ایک ضرب المثل بیان کی ہے کہ خَيْرُ هٰذَا الْحَيْوَانِ الْاَنَاسِيِ وَ خَيْرُ النَّاسِ كَرَاسِيُّ (تاج العروس) حیوانوں میں سب سے بہترین انسان ہیں اور انسانوں میں سب سے بہتر علماء۔ پس اللہ کا کرسی پر بیٹھنے کا اصل مفہوم یہ ہے کہ اللہ کا علم تمام بلندیوں اور زمین پر محیط ہے یہ اللہ کی صفت علیم و خبیر کی وضاحت کی گئی ہے جو کوئی بھی کسی مذہب کا ماننے والا ہے وہ اس کا منکر نہیں ہو سکتا۔ دوم اللہ تعالیٰ کے علیم و خبیر ہونے کی وضاحت خوبصورت الفاظ اور محاورہ کے ساتھ کی گئی ہے یہی قرآن مجید کا اعجاز ہے۔

الزامی جواب :وید میں لکھا ہے وراتیہ جو مہادیو (پرماتما) ہے وہ پورا برس بھر کھڑا رہا اسے دیوتاؤں نے کہا وراتیہ تو کیوں کھڑا ہے؟ اس نے کہا میرے لیے ایک کرسی لاؤ اس کے لیے وہ ایک کرسی لائے اس کرسی پر وراتیہ چڑھا اس کرسی کا تانا رگوید کے منتر تھے اس کا بانا یجروید کے منتر تھے اور برہم سرہانہ تھا تو بیٹھنے کی جگہ سام وید کے منتر اور اُدگیتھ تکیہ تھا (اتھر وید کانڈ 15 سوکت 3 منتر 1 تا 8) ہندو معترض یہ بتا سکتا ہے کہ یہ کرسی کیا ہے۔ اگر اس حوالہ پر غور و فکر کیا جائے تو یہاں بھی اللہ کے علیم و خبیر کو مختلف انداز میں بیان کیا گیا ہے لیکن قرآن مجید کا انداز بیان اچھوتا اور نرالا انداز ہے۔ تمام مذاہب نے اللہ تعالیٰ کو علیم و خبیر کے طور پر بیان کیا ہے۔ قرآن مجید نے اپنے خاص حکیمانہ انداز میں بیان کیا ہے۔

......☆......

مسلمانوں کا خدا شعبدہ باز ہے

اعتراض :واہ واہ دیکھو جی مسلمانوں کا خدا شعبدہ بازوں کی طرح کھیل کر رہا ہے کیا ایسی ہی باتوں سے خدا کی خدائی ظاہر ہوتی ہے عقلمند لوگ ایسے خدا کو خیر باد کہہ کر کنارہ کشی کریں گے اور جاہل لوگ پھنسیں گے اس سے بھلائی کے عوض برائی خدا کے پلے پڑے گی۔ (ستیارتھ پرکاش اعتراض 43)

جواب:معترض نے اس آیت پر اعتراض کیا ہے۔ قَالَ فَخُذْ اَرْبَعَةً مِّنَ الطَّيْرِ فَصُرْهُنَّ اِلَيْكَ ثُمَّ اجْعَلْ عَلٰى كُلِّ جَبَلٍ مِّنْهُنَّ جُزْءًا یعنی چار جانور لے کر ان کو اپنے ساتھ ہلا ؤ تم ان میں سے ہر ایک کو ایک ایک پہاڑ پر رکھ دو۔

انبیاء علیہم السلام مردہ قوموں کو روحانی طور پر زندہ کرنے کے لیے آتے ہیں ان کی آمد سے قبل قومیں روحانی طور پر مردہ ہو چکی ہوتی ہیں روحانی ترقی کے تمام سوتے خشک ہو چکے ہوتے ہیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام جب خدا کا پیغام لے کر آئے اور مُردوں کو زندہ کرنے کا حکم سونپا گیا۔ یعنی مردہ قوم کو زندہ کرنے کا حکم ملا۔ تو انہوں نے حسب عادت اللہ تعالیٰ سے عرض کی یہ کام کیسے ہوگا؟ کس طریقہ سے ان کو زندہ

کروں چونکہ نبی ہر کام اللہ تعالیٰ کی ہدایت کے تحت کرتا ہے اس لیے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے مُردہ قوم کو زندہ کرنے کا طریقہ معلوم کرنا چاہا۔تو اللہ تعالیٰ نے ان کو ایک طبعی طریقہ بتایا کہ چار پرندے لو۔ان کو محبت اور پیار سے اپنی طرف ہلالو۔پھر ان کو پہاڑوں پر آزاد فضا میں رکھ دو جب تم ان پرندوں کو بلاؤ گے وہ تمہاری طرف بھاگتے آئیں گے اس مثال میں انسان کی طبعی کیفیت کا ذکر کیا ہے۔کافروں کو محبت اور پیار سے توحید کا سبق دیں۔جس طرح ہلائے ہوئے پرندے بلانے پر دوڑتے چلے آتے ہیں اسی طرح یہ کافر بھی محبت اور پیار کا جواب محبت او رپیار سے دیں گے۔ان آیات میں روحانی زندگی کا ہی طریقہ نہیں بیان کیا بلکہ معاشرتی زندگی کا بھی ایک سنہری اصول بیان کیا ہے کہ محبت اور پیار سے زندگی بسر کرنی چاہیے اس میں قوموں کی زندگی بھی ہے اوراس سے معاشرہ میں امن قائم ہوسکتا ہے۔

دیانند سرسوتی نے فَصُرْهُنَّ کا ترجمہ (پرندوں کے) گوشت کا ٹکڑا رکھ دے۔کیا ہے۔یہ بالکل غلط ہے اور عربی سے ناواقفیت ہے۔

قرآن مجید نے کس طرح جانوروں کی طبعی خصلت کا اظہار کیا ہے کہ جانور بھی محبت اور پیار کے جواب میں اپنے آپ کو مالک کے حوالے کردیتے ہیں۔یہ خصلت انسان کے اندر بدرجہ اتم موجود ہے۔

......☆......

بنی اسرائیل کے بیٹوں کا قتل کیا جانا

اعتراض: سورہ مومن 3 رکوع 26 آیت فرعون نے بنی اسرائیل کے لڑکوں کو اس لیے مارڈالا کہ وہ موسیٰ پر ایمان لائے یہ غلط ہے بلکہ فرعون نے موسیٰ سے پہلے یہودی لڑکے اس لیے مارے کہ وہ بڑھ نہ جائیں خروج 1 باب 7

جواب: اصل آیت جس پر اعتراض ہے یہ ہے۔ قَالُوا اقْتُلُوْا اَبْنَآءَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ وَاسْتَحْيُوْا نِسَآءَهُمْ وَمَا كَيْدُ الْكٰفِرِيْنَ اِلَّا فِيْ ضَلٰلٍ (مومن 25:40) انہوں نے کہا ان لوگوں کے بیٹوں کو جو اس کے ساتھ ایمان لائے ہیں قتل کرو اور ان عورتوں کو زندہ چھوڑو اور کافروں کی تدبیر رائیگاں جاتی ہے۔

آیت کے آغاز میں امر کا صیغہ اقْتُلُوْا (تم قتل کردو) یہ یاد رکھنا چاہیے صیغہ امر کسی فعل کے وقوع کو مستلزم نہیں ہوا کرتا۔اس آیت سے یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ فرعون نے انہیں قتل کرڈالا۔

آیت کا پچھلا حصہ معترض کے اعتراض کو باطل کردیتا ہے۔ وَمَا كَيْدُ الْكٰفِرِيْنَ اِلَّا فِيْ ضَلٰلٍ یعنی کافروں کا کید یعنی دھوکے اور فریب کی تدابیر اکارت ہوجانے والی ہیں۔

قرآن مجید کا یہ طرز بیان ہے کہ جب بھی کفار نے خدا کے کسی برگزیدہ بندے کی نسبت قتل یا ایذا کی تدبیر کی۔تو اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت کاملہ سے کفار کی تدبیر کو ناکام بنادیا اور برگزیدہ بندے کو کفار کی ایذا یا قتل سے محفوظ کردیا۔اللہ تعالیٰ لفظ کید سے اس کا اظہار کرتا ہے کہ کفار نے بھی ایذا یا قتل کرنے کا منصوبہ باندھا لیکن اللہ نے اپنی قدرت کاملہ سے ان کا داؤ چلنے نہ دیا۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے واقعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ کفار نے ان کو آگ کے الاؤ میں جلادینے کا ارادہ کیا لیکن اپنی حکمت اور قدرت سے بچالیا۔ وَاَرَادُوْا بِهٖ كَيْدًا فَجَعَلْنٰهُمُ الْاَخْسَرِيْنَ (الانبیاء 70:21) اور انہوں نے اس سے برائی کرنی چاہی تو ہم نے انہی کو نقصان اٹھانے والا کردیا۔

قرآن مجید نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو آگ سے محفوظ رکھنے کو مختلف الفاظ میں بیان کیا ہے ایک جگہ آتا ہے۔ قُلْنَا يٰنَارُ كُوْنِىْ

بَرْدًا وَّسَلَامًا عَلٰی اِبْرَاهِیْمَ (الانبیاء 60:21) ہم نے کہا اے آگ! ابراہیم پر ٹھنڈک اور سلامتی ہو جا۔

دوسری جگہ کہاں۔ فَاَنْجٰهُ اللّٰهُ مِنَ النَّارِ (العنکبوت 24:29) پس اللہ تعالیٰ نے ان کو آگ سے بچالیا تیسری جگہ آتا ہے۔ فَاَرَادُوْا بِهٖ كَیْدًا فَجَعَلْنٰهُمُ الْاَسْفَلِیْنَ (الصفت 93:37) سوانہوں نے اس کے ساتھ چال چلنی چاہی پر ہم نے انہی کو نیچا دکھایا۔ جب کفار مکہ نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو قتل کرنے کا منصوبہ بنایا تو اللہ تعالیٰ نے ان کے منصوبے کو ناکام بنادیا۔ ارشاد الٰہی ہے۔ اِنَّهُمْ یَكِیْدُوْنَ كَیْدًا وَّ اَكِیْدُ كَیْدًا (طارق 16,15,87) یہ بھی تدبیر میں لگے ہوئے تھے اور میں بھی ایک تدبیر کر رہا تھا۔

قرآن مجید کا یہ خاص طرز بیان ہے۔ ایسا ہی اس آیت میں ہے جس پر اعتراض کیا گیا ہے کہ فرعون نے کہا یا اپنے نائبین سے مشورہ کیا کہ مومنین (بنی اسرائیل) کے بیٹوں کو مار ڈالو لیکن فرعون اپنے ارادہ میں ناکام و خاسر رہا۔ اور بیٹوں کو قتل نہ کر پایا جیسا کہ قرآن کے یہ الفاظ۔ وَمَا كَیْدُ الْكٰفِرِیْنَ اِلَّا فِیْ ضَلٰلٍ سے ظاہر ہے کہ فرعون کا ارادہ امر وقوع میں نہیں آیا۔

......☆......

خدا کی بعض صفات پر اعتراض

اعتراض: مصنف الجواہر القرآن نے جو ایک عیسائی ہے آیت۔ هُوَ الْاَوَّلُ وَالْاٰخِرُ وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ پر یہ اعتراض کیا ہے کہ قران نے خدا کا نام ظاہر یا تو صرف قافیہ بندی کے لیے لیا ہے یا ویدانیتوں کی مت پر مخلوق کو خدا کہا ہے۔

جواب: اس آیت میں پہلا نام الاول ہے دوسرا نام الاخر یہ دونوں نام یسعیاہ 44 باب 60 میں موجود ہیں رب الافواج فرماتا ہے "میں اول ہوں اور آخر ہوں اور میرے سوا کوئی خدا نہیں۔" تیسرا نام اس آیت میں الظاہر اور چوتھا الباطن ہے ظاہر کے معنی لغت عرب میں غالب اور بڑے زور والے ہیں اور ظاہر اونچے کو بھی کہتے ہیں اور باطن مخفی کو۔

ٹھیک انہیں الفاظ کے مرادف معنی ایوب 11 باب 8 "وہ تو آسمان سے اونچا تو کیا کر سکتا ہے اور پاتال سے نیچے ہے تو کیا جان سکتا ہے۔" رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے خود ان الفاظ کی تفسیر بیان فرمادی ہے۔

هُوَ الْاَوَّلُ لَیْسَ قَبْلَهٗ شَیْءٌ یعنی مخلوق میں سے کسی موجود چیز کو دیکھو تو اللہ تعالیٰ کی ذات اس مخلوق سے پہلے موجود ہے مخلوقات سے کوئی ایسی چیز نہیں جو خدا سے پہلے ہو۔

هُوَ الْاٰخِرُ لَیْسَ بَعْدَهٗ شَیْءٌ یعنی ہر چیز کی فنا کے بعد صرف اسی کی ذات پاک موجود ہے۔

هُوَ الظَّاهِرُ لَیْسَ فَوْقَهٗ شَیْءٌ یعنی ہر چیز سے اوپر اور غالب وہی ہے اس سے اوپر اور غالب کوئی شے نہیں۔

هُوَ الْبَاطِنُ لَیْسَ دُوْنَهٗ شَیْءٌ وہی پوشیدہ اور مخفی اور پردوں میں پنہاں ہے سوائے اس کے کوئی چیز نہیں۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خود بیان کی ہوئی تفسیر خوب واضح کرتی ہے کہ عربی زبان میں ان الفاظ کا مفہوم کیا ہے۔ وہی معتبر ہے جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

......☆......

اللہ دلوں میں بغض اور دشمنی ڈالتا ہے

اعتراض: خدا لوگوں میں دشمنی ڈالتا ہے اور قیامت تک باہمی کینہ پھیلا دیتا ہے۔ (ترک اسلام دھرم پال سوال نمبر 5)

قرآن مجید کی اس آیت پر اعتراض کیا گیا ہے۔ اَلْقَیْنَا بَیْنَھُمُ الْعَدَاوَۃَ وَالْبَغْضَآءَ (مائدہ 64:5) ہم نے ان کے درمیان قیامت کے دن تک دشمنی اور بغض ڈال دیا ہے۔

اگر اس آیت کو مندرجہ ذیل آیت کی روشنی میں پڑھا جائے تو اعتراض خود دور ہو جاتا ہے۔ قرآن مجید کا انداز بیان ہے کہ کسی جگہ ایک مختصر کلمات میں بات کرتا ہے پھر اس بات کو کسی دوسری جگہ تفصیل سے بیان کر دیتا ہے اور اس کی وضاحت ہو جاتی ہے۔ قرآن مجید میں آتا ہے۔ وَنَسُوْا حَظًّا مِّمَّا ذُكِّرُوْا بِهٖ فَاَغْرَيْنَا بَيْنَهُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَآءَ (توبہ 14:5) مگر وہ اس کا ایک حصہ بھول گئے جو انہیں نصیحت کی گئی تھی سو ہم نے ان کے درمیان قیامت کے دن تک دشمنی اور بغض ڈال دیا۔

اس آیت میں بیان کیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہود اور عیسائیوں کے لیے احکام شریعت نازل کیے تا کہ اس پر عمل کر کے سکھ اور امن اور باہمی محبت کی زندگی بسر کریں۔ معاشرہ میں امن قائم کرنے کے لیے شریعت کے احکام پر عمل کرنا ضروری ہے۔ یہود اور عیسائیوں نے ان احکام شریعت کو بھلا دیا۔ دنیاوی مال منال کے حصول کے لیے سرگرداں ہو گئے۔ تو اس کا نتیجہ باہمی دشمنی اور بغض ہی ہو گا۔ یہود اور عیسائیوں میں جو عداوت اور بغض ڈالا گیا ہے وہ ان کے اپنے ہی اعمال کا نتیجہ ہے۔ ان کا اپنا پیدا کردہ ہے اور وہ احکام شریعت پر عمل نہ کرنے کی وجہ سے تھا جیسا کہ الفاظ ظاہر کرتے ہیں۔ وَنَسُوْا حَظًّا مِّمَّا ذُكِّرُوْا بِهٖ (مگر وہ اس کا ایک حصہ بھول گئے جو ان کو نصیحت کی گئی تھی) انہوں نے اللہ تعالیٰ سے میثاق غلیظ کیا ہوا تھا۔ جب انہوں نے میثاق کو پس پشت ڈال دیا تو اس کے نتیجہ میں ان کے دلوں میں دشمنی اور بغض پیدا ہو گئے۔

ان آیات میں تو بین الاقوامی امن قائم کرنے کا ایک سنہری اصول بیان کیا گیا ہے کہ وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ

کے بتائے ہوئے قوانین پر عمل کیا جائے۔ اللہ کے بتائے ہوئے اصول ہی دنیا میں امن قائم کر سکتے ان اصولوں میں سے ایک اصول باہمی اخوت ہے کہ تمام بنی نوع انسان کی اصل ایک ہے۔ اس ایک اصل سے مختلف فروع پیدا ہوئیں گویا تمام دنیا کے لوگ ایک اصل سے ہیں اور سب بھائی بھائی ہیں جب اس اصول کو چھوڑا جائے گا تو دلوں میں ایک دوسرے کے خلاف دشمنی اور بغض پیدا ہوگا۔

الغرض معترض نے قرآن مجید کے طرز بیان کو نہ سمجھنے کی وجہ سے اعتراض کیا ہے۔ اگر دونوں آیات کو اکٹھا کر کے پڑھا جائے تو مفہوم واضح ہو جاتا ہے کہ عداوت اور بغض پیدا ہونے کی وجہ احکام شریعت کو ترک کرنا ہے اللہ تعالیٰ نے عداوت اور بغض پیدا نہیں کیے بلکہ ان کے اپنے اعمال کی وجہ سے عداوت اور بغض پیدا ہوئے ہیں۔

......☆......

توبہ بے انصافی ہے

اعتراض: توبہ اور بے انصافی ایک چیز ہے (ترک اسلام سوال نمبر 6)

جواب: مفردات راغب میں اَلتَّوبُ تَرْکُ الذَّنْبِ عَلٰی اَجْمَلِ الْوُجُوْہِ وَھُوَ اَبْلَغُ وُجُوْہِ الاعتذاز یعنی توبہ کے معنی ہیں عمدہ وجہ سے گناہ کو چھوڑ دینا اور اس سے بڑھ کر عذر خواہی کی اور کوئی عمدہ راہ نہیں ہو سکتی۔

ایک گناہ گار، فاسق، فاجر، اپنے کیے ہوئے بداعمال پر سچے دل کی گہرائیوں سے الگ ہوتا ہے اور اللہ کے سامنے یہ اقرار کرتا ہے کہ وہ آئندہ ان برے اعمال کا ارتکاب نہیں کرے گا تو انصاف کا یہ تقاضا ہے کہ اس کو بری کر دیا جائے۔ اسلام کا خدا تو اب ہے غفار ہے رحمان ہے رحیم ہے اپنے بندوں سے محبت کرنے والا ہے۔

اسلام میں کفارہ پر ایمان لانے کی ضرورت نہیں۔ نہ اسلام تناسخ کا قائل ہے کہ جب تک گناہ گار انسان مختلف جونوں میں جا کر اپنے گناہوں کی سزا بھگت نہیں لیتا اس کی سزا ختم نہیں ہوتی تناسخ اور کفارہ کا بیہودہ مسئلہ اللہ تعالیٰ کی صفت توّاب اور غفاریت کی فلاسفی نہ سمجھنے کی وجہ سے پیدا ہوا ہے۔

مادی دنیا میں ہم دیکھتے ہیں ایک بدکار اپنی بدکاری کی وجہ سے آتشک وسوزاک میں مبتلا ہو جاتا ہے یا کوئی اور مریض اللہ تعالیٰ کے قانون توڑنے کی وجہ سے کسی بیماری میں مبتلا ہو جاتا ہے تو اس کے علاج سے وہ مریض صحت یاب ہو جاتا ہے۔ جب مادی دنیا میں کوئی مریض علاج سے صحت یاب ہو جاتا ہے تو روحانی بیماری کا علاج کیوں نہیں اسلام نے روحانی بیماری کا علاج توبہ استغفار بیان کی ہے توبہ استغفار بے انصافی نہیں۔ بلکہ عین انصاف ہے۔ یہی انسان کی سچی فطرت تقاضا کرتی ہے۔ انسان کے اندر کی آواز ہے۔ اسلام کی یہی خصوصیت ہے کہ وہ انسان کی فطرت کی آواز کے مطابق اس کی راہنمائی کرتا ہے اس لیے اسلام کو فطرت کا دین قرار دیا ہے۔ یہ عین فطرت کے مطابق ہے۔

......☆......

اسلام کا اللہ بہرہ اور سنگدل ہے

اعتراض: غفار ہے اور توبہ نہیں سنتا بہرہ اور سنگدل ہے۔ (ترک اسلام سوال نمبر 7)

جواب: معترض کا سوال 6 اور سوال نمبر ایک دوسرے کے متضاد ہیں پہلے معترض نے یہ کہا کہ توبہ قبول کرنے والا بے انصاف اور ظالم ہے۔ اب یہ کہا ہے اللہ بہرہ وظالم ہے سنگدل ہے توبہ کیوں نہیں مانتا۔

دراصل معترض کو تعصب کا مرض لاحق ہے جس سے وہ چھٹکارا نہیں پاتا۔

قرآن مجید میں آتا ہے وَاِنِّی لَغَفَّارٌ لِّمَنْ تَابَ وَاٰمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا ثُمَّ اهْتَدٰی (طٰه 20:82) اور یقیناً میں اس کو بخشنے والا ہوں جو توبہ کرتا ہے اور ایمان لاتا ہے اور اچھا عمل کرتا ہے پھر ہدایت پر قائم رہتا ہے۔

اس آیت میں یہ بیان کیا گیا ہے اللہ تعالیٰ غفار کن لوگوں کے لیے ہے ان لوگوں کے لیے جو توبہ کرتے ہیں۔ ایمان لاتے ہیں۔ نیک کام کرتے ہیں پھر ہدایت کی راہوں پر ثابت قدم رہتے ہیں۔

اسلام کا اللہ تعالیٰ غفار ہے وہ توبہ بھی سنتا ہے نہ وہ بہرہ ہے نہ سنگدل جو لوگوں کے گناہ معاف کرنے والا ہو وہ سنگدل کیسے ہوسکتا ہے سنگ دل تو آریوں کا خدا ہے۔ جو انسان کے گناہ معاف نہیں کرتا اور اس کو مختلف جونوں میں داخل کرتا ہے کبھی اس کو کتا بناتا ہے کبھی سور اور کبھی کوئی دوسری جون میں تبدیل کر دیتا ہے۔ معاف نہیں کرتا۔ اسلام کا خدا غفار ہے جونہی اس کا بندہ اس کے آستانہ پر گر پڑتا ہے اور سچے دل سے توبہ کر لیتا ہے تو اللہ اس کے گناہ معاف کر دیتا ہے۔ نہ وہ بہرہ اور نہ وہ سنگ دل۔ وہ تو ارحم الرحمین ہے اپنے بندوں سے محبت کرنے والا ہے۔ جب کوئی گناہگار بندہ اس کی طرف خلوص کے ساتھ لپکتا ہے تو وہ خدا اس کی طرف بڑھ کر اپنے دامن رحمت میں لے لیتا ہے۔

مفردات راغب میں لکھا ہے الغفر اَلْبَاسُ الشَّیْءِ مَا یَصُوْنَہٗ عَنِ الدَّنَسِ الْمَغْفِرَۃِ مِنَ اللّٰہِ تَعَالٰی اَنْ یَصُوْنَ الْعَبْدُ مِنْ اَنْ یَّمَسَّہٗ الْعَذَابُ۔ غفر کے معنی ہیں ایسی شے کا پہنانا جو میل کچیل سے بچائے خدا کی مغفرت کے یہ معنی ہیں کہ بندہ عذاب کے لگنے سے بچایا جائے اس سے مغفر مشتق ہے جو لوہے کی خود کو کہتے ہیں اور غفارہ اس کپڑے کو کہتے ہیں جسے سر پر رکھنے سے کپڑوں کو چکنا تیل نہ لگ سکے۔

جب ایک گناہ گار اپنی بدی اور نافرمانی سے خلوص قلب کے ساتھ رجوع کرتا ہے اور اس کو چھوڑ دیتا ہے پھر کامل ایمان داری کے ساتھ اچھے اعمال بجالاتا ہے راہ مستقیم پر گامزن ہو جاتا ہے تب اللہ تعالیٰ اس کو اپنی غفاریت کی چادر میں لپیٹ لیتا ہے۔

......☆......

اسلام کا خدا لڑاکا ہے

اعتراض: خدا بڑا لڑاکا ہے۔ جب خدا ہی لڑاکا ہو گیا پھر زمین پر صلح کون قائم کر سکتا ہے لڑاکا شخص خدا کو بھی لڑاکا کہہ سکتا ہے۔ (ترک اسلام دھرم پال سوال نمبر 4)

جواب: یہ اعتراض آیت وَاللّٰہُ اَشَدُّ بَاْسًا وَّاَشَدُّ تَنْکِیْلًا (النساء 4:84) (اللہ طاقت میں سب سے زیادہ قوی اور عبرتناک سزا دینے میں سخت تر ہے۔) پر کیا گیا ہے باس کے معنی عربی زبان میں عذاب کے ہیں قاموس میں ہے الباس العذاب دوسرا لفظ حوالہ کردہ آیت

میں تنکیل کا لفظ ہے اور قاموس میں ہے نکل بہ تنکیلاً صنع به صَنَعًا یحذ وغیرہ ایسے طور پر بدکار کو سزا دینا کہ دوسروں کو عبرت ہو۔ مذکورہ الفاظ میں اللہ تعالیٰ کا لڑاکا ہونا ظاہر نہیں ہوتا بلکہ یہ مراد ہے کہ بداعمالی کے نتیجہ میں سزا دینا۔ یہ عین انصاف کے مطابق ہے کہ بدکار اور قانون شکن کو سزا نہ دی جائے تو معاشرہ کا امن ہی قائم نہیں رہ سکتا۔ دنیا کے ہر ملک میں یہی دستور اور قانون چل رہا ہے۔ اس کا ثبوت نیچر میں بھی ہے کہ ایک زانی زنا کرتا ہے تو آتشک کے خطرناک امراض میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ زنا کی سزا دنیا اور آتشک کے خطرناک دکھوں اور تکالیف میں مبتلا کرنا خود بدکار کے لیے عاقبت نااندیشی کا سبق اور دوسروں کے لیے مقام عبرت ہے۔ خدا کی ان صفات کا ظہور انسان کی بداعمالیوں اور بدکاریوں کے بعد ہوتا ہے اور قانون شکن کی اصلاح اور دوسرے لوگوں کی عبرت کا موجب ہوتا ہے۔ قرآن مجید میں کہیں بھی اللہ تعالیٰ کو لڑاکا نہیں کہا گیا۔ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کی جتنی بھی صفات بیان کی گئی ہیں وہ انسانوں بلکہ ہر جان دار چیز کے لیے باعث رحمت ہیں۔ ان صفات کے نیچے رحمت کا چشمہ جاری ہے۔

الزامی جواب: جب ہندو دھرم کی کتب کا مطالعہ کیا جائے تو ان میں دشمنوں مخالفوں کو صفحہ ہستی سے مٹانے کی تعلیم دی گئی ہے اس قسم کے ہندو دھرم کا خدا ایک لڑاکا اور جنگجو نظر آتا ہے۔

''دھرم کے مخالفوں کو زندہ آگ میں جلا دو۔'' (یجروید ادھیا 13 منتر 12 دیانند بھاش)

''اپنے مخالفوں کو درندوں سے پھڑوا ڈالو۔'' (یجروید 19,17,15)

''ان کو سمندر میں غرق کر دو۔'' (یجروید 18:15)

''مخالفوں کا جوڑ جوڑ اور بند بند کاٹ ڈالو۔'' (یجروید 38:13)

''اے اندر دیوتا! ہمارا دیا ہوا سوم رس تجھے اور متوالا کرے تو ہمیں دھن و دولت دے اور وید کے دشمنوں کو تباہ اور ہلاک کر۔'' (سام وید اتر آرچک ادھیائے 11 منتر 1)

''اے اندر دیوتا تو غیر ویدک دھرمیوں کو کب یوں کچل کر تباہ کرے گا جیسے چھتری دار پھول کو پاؤں سے کچل کر تباہ کر دیا جاتا ہے اے اندر تو کب ان دعاؤں کو سنے گا۔'' (سام وید اتر آرچک ادھیائے 10 منتر 3)

اسلام کی تعلیم رحمت کی تعلیم ہے جبکہ ہندو دھرم کی تعلیم دوسروں کو تباہ و برباد کرنے کی تعلیم ہے۔ لڑائی اور قتل و غارت کی تاکید کرتا ہے۔

☆......☆
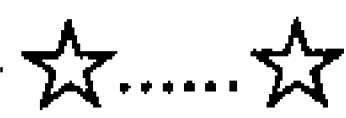
اللہ بدی پیدا کرنے والا ہے

اعتراض: اس کو (خدا کو) بدی پیدا کرنے والا مانا گیا ہے نادان لوگ تقدیر تدبیر اور آزمائش وغیرہ کا ڈھکوسلا بیچ میں لا کر خدا کو الزام سے پاک کرنا چاہتے ہیں۔ (ترک اسلام سوال 8)۔

جواب: معترض نے اسلام کے مسئلہ دکھ سکھ نیکی و بدی (مسئلہ تقدیر) کو سمجھا ہی نہیں۔ مسئلہ تقدیر اسلام کے اہم کلامی مسائل میں سے ہے تقدیر کے معنی حسب لغت عرب اور محاورہ قرآن کسی چیز کا اندازہ اور حق دار ٹھہرانا ہے۔ جیسا کہ قرآن مجید میں آتا ہے۔ وَخَلَقَ كُلَّ شَيْءٍ فَقَدَّرَهُ تَقْدِيرًا (الفرقان 2:25) اس نے ہر چیز کو پیدا کیا پھر اس کے لیے ایک اندازہ ٹھہرا۔

اِنَّا كُلَّ شَيْءٍ خَلَقْنٰهُ بِقَدَرٍ (القمر 49:54) ہم نے ہر چیز کو ایک اندازہ سے پیدا کیا ہے۔

وَكُلُّ شَيْءٍ بِمِقْدَارٍ (الرعد 8:14) ہر ایک چیز اس کے ہاں اندازہ سے ہے۔
سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْاَعْلَى الَّذِي خَلَقَ فَسَوّٰى وَالَّذِي قَدَّرَ فَهَدٰى (الاعلیٰ 87:1-3) اپنے رب بہت بلند کے نام کی تسبیح کر جس نے پیدا کیا پھر ٹھیک بنایا جس نے اندازہ لگایا اور راہ دکھائی۔
قَدْ جَعَلَ اللّٰهُ لِكُلِّ شَيْءٍ قَدْرًا (اطلاق 65:3) اللہ نے ہر چیز کے لیے ایک اندازہ مقرر کر رکھا ہے۔
اللہ تعالیٰ نے تمام کائنات کو ایک قانون کے تابع بنا دیا ہے ہر چیز اس قانون کے تابع کام کر رہی ہے۔ گویا ہر چیز اپنی تقدیر کے مطابق چل رہی ہے۔

اللہ نے آگ کو پیدا کیا ہے اس میں تقدیر (الٰہی قانون) کام کر رہی ہے کہ وہ جلائے پانی پیدا کیا اس میں یہ تقدیر کام کر رہی ہے وہ پیاس بجھائے حیوانات اور نباتات کے لیے باعث زندگی ہے سورج پیدا کیا ہے اس میں یہ تقدیر کام کر رہی ہے کہ وہ روشنی دے اور گرمی پہنچائے۔ غرضیکہ دنیا کی ہر تخلیق میں اللہ کی تقدیر کام کر رہی ہے۔

تقدیر اللہ تعالیٰ کا ایک قانون ہے جس پر تمام نظام کائنات چل رہا ہے۔ انسان بھی اسی تقدیر کے ماتحت آتا ہے اور اس کا ہر عمل اس تقدیر کے ماتحت ہے۔

لہٰذا معترض کا یہ کہنا کہ اللہ تعالیٰ کو بدی پیدا کرنے والا مانا گیا ہے۔ بالکل غلط ہے۔ بدی قانون شریعت توڑنے کا نام ہے جب اللہ تعالیٰ نے قانون مقرر کر دیئے ہیں۔ اب جو شخص ان قوانین کو توڑے گا وہ گویا بدی کا مرتکب ہوا ہے اور وہ اللہ کی تقدیر کے مطابق ہوا ہے۔ قرآن مجید نے مختلف مقامات پر اس پر اظہار کیا ہے۔

ارشاد الٰہی ہے۔ وَاَنْ لَّيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى وَاَنَّ سَعْيَهٗ سَوْفَ يُرٰى (نجم 53:39,40) اور کہ انسان کے لیے کچھ نہیں مگر وہی جو وہ کوشش کرتا ہے اور اس کی کوشش دیکھی جائے گی۔

دوسری جگہ آتا ہے۔ وَمَنْ يَّعْمَلْ سُوْٓءًا اَوْ يَظْلِمْ نَفْسَهٗ (نساء 4:110) جو شخص بدی کرے (قانون توڑے) یا اپنی جان پر ظلم کرے۔
صحیح راستہ یعنی قانون کے مطابق زندگی بسر کرنے کے متعلق آیا ہے۔
وَمَنْ عَمِلَ صَالِحًا فَلِنَفْسِهٖ (حم السجدہ 41:46) جو کوئی نیک عمل کرتا ہے تو اپنی جان کی بھلائی کے لیے ہے۔
وَمَنْ اَسَآءَ فَعَلَيْهَا وَمَا رَبُّكَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيْدِ (41:46) جو کوئی برا کرتا ہے۔ (غلط راستہ اختیار کرتا ہے قانون شکنی کرتا) تو اس کا وبال اس پر ہے تیرا رب بندوں پر کچھ بھی ظلم کرنے والا نہیں۔

یہ تمام آیات ظاہر کرتی ہیں اللہ برائی (بدی) پیدا کرنے والا نہیں بلکہ خود بندہ ہے۔ بندہ نے اللہ کے قانون کو توڑا۔ قانون کی خلاف ورزی کی۔ تو اس کا بد نتیجہ انسان پر پڑا۔ قرآن مجید نے ان الفاظ میں واضح کر دیا۔ مَا اَصَابَكَ مِنْ حَسَنَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ وَمَا اَصَابَكَ مِنْ سَيِّئَةٍ فَمِنْ نَّفْسِكَ (نساء) جو سکھ و فائدہ تجھے پہنچے وہ اللہ کی طرف سے ہے اور جو دکھ پہنچے وہ تیرے ہی طرف سے ہے۔

پس اسلام کے نزدیک بدی اللہ کے بنائے ہوئے قانون توڑنے کا نام ہے وہ قانون بندہ ہی توڑتا ہے۔ لہٰذا بدی اللہ پیدا نہیں کرنے والا بلکہ بندہ ہے جس نے قانون کو توڑا۔ اللہ تعالیٰ نے صرف تقدیر یعنی قانون بنایا ہے۔ جس کے مطابق انسان کا ہر عمل پرکھا جاتا ہے لہٰذا تقدیر ڈھکوسلا نہیں ہے بلکہ ایک سچی حقیقت ہے۔ اس کے بغیر انتظام کائنات ہی نہیں چل سکتا ہم سب ایک تقدیر میں جکڑے ہوئے ہیں۔ جو شخص تقدیر سے باہر نکلے گا وہ خدا کا مجرم ہوگا بدی کا ارتکاب کرنے والا ہوگا۔ لہٰذا اللہ تقدیر (قانون) بنانے والا ہے جس کا تعلق انسان کے اعمال سے ہے اگر وہ اعمال قانون کے مطابق ہیں تو وہ نیکی اور اگر قانون کے خلاف ہیں تو بدی۔ پھر نیکی اور بدی کا نتیجہ اللہ برآمد کرے گا۔ اچھے

اعمال کا نتیجہ اچھا اور برے اعمال کا نتیجہ برا۔

یہی چیز ہم نیچر میں دیکھتے ہیں کہ جب کوئی شخص بدی کرتا ہے یعنی قانون شکنی کرتا ہے تو اس کا بدنتیجہ سامنے آجاتا ہے ایک زانی جب زنا کرتا ہے تو وہ سوزاک کے مرض میں مبتلا ہو جاتا ہے زانی کی بدکاری کا نتیجہ آتشک ہے، اللہ تعالیٰ کی طرف سے نہیں اللہ کے قانون کی خلاف روزی کی وجہ سے ہے۔

چونکہ اللہ تعالیٰ ہی خالق مالک اور قانون بنانے والا ہے۔ اس لیے بعض جگہ اللہ تعالیٰ نے یہ بھی فرمایا ہے۔ كُلٌّ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ یعنی سب اللہ کی طرف سے ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ ایک انسان بدی کرتا ہے تو وہ بھی اللہ کی طرف سے ہے۔ بلکہ اس کا صرف طلب یہ ہے کسی عمل کا جو کوئی بھی نتیجہ نکلتا ہے وہ اللہ کی طرف سے ہے۔

تدبیر:

تدبیر غور و فکر کے نتیجہ کا نام ہے۔ جب ایک انسان کسی کام کرنے سے پہلے ہر پہلو پر غور و فکر کرتا ہے پھر جس نتیجہ پر پہنچتا ہے۔ اس کے مطابق عمل کرتا ہے تو اس کو تدبیر کہا جاتا ہے۔ انسان اشرف المخلوقات ہے۔ اس کی راہنمائی کے لیے اللہ تعالیٰ نے احکام شریعت نازل کیے۔ جو اللہ کی طرف سے قانون ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ہدایت کی ہے کہ ان کے مطابق عمل کیا جائے۔ دوسری چیز جو دوسری مخلوقات سے ممتاز کرتی ہے وہ عقل ہے۔ یعنی عقل اور غور و فکر سے کام لے کر صحیح راستہ تلاش کرلے سو تدبیر تقدیر کی طرح ایک عمدہ چیز ہے یہ بھی اللہ کی طرف سے عطا کردہ ہے۔

تدبیر ہی انسان کو بتاتی ہے کہ تقدیر (قانون) کے مطابق عمل کیا جائے۔ جو اسباب اللہ تعالیٰ نے مہیا کیے ہیں ان کو استعمال میں لایا جائے۔ لہٰذا اللہ کی نعمتوں میں سے ایک بڑی نعمت ہے اس کو ڈھکوسلا کہنا پرلے درجہ کی حماقت ہے۔

امتحان (آزمائش):۔ انسان اس دنیا میں ایک امتحان (آزمائش) میں ہے اللہ تعالیٰ نے انسان کو احکام شریعت (قانون الٰہی) سے آگاہ کر دیا ہے اور عقل سے بھی نوازا ہے اب انسان کو یہ اختیار دے دیا ہے کہ وہ جو چاہے راستہ اختیار کرلے۔ ارشاد الٰہی ہے۔ فَمَنْ شَآءَ فَلْيُؤْمِنْ وَّ مَنْ شَآءَ فَلْيَكْفُرْ (کہف 29:18) سو جو کوئی چاہے ایمان لائے اور جو کوئی چاہے انکار کرے۔ پس جو شخص قانون کے مطابق محنت کرے گا۔ اس کا پھل پائے گا اور امتحان (آزمائش) سے پاس ہو جائے گا اور اپنی محنت کے مطابق اچھا پھل پائے گا اور جو شخص قانون کے مطابق محنت نہیں کرے گا وہ ناکام و نامراد ہوگا اور اس کی سزا پائے گا۔ لہٰذا انسانی ترقی کے لیے تقدیر تدبیر اور امتحان ضروری ہیں یہ ڈھکوسلے نہیں بلکہ حقائق ہیں۔

......☆......

چوری شراب ڈاکا قتل خون اللہ کے حکم سے ہیں

اعتراض: جو ہوتا ہے خدا کے حکم سے پس زنا چوری شراب ڈاکہ قتل خون سب اس کے حکم سے ہوا شیطان بیچارے کو کیوں بدنام سیہوا۔ شیطان بیچارے کو کیوں بدنام کیا جاتا ہے؟ (ترک اسلام اعتراض نمبر 9)

جواب: یہ سوال بھی گزشتہ سوال کی ایک دوسری شکل ہے۔ پہلے یہ واضح کیا جا چکا ہے کہ انسان کا گناہ احکام شریعت کے توڑنے کا نام ہے۔ جو شخص اللہ کے مقرر کردہ قانون کے مطابق عمل نہیں کرے گا۔ وہ گناہ گار ہوگا۔ اس کو اللہ کی طرف منسوب کرنا قرآن مجید کو نہ سمجھنے کا نتیجہ ہے۔ اس سوال میں کچھ برے اعمال کا ذکر کیا ہے کہ یہ کہا گیا ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے ہیں یہ اسلام پر صریحاً بہتان ہے قرآن مجید میں ان

اعمال کو واضح احکام میں حرام قرار دیا ہے۔ جن بداعمال کو اللہ تعالیٰ نے حرام اور ناجائز قرار دیا ہے ان کو اللہ تعالیٰ کے حکم سے جوڑنا پرلے درجے کی حماقت ہے اور دیانت داری سے بعید ہے اسلام تو سچی پاکیزگی اور تقویٰ کی تعلیم دیتا ہے۔

(۱) لَا تَقْرَبُوا الزِّنَا اِنَّهٗ كَانَ فَاحِشَةً وَّسَآءَ سَبِيْلًا (بنی اسرائیل 32:16)

اور زنا کے قریب مت جاؤ کیونکہ وہ بے حیائی کی بات ہے اور بری راہ ہے۔

(۲) اِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَيْسِرُ وَالْاَنْصَابُ وَالْاَزْلَامُ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّيْطٰنِ فَاجْتَنِبُوْهُ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ (المائدہ 90:5)

شراب اور جوا اور بت اور پاسے ناپاک کام صرف شیطان کے عمل سے ہیں سو اس سے بچو تا کہ تم کامیاب ہو۔

(۳) اِنَّمَا جَزٰٓؤُا الَّذِيْنَ يُحَارِبُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَيَسْعَوْنَ فِي الْاَرْضِ فَسَادًا اَنْ يُّقَتَّلُوْٓا اَوْ يُصَلَّبُوْٓا اَوْ تُقَطَّعَ اَيْدِيْهِمْ وَاَرْجُلُهُمْ مِّنْ خِلَافٍ اَوْ يُنْفَوْا مِنَ الْاَرْضِ ذٰلِكَ لَهُمْ خِزْيٌ فِي الدُّنْيَا وَلَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيْمٌ (مائدہ 33:5)

ان کی سزا جو اللہ اور اس کے رسول کے ساتھ جنگ کرتے ہیں اور ملک میں فساد پھیلانے کی کوشش کرتے ہیں صرف یہی ہے کہ وہ قتل کیے جائیں یا صلیب پر مارے جائیں ان کے ہاتھ اور پاؤں مخالف اطراف سے کاٹے جائیں یا ان کو قید کیا جائے یہ ان کے لیے دنیا میں رسوائی ہے اور آخرت میں ان کے لیے بڑا عذاب ہے۔

(۴) السَّارِقُ وَالسَّارِقَةُ فَاقْطَعُوْٓا اَيْدِيَهُمَا جَزَآءًۢ بِمَا كَسَبَا نَكَالًا مِّنَ اللّٰهِ (المائدہ 38:5)

اور چور مرد اور چور عورت سو ان دونوں کے ہاتھ کاٹ دو یہ ان کی سزا ہے۔ جو انہوں نے کیا۔ اللہ کی طرف سے عبرتناک سزا اور اللہ غالب اور حکمت والا ہے۔

(۵) لَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِيْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ (بنی اسرائیل 33:17)

اور اس جان کو قتل نہ کرو جسے اللہ نے حرام ٹھہرایا ہے مگر حق کے ساتھ

جب اللہ تعالیٰ نے واضح الفاظ میں ان تمام برائیوں کے ارتکاب سے روکا ہے مزید سزا بھی مقرر کی ہے۔ اس کے متعلق یہ کہنا کہ یہ جرائم اللہ کے حکم سے کئے گئے ہیں یہ صریحاً اسلام پر بہتان عظیم ہے۔

اگر اعتراض اس آیت قُلْ لَّآ اَمْلِكُ لِنَفْسِيْ ضَرًّا وَّلَا نَفْعًا اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ (یونس) کو زیر نظر رکھ کر کیا ہے۔ تو پھر بھی اعتراض مذکورہ آیات کو نہ سمجھنے کی وجہ کیا گیا ہے۔ اس آیت میں پیش گوئی ہے۔ اس میں اللہ تعالیٰ نے بتایا ہے کہ ہر قوم کی طرف جب کوئی رسول آتا ہے تو کچھ اس کو مان لیتے ہیں اور کچھ انکار کر دیتے ہیں۔ آخر دونوں میں اللہ کی طرف سے حق کا فیصلہ آ جاتا ہے اور نبی کی صداقت ظاہر ہو جاتی ہے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی مخالفین نے آپ ﷺ کی صداقت کے متعلق سوال کیا اور وہ گھڑی کب آئے گی جب ہمارے اور تمہارے درمیان حق کے ساتھ فیصلہ ہوگا اللہ تعالیٰ نبی کریم سے فرماتا ہے کہ ان کو یوں جواب دو اور کہو کہ میں خود نفع پہنچانے اور ضرر دینے کا مالک نہیں کہ میں وقت بتا دوں کہ فیصلہ کی گھڑی کب آنے والی ہے ہاں صرف اللہ ہے جو چاہتا وہی ہو کر رہتا ہے۔ اسی کے پاس ہی اس گھڑی کا تعین ہے ہر گروہ کے لیے وقت اور میعاد مقرر ہے جب ان کا وقت آ جاتا ہے اسے ایک گھڑی پیچھے نہیں کر سکتے نہ اس گھڑی کو آپ آگے لا سکتے ہیں اس گھڑی کا تعین اللہ کے پاس ہے۔ وہی فیصلے کرے گا۔

اللہ ناپاکی اور گمراہی بڑھاتا ہے

اعتراض: خدا کو پاکیزگی پسند ہے پھر ناپاک کو پاک کرنا نہ چاہا ناپاکی اور گمراہی بڑھاتا ہے۔ (ترک اسلام سوال 11)

جواب: معترض نے قرآن مجید کی اس آیت پر اعتراض کیا ہے مَنۡ یُّرِدِ اللّٰہُ فِتۡنَتَہٗ (مائدہ) پر کیا ہے۔

قارئین کے سامنے سیاق و سباق کے ساتھ تمام آیات پیش کی جاتی ہیں۔ جس سے مطلب واضح ہو جائے گا۔

(۱) یٰۤاَیُّهَا الرَّسُوۡلُ لَا یَحۡزُنۡكَ الَّذِیۡنَ یُسَارِعُوۡنَ فِی الۡكُفۡرِ مِنَ الَّذِیۡنَ قَالُوۡۤا اٰمَنَّا بِاَفۡوَاهِهِمۡ وَلَمۡ تُؤۡمِنۡ قُلُوۡبُهُمۡ ۚۛ وَمِنَ الَّذِیۡنَ هَادُوۡا ۚۛ سَمّٰعُوۡنَ لِلۡكَذِبِ سَمّٰعُوۡنَ لِقَوۡمٍ اٰخَرِیۡنَ ۙ لَمۡ یَاۡتُوۡكَ ؕ یُحَرِّفُوۡنَ الۡكَلِمَ مِنۡۢ بَعۡدِ مَوَاضِعِهٖ ۚ یَقُوۡلُوۡنَ اِنۡ اُوۡتِیۡتُمۡ هٰذَا فَخُذُوۡهُ وَاِنۡ لَّمۡ تُؤۡتَوۡهُ فَاحۡذَرُوۡا ؕ وَمَنۡ یُّرِدِ اللّٰهُ فِتۡنَتَهٗ فَلَنۡ تَمۡلِكَ لَهٗ مِنَ اللّٰهِ شَیۡئًا ؕ اُولٰٓئِكَ الَّذِیۡنَ لَمۡ یُرِدِ اللّٰهُ اَنۡ یُّطَهِّرَ قُلُوۡبَهُمۡ ؕ لَهُمۡ فِی الدُّنۡیَا خِزۡیٌ ۚۖ وَّلَهُمۡ فِی الۡاٰخِرَةِ عَذَابٌ عَظِیۡمٌ (مائدہ 41:5)

اے رسول وہ لوگ تجھے غم ناک نہ کریں جو کفر میں جلدی کرتے ہیں ان میں سے جو اپنے مونہوں سے کہتے ہیں کہ ہم ایمان لائے اور ان کے دل ایمان نہیں لائے اور ان میں سے یہودی ہیں وہ جھوٹ بولنے کے لیے جاسوسی کرنے والے ہیں ایک اور گروہ کی جاسوسی کرنے والے جو تیرے پاس نہیں آیا باتوں کو ان کی جگہ (جاننے) کے بعد بدلتے ہیں کہتے ہیں اگر تم کو یہ دیا جائے تو اسے لے لو اور اگر یہ نہ دیا جائے تو بچو اور جس کے دکھ میں پڑا رہنے کا اللہ ارادہ کرے تو اللہ کے سامنے تو اس کے لیے کچھ اختیار نہیں رکھتا یہی وہ ہیں کہ اللہ نے ارادہ نہیں کیا کہ ان کے دلوں کو پاک کرے ان کے لیے دنیا میں رسوائی ہے اور ان کے لیے آخرت میں بڑا عذاب ہے۔

(۲) وَاِذَا مَاۤ اُنۡزِلَتۡ سُوۡرَةٌ فَمِنۡهُمۡ مَّنۡ یَّقُوۡلُ اَیُّكُمۡ زَادَتۡهُ هٰذِهٖۤ اِیۡمَانًا ۚ فَاَمَّا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا فَزَادَتۡهُمۡ اِیۡمَانًا وَّهُمۡ یَسۡتَبۡشِرُوۡنَ وَاَمَّا الَّذِیۡنَ فِیۡ قُلُوۡبِهِمۡ مَّرَضٌ فَزَادَتۡهُمۡ رِجۡسًا اِلٰى رِجۡسِهِمۡ وَمَاتُوۡا وَهُمۡ كٰفِرُوۡنَ (توبہ 125-124:9)

اور جب کوئی سورت اترتی ہے تو ان میں سے بعض کہتے ہیں کہ اس نے ہم میں سے کس کا ایمان بڑھایا ہے سو جو ایمان لائے ان کا ایمان بڑھایا اور وہ خوش ہوتے ہیں اور جن کے دلوں میں بیماری ہے تو ان کی پلیدی پر پلیدی کو زیادہ کیا اور وہ مر گئے اور وہ کافر رہے۔

فتنہ کے معنی مفردات راغب میں بیان ہوئے ہیں اَصۡلُ الۡفِتَنِ اِدۡخَالُ الذَّهَبِ النَّارَ لِیَظۡهَرَ جَوۡدَتُهٗ مِنۡ رَدَائَتِهٖ فتنہ کے اصل معنی ہیں زر کو آگ میں ڈالنا تاکہ اس کی میل کچیل نکل جائے۔

قرآن مجید میں لفظ فتنہ مختلف معنوں میں استعمال کیا گیا ہے۔

عذاب کے معنی ہیں۔

یَوۡمَ هُمۡ عَلَی النَّارِ یُفۡتَنُوۡنَ (ذاریات 13:51)

جس دن وہ آگ میں ڈالے جا کر عذاب دیئے جائیں گے۔ اس آیت میں فتنہ عذاب کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔

دوسری جگہ آتا ہے۔

ذُوْقُوْا فِتْنَتَكُمْ (ذرایت 14:15)

اپنی سزا کا مزہ لو۔

اسباب عذاب کو بھی فتنہ کہا جاتا ہے۔

اَلَا فِي الْفِتْنَةِ سَقَطُوْا (توبہ 49:9)

دیکھو وہ عذاب کے موجبات میں جاپڑے ہیں۔

امتحان لینا، محنت لینا بھی فتنہ کے معنی ہیں۔ ارشاد الٰہی ہے۔

وَفَتَنَّاكَ فُتُوْنًا (طٰہٰ 40:20)

ہم نے تیرا خوب امتحان لیا۔

وَنَبْلُوْكُمْ بِالشَّرِّ وَالْخَيْرِ فِتْنَةً (انبیاء 35:21)

ہم امتحان کے طور پر تمہیں بدی اور نیکی میں مبتلا کرتے ہیں۔

فتنہ کے معنی دکھ بھی قرآن کریم میں آئے ہیں۔ ارشاد الٰہی ہے۔

وَالْفِتْنَةُ اَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ (بقرہ 191:2)

دکھ دینا قتل سے بھی سخت ہے۔

وَقَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ (البقرہ 193:2)

اور ان سے جنگ کرو یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہے۔

اب واضح ہو گیا ہے کہ فتنہ کے معنی بلا، مصیبت، قتل، عذاب امتحان، اسباب عذاب وغیرہ کے ہیں۔ اس کے ساتھ ان آیات سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ ان لوگوں کے ہاتھوں نے وہ کون سے اسباب جمع کیے جن کی وجہ سے اللہ کا عذاب بھڑ کا۔ ان کی سزا اور عدم تطہیر کا اللہ کی طرف سے حکم صادر ہو گیا۔ اب آیت مِنْ يُّرِدِ اللّٰهُ فِتْنَتَهٗ کا مطلب بھی واضح ہو گیا۔ جب ان لوگوں کے اپنے گناہوں کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے ان کو عذاب دینے اور عدم تطہیر کا فیصلہ کر لیا۔ تو کوئی بھی ان کو اللہ عذاب سے نہیں بچا سکے گا۔ اللہ کا عذاب جو ان پر آیا ہے ان کے اپنے کردہ گناہوں کا نتیجہ ہے۔ اس بارہ میں ارشاد الٰہی ہے۔

مَا اَصَابَكُمْ مِنْ مُّصِيْبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ اَيْدِيْكُمْ (شوریٰ)

یعنی تمہیں ہر ایک مصیبت اپنے ہاتھوں کی کرتوت کے سبب پہنچتی ہے۔

دوسری جگہ آتا ہے۔

وَمَا اَصَابَكَ مِنْ سَيِّئَةٍ فَمِنْ نَّفْسِكَ (النساء 79:4)

جو تجھے دکھ پہنچتا ہے وہ تیرے یعنی نفس سے ہے۔

ایک اور موقع پر ہے۔

وَمَنْ اَسَآءَ فَعَلَيْهَا وَمَا رَبُّكَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيْدِ (حٰمٓ السجدہ 46:41)

اور جو کوئی برا کرتا ہے تو اس کا وبال اس پر ہے تیرا رب بندوں پر کچھ بھی ظلم کرنے والا نہیں۔

پس اللہ تعالیٰ نے کفار کو عذاب دینے اور عدم تطہیر کا فیصلہ صادر کیا ہے وہ ان کی بداعمالیوں اور احکام اور قانون کو توڑنے کی وجہ سے ہے۔
جب ان لوگوں نے خدا کے قانون اور احکام کی خلاف ورزی کی۔ اس کے نتیجہ میں ان پر سزا وارد ہوگی۔

اللہ تعالیٰ کہتا ہے، جب اللہ تعالیٰ کسی کو سزا دینے کا ارادہ کر لیتا ہے تو کوئی شخص اس سزا کو دور نہیں کر سکتا۔ وَمَنْ يُّرِدِ اللّٰهُ فِتْنَتَهٗ اور لَمْ يُرِدِ اللّٰهُ اَنْ يُّطَهِّرَ قُلُوْبَهُمْ کا مطلب واضح ہو گیا ہے۔ اللہ کی سزا اور عدم تطہیر کفار کی بداعمالیوں کا نتیجہ ہے۔ جب یہ لوگ بداعمالیوں اور احکام کی خلاف ورزی میں انتہا کو پہنچ جاتے ہیں تو اللہ اپنے دستور اور قانون کے مطابق ان پر سزا وارد دیتا ہے۔ یہی انصاف کا تقاضا ہے۔ لہٰذا گمراہی اور غلط پا کی انسانوں کی بداعمالیوں کی وجہ سے پھیلتی ہے۔ ہم نیچر میں بھی دیکھتے ہیں کہ جب کوئی زنا کرتا ہے تو دردناک بیماری آتشک و سوزاک میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ اللہ نے اس بیماری کا علاج بھی رکھا ہے جو اس بیماری کا علاج کراتا ہے وہ صحت یاب ہو جاتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے روحانی بیماریوں کا علاج بھی مقرر کیا ہے وہ ہے توبہ اور استغفار۔ جب قوم اپنے گناہوں سے توبہ کر لیتی ہے آستانہ الوہیت پر گر جاتی ہے تو اللہ اپنے قانون کے مطابق عذاب کو ٹال دیتا ہے اللہ تعالیٰ نے مادی اور روحانی دنیا میں یہ قانون نافذ کیا ہے اس قانون کے مطابق مادی اور روحانی نظام چل رہے ہیں۔

معترض نے اللہ تعالیٰ کے دائمی جاری ساری قانون کو نہ جاننے کی وجہ سے اعتراض کیا ہے اس قانون کی اطلاع صرف اسلام نے ہی نہیں دی بلکہ ہر نبی نے جزا و سزا کے فلسفہ سے آگاہ کیا ہے۔ مادی اور روحانی ترقی اور تنزل کا دار و مدار اسی قانون میں مضمر ہے۔ انسانوں کو یہ بتایا گیا ہے کہ اگر قانون اور احکام الٰہی کے مطابق زندگی بسر کرو گے تو دنیا میں کامیاب ہو جاؤ گے اور اگر روگردانی کرو گے تو خدا کے عذاب کے مستحق ٹھہرو گے۔ قرآن مجید ایک پُر حکمت کتاب ہے جو انسانوں کو مختلف پیرایوں سے راہ ہدایت پر گامزن کرتا ہے۔

......☆......

زمین کا کناروں سے گھٹنا

اعتراض: اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّا نَاْتِي الْاَرْضَ نَنْقُصُهَا مِنْ اَطْرَافِهَا (رعد 13:41)

کیا وہ نہیں دیکھتے کہ ہم زمین کو اس کے کناروں سے گھٹاتے چلے آتے ہیں۔

یہ فلاسفی قرآن کی عجیب ہے زمین کناروں سے گھٹتی چلی آتی ہے۔

جواب: ہر زبان میں یہ محاورہ ہے کہ مکان سے مراد اہل مکان ہوتے ہیں جیسے نحو میں ظرف بمعنی مظروف سے تعبیر کرتے ہیں یہ محاورہ عام بول چال میں استعمال ہوتا ہے۔ متی کی انجیل 11 باب 21 پڑھیں "ہائے خورزیں تجھ پر افسوس اور ہائے بیت صیدا تجھ پر افسوس کیونکہ معجزے جو تم میں دکھلائے اگر صور و صیدا میں دکھلائے جاتے تو ٹاٹ اوڑھ کے اور خاک میں بیٹھ کے کب کی توبہ کرتے۔" پھر متی 23 باب 37 ملاحظہ کیجیے۔ "اے یروشلم اے یروشلم جو نبیوں کو مار ڈالتا اور انہیں جو تیرے پاس بھیجے گئے سنگسار کرتا ہے کتنی بار میں نے چاہا تیرے لڑکوں کو جمع کروں۔" متی کی ان آیات میں خورزیں اور بیت صدا اور یروشلم سے اس کے مکین مراد ہیں۔ بولنے میں مکان بولا گیا ہے لیکن مقصود اہل مکان ہیں۔

ایسا ہی قرآن مجید کی اس آیت میں الارض سے (جو معرف بالف لام سے خاص زمین والے) یعنی اہل مکہ مراد ہیں۔
اس آیت میں یہ بیان کیا گیا ہے کفار کی تعداد کم ہوتی چلی جائے گی اور مسلمان دن بدن ترقی کرتے چلے جائیں گے۔

اس آیت میں مسلمانوں کی ترقی کی طرف اشارہ کیا گیا ہے تاریخ میں یہ بات سچی بھی ثابت ہوئی۔ وہ مکہ جہاں سے مسلمان نکال دیئے گئے تھے اور رسول کریم ﷺ کو ہجرت کرنی پڑی۔ 8 سال کے بعد وہاں کفار کی تعداد بہت کم رہ گئی اور سب دائرہ اسلام میں داخل ہو گئے اس آیت میں مسلمانوں کی ترقی کی زبردست پیشگوئی ہے زمین کے اطراف کے گھٹانے سے مراد کفار مکہ کی تعداد کا کم ہونا مراد ہے۔ کتب اناجیل میں بھی ''زمین کے کناروں'' کا لفظ ومحاورہ پایا جاتا ہے۔

''زمین کے کنارے ہراساں ہوتے وے نزدیک آتے اور حاضر ہوتے ہویں۔ (یسعیاہ 41، باب 5)

''تجھ سے میری نجات زمین کے کناروں تک پہنچی۔'' (یسعیاہ 49 باب 6)

''اس سرزمین کے چاروں کونوں پر آخر آن پہنچا۔

اگر زمین کے کناروں کا ہراساں ہونا اور نزدیک آنا اور حاضر ہونا ممکن ہے تو ان کا گھٹنا کیا ناممکن ہے۔

......☆......

اللہ طرف دار ہے

اعتراض: **اگر یہی بات ہے کہ جس کو چاہتا ہے حکمت دیتا ہے تو جسے چاہے حماقت بھی دیتا ہوگا ایسا خدا نہیں ہوسکتا جو طرف داری سے پاک رہ کر سب کو حکمت بخشتا ہے۔ وہی خدا اور حق پسند ہوسکتا ہے۔ (ستیارتھ پرکارش اعتراض نمبر 44)**

معترض نے آیت يُؤْتِي الْحِكْمَةَ مَنْ يَّشَآءُ (جس کو چاہتا ہے حکمت دیتا ہے) پر کیا ہے۔

جواب: معترض نے شَآ يَشَآءُ اور مشیت کے معنی نہیں سمجھے اور اس کا معنی ارادہ کر لیا ہے۔ خدا کی مشیت اور انسان کی مشیت میں فرق ہے۔

اللہ کی مشیت اس کے قانون کا نام ہے۔ اللہ تعالیٰ نے نظام کائنات کے لیے قانون بنا دیا ہے تمام انسانوں کے لیے قوانین وضع کر دیئے ہیں نظام کائنات اسی قانون کے مطابق چل رہا ہے۔ انسانوں کے لیے قوانین (احکام شریعت) وضع کر دیئے ہیں۔ انسان کو اختیار دیا ہے کہ وہ احکام شریعت (قوانین) کے مطابق زندگی بسر کرے گا۔ تو فلاح پائے گا۔ اگر ان کے ہٹ کر یعنی قانون شکنی اور حکم عدولی سے کام لے گا تو وہ دنیا اور آخرت میں ناکام و نامراد ہوگا۔ اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو عقل دی ہے جو شخص اللہ کے قانون کے مطابق اپنی عقل استعمال کرے گا۔ تو وہ حکمت پا لے گا اور جو شخص عقل و دانش سے کام نہیں لے گا۔ وہ جاہل اور حکمت کی نعمت سے محروم رہے گا۔ جس شخص کو حکمت ملی ہے وہ اللہ کے اس قانون کے مطابق ملی ہے جو اس نے مقرر کیا ہے وہ یہ ہے یعنی عقل سے کام لینا۔ حکمت سے محروم وہ ہوگا جو عقل سے کام نہیں لیتا۔ گویا حکمت کا ملنا اور نہ ملنا قانون الٰہی کے مطابق ہے۔ وہ ہے قانون عقل کو کام میں لانا۔

اگر کوئی شخص حکمت کی نعمت سے محروم ہے تو اس کا قصور اللہ کا نہیں نہ اللہ نے جانب داری سے کام لیا ہے۔ وہ قصور اس شخص کا ہے جس نے اللہ کے قانون کے مطابق کام نہیں کیا۔

کتنا پاکیزہ اصول ہے جس کو معترض نے ہدف تنقید بنایا ہے اس اصول کے تحت انسان اور قومیں ترقی کرتی ہیں۔ وہ انسان اور قومیں کبھی کامیاب نہیں ہوتیں جو اللہ کی دی ہوئی نعمت عقل سے کام نہیں لیتیں۔ یہ اللہ کے قانون کی خلاف ورزی ہے لہٰذا انسان اور قومیں حکمت

سے محروم ہو جاتی ہیں۔ یہی خدا کا چاہنا اور قانون ہے۔ جو کچھ ہو رہا ہے۔ اللہ کے قانون کے مطابق ہو رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے قانون کو تبدیل نہیں کرتا۔ اگر اللہ کے قانون میں تبدیلی آ جائے تو نظام کائنات بگڑ جاتا ہے۔ پس خدا کی مشیت، اللہ کا قانون ہے۔

الزامی جواب: ہندو دھرم میں عالم اور عقل مند کیسے پیدا ہو سکتا ہے اس کے متعلق بر ہدار نیک اپنشد جو نہایت مستند اپنشد ہے اس میں لکھا ہے۔ ''جو شخص چاہے میرا بیٹا پنڈت، عالم، عقلمند، تقریر کرنے والا پیدا ہو۔ سب ویدوں کو جاننے اور پوری عمر پانے والا ہو۔ وہ بڑے بیل کا گوشت اور چاول پکا کر گھی ڈال کر خود کھائے اور بیوی کو کھلائے۔ (بر ہدار نیک اپنشد 17:6:5)

☆......☆

اللہ کا بخشش کے مستحق کو نہ بخشنا اور غیر مستحق کا بخشنا

اعتراض: کیا بخشش کے مستحق کو نہ بخشنا اور غیر مستحق کو بخشنا بے عدل بادشاہ کا سا کام نہیں ہے؟ اگر خدا جسے چاہے بد اور جسے چاہے نیک بناتا ہے تو آدمیوں کو ثواب وعذاب نہ ہونا چاہیے جس صورت میں خدا نے آدمی کو ایسا بنایا کہ جیسا اس نے چاہا۔ تو آدمی کو رنج وراحت نہ ہونی چاہیے مثلاً اگر سپہ سالار کے حکم سے کوئی سپاہی کسی کو مار ڈالے تو اس کا ذمہ دار سپہ سالار ہوگا نہ کہ سپاہی۔ (ستیارتھ پرکاش اعتراض 45)

جواب: یہ اعتراض آیت فَيَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَآءُ وَ يُعَذِّبُ مَنْ يَّشَآءُ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَىْءٍ قَدِيْرٌ پر کیا گیا ہے۔

یہ اعتراض بھی پہلے اعتراض جیسا ہے۔ دونوں جگہ اللہ تعالیٰ کی مشیت کو ہدف تنقید بنایا گیا ہے۔ خدا کا چاہنا ایک بے عقل انسان کے چاہنے کی طرح نہیں ہے۔ اللہ کی ہر صفت اور ہر کام عیب سے پاک ومبرا ہے۔ جیسا کہ پہلے یہ ذکر کیا جا چکا ہے مشیت، اللہ کے قانون کا نام ہے مذکورہ آیت کا یہ مطلب ہے۔ اللہ جس کو بخشتا ہے اس کو اپنے قانون کے مطابق بخشتا ہے اور جس کو عذاب دیتا ہے اس کو بھی اپنے قانون (مشیت) کے مطابق دیتا ہے۔ وہ قانون کیا ہے وہ ہے اللہ کے نازل کردہ احکام شریعت۔ جو شخص ان نازل کردہ قانون کے مطابق زندگی بسر کرتا ہے وہ بخش دیا جاتا ہے جو شخص ان احکام کے مطابق زندگی بسر نہیں کرتا وہ اللہ کے عذاب کا مستحق ٹھہرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس قانون کی وضاحت کئی جگہ قرآن مجید میں کی ہے۔

ارشاد الٰہی ہے۔

فَمَنْ تَبِعَ هُدَایَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ (بقرہ 38:2)

جو میری ہدایت پر چلا نہ ان کو ڈر ہے اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔

دوسری جگہ آتا ہے۔

فَمَنِ اتَّبَعَ هُدَایَ فَلَا يَضِلُّ وَلَا يَشْقٰى (طٰہٰ 123:20)

جو میری ہدایت کی پیروی کرے گا۔ وہ نہ گمراہ ہوگا اور نہ تکلیف میں پڑے گا۔

اگر کوئی غلط راستہ اختیار کرے گا احکام شریعت کی خلاف ورزی کرے گا تو وہ سزا پائے گا۔ ارشاد الٰہی ہے۔

وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَآ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ (بقرہ 39:2)

اور جنہوں نے انکار کیا (احکام شریعت کا) اور ہماری باتوں کو جھٹلایا وہی لوگ آگ والے ہیں وہ اس میں رہیں گے۔
اللہ تعالیٰ کا ایک واضح قانون ہے۔ ارشاد الٰہی ہے۔
وَمَا رَبُّكَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيْدِ (حٰمٓ السجدہ 46:41)
اور تیرا رب بندوں پر کچھ بھی ظلم نہیں کرنے والا۔

پس اللہ کا بخشنا اور عذاب دینا ایک قانون کے مطابق ہے یہی اس کی مشیت ہے۔ مشیت خدا کی طرف داری کا نام نہیں ہے۔ وہ ایک اصول اور قانون کا نام ہے۔ جس کو معترضین سمجھ نہیں پاتے۔ خدا کا مستحق کو نہ بخشنا اور غیر مستحق کو بخشنا قرآن مجید میں کہیں نہیں آیا۔ یہ معترض نے اپنی طرف سے جھوٹ گھڑا ہے۔

اس طرح اللہ جس کو چاہے بد اور جسے چاہے نیک بناتا ہے۔ یہ بھی قرآن مجید میں کہیں ذکر نہیں۔ یہ بھی معترض کا جھوٹ اور افتراء ہے۔

......☆......

قیامت تو ظاہر ہوئی نہیں اس کا چھپانا کیسا صرف ظاہر چیز کو ہی چھپایا جاتا ہے۔

اعتراض: اِنَّ السَّاعَةَ اٰتِيَةٌ اَكَادُ اُخْفِيْهَا تحقیق قیامت آنے والی ہے قریب ہے میں اسے چھپاؤں یہ غلط ہے کیونکہ چھپانا اس کا ہوتا ہے جو ظاہر ہو قیامت تو ظاہر ہی نہیں اس کا چھپانا کیسا۔

جواب: معترض نے جو ترجمہ کیا ہے وہ غلط ہے اس آیت کا آخیر جملہ خود ہی اس کی غلطی کو ظاہر کر دیتا ہے پوری آیت یہ ہے۔
اِنَّ السَّاعَةَ اٰتِيَةٌ اَكَادُ اُخْفِيْهَا لِتُجْزٰى كُلُّ نَفْسٍۢ بِمَا تَسْعٰى (طٰہٰ 15:20)
تحقیق وہ گھڑی آنے والی ہے قریب ہے میں اسے ظاہر کر دوں تا کہ ہر نفس کو اس کے مطابق بدلہ دیا جائے جو وہ کوشش کرتا ہے۔

یہ معنی واضح ہیں کوئی ابہام نہیں اور نہ ان معنوں پر کوئی اعتراض ہو سکتا ہے اگر کوئی یہ کہے اُخْفِيْهَا کا مادہ خفی ہے ان کے معنی ظاہر کروں کیسے ہوئے۔ تو اس کے بارے میں یہ عرض ہے عربی زبان میں بعض الفاظ ایسے ہیں جن کے معنی متضاد ہوتے ہیں یہ لفظ بھی انہی میں سے ہے۔ خفی کے معنی پوشیدہ بھی ہیں اور ظاہر بھی۔

خَفِيَ الْبَرْقُ خَفْوًا وَخَفَوًا اى لَمَعَ یعنی خفی البرق کے معنی ہیں بجلی چمکی خَفِيَ الشَّيْءُ اَىْ ظَهَرَ یعنی چیز ظاہر ہوئی۔ خَفِيَ الْمَطَرُ النَّافِقَا یعنی مینہ نے چوہے کے چھپے بل کو ظاہر کر دیا۔

پس آیت مذکورہ میں اَكَادُ اُخْفِيْهَا کے معنی یہ ہیں میں ارادہ کرتا ہوں اسے ظاہر کروں۔
یہی عربی زبان کا کمال ہے۔ جو معترض کی نظر سے اوجھل ہے۔

......☆......

آسمان اور زمین کے بند اور کھلنے سے مراد (کیا ہے)

اعتراض: سورۃ الانبیاء رکوع 3 کیا نہیں دیکھا انہوں نے جو کافر ہوئے یہ کہ آسمان اور زمین تھے ملے ہوئے پس جدا کیا ہم نے ان دونوں کو۔ یہ سب پر روشن ہے کہ کافر آسمان اور زمین کی جدائی سے پیچھے پیدا ہوئے انہوں نے اپنی پیدائش سے پہلے خدا کو یہ کام کرتے ہوئے کیسے دیکھ لیا۔

جواب: قرآن مجید کی یہ آیت ہے جس پر معترض پادری صاحب نے اعتراض کیا ہے۔

اَوَلَمْ یَرَالَّذِیْنَ کَفَرُوْٓا اَنَّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ کَانَتَا رَتْقًا فَفَتَقْنٰھُمَا وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَآءِ کُلَّ شَیْءٍ حَیٍّ

(الانبیاء21:30)

(کیا جو کافر ہیں وہ غور نہیں کرتے کہ آسمان اور زمین دونوں بند تھے تو ہم نے انہیں کھولا اور ہر زندہ چیز کو ہم نے پانی سے بنایا تو کیا یہ نہیں مانتے۔)

سمٰوٰت جمع ہے سما کی اور اس کے معنی اوپر کی چیز اور بادل کو بھی کہتے ہیں۔ رتق کے معنی ہیں جوڑنا بند کرنا۔ قحط خشک سالی فتق ضد ہے پھاڑنا فتق تھوڑی سی بارش کو بھی کہتے ہیں صبح کے پھٹنے کو بھی۔

آسمان کا رتق یہ ہے کہ اس سے بارش نہ برسے اور زمین کا رتق یہ ہے کہ سبزی نہ اگے۔

لغت میں رویت اور رای کے معنی جن سے یری کا لفظ مشتق قابل غور ہے دیکھو قاموس اللغت۔ الرُّوْیَۃُ اَلنَّظْرُ بِالْعَیْنِ وَالْقَلْبِ وَالرَّائے الاعتقادُ۔ یعنی رویت آنکھ سے دیکھنے دل سے دیکھنے اور رای اعتقاد کرنے کو کہتے ہیں۔

معترض نے عربی زبان سے عدم واقفیت کی وجہ سے رویت کو آنکھ کے ساتھ دیکھنے پر ہی منحصر سمجھا ہے۔ پس آیت کے معنی یہ ہوئے کیا کفار نے نہیں سمجھا کہ آسمان اور زمین ملے ہوئے تھے پس ہم نے ان کو جدا کیا۔

سمٰوٰت جمع ہے سماء کی اور اس کے معنی ہیں اوپر کی چیز اور بادل کو بھی کہتے ہیں۔ رتق کے معنی جوڑنا بند کرنا قحط، خشک سالی، فتق ضد ہے رتق کی۔ اس کے معنی ہیں پھاڑنا، کھولنا، قاموس میں ہے۔

اَلسَّمَآءُ کُلُّ مَا ارْتَفَعَ اِلٰٓی اَنْ قَالَ وَالسَّحَابُ اَلْفِتَقُ الشَّقِ فَتَقَہٗ شَقَّہٗ وَالْخَصَبُ وَالرِّتْقُ ضِدَّہٗ۔

اب ترجمہ یہ ہوا۔ کیا وہ نہیں سوچتے کہ اوپر کی سطح (بادل) اور زمین بند ہوتے ہیں یعنی خشک سالی واقع ہوتی ہے پھر ہم انہیں کھولتے ہیں یعنی مینہ برستا ہے اور ہر جاندار چیز کو پانی سے بناتے ہیں یعنی آسمان سے مینہ برستا ہے۔ زمین سے نباتات نکلتے ہیں سمان ہوتا ہے ارزانی ہوتی ہے۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے اس نظام کائنات کی طرف اشارہ کیا ہے جس کے تحت بارش ہوتی ہے۔ پھر زمین سے نباتات پیدا ہوتی ہے جو جانوروں اور انسانوں کے لیے باعث حیات ہے۔

اگر کوئی شخص سماوات جو سما کی جمع ہے اعتراض کرے تو اسے ایوب 38 باب 37 پڑھنا چاہیے جہاں لکھا ہے۔

کون اپنی دانش سے بادلوں کو گن سکتا ہے۔ عربی اور عبری دونوں زبانیں قریب قریب ہیں۔ یہی محاورہ کتب مقدسہ میں موجود ہے۔ دیکھو پیدائش 7 باب 11-12 آسمان کی کھڑکیاں کھل گئیں چالیس دن اور رات پانی کی جھڑی لگی رہی۔ پیدائش 8 باب 2 آسمان کی کھڑکیاں

بند ہوئیں اور آسمان سے مینہ تھم گیا۔

اول سلاطین 8 باب 35 پھر جب آسمان بند ہو جائیں اور بارش نہ ہو۔

جھے 1 باب 10 آسمان بند ہے اوس نہیں گرتی۔

2 تاریخ 6 باب 26 اگر آسمان بند ہو جائیں اور نہ برسیں۔

2 تاریخ 7 باب 13 جو میں آسمان بند کروں کہ بارش نہ ہو۔

لوقا 4 باب 25 ساڑھے تین برس آسمان بند رہا زمین حاصل دینے سے باز آئی اور میں نے خشک سالی کو طلب کیا۔

اگر توریت کے مذکورہ حوالہ جات کی روشنی میں قرآن مجید کی آیت کی وضاحت کی جائے تو بھی آیت کا مفہوم واضح ہو جاتا ہے آسمان اور زمین کے بند ہونے سے مراد بارش کا نہ ہونا ہے جبکہ آسمان اور زمین کے کھلنے سے مراد بارش اور نباتات کا ہونا ہے۔ آیت کے آغاز میں جو لفظ یرٰ آیا ہے اس کے معنی غور کرنے اور سمجھنے کے ہیں۔ کفار کو نظام کائنات پر غور کرنے کی دعوت دی گئی ہے۔

اگر مذکورہ آیت کو موجودہ دور کی سائنسی تحقیق پر پرکھا جائے تو بھی قرآن مجید کی علمی صداقت ظاہر ہوتی ہے۔ موجودہ دور کی سائنس نے یہ تحقیق کی ہے کہ کائنات کی سب چیزیں ایک غیر ممیز صورت میں باہم ملی جلی تھیں پھر اللہ تعالیٰ نے تمام اجرام کو الگ الگ کر کے ایک دوسرے سے ممیز کیا۔ اس کی طرف آگے کُلٌّ فِي فَلَكٍ يَسْبَحُوْنَ (33) میں اشارہ ہے کہ اب وہ سب اپنے اپنے افلاک میں چکر لگا رہے ہیں۔ سائنس یہی کہتی ہے کہ یہ سب نظام ایک ابتری اور غیر منظم حالت میں سے نکل کر اس موجودہ نظام پر آیا ہے۔

پانی سے ہر چیز کا زندہ ہونا یہ بھی ایک عظیم الشان صداقت ہے جس کا اعتراف سائنس نے بھی کیا ہے اللہ تعالیٰ نے اس صداقت اور حقانیت کا علم ایک اُمی نبی حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے دیا۔ یہ علم صرف قرآن مجید کی صداقت کو ہی ظاہر نہیں کرتا۔ بلکہ اس کتاب کے لانے والے کی صداقت پر بھی مہر ثبت کرتا ہے۔ یہ وہ علم کا خزانہ ہے۔ جس کو آج سائنس ظاہر کر رہی ہے۔

......☆......

بہشتی بہشت میں اور دوزخی دوزخ میں رہیں گے جب تک آسمان اور زمین قائم رہیں گے پر اعتراض

اعتراض: (ا) سورہ ہود 9 رکوع مومن بہشت میں رہیں گے جب تک آسمان و زمین قائم ہیں اور کافر دوزخ میں رہے گے جب تک آسمان و زمین قائم ہیں۔ (ب) سورہ الحاقہ 14 سے 16 تک۔ جب صور پھونکا گیا آسمان پھٹ جائے گا اور زمین الثائی جائے گی۔ (ج) سورہ الرحمٰن 2 رکوع سب کچھ فنا ہو جائے گا۔ لاکن صرف منہ خدا کا باقی رہے گا۔ سورہ الحاقہ اور الرحمٰن سے ظاہر ہے کہ نہ آسمان و زمین رہیں گے اور نہ مومن بہشت میں نہ دوزخی دوزخ میں کیونکہ سب کچھ فنا ہو جائے گا۔ تو یہ بھی سب کچھ کے احاطے سے باہر نہیں اس لیے یہ کذب ہے۔

جواب: خٰلِدِيْنَ فِيْهَا مَادَامَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ اِلَّا مَاشَآءَ رَبُّكَ اِنَّ رَبَّكَ فَعَّالٌ لِّمَا يُرِيْدُ (ھود 11:107)

اسی میں رہیں گے جب تک آسمان اور زمین ہیں مگر جو تیرا رب چاہے کیونکہ تیرا رب جو چاہے کر گزرے یعنی بہشتی بہشت میں اور دوزخی دوزخ میں رہیں گے جب تک آسمان و زمین قائم رہیں گے۔ عربی زبان میں الف لام تخصیص کی علامت ہے پس السمٰوٰت والارض میں سموات اور ارض کے اول میں الف لام تخصیص کا اظہار کرتا ہے اس تخصیص سے مراد وہ خاص آسمان اور زمین مراد ہیں جو اس عالم آخرت کے مناسب اور اس مقام کی صورت طبعی کے اقتضا کے موافق ہوں گے غرض بہشت اور دوزخ میں خاص آسمان اور زمینیں ہوں گی اور موجودہ آسمان اور زمین اپنی حالت سے بدل جائیں گے۔

قرآن مجید میں آتا ہے۔

يَوْمَ تُبَدَّلُ الْاَرْضُ غَيْرَ الْاَرْضِ وَالسَّمٰوٰتُ وَبَرَزُوْا لِلّٰهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ (ابراہیم 48:14)

جس دن یہ زمین دوسری زمین سے بدل دی جائے گی اور آسمان بھی اور لوگ اللہ اکیلے سب پر غالب کے سامنے نکل کھڑے ہوں گے۔

سورہ ہود کی آیت 107 میں یہ بیان کیا گیا ہے بہشتی بہشت میں رہیں گے جب تک آسمان وزمین قائم ہیں اور دوزخی دوزخ میں رہیں گے جب تک آسمان وزمین قائم ہیں۔ یہ آسمان اور زمین ہماری مادی دنیا کے آسمان اور زمین نہیں ہیں۔ اگلے جہاں کی زندگی کی کیا کیفیت ہو گی۔ وہ اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔ یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے اس دنیا کی زندگی دوسری دنیا (اگلے جہاں) کی زندگی سے مختلف اور مختلف نوعیت کی ہوگی۔

ایک اہم بات یادرکھنی چاہیے کہ دوزخ کی زندگی دائمی نہیں بلکہ عارضی ہے۔ ہر عاصی روح اپنی سزا کاٹ کر دوزخ سے باہر نکال لی جائے گی۔ روحانی بیماریوں کے لیے دوزخ بطور علاج کے ہے اللہ تعالیٰ کی بعض صفات اس بات کا متقاضی ہیں کہ دوزخ کا عذاب دائمی نہ ہو۔ پہلی صفت ''رب'' وہ ذات ہے جو تدریجاً ایک چیز کو اپنے کمال تک پہنچاتی ہے پھر رب کی اضافت عالمین کی طرف یعنی تمام جہانوں کا رب یعنی ان کو درجہ کمال تک پہنچانے والا کسی مشرک اور موحد کی تخصیص نہیں کی گئی کہ اللہ صرف موحدین کا رب ہے۔ جس طرح اللہ کی ربوبیت عام ہے کوئی تخصیص نہیں کافر فاسق ظالم اور مسلمان ہندو عیسائی یہود غرض کہ ہر انسان اللہ تعالیٰ کی ربوبیت سے متمتع ہو رہا ہے اپنا مادی فیض حاصل کر رہا ہے قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کی یہ صفت اپنی کمال شکل میں ظاہر ہوگی ہر شخص اس صفت کے زیر سایہ روحانی کمال حاصل کرے گا جو لوگ جنت میں جائیں گے وہ تدریجاً مزید روحانی زندگی حاصل کرتے چلے جائیں گے اسی طرح جو جہنم میں جائیں گے ان کو اس وجہ سے دوزخ میں ڈالا جائے گا کہ دنیا میں روحانی ترقی حاصل کرنے کے لیے جو خامیاں رہ گئی تھیں ان کی اصلاح کی جائے دراصل جہنم روحانی امراض کی شفا کی جگہ ہے جب اصلاح ہو جائے گی تو خدا کی صفت ربوبیت کے تحت روحانی راستہ پر گامزن ہو جائے گا۔ تاکہ روحانی کمال حاصل کرے۔ قرآن مجید کی رو سے ہر شخص کا روحانی کمال لقا الٰہی ہے۔ ارشاد الٰہی ہے۔

يٰٓاَيُّهَا الْاِنْسَانُ اِنَّكَ كَادِحٌ اِلٰى رَبِّكَ كَدْحًا فَمُلٰقِيْهِ (الانشقاق 6:84)

اے انسان تو سخت کوشش کر کے اپنے رب کی طرف پہنچنے والا پھر اسے ملنے والا ہے۔

اس آیت میں بھی لفظ ''انسان'' لا کر موحد اور غیر موحد کی تخصیص ختم کر دی ہے ہر شخص خدا سے ملنے والا ہے۔

دوزخ انسان کے اپنے کسب کا نتیجہ ہے اور آگ روحانی مدارج کے محصول کا ذریعہ ہے وہ آگ انسان کی روحانی امراض کی صلاح کے لیے ہے۔

حضرت ابوہریرہ کا قول ہے۔

سَيَاتِيْ عَلٰى جَهَنَّمَ زَمَانٌ لَا يَبْقٰى فِيْهَا اَحَدٌ جہنم پر ایک وقت آئے گا کہ اس میں کوئی بھی باقی نہ رہے گا۔ ابن مسعود کا قول ہے لَيَاتِيَنَّ عَلٰى جَهَنَّمَ زَمَانٌ تُخْفَقُ فِيْهَا اَبْوَابُهَا لَيْسَ فِيْهَا اَحَدٌ وَ ذَالِكَ بَعْدَ مَا يَلْبَثُوْنَ فِيْهَا اَحْقَابًا یعنی دوزخ پر ایک ایسا وقت

آئے گا اس کے دروازے کھٹکھٹائے جائیں گے اس میں کوئی نہ ہوگا اور اس کے بعد ہوگا جو اس میں احقاب (صدیوں) تک رہ چکے ہوں گے ابن عمر اور ابن العاس کا قول ہے لَیَاتِیَنَّ عَلٰی جَھَنَّمَ یَوْمٌ تَصْفَقُ فِیْھَا اَبْوَابُھَا لَیْسَ فِیْھَا اَحَدٌ جہنم پر ایک ایسا وقت آئے گا کہ دروازے بند ہو جائیں گے اور اس میں کوئی نہیں ہوگا۔ اسی قسم کے اقوال ابن عباس ابن عمر جابر ابوسعید سے مروی ہیں ایسے ہی اقوال تابعین سے بھی ہیں حضرت امام ابن تیمیہ اور ابن قیم کا بھی یہی مسلک ہے (شفاالعلیل 524 تا 269۔ حاوی الارواح ص 167 تا 235) شیخ محمد الدین ابن العربی اور ان کے متبعین کا یہ نظریہ ہے کہ دوزخ میں ہی راحت اور لذت محسوس کرنے لگ جائیں گے۔

(ب) سورہ الحاقہ 14 سے 16 تک جب صور پھونکا جائے گا تو آسمان پھٹ جائے گا اور زمین الٹائی جائے گی۔

(ج) سورہ رحمٰن 2 رکوع سب کچھ فنا ہو جائے گا لاکن صرف منہ خدا باقی رہے گا۔ سورہ الحاقہ اور الرحمٰن سے ظاہر ہے کہ نہ آسمان وزمین رہیں گے اور نہ مومن بہشت میں نہ دوزخی دوزخ میں کیونکہ سب کچھ فنا ہو جائے گا۔

یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ ہر مذہب نے اس دنیا کے فنا ہونے اور خدا کے سامنے حاضر ہونے کی تعلیم دی ہے فنا کی کیفیت اور نوعیت کو مختلف انداز میں بیان کیا گیا ہے توریت کا مطالعہ کیجیے ''اے خدا تو نے ابتدا میں زمین کی نیو ڈالی اور آسمان تیرے ہاتھ کی کاریگری ہے وے نیست ہو جائیں گے پر تو باقی ہے وے سب پوشاک کے مانند پرانے ہوں گے اور چادر کی طرح تو انہیں لپیٹے گا اور وے بدل جائیں گے پر تو وہی ہے اور تیرے برس جاتے نہ رہیں گے۔ (نامہ عبرانیاں 1 باب 11-13)

پطرس کہتا ہے کہ خداوند کا دن جس طرح رات کو چور آتا ہے اور اسی میں آسمان سناٹے کی طرح جاتے رہیں گے اور اجرام فلکی جل کر گداز ہو جائیں گے اور زمین ان کاریگروں سمیت جو اس میں ہیں بھسم ہو جائے گی۔

پطرس فرماتا ہے اجرام فلکی اور زمین مع اپنے کاریگروں کے فنا ہو جائیں گے۔

قرآن مجید کے مجازات استعارات پر غور وخوض کیجیے پھر توریت کے الفاظ پر تدبر کریں۔ دونوں میں دنیا میں تباہی کے طریقوں میں مماثلت نظر آئے گی ہر چیز پردہ فنا میں چلی جائے گی۔ صرف اللہ کی ذات باقی رہ جائے گی۔ ارشاد الٰہی ہے۔

کُلُّ شَیْءٍ ھَالِكٌ اِلَّا وَجْھَهٗ (قصص 88:28)

ہر چیز ہلاک ہونے والی ہے سوائے اس کی ذات کے (اللہ کے)

دوسری جگہ آتا ہے۔

کُلُّ مَنْ عَلَیْھَا فَانٍ وَّیَبْقٰی وَجْهُ رَبِّكَ ذُوالْجَلَالِ وَالْاِکْرَام (الرحمٰن 55:26-27)

سب جو اس کے اوپر ہیں فنا ہونے والے ہیں اور تیرے رب کی ذات باقی رہتی ہے جو جلال اور غیرت والی ہے۔ ان آیات کا مطلب ہے کہ بقا صرف اللہ کی ذات کو ہے۔ باقی تمام اشیاء فنا ہونے والی ہیں۔

پطرس کہتا ہے اور کہ تم خدا کے اس دن کے آنے کے منتظر ہو جس میں آسمان جل کر گداز ہو جائیں گے پر ہم نئے آسمان اور نئے زمین کی جن میں راست بازی بستی ہے اس کے وعدے کے موافق انتظاری کرتے ہیں۔ (2 پطرس 3 باب)

قرآن مجید میں اس دنیا کے فنا کے متعلق کہا جا رہا ہے اسی طرح توریت میں بھی اس دنیا کے فنا کی بابت کہا جا رہا ہے دوسرے جہاں کے متعلق نہیں کہا جا رہا۔ وہ جہاں تا ابد ہے۔ اُس دنیا کے زمین وآسمان پر تباہی کبھی نہیں آئے گی۔ اس لیے اس جہان میں مومنوں کے لیے بہشت بھی اور دوزخی کی اصلاح کے لیے دوزخ بھی قائم رہیں گے۔ دوسری دُنیا کے بہشت اور دوزخ کے قائم رہنے کا تعلق اس دنیا کی فنا سے ہرگز نہیں۔

الزامی جواب: جب انجیل اور تورات کی رو سے بھی زمین وآسمان اور سب کچھ پردہ فنا میں چلے جائیں گے تو پھر مسیح علیہ السلام کس کی

عدالت میں حاضر ہوں گے اور عیسائیوں کو گناہوں سے نجات دلا کر ابدی آرام پہنچائیں گے۔

اس دنیا کے زمین و آسمان کے فنا کا تعلق دوسری زندگی کے بہشت اور دوزخ سے نہیں وہ ایک الگ دنیا ہوگی اس کا نیا آسمان اور نئی زمین ہوگی اور ایک نئی زندگی ہوگی۔ اس کا علم انسان کو اتنا ہی ہے جتنا انبیاء علیہم السلام خصوصاً حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم نے دیا ہے۔ اس سے آگے نہیں بڑھنا چاہیے۔

☆......☆

آدم کی پیٹھ سے بیٹوں کا نکالا جانا اور ان سے وعدہ لیا جانا کہ خدا کے سوا کوئی معبود نہیں یہ کذب ہے

اعتراض: سورہ اعراف 22 رکوع 173 آدم کے بیٹے اس کی پیٹھ سے نکالے گئے اور ان سے وعدہ کرایا گیا کہ خدا کے سوا کوئی ماننے کے قابل نہیں یہ کذب ہے ہنود کے مقبولہ مسئلہ تناسخ کے مثل معلوم نہیں خدا نے کب اقرار لیا سچ ہو تو بھی خدا کا مطلب نہ نکلا یہی کذب ہے۔

جواب: معترض کے زیر اعتراض یہ آیت ہے۔ وَاِذْ اَخَذَ رَبُّكَ مِنْ بَنِيْٓ اٰدَمَ مِنْ ظُهُوْرِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ وَاَشْهَدَهُمْ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ قَالُوْا بَلٰى شَهِدْنَا (اعراف 172:7)

اور جب تیرے رب نے بنی آدم سے یعنی ان کی پیٹھوں سے ان کی اولاد نکالی اور ان کو اپنے آپ پر گواہ ٹھہرایا کیا میں تمہارا رب نہیں انہوں نے کہا ہم گواہ ہیں۔

اس آیت میں میثاق فطرت کا ذکر ہے یعنی اللہ نے فطرت انسانی میں ایک نور پیدا کر رکھا ہے جو اسے حق کی طرف راہنمائی کرتا ہے اور اللہ کی ربوبیت پر گواہی دیتا ہے۔ خارج سے انبیاء علیہم السلام پر وحی نبوت یا اولیاء کرام پر وحی ولایت اس نور کی معاون ہو کر اس کی تکمیل کرتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا لوگوں کو ہدایت دینے کے عجیب طریقے ہیں پہلے اس کی فطرت میں خدا کی توحید کی پہچان کا بیج بو دیا ہے۔ پھر اس بیج کی نشوونما کے لیے وحی کا سلسلہ جاری کیا۔ یعنی انبیاء علیہم السلام ہدایت کے لیے بھیجے انہوں نے انسانوں کو اللہ کی ربوبیت کی طرف دعوت دی۔ اس طرح اللہ تعالیٰ نے فطرت انسانی کے نور کو زندہ رکھا۔ اشهدهم على انفسهم اپنے آپ پر گواہ ٹھہرانے سے مراد یہ ہے کہ دلائل ربوبیت ان کی فطرت میں رکھ دیئے اور عقل انسانی میں ان کو مرکوز کر دیا اسی کی طرف حدیث اور قرآنی آیت اشارہ کرتی ہیں كُلُّ مَوْلُوْدٍ يُوْلَدُ عَلَى الْفِطْرَةِ یعنی ہر ایک بچہ فطرت صحیحہ پر پیدا ہوتا ہے قرآن مجید میں فرمایا۔

فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِيْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا (روم 30:30)

اللہ کی پیدا کی ہوئی فطرت جس پر سب لوگوں کو پیدا کیا۔

پس وہ آیت جس پر معترض نے اعتراض کیا ہے اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ فطرت انسانی اس بات کا اقرار کرتی ہے کہ انسان اپنا رب آپ نہیں بلکہ اس کا رب وہ ذات جو تمام صفات کاملہ کا مالک ہے اور ہر قسم کے عیوب سے منزہ ہے۔

اللہ تعالیٰ نے انسان کو توحید پر قائم رکھنے کے لیے مختلف طریقے اختیار کیے ہیں ان میں سے ایک طریقہ میثاق فطرت ہے یعنی انسان کی

فطرت میں توحید کا بیج بو دیا ہے۔ یعنی اس کی عقل میں مرکوز کر دیا ہے پھر اس کے علاوہ خارج میں اس بیج کی نشو ونما کے لیے مزید ذرائع پیدا کیے ہیں ان میں سے ایک سلسلہ رسالت ہے جو اللہ تعالیٰ نے لوگوں کی ہدایت کے لیے مختلف اوقات میں مختلف علاقوں میں نبی بھیجے۔ انہوں نے خدا کا پیغام دیا آخر میں حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم بھیجے گئے۔ جنہوں نے توحید کے پیغام کو مکمل شکل میں انسانوں کے سامنے پیش کیا۔ یہ پیغام اور وحی فطرتی نور کی تکمیل کے لیے تھا۔

دنیا میں ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں ان کے اندر کسی باعث سے وہ فطرتی قوت بالکل مرجاتی ہے تو وہ لوگ تباہی کے گڑھے میں جاگرتے ہیں اور شیطان کے بندے بن جاتے ہیں۔ یہ ان کا اپنا قصور ہے۔ اللہ تعالیٰ کی ذات اس سے منزہ ہے۔

خدا کا یہ اقرار اللہ تعالیٰ کے اس قانون کا حصہ ہے کہ جس کے تحت بنی نوع انسان کو راہ ہدایت پر گامزن کر کے منزل مقصود تک پہنچانا ہے۔ راہ ہدایت پر چلانے کے لیے سب سے پہلے اللہ تعالیٰ نے اپنی ہستی کا شعور اس کی فطرت میں رکھ دیا۔ پھر اس کے بعد سلسلہ وحی شروع کیا یہ سلسلہ وحی اس فطرتی نور (ہستی باری تعالیٰ کا شعور) کی تکمیل کے لیے ہے۔ گویا الوہیت ایزدی کا اعتراف انسان کا فطرتی امر ہے یہی قرآن مجید کا اعجاز ہے کہ دقیق مسائل کو اس نہج اور طریق سے بیان کرتا ہے اس سے عالم وجاہل یکساں فائدہ اٹھاتے ہیں۔ عیسائی معترضین ان دقیق مسائل کی طرف توجہ نہ دیں تو یہ ان کی عقل کا نقص ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اپنی الوہیت کا ذکر کس خوبصورتی کے ساتھ کیا ہے انسان کو یہ بتایا ہے خدا کا جو تصور ہے وہ تمہاری فطرت کی آواز ہے۔ تم اس کا شعور رکھتے ہو۔ انسان کی فطرت میں اللہ کی ہستی کے احساس کی ایک دلیل یہ بھی ہے کہ جب کوئی انسان مصائب اور آلام کے گرداب میں پھنس جاتا ہے اور اس سے نکلنے کا کوئی رستہ نہیں پاتا ہر طرف تاریکی ہی تاریکی نظر آتی ہے تو اس کا اندرونی شعور بیدار ہو جاتا ہے آستانہ الوہیت پر گر جاتا ہے اپنے اللہ سے اس گرداب سے نکلنے کی دعا کرتا ہے۔ قرآن مجید میں آتا ہے۔

وَاِذَآ اَنْعَمْنَا عَلَى الْاِنْسَانِ اَعْرَضَ وَنَاٰ بِجَانِبِهٖ وَاِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ فَذُوْ دُعَاۗءٍ عَرِيْضٍ (حم السجدہ 41:51)

اور جب ہم انسان پر انعام کرتے ہیں تو وہ منہ پھیر لیتا ہے اور جب اسے تکلیف پہنچتی ہے تو وہ لمبی چوڑی دعا میں لگ جاتا ہے۔

یہ آیت ظاہر کرتی ہے جب انسان پر مصیبت آتی ہے تو اس کا فطرتی نور چمک اٹھتا ہے اور اپنے حقیقی مولا اور پروردگار کی طرف رجوع کرتا ہے مصائب میں اللہ کی طرف رجوع کرنا اس امر پر دلالت کرتا ہے کہ انسان کی فطرت میں اللہ کی ہستی کا شعور ودیعت ہے۔ یہی اللہ کے وجود کی شہادت ہے۔ اس کا اقرار ارواح نے اللہ تعالیٰ سے کیا ہے۔ یہ اقرار زبان حال سے ہے۔ اگر معترض اس دقیق معرفت کے نکتہ کو نہیں سمجھتا تو یہ اس کی عقل کی خرابی ہے۔

الزامی جواب: متی 17 باب 3 حواریوں کے روبرو جب مسیح مجسم تھے موسیٰ اور ایلیا مسیح کو ملے۔

ایوب 38 باب 5 زمین کے کونے کا پتھر رکھتے وقت صبح کے ستارے مل کے گاتے تھے اور سارے نبی اللہ خوشی کے مارے للکارتے تھے۔ عیسائی معترضین ذرا غور کریں کہ موسیٰ تو مسیح مجسم سے سینکڑوں برس پہلے فوت ہو چکے تھے ایلیا بھی اس سے قبل مر چکے تھے پھر مسیح بن مریم کو کیسے ملے کیا پھر دوسرا جنم دھارا تھا۔

آدم حسب بیان پیدائش، زمین کے بننے کے بعد پیدا ہوئے یہ سارے نبی اللہ کہاں سے آ گئے اور کب پیدا ہوئے۔

عیسائی معترضین جو تاویل ان آیات کی نسبت بیان کریں گے وہی قرآن مجید کی آیت کی نسبت سمجھ لیجیے۔

......☆......

یہود کا بندر بننا (کب، کس ملک میں کس شہر میں)

اعتراض: سورہ بقرہ 18 رکوع اعراف 21 رکوع مائدہ 9 رکوع میں ہے۔ یہود بندر بن گئے۔ کب کس ملک میں کس شہر میں یہ عظیم واقعہ ہوا۔ ان لوگوں کے قرب وجوار والوں سے کس نے لکھا۔

جواب: وَلَقَدْ عَلِمْتُمُ الَّذِيْنَ اعْتَدَوْا مِنْكُمْ فِي السَّبْتِ فَقُلْنَا لَهُمْ كُوْنُوْا قِرَدَةً خَاسِئِيْنَ (بقرہ 65:2) اور بے شک تم ان کو جانتے ہو جو تم میں سے سبت کے معاملہ میں حد سے نکل گئے پس ہم نے ان سے کہا کہ تم ذلیل بندر ہو جاؤ۔

قُلْ هَلْ اُنَبِّئُكُمْ بِشَرٍّ مِّنْ ذٰلِكَ مَثُوْبَةً عِنْدَ اللّٰهِ مَنْ لَّعَنَهُ اللّٰهُ وَ غَضِبَ عَلَيْهِ وَجَعَلَ مِنْهُمُ الْقِرَدَةَ وَالْخَنَازِيْرَ (مائدہ 60:5)

کہہ میں تم کو بتاؤں کہ اللہ کے نزدیک اس سے بدتر بدلہ پانے والا کون ہے وہ جس پر اللہ نے پھٹکار کی اور اس پر ناراض ہوا اور ان میں سے بندر اور سور بنائے۔

لُعِنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ بَنِيْٓ اِسْرَآئِيْلَ عَلٰى لِسَانِ دَاوٗدَ وَ عِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ (مائدہ 78:5)
جن لوگوں نے بنی اسرائیل میں سے کفر کیا۔ ان پر داؤد اور عیسیٰ ابن مریم زبان سے لعنت کی گئی ہے۔

سبت لغت میں آرام کو کہتے ہیں قاموس السبت الراحۃ اور ہفتے کے دن کو بھی کہتے ہیں۔

یہودیوں کو ہفتہ میں ایک دن یعنی شنبہ (ہفتہ) کو کاروبار نہ کرنے کا حکم تھا۔ انہوں نے اس حکم کی نافرمانی کی۔ یہ دن ان کی عبادت کا مقرر تھا۔ اس دن بھی آستانہ الوہیت پر نہ آئے اور دنیا کے حصول میں لگ گئے تو وہ اخلاق فاضلہ کے زیور سے عاری ہو گئے تو اللہ کا غضب ان پر بھڑکا تو وہ ذلیل وخوار ہو گئے اور ان کی حالت ذلت اور ادبار کی وجہ سے گویا بندروں سوروں اور کتوں کی سی ہو گئی۔ اس مجاز کو اللہ تعالیٰ نے بیان کیا ہے امام مجاہد سے اس کی تفسیر یوں مروی ہے۔ قَالَ مَسَخَتْ قُلُوْبُهُمْ لَمْ يَمْسَخُوْا قِرَدَةً یعنی ان کے دل مسخ ہو گئے اور صورتیں مسخ ہو کر بندر نہیں بنیں۔ مفردات میں منقول ہے قِيْلَ بَلْ جَعَلَ اَخْلَاقَهُمْ كَاَخْلَاقِهَا یعنی ان کے اخلاق بندروں کے سے ہو گئے۔

عربی زبان میں بندر کی مثال زنا کی کثرت کے لیے دی جاتی ہے۔ ازنی من قرد یہودیوں میں اس بدی کی کثرت پر بائبل بھی گواہ ہے۔ ''تیرے بیچ وے ہیں جو فسق وفجور کرتے ہیں تیرے بیچ باپ کو بھی انہوں نے بے ستر کیا۔ کسی نے دوسرے کی جورو سے برا کام کیا ہے اور دوسرے نے اپنی بہو سے بدذاتی کی ہے اور کسی نے اپنی بہن اپنے باپ کی بیٹی کو تیرے درمیان خراب کیا۔'' (حزقیل 22:9-11) ان تمام باتوں کی وجہ سے ان یہود کو بندر سے تشبیہ دی ہے۔

معترض کو یہ معلوم ہونا چاہیے یہ مجاز ہیں جو ہر زبان میں ملتے ہیں۔ ہر زبان میں مجازی رنگ پایا جاتا ہے۔ یہ ادب کا حسن ہوتا ہے۔

دوم۔ معترض نے یہ بھی سوال دہرایا ہے یہ کہاں کا واقعہ ہے کتاب مقدسہ سے اس گاؤں کا پتہ لگا دیتے ہیں وہ گاؤں یروشلم ہے۔ نحمیا 13 باب 16 اور وہاں کے صور کے لوگ بھی تکتے تھے جو مچھلی اور ہر طرح کی چیزیں لا کر سبت کے دن یہوداہ اور یروشلم کے لوگوں کے ہاتھ بیچتے تھے تب میں نے یہوداہ کے شریف لوگوں سے تکرار کر کے کہا کہ یہ کیا بُرا کام ہے جو تم کرتے ہو۔ کہ سبت کے دن کو مقدس نہیں جانتے ہو کیا تمہارے باپ دادوں نے ایسا کام نہیں کیا اور ہمارا خدا ہم پر اور اس شہر پر یہ سب آفتیں نہیں لایا تب بھی تم سبت کے دن کو پاک نہ مان کر اسرائیل پر زیادہ غضب بھڑکاتے ہو۔

دیکھو یرمیاہ باب 34، حزقیل باب 20، 44,22,20 سبت کی عدم حفاظت پر عذاب الٰہی آتا تھا۔
زبور 105:29 ان کی مچھلیوں کو مار ڈالا یہ گویا وہ غضب الٰہی کی علامت ہے۔
حزقیل 47 باب 6-12 مچھلیوں کی کثرت ہوگئی یہ اللہ کے فضل کی نشانی ہے۔
قرآن مجید نے بھی اس واقعے کا ذکر یوں کیا ہے۔
اِذْ تَاْتِيْهِمْ حِيْتَانُهُمْ يَوْمَ سَبْتِهِمْ شُرَّعًا
یہود کو سبت کے دن کاروبار چھوڑ کر عبادت الٰہی کرنے کا حکم تھا۔ اس شریر قوم نے حکم عدولی کی۔ اس لیے اللہ کا غضب ان پر نازل ہوا۔ وہ اخلاق عالیہ سے عاری ہو گئے۔ معاشرتی بیماریوں میں مبتلا ہو گئے۔ ان معاشرتی اور اخلاقی برائیوں کی وجہ سے مجازی رنگ میں وہ بندر اور سؤر کہلائے۔

......☆......

حضرت نوح کا بیٹا کنعان طوفان میں مرا

(یہ غلط ہے کنعان بعد طوفان پیدا ہوا)

اعتراض: سورہ ہود 4 رکوع 23,22 نوح کا بیٹا طوفان میں ڈوب مرا مفسرین نے اس کا نام کنعان بتایا ہے اور یہ غلط ہے کنعان بعد طوفان پیدا ہوا۔

جواب: معترض نے خود اقرار کرلیا ہے کہ قرآن مجید میں اس کا نام کنعان نہیں ہے اور مفسرین نے کنعان بیان کیا ہے۔ اس لیے کسی مفسر کی رائے اور تحقیق پر تو اعتراض کیا جاسکتا ہے لیکن کسی مفسر کی تحقیق کو بنیاد بنا کر قرآن مجید پر اعتراض نہیں کیا جاسکتا البتہ مفسرین نے دو نام لکھے ہیں ایک یام بن نوح (فتح البیان اور قاموس لغت) قرآن کا غور سے مطالعہ کیا جائے اس میں یہ نہیں لکھا کہ وہ نوح کا بیٹا حقیقی تھا۔ بلکہ قرآن مجید میں ہے۔

اِنَّ ابْنِيْ مِنْ اَهْلِيْ (ہود 11:45)
میرا بیٹا میری بی بی کی طرف سے ہے قرآن تو صاف کہتا ہے کہ یہ لڑکا تیرے اہل کا بیٹا بھی نہیں۔
ارشاد الٰہی ہے۔
اِنَّهٗ لَيْسَ مِنْ اَهْلِكَ اِنَّهٗ عَمَلٌ غَيْرُ صَالِحٍ (ہود 11:46)
وہ تیرے اہل سے نہیں ہے کیونکہ وہ بدعمل ہے۔
لہٰذا قرآن مجید میں کہیں بھی حضرت نوح کے بیٹے کا نام کنعان نہیں لکھا اور معترض کو بھی اقرار ہے۔ اعتراض خود بخود دور ہو جاتا ہے۔

......☆......

شیطان لوگوں کو گمراہ کرتا ہے شیطان کا گمراہ کنندہ خدا ہے

اعتراض: اس کا خلاصہ یہ ہے کہ شیطان لوگوں کو بہکاتا ہے شیطان کا گمراہ کنندہ خدا ہے شیطان نے خدا کے مونہہ پر کہہ دیا۔ (ترک اسلام دھرم پال سوال نمبر 12)

سوامی دیانند سرسوتی نے بھی ستیارتھ پرکاش کے چودھویں باب اعتراض 11 میں اسی بات کو دہرایا ہے۔

خدا ہمہ دان نہیں اگر ہوتا تو شیطان کو پیدا ہی کیوں کرتا اور خدا میں کچھ قدرت بھی نہیں کیونکہ شیطان نے خدا کا حکم ہی نہ مانا اور خدا اس کا کچھ بھی نہ کرسکا اور دیکھیئے ایک کافر شیطان نے خدا کے چھکے چھڑوا دیئے۔

جواب: قرآن مجید میں ہر وہ بدکار گمراہ کنندہ جو لوگوں کو احکام شریعت کے خلاف بلاتا اور ہلاکت کے راستے پر چلاتا ہے اس کو شیطان کہا ہے۔ اس قسم کے لوگ ہر دور میں پائے جاتے ہیں۔

حضرت آدم علیہ السلام کے دور میں بھی تھے۔ جنہوں نے حضرت آدم کی دعوت اسلام کا انکار کیا۔ یہ ایک امر واقعہ ہے کوئی شخص اس کا انکار نہیں کرسکتا اگر کوئی شخص قرآن مجید کی اصطلاح سے چڑ کھاتا ہے تو تاریخ عالم کی تکذیب کرتا ہے جب دنیا میں اس قسم کے لوگوں سے خالی نہ تھی۔ قرآن مجید نے تو ان کی نشان دہی کی ہے۔

اَبٰی وَاسْتَکْبَرَ وَکَانَ مِنَ الْکَافِرِیْنَ (بقرہ2:34)

اس نے انکار کیا اور تکبر کیا اور وہ کافروں میں سے تھا۔ اس سے معلوم ہوا اللہ نے شیطان (شیطانی لوگوں) کو گمراہ نہیں کیا بلکہ وہ خود گمراہ ہوا اور ہلاک ہوا۔

معترض نے قرآن مجید کی اس آیت سے ٹھوکر کھائی ہے۔ ارشاد الٰہی ہے۔

قَالَ رَبِّ بِمَا اَغْوَیْتَنِیْ لَاُزَیِّنَنَّ لَهُمْ فِی الْاَرْضِ وَلَاُغْوِیَنَّهُمْ اَجْمَعِیْنَ (الحجر15:40)

کہا میرے رب جیسا کہ تو نے مجھے گمراہ ٹھہرایا میں انہیں زمین میں (نافرمانی) کو خوبصورت بنا کر دکھاؤں گا اور ان سب کو (حصول مقصد میں) ناکام رکھوں گا۔

اَغْوَیْتَنِیْ کے معنی گمراہ کرنا نہیں بلکہ ایک گمراہ کی گمراہی کی وجہ سے اس پر گمراہی کی مہر ثبت کرنا ہے یعنی گمراہ کے افعال کی وجہ سے اس کو گمراہ ٹھہرانا۔

پس اغوا کے معنی اضلال ہیں گمراہ ٹھہرایا۔

آیت میں الفاظ لَاُغْوِیَنَّهُمْ اَجْمَعِیْنَ آئے ہیں۔

معترض نے یہاں پھر غلطی کھائی ہے کہ میں ان سب کو گمراہ کروں گا۔

غَوٰی کا معنی خَابَ یعنی ناکام ہوا اور اغواء کے معنی ناکام رکھنا ہے۔

امام راغب کہتے ہیں اَلْغَیُّ جَهْلٌ مِنِ اعْتِقَادٍ فَاسِدٍ یعنی غی وہ جہالت ہے جو اعتقاد فاسد سے پیدا ہو۔ اسی لیے عَصٰی آدَمُ رَبَّهٗ

فَغَوٰی (طٰہٰ 121:20) میں غوی کے معنی جہل کیے گئے ہیں اور غوی کے معنی خاب یعنی ناکام رہا بھی کیے گئے ہیں۔

ابن جریر نے اَغْوَیْتَنِیْ کے معنی اَهْلَكْتَنِیْ (تو نے مجھے ہلاک کیا) بھی کیے ہیں۔

پس اَغْوَیْتَنِیْ کے یہ معنی بالکل غلط ہیں تو نے مجھے بدراہ پر لگایا۔ قرآن مجید میں کسی جگہ بھی یہ ذکر نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے نافرمانی کا حکم دیا۔ بلکہ حکم فرمانبرداری کا ہی دیا۔

قرآن مجید میں شیطان کی نسبت آتا ہے۔ اِنَّ عِبَادِیْ لَیْسَ لَكَ عَلَیْهِمْ سُلْطٰنٌ (بنی اسرائیل) کہ بے ریب میرے بندوں پر تیرا کوئی تسلط نہیں۔

قرآن مجید میں شیطان کا بھی قول ہے۔

مَا كَانَ لِیَ عَلَیْكُمْ مِّنْ سُلْطٰنٍ اِلَّاۤ اَنْ دَعَوْتُكُمْ فَاسْتَجَبْتُمْ لِیْ فَلَا تَلُوْمُوْنِیْ وَلُوْمُوْۤا اَنْفُسَكُمْ (ابراہیم 22:14)

اور میرا تم پر کوئی غلبہ نہ تھا مگر میں نے تمہیں بلایا تو تم نے میری بات مان لی سو مجھے ملامت نہ کرو اور اپنے آپ کو ملامت کرو۔

یہ دونوں آیات ظاہر کرتی ہیں جو لوگ احکام شریعت کے مطابق زندگی بسر کر رہے ہوتے ہیں۔ وہ شیطان کے جال میں نہیں آتے۔ جال میں وہی آتے ہیں جنہوں نے احکام شریعت پس پشت ڈال دیا ہوا ہے جب شیطان شیطانی امور کی طرف بلاتا ہے تو وہ لوگ شیطان کے بہکاوے میں آجاتے ہیں۔ جب محاسبہ کا وقت آتا ہے تو شیطان اپنی بے زاری کا اظہار کر دیتا ہے۔ کہ تم مجھے مجرم قرار نہ دو اپنے آپ کو ملامت کرو۔ یا تم نے میرے بلانے پر میری پیروی کی۔

یہ آیت ظاہر کرتی ہے کہ شیطان کسی کی گمراہی کے لیے علت تامہ نہیں بلکہ وہ ایک مشیر بد کی طرح برے خیالات کی طرف بلانے والا ہے جو لوگ بُرا راستہ اختیار کرتے ہیں وہ اپنی کوتاہی اور کم علمی کی وجہ سے کرتے ہیں۔ یہی خدا کا قانون ہے کہ اس نے نیکی کا راستہ بھی دکھا دیا ہے اور بدی کا راستہ بھی بتا دیا ہے۔ اب انسان کو اختیار دیا ہے کہ وہ جس راستہ پر چاہے گامزن ہو۔ یہ اس کی اپنی مرضی ہے کوئی جبر نہیں۔

فَمَنْ تَبِعَ هُدَایَ فَلَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَلَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ (بقرہ 38:2)

جو میری ہدایت پر چلا نہ ان پر کوئی ڈر ہے اور نہ وہ غمگین ہوں۔

دوسری جگہ آتا ہے۔

فَمَنِ اتَّبَعَ هُدَایَ فَلَا یَضِلُّ وَلَا یَشْقٰی (طٰہٰ 123:20)

جو کوئی میری ہدایت کی پیروی کرے گا وہ نہ گمراہ ہوگا اور نہ تکلیف میں پڑے گا۔

غلط راستہ پر گامزن ہونے والے کے متعلق ارشاد ہے۔

وَمَنْ اَسَآءَ فَعَلَیْهَا وَمَا رَبُّكَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِیْدِ (46:41)

اور جو کوئی برا راستہ اختیار کرتا ہے تو اس کا وبال اس پر ہے اور تیرا رب بندوں پر کچھ بھی ظلم کرنے والا نہیں۔

وَمَاۤ اَصَابَكَ مِنْ سَیِّئَةٍ فَمِنْ نَّفْسِكَ (النساء 79:4)

اور جو (برے کام کے نتیجہ میں) تجھے دکھ پہنچتا ہے وہ تیرے ہی نفس سے ہے۔

اللہ تعالیٰ نے راہ راست پر چلنے کے لیے انسان کو عقل سے نوازا ہے۔ انبیاء علیہم السلام کے ذریعے احکام شریعت بھیجے ہیں۔ صراط مستقیم اور گمراہی کے راستہ کی آگاہی کر دی ہے۔ تب کوئی شخص غلط راستہ اختیار کرتا ہے تو یہ اس کی اپنی کوتاہی ہوگی۔

شیطان کی بالمشافہ بات کا جواب

لفظ قال سے یہ سمجھنا کہ شیطان نے خدا سے بالمشافہ مکالمہ کیا۔ عربی زبان اور قرآن مجید کے طرز بیان اور طرز کلام سے ناسمجھی کی بات ہے۔ اللہ تعالیٰ سے تو وہی لوگ مشرف بکلام ہوتے ہیں جو خدا کے حضور پاک باز ہوتے ہیں۔ شیطان جیسے نجس ذات کو اللہ تعالیٰ سے ہم کلامی کہاں میسر ہوسکتی ہے۔

لفظ قال عربی زبان میں مختلف حالات پر بولا جاتا ہے۔ چنانچہ عربی لغت میں لکھا ہے **العرب تجعل القول عبارة عن جميع الافعال** یعنی قول تمام افعال پر بولا جاتا ہے۔

قَالَتْ لَهُ الْعَيْنَانِ سَمْعًا وَطَاعَةً اس کی آنکھوں نے کہا کہ ہم سنتے اور مانتے ہیں۔

قَالُوا صَدَقَ وَاَوْمَاؤا بِرُؤُسِهِمِ صحابہ نے کہا سچ کہتا ہے اور یہ بات سر کے اشارہ سے کہی۔

قَالَتِ السَّمَاءُ جَادَتْ وَانْسَكَبَتْ بادل نے کہا کیا مینہ برسا۔

وَيُقَالُ لِلْمُتَصَوَّرِ صُوَرٍ فِي النَّفْسِ قَبْلَ التَّلَفُّظِ قَالَ اس خیال پر بھی بولا جاتا ہے جو ابھی تلفظ میں نہیں آیا۔

فَيُقَالُ فِي نَفْسِي قَوْلٌ لَمْ اظهره کہا جاتا ہے میرے دل میں بات ہے جس کو میں نے ظاہر نہیں کیا۔

والاعتقاد يقال فلان يقول بقول الشافعي فلاں اعتقاد کرتا ہے شافعی کا اعتقاد قول کے معنی اعتقاد کے ہوتے ہیں۔

ويقال الد لالة الا علىٰ الشيء على العموم دلالت کو بھی قول کہتے ہیں۔

امتلا الحوض فقال قطني جب حوض پانی سے بھر گیا تو اس نے کہا۔ بس کرو۔

قالت له الطير تقدم راشداً پرندوں نے کہا اقبال مندی سے آگے بڑھو۔

بس لفظ قال مختلف مواقع اور محل پر بولا جاتا ہے۔ اسی مناسبت سے ہی اس کے معنی کیے جائیں گے۔ اللہ کا قول بندوں سے الگ رنگ رکھتا ہے ملائکہ سے دوسرا۔ حیوانات سے تیسرا۔ ارض وسماء سے چوتھا۔

معترض کو قال سے یہ غلط فہمی ہوئی ہے کہ شیطان اور اللہ تعالیٰ کی بالمشافہ گفتگو ہوتی ہے اور شیطان نے اللہ کے منہ پر صاف صاف اپنے دل کی بات کہہ دی۔

خلاصہ:

نیکی کے محرک کو ملک اور فرشتہ کہا جاتا ہے اور بدی کے محرک کو شیطان اور ابلیس۔ اس لحاظ سے ملک اور ابلیس کا کوئی لشکر ہوسکتا ہے اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں شیطان اور ابلیس کا ذکر کیا ہے وہاں بدی کے محرک مراد ہیں۔ اس بات کو جھٹلانا اللہ کے قانون کو جھٹلانا ہے۔ سارا نظام قانون کے مطابق چل رہا ہے اگر بدی اور نیکی کی محرک قوتیں نہ ہوں تو انسان روحانی مدارج حاصل ہی نہیں کرسکتا ایک شخص کو شیطان غلط راستہ کی ترغیب دیتا ہے لیکن مومن مخلص شیطان کی راہ پر گامزن نہیں ہوتا بلکہ فرشتہ کے بتاتے ہوئے راستہ پر گامزن ہوتا ہے تو وہ اللہ کے حضور مقبول اور متقی بندہ شمار ہوتا ہے۔ قرب الٰہی کے راستہ پر گامزن ہوجاتا ہے اور خدا کا قرب حاصل کرلیتا ہے اللہ تعالیٰ نے جو یہ دو طاقتیں (نیکی اور بدی کی) پیدا کی ہیں۔ یہ انسان کی روحانی ترقی کا سبب ہیں۔

......☆......

اسلام کا اللہ مسخرہ ہے

اعتراض: خدا مسخرہ مخولیا ٹھٹھول بھنگڑ، بھنگیوں میں آ کودتا ہے بھنگر پن شروع کر دیتا ہے۔(ترک اسلام دھرم پال نمبر 13) ستیارتھ پرکاش کے مصنف نے بھی یہی اعتراض کیا ہے۔(اعتراض 84)

جواب: یہ اعتراض قرآن مجید کی اس آیت پر کیا گیا ہے۔ فَيَسْخَرُوْنَ مِنْهُمْ سَخِرَ اللّٰهُ مِنْهُمْ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْم۔ وہ ان سے ہنسی کرتے ہیں اللہ ان کو ہنسی کی سزا دے گا اور ان کے لیے دردناک عذاب ہے۔

دوسری یہ آیت ہے۔

اَللّٰهُ يَسْتَهْزِئُ بِهِمْ (البقرہ2:15)

اللہ ان کو ذلیل کرے گا۔ یا اللہ ان کو استہزا کی سزا دے گا۔

عربی زبان میں یہ بھی قاعدہ ہے کہ کسی کے ایک فعل پر جو سزا دی جائے اس کو اسی فعل کے الفاظ میں ادا کیا جاتا ہے۔ ابن جریر کہتے ہیں کہ جب ایک فقرہ جواب کے طور پر ہو جو اس سے مراد فی الواقع وہ فعل نہیں ہوتا بلکہ دوسرے کے کسی فعل کی سزا ہوتی ہے۔ امام راغب نے بھی اسی معنی کی تائید کی۔ ہے ایسا ہی لسان العرب میں ہے۔

پس مذکورہ آیات کا ترجمہ یوں ہوگا۔

1-وہ ان سے ہنسی مذاق کرتے ہیں اللہ ان کے ہنسی مذاق کی سزا دے گا۔

2-اللہ ان کو ان کے استہزا کی سزا دے گا اللہ ان کی تحقیر کرے گا۔ اہانت کرے گا۔ اللہ ان کے عیوب سے لوگوں کو آگاہ کر دے گا۔ جس کی وجہ سے وہ لوگوں کی نظر میں گر جائیں گے۔ جلدی ہلاک کر دے گا۔

عربی زبان کے محاورہ کے مطابق ہی قرآن مجید میں وہ الفاظ آتے ہیں اور عربی محاورہ کے مطابق ہی ترجمہ کیا جائے گا۔ دھرم پال یا دیانند سرسوتی اپنی لاعلمی اور ناسمجھی کی وجہ سے غلط ترجمہ کریں۔۔ تو یہ ان کی لاعلمی ہے۔

......☆......

اللہ تعالیٰ نے شرک کرایا

اعتراض: اللہ تعالیٰ نے شرک کرایا کہ آدم کو فرشتوں سے سجدہ کرایا۔

جواب: قرآن مجید کی اس آیت پر اعتراض کیا گیا ہے۔ وَاِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ (بقرہ2:34) اور جب ہم نے فرشتوں سے کہا کہ آدم کی فرمانبرداری کرو تو انہوں نے فرمانبرداری کی۔ سجدہ کے معنی فرمانبرداری کے ہیں خود قرآن مجید میں ہے۔ وَلِلّٰهِ يَسْجُدُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ اور اللہ کی فرمانبرداری کرتے ہیں جو آسمانوں میں اور جو زمین میں ہیں۔

وَلِلّٰهِ يَسْجُدُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (نحل)

اور اللہ کی فرمانبرداری کرتا ہے جو آسمانوں میں ہے اور جو زمین میں ہے۔

اگر دنیا کے تمام انبیاء علیہم السلام کی تاریخ کا مطالعہ کیا جائے تو یہ بات مشترکہ طور پر سب انبیاء علیہم السلام کی تعلیم میں پائی جاتی ہے کہ سب انبیاء نے توحید کی تعلیم دی۔ اور شرک سے روکا جس ضابطہ کے ساتھ اسلام نے توحید کا پرچار کیا ہے اور شرک سے روکا ہے کسی دوسرے نبی کے حصہ میں نہیں۔ انہوں نے توحید کا پرچار کیا ہے شرک سے روکا ہے لیکن اس موضوع کی تکمیل اسلام نے ہی کی ہے یہی اسلام کی خصوصیت ہے۔ اسلام توحید کا مذہب ہے۔

ارشاد الٰہی ہے۔

شَهِدَ اللّٰهُ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ وَالْمَلٰٓئِكَةُ وَاُولُوا الْعِلْمِ قَآئِمًا بِالْقِسْطِ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ (ال عمران 18:3)

اللہ گواہی دیتا ہے کہ اس کے سوا کوئی معبود نہیں اور فرشتے اور صاحب علم بھی انصاف پر قائم ہو کر اس کے سوا کوئی معبود نہیں غالب حکمت والا ہے۔

اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْحَيُّ الْقَيُّوْمُ (البقرہ 255:2)

اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں وہ زندہ اور قائم رہنے والا ہے۔

فَاعْلَمْ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ (محمد 19:48)

پس جان لے اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں۔

قرآن مجید میں توحید پر ایک جامع الفاظ میں ایک پوری سورت اخلاص ہے۔

قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ اَللّٰهُ الصَّمَدُ لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُوْلَدْ وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ (الاخلاص)

کہہ دیجیے کہ وہ اللہ ایک ہے اللہ بے نیاز ہے نہ وہ کسی کا باپ ہے اور نہ بیٹا اور کوئی اس کا ہمسر نہیں۔

جہاں صرف ایک خدا کی تعلیم دی ہے وہاں اس موضوع کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کے لیے شرک کا بھی رد کیا ہے تا کہ ہر جہت سے یہ موضوع مکمل ہو جائے۔

ارشاد الٰہی ہے۔

اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيْمٌ (لقمان 13:31)

یعنی شرک بہت بڑا ظلم ہے۔

وَمَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًاۢ بَعِيْدًا (نساء 116:4)

جس نے اللہ سے شرک کیا وہ گمراہی میں دور نکل گیا۔

اِنَّهٗ مَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدْ حَرَّمَ اللّٰهُ عَلَيْهِ الْجَنَّةَ (مائدہ 72:5)

جو اللہ کے ساتھ شرک کرتا ہے تو اللہ نے اس پر جنت کو حرام کر دیا ہے۔

وَمَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَكَاَنَّمَا خَرَّ مِنَ السَّمَآءِ (الحج 31:22)

جو کوئی اللہ کے ساتھ شرک کرے گو یا وہ آسمان سے گر پڑا۔

اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ (النساء 48:4)

بے شک اللہ اس گناہ کو معاف نہیں کرتا ہے کہ کسی کو اس کا شریک ٹھہرایا جائے اور اس کے علاوہ جس قدر گناہ ہیں وہ جس کے لیے چاہے معاف کر دیتا ہے۔

پس اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کو آدم (بنی آدم) کی فرمانبرداری کا حکم دیا ہے کیونکہ آدم (بنی آدم) اللہ تعالیٰ کا خلیفہ ہے۔ جب اللہ تعالیٰ کی تابعداری کرنا ضروری ہے تو اس کے خلیفہ کی تابعداری بھی لازم ہے۔ اسی حکم کے تحت نہ صرف ملائکہ بلکہ کائنات کی ہر چیز بنی آدم کی فرمانبرداری میں لگے ہوئے ہیں چونکہ آدم (بنی آدم) اللہ تعالیٰ کا خلیفہ ہے اس لیے ہر مخلوق کو اس کی اطاعت کا حکم ہے اس میں آدم (بنی آدم) کی فضیلت مضمر ہے۔ جس کو معترض نے نہیں سمجھا۔ معترض کو یہ بھی سمجھ لینا چاہیے کہ اس آیت میں آدم سے مراد صرف آدم کی ہی ذات مراد نہیں بلکہ بنی آدم مراد ہیں۔ جب نیچر میں مشاہدہ کرتے ہیں کہ تو ہر چیز بنی آدم کی تابعداری میں لگی ہوئی نظر آتی ہے۔ سورج، چاند، ستارے، ہوا، بادل، سمندر، دریا الغرض ہر چیز بنی آدم کے سامنے سرنگوں ہیں اور دنیا کا جو نظام چل رہا ہے اس کے پیچھے اللہ کے کارندے یعنی فرشتے اللہ کے حکم سے کام کر رہے ہیں۔

گویا فرشتے ہی بنی آدم کی خدمت میں لگے ہوئے ہیں۔

یہ ہے وہ حکم جو اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کو دیا تھا۔ کہ آدم کی فرمانبرداری کریں۔ اس آیت میں فرشتوں کو آدم کے سامنے سجدہ (عبادت) کرنے کا حکم نہیں تھا۔ جس سے شرک لازم آتا ہے بلکہ تابعداری کا حکم ہے۔ تابعداری میں صرف فرشتے ہی شامل نہیں بلکہ کائنات کی ہر چیز مراد ہے کیونکہ ان تمام اشیاء میں ملائکہ افضل ہیں اس لیے ان کا ذکر کر دیا ہے۔ بلکہ فرشتوں کے ساتھ کائنات کی ہر چیز مراد ہے۔

یہ عقلی طور پر ممتنع ہے کہ ایک طرف اللہ تعالیٰ فرشتوں کو آدم کا سجدہ کرائے اور شرک کی تعلیم دے دوسری طرف شرک کو ظلم عظیم قرار دے اور یہ کہے کہ یہ وہ گناہ ہے جس کو اللہ نہیں بخشے گا۔ یہ متضاد باتیں اللہ تعالیٰ کی شان کے منافی ہیں۔ قرآن کریم اپنی نسبت یہ دعویٰ کرتا ہے۔

وَلَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللّٰهِ لَوَجَدُوْا فِيْهِ اخْتِلَافًا كَثِيْرًا (نساء 4:83)

اگر قرآن مجید اللہ تعالیٰ کی طرف سے نہ ہوتا تو اس میں بہت اختلاف پاتے بلکہ قرآن مجید تو اختلاف دور کرنے کے لیے اتارا گیا ہے۔ ارشاد الٰہی ہے۔

وَمَا اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ اِلَّا لِتُبَيِّنَ لَهُمُ الَّذِي اخْتَلَفُوْا فِيْهِ (النحل 16:64)

قرآن مجید اس لیے اتارا گیا ہے تا کہ لوگوں میں جو اختلاف ہے ان کا حکم بن کر فیصلہ کرے۔

اس صورت میں کیسے ہوسکتا ہے کہ قرآن مجید شرک کی تعلیم دے۔

......☆......

روح اور عورت (خدا کی روح عورت کے رحم میں جا سکتی ہے؟)

اعتراض: خدا کی روح عورت کے رحم میں جا سکتی ہے۔

جواب: پہلے تو معترض کی کم علمی یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کو ہر جگہ موجود نہیں سمجھتا۔ صرف اسلام کا ہی یہ عقیدہ نہیں کہ خدا ہر جگہ موجود ہے بلکہ ہر مذہب کا یہی عقیدہ ہے۔ حتیٰ کہ ہندو دھرم کا بھی یہی نظریہ ہے کھم یہ پرمیشور کا نام اس لیے ہے کہ بمثل خلا محیط ہے۔ پھر کیا رحم میں خلا نہیں۔ وشنو ہر جگہ محیط ہونے کے باعث وہ وشنو ہے بلا رکاوٹ محیط ہونے کے باعث برہم ہے گویا پرمیشور اندر بھی ہے اور باہر بھی۔ ہر چیز کو

گھرے ہوئے ہے تو عورت کا رحم کیونکر باہر رہ سکتا ہے اللہ کی ہستی تو ہر جگہ موجود ہے۔ کوئی چیز اس کے وجود سے خالی نہیں۔ لہٰذا عورت کا رحم بھی خدا کی ہستی سے خالی نہیں رہ سکتا۔

اصل حقیقت

ہر پاکیزہ اور عمدہ شے کو الٰہی شے کہا جاتا ہے۔ اس وجہ ہندو ویدوں کو الٰہی کتب الٰہی علم اور ان کے جاننے والوں کو الٰہی علماء کہتے ہیں۔ مسلمان الٰہی کلام کو روح کہتے ہیں۔

نَفَخْنَا فِيهَا مِنْ رُّوْحِنَا (انبیاء 91:21)

یعنی ہم نے اس (حضرت مریم) میں الٰہی کلام کو پہنچا دیا۔

اسی طرح حضرت آدم علیہ السلام کی نسبت ہے۔

نَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِي (ص 72:38)

یعنی جب میں اپنا کلام اس میں پہنچا دوں یا پھونک دوں۔

یعنی یہود حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور حضرت مریم کو بُرا کہتے ہیں اور کہتے تھے۔ ان کے جواب میں فرمایا کہ حضرت مسیح ہماری طرف سے ایک پاک روح تھی۔ جو ہمارے حکم سے پیدا ہوئی۔ ان کی والدہ صدیقہ مطہرہ تھیں پاک روح ہونے کی وجہ سے اللہ کے ساتھ ان کی نسبت ہے۔

قرآن مجید سے بھی یہ واضح ہوتا ہے کہ قرآن مجید میں روح کلام الٰہی کو کہتے ہیں۔ ارشاد الٰہی ہے۔

وَ كَذٰلِكَ اَوْحَيْنَا اِلَيْكَ رُوْحًا (شوریٰ 52:42)

ہم نے تیری طرف روح وحی کی۔

دوسری جگہ آتا ہے۔

يُنَزِّلُ الْمَلٰٓئِكَةَ بِالرُّوْحِ مِنْ اَمْرِهٖ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖٓ اَنْ اَنْذِرُوْٓا (النحل 2:16)

وہ فرشتوں کو وحی کے ساتھ اپنے حکم (کلام الٰہی)۔ سے اپنے بندوں میں سے جس پر چاہتا ہے اتارتا ہے کہ وہ ڈرائیں۔

پس قرآن مجید نے حضرت مسیح علیہ السلام اور حضرت مریم کو روح کہا ہے اس وجہ سے کہ وہ پاک تھے۔ یہود ان کو برا کہتے تھے اور اب بھی کہتے ہیں اللہ تعالیٰ نے ان کو روح کہہ کر ان کی پاکیزگی بیان کر دی ہے۔

دوم قرآن مجید کلام الٰہی کو بھی روح کہا ہے۔ معترض روح کے مفہوم سے ہی نابلد اور ناواقف ہے اس لیے اپنی جہالت کی وجہ سے عورت کے ساتھ جوڑ دیا۔ کتنی بڑی نادانی ہے۔

......☆......

محمدیوں پر دکھ نہیں آئے گا یہ دعویٰ غلط ہے

اعتراض: سورہ انفال 4 رکوع خدا محمدیوں پر عذاب نہ کرے گا جب تک محمد ان میں ہے یہ کذب ہے۔ مدینے میں محمد صاحب کی موجودگی میں قحط پڑا بدر اور احد میں محمد صاحب کے ہوتے محمدیوں پر دکھ آیا۔

جواب: قرآن مجید میں کہیں بھی یہ ذکر نہیں ہے کہ محمد صاحب کی موجودگی میں محمدیوں پر دکھ نہیں آئے گا۔ معترض نے جس آیت کی بناء پر

اعتراض کیا ہے۔ وہ اس کا معنی ہی نہیں سمجھا۔ پہلے وہ آیت درج کی جاتی ہے۔ ارشاد الٰہی ہے۔

وَاِذْ يَمْكُرُ بِكَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِيُثْبِتُوْكَ اَوْ يَقْتُلُوْكَ اَوْ يُخْرِجُوْكَ وَ يَمْكُرُوْنَ وَ يَمْكُرُ اللّٰهُ وَاللّٰهُ خَيْرُ الْمٰكِرِيْنَ وَاِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيٰتُنَا قَالُوْا قَدْ سَمِعْنَا لَوْ نَشَآءُ لَقُلْنَا مِثْلَ هٰذَا اِنْ هٰذَا اِلَّا اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ وَاِذْ قَالُوا اللّٰهُمَّ اِنْ كَانَ هٰذَا هُوَ الْحَقَّ مِنْ عِنْدِكَ فَاَمْطِرْ عَلَيْنَا حِجَارَةً مِّنَ السَّمَآءِ اَوِ ائْتِنَا بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ وَاَنْتَ فِيْهِمْ وَمَا كَانَ اللّٰهُ مُعَذِّبَهُمْ وَهُمْ يَسْتَغْفِرُوْنَ (انفال 8:30-33)

اور جب وہ جو کافر ہوئے تیرے متعلق تدبیریں کرتے تھے تاکہ تجھے قید کریں یا تجھے قتل کریں یا تجھے نکال دیں اور وہ تدبیریں کرتے تھے اور اللہ بھی تدبیر کرتا تھا اور اللہ بہترین تدبیر کرنے والا ہے اور جب ان پر ہماری آیتیں پڑھی جاتی ہیں کہتے ہیں ہم نے سن لیا اگر ہم چاہیں تو اس کی مثل کہہ لیں یہ کچھ نہیں مگر پہلوں کی کہانیاں اور جب انہوں نے کہا اے اللہ! اگر یہ تیری طرف سے حق ہے تو ہم پر آسمان سے پتھر برسا یا ہم پر درد ناک عذاب بھیج۔ اور اللہ ایسا نہ تھا کہ ان کو عذاب دیتا حالانکہ تو ان میں تھا اور اللہ ان کو عذاب دینے والا نہ تھا حالانکہ وہ استغفار کرتے تھے۔

يُعَذِّبَهُمْ میں ضمیرْ هُمْ کا مرجع الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ہے۔ یعنی کفار ہیں آیت کا مطلب یہ ہے کہ جب تک رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا وجود کفار میں موجود ہے اس وقت تک ان پر عذاب نازل نہیں آئے گا۔ یہ اللہ تعالیٰ کی سنت مستمرہ ہے جب تک نبی کا وجود قوم میں ہوتا اللہ اس قوم پر عذاب نازل نہیں کرتا۔ اللہ کی یہی سنت اہل مکہ کے لیے تھی۔ جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہجرت کر لی تو ان پر عذاب آیا۔ ان کے تمام سردار جنگوں میں مارے گئے۔

لِيُعَذِّبَهُمْ میں هُم کی ضمیر کی وجہ سے معترض نے اعتراض کیا ہے کہ هُمْ سے مراد مسلمان لیے ہیں۔ جبکہ هُمْ کی ضمیر کا مرجع الَّذِيْنَ كَفَرُوْا (کافر) ہیں۔ جب تک رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا وجود کفار میں رہا ان پر عذاب نہیں آیا۔ یہ ایک پیشگوئی ہے۔ جو سچ ثابت ہوئی جب رسول کریم ﷺ مکہ سے مدینہ آئے تو کفار پر بربادی کے بادل چھا گئے ان کے عمائدین مارے گئے۔ قحط کا بھی شکار ہوئے۔

دوسری وجہ کفار پر عذاب نہ آنے کی یہ بیان کی ہے وَهُمْ يَسْتَغْفِرُوْنَ وہ استغفار کرتے تھے۔ یہ بھی اللہ کی سنت ہے کہ اللہ استغفار کرنے سے عذاب ٹال دیتا ہے۔ گو کفار بظاہر عداوت اور عناد کی وجہ سے عذاب مانگ لیتے تھے کہ رسول سے یہ کہہ دیتے تھے کہ اگر تو حق پر ہے تو ہم پر آسمان سے پتھر برسا۔ مگر پھر پچھتاتے تھے گھروں میں جا کر استغفار بھی کرتے تھے اللہ تعالیٰ نے ان کے دل کی حالت بھی بیان کر دی ہے۔ یہ بھی رحیم کریم خدا کی شان ہے کہ استغفار کرنے والے پر عذاب نازل نہیں کرتا۔

هُمْ يَسْتَغْفِرُوْنَ میں اشارہ مسلمانوں کے استغفار کی طرف ہے۔ جب ایسی قوم جو دن رات اللہ سے استغفار کرتی رہتی ہے اس کی موجودگی میں ان پر عذاب نہیں آئے گا۔

اگر وہ مفہوم جو معترض نے مذکورہ آیات سے اخذ کیا ہے کو صحیح تسلیم کر لیا جائے تو اس آیت کا مطلب یہ ہوگا۔ جب تک محمدیوں میں ہے یعنی جب تک محمدی (مسلمان) اپنے رسول کی سچی تابعداری کرتے رہیں گے ان کی تعلیم پر عمل پیرا ہوں گے اور اللہ سے تمسک کیے رکھیں گے وہ اللہ کے عذاب سے بچے رہیں گے۔ دیکھیے رسول کریم ﷺ کی زندگی میں غزوہ حنین میں مسلمانوں نے اذیت اٹھائی۔ مسلمانوں کے دلوں میں اپنی کثرت کا گھمنڈ آ گیا تھا۔ عذاب میں مبتلا ہو گئے اسی طرح جنگ احد میں رسول کریم ﷺ کی ہدایت کے باوجود درے کو چھوڑا۔ تو خدا کی گرفت میں آ گئے۔ رسول کریم ﷺ کے بعد کے ادوار میں جب مسلمانوں نے اسلام کے اصولوں کو ترک کر دیا۔ تو وہ تباہی کے گڑھے میں جا گرے۔ لہٰذا محمد کا محمدیوں (مسلمانوں) میں موجود ہونے سے مراد اطاعت رسول ہے۔ جب تک مسلمان رسول کریم ﷺ کی پیروی کرتے رہیں گے مسلمان کامیاب رہیں گے۔ جو مذکورہ مفہوم اختیار کیا گیا ہے کلام مقدس انجیل بھی اس کی تائید کرتی ہے کہ قوم میں نبی کی موجودگی سے

مراد اس کی تعلیم کی پیروی ہے۔ اخط یوحنا 3 باب 24 میں ہے اور جو اس کے حکموں پر عمل کرتا ہے یہ اس میں اور وہ اس میں رہتا ہے۔

رومیوں کو 12 باب 5 ایسے ہی ہم جو بہت سے ہیں مسیح میں ہو کے ایک بدن ہوئے ہیں۔

اخط یوحنا 4 باب 12 میں ہے اگر ہم ایک دوسرے سے محبت کریں تو ہم خدا میں رہتے ہیں۔

......☆......

موسیٰ فرعون اور ہامان کے پاس بھیجا گیا غلط ہے

اعتراض: سورہ مومن 3 رکوع موسیٰ فرعون اور ہامان کے پاس بھیجا گیا یہ غلط ہے موسیٰ فرعون کے پاس ضرور بھیجا گیا لیکن ہامان تو موسیٰ کی موت کے ڈیڑھ سو برس بعد اخورس کا وزیر تھا دیکھو استیر 3 باب۔

جواب: ایک نام کے آدمی کئی ادوار میں ہو سکتے ہیں۔ یہ بھی ہو سکتا ہے ہامان ڈیڑھ سو برس بعد اخورس کا وزیر بھی ہو اور فرعون کے دور میں بھی اس نام کا کوئی افسر ہو۔

ہامان کے معنی عربی میں محافظ کے ہیں یہ وہ شخص ہے جو فرعون کا افسر تعمیرات تھا۔ فرعون کی طرف سے بنی اسرائیل پر متعین تھا۔ کہ ان سے اینٹیں پکانے کا کام لے (دیکھو خروج 5 باب 10) حضرت موسیٰ علیہ السلام اس شخص کو یہ وعظ نصیحت کرتے ہیں کہ بنی اسرائیل سے حسن سلوک کرے قرآن مجید میں یہی معلوم ہوتا ہے کہ یہ شخص افسر تعمیرات تھا۔ جہاں فرمایا ہے۔

يَاهَامَانُ ابْنِ لِي صَرْحًا لَعَلِّي أَبْلُغُ الْأَسْبَابَ (مومن 36:40)

اے ہامان میرے لیے ایک بلند محل بنا تا کہ میں رستوں پر پہنچوں۔

یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ فرعون کے دور میں ایک بااثر کارندہ ہامان نام کا تھا۔ یہ بھی ہو سکتا ہے اس کا کوئی ہم نام ڈیڑھ سو سال بعد کسی کا وزیر ہو۔ ایک نام کے کئی اشخاص کئی ادوار میں ہو سکتے ہیں یہ اعتراض ہی باطل اور غلط ہے۔

......☆......

حضرت موسیٰ اور ہارون کی بعثت اسرائیل کو نجات دلانے کے لیے تھی نہ کہ مصر میں قوم کے گھروں کے منہ روبقبلہ بنانے کے لیے

اعتراض: سورۃ یونس 9 رکوع 87 آیت موسیٰ اور ہارون بھیجے گئے کہ اپنی قوم کے گھروں کے منہ روبقبلہ بنا دیں یہ باطل ہے کیونکہ کتب سماوی سے ظاہر ہے کہ موسیٰ کو خدا نے اس لیے بھیجا کہ قوم بنی اسرائیل کو فرعون کے ظلم سے چھوڑا کر ملک کنعان میں لا بسائے نہ یہ کہ مصر میں رہنے دے۔ (دیکھو خروج 3 باب 7 سے 10 تک)

جواب: معترض نے قرآن مجید کی اس آیت پر اعتراض کیا ہے۔

وَاجْعَلُوْا بُيُوْتَكُمْ قِبْلَةً (یونس 87:10)

اپنے گھروں کو ایک دوسرے کے مقابل بناؤ۔

اس میں کوئی شک وشبہ نہیں کہ حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون کی بعثت کی غرض وغایت بنی اسرائیل کو فرعون کے پنجہ استبداد سے نجات دلانا تھی۔ قرآن مجید نے اس کا کئی جگہ ذکر کیا ہے۔ ارشاد الٰہی ہے۔

فَاَرْسِلْ مَعِىَ بَنِىْٓ اِسْرَآئِيْلَ (الاعراف 105:7)

بنی اسرائیل کو میرے ساتھ بھیج دو۔

دوسری جگہ آتا ہے۔

اَنْ اَرْسِلْ مَعَنَا بَنِىْٓ اِسْرَآئِيْلَ (شعراء 17:26)

کہ ہمارے ساتھ بنی اسرائیل کو بھیج دے۔

جب موسیٰ علیہ السلام نے فرعون سے یہ مطالبہ کیا تو فرعون نے انکار کر دیا اور بنی اسرائیل پر شدائد مزید بڑھا دیئے۔ چونکہ بنی اسرائیل عرصہ دراز تک محکومیت کی حالت میں رہنے کی وجہ سے اخلاق فاضلہ سے عاری ہو چکے تھے۔ ان میں بھی غیرت پیدا نہیں ہوئی تھی کہ وہ اپنے قدموں پر کھڑے ہو سکیں تو عارضی طور پر یہ حکم ہوا کہ ابھی کچھ مدت مصر میں قیام کرنا ہوگا۔ اخلاق فاضلہ سنوارنے کے لیے یہ حکم ہوا تھا کہ وہ مذہبی رسومات اپنے اپنے گھروں میں ادا کریں اپنے گھروں کو مسجدیں بنائیں اللہ سے دعائیں مانگتے رہیں نماز قائم کریں تا کہ ان کے اخلاق درست ہو جائیں۔

دوسری جگہ آتا ہے۔ اَسْتَعِيْنُوْا بِاللّٰهِ (الاعراف 128:7) اللہ سے مدد طلب کرو یہی مشکلات کا علاج ہے۔ جس کی بنی اسرائیل کو ہدایت کی گئی۔ مصر میں قیام کی ہدایت عارضی تھی۔ حضرت موسیٰ کو اللہ کی طرف سے اصل حکم وہی ہے کہ بنی اسرائیل کو فرعون کے ظلم سے نجات دلائے۔ چنانچہ اسی حکم پر عمل کیا گیا۔ دونوں باتوں میں تضاد نہیں ایک حکم عارضی ہے۔ بنی اسرائیل کو مصر سے لے جانے سے پہلے وہ اپنے اخلاق درست کرلیں۔

لہٰذا قبلہ کے تین معنی ہیں اول مذہبی رسوم گھروں میں ادا کریں دوم گھروں میں مساجد بنائیں اور نماز ادا کریں۔ قبلہ کا لفظ اسی طرف اشارہ کر رہا ہے۔ سوم قبلہ کا معنی متقابل کے ہیں یعنی بنی اسرائیل اپنے گھروں کو ایک دوسرے کے سامنے بنائیں تا کہ رات کے وقت نکل جانے کے لیے اچھا موقع مل جائے۔

معترض نے وَاجْعَلُوْا بُيُوْتَكُمْ قِبْلَةً کے معنی ہی غلط سمجھے ہیں۔ بلکہ اس آیت کا صحیح مفہوم یہ ہے کہ:

1- اپنے گھروں میں جائے عبادت مقرر کریں تا کہ نماز ادا کریں اور اپنے رب سے مدد طلب کریں اور اخلاق بہتر بنائیں۔

2- اپنے گھروں میں مذہبی رسوم ادا کریں۔

3- بنی اسرائیل اپنے گھروں کو ایک دوسرے کے مقابل بنائیں تا کہ ہجرت کے وقت بنی اسرائیل کو اکٹھا کرنے میں آسانی ہو۔

......☆......

حضرت سلیمان کے ماتحت ہوا کا ہونا، تاریخ میں کوئی ثبوت نہیں

اعتراض: سورۃ ص 3 رکوع فَسَخَّرْنَا لَهُ الرِّيحَ تَجْرِي بِأَمْرِهِ رُخَاءً حَيْثُ أَصَابَ یہ امر غلط ہے اس کا ثبوت نہیں ملتا۔ کسی معتبر یہودی مورخ کی گواہی سے ثابت کریں۔

جواب: مذکورہ آیت کا ترجمہ یہ ہے سو ہم سے اس کے لیے ہوا کو کام میں لگایا۔ وہ اس (اللہ) کے حکم سے نرمی سے چلتی تھی جدھر وہ قصد کرتے۔ (ص 36:38)

سَخَّرَهُ تَسْخِيرًا ذَلَّلَهُ وَكَلَّفَهُ عَمَلاً بِلَا أَجْرِهِ یعنی سَخَّرَهُ تَسْخِيرًا

کے معنی ہیں اس کو مطیع کیا اور اسے مفت بے مزدوری کام میں لگایا۔

قرآن مجید میں بہت جگہ یہ محاورہ استعمال ہوا فرمایا:

وَسَخَّرَ لَكُمُ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ (ابراہیم 33:14)

اس نے تمہارے سورج اور چاند کام میں لگا دیئے ہیں۔

ایسا ہی اور چیزوں کی انسان کے لیے تسخیر کا ذکر ہے حتیٰ کہ ایک جگہ فرمایا۔

وَمَا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا مِّنْهُ (الجاثیہ 13:45)

اور جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے سب کو اپنے (فضل سے) تمہارے کام پر لگایا۔

ان تمام محاورات سے لفظ تسخیر کا استعمال واضح ہو گیا کہ تسخیر مفت میں بلا مزدوری کام لگا دینے کو کہتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے دنیا اور مافیہا میں جتنی بھی چیزیں سمندر، سورج، چاند، ستارے، رات، دن، کشتیاں، جہاز، مویشی وغیرہ پیدا کر رکھی ہیں سب اس نے اپنے لطف و کرم اور صفت رحمانیت کے تحت ہمارے کام میں لگا رکھی ہیں۔ ہم ان سب چیزوں سے فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ یہ تمام اشیاء بغیر اجرت کے انسان کے کام میں آ رہی ہیں۔

اب ہم مضمون آیت متنازعہ کی طرف آتے ہیں اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے بتایا ہے کہ بنی اسرائیل میں سب سے پہلے حضرت سلیمان علیہ السلام نے ہوا سے ایک خاص کام لیا۔ جس کا ذکر اللہ تعالیٰ نے بطور فضل اس آیت میں کیا ہے۔ تاریخی امر یہ ہے کہ حضرت سلیمان نے جہازوں کے دو بیڑے تیار کیے تھے ایک خلیج فارس اور بحر ہند میں دوسرا بحر روم میں چلتا تھا اس امر کا ثبوت معتبر یہودی تاریخ میں ہے سلاطین اوّل 9 باب 26 پھر سلیمان بادشاہ نے عصیون جبر میں جو ایلوت کے نزدیک ہے دریائے قلزم کے کنارے پر جو ادوم کی سرزمین میں ہے جہازوں کے بحر بنائے اور حیرام نے اس بحر میں اپنے چاکر ملاح جو سمندر کے حال سے آگاہ تھے سلیمان کے چاکروں کے ساتھ کر کے بھجوائے اور وے اوفیر کو گئے۔ (دیکھیے اخبار الایام 2 باب 2-16)

اخبار الایام دوم 2 باب 16 بادشاہ کے جہاز حیرام کے نوکروں کے ساتھ طرسیس کو جاتے اور وہاں سے ان پر تین برس میں ایک بار سونا اور روپا اور ہاتھی دانت اور بندر اور مور اس کے لیے بھیجے جاتے چونکہ اس دور میں جہاز ہوا کی موافقت اور سازگاری سے چلتے تھے اس لیے اللہ تعالیٰ نے امتناناً و احساناً ریح (ہوا) کا ذکر کیا ہے یعنی ہم نے ہوا کام میں لگا دی۔ ہوا کا کام میں لگانے سے مراد اشارۃً جہاز رانی ہے۔ قرآن مجید کی یہ آیت غُدُوُّهَا شَهْرٌ وَرَوَاحُهَا شَهْرٌ (سبا 12:34) میں جہازوں کے سفر اور مسافت کے طے کرنے کا ذکر ہے کہ وہ صبح و شام اتنی

مسافت طے کرتے تھے۔ حضرت سلیمان کے دور کی یہ ایجادات بنی اسرائیل کے لیے بطور آیت یا نشانی کے بیان کی ہیں کہ ان کے بزرگوں نے اپنی قوتوں اور استعدادوں کو کام میں لا کر ایک وسیع سلطنت کے مالک بنے۔ اس کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو یہ توجہ دلائی ہے کہ وہی قوم دنیا کے نقشہ پر ابھرتی ہے جو تسخیر کائنات کرتی ہے تاریخ اسی صداقت پر شاہد ناطق ہے۔ دنیا میں وہی قومیں حکمرانی کی مستحق ٹھہری ہیں جنہوں نے نئی نئی ایجادات کے دروازے کھولے ہیں قرآن مجید میں حضرت سلیمان کے دور کا ذکر کیا گیا ہے کہ ان کے جہاز سمندروں کے سینے چیرتے ہوئے دوسرے ممالک کو جاتے اور سامان تجارت لاتے اور لوگ خوش حالی کی زندگی گزارتے اور ان کی سلطنت دور دور تک پھیلی ہوئی تھی۔ کوئی طاقت مقابلہ نہیں کر سکتی ملکہ سبا نے بھی بغیر لڑے اطاعت قبول کر لی۔ افسوس مسلمان ان تاریخی واقعات سے سبق حاصل نہیں کرتے اور گہرائی میں نہیں جاتے کہ حضرت سلیمان کا ذکر کیوں کیا گیا ہے۔

......☆......

مریم اخت ہارون نہیں تھی

اعتراض: قرآن نے مریم مسیح علیہ السلام کی ماں کو ہارون کی بہن کہا ہے۔ یہ بات صحیح نہیں۔

جواب: دنیا میں کوئی ایسی الہامی کتاب نہیں ہے جس میں حضرت مریم کے خاندان کے حالات درج ہوں نہ عیسائیوں کے پاس کوئی تاریخ وجود ہے جس میں مریم کے بھائیوں ماں باپ اور دیگر رشتے داروں کے نام ہوں۔ جب حضرت مریم کے متعلق معلومات ہے نہیں تو پھر اعتراض کیسا کہ حضرت مریم اخت ہارون نہیں۔

دوم: مختلف ادوار میں ایک نام کا اشتراک عین ممکن ہے دیکھو یوسف اور یعقوب مسیح کے بھائی بھی ہیں اور سینکڑوں برس پہلے یوسف اور یعقوب، اسحاق نبی کے پوتے اور بیٹے بھی گزر چکے ہیں۔ کیا یہ ممکن نہیں ہے کہ ہارون، حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بھائی بھی ہوں اور دوسرے مریم کے بھی۔

سوم: عرب اَخ اور اُخت کا لفظ وسیع معنوں میں استعمال کرتے تھے صرف حقیقی بھائی اور پھر ایک ہی پشت کے آدمیوں اور نبیوں پر بھی استعمال ہوتا ہے قرآن مجید میں بھی اس کی مثال ملتی ہے۔ ارشاد الٰہی ہے۔

ثَمُوْدَ اَخَاهُمْ صَالِحًا (ہود 61:11)

ثمود کی طرف ان کے بھائی صالح (نبی بن کر) آئے۔

وَاِلٰی عَادٍ اَخَاهُمْ هُوْدًا (ہود 50:11)

عاد کی طرف ان کے بھائی ہود کو بھیجا۔ حالانکہ صالح اور ہود اپنی قوم کے حقیقی بھائی نہ تھے ان کی قوم سے تعلق تھا۔

شرح مواہب اللدنیہ میں زرقانی حضرت صفیہ کا ایک واقعہ بیان کرتے ہیں کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی دوسری بیبیوں نے کچھ طعن کیا حضرت صفیہ نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے شکایت کی تو آپ ﷺ نے فرمایا: تو نے یہ کیوں نہ کہا اَبِی هَارُوْنَ وَ عَمِّی مُوْسٰی وَ زَوْجِی مُحَمَّدٌ یعنی حضرت ہارون میرا باپ اور حضرت موسیٰ میرا چچا اور محمد ﷺ میرے خاوند ہیں۔ ہارون اور موسیٰ حضرت صفیہ کے نہ باپ ہیں اور نہ چچا۔ یہودیہ ہونے کی وجہ سے رسول کریم ﷺ نے حضرت ہارون اور حضرت موسیٰ کی طرف نسبت کر دی۔ دور کے رشتہ دار کو بھی بہن بھائی چچا ماموں وغیرہ کہا جاتا ہے الغرض تھوڑے بہت تعلق پر بھی اخوت کا اطلاق ہوتا ہے حضرت مریم نے کاہنوں میں پرورش پائی اور حضرت ذکریا کاہن اس کے قریب رشتے دار تھے کاہن ہارون کے بھائی کہلائے اس نسبت سے حضرت مریم کو اخت ہارون کہہ دیا گیا ہے۔

یہ عام دستور تھا اور اب بھی ہے کہ دور کی رشتے داری کی وجہ سے بھی اخت، ابن وغیرہ کے الفاظ استعمال کیے جاتے تھے اور کیے جاتے ہیں چنانچہ انجیل متی کی ابتداء میں مسیح کو ابن داؤد اور داؤد کو ابن ابراہیم لکھا ہے۔ متی 1 باب 1 حالانکہ مسیح اور داؤد کے درمیان اور داؤد اور ابراہیم کے درمیان کئی پشتوں کا فرق ہے۔ یہ الفاظ ایک خاص نسبت کی وجہ سے استعمال ہوتے ہیں۔ یہ الفاظ قریبی رشتے داری اور دور کی رشتے داری دونوں پر استعمال کیے جاسکتے ہیں۔

......☆......

ضمیری نے نہیں ہارون نے بچھڑہ بنایا

اعتراض: طٰہٰ میں ہے ضمیری نے بنی اسرائیل کی پرستش کے لیے بچھڑہ بنایا توریت سے صاف ظاہر ہے ہارون نے بچھڑہ بنایا۔ نہ ضمیری نے دیکھو خروج 32۔

جواب: قرآن مجید میں ضمیری کا نام ہی نہیں۔ لہٰذا تاریخ سے عدم واقفیت کی وجہ سے اعتراض کیا گیا ہے۔ قرآن مجید میں یہ بھی ذکر نہیں کہ ہارون نے بچھڑہ بنایا۔ اگر توریت سے یہ ظاہر ہے کہ بچھڑہ ہارون نے بنایا۔ ایک تو یہ اس وجہ سے غلط ہے کہ نبی شرک کی تعلیم نہیں دیتا۔ دوم تاریخ بھی اس کو جھٹلاتی ہے۔ ہارون کو زبور 106-17 میں مقدس کہا گیا ہے۔ اسی طرح زبور 105-26 میں ہارون کو برگزیدہ کہا ہے خروج 32 باب 35 میں ہے خدا نے بچھڑہ بنانے کے سبب لوگوں پر مری بھیجی حالانکہ ہارون بچ گئے بلکہ ان کی نسل کے لیے کہانت کا عہدہ وہاں پہاڑ پر تجویز ہوا اور آج تک ہارون کی اولاد میں چلا آرہا ہے۔

......☆......

بہ مجبوری جھوٹ بولنا جائز ہے

اعتراض: مَنْ كَفَرَ بِاللّٰهِ مِنْ بَعْدِ اِيْمَانِهٖۤ اِلَّا مَنْ اُكْرِهَ وَقَلْبُهٗ مُطْمَئِنٌّۢ سپارہ 14 سورۃ نحل رکوع 14 سے معلوم ہوتا ہے بہ مجبوری جھوٹ بولنا جائز ہے۔

جواب: یہ ایک عام مشاہدہ اور تجربہ کی بات ہے کہ جبر و اکراہ کے وقت انسان جھوٹ بولنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ مجبوری کی حالت میں جھوٹ بولنا اور بات ہے اور جائز ہونا اور بات ہے۔ جو شخص کسی مجبوری کی وجہ سے جھوٹ بولتا ہے تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ جھوٹ بولنا جائز ہے ایسی حالت کے جھوٹ پر کفر کا فتویٰ نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کی طبعی کمزوری کی وجہ سے ایک چھوٹ دی ہے۔ معترض کا یہ کہنا کہ اکراہ و جبر کی وجہ سے جھوٹ بولنا جائز ہے غلط ہے۔ صرف ایسے شخص پر کفر کا فتویٰ صادر نہیں ہوسکتا۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کی طبعی کمزوری کا فائدہ دیا ہے۔ ویسے اسلام کی یہی تعلیم ہے کہ ہر حالت میں حق کا دامن نہیں چھوڑنا چاہیے۔ اس میں خدا کی رضا ہے۔

قرآن مجید نے شرک اور جھوٹ کو سخت ناپسند کیا ہے۔

ارشاد الٰہی ہے۔

لَّعْنَتَ اللّٰهِ عَلَى الْكٰذِبِيْنَ "اِنَّمَا يَفْتَرِي الْكَذِبَ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ" (النحل)

جھوٹ وہی لوگ بناتے ہیں جو اللہ کی آیتوں پر ایمان نہیں لاتے۔

حدیث میں ہے۔

لَا تُشْرِكْ بِاللّٰهِ وَاِنْ قُطِّعْتَ اَوْحُرِّقْتَ

اللہ کا شریک نہ بنا اگرچہ تو کاٹا جائے یا جلایا جائے۔

الزامی جواب: ابراہیم نے بخوف جان اپنی جورو کو بہن کہا۔ پیدائش 12 باب 19,13 ایسا ہی اسحاق نے کیا پیدائش 26 باب 11,7، یعقوب نے جھوٹ سے نبوت لی اور جھوٹ میں ایسے کامیاب ہوئے کہ عیسو کی اولاد ابدالا باد کے لیے غلام بن گئی پیدائش 27 باب 29,19، داؤد بخوف جان جھوٹ بولے۔ سموئیل 20 باب 6 ان حوالہ جات سے معلوم ہوتا ہے کہ ان بزرگوں نے جبراً و کراہاً جھوٹ بولا۔

......☆......

طالوت کا لشکر کو پانی پر آزمانا عہد عتیق میں نہیں یہ قرآن کی تاریخی غلطی ہے

اعتراض: سورہ بقرہ 33 رکوع 9 طالوت یعنی ساول نے اپنے لشکر کو پانی پلا کر آزمایا طالوت کا لشکر کو پانی پر آزمانا عہد عتیق میں مذکور نہیں لہٰذا یہ قرآن میں تاریخی غلطی ہے۔ ہاں طالوت سے ایک سو چون برس پیشتر جدعون قاضی نے اس طرح لشکر کو آزمایا۔ بس وحی نبی عرب نے غلطی کی۔ کتاب قاضی 7 باب 4 سموئیل۔

جواب: عہد عتیق میں کوئی بات مذکور نہیں تو اس کا مطلب یہ نہیں وہ بات نفس الامر نہیں۔ اگر جدعون کے وقت بھی ایسا واقعہ ہوا ہو۔ جو طالوت کے وقت ہوا تو کون سا امر بعید ہے۔ ایک کا ذکر بائبل نے کر دیا دوسرے کا قرآن مجید نے کر دیا کوئی عیسائی یہ دعویٰ سے نہیں کہہ سکتا کہ جو واقعہ بائبل میں مذکور نہ ہو۔ وہ تسلیم نہیں کیا جا سکتا۔ نہ کبھی تاریخ میں ایسا ہو سکتا ہے۔ مختلف واقعات مختلف اوقات میں وقوع پذیر ہوتے رہتے ہیں۔ سب کا ذکر کہیں بھی نہیں مل سکتا۔

دوم: اگر تاریخی طور پر یہ بات ثابت ہو جائے جہاں ساول اور جالوت کی لڑائی ہوئی وہاں نہر نہ تھی تو پھر قرآن مجید پر شبہ ہو سکتا ہے مگر وہاں ندی موجود تھی۔ کیونکہ فلسطینی، سوکوہ، غریقاہ، افس، دمیم میں جمع تھے اور بنی اسرائیل وادی ایلاہ میں دونوں کے درمیان دریائے شورق واقع تھا فلسطینی دریا کے جنوبی اور بنی اسرائیل دریا کے شمالی کنارے پر تھے۔ بنی اسرائیل نے دریا عبور کر کے حملہ کیا۔

سوم: نہر کے معنی آرام اور وسعت کو کہتے ہیں۔ ساول نے کہا کہ خدا تم کو رزق میں وسعت دے گا۔ تم کو آرام ملے گا۔ تم افراط سے کام نہ لینا بقدر ضرورت لینا مگر بنی اسرائیل نے ساول کی نصیحت پر عمل نہ کیا جب عمالقیوں پر فتح ہو گئی بہت سا مال غنیمت ہاتھ آیا تھا جس کا ذکر اسموئیل کے باب 15 میں ہے حالانکہ بنی اسرائیل کو حکم تھا کہ مال غنیمت کو حرام کریں۔ یعنی تباہ کر دیں اور اپنے استعمال میں نہ لائیں مگر طالوت کی فوجوں نے اس وقت عمدہ عمدہ مال غنیمت لے لیا اور اپنے تصرف میں لے آئے اس کے بعد یہ لوگ فلسطینیوں کے مقابلہ میں کمزور ہو گئے۔

لہٰذا معترض کا یہ اعتراض کہ اس واقعہ کے یہاں لکھنے میں قرآن مجید نے تاریخی غلطی کی ہے صحیح نہیں۔

چہام جدعون کا واقعہ جو قاضیوں کی کتاب میں درج ہے اس کے متعلق یہ امر مسلمہ ہے کہ یہ اصلی نہیں بلکہ پرانے مسودات کی بنا پر لکھی گئی ہے اس لیے اس قدر وثوق سے نہیں کہا جاسکتا کہ اس کی تاریخی حیثیت پر شک وشبہ نہ ہو سکے اس واقعہ میں کئی ایک غلط بیانیاں ہیں پادری ڈملو اپنی تفسیر بائبل میں اعتراف کرتا ہے کہ جن مقامات کا یہاں ذکر کیا گیا ہے وہ مشتبہ ہیں اور کوہ جلعاد کے ذکر پر لکھتا ہے جلعادیوں کے مشرق میں ہے یہاں مراد کوئی اور مقام ہونا چاہیے جب یہ واقعات اس قدر مشتبہ ہیں تو ان کی بنیاد پر قرآن مجید کے بیان کو غلط قرار نہیں دیا جاسکتا۔

......☆......

قرآن میں اہل بدر کو برائیوں پر دلیری دی گئی ہے

اعتراض: اِعْمَلُوْا مَاشِئْتُمْ فَقَدْ غَفَرْتُ لَکُمْ کہ اہل بدر کو بڑی دلیری دی ہے۔

جواب: انجیل نے تو اس سے بڑھ کر دلیری دی۔ خدا نے بھی مسیح کے لیے تمہیں بخشا ہے نامہ افسی 4 باب 32 اس نے تمہارے سب گناہ بخش دیئے۔ قلیسی 2 باب 13-14 ہم کو جو گناہوں کے سبب مردہ تھے مسیح کے ساتھ جلایا تم فضل سے بچ گئے۔ افسی 2 باب 1,5 باب 2,6 باب 1 قلیسی 1 باب 21۔ ہمیں فضل سے ہمیشہ کی تسلی اور امید آئی۔ 2 تسلیقی 2 باب 16 میرے لیے راست بازی کا تاج دھرا ہے۔ 2 تمطاؤس باب 4 باب 7 پاکوں کے لیے سب کچھ پاک ہے۔ طیطس 1 باب 15 جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام سب عیسائیوں کے گناہوں کا بوجھ اٹھا کر مصلوب ہوگئے۔ تو سب عیسائی پاک ہوگئے۔ طیطس 1 باب 15 عیسائیوں نے اب دام وخلال میں تمیز چھوڑ دی ہوئی ہے اسی طیطس کے 1 باب 15 پر عامل ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اہل بدر کی قربانی کی وجہ سے ان کے گناہ بخش دیئے۔ اس سے کون سا الٰہی قانون ٹوٹتا ہے۔ اللہ کی یہ سنت ہے کہ وہ اس کے راستہ میں قربانی کرنے والوں کے گناہ بخش دیتا ہے اسی سنت کے مطابق اللہ تعالیٰ نے ان کے گناہ بخش دیئے۔

......☆......

مسلمانوں کا کوئی مستقبل نہیں

اعتراض: اسلام کا کوئی مستقبل نہیں مارگولیتھ نے 1904 میں اپنے نتیجہ فکر سے باخبر کیا۔ لانس نے 1930 میں یہی آواز بلند کی۔ اسی طرح دیگر مستشرقین کا بھی یہی نظریہ ہے۔ (بحوالہ مستشرقین اور اسلام حصہ دوم مرتبہ سید صباح الدین عبدالرحمٰن ص 86)

جواب: مستشرقین اور مخالفین اسلام نے اسلام کی ترقی کو مسلم حکومتوں کے ساتھ وابستہ کر دیا ہے چونکہ مسلمان حکومتیں ختم ہوگئی تھیں اس لیے وہ سمجھنے لگ پڑے تھے کہ اسلام بھی ختم ہو جائے گا اور اس کا کوئی مستقبل نہیں۔

اگر حقائق کی روشنی میں ادیان عالم کا مطالعہ کیا جائے تو یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ صرف دین اسلام ہی ایک ایسا دین ہے جو عقلی اور سائنسی اصولوں پر پورا اترتا ہے دنیا کا کوئی مذہب بھی دور حاضر میں عقلی دلائل پر پورا نہیں اترتا۔ جن مذاہب کی تعلیم ہی عقلی پیمانوں پر پوری نہ اترتی ہو وہ کس طرح دنیا میں زندہ رہ سکتے ہیں۔

ایک صدی قبل کی نسبت اب مسلمان زیادہ ترقی کے راستہ پر زیادہ گامزن ہیں اس وقت کرہ ارض پر 57 آزاد اسلامی ممالک ہیں

دنیا بھر کے مسلم ممالک کی مجموعی رقبہ 9 کروڑ مربع میل ہے کرہ ارض پر 21% مسلمان بستے ہیں کرہ ارض پر مسلمانوں کی آبادی ایک ارب 15 کروڑ کے لگ بھگ ہے پچھلے دوعشروں کی نسبت اس وقت مسلم ممالک میں زیادہ ابھار محسوس ہوتا ہے۔ مسلمان استعماریت سے آزادی حاصل کرنے کی کوشش میں ہیں۔ اسلام پر چودہ سوسال سے زیادہ عرصہ ہو چکا ہے مسلمانوں نے عروج وزوال کے مختلف ادوار دیکھے لیکن اسلام پر نہ کوئی ادبار آیا اور نہ آئے گا۔ یہ اللہ کا آخری دین ہے جس کے متعلق پیش گوئی ہے۔

هُوَ الَّذِیْ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّیْنِ كُلِّهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ (الصف 9:61)

وہی ہے جس نے اپنا رسول ہدایت اور سچے دین کے ساتھ بھیجا تا کہ اسے سب دینوں پر غالب کرے اگر چہ مشرک برا منائیں۔

اس آیت کریمہ میں اظہار دین سے مراد صرف نظری اور روحانی غلبہ مراد نہیں بلکہ سیاسی غلبہ بھی مراد ہے ماضی میں مسلمانوں کے غلبے کی جھلک قارئین کے سامنے ہے کہ مسلمان کس طرح ربع مسکون پر حکومت کرتے رہے لیکن قرآن مجید کو متروک بنانے کی وجہ سے تنزل کا شکار ہو گئے۔ اب دنیا میں ایسی دینی تحریکیں پیدا ہو چکی ہیں۔ جو اسلام کا خوبصورت چہرہ نمایاں کرنے کے لیے مصروف تبلیغ ہیں اور ایک ایسا دینی ادب پیدا ہو چکا ہے جس کو پڑھ کر لوگ اسلام کی طرف دوڑے آرہے ہیں قریب کے زمانہ میں ہی پائے محمدیاں ایک بلند مینار پر ہوگا۔ قرآن مجید کی روشنی میں وثوق اور حق الیقین کی بنیاد پر پیشگوئی کیجا سکتی ہے کہ تمام ادیان میں سے صرف دین اسلام ہی ایک ایسا دین ہے جس کا مستقبل روشن ہے۔ وہ وقت قریب آن پہنچا ہے جب مسلمان ایک بڑی طاقت بن کر دنیا پر حکومت کریں گے یہ میں نہیں کہہ رہا بلکہ اسلام کے سچے خدا کا یہ وعدہ ہے۔ اور پیش گوئی ہے۔

......☆......

خدا کا مردوں کو زندہ کرنا اس کے اپنے قانون کے خلاف ہے

اعتراض: کیا ہمہ دان خدا کے لیے امتحان لینے کی ضرورت ہے اور اگر مرنے کے بعد اٹھاتا ہے تو کیا مردے اٹھائے جانے کے وقت سے پہلے دورہ سپرد رہتے ہیں؟ پھر خدا کا مردوں کا زندہ کرنا اس کے اپنے قاعدہ کے خلاف ہے۔ کیا خدا! اپنا قانون توڑ سکتا ہے؟ (ستیارتھ پرکاش اعراض 90)

جواب: معترض نے مندرجہ ذیل آیت پر اعتراض کیا۔ لِيَبْلُوَكُمْ أَيُّكُمْ أَحْسَنُ عَمَلًا وَلَئِنْ قُلْتَ إِنَّكُمْ مَبْعُوثُونَ مِنْ بَعْدِ الْمَوْتِ لَيَقُولَنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا إِنْ هَذَا إِلَّا سِحْرٌ مُبِينٌ (ھود 11:77) تا کہ تم کو آزمائے کون تم میں سے اچھے عمل کرنے والا ہے اور اگر تو کہے کہ تم موت کے بعد اٹھائے جاؤ گے تو جو کافر ہیں کہیں گے تو صریح جادو ہے۔

خدا کی ہمہ دانی اور علیم و خبیر ہونے پر کوئی شک نہیں ہے اور ہر مذہب نے اللہ تعالیٰ کی ہمہ دانی کی تعلیم دی ہے۔ اس ہمہ دانی پر یقین ہونے کی وجہ سے انسان بُرے کاموں سے باز رہتا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ ایک علیم و خبیر ہستی اس کے عمل حتیٰ کہ اس کے دل کی مخفی باتوں کو بھی جانتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنی ہمہ دانی کی وجہ سے کسی شخص کو سزا نہیں دے دیتا کہ تم نے ایسا کرنا تھا لہٰذا اس کی سزا ہے۔ یہ انصاف کے تقاضوں کے خلاف ہے۔ جزا و سزا کردہ عمل پر دی جاتی ہے۔

آیت مذکورہ میں آزمائش (امتحان) کی یہ غرض بیان کی ہے کہ کون اچھے کام کرتا ہے امتحان (آزمائش) ہی کسی شخص اور قومی ترقی کا ذریعہ ہے۔ امتحان انسان کے اندر قوت عملیہ پیدا کرتا ہے۔ قوت عملیہ سے انسان اور قوموں کا مستقبل وابستہ ہے۔ اگر کوئی شخص یا کوئی قوم اپنی استعدادوں کو بروئے کار لاتی ہے تو وہ شخص یا قوم اپنے مستقبل کو سنوار رہی ہوتی ہے۔ اللہ نے یہاں بیان کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تمہیں اس لیے پیدا کیا ہے۔ تا کہ تمہارا امتحان (آزمائش) لے کہ کون اپنی مخفی استعدادوں سے کام لیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے احکام شریعت میں استعدادوں کے کام لینے کا طریقہ بھی بیان کر دیا ہے۔ جو شخص خدا کے بتائے ہوئے طریقوں کے مطابق اپنی استعدادوں سے کام لے گا وہ کام اچھا ہوگا اور اس کی جزا بھی اچھی ہوگی جو استعدادوں سے غیر شرعی طریقہ سے کام لے گا۔ تو اس کو سزا ملے گی بس آزمائش (امتحان) کی غرض یہ ہے کہ کون انسان اچھے کام سرانجام دیتا ہے اگر آزمائش (امتحان) نہ ہو تو کوئی بھی کام نہ کرے۔ ہم دنیا میں دیکھتے ہیں کہ طالب علم اس وجہ سے دن رات محنت کرتے ہیں ان کو معلوم ہے کہ ایک دن اس کا امتحان ہوگا۔ کامیابی کے لیے شب و روز محنت کرتا ہے۔ یہی غرض انسان کی پیدائش کی ہے۔ وہ ایک امتحان میں سے گزر رہا ہے۔ اس امتحان میں کامیابی کے لیے اس کے لیے محنت لازمی ہے۔ پھر احکام شریعت نازل کر کے راستے بھی متعین کر دیئے ہیں۔ کہ کس رستے پر چل کر انسان کامیاب ہو سکتا ہے۔ اس آیت میں تو انسان کی ترقی کا ایک پیغام ہے وہ بیکار اور بے سود پیدا نہیں کیا گیا۔ کیونکہ ایک خاص غرض کے لیے پیدا کیا گیا ہے۔ اس غرض کے حصول کے لیے انسان کو شب و روز محنت کرنی چاہیے۔

مردوں کو زندہ کرنا:

رہا مردوں کا زندہ کرنا اور اس وقت تک دورہ سپرد رہنا (عالم برزخ میں رہنا۔) اللہ تعالیٰ کا اپنا نظام ہے۔ جب اللہ تعالیٰ ایک قطرہ آب سے انسان کو پیدا کر سکتا ہے تو وہ جسم کے فنا ہو جانے کے بعد روح کو ایک نیا جسم کیوں نہیں دے سکتا۔ یہ اللہ کی قدرت اور طاقت

ہے کہ وہ مردہ کی روح کو ایک نیا جسم دے۔ مُردوں کو زندہ کرنا ہر مذہب کا عقیدہ ہے اسی طرح عالم برزخ کا تصور بھی ہر مذہب میں پایا جاتا ہے۔ ہندو دھرم میں بھی ہے کہ مکتی کے زمانے میں گنہگار ارواح 4 ارب برس تک دورہ سپرد رہتی ہے۔ تو قیامت تک ارواح کے عالم برزخ میں رہنے پر کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔ خدا اپنے قاعدے اور قانون کے مطابق ہی مردوں کو زندہ کرتا ہے یہ کسی قانون کے خلاف نہیں۔ موت کے بعد انسان کی روح کو جسم دے کر زندہ اس لیے کرے گا۔ آیا وہ اپنی دنیاوی زندگی کے امتحان میں کامیاب ہے یا ناکام۔ حشر انسان کی مادی زندگی کے اعمال تولنے کا دن ہے۔ یہ ضروری ہے کہ انسان کے اعمال کا نتیجہ ظاہر ہو لہٰذا نظریہ حشر عین عقل اور الٰہی قانون کے مطابق ہے۔ اگر سوامی جی یا دیگر معترضین کے ذہن میں یہ بات نہیں آتی تو قرآن مجید کا کیا قصور۔

☆......☆

دوزخ اور بہشت کی میعاد آسمان اور زمین کے قیام تک ہے
اس لیے بہشت اور دوزخ ابدی نہیں

اعتراض: جب بہشت اور دوزخ میں قیامت کیے پیچھے سب لوگ جائیں گے پھر آسمان اور زمین کس لیے قائم رہیں گے اور جب دوزخ اور بہشت کی میعاد آسمان اور زمین کے قیام تک ہوئی تو بہشت اور دوزخ ابدی کیوں کر ہو سکتے ہو؟ قیامت بھی کبھی نہ آئے گی کیونکہ زمین اور آسمان کبھی نہ ٹلیں گے۔ (ستیارتھ پرکاش اعتراض 92)

جواب: اس آیت پر اعتراض ہے ارشاد الٰہی ہے وَاَمَّا الَّذِيْنَ سُعِدُوْا فَفِي الْجَنَّةِ خَالِدِيْنَ فِيْهَا مَادَامَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ اِلَّا مَاشَآءَ رَبُّكَ عَطَآءً غَيْرَ مَجْذُوْذٍ (ھود 108:11) اور وہ جو خوش بخت ہیں وہ بہشت میں ہوں گے اس میں رہیں گے۔ جب تک آسمان اور زمین ہیں۔ مگر جو تیرا رب چاہے یہ بخشش ہے جو کبھی منقطع نہ ہوگی۔

قیامت کے بعد زمین اور آسمان انہیں ہو گئے اس دنیا پر فنا طاری ہو جائے گی۔ پہاڑ ریزہ ریزہ ہو جائیں گے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں مختلف مقامات پر قیامت کی گھڑی کے قبل کا نقشہ کھینچا ہے۔

جس سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ دنیا کی ہر چیز پردہ دفنا میں چلی جائے گی۔ يَوْمَ تُبَدَّلُ الْاَرْضُ غَيْرَ الْاَرْضِ وَالسَّمٰوٰتُ وَبَرَزُوْا لِلّٰهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ (ابراہیم 48:14) جس دن (بروز قیامت) زمین اور آسمان میں تبدیلی کی جائے گی اور سب لوگ خدا قہار کے سامنے نکلیں گے۔ جب زمین و آسمان کی تبدیلی ہوگی تو وہاں کی زندگی بھی بدل جائے گی جیسے زمین و آسمان یا حالات ہوں گے۔ ویسے ہی وہاں کی زندگی ہوگی اس دنیا کی زمین و آسمان کو جنت کی زمین و آسمان سمجھنا غلط ہے۔ دنیا کی زمین و آسمان پر فنا آئے گی۔ لیکن بہشت کے زمین و آسمان پر فنا نہیں آئے گی جیسا کہ الفاظ عَطَآءً غَيْرَ مَجْذُوْذٍ سے ظاہر ہے یعنی جنت کی نعمتوں پر کبھی بھی انقطاع نہیں آئے گا وہ ہمیشہ رہیں گی معترضین کو یہ بھی اسلامی فلسفہ سمجھ لینا چاہیے کہ صرف جنت کو دوام حاصل ہے۔ دوزخ پر ایک ایسا وقت بھی آئے گا۔ جب کہ اس میں کوئی جان نہ ہوگی۔ سب دوزخیوں کو ان کے گناہوں کی مناسبت سے سزا بھگتنے کے بعد نکال لیا جائے گا۔

دوزخ اور بہشت کے ارض وسما کو دنیا کے ارض وسما قرار نہیں دینے چاہئیں وہاں کے حالات اور کیفیات اس دنیا کے حالات اور کیفیات سے بالکل الگ ہیں۔غیر مشہود چیز کو مشہود چیز کی طرح قرار نہیں دیا جاسکتا لہٰذا مادمت السموت والارض کے الفاظ جنت اور دوزخ کو غیر ابدی ہونے کو ظاہر نہیں کرتے۔دوسری دنیا کے ارض وسما کی کیفیت ہی اور ہے۔

☆......☆

قصہ یوسف میں باپ بیٹے کے درمیان مکالمہ ظاہر کرتا ہے قرآن کلام الٰہی نہیں

اعتراض: اس باب میں باپ بیٹے کی باہم گفتگو درج ہے۔جس سے ثابت ہوتا ہے کہ قرآن کلام اللہ نہیں اس میں کسی آدمی نے آدمیوں کے قصے کہانیاں لکھ ماری ہیں۔

جواب: سورۃ یوسف پر اعتراض ہے جس میں حضرت یوسف اور حضرت یعقوب کے مکالمے اور اس کے بھائیوں کی باتیں بھی درج ہیں۔

قرآن مجید میں انبیاء علیہم السلام کے واقعات درج ہیں۔وہ واقعات ہی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت پر گواہ ہیں کہ یہ وہ شخص بتا رہا ہے جس کو ان واقعات کی خبر تک نہیں تھی نہ اس کے پاس اس دور میں ذرائع تھے جن کی بناء پر ان واقعات کو جان سکتا۔گو وہ واقعات ماضی سے تعلق رکھتے تھے لیکن رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے وہ غیب کی خبریں تھیں۔جن کا آپ کو علم نہ تھا۔ان کا اظہار یہ ظاہر کرتا ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو کسی علیم وخبیر ہستی نے یہ اطلاع دی ہے۔اور آپ بیان کر رہے ہیں گزشتہ انبیاء علیہم السلام کے واقعات میں مسلمانوں کے لیے یہ بشارت تھی کہ جس طرح پہلے انبیاء علیہم السلام مخالفین کے مقابل میں کامیاب وکامران رہے اسی طرح رسول کریم ﷺ اپنے مخالفین پر غالب آئیں گے۔گویا پہلے واقعات میں مسلمانوں کے لیے بے شمار عبرتیں اور بصیرتیں پنہاں ہیں جو اللہ تعالیٰ نے مختلف پیرائے میں بیان کیے ہیں کہیں مکالمے کی شکل میں کہیں کسی دوسرے پیرائے میں جہاں واقعہ مکالمے کی شکل میں بیان کیا گیا ہے اس کا یہ مطلب نہیں۔خدا کا کلام نہیں اللہ تعالیٰ نے وہ واقعہ مکالمے کی شکل میں بیان کر دیا ہے۔عام کتب میں پڑھتے ہیں کہ مصنف کوئی واقعہ دو آدمیوں کے درمیان مکالمے کی شکل میں بیان کر دیتا ہے اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ وہ کتاب اس مصنف کی نہیں یہ تو بڑی کم عقلی کی دلیل ہے کہ قرآن مجید میں باپ اور بیٹے کا مکالمہ ہے لہٰذا یہ کتاب خدا کی طرف سے نہیں کیا خدا باپ اور بیٹے کے واقعہ کو مکالمے کی شکل میں بیان نہیں کر سکتا۔ڈرامے تو مکالمے کی ہی شکل میں ہوتے ہیں۔

حضرت یوسف علیہ السلام کے قصہ میں یہ پیشینگوئی کی گئی ہے کہ جس طرح حضرت یوسف علیہ السلام کو ان کے بھائیوں نے گھر سے نکال دیا اور ان کی جان لینے کے درپے ہوئے اسی طرح رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بھائی آپ کو گھر سے نکال دیں گے۔اور آپ کو اور آپ ﷺ کے مشن کو ختم کرنے کے منصوبے گھڑیں گے۔جس طرح اللہ تعالیٰ نے حضرت یوسف علیہ السلام کو عزت دی اور ان کے بھائی ان کے سامنے عجز وانکساری کے ساتھ پیش ہوئے اسی طرح رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم بھی مخالفوں کے منصوبوں سے نجات پا کر ایک دن غلبہ حاصل کر لیں گے اور ان کے مخالف بھائی ان کے سامنے مجرمانہ رنگ میں پیش ہوں گے اور آپ ﷺ حضرت یوسف علیہ السلام کی طرح فراخ دلی سے ان کو لَا تَثْرِيبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ اِذْهَبُوا فَاَنْتُمُ الطُّلَقَاءُ کہہ کر معاف کر دیں گے۔

پیشینگوئی ہجرت کے دس سال بعد پوری ہوئی جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم دس ہزار قدوسیوں کے ساتھ فاتحانہ طور پر مکہ میں داخل ہوئے اور آپ ﷺ کے سامنے تمام قریش مجرمانہ رنگ میں پیش ہوئے۔

الزامی جواب: اگر ویدوں کا مطالعہ کیا جائے تو اس میں ادھورے قسم کے ماضی کے واقعات درج ہیں ماضی کے واقعات بیان کرنے سے کسی کتاب کی اہمیت کم نہیں ہوتی۔ ماضی کے واقعات میں قارئین کے لیے عبرتیں ہوتی ہیں۔ قرآن مجید کے ماضی کے قصوں میں تو نصائح عبرتیں اور پیشینگوئیاں ہیں۔ جو قارئین کے دلوں کو نور سے روشن کرتی ہیں۔

☆......☆

مسلمانوں کا خدا علم طبعی سے ناواقف ہے

اعتراض: مسلمانوں کا خدا علم طبعی سے واقف نہیں معلوم ہوتا ورنہ آسمانوں کو بغیر ستونوں کے کھڑا کرنے کی شیخی کیوں مارتا آسمان میں تو کشش ثقل نہیں ہے اور یہ عرش پر رہنے سے خدا حاضر و ناظر اور ہمہ دان کس طرح ہوسکتا ہے خدا کا آسمان سے پانی اتارنے کا ذکر ثابت کرتا ہے کہ وہ بادلوں کے بننے کا سبب بھی نہیں جانتا تھا بادل تو زمین سے اٹھے ہوئے بخارات سے بنتے ہیں پھر پانی کا آسمان سے اترنا چہ معنی دارد اور خدا کا بلا اعمال کے کسی کی روزی فراخ کرنا اور کسی کی تنگ کرنا اس کی بے انصافی اور طرف داری پر دلالت کرتا ہے۔ (ستیارتھ پرکاش 94)

جواب: معترض کا اعتراض تین اجزاء پر مشتمل ہے اور تینوں اجزا کے الگ الگ جواب دیئے جاتے ہیں۔

آسمانوں کے غیر مری ستون:

اس آیت پر یہ اعتراض کیا گیا ہے اَللّٰہُ الَّذِیْ رَفَعَ السَّمٰوٰتِ بِغَیْرِ عَمَدٍ تَرَوْنَھَا (الرعد 2:13) اللہ وہ ذات ہے جس نے آسمانوں کو بغیر ایسے ستونوں کے بلند کیا جنہیں تم دیکھتے ہو اس آیت میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آسمانوں کو بلند رکھا ہوا ہے بغیر ایسے ستونوں کے جنہیں تم دیکھتے ہو گویا آسمان اور زمین کے درمیان کوئی ایسے ستون نہیں جنہیں ہم نہیں دیکھتے یعنی ان کا ہم سے تعلق تو ہے مگر وہ ان آنکھوں سے نظر نہیں آتا۔ یہاں بحث ہی بعض تعلقات پر ہے جو آنکھوں سے نظر نہیں آتے جیسے سورج اور چاند کا تعلق ہے یا جیسے زمین اور آسمان کا تعلق ہے یا جیسے پہاڑوں اور دریاؤں کا تعلق دن اور رات کا تعلق وغیرہ۔

سائنس نے بھی شہادت دی ہے کہ ان میں باہم تعلقات ہیں جو اس کو قائم رکھے ہوئے ہے بغیر ان تعلقات (کشش ثقل) کے یہ نظام قائم نہیں رہ سکتا۔ آسمان اور زمین کے درمیان ایک تعلق ہے اس تعلق کی بناء پر آسمان قائم ہے یہ تعلق ہماری نظروں سے اوجھل ہے اسی تعلق کو غیر عمد کے الفاظ سے ظاہر کیا ہے۔

دور حاضر میں سائنس نے بھی یہ ثابت کیا ہے کہ تمام نظام فلکی اور نظام شمسی اور نظام ارضی میں ایک تعلق اور ربط ہے اس ربط اور تعلق کو کشش ثقل کی اصطلاح سے ظاہر کرتے ہیں۔ جس چیز کو آج سائنس نے بیان کیا ہے آج سے چودہ سو سال پہلے ایک امی رسول حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم نے خدا سے وحی پا کر بیان کر دیا تھا۔

دوسرا جزو:

خدا کا عرش۔ ثُمَّ اسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ (الرعد 2:13) پر عرش پر اقرار پکڑا۔

عرش پر بحث سیرت سید البشر کے حصہ اول اور دوم میں مفصل ہو چکی ہے یہاں سلسلہ کلام کو جاری رکھنے کے لیے مختصراً عرض کیا جاتا ہے کہ اس سے پہلے زمین وآسمان یعنی نظام ارضی اور نظام فلکی کا ذکر ہے۔ یعنی اللہ تمام نظام بنا کر ان کے اوپر خود حکمران اعلیٰ بن کر بیٹھ گیا ہے۔ اور اب تمام نظام اس کے حکم کے تحت چل رہے ہیں۔

لفظ ''عرش'' حکومت الٰہی کو بیان کر رہا ہے۔

تیسرا جز آسمانوں سے پانی اترنا:

ارشاد الٰہی ہے اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً (الرعد 17:13) وہ بادلوں سے پانی اتارتا ہے۔

عربی میں آسمان کے معنی بلندی اور اوپر کی چیز کے آتے ہیں۔ اس لیے لفظ سماء کبھی آسمان کے معنی میں استعمال ہوتا ہے اور کبھی بادل کے معنی میں بھی استعمال ہو جاتا ہے سیاق وسباق کو ملحوظ رکھ کر معنی کیے جانے چاہئیں دنیا کے ہر ادب کا یہ طریقہ ہے۔ محل وقوع کی مناسبت اور سیاق وسباق کو سامنے رکھ کر معنی کیے جاتے ہیں کبھی لفظ لغوی معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ کبھی مجازی معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے ایک ہی لفظ مختلف معانی میں استعمال ہو جاتا ہے اسی میں ادب کی چاشنی اور لطف ہے مثلاً لفظ پہاڑ ہے۔ لغوی معنی میں جوڑے ہوئے پتھروں کی اونچی بلندی کو کہا جاتا ہے لیکن جب اس لفظ کو اس طرح استعمال کریں۔ وہ اپنی جگہ پہاڑ بن کر کھڑا ہو گیا تو اس کے معنی اپنی جگہ مضبوطی سے کھڑے ہونے کے ہوں گے۔ یا یہ کہا جائے زید اپنے دشمن کے سامنے پہاڑ بن کر کھڑا ہو گیا تو یہاں زید کی بہادری اور مضبوطی قدم کی تعریف کی گئی ہے۔ الغرض الفاظ اپنے اندر مختلف معانی رکھتے ہیں کبھی لغوی معنی میں استعمال ہوتے ہیں کبھی مجازی معنی میں۔ سیاق و سباق کو سامنے رکھ کر الفاظ کے معنی کیے جانے چاہئیں۔ لہٰذا زیر اعتراض آیت میں سماء کے معنی آسمان نہیں بلکہ بادل کے ہیں۔

چوتھا جز روزی کی تنگی اور فراخی:

ارشاد الٰہی ہے۔ اَللّٰہُ یَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ یَّشَآءُ وَیَقْدِرُ (الرعد 26:13) اللہ جس کے لیے چاہتا ہے رزق فراخ کرتا ہے (جس کے لیے چاہتا ہے) تنگ کرتا ہے۔

مشیت الٰہی سے مراد قانون خداوندی اور سنت الٰہی ہے۔ زیر اعتراض آیت کے معنی یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ اپنے قانون اور سنت کے مطابق کسی کے رزق میں فراخی اور تنگی کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے رزق مہیا کرنے کے بارے میں اپنا قانون مشیت مقرر کیا ہے وہ یہ ہے کہ اس نے انسان کے فائدہ اور تمتع کے لیے ہر چیز پیدا کر دی ہے۔ ارشاد الٰہی ہے ھُوَالَّذِیْ خَلَقَ لَکُمْ مَافِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا (البقرہ 29:2) اور وہی ذات ہے جس نے تمہارے لئے زمین میں سب کچھ پیدا کر دیا ہے۔ وَقَدَّرَ فِیْھَا اَقْوَاتَھَا (حم السجدہ 10:) اس (زمین) میں اس کی غذائیں مقرر کر دیں۔

اب یہ انسان کا کام ہے کہ وہ اس رزق کے حاصل کرنے میں کوشش کرے جو بھی وہ کوشش کرے گا اس کا پھل اس کو مل جائے گا۔

ارشاد الٰہی ہے وَابْتِغَاؤُکُمْ مِنْ فَضْلِہٖ (الروم 30 : 24) اور تم اس کے عطا کردہ رزق (فضل) کی تلاش کرو۔

دوسری جگہ آتا ہے فَانْتَشِرُوْا فِی الْاَرْضِ وَابْتَغُوْا مِنْ فَضْلِ اللّٰہِ (الجمعہ 10:62) خدا کے فضل (رزق) کی تلاش کے لیے زمین میں پھیل جاؤ۔ فرمایا وَاَنْ لَّیْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰی (النجم 39:53) اور انسان کے لیے کچھ نہیں مگر وہ جو وہ کوشش کرتا ہے۔

مذکورہ بحث کی روشنی میں زیر اعتراض آیت کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے قانون اور سنت کے مطابق ہی کسی انسان کی روزی فراخ اور تنگ کرتا ہے وہ قانون کیا ہے سعی بلیغ یعنی رزق کی تلاش میں پوری پوری کوشش اور سعی کرنا۔

اللہ تعالیٰ نے انسان کے لیے رزق کے سامان اپنے صفت رحمانیت کے تحت پیدا کیے ہیں جس میں انسان کی محنت اور کوشش کا کوئی عمل دخل نہیں۔ رزق کے حصول کے لیے کوشش اور عمل کرنا پھر رزق کو پانا یہ صفت رحیمیت کے تابع ہے۔ انسان کی محنت کے نتیجہ میں جو پھل ملتا ہے وہ صفت رحیمیت کے تحت ملتا ہے رحیم وہ ہستی ہے جو محنت کا اعلیٰ پھل دیتی ہے۔ پس اللہ تعالیٰ نے انسان کے لیے رزق حاصل کرنے کے لیے سعی بلیغ کا قانون وضع کیا ہے اسی کے مطابق رزق میں فراخی اور تنگی ہوتی ہے جتنی بلیغ کوشش ہوگی اتنی ہی رزق میں فراخی ہوگی۔ اگر کوشش ناتمام ہے اور سستی سے کام لیا ہے تو رزق میں تنگی آئے گی۔ یہ وہ عمدہ قانون ہے جس پر معترض نے اعتراض کیا ہے اس نے اپنے اعتراض میں جہالت کا ثبوت دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کسی سے بے انصافی نہیں کرتا انسان کی اپنی ہی کوتاہیاں اور خامیاں ہوتی ہیں جن کی وجہ سے انسان گھاٹے میں ہوتا ہے۔ بعض لوگ اپنی نادانی کی وجہ سے خدا کی طرف سے منسوب کر دیتے ہیں۔

......☆......

اسلام کا خدا گمراہ کنندہ ہے

اعتراض : جب خدا گمراہ کرتا ہے تو اس میں اور شیطان میں کیا فرق ہے جب کہ شیطان دوسروں کو گمراہ کرنے کے سبب بُرا کہا جاتا ہے تو خدا بھی ویسا ہی کام کرنے سے شیطان اور بُرا کیوں نہیں کہا جاتا؟ اور اس کے عوض دوزخ کیوں نہیں ملنا چاہیے (سیتارتھ پرکاش نمبر 95)

جواب : یہ اعتراض سورہ الرعد کی آیت 27 ''وَيَقُولُ الَّذِينَ كَفَرُوا لَوْلَا أُنْزِلَ عَلَيْهِ آيَةٌ مِّنْ رَّبِّهِ قُلْ إِنَّ اللَّهَ يُضِلُّ مَنْ يَّشَاءُ وَيَهْدِي إِلَيْهِ مَنْ أَنَابَ یعنی اور جنہوں نے کفر کیا کہتے ہیں اس پر اس کے رب کی طرف سے نشان (معجزہ) کیوں نہیں اتار دیا جاتا کہ اللہ جسے چاہتا ہے گمراہی میں چھوڑ دیتا ہے اور اسے اپنی طرف رستے دکھاتا ہے جو اس کی طرف رجوع کرتا ہے۔

معترض نے اس اعتراض میں خدا کی مشیت پر اعتراض کیا ہے۔ خدا کی مشیت کیا ہے؟ خدا کی مشیت سے مراد وہ قوانین ہیں جو اللہ تعالیٰ نے نظام کائنات کے لیے وضع کیے ہیں۔ لہٰذا نظام کائنات اللہ کی مشیت کے مطابق چل رہا ہے۔ خدا کی مشیت کے مطابق ہی سلسلہ انبیاء علیہم السلام شروع ہوا تاکہ بنی نوع انسانوں کو ہدایت اور گمراہی کے رستوں سے آگاہ کریں۔ اگر کوئی شخص اللہ کی ہدایت کے مطابق رستہ پر چلتا ہے تو وہ کامیاب ہو جاتا ہے جو اس کے برعکس گمراہی کا رستہ اختیار کر لیتا ہے تو وہ ناکام و نامراد ہو جاتا ہے اللہ تعالیٰ نے مادی دنیا کے لیے بھی قانون وضع کر دیئے ہیں جو شخص یا قوم اللہ کے بتائے ہوئے قوانین کے تابع چلے گی وہ شخص یا قوم ترقی کی راہ پر گامزن ہو جائے گی۔ اسی طرح جو شخص اللہ تعالیٰ کے روحانی قوانین کے مطابق زندگی بسر کرتا ہے تو وہ کامیاب ہے اگر اس کے برعکس زندگی بسر کرتا ہے تو وہ ناکام و نامراد ہو جاتا ہے اس کے تمام روحانی قویٰ مردہ ہو جاتے ہیں یہ ہے اللہ کی مشیت مسلمانوں کا یہ مسلمہ عقیدہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات اور صفات میں کوئی نقص نہیں وہ مجمع جمیع صفات کاملہ کا مالک ہے وَلِلَّهِ الْأَسْمَاءُ الْحُسْنَىٰ اس کی تمام صفات بہتر ہیں اور بے نقص ہیں اس لیے اللہ تعالیٰ کی طرف کوئی نقص یا عیب منسوب کرنا جہالت کا نتیجہ ہے۔

اس آیت میں کافر لوگ اپنی ہلاکت کا نشان طلب کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اس کا جواب اسی رکوع کے آخر میں دیا ہے وَلَا يَزَالُ الَّذِينَ كَفَرُوا تُصِيبُهُم بِمَا صَنَعُوا قَارِعَةٌ أَوْ تَحُلُّ قَرِيبًا مِّن دَارِهِمْ حَتَّىٰ يَأْتِيَ وَعْدُ اللَّهِ إِنَّ اللَّهَ لَا يُخْلِفُ الْمِيعَادَ (الرعد 31:13) اور جنھوں نے کفر کیا انہیں اس کی وجہ سے جو وہ کرتے ہیں کوئی نہ کوئی مصیبت پہنچتی رہے گی یا ان کے گھر کے قریب اترے گی یہاں تک کہ اللہ کا وعدہ آجائے اللہ وعدے کے خلاف نہیں کرتا۔

کفار نے اپنی ہلاکت کا نشان طلب کیا۔ اسی رکوع کے آخر میں نشان کا ذکر کردیا جو وہ اللہ کے قوانین کی خلاف ورزی کررہے ہیں اللہ کے احکام کو توڑ رہے ہیں اور گمراہی کا رستہ اختیار کرلیا ہے اس وجہ سے ان کو مصیبت پہنچتی رہے گی وہ مصیبت (قارعہ) کیا ہے؟ وہ سرایا اور جنگیں ہیں۔ ان جنگوں کی آگ خود انہوں نے ہی بھڑکائی تھی اسی آگ میں وہ تباہ و برباد ہوئے یہ ہے ان کا ''اپنا کرنا'' (صنعوا) جو جنگیں انہوں نے خود شروع کی تھیں وہی جنگیں ان کے لیے قارعۃ (مصیبت) بن گئیں۔ أَوْ تَحُلُّ قَرِيبًا مِّن دَارِهِمْ سے مراد فتح مکہ ہے فتح مکہ کفار کے لیے عظیم قارعۃ (بڑی مصیبت) تھی۔

آیت 27 کے آخر میں ہدایت یافتہ لوگوں کا بھی ذکر کیا يَهْدِي إِلَيْهِ مَنْ أَنَابَ جو اس کی طرف مائل ہوتا ہے اس کو اللہ ہدایت دیتا ہے یعنی جو اللہ کی مشیت یعنی اس کے قانون کو اختیار کرتا ہے اس کے مطابق زندگی بسر کرتا ہے اللہ اس کو ہدایت یعنی منزل مقصود تک پہنچا دیتا ہے ترک اسلام کے مصنف دھرم پال نے بھی یہی اعتراض کیا ہے کہ اسلام کا خود گمراہ کنندہ ہے۔ جو سیرت سید البشر حصہ سوم کے صفحہ 360 پر لکھا جاچکا ہے۔ قارئین اس کو بھی سامنے رکھیں تو اعتراض کی کھوکھلی حقیقت واضح ہوجائے گی۔

......☆......

قرآں کہاں سے اُترا؟

اعتراض :قرآن کس طرف سے اُترا؟ کیا خدا اوپر رہتا ہے ایسی صورت میں تو وہ ایک خاص جگہ مقیم ہونے کی وجہ سے خدا نہیں ہوسکتا کیوں کہ وہ حاضر و ناظر ہے پیغام پہنچانا ہرکارہ کا کام ہے اور ہرکارہ کی ضرورت انسان کو ہوتی ہے اور حساب لینا آدمیوں کا کام ہے خدا کا نہیں کیونکہ وہ ہمہ دان ہے (ستیارتھ پرکاش نمبر 96)

جواب :قرآن مجید کی اس آیت کو مورد اعتراض بنایا ہے وَكَذَٰلِكَ أَنزَلْنَاهُ حُكْمًا عَرَبِيًّا (الرعد 37:13) اور اسی طرح ہم نے اسے اتارا فیصلہ عربی میں۔

اس اعتراض کے بھی دو اجزاء ہیں پہلا جزیہ ہے کہ قرآن کس طرف سے اُترا؟ کیا خدا اوپر رہتا ہے۔ قرآن مجید اللہ کی طرف سے ہی اتارا گیا ہے۔ قرآن مجید میں ایک جگہ نہیں بلکہ کئی جگہ اللہ کی طرف سے اتارے جانے کا ذکر ہے۔ ارشاد الٰہی ہے إِنَّا أَنزَلْنَاهُ قُرْآنًا عَرَبِيًّا (یوسف 2:12) ہم نے اس کو (قرآن) کو عربی زبان میں اتارا۔ دوسری جگہ آتا ہے إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْقُرْآنَ تَنزِيلًا (الدھر 23:76) ہم نے تجھ پر قرآن کو (تھوڑا تھوڑا کرکے) اتارا ہے۔ مسلمانوں کا یہ عقیدہ ہے کہ تمام پیغمبروں پر کتب (احکام) نازل ہوئیں۔ ان احکام کو لوگوں تک پہنچانے کے لیے ہی اپنے پیغمبروں کو بھیجا۔ پیغمبر صرف کسی ایک علاقہ میں نہیں آئے بلکہ اسلام کی رو سے

دنیا کے ہر خطہ میں پیغمبر آئے اور انہوں نے اللہ کا پیغام ان تک پہنچایا۔ ارشاد الٰہی ہے اِنۡ مِّنۡ اُمَّةٍ اِلَّا خَلَا فِیۡهَا نَذِیۡرٌ (فاطر 24:35) ہر امت میں ڈرانے والا گزر چکا ہے۔

دوسری جگہ آتا ہے وَلِكُلِّ قَوۡمٍ هَادٍ (الرعد 7:13) ہر قوم کی طرف رہنما آیا ہے۔

اسی اصول کے تحت ہندوستان میں بھی ہادی آئے ہیں ان پر احکام نازل ہوئے ہیں۔ سوامی دیانند جس طرح ویدوں کو منزل من اللہ قرار دیتے ہیں۔ اسی طرح مسلمانوں کا یہ عقیدہ ہے کہ قرآن مجید اللہ کی طرف سے نازل کیا گیا ہے۔

ہرکارہ کی ضرورت:

اس زمین میں انسان بستے ہیں انسان بالطبع نمونہ کا محتاج ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس انسانی احتیاج کو پورا کرنے کے لیے ایک انسان کو ہی رسول (ہرکارہ) بنا کر بھیجا ہے تاکہ وہ اللہ کے احکام پر پہلے خود عمل پیرا ہو۔ انسان ہی انسان کے لیے نمونہ ہوسکتا ہے۔ دنیا میں ہم دیکھتے ہیں کہ انسان ہی انسانوں کو سکھاتے ہیں اور ایک دوسرے سے سیکھتے ہیں جب ہم دنیا کا کوئی مسئلہ کسی انسان سے ہی حل کرواتے ہیں اور اسی سے حل معلوم کرتے ہیں تو احکام الٰہی کے سمجھنے کے لیے بھی کسی انسان کی ضرورت ہوتی ہے۔

اللہ بھی انسان پر اپنے احکام نازل کرتا ہے وہ اللہ سے سیکھتا ہے اس کے بعد وہ لوگوں کو اپنے عمل سے سکھاتا ہے۔ یہی طبعی طریقہ ہے۔ احکام الٰہی پہنچانے کے لیے کوئی آدمی بحیثیت ہرکارہ (نبی یا رسول) بن کر آئے قرآن مجید نے بھی اس عقدہ کو اس آیت کریمہ میں کھولا ہے ارشاد الٰہی ہے قُلۡ لَّوۡ كَانَ فِی الۡاَرۡضِ مَلٰٓئِكَةٌ یَّمۡشُوۡنَ مُطۡمَئِنِّیۡنَ لَنَزَّلۡنَا عَلَیۡهِمۡ مِّنَ السَّمَآءِ مَلَكًا رَّسُوۡلًا (بنی اسرائیل 95:17) کہ اگر زمین میں فرشتے اطمینان سے چلتے پھرتے تو ضرور ان پر آسمان سے فرشتے رسول بنا کر بھیجتے۔ گویا انسان کو سمجھانے کے لیے انسان ہی کی ضرورت ہوتی ہے وہی بہترین معلم ثابت ہوتا ہے اللہ تعالیٰ نے نبی (رسول) کو ہرکارہ بنا کر بھیجا ہے تو یہی انسانی ضرورت کا تقاضا تھا۔ اللہ تعالیٰ جب انسانوں کی طرف نبی بطور ہرکارہ بھیجتا رہا ہے تو اپنی ضرورت کے لیے نہیں بھیجتا بلکہ انسانوں کی ضرورت کو پورا کرنے کے لیے بھیجتا ہے۔

کیا خدا اوپر رہتا ہے؟

خدا اوپر نہیں رہتا۔ خدا وہ ہستی ہے جو لامکاں ہے اور ہر جگہ حاضر و ناضر ہے۔ اس کی بادشاہت سے کوئی شخص باہر نہیں نکل سکتا۔ جب ہم یہ کہتے ہیں کہ اللہ آسمانوں میں ہے تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ آسمان میں کسی جگہ بیٹھا ہوا ہے بلکہ اس سے بلند شان مراد ہوتی ہے یعنی اللہ تعالیٰ اتنی بلند شان والا ہے جیسے آسمان کی بلندی یہ قرآنی محاورہ اللہ تعالیٰ کی بلند شان کو ظاہر کرتا ہے۔

۸۔

قرآن کی رو سے زمین گردش نہیں کرتی (یہ غلط ہے)

اعتراض: سورج اور چاند ہمیشہ گردش کرتے ہیں اور زمین گردش نہیں کرتی اگر زمین گردش نہ کرے تو دن رات کئی برسوں کا ہوا گر انسان سچ مچ ظالم اور گنہگار ہے تو وہ نیک کبھی نہیں ہوسکتا لیکن دنیا میں نیک و بد دو قسم کے آدمی موجود ہیں اس واسطے یہ بات درست نہیں اور قرآن کلام نہیں (سیتارتھ پرکاش اعتراض 97)

جواب: اعتراض سورۃ ابراہیم کی آیات 34,33 پر کیا گیا ہے۔

1- وَسَخَّرَ لَكُمُ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ دَآئِبَيْنِ وَسَخَّرَ لَكُمُ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ (اور سورج اور چاند کو جو ایک قانون کے مطابق چل رہے ہیں تمہارے کام لگایا ہے اور رات دن کو بھی تمہارے کام میں لگایا۔

2- وَاٰتٰكُمْ مِّنْ كُلِّ مَاسَاَ لْتُمُوْهُ وَاِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا اِنَّ الْاِنْسَانَ لَظَلُوْمٌ كَفَّارٌ (اور جو کچھ تم مانگو اس میں سے تمہیں دیتا ہے اور اگر تم اللہ کی نعمتوں کو گننا چاہو تو انہیں گن نہ سکو گے۔ یقیناً انسان بڑا ہی ظالم بڑا ناشکرا ہے۔

معترض نے زمین کا گردش نہ کرنے کا اعتراض کیا ہے جس کی وجہ سے دن رات بنتے ہیں۔ اس آیت میں زمین کی گردش نہ کرنے کا کوئی ذکر نہیں اور نہ ہی اس آیت کا یہ موضوع ہے محض اپنی لاعلمی کی وجہ سے یہ اعتراض کر دیا ہے اللہ تعالیٰ نے زیر اعتراض آیت اور ماقبل کی آیت میں کائنات کی ان چیزوں کا ذکر کیا ہے جو انسان کو فائدہ پہنچا رہی ہیں اللہ تعالیٰ نے بادلوں سے پانی برسانے کا ذکر کیا ہے جس سے انسان کی روزی کا تعلق ہے پھر کشتیوں، دریاؤں، سورج، چاند اور دن رات کا ذکر کیا ہے جن سے انسان فائدہ اٹھا رہا ہے یہ وہ نعمتیں ہیں جو اس کے کسی عمل کے نتیجہ میں نہیں دیں بلکہ اپنی صفت رحمانیت کے تحت عطا کی ہیں انسان اس لیے ظالم اور ناشکرا ہے اس نے ان چیزوں کو ہی خدا کا شریک بنالیا ہے اور ان کے سامنے سجدہ ریز ہو گیا ہے۔ شرک ظلم عظیم ہے۔ جو اس کا مرتکب ہوگا وہ ظلوم اور کفور (ظالم اور ناشکرا) ہے اللہ تعالیٰ نے انسان کو ان آیات میں اس بات سے آگاہ کیا ہے جس طرح اللہ تعالیٰ نے اس کے فائدہ کے لیے کائنات میں ہر قسم کی چیز تخلیق کر دی ہے اور وہ اس سے فائدہ بھی اٹھا رہا ہے۔ اسی طرح اس کی روح کے فائدے کے لیے وحی کا سلسلہ جاری کیا ہے۔ جو شخص اس نعمت سے فائدہ اٹھاتا ہے وہ روحانی مدارج طے کرتا ہوا روحانی ثمرات سے بہرہ مند ہوتا ہے۔ انسان کی پیدائش کی غرض و غایت ان روحانی ثمرات کا حصول ہے۔ قرآن مجید کا یہ خاص طرز بیان ہے کہ جہاں وہ مادی اور جسمانی نعمتوں کا ذکر کرتا ہے تو اس کے ساتھ ہی روحانی نعماء کا بھی ذکر کرتا ہے۔ یہ دونوں قسم کی نعمتیں ایک دوسرے کے ساتھ چلتی ہیں۔ اگر ہمارے مادی جسم کے لیے کائنات میں ہر قسم کی چیزیں پیدا کر دی ہیں تو روح کی نشوونما کے لیے روحانی نظام بھی جاری کر دیا ہے وہ روحانی نظام انبیا کی بعثت اور ان پر احکام کا نزول ہے وہی احکام انسان کی روحانی بلکہ مادی زندگی کے لیے مشعل راہ ہیں۔ ان پر چل کر ہی انسان منزل مقصود تک پہنچتا ہے۔ جس طرح کائنات میں پیدا کی ہوئی چیزوں کو اپنے فائدے کے لیے استعمال میں نہ لایا جائے تو انسان نقصان اٹھاتا ہے اسی طرح اللہ کے روحانی نظام سے فائدہ حاصل نہ کیا جائے تو انسان گھاٹے میں رہتا ہے اس لیے اللہ تعالیٰ کے دونوں نظاموں (جسمانی اور روحانی) سے فائدہ اٹھانا چاہیے۔ قارئین کے سامنے آیات کا ترجمہ اور تشریح پیش کر دی ہے کہ سوامی جی نے ان آیات پر جو اعتراض کیا ہے کہیں بھی اس کا ذکر ہے۔ اس آیت میں کس جگہ لکھا ہے کہ زمین گردش نہیں کرتی۔ معترض کی اپنی ذہنی اختراع ہے یا عربی زبان سے ناواقفیت ان آیات میں اللہ تعالیٰ کے جسمانی (مادی) اور روحانی نظاموں سے فائدہ حاصل کرنے کا ذکر ہے۔ اسی میں انسان کی کامیابی کا راز مضمر ہے۔ جو لوگ ان سے فائدہ نہیں

اٹھاتے بلکہ اللہ کی پیدا کی ہوئی چیزوں کو ہی اس کا شریک بنا لیتے ہیں وہی ظالم اور ناشکرے ہیں ویدوں میں جو شرک کی تعلیم دی گئی ہے اس کا رد ہے اور ہندو دھرم کو توحید کی طرف بلایا ہے۔

.......☆.......

آدم میں خدا نے روح پھونکی تو وہ خدا بن گیا

شیطان کو کس نے بہکایا

اعتراض :اگر خدا نے اپنی روح حضرت آدمؑ میں پھونکی تو وہ بھی خدا بن گیا اور خدا کا فرشتوں کو سجدہ کرنے کا حکم دینا ظاہر کرتا ہے کہ خدا حضرت آدمؑ کو اپنا ہمسر اور شریک سمجھتا ہے اگر شیطان کو گمراہ کرنے والا خدا ہی ہے تو وہ شیطان کا بھی بڑا بھائی ہوا کیونکہ تمہارے نزدیک بہکانے والے کا نام شیطان ہے اور تمہارے کلام ہی میں صاف لکھا ہے کہ خدا نے شیطان کو بہکایا اور شیطان نے صاف کہا کہ میں بھی لوگوں کو بہکاؤں گا اگر خدا شیطان کا معاون نہ ہوتا تو اس کو قید کر دیتا یا مار ڈالتا۔(ستیارتھ پرکاش اعتراض 98)

جواب:یہ اعتراض سورۃ الحجر کی آیات 28,29,30,39 پر کیا گیا ہے ارشاد الٰہی ہے وَاِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّىْ خَالِقٌ بَشَرًا مِّنْ صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ فَاِذَا سَوَّيْتُهٗ وَنَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِىْ فَقَعُوْا لَهٗ سَاجِدِيْنَ (الحجر 15:28,29)اور جب تیرے رب نے فرشتوں سے کہا کہ میں انسان کو سوکھی ہوئی مٹی سیاہ کیچڑ سے جو متغیر ہو چکا ہو پیدا کرنے والا ہوں۔سو جب میں اسے تکمیل کو پہنچاؤں اور اپنی روح اس میں پھونکوں تو تم اس کے لیے فرمانبرداری کرتے ہوئے گر پڑنا۔

فَسَجَدَ الْمَلٰٓئِكَةُ كُلُّهُمْ اَجْمَعُوْنَ اِلَّآ اِبْلِيْسَ (30)

پس کل فرشتوں سب کے سب نے فرمان برداری کی مگر ابلیس نے نہ کی اس نے انکار کیا۔

2- قَالَ رَبِّ بِمَآ اَغْوَيْتَنِىْ لَاُزَيِّنَنَّ لَهُمْ فِى الْاَرْضِ وَلَاُغْوِيَنَّهُمْ اَجْمَعِيْنَ (الحجر 15:39) کہا مرے رب جیسا تو نے مجھے گمراہ ٹھہرایا میں انہیں زمین میں (نافرمانی کو) خوبصورت بنا کر دکھاؤں گا اور ان سب کو (حصول مقصود میں) ناکام رکھوں گا۔

جواب:معترض کے اعتراض کے کئی اجزا ہیں۔

پہلا جز:

"اگر خدا نے اپنی روح حضرت آدم میں پھونکی تو وہ بھی خدا بن گیا" جس طرح اللہ تعالیٰ نے آدم کی زندگی کو قائم رکھنے کے لیے بے شمار چیزیں پیدا کی ہیں۔انہی میں سے روح بھی انسانی زندگی کے لیے ضروری تھی گویا روح بھی اللہ کی تخلیق ہے جس طرح دیگر اشیاء (سورج، چاند، ستارے، ہوا، زمین، پانی وغیرہ) آدم کو عطا کرنے سے وہ خدا نہیں بن جاتا تو روح دینے سے وہ کیوں کر خدا بن گیا دیگر

اشیاء بھی اللہ تعالیٰ نے اپنی صفت رحمانیت کے تحت پیدا کی ہیں اسی طرح روح بھی اسی صفت کے تحت عطا کی ہے یہ اللہ کی عطا کردہ اشیاء ہیں۔ اللہ کی عطاء سے کوئی انسان خدا نہیں بن جاتا۔

دوم:۔ روح صرف آدم کے لیے ہی مخصوص نہیں جو عطا کرنے سے اس کو خدا قرار دے دیا گیا ہے۔ تمام انسانوں میں نفخ کی گئی ہے ارشاد الٰہی ہے۔ ثُمَّ جَعَلَ نَسْلَهٗ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ مَّآءٍ مَّهِيْنٍ ثُمَّ سَوّٰهُ وَنَفَخَ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِهٖ (السجدہ 9,8,32) پھر اس کی نسل ایک نچوڑ سے ٹھہرائی (جو) کمزور پانی میں (آ جاتا ہے) پھر اسے ٹھیک بنایا اور اپنی روح اس میں پھونکی۔

یہاں یہ بتایا گیا ہے کہ روح ہر انسان میں نفخ ہوتی ہے گویا روح صرف آدم سے مختص نہیں بلکہ تمام انسانوں کو عطا کی گئی ہے۔ قرآن مجید میں روح مختلف معنوں میں استعمال ہوا ہے روح کے معنی جان بھی آتے ہیں اور نفس بھی (یعنی نفس ناطقہ) اور وحی اور قرآن کے لیے بھی لفظ استعمال ہوا ہے یہاں روح سے مراد وہ چیز ہے جو انسان کو دیگر حیوانات سے ممتاز کرتی ہے یعنی نفس ناطقہ یا تمیز یا شکر کی صفت اللہ تعالیٰ نے ان آیات میں اس نعمت (صفت) کا ذکر کیا ہے۔ اس صفت متمیزہ (روح) کو اللہ تعالیٰ نے علم بھی کہا ہے ارشاد الٰہی ہے عَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا کہ ہم نے آدم کو کل اشیاء کا علم دیا یہ وہ صفت ہے جو صرف انسان کو عطا ہے جو اسے کل کائنات سے متمیز کرتی ہے اس کے ذریعے ہی اس نے تمام مخلوقات کو اپنے تابع بنایا ہے۔ یہی صفت انسان کے لیے روشنی کا ذریعہ ہے اور اچھائی اور برائی میں تمیز کرتا ہے اللہ تعالیٰ نے قصہ آدم میں وہ معرفت کی باتیں بیان کی ہیں جو انسانی زندگی کے لیے شمع ہدایت ہیں۔ سب سے اہم بات جو قصہ آدم میں مذکور ہے وہ ہے اس کا اشرف المخلوقات ہونا اس کا اشرف المخلوقات ہونا صرف علم کی وجہ سے ہے۔ جس کی وجہ سے انسان نے تمام کائنات کو اپنا تابع بنالیا ہے اسی کا دوسرا نام روح ہے۔ اس صفت سے انسان خدا کا ہمسر نہیں بن جاتا بلکہ یہ صفت انسان کو عبودیت کا سبق دیتی ہے۔

جزو ثانی: شیطان کو خدا نے بہکایا گمراہ کیا معترض نے لفظ "اَغْوَيْتَنِي" کے معنی غلط سمجھے ہیں اس لفظ کے معنی یہ نہیں کہ تو نے مجھے بہکایا۔ بلکہ یہ معنی ہیں تو نے مجھے گمراہ ٹھہرایا۔ جب شیطان نے اللہ کی نافرمانی کی تو اس کی نافرمانی کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے اسے گمراہ ٹھہرایا اور اس کی گمراہی پر مہر ثبت کی گویا اللہ گمراہ کنندہ نہیں بلکہ جو شخص گمراہی کی اس حد تک پہنچ جاتا ہے جہاں سے اس کی واپسی کا کوئی امکان نہیں رہتا اس پر گمراہی کی مہر ثبت کرتا ہے اور اس کو گمراہ ٹھہراتا ہے یہ خدا کا فعل نہیں بلکہ انسان کے اپنے فعل کا نتیجہ ہے۔

زیر اعتراض آیت کا مفہوم:

جب اللہ تعالیٰ شیطان کی نافرمانی کی وجہ سے گمراہ ٹھہرا دیا گیا تو شیطان نے کہا کہ میں لوگوں کو دنیاوی امور اس خوبصورتی سے دکھاؤں گا وہ ان میں اس قدر منہمک ہو جائیں گے وہ تجھے بھول جائیں گے۔ تیرے بتائے ہوئے رستہ سے ہٹ جائیں گے۔

یہ مکالمہ زبان حال سے ہے نہ کہ زبان قال سے

شیطان کیوں پیدا کیا:

اللہ تعالیٰ کا ازل سے ضدین کا قانون چلا آ رہا ہے دن کے مقابلہ پر رات نور کے مقابل پر تاریکی اسی طرح انسان کے لیے نورانی مخلوق کے مقابلہ میں ظلماتی مخلوق بنائی ہے ضدین سے انسان کو ایک کی خوبی اور دوسرے کی برائی دکھادی ہے نورانی مخلوق داعی الی الخیر ہے اور ظلماتی مخلوق داعی الی الشر ہے داعی الی الخیر کا نام روح القدس ہے اور داعی الی البشر کا نام ابلیس اور شیطان ہے دونوں انسان کے قرین اور مصاحب ہیں روح القدس انسان کو نیکی کے راستہ کی ہدایت کرتی ہے جب کہ شیطان برائی کے رستہ کی طرف رہنمائی کرتا ہے مگر کسی بات پر جبر اور اکراہ نہیں جیسا کہ قرآن مجید میں آتا ہے فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰىهَا یعنی خدا بدی کا بھی الہام کرتا ہے اور نیکی کا بھی بدی کا الہام ذریعہ شیطان ہے جو بد خیالات دلوں میں ڈالتا ہے نیکی کا الہام کا ذریعہ روح القدس ہے جو نیک اور پاک خیالات دل میں ڈالتا ہے چونکہ

اللہ تعالیٰ علت العلل ہے اس لیے یہ دونوں الہام اللہ تعالیٰ نے اپنی طرف منسوب کر لیے ہیں اگر اللہ تعالیٰ صرف داعی الی الشر (شیطان) پیدا کرتا اور داعی الی الخیر (فرشتہ) نہ ہوتا تو انسان کو سزا کیسی کیونکہ اس کو نیکی کے راستہ کی ہدایت کی ہی نہیں کی گئی۔ اسی طرح اگر صرف داعی الی الخیر پیدا کیا جاتا تو جزا اور انعام کیسا کیونکہ اس کے سامنے بدی کا راستہ ہے ہی نہیں جس کی وجہ سے وہ راہ ہدایت سے بھٹک سکے۔ انسان کو دونوں راستوں کی راہنمائی کر کے اس کو آزادی دے رکھی ہے جونسا چاہے راستہ اختیار کرے اس کے ساتھ انبیاء علیہم السلام کے ذریعے یہ بھی بتا دیا کہ اگر وہ نیکی کا راستہ اختیار کرے گا تو وہ اس قسم کے انعامات حاصل کرے گا اگر بدی کا راستہ اختیار کرے گا تو وہ سزا پائے گا۔ گویا انسان کے امتحان کے لیے نوری اور ناری ہستیاں پیدا کی ہیں۔ اسی میں انسان کی روحانی اور مادی ترقی کا راز مضمر ہے۔ مسلم کی روایت ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں مَامِنْكُمْ اَحَدٌ اِلَّا وَقَد وُكِّلَ بِهٖ قَرِيْنُهٗ مِنَ الْجِنِّ وَ قَرِيْنُهٗ مِنَ الْمَلَائِكَةِ قَالُوا وَ اِيَّاكَ يَارَسُوْلَ اللّٰهِ قَالَ اِيَّايَ وَلٰكِن اللّٰهَ اَعَانَنِيْ عَلَيْهِ فَلَا يَاْمُرُنِيْ اِلَّا بِخَيْرٍ کوئی تم میں ایسا نہیں کہ جس کے ساتھ ایک ساتھی جن (شیطان) کی نوع میں سے اور ایک مصاحب فرشتوں میں سے موکل نہ ہو۔ صحابہ نے عرض کیا یا رسول اللہ! آپؐ بھی فرمایا ہاں میں بھی پر خدا نے میرے جن (شیطان) کو میرے تابع بنا دیا ہے وہ مجھے بجز نیکی کے کچھ نہیں کہتا۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بتایا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے انصاف کے ترازو میں برابر رکھنے کے لیے داعی الی الشر (شیطان) اور داعی الی الخیر (ملائکہ) پیدا کر دیئے ہیں اب انسان کا یہ کمال ہے کہ وہ داعی الی الشر (شیطان) کے رستے پر گامزن نہ ہو۔ بلکہ داعی الی الخیر (ملائکہ) کا رستہ اختیار کرے۔ شیطان کی پیدائش کی عرض انسان کو گمراہ کرنا نہیں بلکہ امتحان ہے۔ اسی امتحان میں انسان کی ترقی کا راز مضمر ہے اگر اللہ تعالیٰ انسان کو انعام دینے کے لیے امتحان مقرر کیا ہے تو ساتھ انبیاء علیہم السلام کو بھی اپنے احکام دے کر بھیجا ہے تا کہ اس کو بتائیں کہ وہ کون سا راستہ اختیار کرے۔ نیک و بد راستہ اختیار کرنے میں کوئی جبر و اکراہ نہیں۔ راہ راست پر چلانے کے لیے نبی بھی بھیجے ہیں ساتھ عقل کی نعمت سے بھی نوازا ہے۔ عقل بھی نیکی اور بدی میں تمیز کرتی ہے اب انسان کے سامنے نیکی اور بدی کا رستہ کھلا ہوا ہے جو چاہے اختیار کرے۔ بدی اور نیکی میں واضح تمیز کے لیے اللہ تعالیٰ نے نبی بھی بھیجے ہیں وہ بتاتے ہیں کہ کون سا راستہ بدی کا ہے اور کون سا رستہ نیکی کا۔ اس کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے انسان کو عقل سے بھی نوازا ہے عقل بھی راہنمائی کرتی ہے۔ یہ سب نظام انسان کی جزا و سزا کے لیے ہے۔ یہ ہے شیطان کی تخلیق کا فلسفہ اور حکمت۔ اگر شیطان نہ ہوتو انسان کی پیدائش ہی عبث ہو جائے۔ اگر اللہ تعالیٰ نے شیطان کی تخلیق کی ہے تو اس کے ساتھ ملائکہ بھی ہیں۔

پس بشر (انسان) کی پیدائش کی حکمت میں ہی ملائکہ اور شیطان کی تخلیق شامل ہے اگر یہ دو غیر مرئی ہستیاں پیدا نہ کی جاتیں تو بشر کی پیدائش کی حکمت باطل ہو جاتی۔ بشر کی پیدائش کا یہ جز و لازمہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر مذہب میں شیطان اور ملائکہ کا تصور کسی نہ کسی شکل میں پایا جاتا ہے۔

......☆......

کیا آریہ ورت میں بھی نبی بھیجے گئے۔ کیا بے جان زمین سنتی سمجھتی ہے

اعتراض:۔ اگر سب کے لیے اپنے اپنے پیغمبر بھیجے ہیں تو وہ سب لوگ جو پیغمبر کی راہ پر چلتے ہیں کافر کیوں ہیں کیا سوائے تمہارے پیغمبر کے اور کسی پیغمبر کی قدر و منزلت نہیں؟ اگر سارے ملکوں میں پیغمبر بھیجے تھے تو آریہ ورت میں کون سا پیغمبر آیا ہے؟ یہ بات ماننے کے قابل نہیں ہے ابتدا میں جب تمہارے اعتقاد کے مطابق سوائے خدا کے اور کوئی چیز نہ تھی تو اس وقت خدا نے کس کو کن کہا اور کون ہو گیا اور آج کل کیا بے جان زمین خدا کی باتیں سن اور سمجھ سکتی ہے؟ یہ ساری جاہلانہ باتیں جہلا ہی مان سکتے ہیں۔ (ستیارتھ پرکاش اعتراض 99)

جواب: مذکورہ بالا اعتراض حسب ذیل آیات پر کیا گیا ہے۔ وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِي كُلِّ أُمَّةٍ رَّسُولًا أَنِ اعْبُدُوا اللَّهَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوتَ فَمِنْهُم مَّنْ هَدَى اللَّهُ وَمِنْهُم مَّنْ حَقَّتْ عَلَيْهِ الضَّلَالَةُ (النحل 36:16) اور یقیناً ہم نے ہر ایک قوم میں ایک رسول بھیجا کہ اللہ کی عبادت کرو اور شیطان سے بچو۔ سو ان میں سے کوئی ایسا تھا۔ جسے اللہ نے ہدایت دی اور کوئی ان میں سے ایسا تھا جس پر گمراہی ثابت ہوئی۔

2- إِنَّمَا قَوْلُنَا لِشَيْءٍ إِذَا أَرَدْنَاهُ أَن نَّقُولَ لَهُ كُن فَيَكُونُ (النحل 40:16) ہمارا فرمان کسی چیز کے لیے جب ہم اس کا ارادہ کریں صرف یہی ہوتا ہے کہ ہم اسے کہہ دیں ہو جا تو وہ ہو جاتا ہے۔

اسلام پہلا وہ دین ہے جس نے یہ تعلیم دی ہے کہ ہر قوم کی طرف رسول آئے ہیں جیسا کہ زیر اعتراض آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ ہم نے ہر ایک قوم کی طرف رسول بھیجے ہیں یہی مضمون کئی دوسرے مقامات پر دہرایا گیا ہے ارشاد الٰہی ہے إِن مِّنْ أُمَّةٍ إِلَّا خَلَا فِيهَا نَذِيرٌ (فاطر 24:35) ہر امت میں ڈرانے والا گزر چکا ہے۔ ایک اور مقام پر آتا ہے وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا رُسُلًا مِّن قَبْلِكَ مِنْهُم مَّن قَصَصْنَا عَلَيْكَ وَمِنْهُم مَّن لَّمْ نَقْصُصْ عَلَيْكَ (المومن 78:40) اور ہم نے یقیناً تم سے پہلے بہت سے رسول بھیجے ان میں کچھ وہ ہیں جن کا ذکر ہم نے تجھ سے کر دیا ہے اور ان سب سے کچھ وہ بھی ہیں جن کا تجھ سے ذکر نہیں کیا۔

قرآن اس بات کی بھی شہادت دیتا ہے کہ سب انبیاء علیہم السلام کی مشترکہ تعلیم ہے۔

اسلام نے صرف اتنا ہی بیان نہیں کیا کہ پہلی امتوں میں رسول آتے رہے ہیں بلکہ دائرہ اسلام میں داخل ہونے کے لیے ضروری قرار دیا کہ سب انبیاء علیہم السلام اور ان کے الٰہی احکام (کتب) پر بھی ایمان لایا جائے۔ تاکہ لوگوں میں اخوت کا جذبہ پیدا ہو اور معاشرہ میں امن قائم ہو۔

اسلام اس وجہ سے انکار کرنے والوں کو کافر قرار دیتا ہے کہ اسلام رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا لایا ہوا دین نہیں بلکہ یہ تمام انبیاء علیہم السلام کا مشترکہ دین ہے پہلے انبیاء علیہم السلام جو تعلیم لائے تھے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر اللہ تعالیٰ نے پہلے گزرے ہوئے تمام انبیاء علیہم السلام کی تعلیمات کو قرآن مجید میں سمو دیا ہے قرآن مجید میں آتا ہے فِيهَا كُتُبٌ قَيِّمَةٌ (البینۃ 3:98) اس (قرآن) میں قائم رہنے والی کتابیں ہیں یعنی پہلی تمام کتب سماوی کا عطر ہے جو شخص اسلام کا منکر ہے وہ اسلام کا منکر نہیں ہے بلکہ تمام انبیاء علیہم السلام کا منکر

ہے انہی میں سے منکر کا اپنا نبی بھی ہے جس کا وہ پیروکار کہلاتا ہے۔ اسلام نے پہلے بگڑے ہوئے مذاہب کی اصلاح کی۔ توحید کے پیغام کو اجاگر کیا۔ صرف اللہ کی پرستش کی دعوت دی۔ اب معترض خود جائزہ لے کہ توحید کے منکر کو کیا کہا جائے کیا ہندو دھرم میں بت پرستی نہیں عیسائیت میں شخصیت پرستی نہیں؟ کیا دیگر تمام مذاہب توحید سے الگ نہیں ہو گئے؟ اسلام نے ان لوگوں کو کافر قرار دیا ہے جو انبیاء علیہم السلام کے مشترکہ پیغام کی نفی کر رہے ہیں وہ گویا رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہی منکر نہیں بلکہ حقیقت میں سب نبیوں کے منکر ہیں اسلام نے سب انبیاء علیہم السلام کی توقیر کی ہے اور ان کا ماننا جزو ایمان قرار دیا ہے اس سے بڑھ کر اور کیا توقیر اور عزت ہو سکتی ہے دنیا کا کوئی مذہب تمام انبیاء علیہم السلام کے ماننے کی تعلیم نہیں دیتا آریہ ورت میں کون سا پیغمبر ہے جب اصولی طور پر یہ بیان کر دیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر امت میں رسول بھیجے ہیں بعض کا قرآن میں ذکر کر دیا گیا ہے اور کچھ کا ذکر نہیں۔ قرآن مجید کے اس اصول کے مطابق آریہ ورت میں رسول آئے ہیں۔ لیکن مسلمان ان انبیاء علیہم السلام کو ان میں شمار کرتے ہیں جن کا ذکر قرآن مجید میں نہیں لیکن قرآنی اصول کے مطابق وہ نبی ہی ہیں۔

جزو ثانی کا جواب:۔ کن فیکون پر بحث سیرت سید البشر حصہ سوم میں کی جا چکی ہے۔

کیا بے زبان زمین خدا کی باتیں سن اور سمجھ سکتی ہے۔ قرآن مجید میں ان معنی کی کوئی آیت موجود نہیں۔ لیکن معترض کو یہ بات ذہن نشین ہونی چاہیے کہ اللہ تعالیٰ جس زبان میں زمین سے (یا دیگر بے جان اشیاء سے) باتیں کرتا ہے زمین اس کو سنتی ہے اور سمجھتی ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ ایک کسان بے جان زمین میں بیج بوتا ہے خدا حکم دیتا ہے کہ ان بیجوں کو پودے کی شکل میں ظاہر کر دو بے جان زمین اس حکم کے مطابق بیج سے ایک ننھا سا پودا اُگا دیتی ہے پھر اللہ کے حکم سے ہی اس ننھے پودے کو خوراک دیتی ہے اور پودا بڑا ہو جاتا ہے پودا اگانے کی آواز بے جان زمین نے سنی اور حکم بجا آوری کی زمین سے پودا اُگ آیا یہ ہے اللہ تعالیٰ کا حکم زمین کے ساتھ، کسی نے یہ کلام نہیں سنی لیکن زمین نے سن لی اور حکم پر عمل کیا۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ ہر جان دار اور بے جان کے ساتھ کلام کرتا ہے ہر چیز سے اس کے کلام کرنے کا انداز الگ ہے۔ اللہ کی صفت کلیم ہے اس صفت کے تحت ہر چیز سے کلام کرتا ہے انداز الگ الگ ہے اگر معترض اللہ کے کلام کے انداز اور طریقے نہ جانتا ہو تو یہ اس کی اپنی لاعلمی ہے۔ آیئے ذرا زمین سے اللہ کے کلام کا انداز اور طریق کی وضاحت کریں وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے زمین میں ایسی استعدادیں رکھ دی ہیں جب ان کے اظہار کا وقت آتا ہے زمین اس کا اظہار کر دیتی ہے یہ ہے اللہ کا زمین سے انداز تکلم۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے ہر جان دار اور بے جان مخلوق میں مخفی استعدادیں رکھ دی ہوئی ہیں ان کا اللہ کے حکم سے اپنے اپنے وقت پر اظہار ہوتا رہتا ہے یہ ہے اللہ تعالیٰ کا ہر مخلوق سے کلام کرنے کا طریقہ اور انداز۔ مخفی استعدادوں کا اظہار اللہ تعالیٰ کی صفت ربوبیت کے تحت ہوتا ہے۔ رب کا معنی ہے مخفی استعدادوں کو اجاگر کرنے والا اور منزل مقصود تک پہنچانے والا چونکہ معترض کو اللہ تعالیٰ کی صفات حسنہ کا قطعاً علم نہیں اس وجہ سے اس نے لاعلمی کی وجہ سے اعتراض کر دیا ہے عام کتب میں بھی بے جان اشیاء سے انسان کی ہم کلامی کا ذکر ملتا ہے۔ شعراء، ناول نگاروں کی کتب کا مطالعہ کیجیے کہ سمندروں، پہاڑوں، چٹانوں، ہواؤں، پھولوں، درختوں سے باتیں کرتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں اتھروید سے ایک حوالہ پیش کیا جاتا ہے جس سے معترض کا اعتراض خود بخود دور ہو جائے گا "جس میں چٹان، پہاڑ، پتھر اور خاک دھول رہتی ہے اس سونے کے دل والی زمین کو میں سجدہ کرتا ہوں اے زمین جو خوشبو تجھ میں ظاہر ہوتی ہے جس کو بوٹیاں حاصل کرتی ہیں جو خوشبو پانی میں جو خوشبو گندھروں (گانے بجانے والے لونڈوں) میں اور حوروں نے اپنے اندر بسائی ہے اس سے مجھ کو بھی خوشبو والا کر کہ مجھ سے کوئی دشمنی نہ کرے۔ (اتھروید 23:1:12)

اس منتر میں زمین سے التجا کی جا رہی ہے کیا زمین یہ التجا سن رہی ہے مختلف انداز بیان ہیں جواب کی اصطلاح میں مجاز کہلاتے ہیں۔ یہ مجازی رنگ ادب کا حسن ہے۔

خدا کا قسم کھانا

(جھوٹوں کا کام ہے)

اعتراض :اللہ بیٹیوں سے کیا کرے گا؟ یہ تو انسان کو چاہئیں اللہ کے لیے بیٹے کیوں نہیں کیے گئے قسم کھانا جھوٹوں کا کام ہے خدا کا نہیں عموماً دیکھا جاتا ہے کہ جھوٹا ہی قسم کھایا کرتا ہے نہ کہ سچا۔ (ستیارتھ پرکاش اعتراض نمبر 100)

جواب: یہ اعتراض ان آیات پر کیا گیا ہے وَيَجْعَلُوْنَ لِلّٰهِ الْبَنٰتِ سُبْحٰنَهٗ وَلَهُمْ مَّا يَشْتَهُوْنَ (النحل 57:16) اور اللہ کے لیے بیٹیاں ٹھہراتے ہیں وہ پاک ہیں اوران کے لیے ہے جو وہ چاہتے ہیں۔

تَاللّٰهِ لَقَدْ اَرْسَلْنَا اِلٰى اُمَمٍ مِّنْ قَبْلِكَ فَزَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ اَعْمَالَهُمْ فَهُوَ وَلِيُّهُمُ الْيَوْمَ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ (النحل 63:16) اللہ کی قسم ہم نے تجھ سے پہلے قوموں کی طرف رسول بھیجے پھر شیطان نے انہیں ان کے برے عمل اچھے کر کے دکھائے سو وہ آج ان کا دوست ہے اوران کے لیے دردناک دکھ ہے۔

جواب :جز و اول :اللہ بیٹیوں سے کیا کرے گا۔ معلوم ہوتا ہے کہ معترض نے قرآن مجید کے سیاق وسباق کو دیکھا ہی نہیں اس آیت میں عربوں کی ایک غیر مہذب رسم کا ذکر کیا گیا ہے کہ عربوں میں بعض ایسے قبائل بھی تھے جو لڑکیوں کی پیدائش کو ناپسند کرتے تھے وَاِذَا بُشِّرَ اَحَدُهُمْ بِالْاُنْثٰى ظَلَّ وَجْهُهٗ مُسْوَدًّا وَّهُوَ كَظِيْمٌ (النحل 58:16) اور جب ان میں سے ایک کو لڑکی کی خبر دی جاتی ہے اس کا منہ سیاہ ہو جاتا ہے وہ غصہ سے بھرا ہوا ہوتا ہے آیت نمبر 57 میں یہ توجہ دلائی گئی ہے خدا کی طرف بیٹیاں منسوب کرنے والے لوگ خود اپنے لیے بیٹی کی خبر کو کس قدر بُرا مناتے ہیں۔ جب بیٹی کی خبر سنتے ہیں تو ان کا چہرہ سیاہ ہو جاتا ہے قوم سے چھپتا پھرتا ہے اور چاہتا ہے کہ وہ لڑکی کو زندہ دفن کر دے تاریخ بتاتی ہے کہ نومولود بچیوں کو زندہ درگور کر دیتے تھے۔ قرآن مجید نے ان کی فطرت کی طرف توجہ دلائی ہے کہ وہ اپنے لیے بچیوں کو باعث عار سمجھتے ہیں جب کہ خدا کی طرف بیٹیوں کو منسوب کرتے ہیں اس آیت میں اس مشرکانہ رسم کو دور کرنے کی طرف توجہ دلائی ہے کہ اللہ تعالیٰ لم یلد اور لم یولد ہے (نہ اس کا باپ ہے اور نہ بیٹا) اس کی طرف بیٹیاں منسوب کرنا ظلم عظیم ہے لَهُمْ کی ضمیر جمع کی ہے جو مشرکوں کی طرف جاتی ہے معترض کے ترجمہ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ضمیر جمع کی اللہ کی طرف پھیری گئی ہے جس سے معترض کی عربی سے لاعلمی ظاہر ہوتی ہے لہٰذا آیت کا یہ مطلب ہے کہ مشرک خدا کے لیے بیٹیاں تجویز کرتے ہیں اور اپنے لیے وہ چاہتے ہیں جو انہیں پسند ہے یعنی بیٹے اللہ پاک ہے بیٹے اور بیٹیوں سے اس کے بعد فرمایا يَجْعَلُوْنَ لِلّٰهِ مَا يَكْرَهُوْنَ یعنی اللہ کے لیے وہ تجویز کرتے ہیں جسے خود ناپسند کرتے ہیں۔

جواب :جزو ثانی (اللہ کا قسم کھانا) سیرت سید البشر حصہ سوم میں قسموں کی فلاسفی پر مفصل بحث ہو چکی ہے صرف سلسلہ کلام جاری رکھنے کے لیے یہ عرض کیا جاتا ہے۔ قسم درحقیقت گواہ کی قائم مقام ہوتی ہے اس آیت کا مفہوم یہ ہے کہ خدا گواہ ہے اور یہ امر یقینی ہے کہ اس نے تمام اقوام عالم میں انبیاء علیہم السلام بھیجے ہیں اور یہ شہادت صرف اللہ ہی کی قابل قبول ہو سکتی ہے کسی دوسرے کی نہیں یہ بھی مسلمہ تاریخی امر ہے کہ کل اقوام کسی نہ کسی شخص کو اپنے لیے ہادی تسلیم کرتی ہیں۔ یہ سب قوموں کی شہادت ہے اسی شہادت کو اسلام نے پیش کیا ہے۔

معترض کا اعتراض تو اس وقت بنتا تھا اگر تاریخ عالم گواہی نہ دے جب اقوام عالم کی تاریخ اس بات پر شاہد ہے کہ ہر قوم اپنے لیے کسی نہ کسی کو ہادی تسلیم کرتی ہے تو پھر اعتراض کیسا۔ یہ کہنا کہ ہمیشہ جھوٹا ہی قسم کھاتا ہے یہ معترض کی خود ساختہ دلیل ہے۔ اس میں کوئی وزن نہیں۔ دنیا کی ہر عدالت میں قسم کو گواہ کا قائم مقام مانا جاتا ہے کیا عدالتیں جھوٹوں سے قسمیں لے رہی ہیں یہ دلیل ہی بودا ہے کہ جھوٹا ہی قسم کھاتا ہے۔

......☆......

گناہ گاروں کا گناہ دیکھنے کے بعد ان کو ہلاک کرنے کا قصد کرنا یہ ظاہر کرتا ہے وہ ہمہ دان نہیں

اعتراض: کیا یہ سب کی سب بستیاں گنا گار ہو گئیں؟ اور خدا کا گناہ گاروں کا گناہ دیکھنے کے بعد ان کو ہلاک کرنے کا قصد کرنا یہ ظاہر کرتا ہے کہ وہ ہمہ دان نہیں ورنہ وہ پہلے سے ہی اس امر سے واقف ہوتا کہ یہ بستیاں ظالم ہو جائیں گی اور ہلاک کرنے کی وجہ سے خدا بے رحم بھی ثابت ہو گیا (سیتارتھ پرکاش اعتراض 105)

جواب: اس آیت پر مذکورہ اعتراض ہے وَتِلْكَ الْقُرٰىٓ اَهْلَكْنٰهُمْ لَمَّا ظَلَمُوْا وَجَعَلْنَا لِمَهْلِكِهِمْ مَّوْعِدًا (الکہف 18:59) اور ان بستیوں نے جب ظلم کیا ہم نے انہیں ہلاک کر دیا اور ان کی ہلاکت کے لیے ہم نے ایک وعدے کا وقت مقرر کیا ہے۔

خدا کا قوموں کو تباہ کرنے کا اصول یا قانون اس کتاب میں ایک جگہ نہیں کئی جگہ ذکر کیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی کو نہ عذاب دیتا ہے اور نہ کسی کو تباہ و برباد کرتا ہے جو کسی قوم پر عذاب آتا ہے یا کوئی قوم تباہ ہوتی ہے وہ اپنے کردہ گناہوں اور بداعمالیوں کی وجہ سے تباہ و برباد ہوتی ہیں اور قوموں کے عذاب اور تباہی کے ساتھ بِمَا كَسَبُوْا (جو انہوں نے کمایا) کے الفاظ آتے ہیں جس سے ظاہر ہوتا ہے جو کسی قوم پر عذاب آیا ہے وہ ان کے اپنے کردہ گناہوں کی وجہ سے آیا ہے قرآن مجید میں آتا ہے اِنَّ اللّٰهَ لَا يَظْلِمُ النَّاسَ شَيْئًا وَّلٰكِنَّ النَّاسَ اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ (یونس 10:44) اللہ لوگوں پر کچھ بھی ظلم نہیں کرتا لیکن لوگ اپنی جانوں پر ظلم کرتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے انسانوں کی ہدایت کے لیے نبی بھیجے ان کو احکام دیئے کہ وہ لوگوں تک پہنچائیں اور ان کو بتائیں ان احکام پر عمل کرنے سے ہی کامیابی ہے یہی احکام انسان کو منزل مقصود تک پہنچاتے ہیں پھر انسان کو عقل کی نعمت سے نوازا ہے۔ احکام الٰہیہ، نبیوں کا نمونہ اور پھر عقل کی نعمت سے نوازا جانا ان امور کے ہوتے ہوئے انسان غلط روش پر چلے گا تو اس کا نتیجہ لازمی طور پر تباہی و بربادی ہے۔ بُرے عمل کا نتیجہ بُرا ہی ہوتا ہے۔ لہٰذا جو قومیں تباہ و برباد ہوئیں جو مختلف قسم کے عذابوں میں مبتلا ہوئیں یہ ان کے بداعمالیوں کا نتیجہ ہے۔ اللہ تعالیٰ چونکہ مسبب الاسباب اور علت العلل ہے اس وجہ سے اس عذاب یا بربادی کو خدا کی طرف منسوب کر دیا گیا ہے۔ کسی قوم کی بربادی اس کی اپنی اجتماعی بداعمالیوں کا نتیجہ ہے۔ علت اور معلول، سبب اور مسبب کا قانون دنیا کی ہر چیز میں پایا جاتا ہے اس پر دنیا کا نظام چل رہا ہے مثلاً جو شخص مقوی اور صحت یاب غذا کھائے گا تو وہ صحت سے فیض یاب ہوگا جو زہر کھائے گا تو وہ موت سے ہم آغوش ہوگا جو قوم بداعمالیوں کی مرتکب ہوگی وہ تباہ و برباد ہوگی علت اور معلول کے اصول کے تحت ہر عمل کا نتیجہ لازمی ہے۔ جو قومیں تباہ ہوتی ہیں وہاں اللہ کی بے رحمی نہیں بلکہ بدعملی کا نتیجہ ہے۔

اللہ ہمہ دان ہے علیم وخبیر ہستی ہے کوئی چیز اس سے مخفی نہیں کسی قوم کی تباہی کا اسے علم ہوتا ہے۔ کسی قوم کی تباہی اور خدا کی ہمہ دانی کا باہمی کوئی تعلق نہیں۔ اللہ ہمہ دان ہی ہے لیکن قوم اپنے کردہ اعمال کے نتیجہ میں تباہ ہو رہی ہے۔ اللہ تعالیٰ کو ان کی تباہی کا لازمی علم ہے۔ زیر اعتراض آیت کا مطلب واضح ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان بستیوں کو تباہ کیا جو ظلم کرنے والی تھیں ظلم کا لفظ ان تمام بداعمالیوں کا احاطہ کرتا ہے جن کی وجہ سے قومیں تباہ ہوتی ہیں یعنی وہ بستیاں اپنے ظلم کی وجہ سے تباہ ہوئیں۔ گناہ سے پہلے سزا دینا خلاف عقل اور انصاف ہے۔ تباہی گناہوں کے ارتکاب کے بعد ہی آتی ہے۔ یہی انصاف اور عقل کا تقاضا ہے یہی اصول اسلام نے بتایا ہے کہ سزا اس وقت دی جاتی ہے جب کوئی گناہ کرے کسی حکم کی پامالی کرے گناہ کرنے سے پہلے ہلاک کرنا بے انصافی ہے۔

......☆......

سورج کا جھیل میں ڈوبنا یاجوج ماجوج کا فساد

اعتراض: خدا کی بے سمجھی پر غور کیجیے اسے یہ شک ہوا کہ کہیں لڑکوں کے ماں باپ مجھ سے باغی نہ کر دیئے جائیں کیا یہی خدا کا اقبال ہے مصنف قرآن کی جہالت کی طرف نگاہ ڈالیے اس کے خیال میں شام کے وقت سورج ایک کیچڑ کے چشمہ میں جا ڈوبتا ہے اور پھر صبح کو نکل آتا ہے اس بیچارے کو کیا خبر تھی کہ سورج تو زمین کی نسبت بہت بڑا ہے وہ چشمہ، دریا، جھیل یا سمندر میں کیوں کر ڈوب سکتا ہے؟ اسے علم جغرافیہ وہیئت تھوڑے ہی آتے تھے ورنہ ایسی جاہلانہ باتیں کیوں کر مارتا۔ پیرو بھی بے علم ہیں ورنہ وہ ایسی لغو کتاب پر کیوں یقین کرتے اور دیکھیے خدا کا انصاف خود ہی وہ دنیا کا خالق حاکم اور انصاف کنندہ ہے اور خود ہی یاجوج ماجوج کو فساد کرنے پر آمادہ کرتا ہے کیا یہ اس کی خدائی کے شایان ہے ایسے خدا پر جنگلی لوگ ہی یقین کر سکتے ہیں۔ (ستیارتھ پرکاش اعتراض 106)

جواب: یہ قرآن مجید کی حسب ذیل آیات پر اعتراضات کیے گئے ہیں۔

وَاَمَّا الْغُلٰمُ فَكَانَ اَبَوٰهُ مُؤْمِنَیْنِ فَخَشِیْنَاۤ اَنْ یُّرْهِقَهُمَا طُغْیَانًا وَّ كُفْرًا (الکہف 80:18) اور جو جوان تھا تو اس کے ماں باپ مومن تھے۔ تو ہم ڈرے کہ وہ انہیں سرکشی اور کفر میں مبتلا کر دے گا۔

حَتّٰۤى اِذَا بَلَغَ مَغْرِبَ الشَّمْسِ وَجَدَهَا تَغْرُبُ فِیْ عَیْنٍ حَمِئَةٍ وَّ وَجَدَ عِنْدَهَا قَوْمًا (الکہف 86:18) یہاں تک کہ جب وہ (ادھر) پہنچا جدھر سورج ڈوبتا تھا اسے ایک سیاہ کیچڑ والے پانی میں غائب ہوتا ہوا پایا۔

قَالُوْا یٰذَا الْقَرْنَیْنِ اِنَّ یَاْجُوْجَ وَ مَاْجُوْجَ مُفْسِدُوْنَ فِی الْاَرْضِ (الکہف 94:18) انہوں نے کہا اے ذوالقرنین یاجوج اور ماجوج اس ملک میں فساد کرنے والے ہیں۔

جزو اول اعتراض کا جواب: معترض نے آیت 80 کے معنی ہی نہیں سمجھے۔ معترض نے فَخَشِیْنَا کے معنی کیے ہیں کہ خدا کو شک ہوا حالانکہ اس کے معنی ہیں ہم ڈرے سوامی جی نے یہ کلام خدا کا سمجھا ہے حالانکہ حضرت خضر کا منقول ہے جب یہ کلام حضرت خضر کا قرار دے دیا جائے تو معترض کا اعتراض خود بخود درفع ہو جاتا ہے۔ زیر اعتراض آیت میں لڑکوں کے ماں باپ کا اللہ سے باغی ہونے کا تصور ہی نہیں کیا جا سکتا۔

زیر اعتراض آیت کا مفہوم یہ ہے وہ غلام (جوان) مفسد تھا ایک روایت میں ہے کہ وہ ڈاکے مارتا تھا پھر اپنے ماں باپ کے سامنے قسم کھا دیا کرتا تھا کہ میں نے ایسا کوئی فعل نہیں کیا تو وہ اس سے قصاص نہ لینے دیتے تھے اور اس کی حمایت کرتے تھے۔ قرآن کے الفاظ بھی اس طرف اشارہ کرتے ہیں اول لفظ رھق ہے۔ اَرْهَقَ کے معنی ہیں غَشِیَهٗ قَهَرَ (امام راغب) یعنی زبردستی یا غلبہ سے ڈھانک لینا جس سے معلوم ہوتا ہے

کہ وہ اپنے والدین پر بھی جبر کرتا تھا۔ دوسرا لفظ طغیان ہے جس کے معنی حد سے گزر جانا ہے یہاں کفر میں حد سے گزر جانا مراد نہیں بلکہ قانون کی نافرمانی میں حد سے گزرنا مراد ہے۔ ان معنوں میں یہ لفظ بکثرت استعمال ہوا ہے۔ یعنی وہ غلام (جوان) قانون شکن بھی تھا۔

دنیا میں بعض ایسے واقعات رونما ہوتے ہیں جن کی لم معلوم کرنا بہت مشکل ہوتا ہے حضرت موسیٰ علیہ السلام اور خضر کے سفر میں جو واقعات (کشتی کو عیب دار کرنا غلام کو قتل کرنا دیوار کی مرمت کرنا) پیش آئے حضرت موسیٰ علیہ السلام ان واقعات کی لم (مخفی وجہ) معلوم کرنے سے قاصر تھے۔ جب کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت خضر کو آگاہ کر دیا تھا۔ اس الٰہی علم کی روشنی میں حضرت خضر نے ایسے کام سرانجام دے دیئے جو حضرت موسیٰ کے علم سے باہر تھے اس وجہ سے ہر واقعہ پر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اعتراض کیا اور آخر میں حضرت خضر نے ان واقعات کی لِمْ (وجوہ) بیان کر دیں۔

قرآن مجید میں پہلے انبیاء علیہم السلام کے جتنے قصص اور اساطیر بیان کی گئی ہیں ان میں یہ دقیق اشارے پائے جاتے ہیں کہ اس قسم کے واقعات رسول کریم کی زندگی میں بھی رونما ہوں گے۔ جیسے حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنے بھائیوں کے قصور کو معاف کر دیا۔ حضرت یوسف علیہ السلام کے اس واقعہ میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ اس قسم کا واقعہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں بھی پیش آئے گا۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فتح مکہ پر اپنے دشمن بھائیوں کو لاتثریب کہہ کر معاف کر دیا۔ حضرت خضر کے واقعہ قتل غلام میں یہ دقیق اشارہ ہے کہ جس طرح حضرت خضر پر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بے قصور غلام قتل کرنے کا الزام لگا دیا تھا جب کہ وہ غلام مفسد اور قانون شکن تھا۔ اسی طرح رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر بھی یہود کے قبیلہ کے آدمیوں کو قتل کرنے کا الزام لگایا گیا وہ الزام بے بنیاد اس وجہ سے ہے کہ وہ یہود قائدین مفسد اور قانون شکن تھے۔ ان کی سزا عدل پر موقوف تھی۔

جزو ثانی سورج کو سیاہ جھیل میں ڈوبتے ہوئے دیکھنا:

یہ اعتراض معترض کی جہالت پر مبنی ہے۔ اگر ایک شخص سمندر کے کنارے پر کھڑا ہو اور سورج کے غروب ہونے کا وقت ہو تو وہ شخص یہی سمجھے گا کہ سورج پانی میں غروب ہو رہا ہے۔ اسی طرح اگر کسی جنگل میں کھڑا ہو تو وہ دیکھے گا کہ سورج کسی درخت کی اوٹ میں غروب ہو رہا ہے حالانکہ ایسا نہیں اس قسم کا نظارہ صرف انسان کی آنکھ دیکھ رہی ہوتی ہے حالانکہ حقیقت میں ایسا نہیں ہوتا پانی کا پھیلاؤ ہے جب سورج غروب ہو رہا ہوتا ہے تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ وہ سمندر کے پانی میں غروب ہو گیا ہے۔ ذوالقرنین جب کسی جھیل کے پاس پہنچے تو اس وقت سورج غروب ہونے کا وقت تھا تو اس نے دیکھا کہ سورج جھیل میں غروب ہو رہا ہے یہ ایک علم مشاہدہ کی بات ہے اس مشاہدے کو بیان کیا گیا ہے یہ قطعاً غلط ہے کہ اس مشاہدے سے مراد یہ ہے کہ واقعہ سورج جھیل میں غروب ہو رہا تھا۔ وہ تو ذوالقرنین کا مشاہدہ تھا اس قسم کا مشاہدہ وہ شخص کر سکتا ہے جو سورج کے غروب ہونے کے وقت کسی سمندر کے کنارے چلا جائے تو وہ خود دیکھ لے گا کہ سورج سمندر میں غروب ہو رہا ہے۔

جزو ثالث اللہ تعالیٰ کا یاجوج ماجوج کو فساد پر آمادہ کرنا:

قرآن مجید کی کسی آیت میں یہ نہیں پایا جاتا کہ اللہ تعالیٰ نے یاجوج ماجوج کو فساد پر اکسایا بلکہ یہ ترجمہ ہے انہوں نے کہا اے ذوالقرنین یاجوج ماجوج اس ملک میں فساد کرنے والے ہیں قرآن مجید کے الفاظ دیکھئے تو صاف معلوم ہو جائے گا کہ سوامی جی نے ترجمہ ہی غلط کیا ہے یا تو جان بوجھ کر ایسا کیا ہے یا عربی زبان کی عدم واقفیت کی وجہ سے کیا ہے بہرحال جو سوامی جی نے اعتراض کیا ہے وہ زیر اعتراض آیت پر وارد ہوتا ہی نہیں اس وجہ سے مزید بحث کی ضرورت ہی نہیں صرف اتنا لکھ دینا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو بعض افعال میں یہ اختیار دیا ہے اللہ اس میں جبر نہیں کرتا۔ ان افعال اختیاریہ پر ہی جزا و سزا کا قانون مبنی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے یاجوج

ماجوج کوفساد پر آمادہ نہیں کیا بلکہ اس کو یہ اختیار ہے کہ وہ امن کا راستہ اختیار کرے یا فساد اور بگاڑ کا راستہ اس پر اللہ تعالیٰ کا کوئی جبر نہیں۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ کسی کو فساد اور بگاڑ پر آمادہ نہیں کرتا بلکہ انسان خود ہی فساد کا راستہ اختیار کر لیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فساد برپا کرنے کے نتائج بھی بیان کر دیئے ہیں۔ جو شخص یا قوم عمل خیر یا عمل بد انجام دیتی ہے اسی کے مطابق نتیجہ نکل آتا ہے۔ انسان کے سامنے دونوں راستوں (نیک و بد) کی وضاحت کر دی اب انسان کی اپنی مرضی۔ ہے جو چاہے راستہ اختیار کرے اس پر کوئی جبر نہیں۔

......☆......

حضرت مریم کو خدا کے حکم سے فرشتہ نے حاملہ کیا

اعتراض: **اگر فرشتے خدا کی روح ہیں تو وہ خدا سے الگ وجود کبھی نہیں ہو سکتے اور یہ کیسا ظلم ہے کہ کنواری مریم کو جو کسی سے ہم بستر ہونا نہیں چاہتی تھی خدا کے حکم سے فرشتہ نے حاملہ کیا اور اس سے لڑکا پیدا ہوا یہاں اور بھی بہت سی باتیں تہذیب کے خلاف درج ہیں جن کا ذکر کرنا مناسب نہیں (سیتارتھ پرکاش اعتراض 107)**

جواب: یہ اعتراض آیت فَحَمَلَتْهُ فَانتَبَذَتْ بِهِ مَكَانًا قَصِيًّا (مریم 22,19) پھر (مریم نے) اسے حمل میں لیا اور اس کے ساتھ الگ ہو کر دور چلی گئی۔

اس اعتراض کے بھی دو جزو ہیں پہلا جزو ''اگر فرشتے خدا کی روح ہیں تو وہ خدا سے الگ وجود کبھی نہیں ہو سکتے۔ روح اللہ تعالیٰ کی پیدا کردہ ہے لہٰذا وہ مخلوق ہے اور اللہ تعالیٰ خالق روح مخلوق اور خالق ایک نہیں ہو سکتے۔ اللہ کی روح صرف فرشتوں میں ہی نہیں بلکہ دنیا کی تمام اشیا میں اللہ کی روح ہے۔ قرآن مجید روح کو مخلوق قرار دیتا ہے۔ اگر ایک شخص مکان تعمیر کرتا ہے تعمیر کرنے والا اور مکان ایک نہیں ہو سکتے۔ تعمیر کرنے والا مکان کا مالک ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے روح کی تخلیق کی۔ لہٰذا روح اللہ کی ملکیت ہے مالک اور ملکیت میں نمایاں فرق ہے۔

جزو ثانی ''خدا کے حکم سے فرشتہ نے حاملہ کیا'' قرآن مجید کی کسی آیت سے یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ خدا کے حکم سے فرشتہ نے حاملہ کیا۔ لفظ فَحَمَلَتْهُ کا ترجمہ بالکل غلط کیا ہے عمداً کیا ہے یا عربی سے عدم واقفیت کی وجہ سے بہر حال ترجمہ ہی غلط کیا گیا ہے فَحَمَلَتْهُ کے معنی ہیں مریم نے مسیح کو حمل میں لیا۔ فرشتہ کا ذکر اسؑ سے پہلے ہی ختم ہو چکا ہے۔ قرآن مجید میں کون سے وہ الفاظ ہیں جن سے یہ ظاہر ہو کہ کنواری مریم جو کسی سے ہم بستر نہیں ہونا چاہتی تھی خدا کے حکم سے فرشتہ نے اس کو حاملہ کیا یہ معترض کی اپنی ذہنی اختراع ہے جس پر اعتراض کی بنیاد رکھ دی۔ باقی رہا سوال کہ حضرت مریم کے ہاں کیسے بیٹا پیدا ہوا صرف معترضین کو جواب دینے کے لیے یہ عرض کرتا ہوں کہ تاریخ نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ حضرت مریم کی شادی یوسف نجار سے ہوئی تھی بروئے اناجیل و تاریخ یوسف نجار حضرت مریم کے شوہر تھے وہب کا قول ہے ان مریم لَمَّا حَمَلَتْ كَانَ مَعَهَا ابْنُ عَمٍّ لَهَا يُسَمَّى يُوسُفَ النَّجَّار یعنی جب مریم کو حمل ہوا تو ان کے ساتھ ان کے چچا کا بیٹا یوسف تھا عیسائی خود اس بات کو مانتے ہیں کہ حضرت مریم کا یوسف نجار کے ساتھ تعلق زوجیت تھا۔ پاک ہند میں سرسید اور ان کے ہم فکر یوسف نجار کو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا باپ قرار دیتے ہیں۔

معترض نے جو اعتراض کیا ہے وہ بالکل غلط ہے کہ حضرت مریم کسی فرشتہ سے حاملہ ہوئیں جیسے بھی پیدائش ہوئی ہے لیکن فرشتہ

کے ذریعے حاملہ نہیں ہوئیں یہ معترض کی اپنی ذہنی اختراع ہے۔

الزامی جواب:۔ وید میں دو فرشتوں سے کنواری کا حاملہ ہونا مذکور ہے وید میں ہے اردشی ایک حسین حور تھی اسے دیکھتے ہی دو فرشتوں متر اور ورن کا نطفہ گرا۔ (نرکت 13:5)

......☆......

توبہ گناہ کی طرف رغبت دلاتا ہے

اعتراض: توبہ کرنے سے گناہ کے معاف ہونے کا مسئلہ کہ جن کی قرآن تعلیم دیتا ہے سب کو گناہ کی طرف راغب کرنے والا ہے کیونکہ معافی کی امید پر انسان کو گناہ کرنے میں حوصلہ افزائی ہو جاتی ہے گناہوں کو فروغ دینے والی کتاب کلام اللہ اور اس میں بیان کردہ خدا خدا ہی نہیں ہوسکتا۔ (سیتارتھ پرکاش 109)

جواب: یہ اعتراض قرآن مجید کی اس آیت پر کیا گیا ہے ارشاد الٰہی ہے وَاِنِّی لَغَفَّارٌ لِّمَنْ تَابَ وَاٰمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا ثُمَّ اهْتَدٰی (طٰہٰ 82:20) اور یقیناً میں اس کو بخشنے والا ہوں جو توبہ کرتا ہے اور ایمان لاتا ہے اور اچھا عمل کرتا ہے پھر ہدایت پر قائم رہتا ہے۔

قرآن مجید میں توبہ کا ذکر اکثر جگہ آیا ہے معترض نے توبہ کا فلسفہ ہی نہیں سمجھا۔ معترض کے نزدیک توبہ گناہ پر آمادہ کرتا ہے جبکہ اسلام کے نزدیک توبہ گناہوں سے روکتا ہے توبہ کے معنی ہیں اللہ کی طرف لوٹ آنا جھک جانا رجوع کرنا توبہ صرف گناہ سے رجوع کرنے کے معنی ہی نہیں بلکہ ایک اچھی حالت سے اس سے بہتر حالت کی طرف رجوع کرنا بھی توبہ ہے ایک خدا پرست بھی جب خدا کی طرف زیادہ فرمابرداری سے رجوع کرتا ہے اور خدا کے قرب کی راہ میں گامزن ہوتا ہے تو اس حالت کو بھی عربی زبان میں توبہ کہا جاتا ہے۔ الغرض توبہ صرف گناہوں سے رجوع کرنے کا نام نہیں بلکہ اللہ کا قرب حاصل کرنے کے لیے زیادہ سے زیادہ کوشش کا نام بھی ہے۔

اسلام میں گناہ کے ارتکاب کے بعد توبہ کرنے کا مطلب یہ ہے کہ انسان کے دل میں اپنے کردہ گناہ پر ندامت ہو۔ اس ندامت اور خجالت کی وجہ سے وہ اللہ کے استانہ پر گرے اور خدا سے اپنے کردہ گناہ کی معافی کا طلب گار ہو۔ اس کے ساتھ دوبارہ گناہ نہ کرنے کا اقرار کرے جب ایک انسان اپنے کردہ گناہ پر نادم ہو کر رجوع الی اللہ کرے گا تو لازمی ہے کہ وہ اس بات پر بھی عزم کرے گا کہ آئندہ اس سے اس قسم کا گناہ سرزد نہ ہو۔ گویا توبہ گناہ سے معافی طلب کرنے کے ساتھ آئندہ گناہ نہ کرنے کا اقرار ہے۔ جس رنگ میں معترض نے توبہ کا مفہوم بیان کیا ہے وہ توبہ کی روح کے خلاف ہے۔ پس توبہ کا فلسفہ یہ ہے کہ انسان اپنے کردہ گناہ پر نادم ہو کر ہمیشہ کے لیے گناہ سے رک جائے۔ توبہ انسان کے دل میں اللہ کے تصور کو زیادہ اجاگر کرتا ہے۔ انسان کے دل میں خدا کا تصور جتنا زیادہ گہرا ہو گا اتنا ہی وہ بدیوں سے دور رہے گا۔ اسی لیے اسلام نے انسان کو توبہ کی تعلیم دی ہے تاکہ اس کے دل میں خدا کا تصور ہر وقت زندہ رہے انسان اسی وقت بدی کا ارتکاب کرتا ہے جب وہ خدا کے تصور سے غافل ہو جاتا ہے۔ اسی کا نام جہالت ہے ارشاد الٰہی ہے اِنَّمَا التَّوْبَةُ عَلَى اللّٰهِ لِلَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ السُّوْٓءَ بِجَهَالَةٍ ثُمَّ يَتُوْبُوْنَ مِنْ قَرِيْبٍ فَاُولٰٓئِكَ يَتُوْبُ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا (النساء 17:4) اللہ کے نزدیک توبہ صرف ان لوگوں کے لیے ہے جو جہالت سے بدی کر بیٹھتے ہیں پھر جلدی توبہ کر لیتے ہیں پس انہی پر اللہ رحمت سے متوجہ ہوتا ہے اور اللہ جاننے والا حکمت والا ہے۔ جب انسان کے دل میں خدا کا تصور غائب ہوتا ہے تو انسان اس جہالت میں بدی کا ارتکاب کرے گا توبہ انسان کے دل میں خدا کے تصور کو زندہ کرتا

ہے اور زندہ رکھتا ہے۔ توبہ کرنے سے انسان جہالت سے نکل کر معرفت کی روشنی میں آ جاتا ہے۔ جتنی خدا کی معرفت بڑھتی چلی جائے گی بندہ گناہوں سے دور ہوتا چلا جائے گا۔ اسلام میں صرف توبہ ہی گناہوں کے بخشش کا ذریعہ نہیں بلکہ تمام اسلامی عبادات گناہوں نے بخشش کا سبب ہیں۔ یہ صرف اسلام ہی کی تعلیم نہیں بلکہ تمام انبیاء علیہم السلام اس بات پر متفق ہیں یہی وجہ ہے کہ تمام انبیاء علیہم السلام کی ایک خدا اور اس کی عبادت کی تعلیم دی ہے یہ دو امور (توحید الٰہی اور اللہ کی عبادت) ہر مذہب میں پائے جاتے ہیں۔

الزامی جواب : ہندو ہر مذہبی تہوار پر تالاب، ندی، نالے خصوصاً گنگا کے پانی سے شنان کو گناہوں کے ڈھل جانے کا سبب سمجھتے ہیں۔ حالانکہ پانی صرف ظاہری گندگی کو دور کرنے کا ذریعہ ہے نا کہ گناہوں کے اثرات کو ختم کرتا ہے۔ کیا یہ سمجھ لیا جائے کہ اشنان کرنا مزید گناہوں کی ترغیب دیتا ہے۔ خوب گناہ کر لو گنگا کے پانی سے اشنان کر لیا جائے گا اور گناہوں کی میل ڈھل جائے گی۔

اشنان کے ذریعے گناہوں کے ڈھل جانے میں ایک باریک حکمت پوشیدہ ہے جس کو ہندو سمجھ نہیں پائے اشنان میں یہ تعلیم دی گئی ہے کہ جس طرح اشنان سے ظاہری میل دور ہوگئی ہے اس طرح گناہوں پر ندامت کے آنسو جب رخساروں پر گرتے ہیں تو گناہوں کی میل ڈھل جاتی ہے بندہ گناہوں سے پاک ہو جاتا ہے یہی توبہ ہے ہر مذہب میں اس قسم کے استعارات پائے جاتے ہیں۔ جن کی تہ میں یہی حکمت پائی جاتی ہے۔ مثلاً اسلام میں حج کے دوران جانور کی قربانی لازمی قرار دی ہے بظاہر ایک جانور کو چھری سے ذبح کیا جا رہا ہے۔ اس قربانی کی تہ میں ایک حکمت ہے وہ یہ ہے کہ جس طرح جانور نے اپنے مالک کے سامنے چھری کے نیچے گردن رکھ دی ہے اور اپنی جان کی قربانی دے رہی ہے اس طرح ایک انسان کو خدا کے حکم کے سامنے سر تسلیم خم کرنا چاہیے اور اپنے نفس کی سرکش اونٹنی کو اللہ کے حکم کی چھری سے ذبح کر دینا چاہیے۔ یعنی انسان اللہ کے احکام کے تحت زندگی بسر کرے کسی جگہ پر بھی اس کے پاؤں میں نفسانی خواہش کے مطابق لغزش نہیں آنی چاہیے۔

توبہ گناہوں سے دور رہنے کا نام ہے نہ کہ مزید گناہ کرنے کا نام گناہ کا ارتکاب کرنا جہالت ہے جب کہ توبہ انسان کے اندر خدا کی معرفت پیدا کرتا ہے خدا کی معرفت جتنی زیادہ ہوگی انسان گناہوں سے دور رہے گا۔ کیونکہ گناہ ہلاکت ہے۔ اس کی مثال یوں سمجھئے کہ انسان اس بل میں ہرگز ہاتھ نہیں ڈالے گا جس میں اس کو یہ یقین ہو کہ اس میں سانپ ہے۔ انسان کے اس یقین اور معرفت نے اس بل میں ہاتھ ڈالنے سے روک دیا ہے۔ یہی حال گناہ کا ہے جب انسان کو یہ کامل یقین ہو جاتا ہے کہ گناہ ایک زہر ہے۔ اس کے کرنے سے انسان کی روحانی موت ہے تو وہ گناہ کی طرف نہیں جائے گا معترض توبہ کی فلاسفی سے نابلد ہے اس وجہ سے اس نے یہ اعتراض کر دیا ہے۔

☆......☆

قرآن مجید جغرافیہ طبعی سے ناواقف ہے پہاڑ زمین پر کیوں رکھے گئے؟

اعتراض: اگر قرآن کے مصنف کو جغرافیہ طبعی آتا تو وہ یہ نہ کہتا کہ پہاڑ زمین کو ہلنے نہیں دیتے اس واسطے اسے خیال گزرا کہ اگر پہاڑ نہ ہوتے تو زمین لغزش کھا جاتی یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ باوجود پہاڑوں کی موجودگی کے زلزلہ کے وقت زمین کیوں ہلتی ہے (سیتارتھ پرکاش 110)

جواب: معترض نے حسب ذیل آیت کو نہ سمجھنے کی وجہ سے ٹھوکر کھائی ہے وَجَعَلْنَا فِي الْأَرْضِ رَوَاسِيَ أَنْ تَمِيدَ بِهِمْ (الانبیاء

31:21) اور ہم نے زمین میں پہاڑ بنائے تا کہ وہ انہیں لے کر کانپے نہیں۔

لفظ تمید (ماد) کی وضاحت: تمید کے معنی ہیں اضطراب الشیٔ العظیم یعنی عظیم الشان چیز کا اضطراب جیسے زمین کا اضطراب (امام راغب) ماد کے معنی یہ بھی ہیں کہ ایک چیز ایک طرف مائل ہوگئی اور یہ بھی معنی ہیں کچھ دوسرے کو دینا۔ اَنْ تَمِیْدَ کے معنی دونوں طرح سے ہوسکتے ہیں ایک یہ کہ وہ تمہیں کھانے کا سامان دے اور دوسرے یہ بھی کہ وہ اضطراب سے رک جائے۔ یہ مشاہدہ ہے کہ اگر پہاڑ نہ ہوتے تو دریا بھی نہ ہوتے اور انسان کے رزق کے سامان کا انحصار پہاڑوں اور دریاؤں پر ہے یہ ایک واضح حقیقت ہے کہ انسانوں کی روزی کا سامان پہاڑ ہی ہیں تو آیت کا مطلب واضح ہوگیا کہ اللہ تعالیٰ نے زمین میں پہاڑ اس وجہ سے بنائے تا کہ انسانوں کی روزی کا سامان پیدا ہو۔ کیا معترض کو اب بھی اعتراض ہے کہ پہاڑ کیوں بنائے گئے اگر دوسرے معنی اختیار کیے جائیں کہ زیر اعتراض آیت کا مفہوم یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ نے زمین میں پہاڑ اس لیے بنائے ہیں تا کہ زمین میں اضطراب نہ ہو حدیث میں آتا ہے مِمَّا خَلَقَ اللّٰہُ الْاَرْضَ جُعِلَتْ تَمِیْدَ فَاَرْسٰھَا بِالْجِبَالِ یعنی جب اللہ تعالیٰ نے زمین کو پیدا کیا تو اس میں بہت اضطراب تھا تب اللہ تعالیٰ نے پہاڑ کھڑے کیے سائنس اس پر شاہد ہے کہ پہاڑوں کے بن جانے سے زمین کا اضطراب زلزلوں کے رنگ میں کم ہوگیا تمام طبعی جغرافیہ جاننے والے پہاڑوں کے فوائد کو خوب جانتے ہیں کہ ان فوائد میں سے ایک فائدہ یہ ہے کہ ان پہاڑوں نے زمین کے اضطراب یعنی ڈانواں ڈول ہونے سے بچایا ہے۔ آج سے چودہ سو سال سے ایک اُمّی نبی حضرت محمد مصطفےٰ ﷺ نے پہاڑوں کے فوائد سے آگاہ کیا۔ آج سائنس نے اس پر صداقت کی مہر ثبت کر دی ہے۔

......☆......

قرآن مجید میں فحش کلامی ہے

اعتراض: ایسی فحش باتیں کلام اللہ میں تو کجا شائستہ انسان کی تصنیف میں بھی نہیں ہوسکتیں ایسی باتوں سے قرآن پر دھبہ لگ گیا ہے اگر قرآن میں اچھی اچھی باتیں ہوتیں تو قرآن کریم کو وہی فضیلت ملتی جو ویدوں کو ہے۔ (اعتراض 111)

جواب: وَالَّتِیْٓ اَحْصَنَتْ فَرْجَھَا فَنَفَخْنَا فِیْھَا مِنْ رُّوْحِنَا (الانبیاء 91:21) اور وہ جس نے اپنی عصمت کو محفوظ کیا سو ہم نے اپنا کلام اس میں پھونکا۔

قرآن مجید نے حضرت مریم کا ایک وصف بیان کیا ہے وہ ایک باعصمت عورت تھی جس نے اپنی عصمت کو بچایا عصمت ہی عورت کا زیور ہے معلوم نہیں کہ معترض کو اس میں کون سی فحش بات نظر آئی پھر حضرت مریم کی پاک دامنی اور عصمت کی وجہ سے اللہ ان سے ہم کلام ہوا فَنَفَخْنَا فِیْھَا مِنْ رُّوْحِنَا کے معنی ہیں ہم اس سے ہم کلام ہوئے۔ یہاں روح سے مراد روح حیات نہیں وہ تو اس وقت زندہ تھیں اور ان میں روح زندگی موجود تھی پس قرآن مجید میں روح سے مراد صرف روح حیات ہی نہیں بلکہ کلام الٰہی کو بھی روح قرار دیا گیا ہے کیونکہ کلام الٰہی انسان کی باطنی حیات کے لیے ضروری ہے یہ روح اس کو ملتی ہے جو اللہ کے احکام پر عمل کرنے والا ہو زیر اعتراض آیت میں اللہ تعالیٰ نے پہلے حضرت مریم کا خاص وصف یعنی پاک دامنی کا ذکر کیا ہے اس کے بعد اپنے کلام کا ذکر کیا ہے یعنی جو شخص پاک دامن ہوتا

ہے اللہ اس سے ہم کلام ہوتا ہے۔

الزامی جواب: کیا ہندوادب میں نیوگ کا ذکر نہیں نیوگ کیا ہے کسی عورت کا اپنے خاوند کی مرضی سے محض اولاد کے حصول کے لیے کسی مرد کے پاس جانا ستیارتھ پرکاش باب 4 نمبر 123 میں نیوگ کا ذکر ہے ''کہ ہم دونوں نیوگ اولاد پیدا کرنے کی غرض سے کرتے ہیں جب نیوگ کا مدعا پورا ہو جائے گا تب ہمارا قطع تعلق ہوگا اگر اس کے خلاف کریں تو گناہ گار اور ذات یا راجہ کی سزا کے مستوجب ہوں مہینے میں ایک بار گر بھادان (جماع) کا کام کریں گے حمل کے قیام کے ایک برس بعد تک جدا رہیں گے (ستیارتھ پرکاش باب 4 نمبر 123) معترض سے یہ عرض ہے کیا یہ فحش کلامی نہیں یجروید کا ایک حوالہ ملاحظہ ہو''پورش (مرد) کا لنگ (ذکر) استری (عورت) کی یونی (فرج) میں گھسنے پر خصوصیت سے نطفہ چھوڑتا ہے (یجروید باب 19 منتر 76) نیز رگوید 5:5:10، رگوید 37:85:10 اور تشریح کے لیے نرکت 21:3 کا مطالعہ کیجیے تو قاری پر وید کی عریانی اور فحش کلامی ظاہر ہو جائے گی۔

کیا قرآن مجید میں اس قسم کی فحش کلامی ہے قرآن مجید میں جہاں بھی اس قسم کے مسائل کا ذکر آتا ہے ان کو اس لطیف انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ انسان کی طبیعت پر کسی قسم کی ناگواری کے اثرات پیدا نہیں ہوتے۔

......☆......

پانچ اعتراضات: بے جان اشیاء کا خدا کو سجدہ، جنت کی نعماء پر اعتراض، بیت اللہ اللہ کا گھر ہے کیا وہ اس میں رہتا ہے خدا کا منت لینا اور خانہ کعبہ کا طواف قربانی، خانہ کعبہ کی پوجا

اعتراض: بھلا بے جان اشیاء کو جنہیں خدا کا علم ہی نہیں کیونکر خدا کو سجدہ کر سکتی ہیں اس سے قرآن کہ جس میں ایسا لکھا ہے کسی سمجھدار آدمی کی بھی تصنیف نہیں بہشت کا نقشہ خوب کھینچا ہے کہ وہاں سونے کے زیور موتی اور ریشمی کپڑے ملیں گے نامعلوم اس بہشت میں یہاں کے بادشاہی محلوں سے بڑھ کر کیا شے ہے؟ اگر خدا کا بھی گھر ہے تو پھر وہ اس گھر میں رہتا بھی ہوگا پھر اس کی پرستش اور بت پرستی میں کیا فرق ہے؟ ایسی صورت میں مسلمانوں کی بت پرستی کی تردید کرنا فضول ہے۔ اگر خدا نذریں لیتا ہے اور اپنے گھر کے چاروں طرف گھومنے کا حکم دیتا ہے اور جانوروں کو مروا کر کھلاتا ہے تو خدا اور یہاں کے مندروں کے پجاریوں اور بھیروی اور درگاہ وغیرہ دیوتاؤں میں کیا فرق رہا؟ اور خدا خود ہی عظیم بت پرستی کا بانی ثابت ہوا کیونکہ مسجد (خانۂ خدا) سب سے بڑا بت ہے پس مسلمان اور ان کا خدا بڑے بت پرست ہیں اور پورا نک

(ہندو) اور جینی چھوٹے (سیتارتھ پرکاش اعتراض 112)

جواب: یہ اعتراض مختلف اجزاء پر مشتمل ہے قرآن مجید کی مختلف آیات پر اعتراض کیا ہے نمبروار جواب دیا جائے گا۔ وہ آیات جن پر اعتراض کیا گیا ہے وہ یہ ہیں۔

1- اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ يَسْجُدُ لَهٗ مَنْ فِى السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِى الْاَرْضِ وَالشَّمْسُ وَالْقَمَرُ وَالنُّجُوْمُ وَالْجِبَالُ وَالشَّجَرُ وَالدَّوَآبُّ وَ كَثِيْرٌ مِّنَ النَّاسِ (الحج 18:22) کیا تو نے غور نہیں کیا کہ اللہ کی ہی فرمانبرداری کرتے ہیں جو آسمانوں میں ہیں اور جو زمین میں ہیں اور سورج اور چاند اور ستارے اور پہاڑ اور درخت اور جان دار اور بہت سے لوگ بھی۔

2- اِنَّ اللّٰهَ يُدْخِلُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ جَنّٰتٍ تَجْرِىْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ يُحَلَّوْنَ فِيْهَا مِنْ اَسَاوِرَ مِنْ ذَهَبٍ وَّ لُؤْلُؤًا وَّلِبَاسُهُمْ فِيْهَا حَرِيْرٌ (الحج 23:22)

اللہ ان لوگوں کو جو ایمان لاتے ہیں اور اچھے عمل کرتے ہیں باغوں میں داخل کرے گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں ان میں انہیں سونے کے کڑے اور موتی پہنائے جائیں گے اور ان کا لباس ان میں ریشم کا ہوگا۔

3- وَاِذْ بَوَّاْنَا لِاِبْرٰهِيْمَ مَكَانَ الْبَيْتِ اَنْ لَّا تُشْرِكْ بِىْ شَيْئًا وَّطَهِّرْ بَيْتِىَ لِلطَّآئِفِيْنَ وَالْقَآئِمِيْنَ وَالرُّكَّعِ السُّجُوْدِ (الحج 26:22) اور جب ہم نے ابراہیم کے لیے خانہ (کعبہ) کی جگہ مقرر کردی کہ میرے ساتھ کسی کو شریک نہ کر اور میرے گھر کو طواف کرنے والوں اور قیام کرنے والوں اور رکوع اور سجدہ کرنے والوں کے لیے پاک کر۔

4- ثُمَّ لْيَقْضُوْا تَفَثَهُمْ وَلْيُوْفُوْا نُذُوْرَهُمْ وَلْيَطَّوَّفُوْا بِالْبَيْتِ الْعَتِيْقِ (الحج 29:22) پھر چاہیے کہ اپنی میل کچیل اتاریں اور اپنی منتوں کو پورا کریں اور قدیم گھر کا طواف کریں۔

جزو اول: اللہ تعالیٰ کو ہر چیز کا سجدہ کرنا ۔ سجدہ کے معنی فرمانبرداری کے بھی ہیں جب انسان اللہ کو سجدہ کرتا ہے وہ بھی فرمانبرداری کی علامت ہے۔ زیر اعتراض آیت میں جن چیزوں کا نام لیا گیا ہے وہ سب اللہ کی فرمانبردار ہیں وہ اللہ تعالیٰ کے قانون میں جکڑی ہوئی ہیں۔ سرمو بھی اللہ کے قانون سے الگ نہیں ہوتیں جو کام ان چیزوں کے سپرد کیا گیا ہے وہ سرانجام دے رہی ہیں اس آیت میں ان اشیاء کا ذکر ہے جن کی عبادت کی جاتی ہے اللہ تعالیٰ ان چیزوں کی عبادت کرنے والوں کو تعلیم دے رہا ہے کہ یہ چیزیں تو خود اللہ کے سامنے سربسجود ہیں خدا کے قانون کے مطابق کام کر رہی ہیں تم اللہ کو چھوڑ کر ان کی عبادت کر رہے ہو گویا زیر اعتراض آیت میں خالص توحید کا سبق دیا گیا ہے کہ ان چیزوں کی عبادت نہ کی جائے اس خدا کی عبادت کی جائے جس کی یہ چیزیں بھی عبادت کر رہی ہیں گویا عبادت کے لائق صرف اللہ تعالیٰ کی ہی ذات ہے۔

جزو دوم: جنت کی نعماء کے متعلق سیرت سید البشر حصہ سوم میں بحث کی جا چکی ہے اعادہ باعث طوالت ہے۔

جزو سوم: خدا کا گھر سے مراد: - طَهِّرْ بَيْتِىَ میرے گھر کو پاک رکھ، اس پر یہ اعتراض کہ خدا کا گھر ہے تو خدا اس میں رہتا ہوگا یہ بے سمجھی اور نادانی کی باتیں ہیں میرا گھر سے مراد خالص میری عبادت کا گھر ہے چونکہ مسجد میں اللہ کی عبادت کی جاتی ہے اس وجہ سے اس عبادت گاہ کو اللہ کا گھر قرار دیا ہے۔ ''اللہ کا گھر'' کہنے میں یہ حکمت ہے تاکہ لوگ ان جگہوں کی حفاظت اور تکریم کریں۔ جہاں خدا کی عبادت کی جاتی ہے۔ جن جگہوں میں جہاں خدا کی عبادت کی جاتی ہے ان کو پاک صاف رکھنے کا حکم ہے۔ ماحول کی صفائی کا انسان کے دماغ و قلب پر خوش گوار اثر پڑتا ہے۔ اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو یہ حکم دیا ہے ''عبادت کے گھر'' کو صاف ستھرا

رکھو اس میں یہ بھی نکتہ نکلتا ہے کہ انسان کو پاک ستھرا رہنا چاہیے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی صفائی کو نصف ایمان قرار دیا ہے اور عبادت سے قبل وضو کرنے اور کپڑوں کو صاف ستھرا رکھنے کا حکم ہے۔ الفاظ طَهِّرْ بَيْتِي میں معارف کا ایک بہتا ہوا سمندر ہے جس پر معترض نے غور ہی نہیں کیا۔

مسلمانوں کی مسجد میں بت تو کجا تصویر تک بھی نہیں ہوتی اس میں خدا پرستی کو بت پرستی کہنا پرلے درجے کی حماقت اور بے سمجھی ہے۔ کیا مسجد میں کسی نے بت رکھے ہوئے دیکھے ہیں تاریخ بتاتی ہے جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فتح مکہ کیا تو سب سے پہلے یہ کام کیا کہ بیت اللہ میں جو بت رکھے ہوئے تھے ان کو باہر پھینکا اور بیت اللہ کو بتوں کی نجاست سے پاک کیا۔ اس دین کو بت پرستی والا مذہب کہنا اپنی جہالت کا اظہار ہے۔

جزو چہارم خدا کا منت لینا اور بیت اللہ کا طواف: - خدا منتیں لیتا ہے۔ معترض نے افترا سے کام لیا ہے زیر اعتراض آیت میں کہیں بھی ذکر نہیں کہ اللہ منتیں لیتا ہے بلکہ الفاظ یہ ہیں وَلْيُوفُوا نُذُورَهُمْ (چاہیے کہ وہ اپنی نذریں پوری کریں) زیر اعتراض آیت میں خدا کا نذریں لینے کا حکم نہیں بلکہ بیت اللہ کی زیارت کرنے والوں کو حکم دیا کہ وہ اپنی نذریں پوری کریں یعنی مناسک حج پورا کریں وَلْيَطَّوَّفُوا بِالْبَيْتِ الْعَتِيقِ (اس پرانے گھر کا طواف کریں) میں یہ سبق دیا گیا ہے کہ وہ توحید کے گھر کا طواف کر رہے ہیں اب ان پر یہ لازم ہے کہ وہ کبھی بھی بت پرستی نہیں کریں گے۔ خالص توحید پر قائم رہیں گے۔ جو شخص اللہ کے گھر کا طواف کرتا ہے وہ دراصل یہ اقرار کر رہا ہوتا ہے کہ وہ کبھی بھی غیر اللہ کے سامنے نہیں جھکے گا۔ بیت اللہ کے طواف میں صرف اللہ کے سامنے جھکنے کی تعلیم دی گئی ہے اور طواف کرنے والا یہ اقرار کرتا ہے کہ وہ کبھی بھی اللہ کے علاوہ کسی کے سامنے نہیں جھکے گا رہا بیت اللہ کے طواف کا مفہوم اس میں خالص توحید کا سبق دیا گیا ہے۔

جزو پنجم: جانور کی قربانی: - اسلام میں جانور کی قربانی میں دو حکمتیں مضمر ہیں۔ ایک تو جانور کا گوشت خود بھی کھایا جائے دوم غربا و مساکین کو بھی دیا جائے تا کہ جذبہ اخوت کو تقویت ملے۔

دوسری حکمت یہ ہے کہ جس طرح جانور اپنے مالک کے سامنے اپنی گردن رکھ دیتا ہے اور مالک چھری سے جانور کی شہ رگ کاٹ دیتا ہے جانور کوئی شکایت نہیں کرتا اس میں یہ باریک اور دقیق نکتہ ہے کہ ہر شخص کو اللہ کے احکام کے سامنے اپنا سر جھکا دینا چاہیے اگر خدا کی رضا کی خاطر جان بھی دینی پڑے تو کوئی دریغ سے کام نہیں لینا چاہیے اور خدا کی راہ میں جان قربان کر دینی چاہیے گویا جانور کی قربانی میں اللہ کی راہ میں جان قربان کر دینے کی تعلیم ہے یہ ہے فلسفہ اسلامی قربانی کا جس کو معترض نے سمجھا ہی نہیں۔

جزو ششم: - خانہ کعبہ کی پوجا: - بیت اللہ خالص اللہ تعالیٰ کی توحید کا گھر ہے تاریخ یہ بتاتی ہے کہ اللہ کی عبادت کے لیے سب سے پہلا یہی گھر ہے مرور زمانہ سے منہدم ہو گیا تو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس گھر کو ان بنیادوں پر از سر نو اللہ کے حکم سے تعمیر کیا زیر اعتراض آیت ان الفاظ سے شروع ہوتی ہے وَإِذْ بَوَّأْنَا لِإِبْرَاهِيمَ مَكَانَ الْبَيْتِ أَنْ لَا تُشْرِكْ بِي شَيْئًا (اور جب ہم نے ابراہیم کے لیے خانہ کعبہ کی جگہ مقرر کر دی کہ میرے ساتھ کسی کو شریک نہ کر۔ زیر اعتراض آیت میں اللہ تعالیٰ شرک سے منع کر رہا ہے لیکن معترض اسلام پر بیت اللہ کی پوجا کا الزام دھر رہا ہے۔ بیت اللہ کی تعمیر کا مقصد ہی توحید قائم کرنا ہے تو بیت اللہ کی پوجا کا معاملہ کہاں سے آ گیا بیت اللہ کی تعمیر اور شرک دو ضدین ہیں بیت اللہ نام ہی توحید کا ہے جہاں توحید ہوگی وہاں شرک نہیں ہوگا۔ آج دنیا میں جو توحید کی شمع جل رہی ہے وہ صرف اس بیت اللہ کی بدولت ہے اسی بیت اللہ کا طواف کرنے والے اللہ کے ایک ہونے کی گواہی دے رہے ہیں پانچ وقت مسجد کے کناروں پر کھڑے ہو کر ایک خدا کی آواز دیتے ہیں اور ایک خدا کی طرف بلاتے ہیں۔

......☆......

احیاءِ موتی (مرنے کے بعد مردہ کہاں رہے گا

اعتراض: کیا قیامت تک مردے قبروں مین ہی رہیں گے یا کسی اور جگہ اگر قبر میں ہی انہیں رہنا پڑے گا تو سڑے ہوئے بدبودار جسموں میں رہ کر نیک آدمیوں کو بھی عذاب سہنا پڑے گا۔ پس ظاہر ہوا کہ یہ ظلم ہے اور بدبودار عفونت زیادہ پھیلا کر بیماری پیدا کرنے کے موجب ہونے سے خدا اور اہل اسلام قصوروار ٹھہرتے ہیں (سیتارتھ پرکاش اعتراض 113)

جواب: یہ اعتراض سورہ مومنون کی آیات 16,15 پر کیا گیا ہے ارشاد الٰہی ثُمَّ اِنَّكُمْ بَعْدَ ذٰلِكَ لَمَيِّتُوْنَ ثُمَّ اِنَّكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ تُبْعَثُوْنَ۔

پھر تم اس کے بعد یقیناً مرنے والے ہو پھر تم قیامت کے دن اٹھائے جاؤ گے۔

اسلام کے نزدیک قبر سے مراد یہ قبر نہیں کہ جس میں مسلمان مردے کو دفن کرتے ہیں۔ بلکہ قبر سے مراد وہ جگہ ہے جہاں روح پہنچتی ہے یہ بھی یاد رکھنا چاہیے مرنے کے بعد انسانی روح کو اس طرح ایک نیا جسم عطا کیا جاتا ہے جس طرح روح کو پہلی پیدائش کے وقت جسم عطا کیا جاتا ہے۔ اسی دوسری پیدائش کو قرآن مجید میں خلق جدید کہا گیا ہے ارشاد الٰہی ہے وَقَالُوْا وَاِذَا كُنَّا عِظَامًا وَّرُفَاتًا ءَاِنَّا لَمَبْعُوْثُوْنَ خَلْقًا جَدِيْدًا (بنی اسرائیل 49:17) کیا ہم ہڈیاں اور چورا ہو جائیں گے تو کیا ہم نئی پیدائش کے لیے اٹھائے جائیں گے پھر فرمایا اَفَعَيِيْنَا بِالْخَلْقِ الْاَوَّلِ بَلْ هُمْ فِيْ لَبْسٍ مِّنْ خَلْقٍ جَدِيْدٍ (ق 15:50) تو کیا ہم پہلی پیدائش سے تھک گئے ہیں بلکہ وہ نئی پیدائش کے متعلق شبہ میں ہیں۔ الفاظ "خلق جدید" ظاہر کرتے ہیں دوسری پیدائش اس مادی جسم میں نہیں ہوگی بلکہ وہ کسی اور رنگ میں ہوگی وہ جسم نیا ہوگا وہ نیا جسم کیا ہوگا۔ وہ ہمارے اعمال کے مطابق ہوگا بہر حال مرنیکے بعد انسانی روح کو ایک نیا جسم عطا کیا جائے گا۔

مردہ جسم کا گلنا سڑنا:

مرنے کے بعد یہ مادی جسم زمین میں دفن کر دیا جاتا ہے یہ زمین کے اندر ہی گل سڑ جاتا ہے۔ زمین میں دفن ہونے کی وجہ سے کسی قسم کا تعفن اور بدبو پیدا نہیں ہوتی۔ یہ ایک مشاہدہ اور تجربہ کی بات ہے کہ قبرستان میں جائیں تو وہاں ہوا میں کسی قسم کی بدبو نہیں ہوتی۔ ہندوؤں کے مردہ جلانے سے ہوا میں ضرور تعفن پیدا ہوتا ہے کہ جب مردہ کا گوشت پوست جل کر ہوا میں تحلیل ہو جاتا ہے تو فضا ضرور متعفن ہوتی ہے کیونکہ مردہ جسم کے جلے ہوئے اجزا ہوا میں پھیل جاتے ہیں۔ مسلمانوں کے طریقہ تدفین سے کسی قسم کا تعفن پیدا نہیں ہوتا تو بدبودار جسموں میں رہ کر نیک آدمیوں کا عذاب سہنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ پہلی بات تو یہ ہے قبروں سے دوبارہ اٹھانے سے مراد یہ قبریں نہیں ہیں جس میں مسلمان مردوں کو دفن کراتے ہیں۔ ان مردوں کی ارواح کا ٹھکانہ کسی اور جگہ ہے۔ جہاں وہ اپنے نئے جسم کے ساتھ قیام کریں گی۔ وہاں ان ارواح کو نئے جسم عطا کیے جائیں گے اس لیے ان نئے اجسام سے بدبو اور تعفن پیدا کیسے ہوسکتا ہے۔ اس لیے معترض کا اعتراض اسلام کے خلق جدید کی فلاسفی سے ناواقفیت کا نتیجہ ہے۔ یہ سمجھ لینا چاہیے کہ اس مادی جسم کا دوسری خلق جدید سے کوئی تعلق نہیں حدیث میں ہے "جو مرتا ہے درحقیقت اس کی قیامت واقع ہو جاتی ہے (المشکوٰۃ المصابیح 7/26) یہاں حالت برزخ کو قیامت فرمایا ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ جونہی انسان مرتا ہے اس کو ایک نئی زندگی دی جاتی ہے۔

مُردوں (مردہ کی روح) کے قیام کی جگہ:-

معترض نے یہ اعتراض کیا ہے کیا قیامت تک مردے قبر میں رہیں گے یا کسی اور جگہ۔ اصولی طور پر اس کا جواب دے دیا گیا ہے کہ مردہ انسانی روح کا قیام کہاں ہوگا اسلامی اصطلاح میں اس عالم کا نام عالم برزخ ہے برزخ عالم قبر کو کہتے ہیں لفظ برزخ لغت عرب میں اس جگہ کو کہتے ہیں کہ جو دو چیزوں کے درمیان واقع ہو چونکہ یہ زمانہ عالم بعث اور علم انشاء اول میں واقع ہے اس لیے اس کا نام برزخ ہے یہ لفظ قدیم سے اور جب سے دنیا کی بنا پڑی ہے عالم درمیانی پر بولا گیا ہے اس کے بعد عالم حشر اجساد آنے والا ہے برزخ عربی لفظ ہے جو مرکب ہے زخ اور بر سے جس کے معنی یہ ہیں کہ کسب اعمال کا طریقہ ختم ہوگیا اور ایک مخفی حالت میں پڑ گیا برزخ کی حالت وہ حالت ہے کہ جب انسان مرجاتا ہے روح الگ اور جسم الگ ہوجاتا ہے جسم کو ایک گڑھے میں دفن کردیا جاتا ہے اور روح ایک نئے جسم کے ساتھ ایک گڑھے میں پڑ جاتی ہے جس پر لفظ الگ دلالت کرتا ہے امام ابن عربی لکھتے ہیں چونکہ برزخ معلوم اور غیر معلوم اور نابود اور بود اور معقول الاغیر معقول کے درمیان ایک امر فاصل سے اس لیے اس کا نام برزخ ہے جب انسان اس دنیا سے گزر کر عالم برزخ میں پہنچتا ہے تو اس کے اپنے اعمال کے اثرات ظاہر ہونا شروع ہوجاتے ہیں عالم برزخ میں اعمال (نیک و بد) کی کیفیات کھل کر ظاہر ہوجاتی ہیں۔ اسلام کے نزدیک مردہ کی روح ایک نئے جسم کے ساتھ عالم برزخ میں قیام کرے گی اور وہاں اس کے نیک و بد اعمال کی کیفیات ظاہر ہونا شروع ہوجائیں گی۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے کئی مکاشفات سے یہ ظاہر ہے۔

......☆......

ہاتھ پاؤں کا گواہی دینا، اللہ کو مادی شے سے تشبیہ دی گئی ہے جو قانون قدرت کے خلاف ہے

اعتراض: ہاتھ پاؤں وغیرہ بے جان ہونے کی وجہ سے کبھی گواہی نہیں دے سکتے یہ جھوٹ ہے کیونکہ خلاف قانون ہے کیا خدا آگ ہے یا بجلی کہ مندرجہ بالا آیتوں میں اسے چراغ اور قندیل وغیرہ سے تشبیہ دی گئی ہے مادی اشیاء کو ایسی مشابہت دی جاسکتی ہے نہ کہ خدا کو (سیتارتھ پرکاش اعتراض 114)

جواب: اس اعتراض کے دو حصے ہیں دو قرآنی آیات پر کیے گئے ہیں پہلی آیت يَوْمَ تَشْهَدُ عَلَيْهِمْ أَلْسِنَتُهُمْ وَأَيْدِيهِمْ وَأَرْجُلُهُمْ بِمَا كَانُوا يَعْمَلُونَ جس دن ان کے خلاف ان کی زبانیں اور ان کے ہاتھ اور ان کے پاؤں گواہی دیں گے جو وہ کرتے تھے۔

دوسری آیت اَللّٰهُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ مَثَلُ نُوْرِهٖ كَمِشْكٰوةٍ فِيْهَا مِصْبَاحٌ اَلْمِصْبَاحُ فِيْ زُجَاجَةٍ اَلزُّجَاجَةُ كَاَنَّهَا كَوْكَبٌ دُرِّيٌّ يُّوْقَدُ مِنْ شَجَرَةٍ مُّبٰرَكَةٍ زَيْتُوْنَةٍ لَّا شَرْقِيَّةٍ وَّلَا غَرْبِيَّةٍ يَّكَادُ زَيْتُهَا يُضِيْٓءُ وَلَوْلَمْ تَمْسَسْهُ نَارٌ نُوْرٌ عَلٰى نُوْرٍ يَهْدِى اللّٰهُ لِنُوْرِهٖ مَنْ يَّشَآءُ (النور 35:24) نور کی مثال ایسی ہے جیسے ایک طاق میں ایک چراغ ہے چراغ ایک شیشہ میں ہے شیشہ گویا کہ ایک چمکتا ہوا تارہ ہے (چراغ) ایک بابرکت زیتون کے درخت سے روشن ہو رہا ہے جو کہ نہ شرقی ہے اور نہ غربی قریب ہے کہ اس کا تیل روشنی دے گو اسے آگ بھی نہ چھوئے روشنی پر روشنی ہے اللہ اپنے نور کے لیے جسے چاہتا ہے ہدایت کرتا ہے۔

جز واول ہاتھ پاؤں کا بولنا:۔

یہ اعتراض دھرم پال نے بھی اپنی کتاب ترک اسلام میں کیا تھا۔اس کا جواب دیا جا چکا ہے۔سلسلہ کلام کو جاری رکھتے ہوئے اختصار کے ساتھ یہ عرض کیا جاتا ہے گواہی صرف زبان سے ہی نہیں ہوتی بلکہ قوی قرائن بھی گواہ ہوتے ہیں منصف صرف زبان کی گواہی پر فیصلہ صادر نہیں کرتا بلکہ قرائن کو بھی مدنظر رکھتا ہے جب آتشک کا مریض کسی طبیب کے پاس جاتا ہے تو طبیب آتشک کی علامات سے بیماری کا پتا لگا لیتا ہے گویا مریض کے اعضا بول رہے ہیں کہ یہ مریض آتشک وسوزاک کی بیماری میں مبتلا ہے۔جب ایک مریض جس کے پیٹ میں پانی پڑ جاتا ہے طبیب کے پاس جائے گا تو طبیب فوراً جان جائے گا کہ اس کا جگر خراب ہو چکا ہے۔گویا تمام امراض کے متعلق اعضاء گواہی دے رہے ہیں یہی حال روز محشر کو ہوگا کہ انسان کے اعضا اپنے کردہ گناہوں کے متعلق گواہی دیں گے۔اگر اس دنیا میں مرض کی علامات اعضاء پر ظاہر ہو جاتی ہیں تو کیا قیامت کے دن یہ علامات اعضاء پر نہیں ہو سکتیں۔یہ ایک مسلمہ امر ہے کہ ہر فعل کا اثر اعضا پر نقش ہو جاتا ہے۔اسی نقش کا اظہار اعضاء انسانی کریں گے۔

جز وثانی: کیا خدا آگ ہے یا بجلی:

سورۃ نور کی آیت 35 میں اللہ تعالیٰ کو آسمانوں اور زمین کا نور کہا گیا ہے۔زیر اعتراض آیت میں اس کو چراغ اور قندیل سے تشبیہ نہیں دی گئی۔اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے اس نور کا ذکر کیا ہے جو اس کے نور سے ظاہر ہوتا ہے یعنی وہ نور اللہ کے نور کا پرتو ہے یعنی اللہ کا نور سر چشمہ ہے اس نور کا جو زیر اعتراض آیت میں مذکور ہے اس نور سے مراد رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی ہے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو قرآن مجید میں نور کہا گیا ہے ارشاد الٰہی ہے قَدْ جَآءَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ نُوْرٌ وَّكِتٰبٌ مُّبِيْنٌ (المائدہ 15:5) تمہارے پاس اللہ کی طرف سے نور (رسول کریم) اور واضح کرنے والی ہدایت آ چکی ہے گویا اللہ تعالیٰ نے استعارہ کے طور پر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو نور کہا ہے اور وہ نور اللہ کے ہی نور سے ظاہر ہوا ہے اللہ کا نور کل ہے اور دوسرا نور (رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات) بعض یا جز حقیقت میں کل اور جز ایک ہی ہوتے ہیں۔زیر اعتراض آیت میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب صافی اور فطری نور کا نقشہ کھینچا ہے۔جس کو معترض سمجھ نہیں سکا۔مَثَلُ نُوْرِهٖ كَمِشْكٰوةٍ فِيْهَا مِصْبَاحٌ (اس نور کی مثال ایسی ہے جیسے ایک طاق میں چراغ ہے یہاں سے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارفع مرتبہ اور مقام محمود کا ذکر شروع ہوا ہے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اللہ نے اپنے نور کا اظہار رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے وجود سے کیا ہے اللہ تعالیٰ نے وحی نبوت کے نور سے حضور کے قلب مبارک کو روشن کیا ہے اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا وہ قلب مبارک ہے جس میں ادنیٰ شائبہ ظلمت نہیں وہ پاک صاف ہے یعنی دل کامل دنیوی کدورتوں سے پاک اور منزہ ہے جب اس قسم کے شخص کے دل پر وحی نبوت کا نور اترے گا تو وہ تمام انسانوں کے لیے ذریعہ ہدایت ہوگا (ضمنی طور پر یہ بیان کیا گیا ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے قبل تمام دنیا گمراہیوں اور اندھیروں میں تھی) رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب صافی پر جو اللہ کی طرف سے نور نازل ہوا تھا اس نے ساری دنیا کو روشن کر دیا پھر فرمایا اس چراغ میں جو تیل ہے جس سے وہ چراغ روشن ہے وہ ایک بابرکت درخت سے ہے اور مبارک ہے یعنی اس چراغ کی روشنی یعنی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا نور کبھی نہیں بجھے گا تا ابد دنیا کے لیے روشنی اور ہدایت کا باعث بنے گا اس کی خیر کبھی منقطع نہیں ہوگی۔وہ نور نہ صرف مشرق کے لیے ہے اور نہ مغرب کے لیے وہ نور اپنے اندر ایک عالمگیر حیثیت رکھتا ہے یعنی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا وجود مبارک صرف اہل مشرق کے لیے ہی مخصوص نہیں نہ صرف اہل مغرب کے لیے بلکہ آپ کا وجود ساری دنیا کے لیے ہے وہ ایک قوم کا نبی نہیں بلکہ اس کے اندر عالمگیریت کی شان پائی جاتی ہے اس وجہ سے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو رحمۃ للعالمین کہا گیا ہے رسول

کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے خود بھی کہا کہ مجھے دوسرے انبیاء علیہم السلام پر یہ خصوصیت حاصل ہے کہ پہلے نبی صرف ایک قوم کی طرف آتے تھے میں ساری دنیا کی طرف بھیجا گیا ہوں۔

یُضِیٓءُ وَلَوْلَمْ تَمْسَسْهُ نَارٌ وہ چراغ روشن ہوتا ہے خواہ اس کو آگ نہ ہی چھوئے) اس میں یہ بتایا ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات مبارک ایسی ہے جو وحی نبوت سے قبل ہی چشمہ نور تھی اور روشن تھی اس کی روشنی سے لوگ مستفیض ہوتے تھے اس کی شہادت حضرت خدیجہ کے ان الفاظ سے ہوتی ہے جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم غار حرا سے پیغام نبوت لے کر گھر آئے تو حضرت خدیجہ سے اس کا ذکر کیا تو آپؐ کے اندرونی رازوں اور خصائص حمیدہ کو جاننے والی بیوی نے کہا کہ اللہ آپ ﷺ کو ناکام و نامراد نہیں کرے گا۔ اس کی وجہ یہ بتائی کہ آپؐ صلہ رحمی کرتے ہیں بے کسوں کے معاون اور مددگار ہیں مہمان نوازی کا پورا حق ادا کرتے ہیں مظلوموں کی جائے پناہ ہیں مسافروں کے لیے باعث رحمت مصائب میں حق کے مددگار ہیں۔

نُوْرٌ عَلٰی نُوْرٌ (نور پر نور) اوپر سے وحی نبوت کا نور نازل ہوا۔ یعنی ایک کامل کتاب نازل ہوئی جس میں ہر قسم کی ہدایت ہے جس کی ہدایت کا چشمہ تا ابد جاری رہے گا نیچے حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے قلبی نور پر جب اوپر (اللہ) کی طرف سے نور نازل ہوا تو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا وجود کامل نور علیٰ نور بن گیا اس وجہ سے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو خاتم النبین قرار دیا ہے اب صرف رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا وجود ہی تمام دنیا کے لیے روشنی کا ذریعہ ہے۔ یَهْدِی اللّٰهُ لِنُوْرِهٖ مَنْ یَّشَآءُ (اللہ اپنے نور کی طرف جس کو چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے) ان الفاظ میں اس سنت الٰہی کی طرف اشارہ ہے جو اللہ تعالیٰ نے ایمان اور ہدایت کے معاملہ میں مقرر کی ہے وہ یہ ہے اللہ کے نور ہدایت سے وہی شخص فائدہ حاصل کرسکتا ہے جو اپنے دل میں نور رکھتا ہے جو شخص بداعمالیوں کی وجہ سے اپنا قلبی نور بجھا لیتا ہے وہ آسمانی نور سے فائدہ حاصل نہیں کرسکتا۔

زیر اعتراض آیت میں استعارات اور تشبیہات کا استعمال ہوا ہے استعارات اور تشبیہات ادب کا ایک حصہ ہوتے ہیں ان سے عبارت میں ایک حسن پیدا ہوتا ہے قرآن مجید میں جو استعارات تشبیہات اور امثلہ بیان کی گئی ہیں ان سے عبارت میں حسن پیدا ہوا ہے۔ ایسا حسن جس نے قرآن مجید کو بے مثل بنا دیا ہے یہ وہ استعارات اور تمثیلات ہیں جن کو معترض نے سمجھ نہیں پایا۔

الزامی جواب: ۔جب وید کا مطالعہ کیا جائے تو واضح ہو جاتا ہے کہ وہ خدا کی تعریف مادیات کی طرح کرتا ہے اس کے نزدیک خدا کی تعریف وہی ہے جو آگ پانی، ہوا، سورج اور دریاؤں وغیرہ کی ہے یا وہ ہمارے بڑے بھائی وغیرہ کی مانند ہے۔ بلکہ اس سے بھی عجیب تر چنانچہ رگوید منڈل 6 سوکت 55 منتر 4، 5 میں ہے ترجمہ پنڈت رام گووند تیری ویدی اور پنڈت گوری ناتھ جھا دیا کرن تیرتھ کا ہے۔

''آج ہم بکریوں اور گھوڑوں والے پوشن (خدا) کی ثنا کرتے ہیں جو اپنی بہن کا یار کہلاتا ہے اپنی ماں کے خاوند کی ہم تعریف کرتے ہیں اس (ثناء) سے اپنی بہن کا یار ہماری دعا سنے۔ اس منتر میں خدا کو اپنی بہن کا یار اور ماں کا خصم کہہ کر تشبیہ دینا وید کی نرالی اور انوکھی مثال ہے کیا یہ خدا کی تعریف ہے یا اس کو مندا کہا گیا ہے اس تشبیہ میں اس سے زیادہ غلیظ اور گندے الفاظ کیا ہو سکتے ہیں۔ (نعوذ باللہ من ذالک)

☆......☆

اللہ کے ساتھ رسول کا حکم ماننا شرک ہے

اعتراض: یہ کس قسم کی فلاسفی ہے کہ جن جانوروں کے جسم میں سب عناصر پائے جاتے ہیں وہ بھی صرف پانی سے پیدا شدہ بتائے جاتے ہیں یہ محض لاعلمی ہے جب اللہ کے ساتھ رسول کا حکم ماننا ضروری قرار دیا گیا تو رسول خدا کا شریک ٹھہرایا نہیں؟ پھر کیا وجہ ہے کہ قرآن میں خدا کو وحدہٗ لاشریک کہا گیا ہے اور ایسا ہی مسلمان بھی کہا کرتے ہیں۔ (ستیارتھ پرکاش اعتراض ۱۱۵)

جواب: اس اعتراض کے دو حصے ہیں دو آیات پر مبنی ہیں ایک آیت یہ ہے وَاللّٰهُ خَلَقَ كُلَّ دَآبَّةٍ مِّنْ مَّاءٍ فَمِنْهُمْ مَّنْ يَّمْشِي عَلٰى بَطْنِهٖ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّمْشِيْ عَلٰى رِجْلَيْنِ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّمْشِي عَلٰى اَرْبَعٍ يَخْلُقُ اللّٰهُ مَايَشَآءُ (النور 45:24) اور اللہ نے ہر ایک جان دار کو پانی سے پیدا کیا سو کوئی ان میں سے وہ ہے جو اپنے پیٹ پر چلتا ہے اور کوئی ان سب سے وہ ہے جو دو پاؤں پر چلتا ہے اور کوئی ان سب سے وہ ہے جو چار (پاؤں) پر چلتا ہے اللہ جو چاہتا ہے پیدا کرتا ہے۔

دوسری آیت یہ ہے قُلْ اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ (النور 54,24) کہہ اللہ کی اطاعت کرو اور رسول کی اطاعت کرو۔

جزو اول: یہ قانون درست ہے کل جان داروں کی پیدائش پانی سے ہوئی ہے آج سائنس نے بھی اصول ارتقاء کے مسئلہ میں اس بات پر اس قانون کی صداقت پر مہر ثبت کر دی ہے اس پر مزید بحث کی گنجائش ہی نہیں۔ جس بات کو اس دور نے سائنس کے تجربات اور مشاہدات سے ثابت کر دیا ہو تو پھر بحث کیسی۔ پانی منبع حیات ہے مذکورہ آیت میں اللہ تعالیٰ نے مختلف جانوروں کی اقسام بیان کر دی ہے قرآن مجید کا پانی کو منبع حیات قرار دینا پھر سائنس کا اس نظریہ پر حق کی مہر ثبت کرنا قرآن مجید کی صداقت کی زبردست دلیل ہے کس طرح ایک امی نبی پر حیات کا راز منکشف ہوا۔

دوسرا جزو: رسول کی اطاعت سے شرک لازم آتا ہے معترض نے نظریہ رسالت کو سمجھا ہی نہیں رسول جو احکام لے کر آتا ہے وہ اللہ تعالیٰ کے ہوتے ہیں۔ وہ اللہ کے احکام لوگوں تک پہنچاتا ہے وہ احکام رسول کے نہیں ہوتے۔ رسول اللہؐ کے احکام پر عمل کرنے کی تلقین کرتا ہے اس لیے رسول کے بیان کردہ احکام پر عمل کرنا گویا اللہ کے احکام پر عمل کرنا ہوتا ہے۔ دنیا میں بھی یہی نظام ہے کہ ایک حاکم حکومت کے احکام لوگوں تک پہنچاتا ہے اور ان پر عمل کرنے کی تلقین کرتا ہے وہ احکام کسی حاکم کے نہیں ہوتے بلکہ حکومت کے ہوتے ہیں۔ اس سے حاکم اور حکومت ایک نہیں ہو جاتے حاکم ان احکام کے پہنچانے کا پابند ہوتا ہے اس طرح رعایا پر یہ لازم ہوتا ہے کہ وہ حاکم کے فرمودات پر عمل کرے وہ فرمودات دراصل حکومت کے فرمودات ہوتے ہیں حاکم پر یہ فرض عائد کیا گیا ہے کہ وہ احکام لوگوں تک پہنچائے۔ یہی کیفیت ایک رسول کی ہوتی ہے وہ اللہ کا پیغمبر ہوتا ہے اس کا یہ فرض ہوتا ہے کہ وہ لوگوں تک خدا کا پیغام پہنچائے اور لوگ اس پیغام پر عمل پیرا ہوں۔ اس پیغام پر عمل کرنا خدا کا حکم ہے نہ کہ رسول کا رسول تو صرف پیغمبر ہے۔ اس طرح یہ کہنا کہ رسول کی پیروی سے شرک لازم آتا ہے وہ بالکل غلط ہے۔ رسول کی پیروی دراصل اللہ تعالیٰ کی پیروی ہے کیونکہ رسول اللہ کی طرف سے آتا ہے اور لوگوں تک خدا کے پیغام پہنچاتا ہے۔ وہ رسول کی اطاعت نہیں ہے بلکہ دراصل اللہ کی اطاعت ہے۔

☆......☆

آسمان بادلوں سے کیسے پھٹ سکتا ہے برائیاں نیکیوں میں کیسے بدل سکتی ہیں اور کیا وہ تل اور ماش ہیں کہ ایک دوسرے سے تبادلہ ہو جائے گا

دین اسلام فساد کا دین ہے

اعتراض: آسمان کا بادلوں کے ساتھ پھٹ جانا کبھی درست نہیں ہو سکتا آسمان کوئی مادی اور شکل والی چیز تھوڑی ہے کہ پھٹ جائے قرآن امن میں رخنہ اندازی کرنے اور فساد مچانے کی تعلیم دیتا ہے اس لیے پارسا اور عالم نہیں مان سکتے یہ بھی عجیب بات ہے کہ برائیوں کا بھلائیوں کے ساتھ تبادلہ ہو جائے گا کیا یہ نیکی بدی تل اور ماش ہیں کہ ایک دوسرے کا تبادلہ ہو جائے گا اگر توبہ سے نجات اور خدا مل جائے تو بھی گناہ سے خوف نہ کرے اس لیے یہ باتیں لغو ہیں۔ (ستیارتھ پرکاش اعتراض 116)

جواب: یہ اعتراض بھی اپنے اندر کئی اعتراضات لیے ہوئے ہے بعض اعتراض ایسے بھی ہیں جو پہلے دہرائے گئے ہیں سوامی جی نے پھر اس اعتراض میں جمع دیئے ہیں مثلاً جہاد اور توبہ دونوں پر اس کتاب میں بحث کی جا چکی ہے کہ توبہ سے کیا مراد ہے اور اسلام میں جہاد کا کیا تصور ہے۔

مندرجہ ذیل آیات پر یہ اعتراضات کیے گئے ہیں۔ وَيَوْمَ تَشَقَّقُ السَّمَآءُ بِالْغَمَامِ وَنُزِّلَ الْمَلٰٓئِكَةُ تَنْزِيْلًا (الفرقان 25:25) اور جس دن آسمان بادلوں کے ساتھ پھٹ جائے گا اور فرشتے اتارے جائیں گے۔

فَلَا تُطِعِ الْكٰفِرِيْنَ وَجَاهِدْهُمْ بِهٖ جِهَادًا كَبِيْرًا (الفرقان 52:25) سو کافروں کی بات نہ مان اور اس (قرآن) کے ساتھ ان سے جہاد کر جو بڑا جہاد ہے۔

اِلَّا مَنْ تَابَ وَاٰمَنَ وَعَمِلَ عَمَلًا صَالِحًا فَاُولٰٓئِكَ يُبَدِّلُ اللّٰهُ سَيِّاٰتِهِمْ حَسَنٰتٍ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا (الفرقان 70:25) مگر جس نے توبہ کی اور ایمان لایا اور اچھے عمل کرتا رہا تو ایسے لوگوں کی بری زندگی کو نیک زندگی سے بدل دیتا ہے۔

جزو اول:

آسمان کا بادلوں سے پھٹ جانا یہ ایک محاورہ ہے جس کا مطلب یہ ہے کثرت سے بارش ہوئی یہ غزوہ بدر کا تذکرہ ہے جس میں کثرت بارش نے کفار کی یقینی فتح کو شکست میں بدل دیا جس زمین پر کفار کی فوج تھی۔ وہ چٹیل تھی۔ جب بارش ہوئی تو وہ پھسلنی ہو گئی جس وجہ سے کفار کے پاؤں جم نہیں پاتے تھے اور پھسلتے جاتے تھے اور گر گر پڑتے تھے۔ اس کے بالمقابل جس زمین پر مسلمان قوم پڑاؤ ڈالے ہوئے تھی وہ ریتلی تھی جس وجہ سے اس زمین پر پھسلاہٹ پیدا نہ ہوئی اور مسلمان ثابت قدم رہے۔ دوم لوگوں کے دلوں پر ملائکہ کا نزول بھی ہوا کفار کے دلوں میں ایک ناگہانی اور خفیہ قسم کا خوف طاری ہو گیا۔ جب کہ مسلمانوں کے دل نزول ملائکہ سے مضبوط ہو گئے۔ یہ ایک روحانی کیفیت ہے وہی لوگ جان سکتے ہیں جو اس قسم کی کیفیت سے واقف ہوں۔ کمزور مسلمانوں کا طاقت ور دشمن پر غلبہ

اس حقیقت کو واضح کر دیتا ہے کہ اللہ کی مدد کسی رنگ میں ضرور آئی اللہ تعالیٰ نے پہلے ہی بتا دیا تھا اس کے مطابق سب کچھ ہوا یہی غیبی مدد ہوتی ہے۔

جزو ثانی:

(قرآن کے ساتھ جہاد) سیفی جہاد کے متعلق سیرت سید البشر کے حصہ اول دوم اور سوم تینوں میں مفصل بحث کی جا چکی ہے جہاں اس کا اعادہ غیر ضروری ہے۔ صرف اتنا دہرا دیا جاتا ہے۔ مسلمانوں کا جہاد دفاعی تھا۔ مسلمانوں کو اپنی مدنی سلطنت کی سرحدوں جانوں اور مالوں کی حفاظت کے لیے تلوار اٹھانی پڑی۔ مسلمان کمزور تھے اور دشمن طاقتور تھا طاقت ور دشمن نے کمزور پر حملے کیے اور کمزور مسلمان ثابت قدمی کے ساتھ لڑے اور کامیاب رہے۔ اس لیے یہ کہنا کہ قرآن امن میں رخنہ اندازی کرنے اور فساد مچانے کی تعلیم دیتا ہے بالکل غلط ہے۔ دوم جس آیت پر اعتراض کیا ہے اس میں جہاد بالسیف کا ذکر تک نہیں اس آیت میں جہاد بالقران کا ذکر ہے کہ قرآن مجید کی عام اشاعت کی جائے۔ اس کی تعلیم کو عام کیا جائے۔ اسی میں لوگوں کی فلاح اور بھلائی ہے اسلام امن کی تعلیم دیتا ہے اس موضوع پر سیرت سید البشر کے حصہ اول میں بحث گزر چکی ہے۔ اسی طرح کتاب کے دوسرے حصوں میں بھی کئی جگہ یہ بحث ہو چکی ہے۔ اسلام امن کا دین ہے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے تو اسلام کی تعریف ہی یہ بتائی ہے کہ مسلمان وہ ہے جس کی زبان اور ہاتھ سے دوسرا محفوظ رہے۔

جزو ثالث:

بدیوں کا نیکیوں سے بدل جانا۔ معترض پہلے بھی یہ اعتراض کر چکا ہے اس کا جواب دیا جا چکا ہے اعادہ کی ضرورت نہیں یہاں صرف یہ بیان کیا جاتا ہے کہ توبہ نام ہے آئندہ گناہ سے رک جانے کا۔ توبہ انسان کے دل میں گناہ سے اتنا خوف پیدا کر دیتا ہے کہ وہ گناہ کے قریب تک نہیں جاتا۔ رہا یہ سوال بدیوں کا نیکیوں سے بدل جانا اس کا صرف مطلب یہ ہے کہ آئندہ انسان کو بدیوں کی بجائے نیکیاں کرنے کی زیادہ توفیق ملے گی پہلے وہ بدیوں میں زندگی بسر کرتا تھا اب وہ ان بدیوں کو چھوڑ کر نیکی کی زندگی بسر کرے گا اس تغیر کو محاورہ کے طور پر بیان کیا گیا ہے کہ اس انسان کی بدیاں نیکیوں میں بدل جائیں گی۔ دوسرا مفہوم یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ثواب اور اجر میں نیکیاں بدیوں کا کفارہ ہو جائیں گی اسلام کی یہ تعلیم ہے کہ جب انسان کوئی نیکی کرتا تو اس نیکی سے گناہ کے اثرات زائل جاتے ہیں۔ مثلاً نماز، زکوٰۃ اور حج کے متعلق رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمودات ہیں کہ ان کے ادا کرنے سے گناہ معاف ہو جاتے ہیں۔ بدی مرض ہے جس طرح جب کسی شخص کو کوئی مرض لاحق ہو۔ تو وہ اس کا علاج کرتا ہے تو مرض دور ہو جاتا ہے۔ دوا نے مرض کو دور کر دیا بعینہٖ یہی حالت گناہ کی ہے۔ گناہ بھی ایک روحانی بیماری ہے اس روحانی بیماری کا علاج یہی ہے کہ نیکی کی جائے تاکہ اس روحانی بیماری کے اثرات ختم ہو جائیں۔ یہی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بتایا کہ نیکیوں سے بدی کے اثرات زائل ہو جاتے ہیں اور یہی قرآن مجید میں بیان کیا گیا ہے یُبَدِّلُ اللّٰہُ سَیِّاٰتِہِمْ حَسَنٰتٍ کہ اللہ بُری زندگی کو نیک زندگی سے بدل دیتا ہے یعنی نیکیاں بدیوں کا کفارہ ہیں۔ تمام مذاہب میں بدیوں کے اثرات کے ازالے کے لیے مختلف طریقے رائج ہیں۔ کہیں تناسخ کا عقیدہ ہے اور کہیں کفارہ کا۔ لیکن اسلام نے یہ تعلیم دی ہے کہ اگر کسی انسان سے گناہ سرزد ہو جائے تو وہ خلوص قلب سے اللہ سے آئندہ گناہ نہ کرنے کا اقرار کرے پھر نیکی کی زندگی بسر کرے تو اللہ جو غفار ہے وہ اپنے بندے کا گناہ معاف کر دے گا اور گناہ کے اثرات ختم ہو جائیں گے گناہوں کی بخشش کا کتنا اچھا اور اعلیٰ طریقہ ہے جس پر سوامی جی نے اعتراض کیا ہے۔

☆......☆

موسیٰ کی وحی کے بعد دوسرے انبیاء کو وحی کرنے کی کیا ضرورت؟ اگر خدا خود کھلاتا پلاتا ہے تو پھر کسی کو بیماری نہیں ہونی چاہیے اگر خدا ہی بیماری دور کر کے شفا بخشنے والا ہے تو مسلمان کو بیماری میں مبتلا نہ ہونا چاہیے خدا کا سب سے مساوی سلوک نہیں وغیرہ

اعتراض: جب خدا نے موسیٰ پر وحی نازل کی تو پھر داؤد، عیسیٰ اور محمد صاحب پر وحی نازل کرنے کی کیا ضرورت ہوئی اگر خدا نے ارواح پیدا کیے ہیں تو وہ بھی مر جائیں گے اگر خدا ہی سب جان داروں کو کھلاتا اور پلاتا ہے تو کسی کو بیماری نہیں ہونی چاہیے اور خدا کا انصاف بھی اس بات میں ہے کہ سب کو یکساں رزق دے کسی کو کم کسی کو زیادہ رزق دینا (جیسا کہ بادشاہ اور گدا کو) خدا کے انصاف پر دھبہ لگاتا ہے اگر خدا ہی بیماری دور کر کے شفا بخشنے والا ہے تو مسلمانوں کو بیماری میں مبتلا نہ ہونا چاہیے مگر ایسی صورت نہ ہونے سے ثابت ہوتا ہے کہ خدا طبیب حاذق نہیں اگر خدا مارتا اور جلاتا ہے تو گناہ اور ثواب بھی اس کے ذمہ ہونا چاہیے اگر خدا بہت سے جنموں کے اعمال کے مطابق باقاعدہ بدلہ دیتا تو وہ خود گناہ اور ثواب کا ذمہ دار نہ ہوتا یہ مسئلہ کہ خدا گناہ معاف کر کے قیامت کے دن انصاف کرے گا تو خدا کو گناہ کا فروغ دینے والا قرار دینا ہے اور اگر یہ مانا جائے کہ گناہ معاف نہیں کرتا تو قرآن غلط ثابت ہوگا۔ (سیتارتھ پرکاش اعتراض 117)

جواب: یہ اعتراض جو کئی اعتراضات پر مشتمل ہے حسب ذیل آیات پر کیا گیا ہے۔ ارشاد الٰہی ہے وَاَوْحَيْنَآ اِلٰى مُوْسٰٓى اَنْ اَسْرِ بِعِبَادِيْٓ اِنَّكُمْ مُّتَّبَعُوْنَ (الشعراء 52:26) اور ہم نے موسیٰ کی طرف وحی کی کہ راتوں رات میرے بندوں کو لے جا کیوں کہ تمہارا پیچھا کیا جائے گا۔

2- الَّذِيْ خَلَقَنِيْ فَهُوَ يَهْدِيْنِ وَالَّذِيْ هُوَ يُطْعِمُنِيْ وَيَسْقِيْنِ وَاِذَا مَرِضْتُ فَهُوَ يَشْفِيْنِ وَالَّذِيْ يُمِيْتُنِيْ ثُمَّ يُحْيِيْنِ وَالَّذِيْٓ اَطْمَعُ اَنْ يَّغْفِرَ لِيْ خَطِيْٓـَٔتِيْ يَوْمَ الدِّيْنِ (الشعراء 26 : 78 - 82) جس نے مجھے پیدا کیا پھر وہی مجھے ہدایت دیتا ہے اور جو مجھے کھلاتا اور پلاتا ہے اور جب میں بیمار ہوں تو مجھے شفا دیتا ہے اور جو مجھے مارے گا پھر مجھے زندہ کرے گا اور جو میں امید رکھتا ہوں کہ میری خطائیں جزا و سزا کے دن معاف کرے گا۔

جزو اوّل:

موسیٰ کو وحی کی تو پھر داؤد عیسیٰ اور محمد صاحب کو وحی کرنے کیا ضرورت تھی۔ اس پر بحث سیرت سید البشر حصہ دوم صفحہ 53 تا57 پر کی جا چکی ہے مزید براں یہی اعتراض دھرم پال مصنف ترک اسلام نے کیا۔ اس کا جواب بھی اسی حصہ میں گزر چکا ہے۔ اعادہ کی ضرورت نہیں۔ صرف اتنا بتا دینا ضروری ہے اللہ تعالیٰ نے دنیا کے ہر خطہ میں نبی بھیجے ہیں اور ہر نبی کو لوگوں کی ضرورت کے مطابق اللہ تعالیٰ نے احکام دیئے۔ یہی احکام وحی نبوت یا کتاب کہلاتے ہیں وحی نبوت کے بغیر نبی کا آنا ہی بے کار ہے ہر نبی زمانہ کی ضرورت کے مطابق احکام لے کر آتا رہا ہے۔ وہ احکام لوگوں کی فلاح کے ضامن تھے۔ وہ احکام مشعل راہ تھے۔ جن پر عمل کر کے انسان ترقی کے راستہ پر گامزن ہوتا رہا ہے۔

جزو ثانی:

خدا ہی سب جان داروں کو کھلاتا اور پلاتا ہے تو کسی کو بیماری نہیں ہونی چاہیے۔ انصاف بھی اسی بات میں ہے اللہ تعالیٰ نے جان داروں کو پیدا کیا۔ ان کی ضروریات زندگی کے لیے اس زمین میں ہر قسم کی اشیاء پیدا کر دیں تمام جان دار اپنی ضروریات کے مطابق ان اشیاء سے فائدہ حاصل کر رہے ہیں پانی سے پیاس بجھاتے ہیں اشیاء خوردنی سے اپنی بھوک مٹاتے ہیں اللہ تعالیٰ نے یہ اشیاء اپنی صفت رحمانیت کے تحت پیدا کی ہیں۔ ان اشیاء سے فائدہ اٹھانے کی استعداد بھی اللہ تعالیٰ نے دی ہے اسی وجہ سے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کے متعلق یہ فرمایا کہ اللہ کی ذات ہی نے مجھے پیدا کیا اسی نے ہدایت کا سامان مہیا کیا پھر وہی ذات جو مجھے کھلاتی اور پلاتی ہے یہ ایک معرفت کا کلام ہے کہ خدا کا نیک بندہ خدا کی نعمتوں کا شکر ادا کرتا ہے اور اس بات کا اقرار کرتا ہے۔ کہ اللہ نے انسان کو پیدا کیا پھر اس کی ضروریات کے لیے اس دنیا میں ہر چیز پیدا کر دی۔ پھر ان چیزوں سے فائدہ اٹھانے کی استعداد بھی دے دی۔ خدا کے نیک بندے خدا کے سامنے اپنی عاجزی اور اپنی بندگی کا اظہار اسی طرح کرتے ہیں ان آیات میں ہر انسان کو یہ سبق دیا گیا ہے کہ وہ اپنے خدا کے سامنے اپنی بندگی اور اس کی نعمتوں کا اظہار کریں۔

بیماری اور شفا کا دینا:

انسان کو بیماری اللہ تعالیٰ کے بتائے ہوئے اصول صحت کو توڑنے سے لاحق ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ علیم وخبیر ذات ہے۔ اس کو معلوم تھا کہ اس کے بندے اصول صحت کو توڑیں گے اور وہ بیماری کا شکار ہوں گے اللہ تعالیٰ نے پھر اپنی صفت رحمانیت کے تحت بیماری کی شفا کے لیے سامان پیدا کر دیا۔ پھر اس کے ساتھ عقل وشعور بھی عطا کیا کہ ان جڑی بوٹیوں سے فائدہ اٹھا کر اپنی بیماری کو دور کرے۔ زیر اعتراض آیت میں حضرت ابراہیم اس بات کا اظہار کر رہے ہیں کہ جب وہ بیمار ہوتے ہیں تو اللہ کی عطا کی ہوئی دوائیون سے وہ صحت یاب ہو جاتے ہیں۔ اس آیت میں بندگی اور عاجزی کا اظہار کیا گیا ہے خدا کا شکر ادا کیا گیا ہے کہ وہی شفا دینے والا ہے چونکہ بیماری کی شفا کے لیے اللہ تعالیٰ نے ہی جڑی بوٹیاں پیدا کی ہیں اس وجہ سے شفا کی نسبت اللہ کی طرف کی گئی ہے یہ قرآن مجید کا طرز بیان ہے کیونکہ مسبب الاسباب اور علت العلل اللہ تعالیٰ کی ذات ہے اس وجہ سے ہر چیز کی نسبت اس کی طرف کر دی جاتی ہے۔

سوامی جی لکھتے ہیں کہ اگر خدا ہی بیماری دور کر کے شفا بخشنے والا ہے تو مسلمانوں کو بیماری میں مبتلا نہیں ہونا چاہیے یہ بھی عجیب قسم کا اعتراض ہے چونکہ اللہ شفا دینے والا ہے اس وجہ سے مسلمان کو بیماری میں مبتلا نہیں ہونا چاہیے۔ معترض کو سمجھنا چاہیے کہ بیماری اصول صحت کو توڑنے کا نام ہے قرآن مجید نے کہیں یہ نہیں لکھا کہ مسلمان اصول صحت نہیں توڑے گا اور دیگر مذاہب والے وہ اصول صحت توڑیں گے۔ جو

شخص بھی اصول صحت کو توڑے گا وہ بیمار ہوگا۔ خواہ وہ مسلمان ہو یا ہندو یا عیسائی یا یہودی اصول صحت کو توڑنے والا ضرور بیمار ہوگا۔ اللہ تعالیٰ کے اس قانون میں سب برابر ہیں۔ خدا سب کے ساتھ انصاف کرتا ہے۔ یہ زمین پیدا کی ہے سورج چاند ستارے ہوا پہاڑ اور دیگر اشیاء پیدا کی ہیں اشیاء سب کے لیے ہیں مسلمان عیسائی ہندو یہودی دہریہ الغرض ہر شخص ان اشیاء سے مستفید ہو رہے ہیں۔ یہی اللہ کا انصاف ہے پنڈت اور بھنگی میں کوئی فرق نہیں۔

گناہ اور ثواب کی ذمہ داری:-

اللہ تعالیٰ نے انسان کو پیدا کیا۔ اس کو عقل دی پھر ہدایت اور راہنمائی کے لیے سلسلہ انبیاء علیہم السلام جاری کیا۔ ہر دور میں اور دنیا کے ہر خطہ میں نبی آئے۔ انہوں نے اللہ سے احکام پا کر ان پر چلنے کی ہدایت کی۔ اس معاملہ میں انسان مختار کل بنایا چاہے کہ وہ عقل سے کام لے۔ چاہے ان احکام پر عمل کرے یا نہ کرے اگر عقل سے کام لے کر ان احکام پر عمل پیرا ہوگا تو وہ ثواب کا مستحق ہوگا اور فلاح پائے گا اگر احکام کو پس پشت ڈالتا ہے تو وہ گناہ کمائے گا اور سزا کا مستوجب ہوگا اللہ تعالیٰ نے یہی جزا و سزا کا قانون بنایا ہے۔ احکام الٰہیہ پر عمل کرنا یا نہ کرنا انسان کے اختیار اور بس میں ہے۔ عمل کرنے یا نہ کرنے پر جزا و سزا ہے اگر انسان اللہ کے احکام پر عمل پیرا ہوتا ہے تو وہ مادی اور روحانی بلندیوں کو پالیتا ہے اگر عمل نہیں کرتا تو وہ پستی کے گڑھے میں جا گرتا ہے اگر عروج و زوال کا سلسلہ نہ ہو تو کوئی شخص بھی جدوجہد اور سعی بلیغ نہیں کرے گا۔ آج انسان مادی عروج پر ہے اس کی وجہ صرف یہی ہے کہ وہ مختار ہے اور وہ مادی بلندیوں کے حصول کے لیے تگ و دو کر رہا ہے۔ اگر جزا و سزا کا ذمہ دار اللہ کو ٹھہرایا جائے تو انسان نہ بلندی کو پا سکے گا نہ پستی کی ذلت۔ یہ کائنات بے کیف اور بے رونق ہو جائے گی کیوں کہ انسان ہی جزا و سزا ثواب و گناہ کا ذمہ دار ہے اسی وجہ سے دنیا کا کاروبار چل رہا ہے۔ اسی لیے انسان کو پیدا کیا اس کے سامنے نیکی بدی اچھائی برائی۔ عروج و تنزل کے راستے کھول کر رکھ دیئے جو چاہے راستہ اختیار کرے ہر راستہ کے نتیجہ سے بھی آگاہ کر دیا۔ اگر نیکی کا راستہ اختیار کیا گیا تو عزت اور عروج حاصل ہوگا۔ اگر بدی کا راستہ اختیار کیا گیا تو ذلت اور تنزل نصیب ہوگا۔ انسان کی جزا و سزا کا یہ اسلامی فلسفہ ہے۔ معترض کی سمجھ سے بالا ہے معترض نے انسان کو حیوان کے مقام پر لا کھڑا کیا ہے۔

خدا اور مساوات:-

اللہ تعالیٰ نے سب انسانوں کو برابر پیدا کیا ہے ارشاد الٰہی ہے يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ (النساء 4:1) اے لوگو! اپنے رب کا تقویٰ اختیار کرو جس نے تم کو ایک ہی اصل سے پیدا کیا۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں اَيُّهَا النَّاسُ اَلَا اِنَّ رَبَّكُمْ وَاحِدٌ اِنَّ اَبَاكُمْ وَاحِدٌ اَلَا لَا فَضْلَ لِعَرَبِيٍّ عَلٰى عَجَمِيٍّ وَلَا لِعَجَمِيٍّ عَلٰى عَرَبِيٍّ وَلَا لِاَحْمَرَ عَلٰى اَسْوَدَ وَلَا لِاَسْوَدَ عَلٰى اَحْمَرَ اِلَّا بِالتَّقْوٰى (مسند احمد) اے لوگو! ہاں بے شک تمہارا رب ایک ہے اور بے شک تمہارا باپ ایک ہے عربی کو عجمی پر، عجمی کو عربی پر، سرخ کو سیاہ پر اور سیاہ کو سرخ پر کوئی فضیلت نہیں مگر تقویٰ کے سبب سے فرمایا اَلْخَلْقُ عِيَالُ اللّٰهِ فَاَحَبُّ الْخَلْقِ اِلَى اللّٰهِ مَنْ اَحْسَنَ اِلٰى عِيَالِهٖ (بیہقی کتاب الایمان) ساری مخلوق اللہ کا کنبہ (عیال) ہے اور اللہ سب سے زیادہ محبت اس سے کرتا ہے جو اللہ کی مخلوق کو سب سے زیادہ چاہتا اور محبت کرتا ہے۔

پھر فرمایا اِنَّ الْعِبَادَ كُلَّهُمْ اِخْوَةٌ (اخرجہ احمد، ابوداؤد) انسان سب آپس میں بھائی بھائی ہیں۔

عدم مساوات:

معاشرہ میں جو عدم مساوات پائی جاتی ہے۔ وہ سماج اور معاشرہ کی وجہ سے ہے سماج نے انسانوں میں تفریق پیدا کی ہے۔ کوئی

برہمن ہے کوئی کھشتری ہے کوئی ویش ہے اور کوئی شودر، کوئی آقا ہے اور کوئی غلام یہ تفریق انسانوں کی پیدا کردہ ہے اللہ کی نہیں اسلام نے مساوات کا سبق دیا۔ اسلام کا نظریہ توحید اور تمام عبادات مساوات اور اخوت کا سبق دیتی ہیں۔

خدا کا گناہ معاف کرنا:۔

معترض لکھتا ہے کہ یہ مسئلہ کہ خدا معاف کر کے قیامت کے دن انصاف کرے گا تو خدا کو گناہ کا فروغ دینے والا قرار دینا ہے۔
گناہ روحانی بیماری ہے اس دنیا میں اس بیماری کو دور کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے یہ علاج مقرر کیا ہے کہ گناہ سے توبہ کی جائے اور اللہ سے اقرار کیا جائے کہ آئندہ وہ گناہ دوبارہ نہیں کیا جائے گا۔ دوم عبادات بجالائی جائیں یہ عبادات انسان کو نیک راستہ سے آگاہ کرتی ہیں جب انسان نیک راستہ پر گامزن ہو جاتا ہے تو وہ فلاح پالیتا ہے اور بدی کے اثرات ختم ہو جاتے ہیں۔ ہر مذہب نے بدی سے بچنے کا یہی طریقہ بتایا ہے۔ جس طرح اللہ تعالیٰ نے جسمانی بیماری کی شفا جڑی بوٹیوں میں رکھ دی ہے۔ بیماری کی مناسبت سے جو جڑی بوٹی استعمال کی جائے گی وہ بیماری دور ہو جائے گی بعینہٖ اللہ تعالیٰ نے روحانی بیماریوں کا علاج بھی مقرر کیا ہے وہ ہے توبہ استغفار، ذکر الٰہی اور عبادات یہی خدا کا فضل ہے کہ جب اس کا بندہ اپنی جہالت سے کوئی گناہ کر لیتا ہے تو اس کا علاج بھی اللہ تعالیٰ نے مقرر کر دیا ہے اگر وہ اس علاج کو عمل میں لائے تو اللہ تعالیٰ اس روحانی بیماری کو شفا دے دے گا۔ اسی طرح جب انسان مر کر خدا کے سامنے پیش ہوگا تو اللہ تعالیٰ گناہ گار کی روحانی بیماری کو دور کرنے کے لیے دوزخ (ہسپتال) میں رکھے گا تاکہ اس بیمار کی بیماری کا علاج ہو جائے دوزخ انسان کی روحانی بیماری کی علاج گاہ ہے۔ جب انسان کی بیماری دور ہو جائے گی اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے اس بیمار کو دوزخ سے نکال لے گا اور جنت میں داخل کر دے گا۔
جنت میں وہ لوگ جاتے ہیں جو روحانی بیماریوں سے پاک صاف ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ گناہ کو معاف کر کے گناہ کو فروغ دینے والا نہیں بلکہ گناہ انسان اپنی جہالت کی وجہ سے کرتا ہے۔ جب کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے بندہ کو یہ تعلیم دی ہے اے میرے بندے جس نے اپنی جان پر ظلم کیا ہے وہ ناامید نہ ہو بلکہ اس راستہ پر گامزن ہو جو اس گناہ کے بداثرات کو دور کرنے والا ہے وہ راستہ توبہ و استغفار کا ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کی صفت غفاریت ہے جس کے تحت اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کے گناہ معاف کرتا ہے اللہ تعالیٰ گناہوں کو فروغ نہیں دیتا بلکہ اپنے فضل سے بندے کے گناہوں کے بداثرات سے بچاتا ہے جس طرح جسمانی بیماریوں کا علاج مقرر کیا گیا ہے اسی طرح روحانی بیماریوں کا علاج ہے علاج بیماریوں کو فروغ نہیں کرتا بلکہ بیماریوں کو ختم کرتا ہے اگر سوامی جی عفو کی فلاسفی کو نہ سمجھیں تو اس میں اسلام کا قصور نہیں بلکہ سوامی جی کی اپنی لاعلمی ہے۔

......☆......

اللہ اپنے منہ میاں مٹھو، عصا موسیٰ، عرش کی حقیقت، قرآن میں مکررات اور تضاد پر اعتراض

اعتراض: ''اور دیکھیے وہ اپنے منہ میاں مٹھو'' اپنے ہی منہ سے اللہ اپنے آپ کو بڑا زبردست بتلاتا ہے کیا اپنے منہ سے اپنی تعریف کرنا خدا کے شایاں ہے۔ ایسا تو کوئی نیک انسان بھی نہیں کرسکتا۔ قرآنی خدا بھی خوب ہے کہ اندر جال کا تماشا دکھا کر جنگلی لوگوں کو اپنے بس میں کرلیا ہے اگر وہ عرش عظیم کا مالک ہے تو وہ ایک جگہ مقیم ہونے سے خدا ہی نہیں ہوسکتا اگر سرکشی کرنا برا ہے تو خدا اور محمد جس نے اپنی تعریفوں میں کتاب کے صفحے کے صفحے کیوں سیاہ کرڈالے محمد صاحب نے بے شمار لوگوں کا خون کیا یہ سرکشی میں داخل نہیں؟ قرآن مکرر سہ مکرر باتوں اور اجتماع ضدین سے بھرا پڑا ہے (ستیارتھ پرکاش اعتراض 119)

جواب: یہ اعتراض کئی جزوی اعتراضات پر مشتمل ہے۔ اور حسب ذیل آیات پر اعتراضات وارد کیے گئے ہیں۔

1- يَامُوْسٰى اِنَّهٗ اَنَا اللّٰهُ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ (النمل 9:27) اے موسیٰ میں اللہ غالب حکمت والا ہوں۔

2- وَاَلْقِ عَصَاكَ فَلَمَّا رَاٰهَا تَهْتَزُّ كَاَنَّهَا جَآنٌّ وَّلّٰى مُدْبِراً (النمل 10:27) اور اپنا عصا ڈال دے سو جب اسے ہلتا ہوا دیکھا گویا وہ چھوٹا سا سانپ ہے پیٹھ پھیر کر الٹا بھاگا۔

3- اَللّٰهُ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ (النمل 26:27) اللہ اس کے سوائے کوئی معبود نہیں بڑے عرش کا رب ہے۔

4- اَلَّا تَعْلُوْا عَلَيَّ وَاْتُوْنِيْ مُسْلِمِيْنَ (النمل 31:27) کہ میرے خلاف سرکشی نہ کرو اور فرمانبردار ہو کر میرے پاس آجاؤ۔

جزو اول:

اللہ اپنی زبردست تعریف کرتا ہے اپنے منہ میاں مٹھو۔

معترض نے اللہ کی صفات حسنہ کو اپنی تعریف قرار دیا ہے ان صفات میں اللہ تعالیٰ کا بنی نوع انسان کے لیے ایک پیغام ہے وہی صفات حسنہ اس کائنات میں جاری وساری ہیں انہی صفات کے تحت ہر چرند پرند اور انسان زندگی بسر کر رہے ہیں وہ صفات انسانی حیات کا سرچشمہ ہیں۔ اگر ان صفات کو دنیا سے ختم کردیا جائے تو دنیا ہی ختم ہوجائے صفات الٰہیہ پر ہی نظام جسمانی کا دارومدار ہے۔ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کی جن ننانوے صفات کا ذکر ہے انہی صفات کا ظہور اس کائنات میں ہے صفت ربوبیت کا ظہور ہے ہر طرف ربوبیت کا سامان موجود ہے۔ زمین ہے، آسمان ہے، پہاڑ ہیں، دریا ہیں، سمندر ہیں، سورج ہے، چاند ہے، ستارے ہیں، پانی ہے وغیرہ یہ تمام اشیاء اللہ کی ربوبیت کا پرتو ہیں۔ انہی سے زندگی کا دارومدار ہے کہیں صفت رحمانیت اور صفت رحیمیت کا ظہور ہے کہیں صفت غفاریت جلوہ گر ہے کہیں صفت رؤفیت جلوہ افروز تمام کائنات کی پیدائش صفت خالقیت اور بدیعت کا عکس ہے انہی صفات کے ذریعے معرفت الٰہیہ ہوتی ہے یہی وجہ ہے اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں اسماء کا بار بار ذکر کیا ہے تاکہ انسان خدا کے حسن واحسان پر اطلاع پائے اور اس کے دل میں خدا کی محبت پیدا ہو کیونکہ

انسان کی فطرت میں ہے جب بھی کوئی حسین چیز دیکھتا ہے تو اس کا دل اس کی طرف مائل ہو جاتا ہے اسی طرح جب کسی انسان پر کسی کا احسان ہوتا ہے تو انسان طبعی طور پر اپنے محسن سے محبت کرنا شروع کر دیتا ہے۔ یہ تمام صفات اللہ کے حسن اور احسان کو ظاہر کرتی ہیں الغرض صفات سے اللہ تعالیٰ کا اپنی تعریف کرنا مقصود نہیں بلکہ انسان کی راہنمائی کی ہے کہ وہ اللہ کی صفات کا دنیا میں عملی ظہور اور پرتو دیکھیں کہ ان صفات کے تحت انسان کی بھلائی کے لیے کیا کچھ ہو رہا ہے اور کیا کچھ ہو چکا ہے کائنات کی ہر چیز اللہ کی صفات کا پرتو ہے انہی صفات کی وجہ سے وجود میں آئی ہیں۔ دنیا کے تمام مذاہب کی کتب میں کچھ نہ کچھ صفات پائی جاتی ہیں۔ قرآن مجید میں ان تمام صفات کا ذکر ہے جن کا ظہور اس کائنات میں ہو چکا ہے یا ہو رہا ہے معترض صفات الٰہیہ کے فلسفہ کو ہی نہیں سمجھا اپنی کم عقلی اور نادانی سے ان صفات کو اپنی تعریف کر دیا ہے۔

جزو ثانی (عصا موسیٰ) اس اعتراض پر بحث سیرت سید البشر کے حصہ سوم میں گزر چکی ہے اعادہ کی ضرورت نہیں۔

جزو ثالث:

(عرش کی حقیقت) اس اعتراض کا جواب بھی سیرت سید البشر کے حصہ سوم میں دیا جا چکا ہے۔

جزو رابع:

محمد صاحب نے خون بہایا۔ اعتراض ہر معترض نے کیا ہے اس اعتراض کا جواب سیرت سید البشر حصہ اول حصہ دوم اور حصہ سوم میں دیا جا چکا ہے اس موضوع پر اس کتاب میں بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ جنگی ہتھیار مظلوموں نے ظالموں کے خلاف اٹھائے تھے اسلام نے تمام ظالمانہ حربی قوانین کو منسوخ کیا اور وہ راستہ اختیار کیا۔ جس پر چل کر قتل انسانی رک جائے یہی وجہ ہے کہ مسلمانوں کی دفاعی جنگوں میں لوگ بہت کم مارے گئے تھے۔

جزو خامس۔ قرآن مجید میں مکررات اور تضاد:

قرآن مجید کسی ضرورت کے تحت کسی مضمون کو دہراتا ہے۔ انسان کو ذہن نشین کرانے کے لیے دلائل اور واقعات کو مکرر بیان کیا گیا ہے۔ انہی مکررات سے انسان کی راہنمائی کی جاتی ہے۔ قرآن مجید میں جس جگہ بھی کسی واقعہ کو مکرر بیان کیا گیا ہے عقل سلیم خود فیصلہ کرتی ہے کہ انسانی ہدایت کے لیے اس واقعہ کا دہرایا جانا ضروری ہے۔ جن واقعات کو معترض مکرر سہ مکرر کہتا ہے وہ مکرر نہیں بلکہ ان واقعات میں نئے اسرار اور رموز بیان کیے گئے ہیں۔ جب یہ قرآن مجید عربوں کے سامنے بطور اعجاز پیش کیا گیا تو کسی نے واقعات کے مکرر ہونے کا اعتراض نہیں کیا تھا۔ بلکہ اس کی مثل نہ لا سکے اور عرب کے فصحاء اور بلغاء نے اپنی بے بسی اور کم مائیگی کا اظہار کیا یہ اعتراض وہی شخص کرتا ہے جو قرآن مجید کے اچھوتا طرز بیان سے ناواقف ہے۔

الزامی جواب: اگر ہندو دھرم کے ویدوں کا مطالعہ کیا جائے تو ان ویدوں میں مکررات کی بھرمار ہے رگ وید میں 1900 مکررات ہیں رگ وید کا منڈل 9 پورا سام وید میں دہرایا گیا ہے اتھروید کا 2/3 اور یجروید کا 1/3 مکررات سے بھرا ہوا ہے۔ جس قدر لفظی معنوی اور عبارات کا تکرار وید میں موجود ہے اس قدر تکرار کسی مذہبی کتاب میں نہیں۔ رہا سوال تضاد کا قرآن مجید میں کہیں بھی تضاد نہیں۔ مسٹر بلوم فیلڈ کی کتاب مکررات رگوید (Rigvedas Repetitions) پڑھ لی ہوتی تو معترض اعتراض نہ کرتا۔

......☆......

بادلوں کی مانند پہاڑوں کا رواں ہونا کیسے ممکن ہے
باغی شیطان کو سزا نہ دینا یا گرفتار نہ کرنا

اعتراض: بادلوں کی مانند پہاڑوں کا رواں ہونا قرآن کے مصنف کے ملک میں ہوتا ہوگا اور خدا کا خبردار ہونا باغی شیطان کو گرفتار نہ کرنے اور اسے سزا نہ دینے سے عیاں ہے (ستیارتھ پرکاش اعتراض 120)

جواب: یہ اعتراض قرآن مجید کی اس آیت پر کیا گیا ہے وَتَرَى الْجِبَالَ تَحْسَبُهَا جَامِدَةً وَّهِيَ تَمُرُّ مَرَّ السَّحَابِ (النمل 88:27) اور تو پہاڑوں کو دیکھتا ہے تو انہیں جمے ہوئے سمجھتا ہے اور وہ بادلوں کی طرح چلیں گے۔

معترض کو یہ علم ہونا چاہیے تھا کہ زمین حرکت کر رہی ہے جب زمین حرکت میں ہے تو لازمی طور پر جو تمام اشیاء زمین پر ہیں وہ لازمی طور پر حرکت میں ہوں گی۔ یہی بات بیان کی گئی ہے کہ بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ پہاڑ جامد ہیں۔ لیکن زمین کی حرکت کی وجہ سے وہ بھی حرکت میں ہیں لیکن اپنی جگہ پر قائم ہیں یہی قدرت کاملہ ہے۔ ہر چیز زمین کے ساتھ حرکت میں ہے۔ لیکن وہ اپنی جگہ مضبوط معلوم ہوتی ہے نظام کائنات میں کوئی بگاڑ پیدا نہیں ہوتا اس طرف اللہ تعالیٰ نے توجہ دلائی ارشاد الٰہی ہے صُنْعَ اللّٰهِ الَّذِي أَتْقَنَ كُلَّ شَيْءٍ (النمل 88:27) یہ اللہ کی صنعت گری ہے جس نے ہر چیز کو مضبوط بنایا۔ یعنی زمین حرکت میں ہے اس کے باوجود ہر چیز اپنی جگہ پر مضبوط ہے۔ یہی اللہ کے وجود پر ایک دلیل قاطعہ ہے یہی قدرت کاملہ ہے جس کا اظہار اس آیت میں کیا گیا ہے۔

الزامی جواب: یہ تو وید کا مسئلہ ہے کہ زمین ساکن ہے اور بیل نے اسے اٹھایا ہوا ہے۔ سوامی جی نے اس منتر کا حوالہ ستیارتھ پرکاش میں ”زمین کس کے سہارے قائم ہے“ کے زیر عنوان رگ وید منڈل 10 سوکت 31 منتر 8 میں دیا ہے وید کے الفاظ یہ ہیں اُکشا سا دیا واپر تھویم بھرتی یعنی بیل نے اٹھا رکھا ہے زمین کو اور آسمان کو اتھر و وید کانڈ 4 سوکت 11 منتر میں ہے۔

انڈوان و ادھار پرتھویم اُت دیام

”بیل نے اٹھا رکھا ہے زمین کو اور آسمان کو

ایک جگہ اُکشا اور دوسری جگہ انڈوان لا کر وید نے واضح کر دیا ہے کہ اس کے نزدیک فی الواقعہ بیل نے زمین آسمان اٹھا رکھا ہے کیونکہ یہ دونوں الفاظ مترادف ہیں۔

پہاڑوں کے اڑنے سے مراد:-

قرآن مجید میں پہاڑوں کے بادل کی مانند اڑنے سے مراد مضبوط سلطنتوں کا اڑ جانا اور سرکش مخالفوں کی ناکامی و نامرادی ہے یہ ایک خوبصورت استعارہ ہے عموماً مضبوط چیز کو پہاڑ کے ساتھ تشبیہ دی جاتی ہے۔

باغی شیطان:

(حق اور باطل کی جنگ) اللہ کے قانون کے مطابق حق اور باطل کی جنگ جاری ہے جب تک دنیا میں حق موجود ہے باطل قوتیں بھی قائم رہیں گی۔ اللہ بالکل خبردار ہے۔ باغی شیطان (باطل قوتیں) کو حق کے بالمقابل اپنے قانون کے تحت آزاد چھوڑا ہوا ہے اور

یہ بھی بتایا ہے کہ ہمیشہ باطل قوتوں کے بالمقابل حق ہی غالب رہا ہے۔حق اور باطل کی جنگ تا ابد جاری رہے گی۔انسان کی جزا و سزا اسی جنگ میں ہے۔جو شخص حق کا ساتھ دے گا وہ جزا پائے گا اور جو شخص باطل قوت (باغی شیطان) کا ساتھ دے گا وہ سزا کا مستحق ٹھہرے گا۔حق کی وضاحت اور تمیز کے لیے اللہ تعالیٰ نے انسان کو عقل سلیم دے رکھی ہے اس کے ساتھ انبیاء علیہم السلام کا سلسلہ جاری کیا تھا۔ان پر احکام نازل کیے جو یہ بتاتے ہیں کہ حق کیا ہے۔اس کا ساتھ دینے کا کیا فائدہ ہے اس کے برعکس یہ بھی بتایا ہے کہ جو شخص باغی شیطان (طاغوتی طاقت) کا ساتھ دے گا۔وہ گھاٹا کھائے گا اور خدا کی سزا کا مستحق ٹھہرے گا۔اس کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے انسان کو مختار بنایا ہے جو چاہے راستہ اختیار کرے اس دنیا میں بھی اور قیامت کے دن اسی چیز کا حساب کتاب ہوگا۔

......☆......

حضرت موسیٰ علیہ السلام قاتل تھے

اعتراض: اب مسلمانوں اور عیسائیوں کے پیغمبر موسیٰ اور خدا کی رحم دلی کا حال دیکھیے موسیٰ ایک شخص کا خون کرتا ہے اور خدا معاف کر دیتا ہے کیا انصاف اسی کا نام ہے کیا خدا اپنی مرضی سے ہی جیسا چاہتا ہے پیدا کرتا ہے؟ ایسی صورت میں تو وہ خدا ہی نہیں اور جس کتاب میں ایسے خدا کا ذکر ہے وہ کلام اللہ نہیں ہوسکتی۔کیا اپنی مرضی سے ہی کسی کو شاہ اور کسی کو گدا اور کسی کو عالم اور کسی کو جاہل بنا دیتا ہے (ستیارتھ پرکاش اعتراض 121)

جواب: یہ اعتراض اس آیت پر ہے فَوَكَزَهٗ مُوْسٰى فَقَضٰى عَلَيْهِ الخ (القصص 15:28) پس موسیٰ نے اسے مکا مارا اور اس کا کام تمام کر دیا۔

ایک قبطی کی حضرت موسیٰ علیہ السلام سے موت:

قرآن مجید میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی زندگی کا ایک واقعہ بیان کیا ہے جس میں پڑھنے والوں کے لیے بہت سبق ہیں۔واقعہ یہ ہے کہ بنی اسرائیل فرعونیوں کے غلام تھے۔ان سے بیگار لیتے اور ان پر ظلم کرتے یہاں تک کہ بادشاہ اس غلام قوم کے بیٹوں کو مروا دیتا اور بیٹیوں کو زندہ رکھتا۔اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت کاملہ سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو فرعون سے بچالیا۔یہاں تک ان کی پرورش بادشاہ کے گھر ہوئی۔فرعون نے نامعلوم کتنے معصوم بچے مروائے مظلوموں کی آہ و بکا نے خدا کے رحم اور غضب کو کھینچا اور ان کو غلامی اور ظلم سے نجات دینے کا بندوبست کیا۔حضرت موسیٰ ہر روز اپنی ہم قوم اسرائیلیوں پر ظلم اور جور کے واقعات دیکھتے ایک روز حضرت موسیٰ نے اپنے مظلوم بھائی اسرائیلی کو ایک مصری قبطی مارتے دیکھا۔مظلوم اسرائیلی نے حضرت موسیٰ کو دیکھ کر اپنی جان بچانے کی فریاد کی اور حضرت موسیٰ اپنے مظلوم بھائی کی مدد کے لیے آگے بڑھے۔مظلوم کو ظالم سے نجات دلانے میں دھنگا مشتی ہوگئی اور حضرت موسیٰ کے ایک مکا سے قبطی مرگیا۔اس تمام واقعہ سے صرف یہ معلوم ہوتا ہے کہ مظلوم کو بچانے کے لیے حضرت موسیٰ آگے بڑھے اور باہمی دینگا مشتی سے حضرت موسیٰ کی ایک ضرب سے ظالم جاں بحق ہوگیا اس میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کا قتل کرنے کا کوئی ارادہ نہیں۔صرف مظلوم کی مدد کرنا اور اس کو بچانا مقصود تھا۔اس

قسم کے واقعات عموماً ہوتے رہتے ہیں کہ ایک معمولی ضرب کبھی ایسی جگہ لگ جاتی ہے جس سے آدمی کی جان چلی جاتی ہے اس قسم کی دھنگا مشتی میں ضرب لگنے سے کوئی شخص مرجاتا ہے تو مارنے والے کو قاتل نہیں کہا جاسکتا۔ قبطی شخص کی موت اس کے اپنے شیطانی عمل سے ہوئی کہ وہ اپنے آپ کو حاکم اور اسرائیلی کو محکوم سمجھ کر مار رہا تھا۔ اسرائیلی کو مارنا خود شیطانی عمل تھا۔ اس شیطانی عمل کی وجہ سے وہ شخص مارا گیا جس میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کا کوئی قصور نہیں تھا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے خود کہا اِنِّی ظَلَمْتُ نَفْسِی فَاغْفِرْلِی فَغَفَرَلَہٗ

مگر حضرت موسیٰ نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی اے میرے رب میں نے اپنی جان پر ظلم کیا ہے کہ میں مصر میں زندگی بسر کررہا تھا۔ محض مظلوم کو بچانے کے لیے مظلوم کی مدد کی۔ اس کے نتیجہ میں ظالم مرگیا۔ میری نیت مظلوم کی حمایت اور مدد کرنا تھی نا کہ ظالم کو جان سے مارنا اب میری دست گیری فرما لیکن اللہ نے دعا سنی دوسرے ملک میں نکل جانے کا موقعہ مل گیا۔

اس تمام واقعہ میں کہیں بھی یہ معلوم نہیں ہوتا کہ حضرت موسیٰ قاتل تھے اس واقعہ میں ایک اعلیٰ درجہ کا سنہری سبق ملتا ہے کہ انسان کو مظلوم کی مدد کرنی چاہیے۔ ظالم کے ہاتھ کو ظلم سے روکنے سے معاشرہ میں امن قائم ہوتا ہے۔ معاشرہ میں امن قائم کرنے کا ایک بہترین سبق ہے مظلوم کی مدد کرنے کی یہ بہترین مثال ہے افسوس معترض کی نظر سے جو اعلیٰ سبق تھا او جھل ہوگیا ہے اور وہ نتیجہ نکالا جو اس واقعہ سے ظاہر ہوتا ہی نہیں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قتل کرنے کی نیت ہی نہیں تھی۔ لیکن بغیر عمد قتل ہوگیا حضرت موسیٰ علیہ السلام اس فعل پر بھی نادم ہیں اور خدا سے بخشش طلب کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے مخلص بندے کی یہی نشانی ہے اللہ تعالیٰ جو دلوں کے بھیدوں کو جاننے والا ہے وہ اپنے بندے کے گناہ معاف کردیتا ہے گناہ کا معاف کرنا اللہ کی صفت غفاریت کا نتیجہ ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنی اس صفت کے تحت اپنے گناہ گار بندے کے گناہ معاف کردیتا ہے۔ جو اس کے آستانہ پر گر دعا کرتا ہے اور اپنے گناہ پر نادم ہوتا ہے۔ وہ خدا ہندو دھرم کا نہیں جو کسی کے گناہ معاف نہیں کرتا۔ اس وجہ سے گناہ گار کو اپنے گناہ کی بخشش کے لیے مختلف جونوں میں گزرنا پڑتا ہے۔ گناہ گار کبھی سور کی شکل اختیار کرلیتا ہے کبھی کتے کی۔ کبھی گائے بھینس یا کسی اور جانور کی۔ الغرض گناہ گار کو مختلف جونوں میں گزر کر ہی گناہ سے معافی ملتی ہے لیکن اسلام کا خدا اپنی صفت غفاریت کے تحت اس دنیا میں ہی اس شخص کے گناہ معاف کردیتا ہے جو نادم ہوکر اس کے آستانہ پر گرتا ہے اور دوبارہ گناہ نہ کرنے کا اقرار کرتا ہے اور یہی انصاف کا تقاضا ہے۔ اللہ تعالیٰ کسی پر نہ ظلم کرتا ہے اور نہ بے انصافی سے کام لیتا ہے۔

معاشرہ میں عدم مساوات:

اللہ تعالیٰ نہ کسی کو بادشاہ پیدا کرتا ہے اور نہ گداگر نہ کسی کو عالم اور نہ کسی کو جاہل بناتا ہے۔ بادشاہ کا ہونا گداگر ہونا۔ کسی کا عالم ہونا اور کسی کا جاہل ہونا معاشرہ کی پیداوار ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ہر ایک کو نفس واحدہ سے پیدا کیا ہے سب انسان جب اس دنیا میں آتے ہیں سب برابر ہوتے ہیں۔ معاشرتی زندگی اختیار کرتے ہیں تو ظالم سماج طبقاتی تقسیم پیدا کردیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ہر شخص کو قویٰ اور استعدادیں دی ہیں۔ اس کا یہ فرض ہے کہ اللہ کی عطا کردہ صلاحیتوں اور استعدادوں سے کام لے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں اِنَّ الْعِبَادَ کُلَّھُمْ اِخْوَۃٌ (اخرجہ احمد، ابوداؤد) انسان سب بھائی بھائی ہیں۔ پھر فرمایا اَلْخَلْقُ عِیَالُ اللّٰہِ (بیہقی کتاب الایمان) ساری مخلوق اللہ کی عیال ہے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا خطبہ حجۃ الوداع ہے آپؐ نے فرمایا اَیُّھَا النَّاسُ اَلَا اِنَّ رَبَّکُمْ وَاحِدٌ اِنَّ اَبَاکُمْ وَاحِدٌ اَلَا لَا فَضْلَ لِعَرَبِیٍّ عَلٰی عَجَمِیٍّ وَلَا لِعَجَمِیٍّ عَلٰی عَرَبِیٍّ وَلَا لِاَحْمَرَ عَلٰی اَسْوَدَ وَلَا لِاَسْوَدَ عَلٰی اَحْمَرَ اِلَّا بِالتَّقْوٰی (مسند احمد) لوگو! ہاں بے شک تمہارا رب ایک ہے بے شک تمہارا باپ ایک ہے ہاں عربی کو عجمی پر عجمی کو عربی پر سرخ کو سیاہ پر اور سیاہ کو سرخ پر کوئی فضیلت نہیں مگر تقویٰ کے سبب۔

اسلام کی یہ وہ روشن تعلیم ہے جس میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ پیدائشی طور پر سب لوگ برابر ہیں۔ کہیں بھی طبقاتی تقسیم نہیں یہ طبقاتی تقسیم سماج نے کی۔ منو جو ہندو دھرم کا سب سے بڑا مقنن تھا۔ اس نے سماج کو چار حصوں میں تقسیم کیا ہے برہمن کھشتری ویش، شودر پھر جب سلطنتیں وجود میں آئیں تو بادشاہوں نے اپنی حکومت کو قائم کرنے کے لیے معاشرہ کو مختلف طبقات میں تقسیم کر دیا الغرض یہ تقسیم اللہ کی پیدا کردہ نہیں بلکہ ہندو دھرم اور ظالم سماج کی پیدا کردہ ہے۔

......☆......

کیا انسان والدین کے حکم دروغ گوئی پر عمل کرسکتا ہے پیغمبر کو بھی اللہ بھیجتا ہے اور جان داروں کو بھی تو پھر دونوں نبی کیوں نہیں پہلے لوگوں کی عمر ہزار برس تھی اب کیوں نہیں؟

اعتراض: ٹھیک ہے کہ والدین کے ساتھ نیکی کرو اور ان کے کہنے سے کسی کو خدا کا شریک نہ مانو لیکن اگر والدین دروغ گوئی وغیرہ کرنے کا حکم دیں تو کیا اس وقت بھی ان کی فرمانبرداری کرنی چاہیے؟ پس والدین کے متعلق قرآنی تعلیم ادھی اچھی ہے اور ادھی بُری اگر خدا نوح وغیرہ پیغمبروں کو ہی دنیا میں بھیجتا ہے تو اور جان داروں کو کون بھیجتا ہے؟ اگر کہو سب کو خدا ہی بھیجتا ہے تو تمہارے قول کے موافق سب پیغمبر ہوگئے۔ اگر پہلے آدمیوں کی عمر ہزار برس کی تھی تو آج کل کیوں نہیں اس لیے یہ بات بالکل غلط ہے (ستیارتھ پرکاش اعتراض 122)

جواب: یہ اعتراض سورۃ العنکبوت کی ان آیات پر کیا گیا ہے ارشاد الٰہی وَوَصَّيْنَا الْإِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ حُسْنًا ......(العنکبوت 8:29) اور ہم نے انسان کو اپنے ماں باپ سے نیکی کرنے کی تاکیدی حکم دیا ہے......الخ

2- وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا نُوحًا إِلَىٰ قَوْمِهِ فَلَبِثَ فِيهِمْ أَلْفَ سَنَةٍ إِلَّا خَمْسِينَ عَامًا ......الخ (العنکبوت 29 - 14) اور ہم نے نوح کو اس کی قوم کی طرف بھیجا اور ان میں پچاس برس کم ہزار سال رہا......الخ

والدین کے جھوٹ کا حکم دینے پر کیا کیا جائے:-

معترض کی بہت ہی کم عقلی ہے جو اس آیت کی روح کو سمجھا ہی نہیں اس آیت کی روح یہ ہے کہ والدین کے ساتھ نیک سلوک کیا جائے۔ یہ ایک ایسا معاشرتی اور اخلاقی فعل ہے جس سے معاشرتی زندگی میں ایک حسن پیدا ہوتا ہے اور عائلی زندگی خوشگوار گزرتی ہے چونکہ والدین بچے کے مربی ہوتے ہیں۔ جسمانی اور روحانی تربیت کرتے ہیں اس وجہ سے یہ ضروری ہے کہ والدین کے ساتھ نیک برتاؤ کیا جائے اور اس کے ساتھ نیک کاموں میں ان کی مدد کی جائے۔ بُرے کاموں سے بیزاری ظاہر کی جائے شرک وہ فعل ہے جس کو اسلام نے سب سے بڑا گناہ قرار دیا ہے اور یہ مذہب کی روح کے منافی ہے جھوٹ بھی ایک شرک ہے کیونکہ خدا کے سوائے دوسروں کا خوف اور ڈر

جھوٹ بلواتا ہے خدا کے سوا کسی سے ڈرنا اور خوف کھانا ایک قسم کا شرک ہے لہٰذا اگر والدین کسی جھوٹ پر آمادہ کریں تو جھوٹ نہیں بولنا چاہیے دراصل آیت میں یہ تعلیم دی گئی ہے اگر والدین دین کے خلاف کسی فعل کی تعلیم دیں۔ تو اس کو نہیں ماننا چاہیے۔ والدین کا وہی حکم واجب التعمیل ہے جو شریعت کے مطابق ہو۔

نوح علیہ السلام کی عمر:۔

اس آیت میں حضرت نوح کی عمر کا ذکر نہیں بلکہ ان کی شریعت کی عمر کا ذکر ہے کہ ان کی شریعت 950 تک جاری رہی کیونکہ 952 برس بعد دوسرا عظیم الشان نبی حضرت ابراہیم علیہ السلام ہوئے۔

چونکہ اللہ ہی جان داروں کو بھیجتا ہے اس لئے وہ بھی نبی ہوئے:۔

معترض نے عجیب منطق ایجاد کی ہے چونکہ جان داروں کو اللہ ہی بھیجتا ہے انبیاء کو بھی اللہ تعالیٰ۔ اس لیے جاندار بھی نبی ہونے چاہئیں۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی صفت خالقیت کے تحت انسانوں، جان داروں (حیوانوں وغیرہ) کو پیدا کیا ہے پھر انسانوں کی ہدایت اور راہنمائی کے لیے اللہ تعالیٰ نے سلسلہ انبیاء شروع کیا۔ جب اللہ تعالیٰ نے انسانوں کی جسمانی ربوبیت کے لیے اس دنیا میں ہر چیز پیدا کی اسی طرح انسان کی روحانی تربیت کے لیے سلسلہ انبیاء جاری کیا۔ اللہ تعالیٰ ان پر اپنے احکام نازل کرتا ہے اور وہ ان احکام کو انسانوں تک پہنچاتے ہیں۔ جو ان کی فلاح اور بہبود کا سبب بنتے ہیں۔ انبیاء ایک مخصوص کام کے لیے بھیجے جاتے ہیں یہ کام جان داروں کا نہیں ہوتا۔ ان کے ذمے الگ کام ہوتے ہیں جن کو وہ سرانجام دیتے ہیں۔ نبی وہ ہوتے ہیں جو لوگوں کی ہدایت کے لیے بھیجے جاتے ہیں اور وہ وحی نبوت کے حامل ہوتے ہیں۔ معترض کو یہ سمجھ لینا چاہیے نبی وہ ہوتا ہے جس پر جبرائیل علیہ السلام وحی نبوت لے کر آتا ہے وحی نبوت صرف نبی کے لیے مختص ہے۔ لہٰذا جان دار اس دنیا میں آتے ہیں ان کا اس دنیا میں آنا ان کو نبی نہیں بنا دیتا۔ معترض یہ سمجھتا ہے کہ چونکہ جان دار بھی اللہ کی طرف سے آتے ہیں اور نبی بھی اللہ کی طرف سے لہٰذا دونوں اللہ کی طرف سے آئے ہیں اس وجہ سے جان دار بھی نبی کیوں نہیں۔ چونکہ معترض نبوت کی حقیقت سے ناواقف ہے اس وجہ سے اس نے یہ اعتراض کر دیا ہے۔ دوبارہ عرض کرتا ہوں نبی وہ ہوتا ہے جس پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے جبرائیل علیہ السلام وحی نبوت لے کر آتا ہے۔ دیگر جانداروں پر وحی نبوت نازل نہیں ہوتی وہ جاندار جس مقصد کے لیے پیدا کیے گئے ہیں وہ اس مقصد کو پورا کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی ہر پیدا کی ہوئی چیز کے مختلف کام ہیں وہ اپنے اپنے کام سرانجام دیتے ہیں۔

☆......☆

اللہ پہلی اور دوسری تخلیق کے بعد بے کار بیٹھا رہے گا جنت کی نعمتوں کے بارے میں معترض کا تمسخر دلوں پر مہر لگانا

اعتراض: اگر اللہ دوبارہ دنیا کو پیدا کرتا ہے اور تیسری بار نہیں کرتا تو پیدائش کے پہلے اور دوسری پیدائش کے بعد بے کار بیٹھا رہتا ہوگا ایک دو دفعہ پیدا کرنے کے بعد اس کی پیدا کرنے کی طاقت زائل ہو جاتی ہوگی انصاف کے دن گناہ گاروں کے مایوس ہو جانے کی بات تو اچھی ہے لیکن اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ

مسلمانوں کے سوائے اور سب گناہ گار گردانے جا کر مایوس کیے جاویں؟ کیوں کہ قرآن میں عموماً گناہ گاروں سے مراد غیر مذہب والوں سے ہے اگر باغ میں رکھنا اور سنگار کرنا ہی مسلمانوں کا بہشت ہے تو اس دنیا کی مانند ہی ہوا کیا بہشت میں باغبان اور سنار بھی ہوں گے؟ یا خدا ہی باغبانوں وغیرہ کا کام کرتا ہے کسی کو کم زیور ملنے سے وہاں چوری بھی ہوتی ہوگی اور چور دوزخ میں ڈالے جاتے ہوں گے ایسی صورت میں تو تمہارا یہ دعویٰ بہشت ہمیشہ کے لیے ہے باطل ہو جاوے گا اور خدا علم زراعت کے جانے بغیر کیوں کر کسانوں کی کھیتی پر نظر رکھ سکتا ہے اگر بفرض محال یہ مانا بھی جاوے کہ خدا خود بخود علوم سے واقفیت ہے تو پھر ایک اور اعتراض پیش آوے گا یعنی کھیتی برباد کرنے کا خوف لوگوں کو دلانا خدا کے گھمنڈ لاف زنی پر دلالت کرتا ہے اگر خدا نے انسانوں کے دل پر مہر لگا کر ان سے گناہ کروایا تو اس گناہ کا ذمہ دار خدا ہی کو ہونا چاہیے نہ کہ وہ انسان جیسا کہ فتح شکست کا ذمہ دار فوج کا جرنیل ہوا کرتا ہے نہ فوج (سیتارتھ پرکاش اعتراض 123)

جواب: مذکورہ اعتراض حسب ذیل آیات قرآنی پر کیا گیا ہے۔

1- اَللّٰهُ يَبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهٗ ثُمَّ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ (الروم 30:11) اللہ ہی پہلی بار پیدا کرتا ہے پھر اسے دوبارہ پیدا کرتا ہے پھر اسی کی طرف تم لوٹائے جاؤ گے۔

2- يَوْمَ تَقُوْمُ السَّاعَةُ يُبْلِسُ الْمُجْرِمُوْنَ (آیت 12) جب موعودہ گھڑی آئے گی مجرم سخت ناامید ہو جائیں گے۔

3- فَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَهُمْ فِيْ رَوْضَةٍ يُّحْبَرُوْنَ (آیت 51) پس وہ جو ایمان لاتے اور اچھے کام کرتے ہیں وہ سرسبز جگہ میں خوش ہوں گے۔

4- وَلَئِنْ اَرْسَلْنَا رِيْحًا فَرَاَوْهُ مُصْفَرًّا لَّظَلُّوْا مِنْۢ بَعْدِهٖ يَكْفُرُوْنَ (آیت 15) اور اگر ہم ہوا بھیجیں پھر وہ اسے زرد دیکھیں تو اس کے بعد بھی کفر کرتے ہیں۔

5- كَذٰلِكَ يَطْبَعُ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ (آیت 59)

اس طرح اللہ تعالیٰ ان لوگوں کے دلوں پر مہر لگاتا ہے جو نہیں جانتے۔

مذکورہ اعتراض پانچ جزیات پر مشتمل ہے تمسخر اڑایا گیا ہے۔ معترض اکثر اعتراضات پہلے بھی کر گزرا ہے۔ دھرم پال مصنف ترک اسلام نے بھی جنت اور دوزخ اور دلوں پر مہر لگانے کے اعتراضات کیے ہیں۔ اس کتاب میں اکثر اعتراضات کے جوابات دیئے جا چکے ہیں سلسلہ کلام کو جاری رکھنے کے لیے نہایت اختصار کے ساتھ یہاں بھی جوابات دیئے جائیں گے۔ جو تفصیل جاننا چاہتا ہے تو وہ سیرت سید البشر حصہ دوم میں اور حصہ سوم میں دیکھ لے۔

جزواوّل:

اگر اللہ دوبارہ دنیا کو پیدا کرتا ہے اور تیسری بار نہیں کرتا تو پیدائش کے پہلی اور دوسری پیدائش کے بعد بے کار بیٹھا رہتا ہوگا زیر اعتراض آیت میں دو تین بار پیدا کرنے کا ذکر تک نہیں اس آیت میں اول بار تخلیق انسانیت کا ذکر کیا ہے پھر موت کے بعد دوبارہ اٹھانے کا ذکر ہے پھر ہر ایک کو اس (خدا) کی طرف لوٹ کر جانا ہے اس آیت میں ہر انسان کو ایک عمدہ سبق دیا گیا ہے اس کی پیدائش اول کے بعد اللہ کی طرف لوٹنا ہے۔ وہ بے کار پیدا نہیں کیا گیا ہے پیدائش ثانی کے بعد وہ اللہ کے سامنے پیش ہوگا اور اپنے اعمال کا حساب کتاب دے گا۔ انسان کو بتایا گیا ہے کہ وہ اپنی زندگی عبث نہ سمجھے وہ ایک مقصد کے لیے پیدا کیا گیا ہے معترض نے اس آیت سے جو مفہوم اخذ کیا ہے وہ اس میں ہے ہی نہیں۔ اللہ کی صفت خلق اللہ کی ذات عین ہے یہ کبھی معطل نہیں ہوتی۔ جب تخلیق کا ارادہ کرتا ہے تو کن کہتا ہے تو وہ صفت خلق عمل میں آ جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نہ تھکتا ہے اور نہ بے کار ہوتا ہے۔ یہ خدا کی صفات کے منافی ہیں۔ اللہ تعالیٰ صفات حسنہ کا مالک ہے اور صفات سیئہ سے منزہ ہے۔ اس کی طرف صفات سیئہ منسوب کرنا عظیم گناہ ہے۔ زیر اعتراض آیت میں کہیں بھی ذکر نہیں کہ اللہ تعالیٰ پہلی اور دوسری تخلیق کے بعد بے کار بیٹھا رہے گا اور اس کی قوت زائل ہو جائے گی۔ یہ معترض کے ذہن کی اختراع ہے اس میں انسان کی پیدائش اور پھر اس کا خدا کی طرف لوٹ کر جانے کا ذکر ہے موجودہ انسانی دور سے قبل اللہ تعالیٰ کی صفت خلق کتنی بار ظہور میں آ چکی ہے یا موجودہ دور کے ختم ہونے کے بعد کس طرح اس کی صفت خلق ظہور میں آئے گی۔ اس کے بارے کوئی نہیں جانتا، اللہ کی صفت خلق ازل سے ہے اور ابد تک رہے گی۔ زیر اعتراض آیت میں اس دور کی تخلیق کا ذکر کیا ہے۔

جز ثانی:

مجرم خواہ مسلمان ہو یا غیر مسلم دونوں ہی انصاف کے دن مایوس ہوں گے اس میں مسلمان اور غیر مسلم کی تمیز نہیں جس نے بھی اللہ کے احکام کے خلاف زندگی بسر کی ہے وہ مجرم ہے وہ مایوس ہوگا۔

جز ثالث گناہ گار سے مراد:۔

گناہگار سے مراد قرآن مجید میں غیر مسلم ہی نہیں ہیں بلکہ مسلمان بھی ہیں۔ وہ تمام لوگ خواہ وہ مسلمان ہیں یا غیر مسلم اللہ کے احکام کی پابندی نہیں کرتے وہ گناہ گار ہیں وہ سب اللہ تعالیٰ کو اپنے اعمال کا حساب دیں گے اور ان سے باز پرس ہوگی۔

جز رابع جنت کی دنیا کے باغوں سے مراد:۔

سیرت سید البشر کے حصہ دوم زیر عنوان ایمان بالاخرت اور حصہ سوم میں مفصل بحث ہو چکی ہے یہاں اختصار کے ساتھ سلسلہ کلام کو جاری رکھنے کے لیے جنت کی توجیہہ بیان کر دی جاتی ہے یہ یاد رکھنا چاہیے بہشت اور دوزخ کی بنیاد اخلاق حسنہ اور اخلاق سیئہ کی روشنی میں اس دنیا میں پڑ جاتی ہے گویا بہشت اور دوزخ اس دنیا کے ایمان اور اعمال کے اظلال اور آثار ہیں بہشت انسان کے اس دنیا کے ایمان اور عمل کا نتیجہ اور ظل ہے اور دوزخ انسان کے اعمال سیئہ کا ظل اور نتیجہ گویا اعمال حسنہ اور اعمال سیئہ متشکل ہو کر سامنے آ جاتے ہیں وہی بہشت اور دوزخ ہیں۔ بہشت میں جن نعماء کا ذکر ہے وہ ہمارے اعمال کا پھل ہیں اور دوزخ میں جن عذاب وہ چیزوں کا ذکر ہے وہ ہمارے اعمال سیئہ کا نتیجہ بہشت کی نعماء اور اس دنیا کی نعمتوں کے ناموں میں محض اشتراک ہے۔ کیفیت اور نوعیت دونوں نعمتوں کی ایک جیسی نہیں ابن کثیر میں روایت ہے کہ جو چیزیں جنت میں ہیں وہ دنیا کی کسی چیز سے سوائے نام کے مشابہت نہیں رکھتیں قرآن مجید میں بھی اس کی صراحت کر دی گئی ہے فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّا أُخْفِيَ لَهُم مِّن قُرَّةِ أَعْيُنٍ (السجدہ 17:32) پس کوئی شخص نہیں جانتا کہ ان کے لیے کیسی

آنکھوں کی ٹھنڈک چھپا کر رکھی گئی ہے۔
صحیح بخاری میں اسی آیت کی تفسیر میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ میں نے اپنے صالح بندوں کے لیے وہ کچھ تیار کیا ہے جس کو نہ کسی انکھ نے دیکھا ہے نہ کسی کان نے سنا ہے نہ کسی شخص کے دل پر وہ گزرا ہے گویا نعما جنت کی جو کیفیت قرآن اور حدیث میں بیان کی گئی ہے وہ ظاہر کرتی ہے کہ صرف ناموں میں اشتراک ہے کیفیت اور نوعیت میں نہیں یہی حال دوزخ کا ہے لہٰذا معترض نے محض دنیا کی نعمتوں اور جنت کی نعمتوں کے ناموں میں اشتراک دیکھ کر اعتراض کر دیا ہے جنت کی نعمتوں کی نوعیت اور کیفیت وہ نیک شخص ہی جان سکتا ہے جس کو دوسری دنیا کی نعمتوں سے کسی قدر حصہ ملا ہو۔ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو جنت کی نعمتوں سے اس دنیا میں بھی آشنا کر دیتا ہے۔ بہشت کی نعمتوں کی لذت اسی شخص کے دل پر نازل ہوتی ہے جو اللہ کے احکام پر عمل پیرا ہوتے ہیں اولیاء کرام کی کتب کا مطالعہ کیجیے وہاں نمونے مل جائیں گے۔

بہشت میں چوری اور قتل:-

یہ خیال صرف معترض کے دل میں آسکتا ہے جب یہ بات ہر مذہب میں طے شدہ ہے کہ بہشت میں صرف متقی جائیں گے تو پھر وہاں کسی چور یا قاتل کا گزر کیسے۔ بہشت تو چوروں اور قاتلوں کی جگہ ہی نہیں قاتل اور چوروں کی جگہ ہی اور ہے جس کو اسلامی اصطلاح میں جہنم کہا جاتا ہے بہشت میں جس کو جو بھی نعمتیں ملیں گی۔ وہ اس کے اعمال کے مطابق ملیں گی اور وہ شخص وہ نعمتیں حاصل کر کے خوش وخرم ہوگا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل سے اس کو بہشت کی زندگی دی ہے اور اپنی نعمتوں کا وارث بنایا ہے چوری چکاری کا خیال کہاں سے آ گیا۔ بہشت تو خوشی آرام اور امن کی جگہ کا نام ہے وہاں برائی کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔

جز خامس:-

کھیتی برباد کرنے کا خوف لوگوں کو دلانا خدا کے گھمنڈ لاف زنی پر دلالت کرتا ہے زیر اعتراض آیت میں انسانوں کو ایک سنہری سبق دیا گیا ہے جو معترض کی نظر سے اوجھل ہے وہ یہ ہے اللہ کی رحمتوں کے نشانات اس دنیا میں ظاہر و باہر ہیں۔ ہر جگہ وہ پھیلے ہوئے ہیں۔ وہ لوگ جن کے دل پتھر ہو چکے ہیں اور گمراہی میں اپنی انتہا کو پہنچ چکے ہیں۔ اگر عذاب کی ہوا آئے تو بھی یہ لوگ کفر سے باز نہیں آئیں گے زرد ہوا سے مراد عذاب کی ہوا ہے یہ کفار کے کفر پر اصرار کی حالت کو ظاہر کرتی ہے۔ اس آیت میں انسانوں کو یہ بتایا ہے کہ ایمان کی ہری بھری کھیتیاں ان کی بداعمالیوں کی وجہ سے اجڑ جاتی ہے اس وجہ سے انسانوں کو اپنے ایمان کی کھیتوں کی حفاظت اعمال صالحہ سے کرنی چاہیے۔ جس طرح زرد ہوا چلتی ہے ہری بھری کھیتیاں تباہ و برباد ہو جاتی ہیں اسی طرح ایمان کی کھیتیاں بداعمالیوں کی ہوا سے تباہ و برباد ہو جاتی ہیں کیا نصیحت اموز سبق ہے جو معترض کی نظر سے اوجھل ہے۔

جز سادس عقل سے کام نہ لینا دلوں مہر ہے:-

اس اعتراض پر سیرت سید البشر حصہ سوم میں بحث گزر چکی ہے یہ اعتراض صرف سوامی دیانند نے ہی نہیں کیا بلکہ دھرم پال مصنف ترک اسلام بھی یہی اعتراض کر چکا ہے ان کے علاوہ کئی دوسرے مخالفین نے اس اعتراض کو دہرایا ہے سلسلہ کلام کو جاری رکھنے کے لیے یہاں بھی اختصار کے ساتھ جواب درج کر دیا جاتا ہے۔ امام راغب نے مفردات میں دلوں پر مہر کرنے کی تشریح یوں کی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی یہ عادت ہے کہ جو شخص اعتقاد باطل میں یا ارتکاب گناہ میں حد سے بڑھ جاتا ہے یہاں تک کہ وہ کسی طرح حق وصداقت کی طرف توجہ نہیں کرتا تو یہ اس میں ایسی کیفیت پیدا کر دیتا ہے جو اس کو گناہ اچھے سمجھنے کا عادی کر دیتی ہے گویا اس کے ساتھ اس کے دل پر مہر لگا دی جاتی

ہے اور لکھتے ہیں یہ ایسا ہی استعارہ ہے جیسے جَعَلْنَا عَلٰی قُلُوْبِهِمْ اَكِنَّةً اَنْ يَّفْقَهُوْا (الانعام 25:6) میں یا جَعَلْنَا قُلُوْبَهُمْ قَاسِيَةً (مائدہ 13:5) میں استعارہ ہے گویا خدا کا مہر لگانا اعمال کا نتیجہ ہے جب ایک انسان اپنے دل سے غور وفکر کا کام نہیں لیتا تو اس سے قوت فکر یہ سلب ہو جاتی ہے جس طرح اگر عضو سے کام لینا چھوڑ دیں تو وہ بے کار ہو جاتا ہے یہ مہر ٹوٹ بھی سکتی ہے جب وہ شخص اللہ کی طرف مائل ہو۔ اپنے کیے پر نادم ہو استانہ الوہیت پر گر کر اللہ سے گناہ نہ ارتکاب کرنے کا اقرار کرے تو اس کی مہر ٹوٹ جاتی ہے جس طرح جسمانی بیاری علاج سے دور ہو جاتی ہے اسی طرح روحانی بیاری بھی توبہ استغفار سے دور ہو جاتی ہے۔ ہندو دھرم میں روحانی بیاری مختلف جونوں میں منتقل ہونے کے بعد دور ہوتی ہے عیسائیت میں کفارہ پر ایمان لانا ضروری ہے اسلام نے گناہوں کی معافی اور دل پر مہر کے توڑنے کا ایک اصول بیان کر دیا ہے وہ ہے توبہ واستغفار اور اللہ سے گناہ دوبارہ نہ کرنے کا اقرا۔ اسی طرح جب ایک انسان گناہ کی زندگی ترک کر کے نیکی کی زندگی شروع کر دیتا ہے تو اللہ تعالیٰ گناہ گار بندے کی برائیوں کو نیکیوں میں بدل دیتا ہے انسان کا نیک زندگی اختیار کرنا ہی بدیوں کا کفارہ ہے نیکیاں بدیوں کے اثرات کو ختم کر دیتی ہیں یہ ہے گناہوں کے معاف کرنے کا اسلامی فلسفہ۔

☆......☆

آسمان کا بغیر ستون کے قائم رہنا۔ زمین کا پہاڑوں سے جکڑے رہنا دن رات کا ایک دوسرے میں داخل ہونا ناؤ کا سمندر پر چلنا (خلاف عقل اور ناممکن)

اعتراض: واہ جی واہ حکمت والی کتاب کی خوب کہی۔ تمہاری حکمت والی کتاب میں قریباً ساری کی ساری خلاف علم وعقل باتیں بھری پڑی ہیں مثلاً آسمان کا پیدا ہونا اور اس کا بغیر ستون کے قائم رہنا اور زمین کا پہاڑوں سے جکڑے رہنا وغیرہ۔ تھوڑے علم والا آدمی بھی ایسی (نامعقول باتیں) تحریر نہیں کر سکتا اور نہ ہی ایسی باتیں مان سکتا ہے قرآنی حکمت کا اور نمونہ دیکھیے کہ خدا دن کو رات میں اور رات کو دن میں داخل کرتا ہے یہ کبھی ممکن نہیں کیونکہ جہاں دن ہے وہاں رات نہیں اور جہاں رات ہے وہاں دن نہیں پھر ایک دوسرے میں داخل ہونے کا یقین سوائے جاہل مطلق کے اور کون کر سکتا ہے اور دیکھیے کیا لکھا ہے ناؤ بھی خدا کی حکمت سے چلتی ہے بتاؤ اگر لوہے یا پتھر کی ناؤ سمندر میں چلائی جائے تو وہ بھی خدا کے فضل سے چلے گی یا نہیں؟

(ستیارتھ پرکاش اعتراض 124)

جواب: یہ اعتراضات قرآن مجید کی مختلف آیات پر کیے گئے ہیں۔

1- تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ الْحَكِيْمِ (لقمن 1:31) یہ حکمت والی کتاب کی آیتیں ہیں۔

2- خَلَقَ السَّمٰوٰتِ بِغَيْرِ عَمَدٍ تَرَوْنَهَا وَاَلْقٰى فِى الْاَرْضِ رَوَاسِىَ اَنْ تَمِيْدَ بِكُمْ الخ (لقمان 10:31) اس نے آسمانوں کو بغیر ایسے ستونوں کے پیدا کیا جنہیں تم دیکھ سکو اور زمین میں پہاڑ قائم کیے تا کہ وہ تمہیں لے کر کانپے نہیں۔

3- اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ يُوْلِجُ الَّيْلَ فِى النَّهَارِ وَيُوْلِجُ النَّهَارَ فِى الَّيْلِ ...... الخ (آیت 29) کیا تو غور نہیں کرتا کہ اللہ رات کو دن میں داخل کرتا ہے اور دن کو رات میں داخل کرتا ہے؟

4- اَلَمْ تَرَ اَنَّ الْفُلْكَ تَجْرِىْ فِى الْبَحْرِ بِنِعْمَتِ اللّٰهِ لِيُرِيَكُمْ مِّنْ اٰيٰتِهٖ ...... آیت 31) کیا تو غور نہیں کرتا کہ کشتیاں سمندر میں اللہ کی نعمت لے کر چلتی ہیں تا کہ وہ تمہیں اپنے نشانوں سے دکھائے۔

جزاول: معترض نے قرآن مجید کے پُر حکمت ہونے پر تمسخرانہ انداز اختیار کیا ہے جب کہ قرآن مجید وہ کتاب ہے جو اپنی فصاحت و بلاغت اور پُر حکمت ہونے کی وجہ سے ایک معجزہ ہے جس کی نظر نہیں ملتی کوئی فصیح و بلیغ اور حکیم بھی اس کی مانند کتاب نہیں بنا سکا۔ یہ چیلنج اور پھر اس کے مقابل پر فصحاء و بلغاء اور حکما کی عاجزی اور بے بسی اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ قرآن مجید پُر حکمت کتاب ہے اگر معترض اپنی نا سمجھی اور کم عقلی کی وجہ سے ان پُر حکمت باتوں کو نہ سمجھ سکے تو قرآن مجید کا کیا قصور قرآن مجید ایک پُر حکمت کتاب ہے معترضین کو غور وفکر سے کام لینا چاہیے جب غور وفکر سے کام لیں گے تو حکمت کے موتی چمکتے ہوئے ان کے سامنے آ جائیں گے۔ قرآن مجید کی حکمت کا ہی یہ کرشمہ ہے اس مقدس کتاب کی وجہ سے دنیا میں ہر قسم کے علوم نے جنم لیا جس کے بانی مسلمان تھے۔ مسلمانوں کی پُر حکمت کتابوں نے دنیا میں علم کی شمع روشن کی آج تمام دنیا علم کی روشنی سے منور ہو چکی ہے۔ قرآن مجید کا اپنی پُر حکمت باتوں کے متعلق یہ دعویٰ ہے اگر جو درخت زمین میں ہیں سب قلمیں بن جائیں اور سمندر سیاہی ہو۔ اس کے بعد سات سمندر اور ہوں تو اللہ کی پُر حکمت باتیں ختم نہ ہوں گی۔ (لقمان 27:31)

جز ثانی:

آسمان کا بغیر ستون کے قائم رہنا اور زمین کا پہاڑوں سے جکڑے رہنا۔ یہ اعتراض بھی کئی معترضین نے کیا ہے۔ سوامی جی بھی پہلے یہ اعتراض کر چکے ہیں اور جواب دیا جا چکا ہے۔

جز ثالث:۔ رات کا دن میں داخل ہونا اور دن کا رات میں داخل ہونا:

زیر اعتراض آیت میں یہ بیان کیا ہے کہ کس طرح اللہ تعالیٰ نے زمین کی حرکت سے دن رات پیدا کیے ہیں رات کا دن میں داخل ہونا اور دن کا رات میں داخل ہونے سے مراد دن اور رات کا نمودار ہونا ہے جب رات ختم ہوتی ہے تو دن ظاہر ہو جاتا ہے اور جب زمین کی گردش سے دن ختم ہوتا ہے تو رات چھا جاتی ہے قرآن مجید نے اس مضمون کو اختلاف الیل والنھار کے الفاظ سے بھی بیان ہے یعنی دن رات ادل بدل سے آتے ہیں۔ رات کا دن میں داخل ہونے سے مراد یہ ہے کہ جب رات ختم ہوتی ہے تو دن شروع ہو جاتا ہے اسی طرح جب دن رات میں داخل ہوتا ہے تو رات شروع ہو جاتی ہے رات کا دن میں اور دن کا رات میں داخل ہونے کا دوسرا مفہوم یہ ہے کہ کبھی دن چھوٹا اور کبھی رات چھوٹی ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے خوب صورت انداز میں دن رات کے آغاز اور اختتام کا ذکر کیا ہے دن رات کے ادل بدل میں ایک سنہری سبق دیا گیا ہے کہ حالات ایک جیسے نہیں رہتے بلکہ بدلتے رہتے ہیں۔ اگر آج مصائب ہیں تو سکھ کے دن بھی آئیں گے۔ اگر سکھ کے دن ہیں تو دکھ کے دن بھی آئیں گے۔ دنیا تغیر میں ہے۔ انسان کو اس تغیر پر توجہ دینی چاہیے اور سبق حاصل کرنا چاہیے تاریخ بھی یہ گواہی دیتی ہے کہ کبھی ایک قوم پر ترقی کا سورج روشن ہوتا ہے تو دوسری قوم پر تنزل کا اندھیرا ہوتا ہے۔ قومیں عروج و زوال کا شکار رہتی ہیں۔ انسان عروج و زوال کا شکار رہتے ہیں خاندان عروج و زوال کا شکار رہتے ہیں۔ یہ سبق اس آیت سے ملتا ہے جس پر

معترض نے اپنی نادانی سے اعتراض کیا ہے۔

جز رابع ۔کشتیوں اور جہازوں کا سمندر میں چلنا:

زیر اعتراض آیت کو معترض نے سمجھنے کی کوشش ہی نہیں کی اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ کشتیاں اللہ کی نعمتوں کو لے کر سمندروں کے سینوں کو چیر کر اپنی منازل تک پہنچ جاتی ہیں اور لوگ ان نعمتوں سے فیض یاب ہوتے ہیں۔کیا کشتیوں اور جہازوں میں اللہ کی نعمتیں بھری ہوئی نہیں ہوتیں کیا انسان ان سے فائدہ نہیں اٹھا رہا ہے۔

جز خامس ۔اجرام فلکی کا بغیر ستون کے قائم ہونا:۔

اللہ تعالیٰ نے کشش ثقل سے دنیا اور تمام اجرام فلکی کو اپنی اپنی جگہ پر قائم رکھا ہوا ہے اور وہ مضبوطی سے جمے ہوئے ہیں۔اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں اپنی قدرت کاملہ کا اظہار کیا ہے کہ اس نے دنیا بشمول اجرام فلکی کا نظام ایسے اصول اور قانون کے ساتھ باندھ رکھا ہے۔ اس میں ذرا بھر خرابی اور بگاڑ پیدا نہیں ہوتا ایک نظام کے تحت قائم دائم ہیں دور حاضر میں سائنس نے بھی اس بات کی تصدیق کر دی کہ تمام اجرام فلکی کشش ثقل کے اصول پر قائم دائم ہیں۔کشش ثقل ایک دوسرے کو قائم رکھے ہوئے ہے۔

الزامی جواب: جب ویدوں کا مطالعہ کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ زمین پکتے چاولوں کی ہنڈیا ہے اور آسمان ڈھکنا ہے پہاڑ دونوں کے بیچ ستون ہیں اور زمین بیل کے سینگوں پر کھڑی ہے کیا اس قسم کی نامعقول اور سائنس کے منافی باتوں کو عقل تسلیم کر سکتی ہے قرآن مجید نے تو انسان کی توجہ اجرام فلکی کی طرف مبذول کروائی ہے کہ یہ تمام تخلیق کس طرح قائم ہے تو انسان نے ان کے قائم رہنے کی وجہ معلوم کر لی۔قرآن مجید نے سائنسی معلومات کا راستہ کھولا ہے جب کہ ویدآسمان اور زمین کے متعلق بالکل لایعنی باتیں بیان کر رہا ہے۔

☆......☆

محمدی خدا ایک جگہ مقیم ہے اگر فرشتے رشوت لے کر کوئی معاملہ بگاڑ دیں...... اللہ لوگوں کو ہدایت نہیں کر سکتا دوزخ کو ان سے بھرتا ہے انہیں ازار پہنچا کر خود تماشہ دیکھتا ہے

اعتراض: اب یہ بات پایہ ثبوت کو پہنچ گئی ہے کہ محمدی خدا انسان کی طرح ایک خاص جگہ مقیم ہے ورنہ کسی ایک مقام پر خدا کا تدبیر کرنا اور کام کا اس کی طرح چڑھ جانا کیونکر ممکن ہوتا؟ اگر خدا فرشتے بھیجتا ہے تو بھی اس کا ایک جگہ مقیم ہونا عیاں ہے کیونکہ آسمان پر لٹکتا رہتا ہوگا اور فرشتے دوڑاتا ہوگا اگر فرشتے رشوت لے کر کوئی معاملہ بگاڑ دیں یا کسی مردے کو چھوڑ جائیں تو خدا کو اس امر کی کیا خبر ہو سکتی ہے؟ وہ کوئی حاضر و ناظر اور ہمہ دان تھوڑا ہی ہے پھر ایک ہزار برس کا عرصہ کام میں لگ جانا اور خدا کا اوپر نیچے آجا کر انتظام کرنے کی ضرورت کا ہونا ظاہر کرتا ہے کہ وہ قادر مطلق بھی نہیں اگر ملک الموت کے ہاتھ میں لوگوں کی موت ہے تو ملک الموت کی کس کے ہاتھ میں ہے؟ اگر وہ غیر فانی ہے تو بلاشبہ وہ خدا کا شریک ہوا پھر

دیکھیے خدا آدمیوں کو ہدایت تو کر نہیں سکتا لیکن اپنی مرضی سے دوزخ کو ان سے بھرتا ہے اور انہیں ازار پہنچا کر خود تماشہ دیکھتا ہے کیا خدا کے یہی لچھن (اوصاف) ہیں اور کیا جو کتاب کہ ایسی خدا کی تعلیم دے وہ کلام اللہ ہو سکتی ہے (سیتارتھ پرکاش اعتراض 125)

جواب: یہ اعتراض بھی کئی اجزاء پر مشتمل ہے بعض اجزا ایسے بھی ہیں جن کو دہرایا گیا ہے وہ آیات جن کو موردِ اعتراض بنایا گیا ہے وہ یہ ہیں۔

1- يُدَبِّرُ الْاَمْرَ مِنَ السَّمَآءِ اِلَى الْاَرْضِ ثُمَّ يَعْرُجُ اِلَيْهِ فِىْ يَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهٗ اَلْفَ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ (السجدہ 5:32) وہ اس امر کی تدبیر آسمان سے زمین کی طرف کرتا ہے پھر وہ اس کی طرف چڑھ جائے گا ایک دن میں جس کا اندازہ ایک ہزار سال ہے اس سے جو تم گنتے ہو۔

2- ثُمَّ سَوّٰىهُ وَنَفَخَ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِهٖ وَجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْئِدَةَ قَلِيْلًا مَّا تَشْكُرُوْنَ (آیت 9)
پھر اسے ٹھیک بنایا اور اپنی روح اس میں پھونکی اور تمہارے لیے کان اور آنکھیں اور دل بنائے بہت کم تم شکر کرتے ہو۔

3- قُلْ يَتَوَفّٰىكُمْ مَّلَكُ الْمَوْتِ الَّذِىْ وُكِّلَ بِكُمْ ثُمَّ اِلٰى رَبِّكُمْ تُرْجَعُوْنَ (آیت 11) کہہ موت کا فرشتہ تمہاری روح قبض کرتا ہے جو تم پر مقرر کیا گیا ہے پھر تم اپنے رب کی طرف لوٹائے جاتے ہو۔

4- وَلَوْ شِئْنَا لَاٰتَيْنَا كُلَّ نَفْسٍ هُدٰىهَا وَلٰكِنْ حَقَّ الْقَوْلُ مِنِّىْ لَاَمْلَئَنَّ جَهَنَّمَ مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ اَجْمَعِيْنَ (آیت 13) اگر ہم چاہتے تو ہر شخص کو اس کی ہدایت دے دیتے لیکن میری طرف سے بات سچی ہوئی میں ضرور دوزخ کو جنوں اور انسانوں سب سے بھر دوں گا۔

جز اول اللہ تعالیٰ کا ایک جگہ مقیم ہونا:-

یہ اعتراض اللہ کا کرسی پر متمکن ہونے کی وجہ سے کیا جاتا ہے معترض نے کرسی کو ترکھان کی بنائی ہوئی کرسی سمجھ رکھی ہے۔ قرآن مجید اور عربی کے محاورہ میں کرسی سے مراد علم کل اور اقتدار اعلیٰ ہیں یعنی اللہ تعالیٰ علیم وخبیر ہستی ہے ہر چیز اس کے علم میں ہے پھر اس کا ہر چیز پر اقتدار ہے۔ سیرت سید البشر حصہ سوم میں اس موضوع پر مفصل بحث کی جا چکی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی خاص جگہ مقیم نہیں بلکہ قرآن مجید میں آتا ہے وَهُوَ اللّٰهُ فِى السَّمٰوٰتِ وَفِى الْاَرْضِ (الانعام 3:) یعنی اللہ زمین اور آسمان میں ہے۔

الزامی جواب:-

وید میں صاف لکھا ہے کہ ایشور جی (خدا) تیسرے آسمان پر ایک پالکی یا صندوق میں جس کے نیچے ارے اور ڈنڈے بھی آڑے ترچھے گئے ہیں برہم پوری میں کبھی مقیم تھا۔

ویدک ایشور کے ٹکڑے:-

مدت ہوئی شروع دنیا میں اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے منہ سے برہمن بازوؤں سے چھتری جانگھوں سے ویش سر سے آسمان ناف سے جو اور پاؤں کاٹ کر زمین وغیرہ بنائے گئے۔ (پرش سوکت) ویدوں میں اللہ کا یہ تصور بیان کیا گیا ہے۔ ہندوؤں علماء اس کی کیا توجیہہ کریں گے۔

جز ثانی۔ تدبیر امر:-

تدبیر کے لغوی معنی التفکیر فی دُبُرِ الْاُمُوْرِ یعنی امور کے نتائج میں فکر کرنا۔ زیر اعتراض آیت کا مفہوم واضح ہے زمین اور آسمان میں اللہ کا حکم چلتا ہے اور ہر حکم کے انجام پر اللہ کی نگاہ ہوتی ہے اس میں کسی قسم کی خرابی نہیں ہوتی وہ محکم اور مستحکم ہوتا ہے اس حکم کا

انجام وہی ہوتا ہے جو اللہ کے علم میں ہوتا ہے۔

امر کا خدا کی طرف چڑھنا:۔

جب اللہ تعالیٰ اپنا حکم نازل کرتا ہے یعنی کن کہتا ہے پھر وہ عروج کرنا شروع کر دیتا ہے خدا کی منشا کے مطابق اس کے نتائج ظاہر ہوتے ہیں یہاں یہ کہا گیا ہے کائنات علیم وخبیر مدبر ہستی نے پیدا کی ہے۔ اس میں کسی قسم کا رخنہ واقع نہیں ہوسکتا۔ اس [illegible] اللہ تعالیٰ اپنے احکام نافذ کرتا ہے ان کی تکمیل ایک دن میں اتنی ہوجاتی ہے جتنی کسی بادشاہ کے حکموں اور تدبیروں کی ہزار سال میں۔ ہزار سال تمثیلاً ہے یہ الفاظ لمبے عرصہ پر دلالت کرتے ہیں۔

جز ثالث۔ فرشتے اور رشوت:۔

قرآن مجید میں فرشتوں کے متعلق آتا ہے لَا يَعْصُونَ لِاَمْرِ اللّٰهِ وہ خدا کے حکم کی نافرمانی نہیں کرتے وہ وہی کرتے جو ان کو حکم دیا جاتا ہے يَفْعَلُوْنَ مَا يُؤْمَرُوْنَ

الزامی جواب:

ویدوں میں دیوتاؤں کا بے وقوف ہونا ثابت ہے وید میں ان کو مور دیو کہا گیا ہے (رگ وید منڈل 7 سوکت 104 منتر 24 اور 14,2:87:10 نیز اتھروید کانڈ 8 سوکت 4 منتر 24۔ وید کے ایشور سوم کے نشہ میں مست ہیں اس کے ملک الموت (یم دوت) جو چاہیں کریں چنانچہ رگ وید میں لکھا ہے۔ ''تو نے سوم پی لیا ہے اے اندر (پرماتما) گھر کو واپس آؤ، تیرا عیش تیرے جہاں تیری طبی گاڑی ٹھہرتی ہے۔'' (رگوید منڈل 3 سوکت 53 منتر 6)

جز رابع۔ اللہ کا ہدایت نہ دے سکنا اور جہنم میں ڈالنا:

یہ اعتراض سوامی جی نے اپنی کتاب میں کئی بار دہرایا ہے یہ اعتراض صرف سوامی جی کا ہی نہیں بلکہ تمام مخالفین نے کہا ہے ہر معترض کا انداز بیان اپنا اپنا ہے سیرت سید البشر حصہ سوم میں اس اعتراض پر بحث گزر چکی ہے سلسلہ کلام کو جاری رکھنے کے لیے اس حصہ میں بھی مختصراً جواب دیا جاتا ہے ہدایت کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا یہ قانون ہے کہ اس نے انسان کے سامنے نیکی اور بدی دونوں راستے واضح کر دیئے ہیں پھر اللہ تعالیٰ نے اپنے انبیاء علیہم السلام کی معرفت نیکی اور بدی میں تمیز بھی سکھادی ہے اور عقل کی نعمت سے بھی نوازا ہے کہ وہ اپنی عقل سے نیکی اور بدی میں تمیز کرے اس بارے میں انسان کو مختار پیدا کیا ہے۔ جو وہ چاہے راستہ اختیار کرے ارشاد الٰہی ہے وَقُلِ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكُمْ فَمَنْ شَآءَ فَلْيُؤْمِنْ وَّمَنْ شَآءَ فَلْيَكْفُرْ (الکہف 29:18) اور کہہ حق تمہارے رب کی طرف سے ہے سو جو کوئی چاہے ایمان لائے اور جو کوئی چاہے انکار کرے۔

اللہ کا سزا دینا:۔

اللہ نے جزا وسزا کا ایک اصول بیان کر دیا ہے وہ یہ ہے لَهَا مَا كَسَبَتْ وَعَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ (البقرہ 2: 286) اس (نفس) کے لیے ہے جو وہ اچھی کمائی کرے اور اسی پر ہے جو وہ بری کمائی کرے یعنی جزا وسزا کا انحصار اعمال حسنہ اور اعمال سیہ پر ہے اعمال کا وزن کیا جائے گا اسی کے مطابق اس کو بدلہ ملے گا۔ اگر اعمال حسنہ بھاری ہیں تو وہ انسان جنت کا وارث ہوگا اور جس کے اعمال سیہ کا وزن بھاری ہے تو وہ جہنم میں ڈالا جائے گا۔ اللہ تعالیٰ کسی جان پر ظلم نہیں کرتا کسی جان کو جہنم میں نہیں ڈالتا ہے اس کے اعمال ہی جنت اور جہنم کے وارث بناتے ہیں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وَمَا اَنَا بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيْدِ (ق 50:29) میں بندوں پر ظلم کرنے والا نہیں)

میدان جنگ سے فرار نہ ہونے کی تلقین (تا کہ محمدؐ صاحب کا اقبال بڑھے)

بیویوں کو فاحشہ مبینہ سے ممانعت (کیا محمد صاحب خود بے حیائی کریں؟)

اعتراض: یہ تحریر محمد صاحب نے اس مطلب سے کی ہوگی کہ کوئی لڑائی میں نہ بھاگے اور اپنی فتح ہو اور مرنے سے کوئی نہ ڈرے اپنا اقبال بڑھے اور مذہب پھیلے اگر عورتیں بے حیائی نہ کریں تو کیا محمد صاحب خود بے حیائی کریں یہ کس قسم کا انصاف ہے کہ عورتوں پر عذاب ہو اور محمد صاحب پر نہ ہو (سیتارتھ پرکاش اعتراض 126)

جواب: یہ اعتراض حسب ذیل آیات پر کیا گیا ہے۔

قُلْ لَّنْ يَّنْفَعَكُمُ الْفِرَارُ اِنْ فَرَرْتُمْ مِّنَ الْمَوْتِ اَوِ الْقَتْلِ وَاِذًا لَّا تُمَتَّعُوْنَ اِلَّا قَلِيْلًا (الاحزاب 16:33) کہہ تمہیں بھاگنا نفع نہیں دے گا۔ اگر تم موت یا قتل سے بھاگتے ہو اور اس صورت میں تمہیں تھوڑا سا سامان ملے گا۔

يٰنِسَآءَ النَّبِيِّ مَنْ يَّاْتِ مِنْكُنَّ بِفَاحِشَةٍ مُّبَيِّنَةٍ يُّضٰعَفْ لَهَا الْعَذَابُ ضِعْفَيْنِ وَكَانَ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرًا (الاحزاب 30:33) اے نبی کی عورتو! جو کوئی تم میں سے کھلی بے حیائی کرے اسے دو چند سزا دی جائے گی اور یہ اللہ تعالیٰ پر آسان ہے۔

جزو اول:

زیر اعتراض آیت 16 میں مجاہدین کو میدان جنگ سے فرار نہ ہونے کی تلقین کی گئی ہے۔ یہ تلقین محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے۔ اب تو یہ بات پایہ تکمیل کو پہنچ چکی ہے کہ قرآن مجید اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہی نازل ہوئی ہے اگر کوئی اپنی ضد سے نہ مانے تو یہ اس کی کم علمی ہے۔ اس میں غیب کی خبریں ہی اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ یہ علیم و خبیر ہستی کی طرف نازل کی گئی ہے۔ قرآن مجید کا خدا کا کلام ہونے کے متعلق سیرت سید البشر حصہ سوم میں مفصل بحث ہو چکی ہے۔

دنیا کا کوئی ایسا جرنیل ہے جو فوجیوں کو میدان جنگ سے بھاگنے کی نہ تلقین کرتا ہو۔ میدان جنگ سے نہ بھاگنا ہی کامیابی کی دلیل ہے۔ فوج وہی کامیاب ہوتی ہے جو میدان جنگ ثابت قدم اور بہادری سے لڑتی ہے زیر اعتراض آیت میں مسلمان مجاہدین کو ثابت قدمی کے ساتھ لڑنے کی تلقین کی گئی ہے۔ اس تلقین کا ہی یہ نتیجہ تھا کہ مسلمان مجاہدین نے اپنے سے کئی گنا زیادہ فوج کو بھی شکست دی۔ مسلمان مجاہدین کی کامیابی اسی تلقین میں مضمر ہے۔ نا معلوم سوامی جی نے کس پہلو سے اس تلقین کو قابل اعتراض سمجھا ہے یہ تو خوبی کی ہدایت ہے کہ میدان جنگ سے فرار نہیں کرنا سوامی جی نے خوبی کی بات کو قابل اعتراض گردان لیا ہے۔

جزو ثانی۔ فاحشہ مبینہ سے ممانعت:

فاحشہ مبینہ سے مراد رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی نافرمانی ہے یا ایسے امور کا ارتکاب ہے جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو تکلیف یا حزن کا باعث بن سکتے تھے۔ فاحشہ سے مراد زنا نہیں کیونکہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت میں رہنے کی وجہ سے ازواج رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے توقع ہی نہیں کی جا سکتی کہ وہ اس قسم کے گناہ کی طرف مائل ہوں بشری کمزوری کی وجہ سے کوئی ایسی بات سرزد ہو سکتی ہے جو رسول

کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے مزاج کے خلاف ہو اور وہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو تکلیف دے ہر خاوند اپنی بیوی کو یہی ہدایت دیتا ہے کہ عائلی زندگی کو بہتر بنانے کے لیے گھر میں کوئی ایسی بات نہ کی جائے جو گھر کے امن وسکون کو خراب کرے۔ گھریلو زندگی اچھی گزارنے کا بہترین لائحہ عمل ہے کہ بیوی سے کوئی ایسی حرکت سرزد نہ ہو جو خاوند کے مزاج کے منافی ہو۔ گھروں میں بعض اوقات اسی قسم کی معمولی معمولی باتوں سے لڑائی جھگڑے شروع ہو جاتے ہیں۔ اس کا انجام بھی بُرا ہوتا ہے زیر اعتراض آیت میں جو ہدایت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج مطہرات کو دی گئی ہے وہ صرف ازواج مطہرات سے ہی مختص نہیں بلکہ ہر عورت کو یہ تلقین کی گئی ہے کہ وہ کسی ایسی بات کا ارتکاب نہ کریں جو خاوند کی مرضی کے خلاف ہو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بیویوں کو دوگنا عذاب کی خبر اس لیے دی گئی ہے کہ ان کو یہ گھمنڈ نہ ہو کہ انہیں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بیویاں ہونے کی وجہ سے عذاب نہیں دیا جائے گا۔

اسلام ویدک دھرم کی طرح نہیں کہ برہمن سب کچھ کر کے بھی چھوٹ جائے بلکہ اللہ تعالیٰ خود رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہیں وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ اَهْوَاءَهُمْ مِنْ بَعْدِ مَا جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ اِنَّكَ اِذًا لَّمِنَ الظّٰلِمِيْنَ (البقرة) اگر علم (قرآن) آ جانے کے بعد تو مشرکین کی خواہشات کی پیروی کرے تو تو بھی گناہ گاروں میں سے ہوگا۔

......☆......

رسول کو ایذا نہ پہنچاؤ تو رسول کو بھی باز رہنا چاہیے۔ اللہ اور رسول کو ایذا دینا۔ اگر مسلمان مرد و زن کو ایذا صحیح نہیں تو دوسرے مذاہب والوں کو کیوں ایذا دی جاتی ہے کافروں کو جہاں پاؤ قتل کر دو۔ اپنے مخالفوں کے لیے دوگنا عذاب کی دعا

اعتراض: خوب خدا نے کیسی نیک نیتی سے اپنی خدائی کا اظہار کیا ہے لوگوں کو تو اس نے اس بات کا حکم دیا ہے کہ رسول کو مت ایذا پہنچاؤ لیکن اسے یہ لازم تھا کہ رسول کو بھی دوسروں کی ایذا رسانی سے باز رکھتا کیا کوئی خدا کو بھی ایذا پہنچا سکتا ہے اگر یہ سچ ہے تو وہ خدا بھی عجیب خدا ہے کیا اللہ اور رسول کو ایذا پہنچانے کی ممانعت اس بات پر دلالت نہیں کرتی کہ اللہ اور رسول آزاد ہیں جسے چاہیں ایذا پہنچائیں اور لوگ بھی سوائے اللہ اور رسول کے اور جسے چاہیں ایذا پہنچائیں۔ جب مسلمان مرد و زن کو ایذا پہنچانا برا ہے ویسا ہی اور مذہب والوں کو ایذا پہنچانا برا ہے اس بات کا انکار کرنے والا متعصب ہے جیسے غدر مچانے والا خدا اور نبی بے رحم ہیں ویسا دنیا میں اور کم ہی ہوگا جیسا سلوک کافروں سے مسلمانوں کو کرنا لکھا ہے یعنی ان کو جہاں پاؤ پکڑو اور خوب قتل کر دو ویسا ہی اگر اور مذہب والے مسلمانوں سے روا رکھیں تو کیا مسلمان برا نہ منائیں گے؟ پیغمبر صاحب وغیرہ کیسے ایذا رساں ہیں کہ خدا سے اپنے مخالفوں کے لیے دوگنا عذاب دینے کی دعا مانگتے ہیں اس سے ان کی خود غرضی اور بدنیتی کا کافی ثبوت ملتا ہے اس لیے اب تک بھی مسلمانوں میں بہت سے شریر لوگ ہیں کہ

دوسروں کو تنگ کرنے سے بالکل نہیں جھجکتے بغیر تعلیم و تربیت کے انسان حیوان کی مانند ہوتا ہے۔ (سیتارتھ پرکاش اغراض 128)

جواب: مندرجہ ذیل آیات پر اعتراضات کیے گئے ہیں۔

وَمَا كَانَ لَكُمْ اَنْ تُؤْذُوا رَسُوْلَ اللّٰهِ ...... (الاحزاب 53:33) اور تمہیں مناسب نہیں کہ اللہ کے رسول کو ایذا دو۔

2- اِنَّ الَّذِيْنَ يُؤْذُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ ...... (الاحزاب 57:33) وہ لوگ جو اللہ اور اس کے رسول کو ایذا دیتے ہیں۔

3- وَالَّذِيْنَ يُؤْذُوْنَ الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ بِغَيْرِ مَا اكْتَسَبُوْا ...... (الاحزاب 87) اور وہ لوگ جو مومن مردوں اور مومن عورتوں کو ایذا دیتے ہیں بغیر اس کے کہ انہوں نے (قصور) کیا۔

4- اَيْنَمَا ثُقِفُوْٓا اُخِذُوْا وَقُتِّلُوْا تَقْتِيْلًا (الاحزاب 61:33) جہاں کہیں پائے جائیں گے پکڑے جائیں گے اور قتل کیے جائیں گے۔

5- رَبَّنَآ اٰتِهِمْ ضِعْفَيْنِ مِنَ الْعَذَابِ وَالْعَنْهُمْ لَعْنًا كَبِيْرًا (الاحزاب 68:33) اے میرے رب انہیں دو چند عذاب دے اور ان پر بہت بڑی لعنت کر۔

جز و اول رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ایذا پہنچانے کی ممانعت:-

رسول اپنی قوم کا قائد اور رئیس ہوتا ہے۔ اگر اس کے حکم کی نافرمانی کی جائے تو وہ اس کے لیے باعث اذیت ہوتا ہے اور زیر اعتراض آیت میں نہ صرف کفار کو ہی اللہ اور اس کے رسول کو ایذا نہ پہنچانے کا حکم ہوا ہے بلکہ مسلمانوں بھی یہ حکم دیا گیا ہے کوئی ایسا کام نہ کیا جائے جو اللہ اور اس کے رسول کی احکام کے خلاف ہو۔ اللہ اور اس کے رسول کے احکام کی خلاف ورزی اللہ کی ناراضی کا باعث ہے۔ جس قوم سے اللہ تعالیٰ ناراض ہو وہ قوم تباہ و بربادی کا شکار ہو جاتی ہے وہ قوم دنیا سے مٹ جاتی ہے اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں کئی نافرمان قوموں کا ذکر کیا ہے جو محض اللہ کے احکام کی نافرمانی کی وجہ سے تباہ و برباد ہوئیں زیر اعتراض آیت میں لَعَنَهُمُ اللّٰهُ فِى الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ وَاَعَدَّ لَهُمْ عَذَابًا مُّهِيْنًا کے الفاظ اللہ کی شدید ناراضگی کو ظاہر کرتے ہیں یہ الفاظ اللہ اور اس کے رسول کو ایذا پہنچانے کا نتیجہ ہے آج مسلمان تنزل کا شکار ہیں اس کی وجہ محض اللہ کے احکام کو پس پشت ڈالنا ہے مسلمان اللہ کی بتائی ہوئی تعلیم سے دور جا پڑے ہیں۔ اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے ان کو عذاب میں مبتلا کر رکھا ہے۔ اس آیت میں صرف کفار اور منافقین کو ہی اللہ اور اس کے رسول کو ایذا پہنچانے سے منع نہیں کیا گیا بلکہ مسلمانوں کو بھی ہدایت کی ہے کہ وہ اپنے کسی عمل سے رسول کو ایذا پہنچانے کا سبب نہ بنیں۔ معترض نے یہ بھی اپنے اعتراض میں اضافہ کیا ہے کہ رسول بھی دوسروں کو ایذا نہ پہنچائے۔ تاریخ اس بات شاہد ہے کہ اللہ کے رسول حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی کو ایذا نہیں دی وہ روف رحیم تھے رحمۃ للعالمین تھے۔ ہر موقع پر اپنے رحمۃ للعالمین کا اظہار کیا اپنے مخالفین کو معاف کیا فتح مکہ کے وقت دشمنوں کو معاف کر کے جس وسعت قلبی۔ رحیمیت اور رؤفیت کا اظہار کیا دنیا میں اس کی مثال نہیں ملتی۔ لہٰذا اللہ اور اس کا رسول ایذا رساں نہیں ہو سکتے۔

جز و ثانی:

جب مسلمان مرد و زن کو ایذا پہنچانا بُرا ہے ویسا ہی اور مذہب والوں کو ایذا پہنچانا بُرا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کسی کو بھی ایذا پہنچانا بُری بات ہے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے تو مسلمان کی تعریف یہ کی ہے کہ مسلمان وہ ہے جس کے ہاتھ اور زبان سے کسی کو تکلیف اور ایذا نہ پہنچے۔ پھر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے تمام مخلوق کو عیال اللہ قرار دیا ہے پھر فرمایا اللہ کے نزدیک سب سے زیادہ محبوب وہ شخص

ہے جو اس کے کنبہ کے حق میں مفید ہو (جامع صغیر جلد 17) ایک اور حدیث ہے لوگوں میں بہتر وہ ہے جو لوگوں کو فائدہ پہنچاتا ہے (کنوز الحقایق پھر فرمایا قوم کی خدمت کرنے والا بڑے اجر والا ہے (کنوز الحقایق حدیث 1) الغرض اسلام وہ دین ہے جس نے ایذا رسانی کی ہر قسم کو حرام اور ناجائز قرار دیا ہے۔

جزو ثالث: کفار کو جہاں پاؤ قتل کردو:

یہ اعتراض صرف سوامی دیانند جی کا ہی نہیں بلکہ تمام مخالفین اور مستشرقین کا یہ مشترکہ اعتراض ہے اس کا جواب اس کتاب میں سے گزر چکا ہے اعادہ کی ضرورت نہیں۔

جزو رابع:

رسول خدا اپنے دشمنوں کے لئے دُگنا عذاب دینے کی دعا مانگتے ہیں زیر اعتراض آیت کو سمجھا ہی نہیں گیا۔ وہ قول کس کا ہے اس آیت کا یہ مفہوم ہے کہ شریر لوگ کہیں گے ہم نے اپنے سرداروں اور بڑوں کی اطاعت کی سو انہوں نے راہ حق سے بھٹکایا اے ہمارے رب انہیں دو چند عذاب دے اور ان پر بڑی لعنت کر" یہ قول گمراہ کفار کا ہے نہ کہ اللہ اور اس کے رسول کا معترض نے محض اپنی لاعلمی اور کم فہمی کی وجہ سے اس قول کو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کر دیا ہے۔

☆......☆

ہواؤں کا بادل اٹھائے پھرنا بہشت کو عشرت کدہ قرار دے کر تمسخر اڑانا

اعتراض: یہ تو عجیب فلاسفی ہے کہ خدا ہوا کو بھیجتا ہے وہ بادلوں کو اٹھاتی ہے اور خدا اس سے مردے جلاتا پھرتا ہے یہ باتیں خدا کی کبھی نہیں ہوسکتیں کیونکہ خدا کا کام برابر یکساں رہتا ہے۔ گھر چونکہ بنانے سے بنتے ہیں اور جو چیز بنتی ہے وہ مفید نہیں رہ سکتی اس لیے ہمیشہ رہنے والے گھروں کا ذکر ایک ڈھکوسلا ہے اور مجسم وجود بغیر محنت کے تکلیف میں اور بیمار رہتا ہے جب ایک عورت سے صحبت کرنا بیماری کا باعث ہے تو بہت سی عورتوں سے عیش وعشرت میں مشغول ہونا نہ معلوم کس قدر نقصان پیدا کرے گا؟ پس مسلمانوں کو ابدی بہشت بھی ہمیشہ راحت بخش ثابت نہیں ہوسکتا (ستیارتھ پرکاش اعتراض 129)

جواب: یہ اعتراض حسب ذیل آیات پر کیا گیا ہے۔

وَاللّٰهُ الَّذِي أَرْسَلَ الرِّيَاحَ فَتُثِيرُ سَحَابًا فَسُقْنَاهُ إِلَىٰ بَلَدٍ مَّيِّتٍ فَأَحْيَيْنَا بِهِ الْأَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا ۚ كَذَٰلِكَ النُّشُورُ (فاطر 9:35) اور اللہ تعالیٰ وہ ذات ہے جو ہواؤں کو بھیجتا ہے سو وہ بادل کو اٹھاتی ہیں پس ہم اسے مردہ شہر کی طرف چلاتے ہیں پھر اس کے ساتھ زمین کو اس کی موت کے بعد زندہ کرتے ہیں اسی طرح جی اٹھنا ہے۔

2- الَّذِي أَحَلَّنَا دَارَ الْمُقَامَةِ مِن فَضْلِهِ لَا يَمَسُّنَا فِيهَا نَصَبٌ وَلَا يَمَسُّنَا فِيهَا لُغُوبٌ (فاطر 35:35) وہ جس نے ہمیں اپنے فضل سے ٹھہرنے کے گھر میں اتارا نہ ہمیں اس میں مشقت ہوگی اور نہ اس میں تکان ہوگی۔

جزاول۔ ہوا کا بادلوں کو اڑاتے پھرنا:

معلوم نہیں معترض کو زیر اعتراض آیت میں کون سی بات طبعی اصول کے خلاف نظر آئی ہے۔تمام سائنس دان اسی بات پر متفق ہیں کہ ہوائیں ہی بادلوں کو اڑائے پھرتی ہیں اور بادل ویران زمینوں پر برستے ہیں اس پانی کی وجہ سے مردہ اور ویران زمین ہری بھری ہوجاتی ہے بنجر اور ویران زمین ہرا بھرا ہوجانا زندگی (حیات) سے تعبیر کیا گیا ہے یعنی زمین زندہ ہوجاتی ہے۔مردہ زمین کی زندگی کو اللہ تعالیٰ نے خوبصورت انداز میں بیان کیا ہے اور مردہ زمین کی زندگی کا سبب آسمانی پانی ہے۔قرآن مجید کا ایک خاص انداز ہے کہ وہ ظاہری چیز بیان کر کے ایک روحانی امر کی طرف توجہ دلاتا ہے اس میں یہ بیان کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ بارش سے مردہ زمین کو زندہ کردیتا ہے اس طرح آسمانی وحی کے ذریعے مردہ دلوں کو زندہ کردیتا ہے اور وحی مردہ لوگوں کو زندہ کردیتی ہے۔اس کی مثال رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وحی کی ہے آپ کی وحی سے پہلے کا عرب روحانی طور پر مرچکا تھا۔اس وحی نے اس مردہ قوم کو زندہ کردیا وہ لوگ جو بدی میں لذت محسوس کرتے تھے وہی بدی سے نفرت کرنے لگے اور نیکی کے راستہ پر چل پڑے اور ان کے مردہ دل اللہ کا مسکن بن گئے۔اللہ کی یاد ان کی غذا تھی۔یہ وہ معرفت کے نکات ہیں جو معترض کی نظر سے اوجھل ہیں۔اپنی جہالت اور لاعلمی سے قرآن مجید کے خوب صورت انداز بیان کو سمجھ نہیں پایا۔

جزو ثانی۔ دار المقامہ میں اتارنا:

دار المقامۃ آخرت کے اسماء میں سے ایک نام ہے قرآن مجید میں آخرت کے کئی نام بیان ہوئے ہیں۔کیونکہ وہ ارواح کی مستقل قیام گاہ ہے اس کو دار المقامہ کہا گیا ہے جنت اور دوزخ کی نعمتوں کی نوعیت اور کیفیت کے بارے میں سیرت سید البشر حصہ دوم حصہ سوم اور حصہ سوم میں مختلف مقامات پر وضاحت کی گئی ہے جنت اور دوزخ میں جو بھی جزا و سزا ہوگی جو بھی نعمتیں اور سزائیں ملیں گی جو کچھ بھی دوزخ اور جنت میں انسان کو میسر آئے گا وہ ہمارے ہی اعمال کے اثار اور نتائج ہوں گے۔ہمارے نیک اور بد اعمال مختلف نعماء اور سزاؤں میں متشکل ہوجائیں گے جنت میں حوریں، غلماں، شہد اور دودھ کی نہریں پھل وغیرہ ہمارے نیک اعمال کی مختلف شکلیں ہیں اسی طرح دوزخ کے عذاب کی مختلف شکلیں ہمارے اعمال بد ہی ہیں جن کو مختلف شکلوں میں بیان کیا گیا ہے جنت وہ دار المقامہ ہے جہاں جنتی ہمیشہ رہے گا چونکہ جنت خوشیوں اور آرام کا دار المقامۃ ہے اس لیے وہاں مشقت اور تکان نہیں ہوگی۔یہ دار المقامۃ کی ایک خصوصیت ہے جنت اور نصب لغوب ایک دوسرے کے متضاد ہیں اس لیے یہ بیان کیا گیا ہے جنت میں کسی قسم کی تکان اور مشقت نہیں ہوگی وہ آرام کی زندگی ہوگی۔دنیا کی نعمتوں اور جنت کی نعمتوں کو ایک دوسرے کی مثل قرار دیا ہے۔یہ مماثلت صرف ناموں میں ہے کیفیت اور نوعیت میں نہیں۔جنت کی نعمتیں وہ ہیں جن کی کیفیت اور نوعیت کسی انسان کے ذہن میں آ ہی نہیں سکتی۔اللہ تعالیٰ نے ہی اپنے نیک بندوں کے لیے مہیا کر رکھی ہیں ان کی کیفیت مرنے کے بعد ہی ظاہر ہوگی۔جنت کی نعمتوں کی کیفیت اور نوعیت معلوم نہ ہونے کی وجہ سے اور دنیا کی نعمتوں پر قیاس کر کے اعتراض کردیا جاتا ہے۔چونکہ عورتیں اس دنیا میں جنسی تسکین کے لیے ہیں اس لیے معترضین جنت کی نعمت کو اسی مقصد کے لیے سمجھ لیتے ہیں۔یہ ایک غلطی اور ناسمجھی ہے یہ بھی اللہ تعالیٰ کی حکمت ہے جنت کی نعمتوں کی حقیقت سے لوگوں کو بے خبر رکھا ہے صرف اتنی حقیقت معلوم ہے جو نبی نے اپنی روحانی بصیرت (انکھ) (مکاشفات) کے ذریعے اطلاع پا کر بتائی ہے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے مکاشفات میں جنت اور دوزخ کی کیفیت اور نوعیت کسی قدر بیان کی گئی ہے معترض نے جنت کی نعماء پر جو تمسخرانہ انداز اختیار کیا ہے وہ اس کی جہالت اور بے علمی کو ظاہر کرتا ہے۔جنت اور دوزخ کی جزا و سزا کے متعلق قرآن اور حدیث کے تمام بیان کردہ پہلوؤں کو سامنے رکھ کر اظہار خیال کرنا چاہیے۔جنت دوزخ اور جزا و سزا (جزا اور سزا کی کیفیت اور نوعیت) ایک اہم کلامی مسئلہ ہے جس پر علماء ربانی اور صوفیا نے بہت کچھ لکھا ہے وہ قاری کی نظر میں ہونا چاہیے۔یہ بڑا دقیق مسئلہ ہے۔

بہشت میں شراب کی نہریں ہوں گی مسلمان سیر ہو کر پئیں گے

(تمسخرانہ انداز میں) اسلام کا خدا طرف دار ہے

اعتراض : کیوں مسلمان صاحب یہاں تو شراب کو حرام مانتے ہو لیکن تمہارے بہشت میں تو شراب کی ندیاں بہتی ہیں اس سے یہ فائدہ ہے کہ مسلمان یہاں شراب سے پرہیز کریں گے لیکن یہاں کی کسر اگلی دنیا میں نکالیں گے۔ عورتوں کی کثرت سے کسی کا دل اپنے قابو میں نہیں رہتا ہوگا اور بہت سی بیماریاں بھی ہوتی ہوں گی اگر بہشت کے رہنے والے مجسم ہیں تو وہ ایک نہ ایک دن ضرور مریں گے اور اگر مجسم نہیں تو عیش و عشرت بھی نہ کر سکیں گے پھر ان کا بہشت میں رہنا رائیگاں ہے اگر لوط کو پیغمبر مانتے ہو تو بائبل میں بیان کی ہوئی لوط سے کرتوت (یعنی اس کا اپنی بیٹیوں سے جماع کر کے دولڑکے پیدا کرنا) بھی سچ مانتے ہو تو اس قسم کے آدمی کو پیغمبر ماننے سے قصوروار ہوا گر اس قسم کے پیغمبر کو خدا نجات دیتا ہے تو وہ خدا بھی اپنے پیغمبر نبی کے مانند ہوگا اور بڑھیا کا قصہ بیان کرنے والا اور طرف داری سے دوسروں کو مارنے والا خدا کبھی نہیں ہوسکتا ایسے خدا کی مسلمانوں ہی کے گھر میں سمائی ہے اور کہیں نہیں (سیتارتھ پرکاش اعتراض 132)

جواب :مذکورہ آیات پر اعتراضات کیے گئے ہیں۔

يُطَافُ عَلَيْهِمْ بِكَاْسٍ مِّنْ مَّعِيْنٍ الخ (الصّٰفّٰت 45:37) ان میں ایک پیالہ پھرایا جائے گا صاف سفید (شراب) سے پینے والوں کے لئے لذت ہوگی۔

اَفَمَا نَحْنُ بِمَيِّتِيْنَ (58:37) تو کیا سچ نہیں کہ ہم مرنے والے ہیں۔

اِنَّ لُوْطًا لَّمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ (الصّٰفّٰت 133:37) اور لوط بھی رسولوں میں سے تھا۔

اِلَّا عَجُوْزًا فِي الْغٰبِرِيْنَ ثُمَّ دَمَّرْنَا الْاٰخَرِيْنَ (136،135:37)

سوائے بڑھیا کے جو پیچھے رہنے والوں میں سے تھی اور دوسروں کو ہم نے ہلاک کر دیا۔

شراب اور جنت:

اللہ تعالیٰ نے شراب کو حرام قرار دیا ہے ارشاد الٰہی ہے يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَيْسِرُ وَالْاَنْصَابُ وَالْاَزْلَامُ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّيْطٰنِ فَاجْتَنِبُوْهُ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ (المائدہ 90:5)

اے لوگو! جو ایمان لائے ہو شراب اور جوا اور بت اور پاسے ناپاک کام صرف شیطان کے عمل سے ہیں اس سے بچو تاکہ تم کامیاب ہو۔

عربی زبان میں شراب کو خمر کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے جس کے معنی ہیں پردہ ڈالنا یا ڈھانکا یا چھپانا اسی مادہ سے اخمار کا لفظ آیا ہے جس کے معنی عورت کی اوڑھنی ہے۔ اصطلاح میں خمر اس مشروب کو کہا جاتا ہے جو نشہ دے لہٰذا ہر نشہ آور مشروب کو خمر کہا جاتا ہے چونکہ

شراب کونشہ آور ہونے کی وجہ سے حرام کیا گیا ہے اس لیے ایک حدیث میں آتا ہے کہ ہر نشہ آور چیز حرام ہے کُلُّ مُسْکِرٍ حَرَامٌ بخاری کتاب الاشربۃ باب الباذق من نھی عن کل مسکر من الاشربۃ و بابُ الخمر من العسل) قرآن مجید میں شراب کے حرام کی وجہ خود بتا دی کہ وہ عقل کو ڈھانپ لینے والی چیز ہے۔ جب وہ چیز جو عقل کو ڈھانپ لے اور اس کے پینے کی وجہ سے عقل کام لینا چھوڑ دے کیا ایسی چیز کا پینا جائز ہے نشہ کی حالت میں نامعلوم شرابی سے کیا کیا قبیح و شنیع امور کا ارتکاب ہو جائے۔ طب نے بھی شراب کے مضرات کی تصدیق کر دی ہے تاریخ گواہ ہے کہ جن قوموں میں شراب کی کثرت ہے ان میں ویوسی بے غیرتی زیادہ پائی جاتی ہے لہٰذا اس دنیا میں اللہ تعالیٰ نے انسانوں کے لیے شراب حرام قرار دی ہے جب نشہ آور چیز اس دنیا میں حرام ہے تو پھر اگلے جہاں (دوسری دنیا) میں کیوں کر جائز ہوسکتی ہے قرآن مجید میں آخرت کی شراب کے یہ اوصاف بیان کر دیئے ہیں یُطَافُ عَلَیْھِمْ بِکَاْسٍ مِّنْ مَّعِیْنٍ بَیْضَآءَ لَذَّۃٍ لِّلشّٰرِبِیْنَ لَا فِیْھَا غَوْلٌ وَّلَا ھُمْ عَنْھَا یُنْزَفُوْنَ (37:45 تا 47) ان میں ایک پیالہ پھیرایا جائے گا صاف سفید (شراب) سے پینے والوں کے لیے لذت والا نہ اس میں ہلاکت ہوگی اور نہ اس کے پینے سے نشہ آئے گا۔

اس دنیا کی شراب سے انسان کی عقل ماری جاتی ہے اور انسان کو آہستہ آہستہ ہلاکت کی طرف لے جاتی ہے جب کہ آخرت کی شراب ان تمام مضرات سے پاک ہوگی۔

اس کتاب میں کئی مقامات پر جنت کی نعمتوں کی تشریح کی ہے کہ وہ نعمتیں انسان کے اعمال حسنہ کی مختلف شکلیں ہوں گی بہشتی اپنے اعمال حسنہ کے نتائج سے لطف اندوز ہوگا۔ شراب بھی انسان کے عمل حسنہ کا نتیجہ ہے۔ انسان کا عمل ذکر الٰہی شراب کی شکل اختیار کرے گا جس طرح اس دنیا میں انسان ذکر الٰہی میں لذت محسوس کرتا ہے اور ذکر الٰہی کے نشہ میں مخمور رہتا ہے۔ وہی ذکر الٰہی شراب طہورہ کی شکل اختیار کرے گا۔ دنیا کا شراب ہلاکت کی طرف لے جاتا ہے بہشت کا شراب مزید روحانی مدارج کا سبب ہوگا۔ جس شخص نے اس دنیا میں ذکر الٰہی کی لذت کبھی محسوس نہیں کیا۔ وہ جنت کی شراب طہورہ کے تصور کو کب سمجھ سکتا ہے نہ اس کے ادراک میں آسکتا ہے۔ لہٰذا بہشت کی شراب طہورہ کو اس دنیا کی شراب رجس سے مقابلہ کرنا پرلے درجہ کی حماقت ہے۔ جو شراب اس دنیا میں حرام قرار دی گئی ہے وہ آخرت میں بھی حرام ہوگی کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اس شراب کو خود رجس (ناپاک) قرار دے دیا ہے۔

الزامی جواب:

قرآن مجید کے بیان کردہ بہشت میں جو شراب ہوگا اس کا وصف قرآن مجید نے خود بیان کر دیا۔ لَا فِیْھَا غَوْلٌ وَّلَا ھُمْ عَنْھَا یُنْزَفُوْنَ نہ اس میں ہلاکت ہوگی اور نہ وہ اس سے متوالے ہوں گے۔ لیکن ہندو دھرم کی سورگ (بہشت) میں اس دینوی شراب کی نہریں بہتی ہیں اس میں دیوتا تک سوم (بھنگ) کے نشہ میں اپنی، پرائی نہیں دیکھتے چنانچہ اندر دیوتا کو سوم پینے سے سرامہ کی بیماری ہو جانا اور اشونی کمار طبیبوں کے علاج سے صحت ہو جانے کا ذکر رگ وید اور شت پتھ براہمن وغیرہ میں موجود ہے رگ وید کے 1400 منتروں میں اس کی تعریف موجود ہے سام وید پورا اس کی تعریف سے بھرا ہوا ہے ویدک دور میں پنڈت پھولوں کی جو کی اور نہ معلوم کون کون سی شراب کشید کر کے خود بھی پیتے اور دیوتاؤں کی نذر بھی کرتے۔ راجہ پریکشت جو بڑا دھرماتما اور امن پسند راجہ تھا اس کے راجیہ کی تعریف ہی یہ کی گئی ہے کہ اس میں عورتیں تک شراب خرید سکتی تھیں چنانچہ اتھروید کانڈ 20 سوکت 127 منتر 9 میں ہے ''کیا چیز تیرے لیے لاؤں وہی میٹھا شراب بیوی خاوند کو پوچھتی ہے راجہ پریکشت کے راج میں۔

اسی طرح اتھروید کانڈ 10 سوکت 6 منتر 25 میں ہے۔ ''وہ ایشور میرے پاس شہد گھی اور شراب کی نہر کے ساتھ آیا ہے''۔

''شراب اور جو کی شراب اور شہد کی شراب میرے لیے ہو (اتھرو 6:69:1)

ویدک دور میں شراب کا استعمال:-

اسلام نے شراب کو رجس قرار دے کر حرام قرار دیا ہے مگر ویدک کے زمانہ میں حرام نہ تھی شت پتھ برہمن میں مختلف اقسام کی شراب کے نام اور یگیوں کے اندر دیوتاؤں کو اس کی نذریں پیش کرنے کا ذکر موجود ہے۔
ویدک بہشت میں عورتوں اور اپسراؤں کے جھنڈ لوگوں کے گرد منڈلاتے پھریں گے (اتھروید کانڈ 4 سوکت 32)

بہشت کی زندگی:

یہ اعتراض کہ بہشت میں رہنے والے مجسم ہیں تو ایک نہ ایک دن ضرور مریں گے۔ یہ خیال بھی سوامی جی کا خود تراشیدہ ہے۔ قرآن مجید کا نہیں۔ انسانی روح کو ضرور ایک جسم ملے گا۔ وہ جسم انسان کے اعمال حسنہ یا سیئہ کے مطابق ہوگا۔ روح جسم کے بغیر نہیں رہ سکتی جس خدا نے اس دنیا میں روح کو ایک جسم عطا کیا ہے تو کیا اسی روح کو مرنے کے بعد دوسرا نیا جسم عطا نہیں کر سکتا؟ اللہ تعالیٰ ہر روح کو ایسا جسم عطا کرے گا۔ جو اس جسم کے برعکس فنا نہیں ہوگا۔ اسلام کا خدا قادر مطلق ہے۔ دوسری دنیا کی ان دیکھی حقیقتوں سے کوئی شخص واقف نہیں ہاں اتنی ہی واقفیت ہے جتنی انبیاء علیہم السلام خصوصاً حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم نے کشفی رنگ میں دیکھ کر بتائیں۔ یا اسلام کے اولیاء بھی اپنی کشفی آنکھ سے دیکھ کر ان رازوں کو بیان کر دیتے ہیں اور اللہ کے فضل اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی سے اس دنیا میں بھی ان نعمتوں سے متمتع ہوتے رہتے ہیں یہی اسلام کی برکت ہے۔

لوط کا گندہ قصہ:-

لوط کا گندہ قصہ بائبل میں مذکور ہے اسلام کا یہ احسان ہے کہ اس نے تمام انبیاء علیہم السلام کو معصوم عن الخطاء قرار دیا ہے۔ تمام انبیاء کو امین اور صادق القول اور الفعل قرار دیا ہے۔ اسلام کی رو سے کسی نبی سے کوئی برائی سرزد ہو نہیں سکتی۔

لوط کی بیوی کی ہلاکت:

بڑھیا (لوط علیہ السلام کی بیوی) کی ہلاکت اور طرف داری سے دوسروں کو مارنے کا ذکر کیا گیا ہے۔ اس کتاب میں ایک جگہ نہیں کئی مقامات پر اس بات کو دہرایا گیا ہے کہ اللہ اپنی سنت کے مطابق لوگوں کے اپنے کردہ گناہوں کی وجہ سے ہلاک اور برباد کرتا ہے گویا لوگوں کی ہلاکت ان کے اپنے اعمال کی وجہ سے واقع ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا تو ایک قانون ہے ارشاد الٰہی ہے اِنَّ اللّٰـهَ لَا يَظْلِمُ النَّاسَ شَيْئًا وَّ لٰكِنَّ النَّاسَ اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ (یونس 10:44) اللہ لوگوں پر کچھ بھی ظلم نہیں کرتا لیکن لوگ آپ اپنی جانوں پر ظلم کرتے ہیں۔
دوسری جگہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وَمَآ اَنَا بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيْدِ (ق 50:29) اور میں بندوں پر کچھ بھی ظلم نہیں کرتا۔
سوامی جی کا اسلام کے خدا کو طرف دار قرار دینا کتنی جہالت اور لاعلمی ہے اسلام کے خدا نے لوگوں کی ہدایت کے لیے نبی بھیجے انہوں نے خدا سے وحی پا کر راہ مستقیم کی تعلیم دی پھر اللہ تعالیٰ نے انسان کو عقل دی وہ بھی ایک ایسا نور ہے جو نیکی کو بدی سے تمیز کر سکتا ہے اس کے بعد اگر انسان اس راستہ پر گامزن ہو جو تباہی کا راستہ ہے تو یہ انسان کی اپنی غلطی اور ناسمجھی ہے جب انسان غلط راستہ اختیار کرے گا تو لازمی طور پر وہ تباہی کے گڑھے میں گرے گا۔ لوط کی بیوی (بڑھیا) اور دوسرے وہ لوگ جو ہلاک ہوئے وہ اپنے کردہ اعمال سیئہ کی وجہ سے ہلاک ہوئے تھے ان لوگوں کو اللہ تعالیٰ نے حضرت لوط کے ذریعے راہ مستقیم بتائی لیکن وہ اس راستہ پر گامزن نہ ہوئے اور وہ تباہ ہو گئے۔ یہ اللہ کی طرف نہیں بلکہ ان لوگوں کی اپنی بداعمالی تھی۔

الزامی جواب:

آریوں کا ایشور اندر غیر اریوں کو مارتا پھرتا ہے اور ان کا مال چراتا پھرتا ہے۔ رگ وید منڈل 3 سوکت 53 منتر 14 میں ہے ''پرم گند کی دولت ہمارے لیے لوٹ لا۔''

وید کی متعصبانہ تعلیم:

جو ہم سے دشمنی کرتا ہے یا جس سے ہم دشمنی کرتے ہیں اس کو ہم ایسے تڑپا تڑپا کر ماریں جیسے بلی کے منہ میں چوہا (دیانند یجروید بھاش ادھیاء 16 منتر 65 اور ادھیاء 15 منتر 19)

جس ایشور نے وید میں غیروں سے اس وحشیانہ سلوک کی تعلیم دی ہے ان کو دسیو، راکشس اور اسر کہہ کر گردن زدنی قرار دیا ہے وہی سخت اور حاسد ایشور ہے دیکھیے رگ وید 8:30:5 رگ وید 6:4:5 رگ وید 4:33:1، رگ وید 9:34:3) ان منتروں میں وسیوں کو مارنے تباہ و برباد کرنے اور آریوں کی حفاظت کرنے کی دعا کی گئی ہے۔ سو قرآن مجید کا خدا ایک عادل، رحمان، ارحم الرحمین اور رب العالمین ہے اس کے برعکس ویدوں کا ایشور غیر آریوں کو تباہ و برباد کرنے والا ہے۔ قرآن مجید اور ویدوں کی تعلیم کا موازنہ کیجیے کہ کس کتاب کا خدا طرف دار اور قاتل ہے۔

بہشت ہمیشہ نہیں رہے گی:

محمد صاحب نے جنت کی نعمتوں کا جھانسہ دے کر عربوں کو اپنے مذہب میں شامل کیا شیطان نے اللہ کے حکم کی پروانہ کی اور آدم کو سجدہ نہ کیا کیا خدا کے بھی ہاتھ ہوتے ہیں کیا آسمان پر ہی خدا کا گھر ہے شیطان کو بہکانے والا خدا ہے۔ اگر خدا خود ہی گناہ کروا کے اس کی سزا دے تو بے انصاف ٹھہرتا ہے

☆......☆

بہشت کی نعمتوں اور قصہ آدم وابلیس پر اعتراضات

اعتراض: اگر سچ قرآنی بہشت میں باغ باغیچے نہریں اور مکانات وغیرہ ہیں تو ثابت ہوتا ہے کہ وہ نہ ہمیشہ تھے اور نہ وہ ہمیشہ رہ سکتے ہیں کیونکہ جو چیز مرکب ہے وہ مرکب ہونے سے پہلے نہ تھی اور جب اس کے اجزاء الگ الگ ہو جائیں گے تو اس کی ہستی نہ رہے گی۔ یہی حالت بہشت کی سمجھنی چاہیے جب بہشت ہمیشہ نہیں رہنے کا تو وہاں کے لوگ ہمیشہ کیوں کر رہ سکتے ہیں اور تکیوں، میووں اور پینے کی اشیاء کا ذکر ظاہر کرتا ہے کہ مذہب اسلام کے جاری ہونے کے زمانہ میں عرب افلاس کی حالت میں تھا اسی لیے محمد صاحب نے ان چیزوں کا لالچ دے کر مفلسوں کو اپنے مذہب میں شامل کر لیا۔ پھر عورتوں کی موجودگی بہشت میں ابدی راحت کا ہونا غلط ثابت کرتی ہے لیکن سوال یہ ہے کہ کبھی نہ کبھی بہشت سے نکلنا پڑے گا اور دوسری صورت میں یہ اعتراض واقع ہوتا ہے کہ قیامت سے پہلے ان کا بہشت میں کیا کام ہے۔

خدا کا اقبال دیکھیے کہ اور تو سب فرشتوں نے بموجب حکم آدم کو سجدہ کیا لیکن شیطان نے اس حکم کی کوئی پروانہ کی۔ خدا نے بہتراز ور لگایا اور کہا کہ میں نے جس چیز کو اپنے دونوں ہاتھوں سے بنایا اسے سجدہ کر اور تکبر نہ کر مگر شیطان نے ایک نہ مانی علاوہ ازیں یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ خدا انسان کے مانند دو ہاتھوں والا تھا بھلا پھر وہ کیونکر سب جگہ حاضر و ناظر و قادر مطلق ہو سکتا ہے۔

پھر شیطان کے سجدہ نہ کرنے کی وجہ جو اس نے پیش کی معقول تھی یعنی وہ آدم سے افضل تھا اس پر خدا نے غصہ کیوں کیا؟ کیا آسمان پر ہی خدا کا گھر ہے زمین پر نہیں اور کیا وجہ کہ پہلے کعبہ کو خدا کا گھر بتایا تھا پھر خدا کا اپنی مملکت سے شیطان کو نکال دینا کیوں کر ممکن ہے کیا ہر ایک جگہ خدائی نہیں وہ صرف بہشت کا بادشاہ ہے اور دیکھیے خدا اور شیطان کے آپس میں دو دو ہاتھ ہوتے ہیں خدا نے شیطان کو لعنت دی اور قید کر لیا شیطان نے کہا اے مالک مجھ کو قیامت تک چھوڑ دے خدا نے اس کی خوشامد سے خوش ہو کر چھوڑ دیا چھوٹ کر شیطان کہتا ہے کہ اب میں لوگوں کو خوب بہکاؤں گا اور غدر مچاؤں گا خدا جواب دیتا ہے کہ جنہیں تو بہکائے گا انہیں میں دوزخ میں ڈالوں گا اور تجھ کو بھی۔ دانا بتائیں کہ شیطان کا بہکانے والا خدا ہے یا وہ خود بخود گمراہ ہو گیا؟ پہلی صورت میں تو خدا پر حرف آتا ہے اور وہ شیطان کا بھی شیطان ٹھہرتا ہے۔ دوسری صورت میں اگر شیطان خود گمراہ ہوا۔ تو انسان بھی ادھرم کرنے اور شیطان کا ساتھی ثابت ہوتا ہے اگر خدا خود ہی گناہ کروا کر اس کی سزا دے تو بے انصاف ٹھہرتا ہے (سیتارتھ پرکاش اعتراض 133)

یہ اعتراض سورہ ص کی آیات 85,73,53,50 پر کیا گیا ہے۔

جواب: یہ اعتراض بھی کئی اجزا پر مشتمل ہے اکثر اعتراض کے وہ اجزا ہیں جن کا پہلے مفصل جواب دیا جا چکا ہے یہ اعتراضات دھرم پال نے بھی اپنی کتاب ترک اسلام میں کیے ہیں سوامی جی بھی اعتراض دہرا چکا ہے لہٰذا اعتراض کے جس جزو کا جواب نہیں دیا گیا اس کا جواب درج کیا جاتا ہے۔

بہشت کی نعماء کی کیفیت اور نوعیت کے متعلق کتاب کے تمام حصوں میں بحث ہو چکی ہے۔ جس میں یہ بتایا گیا تھا جنت اور اس دنیا کی نعمتوں میں صرف نام کا اشتراک ہے نوعیت اور کیفیت متغائر ہے لہٰذا جنت کی نعمتوں کو اس دنیا کی نعمتوں پر قیاس نہیں کرنا چاہیے معترض کی سب سے بڑی غلطی یہ ہے۔

الزامی جواب:

جبکہ وید میں بہشت کا جسمانی ہونا مذکور ہے (اتھر وید کانڈ 18)

اس وید کے منتروں میں سورگ لوک (بہشت) میں اعضاء سمیت جانے اور ان اعضاء کے ساتھ مزے اڑانے کا ذکر ہے۔

"اے پترو (مردہ بزرگو) اپنے اعضا سمیت سورگ (بہشت) میں لطف اٹھاؤ جو ہمارے باپ دادا وسیع عالم بالا میں داخل ہو چکے ہیں ان کے لیے اے ارواح کے لے جانے والے حتی المقدور اجسام عطا کر

''پتر (مردہ بزرگ) جسم حاصل کریں اچھی روشنی پاکر''

''جو کوئی بھی تمہارا اعضواے پتر و آگ نے پیچھے چھوڑ دیا ہے تمہیں عالم ارواح مین لے جاتے ہوئے وہ میں دوبارہ مہیا کرتا ہوں اے پتر و سورگ (بہشت) میں سب اعضاء کے ساتھ مزے اڑاؤ''

صرف وید میں ہی نعماء جنت کا ذکر نہیں بلکہ دنیا کے تمام مذاہب میں ذکر پایا جاتا ہے یہ وہ موضوع ہے جو تمام مذاہب میں مشترک ہے۔ طرز بیان الگ الگ ہوسکتا ہے لیکن روح اور مغز ایک ہی ہے لہٰذا اعتراض کرنے والے کو پہلے اپنے مذہب کا مطالعہ کرنا چاہیے آخرت کی نعماء کا مسئلہ خود بخود حل ہوجائے گا۔ اخروی زندگی کے مسائل ادق مسائل ہیں صرف انبیاء علیہم السلام نے اپنی کشفی انکھ سے دیکھ کر بیان کیے ہیں ان نعماء کو کسی نے دیکھا نہیں یہ ان دیکھی حقیقتیں ہیں۔

پہلے کئی جگہ یہ بیان کیا جاچکا ہے جزا و سزا پانے کے لیے روح کا جسم پانا ضروری ہے۔ اس دنیا کے جسم کی نوعیت الگ ہے اور آخرت کے جسم کے نوعیت الگ ہوگی۔ لیکن روح کو جسم ضرور عطا کیا جائے گا جیسا کہ وید کے منتروں سے ظاہر ہے سورگ میں اعضا ہوں گے وہ سورگ کی نعمتوں کا مزہ اڑائیں گے جنت اور اس کی زندگی دائمی ہے۔ معترض نے منطقی لحاظ سے بہشت کی زندگی کو عارضی زندگی ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ اسلامی تعلیمات کے مطابق بہشت کی زندگی دائمی ہے اس پر فنا نہیں آئے گی۔ یہ دنیا اللہ تعالیٰ کی صفت خالقیت سے وجود میں آئی۔ خلق خدا کا فعل ہے اور فنا کرنا بھی اللہ تعالیٰ کا فعل ہے جب بہشت پر اللہ تعالیٰ کا یہ فعل (فنا کرنا) وارد ہی نہیں ہوگا تو بہشت پر فنا کیسے وارد ہوگا۔ بہشت پر فنا اس وقت وارد ہوگا جب خدا کا یہ فعل ظہور میں آئے گا۔ جب اللہ کا فعل (فنا کرنا) ظہور میں ہی نہیں آتا تو بہشت پر فنا کیسے آسکتا ہے دنیا کی تخلیق میں اللہ کی سنت کے مطابق فنا رکھ دی گئی ہے لہٰذا یہ دنیا فانی ہے اور بہشت کی نعمتوں کی تخلیق میں فنا نہیں رکھی اس لیے ان پر فنا نہیں آئے گی خلق اور فنا اللہ کی سنت کے مطابق عمل میں آتے ہیں معترض اللہ کی صفات کو ہی نہیں جانتا اس وجہ سے ٹھوکر کھائی ہے۔

بہشت اور اس کی نعماء کا وعدہ:

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہی عرب کی مفلس قوم کو بہشت کی نعماء کا وعدہ نہیں دیا بلکہ تمام مذاہب کی کتب میں یہ درج ہے کہ آخرت مین اس دنیا کے افلاس اور تکالیف دور ہوجانے کا وعدہ دیا گیا ہے بلکہ مزید روحانی ترقی کا عہد دیا گیا ہے۔ انسان اپنے اعمال حسنہ کا اجر بہترین شکل میں پائے گا۔ یہ وعدہ صرف اسلام کا ہی نہیں بلکہ تمام مذاہب کا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ معترض اپنے مذہب کی کتب سے بھی نابلد ہے۔

نیک عورتیں بھی بہشت میں جائیں گی:

اسلام کی تعلیم کے مطابق جس طرح نیک مرد بہشت میں جائیں گے نیک عورتیں بھی جائیں گی چونکہ ہندو دھرم میں عورت کو ذلیل سمجھا جاتا ہے اور معترض کو عورت سے نفرت ہے اس نفرت کا اظہار اپنے اعتراض میں کیا ہے۔ قرآن مجید میں پاک چیز کو ہی حور کے لفظ سے تعبیر کیا ہے۔ اگر عورتیں پاک و مطہر بن کر حوریں بن جائیں تو کیا اعتراض ہے۔ یہ تو اسلام کی خصوصیت ہے کہ وہ عورت کو کتنا بلند درجہ دیتا ہے۔

بہشت سے کوئی نکالا نہیں جائے گا:

اسلام کی تعلیم کے مطابق بہشت کی زندگی دائمی ہے نہ اس پر کوئی فنا ہے اور نہ انقطاع لہٰذا دوسرے جہاں کو اس جہاں کی زندگی پر

قیاس نہیں کرنا چاہیے۔ دوسرے جہاں میں اس دنیا کے اعمال کی جزا غیر منقطع ہوگی یہ خدا کی سنت ہے اللہ کی سنت میں کوئی دخل نہیں دے سکتا۔

قصہ آدم وشیطان:

سیرت سید البشر کے تیسرے حصہ میں تفصیل آ چکی ہے۔ اعادہ باعث طوالت ہے اس قصہ پر صرف سوامی دیانند نے ہی اعتراض نہیں کیا کئی معترضین اعتراض کر چکے ہیں یہ ایک تمثیلی واقعہ خوب صورت انداز میں بیان کیا گیا ہے ادبی ذوق نہ رکھنے کی وجہ سے معترضین نے اعتراض کیا ہے اللہ تعالیٰ نے کسی کو گمراہ نہیں کیا اللہ کے احکام ماننے یا نہ ماننے میں انسان اور شیطان دونوں آزاد ہیں۔ اللہ کی طرف سے کوئی پابندی نہیں۔ اللہ کا حکم تسلیم کرنے یا نہ کرنے میں ہی فائدہ اور نقصان مضمر ہے جو شخص اللہ کا حکم تسلیم کرے گا اور اس پر عمل پیرا ہوگا تو فائدہ اٹھائے گا۔ اگر اس نے حکم پس پشت ڈال دیا ہے تو نقصان اٹھائے گا۔ اللہ تعالیٰ کا یہ قانون ہے لَآ اِکْرَاہَ فِی الدِّیْنِ ۔ دین (اللہ) کے احکام ماننے یا نہ ماننے پر کوئی جبر نہیں ہر ایک کا اپنا اختیار ہے یہ وہ راز ہے جس کو اسلام نے ہی کھولا ہے۔

خدا کے ہاتھ:

قرآن مجید میں لفظ ''ید'' اللہ تعالیٰ کے لیے آتا ہے جس پر معترض نے اعتراض کیا ہے عربی زبان میں لفظ ''ید'' بطور استعارہ نعمت حفاظت اور ملک کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے جہاں اللہ تعالیٰ کے لیے لفظ ''ید'' آیا ہے وہاں نعمت یا حفاظت کے ہیں۔ (امام راغب) نہایہ میں ''ید'' کے معنی دفاع اور حفاظت کے آئے ہیں اس کی تائید میں ایک حدیث بیان کی ہے لایدان لاحد بقتلھم یعنی کسی شخص کو ان (یاجوج ماجوج) سے لڑنے کی طاقت نہیں۔ قرآن مجید میں ایک جگہ اختیار اور طاقت کے معنی بھی استعمال ہوا ہے ارشاد الٰہی ہے اویعفو الذی بیدہ عقدہ النکاح یعنی معاف کردے وہ شخص جس کے ہاتھ میں نکاح کی گرہ ہے۔ نکاح کی گرہ سے مراد اختیار اور قوت ہے۔ لہٰذا لفظ ''ید'' استعارہ کے طور پر استعمال ہوا ہے یہی قرآن مجید کی فصاحت وبلاغت کا حسن ہے۔ کورذوق اس حسن سے کب لطف اندوز ہوسکتے ہیں۔

الزامی جواب: وید میں ایشور کے اعضاء اتھروید کانڈ 11 سوکت 2 منتر 6,5 میں ہے۔

اے حیوانات کے مالک پر ماتما تیرے منہ کو تعظیم ہو اے سب کے خدا تیری انکھوں کو تعظیم تیری کھال کو تعظیم۔ تیرے قابل زیارت جسم کے آگے پیچھے کو تعظیم ہو۔ تیرے اعضا کے لیے تعظیم ہو پیٹ کے لیے زبان کے لیے تیرے منہ کے لیے دانتوں کے لیے۔ (دانتوں کی) بدبو کے لیے تعظیم ہو'' (منقول از ترجمہ سے دیو شرما آریہ)

......☆......

قرآن مجید لغویات سے بھرا پڑا ہے (نعوذ باللہ) لہٰذا یہ کتاب منزل من اللہ نہیں ہے

اعتراض: قرآن کا خدا کی طرف منسوب کرنا اس مطلب کے لیے ہے کہ سیدھے سادے آدمی اس پر ایمان لے آویں اس کتاب میں سوائے معدودے چند باتوں کے سب لغویات بھری پڑی ہیں اس کا سچ بھی جھوٹ کے ساتھ مل کر خراب ہوگیا پس قرآن۔ قرانی خدا اور قرآن کے معتقد سب گناہ پھیلانے والے اور گناہوں کو فروغ دینے والے ہیں گناہوں کا معاف کرنا اول درجہ کا ادھرم ہے۔ اسی وجہ سے مسلمان گناہ

کرنے اور فساد برپا کرنے سے کم ڈرتے ہیں۔ بلکہ نہیں ڈرتے (سیتارتھ پرکاش اعتراض 135)

جواب: قرآن مجید کی سورۃ المومن کی آیات تَنۡزِيۡلُ الۡكِتٰبِ مِنَ اللّٰهِ الۡعَزِيۡزِ الۡعَلِيۡمِ غَافِرِ الذَّنۡۢبِ وَقَابِلِ التَّوۡبِ شَدِيۡدِ الۡعِقَابِ ذِى الطَّوۡلِ (المومن 40 ,3,2) یہ کتاب اللہ غالب علم والے کی طرف سے اُتری ہے گناہ بخشنے والا اور توبہ قبول کرنے والا سخت سزا دینے والا بڑے فضل والا (کی طرف سے)

قرآن مجید کے خدا کی طرف سے ہونے کا ثبوت:

صرف ایک معترض (سوامی دیانند جی) نے ہی نہیں بلکہ نزول قرآن سے لے کر اب تک معترضین نے یہ بات ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہ کتاب محمد (مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم) نے از خود تخلیق کی ہے۔ نعوذ باللہ لغویات سے بھری پڑی ہے۔ قرآن مجید کے بے مثل لاجواب اور منزل من اللہ ہونے کے متعلق سیرت سید البشر کے تمام حصوں میں بحث گزر چکی ہے اس کتاب کے بے مثل اور منزل من اللہ ہونے کے کئی روشن دلائل ہیں۔ اپنے علم کے مطابق کچھ بیان کیے جاچکے ہیں۔ کسی انسانی طاقت سے باہر ہے کہ ان کا کوئی احاطہ کرسکے۔ صرف دو دلائل کا اختصار کے ساتھ ذکر کیا جاتا ہے۔ یہ دونوں کا ذکر بھی پہلے گزر چکا ہے۔ ایک بڑی اور روشن دلیل قرآن مجید کے بے مثل ہونے کی یہ ہے ارشاد الٰہی ہے قُلۡ لَّئِنِ اجۡتَمَعَتِ الۡاِنۡسُ وَالۡجِنُّ عَلٰۤى اَنۡ يَّاۡتُوۡا بِمِثۡلِ هٰذَا الۡقُرۡاٰنِ لَا يَاۡتُوۡنَ بِمِثۡلِهٖ وَلَوۡ كَانَ بَعۡضُهُمۡ لِبَعۡضٍ ظَهِيۡرًا (بنی اسرائیل 88:17) کہہ دے اگر انس وجن جمع ہو جائیں اور کوشش کریں کہ اس قرآن کی مثل بنالائیں تو وہ ہرگز اس کی مثل نہ بنالاسکیں گے خواہ وہ ایک دوسرے ظہیر و مددگار بن جائیں۔

یہ قرآن مجید علمی لحاظ سے قوت دلائل کے لحاظ سے معجزات کے لحاظ سے تصرفات خارجیہ کے لحاظ سے قوت تاثیر کے لحاظ سے عدم اختلاف کے لحاظ سے فصاحت و بلاغت کے لحاظ سے ایک روشن معجزہ ہے جس کی مانند آج تک کوئی شخص کتاب لا نہیں سکا۔ یہ چیلنج آج تک قائم ہے۔ قرآن مجید کے منزل من اللہ ہونے کی اس سے بڑھ کر اور کیا دلیل ہو سکتی ہے۔

پھر معترض نعوذ باللہ قرآن مجید کو لغویات سے بھری کتاب قرار دیتا ہے جو انقلاب مادی اور روحانی قرآن مجید نے برپا کیا اس کی مثال تاریخ عالم میں نہیں ملتی کس طرح ایک مردہ قوم کو زندگی بخشی۔

گناہوں میں لذت لینے والی قوم نہ صرف گناہوں سے کنارہ کش ہوگی۔ بلکہ راتوں کی تاریکیوں میں اٹھ کر استانہ الوہیت پر گر گئی۔ ان کے دل خدا کا مسکن بن گئے ان کی زبانیں یاد الٰہی سے تر رہنے لگیں یہ تھا روحانی انقلاب۔ مادی انقلاب یہ تھا ہمسایہ اقوام کی نظر میں ذلیل قوم تختوں کی وارث بن گئی۔ اس قسم کا روحانی اور مادی انقلاب نہ پہلے کسی نہ دیکھا ہے اور نہ آئندہ کوئی دیکھے گا۔ یہ ایک بے مثل انقلاب تھا۔ یہ قرآن اور محمد مصطفےٰ کا معجزہ ہے کہ مردہ قوم نے وہ زندگی پائی جس کی نظیر نہیں ملتی توبہ اور استغفار کے فلسفہ کے متعلق کئی بار لکھا جاچکا ہے کتاب کے اس حصہ میں بھی ذکر آچکا ہے۔

☆......☆

ا۔خدا جس کو چاہتا ہے اس کو بغیر نیک و بداعمال کے رزق کشادہ یا تنگ کر دیتا ہے یہ خدا کی بے انصافی ہے

2- جس کو چاہتا ہے بیٹے اور بیٹیاں دیتا ہے تو مچھلیوں اور مرغوں کو کون بیٹے بیٹیاں دیتا ہے اور طریقہ وحی پر اعتراض

اعتراض : خدا کے پاس کنجیوں کا خزانہ بھرا پڑا ہوگا کیونکہ سب مقامات کے تالے کھولنے پڑتے ہیں یہ تو لڑکوں کی سی بات ہے کہ جس کو چاہتا ہے اس کو بغیر نیک و بداعمال کے رزق کشادہ یا تنگ کر دیتا ہے اس سے تو خدا بے انصاف ٹھہرتا ہے اور دیکھیے قران کے مصنف کی چالاکی عورتوں کو دام میں لانے کے لیے الفاظ لکھے ہیں کہ ''جو کچھ چاہتا ہے پیدا کرتا ہے'' بتایئے کہ خدا دوسرا خدا پیدا کرسکتا ہے یا نہیں؟ اگر نہیں کرسکتا تو تمہارے اعتقاد کے مطابق قادر مطلق نہ رہا۔ بھلا انسانوں میں سے تو خدا جسے چاہے بیٹے بیٹیاں دے دیتا ہے لیکن مرغوں مچھلیوں سور وغیرہ کو بہت سے بیٹے بیٹیاں کون دیتا ہے؟ خدا کسی کو بغیر مرد و عورت کو مجامعت کے کیوں بیٹے بیٹیاں نہیں دیتا اور کسی کو اپنی مرضی سے بانجھ رکھ کر تکلیف کیوں پہنچاتا ہے خدا کا رعب بھی خوب ہے کہ اس کے سامنے کوئی بات نہیں کرسکتا۔ لیکن ساتھ ہی یہ بھی کہا گیا ہے کہ پردہ ڈال کر باتیں کرسکتا ہے یا فرشتوں کی معرفت اگر یہ سچ ہے تو فرشتے اور پیغمبر خوب اپنا مطلب نکالتے ہوں گے اور پردہ کے پیچھے سے یا اوروں کے ذریعے ڈاک کی مانند بات چیت کرنا ثابت کرتا ہے کہ خدا حاضر و ناظر اور ہمہ دان نہین گویا وہ خدا ہی نہیں بلکہ کوئی چالاک آدمی ہے اس واسطے یہ قرآن ہرگز خدا کا بنایا نہیں ہوسکتا۔ (ستیارتھ پرکاش اعتراض 137)

جواب: یہ اعتراض سورہ شوری کی آیات 12 ,51,49 پر کیا گیا ہے۔

لَهٗ مَقَالِيْدُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ وَ يَقْدِرُ (الشوری 12:42) آسمانوں اور زمین کے خزانے اسی کے ہیں وہ جس کے لیے چاہتا ہے رزق فراخ کرتا ہے اور جس کے لیے چاہتا ہے تنگ کرتا ہے۔

مقالید کا ترجمہ اگر کنجیاں ہوں تو اس سے مراد ہوگی کہ ارض و سما میں جو کچھ بھی ہو رہا ہے اور جو کچھ ہوگا اس کی چابی اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ سب کچھ اسی کے قبضہ قدرت میں ہے کوئی چیز اس کے احاطہ اقتدار سے باہر نہیں۔ رزق کی ہر قسم کا سامان اس دنیا میں پیدا کر دیا ہے خواہ اس رزق کا تعلق دنیوی ہو یا اخروی مال و دولت سے ہو یا جاہ و حشمت سے ہو یا علم سے یہ اللہ تعالیٰ کی عطا جاری ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس رزق (عطائے جاری) کے لیے سعی بلیغ کی ہدایت کی ہے۔ جتنا انسان زیادہ کوشش کرے گا۔ اتنا ہی زیادہ وہ اس رزق (عطائے جاری) سے فائدہ حاصل کرے گا۔ ارشاد الٰہی ہے تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ لَا يَمْلِكُوْنَ لَكُمْ رِزْقًا فَابْتَغُوْا عِنْدَ اللّٰهِ الرِّزْقَ (العنکبوت:17) جن کو تم اللہ کے سوا پوجتے ہو وہ تمہاری روزی (رزق عطائے جاری) کے مالک نہیں ہیں سو تم اللہ کے پاس رزق تلاش کرو۔

وَابْتِغَاؤُكُمْ مِنْ فَضْلِهٖ (الروم 24:30) اور تم اس کا عطا کردہ فضل (رزق روزی) کی تلاش کرو۔

اس آیت میں رزق کو فضل کہا ہے۔ ایک اور مقام پر اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے فَانْتَشِرُوْا فِي الْاَرْضِ وَابْتَغُوْا مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ (الجمعہ :10) خدا کے فضل (رزق) کی تلاش کے لیے زمین میں پھیل جاؤ۔

وَلَا تَنْسَ نَصِيْبَكَ مِنَ الدُّنْيَا (القصص:77) اور تمہارا دنیا میں جو حصہ ہے اس کو نہ بھول جاؤ۔

وَاَنْ لَّيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى (النجم آیت 39)

انسان کو وہی کچھ ملے گا جتنی وہ کوشش کرے گا۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں اِسْعَوْا فَاِنَّ اللّٰهَ كَتَبَ عَلَيْكُمُ السَّعْيَ (مسند احمد، کنوز الحقایق) کوشش کرو کہ اللہ نے تم پر کوشش کرنی فرض کی ہے۔

اللہ تعالیٰ نے حصول رزق کا اصول سعی بلیغ اور جدوجہد بیان کر دیا ہے۔ جو شخص جتنی سعی بلیغ کرے گا اس کے مطابق اس کو رزق مل جائے گا۔ رزق کی تلاش کرنا انسان کا کام ہے۔ اب رزق کی فراخی اور تنگی کی وجہ سامنے آ گئی کہ جو شخص اللہ تعالیٰ کے بتائے ہوئے اصولوں کے مطابق زیادہ کوشش کرے گا تو اس کو وافر رزق نصیب ہوگا۔ اگر کوئی کاہلی اور سستی کا مظاہرہ کرے گا تو اس کے رزق میں تنگی آ جائے گی۔ اللہ تعالیٰ رزق کی فراخی اور تنگی انسان کی کوشش کے مطابق کرتا ہے چونکہ اللہ تعالیٰ مسبب الاسباب ہے علت العلل ہے اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے رزق کی تنگی اور فراخی اپنی طرف منسوب کی ہے۔ قرآن مجید کا یہ انداز بیان ہے۔ قرآن مجید میں دیگر مقامات پر رزق کے حصول کا اصول بھی بیان کر دیا جیسا کہ مذکورہ قرآنی آیات اور حدیث سے واضح ہے وہ اصول محنت، سعی بلیغ، جدوجہد ہے رزق کی فراخی اور تنگی اللہ تعالیٰ کی بے انصافی نہیں ہے بلکہ اللہ تعالیٰ کے مقرر کردہ اصول سے وابستہ ہے جو اس اصول کو اپنائے گا اس کا رزق وسیع ہوگا۔ اگر اس اصول سے روگردانی کرے گا تو اس کا رزق تنگ ہوگا۔

اسی دقیق مسئلہ کو دوسرے رنگ میں بیان کیا جاتا ہے وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ نے سامان رزق اپنی صفت رحمانیت کے تحت کائنات میں پیدا کر دیا ہے انسان کو یہ ہدایت کی ہے کہ وہ سامان رزق کے حصول کے لیے کوشش کرے۔ اللہ تعالیٰ اپنی صفت رحیمیت کے تحت تمہاری کوشش کا پھل دے گا۔ رزق کی فراخی اور تنگی صفت رحیمیت کے تحت ہے۔ اگر حصول رزق کے لیے زیادہ سعی ہے تو رزق وافر ملے گا اگر کوشش میں کمی رہ گئی ہے تو رزق کم ملے گا۔ رحیم وہ ذات ہے جو انسان کے عمل کا بہترین بدلہ دیتی ہے محنت کا پھل پانا اللہ کی صفت رحیم کے ساتھ وابستہ ہے۔ اسی لیے رزق کی فراخی اور تنگی اللہ کی طرف منسوب کی گئی ہے۔

اللہ تعالیٰ کا بیٹے بیٹیاں دینا:

اللہ نے واضح طور پر کہا ہے یَهَبُ لِمَنْ يَشَآءُ اِنَاثًا وَّيَهَبُ لِمَنْ يَّشَآءُ الذُّكُوْرَ جس کو چاہے لڑکیاں دے جس کو چاہے ذکور (لڑکے) دے۔ یہ اللہ تعالیٰ کا اپنا قانون اور مشیت ہے۔ یہ بیان کیا گیا ہے یہ اللہ تعالیٰ کی عطا ہے کہ اس پر راضی رہنا چاہیے۔ اگر لڑکا خدا کی عطا اور نعمت ہے تو لڑکی بھی عطا اور نعمت ہے۔ اللہ کی نظر میں لڑکا اور لڑکی دونوں برابر ہیں۔ ہندو دھرم میں عورت کے متعلق جو نفرت ہے اس کو رد کیا گیا ہے۔

خدا کا کلام کرنا:

ارشاد الٰہی ہے وَمَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّكَلِّمَهُ اللّٰهُ اِلَّا وَحْيًا اَوْ مِنْ وَّرَآئِ حِجَابٍ اَوْ يُرْسِلَ رَسُوْلًا فَيُوْحِيَ بِاِذْنِهٖ مَا يَشَآءُ (الشوری 51:42) اور کسی بشر کے لیے یہ میسر نہیں کہ اللہ اس سے کلام کرے مگر وحی سے یا پردہ کے پیچھے یا رسول بھیجے پس اپنے حکم سے جو چاہے وحی کرے۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے وحی کے تین طریقے بیان کیے ہیں۔ سوامی صاحب نے محض اپنی بے عقلی کی وجہ سے اعتراض کر دیا ہے وہ تین طریقے یہ ہیں دل میں القا۔ 2 خواب یا مکاشفہ کے پردہ میں۔ کسی فرشتہ کی وساطت ہے۔ اللہ اپنے مقرب بندوں سے ہم کلام ہوتا ہے۔ پہلی اور دوسری صورتوں کو وحی ولایت کا نام دیا جاتا ہے اخری شکل کو وحی نبوت کہا جاتا ہے، تکمیل شریعت کی وجہ سے آخری شکل یعنی وحی نبوت ختم ہو چکی ہے تا قیامت حضرت جبرائیل علیہ السلام وحی نبوت لے کر نازل نہیں ہوگا۔ معترض نے اس عقیدہ پر اعتراض کیا ہے جو تمام مذاہب کا مسلمہ عقیدہ ہے۔ اسی اعتراض میں سوامی جی نے اپنی ایک حماقت کا بھی اظہار کیا ہے دیانند جی لکھتے ہی "اگر یہ سچ ہے تو فرشتے اور پیغمبر خوب اپنا مطلب نکالتے ہوں گے قرآن مجید یہ بیان کرتا ہے کہ نبی بھی اسی وحی کی پیروی کرتا ہے جو اس پر نازل ہوتی ہے اور دوسروں کو بھی اسی کی پیروی کرنے کی تعلیم دیتا ہے اور فرشتوں کے متعلق یہ آتا ہے بَلْ عِبَادٌ مُّكْرَمُوْنَ لَا يَعْصُوْنَ لِاَمْرِ اللّٰهِ وَهُمْ يَفْعَلُوْنَ مَا يُؤْمَرُوْنَ یعنی فرشتے بھی اللہ کے حکم کی نافرمانی نہیں کرتے اور وہی کام انجام دیتے ہیں جس کا ان کو حکم دیا جاتا ہے۔ آیت مذکورہ میں فرشتوں کی ایک صفت عباد مکرمون یعنی معزز اور دوسری صفت فرمانبردار بیان کی گئی ہے۔

اسلام کے فرشتے ویدوں کے دیوتا نہیں جو موڈ دیوتا یا بے وقوف دیوتا کہلاتے ہیں اور ایشور سے اپنا الو سیدھا کرنا جانتے ہیں۔
اللہ تعالیٰ نے یہ نظام قائم کیا ہے فرشتے وسائط ہیں تمام نظام کائنات انہی وسائط کے ذریعہ چلا رہا ہے یہ وسائط اللہ کا حکم نافذ کرتے ہیں۔

......☆......

قرآن اور انجیل کی تعلیمات ایک دوسرے کے برعکس ہیں اور دونوں میں تضاد ہے لہٰذا دونوں کتب اللہ کا کلام نہیں

اعتراض :اگر عیسیٰ بھی خدا کا رسول ہے تو اس کی تعلیم کے برعکس خدا نے قرآن کیوں نازل کیا اور قرآن کے برعکس انجیل کیوں اتاری پس ثابت ہوا کہ یہ دونوں کتابیں کلام اللہ نہیں (ستیارتھ پرکاش اعتراض 138)

جواب :قرآن مجید اور انجیل کی تعلیم میں کوئی تضاد اور اختلاف نہیں بلکہ دنیا کی تمام آسمانی کتب میں اختلاف نہیں۔ اختلافات پیدا ہوئے ہیں پادریوں اور پنڈتوں کی تحریف کی وجہ سے اس مذہبی طبقے نے اپنے اپنے مذاہب میں شامل کر دی ہیں۔ جن کا اصلی اور حقیقی مذہب سے کوئی تعلق نہیں ہر مذہب نے توحید کی تعلیم دی ہے لیکن بعد کے آنے والوں نے اپنے اپنے مذہب میں شرک کی ملونی کر دی ہے تثلیث اللہ کی تعلیم نہیں بلکہ بعد کے آنے والے پادریوں نے یہ عقیدہ رائج کر دیا ہے۔ یہی حال دیگر مذاہب کے ماننے والوں کا ہے انہوں نے اپنے مذاہب میں غلط عقائد رائج کر لیے۔ تمام مذاہب ایک ہی سرچشمہ سے نکلے ہیں۔ سب کی تعلیم یکساں ہے کوئی اختلاف نہیں۔

......☆......

اللہ مجرموں کو پکڑوا کر گھسٹوائے گا یہ ہے مسلمانوں کا معبود

اعتراض :خوب! خدا کا رحم جان داروں پر خوب عیاں ہے کہ ان کو پکڑواتا گھسٹواتا ہے جب معبود ہی ایسا ہے تو اس کے عابد مسلمان عاجزوں کو پکڑیں اور گھسیٹیں تو کیا تعجب ہے؟ پھر خدا دنیاداروں کی طرح بیاہ بھی کراتا ہے گویا مسلمانوں کا پروہت ہے۔ (ستیارتھ پرکاش اعتراض 139)

سورۃ الدخان کی آیت 54,47 پر یہ اعتراض کیا گیا ہے۔

جواب :ارشاد الٰہی ہے خُذُوْهُ فَاعْتِلُوْهُ اِلٰى سَوَآءِ الْجَحِيْمِ (الدخان 44:47) اسے پکڑو پھر اسے دوزخ کے درمیان کھینچ لے جاؤ یہ آیت جہنمیوں کے متعلق ہے جنہوں نے اس دنیا میں اللہ کے احکام کے خلاف زندگی بسر کی۔ نبیوں نے ان لوگوں کو اللہ کی راہ بھی بتلائی ہے اللہ تعالیٰ نے نیکی اور بدی میں تمیز کرنے کے لیے عقل کی نعمت سے بھی نوازا۔ عقل ایک روشنی ہے لیکن ان مجرموں نے عقل سے بھی کام نہ لیا۔ تمام مذاہب کی یہ تعلیم ہے کہ آخرت میں اس قسم کے لوگوں کو سزا ملے گی۔ تو زیر اعتراض آیت میں ان مجرموں کا ذکر ہے۔ جو سزا کے مستحق ہیں۔ اللہ تعالیٰ تو فرماتا ہے اِنَّ اللّٰهَ لَا يَظْلِمُ النَّاسَ شَيْئًا وَّلٰكِنَّ النَّاسَ اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ (یونس 10:44) اللہ لوگوں پر ظلم نہیں کرتا لیکن لوگ آپ اپنی جانوں پر ظلم کرتے ہیں۔ اللہ سزا بطور ظلم نہیں دیتا بلکہ ان کے اعمال کے نتیجہ میں سزا دیتا ہے۔

دوسری جگہ آتا ہے وَاَنَّ اللّٰهَ لَيْسَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيْدِ (الحج 22:10) اور اللہ بندوں پر ظلم کرنے والا نہیں۔

<u>خدا مسلمانوں کا پروہت ہے:</u>

قرآن مجید کی اس آیت پر اعتراض کیا ہے كَذٰلِكَ وَزَوَّجْنٰهُمْ بِحُوْرٍ عِيْنٍ (الدخان 44:54)

اور ایسا ہی ہوگا اور ہم انہیں خوبصورت حوروں کے ساتھی بنادیں گے۔

اس دنیا کے طریقہ مناکحت کو اس دنیا میں حوروں کا ساتھی ہونے پر قیاس کرنا پرلے درجے کی لاعلمی اور بے سمجھی ہے حور نعمائے جنت میں سے ایک نعمت ہے جو مردوں کے لیے بھی ہے اور عورتوں کے لیے بھی۔ مرد اور عورت دونوں حور کے قرین اور ساتھی ہوں گی حور کے ساتھ مصاحبت تزویج مناکحت کے رنگ میں نہیں بلکہ قرین اور ساتھی کے رنگ میں ہوگی یہ حوریں انسان کے حسن اعمال کا نتیجہ ہیں۔ جو دوسرے عالم میں ایک نیا رنگ اختیار کر لیتے ہیں اس اَن دیکھی حقیقت کو اس دنیا میں نہیں سمجھ سکتے۔ حور غلمان اور دیگر نعمائے جنت پر مفصل بحث گزر چکی ہے قارئین وہ اپنے سامنے رکھیں۔

الزامی جواب:

معترض نے اسلام کے خدا پر پروہت ہونے کا الزام لگایا ہے قرآن مجید میں صرف یہ درج ہے کہ جنہوں نے اچھے کام کیے اللہ تعالیٰ ان کو بے عیب اور مطہر زندگی کے ساتھ ایک قرین دے گا۔ اس میں خدا کے پروہت یا نکاح خوانی کی کوئی بات ہی نہیں البتہ جب وید کا مطالعہ کیا جائے تو اس میں ایشور کو پروہت کہا گیا ہے "اگنم ایلھے پردھتم یعنی اگنی ایشور کی میں تعریف کرتا ہوں جو پروہت ہے رہا بیویاں مہیا کرنا سو یہ اندر آریوں کے ایشور کا کام ہے چنانچہ رگ وید منڈل 5 سوکت 31 منتر 2 میں ہے۔

"اینام چہ جنیوتہ چکرتھ" یعنی اے اندر تو نے جن کی بیویاں نہ تھیں ان کو بیویاں والا بنایا اور رگوید منڈل 4 سوکت 17 منتر 15 میں ہے۔

"جنیو جنی دام" یعنی بیویوں کی خواہش کرتے ہوئے ہم بیویاں دینے والے اندر کو اکساتے ہیں۔

☆......☆
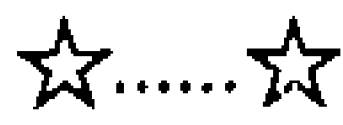
اسلام نے فساد اور نفاق کی بنیاد ڈالی۔ عربوں کو آپس میں لڑایا

اعتراض: اس بات کی تعلیم نے تو بے چارے عربوں کو سب سے لڑا کر اور اس پر مخالفت پیدا کر کے عذاب میں ڈالا اور مذہب کا جھنڈا کھڑا کر کے فساد برپا کرنے پر آمادہ کیا جس نے قوم میں نفاق کی بنیاد ڈالی اور جو سب کو تکلیف دینے والا ہے۔ اسے کوئی دانا خدا نہیں مان سکتا۔ (ستیارتھ پرکاش اعتراض 142)

جواب: یہ اعتراض جہاد پر ہے۔ اسلام میں تصور جہاد پر سیرت سید البشر کے تینوں حصوں میں مختلف مقامات پر مفصل بحث کی ہے۔ خصوصاً حصہ دوم میں عنوان جہاد کے تحت جہاد کے تمام پہلوؤں پر بحث گزر چکی ہے۔ اسلام کی جنگیں مدافعانہ تھیں انہی مدافعانہ جنگوں کی وجہ سے عرب میں امن قائم ہوا۔ عربوں کو ایک قوم بنایا ان میں زندگی بخشی اور عرب سے نکل کر تمام مسکونہ زمین پر غالب آ گئے۔ عربوں کو زمین سے اٹھا کر بلندیوں تک پہنچایا۔

اسلام نے نفاق پیدا نہیں کیا بلکہ عربوں کو اتحاد کی سلک میں منسلک کر کے تختوں کا وارث بنایا۔ اس کے برعکس جب ہندو دھرم کا مطالعہ کرتے ہیں وہاں نفاق اور طبقاتی تقسیم کی ظلمت نظر آتی ہے۔ برہمن چھتری، ویش، شودر، اسر راکشس اور ملیچھ وغیرہ مختلف خطاب دے کر لوگوں کو مختلف گروہوں اور طبقات میں تقسیم کر دیا ہے۔ اس طبقاتی تقسیم نے ارض ہند کو فساد کی آگ میں جھونک دیا تھا۔ جو شودروں

کے ساتھ ظلم ڈھائے گئے۔ کہیں تاریخ میں اس کی مثال نہیں ملتی ہے۔

ستیارتھ پرکاش کا اعتراض 144 بھی جہاد پر ہے۔ نہ اعتراض کو دہرانے کی ضرورت ہے اور نہ جواب دینے کی ضرورت ہے جہاد پر تفصیلی بحث کئی مقامات پر کی جا چکی ہے۔ سوامی دیانند نے جہاد پر اعتراض مختلف زاویوں سے کئی بار کیا ہے لیکن مقصد ایک ہی ہے کہ اسلام دنگا فساد اور لوٹ مار کا مذہب ہے حالانکہ وید میں اپنے تمام مخالفوں سے جنگ کرنے کا حکم ہے۔

''آگ برسانے والے شعلہ کی طرح تیز تیروں کے ساتھ آراستہ ہو کر اپنے ہتھیاروں کو تیز کرتے ہوئے جنگ میں جاؤ

''آگ کی طرح لال بھبوکا ہو کر اے فتح مند مینیو (غیظ وغضب کے دیوتا) مخالفوں کو شکست دو اپنی طاقت دکھاؤ تمہیں یہاں بلایا گیا ہے جنگ میں ہمارے سپہ سالار بنو مخالفوں کو قتل کر کے ان کی دولت ہمیں دے دو۔ ہمیں طاقت دے کر مخالفوں کو قتل کرو، رگ وید منڈل 10 سوکت 84 منتر 2,1)

''اے غیظ وغضب کے دیوتا تمہاری تعریف کی جاتی ہے تم اکیلے ہو جنگ کے لیے ہر شخص کو اکساؤ۔ تمہیں مددگار پا کر ہماری تجلی کبھی فنا نہ ہوگی فتح پانے کے لیے ہم نعرہ بلند کرتے ہیں۔ (حوالہ مذکور منتر 4)

''مجھ کو چاہیے کہ میں بہادری کے ساتھ غیر ملک والوں کو جلا دوں برہمنوں کو دان (ٹیکس) نہ دینے والو کو جلا دوں مخالفوں کو بھسم کر دوں'' (یجروید 7:1)

''اے سخت سزا دینے والے دھرم کے مخالف لوگوں کو ہمیشہ جلایئے اور اے جاہ وجلال والے جو شخص ہمارے مخالفوں کو حوصلہ دیتا ہے آپ اس کو الٹا لٹکا کر خشک لکڑی کی طرح جلایئے۔'' (یجروید 12:13)

''برہمن کے فاتح بدکردار دیوتاؤں کو دکھ دینے والوں کو دان (برہمنوں کا ٹیکس) نہ دینے والے کے کندھوں اور سر کو صدہا جوڑ والے تیز اُسترے کی سی دھار والے ہتھیار سے توڑ دے۔ (اتھروکانڈ 12 سوکت 5 منتر 60)

یہ ہے ہندو دھرم کی تعلیم کیا اس تعلیم کی روشنی میں دنیا میں امن قائم ہو سکتا ہے۔ آریوں نے اپنے مذہبی مخالفین سے جو مظالم کیے۔ تاریخ میں اس کی نظیر نہیں ملتی۔

......☆......

1۔ آسمان کا پھٹنا 2۔ خدا کا مجسم ہونا 3۔ جنتیوں کے دائیں ہاتھ میں اعمال نامہ دینا اور دوزخیوں کو بائیں ہاتھ میں (یہ لڑکپن کی باتیں ہیں)

اعتراض: کیا اعلیٰ فلاسفی کی باتیں ہیں کیا کبھی آسمان بھی پھٹ سکتا ہے؟ کیا وہ کپڑا ہے پھٹ جائے گا اگر اوپر کی تمام دنیا کا نام اسمان ہے تو بھی یہ بات بعید از قیاس ہے اب تو یہ بات کافی طور پر ثابت ہو گئی ہے کہ قرآنی خدا مجسم ہے کیوں کہ وہ تخت پر بیٹھے گا اور اٹھ کہار اسے اٹھائے ہوئے ہوں گے اور کسی کا اس کے آگے پیچھے آنا جانا بھی جب ہی ممکن ہے کہ وہ جسم ہو۔ خدا مجسم اور ایک جگہ مقیم ہونے کی وجہ سے ہمہ دان۔ سب جگہ حاضر و ناظر اور قادر مطلق نہیں ہو سکتا اور سب جانداروں کے تمام اعمال نہیں خدا کے (انصاف کا

طریق بھی حیرت انگیز ہے یعنی نیکوکاروں کے داہنے ہاتھ میں اعمال نامہ ہونا اور بہشت میں بھیجے جانا اور گناہ گاروں کے بائیں ہاتھ میں اعمال نامہ ہونا اور ان کا دوزخ میں ڈالا جانا کیا ہمہ دان خدا کو بھی بذریعہ تحریر انصاف کی ضرورت ہے یہ تو لڑکپن کی بات ہے (سیتارتھ پرکاش اعتراض 145)

جواب: یہ اعتراض سورہ الحاقہ کی آیات 16 تا 26 پر کیا گیا ہے۔ یہ اعتراض بھی کئی اجزاء پر مشتمل ہے۔ بعض کا جواب دیا جا چکا ہے۔ جن جن اجزاء کا جوابات نہیں دیئے گئے وہی دیئے جائیں گے۔

انْشَقَّتِ السَّمَاءُ آسمان کا پھٹنا:

آسمان پھٹنے سے مراد ایتھر کی حرارت ضائع ہو کر اس کا پھٹنا فضا میں خلا پیدا ہو جانا اور اجرام سماوی کا ٹوٹ پھوٹ جانا ہے

Unseen universe by stewart & fait P91 solar physics by John Norman Lockyer P93.

2- محاورہ زبان کے لحاظ سے آسمان پھٹنے سے مراد آسمانی مصائب کا نزول ہے 3- آسمانی برکات کا منقطع ہو جانا بھی ہو سکتا ہے اللہ کا عرش پر متمکن ہونا اور اٹھ فرشتوں کا اٹھائے ہونا: ان موضوعات پر مفصل بحث گزر چکی ہے سلسلہ کلام کو جاری رکھنے کے لیے اختصار کے ساتھ یہ عرض ہے کہ حمل عرش سے یہ مراد لینا کہ واقعی کوئی عظیم الشان تخت بنا ہوا ہے اور فرشتے اس کو اٹھائے ہوئے ہوں گے صحیح نہیں اللہ تعالیٰ قیوم ہے ہر چیز کے قیام کا موجب ہے کوئی چیز اس کے قیام کی موجب نہیں اس سے مراد نفاذ امر کا حمل ہے۔ کرسی پر متمکن ہونے سے مراد اللہ کا اقتدار اعلیٰ مراد ہے اور فرشتے اس کے حکم کو نافذ کرتے ہیں لفظ کرسی پر مفصل بحث گزر چکی ہے قارئین اس کو سامنے رکھیں

دائیں اور بائیں کے اعمال نامے سے مراد:

اعمال ناموں کی بحث بھی گزر چکی ہے انسان نے جو کچھ اس دنیا میں کیا ہے اس کا ظہور آخرت میں ہوگا قرآن مجید میں انسانی اعمال ناموں کو مختلف انداز میں بیان کیا گیا ہے اور یہ ظاہر کیا گیا ہے کہ انسان کے اعمال ضائع نہیں جاتے۔ ان کے نتائج ظاہر ہوں گے۔ ان لوگوں پر یہ بات واضح کی گئی ہے جو صرف اس دنیا کی زندگی کے ہی قائل ہیں۔ وہ لفظ کرسی (اقتدار کی علامت ہے) یعنی مقتدر اعلیٰ کے سامنے پیش ہوں گے وہ اپنے کردہ افعال کے نتائج دیکھیں گے۔

یمین اور شمال (دایاں اور بایاں ہاتھ سے مراد:-

عربی زبان میں یمین منزلہ حسنہ پر بولا جاتا ہے اہل عرب کہتے ہیں فلان عندی بالیمین جس سے مراد یہ ہے کہ وہ اچھے مرتبہ پر ہے گویا یمین کے معنی منزلہ حسنہ ہے جب ایک شخص کا مقام ذلیل ہو تو کہا جاتا ہے انت عندی بالشمال شمال کے معنی شوم اور نحوست بھی ہیں۔ دائیں ہاتھ میں اعمال نامہ دیئے جانے کا مطلب منزلہ حسنہ یعنی اچھا ٹھکانہ اور اچھی منزل کا حصول ہے یعنی جنت اور بائیں ہاتھ میں اعمال نامہ دیئے جانے کا مطلب یہ ہے کہ ان کا ٹھکانہ برا ہوگا یعنی وہ دوزخ میں جائیں گے۔ قرآن مجید عربی زبان میں نازل ہوا ہے۔ اس کے معانی عربی محاورہ کے مطابق ہی کیے جائیں گے۔ قرآن مجید نے یمین اور شمال کے الفاظ بیان کر کے اعمال حسنہ کے نتیجہ میں اچھے ٹھکانے (جنت) اور اعمال سیہ کے برے ٹھکانے (دوزخ) کا اظہار کیا ہے یہی قرآن مجید کی فصاحت و بلاغت کا کمال ہے کہ ایک لفظ کے تحت معانی کا ایک سمندر ہے۔ جس کا احاطہ کرنا مشکل ہے یہی وجہ ہے کہ اہل زبان قرآن مجید کو سنتے تھے تو اس کی فصاحت و بلاغت کے

سامنے سرنگوں ہو جاتے تھے کسی اہل زبان نے قرآن مجید کی فصاحت و بلاغت کا انکار نہیں کیا۔ لیکن کور ذوق اور عربی زبان سے نابلد شخص قرآن مجید پر اعتراض کر دیتے ہیں وہ اعتراض معترض کی لاعلمی، کور ذوقی اور عربی زبان کے حسین محاورات سے ناسمجھی پر دلالت کرتا ہے اعمال نامے کا دائیں اور بائیں ہاتھ میں بیان کرنے سے اعمال حسنہ اور اعمال سیہ کے انجام کو خوبصورت انداز میں بیان کر دیا ہے۔ سوامی جی اپنی کور ذوقی کی وجہ سے خوبصورت انداز بیان سے لطف اندوز نہیں ہو پائے۔

☆......☆

جنت میں حوروں پر اعتراض (کیا بہشت رنڈی خانہ ہے؟)

اعتراض : بھلا یہ بہشت ہوا یا رنڈی خانہ؟ اور وہاں کا خدا خدا ہے یا عورتوں کا شائق؟ کیا کوئی عقل مند اس کتاب کو جس میں ایسی باتیں درج ہوں کلام اللہ تسلیم کر سکتا ہے مسلمان بتائیں کہ جو عورتیں بہشت میں ہیں آیا وہ ہمیشہ سے ہی وہاں رہتی ہیں یا وہیں پیدا ہوئی ہیں یا اس دنیا سے مر کر وہاں پہنچی ہیں اگر یہاں سے مر کر وہاں گئی ہیں تو بتایئے کہ خدا نے عورتوں کو قیامت کے دن سے پہلے بہشت میں کیوں بلا لیا اور مردوں کو کیوں نہ بلایا؟ اور قیامت کے دن انصاف کرنے کا قاعدہ کیوں توڑا۔ اور اگر وہ عورتیں اس جگہ پیدا ہو کر وہاں رہتی ہیں تو قیامت کے دن تک ان کا وہاں گزارہ کیسے ہوگا اور اگر ان کے لیے وہاں مرد بھی موجود ہوں تو خدا اور بیویاں یہاں سے بہشت میں جانے والے مسلمانوں کو کہاں سے دے گا؟ جس طرح ہمیشہ کے لیے بہشت میں رہنے والی عورتیں خدا نے بنائیں اس طرح مردوں کو کیوں نہ بنایا؟ عورتوں کو ہی ہمیشہ کے لیے بہشت میں رکھنا اور مردوں کو نہ رکھنا ثابت کرتا ہے کہ خدا بے انصاف اور طرف دار ہے۔ (ستیارتھ پرکاش اعتراض نمبر 46)

حوروں کے متعلق اسی رنگ میں اعتراض دھرم پال مصنف ترک اسلام نے سوال نمبر 41 میں کیا ہے۔ نیز تمام مخالفین اور مستشرقین نے بہشت میں حوروں کے متعلق کیا ہے۔

جواب : معترضین کی پہلی علمی غلطی یہ ہے کہ انہوں نے حور سے مراد خوبصورت عورتیں لی ہیں۔ دوم بہشت کی نعمتوں سے حور کو جس مفہوم میں بیان کیا گیا ہے معترضین اس کو قطعاً سمجھ نہیں پائے۔

حور کا تصور:

بہشت میں نعماء الٰہیہ میں سے ایک نعمت حور ہے حور ایک تو احور کی جمع ہے جو مرد پر بولا جاتا ہے۔ دوسری حوراء کی جمع ہے جو عورت پر بولا جاتا ہے گویا لفظ حور جمع کے لحاظ سے مرد اور عورت پر بولا جاتا ہے۔

حور کے اصل معنی سفیدی ہیں جو صفائی اور پاکیزگی کی علامت ہے احور اس مرد کے لیے بولا جاتا ہے جس کی آنکھوں کی سفیدی نہایت درجہ کی ہو اور سیاہی بھی نہایت درجہ کی ہو اور ساتھ پاکیزہ اخلاق کا مالک بھی ہو اسی طرح حوراء اس عورت پر بولا جاتا ہے جس کی آنکھوں کی سفیدی اور سیاہی غایت درجہ کی ہو اور پاکیزہ اخلاق کی مالک بھی ہو احور اور حوراء دونوں الفاظ مرد اور عورت کی ظاہری اور باطنی حُسن کو ظاہر کرتے ہیں۔

دوم: بہشت کی نعماء مرد اور عورت کے لیے ہیں ارشاد الٰہی ہے۔

وَمَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَاُولٰٓئِكَ يَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ يُرْزَقُوْنَ فِيْهَا بِغَيْرِ حِسَابٍ (المومن 40:40)

اور جو نیک کام کرے خواہ وہ مرد ہو یا عورت اور وہ مومن ہو تو یہی جنت میں داخل ہوں گے اور ان پر ذرہ بھر ظلم نہ کیا جائے گا۔

فرمایا:

وَمَنْ يَّعْمَلْ مِنَ الصّٰلِحٰتِ مِنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَاُولٰٓئِكَ يَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ وَلَا يُظْلَمُوْنَ نَقِيْرًا o

(النساء 124:4)

اور جو کام کرے خواہ وہ مرد ہو یا عورت اور وہ مومن ہوں۔ تو یہی جنت میں داخل ہوں گے اور ان پر ذرہ بھر ظلم نہ کیا جائے گا۔

یہ دونوں آیات ظاہر کرتی ہیں کہ مرد اور عورت دونوں اعمال کے نتائج کے لحاظ سے برابر ہیں جس طرح صالح مرد کے لیے جو نعماء جنت ہیں وہی نعماء جنت عورت کے لیے بھی ہیں۔

اب ان آیات کا ذکر کیا جاتا ہے جن میں ''حور'' بطور نعمت کے ذکر کیا گیا ہے۔ واضح ہو جائے گا کہ اس نعمت سے مرد اور عورت کی کوئی تخصیص نہیں کی گئی۔ ارشاد الٰہی ہے۔

اِنَّ الْمُتَّقِيْنَ فِيْ مَقَامٍ اَمِيْنٍ فِيْ جَنّٰتٍ وَّعُيُوْنٍ، .... وَزَوَّجْنٰهُمْ بِحُوْرٍ عِيْنٍ (الدخان 44:51-55)

متقی امن کی جگہ میں ہوں گے باغوں اور چشموں میں...... ہم انہیں خوبصورت حوروں کے ساتھی بنا دیں گے۔

دوسری جگہ ہے۔

اِنَّ الْمُتَّقِيْنَ فِيْ جَنّٰتٍ وَّنَعِيْمٍ.......... مُتَّكِئِيْنَ عَلٰى سُرُرٍ مَّصْفُوْفَةٍ وَزَوَّجْنٰهُمْ بِحُوْرٍ عِيْنٍ

(الطور 52:17-20)

متقی باغوں اور نعمتو میں ہیں...... بچھے ہوئے تختوں پر تکیے لگائے ہوئے ہم انہیں خوبصورت حوروں کے ساتھی بنا دیں گے۔

قرآن مجید میں زَوَّجْنٰهُمْ بِحُوْرٍ کے الفاظ میں۔ لفظ ''حور'' میں مرد اور عورت دونوں شامل ہیں اور کہیں بھی زَوَّجْنٰهُمْ حَوْرَاء نہیں آیا۔ لہٰذا یہ واضح ہوتا ہے کہ حور بہشت کی نعمت ہے جو مرد اور عورت دونوں کے لیے یکساں ہے دونوں آیات میں لفظ متقین میں مرد اور عورت دونوں شامل ہیں اسی طرح ایک اور آیت ہے۔

وَالسّٰبِقُوْنَ السّٰبِقُوْنَ اُولٰٓئِكَ الْمُقَرَّبُوْنَ فِيْ جَنّٰتِ النَّعِيْمِ...... وَحُوْرٌ عِيْنٌ (الواقعہ 56:10-21)

اور آگے بڑھنے والے سب سے آگے ہیں وہی مقرب ہیں نعمتوں والے باغ وہیں...... خوبصورت حوریں اس آیت میں السّٰبِقُوْنَ السّٰبِقُوْنَ میں بھی مرد اور عورت دونوں شامل ہیں دونوں جنت میں ہوں گے وہاں بطور نعمت ''حور عین'' ان کے ساتھی ہوں

گے۔ آخر میں یہ الفاظ ہیں۔ جَزَآءً بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ (الواقعہ 24:56)، اس کا بدلہ ہے جو کرتے ہیں گویا یہ نعماء جنت اہل جنت (مرد و زن) کے اعمال کی جزا ہیں ان کے اپنے پاکیزہ اعمال ان نعماء کی شکل میں متمثل ہوتے ہیں جیسا کہ پہلے یہ ذکر کیا گیا ہے لفظ حور پاکیزگی اور طہارت کا مفہوم اپنے اندر لیے ہوئے ہے اس لیے انسان کی اپنی پاکیزگی اور طہارت ہی حور کی شکل اختیار کرے گی لہٰذا جنت کی حور کو اس دنیا کی عورتوں کی مانند جاننا کھلی جہالت ہے۔

نعماء جنت کے متعلق یہ بات جان لی جانی چاہیے کہ جنت کی نعما اور اس دنیا کی نعماء میں صرف نام کا اشتراک ہے ابن عباس سے ابن کثیر میں روایت ہے۔

لَا يَشْبَهُ شَيئٌ مِمَّا فِي الْجَنَّةِ مَا فِي الدُّنْيَا اِلَّا فِي الْاَسْمَآءِ

یعنی جو چیزیں جنت میں ہیں وہ دنیا کی کسی چیز سے سوائے نام کے مشابہت نہیں رکھتیں قرآن میں اس کی صراحت کر دی گئی ہے۔ ارشاد الٰہی ہے۔

فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّا اُخْفِيَ لَهُمْ مِّنْ قُرَّةِ اَعْيُنٍ (السجدہ 17:32)

بس کوئی شخص نہیں جانتا کہ ان کے لیے کیسی آنکھوں کی ٹھنڈک چھپا رکھی ہے۔

صحیح بخاری میں اسی آیت کی تفسیر میں رسول کریم صلعم نے فرمایا:

قَالَ اللّٰهُ اَعَدَدْتُ لِعِبَادِي الصَّالِحِيْنَ مَا لَا عَيْنٌ رَاَتْ وَلَا اُذُنٌ سَمِعَتْ وَلَا خَطَرَ عَلٰى قَلْبِ بَشَرٍ (بخاری)

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ میں نے اپنے صالح بندوں کے لیے وہ کچھ تیار کیا ہے جس کو نہ کسی آنکھ نے دیکھا نہ کسی کان نے سنا ہے نہ کسی شخص کے دل پر وہ گزرا۔

سورہ محمد کی آیت 15 میں نعماء جنت کی جو کیفیت بیان کی گئی ہے وہ بھی ظاہر کرتی ہیں کہ صرف ناموں میں اشتراک ہے کیفیت اور اوصاف میں نہیں ہے۔

سوامی دیانند یا اس قسم کے دیگر معترضین لفظ حور کی وجہ سے جو اعتراض کرتے ہیں وہ ایک تو حور کے معنی سے ناواقف ہیں لفظ حور مرد اور عورت دونوں کے لیے بولا جاتا ہے۔ دوم: بہشت میں نعمت حور کس مفہوم میں بیان ہوئی ہے؟ اس کی کہنہ سے بالکل نابلد ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ جنت کی نعمتوں کی نوعیت اور کیفیت کا تصور انسان کے دل و دماغ میں آ ہی نہیں سکتا۔ یہ وہ روحانی لذات ہیں۔ جن سے اللہ تعالیٰ اپنے ربانی بندوں کو کسی حد تک اس دنیا میں آشنا کرتا ہے۔ لیکن اس کا مکمل اظہار بہشت میں ہی ہوگا لہٰذا بہشت نہ تو رنڈی خانہ ہے نہ خدا عورتوں کا شائق ہے نہ عورتیں بہشت میں بستی ہیں نہ خدا نے عورتوں میں بہشت میں قیامت سے پہلے بلا لیا اور مردوں کو نہ بلایا نہ بہشت میں اس قسم کی عورتیں ہوں گی جن کا قیامت کے دن تک گزارہ نہ ہو سکے گا۔ نہ خدا نے بہشت میں ہمیشہ رہنے والی عورتیں بنائیں اور مردوں کو کیوں نہ بنایا یہ سب سوامی دیانند کے دماغ کی اختراع ہے۔ بہشت کی نعمتوں کی کیفیت سے آشنا ہو نہیں سکتا۔ معترضین کو صرف اتنا جان لینا چاہیے کہ انسان کے نیک اعمال کی جزاء کے روحانی ثمرات ہیں۔ ہر نیک عمل کی جزا کا روحانی ثمر الگ ہوگا۔ قرآن مجید میں ان روحانی ثمرات کو مختلف ناموں سے بیان کیا ہے تاکہ انسان کا ذہن ان نعماء کی کیفیت اور نوعیت کسی حد تک سمجھ سکے۔

دنیا کے مذاہب کی تمام کتب میں کسی نہ کسی رنگ میں دوزخ اور جنت کی کیفیت بیان کی ہے۔ انسان کو اس دنیا کی نعمتوں کی مماثلت سے سمجھایا ہے۔ عموماً یہی ہوتا ہے کہ جس شخص نے کوئی چیز نہ دیکھی ہو تو اس کو سمجھانے کے لیے کوئی مثال دینی پڑتی ہے مثلاً کسی نے ہوائی جہاز نہ دیکھا ہو تو اس کو سمجھانے کے لیے کسی بڑے پرندے کا نام لینا پڑے گا۔ اس کے دو بازو ہوتے ہیں دم ہوتی ہے وغیرہ وغیرہ اگر

کوئی بچہ جنسی لذت کے متعلق سوال کرے تو جنسی لذت کی کیفیت کو ظاہر کرنے کے لیے کوئی مثال دینی پڑے گی۔ یا یوں کہہ دیا جائے گا جیسے شہد کی مٹھاس، قرآن مجید نے بہشت کی نعماء کو محض سمجھانے کے لیے اس دنیا کی نعمتوں سے مشابہت دی ہے۔

الزامی جواب: ویدوں میں بھی انہی ناموں کے ساتھ نعماء بہشت کا ذکر کیا ہے برہموں کو کھیر کھلانے اور سفید پاؤں والی بھیڑ خیرات کرنے سے ملتی ہے اس میں گھی کے تال شہد کی نہریں بہتی ہوئی شراب، دودھ کی نہریں، دہی کے تالاب نیلوفرم کے حوض (دراز زلفوں والے حسین مغنی) گندھرو (لونڈے) عورتوں کے جھنڈ سب سورگی لالاؤں کو ملیں گے۔ (اتھروید کانڈ 4 سوکت 34)

اس میں ایشور جی کا شہر ایودھیا جس کی آٹھ فصیلیں نو دروازے ہیں اس میں ایشور جی کے بیٹھنے کی ایک پالکی سونے کے لیے پلنگ۔ (اتھرو 31:2:10) اور شری اور لکشمی (دو بیویاں) ہیں جن میں ویدک ایشور ہمیشہ غلطاں رہتا ہے۔ (یجرو وید 22:30)

ہندو معترض ذرا اپنی کتب ویدوں پر ایک نظر ڈالیں۔ تو ان کا اعتراض خود بخود ختم ہو جائے گا۔ بلکہ ویدک نے ایشور کو اس طرح بیان کیا ہے جیسا کہ کوئی اس بازار کا ہے۔ بہشت کی بھی جس طرح تصور کشی کی ہے تو طبیعت اس سے ابا کرتی ہے لیکن جس رنگ میں بہشت کی نعماء کو سمجھانے کے لیے قرآن مجید نے طرز بیان اختیار کیا ہے اس سے بہتر ہو نہیں سکتا۔ رسول کریم ﷺ نے وضاحت کرتے ہوئے فرمایا کہ یہ ایسی نعمتیں ہیں جن کی کہنہ اور کیفیت انسان کے دل میں آ ہی نہیں سکتی۔

......☆......

اللہ مسلمان کا ہے دوسروں کا نہیں قرآن کسی متعصب شخص کی تصنیف ہے

اعتراض: کیا اللہ مسلمانوں ہی کا ہے دوسروں کا نہیں کیا تیرہ سو برس کے پہلے خدا کی طرف سے کوئی مذہب نہ تھا اس سے ثابت ہوتا ہے کہ قرآن کلام اللہ نہیں بلکہ کسی متعصب آدمی کی تصنیف ہے۔ (ستیارتھ پرکاش اعتراض 47)

جواب: یہ اعتراض تو قرآن مجید کے نہ سمجھنے کا واضح ثبوت ہے۔ جب دیگر مذاہب کا مطالعہ کیا جائے تو ان کی کتب میں قومی خدا کا تصور پایا جاتا ہے۔

بائبل میں یہود کا خدا قومی خدا ہے ہر جگہ اللہ تعالیٰ کو خداوند اسرائیل کے نام سے پکارا ہے ان الفاظ سے خدا تعالیٰ کی ذات کا مفہوم محدود ہو کر رہ جاتا ہے۔

بائبل میں لکھا ہے اے خداوند اسرائیل کے خدا تجھ سا کوئی خدا نہ اوپر آسمان میں ہے نہ نیچے زمین میں۔ (سلاطین اول 23:8)

''تیرے سوا جہاں تک کہ ہم نے اپنے کانوں سے سنا کوئی خدا نہیں اور دنیا میں تیری قوم اسرائیل کی مانند ایک قوم کون ہے کہ جس کو بچانے کو خدا آپ گیا تاکہ اسے اپنی قوم آپ بنائے۔'' (سموئیل دوم 23:22:7)

ہندو کا خدا بھی قومی خدا ہے۔ سام وید میں ہے ''اے اندر دیوتا! تو غیر ویدک دھرمیوں کو کب یوں کچل کر تباہ کرے گا جیسے چھتری دار پھول کو پاؤں سے کچل کر تباہ کر دیا جاتا ہے۔ اے اندر تو کب ہماری ان دعاؤں کو سنے گا۔'' (سام وید اتر آرچک ادھیائے 10 منتر 3)

آریہ ایشور کے بیٹے کا نام ہے تو یہ ایشور صرف آریوں کا خدا ہوا ناریوں کا نہ ہوا۔ پھر برہمنوں کا دیوتا اگنی ہے کشتریوں کا اندر ہے غریب شودر کا کوئی دیوتا نہیں۔ صرف اسلام ہی ایک ایسا دین ہے جس نے اللہ کے تصور کی عالمگیر بیان کی ہے۔

وہ خدا ساری دنیا کا خدا ہے ہر قوم کی راہنمائی کے لیے نبی بھیجے۔ ساری مخلوق کے لیے کائنات میں مادی اشیاء پیدا کر دی ہیں جن سے ہر شخص خواہ وہ دہریہ ہے یا مشرک یا موحد فائدہ اٹھا رہا ہے۔ قرآن مجید نے اس کا نام رب العالمین بیان کیا ہے قرآن مجید اسی صفت کے ساتھ شروع ہوتا ہے ارشاد الٰہی ہے۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ (سورۃ فاتحہ 2:1)

سب تعریف اللہ کے لیے ہے تمام جہانوں کا رب۔

دوسری صفت رحمان بیان کی ہے۔ اس صفت میں بھی عالمگیریت پائی جاتی ہے یعنی رحمان وہ ہستی ہے جس نے انسان کی روحانی اور مادی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے ہر قسم کا سامان مہیا کر رکھا ہے روحانی ضرورت کو پورا کرنے کے لیے نبی بھیجے۔ ان پر احکام نازل کیے تاکہ انسان ان پر عمل کر کے روحانی پھل پائے۔ مادی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے کائنات میں ہر قسم کا سامان پیدا کر رکھا ہے۔ سورج، چاند، پانی ہوا، ستارے، پہاڑ، زمین، آسمان غرض کہ کوئی ایسی چیز تخلیق سے باہر نہیں رہی جو انسان کی ضرورت کے لیے ضروری ہو لیکن پیدا نہ کی گئی ہو۔ پھر خدا کی پیدا کی ہوئی چیزوں سے ہر آدمی فائدہ اٹھا رہا ہے۔ الغرض اسلام ہی ایک ایسا دین ہے جس نے خدا کو تمام انسانوں کا خدا کہا ہے۔ پھر قرآن مجید نے اللہ تعالیٰ کو رب الناس کہا ہے یعنی تمام انسانوں کا رب پھر ایک جگہ فرمایا یا رب المشرق والمغرب

یعنی اسلام کا خدا مشرقی لوگوں کا رب بھی ہے اور مغربی لوگوں کا بھی وہی رب ہے۔

اسلام ہر نبی کا دین ہے:

معترضین کی یہ بھی غلطی ہے کہ وہ سمجھتے ہیں کہ اسلام صرف مسلمانوں کا دین ہے۔ دین اسلام وہ دین ہے جس کا آغاز حضرت آدم علیہ السلام سے ہوا اور اختتام رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر ہر نبی دین اسلام کے احکام مختلف ادوار میں لاتے رہے ہیں۔ حتیٰ کہ ان کی تکمیل رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر ہوگئی گویا دین اسلام تمام نبیوں کا دین ہے۔ حضرت نوح علیہ السلام فرماتے ہیں۔

وَأُمِرْتُ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ

مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں مسلمان ہو جاؤں۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کا قول ہے۔

اَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعَالَمِيْنَ

میں رب العالمین کا مسلمان ہوں۔

حضرت یعقوب علیہ السلام نے اپنے بیٹوں کو حکم دیا:

فَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُسْلِمُوْنَ

یعنی تم نے مسلمان ہی مرنا ہے۔

اسلام مسلمانوں کا دین نہیں بلکہ تمام دنیا کے لوگوں کا دین ہے۔ کیونکہ تمام دنیا کے انبیاء دین اسلام کی تبلیغ کے لیے ہی آئے تھے۔ قرآن مجید میں اسی طرف اشارہ ہے۔

فِيْهَا كُتُبٌ قَيِّمَةٌ (البینۃ)

یعنی اس میں قائم رہنے والی کتب ہیں۔

یعنی قرآن مجید میں تمام کتب کی تعلیم پائی جاتی ہے۔ گویا قرآن مجید تمام کتب سماوی کی تعلیمات کا نچوڑ اور خلاصہ ہے۔ لہٰذا مسلمان اسی دین کو مانتے ہیں جو مختلف ادوار میں مختلف نبی لے کر آتے رہے۔ اسی لیے مسلمان تمام نبیوں اور تمام کتب سماوی پر ایمان لاتے ہیں۔ کیونکہ مسلمان تسلیم کرتے ہیں۔ پہلے نبی وہ نبی ہیں جو اپنے دور میں اسلام کی تعلیم لے کر آئے۔ اور ان کی کتب وہ ہیں جن میں اسلام کی تعلیم پائی جاتی ہے۔ گو وہ تعلیم مرور زمانہ سے اپنی اصل شکل میں قائم نہیں رہی۔

لہٰذا قرآن مجید کسی متعصب کی تصنیف نہیں بلکہ رب العالمین کے ابدی احکام ہیں جو رحمۃ للعالمین حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوئے۔ وہی دائمی صداقتیں ہیں جو پہلے انبیاء لاتے رہے۔ دوم اگر دیگر مذاہب کی کتب کا مطالعہ کیا جائے تو ان کتب میں حضرت محمد مصطفےٰ ﷺ کی آمد کی پیشگوئیاں پائی جاتی ہیں۔ سید البشر حصہ اوّل اور دوم میں ان پیشگوئیوں کا ذکر کیا جاچکا ہے۔ ان پیشگوئیوں پر بہترین کتاب عبدالحق ودیارتھی کی "میثاق النبیین" ہے۔

☆......☆
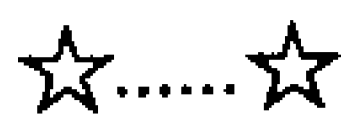
موالات کفار (کفار سے دوستی ناجائز ہے)

اعتراض: مشرک اور کافر ناپاک ہیں ان سے دوستی مت لگاؤ۔ (ترک اسلام نمبر 94)

یہ وہ اعتراض ہے جس کو متعدد مخالفین اسلام نے کیا ہے یہ ستیارتھ پرکاش کے مصنف سوامی دیانند جی نے بھی اس اعتراض کو اپنی کتاب ستیارتھ پرکاش کے چودھویں باب کے سوال نمبر 48 میں دہرایا ہے۔ ''اب متعصبانہ تعلیم کی طرف غور کیجیے جو دین اسلام میں نہیں اسے کافر قرار دیا گیا ہے غیر مذہب کے نیکوکاروں سے رفاقت نہ رکھنا اور مسلمانوں سے رفاقت رکھنے کی تعلیم دینا خدا کی شان نہیں اس لیے قرآن کا خدا اور مسلمان محض تعصب اور جہالت سے پُر ہیں۔''

جواب: قرآن مجید کی اس آیت پر اعتراض کیا گیا ہے۔

لَا يَتَّخِذِ الْمُؤْمِنُوْنَ الْكَافِرِيْنَ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ فَلَيْسَ مِنَ اللّٰهِ فِيْ شَيْءٍ اِلَّآ اَنْ تَتَّقُوْا مِنْهُمْ تُقٰىةً (آل عمران 28:3)

مومن مومنوں کو چھوڑ کر کافروں کو دوست نہ بنائیں اور جو ایسا کرے تو اس کا اللہ کے ساتھ کچھ تعلق نہیں سوائے اس کے کہ تم ان سے کسی طرح بچاؤ کرلو۔

مشرک کون ہے؟:

وہ شخص جو اللہ کی ذات صفات اور افعال میں کسی دوسرے کو شریک مانتا ہے۔

کافر کون ہے؟:

وہ شخص جو اللہ کے احکام کو پس پشت ڈالتا ہے اور ان پر عمل نہیں کرتا۔

خواہ کوئی شخص جو اسلام میں بھی داخل ہے اگر وہ اللہ کی ذات صفات اور افعال میں کسی دوسرے کو شریک کرتا ہے وہ مشرک ہی ہے اسی طرح اگر کوئی شخص دائرہ اسلام میں داخل ہو کر خدا کے احکام کا انکار کرتا ہے تو وہ بھی کافر ہے۔ اسلام میں مشرک اور کافر کی اصطلاح ہر اس شخص کے لیے جو خدا کی ذات صفات اور افعال میں شرک کرے یا خدا کے احکام کو تسلیم نہ کرے۔ اسلام کے نزدیک سچا وہی مسلمان ہے جو ہر قسم کے شرک سے اجتناب کرے اور خدا کے احکام پر حتی المقدر عمل کرے۔ اسلام کے اس تصور کا کون انکار کرسکتا ہے۔ اسلام سے قبل تمام انبیاء مسلمان تھے اسی طرح ان کے پیروکار بھی۔ حضرت یعقوب نے اپنے بیٹوں کو وصیت کی۔

فَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ

یعنی تم نے مسلمان ہی مرنا۔

حضرت نوح علیہ السلام فرماتے ہیں۔

اُمِرْتُ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ

مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں مسلمان ہو جاؤں۔

معترضین نے اصطلاح مسلمان، کافر اور مشرک کی روح کو ہی نہیں سمجھا۔

موالات کفار:

یہاں مومنوں کو کفار کی جس ولایت اور دوستی سے منع کیا گیا ہے اس کے ساتھ دُوْنِ الْمُؤْمِنِیْنَ کے الفاظ بڑھائے ہیں۔ یوں مومنوں کو یہ ہدایت دی گئی ہے کہ وہ مومنوں کے مفاد کو پس پشت ڈال کر کفار (جو مسلمانوں کے نقصان اور ازار کے در پے ہیں) کے ساتھ ولایت اور دوستی قائم نہ رکھیں۔

اس آیت میں کفار کے ساتھ معاہدات اور تعلقات قائم کرنے سے نہیں روکا۔ صرف ایک شرط عائد کر دی ہے کہ ان کفار کے ساتھ تعلقات قائم نہ کیے جائیں۔ جن کی وجہ سے کسی دوسرے مسلم ملک کے مفاد پر زد پڑتی ہو۔ اور مسلمان بھائیوں کو نقصان پہنچتا ہو یہ اسلامی اخوت کے منافی ہے۔

جب اس آیت کی روشنی میں تاریخ اسلام کا مطالعہ کیا جائے تو ایک صداقت اور حقانیت اس آیت سے ظاہر ہوتی ہے کہ مسلمانوں کی سلطنتوں کے زوال کا ایک سبب یہ ہے کہ مسلمانوں کے اندر بیٹھے ہوئے آپنے ہی بھائیوں نے دشمن کے ساتھ ولایت قائم کی۔ اور سلطنتوں کو زوال آیا سقوط بغداد اور سقوط دہلی واضح مثالیں ہیں۔ لہٰذا اس آیت میں غیر مسلموں سے معاہدات اور تعلقات قائم کرنے سے نہیں روکا۔

بلکہ صرف ایسے تعلقات قائم کرنے سے روکا ہے جن سے مسلمانوں کے مفاد پر زد پڑتی ہے۔

اس آیت میں یہ حصر کیا گیا ہے کہ کوئی مسلمان ملک ایسا کوئی معاہدہ نہیں کر سکتا۔ جس سے کسی دوسرے اسلامی ملک کو نقصان پہنچتا ہو۔ کفار سے ترک موالات مشروط ہے۔

تاریخ بتاتی ہے کہ مسلمان حبشہ میں ہجرت کر کے گئے تھے وہ حبشہ کے عیسائیوں کی حمایت میں دشمنوں کے خلاف لڑے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کئی مشرک قبائل سے معاہدات کیے یہود سے بھی معاہدات کیے جن میں دشمنان اسلام کے مقابلہ میں ان معاہد قبائل نے غیر جانب دار رہنا منظور کیا تھا یا مسلمانوں کو امداد دینا منظور کیا اس شرط پر کہ ان پر حملہ کے وقت مسلمان ان کی مدد کریں گے جنگ حنین میں مشرکین اسلامی فوج میں شامل تھے۔ خلفاء راشدین کے دور میں ایران کی جنگوں میں عیسائی فوج مسلمان فوج کے پہلو بہ پہلو لڑی۔ اسلام سب غیر مسلموں سے معاہدات اور تعلقات قائم کرنے سے نہیں روکتا۔ بلکہ اس غداری سے روکتا ہے۔ جو اسلامی سلطنت کی سالمیت کے خلاف کی جارہی ہو۔

قرآن مجید واضح الفاظ میں فرماتا ہے۔

لَا یَنْھٰکُمُ اللّٰہُ عَنِ الَّذِیْنَ لَمْ یُقَاتِلُوْکُمْ فِی الدِّیْنِ وَلَمْ یُخْرِجُوْکُمْ مِّنْ دِیَارِکُمْ اَنْ تَبَرُّوْھُمْ وَتُقْسِطُوْٓا اِلَیْھِمْ اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ الْمُقْسِطِیْنَ اِنَّمَا یَنْھٰکُمُ اللّٰہُ عَنِ الَّذِیْنَ قٰتَلُوْکُمْ فِی الدِّیْنِ وَاَخْرَجُوْکُمْ مِّنْ دِیَارِکُمْ وَظٰھَرُوْا عَلٰٓی اِخْرَاجِکُمْ اَنْ تَوَلَّوْھُمْ وَمَنْ یَّتَوَلَّھُمْ فَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الظّٰلِمُوْنَ (الممتحنہ 9,8:60)

اللہ تمہیں ان سے (موالات قائم کرنے سے) نہیں روکتا جنہوں نے تمہارے ساتھ دین کے بارہ میں لڑائی نہیں کی اور تمہیں اپنے گھروں سے نہیں نکالا کہ تم ان سے بڑے بڑے احسان کرو اور انصاف کرو۔ اللہ انصاف کرنے والوں سے محبت رکھتا ہے اللہ تمہیں صرف ان لوگوں سے دوستی کرنے سے روکتا ہے جنہوں نے دین کے بارہ میں تم سے لڑائی کی اور تمہیں تمہارے گھروں سے نکالا اور تمہارے نکالنے میں دوسروں کی مدد کی اور جو ان سے دوستی کرتا ہے وہی ظالم ہے۔

جولوگ لڑائی لڑتے ہیں اور پر امن شہریوں کو گھروں میں رہنے نہیں دیتے اور ان کو گھروں سے زبردستی نکالتے ہیں یہ لوگ امن کے دشمن ہیں امن کے دشمنوں سے ولایت اور دوستی کیسے ہوسکتی ہے۔

اگر اس قسم کے لوگوں سے دوستی کی جائے تو ان سے دوستی انسانیت سے کھلی دشمنی ہے۔ اسلام صلح اور امن کا مذہب ہے وہ محارب قوم سے اس وقت تک دوستی قائم کرنے کی اجازت نہیں دیتا۔ جب تک وہ ہتھیار نہیں پھینک دیتی اسلام نے تو صرف محارب کفار سے ترک موالات کی ہدایت کی ہے۔ ہندودھرم نے تو دشمنوں کو تباہ و برباد کر دینے کی تعلیم دی ہے۔ ''جو ہم سے دشمنی کرتا ہے یا جس سے ہم دشمنی کرتے ہیں اس کو ہم ایسے ایسے تڑپا تڑپا کر ماریں جیسے بلی کے منہ میں چوہا۔'' (دیانند یجروید بھاش ادھیاء 16 منتر 65 اور ادھیاء 15 منتر 19)

کیا اسلام کی تعلیم تعصب پر مبنی ہے یا ہندودھرم کی۔

☆......☆

حضرت حزقیل کے رویاء پر اعتراض

اعتراض: ایک شخص کو قیامت کا یقین دلانے کے لیے مار دیا سو سال بعد زندہ کیا گدھے کی ہڈیاں بوسیدہ ہیں پھر گدھا زندہ اور اس کا کھانا بھی سو سال تک نہ سڑا۔ خواب ہوگا۔ (ترک اسلام سوال نمبر 70)

جواب: معترض نے جس واقعہ کی طرف اشارہ کیا ہے وہ ایک رویاء ہے رویا میں سو سال کے واقعات قلیل عرصہ میں دکھائے گئے اس کی نظیر قرآن مجید میں موجود ہے کہ ایک بادشاہ نے سات برس کا قحط رویاء کے قلیل عرصہ میں دیکھ لیا۔ یہ عموماً ہوتا ہے کہ رویاء دیکھنے والا طویل مدت کو رویاء میں قلیل مدت میں دیکھ لیتا ہے۔

قرآن مجید میں جس طرح رویاء کا ذکر ہے وہ بالکل بائبل میں حزقیل کے رویا کے مطابق پایا جاتا ہے۔ دیکھو حزقیل 37 باب ایک آیت 13 تک

''خداوند کا ہاتھ مجھ پر تھا اور اس نے مجھے خداوند کی روح میں اٹھا لیا اور اس وادی میں جو ہڈیوں سے بھر پور تھی۔ مجھے اتار دیا اور مجھے ان کے آس پاس چوگرد پھرایا اور دیکھ دے وادی کے میدان میں بہت تھیں اور دیکھ وے نہایت سوکھی تھیں اور اس نے مجھے کہا اے آدم زاد کیا یہ ہڈیاں جی سکتی ہیں؟ میں نے جواب میں کہا۔ اے خداوند یہود تو ہی جانتا ہے پھر اس نے مجھے کہا کہ تو ان ہڈیوں کے اوپر نبوت کر اور ان سے کہہ اے سوکھی ہڈیو! تم خداوند کا کلام سنو۔ خداوند یہواہ ان ہڈیوں کو یوں فرماتا ہے کہ دیکھو تمہارے اندر میں روح داخل کروں گا اور تم جیوگے اور تم پر نسیں بٹھاؤں گا اور گوشت چڑھاؤں گا اور تمہیں چمڑے سے مڑھوں گا اور تم میں روح ڈالوں گا اور تم جیوگے اور جانوگے کہ میں خداوند ہوں سو میں نے حکم کے بموجب نبوت کی اور جب میں نبوت کرتا تھا تو ایک شور ہوا اور دیکھ ایک جنبش اور ہڈیاں آپس میں مل گئیں ہر ایک ہڈی اپنی ہڈی سے اور جو میں نے نگاہ کی تو دیکھا نسیں اور گوشت ان پر چڑھ آئے اور چمڑے کی ان پر پوشش ہوگئی پر ان میں روح نہ تھی۔ تب اس نے مجھے کہا کہ نبوت کر تو ہوا سے نبوت کر اے آدم زاد اور ہوا سے کہہ کہ خداوند یہوواہ یوں کہتا ہے کہ اے سانس تو چاروں ہواؤں میں سے آ۔ اور ان مقتولوں پر پھونک کہ وہ جئیں سو میں نے حکم کے بموجب نبوت کی اور اس میں روح آئی اور وے جی اٹھے اور اپنے پاؤں پر کھڑے ہوئے ایک نہایت بڑا لشکر تب اس نے مجھے کہا کہ اے آدم زاد یہ ہڈیاں سارے اسرائیل ہیں دیکھ یہ کہتے ہیں کہ ہماری ہڈیاں سوکھ گئیں اور ہماری امید جاتی رہی ہم تو بالکل فنا ہوگئے۔ اس لیے تو نبوت کر اور ان سے کہو کہ خداوند یہوواہ یوں کہتا ہے کہ دیکھ اے

میرے لوگ میں تمہاری قبروں کو کھولوں گا اور تمہیں تمہاری قبروں سے باہر نکالوں گا اور اسرائیل کی سرزمین میں لاؤں گا۔"

قرآن مجید اور بائبل کی عبارت سے واضح ہوتا ہے کہ یہ ایک رویا ہے۔ جس میں ایک سو سال کے واقعات کا نظارہ دکھایا گیا ہے اس واقعہ میں ایک پیشگوئی ہے امر واقع ہے کہ بنی اسرائیل ایک سو سال مردہ حالت میں رہی بخت نصر نے 613 قبل مسیح میں یروشلم پر چڑھائی کر کے اس کو فتح کیا 436 قبل مسیح میں بابلیوں کی تباہی کے بعد خورس شاہ ایران نے یہودیوں کو واپس آ کر آباد ہونے کی اجازت دی اور 520 قبل مسیح تک یہ دوبارہ آباد ہوتا رہا گویا یہ 93 یا قریباً ایک سو کا زمانہ حالت موت کا گزرا۔

یہ واقعہ بیان کر کے مسلمانوں کو یہ خبر دی ہے کہ تکالیف کا زمانہ عارضی ہوتا ہے۔ بنی اسرائیل سو سال تک اپنے گھر یروشلم سے دور رہے۔ آخر سو سال بعد اپنے گھر یروشلم میں واپس آ گئے اس طرح تم اپنے گھروں سے الگ کر دیئے گئے ہو۔ وہ وقت قریب آنے والا ہے جب تم مکہ میں فاتحانہ رنگ میں داخل ہو گئے ہو یہ پیشگوئی پوری شان کے ساتھ پوری ہو گی۔

اس مکاشفہ میں قوموں کی موت اور زندگی کا نظارہ دکھایا گیا ہے کسی وقت ایک قوم مردہ ہوتی ہے۔ پھر ایک وقت کے بعد وہی قوم زندہ دکھائی دیتی ہے قوموں کا عروج و زوال اسی طرح ہوتا ہے۔

ایک وقت قوم مردہ ہوتی ہے۔ اس میں زندگی کی کوئی رمق پائی نہیں جاتی پھر ایک وقت وہ بھی آتا ہے وہی مردہ قوم ترقی کے راستہ پر گامزن ہو پڑتی ہے۔ اس واقعہ میں صرف مسلمانوں کو ہی خوشخبری سنائی نہیں گئی بلکہ دنیا کی تمام اقوام کے لیے اس واقعہ میں خوشخبری ہے۔

احیائے موتیٰ کے واقعات بیان کرنے کے معاً بعد انفاق فی سبیل اللہ کا ذکر آیا ہے۔ جس میں مردہ قوم کو یہ سبق دیا گیا ہے کہ مردہ قوم کی زندگی انفاق فی سبیل اللہ میں ہے جو قوم اللہ کی راہ میں خرچ کرتی ہے وہ قوم ہی ترقی کے راستہ پر چلتی ہے۔

اَمَاتَهُ اللّٰهُ مِائَةَ عَامٍ

قرآن مجید میں لفظ موت مختلف معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ ایک موت وہ ہے جب روح جسم سے جدا ہو جاتی ہے لفظ موت بربادی اور تباہی کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے۔ پس اَمَاتَهُ اللّٰهُ مِائَةَ عَامٍ میں لفظ موت حقیقی معنی میں استعمال نہیں ہوا۔ قرآن کے ان الفاظ کے معنی یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اس (حزقیل) کو بنی اسرائیل کی صد سالہ تباہی رویاء میں دکھا دی۔ یہاں حقیقی موت مراد نہیں بلکہ لفظ امات (موت) مجازی رنگ میں استعمال ہوا ہے۔ حقیقی موت کے متعلق قاعدہ کلیہ ہے کہ مرنے والا دوبارہ زندہ نہیں ہو سکتا۔

معترضین نے اپنے اعتراض میں تین جھوٹ بولے ہیں پہلا جھوٹ یہ ہے کہ قیامت کا یقین دلانے کے لیے ایسا کیا گیا حالانکہ یہ بات قرآن مجید میں کہیں بھی نہیں دوسرا جھوٹ یہ بولا گیا ہے کہ ہڈیاں بوسیدہ ہیں حالانکہ قرآن مجید صرف یہ الفاظ ہیں۔ اُنْظُرْ اِلٰی حِمَارِكَ اپنے گدھے کی طرف دیکھ۔ تیسرا جھوٹ یہ بولا گدھا زندہ ہو گیا۔

ان آیات میں احیاء کی فلاسفی اور حکمت جو معترض کی نظر سے اوجھل ہے کا ذکر کیا ہے کہ ان آیات میں قوموں کے عروج و زوال کا ذکر ہے کہ کس طرح ایک قوم ایک وقت میں مردہ ہوتی ہے پھر وہی قوم ترقی کے راستہ پر گامزن ہو جاتی ہے۔ اس میں مسلمانوں کو خوشخبری دی گئی ہے کہ لوگوں کی نظر میں تم مردہ ہو۔ تمہارے گھروں سے تم کو نکال دیا گیا ہے ایک وقت آنے والا ہے تم اپنے گھروں میں واپس آؤ گے اور ان ویران گھروں کو آباد کرو گے اور ترقی کے راستہ پر اس تیزی سے چلو گے۔ کہ بڑی بڑی سلطنتیں تمہارے قدموں کے نیچے ہوں گی۔ برباد قوم بنی اسرائیل کی مثال دی ہے۔ وہ کس طرح تباہی کے بعد یروشلم میں آباد ہو گی۔

☆......☆

واقعہ غرانیق (شیطانی آیات)

(رسول کریم نے کفار کے بتوں کی شفاعت کو صحیح مان لیا)

اعتراض: واقدی اور زہری کی روایت کو بنیاد بنا کر مستشرقین نے واقعہ غرانیق کو بہت اچھالا ہے کفار کے ساتھ محض سمجھوتہ کے لیے رسول کریم ﷺ نے کفار کے بتوں کی شفاعت کو برحق مان لیا ہے۔ (ابن وراق صفحہ 77)

جواب: ابن سعد اور طبری دونوں نے طبقات اور تاریخ الرسل والملوک میں علی الترتیب ایک واقعہ نقل کیا ہے اور مستشرقین نے بھی یہ واقعہ رنگ امیزی کے ساتھ بیان کیا ہے وہ واقعہ یہ ہے۔

ایک روز نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کفار کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سورۃ نجم سنانا شروع جب یہ آیت

أَفَرَءَيْتُمُ اللّٰتَ وَالْعُزّٰى وَمَنٰوةَ الثَّالِثَةَ الْأُخْرٰى (النجم 20,19:53)

(''اے مشرکو! کیاتم نے لات وعزی اور تیسری دیوی مناۃ کی بے بسی پر بھی غور کیا ہے۔'')

پڑھی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بجائے

أَلَكُمُ الذَّكَرُ وَلَهُ الْأُنْثٰى تِلْكَ إِذًا قِسْمَةٌ ضِيْزٰى (النجم 22,21:53)

کیا تمہارے لیے لڑکے ہیں اور اس کے لیے لڑکیاں یہ تقسیم تو بہت بے انصافی کی ہے۔

کے یہ الفاظ پڑھ دیئے۔

تِلْكَ الْغَرَانِيْقُ الْعُلٰى وَإِنَّ شَفَاعَتَهُنَّ لَتُرتَجٰی

یعنی یہ بلند دیویاں ہیں اور ان کی شفاعت کی امید رکھی جاتی ہے۔

اس جملہ کے تداخل کے ساتھ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کفار میں پوری سورۃ نجم پڑھی سورہ ختم کرنے کے بعد جب آپ نے سجدہ کیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مشرکین بھی سجدہ میں گر گئے۔ سجدہ سے فارغ ہونے کے بعد کفار نے کہا۔ اے محمد! آج آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمارے معبودوں کی شفاعت کا اعتراف کرلیا ہے۔ اب آپ سے کوئی منافشہ نہیں رہا۔ رفتہ رفتہ یہ خبر تمام عرب میں پھیل گئی مہاجرین حبشہ نے بھی یہ خبر سنی تو وہ حبشہ سے چل پڑے جب وہ مکہ کے چند میل ادھر تک پہنچے تو صحرا میں ان کی کنانہ کے ایک کارواں سے ملاقات ہوئی جنہوں نے دریافت کرنے پر کہا۔ بے شک آپ کے صاحب نے ہمارے بتوں کی تعریف کی تھی۔ جس پر قریش نے ان سے صلح کرنی تھی مگر محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے اب انحراف کرلیا ہے اور پہلے کی طرح ہمارے بتوں کی مذمت شروع کردی ہے اس پر اہل مکہ بھی پہلے کی طرح ان سے برگشتہ ہیں۔

یہ سن کر مہاجرین نے مشورہ کیا اور طے پایا کہ اپنے اپنے اعزہ اقرباء سے ملاقات کرکے واپس لوٹ جائیں گے اور وہ شہر میں پہنچے۔

رد:

قرآن مجید جیسی پر حکمت کتاب کی طرف اس قسم کی خرافات منسوب کرنا سراسر نادانی اور کم علمی کا ثبوت ہے اس سورت کے متعلق یہ مسلمہ امر ہے کہ علیٰ الاعلان کفار پر پڑھی گئی۔ ابن مسعود رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ یہ پہلی سورت ہے کہ جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے علی الاعلان کفار کو سنائی اور یہ پہلی سورت ہے جس میں سجدہ نازل ہوا اور سجدہ کے موقع پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے سجدہ کیا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ سب سامعین نے بھی کیا۔ جن میں مشرکین بھی تھے لیکن سوال یہ ہے جو خیال مخالفین نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کیا ہے اس کو سورت کا ایک ایک لفظ جھٹلا رہا ہے اگر بالفرض دو آیتیں چھوڑ کر ان کی بجائے یہ لفظ رکھے بھی جائیں اگلی تمام آیات پھر اس خیال کی تردید کرتی ہیں کہ لات عزیٰ اور مناۃ اپنی وضع وقطع کے اعتبار سے بھی اس قدر حقیر ہیں کہ تم ہی نے خود انہیں تراشا اور ان کے نام اپنے بزرگوں سے سن سنا کر رکھ لیے ہیں۔

شیخ محمد عبدہ کہتے ہیں کہ عرب نے اپنے اشعار اور خطبوں میں لفظ غرانیق اپنے معبودوں کے متعلق استعمال نہیں کیا۔ کیونکہ غرانیق اور غرنوق دونوں لفظ سیاہ و سفید رنگت حسین آبی پرندہ کے لیے مستعمل ہے یہ الفاظ سفید رنگ حسین نوجوان کے لیے آتے ہیں لیکن بتوں کے ساتھ ان لفظوں کی مطابقت غیر متعلق ہے۔

گویا یہ لفظ بتوں کے لیے استعمال ہوتا ہی نہیں۔ ان کی شفاعت کیسی۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت سے قبل کی زندگی اس بات پر شاہد ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم شرک اور بت پرستی سے طبعی طور پر نفرت کرتے تھے چہ جائیکہ دعویٰ نبوت کے بعد اس قسم کا خیال آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے دل میں آئے تاریخ تو ہمیں یہ بتاتی ہے کہ کفار آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا کے پاس گئے کہ وہ اپنے بھتیجے محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کو بتوں کی تنقیص اور تحقیر سے باز رکھیں لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم بتوں کو برا بھلا کہنے سے باز نہ آئے اس کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو ہر قسم کا لالچ دیا گیا لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم لالچ کے دام میں نہ پھنسے جس پیغام حق کو لے کر آئے متواتر لوگوں تک پہنچاتے رہے کسی محقق نے اس روایت کو قبول نہیں کیا اور حدیث کی کسی کتاب میں اس کا ذکر نہیں ابن اسحاق سے اس کی صحت کے متعلق دریافت کیا گیا تو انہوں نے کہا انه من وضع الزنادقة یہ واقعہ زنادقہ کا وضع کیا ہوا ہے۔

اگر واقعہ کی جدید علمی رنگ میں تنقید کی جائے تو ان روایات میں لفظاً بھی تطابق نہیں پایا جاتا۔

ایک روایت کے الفاظ ہیں۔

تلك الغرانيق العلا وان شفاعتهن لترتجىٰ

دوسری روایت کے الفاظ ہیں۔

تلك الغرانقة العلا وان شفاعتهن ترتجى

تیسری روایت کے الفاظ ہیں۔

تلك الغرانقة العلا وان شفاعتهن ترتجى

چوتھی روایت کے الفاظ ہیں۔

انها لهى الغرانيق العلا وان شفاعتهن ترتجى

پانچویں روایت کے الفاظ ہیں۔

وانهن الغرانيق العلا وان شفا عتهن لهى التى ترتجى
(حیات محمد مصنفہ محمد حسین ہیکل)

متن کا اختلاف اس بات پر کافی شاہد ہے کہ یہ روایت وضعی ہے مندرجہ بالا امور یہ ثابت کرتے ہیں کہ واقعہ غرانیق کا کوئی وجود نہیں مخالفین اسلام نے محض دشمنی اور تعصب کی بناء پر یہ قصہ گھڑا ہوا ہے تاکہ اسلام کے روشن چہرے پر شرک کا دھبہ لگائیں۔

مہاجرین کی حبشہ سے مراجعت کی وجہ:

مہاجرین کی حبشہ سے مراجعت کی اصل وجہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا اسلام لانا ہے حضرت عمر جب کفر میں تھے تو کفر کی سخت حمایت کرتے تھے جب ان کا سینہ حق کے لیے کھل گیا تو اسلام کی حمایت میں استقامت کے ساتھ سر بکف ہو کر نکل پڑے جس کو سن کر مہاجرین حبشہ واپس مکہ آنے شروع ہو گئے۔

نوٹ: میرے پاس ایک پرانی کتاب آئینہ حق مصنفہ ابوالنصر منظور احمد خطیب جامع مسجد سنہری منٹگمری (ساہیوال) ہے۔ ابوالنصر صاحب نے اس کتاب میں اعتراضات جمع کیے ہیں۔ ان کو اس کتاب میں شامل کر کے ان کا جواب قارئین کے سامنے پیش کر دیتا ہوں۔ آئینہ حق ایک مختصر کتاب ہے لیکن اچھی جامع کتاب ہے۔ عیسائیت کے اوپر ایک عمدہ تصنیف ہے۔ کوئی دینی ادارہ اس کو کتاب کو دوبارہ شائع کرے تو اسلام کی اچھی خدمت ہوگی۔

مذکورہ کتاب میں کچھ ایسے اعتراضات بھی ہیں۔ جو موجودہ دور کے مستشرقین بڑے زور شور سے آج کل بھی کر رہے ہیں بہرحال میری کوشش یہ ہے کہ جہاں سے بھی کوئی اعتراض ملے اس کو اس کتاب میں شامل کر کے اس کا جواب قارئین کے سامنے پیش کر دوں۔

☆......☆

خدا اور رسول کا منکر بھی مسلمان ہے

اعتراض: اسلام کے اندر بڑی آزادی ہے یہاں تک کہ کوئی شخص خدا اور رسول کا منکر بھی ہو جائے تب بھی وہ مسلمان ہے قرآن وحدیث کا انکار کرتا ہے تب بھی پکا سچا مسلمان ہے لہٰذا اسلام کا کوئی ضابطہ و ڈسپلن نہیں۔ (آئینہ حق صفحہ 125)

جواب: ایمان و کفر کے متعلق اسلام کا ایک مکمل ضابطہ حیات ہے معترض نے اس ضابطہ حیات کو سمجھا ہی نہیں۔ مذہب اسلام دو بڑے حصوں پر مشتمل ہے ایک اعتقادی ہے اور دوسرا عملی۔ اعتقادی حصہ اصول ایمان پر مشتمل ہے اور عملی حصہ اوامر اور نواہی پر مشتمل ہے وہ امور جن کے کرنے کا ایک مسلمان مکلف ہے وہ اوامر ہیں اور جن کے نہ کرنے کا حکم ہے وہ نواہی ہیں۔ اوامر و نواہی کو ہی احکام شریعت کہا جاتا ہے۔

اصول ایمانیات:

یہ اصول ایمانیات پانچ ہیں جن کو ماننا دائرہ اسلام میں داخل ہونے کے لیے ضروری اور لابدی ہے۔ اگر کوئی شخص ان پانچ ارکان میں سے ایک کا بھی انکار کرتا ہے وہ اسلام سے خارج ہو جاتا ہے ارشاد الٰہی ہے۔

اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالْكِتٰبِ وَالنَّبِيّٖنَ o (البقرہ 177:2)

یعنی ایک شخص کو اللہ۔ آخرت کے دن فرشتوں اور کتاب اور نبیوں پر ایمان لانا چاہیے۔

قرآن مجید میں تکرار کے ساتھ ان پانچ ارکان پر ایمان لانا ضروری قرار دیا ہے لیکن حدیث میں خفیف سا اختلاف ہے چنانچہ بخاری میں ہے کہ جو اللہ پر ایمان لائے اس کے فرشتوں پر اور اس کی نعماء پر اور اس کے رسولوں پر یہ کہ حیات بعد الموت پر ایمان لائے۔ (37:2) اس حدیث میں لقاء اللہ کا ذکر ہے۔ دراصل یہ خدا پر ایمان لانے میں ہی شامل ہے۔ مگر قرآن مجید میں بھی کئی جگہ ذکر آیا ہے سورہ رعد میں آتا ہے۔

لَعَلَّكُمْ بِلِقَآءِ رَبِّكُمْ تُوْقِنُوْنَ (الرعد 2:13)

تاکہ تم اپنے رب کی ملاقات کا یقین کرو۔

پھر احادیث میں ''کتب کا الگ ذکر نہیں کیا مگر رسولوں کے لفظ میں شامل ہیں پس قرآن اور حدیث کی رو سے ایمان کے پانچ ارکان ہیں، یعنی خدا، ملائکہ، انبیاء کتب، حیات بعد الموت، پر ایمان لانا ہے۔ پھر اسلام نے ان پانچوں ارکان کا خلاصہ دو مختصر جملوں لا الٰہ الا اللہ یعنی اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد رسول اللہ یعنی محمد اللہ کے رسول ہیں میں بیان کر دیا ہے۔ پہلا حصہ (توحید) ہی اسلام بلکہ تمام مذاہب کا محور ہے۔ تمام تعلیمات اس محور کے اردگرد گھومتی ہیں پس دائرہ اسلام میں داخل ہونے کے لیے کلمہ شہادت (لا الـه الا الـلـه محـمـد رسـول الـلـه) کافی ہے اور یہ کلمہ پانچ عقائد کا خلاصہ ہے۔ جو شخص پانچ عقائد میں سے کسی ایک عقیدہ کا منکر ہے تو وہ شخص دائرہ اسلام سے خارج ہے۔ معترض نے جو اعتراض اسلام پر آزاد خیالی (خدا اور رسول کا منکر) کا لگا کر یہ کہا ہے کہ وہ بھی مسلمان ہے سراسر باطل اور حقیقت کے خلاف ہے۔ اسلام تو اس شخص کو بھی دائرہ اسلام سے خارج سمجھتا ہے جو رسول کریم ﷺ پر ایمان لانے کا تو دعویٰ کرے لیکن کسی رنگ میں توہین کا مرتکب ہو۔

اسلام انسان کے سامنے ایک مکمل ضابطہ حیات پیش کرتا ہے اس ضابطہ حیات کے دو حصے ہیں ایک اعتقادی (پانچ عقائد) دوسرا عملی (احکام شریعت اوامر ونواہی)

انسان کو صرف ضابطہ حیات تسلیم کرنے یا نہ کرنے کا ہی اختیار ہے چاہے وہ اس پر ایمان لائے چاہے ایمان نہ لائے۔ ضابطہ حیات تسلیم کرنے پر کوئی جبر نہیں ارشاد الٰہی ہے۔

لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ

کہ دین میں کوئی جبر نہیں۔

دوسری جگہ آتا ہے جو چاہے ایمان لائے جو چاہے ایمان نہ لائے لیکن جو شخص ضابطہ حیات کو زبان کے ساتھ اقرار کر کے تسلیم کرلے وہ اسلام کی اصطلاح میں مسلمان ہے اور جو انکار کردے وہ کافر ہے صرف ضابطہ حیات کے تسلیم کرنے یا نہ کرنے کی آزادی ہے یہی اسلام کی نمایاں خصوصیت ہے کہ وہ اللہ کا ضابطہ حیات تسلیم کرنے یا نہ کرنے میں آزاد ہے۔ جو آزادی کا تصور معترض نے اسلام کی طرف منسوب کیا ہے۔ وہ بالکل غلط ہے۔ جو شخص ضابطہ حیات کو تسلیم کرتا ہے وہ مومن ہے اور جو شخص انکار کرتا ہے وہ کافر ہے یہ نہیں کہ ضابطہ حیات کو تسلیم نہ کرنے والا بھی مسلمان ہے۔

☆......☆

کعبہ کا بتوں کی نجاست سے آلودہ ہونا

اعتراض :اسلام میں مقدس مقام کعبہ کو بنایا گیا ہے جس میں حضرت محمد سے قبل سینکڑوں بت رکھے ہوئے تھے اور معلوم نہیں کتنے لمبے عرصے سے بت خانہ چلا آ رہا تھا۔کم از کم تعظیم گاہ کوئی ایسی تو ہوتی جس پر کوئی انگشت نمائی نہ کر سکتا اور جو کسی زمانہ میں بھی بتوں کی نجاست سے آلودہ نہ ہوتی۔(آئینہ حق ص 126:125)

جواب :اس میں کوئی شک وشبہ نہیں کہ کعبہ اللہ کا گھر ہے جو روئے زمین پر سب سے پہلے تعمیر کیا گیا۔یہ تسلیم شدہ بات ہے کئی بار منہدم ہوا۔پھر یہ بھی تاریخ بتاتی ہے کہ اس گھر کو انہی بنیادوں پر حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت اسماعیل علیہ السلام نے از سر نو تعمیر کیا۔اگر بت پرستوں نے اس مقدس جگہ میں بت رکھ لیے تو اس سے کعبہ کا تقدس مجروح نہیں ہوا صرف بت پرستوں کی جہالت ظاہر ہوتی ہے۔ جب کعبہ کے حقیقی متولی حضرت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ کو فتح کیا تو سب سے پہلے کعبہ کو بتوں سے پاک کیا یہ بات کوئی قابل اعتراض نہیں کہ کعبہ میں بت کیوں رکھے گئے۔بت رکھنے والے بھی کعبہ کو مقدس ہی مانتے تھے اور اس کی عزت کرتے تھے۔اس کے اردگرد تعظیماً طواف کرتے تھے۔

آیئے ایک دوسری مقدس جگہ یعنی بیت المقدس کا تاریخ کے آئینہ میں مطالعہ کریں۔تو واضح ہو جائے گا کہ یہ جگہ بھی بدکار لوگوں کا اڈہ بن گئی تھی۔حضرت مسیح علیہ السلام نے ہیکل کو تاجروں اور بدکرداروں سے جھوٹوں اور خدا کی بادشاہت میں نہ داخل ہونے والوں کو نکال دیا اور اسے خدا کا گھر ٹھہرایا۔

''اور یسوع نے خدا کی ہیکل میں داخل ہو کر ان سب کو نکال دیا جو ہیکل میں خرید وفروخت کر رہے تھے اور صرافوں اور کبوتر فروشوں کی چوکیاں الٹ دیں اور ان سے کہا کہ میرا گھر دعا کا گھر کہلائے گا۔مگر تم اسے ڈاکوؤں کی کھوہ بناتے ہو۔''(متی 12:21)

نیز مسیح نے کئی بدروحوں کو نکال کر پاک تعلیم ڈالی۔سینکڑوں کو نیکی کے راستہ پر چلایا۔

ہیکل بھی خدا کا گھر تھا۔جو دنیا دار لوگوں کا مستقر بنا ہوا تھا۔حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے ان دنیا دار لوگوں سے پاک صاف کیا۔ کیا ہیکل خدا کا گھر نہیں تھا۔جو کبوتر فرشوں اور صرافوں کی اماجگاہ بنا ہوا تھا۔کیا کبوتر فروشوں سے اس گھر کا تقدس پامال نہیں ہو رہا تھا۔جو اعتراض کعبہ پر وارد ہوتا ہے بعینہ وہی اعتراض ہیکل پر وارد ہوتا ہے۔خدا کا گھر خدا کا گھر ہی ہے خواہ اس میں بت رکھ دیئے جائیں یا وہ کبوتر فروشوں اور صرافوں کی آماجگاہ بن جائے۔اللہ تعالیٰ نے دین کے بارہ میں ایک قانون مقرر کر دیا ہے کہ اس میں کوئی جبر نہیں دین کے بارے میں جو چاہے کرے۔خدا اس کا روز محشر حساب لے گا۔کعبہ اور ہیکل دونوں مقدس جگہیں تھیں لیکن جاہل لوگوں نے ان کی حرمت کو پامال کیا۔پھر ان کا تقدس بحال کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے بندوبست بھی کیا۔کعبہ کا تقدس رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بحال کیا۔ہیکل کا تقدس حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے۔کعبہ میں بتوں کا رکھا جانا تو ایک طرف رہا بائبل میں تو (نقل کفر کفر نہ باشد) لکھا ہے کہ مصر کی زانیہ فاسقہ فاجرہ بدکار دو عورتیں تائب ہو کر خدا کی بیویاں بن گئیں۔

''اور خداوند کا کلام مجھ پر نازل ہوا کہ اے آدم زاد! دو عورتیں ایک ہی ماں کی بیٹیاں تھیں انہوں نے مصر میں بدکاری کی وہ اپنی جوانی میں بدکار بنیں وہاں ان کی چھاتیاں مل گئیں۔اور وہیں ان کی دوشیزگی کے پستان مسلے گئے۔ان میں سے بڑی کا نام آہولہ اور اس کی

بہن کا نام آہولیبہ تھا اور وہ دونوں میری ہوگئیں اور ان سے بیٹے بیٹیاں پیدا ہوئیں۔'' (حزقیل 5-1:23)

کیا دو بدکار عورتیں (جو اپنے گناہوں سے تائب ہوگئی تھیں) اللہ تعالیٰ کی بیویاں بن سکتی ہیں۔

اللہ کا یہ نظام ہے کہ وہ کسی کو نہ نیکی پر مجبور کرتا ہے اور نہ ہی بدی پر۔ انسان اس بارے میں مختار ہے۔ عربوں نے کعبہ میں بت رکھے یہ ان کا اپنا فعل تھا ان کی جہالت کی وجہ سے کعبہ کے تقدس پر کوئی زد نہیں پڑتی۔

☆......☆

جو باتیں بائبل میں مذکور ہوں وہ غیب کی خبریں کیسے ہوسکتی ہیں؟

(ماضی کی غائب خبروں پر اعتراض)

اعتراض: اے رسول ہم تم کو خبریں غیب کی سناتے ہیں حالانکہ یہ قصہ ہائے بائبل میں موجود ہیں ان میں غیب اور وحی کی کیا ضرورت تھی۔

جواب: یہ قرآن مجید کی اس آیت پر اعتراض کیا گیا ہے۔

تِلْكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْغَيْبِ نُوْحِيْهَآ اِلَيْكَ مَا كُنْتَ تَعْلَمُهَآ اَنْتَ وَلَا قَوْمُكَ مِنْ قَبْلِ هٰذَا فَاصْبِرْ اِنَّ الْعَاقِبَةَ لِلْمُتَّقِيْنَ (ھود 49:11)

یہ غیب کی خبروں سے ہیں جو ہم تیری طرف وحی کرتے ہیں تو انہیں اس سے پہلے نہ جانتا تھا اور نہ تیری قوم سو صبر کر انجام متقیوں کے لیے ہے۔

<u>غیب کیا ہے:</u>

غیب مصدر ہے جو چیز انسان کی آنکھ سے چھپ جائے۔ غیب ہر اس چیز پر بولا جاتا ہے جو انسان کے علم میں نہ ہو۔ خواہ اس کا تعلق ماضی سے ہو یا حال یا مستقبل سے۔ جس چیز کا انسان کو علم نہیں وہ اس کے لیے غیب ہے اس آیت سے قبل حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت نوح علیہ السلام کا ذکر ہے۔ گو ان شخصیات کا ذکر ماضی سے تعلق رکھتا ہے لیکن اس کا علم رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو نہیں تھا۔ ماضی کی داستانیں وحی کر کے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو بتائیں۔ یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ رسول کریم ﷺ ایک اُمی رسول تھے۔ پھر ماضی کی خبروں تک آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسائی بھی نہ تھی۔

بائبل میں ذکر ہونے کا یہ مطلب نہیں کہ وہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی ان کا علم ہو۔ لہٰذا رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر ان خبروں کا نزول غیب سے پردا اٹھانے کے مترادف ہے تاریخی واقعات غیب سے تعلق رکھتے تھے اور وہ انباء الغیب ہی کے زمرہ میں آتے ہیں اور یہی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت کی علامت ہیں کہ رسول کریم صلعم نے ایسے ملک میں پرورش پائی جہاں کوئی ایسے ذرائع وسائل نہ تھے کہ ان ماضی کی خبروں سے واقفیت حاصل ہو۔

حقیقت میں انباء الغیب میں یہ بتایا گیا ہے حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت نوح علیہ السلام اپنے دشمنوں پر غالب رہے۔ مخالف ناکام و نامراد۔ اسی طرح رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے دشمن اپنے ارادوں میں ناکام و نامراد رہیں گے۔ اللہ تعالیٰ نے خود ان

تاریخی قصص کے متعلق فرمایا:

لَقَدْ كَانَ فِيْ قَصَصِهِمْ عِبْرَةٌ لِّاُولِي الْاَلْبَابِ (یوسف 111:12)

ان قصص میں عقل مندلوگوں کے لیے عبرت کا سامان ہے۔

تاریخ نے خود بتا دیا کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت لوح علیہ السلام کی طرح اپنے دشمنوں پر غالب رہے اور یہی قانون اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں بیان کیا ہے۔ ارشاد الٰہی ہے۔

كَتَبَ اللّٰهُ لَاَغْلِبَنَّ اَنَا وَرُسُلِي

یعنی اللہ نے یہ فرض کر دیا ہے کہ وہ اور اس کے رسول ہی الب آئیں گے۔

دوسری جگہ آتا ہے۔

قُلْ جَآءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ اِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوْقًا

یعنی جب حق آ جائے تو باطل بھاگ ہی جاتا ہے۔

مزید براں ان ہی قصص میں مسلمانوں کو یہ تعلیم دی ہے جب تک امتیں تعلیم حق پر گامزن رہتی ہیں وہ ترقی کرتی ہی جب وہ تعلیم حق سے روگردانی کر لیتی ہے تو قصر مذلت میں گر جاتی ہیں اس وجہ سے مسلمانوں کو رسول کریم ﷺ کی تعلیم پر پختگی کے ساتھ عمل پیرا رہنا چاہیے تاکہ تنزل اور ادبار کی لعنت سے بچ جائیں۔

☆......☆

جزاوسزا اور مغفرت، نیک اعمال کے بدوں، خدا کا کسی کوسلطنت دینا (یہ خدا کی بے انصافی ہے) زندہ سے مردہ اور مردہ سے زندہ نکالنا (کیا ہوسکتا ہے؟)

اعتراض: جب ایک آدمی کو اس کے اعمال کا پھل دیا جائے گا تو گناہ معاف نہ ہوسکیں گے اور اگر گناہ معاف ہوں گے تو پورا پھل نہیں دیا جائے گا اور خدا بے انصاف ٹھہرے گا۔ اگر نیک اعمال کے بدوں خدا کسی کوسلطنت بخشے گا تو بھی بے انصاف ہو جائے گا۔ بھلا م زندہ سے مردہ اور مردہ سے زندہ کبھی نکل سکتا ہے اور کیا قانون قدرت کبھی تبدیل ہوسکتا ہے۔ (ستیارتھ پرکاش اعتراض 48)

جواب: اس اعتراض کے تین اجزاء ہیں۔ جن کا جواب مطلوب ہے۔ پورا بدلہ گناہوں کی معافی۔ اعتراض اس آیت پر کیا گیا ہے۔

فَكَيْفَ اِذَا جَمَعْنٰهُمْ لِيَوْمٍ لَّا رَيْبَ فِيْهِ وَوُفِّيَتْ كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ (آل عمران 25:3)

پھر کیا حال ہوگا جب ہم ان کو اس دن اکٹھا کریں گے جس میں کوئی شک نہیں اور ہر ایک جان کو پورا (بدلہ) دیا جائے گا جو اس نے کمایا اور ان پر ظلم نہ ہوگا۔

اللہ تعالیٰ نے جزاوسزا کا قانون مقرر کیا ہے۔ ارشاد الٰہی ہے۔

فَإِنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيعُ أَجْرَ الْمُحْسِنِينَ (ہود:11, 115:11 ,90:12)

اللہ نیکو کاروں کا اجر ضائع نہیں کرتا۔

أَنِّي لَا أُضِيعُ عَمَلَ عَامِلٍ مِّنكُم مِّن ذَكَرٍ أَوْ أُنثَىٰ بَعْضُكُم مِّن بَعْضٍ (آل عمران:195)

میں تم میں سے کسی عمل کرنے والے کے عمل کو ضائع نہیں کرتا مرد ہو یا عورت تم سب ایک دوسرے سے ہو۔

فَمَن يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَرَهُ وَمَن يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَرَهُ (8,7:99)

جو کوئی ایک ذرہ کے وزن کے برابر بھلائی کرتا ہے وہ اسے دیکھ لے گا اور جو کوئی ایک ذرہ کے وزن کے برابر بدی کرے گا وہ اسے دیکھ لے گا۔

جب ہم نظام کائنات کا مشاہدہ کرتے ہیں تو یہی قانون کام کرتا ہوا نظر آتا ہے کہ ہر سبب کا ایک نتیجہ ہے ہر کام کا اپنا پھل ہوتا ہے جو کچھ انسان اس زندگی میں کرتا ہے اس کا نتیجہ ضرور برآمد ہوتا ہے۔ اگر کوئی شخص اصول صحت کی خلاف ورزی کرتا ہے تو وہ بیماری میں بتلا ہو جاتا ہے۔ اس طرح انسان کے نیک و بداعمال اپنے ساتھ اچھا اور برا نتیجہ لیے ہوئے ہیں جو قانون کائنات میں جاری و ساری ہے۔ وہی قانون انسان کے نیک و بداعمال پر جاری ہے۔

اصلاح کا قانون:

اللہ نے جہاں اعمال کے نتائج کا قانون وضع کیا ہے وہاں بدعمل کی اصلاح کا قانون بھی جاری رکھا ہے۔ مثلاً ایک شخص زنا کاری میں بتلا ہوتا ہے تو وہ آتشک و سوزاک کے مرض میں بتلا ہو جاتا ہے۔ اللہ نے آتشک و سوزاک کی درستی اور صحت کا بھی قانون جاری کیا ہے کہ جو شخص اس علاج کو اپنائے گا وہ صحت یاب ہو جائے گا۔ اسی طرح اللہ نے بُرے کاموں کے بدنتائج سے بچنے کے لیے بھی اصول اور قانون مقرر کیا ہے وہ ہے توبہ و استغفار، دوبارہ ان بُرے کاموں کے نہ کرنے کا وعدہ اللہ سے۔ یہ بھی اللہ تعالیٰ کا قانون ہے۔ ارشاد الٰہی ہے۔

يَا عِبَادِيَ الَّذِينَ أَسْرَفُوا عَلَىٰ أَنفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوا مِن رَّحْمَةِ اللّٰهِ إِنَّ اللّٰهَ يَغْفِرُ الذُّنُوبَ (زمر 53:39)

''اے میرے بندو جنہوں نے اپنی جانوں پر زیادتی کی ہے اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہو کیونکہ اللہ سب گناہ بخشنے والا ہے۔''

نَبِّئْ عِبَادِي أَنِّي أَنَا الْغَفُورُ الرَّحِيمُ (حجر 45:15)

''میرے بندوں کو خبر دے کہ میں بخشنے والا رحم کرنے والا ہوں۔''

وَرَحْمَتِي وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ (الاعراف 156:7)

''اور میری رحمت سب پر حاوی ہے۔''

كَتَبَ عَلَىٰ نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ (انعام 12:6)

''اس نے اپنے اوپر رحمت کو لازم کرلیا ہے۔''

صفت غفوریت کے قانون کے تحت انسان کو اس کے بداعمال کے بدنتائج سے بچانے کے لیے توبہ اور استغفار کا دروازہ کھلا چھوڑا ہے جب بندہ اپنے کیے بداعمال پر پچھتاتا ہے نادم ہوتا ہے تو آستانہ الوہیت پر گرتا ہے تو اللہ اپنے قانون غفوریت کے تحت اس کے گناہ بخش دیتا ہے اور اس کے بدنتائج سے محفوظ رکھتا ہے۔ اسلام نے ایک اور بھی اصول مقرر کیا ہے وہ یہ ہے کہ نیکیاں برائیوں کے اثرات کو مٹا دیتی ہیں ارشاد الٰہی ہے۔

اِنَّ الْحَسَنَاتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّئَاتِ

نیکیاں بدیوں کو محو کر دیتی ہیں۔

حدیث میں آتا ہے کہ صحابہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں بیٹھے ہوئے تھے آپ ﷺ نے صحابہ سے پوچھا بتاؤ اگر کسی شخص کے دروازے کے سامنے سے نہر بہتی ہو اور وہ پانچ دفعہ اس میں غسل کرے تو کیا اس کے جسم پر میل رہ جاتی ہے صحابہ نے کہا یا رسول نہیں آپ ﷺ نے فرمایا: یہی حال پانچ نمازوں کا ہے۔ جب کوئی شخص پانچ دفعہ نماز ادا کرتا ہے تو گناہوں کی میل اس کے دل پر نہیں رہتی۔

اسلام نے بدیوں کے بدنتائج سے بچانے کا ایک یہ بھی اصول مقرر کر دیا کہ انسان نیکیاں کرے۔ تو اس کی نیکیاں اس کی بدیوں کے بداثرات کو دور کر دیتی ہیں۔ کائنات میں یہ بھی قانون ہے اگر کسی شخص نے گرم اغذیہ کا زیادہ استعمال کیا ہے تو ان کے بداثرات سے بچنے کے لیے ٹھنڈی غذائیں استعمال کی جاتی ہیں۔ اس طرح گرم اغذیہ کے بداثرات دور ہو جاتے ہیں یہ سب اللہ کے ہی اصول اور قانون ہیں۔

اللہ کے دو قانون ہیں ایک عملی (فعلی) دوسرا قولی۔ فعل میں نظام کائنات آ جاتا ہے اور قولی میں نظام شریعت۔ دونوں میں کلی طور پر مطابقت پائی جاتی ہے۔

قیامت کے دن حساب کتاب:

ہر مذہب کا یہ اصول ہے کہ قیامت کے دن انسانوں کے اعمال کا حساب کتاب ہوگا۔ اسلام یہ کہتا ہے کہ قیامت کے دن انسان کے اعمال نامے میں جو اعمال ہوں گے ان کا حساب کتاب ہوگا۔ ارشاد الٰہی ہے۔

وَنَضَعُ الْمَوَازِيْنَ الْقِسْطَ لِيَوْمِ الْقِيَامَةِ فَلَا تُظْلَمُ نَفْسٌ شَيْئًا (الانبیاء 21:47)

''اور ہم قیامت کے میزانوں کو قائم کریں گے۔ پس کسی شخص پر ذرہ بھی ظلم نہیں کیا جائے گا۔''

وَالْوَزْنُ يَوْمَئِذِ نِ الْحَقُّ فَمَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِيْنُهٗ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ وَمَنْ خَفَّتْ مَوَازِيْنُهٗ فَاُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ

''اور وزن اس دن حق ہے سو جن کی نیکیوں کا پلہ بھاری ہوگا تو وہی کامیاب ہونے والے ہیں اور جن کی نیکیوں کا پلہ ہلکا ہوگا تو وہی ہیں جنہوں نے اپنی جانوں کو گھاٹے میں ڈالا۔

دوزخ کیا ہے:

اللہ تعالیٰ دوزخیوں کو دوزخ میں بطور سزا یا بطور انتقام نہیں بھیجے گا۔ بلکہ دوزخ بھی انسان کی بداعمالیوں کی اصلاح کے لیے ہے۔ جس طرح اس دنیا میں ایک مریض کو ہسپتال میں داخل کیا جاتا ہے اس کا ہسپتال میں داخل ہونا مرض کی اصلاح کے لیے ہے بعینہ یہ معاملہ دوزخ کا ہے۔ وہاں گناہ گاروں کے گناہوں کی میل کچیل دھوئی جائے گی۔ اس لیے یہ (دوزخ) کو ام (ماں) کہا ہے۔ ارشاد الٰہی ہے۔

اَمَّا مَنْ خَفَّتْ مَوَازِيْنُهٗ فَاُمُّهٗ هَاوِيَةٌ

''یعنی جن کے نیک اعمال کا پلڑا ہلکا ہوگا تو اس کی ماں ہاویہ (دوزخ) ہے۔''

دوزخ دوزخیوں کی ماں ہے۔ ماں کی گود میں ہی ان کے گناہوں کا علاج ہوگا۔ بداعمالیوں کی اصلاح کے بعد جنت میں داخل کیا جائے گا اور اس کی روحانی ترقی شروع ہو جائے گی۔

اسلام میں گناہوں کی معافی اور جنت دوزخ کا تصور ہندو دھرم اور عیسائیت کی طرح نہیں ہے۔ ہندو تناسخ کے قائل ہیں یعنی گناہ

گار کو اس کے گناہوں کی وجہ سے مختلف جونوں یعنی کتا بلا سور اور دیگر جانوروں کی جون میں ایک نیا روپ دھارنا پڑے گا۔ پھر اس کے گناہ معاف کیے جائیں گے۔ ہندوؤں کے نزدیک جو مختلف جانور دکھائی دیتے ہیں یہ انسانوں کی بداعمالیوں کی مختلف شکلیں ہیں۔ اسی طرح عیسائی کفارہ پر یقین رکھتے ہیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام ان کے گناہوں کا بوجھ اٹھا کر مصلوب ہو گئے ہیں کیا عقیدہ تناسخ اور کفارہ انسانی عقل کے معیار پر اترتے ہیں۔ انسانی عقل اس قسم کے عقیدوں کو دھکے دیتی ہے اسلام کا خدا تو اب غفار رحیم رحمان ہے۔ وہ اپنے اس بندے کے گناہ معاف کر دیتا ہے۔ جو ندامت میں ڈوب کر آستانہ الوہیت پر گرتا ہے اور اپنے خالق سے اپنے کردہ گناہ کی معافی طلب کرتا ہے اللہ تعالیٰ اپنے قانون کے تحت اس کو معاف کر دیتا ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کا قانون ہے پھر اللہ تعالیٰ نے انسانوں کے گناہوں کو بخشنے کے طریقے بیان کر دیئے ہیں مثلاً نیکیوں کی راہ پر چل پڑنا اور ان نیکیوں کے اچھے اثرات، بدیوں کے اثرات کو مٹا دیتے ہیں پھر نیکیوں کا کئی گنا زیادہ ثواب اور بدی کی اتنی ہی سزا۔ اس طرح نیکیوں کا وزن بڑھتا جاتا ہے۔ بدیوں کا وزن ہلکا رہتا ہے۔ پھر مسئلہ شفاعت ہے یہ تمام اللہ کے گناہوں کو معاف کرنے کے طریقے ہیں اسی لیے اسلام کے خدا نے کہا کہ میں اپنے بندوں پر ظلم کرنے والا نہیں ہوں اور اپنے بندوں کو یہ بھی خبر دی ہے کہ وہ اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہوں۔

یہ ہے فلسفہ اسلام کا نیکیوں اور بدیوں کی جزا و سزا کا۔ اور گناہوں کے عفو کی فلاسفی۔ جس کو معترض نے سمجھا ہی نہیں۔ کیا گناہوں کو معاف کرنا بے انصافی ہے۔ یہ خدا کی غفوریت رحیمیت اور رحمانیت کا پرتو ہے۔ جس کو معترض بے انصافی کہہ رہا ہے۔

جزو ثانی:

اگر نیک اعمال کے بدوں خدا کسی کو سلطنت بخشے گا تو بھی بے انصاف ہو جائے گا جس طرح ایک فرد کے اعمال اپنے اندر نتائج اور اثرات لیے ہوئے ہیں۔ اگر اعمال اچھے ہیں تو نتائج اچھے نکلیں گے اور اگر اعمال بد ہیں تو نتائج اور اثرات بد آئیں گے۔ یہ انفرادی زندگی کا ایک مسلّمہ قانون ہے اسی طرح اللہ تعالیٰ نے کسی قوم کو سلطنت اور حکومت دینے کے اصول اور قانون وضع کیے ہیں۔ وہ سلطنت، الٰہی اصولوں پر گامزن ہو کر ملے گی۔ اللہ کے اصولوں پر چلنا ہی نیکی ہے اس کے نتیجہ میں اللہ تعالیٰ اس قوم کو سلطنتوں کا وارث بنا دیتا ہے اس میں کسی قوم کا مسلمان ہونا یا نہ ہونا شرط نہیں۔ صرف اللہ کے مقرر کردہ قانون پر عمل کرنے والی قوم ہی سلطنتوں کی وارث بنتی ہے۔ تاریخ عالم اس پر صداقت کی مہر ثبت کرتی ہے مختلف ادوار میں مختلف قومیں عروج و زوال کی وارث بنی ہیں جو خدا کے مقرر کردہ قوانین کی پابند ہوئیں وہ تختوں کی وارث بنیں جن اقوام نے اللہ کے اصول اور قوانین کو پس پشت ڈالا وہ محکوم اور غلام بنی۔

تُؤْتِی الْمُلْكَ مَنْ تَشَآءُ وَتَنْزِعُ الْمُلْكَ مِمَّنْ تَشَآءُ وَتُعِزُّ مَنْ تَشَآءُ وَ تُذِلُّ مَنْ تَشَآءُ (آل عمران 3:26)

"تو جسے چاہتا ہے ملک دیتا ہے اور جس سے چاہتا ہے ملک لے لیتا ہے اور جسے چاہتا ہے عزت دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے ذلیل کرتا ہے۔"

اس آیت کریمہ میں اللہ کی مشیت سے مراد اللہ کا قانون ہے جو اس نے قوموں کے عروج زوال کا مقرر کیا ہوا ہے۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ اس قوم کو ہرگز سلطنت کا وارث نہیں بناتا جو اس کی اہل نہ ہو۔ خواہ وہ مسلمان ہے یا ہندو۔ جو بھی اللہ کے وضع کردہ قانون کی خلاف ورزی کرے گا وہ ذلیل و خوار ہو جائے گا۔ کیا اس میں اللہ تعالیٰ کی کوئی بے انصافی نظر آتی ہے۔ اگر ایک مدت تک ہندو محکوم رہے ہیں تو اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ انہوں نے اللہ کے احکام کو پس پشت ڈال رکھا تھا۔ اسی طرح جب مسلمان عروج سے زوال کی طرف آئے تو اس کی وجہ بھی اللہ کے احکام سے روگردانی تھی۔

جز ثالث زندہ سے مردہ اور مردہ سے زندہ نکالنا:

تُخْرِجُ الْحَیَّ مِنَ الْمَیِّتِ وَ تُخْرِجُ الْمَیِّتَ مِنَ الْحَیِّ (العمران 27:3)

''تو مردہ سے زندہ کو نکالتا ہے اور زندہ سے مردہ کو نکالتا ہے۔''

اس آیت کے ایک معنی تو یہ ہیں نطفہ سے جاندار کا اور جاندار سے نطفہ کا پیدا کرنا۔ لیکن مردہ سے زندہ اور زندہ سے مردہ نکالنے کا مطلب یہ ہے کہ ایک مردہ قوم ہے اس میں کوئی ایسا قائد پیدا ہو جاتا ہے جو مردہ قوم کو بام عروج تک پہنچا دیتا ہے اس طرح ایک ترقی یافتہ قوم ہے۔ جب اس میں نااہل حکمران پیدا ہو جاتے ہیں وہی ترقی یافتہ پستی کی اتھاہ گہرائیوں میں گر جاتی ہے قرآن مجید میں قوموں کے عروج زوال کو بیان کیا گیا ہے۔ عروج زندگی ہے اور زوال مردنی۔

ایک تو ان آیات میں دنیا کی تمام اقوام کے لیے ایک سبق ہے کہ وہ ترقی کے لیے اللہ کے قانون کی پابندی کریں۔ دوم: رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد کے مسلمانوں کو یہ سبق دیا ہے کہ وہ ایک دن سلطنتوں کے وارث بنیں گے۔ عزت اور زندگی پائیں گے سو اللہ تعالیٰ نے اپنے وعدہ کو سچ کر دکھایا۔

☆......☆

تمام انبیاء کے نام کیوں نہیں؟

اعتراض: انبیاء کے چند ناموں کا ذکر ہے۔ باقی کیوں نہیں (ترک اسلام دھرم پال سوال نمبر 108)

جواب: قرآن مجید پہلی وہ کتاب ہے جس نے نبوت اور رسالت کو عالمگیر قرار دیا اور کہا کہ دنیا کی ہر قوم کی طرف نبی آتے رہے ہیں۔ ارشاد الٰہی ہے۔

وَاِنْ مِّنْ اُمَّةٍ اِلَّا خَلَا فِیْهَا نَذِیْرٌ (فاطر 34:35)

یعنی ہر امت میں ڈرانے والے ہر گزرے ہیں۔

پھر یہ کہا کہ تمام انبیاء علیہم السلام ایک ہی گروہ ہے یعنی تمام انبیاء ایک ہی چشمہ سے سیراب ہوتے تھے اور ان کا ایک ہی پیغام تھا۔ ارشاد الٰہی ہے۔

اِنَّ هٰذِهٖۤ اُمَّتُكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّاَنَا رَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْنِ (الانبیاء 93:21)

''یہ تمہاری امت ایک ہی جماعت ہے اور میں تمہارا رب ہوں سو میری عبادت کرو۔''

قرآن مجید نے ایک اصول بیان کرنے کے بعد کہا کہ ''ہر قوم میں رسول آئے ہیں'' چند اہم نبیوں کا ذکر کر دیا ہے۔ یہ وہ نبی ہیں جن کو اول مخاطب یعنی عرب جانتے تھے۔

قرآن مجید میں چند انبیاء کا ذکر کر کے یہ بتانا مقصود تھا کہ جس طرح یہ نبی اپنے مشن میں کامیاب ہوئے تھے اسی طرح حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے مشن اور مقصد میں کامیاب ہوں گے۔ ایک یہ بتانا مقصود ہے کہ سب نبی ایک ہی پیغام لے کر آئے ہیں۔ محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کوئی نیا پیغام لے کر نہیں آئے یہ پہلے انبیاء کے پیغام کا تسلسل ہے۔

اگر دنیا کے تمام انبیاء اور مصلحین کا ذکر کر دیا جاتا تو قرآن مجید بے فائدہ اسما شماری سے لاطائل طویل ہو جاتی۔ جس سے قاری کو

کوئی فائدہ نہیں۔

قرآن مجید نے ایک اصول طے کر کے تمام دنیا کے نبیوں کو بھی مان لیا ہے اس کے ساتھ طوالت سے بچاؤ اختیار کر لیا ہے یہی اس کتاب کا اعجاز ہے اس طرح ایک اصول بیان کر کے گویا تمام انبیاء کا ذکر کر دیا۔ پھر دائرہ اسلام میں داخل ہونے کے لیے لازمی قرار دیا کہ وہ بلاتفریق تمام نبیوں کو سچا قرار دے۔

☆......☆

ویدوں کا ذکر قرآن میں کیوں نہیں؟

اعتراض: ویدوں کا ذکر کیوں قرآن میں نہیں۔ (ترک اسلام سوال 109)

جواب: وید علم الٰہی کی کتاب کا نام ہے۔ دنیا میں کتنے نبی آئے ان پر وحی نبوت (کتاب، حکمت، دانائی کی بات) نازل ہوئی۔ وہ وحی نبوت حکمت و دانش کا خزانہ ہوتی ہے۔ جس پر چل کر انسان اور قومیں ترقی کی منازل طے کرتی ہیں۔ اگر یہ وحی نبوت نازل نہ ہوتی تو دنیا زندگی کے ہر شعبہ میں ٹامک ٹوئیاں مار رہی ہوتی۔ وحی نبوت روشنی کا مینار ہے۔

قرآن مجید میں چند کتب الٰہی کا ذکر ہے کتنے رسائل یہود اور نصاریٰ کے پاس ہیں جن میں کسی کا ذکر نہیں صرف ابراہیم کا ذکر ہے اور وہ اب تک موجود نہیں۔ وید کوئی خاص محقق متعین شے بھی نہیں ہے۔ اس اختلاف پر بحث کرنے کا محل نہیں لیکن یہ امر مسلم ہے وید صحیح علم کو کہا جاتا ہے اس لیے وید کے معنی ہیں وہ چیز جس کے ذریعے صحیح علم ہوتا ہے یا جس کے ذریعے لوگ عالم ہوتے ہیں جس کے ذریعے ہماری سوچ بچار کے دروازے کھلتے ہیں اس معنی کے لحاظ سے تمام ذرائع جن سے سچے علوم حاصل ہوتے ہیں وہ وید ہیں۔ سو قرآن مجید نے تمام ذرائع صحیحہ بیان کر دیئے ہیں۔ مثلاً فرمایا:

وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَيُعَلِّمُكُمُ اللّٰهُ

''تم اللہ سے ڈرتے رہو اللہ تمہارا معلّم ہوگا۔''

تقویٰ کو ذریعہ علم بیان کیا ہے تقویٰ کیا ہے عقائد صحیحہ اور اعمال حسنہ۔ اس کے علاوہ دعا اور کوشش بھی حصول علم کے ذریعے ہیں ارشاد الٰہی ہے۔

رَبِّ زِدْنِيْ عِلْمًا ط

''اے اللہ میرے کو بڑھا۔''

پھر فرمایا:

اَفَلَا يَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْآنَ (محمد)

''وہ قرآن پر تدبر کیوں نہیں کرتے۔''

وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ (عنکبوت)

''جو لوگ بہت کوشش کرتے ہیں وہ ہماری راہوں کو پا لیتے ہیں۔''

الغرض تمام سچے علوم قرآن مجید میں پائے جاتے ہیں۔ ارشاد الٰہی ہے۔

فِيهَا كُتُبٌ قَيِّمَةٌ۔ اس (قرآن) میں قائم رہنے والی کتب ہیں۔ جب تمام ساوی کتب کی تعلیم کا نچوڑ قرآن مجید میں آ گیا ہے تو دیگر ساوی کتب کا نام لے کر ذکر کرنا بے سود ہے۔ حقیقی وید کے یہی معنی ہیں تو معنوی لحاظ سے قرآن مجید میں وید کا ذکر آ گیا ہے۔ جس کا اقرار قرآن مجید نے بھی کر دیا ہے۔ اگر دھرم پال اس حکمت کو نہ سمجھے تو پھر اپنی دانش پر ماتم کرے۔

دوم: قرآن مجید میں تمام کتب ساوی کی قائم رہنے والی صداقتیں پائی جاتی ہیں۔ جب دوسری تمام کتب ساوی کی صداقتیں قرآن میں بیان کر دی گئی ہیں تو تمام کتب کا ذکر کرنا بے سود ہے۔ ارشاد الٰہی ہے۔

فِيهَا كُتُبٌ قَيِّمَةٌ (البینہ)

اس میں تمام قائم رہنے والی تعلیم (صداقتیں) ہیں۔

وید کی تمام صداقتیں قرآن مجید میں موجود ہیں جس طرح صرف چند نبیوں کا ذکر کر دیا ہے۔ تمام انبیاء کا ذکر نہیں کیا اسی طرح بعض کتب کا ذکر کر دیا تمام کتب کا ذکر نہیں کیا۔ اصولی طور پر یہ بیان کر دیا ہے کہ اس کتاب (قرآن) میں تمام کتب کی صداقتیں قائم ہیں۔

☆......☆

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اُمی تھے (عالم اَن پڑھ کی بات کیوں مانے)

اعتراض: هُوَ الَّذِي بَعَثَ فِي الْأُمِّيِّينَ رَسُولًا پر اعتراض کیا کہ پڑھے لکھے عالم فاضل ان پڑھ کی بات کو کیوں مانیں سورج کا دلدل میں غروب ہونا عیسیٰ بلا باپ پیدا ہو گیا لاٹھی کا سانپ بن گیا۔ یہ باتیں معقول پسند آدمی کی کتاب میں نہیں ہو سکتیں۔ (ترک اسلام سوال 111)

جواب: سورج کا دلدل میں غروب ہونا لاٹھی کا سانپ بن جانا پہلے اعتراضات میں جوابات دیئے جا چکے ہیں۔ یہاں صرف اُمی رسول کی وضاحت کرنا چاہتا ہوں۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اُمی دو وجہ سے کہا گیا ہے۔ اُمی (ان پڑھ) اس وجہ سے کہ آپ کا انسانوں میں سے کوئی استاد نہ تھا۔ آپ ﷺ نے کسی کے سامنے زانوئے تلمذ تہ نہیں کیا تھا۔ دوسرے ام القریٰ (مکہ) کی نسبت سے بھی اُمی کہا جاتا ہے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے معلم اللہ تعالیٰ کی ذات تھی جو علیم و خبیر ہستی ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

عَلَّمَكَ مَا لَمْ تَكُنْ تَعْلَمُ (نساء)

"تجھے وہ سکھایا جو تو نے نہیں جانا تھا۔"

عَلَّمَهُ شَدِيدُ الْقُوَىٰ ذُو مِرَّةٍ فَاسْتَوَىٰ (نجم 53:5-6)

اسے مضبوط قوتوں والے نے سکھایا حکمت والے نے سو وہ اعتدال پر قائم ہوا۔

رَّبِّ زِدْنِي عِلْمًا

"اے میرے رب میرے علم کو بڑھا۔"

یہ تمام آیات ظاہر کرتی ہیں کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے معلم اللہ تعالیٰ تھے۔ وہی علیم و خبیر ہستی ہے۔ تمام علوم اس کی ذات سے وابستہ ہیں۔ اس علیم و خبیر ہستی نے آپ پر وہ کتاب نازل کی۔ جو ظاہری اور باطنی علوم کا خزانہ ہے۔ زندگی کا کوئی ایسا مسئلہ نہیں جس کا

حل اس کتاب میں نہ ہو۔ اس لیے اس کتاب کو ھدی للناس کہا ہے۔ یعنی یہ کتاب راہنمائی کر کے منزل مقصود تک پہنچاتی ہے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم وہ ذات ہیں جنہوں نے عربوں کو کتاب اور دانائی کی باتیں سکھائیں۔ پھر عرب تمام دنیا کے معلم بن گئے ایسے شخص کو بطور تحقیر اُمی کہنا نادانی اور جہالت ہے۔

حصول علم کے دو ذرائع ہیں حواس خمسہ ظاہری اور حواس خامسہ باطنی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر اللہ تعالیٰ کا فرشتہ جبرائیل وحی نبوت (علم دانائی کی باتیں) لے کر آپ ﷺ کے قلب (حواس باطنی) پر نازل ہوتا تھا وحی نبوت سے آپ کا دل علم کی روشنی سے منور ہو جاتا تھا۔ یہی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی فضیلت ہے کہ آپ ﷺ کا معلم اللہ تعالیٰ تھا۔

معترض نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر تو اُمی ہونے کا اعتراض کر دیا ہے کیا وہ جن ہستیوں پر وید نازل ہوئے۔ ان کے اساتذہ کے نام بتا سکتے ہیں۔ تمہارے اعتقاد کے مطابق یہ خلاف قانون قدرت ہے کہ خدا ان سے بولا ہو۔ جب اللہ نے بھی ان سے کلام نہیں کیا تو وہ خدا کے شاگرد نہ ہوئے۔ اساتذہ کے نام بھی کسی تاریخ میں نہیں ملتے جس کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا ہو۔ پھر وہ رشی بھی بے باپ تھے جو تم نے عیسیٰ علیہ السلام کے بن باپ ہونے کا اعتراض کیا ہے۔

یہ بات ذہن نشین کر لینی چاہیے کیونکہ انبیاء علیہم السلام نے اپنی اپنی قوم کو خدا کے پیغام کے تعلیم دینی ہوتی ہے اس لیے ہر نبی کا حقیقی معلم اللہ کی ذات ہوتی ہے حقیقی علم وہی ہوتا ہے جو اللہ تعالیٰ سکھاتا ہے انسانوں کا سکھایا ہوا علم اس کے سامنے ہیچ ہے یہ رسالت کا ایک لازمہ ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ نبی کا معلم ہوتا ہے۔ وہ لوگوں کی نظر میں تو اُمی ہے کیونکہ اس نے کسی شخص کے سامنے زانوئے تلمذ نہیں کیا۔ حقیقت میں وہ علم کے لحاظ سے اپنے دور کے سب لوگوں سے بڑھ کر ہوتا ہے۔ کیونکہ اس کا معلم اللہ ہوتا ہے۔

یہ اللہ کی سنت مستمرہ ہے کہ وہی اپنے انبیاء کو تعلیم دیتا ہے۔ حقیقی اور سچا علم وہی ہے جو اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو دیا ہے۔ درحقیقت معترض کا اعتراض اللہ تعالیٰ کی سنت پر ہے کیونکہ نبی اللہ کے احکام لے کر آتے ہیں۔ اس لئے وہی اپنے احکام کی تعلیم اپنے نبیوں کو دے دیتا ہے کسی دوسرے شخص کی ضرورت ہی نہیں۔

☆......☆

آج کل فرشتے اور خدا کسی سے کلام نہیں کرتے

اعتراض: جب آج کل خدا کے فرشتے اور خدا کسی سے باتیں کرنے نہیں آتے تو پہلے کیسے آتے ہوں گے۔ اگر کہو کہ پرانے زمانہ کے آدمی بے گناہ تھے اب نہیں تو یہ بھی غلط ہے کیونکہ جس وقت عیسائیوں اور مسلمانوں کا مذہب جاری ہوا تھا اس وقت ان ملکوں میں کہ جہاں ان کے مذہب نے فروغ پایا۔ وحشی اور مجہول آدمی زیادہ تھے اس لیے ان میں یہ خلاف علم وعقل مذاہب جاری ہو گئے۔ اب لوگ سمجھ دار زیادہ ہو گئے ہیں اس لیے یہ مذہب ان میں رواج نہیں پا سکتے اور جو جو ایسے بیہودہ مذہب ہیں وہ بھی معدم ہوتے جاتے ہیں ان کی ترقی کا ذکر ہی کیا ہے۔ (ستیارتھ پرکاش اعتراض 49)

جواب: یہ اعتراض قرآن مجید کی اس آیت پر کیا گیا ہے۔

وَاِذْ قَالَتِ الْمَلٰٓئِكَةُ يٰمَرْيَمُ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰكِ وَطَهَّرَكِ وَاصْطَفٰكِ عَلٰى نِسَآءِ الْعٰلَمِيْنَ (ال عمران 42:3)

''اور جب فرشتوں نے کہا اے مریم اللہ نے تجھے برگزیدہ کیا اور تجھے پاک بنایا ہے اور قوموں کی عورتوں میں سے تجھے چن لیا ہے۔''

وحی الٰہی (کلام الٰہی) پر مفصل بحث سیرت سید البشر حصہ سوم گزر چکی ہے یہاں صرف یہ بتانا مقصود ہے کہ معترض کا یہ اعتراض کہ پہلے اللہ تعالیٰ اپنے بندوں سے ہم کلام ہوتا تھا۔ اب کیوں نہیں۔ پہلے اس وجہ سے ہم کلام ہوتا تھا کہ وہ لوگ بے گناہ تھے اب اس لیے نہیں بولتا کہ لوگ گناہ گار ہو گئے ہیں کلام کرنا اللہ تعالیٰ کی صفات میں سے ایک صفت ہے جس طرح اللہ تعالیٰ کی دیگر صفات معطل نہیں ہوئیں۔ اللہ کی ذات میں ہیں اور تا ابد رہیں گی۔ اسی طرح اسلام کے نزدیک صفت کلام الٰہی بھی ہمیشہ رہے گی۔ جس طرح اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کے ساتھ پہلے بولتا تھا اب بھی بولتا ہے اور ہمیشہ بولتا رہے گا۔ اللہ کا کلام ہستی باری تعالیٰ پر ایک قاطع دلیل ہے۔ قرآن مجید کی رو سے کلام الٰہی مختلف صورتیں ہیں ان میں ایک وحی نبوت ہے۔ جو صرف انبیاء علیہم السلام کے ساتھ مختص ہے۔ اللہ تعالیٰ، جبرائیل علیہ السلام کی معرفت احکام شریعت (وحی نبوت) نازل کرتا تھا۔ اسلام کے نزدیک سلسلہ رسالت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات پر ختم ہو چکا ہے اس لیے آپ کے بعد وحی نبوت (احکام شریعت) ختم ہو گئی۔ لیکن کلام کی دوسری صورتیں قائم ہیں۔ وحی نبوت کے علاوہ کلام الٰہی کی بھی کئی صورتیں ہیں۔ وہ لفظاً بھی انسان کے ساتھ ہم کلام ہوتا ہے۔ اسی طرح رویاء اور القائی القلب کے ذریعے بھی۔ یہ سلسلہ تا قیامت جاری رہے گا۔ اللہ تعالیٰ اپنے برگزیدہ بندوں سے کثرت سے بولتا ہے۔ اس کی مثالیں اسلام میں کثرت سے پائی جاتی ہیں۔ اسلام میں ہزاروں ایسے ولی ہو گزرے ہیں۔ جن کا یہ دعویٰ تھا کہ اللہ ان سے ہم کلام ہوتا ہے پھر ہم کلامی کے ثبوت بھی دیئے۔ ویسے تو خدا کی ہم کلامی بلاتخصیص ہر شخص کے ساتھ ہو سکتی ہے۔ لیکن وحی ولایت صرف اللہ کے برگزیدہ بندوں کے ساتھ مختص ہے۔ جب کسی انسان کا دل گناہوں کی میل کچیل سے صاف ستھرا ہو جاتا ہے تو اس شخص کے ساتھ اللہ تعالیٰ اپنی محبت کا اظہار کرنے کے لیے ہم کلام ہوتا ہے۔

الغرض: اسلام کے نزدیک اب بھی کلام الٰہی کا سلسلہ جاری ہے عام لوگوں کے ساتھ بھی اور برگزیدہ بندوں کے ساتھ بھی۔ اس کلام الٰہی کی کئی صورتیں ہیں یعنی اللہ کا کلام لفظاً بھی ہوتا ہے اور رویا یا القا کے ذریعے بھی یہ تمام صورتیں کلام الٰہی کی ہیں اور جاری ہیں۔

یہ عقیدہ رکھنا کہ اللہ تعالیٰ پہلے بولا کرتا تھا۔ اب نہیں یہ بالکل لغو عقیدہ ہے اور اللہ کی صفت کلام کو معطل کرنے کے مترادف ہے وہ مذہب زندہ نہیں رہ سکتا جو کلام الٰہی کا دروازہ بند کرے۔

اسلام کی ترقی:

معترض نے یہ بھی کہا کہ عیسائیت اور اسلام جیسے بیہودہ مذہب معدوم ہوتے جاتے ہیں۔ مذاہب عالم میں دین اسلام ہی ایک فطرتی مذہب ہے اس کی تعلیم عین فطرت کے مطابق ہے۔ دوم اس کی تعلیم عقل کی کسوٹی پر پوری اترتی ہے۔ سوم دنیا کے مسائل صرف اسلام ہی حل کر سکتا ہے۔ اس لیے اسلام ہی ایک ایسا مذہب ہے جو انسان کی فلاح کا ضامن ہے لوگ اس کے دامن میں پناہ لیں گے۔ تا قیامت قائم رہے گا۔

☆......☆

۱۔اس دنیا کا بغیر مادہ کے تخلیق کرنا ۲۔اللہ کا مکر کرنا

اعتراض: جب مسلمان خدا کے سوا دوسری چیز کی ہستی نہیں مانتے تو خدا نے کس سے کہا اور اس کے کہنے سے کون ہوگیا اس بات کا جواب مسلمان لوگ سات جنم میں نہیں دے سکیں گے کیونکہ علت کے بغیر معلول ہر گز نہیں ہوسکتا اس کے خلاف کہنا ایسا ہی ہے کہ جیسا بغیر والدین کے کسی آدمی کا پیدا ہونا۔ جو دھوکا کھاتا ہے یا مکر وفریب کرتا ہے وہ نیک آدمی بھی نہیں کہلایا جا سکتا۔ (سیتارتھ پرکاس اعتراض 50)

جواب: یہ اعتراض دو اجزاء پر مشتمل ہے۔

وَيَوْمَ يَقُوْلُ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ (انعام 73:6)

اور جس دن کہے گا کہ ہو تو وہ جائے گا۔

دوم: يَمْكُرُ اللّٰهُ وَاللّٰهُ خَيْرُ الْمَاكِرِيْنَ

اللہ مکر کی سزا دے گا اور اللہ مکر کی سزا دینے والا ہے۔

پہلا جز:

يَقُوْلُ (وہ کہتا ہے) مصدر قول۔ مفردات میں ہے قول سے مراد نطق بھی ہوتا ہے یعنی زبان سے الفاظ ادا کرنا اور جو دل میں تصور کرلیا جائے قبل اس کے کہ لفظوں میں اس کا اظہار ہو۔ اسے بھی قول کہہ دیتے ہیں۔

وَيَقُوْلُوْنَ فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ لَوْلَا يُعَذِّبُ اللّٰهُ (المجادلہ 8:58)

وہ اپنے دلوں میں کہتے ہیں کہ اللہ ہمیں عذاب کیوں نہیں دیتا۔

اس طرح اعتقاد پر قول کا لفظ بولا جاتا ہے۔

پس مذکورہ زیر اعتراض آیت کا معنی یہ ہوگا۔ جب اللہ کسی چیز کے بنانے کا تصور کرلیتا ہے یا ارادہ کرلیتا ہے پھر اس چیز کو کن کہہ کر یا اپنے ارادہ سے ہی ایک خارجی وجود دے دیتا ہے۔ اس کا نام قدرت کاملہ ہے۔ اسی طرح تمام دنیا کا کاروبار چل رہا ہے۔ جب کوئی انجینئر کسی چیز کے بنانے کا ارادہ کرتا ہے۔ تو پہلے اس کا نقشہ اپنے ذہن میں تیار کرتا ہے پھر اس کا اظہار لائنوں سے کرتا ہے۔ پھر اس کو عملی شکل دیتا ہے۔

خارج میں وجود لانے سے قبل اس کا نقشہ انجینئر کے ذہن میں ہوتا ہے ذہن میں جو نقشہ ہے وہ اس انجینئر کا تصور یا ارادہ ہے۔ پھر کن کا درجہ آتا ہے پھر "فیکون" یعنی انجینئر کا تصور (ارادہ) عملی شکل میں وجود میں آتا ہے۔ یہ مثال اپنے مطلب کو سمجھانے کے لیے دی ہے۔ کیونکہ ہر چیز کا وجود اسی طرح عملی شکل اختیار کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ بھی اپنے ارادے کو اسی طرح وجود میں لاتا ہے۔

اللہ تعالیٰ علت مادی کا محتاج نہیں۔ وہ خدا جو بغیر آنکھ کے دیکھتا ہے بغیر کان کے سنتا ہے اور بغیر ہاتھوں کے بناتا ہے۔ وہ علت مادی کا محتاج نہیں وہ کسی چیز کے پیدا کرنے میں کسی علت مادی کا محتاج نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ کی ایک صفت خالق ہے یعنی وہ ہستی جو مادہ سے کسی چیز کو بناتی ہے ایک صفت بدیع ہے یعنی وہ ہستی جو بغیر مادہ کے کسی چیز کو وجود میں لاتی ہے پس جو تخلیق بغیر مادہ کے وجود میں آتی ہے وہ

صفت بدیع کے تحت ہے۔ گویا کائنات کی ہر چیز کا وجود اللہ تعالیٰ کی صفات کا مظہر ہیں اللہ کی صفات کی شکلیں ہیں۔ جن کا عملی طور پر ظہور ہوا ہے۔ اسی سے اللہ کی ہستی پہچانی جاتی ہے۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے کائنات کی ہر چیز پر غور کرنے کو کہا ہے۔ تا کہ اللہ کی ہستی کا تصور انسان کے دل و دماغ پر مرتسم ہو جائے۔

الزامی جواب: وید کو اللہ تعالیٰ کے اس راز کی خبر نہیں اس لیے وہ کہتا ہے ''کون جانتا ہے کون اسے بیان کرسکتا ہے کہ یہ دنیا کہاں سے بنی۔ دیوتا اس کے بننے کے بعد ہوئے اس لیے کون جانتا ہے کہ یہ کہاں سے پیدا ہوئی۔ یہ دنیا کس منبع سے پیدا ہوئی۔ آیا اسے کسی نے پیدا کیا یا نہیں وہ جو اعلیٰ آسمانوں میں اس کا حاکم ہے سچ مچ وہی جانتا ہے یا وہ بھی نہیں جانتا۔'' (رگوید منڈل 10 سوکت 129 منتر 7,6)

گویا وید کے نزدیک دنیا کی تخلیق کا کسی کو علم ہی نہیں۔ جب وید ہی تخلیق دنیا سے آگاہ نہیں تو دھرم پال جیسے ہندو معترضین نے تو اعتراض کرنا ہی ہے۔ معترض کا زیادہ زور اس بات پر ہے کہ مادہ کے بغیر دنیا کیسے بن گئی۔ دراصل اعتراض اللہ تعالیٰ کی صفات کا علم نہ ہونے کی وجہ سے ہے جو شخص اللہ تعالیٰ کی صفات سے واقف ہو وہ اس قسم کا اعتراض نہیں کرسکتا۔

دوسرا جز:

خیر الماکرین کے معنی: مفردات راغب میں مکر کے یہ معنی بیان ہوئے ہیں (المکر) **صرف الغیر عما یقصده بحیلة** مخالف کے مقاصد کو تدبیر سے روک دینا مکر ہے۔

ابن الاثیر جس نے لغت قرآن وحدیث پر کتاب لکھی ہے لکھتا ہے (مکر اللہ) **ایقاع بلائه باعدائه دون اولیائه** یعنی مکر اللہ کے معنی ہیں مخالفان الٰہی پر عذاب ڈالنا اور مقربوں کو ان عذابوں سے بچانا لسان العرب میں ہے المکر احتیال فی خفیة یعنی مخفی تدابیر کو مکر کہتے ہیں۔

پس زیر اعتراض آیت کے معنی یہ ہیں۔ نیک تدبر کرنے والا یا لوگوں کی خفیہ تدابیر کی بہترین سزا دینے والا۔ لہٰذا خیر الماکرین کے معنی فریب کرنے والا نہیں۔

حضرت امام راغب میں ہے مکر کی دو قسمیں ہیں ایک مکر محمود ہے جس سے نیک اور عمدہ کام کا قصد کرنا مقصود ہے چنانچہ انہی معنوں سے اللہ تعالیٰ نے اپنی نسبت فرمایا:

وَاللّٰهُ خَيْرُ الْمَاكِرِيْنَ

دوسری قسم مکر مذموم ہے یعنی برے فعل کا ارادہ کرنا یہی معنی ہیں اس آیت کے۔

وَلَا يَحِيْقُ الْمَكْرُ السَّيِّئُ

زیر اعتراض آیت کا مطلب یہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اہل عرب کو راہ ہدایت کی طرف بلایا۔ شرک کرنے سے منع کیا۔ محبت اور امن اتحاد اور رواداری کی تعلیم دی۔ خانہ جنگی سے روکا۔ صرف ایک خدا کی عبادت کی تعلیم دی لیکن مشرک نادانوں نے اس نیک پیغام کو بری تدابیر سے مٹانے کی کوشش کی۔ آپ کو قتل کرنے کا ارادہ کیا۔ آپ ﷺ کے ماننے والوں کو ہر قسم کی اذیتیں اور تکلیفیں دیں اور مخفی تدابیر سے اللہ کے پیغام کو نابود کرنا چاہا۔ تو اللہ تعالیٰ نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی کہ اللہ تعالیٰ ان کی مذموم تدابیر کو ناکام بنا دے گا۔ ان کے مقابل پر اللہ بہترین تدبیر کرنے والا ہے۔

☆......☆

حضرت ابراہیم علیہ السلام پر آگ سرد ہوگئی

اعتراض: ابراہیم کے لیے آگ سرد ہوئی پھول کھل پڑے چشمے جاری ہوگئے لیٹر کرنیمر کے لیے کیوں سرد نہ ہوئی۔ جیسے لکھا ہے قلنا یا نار کونی برداً وسلاما علی ابراہیم۔ (ترک اسلام سوال نمبر 65)

قُلْنَا يَا نَارُ كُونِي بَرْدًا وَّسَلَامًا عَلٰى اِبْرَاهِيْمَ ۔ (الانبیاء 69)

جواب: قرآن مجید میں آتا ہے۔

قَالُوْا حَرِّقُوْهُ وَانْصُرُوْا اٰلِهَتَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ فَاعِلِيْنَ قُلْنَا يَانَارُ كُوْنِيْ بَرْدًا وَّسَلَامًا عَلٰى اِبْرَاهِيْمَ وَاَرَادُوْا بِهٖ كَيْدًا فَجَعَلْنَاهُمُ الْاَخْسَرِيْنَ وَنَجَّيْنٰهُ وَلُوْطًا اِلَى الْاَرْضِ الَّتِيْ بَارَكْنَا فِيْهَا لِلْعٰلَمِيْنَ (انبیاء 21:68-71)

انہوں نے کہا اسے جلا دو اور اپنے معبودوں کی مدد کرو۔ اگر کچھ کرنا ہے۔ ہم نے کہا اے آگ تو ابراہیم پر سرد اور سلامتی ہو جا انہوں نے ابراہیم سے جنگ کرنی اور خفیہ تدابیر سے انہیں ایذا دینی چاہی ہم نے انہیں نقصان اٹھانے والے کر دیا اور ہم نے ابراہیم اور لوط کو مبارک زمین میں پہنچایا۔

دوسری جگہ آتا ہے۔

فَمَا كَانَ جَوَابَ قَوْمِهٖ اِلَّا اَنْ قَالُوا اقْتُلُوْهُ اَوْ حَرِّقُوْهُ فَاَنْجٰهُ اللّٰهُ مِنَ النَّارِ (عنکبوت 29:24)

"اس کی قوم کا جواب یہی تھا کہ اسے مار ڈالو یا جلا دو سو خدا نے اسے آگ سے بچالیا۔"

قَالُوا ابْنُوْا لَهٗ بُنْيَانًا فَاَلْقُوْهُ فِي الْجَحِيْمِ فَاَرَادُوْا بِهٖ كَيْدًا فَجَعَلْنٰهُمُ الْاَسْفَلِيْنَ (الصفت 37:97,98)

انہوں نے کہا کہ اس کے لیے ایک مکان بناؤ اور اسے شعلے مارتی ہوئی آگ میں ڈالو۔

انہوں نے اس کے ساتھ ایک چال چلنی چاہی پر ہم نے انہی کو نیچا دکھایا۔ مذکورہ آیات سے صرف یہ معلوم ہوتا ہے کہ کفار نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے متعلق دو فیصلے کیے۔ یا انہیں قتل کر دیا جائے یا انہیں آگ میں ڈالا جائے۔ یہ منصوبے تھے جیسا کہ یہ الفاظ ظاہر کرتے ہیں۔ فَاَرَادُوْا بِهٖ كَيْدًا یعنی انہوں نے منصوبہ بنایا۔ چال چلنی چاہی۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ فَجَعَلْنٰهُمُ الْاَسْفَلِيْنَ یعنی ہم نے ان کو نیچا دکھایا یعنی وہ اپنے منصوبہ میں ناکام ہوئے اور اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو آگ سے بچالیا۔ جیسا کہ یہ الفاظ ظاہر کرتے ہیں۔ فَاَنْجٰهُ اللّٰهُ مِنَ النَّارِ (العنکبوت 29:24) اللہ نے اسے آگ سے بچالیا۔ پس قرآن مجید سے صرف یہی ظاہر ہوتا ہے کہ کفار نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو قتل کرنے یا جلانے کا منصوبہ بنایا۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی سنت مستمرہ کے تحت قتل ہونے یا جلائے جانے سے بچالیا اور وہ وہاں سے ہجرت کر گئے۔ جیسا کہ یہ الفاظ ظاہر کرتے ہیں۔ وَنَجَّيْنٰهُ وَلُوْطًا اِلَى الْاَرْضِ (الانبیاء 21:71) اور ہم نے اسے اور لوط کو اس سرزمین کی طرف بچا نکالا یعنی حضرت ابراہیم اور حضرت لوط شام کی طرف ہجرت کر گئے۔

اللہ تعالیٰ کی یہ سنت مستمرہ ہے کہ جب کفار نبی کو قتل کرنے کا منصوبہ بناتے ہیں تو اللہ تعالیٰ اپنی قدرت کاملہ سے اپنے نبی کو بحفاظت محفوظ جگہ پہنچا دیتا ہے۔ کفار کی تدابیر کو ناکام بنا دیتا ہے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی مثال سامنے ہے جب آپ کو کفار نے قتل کرنے کا ارا منصوبہ بنایا تو اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت کاملہ سے رسول کریم صلعم کو کفار کے گھیرے سے نکال کر محفوظ جگہ پہنچا دیا۔ کفار کی تدبیر ناکام ہوگئی۔ یہ خدا کی سنت ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے نبی کو مخالفین کے بالمقابل کامیابی و کامرانی سے ہمکنار کرتا ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو

بھی اسی سنت الٰہیہ کی روشنی میں دیکھنا چاہیے کہ کفار نے ان کو قتل یا جلانے کا ارادہ کیا۔ تو اللہ تعالیٰ نے قتل یا جلنے سے بچالیا۔ جیسا کہ یہ الفاظ ظاہر کرتے ہیں۔ وَاَرَادُوا بِهٖ كَيْدًا فَجَعَلْنٰهُمُ الْاَخْسَرِيْنَ انہوں نے قتل یا جلانے کی تدبیر کی اللہ تعالیٰ نے ان کے منصوبے کو ناکام بنادیا اور وہ آگ حضرت ابراہیم علیہ السلام پر ٹھنڈی اور سلامتی کا سبب بن گئی۔ اللہ کی یہی سنت ہے کہ کفار اپنے منصوبہ میں ناکام رہتے ہیں اور اپنے منصوبہ کو پایہ تکمیل تک نہیں پہنچا سکتے۔ لہٰذا اللہ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو کفار کے منصوبہ ''حـرقـوہ'' سے پہلے بچالیا۔ قرآن مجید میں کہیں بھی یہ ذکر نہیں کہ مشرکین نے حضرت ابراہیم کو آگ میں ڈال دیا۔ صرف منصوبہ بنانے کا ذکر ہے سو اللہ تعالیٰ نے منصوبہ سے پہلے بحفاظت ہجرت کے ذریعے شام پہنچا دیا۔ کفار سے بچانے کا وعدہ اور سنت صرف نبیوں کے ساتھ مخصوص ہے اور کسی کے ساتھ نہیں۔ کیونکہ وہ خدا کے ایلچی ہوتے ہیں۔ اپنے پیغمبروں کو دشمن کے ہاتھ سے بچانا اللہ کی سنت ہے۔ اسی سنت کے تحت اللہ تعالیٰ انبیاء کی حفاظت کرتا ہے ہاں لے ٹی مر (لیٹمر) بشپ بادشاہ انگلینڈ اڈورڈ ششم کا درباری تھا۔ 15 اکتوبر 1555ء کو ملکہ میری کے عہد سلطنت میں پروٹسٹنٹ مذہب پر قائم رہنے اور وعظ کرنے کے سبب آگ میں جلایا گیا۔

رڈے بشپ پروٹسٹنٹ مذہب پر قائم رہنے اور وعظ کرنے کے سبب لیٹمر کے ساتھ آگ میں جلایا گیا۔

کرینمر آرچ بشپ پراٹسٹنٹ ہونے کی وجہ سے قید کیا گیا تھا اس نے توبہ کی مگر وہ خفیہ تھی۔ باہر آ کر پھر پراٹسٹنٹ ہونے کا اقرار کرلیا کہ یہ بھی اقرار کیا کہ موت کے ڈر سے اپنے مذہب کے چھوڑنے کا وعدہ کیا تھا۔ 1556ء میں آگ میں جلا دیا گیا۔

معترض نے تین خداؤں کے ماننے والوں کو موحد حضرت ابراہیم کے ساتھ جا ملایا ہے پھر حضرت ابراہیم علیہ السلام مقدس نبی تھے۔ نبیوں کو بچانا اللہ کی سنت ہے۔ یہ نہیں ہوسکتا کہ یہ لوگ آگ میں جلا دیئے گئے۔ اس لیے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بچائے جانے کا واقعہ ہی غلط ہے۔

جواب نمبر2: يٰنَارُ كُوْنِيْ بَرْدًا وَّ سَلٰمًا

لغت عربی میں نار سے مراد صرف آگ ہی نہیں بلکہ نار کا لفظ غصہ اور لڑائی پر بھی بولا جاتا ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے مشرکین کے منصوبہ کو ناکام بنا کر حضرت ابراہیم علیہ السلام کو ان کے نار غضب سے بچالیا اور مشرکین کے نار غضب کی حدت ٹھنڈی ہوگئی اور کسی قسم کی تکلیف نہ پہنچاسکی۔

قرآن مجید میں جتنے بھی تاریخی واقعات ہیں ان میں مسلمانوں کے لیے سبق ہیں حضرت ابراہیم علیہ السلام کا واقعہ بیان کر کے یہ بتایا ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی کفار قتل کرنے کا منصوبہ بنائیں گے۔ تو اللہ تعالیٰ اپنی سنت کے تحت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی بچائے گا۔ قرآن مجید میں آتا ہے۔

وَاِذْ يَمْكُرُ بِكَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِيُثْبِتُوْكَ اَوْ يَقْتُلُوْكَ اَوْ يُخْرِجُوْكَ (انفال 30:8)

جب کافر خفیہ تدبیر کررہے تھے کہ تجھے قید کرلیں یا قتل کردیں یا تجھے نکال دیں یہ ان کی تدابیر تھیں لیکن اپنی سنت کے تحت ان کی تدابیر کو ناکام بنادیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

اُولٰٓئِكَ حِزْبُ الشَّيْطٰنِ اَلَآ اِنَّ حِزْبَ الشَّيْطٰنِ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ (مجادلہ 19:58)

وہ شیطان کے ساتھی ہیں خبردار شیطان کے ساتھی گھاٹے میں رہنے والے ہیں اللہ تعالیٰ اپنی سنت کے متعلق فرماتا ہے۔

اِنَّا لَنَنْصُرُ رُسُلَنَا وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا (مومن)

ہم اس دنیا میں اپنے رسول اور ان پر ایمان لانے والوں کی مدد کرتے ہیں۔

الزامی جواب: منو جی اور بھرگ سنگتا میں لکھا ہے اگلے زمانہ میں تبش رش کے چھوٹے بھائی نے ان کو عیب لگایا اور تبش رش نے اپنی صفائی کے واسطے آگ کو اٹھایا لیکن تمام دنیا کے عمل نیک و بد جاننے والے اگن نے رش کا ایک بال بھی نہ جلایا۔ (ادھیا اٹھ شلوک 116)

کیا ہندو بتا سکتے ہیں کہ یہ شلوک غلط ہے یا کوئی اور تاویل کریں گے یا منو کا قول وید کے شلوک کے خلاف سمجھ کر رد کر دیں گے۔ لازمی طور پر وہ کوئی تاویل ہی کریں گے۔ وہی تاویل قرآن مجید کی سمجھ لیں۔

☆......☆

حضرت ابراہیم کا حضرت اسماعیل کو ذبح کرنا اور معترض کی غلط بیانی

اعتراض: حضرت ابراہیم کو کہا بیٹا ذبح کر چھری نے کاٹ نہ کی۔ ایک دنبہ بدست جبرائیل بہشت سے بھیج دیا۔ اسماعیل کی گردن تانبہ کی بن گئی۔ یا کٹ جاتی تو پھر مل جاتی۔ یہ دنبہ ہابیل والا تھا۔

جواب: قرآن مجید میں یہ واقعہ ان الفاظ میں بیان کیا ہے۔ وہ الفاظ درج کیے جاتے ہیں۔ معترض کی کذب بیانی خود واضح ہو جائے گی۔ قرآن مجید میں آتا ہے۔

قَالَ يٰبُنَيَّ اِنِّيْۤ اَرٰى فِي الْمَنَامِ اَنِّيْۤ اَذْبَحُكَ فَانْظُرْ مَاذَا تَرٰى ۔ قَالَ يٰۤاَبَتِ افْعَلْ مَا تُؤْمَرُ سَتَجِدُنِيْۤ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ مِنَ الصّٰبِرِيْنَ

فَلَمَّاۤ اَسْلَمَا وَتَلَّهٗ لِلْجَبِيْنِ وَ نَادَيْنٰهُ اَنْ يّٰۤاِبْرٰهِيْمُ قَدْ صَدَّقْتَ الرُّءْيَا اِنَّا كَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ

اِنَّ هٰذَا لَهُوَ الْبَلٰٓؤُا الْمُبِيْنُ وَفَدَيْنٰهُ بِذِبْحٍ عَظِيْمٍ وَتَرَكْنَا عَلَيْهِ فِي الْاٰخِرِيْنَ سَلٰمٌ عَلٰۤى اِبْرٰهِيْمَ اِنَّا كَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ اِنَّهٗ مِنْ عِبَادِنَا الْمُؤْمِنِيْنَ (صافات 37:102-111)

اس نے کہا۔ اے میرے بیٹے میں نے رویاء میں دیکھا ہے کہ میں تجھے ذبح کرتا ہوں۔ تو بتا تیری کیا رائے ہے۔ اس نے کہا۔ اے میرے باپ جو کچھ تجھے حکم دیا جاتا ہے کر تو مجھے اگر اللہ نے چاہا صبر کرنے والوں میں سے پائے گا۔

سو جب دونوں نے حکم تسلیم کر لیا اور اسے ماتھے کے بل لٹایا اور ہم نے اسے پکارا اے ابراہیم تو نے خواب سچ کر دکھایا اسی طرح ہم نیکی کرنے والوں کو بدلہ دیتے ہیں۔

بے شک یہ ایک کھلا امتحان تھا۔ اور ہم نے ایک بھاری قربانی کا فدیہ دیا اور اور ہم نے پچھلے لوگوں میں اس کا (ذکر خیر) باقی رکھا ابراہیم پر سلام اسی طرح ہم نیکی کرنے والوں کو بدلہ دیتے ہیں۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے رویاء میں دیکھا کہ وہ اپنے بیٹے اسماعیل علیہ السلام کو ذبح کرتے ہیں نہ یہ کہ ذبح کر دیا۔ قرآن مجید کے یہ الفاظ ہیں۔ اِنِّيْۤ اَرٰى فِي الْمَنَامِ اَنِّيْۤ اَذْبَحُكَ رویا کا معاملہ ہے اس پر کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔ اس وقت حضرت ابراہیم علیہ السلام کی عمر ننانوے سال تھی حضرت اسماعیل کی عمر تیرہ (13) سال تھی اور اکلوتے بیٹے ہیں اس عمر میں اور بیٹا ہونے کی امید بھی نہیں خدا کی طرف سے اپنے بیٹے کو ذبح کرنے کا حکم ہوتا ہے۔ باپ اپنے بیٹے سے اپنی رویا کا ذکر کرتے ہیں۔ تو فرمانبردار بیٹا بھی اللہ کا حکم ماننے کے لیے تیار ہو گئے۔ جب حضرت ابراہیم علیہ السلام نے حضرت اسماعیل علیہ السلام کو ذبح کرنے کے لیے اوندھا منہ لٹایا تو خدا کا حکم آیا ہے ا۔

ابراہیم تو نے اپنا رویا سچ کر دکھایا ہے۔اس کے بدلے اللہ تعالیٰ نے ایک جانور ذبح کرنے کا حکم دیا۔

انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا جلد 1 صفحہ 55 میں کنعانیوں میں جو قدیم باشندے فلسطین کے تھے انسانی قربانی کا رواج تھا۔حضرت ابراہیم نے انسانی قربانی کے بدلے ایک جانور ذبح کیا۔انسانی قربانی کو منسوخ کر دیا۔حضرت ابراہیم علیہ السلام کا بنی نوع انسان پر ایک بہت بڑا احسان ہے کہ انسانی قربانی منسوخ کر کے جانور کی قربانی کو رواج دیا اور کروڑوں انسانوں کو ذبح ہونے سے بچالیا۔

فلسفہ قربانی:

اس قربانی کا یہ فلسفہ ہے کہ جس طرح ایک جانور اپنے مالک کے سامنے چھری کے نیچے گردن رکھ دیتا ہے کوئی فریاد نہیں کرتا اور مالک کے ہاتھ میں اپنی جان دے دیتا ہے۔اسی طرح ایک بندے کو اللہ کے ہر حکم کے سامنے اپنے آپ جھکا دینا چاہیے اس پر برضا ورغبت عمل کرنا چاہیے اپنے سفلی جذبات کو اللہ تعالیٰ کے احکام کے سامنے ختم کر دینے چاہئیں اس طرح نفس امارہ کی سرکش اونٹنی کو خدا کی رضا کی خاطر ذبح کر دینی چاہیے اور کلی طور پر خدا کی صفات میں اپنے آپ کو رنگین کر لینا چاہیے۔یہ ہے قربانی کا فلسفہ کہ انسان کا خدا کا حقیقی بندہ بن جانا چاہیے۔

کتنا اعلیٰ فلسفہ ہے قربانی کا لیکن معترض اس فلسفہ قربانی کو سمجھا تک نہیں۔

☆......☆

سامری نے جبرائیل کے گھوڑے کے سم کی مٹی سے بچھڑا بنایا دھات سے بنا ہوا بچھڑا کس طرح بولا (معترض کی اپنی ذہنی اختراع ہے)

اعتراض: بچھڑی کی پرستش سامری نے کرائی جبرائیل کے گھوڑے کے سم کی مٹی سے ایک بچھڑا بنایا دھات سے بنا ہوا بچھڑا کس طرح بولا۔بالکل گپ؟ (ترک اسلام سوال نمبر 63)

جواب: قرآن مجید میں کہیں بھی یہ ذکر نہیں کہ جبرائیل کے گھوڑے کے سم کی مٹی سے بچھڑا بنایا گیا۔معلوم نہیں معترضین کے پاس اس قسم کے بیہودہ اور لغو اعتراض کا کون سا ماخذ ہے۔قرآن مجید کی ان آیات میں بچھڑے کا ذکر ہے۔

وَاتَّخَذَ قَوْمُ مُوْسٰى مِنْۢ بَعْدِهٖ مِنْ حُلِيِّهِمْ عِجْلًا جَسَدًا لَّهٗ خُوَارٌ (اعراف 148:7)

موسیٰ کے بعد اس کی قوم نے اپنے زیورات سے ایک بچھڑا بنایا ایک جسم جس میں سے گائے کی آواز نکلتی تھی۔

قَالَ فَمَا خَطْبُكَ يٰسَامِرِيُّ قَالَ بَصُرْتُ بِمَا لَمْ يَبْصُرُوْا بِهٖ فَقَبَضْتُ قَبْضَةً مِّنْ اَثَرِ الرَّسُوْلِ فَنَبَذْتُهَا وَكَذٰلِكَ سَوَّلَتْ لِيْ نَفْسِيْ۔ (طٰہٰ 96,95:20)

(موسیٰ نے) کہا اے سامری تیرا کیا معاملہ ہے اس نے کہا میں نے وہ کچھ جانا جو انہوں نے نہیں جانا پس میں نے رسول کے نقش قدم سے کچھ حاصل کیا۔پھر اسے پھینک دیا اور ایسا ہی میرے دل نے مجھے (یہ کام) اچھا کر دکھایا۔

سورہ اعراف کی آیت سے صرف یہ ظاہر ہوتا ہے کہ بنی اسرائیل نے زیورات اکٹھے کر کے ان کو پگھلایا اور بچھڑا بنایا اس سے آواز آتی تھی وہ ایک جسم تھا اس میں روح نہ تھی۔دور حاضر میں یورپ سے دھات سے بنے ہوئے کھلونے آتے ہیں ان سے آوازیں نکلتی ہیں۔

یہ کوئی ایسی چیز نہیں جو ہمارے تجربے اور مشاہدے سے باہر ہو۔ اس پر تعجب کا اظہار کرنا محض تجربہ اور مشاہدہ کی کمی ہے کسی مارکیٹ میں چلے جایئے اس قسم کے کئی کھلونے مل جائیں گے۔ جن سے آوازیں نکلتی ہیں۔

دوسری آیت سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے سامری سے پوچھا اے سامری یہ تو نے اتنی بڑی کارروائی کیوں کی۔ سامری نے کہا میں نے تیری تعلیم سے کچھ حاصل کیا۔ پھر اسے پس پشت ڈال دیا اور اس تعلیم سے سبکدوش ہو گیا ہوں۔ میں نے یہ تعلیم اپنے قلب کی قوت مدرکہ سے حاصل کی۔ دوسرے پیروکاروں نے بغیر سوچے سمجھے آپ کی تعلیم کو قبول کیا۔ جو کچھ میں نے کیا ہے یہ میرے نفس کی تزئین تھی یعنی میرے نفس نے اس کو اچھا سمجھا۔ اس لیے میں نے یہ کیا۔ اس دور میں بچھڑے کی پرستش کا عام رواج تھا۔ جب بنی اسرائیل نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی عدم موجودگی میں دوسری اقوام کو بچھڑے کی پرستش کرتے ہوئے دیکھا تو وہ بھی بچھڑے کی محبت کا شکار ہو گئے اور زیورات سے ایک بچھڑا بنایا اور اس کی پرستش شروع کر دی۔ بچھڑے کی پرستش کا سرغنہ سامری تھا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قوم بنی اسرائیل کا بچھڑے کی پرستش کرنا کوئی ایسی انہونی بات نہیں ہے جس پر اعتراض کیا جا سکے۔ دوسری اقوام کی دیکھا دیکھی بچھڑے کی پرستش کوئی خلاف معمول بات نہیں۔ جس کو تنقید کا ہدف بنایا جائے۔ بنی اسرائیل میں عقیدہ توحید راسخ نہیں ہوا تھا۔ اس وجہ سے انہوں نے بچھڑے کی پرستش شروع کر دی۔

قرآن مجید میں محض بچھڑے کی پرستش کا ذکر ہے۔ یہ اعتراض والی بات نہیں لیکن جبرائیل کے گھوڑے کے سم کی مٹی سے بچھڑے کا بنایا جانا محض ذہنی اختراع ہے جس کا کوئی تاریخی ماخذ نہیں۔

☆......☆

بنی اسرائیل کی بجلی سے ہلاکت اور زندہ اٹھایا جانا (کیا یہ ممکن ہے)

اعتراض: بنی اسرائیل کو بجلی سے ہلاک کیا۔ (ترک اسلام سوال نمبر 58)

جواب: قرآن مجید میں آتا ہے۔

فَاَخَذَتْکُمُ الصّٰعِقَةُ وَاَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ

پس تم کو ہولناک آواز نے آلیا اور تم دیکھ رہے تھے۔

ثُمَّ بَعَثْنٰکُمْ مِنْۢ بَعْدِ مَوْتِکُمْ لَعَلَّکُمْ تَشْکُرُوْنَ (البقرہ 55:2)

پھر ہم نے تم کو تمہاری موت کی سی حالت کے بعد اٹھایا تا کہ تم شکر کرو۔

ان آیات میں تین الفاظ الصّٰعِقَةُ موت اور بعثت قابل وضاحت ہیں۔ صاعقہ صعق سے مشتق ہے جس کے معنی میں لکھا ہے۔

الصعق ان یغشی من صوت شدید یسمعه وربما مات (مجمع البحار)

صعق یہ ہے کہ کسی پر کسی سخت آواز سے بیہوشی پڑ جائے۔ جس کو اس بے ہوش ہونے والے شخص نے سنا اور کبھی اس سے موت بھی ہو جاتی ہے۔

قرآن مجید میں آتا ہے۔

فَخَرَّ مُوْسٰی صَعِقًا فَلَمَّآ اَفَاقَ (اعراف)

موسیٰ بے ہوش ہو کر گر پڑے پس جب آفاقہ آیا۔
مفردات میں لکھا ہے الصاعقہ تین قسم کا ہوتا ہے۔
موت۔فرمایا:
صَعِقَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ (زمر)
جو آسمانوں اور زمین میں ہے مر گئے۔
عذاب۔فرمایا:
اَنْذَرْتُكُمْ صَاعِقَةً مِثْلَ صَاعِقَةِ عَادٍ وَّثَمُوْدَ (فصلت)
تم کو عاد اور ثمود کے عذاب کی مانند عذاب سے ڈرایا۔
آگ۔فرمایا:
يُرْسِلُ الصَّوَاعِقَ فَيُصِيْبُ بِهَا مَنْ يَّشَاۗءُ (رعد 13:13)
وہ بجلیاں بھیجتا ہے پھر جس پر چاہتا ہے گراتا ہے۔
پس صاعقہ بیہوشی موت، عذاب اور آگ کو کہتے ہیں۔
دوسرا لفظ موت ہے۔امام راغب نے موت کے کئی معنی بیان کیے ہیں۔
اول قوت نامیہ کا نہ ہونا جیسے يُحْيِي الارضَ بَعْدَ مَوْتِهَا (الحدید 17:57)
دوم: قوت حسی کا زائل ہونا یعنی بے ہوش ہو جانا۔یعنی يٰلَيْتَنِيْ مِتُّ قَبْلَ هذا (مریم 23:19)
سوم: قوت عقلی کا زائل ہونا یعنی جہالت جیسے او من كان ميتاً فَاَحْيَيْنَا (الانعام 122:6)
چہارم: وہ غم جو زندگی کو مکدر کر دیتا ہے۔وَيَاْتِيْهِ الْمَوْتُ مِنْ كُلِّ مَكَانٍ وَّمَا هُوَ بِمَيِّتٍ (ابراہیم 17:14)
پنجم: نیند چنانچہ نیند کو موت خفیف اور موت کو نوم ثقیل یعنی بھاری نیند کہا جاتا ہے۔حدیث میں ہے اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ اَحْيَانَا بَعْدَمَا اَمَاتَنَا جو سو کر اٹھنے کی دعا ہے یعنی سب تعریف اس خدا کی ہے جس نے ہم کو زندہ کیا بعد اس کے کہ ہمیں مار دیا تھا۔یعنی احیاء اور اماتت دونوں کا ذکر ہے مگر مراد صرف بیداری اور نیند ہیں۔
ششم تھی۔یعنی روح کی جسم سے مفارقت۔
اور لسان العرب میں ہے کہ موت کا لفظ کبھی استعارۃً احوال شاقہ پر بولا جاتا ہے جیسے فقر اور ذلت اور سوال اور بڑھاپا اور مصیبت وغیرہ اور موت کے معنی غشی بھی ہیں۔

بعثت کا لفظ موت سے اٹھانے، نیند سے اٹھانے دونوں پر بولا جاتا ہے۔(تاج العروس) ایسا ہی بے ہوشی سے ہوش میں لانے پر بھی بولا جاتا ہے (بیضاوی) پس مذکورہ معانی کی روشنی میں ثُمَّ بَعَثْنٰكُمْ مِنْۢ بَعْدِ مَوْتِكُمْ کے معنی یہ ہوں گے تمہاری بے ہوشی کے بعد تمہیں اٹھایا۔یہاں موت کے معنی روح کا جسد سے مفارقت نہیں۔بلکہ بے ہوشی ہے اور اَخَذَتْكُمُ الصّٰعِقَةُ کے معنی ہیں تم کو سخت کڑک نے آلیا۔معترض نے یہ معنی کیے ہیں تم کو بجلی نے مار دیا غلط ہیں۔الصعقہ الرجفۃ (زلزلہ) کے معنی ہیں استعمال ہوا ہے قرآن مجید میں آتا ہے فاخذتهم الرجفة (الاعراف 78:7) صاعقہ کے معنی ہولناک آواز کے ہیں شدید زلزلہ سے پہلے بھی ایک ہولناک آواز آتی ہے اس لیے زلزلہ کو صاعقہ کہا گیا ہے۔الفاظ صاعقہ موت اور بعث کی لغوی وضاحت کے بعد معنی صاف ہو جاتے ہیں کہ بنی اسرائیل زلزلہ کی کڑک کی وجہ سے بے ہوش ہو گئے۔پھر اللہ تعالیٰ ان کو ہوش میں لے آیا۔ان آیات میں حقیقی موت کے بعد زندہ کرنا مراد نہیں ہے۔

قرآنی احکام وراثت میں ریاضی کی غلطی ہے

اعتراض: ہندو دانشور، ارون شوری نے دعویٰ کیا ہے کہ قرآن کریم میں ریاضی کی ایک غلطی پائی جاتی ہے وہ کہتا ہے کہ سورۃ نساء کی آیات 12,11 میں وارثوں کو دی جانے والی وراثت کے حصوں کو جمع کیا جائے تو کل عدد ایک سے زیادہ بن جاتا ہے لہٰذا (نعوذ باللہ) قرآن کا مصنف ریاضی نہیں جانتا۔ (اسلام پر 40 اعتراضات کے عقلی اور نقلی جواب از ڈاکٹر ذاکر عبدالکریم نائیک) اسلام میں وراثت اور اس کی تقسیم ایک اہم ریاضی علم ہے۔ مجھے اس علم پر کلی دسترس حاصل نہیں۔ لہٰذا وراثت پر جو اعتراض کیا گیا ہے اس کا جواب بھی شکریہ کے ساتھ نائیک صاحب کی کتاب مذکورہ بالا سے اخذ کیا جا رہا ہے۔ وراثت کے مسائل قرآن کریم میں متعدد مقامات پر بیان کیے گئے ہیں۔

سورہ البقرۃ آیت 180, سورۃ البقرہ آیت 240 سورۃ النساء 7-9، سورۃ النساء آیات 19 اور 33 سورۃ المائدہ آیات 188,105

لیکن وراثت کے حصول کے بارے میں سورۃ النساء کی آیات نمبر 12,11 اور 176 میں واضح احکام ہیں۔

آیئے سورۃ النساء کی آیت نمبر 12,11 کا جائزہ لیں جس کا حوالہ ارون شوری نے دیا ہے۔

يُوْصِيْكُمُ اللّٰهُ فِيْٓ اَوْلَادِكُمْ ۗ لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْاُنْثَيَيْنِ ۚ فَاِنْ كُنَّ نِسَآءً فَوْقَ اثْنَتَيْنِ فَلَهُنَّ ثُلُثَا مَا تَرَكَ ۚ وَاِنْ كَانَتْ وَاحِدَةً فَلَهَا النِّصْفُ ۗ وَلِاَبَوَيْهِ لِكُلِّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا السُّدُسُ مِمَّا تَرَكَ اِنْ كَانَ لَهٗ وَلَدٌ ۚ فَاِنْ لَّمْ يَكُنْ لَّهٗ وَلَدٌ وَّوَرِثَهٗٓ اَبَوٰهُ فَلِاُمِّهِ الثُّلُثُ ۚ فَاِنْ كَانَ لَهٗٓ اِخْوَةٌ فَلِاُمِّهِ السُّدُسُ مِنْۢ بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُّوْصِيْ بِهَآ اَوْ دَيْنٍ ۗ اٰبَآؤُكُمْ وَاَبْنَآؤُكُمْ لَا تَدْرُوْنَ اَيُّهُمْ اَقْرَبُ لَكُمْ نَفْعًا ۚ فَرِيْضَةً مِّنَ اللّٰهِ ۗ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيْمًا حَكِيْمًا [۱۱] وَلَكُمْ نِصْفُ مَا تَرَكَ اَزْوَاجُكُمْ اِنْ لَّمْ يَكُنْ لَّهُنَّ وَلَدٌ ۚ فَاِنْ كَانَ لَهُنَّ وَلَدٌ فَلَكُمُ الرُّبُعُ مِمَّا تَرَكْنَ مِنْۢ بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُّوْصِيْنَ بِهَآ اَوْ دَيْنٍ ۗ وَلَهُنَّ الرُّبُعُ مِمَّا تَرَكْتُمْ اِنْ لَّمْ يَكُنْ لَّكُمْ وَلَدٌ ۚ فَاِنْ كَانَ لَكُمْ وَلَدٌ فَلَهُنَّ الثُّمُنُ مِمَّا تَرَكْتُمْ مِّنْۢ بَعْدِ وَصِيَّةٍ تُوْصُوْنَ بِهَآ اَوْ دَيْنٍ ۗ وَاِنْ كَانَ رَجُلٌ يُّوْرَثُ كَلٰلَةً اَوِ امْرَاَةٌ وَّلَهٗٓ اَخٌ اَوْ اُخْتٌ فَلِكُلِّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا السُّدُسُ ۚ فَاِنْ كَانُوْٓا اَكْثَرَ مِنْ ذٰلِكَ فَهُمْ شُرَكَآءُ فِي الثُّلُثِ مِنْۢ بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُّوْصٰى بِهَآ اَوْ دَيْنٍ ۙ غَيْرَ مُضَآرٍّ ۚ وَصِيَّةً مِّنَ اللّٰهِ ۗ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَلِيْمٌ [۱۲]

"تمہاری اولاد کے بارے میں اللہ تمہیں ہدایت کرتا ہے کہ مرد کا حصہ دو عورتوں کے حصے کے برابر ہے پھر اگر (دو یا) دو سے زائد عورتیں ہوں تو انہیں ترکے کا دو تہائی دیا جائے اور اگر ایک بیٹی وارث ہو تو آدھا ترکہ اس کا ہے۔ اگر میت صاحب اولاد ہو تو اس کے والدین میں سے ہر ایک کو ترکے کا چھٹا ملنا چاہیے اور اگر وہ صاحب اولاد نہ ہو اور والدین ہی اس کے وارث ہوں۔ تو ماں کو تیسرا حصہ دیا جائے اور اگر میت کے (ایک سے زیادہ) بھائی بہن بھی ہوں تو ماں چھٹے حصے کی حق دار ہوگی۔ (یہ تقسیم) اس کی وصیت پر عمل یا قرض ادا

کرنے کے بعد ہوگی۔تم نہیں جانتے کہ تمہارے باپ دادا اور تمہاری اولاد میں سے کون بلحاظ نفع تم سے قریب تر ہیں۔ یہ حصے اللہ نے مقرر کیے ہیں اور بے شک اللہ خوب جاننے والا، بڑی حکمت والا ہے اور تمہاری بیویوں نے جو کچھ چھوڑا ہو۔ اگر وہ بے اولاد ہوں تو اس کا آدھا حصہ تمہیں ملے گا ورنہ اولاد ہونے کی صورت میں ان کے ترکے کا چوتھا حصہ تمہارا ہے۔ (یہ تقسیم) ان کی وصیت پر عمل یا قرض ادا کرنے کے بعد ہوگی اور اگر تمہاری اولاد نہ ہو تو تمہارے ترکے میں تمہاری بیویوں کا چوتھا حصہ ہے پھر اگر تمہاری اولاد ہو تو تمہارے ترکے میں ان کا آٹھواں حصہ ہے۔ (یہ تقسیم) تمہاری وصیت پر عمل یا قرض ادا کرنے کے بعد ہوگی اور اگر وہ آدمی جس کا ورثہ تقسیم کیا جا رہا ہو۔ اس کا بیٹا ہو نہ باپ یا ایسی عورت ہو اس کا ایک بھائی یا بہن ہو تو ان دونوں میں سے ہر ایک کے لیے چھٹا ہے پھر اگر ان کی تعداد اس سے زیادہ ہو تو وہ سب ایک تہائی حصے میں برابر شریک ہوں گے۔ (یہ تقسیم) اس کی وصیت پر عمل یا قرض ادا کرنے کے بعد (ہوگی) جب کہ وہ کسی کو نقصان پہنچانے والا نہ ہو۔ یہ اللہ کی طرف سے تاکید ہے اور اللہ خوب جاننے والا بڑے حوصلے والا ہے۔ (النساء4: 12,11)

اسلام کا قانون وراثت:

اسلام نے قانون وراثت کو بڑی تفصیل سے بیان کیا ہے قرآن میں ایک جامع اور بنیادی خاکہ دیا گیا ہے جبکہ اس کی تفصیل اور جزئیات نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث میں بیان کی گئی ہے۔ یہ قانون اتنا جامع اور مفصل ہے کہ اگر کوئی شخص حصہ داروں کی مختلف ترتیب و ترکیب کے ساتھ اس پر عبور حاصل کرنا چاہے تو اسے اس کے لیے ساری عمر وقف کرنی پڑے گی۔ ادھر ارون شوری ہے جو قرآن کی دو آیات کے سرسری اور سطحی مطالعے سے اور شرعی معیارات سے واقفیت حاصل کیے بغیر ہی اس قانون کو جاننے کی توقع رکھتا ہے۔

اس کی حالت اس شخص جیسی ہے جو الجبرے کی ایک مساوات حل کرنے کا خواہاں ہے حالانکہ وہ ریاضی کے بنیادی قواعد (Bodmas) بھی نہیں جانتا۔ جن کے مطابق قطع نظر اس بات سے کہ ریاضی کی کون سی علامت پہلے آتی ہے پہلے آپ کو (Bod mas) حل کرنا ہوگا۔ یعنی پہلے بریکٹیں حل کرنی ہوں گی۔ دوسرے مرحلے پر تقسیم کا عمل انجام دینا ہوگا۔ اگر ارون شوری ریاضی سے نابلد ہے اور وہ مساوات کے حل کا عمل ضرب سے شروع کرتا ہے تو پھر تفریق کا عمل کرتا ہے اس کے بعد بریکٹوں کو دور کرنے کا عمل انجام دیتا ہے پھر تقسیم کی طرف آتا ہے اور آخر میں جمع کا عمل بروئے کار لاتا ہے تو یقیناً جواب غلط ہی ہوگا۔

اسی طرح جب قرآن مجید سورۃ النساء کی آیات نمبر 12,11 میں قانون وراثت بیان کرتا ہے تو اگرچہ سب سے پہلے اولاد کے حصے کا ذکر کیا گیا ہے اور اس کے بعد والدین اور میاں یا بیوی کے حصے بیان ہوئے ہیں لیکن اسلامی قانون وراثت کے مطابق سب سے پہلے قرض اور واجبات ادا کیے جاتے ہیں اس کے بعد والدین اور میاں یا بیوی کا حصہ ادا کیا جاتا ہے جو اس امر پر منحصر ہے کہ مرنے والے نے اپنے پیچھے بچے بھی چھوڑے ہیں یا نہیں اس کے بعد بچنے والی جائیداد بیٹوں اور بیٹیوں میں مقررہ حصوں کے مطابق تقسیم کی جاتی ہے لہٰذا کل حصص کے مجموعے کا ایک جانے کا سوال کہاں پیدا ہوا۔ (1)

سو یہ اللہ نہیں جو ریاضی نہیں جانتا بلکہ ارون شوری ریاضی کے علم سے بے بہرا اور ناواقف ہیں۔

قانون وراثت کے عام مسائل تو سیدھے ہیں ان میں جتنے حصص ہوں وہ مخرج کے حساب سے ورثاء میں تقسیم ہو جاتے ہیں لیکن بعض اوقات ورثاء کے حصص مخرج سے بڑھ جاتے ہیں ان میں مناسب عدد کا اضافہ کر کے مخرج کو حصص کے برابر کر لیا جاتا ہے اصطلاح میں اسے "عول" کہتے ہیں ان سے یہ فرق پڑتا ہے کہ ورثاء کا حصہ کچھ کم ہو جاتا ہے عول کا سب سے پہلے فتوی حضرت عمر بن خطابؓ نے دیا تھا اکثر صحابہ کرامؓ نے اسے قبول کیا۔ سوائے چند ایک کے ان میں حضرت عبداللہ بن عباسؓ بھی ہیں اس کی مثال یہ ہے مرنے والی خاتون اپنے پیچھے خاوند اور دو سگی بہنیں وارث کے طور پر چھوڑ جاتی ہے خاوند کا حصہ نصف ½ ہے اور دو سگی بہنوں کا حصہ دو تہائی 2/3 ہے۔ یہاں

اصل مسئلہ (ذو اضعاف اقل) 6 ہے۔ خاوند کو نصف (تین حصے) ملے گا اور بہنوں کے لیے 2 تہائی (چار حصے) ہے اب اس مسئلہ میں ''عول'' آ گیا یعنی مخرج تنگ ہو گیا جس کی بناء پر حصص بڑھا دیئے پہلے 6 تھے اب 7 ہو گئے اس طرح چند اور صورتیں اور بھی ہیں جن میں عول آتا ہے اور یہ عول کا آنا ریاضی کے قانون سے ناواقفیت کی بناء پر نہیں بلکہ یہ ایک تقدیری مسئلہ ہے کہ مورث کی موت کے وقت کون سا وارث زندہ ہے ان میں سے جو زیادہ حق دار ہے اسی کو وراثت میں سے حصہ ملے گا۔ بعض دفعہ مخرج کے مطابق نکالے ہوئے حصص بچ جاتے ہیں وہ اصحاب الفروض میں سے سوائے زوجین کے تقسیم کر دیئے جاتے ہیں۔ (تفصیل کے لیے دیکھیے تفہیم المواریث از استاد فاروق اصغر صارم)

☆......☆

بنی اسرائیل کے لئے من وسلویٰ کا نازل ہونا

اعتراض: من اور سلویٰ بنی اسرائیل کے لیے نازل کیا۔ (ترک اسلام سوال 59)

جواب: مَنّ اور سلویٰ آسمان سے نازل ہوتے تھے۔ قرآن مجید میں نزول کا لفظ اللہ کی طرف سے نعمت غیر مترقبہ کے دیئے جانے پر بھی بولا جاتا ہے حدید (لوہا) ایک نفع بخش دھات ہے۔ قرآن مجید میں حدید کے لیے لفظ نزول استعمال ہوا ہے۔ کیونکہ بنی نوع انسان کے لیے اس میں منافع کثیر ہیں۔

بنی اسرائیل جنگل میں مصیبت میں پھنسے ہوئے تھے۔ غذا کی قلت تھی تو اللہ تعالیٰ نے اس غذا کی قلت کو من وسلویٰ کے ذریعے پورا کر دیا۔ بنی اسرائیل کے لیے یہ نعمت اللہ تعالیٰ کی طرف سے غیر مترقبہ تھی۔ اس لیے من وسلویٰ کی پیداوار کو نزول کے ساتھ تعبیر کیا ہے۔

سخت محنت کے بغیر جو رزق ملتا ہے اس کو عربی میں من کہا جاتا ہے اس لیے کہا جاتا ہے الکماۃ من المن یعنی کھنبی بھی من ہے اور ترنجبین اور تمام جنگل کی اشیاء ان سب کو من میں داخل کیا گیا ہے اللہ تعالیٰ قوموں کو اپنی آسمانی نعمتوں سے نوازتا ہے تا کہ اللہ کی شکر گزاری کریں۔ اگر قوم اللہ کی نعمت پر اپنے عمل سے شکر گزاری کرتی ہے اور خدا کے احکام پر عمل پیرا ہوتی ہے تو اللہ تعالیٰ مزید نعمتوں کے دروازے کھول دیتا ہے۔ قرآن مجید میں دشت وصحرا میں بنی اسرائیل کے لیے غذائی قلت کو دور کرنے کے لیے من وسلویٰ لگا دیا لیکن بنی اسرائیل نے خدا کی شکر گزاری کرنے کی بجائے کفران نعمت کیا۔ احکام خداوندی کو پس پشت ڈال دیا۔ اس میں مسلمانوں کو یہ نوید سنائی ہے اللہ تعالیٰ اپنی جناب سے مسلمانوں کو نعمتوں سے نوازے گا۔ مسلمان ان نعمتوں کے نزول کے وقت اللہ کی شکر گزاری کریں۔ بنی اسرائیل کے نقش قدم پر نہ چلیں۔ اگر وہ خدا کی شکر گزاری بجا لائیں گے تو وہ مزید نعمتوں سے نوازے جائیں گے سو ایسا ہی ہوا۔ گھروں سے نکالے ہوئے غریب مسلمانوں کو اللہ تعالیٰ نے بغیر محنت شاقہ کے نعمتوں سے نوازا جب تک مسلمان اللہ کی شکر گزاری کے راستہ پر گامزن رہے۔ مسلمانوں کا قدم ترقی کے راستہ پر تھا۔ جب اللہ کی نعمتوں کے ناشکر گزار بندے بن گئے تو اللہ نے اپنی نعمتوں کو چھین لیا۔ لہٰذا اللہ کے فضلوں کا وارث بننے کے لیے ضروری ہے کہ پہلے اس کی دی ہوئی نعمتوں پر شکر گزاری کریں۔ شکر گزاری کیا ہے پہلے ان نعمتوں کا صحیح استعمال۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے کسی کو دولت دی ہے۔ تو اس کا اللہ کے احکام کے مطابق خرچ کرنا۔ سب سے اہم حکم یہ ہے کہ اس دولت میں غرباء مساکین کو حق دار گردانا۔ جب ایک امیر آدمی اپنی دولت میں غرباء کو حق دار جانے گا تو لازمی طور پر غرباء کی بہبود پر وہ دولت خرچ بھی کرے گا۔ اگر صاحب ثروت آدمی دولت کو اپنی عیاشی اور آن بان پر خرچ کرتا ہے اور غرباء کو نظر انداز کر دیتا ہے تو وہ اپنی دولت کو ناجائز اور حرام ذرائع پر خرچ کر رہا ہے تو یہ ناشکر گزاری ہے۔ وہ شخص اپنے اس زعم میں ہے کہ یہ دولت اس نے خود کمائی ہے اور اللہ تعالیٰ کی عطا کا انکار کر

رہا ہوتا ہے۔تو پھر اللہ اپنی نعمت سے محروم کر دیتا ہے۔اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں جہاں نعمتوں کے دیئے جانے کا ذکر کرتا ہے وہاں نعمتوں کے چھین لینے کا بھی ذکر کرتا ہے۔لہٰذا بنی اسرائیل کو من وسلویٰ دینا اپنی نعمت کے عطا کرنے کا ذکر ہے۔قرآن مجید میں اس قسم کے قصص میں ہر شخص اور ہر قوم کے لیے نصائح ہیں۔جو ان نصائح پر عمل پیرا ہو گا وہ شخص اس دنیا میں کامیاب وکامران زندگی بسر کرے گا۔

☆......☆

بنی اسرائیل پر بادلوں کا سایہ کرنا

اعتراض: ظَلَّلْنَا عَلَيْكُمُ الْغَمَامَ (بقرہ) پر اعتراض کیا ہے کہ بنی اسرائیل کو دھوپ نے ستایا تو خدا نے ان پر بادل بھیج دیا اور بطور سائبان دینے لگا۔(ترک اسلام سوال نمبر 60)

جواب: بنی اسرائیل چالیس برس اس ملک میں رہائش پذیر رہے جو ملک فلسطین اور بحیرہ قلزم کے درمیان ہے انسانی ضروریات بغیر پانی پوری نہیں ہو سکتیں اللہ تعالیٰ نے ان دنوں ضروری اوقات پر بارشیں برسائیں۔اچھی فصلیں ہوئیں۔پانی کی کمی پوری ہو گئی۔بنی اسرائیل میں خوشحالی آ گئی۔اللہ تعالیٰ نے اپنی اس نعمت کا ذکر کیا۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم، حضرت موسیٰ علیہ السلام کے مثیل ہیں۔حضرت موسیٰ علیہ السلام کی زندگی کے واقعات بیان کیے جا رہے ہیں کہ جس طرح اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کے لیے ان کی تنگ دستی کے وقت ایسے حالات پیدا کر دیئے جس سے ان کی عسرت اور تنگ دستی دور ہو گئی۔ان میں سے ایک واقعہ ضرورت کے مطابق بادلوں کا بھیجنا ہے مناسب وقت پر خوب بارش ہوئی۔تنگ دستی دور ہو گئی۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں بھی ہوا۔جنگ بدر کے موقع پر بارش ہو گئی۔یہ بارش مسلمانوں کی فتح کا باعث بنی اور مسلمانوں کے لیے عسرت کے دروازے بند ہونے شروع ہو گئے اور فراخی کے راستے کھل گئے اسی طرح جنگ احزاب میں ہوا۔رات کو طوفان آیا۔کفار کے خیمے اکھڑ گئے۔ان کے دلوں میں خوف وہراس پیدا ہو گیا اور رات کی تاریکی میں محاصرہ ختم کر کے اپنے اپنے گھروں کی طرف چل دیئے۔حضرت موسیٰ علیہ السلام کے دور میں بھی اللہ تعالیٰ نے بادلوں سے ان کی مدد کی اس طرح رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں عین مصیبت کے وقت اللہ تعالیٰ نے بادلوں سے مدد کی۔

اللہ تعالیٰ اپنے فضلوں کا ذکر کر رہا ہے کہ وہ کس طرح اپنے بندوں کی مختلف طریقوں سے مدد کرتا ہے۔نامعلوم معترض نے فضل الٰہی کو بھی ہدف تنقید بنایا ہے۔

☆......☆

بنی اسرائیل کا گائے کو ذبح کرنا

اعتراض: گاؤ کا ذبح کرنا بنی اسرائیل میں (دھرم پال نمبر 61)

جواب: تمام انبیاء کی ایک مشترکہ تعلیم ہے وہ ہے توحید کو قائم کرنا اور شرک کو مٹانا۔بنی اسرائیل کے تمام انبیاء علیہم السلام شرک اور بت پرستی کے دشمن تھے۔بنی اسرائیل نے بچھڑے کی پرستش شروع کر دی۔جیسا کہ یہ الفاظ ظاہر کرتے ہیں۔

تَسُرُّ النَّاظِرِيْنَ اور لَاتُثِيْرُ الْاَرْضَ وَلَاتَسْقِي الْحَرْثَ مُسَلَّمَةٌ لَّاشِيَةَ فِيْهَا (بقرہ)

جب حضرت موسیٰ علیہ السلام کو گائے پرستی کا علم ہوا انہوں نے اپنی قوم سے گائے پرستی کے متعلق پوچھا تو بنی اسرائیل نے حیلے بہانے تراشنے شروع کر دیئے آخر کار پس وپیش کے بعد بنی اسرائیل نے گائے کو ذبح کر دیا۔

گائے کو ذبح کرنے میں دنیا کی تمام اقوام کو یہی سبق دیا گیا ہے کہ خدا تعالیٰ کے علاوہ کسی کی پرستش جائز نہیں۔ صرف اللہ تعالیٰ کی ذات ہی پرستش کے لائق ہے۔ دوم بت پرست قوم کے مزاج سے بھی آگاہ کیا ہے کہ وہ راہ راست پر آنے سے قبل کس طرح اپنی گمراہی پر قائم رہنے کے لیے حیلے بہانے تراشتی ہے۔ بتایا ہے کہ انسان کو اپنی خواہشات کی پیروی کرنے کی بجائے احکام خداوندی پر عمل کرنا چاہیے۔ اسی میں انسان کی فلاح ہے چونکہ دھرم پال ہندو ہے اس لیے اس کو گائے کو ذبح کرنے کا حکم برا لگا ہے۔

☆......☆

فرعونیوں کا غرق ہونا اور بنی اسرائیل کا دریا کا عبور کر جانا اللہ کے عدل کے منافی ہے

فرعونیوں کے لیے عذاب کے طور پر ٹڈی، مینڈک اور چچڑی پیدا کرنا

اعتراض: ٹڈی، مینڈک چچڑی وغیرہ کا عذاب نازل کیا۔ (دھرم پال نمبر 62)

یہی اعتراض سوامی دیانند نے ستیارتھ پرکاش میں مختلف انداز میں کیا ہے۔ (ستیارتھ پرکاش اعتراض نمبر 3)

جواب: اس قسم کے عذابوں کے اذکار اکثر تاریخوں میں ملتے ہیں اور عام مشاہدے اور تجربے کی بات ہے۔ ٹڈی دل آیا اس نے کھیتوں کے کھیت تباہ و برباد کر دیئے اور قحط سالی کا سبب بنا۔ جب کثرت سے بارشیں ہوں۔ نشیب میں مٹی نمناک ہو جاتی ہے۔ تو وہاں مینڈک علی العموم پیدا ہوتے ہیں اسی طرح عفونت زیادہ ہو جاتی ہے تو وہاں قسما قسم کے حشرات الارض (چچڑیاں وغیرہ) پیدا ہو جاتے ہیں۔ یہ سب عذاب الٰہی ہیں۔ اس قسم کے عام مشاہدات میں اعتراض کیا۔ ہمارے تجربات اور مشاہدات سے تو قرآن مجید کے بیان کیے ہوئے عذاب کی تصدیق ہوتی ہے۔ فرق یہ ہے کہ معترض قسم کے لوگ اس قسم کے واقعات کو نیچر کا نتیجہ قرار دیتے ہیں قرآن مجید اس قسم کے عذاب و واقعات کو اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب قرار دیتا ہے تاریخ شاہد ہے کہ اللہ کے احکام کی باغی قومیں عذاب میں مبتلا ہوئیں اللہ تعالیٰ کے احکام کو توڑنا ہی عذاب الٰہی کا ذریعہ ہے۔ اس میں یہ سبق دیا گیا ہے۔ اللہ کے احکام کے مطابق زندگی بسر کرنی چاہیے۔ اس میں ہر شخص اور قوم کے لیے فلاح ہے۔

سوامی دیانند سرسوتی نے فرعونیوں کے غرق ہونے اور بنی اسرائیل کا باہر نکلنے کو اللہ کے انصاف اور عدل کے منافی قرار دیا ہے اس اعتراض میں لکھا ہے "جو ایک قوم کو ڈبو دے اور دوسری کو پار اتارے بھلا وہ خدا عدل اور انصاف پسندی کیوں کر سکتا ہے۔

قرآن مجید میں آتا ہے۔

فَاَغْرَقْنٰهُمْ فِي الْيَمِّ (الاعراف:136)

میں نے ان (فرعونیوں) کو دریا میں غرق کر دیا۔

وَجٰوَزْنَا بِبَنِيْٓ اِسْرَآئِيْلَ الْبَحْرَ (الاعراف 138:7)

ہم نے بنی اسرائیل کو دریا سے گزار دیا۔

خدا کا عدل:

اللہ کا یہ قانون اور سنت ہے کہ جب کوئی قوم ظلم اور فساد میں حد سے بڑھ جاتی ہے تو وہ تباہ و برباد ہو جاتی ہے قوم کی تباہی کا باعث اس کا ظلم ہے۔ جب فرعونی ظلم و فساد میں حد سے بڑھ گئے تو وہ اپنے گناہوں کی پاداش میں تباہ ہو گئے۔ یہی عدل اور انصاف کا تقاضا ہے کہ ظالم اپنے ظلم کی سزا پائے۔ اگر ظالم کو اس کی سزا نہ ملے تو یہ بے انصافی اور عدل کے منافی ہے لہٰذا فرعونیوں کا تباہ ہونا عین عدل ہے۔

☆......☆

بھونی ہوئی مچھلی کا زندہ ہونا

اعتراض: موسیٰ ایک خدا رسیدہ شخص سے ملنے گئے۔ پتہ یہ کہ جہاں بھونی ہوئی مچھلی زندہ ہو کر پانی میں چلی جائے وہاں پر ہے۔ (ترک اسلام سوال نمبر 66)

جواب: معترض نے قرآن مجید کا متن پڑھے بغیر غلط بیانی سے کام لیا ہے قرآن مجید میں کہیں بھی بھونی ہوئی مچھلی پھر اس کا زندہ ہونے کا ذکر نہیں۔ نہ مسلمانوں کا یہ عقیدہ ہے کہ بھونی ہوئی مچھلی زندہ نہیں ہو سکتی ہے۔ اس میں صرف یہ واقعہ بیان ہوا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو خدا رسیدہ بندے کے ملنے کی جگہ کا ذکر کیا گیا ہے ارشاد الٰہی ہے۔

فَلَمَّا بَلَغَا مَجْمَعَ بَيْنِهِمَا نَسِيَا حُوْتَهُمَا (کہف)

جب وہ ملنے کی جگہ پر پہنچے مچھلی بھول گئے۔

اس میں صرف یہ بتایا گیا مچھلی ان کی یاد سے اتر گئی اور وہ ندی میں چلی گئی یہ خدا رسیدہ بندے سے ملاقات کا مقررہ نشان تھا۔ جہاں ان کو بھول جانے کا واقعہ پیش آیا۔ اللہ تعالیٰ نے غیب سے انہیں ایک نشان بتایا چنانچہ وہ پورا ہو گیا۔ سالکوں اور اولیاء کرام کی سوانح میں اس قسم کے بے شمار واقعات ملتے ہیں یہ کوئی ایسی چیز نہیں جس پر اعتراض کیا جائے۔ اللہ تعالیٰ جو عالم الغیب ہے اپنے بندوں کو اس قسم کی غیب کی خبروں سے آگاہ کرتا ہے۔ یہ نشان خدا کی ہستی پر دلالت کرتے ہیں۔ اس میں ہر شخص کو یہ تعلیم دی ہے کہ وہ برگزیدہ بندوں کی صحبت اختیار کریں۔ ان کی صحبت میں اللہ تعالیٰ کے نشانات دیکھے گا۔ حکمت کی باتیں سیکھے گا۔

☆......☆

جنگ میں تین ہزار فرشتوں کے ساتھ مدد، اللہ اب مسلمانوں کی کیوں مدد نہیں کرتا

اعتراض: اگر پہلے مسلمانوں کو تین ہزار فرشتوں کے ساتھ مدد دیتا تھا تو ایسے وقت میں جب ان کی بادشاہت جا چکی ہے اور جا رہی ہے کیوں مدد نہیں دیتا پس ظاہر امر ہے کہ یہ صرف جاہلوں کو پھنسانے کا ڈھکوسلہ ہے۔ (ستیارتھ پرکاش سوال نمبر 51)

جواب: یہ اعتراض حسب ذیل آیت کی رو سے کیا ہے ارشاد الٰہی ہے۔

اَلَنْ یَّكْفِیَكُمْ اَنْ یُّمِدَّكُمْ رَبُّكُمْ بِثَلٰثَةِ اٰلٰفٍ مِّنَ الْمَلٰٓئِكَةِ مُنْزَلِیْنَ (آل عمران 3:124)

کیا یہ تمہارے لیے کافی نہیں کہ تمہارا رب تین ہزار اتارے ہوئے فرشتوں سے تمہاری مدد کرے۔

قرآن مجید میں تین بڑی جنگوں میں مسلمانوں کی مختلف تعداد کے ساتھ فرشتوں کے ذریعے مدد کرنے کا ذکر ہے جنگ بدر میں ایک ہزار جنگ احد میں تین ہزار اور جنگ احزاب میں پانچ ہزار فرشتوں کے نزول کا ذکر ہے۔ جنگ بدر میں دشمن کی تعداد ایک ہزار تھی اس لحاظ سے ایک ہزار فرشتوں کا ذکر کیا گیا جنگ احد میں دشمن کی تعداد تین ہزار تھی اس لحاظ سے تین ہزار فرشتوں کے نزول کا ذکر کیا ہے جنگ احزاب میں زیادہ تعداد تھی اس مناسبت سے پانچ ہزار فرشتوں کی مدد کا ذکر ہے۔

عموماً یہ تصور کیا جاتا ہے کہ فرشتے مومنوں کی طرف سے لڑتے بھی تھے۔ میرے نزدیک یہ تصور غلط ہے۔ ملائکہ کے نزول سے مراد صرف نصرت الٰہی ہے۔ فرشتوں کا نزول نصرت الٰہی پر دلالت کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی مدد ہمیشہ فرشتوں کے نزول کے ساتھ ہوتی ہے۔

معترض نے یہ سوال اٹھایا ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں فرشتے جنگوں میں مسلمانوں کی مدد کرتے تھے اب مسلمانوں کی بادشاہت ختم ہو چکی ہے اللہ اب مدد کیوں نہیں کرتا۔ اللہ تعالیٰ عہد رسول صلی اللہ علیہ وسلم میں اس لیے مسلمانوں کی مدد کرتا تھا کہ کفار اسلام کو نیست و نابود کرنے کے لیے تلے ہوئے تھے اور مسلمان اسلام اور مظلوم لوگوں کے دفاع کے لیے جنگ لڑ رہے تھے۔ اس لیے ضروری تھا کہ اللہ تعالیٰ ان کمزور مسلمانوں کی مدد فرشتوں کے ذریعے کرتا تا کہ اسلام کا بول بالا ہو۔ اور ناتواں اور کمزور مسلمانوں کی جانیں اور مال اور ابروئیں محفوظ رہیں۔ مسلمان اس نیک مقصد کے لیے میدان جنگ میں آئے تھے۔ اللہ تعالیٰ کی یہ سنت ہے کہ وہ اپنے رسولوں کی مدد کرتا ہے کیونکہ تمام رسول اللہ کے پیغام کو لے کر آتے تھے اسی پیغام میں لوگوں کی فلاح مضمر تھی۔ اس لیے اللہ تعالیٰ رسولوں کی مدد کے لیے فرشتے نازل کرتا تھا۔ اسی سنت متمرہ کے مطابق رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی مدد کی گئی۔ یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی بھی مدد کی۔ کرشن جی مہاراج کی بھی مدد کی۔ اسی طرح دیگر انبیاء کی بھی۔ اللہ تعالیٰ نے فرشتے مومنین کی مدد کے لیے مقرر کر رکھے ہیں ان کے ذریعے اپنے بندوں کی مدد کرتا ہے۔ بعد کے آنے والوں کی مدد کے لیے یہ شرط عائد کی ہے کہ اللہ ان کی مدد کرے گا جو مومن ہوں گے۔ مومن کے لفظ میں یہ اشارہ ہے کہ وہ اس مقصد کے لیے لڑ رہے ہوں۔ جس مقصد کے لیے رسول آئے تھے۔

ارشاد الٰہی ہے۔

اَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ

یعنی مومن ہی کامیاب ہوں گے۔ مومن اپنی ذات کے لیے نہیں لڑتے بلکہ خدا کی خاطر لڑتے ہیں وہ اللہ کے نام کو بلند کرنے کے لیے لڑتے ہیں مسلمانوں کی لڑائی بادشاہت کو قائم کرنے کے لیے نہیں ہوتی۔ بلکہ خدا کی بادشاہت قائم کرنے کے لیے ہوتی ہے۔

مسلمانوں کی بادشاہت اس وجہ سے گئی تھی کہ وہ ان اصولوں اور قوانین کو ترک کر چکے تھے۔ جن پر عمل کرنے سے بادشاہتیں قائم رہتی ہیں۔ قرآن مجید نے استحکام سلطنت کے بھی اصول اور قوانین مقرر کر دیئے ہیں۔ مسلمانوں کی بادشاہتیں بھی اسی قانون کی وجہ سے تباہ ہوئی تھیں۔ اللہ تعالیٰ خواہ مسلمان ہو یا غیر مسلم ظالم کی مدد نہیں کرتا۔ یہ اللہ کا قاعدہ کلیہ ہے اس میں مسلم اور غیر مسلم کی تفریق نہیں۔ اگر مسلمان ظالم ہے تو وہ اللہ کی مدد سے محروم رہے گا۔ اگر کافر منصف ہے تو اللہ اس کا حامی و ناصر ہے۔ معترض نے یہ سمجھا ہی نہیں کہ اللہ تعالیٰ کن کی مدد کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے عہد رسول میں مسلمانوں کی اس وجہ سے مدد کی تھی وہ حق پر تھے اور حق قائم کرنے کے لیے لڑ رہے تھے وہ ذاتی اغراض و مقاصد کے لیے نہیں لڑ رہے تھے۔ اب بھی جب مسلمان حق کی خاطر لڑیں گے تو لازمی کامیاب ہوں گے۔ اللہ کی مدد ضرور آئے گی۔ اللہ تعالیٰ حق اور صداقت کی مدد کرتا ہے نہ کہ انسان کی۔ کیونکہ وہ شخص حق کا علمبردار ہوتا ہے اس لیے یہ کہا جاتا ہے کہ اللہ نے فلاں شخص کی مدد کی۔ دراصل وہ مدد حق اور صداقت کی ہوتی ہے اگر دنیا میں حق کی مدد نہ کی جائے تو دنیا میں ظلم و فساد ہی برپا ہو جائے۔

الزامی جواب: اتھروویدکانڈ 8 سوکت 8 منتر 15 میں ہے۔ ''گندھروں، موروں، سانپوں نیک لوگوں بزرگوں نظر آنے والے اور نہ نظر آنے والوں کو بھیجتا ہوں جس سے وہ (دشمن کی) فوج کو ماریں۔''

اتھروویدکانڈ 11 کی سوکت 9 اور 10 میں دو جنگ کے خاص دیوتا جن کا نام اربدی اور انیربدی ہے ان کو راجا کی فوج کی مدد کے لیے بلایا گیا۔ ''سب پر کامل غلبہ پاتے ہوئے تم اٹھو کمر کس لو۔ دوستو اے فرشتو تم دونو اس جنگ کو اکٹھے جیت کر اپنے (آسمان) مقام پر جاٹھہرو۔ (اتھروویدکانڈ 11 سوکت 4 منتر 26)

مذکورہ منتروں سے یہ واضح ہوتا ہے کہ ویدوں میں بھی آسمانی مدد کا ذکر ہے اور ایسے دیوتا موجود ہیں جو دشمن کی فوج کو تباہ کرتے ہیں۔ وہ بروقت مدد کے لیے بلائے جاتے ہیں۔ دراصل حق کی مدد کرنا اللہ تعالیٰ کی سنت ہے۔ جب کوئی حق کے لیے اٹھتا ہے اللہ اس کی مدد کرتا ہے۔ عہد مرد میں مسلمانوں کی مدد اسی اصول کے تحت کی گئی تھی۔ آئندہ بھی اسی اصول کے تحت کی جائے گی۔

☆......☆

مسلمان غیر مسلموں کے مارنے کی دعا کرتے ہیں

(کیا خدا نادان ہے کہ ان کی بات مان لے)

اعتراض: مسلمانوں کی غلطی کا اندازہ لگایئے جو لوگ ان کے مذہب میں نہیں ہیں ان کے مارنے کے لیے وہ خدا سے دعا کرتے ہیں کیا خدا نادان ہے کہ ان کی بات مان لے؟ اگر مسلمانوں کا کارساز اللہ ہے تو پھر ان کے کام کیوں بگڑتے ہیں؟ اور خدا مسلمانوں کی محبت میں مبتلا نظر آتا ہے اگر خدا ایسا طرف دار ہے تو وہ پارساؤں کی بندگی کے لائق ہرگز نہیں ہوسکتا۔ (ستیارتھ پرکاش اعتراض نمبر 52)

جواب: معترض نے قرآن مجید کے ان الفاظ کو بنیاد بنا کر اعتراض کیا ہے۔

فَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكَافِرِيْنَ اور بَلِ اللّٰهُ مَوْلٰكُمْ

اس آیت میں غیر مسلموں کو کہیں بھی مارنے کا ذکر نہیں ہے۔ صرف کافر قوم پر مدد کرنے کی دعا ہے۔ آیت کے سیاق وسباق سے یہ واضح معلوم ہوتا ہے کہ یہ وہ کافر قوم ہیں جو حق کو مٹانے کے لیے میدان جنگ میں آئے تھے اور مسلمان حق کی سربلندی کے لیے لڑ رہے تھے۔ وہ اللہ تعالیٰ سے دعا گو ہیں کہ ان کو محاربین کفار پر فتح دے۔ یہ اللہ کا دستور ہے کہ وہ ان لوگوں کی مدد کرتا ہے۔ جو حق کے علمبردار ہوں۔

دشمنوں پر فتح کی دعا اور التجا ویدوں میں پائی جاتی ہے چنانچہ ایشور حکم دیتا ہے۔

''تمہارے آیدہ آتش گیر اسلحہ اور تیر کمان وغیرہ ہتھیار میری عنایت سے مضبوط اور فتح نصیب ہوں۔ بدکردار دشمنوں کو شکست اور تمہاری فتح ہو۔ تمہاری فوج جرار کارگزار اور نامی گرامی ہو۔ تاکہ تمہاری عالمگیر حکومت روئے زمین پر قائم ہو۔ (رگ وید اشٹک 1، ادھیائے 3، ورگ 1، منتر 2)

قرآن مجید میں غلبہ حاصل کرنے کے لیے مومن ہونا ضروری قرار دیا ہے۔

ارشادالٰہی ہے۔

اَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ

تمہی غالب رہو گے اگر تم مومن ہو۔

مومن سے مراد حق کی راہ پر گامزن ہونے والا تا کہ حق کا بول بالا ہو اور باطل ناکام و نامراد ہو۔ یہی وہ لوگ ہیں جو اللہ سے مدد کے طلبگار ہیں اللہ کی نصرت انہی لوگوں کے لیے ہے۔ وید نے بھی یہی اصول بیان کیا ہے۔

''جب تک لوگ دھرم پر چلتے رہتے ہیں تب تک سلطنت بڑھتی رہتی ہے اور جب بدکردار ہو جاتے ہیں تو راج نیست و نابود ہو جاتا ہے۔(منڈل 1، سکت 31، منتر 2)

پس خدا کا یہ مسلمہ دستور ہے کہ دنیا میں وہی غالب رہتا ہے جو حق پر ہو اور حق کا علمبردار ہی اللہ سے اپنے مخالفین کے خلاف دعا کی درخواست کرتا ہے اس اصول سے کسی صاحب بصیرت کو انکار نہیں اور فطرت انسانی کے مطابق ہے۔

اللہ تعالیٰ ان مسلمانوں کا کارساز ہوتا ہے۔ جو اس کے احکام پر عمل کرتے ہیں اور حق پر قائم رہتے ہیں خواہ کتنی ہی مشکلات کا سامنا کرنا پڑے ان کے پائے استقلال میں ذرہ بھر جنبش نہیں آتی۔ اس قسم کے مسلمانوں کے ساتھ ہمیشہ خدا کی نصرت رہتی ہے اور اللہ ان کا کارساز ہوتا ہے۔ اگر کہیں مسلمان ناکام و نامراد ہیں تو ناکامی کی وجہ معلوم کرنا پڑے گی۔ ناکامی کی کوئی وجہ ضرور ہو گی۔ اسلام کا قانون برحق ہے۔ کسی مسلمان کی ناکامی سے اللہ کا اصول باطل نہیں ہو جاتا۔ اللہ تعالیٰ نے انسانی زندگی کے لیے ایک مکمل ضابطہ قائم کیا ہے۔ جو شخص اس ضابطے پر چلے گا۔ وہ کامیاب ہو گا جو نہ چلے گا وہ ناکام و نامراد رہے گا۔ اس میں کسی کا مسلمان ہونا یا نہ ہونا کوئی معنی نہیں رکھتا۔ جو بھی اللہ کے مقرر کردہ احکام پر چلے گا وہی کامیاب ہو گا۔ لہٰذا خدا کسی کا طرف دار نہیں۔ اس دنیا میں کامیابی حاصل کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے قوانین وضع کر رکھے ہیں جو ان اصولوں اور قوانین پر چلے گا کامیاب ہو گا۔ اگر مسلمان ناکام نظر آتے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ اللہ کے قوانین پر عمل پیرا نہیں اللہ کا قانون سب کے لیے یکساں ہے۔ جس طرح اللہ تعالیٰ نے تمام انسانوں کے لیے سورج چاند ستارے ہوا، پہاڑ دریا سمندر اور دیگر اشیاء پیدا کی ہیں ان اشیاء سے ہر شخص خواہ وہ مسلمان ہے یا غیر مسلم سب یکساں فائدہ اٹھا رہے ہیں کوئی تفریق نہیں ہے اسی طرح اللہ تعالیٰ کے تمام انسانوں کے لیے ضابطہ حیات مقرر کر دیا ہے۔ جو بھی اس پر عمل پیرا ہو گا وہ کامیاب ہو گا۔ یہ وہ اصول ہے جس پر کسی کو اعتراض نہیں۔

اگر مسلمان ناکام ہیں تو وہ اپنے کردہ افعال کی وجہ سے ناکام و نامراد ہیں۔ یہ وہ تعلیم ہے جس کو قرآن مجید نے لوگوں کے سامنے پیش کی ہے قرآن مجید کسی خاص قوم کے لیے نہیں بلکہ تمام انسانوں کے لیے چشمہ ہدایت ہے قرآن مجید میں آتا ہے هدًى للنّاس کہ قرآن تمام انسانوں کے لیے چشمہ ہدایت ہے یہی دو الفاظ معترض کے اعتراض کو باطل کر دیتے ہیں۔ اللہ ان لوگوں سے محبت کرتا ہے جو اس کے قانون کے پابند ہیں اور اس کے احکام پر چلتے ہیں اور انہی کو منزل مقصود تک پہنچاتا ہے۔ کتنی پیاری تعلیم ہے جس کو معترضین نے سمجھا ہی نہیں قرآن مجید جیسی اعلیٰ قسم کی تعلیم کی حامل کتاب پر اپنی ناسمجھی سے اعتراض کر رہے ہیں۔

......☆......

ا۔ پیغمبر پر ایمان لانا خدا کے ساتھ شرک ہے

اگر خدا بلا پیغمبر اپنی خواہش کے مطابق کام نہیں کرسکتا تو ضرور خالی از قدرت ہوا۔

اعتراض: جب مسلمان سوائے خدا کے کسی پر ایمان نہیں لاتے اور نہ کسی کو خدا کا شریک مانتے ہیں تو پیغمبر صاحب کو ایمان میں کیوں خدا کے ساتھ شریک گردانتے ہیں؟ اللہ نے پیغمبر پر ایمان لانا لکھا ہے اس لیے پیغمبر بھی شریک ہو گیا۔ پھر خدا کو لاشریک کہنا غلط ہوا۔ اگر اس کا مطلب یہ سمجھا جائے کہ محمد صاحب کے پیغمبر ہونے پر ایمان لانا چاہیے تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ محمد صاحب کی کیا ضرورت ہے اگر خدا بلا پیغمبر کے اپنی خواہش کے مطابق کام نہیں کرسکتا تو ضرور خالی از قدرت ہوا۔ (سیتارتھ پرکاش اعتراض 53)

یہ اعتراض مختلف انداز اور مختلف الفاظ میں کئی مخالفین نے کیا ہے کہ کسی نے یہ کہا کہ مسلمانوں نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو ربانی اور ملکوتی مقام پر فائز کیا ہے اور بعض نے اس حد تک مبالغہ آرائی کی کہ مسلمان محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی پرستش کرتے ہیں۔ اگر اسلام کی تعلیمات کا سرسری بھی جائزہ لیا جائے تو اسلام میں غیر اللہ کی پرستش کا شائبہ تک نہیں ملتا۔

اسلام نے توحید کے موضوع کو اس تفصیل سے بیان کیا ہے کہ اس کا کوئی پہلو تشنہ نہیں رہا۔ اسی طرح شرک کو اس طرح رد کیا کہ شرک کا کوئی پہلو بھی مخفی نہیں رہنے دیا۔ حتیٰ کہ قرآن مجید کی پوری سورۃ اخلاص توحید کے موضوع پر ہے۔ اس سورۃ میں توحید کے تمام پہلوؤں کو اجاگر کر دیا ہے۔ عناصر قدرت کی پرستش اور بت پرستی سے منع کیا ثنویت، تثلیث اور ابنیت کا رد کیا۔ اتباع نفسانی خواہش کو بھی شرک کی ایک باریک قسم قرار دیا ہے۔ اسلام کسی انسان کے لیے مقام الوہیت تجویز نہیں کرتا۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم خود اپنے متعلق یہ اعلان کرتے ہیں۔

اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوْحٰٓى اِلَيَّ اَنَّمَآ اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ (الکہف 18:110)

کہ میں صرف تمہاری طرح بشر ہوں لیکن میری طرف وحی کی جاتی ہے کہ تمہارا معبود ایک ہی معبود ہے۔

قرآن مجید کی اس آیت کی موجودگی میں یہ کہنا کہ مسلمان محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو کوئی خدائی مقام دیتے ہیں پرلے درجے کی حماقت اور نادانی ہے۔

رسالت پر ایمان لانا:

اسلام نے صرف رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت پر ایمان لانا ضروری قرار نہیں دیا۔ بلکہ تمام انبیاء علیہم السلام پر ایمان لانا ضروری قرار دیا ہے کیا دوسرے انبیاء بھی ایمان لانے کی وجہ سے مقام الوہیت پر فائز ہو گئے ہیں؟ قرآن مجید میں آتا ہے۔

وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالْكِتٰبِ وَالنَّبِيّٖنَ (البقرہ 2:177)

لیکن نیک وہ ہے جو اللہ اور آخرت کے دن اور فرشتوں اور کتاب اور نبیوں پر ایمان لائے۔

دوسری جگہ آتا ہے۔

كُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ۔ (البقرہ285:2)

سب اللہ پر اس کے فرشتوں اور اس کی کتابوں اور اس کے رسولوں پر ایمان لاتے ہیں ہم ان رسولوں میں سے کسی ایک میں تفریق نہیں کرتے۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ خاص خصوصیت ہے کہ آپ ﷺ نے تمام رسولوں کی رسالت کو اپنی رسالت میں شامل کیا۔ اللہ پر ایمان لانا بالکل الگ معاملہ ہے اور رسول پر ایمان لانا ایک الگ معاملہ ہے۔ رسول پر ایمان اس وجہ سے لاتے ہیں یہ خدا کے بھیجے ہوئے ہیں اور خدا کی ذات سے آگاہ کرتے ہیں۔ اگر اللہ تعالیٰ نہ بھیجتا تو خدا کا چہرہ لوگوں کی نظر سے اوجھل رہتا۔ دوم ان لوگوں (رسولوں) نے خدا سے وحی پا کر احکام الٰہی سے آگاہ کیا۔ یہ وہ احکام ہیں جن پر انسان چل کر منزل مقصود تک پہنچتا ہے۔ لہٰذا رسول پر ایمان لانا شرک کے مترادف نہیں بلکہ توحید کا لازمہ ہیں۔ اگر یہ لوگ مبعوث نہ ہوتے تو خدا کا چہرہ لوگوں کی نظر سے اوجھل رہتا۔ سوم یہ اللہ کے خلیفہ (نائب) ہیں۔ اللہ کی نیابت کی وجہ سے رسول کو تسلیم کرنا لازمی ہے۔

خدا کا بغیر پیغمبر اپنی خواہش کا پورا کرنا:

پیغمبر کا وجود اس وجہ سے ضروری ہے کہ وہ ان احکام کی عملی تفسیر ہوتا ہے جو اس پر نازل ہوتے ہیں۔ دوم اپنے قول سے ان احکام کی وضاحت بھی کرتا ہے گویا عمل اور قول کے ذریعے احکام خداوندی کی وضاحت کرتا ہے۔ اگر احکام کسی درخت پر نازل ہوتے تو پھر انسان کیوں کر سمجھ سکتا کہ یہ کیا چیز ہیں۔ احکام کی وضاحت کے لیے کسی انسان کا پیغمبر ہونا ضروری ہے۔

الزامی جواب: ہندو تو خود اس بات کے قائل ہیں کہ وید بغیر رشیوں کے کسی کو سمجھ میں نہیں آسکتے اس لیے ان کو رشی کہا جاتا ہے کہ وہ خود منتروں کو دیکھتے اور دکھاتے ہیں اگر رشیوں کا ماننا ضروری نہیں تو ان کو منتر دکھانے والے کیوں کہا گیا ہے ان کے نام ویدوں میں کیوں درج ہیں ہندو کے برہمن گرنتھوں میں تو لکھتا ہے کہ جو شخص منتروں کے رشی دیوتا، وزن اور سرتال جانے بغیر وید کو پڑھتا ہے وہ گڑھے میں گرتا ہے اور گنہگار ہوتا ہے اس لیے وید کے ہر سوکت پر رشی دیوتا کا نام دیا ہوا ہے پس ہر رشی کا معلوم کرنا اور ماننا ضروری ہے۔

اللہ تعالیٰ نے نظام کائنات چلانے کے لیے وسائط مقرر کیے ہوئے ہیں ان کی معرفت نظام کائنات چلا رہا ہے یہ اللہ کا دستور ہے اللہ تعالیٰ کا اپنے وسائط کے ذریعے کام لینے کا یہ مطلب نہیں کہ وہ خالی از قدرت ہے۔ تمام وسائط اس کی قدرت کے نشان ہیں لوگوں کو ہدایت دینے کا طریقہ اور ذریعہ بعثت انبیاء ہے۔ انبیاء اللہ کی قدرت کے نشان ہیں ان کی معرفت اپنی قدرت کے نشان دکھاتا ہے اگر خدا نے نبیوں کی معرفت لوگوں کو ہدایت دی ہے تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ اس نے نبی کی معرفت ہدایت دی ہے اس لیے وہ خالی از قدرت ہے۔ اللہ کا اپنا مقرر کردہ نظام ہے اس میں کوئی دخل نہیں دے سکتا۔ اللہ تعالیٰ نے ہی یہ قانون بنایا ہے کہ وہ اپنی خواہش نبیوں کے ذریعے لوگوں تک پہنچائے۔ خدا کا اپنا قانون اور دستور ہے کہ وسائط کے ذریعے اپنا نظام کائنات چلائے اس کے پیچھے اللہ کا حکم کارفرما ہوتا ہے۔ وہ وسائط اللہ کے حکم سے ہی کام کر رہے ہیں۔ بادشاہ اپنے کارندوں کے ذریعے ہی اپنی حکومت چلاتے ہیں کارندوں کی کارگزاری بادشاہ کے حکم کے مطابق ہوتی ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ بادشاہ کا کوئی عمل دخل نہیں۔ اللہ تعالیٰ کی شان اور رفعت اسی میں ہے کہ اس کے حکم کے مطابق اس کے کارندے نظام کائنات چلائیں۔ حقیقت میں وہ کارندے نظام کائنات نہیں چلا رہے بلکہ اللہ تعالیٰ کا حکم ان وسائط کے ذریعے جاری و ساری ہو رہا ہے۔ قرآن مجید میں آتا ہے۔ يَفْعَلُوْنَ مَا يُؤْمَرُوْنَ وہ وہی کرتے ہیں جو ان کو حکم دیا جاتا ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ اپنا رسول بھیج کر اپنا حکم نافذ کرتا ہے تو اس کا یہ ہرگز مطلب نہیں کہ وہ خالی از قدرت ہے۔

قرآن کا خدا اور پیغمبر دونوں جنگجو ہیں

اعتراض: یہ قرآن کا خدا اور پیغمبر دونوں جنگجو ہیں جو لڑائی کا حکم دیتا ہے وہ امن میں خلل انداز ہوتا ہے۔ نجات تو ادھرم کی لڑائی سے خوف کرنے سے ہوتی ہے نہ کہ برائے نام خدا سے ڈرنے سے کہ جس سے ڈرنا نہ ڈرنا برابر ہے۔ (سیارتھ پرکاش نمبر 54)

دھرم پال نے بھی یہ اعتراض کیا ہے۔

جواب: یہ اعتراض اس آیت قرآنی کا ہے۔

يَآ اَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اصْبِرُوْا وَصَابِرُوْا وَرَابِطُوْا وَاتَّقُوْا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ (آل عمران 3:200)

اے لوگو! جو ایمان لائے ہو۔ صبر کرو اور مقابلہ میں بڑھ کر صابر دکھاؤ اور محافظت کرو اور اللہ کا تقویٰ اختیار کرو۔ تاکہ تم کامیاب ہو۔

معترض کا اعتراض صرف مذکورہ آیت پر ہی نہیں بلکہ قرآن مجید میں جہاد کا جو تصور پایا جاتا ہے اس پر بھی یہ اعتراض وارد ہوتا ہے۔ سیرت سید البشر کے حصہ اول، دوم اور سوم تینوں جلدوں میں جہاد پر مفصل بحث ہو چکی ہے جس میں واضح کیا گیا ہے کہ مسلمانوں کی تمام جنگیں دفاعی تھیں۔ بین الاقوامی قانون کے مطابق ہر قوم کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ اپنے دفاع میں ہتھیار اٹھائے۔ دوم رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے تو دفاعی جنگوں میں بھی خوں ریزی سے روکا اور وحشت ناک جنگی قوانین کو ختم کیا۔

معترض نے لفظ رَابِطُوْا سے ''خدا اور پیغمبر دونوں جنگجو ہیں'' اخذ کیا ہے۔

رابطو کے معنی ''جنگ میں لگے رہو'' بالکل غلط معنی ہیں بلکہ اس کے معنی ہیں اپنی سرحدوں کی حفاظت میں لگے رہو۔ رابطوا، ربط سے ہے رَبَطَ الْفَرَسَ کے معنی ہیں گھوڑے کو حفاظت کے لیے مکان پر باندھنا اور رباط اس مکان کو کہتے ہیں جس میں محافظین کا قیام ہو۔ مفردات میں ہے مرابطہ جس سے رابطہ ہے دو طرح پر ہے ایک حدود پر گھوڑوں کو باندھنا یعنی دشمن کے مقابلہ کے لیے ہر وقت تیار رہنا اور دوسری مرابطہ انسان کے نفس کے متعلق ہے گویا نفس کو حدود پر کھڑا کیا گیا تاکہ وہ انسان کی حفاظت کرے۔ نبی کریم صلعم سے اس کے معنی انتظار الصلوٰۃ بعد الصلوٰۃ بھی مروی ہیں یعنی ایک نماز کے بعد دوسری نماز کا انتظار لسان العرب میں دونوں معنی رباط یا مرابطۃ کے ہیں یعنی ایک دشمن کی حد پر قائم رہنا اور دوسرا ایک امر کی محافظت کرنا۔

گویا اس آیت میں دشمن اور بدی دونوں کا مقابلہ کرنے کی تعلیم دی گئی ہے۔ اس آیت میں فلاح کے تین طریقے بیان کیے ہیں۔ صبر کرنا، مقابلہ میں بڑھ کر صبر دکھانا، تیسرا بدی کا مقابلہ کرنا اور برے کاموں سے دور رہنا۔ دوسرے معنی سرحد پر گھوڑے باندھنا بھی (دشمن کے مقابل پر تیار رہنا) لیے جا سکتے ہیں ان تین اصولوں پر عمل کرنے سے ہی انسان کامیاب ہو سکتا ہے۔

معترض نے رابطوا کے جو معنی ''جنگ میں لگے رہو'' کیے ہیں بالکل لغت عرب کے لحاظ سے غلط ہیں۔ لغت عرب کے لحاظ سے ربط کے معنی دشمن کے مقابل پر سرحدوں کی حفاظت کرنا یا اپنے نفس کو بدی سے دور رکھنے کے لیے ہیں۔

قرآن مجید میں کسی جگہ بھی خواہ مخواہ لڑائی کرنے کا حکم نہیں صرف مدافعت اور محافظت کا حکم ہے۔

قرآن مجید میں آتا ہے۔

اُذِنَ لِلَّذِیْنَ یُقٰتَلُوْنَ بِاَنَّهُمْ ظُلِمُوْا وَ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰی نَصْرِهِمْ لَقَدِیْرُ (الحج39:22)

ان لوگوں کو اجازت دی گئی ہے جن سے لڑائی کی جاتی ہے اس لیے ان پر ظلم کیا گیا اور بے شک اللہ ان کی مدد پر قادر ہے۔

اس آیت میں بتایا گیا ہے کہ صرف مظلومیت کی حالت میں جنگ کی اجازت دی گئی تھی۔ مسلمان صرف مظلوم ہی نہیں تھے بلکہ کفار نے ان کو صفحۂ ہستی سے مٹانے کے لیے جنگیں مسلط کر دی تھیں۔ جنگجو دشمن کے دفاع میں مسلمانوں نے ہتھیار اٹھائے تھے۔

دوسری جگہ آتا ہے۔

وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّهُدِّمَتْ صَوَامِعُ وَبِيَعٌ وَّصَلَوٰتٌ وَّمَسٰجِدُ يُذْكَرُ فِيْهَا اسْمُ اللّٰهِ كَثِيْرًا (الحج40:22)

اور اگر اللہ لوگوں کو ایک دوسرے کے ذریعے سے نہ ہٹاتا رہتا تو یقیناً راہبوں کی کوٹھریاں اور گرجے اور عبادت گاہیں اور مسجدیں جن میں اللہ کا نام بہت لیا جاتا ہے گرادی جائیں۔

یہ آیت بتاتی ہے کہ مسلمانوں کی جنگیں مذہبی آزادی کے لیے تھیں نہ صرف مسلمانوں کی آزادی کے لیے۔ اسلام نے دوسرے مذاہب کے انبیاء علیہم السلام کو ماننا ہی جزو ایمان قرار نہیں دیا بلکہ ان کے مذاہب کی عبادت گاہوں کی حفاظت بھی مسلمانوں کے فرائض میں داخل کیا۔ یہ ہے مقصد اسلامی جہاد کا۔

ایک دوسری جگہ جہاد کے مقصد کو ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے ارشاد الٰہی ہے۔

وَمَا لَكُمْ لَا تُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَالْمُسْتَضْعَفِيْنَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَآءِ وَالْوِلْدَانِ الَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا اَخْرِجْنَا مِنْ هٰذِهِ الْقَرْيَةِ الظَّالِمِ اَهْلُهَا وَاجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْكَ وَلِيًّا وَّاجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْكَ نَصِيْرًا (النساء75:4)

اور تمہیں کیا (عذر) ہے کہ تم اللہ کے رستے میں جنگ نہ کرو اور کمزور مردوں اور عورتوں اور بچوں کے لیے جو کہتے ہیں اے ہمارے رب ہم کو اس بستی سے نکال جس کے رہنے والے ظالم ہیں اور اپنی جناب سے ہمارا کوئی ولی بنا۔

اس آیت میں بھی جنگ کی ضرورت کو بیان کیا گیا ہے اول تو فی سبیل اللہ کہہ کر بتایا ہے کہ جنگ کی ضرورت دین کی حفاظت ہے کیونکہ کفار بزور شمشیر اس کو مٹانے پر تلے ہوئے تھے۔ دوسری ضرورت یہ بیان کی گئی ہے کمزور مرد اور عورتیں اور بچے اہل مکہ سے دکھ برداشت کر رہے تھے۔

ارشاد الٰہی ہے۔

وَقَاتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَكُمْ وَلَا تَعْتَدُوْا اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ (البقرہ190:2)

اور اللہ کی راہ میں ان لوگوں سے جنگ کرو جو تم سے جنگ کرتے ہیں اور زیادتی نہ کرو اللہ زیادتی کرنے والوں سے پیار نہیں کرتا۔

اس آیت میں جنگ کی دو شرائط بیان کر دی ہیں اول صرف ان لوگوں سے جنگ کی جائے جو جنگ کرنے کے لیے میدان جنگ میں اترے ہیں وہ لوگ جو جنگ میں شامل نہیں یا جو جنگ میں ابتداء نہ کریں ان سے جنگ کرنے کی اجازت نہیں دوسرے حد سے نہ بڑھا جائے۔ یعنی جنگ میں اپنے حق سے یا ضرورت جنگ سے تجاوز نہ کیا جائے تا کہ اتلاف جان و مال کا سبب نہ ہو۔ اسلامی جنگ رحمت ہی رحمت نظر آتی ہے۔ پھر عفو اور انصاف اور تقویٰ کا حکم بھی ساتھ ہے۔

جنگ میں صلح کے متعلق فرمایا:

وَ اِنْ جَنَحُوْا لِلسَّلْمِ فَاجْنَحْ لَهَا وَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ (الانفال 16:8)

اور اگر وہ صلح کی طرف مائل ہوں تو تُو بھی اس کی طرف جھک جا اور اللہ پر بھروسہ رکھ۔

گویا جہاد کا مقصد دشمن کے شر کو رفع کرنا ہے۔ جب دشمن صلح کی طرف مائل ہو جائے اور شر کا خطرہ ختم ہو جائے تو اسلام اس حالت میں صلح کی تعلیم دیتا ہے۔ صلح حدیبیہ اس کی واضح مثال ہے جب کفار صلح کی طرف مائل ہوا تو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی شرائط پر صلح کر لی۔ گو بظاہر وہ شرائط بعض مسلمان عمائدین کو ناپسند تھیں۔ لیکن رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان شرائط کو بطیب خاطر قبول کر لیا۔

الزامی جواب آزادی (ویدک دھرم) کی جنگجوئی)

آیئے ذرا ہندو دھرم کے ویدوں کا مطالعہ کریں وہ جنگ کے متعلق کیا تعلیم دیتے ہیں۔

''دھرم کے محافظوں کو زندہ آگ میں جلا دو۔'' (یجر وید ادھیاء 13 منتر 12 دیانند بھاش)

''دشمنوں کے کھیتوں کو اجاڑ دیعنی گائے بیل بکری اور لوگوں کو بھوکا مار کر ہلاک کرو۔'' (حوالہ مذکور منتر 13)

اپنے مخالفوں کو درندوں سے پھڑوا ڈالو۔ (یجر وید 19,17,15)

''اے اندر دیوتا ہمارا دیا ہوا سوم رس تجھے خوش اور متوالا کرے۔ تو ہمیں دھن اور دولت دے اور وید کے دشمنوں کو تباہ اور ہلاک کر۔'' (سام وید اُترار چک ادھیائے 11 منتر 1)

تورات کیا کہتی ہے:

''جب خداوند تیرا خدا اسے تیرے قبضہ میں کر دے تو وہاں کے ہر ایک مرد کو تلوار کی دھار سے قتل کر............لیکن ان قوموں کے شہروں میں جنہیں خداوند تیرا خدا تیری میراث کر دیتا ہے۔ کسی چیز کو جو سانس لیتی ہے جیتا نہ چھوڑیو۔ (استثناء 16,13:20)

''سو تم ان بچوں کو جو لڑکے ہیں سب کو قتل کرو اور ہر عورت کو جو مرد کی صحبت سے واقف ہو چکی ہو جان سے مارو لیکن وے لڑکیاں جو مرد کی صحبت سے واقف نہیں ہوئیں ان کو اپنے لیے زندہ رکھو۔'' (گنتی باب 31:9__17,16)

قاضیوں کی کتاب 11:21 میں لکھا ہے۔

''تب انہوں نے 12000 مرد بہادر روانہ کیے اور انہیں حکم دیا کہ بیس جلعاد کے باشندوں کو عورتوں اور بچوں سمیت قتل کرو'۔

حضرت داؤد علیہ السلام کے متعلق لکھا ہے۔

''اور داؤد نے اس سرزمین کو حرم کیا اور عورت مرد کسی کو جیتا نہ چھوڑا اور ان کو بھیڑ بکریاں ہیں اور گدھے اور اونٹ لے کر لوٹا۔'' (سموئیل اول 9:27)

دوسرا لفظ اولو باس ہے جس سے معترضین نے دھوکا کھایا ہے قاموس میں ہے الباس العذاب اور ایک اور لفظ تنکیل ہے قاموس میں ہے۔

لِكُلِّ بِهِ تَنْكِيْلًا صُنِعَ بِهِ صُنْعًا يُحَذِّ

وغیرہ ایسے طور سے بدکار کو سزا دینا کہ دوسروں کو عبرت ہو۔ اس کا ثبوت نیچر میں موجود ہے کھلی ہوئی آنکھ والا دیکھ سکتا ہے ذی شعور سمجھ سکتا ہے۔ ایک زانی بدکار، بدکاری اور زنا کرتا ہے اس کے نتیجہ میں وہ آتشک جیسی موذی بیماری میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ آتشک میں مبتلا ہونا بدکاری کا نتیجہ ہے اور یہ بیماری بدکار اور دوسروں کے لیے باعث عبرت ہے۔ اولو باس اور تنکیل کے الفاظ صرف یہ ظاہر کرتے ہیں کہ اللہ

تعالیٰ نے انسانوں کے لیے ایک ضابطہ حیات دے دیا ہے وہ ضابطہ حیات انبیاء علیہم السلام کی معرفت لوگوں تک پہنچا دیا ہے۔ اس ضابطہ حیات کی مکمل شکل قرآن مجید میں موجود ہے۔ جو شخص اس ضابطہ حیات کی خلاف ورزی کرے گا وہ مستوجب سزا ہے۔ اور اولو باس اور تنکیل کا یہ مطلب نہیں کہ خدا لوگوں کو سزا دیتا پھرتا ہے جیسا کہ معترض نے خیال کر لیا ہے۔ بدکاری کے بدنتیجہ سے آگاہ کیا گیا ہے یعنی جو شخص بھی برا کام کرے گا وہ اس کا برا نتیجہ پالے گا۔ انسانوں کو راہ راست پر رکھنے کے لیے کتنی عمدہ تعلیم ہے۔ نظام کائنات اسی اصول پر چلتا ہے جہاں بھی قانون شکنی ہوگی وہاں بگاڑ پیدا ہو جائے گا اور خدا کی سزاوار دھوگی۔ ان الفاظ میں خدا کے لڑاکا ہونے کی کوئی تعلیم نہیں بلکہ دنیا میں امن قائم رکھنے کا اصول بیان کیا ہے۔ ہاں ویدوں کی تعلیم یہ ظاہر کرتی ہے کہ خدا لڑاکا ہے اور دشمنوں کو فنا کر دینے کی تعلیم دیتا ہے۔

☆......☆

خدا نے محمد (ﷺ) کو خود اپنا شریک بنایا ہے

اعتراض: دیکھیے خدا نے ہی محمد صاحب کو اپنا شریک بنالیا ہے اور اس نے خود ہی یہ بات قرآن میں لکھ دی ہے اور دیکھو خدا اپنے رسول کی محبت میں کیسا گرفتار ہے کہ اس نے بہشت میں بھی اپنا شریک بنالیا ہے جب مسلمانوں کا خدا ہر بات میں دوسرے پر انحصار رکھتا ہے تو اسے لاشریک کہنا فضول ہے۔ ایسی باتیں کلام الٰہی کی نہیں ہوسکتیں۔

جواب: یہ اعتراض آیت

تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ يُدْخِلْهُ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا وَذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ (النساء 13:4)

(یہ اللہ کی حد بندیاں ہیں جو اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرتا ہے وہ اسے باغوں میں داخل کرے گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں ان میں رہیں گے اور یہ بڑی کامیابی ہے)

اس آیت میں کہیں بھی یہ ذکر نہیں کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم خدا کے شریک ہیں یا آپ ﷺ کی محبت میں خدا گرفتار ہو گیا ہے اور بہشت میں خدا کے شریک ہیں معترض نے مذکورہ آیت سے جو اعتراض اخذ کیا ہے قرآن مجید کی عبارت سے اس کا دور کا بھی تعلق نہیں۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم خود اپنے متعلق فرماتے ہیں۔

اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوْحٰٓى اِلَيَّ اَنَّمَآ اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ (الکہف 110:18)

کہہ میں صرف تمہاری طرح کا بشر ہوں لیکن میری طرف وحی کی جاتی ہے تمہارا معبود ایک ہی معبود۔

اس آیت میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے آپ کو بشر ہونے کا اقرار کرتے ہیں۔ پھر یہ بتاتے ہیں کہ اللہ واحدہ لاشریک ہے۔ گویا اس آیت میں اپنی بشریت اور خدائے واحد ہونے کا اعلان ہے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم خدا کے کہاں شریک ہو گئے یا اللہ تعالیٰ نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنا کیوں کر شریک بنالیا۔

سورۃ اخلاص ایک ایسی سورۃ ہے جو کامل توحید پر مشتمل ہے اور توحید کے تمام پہلوؤں کو اجاگر کیا ہے۔

قُلْ هُوَاللّٰهُ اَحَدٌ اللّٰهُ الصَّمَدُ لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُوْلَدْ وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ (الاخلاص 112)

کہہ اللہ ایک ہے اللہ بے نیاز ہے۔ نہ اس کا کوئی بیٹا ہے اور نہ وہ کسی کا بیٹا اور اس کا کوئی ہمسر نہیں۔

اس سورۃ میں اللہ تعالیٰ اپنی وحدانیت کا اعلان کرتا ہے اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اس کا اقرار کرتے ہیں۔

قرآن مجید میں شرک کو ظلم عظیم قرار دیا ہے۔ ارشاد الٰہی ہے۔

اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيْمٌ (لقمان 13:13)

بے شک شرک ظلم عظیم ہے۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وہ ذات مطہرہ ہے جس کو اس وجہ سے کفار نے تکالیف کا نشانہ بنایا اور قتل کرنے کا منصوبہ گھڑا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو مکہ چھوڑنا پڑا وہ ایک خدا کی تعلیم دیتے تھے۔ اور بتوں کی مذمت کرتے تھے۔ کیا توحید کو قائم کرنے والا خود خدا کا شریک ہوسکتا ہے۔ پھر اسلام میں داخل ہونے کی پہلی شرط یہ ہے کہ خدا کے ایک ہونے کی شہادت دی جائے۔

الزامی جواب: ویدوں میں خالص توحید نہیں پائی جاتی اور پرمیشور کا تصور جو ویدوں نے پیش کیا ہے وہ انسانی ذہن کا تراشیدہ ہے وید کے سوکتوں کے اوپر ایک تو دیوتا کا نام ہے اور دوسرے کسی رشی کا، دیوتا وہ ہے جس کی تعریف یا پرستش کا ذکر اس سوکت میں موجود ہے رشی اس کا مصنف ہے ویدوں میں دیوتاؤں کی تعداد مختلف ہے یجر وید میں لکھا ہے کہ دیوتا کل 33 ہیں 11 زمین پر 11 آسمان میں اور 11 اوپر جنت میں۔

رگوید منڈل (3 سوکت 9 منتر 9 میں لکھا ہے کہ کل دیوتا 3340 ہیں رگوید کے بیان کے مطابق 3339 دیوتاؤں نے مل کر آگ دیوتا کو گھی سے سینچا اور اس کے پاس گئے پس 3339 میں ایک اضافہ ہوا تو 3340 دیوتا بن گئے چنانچہ رگوید منڈل 10 سوکت 52 منتر 6 میں واضح الفاظ میں لکھا ہے کہ کل دیوتا 3340 ہیں۔

دیوتاؤں کی یہ کثرت شرک فی ذات الٰہی ہے ہندو روح مادہ آکاش اور زمانہ کو خدا کا برابر ازلی ابدی گردانتے ہیں یہ شرک فی صفات الٰہی ہے۔

اسی طرح آگ، ہوا پانی، دریاء پہاڑ زمین سورج اور چاند کی عبادت کرنا شرک فی عبادت الٰہی ہے۔

تری مورتی:

(عقیدہ تثلیث) ویدک دھرم کی غیر مقبولیت کے پیش نظر برہمنوں نے یہ محسوس کیا کہ ویدک دیوتاؤں میں بنیادی تبدیلی کرنی چاہیے چنانچہ اس احساس کے نتیجہ میں ہندو دھرم میں بڑے خدا مقرر کیے گئے براہمہ، شیو اور وشنو انہی کو تری مورتی یعنی تین شکلیں کہتے ہیں ان کے تحت بے شمار دیوتا اور دیویاں مقرر کی گئی ہیں۔

توحید کے بارے میں ہندو دھرم کی یہ حالت ہے۔ کہ اس میں شرک کے سوا ہے ہی کوئی چیز نہیں۔

☆......☆

خدا لوگوں کے دلوں میں دشمنی ڈالتا ہے

اعتراض: خدا لوگوں میں دشمنی ڈالتا ہے اور قیامت تک باہمی کینہ پھیلا دیتا ہے۔ (ترک اسلام سوال نمبر 5)

جواب: یہ اعتراض قرآن مجید کی اس آیت کی بناء پر کیا گیا ہے۔

اَلْقَيْنَا بَيْنَهُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَآءَ اِلٰى يَوْمِ الْقِيَامَةِ

سو ہم نے ان کے درمیان قیامت کے دن تک دشمنی اور بغض ڈال دیا ہے۔

معترض نے ماقبل کی ایک ہدایت کا پاک کلمہ ترک کیا تو وہ غلط فہمی کے مرض میں مبتلا ہو گیا وہ کلمہ یہ ہے۔

وَاَخَذْنَا مِيْثَاقَهُمْ فَنَسُوْا حَظًّا مِّمَّا ذُكِّرُوْا بِهٖ فَاَغْرَيْنَا بَيْنَهُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَآءَ (مائدہ 14:5)

ہم نے ان سے عہد لیا مگر وہ اس کا ایک حصہ بھول گئے جو انہیں نصیحت کی گئی تھی سو ہم نے ان کے درمیان قیامت کے دن تک دشمنی اور بغض ڈال دیا۔

اخذ میثاق کیا ہے:

یہ وہ احکام ہیں جن پر عمل کرنے یا نہ کرنے کا وعدہ عیسائیوں سے لیا گیا تھا۔ انجیل اس پر شاہد ہے جس کی پہاڑی تعلیم میں بھی یہ احکام پائے جاتے ہیں کہ ایسا کرو اور ایسا نہ کرو انہی میں نماز پڑھنے اور روزہ رکھنے اور دوسرے لوگوں سے انصاف کرنے کا حکم تھا۔ یہ وہ احکام تھے جو میثاق کہلاتے ہیں عیسائیوں نے ان سے اعراض کیا یعنی میثاق کو توڑا اس عہد شکنی کی سزا ہے جو باہم عداوت اور بغض میں رہنا بتائی ہے۔ عیسائی اقوام کی غرض محض متاع دنیا کو جمع کرنا ہے اس وجہ سے وہ اخلاق فاضلہ کے زیور سے عاری ہیں اس لیے وہ ہمیشہ ایک دوسرے کے خلاف منصوبے بناتے رہتے ہیں اور ان کے دل بغض وحسد اور ایک دوسرے سے وعناد سے بھرے ہوئے ہیں پس عیسائیوں کا بغض وعناد کی بیماری میں مبتلا ہونا میثاق کی خلاف ورزی ہے۔ قرآن مجید کا یہ طرز بیان ہے کہ جب کوئی احکام شریعت کی خلاف ورزی کرتا ہے تو اس کے نتیجہ میں جو سزا وارد ہوتی ہے تو اللہ تعالیٰ اس سزا کو اپنی طرف منسوب کر لیتا ہے۔ حالانکہ وہ سزا احکام کی خلاف ورزی کی وجہ سے وارد ہوئی تھی کیونکہ احکام اللہ کی طرف سے نازل کیے ہوئے ہیں جو ان کی خلاف ورزی کرتا ہے تو وہ سزا پاتا ہے۔ چونکہ احکام اللہ تعالیٰ کے ہیں اس وجہ سے اللہ تعالیٰ خلاف ورزی کی سزا کو اپنی طرف منسوب کر لیتا ہے۔ حقیقت میں وہ سزا احکام کو پس پشت ڈالنے کی وجہ سے وارد ہوئی ہے جیسا کہ ایک شخص چوری کرتا ہے تو منصف اس کو سزا دیتا ہے تو کہا جاتا ہے کہ منصف نے چور کو سزا دی ہے۔ حالانکہ منصف نے چور کو سزا نہیں دی بلکہ چور کو نقب زنی کی وجہ سے سزا ملی ہے۔ ہر زبان کا یہ طرز بیان ہے۔ جو عیسائیوں کے دلوں میں بغض وعناد کی بیماری پیدا ہو چکی ہے وہ میثاق کی خلاف ورزی کی وجہ سے پیدا ہوئی ہے۔ اس عہد شکنی کے نتیجہ میں جو سزا ان کو ملی ہے اس کو اللہ تعالیٰ نے کہا۔

اَلْقَيْنَا بَيْنَهُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَآءَ

اگر ہم نے ان میں عداوت اور بغض ڈال دیا یہ عداوت اور بغض کی بیماری میثاق کی خلاف ورزی ہے۔ آج دنیا باہمی بغض وعناد میں مبتلا ہے۔ ہر قوم اپنے مفاد کی خاطر دوسروں کو تباہ و برباد کرنے پر تلی ہوئی ہے یہ سب ترک احکام الٰہیہ کی وجہ سے ہے۔ جس آیت پر اعتراض کیا گیا ہے اس میں تو تمام دنیا کے لوگوں کو یہ پیغام دیا گیا ہے کہ خدا کے احکام پر عمل کریں اسی میں لوگوں کی فلاح ہے اور دنیا میں امن قائم ہو سکتا ہے۔

توبہ بے انصافی کا نام ہے

اعتراض: توبہ اور بے انصافی ایک چیز ہے۔(ترک اسلام نمبر 6)

جواب: مفردات راغب میں ہے۔

اَلتَّوْبَۃُ تَرْکُ الذَّنْبِ عَلٰی اَجْمَلِ الْوُجُوْہِ وَھُوَ اَبْلَغُ وُجُوْہُ الْاِعْتِذَارِ

یعنی توبہ کے معنی ہیں بہت ہی عمدہ وجہ سے گناہ کو چھوڑ دینا اور اس سے بڑھ کر عذر خواہی کی اور کوئی عمدہ راہ نہیں ہوسکتی۔

تاج العروس میں ہے رجوع کرنا جب بندہ کے لیے استعمال ہو تو مراد اللہ کی طرف لوٹ آنا اور جھک جانا اور رجوع کرنا ہوتا ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ پہلی حالت بری ہو۔ بلکہ اچھی حالت سے اس سے بہتر حالت کی طرف رجوع کرنا بھی توبہ ہے ایک خدا پرست بھی جب اللہ تعالیٰ کی طرف زیادہ فرمانبرداری سے رجوع کرتا ہے اس کے آستانہ پر آہ وگریہ کرتا ہے تو یہ بھی توبہ ہے۔

اور جب لفظ توبہ اللہ کے لیے ہو۔ تو اس سے مراد بندہ کی طرف مغفرت کے ساتھ عود کرنا ہے (تاج العروس) اس سے توّاب مبالغہ کا صیغہ ہے جو اسمائے الٰہی میں سے ہے۔

توبہ کی لغوی بحث سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ یہ لفظ گناہوں کی معافی کے لیے ہی استعمال نہیں ہوتا بلکہ ایک نیک آدمی کا مزید سلوک کی راہوں کو طے کرنے کا نام بھی توبہ ہے اور جب اللہ تعالیٰ اپنی مغفرت کے ساتھ اپنے نادم بندہ کی طرف رجوع کرتا ہے تو اس کو بھی توبہ کہا جاتا ہے۔ کیا ایک سالک خدا کا قرب حاصل کرنے کے لیے جو جدوجہد کرتا ہے اور ہر روز پہلی کوشش سے بڑھ کر کوشش کرتا ہے کیا یہ بے انصافی ہے؟ اسی طرح جب اللہ تعالیٰ اپنے نادم بندے کی طرف رجوع کر کے اپنی رداء مغفرت میں لپیٹ لیتا ہے تو یہ بے انصافی ہے۔

اسی طرح ایک نافرمان بدکار شخص اپنے کردہ گناہوں پر نادم ہوتا ہے اپنی غلط کاریوں اور گناہوں سے الگ ہو جاتا ہے۔ کیا یہ اس کا غلط فعل ہے؟ بلکہ انصاف کا یہ تقاضا ہے کہ اس کے گناہوں کو معاف کر دیا جائے یہ تو پرلے درجہ کی حماقت اور ناسمجھی ہے کہ توبہ کو ناانصافی کہا جائے۔

اللہ تعالیٰ نے نیچر میں بھی یہ قانون وضع کر رکھا ہے کہ کوئی شخص صحت کے اصول کی خلاف ورزی کرتا ہے تو اس کی صحت میں بگاڑ پیدا ہو جاتا ہے تو اللہ تعالیٰ نے اس کی صحت کو دوبارہ بحال کرنے کے لیے بھی دوا مقرر کر رکھی ہے جب بیمار شخص اس دوا کو استعمال کرتا ہے تو اس کی صحت دوبارہ بحال ہو جاتی ہے۔ توبہ روحانی بیماریوں کا علاج ہے۔ جب ایک شخص گناہ کے بعد توبہ کر لیتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس روحانی بیماری کے بداثرات سے بندے کو محفوظ کر دیتا ہے اسلام میں یہی نجات اور مکتی کی راہ ہے۔ نہ تناسخ کی ضرورت ہے اور نہ کفارہ کی۔ اسلام نے گناہوں کے بداثرات کو دور رکھنے کے لیے کتنا عمدہ طریقہ بیان کیا ہے۔ اے میرے بندے! اللہ کی رحمت سے ناامید نہ ہو اس کی طرف رجوع کر۔ اس کے آستانہ پر گر جا۔ اللہ اپنی رداء رحمت میں لپیٹ لے گا اور تیرے کردہ گناہ کے بداثر سے بچا لے گا۔ کتنی نیچر کے مطابق تعلیم ہے۔ جس کو معترض نے اپنی ناسمجھی اور نادانی کی وجہ سے توبہ کو ناانصافی کہہ رہا ہے۔ کاش معترضین اسلام کے روحانی نظام کو سمجھیں۔

توبہ کی تعلیم تو آغاز سلسلہ نبوت سے دی گئی ہے۔ حضرت آدم علیہ السلام سے لغزش ہوئی۔ تو وہ اللہ تعالیٰ کے فرمان کے تحت رجوع الی اللہ ہوئے تو اللہ نے ان کے لئے بخشش اور رحمت کا دروازہ کھول دیا۔

☆ ☆

اللہ توبہ نہیں سنتا گویا بہرہ ہے

اعتراض: ”غفار ہے توبہ نہیں سنتا بہرہ اور سنگ دل ہے۔“ (دھرم پال، اعتراض 7)

جواب: معترض نے پہلے یہ اعتراض کیا ہے کہ توبہ بے انصافی ہے اس اعتراض میں ایک متضاد بات کہہ دی کہ اگر اللہ تعالیٰ غفار ہے تو پھر توبہ قبول کیوں نہیں کرتا کیا وہ بہرا اور سنگ دل ہے؟

قرآن مجید میں کہاں آیا ہے کہ اللہ تعالیٰ توبہ کرنے والے کی توبہ کی طرف دھیان نہیں کرتا۔ اس کی سنتا نہیں۔ بہرہ اور سنگدل تو اس وقت کہا جائے گا جب وہ توبہ قبول نہ کرے۔ ہاں ہندو دھرم میں یہ تعلیم ہے کہ اللہ تعالیٰ انسان کے کردہ گناہ معاف نہیں کرتا اس وجہ سے گناہ گار بندے کو اپنے گناہوں کو معاف کرانے کے لیے مختلف جونوں میں منتقل ہونا پڑتا ہے۔ کبھی وہ کتے کی شکل اختیار کر لیتا ہے کبھی سور کا روپ دھار لیتا ہے کبھی گدھے کا کبھی کوئی دوسری شکل۔ ہندو دھرم میں تو خدا کا تصور ایک سنگ دل کا قرار پایا جاتا ہے۔ جبکہ اسلام میں خدا کو رحیم اور رحمان ہستی قرار دیا ہے ذات باری تعالیٰ میں محبت شفقت اور رحم کی صفات کا غلبہ ہے۔ ارشاد الٰہی ہے۔

كَتَبَ عَلٰى نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ (الانعام 12:6)

اس نے اپنے اوپر رحمت کو لازم کر لیا ہے۔

پھر فرمایا:

رَبُّكُمْ ذُوْ رَحْمَةٍ وَّاسِعَةٍ (الانعام 147:6)

تمہارا باپ وسیع رحمت والا ہے۔

پھر فرمایا:

وَرَحْمَتِيْ وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ (الاعراف 156:7)

میری رحمت برستے پر حاوی ہے۔

پھر فرمایا:

قُلْ يَا عِبَادِيَ الَّذِيْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰى اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ اِنَّ اللّٰهَ يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِيْعًا (الزمر 53:39)

کہ اے میرے بندو! جنہوں نے اپنی جانوں پر زیادتی کی ہے اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہو اللہ سبھی گناہ بخش دیتا ہے۔

پھر فرمایا:

وَاِنِّيْ لَغَفَّارٌ لِّمَنْ تَابَ وَاٰمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا ثُمَّ اهْتَدٰى (طٰہ 82:20)

میں گناہ معاف کرنے والا ہوں اس کے جو توبہ کر چکا اور ایمان لایا اور اس کے عمل اچھے ہوئے پھر ہدایت کی راہوں پر ثابت قدم رہا۔

نہیں سنتا وہ بہرہ اور سنگدل ہے:

جب انسان پکے ارادے سے بدی سے کنارہ کر لیتا ہے اور احکام خداوندی پر عمل پیرا ہو جاتا ہے تب اس کی گناہوں سے حفاظت کی

جاتی ہے اور خدا کا فضل اس کے شامل حال ہو جاتا ہے اور اللہ اس کا محافظ اور نگہبان بن جاتا ہے۔ امام راغب نے غفر کے یہی معنی کیے ہیں۔

اَلْغَفْرُ اِلْبَاسُ الشَّیءِ مَایَصُونُهُ عَنِ الدَّنَسِ الْمَغْفِرَةِ مِنَ اللّٰهِ تَعَالٰی اَنْ یَّصُونَ الْعَبْدُ مِنْ اَنْ یَّمَسَّهُ الْعَذَابُ

غفر کے معنی ہیں ایسی شے کا پہننا جو میل کچیل سے بچائے خدا کی مغفرت کے یہ معنی ہیں کہ بندہ عذاب کے لگنے سے بچایا جائے۔

اسی سے مغفر مشتق ہے جس کے معنی خود کے ہیں اور غفارہ اس کپڑے کو کہا جاتا ہے جسے سر پر رکھنے سے کپڑوں کو چکنا تیل نہ لگ سکے۔

اللہ تعالیٰ کی مغفرت کا یہی مفہوم ہے کہ انسان عذاب سے بچ جاتا ہے۔ یہ مغفرت توبہ سے منسلک ہے۔ جب اللہ کا بندہ سچے دل سے خدا کی طرف رجوع کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے لیے ایسا پردہ مہیا کر دیتا ہے جو اس کو عذاب سے بچا لیتا ہے۔ توبہ اور مغفرت لازم و ملزوم ہیں یہ اسلام کا وہ فلسفہ ہے جو دوسرے کسی مذہب میں نہیں پایا جاتا۔

☆......☆

خدا نیکی کا دوگنا ثواب دے کر بے انصافی کرتا ہے

اعتراض: اگر ایک ذرہ بھر خدا بے انصافی نہیں کرتا تو نیکی کا ثواب دگنا کیوں دیتا ہے؟ اور مسلمانوں کی طرف داری کیوں کرتا ہے؟ واقعی اعمال کا دگنا یا پورا ثمرہ نہ دینے سے خدا غیر منصف ٹھہرتا ہے۔ (سیتارتھ پرکاش نمبر 56)

جواب: معترض نے قرآن مجید کی حسب ذیل آیت پر اعتراض کیا ہے۔ ارشاد الٰہی ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ لَا یَظْلِمُ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ وَاِنْ تَکُ حَسَنَةً یُّضٰعِفْهَا وَیُؤْتِ مِنْ لَّدُنْهُ اَجْرًا عَظِیْمًا (النساء 40:4)

اللہ ایک ذرہ کے برابر بھی ظلم نہیں کرتا اور اگر وہ نیکی ہو (تو) وہ اس کو کئی گنا بڑھاتا ہے اور اپنے پاس سے بڑا اجر دیتا ہے۔

خدا کا کرم اور فضل:

اسلام کا خدا بڑے فضل والا ہے۔ فضل اللہ کی صفت ہے۔ اسلام کے نزدیک نجات (مکتی) بھی خدا کے فضل سے نصیب ہوگی۔ ایمان اور اعمال صالحہ اللہ کے فضل کو جذب کرنے کے ذرائع ہیں انسان کی نجات کا دارومدار فضل الٰہی پر ہے۔ اس طرح اللہ کی ایک صفت رحمان ہے رحمان وہ ہستی ہے جس نے انسان کو اس کی محنت اور کسب کے بغیر اس کی ضروریات زندگی کے لیے تمام اشیاء پیدا کر دی ہیں۔ جیسے زمین، آسمان، ہوا، دریا، سمندر، سورج، چاند، ستارے اور دیگر اشیاء۔ انسان یہ نہیں کہہ سکتا کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو اس کے فلاں عمل کی وجہ سے دی ہیں۔ یہی خدا کا فضل ہے۔

اللہ تعالیٰ نے مذکورہ آیت میں اپنے فضل کا ذکر کیا ہے کہ اگر اس کا بندہ کوئی عمل صالحہ بجالاتا ہے تو اللہ اس کو دوگنا اجر دیتا ہے۔ یہ اللہ کا فضل، کرم اور دیا ہے۔ یہ ایسے ہی ہے اگر کوئی شخص کسی مزدور کو اس کے خلوص اور محنت سے کام کرنے کی وجہ سے مقررہ اجرت سے دگنی اجرت دے دیتا ہے تو کیا آجر نے اجیر پر ظلم کیا ہے۔ یہ ایک دیا، کرم اور فضل ہے اور مستحسن کام ہے۔ اللہ تعالیٰ تو اپنے بندوں پر بے انتہا رحم و بخشش کرنے والا ہے وہ رحمان، رحیم اور ذوفضل ہستی ہے اور اپنے بندے کے عمل صالحہ پر دوگناہ ثواب دیتا ہے تو اعتراض کیا؟ یہ اللہ تعالیٰ نے اپنا قانون وضع کر رکھا ہے۔ تاکہ اس کا بندہ بڑھ چڑھ کر اعمال صالحہ بجالائے۔

اللہ کے دیا (کرم) کے طریقے نرالے ہیں۔ وہ شخص بے عقل اور احمق ہی ہوگا جو اللہ کے فضل اور کرم پر اعتراض کرے۔

اللہ مسلمانوں کی طرف داری کیوں کرتا ہے؟:

معترض نے اسلام کی تعلیم کو بخوبی سمجھا ہی نہیں۔ اگر معترض نے سورۃ فاتحہ کو پڑھ لیا ہوتا تو یہ اعتراض نہ کرتا۔ سورہ فاتحہ میں پہلی صفت رب العالمین بیان کی ہے کہ اللہ تمام جہانوں کا رب ہے۔ پالن ہار ہے۔ پھر دوسری صفت رحمان بیان کی ہے۔ رحمان وہ ہستی ہے جس نے ہر انسان کو اس کی محنت اور کسب کے بغیر اس کے لیے ضروریات پیدا کر رکھی ہیں۔ بحیثیت انسان اللہ کی نظر میں برابر اور مساوی ہیں۔ ہر شخص کی خواہ وہ مسلمان ہے یا غیر مسلم پرورش کر رہا ہے اور اس کی ربوبیت کے لیے سامان پیدا کر رکھا ہے۔ ہر شخص اللہ کی پیدا کردہ اشیاء سے فائدہ اٹھا رہا ہے۔ حتیٰ کہ وہ شخص بھی جو خدا کا باغی ہے وہ بھی اللہ کی پیدا کردہ اشیاء سے فائدہ اٹھا رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ کسی کا طرف دار نہیں۔ ہاں جو شخص احکام شریعت پر عمل پیرا ہے حقوق اللہ اور حقوق العباد ادا کرتا ہے وہ اپنے اعمال کی وجہ سے قابل تکریم ہے۔ قرآن مجید میں آتا ہے۔

اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقٰکُمْ

یعنی اللہ کے نزدیک وہ شخص قابل تکریم ہے جو سب سے زیادہ تقویٰ اختیار کرتا ہے۔

صاحب تکریم ہونے کا اصول تقویٰ بیان کیا ہے۔ تقویٰ کیا ہے نیکی اور عمل صالحہ بجالانا اور فحش اور منکر سے اجتناب۔ جو شخص بھی اللہ کے احکام بجالائے گا۔ اور اللہ کے بتائے ہوئے صراط مستقیم پر گامزن ہوگا۔ وہ اللہ کو پیارا ہوگا۔ یہی تعلیم فطرت کے مطابق ہے۔ کوئی ذی شعور شخص اس تعلیم کو جھٹلا نہیں سکتا۔

"یٰٓاَیُّھَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّکُمُ الَّذِیْ خَلَقَکُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَۃٍ (النساء 1:4)

(اے لوگو اپنے رب سے ڈرو جس نے تم کو ایک جان سے پیدا کیا) کا اعلان کر کے تمام روئے زمین کے انسانوں کو دائرہ اخوت میں لے آیا ہے۔ ایک عالمگیر اخوت کی بنیاد رکھ دی ہے۔ اس کے ساتھ یہ بھی بیان کر دیا کہ قابل احترام وہ شخص ہے جو اللہ کے احکام کے مطابق زندگی بسر کرتا ہے۔ عالمگیر اخوت قائم کر کے احکام الٰہیہ کا پابند کیا ہے۔ یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ دنیا میں امن کا قیام احکام الٰہیہ پر عمل کرنے سے ہی ہوتا ہے۔ عالمگیر اخوت کی بھی تعلیم دے دی۔ دوم قیام امن کا طریقہ بھی بیان کر دیا۔

الزامی جواب:

اسلام تو ایک عالمگیر اخوت اور مساوات کی تعلیم دیتا ہے جب ویدوں کا مطالعہ کیا جائے تو اللہ تعالیٰ ضرور برہمن کے لیے طرف دار معلوم ہوتا ہے وید میں لکھا ہے۔ "برہمن اس کا (ایشور کا) منہ ہوا۔ بازو کشتری بنایا گیا۔ اس کی جانگھیں ویش دونوں پاؤں سے شودر پیدا ہوا۔" یہ منتر تینوں ویدوں میں آتا ہے۔ قرآن مجید کی آیت پر غور کرو وہاں نفس واحدہ (ایک جان) کا ذکر ہے۔ وید میں چاروں ذاتوں میں تفریق کی گئی ہے برہمن کو اللہ کا منہ قرار دیا گیا ہے جبکہ شودر کو اللہ کا پاؤں۔ کیا اسلام کا خدا طرف دار ہے یا ہندو دھرم کا۔ پھر شودر کے متعلق جو ظالمانہ احکام ویدوں میں آئے ہیں اس کتاب میں کئی جگہ بیان کیے جا چکے ہیں۔ شوادر باقی تینوں ذاتوں کی خدمت کے لیے پیدا کیا گیا ہے۔

دنیا میں صرف ایک دین ہے وہ ہے اسلام۔ جو عالمگیر اخوت اور مساوات کی تعلیم دیتا ہے۔ صرف اسلام ہی ایک ایسا دین ہے جس پر چل کر دنیا میں امن قائم کیا جا سکتا ہے۔ صرف دین اسلام ہی انسانیت کا دین ہے۔ اسی میں بنی نوع انسان کی فلاح مضمر ہے۔

☆......☆

اللہ روزنامہ لکھتا ہے اللہ گمراہ کرتا ہے

اعتراض: اللہ جب ایسی باتوں کا روزنامہ رکھتا ہے تو وہ ہمہ دان کیونکر ہوسکتا ہے؟ اگر ہمہ دان ہے تو روزنامہ کی کیا ضرورت ہے۔ مسلمان کہتے ہیں کہ شیطان انسان کو گمراہ کرتا ہے مگر اب معلوم ہوا کہ خدا بھی انسان کو گمراہ کرتا ہے پھر خدا اور شیطان میں کیا فرق ہوا؟ ہاں اتنا فرق کیا جا سکتا ہے کہ خدا بڑا شیطان اور عزرائیل چھوٹا شیطان ہے۔ مسلمانوں کا قول ہے جو بہکاتا ہے وہی شیطان ہے پس اس اصول سے خدا ہی شیطان ثابت ہوگیا۔ کیونکہ اس آیت میں وہ خود ہی لوگوں کو گمراہ کرنے والا لکھتا ہے۔ (ستیارتھ کاش اعتراض 57)

جواب: مسلمانوں کا یہ ہرگز یہ عقیدہ نہیں کہ اللہ اعمال نامے کسی کتاب میں لکھتا ہے معترض نے

وَاللّٰهُ يَكْتُبُ مَا يُبَيِّتُوْنَ (النساء4:81)

اور اللہ لکھ لیتا ہے جو وہ راتوں کو مشورہ کرتے ہیں۔

پر اعتراض کیا ہے عربی زبان میں كَتَبَ کے معنی لکھنے کے ہی نہیں ہوتے بلکہ قرآن مجید میں مختلف مفاہیم میں استعمال ہوا ہے كَتَبَ کے معنی محفوظ کرنے کے بھی ہیں۔ مذکورہ آیات کے معنی یہ ہیں کہ کفار جو راتوں کو خفیہ مشورہ کرتے ہیں اللہ ان کو محفوظ کر لیتا ہے۔ خدا کے علم میں ہونا ہی حفاظت ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ اللہ کے علم میں محفوظ ہیں۔ عربی کی باریک ادبی نزاکتوں کی عدم واقفیت کی وجہ سے اعتراض کیا گیا ہے۔

قرآن مجید میں جہاں بھی اعمال کی کتاب کا ذکر آیا ہے وہاں مراد اعمال کا محفوظ کر لینا ہے۔ حفاظت کا سب سے بڑا ذریعہ اللہ کا علیم وخبیر ہونا ہے۔ انسان جو بھی کرتا ہے وہ اللہ کے علم میں ہے۔ ہر مذہب کا یہ عقیدہ ہے کہ انسان جو کچھ کرتا ہے وہ اللہ کے ہاں محفوظ ہے اس پر جزا وسزا ہوگی۔

اللہ کا گمراہ کرنا

اعتراض کا دوسرا جز: قرآن مجید کی اس آیت پر یہ اعتراض کیا ہے۔

اَتُرِيْدُوْنَ اَنْ تَهْدُوْا مَنْ اَضَلَّ اللّٰهُ وَمَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَلَنْ تَجِدَ لَهٗ سَبِيْلًا (النساء4:88)

''کیا تم چاہتے ہو کہ اسے ہدایت کرو۔ جسے اللہ نے گمراہی میں چھوڑ دیا ہے۔ اور جس کو اللہ گمراہ چھوڑ دے تو تُو اس کے لیے کوئی راستہ نہیں پائے گا۔''

یہ آیت منافقوں کے بارے میں ہے۔ اس آیت میں بیان کیا گیا ہے کہ وہ منافق بے ایمان ہیں راہ ہدایت سے بھٹکے ہوئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی بداعمالیوں کی وجہ سے گمراہ ٹھہرایا ہے ان کی بداعمالیاں اس انتہا تک پہنچ گئیں تو ان پر سزا کا وارد ہونا ضروری ٹھہرا۔ اللہ تعالیٰ کسی کو گمراہ نہیں کرتا۔ بلکہ اللہ تعالیٰ نے سیدھا راستہ دکھا دیا ہے۔ جو شخص اللہ کے بتائے ہوئے سیدھے راستہ پر نہیں چلتا تو گویا اس

نے خود گمراہی کا راستہ اختیار کیا ہے اللہ نے گمراہی اور ضلالت کا راستہ اختیار کرنے پر گمراہی کا فیصلہ صادر کیا ہے۔ جیسا کہ ایک چور چوری کرتا ہے منصف کے پاس مقدمہ چلا جاتا ہے منصف چور کے خلاف فیصلہ سنا دیتا ہے اور چور جیل میں چلا جاتا ہے۔ منصف نے چور کے فعل کے خلاف فیصلہ صادر کیا ہے اللہ تعالیٰ گمراہ کی گمراہی کی وجہ سے اس کے خلاف فیصلہ صادر کرتا ہے اور مہر ثبت کرتا ہے۔

اس موضوع پر سیرت سید البشر حصہ سوم صفحہ 300 پر بحث ہو چکی ہے قارئین مزید مطالعہ کے لیے تیسرے حصے کی طرف رجوع کریں۔ دھرم پال نے بھی اپنی کتاب ترک اسلام میں یہ اعتراض کیا ہے اسلام پر یہ اعتراض متعدد مخالفین نے کیا ہے قرآن مجید کے طرز بیان کی عدم واقفیت کی وجہ سے یہ اعتراض کیا گیا ہے۔

☆......☆
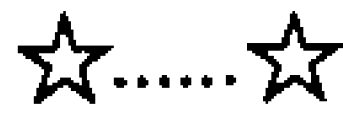
چند فٹ لمبی اور چوڑی کشتی نوح میں دنیا کی تمام اشیاء کیسے سما گئیں

اعتراض: چند فٹ لمبی چوڑی کشتی میں روئے زمین کے تمام چرند پرند درند مع خوراک گپ ہے۔ (ترک اسلام اعتراض 73)

معترض نے اپنے اعتراض میں ہی غلط بیانیوں سے کام لیا ہے۔ کہ کشتی چند فٹ لمبی چوڑی تھی یہ غلط بیانی ہے۔ قرآن مجید میں کہیں بھی یہ ذکر نہیں۔ دوم روئے زمین کے تمام چرند پرند درند مع خوراک اس میں رکھ لیے یہ بھی افتراء ہے۔ زیر اعتراض یہ آیت ہے۔

قُلْنَا احْمِلْ فِيهَا مِنْ كُلٍّ زَوْجَيْنِ اثْنَيْنِ وَاَهْلَكَ (ھود 11:40)

ہم نے کہا کہ اس میں ہر (ضرورت کی) شے نر و مادہ دو دو لے لو اور اپنے اہل کو۔

جواب: معترض کو مِنْ كُلٍّ سے غلط فہمی پیدا ہوئی ہے کہ اس کشتی میں دنیا کی ہر شے یعنی نر و مادہ سوار کر لیے گئے تھے اول تو دنیا کی ہر شے کو جمع کرنا مشکل ہے۔ پھر دنیا کی ہر شے جمع کرنے کی ضرورت کیا تھی مِنْ كُلٍّ سے مراد اپنی ضرورت کی تمام اشیاء ہیں۔ قرآن میں كُلٌّ کا لفظ ہر موقعہ پر الگ الگ معنی دیتا ہے قرآن مجید کے محاورات پر نظر دوڑایئے۔

ایک ملکہ کے متعلق کہا۔

اُوْتِيَتْ مِنْ كُلِّ شَيْءٍ (النمل 27:23)

تو مراد تمام عالم کی اشیاء نہیں بلکہ اس کی اپنی ضرورت کی اشیاء مراد ہیں۔

توریت کے بارے میں آتا ہے۔

تَفْصِيلَ كُلِّ شَيْءٍ (یوسف 12:111)

ہر چیز کی تفصیل ہے۔

یہاں کُل سے مراد توریت میں ان تمام احکام کی تفصیل موجود ہے جو اس وقت تقاضہ کرتے تھے۔

ذوالقرنین کے متعلق آتا ہے۔

اٰتَیْنٰهُ مِنْ كُلِّ شَیْءٍ سَبَبًا (کہف 84:18)

ہم نے اسے کل قسم کے اسباب دیئے کیا اس کل سے یہ مطلب نکلتا ہے کہ دنیا کے جزوی اور کلی اسباب اس کو میسر تھے یقیناً کل سے مراد ضروری اسباب ہیں۔ یہ ایک محاورہ ہے جس سے مراد ضروری اشیاء ہیں۔ پس زیر اعتراض کا مفہوم صرف یہ ہے کہ اس کشتی میں حضرت نوح علیہ السلام نے اپنی ضرورت کی تمام اشیاء رکھ لیں۔

☆......☆

محمد (ﷺ) نے محض مال کمانے اور عیش وعشرت کے لیے سب کچھ گھڑا

اعتراض: خدا اور رسول کی یک طرفہ باتوں پر دھیان کیجیے محمد صاحب نے خیال کیا ہوگا کہ اگر خدا کے نام پر ایسی باتیں نہ لکھی جائیں گی تو ان کا مذہب فروغ نہ پائے گا اور مال ہاتھ نہ آئے گا عیش وعشرت نہ کرسکیں گے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنی مطلب براری اور دوسروں کا کام بگاڑنے میں کامل استاد تھے۔ اس وجہ سے ان کی باتوں پر راست باز علماء اعتبار نہیں کر سکتے۔ (ستیارتھ پرکاش اعتراض 59)

جواب: یہ اعتراض حسب ذیل آیت پر کیا گیا ہے۔

وَمَنْ یُّشَاقِقِ الرَّسُوْلَ مِنْۢ بَعْدِ مَا تَبَیَّنَ لَهُ الْهُدٰی وَیَتَّبِعْ غَیْرَ سَبِیْلِ الْمُؤْمِنِیْنَ نُوَلِّهٖ مَا تَوَلّٰی وَنُصْلِهٖ جَهَنَّمَ وَسَآءَتْ مَصِیْرًا (النساء 115:4)

اور جو شخص رسول کی مخالفت کرے اس کے بعد کہ اس کے لیے حق ظاہر ہو چکا ہے اور مومنوں کے رستے کے سوائے اور راستہ کی پیروی کرے۔ ہم اسے پھیر دیں گے جدھر وہ پھرتا ہے اور اسے جہنم میں داخل کریں گے اور وہ بری جگہ ہے۔

پیشتر اس کے کہ معترض کے اعتراض پر کچھ لکھا جائے پہلے زیر اعتراض کا مفہوم بیان کیا جاتا ہے تاکہ یہ واضح ہو جائے کہ معترض آیت کا مفہوم ہی نہیں سمجھ پایا۔

اس آیت میں منافقوں کا ذکر ہے کہ وہ دن رات مسلمانوں میں رہتے ہیں۔ مسلمانوں کے شب وروز دیکھتے ہیں کہ وہ اسلام قبول کرنے کے بعد ہر برائی کو چھوڑ کر نیکیوں کے راستہ پر گامزن ہیں رسول کریم صلعم کا نمونہ ان کے سامنے ہے۔ کہ ان کی دعوت کا محور ہی توحید باری تعالیٰ ہے۔

پھر اللہ تعالیٰ دن رات رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت پر اپنی آیات بینات دکھاتا ہے۔ کامیابیوں کے راستے کھل گئے ہیں۔ مسلمان ہر میدان میں ترقی کے راستہ پر گامزن ہیں۔ ان باتوں کو دیکھتے ہوئے ان کے دلوں سے منافقت کی بیماری دور نہیں ہوئی۔ اللہ تعالیٰ نے بھی ان کی اس بیماری کی وجہ سے اس راستہ پر چلا دیا ہے جس کو وہ پسند کرتے ہیں وہ راستہ جہنم کا راستہ ہے یعنی ناکامی ونامرادی کا۔ منافقوں کا انجام ظاہر کرتا ہے کہ وہ غلط راستہ پر گامزن ہونے کی وجہ سے ہی ناکام ونامراد رہے ہیں اس میں یہ بتایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ انسان سے معاملہ اس کے عمل کے مطابق کرتا ہے یہی قانون قدرت ہے جیسا کرو گے ویسا بھرو گے۔ منافقوں نے بھی اپنے کیے کا پھل پا لیا۔ گویا اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں یہ قانون بیان کر دیا ہے کہ جو شخص جس راستہ کو پسند کرتا ہے اللہ اس کو اسی راستہ پر چلا دیتا ہے۔ ساتھ یہ بھی بتا دیا کہ راستہ وہی صحیح ہے جس پر (مومنین احکام الٰہیہ پر عمل کرنے والے) چلتے ہیں اور احکام الٰہیہ پر چلنے والے ہی مومن ہیں اور احکام

الٰہیہ پر چلنے والے ہی کامیاب و کامران رہتے ہیں اوران کے مخالف ناکام ونامراد اللہ تعالیٰ نے انسانوں کی کامیابی کے لیے ایک عمدہ طریقہ بیان کیا ہے معترض نے اپنی ناسمجھی کی وجہ سے اس پر اعتراض کردیا ہے:۔

کیا رسول کریم ﷺ نے مال اور عیش وعشرت کے لیے یہ سب کچھ کیا؟ جب ہم رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کا مطالعہ کرتے ہیں تو معترض کا افتراء اور جھوٹ واضح ہوجاتا ہے۔ جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ کے حکم سے دعوت اسلام دینا شروع کی اور لوگ اس میں داخل ہونا شروع ہوئے تو کفار کے تین وفد رسول کریم صلعم کے چچا ابوطالب کے پاس گئے۔ قیادت سیادت مال ومنال اور خوبصورت عورت سے شادی کی پیش کی۔ تو آپ ﷺ نے ہر دنیاوی لالچ کو مسترد کردیا اور فرمایا:

يَا عَمّ وَاللّٰه لَوْ وَضَعُوا الشَّمْسَ فِي يَمِيْنِي وَالْقَمَرَ فِي يَسَارِي عَلٰى اَنْ اَتْرُكَ هٰذَا الْاَمْرَ حَتّٰى يُظْهِرَ اللّٰهُ اَوْ اَهْلِكَ فِيهِ مَاتَرَكْتُهُ

یعنی اے میرے چچا اگر کفار مکہ میرے دائیں ہاتھ پر سورج اور بائیں پر چاند رکھ دیں اور کہیں کہ اس کے عوض میں تبلیغ اسلام ترک کردوں مجھے منظور نہ ہوگا اگر مجھے اس راہ میں ہلاکت نظر آئے تو میں پیچھے نہیں ہٹوں گا۔

آغاز دعوت میں ہی کفار نے قیادت وسیادت مال ومنال اور خوبصورت عورت سے شادی کی پیشکش کردی تھی مگر آپ ﷺ نے دنیاوی ترغیبات کو مسترد کردیا۔ پھر آپ کو اپنا گھر بار چھوڑنا پڑا۔ جب اللہ تعالیٰ نے کفار پر فتح دی۔ کامیابیوں کے راستے کھول دیئے تو آپ کی زندگی سادگی اور قناعت کی سچی تصویر تھی۔ پیوند لگے ہوئے کپڑے ہیں۔ فاقوں سے دن گزارے جاتے ہیں گھر میں بھوک ہے۔ چولہے ٹھنڈے ہیں عسرت اور فقر کی زندگی بسر کرتے ہیں صحابہ عسرت کی طرف توجہ دلاتے ہیں تو فرماتے ہیں الفقر فخری قومی ضرورت کے پیش نظر شادیاں کیں تو بوڑھی عورتوں کو بھی عقد نکاح میں لائے (شادیوں پر اعتراض کا جواب بعد میں دیا جائے گا) تاریخ اس بات پر شاہد ناطق ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی مدنی زندگی سادگی کا مرقع تھی۔ مدنی دور ہی وہ دور ہے جب مسلمانوں کی حالت بہتر ہوئی تھی۔ لیکن سب کچھ ہوتے ہوئے تن آسانی کی زندگی سے گریز کیا عسرت اور فقر کی زندگی کو ترجیح دی۔

معلوم نہیں کہ معترض کو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کا کون سا پہلو عیش وعشرت اور یسر کا نظر آیا ہے جس پر اعتراض کردیا ہے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی عملی زندگی ہی معترض کے اعتراض کو رد کرتی ہے۔ یہ اعتراض سوامی دیانند نے ہی نہیں کیا بلکہ مختلف طریقوں سے کئی مخالفین نے اعتراض کیا ہے کہ آپ نے محض دنیاوی اغراض ومقاصد کے لیے (نعوذ باللہ) یہ ڈھونگ رچایا تھا۔

ستیارتھ پرکاش کے مصنف سوامی دیانند نے خود سچے مذہب کا ایک اصول بیان کیا ہے وہ یہ ہے "جو کوئی دوسرے مذہب کو جسے کروڑہا آدمی مانتے ہوں جھوٹ کہے اس سے بڑا جھوٹا کون ہے" (ستیارتھ پرکاش صفحہ 697 باب 14 جز 73)

تاریخ اس بات پر شاہد ہے کہ دنیا کے ہر خطہ میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ماننے والے ہیں پھر عہد رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے لے کر اب تک آپ ﷺ کے ماننے والوں کی حکومتیں قائم ہیں کیا (نعوذ باللہ) یہ ایک فریبی کا دین ہے۔ کیا فریب دھوکا افترا بھی بارآور ہوسکتا ہے۔ کیا دنیا میں کوئی ایسی مثال ہے تو پیش کی جائے یہ ایک واضح حقیقت ہے کہ دین اسلام ایک صادق امین رسول کا دین ہے یہ وہ دین ہے جس کی کتاب زندہ کتاب ہے جس کا رسول ایک زندہ رسول ہے جس کا خدا ایک زندہ خدا ہے۔ اس کے مقابل پر سب دین مردہ ہو چکے ہیں۔

☆......☆
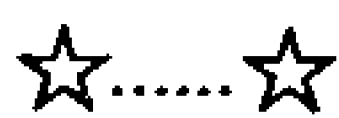
مسلمان خدا کو لاشریک کہنے کے باوجود اس کے ساتھ بہت سے شریک مانتے ہیں (گویا مسلمان خدا کو لاشریک نہیں مانتے)

اعتراض: کیا اب بھی لاشریک رہ سکتا ہے؟ کیا لاشریک کہتے جانا اور اس کے ساتھ بہت سے شریک بھی مانتے جانا اجتماع ضد پن نہیں کیا تین بار معاف کرنے کے بعد خدا معاف نہیں کرتا؟ اور تین بار کفر کرنے پر راہ دکھاتا ہے اور چوتھی بار سے آگے نہیں دکھلاتا اگر سارے آدمی چار چار بار بھی کفر کریں تو کفر بہت ہی بڑھ جائے گا۔ (سیتارتھ پرکاش اعتراض نمبر 60)

جواب: مصنف سیارتھ پرکاش نے اس آیت پر اعتراض کیا ہے ارشاد الٰہی ہے۔

اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا ثُمَّ کَفَرُوْا ثُمَّ اٰمَنُوْا ثُمَّ کَفَرُوْا ثُمَّ ازْدَادُوا کُفْرًا لَّمْ یَکُنِ اللّٰہُ لِیَغْفِرَ لَھُمْ وَلَا لِیَھْدِیَھُمْ سَبِیْلًا (النساء4:137)

بے شک وہ لوگ جو ایمان لائے پھر کافر ہوئے پھر ایمان لائے پھر کافر ہوئے پھر کفر میں بڑھ گئے تو اللہ یہ نہیں کہ ان کی مغفرت کرے اور نہ یہ کہ ان کو راہ پر سیدھا چلائے۔

اس اعتراض کے دو جزو ہیں اعتراض کے پہلے جزو میں یہ کہا ہے کہ مسلمان اللہ تعالیٰ کو واحد و لاشریک نہیں مانتے۔ یہ اعتراض مختلف شکلوں میں مختلف مخالفین اور مستشرقین نے بھی کیا ہے کہ مسلمان حجر اسود کی پرستش کرتے ہیں بیت اللہ کی پرستش کرتے ہیں حتیٰ کہ مسلمانوں پر بعض یہ اعتراض کرتے ہیں کہ وہ رسول کریم صلعم کی بھی پرستش کرتے ہیں۔ یہ سب توہمات ہیں لاعلمی کا نتیجہ ہیں۔ اسلام ہی ایک ایسا دین ہے جس نے خالص توحید کی تعلیم دی۔ توحید کے تمام پہلوؤں کو اجاگر کیا۔ شرک کے ہر پہلو کو رد کیا۔

قرآن مجید میں توحید کی تعلیم:

ارشاد الٰہی ہے۔

اَللّٰہُ لَآ اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ الْحَیُّ الْقَیُّوْمُ (البقرہ2:225)

اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں وہ زندہ قائم رہنے والا ہے۔

وَاِلٰھُکُمْ اِلٰہٌ وَّاحِدٌ لَآ اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِیْمُ (البقرہ2:162)

تمہارا معبود ایک ہی معبود ہے اس کے سوا کوئی معبود نہیں وہ رحمان اور رحیم ہے۔

فَاعْلَمْ اَنَّہٗ لَآ اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ (محمد48:19)

پس جان لے اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں۔

ھُوَ اللّٰہُ الَّذِیْ لَآ اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ عَالِمُ الْغَیْبِ وَالشَّھَادَۃِ ھُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِیْمُ (الحشر59:22)

وہی اللہ ہے جس کے سوا کوئی معبود نہیں وہ غیب اور حاضر جاننے والا ہے وہی بے انتہا رحم والا بار بار رحم کرنے والا ہے۔

قرآن مجید میں توحید پر جامع مانع الفاظ میں پوری سورۃ اخلاص ہے۔

قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ اللّٰهُ الصَّمَدُ لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُوْلَدْ وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ (اخلاص)

کہہ دیجیے کہ وہ اللہ ایک ہے اللہ بے نیاز ہے نہ وہ کسی کا باپ ہے اور نہ بیٹا اور کوئی بھی اس کا ہمسر نہیں۔

حدیث میں بھی اسلام کی عمارت کے پانچ ستون بیان کیے گئے ہیں ان میں پہلا ستون الا الہ الا اللہ (اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں) قرار دیا ہے۔

شرک کے رد میں قرآن مجید میں آتا ہے۔

اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيْمٌ (لقمان 13:31)

یعنی شرک بہت بڑا ظلم ہے۔

مَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدِ افْتَرٰى اِثْمًا عَظِيْمًا (النساء4:48)

اللہ کا شریک ٹھہرایا اس نے بہت بڑا جھوٹ گھڑا۔

وَمَنْ يَّدْعُ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ لَا بُرْهَانَ لَهٗ بِهٖ (المومنون23:117)

جو کوئی اللہ کے ساتھ کسی دوسرے کو معبود پکارتا ہے تو اس کے پاس اس کی کوئی دلیل نہیں۔

وَمَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَكَاَنَّمَا خَرَّ مِنَ السَّمَآءِ (الحج22:31)

جو کوئی اللہ کے ساتھ شرک کرے تو گویا وہ آسمان سے گر پڑا۔

یہ ہے اسلام کی خالص توحید کی تعلیم اس تعلیم کی موجودگی میں یہ کہنا کہ اسلام شرک کی تعلیم دیتا ہے پرلے درجے کی لاعلمی اور جہالت ہے دنیا میں صرف اسلام ہی ایک دین ہے جو خالص توحید کی تعلیم دیتا ہے ہندو کروڑوں دیوتاؤں کے پوجاری ہیں آخر تری مورتی یعنی تین خدا براہمہ، وشنو اور شیو کے قائل نظر آتے ہیں۔ یہودیوں نے حضرت عزیر کو اللہ کا بیٹا ٹھہرالیا۔ عیسائی تین خداؤں باپ بیٹا اور روح القدس کے قائل ہیں۔

اعتراض کا دوسرا جزو:

اللہ تین دفعہ کفر کرنے کو معاف کر دیتا ہے چوتھی دفعہ معاف نہیں کرتا۔ اس آیت میں منافقوں کا ذکر ہے۔ آیت میں دو تین بار کفر کرنے کی گنتی مراد نہیں بلکہ ان کے تردد کا ذکر ہے کہ وہ بار بار ایمان لاتے ہیں اور بار بار کفر کا ارتکاب کرتے ہیں پھر ان کا خاتمہ کفر میں بڑھ جانے پر ہوا۔ یعنی کفر کی اس انتہا پر پہنچ گئے پھر انہوں نے کفر سے رجوع نہیں کیا یہ کفر کی شدت کے بیان کرنے کا انداز ہے۔ اس کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے یہ بیان کر دیا کہ اللہ کفر کی طرف راہنمائی نہیں کرتا بلکہ انسان خود کفر کا راستہ اختیار کرتا ہے اللہ تعالیٰ نے دونوں راستے ہدایت اور کفر کے واضح کر دیئے ہیں انسان کو اختیار دے دیا ہے کہ وہ جون سا راستہ چاہے اختیارات کر لے۔ اللہ اس کے اختیار کردہ راستہ کے مطابق جزا و سزا دے گا۔ یہی اللہ کی سنت ہے۔

☆......☆

پیغمبر پر ایمان لانا خدا کے ساتھ شرک ہے

اعتراض: جب پیغمبر پر ایمان لانا لکھا تو ایمان میں پیغمبر کا خدا شریک ہوا یا نہیں جب خدا ایک جگہ رہنے والا ہے ہر جگہ نہیں تب ہی تو پیغمبر اس کے پاس آتے جاتے ہیں ایسا خدا تو خدا ہی نہیں ہوسکتا۔ (سیتارتھ پرکاش اعتراض نمبر 62)

جواب: قرآن مجید کی اس آیت پر اعتراض کیا گیا ہے۔

يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَكُمُ الرَّسُوْلُ بِالْحَقِّ مِنْ رَّبِّكُمْ فَاٰمِنُوْا خَيْرًا لَّكُمْ وَاِنْ تَكْفُرُوْا فَاِنَّ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا (النساء4:170)

اے لوگو! رسول تمہارے رب کی طرف سے حق کے ساتھ تمہارے پاس آیا۔ سو ایمان لاؤ تمہارے لیے اچھا ہے۔ اگر تم انکار کرو تو جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے اللہ ہی کا ہے اور اللہ جاننے والا حکمت والا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے انسان کی ہدایت اور ضروریات کو پورا کرنے کے لیے خارج میں سامان پیدا کیے ہیں۔ مادی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے کائنات میں سورج چاند ستارے ہوا زمین چرند پرند دریا سمندر دیگر تمام سامان پیدا کر رکھے ہیں پھر نظام کائنات چلانے کے لیے اَن دیکھے وسائط پیدا کیے ہیں۔ قرآن مجید نے ان وسائط کو ملائکہ کہا ہے۔ ملائکہ خدا کے حکم سے یہ نظام کائنات چلا رہے ہیں اور انسان کی تمام مادی ضروریات پوری ہو رہی ہیں اس کے ساتھ انسانی ہدایت کے لیے سلسلہ انبیاء و رسل جاری کیا ہے اللہ تعالیٰ ان انبیاء پر اپنے احکام نازل کرتا ہے۔ انبیاء علیہم السلام ان احکام کو لوگوں تک پہنچاتے ہیں وہ احکام انسان کی ہدایت کا موجب ہیں۔ یہ بھی انسان کی ایک ضرورت تھی اس ضرورت کو انبیاء علیہم السلام کے ذریعے پورا کیا۔ یہ اللہ کے کارندے ہیں۔ اللہ نے انسانوں کو حکم دیا ہے کہ وہ ان کارندوں پر ایمان لائیں۔ جب ہم رسول پر ایمان لاتے ہیں تو ہم اللہ کے حکم کے تحت ایمان لاتے ہیں گویا ہم ایمان لا کر اللہ تعالیٰ کا حکم بجا لا رہے ہیں۔ یہ اللہ کی ہی اطاعت ہے۔ جب ایک مسلمان رسول کریم صلعم پر ایمان لاتا ہے تو وہ خدا کا حکم بجا لا رہا ہوتا ہے اسی لیے اللہ تعالیٰ نے رسول کی اطاعت کو خدا کی اطاعت قرار دیا ہے۔ کیونکہ رسول پر ایمان لانا خدا کا حکم ہے اس لیے رسول پر ایمان لانے کو شرک نہیں کہا جا سکتا اگر رسول پر ایمان نہ لائیں تو خدا کے حکم کی عدولی ہوگی اور ہم اللہ کے نافرمان ہوں گے۔

معترض کا اعتراض بے دلیل ہے کہ رسول پر ایمان لانے سے شرک لازم آ جاتا ہے۔ شرک اس وقت لازم آتا ہے جب ہم پیغمبر کو اللہ کی ذات کے سوا ایک اور قابل پرستش ہستی قرار دیں۔ اسلام کا پیغمبر یہ نہیں کہتا کہ اس کو اللہ کے ساتھ شریک بنائیں اور نہ مسلمان پیغمبر کو اللہ کے سوا قابل عبادت تسلیم کرتے ہیں ایمان لانا خدا کا حکم ہے مسلمان خدا کے اس کو بجا لا رہے ہوتے ہیں۔

دوسرا جزو:

اسلام کا خدا کسی خاص جگہ پر نہیں رہتا۔ وہ ہر جگہ موجود ہے۔ پیغمبر خدا کی کوئی خاص قیام گاہ سے زمین پر نہیں آتا بلکہ وہ انسانوں میں سے ہی ہوتا ہے اور وہ کسی عورت کے پیٹ سے جنم لیتا ہے۔ پھر اللہ اپنے فضل سے اس کو رسول بناتا ہے اس پر وحی نازل کرتا ہے وہ وحی احکام الٰہیہ ہوتے ہیں اور وہی انسانوں کی فلاح کا ضامن ہوتے ہیں (تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے حق کے ساتھ رسول آیا)

قَدْ جَآءَكُمُ الرَّسُوْلُ بِالْحَقِّ مِنْ رَّبِّكُمْ

کا یہ مطلب نہیں کہ رب کسی ایک جگہ قیام پذیر ہے اور رسول اس کے پاس سے آیا۔ بلکہ صرف مطلب یہ ہے کہ اللہ نے حق یعنی وحی کے ساتھ اپنی طرف سے بھیجا ہے۔ یعنی پیغمبر اللہ کا فرستادہ ہے۔ تمام مذاہب کا اس بات پر اتفاق ہے کہ اللہ لامکان ہے۔ وہ ہر جگہ موجود ہے اللہ کے کارندے اس کے حکم سے نظام کائنات چلا رہے ہیں۔ ویدوں میں یہی تعلیم ہے۔ ''پرماتما کے اس خزینہ قدرت کو جس کی دیوتا حفاظت کرتے ہیں کون جان سکتا ہے۔'' (اتھروید کانڈ 10، پرپھاٹک 22، انوواک 4 منتر 23)

تینتیس دیوتا اس پرماتما کے تقسیم کیے ہوئے فرائض کو پورا کر رہے ہیں وہ اس کی قدرت کے جزوی مظہرات ہیں جو لوگ اس برہم یعنی وید یا محیط کل ایشور کو پہچانتے ہیں وہی ان تینتیس دیوتاؤں کو جانتے اور ان کو اسی ایک برہم کے سہارے قائم مانتے ہیں۔ (اتھروید کانڈ 10 پرتھاٹک 23، انوواک 4 منتر 27)

کیا تینتیس دیوتاؤں کا پرماتما (خدا) کے ساتھ ذکر ہوا ہے وہ خدا کے فرستادہ ہیں گیا وہ اللہ کے شریک ہو گئے۔ نبیوں اور ملائکہ کا ذکر اللہ کے ساتھ آ جانے سے شرک لازم نہیں آتا۔ شرک اس وقت لازم آتا ہے جب ایک انسان اللہ کے سوا دوسرے کسی کو قابل پرستش تعلیم کرے۔

☆......☆

اللہ تعالیٰ نے ارض و سما اپنے ہاتھ سے بنایا اور تھک گیا

اعتراض: خدا نے زمین و آسمان کو اپنے ہاتھ سے بنایا اور خدا کو تکان نہ ہوئی ہاتھ سے بنانے کی کیا ضرورت تھی۔ کن سے بناتا وغیرہ وغیرہ۔ (ترک اسلام سوال 83)

جواب: چھ دن میں ارض و سما کی تخلیق کا جواب سیرت سید البشر حصہ سوم میں دیا جا چکا ہے۔ وہاں بھی معترض نے یہ سوال کیا تھا کہ چھ دن میں تخلیق کرنے کی کیا ضرورت تھی ''کُن'' کہہ کر فوری بنا دیتا۔ یہاں معترض نے ہاتھ سے بنانے پر اعتراض ''کُن'' (ہوجا) کیا ہے۔ اعتراض کی ایک دوسری جہت ہے۔ پھر ہاتھ سے بنانے کی وجہ سے تکان کا بھی ذکر کیا ہے۔ پھر وہی اعتراض کیا ہے۔ ہاتھ سے بنانے کی بجائے ''کن'' سے بنا دیتا ہے۔

قرآن مجید کی اس آیت پر اعتراض کیا گیا ہے۔ ارشاد الٰہی ہے۔

وَالسَّمَآءَ بَنَيْنٰهَا بِاَيْىدٍ وَّاِنَّا لَمُوْسِعُوْنَ (الذاریات 47:51)

اور آسمان کو ہم نے قوت کے ساتھ بنایا اور ہم وسیع قدرت والے ہیں۔

معترض نے بِاَيْىدٍ کے معنی ہاتھ کیے ہیں۔ ''اید'' ید کی جمع نہیں جس کے معنی ہاتھ کے ہیں۔ قرآن مجید میں ایک دوسری جگہ بھی یہ لفظ استعمال ہوا ہے ارشاد الٰہی ہے۔

وَاذْكُرْ عَبْدَنَا دَاوٗدَ ذَا الْاَيْدِ (صٓ 17:38)

(ہمارے قوت والے بندے داؤد کو یاد کرو۔

''ذا الاید'' کے معنی ذا القوۃ ہیں یعنی قوت والا۔ ''اید'' اور ''اد'' دونوں کے معنی قوت کے ہیں اسی سے اَيَّدَ ہے۔ (نہایۃ ابن کثیر)

وَاَيَّدْنٰهُ بِرُوْحِ الْقُدُسِ (البقرہ 87:20)

تائید کی یا قوت دی۔

پس زیر اعتراض آیت کے معنی یہ ہیں یہ سب ہم نے آسمان کو اپنی قدرت کاملہ اور قوت تامہ سے بنایا۔

اگر ''اید'' کے معنی ہاتھ بھی لیے جائیں تو اید (ہاتھ ید کی جمع) بھی عربی زبان میں استعارہ کے طور پر قوت اور قدرت کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ معترض نے عربی زبان کی باریکیوں اور نزاکتوں سے عدم واقفیت کی وجہ سے یہ اعتراض کیا ہے۔ اس آیت کو جب ایک عربی زبان کا ماہر پڑھے گا تو وہ لفظ ''اید'' کے استعمال کو دیکھ کر وجد میں آ جائے گا اور قرآن مجید کے بے مثل ہونے کا اقرار کرے گا۔ بڑے بڑے فصحاء اور بلغاء نے قرآن مجید کی فصاحت و بلاغت کا اقرار اسی قسم کے استعارات کے استعمال کی وجہ سے کیا تھا۔

باقی رہا سوال اللہ تعالیٰ کی تکان کا۔ قرآن مجید میں واضح الفاظ میں نفی کی ہے۔

ارشاد الٰہی ہے۔

وَمَا مَسَّنَا مِنْ لُّغُوْبٍ (ق 38:50)

اور تکان نے ہمیں نہیں چھوا۔

اللہ تعالیٰ نے ارض و سما کو چھ مراحل میں بتدریج بنایا تھا۔ جس کی وضاحت سیرت سید البشر کے حصہ سوم میں کی جا چکی ہے اعادہ کی ضرورت نہیں وہاں ہی لفظ ''کن فیکون'' کی وضاحت ہو چکی ہے۔ یہاں معترض نے ایک نئی جہت سے اعتراض کیا اس کا جواب دے دیا گیا ہے۔ قرآن مجید کی یہ خوبی ہے کہ جس آیت یا لفظ پر اعتراض کیا جائے اسی آیت اور لفظ میں اس اعتراض کا جواب مضمر ہوتا ہے۔ اسی وجہ سے کہا جاتا ہے کہ قرآن مجید اسرار و رموز کا خزانہ ہے۔ غور و فکر کرنے والے اپنی استعداد کے مطابق ان اسرار تک ایک حد تک رسائی حاصل کر لیتے ہیں۔

☆......☆

زمین پر پہاڑ رکھے تا کہ آدمیوں کے بوجھ سے ہل نہ جائے

اعتراض: زمین پر پہاڑ اس لیے رکھے کہ وہ آدمیوں کے بوجھ سے ہل نہ جائیں۔ (ترک اسلام سوال 84)

جواب: قرآن مجید کی اس آیت پر اپنی جہالت کی وجہ سے اعتراض کیا ہے۔

وَاَلْقٰی فِی الْاَرْضِ رَوَاسِیَ اَنْ تَمِیْدَ بِکُمْ وَاَنْھٰرًا وَّسُبُلًا لَّعَلَّکُمْ تَھْتَدُوْنَ (نحل)

اور اس نے زمین میں پہاڑ ڈالے کہ تمہیں لے کر کانپے نہیں اور دریا اور راستے بنائے تا کہ تم ہدایت پاؤ۔

دوسری آیت اسی مضمون کی یہ ہے۔

وَجَعَلْنَا فِیْھَا رَوَاسِیَ اَنْ تَمِیْدَ بِھِمْ وَجَعَلْنَا فِیْھَا فِجَاجًا سُبُلًا لَّعَلَّھُمْ یَھْتَدُوْنَ (انبیاء 21:31)

اور ہم نے زمین میں پہاڑ بنائے تا کہ وہ انہیں لے کر کانپے نہیں اور ہم نے اس میں کھلے راستے بنائے تا کہ وہ راہ پائیں۔

معترض نے لفظ تَمِیْدَ (ماد) کے معنی نہیں سمجھے تَمِیْدَ ماد سے مشتق ہے مَادَنِی اَطْعَمَنِیْ (مفردات امام راغب)

اس نے مجھے کھلایا۔ اس لحاظ سے اس کے معنی ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے زمین پر پہاڑ نصب کیے تا کہ وہ لوگوں کے لیے کھانے کا سامان بہم پہنچائیں اسی آیت میں لفظ انہار (دریا) بھی اس طرف اشارہ کرتا ہے۔ دریا پہاڑوں کی وجہ سے جاری و ساری رہتے ہیں اور دریا

فصلوں کی سرسبزی کا باعث ہیں۔ بارشوں کا نزول بھی پہاڑ ہیں۔ اس معنی کی رو سے اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو اپنی رحمتوں کے خزانہ سے آگاہ کرنے کے لیے یہ بتایا ہے اللہ تعالیٰ نے زمین پر پہاڑ نصب کیے ہیں وہ اپنے اندر تمہاری روزی کا سامان لیے ہوئے ہیں۔ تمید (ماد) کے معنی اضطراب اور ایک طرف مائل ہونے کے بھی ہیں۔ حدیث میں آتا ہے۔

لَمَّا خَلَقَ اللّٰہُ الْاَرْضَ جُعِلَتْ تَمِیْدُ فَارسٰھَا بِالْجِبَالِ

یعنی جب اللہ تعالیٰ نے زمین کو پیدا کیا تو اس میں اضطراب تھا تب اللہ تعالیٰ نے پہاڑ قائم کیے۔ یہ معنی بھی درست ہیں سائنس اس بات پر شاہد ہے کہ پہاڑوں کے بن جانے سے زمین کا اضطراب زلزلوں کے رنگ میں کم ہو گیا ہے۔ اس کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت تامہ کا ذکر کیا ہے کہ زمین کے چکر کھانے کے ساتھ پہاڑ بھی چکر کھاتے ہیں لیکن نظام ارضی میں بگاڑ پیدا نہیں ہوتا۔ اس آیت میں پہاڑوں کے فوائد کا ذکر کیا گیا ہے۔ دور حاضر کی سائنس نے پہاڑوں کے یہی فوائد بیان کیے ہیں۔ یہ پہاڑ اللہ کی رحمتوں کا سرچشمہ ہیں اگر یہ نہ ہوتے تو انسان کی روزی کے دروازے بند ہو جاتے۔ گویا پہاڑ انسانوں کی حیات کا ذریعہ ہیں۔ مزید وضاحت اس آیت سے کر دی۔

وَجَعَلَ فِیْھَا رَوَاسِیَ مِنْ فَوْقِھَا وَبٰرَکَ فِیْھَا وَقَدَّرَ فِیْھَآ اَقْوَاتَھَا (حم السجدہ 10:41)

اور زمین کے اوپر پہاڑ بنائے اور اس میں برکت رکھی اور اس پر ہر قسم کی کھانے کی چیزیں پیدا کیں۔ اس آیت میں الفاظ بٰرَکَ فِیْھَا وَقَدَّرَ فِیْھَآ اَقْوَاتَھَا (برکتیں اور خوراکیں) پہاڑوں کی بدولت ہیں یہ راز ایک امی پر منکشف ہوئے تھے۔ آج سائنس نے ان پر صداقت کی مہر ثبت کی ہے۔

☆......☆

لوط قوم کی بستیوں پر پتھروں کی بارش ہونا (کیا پتھروں کی بارش ممکن ہے)

اعتراض: قوم لوط کی بستیاں الٹ کر پھینک دیں۔ پتھروں کا مینہ برسایا۔ جبرائیل نے پروں سے شہر الٹا دیا۔ (ترک اسلام سوال نمبر 75)

جواب: قرآن مجید میں حضرت لوط کا ذکر مختلف مقامات پر مختلف انداز میں کیا ہے جس میں لوط قوم کے بدکاریوں، حق کی دشمنی خلاف فطرت افعال کا ذکر ہے۔ ان کی بداعمالی کی وجہ سے ان پر عذاب الٰہی آیا۔ قرآن مجید میں آتا ہے۔

وَاَمْطَرْنَا عَلَیْھَا حِجَارَۃً مِّنْ سِجِّیْلٍ مَّنْضُوْدٍ (ھود 82:11)

اور ہم نے اس پر سخت پتھر پے در پے برسائے۔

پتھروں کی بارش آتش فشاں پہاڑوں سے ہوتی ہے۔ اس آتش فشانی پتھروں کی بارش نے لوط کی بستیوں کو تباہ و برباد کر دیا اور اپنی بدکاریوں کی سزا پا لی۔

اس قوم کے عذاب کو کہیں صرف اَمْطَرْنَا عَلَیْھِمْ مَّطَرًا (النمل 58:27) بھی کہا ہے یعنی ہم نے ان پر بارش کی۔

قرآن مجید میں کہیں بھی یہ نہیں لکھا کہ جبرائیل نے اپنے پروں سے شہر الٹا دیا قرآن میں کہیں صرف مطر کا ذکر کیا ہے اور کسی جگہ پتھروں کی بارش کا۔ آتش فشانی سے ان پر پتھروں کے سنگریزوں کی بوچھاڑ ہوئی ہے اور ان کی بستیاں تباہ و برباد ہو گئی تھیں قوموں کی تباہی کا ذکر صرف قرآن مجید میں ہی نہیں بلکہ دنیا کی تواریخ میں مختلف قوموں کی تباہی کے اذکار ملتے ہیں۔ قرآن مجید میں یہ غیر طبعی اور غیر فطرتی،

ان نیچرل واقعہ نہیں ہے جس پر اعتراض کیا جائے اکثر آتش فشاں پھٹتے ہیں اور لوگ تباہ و برباد ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح تباہی و بربادی کے اور بھی کئی طریقے ہیں۔ بہر حال قوم لوط پتھروں کی بارش یعنی آتش فشاں پھٹ پڑنے سے تباہ و برباد ہوئی۔

بحر مردار کی جھیل ان کی تباہی کی زندہ نشانی ہے۔

دوسری توجیہہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ ان کی بستیوں پر شہاب ثاقب کثرت سے گرے ہوں۔ اس کثرت کو استعارہ کے طور پر لفظ ''مطر'' سے بیان کر دیا ہے۔ شہاب اکثر گرتے ہیں آسمان سے کرہ ہوائی میں داخل ہو کر روشن ہو جاتے ہیں۔ ایسے ہر روز 20 ملین ہوا میں داخل ہوتے ہیں۔ رات کے پچھلے حصے میں پہلے کی نسبت تین گنا زیادہ ہوتے ہیں۔ شہاب کی فوج دورے کے ساتھ آتی ہے۔ یہ دورہ صدی میں تین بار ہوتا ہے بعض مقامات پر یہ شہاب جمع بھی کرائے گئے ہیں یورپ میں وائنا، پیرس، لندن، برلن، امریکہ میں نیو ہیون ایمہرسٹ لوئزول یہ پتھر عموماً بڑے نہیں ہوتے عجائب خانہ میں ایک سو پونڈ سے زیادہ وزن کے پتھر کم ہیں پائے جاتے ہیں۔ نو سو پچاس سالم پتھر پیرس کے عجائب خانہ میں موجود ہیں جن میں سے ہر ایک کا اوسط وزن 67 گرام یعنی 2½ اونس سے بھی کم ہے سٹاک ہولم کے عجائب خانہ میں ایک پتھر کا وزن ایک گرین سے بھی کم ہے مقام ایمٹ کی بارش میں ایک پتھر تقریباً 500 پونڈ کا گرا تھا۔

میٹی ارک آئرن اس قسم کا ایک ٹکڑا 1635 پونڈ وزنی کالج میوزیم میں موجود ہے قریباً اتنے ہی حجم کا ایک ٹکڑا پیرس کے میوزیم میں ہے اس سے کسی قدر چھوٹا ٹکڑا شہر واشنگٹن کے نیشنل میوزیم میں ہے اور ان سے ایک بہت بڑا ٹکڑا برٹش میوزیم میں ہے۔

یہ ایک تاریخی حقیقت ہے شہاب آسمان سے گرتے ہیں۔ ان کے ٹکڑے مختلف حجموں کے مختلف میوزیم میں جمع کر دیئے گئے ہیں۔

عین ممکن ہے لوط قوم شہاب کے گرنے سے تباہ ہوئی ہو۔ اس قسم کے واقعات رونما ہوتے رہتے ہیں۔ سینٹ پیری پتھروں کی بارش سے ہی تباہ ہوا تھا۔

......☆......

شعیب قوم کی تباہی (شعیب پیغمبر کی قوم کو چیخ مار کر تباہ کیا)

اعتراض: شعیب پیغمبر کی قوم کو چیخ مار کر تباہ کیا۔ (ترک اسلام سوال 76)

جواب: وہ لفظ جس کا ترجمہ چیخ کیا ہے وہ صیحۃ ہے لغات القرآن میں ہے۔

اَلصَّيْحَةُ قَدْ تَفْزَعُ فَعَبَّرَ بِهَا مِنَ الْفَزَعِ

یعنی صیحۃ سے مراد آفت اور مصیبت ہوتی ہے۔ صیحۃ بلند آواز کا نام ہے (امام راغب) قرآن مجید میں آتا ہے۔

وَاَخَذَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوا الصَّيْحَةُ فَاَصْبَحُوْا فِیْ دِيَارِهِمْ جٰثِمِيْنَ (ھود 11:67)

اور جو ظالم تھے انہیں ہولناک آواز نے آ پکڑا سو وہ اپنے گھروں میں اوندھے پڑے رہ گئے۔

جس کو یہاں صیحۃ کہا ہے اسی کو الاعراف 7:78 میں رجفہ یا زلزلہ کہا ہے۔ ارشاد الٰہی ہے۔

فَاَخَذَتْهُمُ الرَّجْفَةُ فَاَصْبَحُوْا فِیْ دَارِهِمْ جٰثِمِيْنَ

سو ان کو زلزلہ نے آ پکڑا تو وہ اپنے گھروں میں اوندھے پڑے رہ گئے۔

اس سے معلوم ہوا کہ ایک ہی عذاب کی مختلف صورتوں کے یہ نام تھے۔ زلزلہ سے پہلے بھی ایک خوفناک آواز آتی ہے۔ اسی آواز

کو ایک جگہ صیحۃ کے لفظ سے بیان کر دیا۔ یہاں شعیب کی قوم کی تباہی کا سبب بیان کیا گیا ہے کہ وہ سبب زلزلہ تھا اور قوم عذاب الٰہی سے چیختی چلاتی آہ و بکا کرتی تباہ و برباد ہوگئی۔ اس واقعہ میں کون سی ناممکن اور غیر طبعی بات ہے۔ جس کی وجہ سے اعتراض کر دیا گیا ہے۔

☆......☆

مٹھی بھر کنکریوں سے فوج کو بھگانا

اعتراض: مٹھی بھر کنکریاں مار کر فوج مخالف اسلام کو بھگا دیا۔ (ترک اسلام سوال 77)

جواب: قرآن مجید کی اس آیت پر اعتراض کیا گیا ہے۔

مَارَمَیْتَ اِذْ رَمَیْتَ وَلٰکِنَّ اللّٰہَ رَمٰی (الانفال 17:8)

جب تو نے پھینکا تو تو نے نہیں پھینکا بلکہ اللہ نے پھینکا۔

یہ ایک معجزہ ہے اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کی اس قسم کے معجزات سے مدد کرتا رہتا ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام جب بنی اسرائیل کو لے کر چل دیئے تو فرعون نے اپنے الاؤ لشکر کے ساتھ ان کا تعاقب کیا جب حضرت موسیٰ علیہ السلام سمندر پر پہنچے تو پانی ہٹا ہوا تھا اور حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنی قوم کے ساتھ اس رستے سے سمندر پار کر گئے۔ جب فرعون سمندر پر پہنچا تو جونہی جوش و غضب میں سمندر میں اترا تو پانی چڑھ گیا اور وہ غرق ہو گیا حضرت موسیٰ علیہ السلام کا سمندر سے پار ہو جانا اور فرعون کا غرق ہونا ہی ایک معجزہ تھا۔ اللہ تعالیٰ اپنے بندہ کی نصرت کے خود اسباب پیدا کرتا ہے۔ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام سمندر پر پہنچے تو جوار بھاٹا کی وجہ سے پانی اترا ہوا تھا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام بحفاظت سمندر پار کر گئے جب فرعون اپنے لشکر کے ساتھ آیا۔ جونہی سمندر میں اترے تو پانی چڑھنا شروع ہو گیا اور وہ غرق ہو گئے۔ اللہ کی نصرت سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو سمندر میں رستہ مل گیا اور وہ پار کر گئے اور فرعون اللہ کی ناراضگی کی وجہ سے اسی راستے میں جو حضرت موسیٰ کی نجات کا باعث تھا غرق ہو گیا۔ اللہ اپنے بندوں کی اسی سنت اور عادت کے مطابق مدد کرتا ہے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ بھی جنگ بدر میں ایسا ہی ہوا۔ دشمن کا لشکر زیادہ تھا اور وہ اسلحہ سے لیس تھا۔ مسلمان تعداد میں کم تھے اسلحہ بھی نہ تھا۔ اس موقعہ پر اللہ تعالیٰ نے یہ معجزہ دکھایا رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کنکریوں کی ایک مٹھی دشمن کی طرف پھینکی تو آندھی نما تیز ہوا چل پڑی۔ تیز ہوا کا رخ یہ تھا کہ مسلمان فوج کی پیٹھ تھی اور کافر فوج کا منہ۔ اس تیز ہوا کی وجہ سے مسلمانوں کے تیر دشمن فوج تک نشانہ پر پہنچ جاتے تھے جبکہ کفار کی فوج کے تیر تیز ہوا کے سبب اپنے نشانہ پر نہیں لگتے تھے۔ بلکہ ہوا کی مزاحمت اور مخالفت کی وجہ سے مسلمانوں تک پہنچتے ہی نہ تھے اس کے ساتھ اندھی کفار کی فوج کے سامنے سے آ رہی تھی اور مسلمانوں کی پیٹھیں تھیں۔ مٹی اور ریت اڑ کر کفار کی فوج کی آنکھوں میں پڑ رہی تھی۔ کفار کچھ بھی دیکھ نہ پاتے تھے۔ اس طرح اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کی تیز ہوا کے ساتھ مدد کی۔ یہ ایک تاریخی واقعہ ہے جس کو جھٹلایا نہیں جا سکتا۔ رسول کریم ﷺ کی مٹھی بھر مٹی نے ایک اعجازی شکل اختیار کر لی۔ کفار کی شکست کا موجب ہوئی۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ جب تو نے ریت کی مٹھی پھینکی تھی وہ تو نے نہیں پھینکی تھی۔ وہ اللہ نے پھینکی تھی یعنی رسول کریم صلعم کے فعل کو اللہ تعالیٰ نے اپنا فعل قرار دیا۔

جنگ بدر میں قلت اور غیر مسلح ہونے کے باوجود اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو فتح دی۔ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے جس کو جھٹلایا نہیں جا سکتا۔ سب سے بڑھ کر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلے ہی فتح کی خبر دے دی تھی۔ اب اس جنگ کی فتح کو کوئی معجزہ تسلیم نہ کرے تو یہ اس کی مرضی۔ حقیقت یہ ہے جس طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام کا بحفاظت سمندر کو پار کر جانا ایک معجزہ تھا۔ اسی طرح رسول کریم صلی اللہ

علیہ وسلم کی جنگ بدر میں کامیابی ایک بیّن معجزہ ہے۔
جنگ احزاب میں بھی اللہ تعالیٰ نے تیز آندھی کے ساتھ مسلمانوں کی مدد کی تھی۔ تیز آندھی کی وجہ سے کفار میں اضطراب اور بے چینی پیدا ہوگئی خیمے اکھڑ گئے۔ ایک باطنی اضطراب کی وجہ سے کفار کے گروہ محاصرہ چھوڑ کر اپنے اپنے شہروں کی طرف چل دیئے۔
اللہ کی یہ عادۃ اور سنت ہے کہ وہ اپنے بندوں کی نصرت اور تائید کے لیے اعجازی رنگ میں اسباب پیدا کر دیتا ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی مدد اور نصرت سمندر کے پھٹنے، چشموں کے جاری ہونے بارشوں کے سبب، من وسلویٰ کے پیدا ہونے سے کی۔ یہ تمام اسباب ارضی ہیں۔ اسی طرح رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی مدد ہجرت کے وقت، دوران ہجرت، تمام جنگوں میں کی مدد اور نصرت کے تمام اسباب ارضی ہیں۔ پہلے آسمان پر فیصلہ ہوتا ہے پھر نصرت اور مدد کے اسباب زمین پر پیدا ہو جاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ اس قسم کی اعجازی نصرت پر غور و فکر کرنا چاہیے اس میں ہی ہدایت کی روشنی ہوتی ہے جو انسان کے دل کی تاریکیوں کو دور کر دیتی ہے۔

......☆......

وَ مَنْ اَظْلَمَ مِمَّنِ افْتَرٰی عَلَی اللّٰهِ پر اعتراض

اعتراض: اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جب محمد صاحب کہتے تھے کہ مجھ پر خدا کی طرف سے وحی اترتی ہے تو کسی دوسرے نے بھی اس کی تقلید کی ہوگی اور کہا ہوگا کہ مجھے بھی پیغمبر جانو۔ اس کا انسداد کرنے اور اپنی عزت وتوقیر بڑھانے کے لیے محمد صاحب نے یہ آیت پیش کی ہوگی۔

وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰی عَلَی اللّٰهِ كَذِبًا اَوْ قَالَ اُوْحِیَ اِلَیَّ وَلَمْ یُوْحَ اِلَیْهِ شَیْءٌ وَّمَنْ قَالَ سَاُنْزِلُ مِثْلَ مَا اَنْزَلَ اللّٰهُ۔ (الانعام 93:6)

جو اللہ پر جھوٹ افتراء کرے یا کہے میری طرف وحی کی گئی ہے اور اس کی طرف کچھ وحی نہیں کی گئی اور جو کہے میں اس کی مثل اتار سکتا ہوں جو اللہ نے اتارا۔

جواب : اس آیت میں تین قسم کے مفتریوں کا ذکر کیا ہے۔ اول خدا پر جھوٹ بولنے والے دوسرے سچے رسولوں کے بالمقابل جھوٹی ڈینگیں مارنے والے تیسرے خدا کا مذاق اڑانے والے اور یہ کہنے والے کہ ہم بھی اس قسم کا کلام بنا سکتے ہیں۔ مثلاً نضر بن الحرث یہ کہتا تھا کہ ہم بھی قرآن جیسی وحی بنا سکتے ہیں۔ قرآن مجید میں ان کا قول بھی مذکور ہے۔

لَوْ نَشَاءُ لَقُلْنَا مِثْلَ هٰذَا (الانفال 31:8)

اگر ہم چاہیں اس کی مثل کہہ لیں۔

سوال صرف یہ ہے کہ آیا کوئی مفتری کامیاب ہوا۔ تاریخ اس بات پر گواہ ہے جن مفتریوں نے دعادی کیے وہ بری طرح ناکام و نامراد ہوئے۔ قرآن جیسی وحی بنانے کا دعویٰ کیا۔ کیا کسی نے قرآن مجید کے مقابل کوئی کتاب پیش کی؟ صرف زبانی ہی دعویٰ ہے کہ ہم چاہیں تو اس قسم کی وحی (کتاب) بنالیں لیکن کسی نے کتاب پیش نہیں کی۔ یہ آیت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت کی دلیل ہے کہ کسی

نے قرآن جیسی کتاب پیش نہیں کی یہی قرآن مجید کا اعجاز ہے کہ قرآن کے بالمقابل کسی نے کوئی تحریر پیش ہی نہیں کی۔ تمام مفتری ناکام ہوئے۔ ان کی ناکامی اور حضرت محمد مصطفی صلعم کی کامیابی رسول کریم ﷺ کی صداقت کی مبینہ دلیل ہے۔

اس آیت میں صرف رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد کے ہی مفتریوں کے بدانجام کا ذکر نہیں بلکہ اس میں ایک روشن پیشگوئی ہے کہ مستقبل میں بھی جو افترا کرے گا وہ بھی نامراد و خاسر رہے گا اور اپنے بدانجام کو پہنچے گا۔ تاریخ میں اس کی کئی روشن مثالیں موجود ہیں۔

☆......☆

اللہ تعالیٰ اب کیوں نہیں معجزہ دکھاتا

اعتراض: خدا پہلے زمانہ میں معجزہ دکھایا کرتا تھا تو اب کیوں نہیں دکھاتا (ستیارتھ پرکاش)

جواب : اسلام کا خدا زندہ خدا ہے اس کا رسول زندہ رسول ہے اور قیامت تک اس کی سچائی کے نشان ظاہر ہوتے رہیں گے۔ یہی اسلام کی سب سے بڑی خصوصیت ہے کہ وہ زندہ دین ہے۔ اسلام میں سینکڑوں نہیں ہزاروں نہیں بلکہ لاکھوں انسان موجود ہیں۔ جو اسلام کی تعلیم پر عمل پیرا ہیں۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے نقش قدم پر چلتے ہیں۔ آستانہ الوہیت پر گرے رہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کے ہاتھ پر اپنے معجزات دکھاتا ہے ان کی دعائیں سنتا ہے۔ ان سے ہم کلام ہوتا ہے۔ یہ لوگ اسلام کی صداقت کی دلیل ہیں۔ صرف اسلام ہی ایک ایسا دین ہے۔ جو ایک انسان کو روحانی معراج تک پہنچاتا ہے پھر اس کے ذریعے اللہ تعالیٰ اپنا چہرہ ظاہر کرتا ہے دور حاضر میں بھی ایسے آدمی پائے جاتے ہیں اور ماضی میں بھی اسے بے شمار انسان ہو گزرے ہیں جن کے ہاتھ پر اللہ تعالیٰ نے معجزے دکھائے۔ معجزے دکھانا اللہ تعالیٰ کی سنت ہے۔ تا قیامت جاری رہے گی۔ ایک تو اللہ تعالیٰ نے ایک مستقل معجزہ ظاہر کر دیا ہے وہ قرآن مجید ہے اس کا بے مثل ہونے کا دعویٰ قیامت تک ہے۔ کوئی بھی عربی کا ماہر ایسا نہیں گزرا جو اس بے مثل جیسی کتاب بنا لائے اور نہ آئندہ پیدا ہوگا جو اس قسم کی بے مثل کتاب بنا سکے۔ قرآن مجید ہر دور کا معجزہ ہے۔ اگر کوئی شخص کسی ولی اور محدث کے معجزے نہ تسلیم کرے لیکن قرآن مجید کا بے مثل کتاب ہونا ایسا معجزہ ہے جو کوئی انکار نہیں کر سکتا یہی اسلام کی سب سے بڑی خصوصیت ہے کہ اس کی کتاب ایک زندہ کتاب ہے۔ جس کے ثمرات ہر دور میں ظاہر ہوتے ہیں۔ یہ وہ کتاب ہے جس کی تاثیر سے انسان باخدا بنتا ہے کیا یہ کم معجزہ ہے۔

☆......☆

اسلام لوٹ مار کا مذہب ہے

اعتراض : تعجب ہے کہ جو لوٹ مچا دیں اور ڈاکہ ماریں وہ خدا، پیغمبر اور ایماندار کہلائیں اللہ سے ڈرنے کی تعلیم بھی دیتے ہیں اور برے کام بھی کرتے ہیں پھر یہ کہتے شرم نہیں آتی کہ ہمارا مذہب اچھا ہے اس سے بڑھ کر اور کیا بدبختی ہوگی کہ تعصب کو چھوڑ کر حقیقی ویدک دھرم کو مسلمان قبول نہیں کرتے۔ (ستیارتھ پرکاش اعتراض 76)

جواب: یہ اعتراض حسب ذیل آیت پر کیا گیا ہے۔

يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْاَنْفَالِ قُلِ الْاَنْفَالُ لِلّٰهِ وَالرَّسُوْلِ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَصْلِحُوْا ذَاتَ بَيْنِكُمْ وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ

وَرَسُوْلَهٗٓ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ (الانفال 1:8)

تجھ سے مال غنیمت کے متعلق سوال کرلے ہیں کہ مال غنیمت اللہ اور رسول کا ہے سو اللہ کا تقویٰ کرو اور اپنے اندر کے حالات کو درست کرو اور اللہ اور اس کے رسول کی فرمانبرداری کرو اگر تم مومن ہو۔

اس کتاب میں ایک جگہ نہیں کئی مقامات پر مسلمانوں کی جنگوں (جہاد) پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ جس میں یہ وضاحت کی گئی ہے کہ تمام لڑائیاں دفاعی تھیں۔ جب مدنی ریاست کی سرحدیں غیر محفوظ ہوگئیں اور مسلمانوں کے مال اور جانیں خطرے میں پڑ گئے۔ ہر طرف سے تباہی و بربادی کی اندھیاں چلنی شروع ہوگئیں تب مسلمانوں نے اللہ کے حکم سے ہتھیار اٹھائے ہر لڑائی میں مسلمانوں کے مقابل پر کفار کی تعداد زیادہ تھی اور وہ اسلحہ سے لیس تھے۔ ان حالات میں مسلمانوں نے جنگیں کیں۔ مسلمان اعلیٰ قیادت اور اللہ کی تائید اور نصرت سے ہر جنگ میں کامیاب ہوئے۔ پھر رسول کریم ﷺ نے عہد جہالیت کے تمام جنگی مظالم کے اصول باطل قرار دیئے اور امن اور صلح کی پالیسی پر گامزن رہے جنگوں میں جو قیدی ہاتھ لگے ان کو رہا کردیا۔ فتح مکہ کے موقع پر جنگی مجرموں اور دشمنوں کو معاف کرنے کی مثال تاریخ عالم میں نہیں ملے گی۔ یہ وہ امن پسند دین ہے جس کو معترض نے لوٹ مار کا مذہب کہا ہے۔

الزامی جواب:

جب ہندو دھرم کی کتب کا مطالعہ کیا جائے۔ تو وہاں لوٹ مار کی ہی تعلیم ملتی ہے چند حوالے ملاحظہ کیجیے۔

1۔ ''دھرم کے مخالفوں کو زندہ آگ میں جلادو'' (یجروید ادھاء 13 منتر 12 دیانند بھاش)

2۔ ''دشمنوں کے کھیتوں کو اجاڑو (یعنی گائے، بیل، بکری اور لوگوں کو بھوکا مار کر ہلاک کرو۔'' (حوالہ مذکور منتر 13)

3۔ ''اپنے مخالفوں کو درندوں سے پھڑواڈالو۔'' (یجروید 19,17,15:15)

4۔ ''ان کو سمندر میں غرق کردو۔'' (18:15)

5۔ ''جس طرح بلی چوہے کو تڑپا تڑپا کر مارتی ہے اسی طرح ان کو تڑپا کر مارو۔'' (65:16)

6۔ ''ان کی گردنیں کاٹو۔''

7۔ ''جائز اور ناجائز طریق سے ہلاک کرو۔'' (28:1)

8۔ ''مخالفوں کا جوڑ جوڑ اور بند بند کاٹ دیا جائے۔'' (28:13)

9۔ ''ان کو پاؤں کے نیچے کچل دو اور ان پر رحم نہ کرو۔'' (89:17)

اسلام کیا کہتا ہے؟:

وَاِنْ جَنَحُوْا لِلسَّلْمِ فَاجْنَحْ لَهَا (انفال 61:8)

اور اگر وہ صلح کی طرف جھکیں تو تُو بھی اس کی طرف جھک جا۔

پھر فرمایا:

وَقَاتِلُوْا فِىْ سَبِيْلِ اللّٰهِ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَكُمْ وَلَا تَعْتَدُوْا اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ (بقرہ 190:2)

اور اللہ کی راہ میں ان لوگوں سے جنگ کرو جو تم سے جنگ کرتے ہیں اور زیادتی نہ کرو اللہ زیادتی کرنے والوں سے پیار نہیں کرتا۔

دونوں مذاہب (ہندو دھرم اور اسلام) کی تعلیمات کا تقابلی جائزہ لیا جائے تو واضح ہو جائے گا کہ کون سا مذہب لوٹ مار اور ظلم کی

تعلیم دیتا ہے اور کون سا مذہب امن اور ظلم نہ کرنے کی تعلیم دیتا ہے۔ رہا معاملہ مال غنیمت کا جب جنگ ہو تو لامحالہ مال غنیمت ہاتھ میں آتا ہے اور مال غنیمت تمام اقوام اور مذاہب میں جائز ہے۔ زیر اعتراض آیت میں مال غنیمت کے متعلق سوال کیا گیا ہے اس کے متعلق یہ تعلیم دی گئی ہے کہ مال غنیمت کو قومی خزانہ میں جمع کیا جائے پھر قوم کی مشترکہ ضرورت پر خرچ کیا جائے یہی ایک عمدہ اصول ہے۔ جو یہاں تعلیم کی گئی ہے۔

لوٹ مار کا اعتراض متعدد مخالفین نے کیا ہے اس اعتراض کی کوئی اصلیت نہیں یہ اعتراض اسلامی جہاد کے فلسفہ کو نہ سمجھنے کی وجہ سے کیا گیا ہے اسلام صرف دفاع کی تعلیم دیتا ہے جارحانہ اقدام ناجائز اور باطل ہے جارحانہ اقدام استیصال کا ذریعہ ہے اور اس سے ہی دنیا کا امن تباہ و برباد ہوتا ہے۔

☆......☆

کیا خدا صرف مسلمانوں کا ہی خدا ہے اس کی خدائی سے بعید ہے

اعتراض: کیا خدا مسلمانوں ہی کا ہے اگر ایسا ہے تو یہ اس کی خدائی سے بعید ہے خدا تو ساری خلقت کا رب ہے کیا خدا بن پکارے نہیں سن سکتا۔ بہرا ہے خدا کے ساتھ رسول کو شریک کرنا بہت برا ہے۔ اللہ کا کون سا خزانہ بھرا ہے جو چرایا جاسکے۔ کیا رسول کی چوری اور امانت میں خیانت کے سوا سب قسم کی چوری روا ہے؟ اس قسم کی تعلیم بے علموں اور جاہلوں کو ہو سکتی ہے بھلا اگر خدا مکر کرتا ہے اور مکاروں کا ساتھی ہے تو پھر وہ ادھرمی کیوں نہیں پس قرآن کلام اللہ نہیں کسی مکار کی تصنیف ہے۔ ورنہ اس میں اس قسم کی واہیات باتیں کیوں ہوتیں۔ (ستیارتھ پرکاش اعتراض 78)

جواب: معترض کے اعتراض کے کئی اجزا ہیں۔ ہر جزو کا الگ الگ جواب دیا جائے گا۔ عجیب بات یہ ہے۔ اعتراض کے بعض اجزا کی تکرار ہے۔

پہلا جزو:

کیا خدا مسلمانوں ہی کا ہے؟ اسلام کے نزدیک یہ نظام کائنات اللہ تعالیٰ کی صفات حسنہ کے تحت چل رہا ہے ان صفات کو اجاگر کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے اپنے وسائط مقرر کر رکھے ہیں اور نظام کائنات چل رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ سب کا رب ہے اس کی ربوبیت اور شان رحمانیت سے کوئی باہر نہیں۔ خواہ کوئی کافر ہے خواہ کوئی مشرک ہے خواہ کوئی مومن ہے حتیٰ کہ چرند پرند حیوانات سب چشمہ رحمانیت سے فیض حاصل کر رہے ہیں اللہ تعالیٰ نے زندگی کو برقرار قائم رکھنے کے لیے ہر قسم کا سامان پیدا کیا۔ زمین پیدا کی پہاڑ پیدا کیے۔ دریا سمندر جاری کیے ہوا چلائی سورج چاند ستارے پیدا کیے۔ یہ تخلیق کسی شخص کے کسی عمل کے نتیجہ میں ظاہر نہیں ہوئی۔ نہ کوئی دعویٰ کر سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کے کسی عمل کی وجہ سے یہ اشیاء پیدا کیں یہ ہے اللہ تعالیٰ کی شان رحمانیت اور ربوبیت۔ ہر جاندار چیز اپنی زندگی کو برقرار رکھنے کے لیے اس تخلیق سے فائدہ اٹھا رہی ہے۔ معترض کا اعتراض خود بخود باطل ہو جاتا ہے اللہ سب کا رب ہے۔ وہی پالن ہار ہے اس کی نظر میں سب برابر ہیں۔ حتیٰ کہ وہ شخص جو خدا کی ہستی کو مانتا ہی نہیں وہ بھی اللہ کی پیدا کی ہوئی اشیاء سے فائدہ حاصل کر رہا ہے۔

یہ نظام اللہ کی صفات "رب" اور "رحمانیت" سے چل رہا ہے۔ اللہ کی ایک صفت رحیمیت (رحیم) ہے۔ انسان کی محنت کا بہترین بدلہ دینے والا۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کی روحانی اور مادی ترقی کے لیے دو نعمتیں عطا کی ہیں۔ عقل اور احکام خداوندی۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کی ہدایت کے لیے اپنے انبیاء پر احکام نازل کیے۔ اس کے ساتھ عقل کی نعمت سے بھی نوازا۔ تاکہ انسان ان احکام پر عمل کر کے روحانی اور مادی ترقی کر سکے۔ ارشاد الٰہی ہے۔

وَاِنْ مِّنْ اُمَّةٍ اِلَّا خَلَا فِيْهَا نَذِيْرٌ (فاطر 24:35)

اور کوئی قوم نہیں مگر اس میں ڈرانے والا گزرا ہے۔

دوسری جگہ آتا ہے۔

وَلِكُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلٌ (یونس 47:10)

اور ہر قوم کے لیے ایک رسول ہے۔

اللہ تعالیٰ نے ان انبیاء علیہم السلام پر اپنے احکام نازل کیے کہ وہ ان پر عمل کریں تاکہ روحانی اور مادی لحاظ سے ترقی کریں اللہ تعالیٰ نے تمام انبیاء کی تعلیمات کو اعجازی رنگ میں قرآن مجید میں جمع کر دیا ہے۔ جو لوگ ان ابیاء علیہم السلام کی تعلیمات اور احکام پر عمل پیرا ہیں اسلامی اصطلاح میں وہی مومن ہیں اور ان کے ساتھ ہے۔

وَاَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُؤْمِنِيْنَ

بے شک اللہ مومنوں کے ساتھ ہے۔

اس آیت میں لفظ مع استعانت کو ظاہر کرتا ہے۔ یعنی جو لوگ اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لا کر احکام خداوندی پر عمل پیرا ہیں وہی اللہ کی استعانت کے حق دار ہیں۔ اس موضوع کو اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں مختلف انداز میں بیان کیا ہے۔

ایک جگہ ارشاد الٰہی ہے۔

وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا وَاِنَّ اللّٰهَ لَمَعَ الْمُحْسِنِيْنَ (العنکبوت 69:29)

اور جو لوگ ہمارے لیے محنت اٹھاتے ہیں ہم یقیناً انہیں اپنے رستوں پر چلاتے ہیں اور اللہ نیکی کرنے والوں کے ساتھ ہے۔

اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لانا پھر اس کے احکام پر عمل پیرا ہونے والے ہی مومن اور محسن ہیں اور اللہ کی استعانت اور مدد اور نصرت انہی لوگوں کے ساتھ ہے یہی لوگ اللہ کی استعانت اور مدد کے ساتھ روحانی اور مادی لحاظ سے ترقی کرتے ہیں۔ روحانی اور مادی ترقی کا عمل اللہ کی صفت رحیمیت کے تحت ہے۔ رحیم وہ ہستی ہے جو محنت انسانی کا بہترین بدلہ دیتی ہے۔ گویا رحیم وہ ذات ہے جو انسان کے اعمال پر بہترین اجر دیتی ہے۔

زیر اعتراض آیت میں یہ بیان کیا گیا ہے اللہ کی مدد ان لوگوں کے ساتھ ہے جو اس پر ایمان لاتے ہیں اور اس کے احکام پر عمل پیرا ہیں کیا کوئی شخص ہے جو اللہ کے اس قانون کو خدا کی خدائی سے بعید جانے اور اللہ کے انصاف اور عدل پر حرف گیری کرے۔ انصاف کا تقاضا یہی ہے کہ اللہ کے رستے میں محنت کرنے والے اور اس کے احکام کی پیروی والے کو پورا پورا بدلہ دیا جائے اور وہی اللہ کی استعانت اور مدد کا حق دار ٹھہرتا ہے۔ زیر اعتراض آیت میں اللہ تعالیٰ نے مومنین کی اعانت اور نصرت کا یہ ذکر کیا ہے کہ کفار مسلمانوں کو تباہ و برباد کرنے کے لیے بار بار حملے کرتے اور ہر بار زیادہ الاؤ لشکر کے ساتھ اور مسلح ہو کر آتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں (مومنین) کی مدد کرتا ہے۔ کفار کو کہا گیا ہے کہ وہ باز آجائیں اگر انہوں نے جنگ جاری رکھی تو وہ سزا پائیں گے اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو یہ مدد اپنی صفت رحیمیت کے تحت

دے رہا تھا۔ کیونکہ مسلمان اللہ کے احکام پر عمل پیرا تھے۔ اللہ انہی ہی کی مدد کرتا ہے جو اس کے احکام پر عمل پیرا ہوں۔ یہی انصاف کا تقاضا تھا۔ اور یہی اللہ کی سنت مستمرہ ہے پہلے بھی اللہ تعالیٰ مومنین کی مدد کیا کرتا تھا۔ اور عہد رسول میں بھی اسی سنت کے مطابق مومنین کی مدد کی۔ یہی خدائی قانون ہے۔ یہ قانون تا ابد جاری و ساری رہے گا۔

اللہ تعالیٰ انہی کی مدد کرے گا جو اس کے احکام پر عمل کریں گے۔ جو اس کے بتائے ہوئے قانون پر گامزن ہوں گے۔ اس قانون اور اصول سے کسی صاحب عقل کو اعتراض نہیں ہو سکتا کہ اللہ کے احکام کے مطابق محنت کرنے والا ہی پھل حاصل کرے۔

دوسرا جزو:

کیا خدا پکار کے بغیر نہیں سنتا۔

قرآن مجید میں اس موضوع کی کوئی آیت نہیں کہ خدا پکارے بغیر نہیں سنتا۔ اسلام کا خدا دل کے بھیدوں کو بھی جانتا ہے۔ جب ایک شخص اپنے دل کی گہرائیوں میں خدا کے متعلق سوچتا ہے اور دل میں خواہش اور آرزو پیدا کرتا ہے۔ اللہ اپنے بندے کی دل میں چھپی ہوئی بات کو بھی جانتا ہے وہ سینوں کی باتوں کو جاننے والا ہے۔ قرآن مجید میں تو صاف الفاظ میں آیا ہے۔

سَوَاءٌ مِّنْكُمْ مَنْ اَسَرَّ الْقَوْلَ وَمَنْ جَهَرَ بِهٖ وَمَنْ هُوَ مُسْتَخْفٍۢ بِالَّيْلِ وَسَارِبٌۢ بِالنَّهَارِ (الرّعد)

اس کے نزدیک سب برابر ہے جو ہم میں سے بات کو چھپائے یا اسے بلند آواز سے پکارے اور جو رات کو چھپ جائے اور جو دن کو چل رہا ہو۔

رسول کا حکم ماننا خدا کا حکم ماننا ہے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اسْتَجِيْبُوْا لِلّٰهِ وَلِلرَّسُوْلِ وَ اِذَا دَعَاكُمْ لِمَا يُحْيِيْكُمْ (الانفال 24:8)

اے لوگو! جو ایمان لائے ہو اللہ اور رسول کا حکم مانو جب وہ تم کو اس کام کے لیے بلاتا ہے جو تمہیں زندگی دیتا ہے۔

اللہ کا حکم رسول کی وساطت سے ملتا ہے۔ رسول اپنی طرف سے کوئی بات نہیں کہتا۔

حکم صرف اللہ کا ہی ہے۔ رسول کو جو حکم ملتا ہے اس پر عمل کر کے دکھا دیتا ہے اس لیے رسول کا حکم دراصل اللہ کا حکم ہی ہوتا ہے۔ اس لیے رسول کے ماننے سے اللہ کی توحید پر کوئی حرف نہیں آتا۔ رسول کی اطاعت اللہ کی ہی اطاعت ہے کیونکہ رسول تو اللہ تعالیٰ کا نمائندہ ہوتا ہے۔ جب کوئی شخص رسول کی اطاعت اور اس کے حکم کی پیروی کر رہا ہوتا ہے تو وہ گویا اللہ کی اطاعت اور اس کے حکم کی پیروی کر رہا ہے۔ اس لیے قرآن مجید میں اللہ کی نیابت کی وجہ سے رسول کی اطاعت کو اللہ کی اطاعت گردانا ہے۔

یہ راز وہی شخص جانتا ہے جو رسالت اور نبوت کے فلسفہ کو جانتا ہے۔ چونکہ معترض رسالت کے فلسفہ سے نا آشنا ہے اس لیے رسول کے ماننے کو مشرک قرار دے دیا ہے۔ ہم صرف رسول کے حکم کو ہی نہیں مانتے بلکہ معاشرہ میں بہت سے ایسے لوگ بھی ہیں جن کا ہم حکم مانتے ہیں۔ مثلاً استاد، والدین بڑے آدمی وغیرہ کیا ان کا حکم ماننے سے ہم نے ان کو خدا کا شریک ٹھہرا لیا ہے۔ شرک وہ ہے کہ اللہ کے حکم کو چھوڑ کر کسی دوسرے کا حکم مانا جائے یا اللہ کے علاوہ کسی کی عبادت کی جائے یا اللہ کی ذات میں کسی دوسرے کو شریک تسلیم کر لیا جائے۔ جب ہم رسول کا حکم مانتے ہیں وہ حکم رسول کا نہیں ہوتا بلکہ وہ اللہ تعالیٰ کا ہی ہوتا ہے۔ اس لیے رسول کا حکم ماننا گویا اللہ کا حکم ماننا ہے۔ پھر رسول کے حکم ماننے میں روحانی زندگی ہے۔ انسان نیکی کے راستہ پر گامزن ہو جاتا ہے خدا کا قرب حاصل کر لیتا ہے۔ صرف روحانی زندگی ہی حاصل نہیں ہوتی بلکہ مادی زندگی میں بھی انسان ترقی کرتا ہے۔

اللہ اور رسول کی خیانت کا مطلب:

ارشاد الٰہی ہے۔

يَآ اَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَخُوْنُوا اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ وَتَخُوْنُوْٓا اَمٰنٰتِكُمْ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ (الانفال 8:27)

اے لوگو جو ایمان لائے ہو اللہ اور رسول کی خیانت نہ کرو نہ اپنی امانتوں میں خیانت کرو حالانکہ تم جانتے ہو۔

معترض نے زیر اعتراض آیت کا ترجمہ یا مفہوم یہ بیان کیا ہے اللہ کا کون سا خزانہ بھرا ہے جو چرایا جا سکے کیا رسول کی چوری اور امانت میں خیانت کے سوا سب قسم کی چوری روا ہے۔ یہ اعتراض جہالت اور لاعلمی پر مبنی ہے۔ جو مفہوم معترض نے مذکورہ آیت سے لیا ہے وہ مفہوم نکلتا ہی نہیں۔ یہ مفہوم معترض کے ذہن کی اختراع ہے۔ معترض نے خیانت سے مراد روپیہ پیسہ کی چوری مراد لی ہے۔

خدا کی امانت خدا کی تعلیم اور احکام ہیں اللہ اور اس کے رسول کی خیانت سے مراد اللہ اور اس کے رسول کے احکام پر عمل پیرا نہ ہونا ہے۔

اور تَخُوْنُوْٓا اَمٰنٰتِكُمْ سے مراد یہ ہے قوم کی طرف سے جو فرائض کسی ایک شخص پر عائد کئے گئے ہیں ان کو کماحقہ ادا کیا جائے اور ان میں کوتاہی نہ برتی جائے۔ جو شخص اپنے فرائض منصبی کی ادائیگی میں کوتاہی برتتا ہے تو گویا وہ خیانت کا مرتکب ہو رہا ہے۔

اس آیت کریمہ میں اللہ اور اس کے رسول کے احکام پر عمل پیرا ہونے اور اپنے فرائض منصبی کی ادائیگی کی تعلیم دی گئی ہے۔ یہ رکوع اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت سے شروع ہوتا ہے۔

ارشاد الٰہی ہے۔

يَآ اَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَلَا تَوَلَّوْا عَنْهُ وَاَنْتُمْ تَسْمَعُوْنَ (الانفال 8:20)

اے لوگو! جو ایمان لائے ہو اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو۔ اس سے مت پھیرو درانحالیکہ تم سنتے ہو۔

اسی موضوع کو دوسرے الفاظ میں بیان فرمایا ہے کہ اللہ اور اس کے رسول کی خیانت نہ کرو اور اس کے رسول نے مسلمانوں کے پاس کوئی دولت نہیں رکھی تھی کہ ان کو روپیہ پیسہ کی خباثت سے روکا جا رہا ہے رسول اللہ کے احکام لے کر آتا ہے مسلمانوں کو یہ تعلیم دی ہے کہ تم ان احکام پر دل و جان سے پیروی کرو اور جو قوم کی طرف سے کسی پر فرض عائد کیا گیا ہے اس کو کماحقہ ادا کرے کتنی پیاری تعلیم ہے۔ جس کے بجا لانے کے لیے کہا گیا ہے۔ قومیں اطاعت امیر سے ہی ترقی پاتی ہیں اس آیت میں صرف روحانی کامیابی کا گُر ہی نہیں بتایا گیا بلکہ قومی ترقی کی راہ بھی دکھائی گئی ہے۔

اللہ کا مکر:

اس کی وضاحت سیرت سید البشر کے حصہ سوم میں کر دی گئی ہے اعادہ کی ضرورت نہیں۔ صرف اتنا بیان کر دیا جاتا ہے اللہ کے مکر سے مراد دشمنوں کے منصوبوں کو باطل قرار دینا اور ان منصوبہ بازوں کو سزا دینا مراد ہے۔ اللہ صفات حسنہ کا مالک ہے اس کی طرف ایسی صفت بیان کی ہی نہیں جا سکتی جو خدا کی صفات کے منافی ہو۔

☆......☆

مَنْ جَآءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهٗ عَشْرُ اَمْثَالِهَا وَمَنْ جَآءَ بِالسَّيِّئَةِ فَلَا يُجْزٰٓى اِلَّا مِثْلَهَا وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ

(الانعام160:6)

جو کوئی نیکی کرتا ہے تو اس کے لیے دس اس کی مثل ہیں اور جو کوئی بدی کرتا ہے تو اس کی مثل یہ اس کو سزا دی جائے گی اور ان پر ظلم نہیں کیا جائے گا۔ مذکورہ آیت میں نیکی اور بدی کی جزا وسزا کا قانون بیان کیا گیا ہے کہ ہر نیکی کا بدلہ ملتا ہے وہ دس گنا ہے یا اس سے بھی زیادہ انسان کے خلوص اور نیت کے مطابق اور جو بدی کا بدلہ ملتا ہے وہ اس بدی کی مثل ہوتا ہے یا اس سے بھی کم اللہ معاف بھی کر دیتا ہے یہ اللہ کی سنت ہے۔

اگر قرض کے معنی انفاق فی سبیل اللہ (اللہ کی راہ میں خرچ کرنا) قرآن مجید میں بھی اس کی وضاحت موجود ہے۔ ارشاد الٰہی ہے۔

اَلَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ كَمَثَلِ حَبَّةٍ اَنْۢبَتَتْ سَبْعَ سَنَابِلَ فِيْ كُلِّ سُنْۢبُلَةٍ مِّائَةُ حَبَّةٍ وَاللّٰهُ يُضٰعِفُ لِمَنْ يَّشَآءُ (بقرہ261:2)

ان لوگوں کی مثال جو اپنے مالوں کو اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں ایک دانہ کی مثال ہے جو سات بالیں اگائے ایک بالی میں سو دانے ہوں اور اللہ جس کے لیے چاہتا ہے کئی گنا کر دیتا ہے۔

پس مذکورہ بحث سے زیر اعتراض آیت کے معنی واضح ہو جاتے ہیں کہ کون ہے جو اللہ کے حضور (پُر خلوص) نیکی کرے (یا اس کی رضا کی خاطر مال دے) اللہ اس کو بڑھا کر دے گا۔ اللہ لیتا ہے اور بڑھاتا ہے اس کی طرف تم لوٹائے جاؤ گے۔

اس آیت میں لفظ قرض سے مراد ہر نیک عمل ہے جو شخص بھی پُر خلوص نیک سے عمل بجالائے گا۔ اللہ اپنی سنت کے مطابق اس کا گئی گنا زیادہ بدلہ دے گا۔ اللہ کا کئی گنا زیادہ بدلہ دینا اس کا فضل ہے تا کہ اس کا بندہ بڑھ چڑھ کر نیکی کرے۔

دوم قرض کے مراد انفاق فی سبیل اللہ بھی لیا جائے تو اس کے معنی یہ ہوں گے معاشیات کا اصول ہے کہ جس ملک میں جتنی زیادہ دولت کی گردش ہوگی اتنا ہی ملک امیر ہوتا جاتا ہے۔ انفاق فی سبیل اللہ سے دولت کی گردش میں تیزی آتی ہے۔ اس کا ثبوت صحابہ کرام کی زندگیاں ہیں انہوں نے غربت میں بھی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اپیل پر اپنا مال پیش کر دیا۔ اگر کسی کے پاس نہیں تو محنت مزدوری کر کے بھی کار خیر میں حصہ لیا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا۔ وہی لوگ خزانوں کے مالک بن گئے۔ انفاق فی سبیل اللہ قوموں کی ترقی کا ایک سبب ہے۔

معترض نے قوموں کو زندگی دینے والے اصول پر اپنی جہالت سے اعتراض کر دیا ہے اور اس موضوع کو مختلف انداز میں بیان کیا ہے۔ موقع کی مناسبت سے یہ بھی عرض کرتا ہوں۔ مسلمان کے تنزل کی ایک وجہ یہ ہے کہ وہ اللہ کی راہ میں خرچ کرنے سے بخل سے کام لیتے ہیں اللہ تعالیٰ نے اس قوم کو رسوا کر دیا ہے۔

☆......☆

اللہ تعالیٰ نے سب لوگوں کو ایک دین پر جمع کیوں نہیں کیا

اعتراض: خدا چاہتا تو سب کو ایک دین پر جمع کر دیتا سو ایسا کیوں نہیں کیا مذاہب کا خون بہتا دیکھنا اسے خوش ہے شیر بھیڑیا کا جنگ رومیوں کی طرح دیکھتا ہے ٹیلی میکس ایلی میکس آ کر خون بہائے (ترک اسلام 90)

جواب: اللہ کے دین کے دو حصے ہیں فعلی دین اور قولی دین۔

اللہ کا فعلی دین اس کا نظام کائنات ہے۔ کائنات کی تخلیق اللہ تعالیٰ نے انسان کی مادی زندگی کے لئے کی۔ اس کائنات میں ہر وہ چیز پیدا کر دی جو انسان کی زندگی کے لئے ضروری ہے دنیا کے تمام انسان اللہ تعالیٰ کے اس فعلی دین پر ایمان رکھتے ہیں۔ اس دین پر ایمان لانے سے کسی کو فرار نہیں اور اس دین سے باہر نہیں جا سکتا۔ اس دین کا جُوا اس کی گردن پر ہے۔

مثلاً انسان کو پانی کی ضرورت ہے۔ انسان کی پیدائش سے پہلے ہی پانی پیدا کر دیا۔ پیدا ہوتے ہی انسان اپنی ضرورت کو پورا کر لیتا ہے۔ اسی طرح زندگی کی دوسری ضروریات ہیں ان کی تکمیل کے لئے اللہ تعالیٰ نے پہلے ہی سامان مہیا کر رکھا ہے۔ یہ اللہ کا فعلی دین (راستہ) ہے۔ جس کے تمام انسان کاربند ہیں۔ اور ایمان لاتے ہیں۔ دنیا کے کسی خطے کا انسان ہو وہ اللہ کے اس دین پر چلتا نظر آئے گا۔ تمام اس ابدی دین (قانون) کی زنجیر میں جکڑے ہوئے ہیں۔ اس سے کسی کو فرار نہیں دوسرا دین (راستہ) قولی ہے جس کو اسلامی اصطلاح میں شریعت کہا جاتا ہے قولی دین حضرت ادم علیہ السلام پر نازل ہونا شروع ہوا اور حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم پر پایہ تکمیل تک پہنچا۔ کوئی مانے یا نہ مانے یہ ایک حقیقت ہے اللہ تعالیٰ نے احکام شریعت قرآن مجید میں مکمل کر دیئے ہیں۔ کوئی ایسا حکم نہیں جو اس میں نہ پایا جاتا ہو۔ یہ ابدی شریعت ہے انبیاء علیہم السلام پر اترنے والے قولی دین (شریعت۔ راستہ) کے متعلق اللہ تعالیٰ کی یہ حکمت ہے جس کا ذکر قرآن مجید میں کر دیا ہے۔ وَقُلِ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكُمْ فَمَنْ شَآءَ فَلْيُؤْمِنْ وَّمَنْ شَآءَ فَلْيَكْفُرْ (الکھف 29:18) اور کہہ حق تمہارے رب کی طرف سے ہے اور جو کوئی چاہے ایمان لائے اور جو کوئی چاہے انکار کرے۔

اس آیت میں واضح کر دیا ہے اللہ نے دین کو ماننے کا اختیار انسان کو دے دیا ہے چاہے تسلیم کرے چاہے انکار کرے۔ اس بارہ میں کوئی جبر نہیں۔ قرآن مجید میں دوسری جگہ آتا ہے لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ قَدْ تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ (البقرہ 265:2) دین میں کوئی جبر نہیں ہدایت کی راہ گمراہی سے واضح ہو چکی ہے۔

اللہ کے دین کی دونوں فروع اس کائنات و دنیا میں جاری ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے فعلی دین سے انسان کو یہ ہدایت دی ہے کہ جس طرح اللہ کا یہ دین اس کی زندگی کے لئے بہتر ہے اور اس کے بغیر زندہ رہنا ناممکن ہے اس طرح اللہ تعالیٰ کے قولی دین پر عمل کرنا اس کی بھلائی اور فلاح کا موجب ہے۔ اس دین کے ماننے اور نہ ماننے کا اختیار انسان کو دے دیا ہے۔ اس اختیار میں انسان کی جزا و سزا ہے۔ اگر انسان قولی شریعت پر ایمان لاتا ہے اور اس پر عمل پیرا ہوتا ہے تو اس میں اس کے لئے بہتری ہے اگر انکار کرتا ہے تو اس میں اس کے لئے خسران اور گھاٹا ہے۔ یہی انسان کا امتحان ہے اس امتحان میں ہی انسان کی کامیابیوں کا راز مضمر ہے۔ قوموں کی ترقی اور تنزل کا راز دین کے قبول کرنے اور نہ کرنے میں ہے۔ جو قوم ترقی کی راہ پر گامزن ہے وہ اس دین کو قبول کر کے اس پر عمل پیرا ہے جو قوم تنزل کا شکار ہے

شادی سے رزق میں فراخی ہو جاتی ہے (از راہ تمسخر)

اعتراض: غریبی سے مت ڈرو نکاح کرلو۔ خدا ان کو غنی کردے گا اس پر ہنسی کی ہے اور تمسخر سے کام لیا ہے۔ (ترک اسلام اعتراض 104)

جواب: قرآن مجید کی اس آیت پر اعتراض کیا ہے۔

وَانْكِحُوا الْاَيَامٰى مِنْكُمْ وَالصّٰلِحِيْنَ مِنْ عِبَادِكُمْ وَاِمَآئِكُمْ اِنْ يَّكُوْنُوْا فُقَرَآءَ يُغْنِهِمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ (النور 32:24)

اور جو تم میں سے مجرد ہیں ان کے نکاح کر دو۔ اور اپنے غلاموں اور لونڈیوں کے بھی جو صلاحیت رکھتے ہوں۔ اگر وہ محتاج ہوں گے تو اللہ اپنے فضل سے ان کو غنی کر دے گا اور اللہ فراخی والا علم والا ہے۔

اس آیت میں نکاح کی اہمیت بیان کی ہے۔ نکاح ہی بدکاریوں کے انسداد کا ذریعہ ہے۔ اس آیت کریمہ میں اپنے بچی بچوں کی شادی کے علاوہ لونڈی اور غلاموں کو بھی حلقہ زوجیت میں لانے کی تلقین کی ہے۔

شرع اسلام میں غلاموں اور لونڈوں کے لیے گھر میں آنے جانے کی اجازت ہے ان سے پردہ نہیں اگر ان کی شادی نہ کی جائے تو گھر میں بدکاری کا ارتکاب شروع ہو جائے گا۔ تو معاشرہ میں بگاڑ پیدا ہو جائے گا اس لیے اسلام نے عمدہ رنگ میں معاشرتی تعلیم دی ہے کہ ان غلاموں اور لونڈیوں کے نکاح باذن ان کے مالکان کے کر دیئے جائیں۔

رزق کی فراخی:

معترض نے اپنی جہالت اور بے سمجھی کی وجہ سے "اِنْ يَّكُوْنُوْا فُقَرَآءَ يُغْنِهِمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ" پر تمسخر اڑایا ہے۔

اس میں ایک تو تعلیم دی گئی ہے کہ محض غربت اور فقر کی وجہ سے شادی سے گریز نہیں کرنا چاہیے۔

دوم: اس میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ جب دو غریب زوجیت کے بندھن میں آجائیں گے تو وہ لازمی طور پر حصول رزق کے لیے کوشاں ہو جائیں گے اور میاں کے ساتھ بیوی بھی رزق کے حصول کے لیے کوشش کرے گی۔ تو اللہ تعالیٰ رزق کی فراخی کے دروازے کھول دے گا۔

سوم: شادی ہونے کے بعد خاوند احساس ذمہ داری محسوس کرتے ہوئے زیادہ محنت کرتا ہے۔ زیر اعتراض الفاظ آیت میں انسان کی فطرت کا اظہار کیا گیا ہے۔ جب انسان پر ذمہ داری کا بوجھ پڑتا ہے تو وہ زیادہ کوشش اور محنت میں لگ جاتا ہے محنت اور کوشش ہی رزق کو بڑھاتی ہے۔

مذکورہ آیت میں معاشرتی بدکاریوں سے بچنے کا ایک عمدہ علاج بیان کیا ہے وہ ہے نکاح۔ جو قومیں اس تعلیم سے باغی ہیں اور بلوغت پر مرد اور عورت کا نکاح نہیں کرتیں۔ مرد اور عورت کے آزادانہ ملاپ کو برا نہیں سمجھتیں تو معاشرہ میں بگاڑ فساد پیدا ہو جاتا ہے مختلف قسم کی بیماریوں کا شکار ہو جاتا ہے اسلام نے فساد اور بیماریوں سے بچنے کے لیے بالغ مرد اور عورت کے نکاح کو لازمی قرار دیا ہے حتیٰ کہ یہ بھی حکم دیا ہے اگر ان کے پاس غلام اور لونڈیاں بھی ہیں تو ان کی بھی شادی کر دی جائے۔

جو لوگ بیوہ عورت کی شادی کے خلاف ہیں تو وہ بھی اسلام کی تعلیم سے باغی ہیں اور معاشرہ میں بگاڑ کا سبب ہیں۔

خدا کو قرض دینا پھر خدا کا دوگنا دینا

(خدا سود حرام کرے خود دوگنے سود پر قرضہ لے)

اعتراض: خدا کو خوب قرضہ دو وہ دگنا واپس کرے گا۔ خدا سود حرام کرے۔ خود دوگنے سود پر قرضہ لے۔ دکان داروں کو مات کیا ہے۔ پھر حسب عادت بکواس کی ہے۔ (ترک اسلام نمبر 89)

جواب: حسب ذیل آیت پر یہ اعتراض کیا گیا ہے۔

مَنْ ذَا الَّذِیْ یُقْرِضُ اللّٰہَ قَرْضًا حَسَنًا فَیُضٰعِفَهٗ لَهٗ اَضْعَافًا كَثِیْرَةً وَاللّٰہُ یَقْبِضُ وَیَبْصُطُ وَاِلَیْهِ تُرْجَعُوْنَ

(البقرہ 245:2)

کون ہے کہ جو اللہ کے لیے اچھا مال الگ کرے تو وہ اسے اس کے لیے کئی گنا بڑھاتا ہے اور اللہ گھٹاتا اور بڑھاتا ہے اور اسی کی طرف تم لوٹائے جاؤ گے۔

معترض کو لفظ قرض سے یہ غلط فہمی پیدا ہوئی ہے کہ اللہ کو اس رنگ میں روپیہ پیسہ دینا مراد ہے جس طرح اس دنیا میں کسی محتاج آدمی کو ادھار کے طور پر روپیہ پیسہ دیا جاتا ہے۔ پھر وہ سود کے ساتھ واپس کرتا ہے۔

عربی زبان میں قرض کاٹنے یا قطع پر بولا جاتا ہے قرض ہر اس فعل پر بولا جاتا ہے۔ جس کا بدلہ دیا جائے۔ تاج العروس میں ہے جو اصل میں قطع کرنے کو کہتے ہیں اس سے حسب مراتب بہت سے معنی نکلتے ہیں اور جوہری کا قول نقل کیا ہے قرض وہ ہے نیکی سے ہو یا بدی سے جسے تم نے پہلے کیا یعنی جس کا کوئی بدلہ ملنے والا ہے اور لکھا ہے کہ عرب کا محاورہ ہے وہ کہتے ہیں۔

لَكَ عِنْدِیْ قَرْضٌ حَسَنٌ قَرْضٌ سَیِّیٌ

مراد یہ ہوتی ہے کہ تم نے مجھ سے کوئی اچھا یا برا فعل کیا ہے جس کا اچھا یا برا بدلہ تمہیں ملے گا۔

واصل القرض مایعطیه الرجل اویفعل لیجازی علیه

یعنی اصل قرض یہ ہے جو آدمی دے یا کرے تا کہ اسے اس پر بدلہ ملے۔ اس آیت میں لفظ قرض کے معنی ابو اسحاق نے نقل کیے ہیں کہ وہ ہر فعل ہے جس پر جزا چاہی جائے۔ اور اخفش سے یہ کہ اللہ کے حکم کی اتباع اور اسی کی فرمانبرداری میں نیک کام کرے۔ کیونکہ جب کوئی شخص دوسرے کے ساتھ بھلائی کرے تو عرب کے لوگ کہتے ہیں۔

قَدْاَحْسَنْتَ قَرْضِی یَا اَقْرَضْتَنِی قَرْضًا حَسَنًا

اور بیضاوی میں کہ اللہ کا قرض مثال ہے ایسے عمل کے آگے بھیجنے سے جس پر ثواب کی امید ہو اور اسی میں ہے کہ قرض حسنہ مجاہدہ اور انفاق فی سبیل ہے۔

گویا قرض کا لفظ عمل حسنہ اور عمل سیہ پر بولا جاتا ہے۔ دونوں کا بدلہ انسان کو ملتا ہے زیر اعتراض آیت کے معنی یہ ہیں۔ جو شخص بھی نیک عمل بجالائے گا۔ اللہ اس کو اس کا بدلہ اپنی سنت کے مطابق کئی گناہ زیادہ دے گا۔ قرآن مجید میں دوسری جگہ آتا ہے۔

مَنْ جَآءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهٗ عَشْرُ اَمْثَالِهَا وَمَنْ جَآءَ بِالسَّيِّئَةِ فَلَا يُجْزٰى اِلَّا مِثْلَهَا وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ

(الانعام6:160)

جو کوئی نیکی کرتا ہے تو اس کے لیے دس اس کی مثل ہیں اور جو کوئی بدی کرتا ہے تو اس کی مثل یہ اس کو سزا دی جائے گی اور ان پر ظلم نہیں کیا جائے گا۔ مذکورہ آیت میں نیکی اور بدی کی جزا و سزا کا قانون بیان کیا گیا ہے کہ ہر نیکی کا بدلہ ملتا ہے وہ دس گنا ہے یا اس سے بھی زیادہ انسان کے خلوص اور نیت کے مطابق اور جو بدی کا بدلہ ملتا ہے وہ اس بدی کی مثل ہوتا ہے یا اس سے بھی کم اللہ معاف بھی کر دیتا ہے یہ اللہ کی سنت ہے۔

اگر قرض کے معنی انفاق فی سبیل اللہ (اللہ کی راہ میں خرچ کرنا) قرآن مجید میں بھی اس کی وضاحت موجود ہے۔

ارشاد الٰہی ہے۔

اَلَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ كَمَثَلِ حَبَّةٍ اَنْۢبَتَتْ سَبْعَ سَنَابِلَ فِيْ كُلِّ سُنْۢبُلَةٍ مِّائَةُ حَبَّةٍ وَاللّٰهُ يُضٰعِفُ لِمَنْ يَّشَآءُ (بقرہ2:261)

ان لوگوں کی مثال جو اپنے مالوں کو اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں ایک دانہ کی مثال ہے جو سات بالیں اگائے ایک بالی میں سو دانے ہوں اور اللہ جس کے لیے چاہتا ہے کئی گنا کر دیتا ہے۔

پس مذکورہ بحث سے زیر اعتراض آیت کے معنی واضح ہو جاتے ہیں کہ کون ہے جو اللہ کے حضور (پُر خلوص) نیکی کرے (یا اس کی رضا کی خاطر مال دے) اللہ اس کو بڑھا کر دے گا۔ اللہ لیتا ہے اور بڑھاتا ہے اس کی طرف تم لوٹائے جاؤ گے۔

اس آیت میں لفظ قرض سے مراد ہر نیک عمل ہے جو شخص بھی پُر خلوص نیک سے عمل بجا لائے گا۔ اللہ اپنی سنت کے مطابق اس کا کئی گنا زیادہ بدلہ دے گا۔ اللہ کا کئی گنا زیادہ بدلہ دینا اس کا فضل ہے تاکہ اس کا بندہ بڑھ چڑھ کر نیکی کرے۔

دوم قرض کے مراد انفاق فی سبیل اللہ بھی لیا جائے تو اس کے معنی یہ ہوں گے معاشیات کا اصول ہے کہ جس ملک میں جتنی زیادہ دولت کی گردش ہوگی اتنا ہی ملک امیر ہوتا جاتا ہے۔ انفاق فی سبیل اللہ سے دولت کی گردش میں تیزی آتی ہے۔ اس کا ثبوت صحابہ کرام کی زندگیاں ہیں انہوں نے غربت میں بھی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اپیل پر اپنا مال پیش کر دیا۔ اگر کسی کے پاس نہیں تو محنت مزدوری کر کے بھی کار خیر میں حصہ لیا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا۔ وہی لوگ خزانوں کے مالک بن گئے۔ انفاق فی سبیل اللہ قوموں کی ترقی کا ایک سبب ہے۔

معترض نے قوموں کو زندگی دینے والے اصول پر اپنی جہالت سے اعتراض کر دیا ہے اور اس موضوع کو مختلف انداز میں بیان کیا ہے۔ موقع کی مناسبت سے یہ بھی عرض کرتا ہوں۔ مسلمان کے تنزل کی ایک وجہ یہ ہے کہ وہ اللہ کی راہ میں خرچ کرنے سے بخل سے کام لیتے ہیں اللہ تعالیٰ نے اس قوم کو رسوا کر دیا ہے۔

☆......☆

اللہ تعالیٰ نے سب لوگوں کو ایک دین پر جمع کیوں نہیں کیا

اعتراض: خدا چاہتا تو سب کو ایک دین پر جمع کر دیتا سو ایسا کیوں نہیں کیا مذاہب کا خون بہتا دیکھنا اسے خوش ہے شیر بھیڑیا کا جنگ رومیوں کی طرح دیکھتا ہے ٹیلی میکس ایلی میکس آ کر خون بہائے (ترک اسلام 90)

جواب: اللہ کے دین کے دو حصے ہیں فعلی دین اور قولی دین۔

اللہ کا فعلی دین اس کا نظام کائنات ہے۔ کائنات کی تخلیق اللہ تعالیٰ نے انسان کی مادی زندگی کے لئے کی۔ اس کائنات میں ہر وہ چیز پیدا کر دی جو انسان کی زندگی کے لئے ضروری ہے دنیا کے تمام انسان اللہ تعالیٰ کے اس فعلی دین پر ایمان رکھتے ہیں۔ اس دین پر ایمان لانے سے کسی کو فرار نہیں اور اس دین سے باہر نہیں جا سکتا۔ اس دین کا جوا اس کی گردن پر ہے۔

مثلاً انسان کو پانی کی ضرورت ہے۔ انسان کی پیدائش سے پہلے ہی پانی پیدا کر دیا۔ پیدا ہوتے ہی انسان اپنی ضرورت کو پورا کر لیتا ہے۔ اسی طرح زندگی کی دوسری ضروریات ہیں ان کی تکمیل کے لئے اللہ تعالیٰ نے پہلے ہی سامان مہیا کر رکھا ہے۔ یہ اللہ کا فعلی دین (راستہ) ہے۔ جس کے تمام انسان کاربند ہیں۔ اور ایمان لاتے ہیں۔ دنیا کے کسی خطے کا انسان ہو وہ اللہ کے اس دین پر چلتا نظر آئے گا۔ تمام اس ابدی دین (قانون) کی زنجیر میں جکڑے ہوئے ہیں۔ اس سے کسی کو فرار نہیں دوسرا دین (راستہ) قولی ہے جس کو اسلامی اصطلاح میں شریعت کہا جاتا ہے قولی دین حضرت ادم علیہ السلام پر نازل ہونا شروع ہوا اور حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم پر پایہ تکمیل تک پہنچا۔ کوئی مانے یا نہ مانے یہ ایک حقیقت ہے اللہ تعالیٰ نے احکام شریعت قرآن مجید میں مکمل کر دیئے ہیں۔ کوئی ایسا حکم نہیں جو اس میں نہ پایا جاتا ہو۔ یہ ابدی شریعت ہے انبیاء علیہم السلام پر اترنے والے قولی دین (شریعت۔ راستہ) کے متعلق اللہ تعالیٰ کی یہ حکمت ہے جس کا ذکر قرآن مجید میں کر دیا ہے۔ وَقُلِ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكُمْ فَمَنْ شَآءَ فَلْيُؤْمِنْ وَّمَنْ شَآءَ فَلْيَكْفُرْ (الکھف 18:29) اور کہہ حق تمہارے رب کی طرف سے ہے اور جو کوئی چاہے ایمان لائے اور جو کوئی چاہے انکار کرے۔

اس آیت میں واضح کر دیا ہے اللہ نے دین کو ماننے کا اختیار انسان کو دے دیا ہے چاہے تسلیم کرے چاہے انکار کرے۔ اس بارہ میں کوئی جبر نہیں۔ قرآن مجید میں دوسری جگہ آتا ہے لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ قَدْ تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ (البقرہ 2:265) دین میں کوئی جبر نہیں ہدایت کی راہ گمراہی سے واضح ہو چکی ہے۔

اللہ کے دین کی دونوں فروع اس کائنات و دنیا میں جاری ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے فعلی دین سے انسان کو یہ ہدایت دی ہے کہ جس طرح اللہ کا یہ دین اس کی زندگی کے لئے بہتر ہے اور اس کے بغیر زندہ رہنا ناممکن ہے اس طرح اللہ تعالیٰ کے قولی دین پر عمل کرنا اس کی بھلائی اور فلاح کا موجب ہے۔ اس دین کے ماننے اور نہ ماننے کا اختیار انسان کو دے دیا ہے۔ اس اختیار میں انسان کی جزا و سزا ہے۔ اگر انسان قولی شریعت پر ایمان لاتا ہے اور اس پر عمل پیرا ہوتا ہے تو اس میں اس کے لئے بہتری ہے اگر انکار کرتا ہے تو اس میں اس کے لئے خسران اور گھاٹا ہے۔ یہی انسان کا امتحان ہے اس امتحان میں ہی انسان کی کامیابیوں کا راز مضمر ہے۔ قوموں کی ترقی اور تنزل کا راز دین کے قبول کرنے اور نہ کرنے میں ہے۔ جو قوم ترقی کی راہ پر گامزن ہے وہ اس دین کو قبول کر کے اس پر عمل پیرا ہے جو قوم تنزل کا شکار ہے

اس قوم نے دین الٰہی کو رد کر دیا ہوا ہے یہ اللہ کی سنت ہے کہ اس نے اپنے قولی دین پر سب لوگوں کو جمع نہیں کیا۔ اگر سب کو جمع کر دیتا تو پھر حساب کتاب کس چیز کا جزا و سزا کیسی۔ اللہ تعالیٰ نے جزا و سزا اور حساب کتاب کا قانون مقرر کر رکھا ہے۔ اس لئے اس نے انسان کو اختیار دے رکھا ہے کہ وہ چاہے اللہ کے احکام شریعت کو مانے چاہے نہ مانے۔ احکام شریعت پر عمل کرنے سے جزا اور نہ عمل کرنے پر سزا ہے۔

دوسرا جزو:

کیا مذاہب کا خون بہتا دیکھنا اسے خوش ہے؟ اللہ تعالیٰ نے انسان کو پیدا کیا دو نعمتیں عطا کیں۔ ایک عقل اور دوسرے احکام شریعت۔ احکام شریعت نے انسان کے لئے حقوق وفرائض مقرر کر دیئے ہیں۔ اگر انسان ان حقوق وفرائض پر کاربند ہے اور پورا پورا عمل کرتا ہے تو معاشرہ میں امن ہوگا۔ اگر انسان ان احکام کو پس پشت ڈال دیتا ہے تو فساد اور بگاڑ پیدا ہوگا۔

جزا و سزا اسی میں ہے۔ انسان کو عقل سے بھی نوازا ہے وہ سوچ سمجھ کر احکام شریعت پر عمل کرے۔ اللہ تعالیٰ نے دونوں رستوں (امن اور فساد) سے آگاہ کر دیا ہے۔ اب اختیار انسان کو ہے کہ وہ کون سا راستہ اختیار کرتا ہے۔ دنیا میں جو ترقی ہو رہی ہے وہ اس اختیار کی وجہ سے ہے اگر انسان مختار نہ ہوتا۔ تو انسان اور حیوان میں کوئی تمیز نہ ہوتی۔ انسان مختار ہونے کی وجہ سے ہی حیوانوں سے ممتاز ہے معترضین کو اللہ تعالیٰ کی اس حکمت کو جاننا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو مختار پیدا کیا ہے۔ یہی اختیار انسان کو حیوان سے ممتاز کرتا ہے۔ پھر اسی اختیار کی وجہ سے اشرف المخلوقات ہے اسی اختیار کی وجہ سے دنیا میں رونق اور حسن پایا جاتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے دنیا میں خون بہانا اور کسی کی جان لینا حرام قرار دیا ہے ارشاد الٰہی ہے مَنْ قَتَلَ نَفْسًا بِغَيْرِ نَفْسٍ اَوْ فَسَادٍ فِى الْاَرْضِ فَكَاَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيْعًا وَمَنْ اَحْيَاهَا فَكَاَنَّمَا اَحْيَا النَّاسَ جَمِيْعًا (المائدہ 32:5)

کہ جو کوئی کسی جان کو بغیر جان کے (بدلہ کے) یا زمین میں فساد کر کے مار ڈالے۔ تو گویا اس نے سب لوگوں کو مار ڈالا۔ اور جو کوئی اس کو زندہ رکھے تو گویا اس نے سب لوگوں کو زندہ رکھا۔

اس آیت میں قیام امن کا پیغام ہے کہ دنیا میں قتل اور فساد کو حرام قرار دیا ہے صرف قتل اور فساد حرام ہی قرار نہیں دیا بلکہ جو شخص قتل اور فساد کا موجب بنتا ہے اللہ تعالیٰ نے اس کی سخت سزا مقرر کی ہے تاکہ زمین میں امن قائم ہو۔ ارشاد الٰہی ہے اِنَّمَا جَزٰٓؤُا الَّذِيْنَ يُحَارِبُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَيَسْعَوْنَ فِى الْاَرْضِ فَسَادًا اَنْ يُّقَتَّلُوْٓا اَوْ يُصَلَّبُوْٓا اَوْ تُقَطَّعَ اَيْدِيْهِمْ وَاَرْجُلُهُمْ مِّنْ خِلَافٍ اَوْ يُنْفَوْا مِنَ الْاَرْضِ (المائدہ 33.5) ان کی سزا جو اللہ اور اس کے رسول کے ساتھ جنگ کرتے ہیں اور ملک میں فساد پھیلانے کی کوشش کرتے ہیں صرف یہی ہے کہ وہ قتل کئے جائیں یا صلیب پر مار دیے جائیں یا ان کے ہاتھ اور پاؤں مخالف اطراف سے کاٹے جائیں یا ان کو قید کیا جائے۔

اس آیت میں خون بہانے اور زمین میں فساد برپا کرنے والوں کی سزاؤں کا ذکر کیا ہے چاروں قسم کی سزائیں (قتل، صلیب ہاتھ پاؤں کاٹنا اور قید) جرم کی چار نوعیتوں کے لحاظ سے ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام نے خون بہانے کو کتنا ناپسند کیا ہے۔

دوسری جگہ آتا ہے وَلَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِىْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ (بنی اسرائیل 33:17) اور بغیر حق وانصاف کے کسی کی جان نہ لی جائے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع کے موقع پر فرمایا اِنَّ دِمَآءَكُمْ وَاَمْوَالَكُمْ وَاَعْرَاضَكُمْ حَرَامٌ كَحُرْمَةِ يَوْمِكُمْ هٰذَا (بخاری کتاب الحج) تمہاری جانیں اور تمہارے مال اور تمہاری ابروئیں ویسی ہی حرمت رکھتی ہیں جیسے آج کے دن کی حرمت ہے (یعنی حج کے دن کی)

پس اسلام اور اس کا خدا قتل وغارت کو ایک سنگین جرم قرار دیتا ہے۔

☆......☆

توبہ، عفو اور شفاعت گناہ کے بخشش کا ذریعہ نہیں بلکہ کرم تھیوری ہے

اعتراض: خدا شرک کے سوا باقی تمام گناہ معاف کر دیتا ہے افسوس ہے کہ کرم تھیوری کو چھوڑ کر توبہ، عفو اور شفاعت کے مسئلے گھڑے گئے۔ (ترک اسلام 92)

جواب: اسلام توحید کا مذہب ہے۔ یہی اسلام کی امتیازی خصوصیت ہے اس میں کوئی شک وشبہ نہیں کہ اسلام نے شرک کو ایسا گناہ قرار دیا ہے جو نا قابل معافی ہے اس وجہ سے اس کو ظلم عظیم قرار دیا ہے ارشاد والٰہی ہے۔

اِنَّ اللّٰہَ لَایَغْفِرُ اَنْ یُّشْرَكَ بِہٖ وَیَغْفِرُ مَادُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ یَّشَآءُ (النساء 48:4) اللہ نہیں بخشا کہ اس کے ساتھ شریک بنایا جائے اور جو اس کے علاوہ ہے وہ جسے چاہتا ہے بخش دیتا ہے۔

فرمایا اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِیْمٌ (لقمان 13:13) شرک بہت بڑا ظلم ہے۔

اسلام نے توحید کے تمام پہلوؤں کو اجاگر کر کے شرک کی تمام اقسام کا رد کیا ہے سیرت سید البشر کے حصہ دوم کے باب ایمانیات کے ذیلی عنوان ایمان باللہ کے تحت توحید اور شرک پر مفصل بحث کی گئی ہے اسی طرح چوتھے حصہ میں بھی مختلف مقامات پر توحید اور شرک پر بحث کی جا چکی ہے۔

شرک کیوں نا قابل معافی گناہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کی پیدائش کے قبل اس کی مادی زندگی کی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے ہر قسم کا سامان پیدا کر دیا پھر اس کی ہدایت کے لئے انبیاء علیہم السلام کا سلسلہ جاری کیا۔ پھر اس کو یہ فضیلت دی کہ اس کو اپنا خلیفہ بنایا۔ انسان اللہ تعالیٰ کا خلیفہ ہے۔ خلیفہ وہ ہوتا ہے جو اپنے مالک اور آقا کے احکام پر عمل کرے۔ اور عمل کرائے۔ اب اگر ایک انسان خدا کی ذات صفات میں کسی دوسرے کو شریک کر لیتا ہے اور اللہ کے احکام کو پس پشت ڈال دیتا ہے۔ تو وہ خدا کا باغی تصور کیا جائے گا۔ دنیا کا ہر شخص جانتا ہے کہ بغاوت کتنا بڑا جرم ہے۔ کوئی حکمران باغی کو معاف نہیں کرتا۔ کیونکہ بغاوت سے بگاڑ اور فساد برپا ہوتا ہے۔

اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے شرک کو ظلم عظیم قرار دیا ہے یعنی یہ وہ جرم ہے جو نا قابل معافی ہے۔ چونکہ مشرک اللہ کا باغی ہے اور اس کی حکمرانی میں دوسروں کو شریک کر رہا ہے اس وجہ سے یہ جرم نا قابل معافی ہے۔

اگر مشرک شرک کی حالت میں مرگیا ہے تو اللہ اس کی بغاوت کی وجہ سے اس کو سزا دے گا۔ اگر اس نے مرنے سے پہلے اپنے شرک توبہ قبول کرنا اللہ تعالیٰ کی صفات حسنہ ہیں۔ اسلام کفارہ، تناسخ اس قسم کے باطل عقائد کو ذریعہ نجات قرار نہیں دیتا۔ بلکہ نجات (مکمل) اللہ تعالیٰ کے فضل سے ہے۔ ایمان اور اعمال حسنہ اللہ کے فضل کو جذب کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے رحم وکرم کی وجہ سے توبہ استغفار کو گناہوں کی معافی کا ذریعہ قرار دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت محمد مصطفٰے صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے انسانوں کو یہ بتایا۔ کہ اللہ تعالیٰ توبہ کرنے والے انسان کے گناہ بخش دیتا ہے۔ کتنی آسان اور عمدہ تعلیم ہے کہ انسان کی ندامت ہی گناہوں کی سیاہی کو دھو دیتی ہے۔ انصاف کا تقاضا ہے کہ ایک شخص اپنے گناہوں سے الگ ہو جائے تو اس کو بری کر دیا جائے۔

عفو، توبہ اور مغفرت اور شفاعت پر بحث گزر چکی ہے اعادہ کی ضرورت نہیں قارئین مذکورہ بحثوں کو سامنے رکھیں۔ کرم تھیوری ایک لغو نظریہ ہے جو اللہ تعالیٰ کی صفات کے منافی ہے۔ اسلام نے گناہوں کی معافی کے جو طریقے بیان کئے ہیں وہی عین فطرت کے مطابق ہیں۔

☆

رسول کریم ﷺ نے کوئی معجزہ نہیں دکھایا

اعتراض: محمد (ﷺ) کو کبھی بھی کوئی معجزہ نہ ملا۔ جیسا کہ عنکبوت میں درج ہے (ترجمہ عربی کا) اور کہتے ہیں کیوں نہ اتریں اس پر کچھ نشانیاں (یعنی کوئی ایک بھی کیونکہ لا نافیہ اس آیت میں جو کہ جنس پر داخل ہے کل جنس کی نفی کرتا ہے) اس کے رب کے سے اور سورۃ بنی اسرائیل میں بھی اور ہم نے موقوف کیں نشانیاں بھیجنی کہ اگلوں نے ان کو جھٹلایا اس سے صاف ظاہر ہے خدا نے کوئی معجزہ نہیں دیا حقیقت میں اگر کوئی ایک معجزہ ملتا تو وہ نبوت اور قرآن پر متشکی نہ ہوتے (مئی 1889 میں مشہور عیسائی مبلغ عبداللہ جمیز نے انجمن حمایت اسلام لاہور کو تین اہم سوال بھیجے یہ سوال نمبر 3 ہے)

جواب: جن دو آیات سے معترض نے اپنا اعتراض اخذ کیا ہے وہ حسب ذیل ہیں۔

1۔ وَقَالُوا لَوْ لَا اُنْزِلَ عَلَیْہِ اٰیٰتٌ مِّنْ رَّبِّہٖ قُلْ اِنَّمَا الْاٰیٰتُ عِنْدَ اللّٰہِ وَاِنَّمَآ اَنَا نَذِیْرٌ مُّبِیْنٌ اَوَلَمْ یَکْفِھِمْ اَنَّآ اَنْزَلْنَا عَلَیْکَ الْکِتٰبَ یُتْلٰی عَلَیْھِمْ اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَرَحْمَۃً وَّ ذِکْرٰی لِقَوْمٍ یُّؤْمِنُوْنَ .... وَیَسْتَعْجِلُوْنَکَ بِالْعَذَابِ وَلَوْلَآ اَجَلٌ مُّسَمًّی لَّجَآءَھُمُ الْعَذَابُ وَلَیَاْتِیَنَّھُمْ بَغْتَۃً وَّھُمْ لَا یَشْعُرُوْنَ (العنکبوت 29: 53،51،50) اور کہتے ہیں اس پر اپنے رب کی طرف سے نشان کیوں نہ اتارے گئے کہہ نشان صرف اللہ کے پاس ہیں اور میں صرف کھلم کھلا ڈارنے والا ہوں کیا ان کے لئے یہ کافی نہیں کہ ہم نے تیری طرف کتاب اتاری ہے جو ان پر پڑھی جاتی ہے۔ یقیناً اس میں ان لوگوں کے لئے رحمت اور نصیحت ہے جو ایمان لاتے ہیں .... اور تجھ سے عذاب کے لئے جلد کررہے ہیں اور وہ ان پر اچانک آجائے گا اور انہیں خبر (بھی) نہ ہوگی۔

وَمَا مَنَعَنَآ اَنْ نُّرْسِلَ بِالْاٰیٰتِ اِلَّآ اَنْ کَذَّبَ بِھَا الْاَوَّلُوْنَ وَاٰتَیْنَا ثَمُوْدَ النَّاقَۃَ مُبْصِرَۃً فَظَلَمُوْا بِھَا وَمَا نُرْسِلُ بِالْاٰیٰتِ اِلَّا تَخْوِیْفًا (بنی اسرائیل 17:59) اور ہمیں کسی چیز نے نہیں روکا کہ نشان بھیجتے رہیں مگر یہ ہوا کہ پہلے انہیں جھٹلاتے رہے اور ہم نے ثمود کو اونٹنی روشن (نشان کے طور پر) دی اور انہوں نے اس پر ظلم کیا اور ہم نشان صرف ڈرانے کو بھیجتے ہیں۔

آیات کی وضاحت:

العنکبوت کی آیات 53،51،50 میں کہیں بھی معجزات کا انکار نہیں پایا جاتا ان آیات میں یہ بتایا گیا ہے کہ کفار نے عذاب کا نشان مانگا تھا انہیں یہ بتایا کہ تم میں ایک معجزہ آیا ہوا ہے وہ ہے قرآن مجید وہ تمہیں ہلاک نہیں کرتا بلکہ مردہ دلوں کو زندہ کرتا ہے۔ گمراہوں کو سیدھی راہ دکھاتا ہے۔ اور راہ ہدایت پر چلا کر منزل مقصود تک پہنچاتا ہے۔ وہ انسانوں کے لئے مکمل ضابطہ حیات ہے یہ قرآن مجید اپنی فصاحت وبلاغت اور قوت تاثیر کے لحاظ سے ایک معجزہ ہے یہ رحمت کا نشان ہے۔ اس قرآن سے فائدہ اٹھا ہیں۔ اور روحانی زندگی پائیں۔ اگر تم عذاب کا نشان ہی مانگتے ہو تو یاد رکھو وہ بھی جلد آجائے گا۔ ان آیات میں عذاب کے نشان کا وعدہ دیا گیا ہے اور قرآن مجید جو دلوں پر خارق عادت اثر ڈالنے والا اور رحمت الٰہی کا موجب ہے کی طرف توجہ دلائی ہے کہیں بھی معجزہ کا انکار نہیں کیا گیا۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے صرف یہ کہا ہے کہ وہ تو صرف ڈرانے والے ہیں۔ عذاب کا نشان بھیجنا اللہ کا کام ہے وہ اپنی سنت کے مطابق جب چاہے عذاب کا

نشان بھیج دیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے عذاب کا نشان بھیجنے کا وعدہ کیا ہے وہ وقت مقرر پر آ جائے گا۔ عذاب بھیجنے میں کسی انسان کا عمل دخل نہیں ہوتا۔ اللہ اپنی حکمت سے جب چاہے عذاب کا نشان بھیج دیتا ہے۔ قرآن مجید کے اولین مخاطب عرب کفار نے بھی یہ کبھی اعتراض نہیں کہا تھا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو کوئی معجزہ نہیں دیا گیا۔ بلکہ جب رسول کریم ﷺ کوئی نشان (اعجاز) دکھاتے تو کفار نشان دیکھ کر آپ ﷺ کو ساحر کہہ دیتے یہ تو جادوگر ہے۔ یعنی کفار نشان کو جادوگری قرار دیتے۔ ارشاد الٰہی ہے۔

وَاِنْ یَّرَوْا اٰیَةً یُّعْرِضُوْا وَیَقُوْلُوْا سِحْرٌ مُّسْتَمِرٌّ (القمر 2:54) اور اگر کوئی نشان دیکھیں تو منہ پھیر لیتے ہیں اور کہتے ہیں زبردست جادوگر ہے۔

یہ آیت ظاہر کرتی ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کفار کو نشان (معجزات) دکھاتے تھے۔ اس وجہ سے کفار آپ ﷺ کو ان نشانات کی وجہ سے ساحر پکارتے تھے۔ پھر وہی کافر تھے۔ جنہوں نے ان نشانات (معجزات) کی وجہ سے مان لیا۔ لہذا العنکبوت کی زیر اعتراض آیت سے یہ اخذ نہیں کیا جا سکتا کہ آپ ﷺ کو کوئی معجزہ نہیں ملا۔ آیت 51 میں ایک دائمی معجزہ کا ذکر ہے۔ یعنی قرآن مجید کا۔ جس کا اعجاز یہ ہے کہ وہ مردہ دلوں کو زندہ کرتا ہے۔ اور آیت 53 میں عذاب کے نشان کا وعدہ دیا گیا ہے۔ معترض نے آیت میں لاؔ کو لاؔ نفی جنس قرار دے کر یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے یہ لاؔ ہر قسم کے معجزات کی نفی کرتا ہے یہ بھی محض صرف ونحو سے ناواقفیت کی وجہ سے ہے۔ مثلاً کوئی یہ کہے اب سردی کا نام ونشان نہیں۔ تو اس سے مراد صرف متکلم کا اپنا علاقہ ہے جس علاقہ میں وہ رہ رہا ہے اس میں سردی ختم ہو گئی ہے اس سے یہ مراد نہیں کہ دنیا کے دوسرے خطے جہاں سخت سردی پڑتی ہے وہاں سے بھی سردی ختم ہو گی۔ نفی کا اثر اس حد تک محدود ہے جہاں تک متکلم کے ذہن میں متعین ہے خواہ وہ صریحاً بیان کرے یا اشارۃً لہذا زیر اعتراض آیت میں لا نفی جنس نہیں۔ اس آیت میں مخصوص قسم کے نشانات مراد ہیں جو کفار طلب کرتے تھے" الایات" میں "الف لام" ظاہر کرتا ہے وہ مخصوص نشانات تھے جو کفار طلب کرتے تھے۔ مثلاً کفار کہتے تھے کہ تو ایک زینہ کے ذریعے آسمان پر چڑھ جائے۔ اور وہاں سے ایسی کتاب لائے جس کو پڑھیں یا ایسا کر مکہ میں جہاں ہمیشہ پانی کی قلت کی تکلیف رہتی ہے شام اور عراق کے ملک کی طرح نہریں جاری ہوں۔ اور جس قدر آج تک ہمارے بزرگ مر چکے ہیں سب زندہ ہو کر آ جائیں۔ اور اس میں قصی بن کلاب بھی ہو۔ کیونکہ وہ بڈھا سچ بولتا تھا اس سے پوچھیں گے کہ تیرا دعویٰ سچا ہے یا جھوٹا اس قسم کے خود تراشیدہ نشان طلب کرتے۔ ہر دور میں مخالفین نے اپنے دور کے نبی سے خود تراشیدہ نشان طلب کئے تھے لیکن اللہ تعالیٰ نے ان خود تراشیدہ نشان کو پورا نہیں کیا۔ اللہ تعالیٰ کی سنت کے خلاف ہے۔ اللہ نشان دکھاتا ہے لیکن اپنی حکمت کے تحت۔ آیت کریمہ میں اس قسم کے خود تراشیدہ نشان کی نفی کی گئی ہے لہذا زیر اعتراض آیت میں لا نفی جنس نہیں بلکہ کفار کے مخصوص خود تراشیدہ نشان کی نفی کی گئی ہے۔

اب بنی اسرائیل کی آیت 59 کی وضاحت کی جاتی ہے اس میں بھی معترض نے سیاق وسباق سے الگ کر کے اعتراض کیا ہے۔

معجزات (نشان۔ آیت) دو قسم کے ہوتے ہیں۔ نشان تخویف وتعذیب دوسرا نشان تبشیر۔ نشان تخویف کافروں اور نافرمانوں کے لئے ظاہر کئے جاتے ہیں۔ تاکہ ان نشانوں کو دیکھ کر راہ ہدایت پر آ جائیں۔ اور نشان تبشیر مومنوں کے لئے ظہور پذیر ہوتے ہیں تاکہ وہ اللہ کے راستہ میں ترقی کریں اور روحانی نعماء سے لطف اٹھائیں اور ان کے قلوب اللہ کی محبت سے لبریز ہو جائیں۔ یہ نشان مومنوں کے لئے باعث سکینت اور اطمینان ہوتے ہیں۔ قرآن مجید کے احکام پر عمل پیرا ہونے والے ہمیشہ ان نشانوں سے وافر حصہ پاتے ہیں۔

ہے لَهُمُ الْبُشْرٰى فِى الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِى الْاٰخِرَةِ لَا تَبْدِيْلَ لِكَلِمٰتِ اللّٰهِ ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ (یونس 64:10) ان کے دنیا کی زندگی میں اور آخرت میں خوش خبری ہے اللہ کی باتیں (قانون) بدل نہیں سکتیں یہ بڑی بھاری کامیابی ہے مومنین کے لئے یہی وہ ارفع مقام ہے جس کو قرآن مجید نے فوز عظیم قرار دیا ہے۔ معترض نے تو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق یہ کہا ہے کہ آپ ﷺ کو کوئی معجزہ

نہیں ملا۔قرآن مجید رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی کرنے والوں کے متعلق یہ ارشاد فرماتا ہے کہ ان کے ہاتھوں پر نشان (معجزات) ظاہر ہوں گے۔تاریخ بتاتی ہے کہ رسول کریم ﷺ کے کامل متبعین نے معجزات دکھائے۔

زیر اعتراض آیت میں صرف تخویف کے نشانوں کا ذکر ہے وَمَا نُرْسِلُ بِالْاٰيٰتِ اِلَّا تَخْوِيْفًا (کہ ہم نشان صرف ڈرانے کو بھیجتے ہیں) سے ظاہر ہے اس آیت میں کل نشانوں کو قہری نشانوں میں محصور کیا گیا ہے اس آیت کے یہ معنی کرنا کہ تمام نشانوں کو محض تخویف کی غرض سے بھیجا جاتا تھا دوسری اور کوئی غرض نہیں ہوتی تھی۔یہ معنی بالبداہت غلط اور باطل ہیں جیسا کہ پہلے ذکر کیا جا چکا ہے نشان بھیجنے کے دو مقاصد ہوتے ہیں۔تخویف اور تبشیر۔مذکورہ آیت میں صرف تخویفی نشان مراد ہیں۔

اب دوسرا امر تنقیح طلب باقی رہا۔کہ کیا اس آیت (59) میں یہ معنی سمجھنے جائیں۔کہ اللہ تعالیٰ نے رسول کریم ﷺ کے ہاتھ پر تخویف کا کوئی نشان ظاہر نہیں کیا۔یا یہ معنی سمجھنے جاہیں کہ تخویف کے نشانوں میں سے صرف وہ نشان ظاہر نہیں کیے جو پہلی امتوں کو دکھلائے گئے یا تیسرے یہ معنی سمجھے جائیں۔دونوں قسم کے تبشیری اور تخویفی نشان رسول کریم ﷺ کے ہاتھ پر ظاہر ہوتے رہے بجز ان خاص قسم کے بعض نشان کے جن کو پہلی امتوں نے دیکھ کر جھٹلایا تھا۔اور ان کو معجزہ تصور نہیں کیا تھا سو زیر اعتراض آیات پر نظر ڈالنے سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ پہلے اور دوسرے معنی صحیح نہیں۔لہٰذا اس آیت کے یہی معنی صحیح ہوں گے کہ جو بعض نشانات پہلے کفار دیکھ چکے تھے اور ان کو جھٹلا چکے تھے ان کا دوبارہ بھیجنا عبث اور بے سود سمجھا گیا اور قرینہ بھی موجود ہے کہ اس موقعہ پر ناقہ ثمود کا بھی ذکر کیا ہے یہ ذکر ایک واضح قرینہ ہے کہ اس جگہ گذشتہ اور رد کردہ معجزات کا ذکر ہے جو تخویف کے نشانوں میں سے تھے۔یہی تیسرے معنی صحیح اور درست ہیں۔

قارئین اس آیت پر غور کریں وَمَا مَنَعَنَا اَنْ نُّرْسِلَ بِالْاٰيٰتِ الخ سے ثبوت معجزات پایا جاتا ہے نہ کہ نفی معجزات کیونکہ اَلْاٰيٰت کے لفظ پر جو الف لام واقع ہے وہ بموجب قواعد نحو یہ واضح ہوتا ہے کہ وہ بعض خاص نشان مراد ہیں جن کو اگلوں نے جھٹلایا تھا۔

صرف ان نشانوں کی نفی کی گئی ہے جو پہلی امتوں کی طرف بھیجے گئے تھے اور وہ قومیں تکذیب کر چکی تھیں ان کا بھیجنا اب عبث اور بے سود تھا۔

گویا اس آیت میں مخصوص پہلے بھیجے ہوئے اور رد کیے ہوئے تخویفی نشانات کی نفی کی گئی ہے نہ کہ کل نشانات کی۔نفی کا حرف صرف نشانوں کی ایک خاص قسم کی نفی کرتا ہے۔کفار کو یہ بتایا گیا ہے کہ تخویفی نشان کی ایک خاص قسم کی نفی کرتا ہے۔کفار کو یہ بتایا گیا ہے کہ تخویفی نشان ضرور نازل ہوں گے مگر ان کی ماہیت اور نوعیت دوسری ہوگی اس کی کیا ضرورت ہے کہ وہی نشان دکھائے جائیں جو پہلے انبیاء علیہم السلام کو دکھائے گئے۔ان آیات کی وضاحت دوسری آیات میں کر دی گئی ہے۔ارشاد الٰہی ہے وَاِنْ يَّرَوْا كُلَّ اٰيَةٍ لَّا يُؤْمِنُوْا بِهَا حَتّٰٓى اِذَا جَآءُوْكَ يُجَادِلُوْنَكَ يَقُوْلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِنْ هٰذَآ اِلَّآ اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ (الانعام 25:6) اور اگر سارے نشان بھی دیکھ لیں تو ان پر ایمان نہیں لائیں گے یہاں تک کہ جب تیرے پاس آتے ہیں تجھ سے جھگڑتے ہیں جو کافر ہیں کہتے ہیں یہ کچھ نہیں مگر پہلوں کی کہانیاں ہیں۔

دوسری جگہ آتا ہے قَدْ جَآءَكُمْ بَصَآئِرُ مِنْ رَّبِّكُمْ فَمَنْ اَبْصَرَ فَلِنَفْسِهٖ وَمَنْ عَمِيَ فَعَلَيْهَا وَمَآ اَنَا عَلَيْكُمْ بِحَفِيْظٍ (الانعام 104:6) تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے روشن (دلیلیں (نشان) آ چکی ہیں سو کوئی دیکھتا ہے تو وہ اپنی جان کی (بھلائی) کے لئے ہے اور جو اندھا رہا اس پر (وبال) ہے اور میں تم پر نگہبان نہیں۔

سَنُرِيْهِمْ اٰيٰتِنَا فِي الْاٰفَاقِ وَفِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَهُمْ اَنَّهُ الْحَقُّ (الشوری 53:41) ہم انہیں اپنی نشانیاں اطراف میں اور ان کی جانوں میں دکھائیں گے۔یہاں تک کہ ان کے لئے کھل جائے کہ وہ حق ہے۔

یہ آیات ظاہر کر رہی ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے رسول کریم ﷺ کے ہاتھ پر نشانات (آیات) ظاہر کیے۔اور زیر اعتراض آیات میں

صرف مخصوص نشانات کی نفی کی گئی ہے نہ کہ ہر قسم کے نشانات کی۔ جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کا مطالعہ کیا جائے۔ تو صحابہ کی شہادتوں سے تقریباً تین ہزار معجزات کا پتہ چلتا ہے اور پیشگوئیاں تو دس ہزار سے بھی زائد ہوں گی جو اپنے اپنے وقتوں پر پوری ہوئیں۔ قرآن مجید میں ایسی بھی ہیں۔ جو مستقبل میں اپنے اپنے وقت پر پوری ہوں گی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کا ہر لمحہ اپنے اندر ایک نشان رکھتا تھا۔ افسوس ان لوگوں پر ہے جو اس زندہ نبی کو جھٹلاتے ہیں۔ رسول کریم ﷺ کا سب سے بڑا معجزہ تو قرآن مجید ہے جو اپنی تعلیم اور فصاحت و بلاغت کے لحاظ سے بے مثل کتاب ہے۔ اس کتاب کا سب سے بڑا اعجاز یہ ہے کہ جو شخص سچے دل سے اس پر ایمان لاتا ہے۔ اس کا مردہ دل زندہ ہو جاتا ہے۔ بدکرداری اور بداخلاقی کی راہ ترک کر کے نیکی کے راستے پر گامزن ہو جاتا ہے۔ دن رات اس پر فرشتے نازل ہوتے ہیں۔ صحابہ کرام کی مثال ہمارے سامنے ہے کہ وہ مردہ قوم قرآن مجید کی تاثیر سے کس طرح زندہ ہوئی۔ اور کس طرح اس نے ترقی کی راہ میں قدم مارے۔ صرف روحانی زندگی میں ہی نہیں بلکہ مادی ترقی میں بھی یہ عرب قوم بے مثل ثابت ہوئی۔ عرب سے نکل کر تمام معمورہ دنیا پر چھا گئی۔ یہ قرآن مجید کی تاثیر کا نتیجہ تھا۔ پھر اللہ تعالیٰ نے رسول کریم ﷺ پر غیب کے دروازے کھولے۔ اپنی صفت علام الغیوب کے تحت رسول کریم ﷺ کو غیب کا علم دیا۔ اور آپؐ نے پیشگوئیاں کیں وہ ہر دور میں پوری ہو رہی ہیں۔ انہی پیشگوئیاں میں سے فرعون کی لاش کی حفاظت کی پیشگوئی قرآن مجید میں پائی جاتی ہے۔ الغرض معجزات ایک مستقل اور طویل موضوع ہے علماء کرام نے اس موضوع پر سیر حاصل بحث کی ہے سیرت النبی مصنفہ شبلی نعمانی و سلیمان ندوی میں ایک پوری جلد اسی موضوع پر ہے الغرض ہر سیرت بنوی پر پر لکھنے والا کم و پیش اس موضوع پر بحث کرتا ہے خاکسار نے بھی سیرت سید البشر حصہ اول میں بحث کی ہے۔ معجزات اور نبی کریم ﷺ کی ذات مقدسہ لازم و ملزوم ہیں۔ معترض نے محض لاعلمی اور جہالت سے رسول کریم ﷺ کے معجزات سے انکار کیا ہے۔ آنکھ پر پٹی باندھ کر انکار کرنے کا علاج کسی کے پاس نہیں۔

......☆......

اسلام کا خدا اور پیغمبر لڑاکے اور لٹیرے ہیں

اعتراض ایسا اندھا دھند لڑنے والا اور امن میں خلل ڈالنے والا سوائے محمدی خدا کے اور کون ہو سکتا ہے؟ کیا رسول اور خدا کے نام پر اور مذہب کی آڑ میں دنیا کو لوٹنا اور لٹوانا لیٹروں کا کام نہیں؟ اور کیا خدا بھی ڈاکو ہے کہ لوٹ کے مال کا حصہ دار بنے گا کیا خدا کا لیٹروں کا مددگار بننا اس کی خدائی پر بٹہ نہیں ہے؟ نامعلوم ایسا کلام اللہ خدا اور پیغمبر جہان میں فساد ڈلوانے' امن عامہ میں رخنہ انداز بن کر لوگوں کو آزار دینے کے لئے کہاں سے رونق افروز ہوئے ہیں کاش کہ ایسے مذہب کا ظہور صفحہ ہستی پر نہ ہوتا تا کہ کل خلق خدا آرام سے زندگی بسر کرتی (سیتارتھ پرکاش اعتراض نمبر 79)

جواب: یہ اعتراض قرآن مجید کی ان آیات کو سامنے رکھ کر کیا گیا ہے۔ وَقَاتِلُوهُمْ حَتَّى لَا تَكُونَ فِتْنَةٌ وَيَكُونَ الدِّينُ كُلُّهُ لِلَّهِ فَإِنِ انتَهَوْا فَإِنَّ اللَّهَ بِمَا يَعْمَلُونَ بَصِيرٌ وَإِن تَوَلَّوْا فَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ مَوْلَاكُمْ نِعْمَ الْمَوْلَىٰ وَنِعْمَ النَّصِيرُ وَاعْلَمُوا أَنَّمَا غَنِمْتُم مِّن

شَیْءٍ فَاَنَّ لِلّٰہِ خُمُسَہٗ وَلِلرَّسُوْلِ وَلِذِی الْقُرْبٰی وَالْیَتٰمٰی وَالْمَسٰکِیْنِ وَابْنِ السَّبِیْلِ (انفال 8:39:41)
اوران کے ساتھ جنگ کرو۔ یہاں تک کہ (دین کے لئے) دکھ دینا نہ رہے اور دین سب کے سب اللہ کے لئے ہوں پھر اگر وہ رک جائیں تو اللہ اس کو دیکھ رہا ہے جو وہ کرتے ہیں اگر وہ پھر جائیں تو جان لو کہ اللہ تمہارا مولا ہے کیا ہی اچھا مولیٰ اور کیا ہی اچھا مددگار ہے۔ اور جان لو کہ کوئی چیز تم فتح پا کر حاصل کرو۔ تو اس کا پانچواں حصہ اللہ کے لئے ہے۔ اور رسول کے لئے اور قریبیوں کے لئے اور یتیموں اور مسکینوں اور مسافروں کے لئے۔

دراصل یہ اعتراض اسلام کے نظریہ جہاد پر ہے اور اس کا جواب بھی علماء نے کثرت سے دیا ہے۔ اس کتاب کے دوسرے حصے میں صفحہ 229 تا 244 اور تیسرے حصے میں صفحہ 187 تا 204 پر بحث کی گئی ہے اس کے علاوہ کتاب کے چوتھے حصہ میں بھی جہاد کے مختلف پہلوؤں پر بحث ہو چکی ہے یہاں سوامی دیانند سرسوتی نے اس اعتراض کو دہرایا ہے۔ سرسوتی نے جہاد کے جس پہلو پر اعتراض کیا ہے اختصار کے ساتھ اس کا جواب رقم کیا جاتا ہے۔ معترضین کی سب سے بڑی لاعلمی یہ ہے کہ اسلامی جنگوں کو جارحانہ اور استعماری جنگیں تصور کرتے ہیں جن کا مقصد لوٹ، قتل وغارت اور فساد ہوتا ہے۔

اس قسم کی جنگوں کا نہ کوئی اصول ہوتا تھا اور نہ ہے۔ اپنی طاقت کے بل بوتے پر کمزور کو زیر کرنا اور ان کی دولت لوٹنا اور ان کو غلام بنانا حق سمجھا جاتا تھا اور اب بھی یہی تصور ہے اگر قرآن مجید کا مطالعہ کیا جائے تو واضح ہو جاتا ہے کہ اسلام کی جنگیں محض دفاعی تھیں کمزور مسلمانوں کو پہلے ان کے گھروں سے نکالا گیا پھر ان کو صفحہ ہستی سے مٹا دینے کے لئے ان پر حملے شروع کر دئے گئے تو ان جارحانہ حملوں کے جواب میں مسلمانوں نے محض دفاع کے لئے ہتھیار اٹھائے قرآن مجید میں آتا ہے۔ اُذِنَ لِلَّذِیْنَ یُقٰتَلُوْنَ بِاَنَّھُمْ ظُلِمُوْا وَاِنَّ اللّٰہَ عَلٰی نَصْرِھِمْ لَقَدِیْرُ الَّذِیْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِیَارِھِمْ بِغَیْرِ حَقٍّ اِلَّآ اَنْ یَّقُوْلُوْا رَبُّنَا اللّٰہُ وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰہِ النَّاسَ بَعْضَھُمْ بِبَعْضٍ لَّھُدِّمَتْ صَوَامِعُ وَبِیَعٌ وَّصَلَوٰتٌ وَّمَسٰجِدُ یُذْکَرُ فِیْھَا اسْمُ اللّٰہِ کَثِیْرًا (الحج 22:40) ان لوگوں کو اجازت دی گئی ہے جن سے لڑائی کی جاتی ہے اس لئے کہ ان پر ظلم کیا گیا اور اللہ یقیناً ان کی مدد پر قادر ہے اور وہ اپنے گھروں سے ناحق نکالے گئے صرف اس وجہ سے کہ وہ کہتے تھے کہ ہمارا رب اللہ ہے اور اگر اللہ لوگوں کی ایک دوسرے کے ذریعے مدافعت نہ کرتا تو یقیناً راہبوں کی کوٹھڑیاں اور گرجے اور عبادت گاہیں اور مسجدیں جن میں اللہ کا نام بہت ذکر کیا جاتا ہے گرادی جائیں۔

یہ آیات ظاہر کرتی ہیں کہ مسلمانوں کی جنگیں دفاعی تھیں اور ان کو اس وقت اجازت دی گئی جب ان کی بقا اور زندگی خطرے میں تھی اور کفار مسلمانوں کو صفحہ ہستی سے مٹا دینے پر تلے ہوئے تھے۔

اس طرح آیت 40 اسلامی جنگوں کی غرض وغایت پر روشنی ڈالی ہے کہ اسلامی جنگیں صرف مسلمانوں کی اپنی مذہبی آزادی کے لئے ہی نہیں بلکہ تمام مذاہب کی آزادی کے لئے تھیں جنگوں کی غرض تمام مذاہب کی عبادت گاہوں کی حفاظت کے لئے تھیں۔ عبادت گاہوں کی حفاظت مذہبی تحفظ پر دلالت کرتی ہے اس آیت میں قیام امن کا نہایت ہی سنہری اصول بیان کیا گیا ہے کہ اگر دنیا کے کسی حصے میں کسی مذہب کے ماننے والوں کی مذہبی آزادی خطرے میں ہو تو مسلمانوں پر ان کی مدد کرنا فرض ہو جاتا ہے۔

مخالفین کی سمجھ پر افسوس ہے کہ وہ جنگیں جو دفاع، قیام امن اور مذہبی آزادی کو برقرار رکھنے کے لئے لڑی گئیں ان کو وہ لوٹ اور ظلم کی جنگوں کا نام دیتے ہیں۔

پھر جنگوں کو لوٹ مار اور ظلم وستم سے پاک رکھنے کے لئے یہ تعلیم دی۔ وَقَاتِلُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ الَّذِیْنَ یُقَاتِلُوْنَکُمْ وَلَا تَعْتَدُوْا اِنَّ اللّٰہَ لَا یُحِبُّ الْمُعْتَدِیْنَ (بقرہ) اللہ کے راستہ میں جنگ کرو ان لوگوں سے جو تم سے جنگ کرتے ہیں اور حد سے نہ بڑھو بے شک اللہ

حد سے بڑھنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔

اس آیت میں واضح طور پر اسلامی جنگ کا اصول بیان کر دیا ہے کہ جنگ صرف انہی لوگوں سے جائز ہے جو مسلمانوں کی قومی زندگی کو ختم کرنے کے لئے ہتھیار اٹھائیں ان کے ساتھ بھی اسلام نے مسلمانوں کو یہ اخلاقی تعلیم دی ہے کہ جنگ میں کسی قسم کی زیادتی نہ کی جائے۔

پھر فرمایا وَقَاتِلُوهُمْ حَتَّى لَا تَكُونَ فِتْنَةٌ وَيَكُونَ الدِّينُ لِلَّهِ فَإِنِ انْتَهَوْا فَلَا عُدْوَانَ إِلَّا عَلَى الظَّالِمِينَ (بقرہ 2:193)

تم ان سے لڑتے رہو جہاں تک فتنہ باقی نہ رہے اور دین اللہ کے لئے ہو جائے پھر اگر وہ باز آ جائیں تو ظالموں سے دست درازی سے رک جاؤ اس آیت میں اسلامی جنگوں کا مقصد زمین سے فساد کی بیخ کنی اور امن کا قیام بیان کیا گیا ہے جب مفسد فساد سے باز آ جائیں تو جنگ بند کر دینی چاہیے۔اور فسادیوں اور ظالموں پر کسی قسم کا ظلم نہیں کرنا چاہیے۔

اسلام صلح کو جنگ پر ترجیح دیتا ہے اگر دشمن صلح کی طرف مائل ہو جائے تو فوراً صلح کر لینی چاہیے قرآن مجید میں آتا ہے اِنْ جَنَحُوْا لِلسَّلْمِ فَاجْنَحْ لَهَا (الانفال 8:61) اگر وہ لوگ صلح کی طرف مائل ہوں تو تم بھی مائل ہو جاؤ۔

تاریخ اسلام میں صلح حدیبیہ اس کی زندہ مثال ہے۔جب دشمن صلح کی عرف مائل ہو گیا تو رسول کریم ﷺ نے ان کی شرائط پر صلح کر لی۔

رسول کریم ﷺ نے جنگوں کے تمام انسانیت سوز طریقے منسوخ کر دیے۔اور ان اصولوں کو رواج دیا جو قیام امن کا موجب تھے۔عربوں کے انسانیت سوز جنگی طریقوں اور جنگی اصلاحات کا ذکر سیرت سید البشر کے حصہ دوم میں گزر چکا ہے اعادہ کی ضرورت نہیں۔ بتانا صرف یہ مقصود ہے کہ مسلمانوں کی جنگیں صرف دفاعی تھیں جن کی غرض وغایت زمین میں امن قائم کرنا اور مذہبی آزادی ہے۔لوٹ مار کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا جنگوں میں مال غنیمت ملتا ہے۔اس کی تقسیم کی مختلف مدات مقرر کر دی ہیں کہ مال غنیمت کا پانچواں حصہ بیت المال میں حکومت کے اخراجات پورا کرنے کے لئے باقی مال غنیمت دیگر مدات میں خرچ کیا جائے گا مال غنیمت کو عام لوٹ مار اور غارت گری قرار دینا سوامی صاحب اور دیگر معترضین کی لاعلمی اور جہالت ہے۔اگر ہندو دھرم کا مطالعہ کیا جائے تو یجروید میں تمام قسم کے چوروں ٹھگوں جیب کتروں اور ڈاکوؤں کو پرماتما کا روپ قرار دے کر ان کی تعظیم و تکریم ایسے ہی کی گئی ہے جیسے ایشور پرماتما کی اس کے علاوہ ایشور کا ایک نام ہری یعنی چور بھی ہے۔

دوم قانون منو میں غریب شودروں کا مال چھین لینا اور چرا لینا ماں کے دودھ کی طرح حلال ہے۔سیرت سید البشر حصہ دوم اور حصہ سوم مختلف مقامات پر ہندو دھرم کی لوٹ مار اور غارت گری کی تعلیم درج کی گئی ہے۔قارئین وہ بھی نظر کے سامنے رکھیں پھر سوامی صاحب کے اعتراض پر توجہ دیں۔اور اس اعتراض کا بودا پن ظاہر ہو جائے گا۔جس شخص کا مذہب لوٹ مار اور قتل وغارت کی تعلیم دیتا ہے۔ اس کے اعتراض کا کیا وزن ہو سکتا ہے۔

......☆......

موت کے وقت فرشتے مونہوں اور پیٹھوں پر مارتے ہیں

اعتراض : کیوں جی آج کل تو روس نے روم وغیرہ کی اور انگلستان نے مصر کی خوب گت بنائی ہے۔اب تمہارے فرشتے کہاں گئے اگر سچ ہے کہ خدا پہلے عابدوں کے دشمنوں کو مارتا اور ڈبوتا تھا تو وہ آج کل ایسا کیوں نہیں کرتا۔دوسرے مذہب والوں کو حتی الوسع نقصان پہنچانے کا حکم کیسا بُرا حکم ہے ایسا حکم عالم کل عین الحق اور رحیم خدا کا نہیں ہوسکتا ان حکموں سے معلوم ہوتا ہے کہ محمدی خدا انصاف اور رحم وغیرہ نیک اوصاف سے مبّرا ہے۔(ستیارتھ پرکاش اعتراض 80)

جواب:۔معترض نے حسب ذیل آیات پر اعتراضات کئے ہیں۔

وَلَوْ تَرٰىٓ اِذْ يَتَوَفَّى الَّذِيْنَ كَفَرُوا الْمَلٰٓئِكَةُ يَضْرِبُوْنَ وُجُوْهَهُمْ وَاَدْبَارَهُمْ وَذُوْقُوْا عَذَابَ الْحَرِيْقِ

(الانفال 50:8)

اور اگر تو دیکھے جب فرشتے کافروں کی روح قبض کرتے ہیں اور ان کے مونہوں اور پیٹھوں کو مارتے ہیں اور جلنے کا مزہ چکھو۔

وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ وَّمِنْ رِّبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُوْنَ بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ وَعَدُوَّكُمْ وَاٰخَرِيْنَ مِنْ دُوْنِهِمْ

(الانفال 60:8) اور جو کچھ طاقت اور گھوڑوں کے سرحدوں پر باندھ رکھنے سے تم سے ہو سکے ان کے لئے تیار رکھو تم اس کے ساتھ اللہ کے دشمن اور اپنے دشمن کو خوف زدہ رکھو اور ان کے سوائے اوروں کو بھی۔

سوامی جی نے اپنی لاعلمی اور قرآن مجید کی نافہمی کی وجہ سے اس آیت کو جہاد پر چسپاں کیا ہے۔حالانکہ اس آیت میں ان لوگوں کا ذکر کیا ہے جنہوں نے احکام شریعت کو پس پشت ڈالا اور اعمال سیئہ پر مصر رہے جب ان پر موت آتی ہے تو فرشتے ان کے مونہوں اور پیٹھوں پر مارتے ہیں۔جلنے کی خبر دیتے ہیں۔یہ سزا ان کے کردہ گناہوں کی وجہ سے ہے یہی اللہ کا انصاف اور عدل ہے کہ ہر بندہ اپنے اعمال کی جزا و سزا پائے۔

آیت 54 میں فرعونیوں کے غرق ہونے کا ذکر کیا ہے۔یہ بھی فرعون اور اس کے لوگوں کے ظلم وجور کی سزا ہے۔اور اللہ کے قانون کے عین مطابق ہے آیت 60 میں قیام امن کا ایک بہترین اصول بیان کیا ہے۔وہ یہ ہے کہ تمام اقوام اپنی سرحدوں کی خوب حفاظت کریں۔سرحدوں کی حفاظت کے لئے ضروری سامان مہیا رکھیں تا کہ کوئی دوسرا ملک اس کی سرحدوں کو پامال نہ کر سکے۔عموماً دنیا میں فساد اسی وقت برپا ہوتا ہے۔جب ایک طاقت ور ملک کمزور ملک پر چڑھائی کر دیتا ہے اس کی سرحدوں کو پامال کر دیتا ہے۔جب دفاع مضبوط ہوگا تو کوئی ملک دوسرے ملک پر چڑھائی نہ کر سکے گا۔اس طرح مضبوط عسکری دفاع کی وجہ سے دنیا میں امن قائم رہے گا۔اس آیت میں صرف مسلمان ہی مخاطب نہیں بلکہ دنیا کی تمام سلطنتوں کے لئے ہدایت ہے اگر دنیا کے تمام ممالک اس اصول پر کاربند ہوں تو دنیا میں فساد ختم ہو جائے گا یہ دانشمندانہ احکام ہیں اس سے ظالم کو ظلم کرنے کا موقعہ نہیں ملتا اسی لئے کہا جاتا ہے کہ یہ کتاب ایک حکیم ہستی کی طرف سے ہے

......☆......

اسلام کی سزائیں ظلم پر مبنی ہیں

اعتراض: اسلام کی سزائیں ظلم اور بربریت پر مبنی ہیں (متعدد)

یہ اعتراض مخالفین نے کثرت سے کیا ہے کہ اسلام کی سزائیں (حدود) بربریت اور ظلم پر مبنی ہیں۔

جواب: اسلامی سزاؤں اور ان کے اصول پر مفصل بحث سرت سید البشر حصہ دوم میں کی جا چکی ہے۔ گواعادہ کی ضرورت نہیں لیکن سلسلہ کلام کو جاری رکھنے کے لئے یہاں اس کا تکرار کر دیا جاتا ہے۔ کیونکہ یہ اعتراض متعدد مخالفین کی طرف سے کیا گیا ہے اور کیا جاتا ہے۔

اسلام میں تعزیری سزاؤں کا اصول:

اسلام میں تعزیری سزا کا قانون عدل وانصاف پر مبنی ہے۔ اور انسانی فطرت کا لحاظ رکھا گیا ہے۔ غیر جانب دارانہ قانونی عدل وانصاف کے ساتھ رحم کے تقاضے اور مجرم کی اصلاح کو سامنے رکھتا ہے۔ ارشاد الٰہی ہے وَجَزٰٓؤُا سَیِّئَةٍ سَیِّئَةٌ مِّثْلُهَا فَمَنْ عَفَا وَاَصْلَحَ فَاَجْرُهٗ عَلَی اللّٰهِ اِنَّهٗ لَا یُحِبُّ الظّٰلِمِیْنَ (الشوری 40:42) بدی کا بدلہ اس کی مثل ہے پھر جو کوئی معاف کر دے اور اصلاح کرے اس کا (اجر) اللہ پر ہے یہی انصاف کا تقاضا ہے اگر مظلوم معاف کر دے اس کو بھی ایک احسن قدم قرار دیا ہے۔ سزا کے ساتھ معافی کو بھی نظر انداز نہیں کیا گیا۔

دوسری جگہ آتا ہے فَمَنِ اعْتَدٰی عَلَیْكُمْ فَاعْتَدُوْا عَلَیْهِ بِمِثْلِ مَا اعْتَدٰی عَلَیْكُمْ (البقرہ 194:2) جو کوئی تم پر زیادتی کرے تم اس کو اسی کے مطابق سزا دو جو اس نے تم پر کی ہے۔ اس آیت میں مثل کا لفظ آیا ہے۔ یعنی جرم کے مطابق سزا دی جائے۔

وَاِنْ عَاقَبْتُمْ فَعَاقِبُوْا بِمِثْلِ مَا عُوْقِبْتُمْ بِهٖ وَلَئِنْ صَبَرْتُمْ لَهُوَ خَیْرٌ لِّلصّٰبِرِیْنَ (النحل 126:16) اگر تم انہیں بدلہ دو تو اتنا دو جتنی تمہیں تکلیف دی گئی ہے اگر تم صبر کرو۔ تو وہ صبر کرنے والوں کے لئے بہتر ہے۔

اس آیت میں بھی جرم کی مثل سزا دینے کا حکم ہے۔ ساتھ صبر کرنے کی بھی تلقین کی ہے اگر مجرم کی بھلائی کے لئے جرم کو معاف کر دیا جائے تو یہ بات اللہ کے ہاں پسندیدہ ہے۔

یہ آیات اسلامی حدود (سزاؤں) کے فلسفہ کو واضح کرتی ہیں۔ اور اسلامی حدود کی بنیاد عدل وانصاف اور فطرت انسانی پر ہے۔ دور حاضر میں اسی فلسفہ کو سامنے رکھ کر دنیا کے تمام ممالک اپنا آئین مرتب کرتے ہیں۔ منصف بھی انصاف کے تقاضوں کو سامنے رکھتے ہیں اسلام پہلا دین ہے جس نے بلا تمیز نسل، مذہب ہر شخص کے ساتھ انصاف مہیا کیا ہے۔ جب کہ ہندو دھرم کا مطالعہ کیا جائے تو ذات پات کو ملحوظ رکھا گیا ہے منو کے قانوں میں جرائم کی سزاؤں میں نہ تو عدل وانصاف کو پیش نظر رکھا گیا ہے اور نہ انسانی فطرت کو۔ سزائیں وحشیانہ ہیں اور بعض جرائم خفیف ہیں جب کہ جرائم کی سزائیں سنگین ہیں اور بعض سنگین جرائم کی سزائیں خفیف ہیں۔ اور طبقاتی تقسیم کے اصول کو بھی سزاؤں میں مدنظر رکھا گیا ہے۔ برہمن کو کسی صورت میں قتل نہیں کیا جا سکتا کیونکہ اس سے مسئلہ تعلیم کو نقصان پہنچتا ہے (منو 81:8)

اسی طرح کسی اونچی (ذات) کے مرد کی طرف راغب ہونے والی عورت پر کوئی جرمانہ نہ ہوگا۔ لیکن جو نیچی ذات کے مرد کی طرف مائل ہوتی ہے اسے گھر میں پابند کر دیا جائے (منو 257:8)

برہمن کھشتری ویش کی عورت شوہر سے محفوظ ہو یا نہ ہو اس سے زنا کرنے والا شودر کا عضو تناسل کو قطع کرنا تمام دولت چھین لینا اور قتل کی سزا دینی چاہیے (منو 366:8)

کھشتری یا ویش کسی ایسی برہمنی سے مباشرت کرتے ہیں جو حفاظت میں نہیں تو وہ ویش کو پانچ سو (پن) اور کھشتری کو ایک ہزار جرمانہ کریں (368:8)

کوئی ویش غیر محفوظ کھشتری عورت سے مباشرت کرتا ہے تو اسے 500 (پن) کا جرمانہ ہوگا لیکن (اس جرم میں) کھشتری کا سر (گدھے) کے پیشاب سے مونڈ دیا جائے گا یا اسے اتنا ہی جرمانہ (ادا کرنا ہوگا) (منو 376:8)

محفوظ عورت کی طرف اس کی مرضی کے خلاف رجوع کرنے والا برہمن ایک ہزار (پن) کا (جرمانہ ہوگا) لیکن اگر عورت کی رضا مندی شامل ہو تو جرمانہ 500 (پن) ہوگا (منو 370:8)

برہمن کھشتری ویش کی عورت شوہر وغیرہ سے محفوظ ہو یا نہ ہو اس سے زنا کرنے والا شودر کا عضو تناسل قطع کرنا تمام دولت چھین لینا اور قتل کی سزا دینی چاہیے اگر وہ غیر محفوظ عورت سے جماع کرے تو اسے دونوں متذکرہ صدر سزائیں اور قتل کی سزا دینی چاہیے (منو 374:8)

ہندو دھرم کی سزاؤں میں طبقاتی تقسیم کی ملحوظ رکھا گیا ہے جو عدل و انصاف کے خلاف ہے۔ دوم ہندو دھرم کی سزاؤں میں سنگینی پائی جاتی ہے چوری کی سزا میں جب چور چوتھی بار چوری کرے تو اس کو قید اور جسم کا انگ کاٹنے کی سزا ہے (منو 129:8)

جس عضو سے دوسرے کی چیز چرائے اسی عضو کو قطع کرنا چاہیے تاکہ پھر ایسا کام نہ کرے (منو 327:8)

اگر جسم کا عضو کاٹنے سے مجرم جرم سے باز نہ آئے تو اس کو چار قسم کی سزا ایک ساتھ دینی چاہیے چار قسم کی سزا سے وہ سزائیں مراد ہیں جو اشلوک 129:8 میں مذکور ہیں وہ یہ ہیں۔

پہلی دفعہ زبانی سزا یعنی تم نے اچھا کام نہیں کیا۔ پھر ایسا کام نہ کرنا دوبارہ جھڑکے اور لعنت کرکے اس کام سے ہٹا دے اور سہ بار کرے تو جرمانے کی سزا دے اگر اس پر بھی نہ مانے تو قید اور جسم کے انگ کاٹنے کی سزا دے۔

گویا جسم کے انگ کاٹنے کی سزا ہندو دھرم میں بھی ہے۔ سر ولیم جونز نے منو کے قانون پر تبصرہ کرتے ہوئے اپنی کتاب Institutes of Manw کے دیباچہ میں رقمطراز ہے "منو کا قانون استبداد اور رہبانیت کا مجموعہ ہے اخلاق نیچرل فلاسفی اور تاریک مذہبی نظام متکبرانہ اصولوں سے پُر ہے اس خطرناک بدگمانیوں کا ذمہ دار ہے یہ قانون احمقانہ رسوم و تکلفات سے لبریز ہے بعض جرائم کی سزائیں سخت حکم پر مبنی ہیں اور بعض جرائم بہت کم سزا پر۔

جرائم کی سزاؤں میں بے انصافی صرف ہندو دھرم پر ہی موقوف نہیں بلکہ رسول کریم ﷺ کی بعثت سے قبل کے تمام متمدن ممالک کے قوانین طبقاتی تقسیم پر مبنی تھے۔ حکمرانوں کے الگ قوانین اور رعایا کے الگ قوانین۔ قانون کی نظر میں حکمران اور اشرافی طبقہ اور عام رعایا برابر نہیں تھے اس کے برعکس اسلام میں معاشرہ کا ہر فرد قانون کی نظر میں برابر تھا۔ اور سزا بھی جرم کے مطابق تھی۔

چندان جرائم کی سزاؤں پر تبصرہ کیا جاتا ہے جن پر مخالفین نے اعتراض کیا ہے۔

قتل کی سزا:

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ فِي الْقَتْلٰى اَلْحُرُّ بِالْحُرِّ وَالْعَبْدُ بِالْعَبْدِ وَالْاُنْثٰى بِالْاُنْثٰى فَمَنْ عُفِيَ لَهٗ مِنْ اَخِيْهِ شَيْءٌ فَاتِّبَاعٌ بِالْمَعْرُوْفِ وَاَدَآءٌ اِلَيْهِ بِاِحْسَانٍ ذٰلِكَ تَخْفِيْفٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَرَحْمَةٌ فَمَنِ اعْتَدٰى بَعْدَ ذٰلِكَ فَلَهٗ عَذَابٌ اَلِيْمٌ وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيٰوةٌ يّٰاُولِي الْاَلْبَابِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ۔

(البقرہ 2:178,179) اے لوگو جو ایمان لائے ہو مقتولوں کے بارے میں تم پر قصاص مقرر کیا گیا ہے قاتل آزاد ہو تو آزاد مارا جائے غلام ہو تو غلام اور عورت ہو تو عورت مگر جس کو اپنے بھائی کی طرف سے کچھ معافی دی گئی ہے تو عمدگی سے پیروی کرنی چاہیے اور نیکی سے ادا کیا جائے یہ تمہارے رب کی طرف سے آسانی اور مہربانی ہے پھر جو کوئی اس کے بعد زیادتی کرے تو اس کے لئے دردناک عذاب ہے تمہارے لئے قصاص میں زندگی ہے۔ اے عقل والو! تاکہ تم بچے رہو۔

اس آیت میں حسب ذیل احکام ہیں۔

1۔ قصاص یعنی قاتل کو قتل کی سزا دی جائے۔

2۔ آزاد قاتل ہو تو اس کے بدلے آزاد قاتل کو ہی قتل کیا جائے۔ اگر غلام قتل کرے تو غلام قاتل کو ہی قتل کیا جائے۔ اور عورت قتل کرے تو عورت قاتل کو قتل کیا جائے۔

3۔ اگر وارث خون بہا پر راضی ہو جائے تو دیت کا لینا جائز ہے۔

اس قانون میں کہیں بھی بے انصافی نظر نہیں آتی۔ قاتل کو سزا ملنی چاہیئے خواہ اس کا تعلق کسی اعلیٰ خاندان سے ہو خواہ اس کا تعلق کسی ادنیٰ ذات سے خواہ وہ آزاد ہو۔ خواہ وہ غلام ہو خواہ وہ عورت ہو۔ ہر کسی کو اس جرم کی سزا ملنی چاہئے۔ اسی سے معاشرہ میں امن قائم رہ سکتا ہے۔ معاشرہ میں امن قائم رکھنے کے لئے انہی اصولوں پر کاربند رہنا چاہیے۔ جو بھی اس سے انحراف کرے گا۔ معاشرہ میں بگاڑ اور فساد کا موجب ہوگا۔

پھر ایک اور راہ نکالی کہ اگر مقتول کے وارث دیت پر راضی ہو جائیں تو وہ ادا کر دی جائے اگر ورثاء معاف کر دیں تو یہ ان کی مرضی لیکن معافی بلا خوف وخطر ہونی چاہیے۔

یہ وہ قتل ہے جو جان بوجھ کر بقائمی ہوش وحواس کیا جاتا ہے لیکن جو قتل بغیر عمد کیا جائے تو اس کی سزا الگ ہے ارشاد الٰہی ہے

وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ اَنْ يَّقْتُلَ مُؤْمِنًا اِلَّا خَطَأً وَمَنْ قَتَلَ مُؤْمِنًا خَطَأً فَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ وَّدِيَةٌ مُّسَلَّمَةٌ اِلٰى اَهْلِهٖ اِلَّا اَنْ يَّصَّدَّقُوْا فَاِنْ كَانَ مِنْ قَوْمٍ عَدُوٍّ لَّكُمْ وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ وَاِنْ كَانَ مِنْ قَوْمٍۢ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُمْ مِّيْثَاقٌ فَدِيَةٌ مُّسَلَّمَةٌ اِلٰى اَهْلِهٖ وَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ شَهْرَيْنِ مُتَتَابِعَيْنِ تَوْبَةً مِّنَ اللّٰهِ وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا۝ (النسا 4:92)

اور کسی مومن کی شایاں نہیں کہ وہ مومن کو قتل کر ڈالے مگر غلطی سے اور جو کوئی غلطی سے کسی مومن کو مار ڈالے تو ایک مومن غلام آزاد کرے اور خون بہا دے جو اس کے وارثوں کے سپرد کیا جائے سوائے اس کے وہ معاف کر دیں پھر اگر (مقتول) ایسے لوگوں سے ہو جو تمہارے دشمن ہیں اور وہ مومن ہو تو ایک مومن غلام آزاد کرنا چاہئے اور اگر ایسے لوگوں سے ہو کہ تم میں اور ان میں معاہدہ ہے تو خون بہا دینا چاہیے جو اس کے وارثوں کو دیا جائے۔ اور ایک مومن غلام آزاد کرنا چاہیئے پھر جو شخص نہ پائے تو دو مہینے کے متواتر روزے رکھے۔ تاکہ اللہ اس پر رحمت سے متوجہ ہو اور اللہ جاننے والا حکمت والا ہے۔

اس آیت سے حسب ذیل احکام مستنبط ہوتے ہیں۔

1۔ قتل بغیر عمد کی سزا مومن غلام آزاد کرنا اور وارثوں کو خون بہا دینا ہے۔

2۔ دشمن قوم (جو اسلامی حکومت سے برسر جنگ ہو) سے کوئی مسلمان قتل ہو جائے تو اس کی سزا ایک مومن غلام آزاد کرنا ہے۔

3۔ اگر معاہد قوم کے کسی شخص کو غلطی سے قتل کر دیا جائے تو مقتول کے ورثاء کو دیت دینا ہے اور ایک غلام آزاد کرنا اسلام نے

انصاف کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لئے قتل بغیر عمد کی سزا بھی بتا دی ہے اس میں دیت کے ساتھ ایک غلام کو آزاد کرنا لازمی قرار دیا ہے۔ یعنی غلاموں کی آزادی کا ایک رستہ مقرر کر دیا ہے۔ اس سے اسلام کی انسان دوستی کا پتا چلتا ہے۔

اِنَّمَا جَزٰٓؤُا الَّذِیْنَ یُحَارِبُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَیَسْعَوْنَ فِی الْاَرْضِ فَسَادًا اَنْ یُّقَتَّلُوْٓا اَوْ یُصَلَّبُوْٓا اَوْ تُقَطَّعَ اَیْدِیْهِمْ وَاَرْجُلُهُمْ مِّنْ خِلَافٍ اَوْ یُنْفَوْا مِنَ الْاَرْضِ ذٰلِكَ لَهُمْ خِزْیٌ فِی الدُّنْیَا وَلَهُمْ فِی الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ عَظِیْمٌ ○ (المائدہ 33:5)

ان کی سزا جو اللہ اور اس کے رسول کے ساتھ جنگ کرتے ہیں اور ملک میں فساد پھیلانے کی کوشش کرتے ہیں صرف یہی ہے کہ وہ قتل کیے جائیں یا صلیب پر مارے جائیں یا ان کے ہاتھ اور پاؤں مخالف اطراف سے کاٹے جائیں یا ان کو قید کیا جائے ان کے لئے دنیا میں رسوائی ہے اور آخرت میں ان کے لئے بڑا عذاب ہے اس آیت میں چار قسم کی سزائیں بیان ہوئی ہیں۔

1۔ جو لوگ ڈاکے کے ساتھ قتل بھی کرتے ہیں ان کو قتل کیا جائے۔

2۔ جو قتل وغارت کے ساتھ ملک میں فساد برپا کرتے ہیں انہیں صلیب پر لٹکایا جائے۔ تاکہ ان کی سزا کی تشہیر ہو

3۔ جو لوگ ڈاکا کے ساتھ لوگوں کے ہاتھ پاؤں کاٹتے ہیں ان کے ہاتھ پاؤں کاٹے جائیں۔

4۔ جو لوگ محض ڈرا دھمکا کر مال لوٹتے پھرتے ہیں انہیں قید کرنے کا حکم دیا ہے یُنْفَوْا مِنَ الْاَرْضِ کے معنی قید لئے گئے ہیں حضرت امام ابوحنیفہ اور امام احمد بن حنبل نے ان الفاظ کے معنی قید لئے ہیں اس آیت کریمہ میں ڈاکا کی مختلف شکلیں بیان کی گئی ہیں پھر ان شکلوں کے مطابق ہی سزا تجویز کی ہے۔ جس سنگینی کا ڈاکا ہے اسی قسم کی سنگین سزا ہے۔ اگر ڈاکو مال لوٹنے کے ساتھ ہاتھ پاؤں بھی کاٹتے ہیں تو ان کی سزا ویسے ہی مقرر کی۔ جو ڈرا دھمکا کر مال لوٹتے ہیں لیکن قتل نہیں کرتے ان کی سزا صرف قید مقرر کی ہے۔ یہ ہے انصاف کہ ڈاکے کی مختلف شکلوں کی سزائیں بھی مختلف ہے۔ کیا لوگوں کے ہاتھ پاؤں کاٹنے والوں کی سزا ان کے بھی ہاتھ پاؤں کاٹے جائیں بے رحمی اور سنگین سزا ہے۔ ہر انسان کا دل یہی گواہی دے گا کہ یہ سزا عین انصاف کے تقاضوں کو پورا کرتی ہے اور جَزٰٓؤُا سَیِّئَةٍ سَیِّئَةٌ مِّثْلُهَا (شوریٰ 40:42) (بدی کا بدلہ اس کی مثل سزا ہے) کے مطابق ہے کہیں بھی بے رحمی اور سنگینی نہیں۔ جس قسم کا جرم ہے ویسی ہے سزا۔

چوری کی سزا:

سرقہ کی سزا کے متعلق قرآن مجید میں آتا ہے۔

وَالسَّارِقُ وَالسَّارِقَةُ فَاقْطَعُوْٓا اَیْدِیَهُمَا جَزَآءًۢ بِمَا كَسَبَا نَكَالًا مِّنَ اللّٰهِ وَاللّٰهُ عَزِیْزٌ حَكِیْمٌ ○ فَمَنْ تَابَ مِنْۢ بَعْدِ ظُلْمِهٖ وَاَصْلَحَ فَاِنَّ اللّٰهَ یَتُوْبُ عَلَیْهِ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ○ (المائدہ 39.38:5)

اور چور مرد اور چور عورت سو ان دونوں کے ہاتھ کاٹ دو یہ اس کی سزا ہے جو انہوں نے کیا اللہ کی طرف سے عبرت ناک سزا اور اللہ غالب حکمت والا ہے۔ پھر جو شخص اپنے ظلم کے بعد توبہ کرے اور اصلاح کرے تو اللہ اس پر رحمت سے توجہ کرے گا۔ اللہ بخشنے والا رحم کرنے والا ہے۔

قطع ید کی تفسیر میں اختلاف ہے ایک گروہ نے قطع ید کے معنی ہاتھ کاٹنے کے لئے ہیں دوسرے گروہ نے قطع ید کے مجازی معنی بھی لئے ہیں یعنی ہاتھ روک دینا وہ کہتا ہے کہ قطع کا لفظ روکنے کے معنی میں عربی زبان میں استعمال ہوتا ہے مثلاً یَقْطَعُوْنَ السَّبِیْلَ سے مراد رستہ کا روکنا ہے نہ کہ راستہ کا کاٹنا اس طرح قطع رحم بھی مجازی معنی میں استعمال ہوا ہے۔ اور قَطَعَ لِسَانَهٗ کے معنی نہیں اسے خاموش کر دیا حدیث

شریف میں آتا ہے کہ ایک شاعر نے رسول کریم ﷺ کی ہجو کی تو رسول کریم ﷺ نے فرمایا اِقْطَعُو اعَنِّی لِسَانَهٗ' میری طرف سے اس کی زبان کاٹ دو یعنی اسے خاموش کرو۔ یہاں زبان کاٹنے سے مراد زبان روکنا ہے اسی طرح قطع ید کے یہ معنی ہیں کہ چور کے ہاتھ روک کر معاشرہ میں امن میں لایا جائے خواہ قید کرکے اس کا ہاتھ روک دیا جائے خواہ ہاتھ کاٹ کر روک دیا جائے۔

اگر دونوں آیات پر غور کیا جائے تو یہ بات کھل کر سامنے آجاتی ہے کہ قطع ید کی سزا انتہائی سزا ہے یعنی اگر چور توبہ اور اصلاح نہ کرے اور عادی ہو جائے جس کی وجہ سے معاشرہ کا امن خطرے میں پڑ جائے تو اس چور کی سزا قطع ید (ہاتھ کاٹنا) ہے نئی تحقیقات نے بھی یہ بات واضح کردی ہے کہ چور کے دماغ میں چوری کی عادت ایک نیا مرکز چوری کا بنا دیتی ہے جس کا تعلق ہاتھ سے ہوتا ہے ہاتھ کٹنے سے وہ مرکز بھی ختم ہو جاتا ہے اور عادت دور ہو جاتی ہے ہاں ایسا چور جس نے کسی مجبوری کے تحت چوری کی۔ عادی مجرم نہیں ہے یا کسی معمولی چیز کی چوری کی تو چور کو اصلاح کا موقع دینا چاہیے چور کو اس معمولی چوری کے بدلے منصف حالات کے مطابق سزا دے سکتا ہے مثلاً قید کردے یا کوئی اور سزا تجویز کردے۔

آئمہ مجتہدین کے اجتہاد سے بھی یہی بات ثابت ہوتی ہے چوری کی سزا میں حد بندی کردی ہے مثلاً امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک دس درہم اور امام شافعی کے نزدیک دینار کے چوتھے حصے سے کم کی چوری میں ہاتھ کاٹنے کی سزا نہیں جس سے واضح ہو جاتا ہے کہ ہاتھ کاٹنے کی سزا کسی خاص حد تک پہنچ کر شروع ہوتی ہے سورۃ مائدہ کی آیت 39 سے بھی یہ ظاہر ہوتا ہے کہ چور کو توبہ اور اصلاح کا موقع دیا جائے۔ اور آغاز جرم میں ہی اس کو انتہائی سزا نہ دی جائے۔

مخالفین اور معترضین چور کی سزا قطع ید کو سنگین اور بے رحمی کی نشانی قرار دیتے ہیں۔ قطع ید ہر چور کی سزا نہیں نہ بلکہ اس چور کی ہے جو عادی مجرم ہو۔ جس کی وجہ سے معاشرہ میں ایک اضطراب اور فساد برپا ہوا ہے۔

اس آیت میں قطع ید کی سزا نکال کے طور پر لکھی ہے "نکال" کے طور پر سزا عادی مجرم کو دی جاتی ہے یہ آخری حد ہے تھوڑے مذموم امر کے لئے لفظ نکال استعمال نہیں ہوتا اگر وہ بڑا اور مشہور ہو جائے تو اسے نکال کہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ خدا نے ایسے چور کے لئے جو چوری پر اصرار کرے قطع ید کی سزا نکال کے طور پر مقرر کی ہے۔

زنا کی سزا:۔ اَلزَّانِیَةُ وَالزَّانِی فَاجْلِدُوْا کُلَّ وَاحِدٍ مِنْهُمَا مِائَةَ جَلْدَةٍ (النور 2:24) زنا کرنے والی عورت اور زنا کرنے والے مرد کا حکم ہے کہ ان دونوں میں سے ہر ایک کو سو کوڑے لگاؤ۔

فقہاء نے زانیہ اور زانی کی مختلف قسمیں بنا کر مختلف سزائیں بیان کی ہیں شادی شدہ جوڑے کی سزا سنگساری قرار دی ہے۔ جس کو معترضین سنگدلی اور بے رحمی کی سزا قرار دیتے ہیں قرآن مجید تو صرف سو کوڑے کی سزا تجویز کرتا ہے۔ اس کے الفاظ سے کہیں بھی سنگساری کی سزا ظاہر نہیں ہوتی معاشرہ میں بگاڑ اور فساد برپا کرنے والوں کے لئے سو کوڑے کی سزا سنگین نہیں۔

فقہاء کی تجویز کردہ سزا سنگساری بھی اس سنگین جرم کے مقابل پر سنگین نہیں۔ زنا کی وبا کو اگر آہنی ہاتھ سے روکا نہ جائے اور یہ پھیلتی جائے تو معاشرہ بے شمار اخلاقی اور طبی امراض کا شکار ہو جاتا ہے۔ تاریخ یہ بتاتی ہے۔ کہ اکثر اقوام محض زنا کی کثرت کی وجہ سے تباہ و برباد ہوئیں۔ زنا انسان کی تمام مخفی استعدادوں اور قوتوں کو تباہ و برباد کر دیتا ہے انسان معاشرہ کا عضو معطل بن کر رہ جاتا ہے۔ قوت عملیہ قوت ارادیہ اور قوت فکریہ ختم ہو جاتی ہیں۔ سستی اور کاہلی کا شکار ہو جاتا ہے۔ جب کسی معاشرہ میں زانیوں کی کثرت ہو جاتی ہے۔ تو معاشرہ بے عملی کا شکار ہو جاتا ہے۔ اور قوم اور ملک تباہ و برباد ہو جاتے ہیں۔ بنی اسرائیل کی تاریخ اس بات پر شاید ہے وہ اپنی زنا کاری کی وجہ سے ہی دوسروں کی غلامی کا شکار رہی۔ اگر اس قسم کے سنگین جرم کی وجہ سے کسی کو سنگسار بھی کر دیا جاتا ہے تو سزا نہ سنگین ہے اور نہ بے رحمی کی

نشانی۔ اصل میں معترض نے زنا کی سنگینی کو سمجھا ہی نہیں۔ اگر اس کے سامنے ان قوموں کی تاریخ ہوتی جو کثرت زنا کی وجہ کے تباہ ہوئیں تو وہ ہرگز یہ اعتراض نہ کرتا۔

معترضین نے جن جرائم کی سزاؤں کو سنگین اور بے رحمی کی علامت قرار دیا ہے دراصل انہوں نے جرائم کی سنگینی کی طرف توجہ نہیں کی معاشرہ میں امن قائم نہیں ہوسکتا۔ جب تک جرائم کا خاتمہ نہ ہو جرائم کا خاتمہ سزاؤں سے ہی کیا جاسکتا ہے۔ اسلام کی تمام سزائیں جرائم کی سنگینی کے مطابق ہیں اور انصاف پر مبنی ہیں۔

☆......☆

کیا اللہ کا بھی جسم ہے؟

اعتراض: وَجَآءَ رَبُّكَ وَالْمَلَكُ صَفًّا صَفًّا (الفجر 22:89)

يَحْمِلُ عَرْشَ رَبِّكَ فَوْقَهُمْ يَوْمَئِذٍ ثَمَانِيَةٌ (الحاقہ 17:69)

خدا ملائکہ اور عرش کوئی مجسم چیز ہیں (ترک اسلام اعتراض نمبر 27)

جواب:

ترجمہ (1) اور تیرا رب آئے گا اور فرشتے قطاروں کی قطاریں

2۔ اور تیرے رب کا عرش اس دن اٹھ (فرشتے) اوپر اٹھائے ہوئے ہوں گے۔

معترض نے یہ اعتراض کیا ہے کیا اللہ تعالیٰ اور فرشتے مجسم ہیں کہ وہ آئیں گے۔ معترض کے نزدیک جو چیز بھی آتی ہے وہ مجسم ہی ہوتی ہے گو لفظ جَآءَ جسم پر دلالت کرتا ہے اور خدا کا کوئی جسم ہے ہر زبان میں فاعل اور موصوف کے لحاظ سے افعال اور صفات کا مفہوم متعین کیا جاتا ہے مثلاً لفظ بیٹھنا ہے مختلف حالات میں اس کے معانی بھی بدلتے جاتے ہیں لفظ ایک ہی ہے جب حالت بدلی تو اس کا مفہوم بھی بدل گیا اگر کہا جائے زید آیا اور کرسی پر بیٹھ گیا اس حالت میں بیٹھنے کے معنی اپنے ذہن میں رکھیں۔ پھر یہ کہا جائے کہ اس کا بھٹہ ہی بیٹھ گیا۔ یا یہ کہا جائے مجید کی محبت میرے دل میں ایسی بیٹھی ہے نکلتی ہی نہیں۔ آج کل فلاں شخص کرسی صدارت پر بیٹھا ہوا ہے۔ غم کے مارے زید کا دل بیٹھے جا رہا ہے۔

دھرم پال کے دل میں اسلام کی عداوت بیٹھ گئی ہے۔

لفظ بیٹھنے کے معنی مختلف حالتوں میں مختلف ہیں۔

ہر زبان میں یہی ہے۔ حالت کے بدل جانے سے لفظ کے معنی بدل جاتے ہیں۔ لہٰذا اللہ اور اس کے فرشتوں کے آنے کا مفہوم اللہ کی مدد برکت اور اس کی قدرت اور اس کے نشانوں کا اظہار ہے۔ اللہ تعالیٰ کی قدرت کا اظہار عہد رسول میں کئی بار ہوا جب کفار نے دارالندوہ میں رسول کریم ﷺ کو مار دینے کا منصوبہ بنالیا۔ اور رات کے وقت آپ ﷺ کے مکان کا گھیرا کرلیا۔ تو اس وقت اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت کاملہ کا اظہار کیا۔ دشمنوں کے درمیان سے نکل گئے۔ یہ ہے اللہ اور اس کے فرشتوں کا آنا۔ جب آپ ﷺ حضرت ابوبکرؓ کے ہمراہ غار ثور میں چھپے ہوئے تھے۔ دشمن کھوج لگاتا ہوا غار ثور کے منہ تک پہنچ جاتا ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت سے ایسے اسباب پیدا کردیئے کہ رسول کریم ﷺ کو ڈھونڈ نہ پائے اور ناکام واپس لوٹ آئے۔ دشمن رسول کریم ﷺ کے سر پر پہنچ گیا ہے۔ اور پکڑ نہیں سکا یہ ہے

اللہ تعالیٰ اور اس کے فرشتوں کا قطار در قطار آنا۔ حتیٰ کہ اللہ کی حفاظت میں مدینہ تک پہنچ گئے۔ جب 2 ہجری میں جنگ بدر ہوتی ہے مسلمان دشمن کے مقابل پر ہر لحاظ سے کمزور ہیں لیکن اللہ اور اس کے فرشتوں کی آمد سے مسلمانوں نے دشمن کو شکست فاش دی۔

الغرض عہد رسول میں خصوصاً تمام جنگوں میں اللہ اور اس کے فرشتے آئے اور مسلمان کامیاب و کامران ہوئے۔ پس جَآءَ رَبُّكَ وَالْمَلَكُ صَفًّا صَفًّا کا مطب یہ ہے اللہ اور اس کے فرشتے رسول کریم ﷺ اور مسلمانوں کی مدد اور نصرت کے لئے آتے ہیں۔ یعنی اپنی قدرت کاملہ کے ساتھ ان کی مدد کرتے ہیں۔ اور ایسے اسباب پیدا ہو جاتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ اپنے دشمنوں پر غالب آ جاتے ہیں۔ اللہ اور اس کے فرشتوں کا آنا غلبہ کی نشانی ہے۔

دوسری آیت اٹھ فرشتوں کا عرش اٹھانے کی وضاحت سیرت سید البشر میں کی جا چکی ہے۔ اعادہ کی ضرورت نہیں ہے۔

☆.....☆

اسلام اپنے طرف دار خواہ وہ ظالم ہوں اسے فائدہ پہنچانے کی تعلیم دیتا ہے۔

اعتراض : بھلا یہ کون سے انصاف عقل مندی اور دھرم کی بات ہے کہ جو اپنا طرف دار ہو۔ اور خواہ بے انصاف ہی کیوں نہ ہو۔ اسے فائدہ پہنچایا جائے اور جو امن عالم میں خلل انداز ہو کر لڑائی جھگڑا کرا دے اور لوٹ مار کی چیزوں کو حلال بتا دے اسے بخشندہ اور مہربان ناموں سے موسوم کیا جائے خدا تو در کنار کوئی حق پسند اور سمجھ دار آدمی بھی ایسی تعلیم نہیں دے سکتا ایسی ایسی باتیں قرآن کو کلام اللہ ہونے کے درجہ سے گرا دیتی ہیں (ستیارتھ پرکاس اعتراض 81)

جواب: یہ اعتراض حسب ذیل دو آیات پر کیا گیا ہے ارشاد الٰہی ہے۔

يٰۤاَيُّهَا النَّبِىُّ حَرِّضِ الْمُؤْمِنِيْنَ عَلَى الْقِتَالِ اِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ عِشْرُوْنَ صَابِرُوْنَ يَغْلِبُوْا مِائَتَيْنِ وَاِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ مِّائَةٌ يَّغْلِبُوْۤا اَلْفًا مِّنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ (الانفال 65:8)

اے نبی! مومنوں کو جنگ کی رغبت دے اگر تم میں سے بیس صبر کرنے والے ہوں تو وہ سو پر غالب آئیں گے اور اگر تم میں سے ایک سو ہوں تو کافروں میں سے ایک ہزار پر غالب آئیں گے۔ یہ اس لئے کہ یہ ایسے لوگ ہیں جو سمجھ سے کام نہیں لیتے۔

2۔ فَكُلُوْا مِمَّا غَنِمْتُمْ حَلٰلًا طَيِّبًا وَّاتَّقُوا اللّٰهَ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ (الانفال 69:8) پس اس سے جو تم نے فتح پا کر حاصل کیا ہے حلال طیب کھاؤ اور اللہ کا تقویٰ کرو بے شک اللہ بخشنے والا رحم کرنے والا ہے۔

یہ اعتراض ایک نئے پہلو سے جہاد پر کیا ہے۔ اسلام نے کہیں بھی تعلیم نہیں دی کہ اپنے طرف دار غیر منصف کو فائدہ دیا جائے۔ اور نہ لڑائی اور لوٹ مار کی تعلیم دیتا ہے اور نہ لڑائی اور لوٹ مار کرنے والے کو بخشندہ اور مہربان کے ناموں سے موسوم کرتا ہے۔ یہ تمام باتیں معترض کے ذہن کی اختراع ہیں۔

سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ اسلام نے اس وقت ہتھیار اٹھانے کی اجازت دی جب مسلم ریاست کی سرحدیں غیر محفوظ ہو گئیں۔

دشمن نے غیر قانونی طور پر سرحدوں کو پامال کرنا شروع کیا۔ اس کے ساتھ مسلمانوں کی جانیں بھی خطرہ میں پڑ گئیں۔ دشمن مسلمانوں کو صفحہ ہستی سے مٹا دینے کا منصوبہ بنا چکا تھا۔ اس وقت مسلمانوں کو دفاع ریاست اور جانوں مالوں اور ابروں کی حفاظت کے لئے جنگ کرنے کی اجازت دی گئی جیسا کہ اس آیت سے ظاہر ہوتا ہے ارشاد الٰہی ہے اُذِنَ لِلَّذِیْنَ یُقَاتَلُوْنَ بِاَنَّهُمْ ظُلِمُوْا (الحج 39:22) ان لوگوں کو اجازت دی گئی ہے جن سے لڑائی کی جاتی ہے اس لئے کہ ان پر ظلم کیا گیا۔

دوسری جگہ فرمایا صرف ان لوگوں سے جنگ کرو جو تم سے جنگ کرتے ہیں فَقَاتِلُوْا الَّذِیْنَ یُقَاتِلُوْنَکُمْ وَلَا تَعْتَدُوْا اِنَّ اللّٰهَ لَا یُحِبُّ الْمُعْتَدِیْنَ جو تم سے لڑیں ان سے لڑو اور لڑنے میں زیادتی نہ کرنا۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ زیادتی کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا پھر لڑائی کی حد بندی کردی کہ کب تک جنگ جاری رکھنی ہے ارشاد الٰہی ہے قَاتِلُوْهُمْ حَتّٰی لَا تَکُوْنَ فِتْنَةٌ (بقرہ 193:2) تم ان سے لڑتے رہو جہاں تک فتنہ باقی نہ رہے۔ یعنی فتنہ سے مراد وہ اسباب ہیں جو امن قائم کرنے کے راستہ میں روک ہیں۔ یعنی قیام امن تک لڑائی جاری رکھیں جب دشمن صلح کی طرف مائل ہو جائے مسلمانوں کو بھی یہ حکم ہے وہ صلح کی عرف مائل ہو جائیں ارشاد الٰہی ہے وَاِنْ جَنَحُوْا لِلسَّلْمِ فَاجْنَحْ لَهَا (انفال 61:8) اگر وہ لوگ صلح کی طرف مائل ہوں تو تم بھی مائل ہو جاؤ قرآن مجید میں جو آیات جنگ سے تعلق رکھتی ہیں ان میں سے کسی ایک آیت میں بھی غیر منصف اور ظالم طرف دار کو فائدہ پہنچانے کا ذکر نہیں اور نہ لوٹ مار کی چیزوں کو حلال قرار دیا۔ اسلام صرف حق اور صداقت کا ساتھ دیتے اور حلال اور طیب روزی کمانے کا حکم دیتا ہے۔ ارشاد الٰہی ہے یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ کُلُوْا مِمَّا فِی الْاَرْضِ حَلٰلًا طَیِّبًا (البقرہ آیت 168) اے لوگو! جو چیزیں زمین میں موجود ہیں ان میں سے حلال پاک چیزیں کھاؤ۔ رسول کریم ﷺ نے فرمایا اَفْضَلُ الْاَعْمَالِ الْکَسْبُ الْحَلَالُ (المدینہ والاسلام) بہترین حلال روزی کمانا ہے فرمایا طَلَبُ الْحَلَالِ فَرِیْضَةٌ عَلٰی کُلِّ مُسْلِمٍ (المدینہ والاسلام فرید وجدی) حلال طریقے سے کمانا ہر مسلمان پر فرض ہے۔

جنگوں میں مال غنیمت حاصل ہوتا ہے۔ ہر مذہب میں مال غنیمت حلال ہے فاتح قومیں اپنے آئین کے مطابق اس کی تقسیم کر لیتی ہیں۔ اسلام نے مال غنیمت کی تقسیم کے اصول وضع کر دیئے ہیں مال غنیمت کا پانچواں حصہ حکومت کے اخراجات کو پورا کرنے کے لئے بقیہ تمام مال غنیمت غربا و مساکین کے لئے ہے۔

جہاد کی آیات پر غور کیا جائے تو ایک یہ واضح ہو جاتا ہے کہ جہاد صرف لڑائی کا نام نہیں بلکہ وسیع معنی میں استعمال ہوا ہے دوم جو آیات لڑائی سے تعلق رکھتی ہیں وہ بھی اپنے دفاع اور امن قائم کرنے کے لئے ہیں کہیں بھی جارحانہ کاروائی کی تعلیم نہیں دی گئی۔ بلکہ جارحانہ کاروائی کرنے والوں کے خلاف لڑنے کی تعلیم دی گئی ہے۔ تاکہ زمین میں فساد نہ ہو اسلام امن کا مذہب ہے اسلام انسانیت کا مذہب ہے تمام انسانوں کی جان مال اور ابرو کی حفاظت اور احترام کی تعلیم دیتا ہے ارشاد الٰہی ہے مَنْ قَتَلَ نَفْسًا بِغَیْرِ نَفْسٍ اَوْ فَسَادٍ فِی الْاَرْضِ فَکَاَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِیْعًا وَمَنْ اَحْیَاهَا فَکَاَنَّمَا اَحْیَا النَّاسَ جَمِیْعًا (المائدہ 32:5) کسی کی ناحق جان لینا یا زمین میں فساد برپا کرنا قتل عام کی مانند ہے کسی کی جان کی حفاظت کرنا بقائے انسانیت کے برابر ہے فرمایا وَلَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِیْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ (بنی اسرائیل 33:17) حق اور انصاف کے بغیر کسی کی جان نہ لی جائے۔ رسول کریم ﷺ فرماتے ہیں اِنَّ دِمَآءَکُمْ وَاَمْوَالَکُمْ وَاَعْرَاضَکُمْ حَرَامٌ کَحُرْمَةِ یَوْمِکُمْ هٰذَا (بخاری کتاب الحج) تمہاری جانیں اور تمہارے مال اور تمہاری ابروئیں ویسی ہی حرمت رکھتی ہیں جیسے آج کے دن کی حرمت ہے۔ کیا کوئی اسلام کو لڑائی کا مذہب کہہ سکتا ہے۔ کیا رسول کریم ﷺ کو (نعوذ باللہ) لڑاکا اور جنگجو کہہ سکتا ہے۔ دنیا میں اگر کوئی دین امن قائم کرنے والا ہے وہ دین اسلام ہے۔ اگر تاریخ عالم میں امن کا پیغام دینے والا کوئی شخص ہے تو وہ صرف حضرت محمد مصطفٰے ﷺ ہیں۔

الزامی جواب

جب ہندو دھرم کی کتب کا مطالعہ کیا جائے تو ان میں ضرور لوٹ مار اور قتل و غارت کی تعلیم نظر آتی ہے چند حوالے ملاحظہ فرمائے۔

1۔ ''دھرم کے مخالفوں کو زندہ آگ میں جلا دو'' (یجر وید ادھیاء 13 منتر 12 دیانند بھاش)

2۔ دشمنوں کے کھیتوں کو اجاڑ و (یعنی گائے بیل بکری اور لوگوں کو بھوکا مار کر ہلاک کرو' حوالہ مذکور منتر 13)

3۔ اپنے مخالفوں کو درندوں سے پھڑوا ڈالو (یجر وید 15:,19,17,15)

4۔ ''ان کو سمندر میں غرق کر دو'' (یجر وید 18:5)

5۔ جس طرح بلی چوہے کو تڑپا تڑپا کر مارتی ہے اسی طرح ان کو تڑپا کر مارو (یجر وید 65:16)

6۔ ان کی گردنیں کاٹو۔

7۔ ''جائز اور ناجائز طریق سے ہلاک کر دو'' (یجر وید 28:1)

8۔ ''مخالفوں کا جوڑ جوڑ اور بند بند کاٹ دیا جائے (یجر وید 28:13)

9۔ ''اپنے زور شجاعت سے دشمنوں کو تہ تیغ کرو تا کہ تمہارے زور بازو اور ایشور کے لطف و کرم سے ہماری فتح ہو (اتھر وید کانڈ انوواک ورگ 95 منتر 13)

10۔ ''اے فرمان بردار لوگو! تمہارے اسلحہ انشین وغیرہ از قسم توپ و تفنگ تیر تلوار وغیرہ شتر مخالفوں کو مغلوب کرنے اور ان کو روکنے کے لئے قابل تعریف اور با استحکام ہوں تمہاری فوج مستوجب توصیف ہو تا کہ تم ہمیشہ فتح یاب ہوتے رہو (رگ وید منڈل اول سوکت 26 منتر 2)

اسلام مومنوں کو ماں باپ بھائی اور دوستوں سے جدائی کی تعلیم دیتا ہے۔

☆......☆

اللہ پہلے مسلمانوں پر مہربان تھا اب کیوں نہیں؟

اعتراض: اگر اللہ بہشتوں کے پاس رہتا ہے تو حاضر و ناظر کیوں کر رہ سکتا ہے اگر حاضر نہیں تو خالق و عادل بھی نہیں ہو سکتا اور لوگوں کے ماں باپ بھائی اور دوستوں سے جدا کرنا محض ظلم ہے ہاں اگر وہ بُری تعلیم دیں تو نہ ماننی چاہیئے۔ لیکن ان کی خدمت ہمیشہ کرنی چاہے اگر خدا مسلمانوں پر پہلے مہربان تھا اور ان کی مدد کے لئے لشکر اتارتا تھا تو اب کیوں نہیں کرتا اور اگر کافروں کو سزا دیتا تھا اور پھر ان پر رحمت کرتا تھا تو اب کہاں گیا ہے کیا خدا لڑائی کے بدوں ایمان نہیں قائم کر سکتا؟ ایسے خدا کو ہم ماننے سے باز آئے خدا کیا ہوا مداری ہوا (ستیارتھ کاش نمبر 82)

جواب: یہ اعتراض تین اجزاء پر مشتمل ہے۔ جو حسب ذیل آیات سے لاعلمی کی وجہ سے اخذ کئے گئے ہیں۔

خٰلِدِیْنَ فِیْهَآ اَبَدًا اِنَّ اللّٰهَ عِنْدَهٗٓ اَجْرٌ عَظِیْمٌ (التوبہ 23:9)

انہی (بہشت) میں ہمیشہ رہیں گے اللہ کے پاس بڑا اجر ہے۔

یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْٓا اٰبَآءَكُمْ وَاِخْوَانَكُمْ اَوْلِیَآءَ اِنِ اسْتَحَبُّوا الْكُفْرَ عَلَى الْاِیْمَانِ وَمَنْ یَّتَوَلَّهُمْ مِّنْكُمْ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ (توبہ 23:9)

اے لوگو! جو ایمان لائے ہو اپنے باپوں اور اپنے بھائیوں کو دوست نہ بناؤ اگر وہ ایمان پر کفر کو پسند کریں اور جو کوئی تم میں سے ان کو دوست بنائے گا تو یہی ظالم ہیں۔

ثُمَّ اَنْزَلَ اللّٰهُ سَكِیْنَتَهٗ عَلٰى رَسُوْلِهٖ وَعَلَى الْمُؤْمِنِیْنَ وَاَنْزَلَ جُنُوْدًا لَّمْ تَرَوْهَا وَعَذَّبَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا وَذٰلِكَ جَزَآءُ الْكٰفِرِیْنَ (التوبہ 26:9)

تب اللہ نے اپنی تسکین اپنے رسول اور مومنوں پر اتاری اور وہ لشکر اتارے جن کو تم نہیں دیکھتے تھے اور ان کو جو کافر تھے عذاب دیا اور یہی کافروں کی سزا ہے۔

ثُمَّ یَتُوْبُ اللّٰهُ مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ عَلٰى مَنْ یَّشَآءُ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ (التوبۃ 27:9)

پھر اللہ اس کے بعد جس پر چاہے رجوع ہر رحمت کرے اللہ بخشنے والا رحم کرنے والا ہے۔

4۔ قَاتِلُوا الَّذِیْنَ لَا یُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَبِالْیَوْمِ الْاٰخِرِ الخ (التوبۃ 29:9) ان سے جنگ کرو جو اللہ پر ایمان نہیں لائے اور نہ پچھلے دن پر الخ

جزو اول: معترض نے آیت 22 کا ترجمہ ہی غلط کیا ہے۔ آیت کے اس جزو میں یہ بتایا گیا ہے کہ بہشتی بہشت میں ہمیشہ رہیں گے اور ان لوگوں کے لئے جو ایمان اور اعمال صالحہ بجالاتے ہیں اللہ کے پاس بہت بڑا اجر ہے۔ انصاف کا یہی تقاضا ہے کہ اعمال صالحہ بجالانے والے کو اجر عظیم دیا جائے۔ یہی اللہ کی سنت ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنی سنت اور قانون کے مطابق اپنے فضل سے اعمال صالحہ بجا لانے والے کو اجر عظیم سے نوازتا ہے۔

معترض نے بد دیانتی سے ''بے شک اللہ کے پاس بڑا اجر ہے'' کو دو ٹکڑے کر کے ایک ٹکڑے کو آیت ما سبق سے ملا دیا ہے اور دوسرے حصہ آیت کو مہمل بنا دیا ہے۔

جزو ثانی: اعتراض کا دوسرا جزو کہ لوگوں کو ان کے ماں باپ بھائی اور دوستوں سے جدا کرنا ظلم ہے۔ مذکورہ آیت میں دینی رشتہ کو دنیاوی رشتہ پر فوقیت دی گئی ہے۔ مسلمانوں کو یہ تعلیم دی گئی ہے کہ اگر دین کی خاطر مال دولت ماں باپ بھی چھوڑنے پڑیں تو بطیب خاطر چھوڑ دیں۔ اسی میں مسلمانوں کی حیات ہے اسی میں مسلمانوں کی ترقی کا راز مضمر ہے۔۔

اسلام نے ماں باپ بھائی اور دوستوں کو چھوڑنے کی تعلیم نہیں دی بلکہ دین کو دنیا پر مقدم رکھنے کی تعلیم دی ہے۔ یعنی خدا کی خاطر اگر والدین بہن بھائی مال دولت قربان کرنے کا وقت آئے تو مسلمان کو تیار رہنا چاہیے ویسے اللہ تعالیٰ نے صلہ رحمی پر بہت زور دیا ہے اور حقوق والدین اور حقوق العباد وغیرہ کھول کر بیان کر دئے ہیں ان حقوق سے پہلوتہی کرنے والا قابل مواخذہ ہے ارشاد الٰہی ہے وَبِالْوَالِدَیْنِ اِحْسَانًا وَّذِی الْقُرْبٰى (البقرہ 83:2) ماں باپ اور رشتے داروں کے ساتھ حسن سلوک کرو۔ ایک اور جگہ آتا ہے وَبِالْوَالِدَیْنِ اِحْسَانًا وَّبِذِی الْقُرْبٰى وَالْیَتٰمٰى (النساء 36:4) اور ماں باپ کے ساتھ نیکی کرو اور رشتے داروں اور کے ساتھ بھی۔

اسلام نے ہر شخص کے ساتھ حسن سلوک کی تعلیم دی ہے کفر اور اسلام کی کوئی تفریق نہیں کی۔ اسلام ان لوگوں کو جو قطع رحمی کرتے ہیں ان کو فاسق قرار دیتا ہے ارشاد الٰہی ہے۔

وَمَا يُضِلُّ بِهٖٓ اِلَّا الْفٰسِقِيْنَ الَّذِيْنَ يَنْقُضُوْنَ عَهْدَ اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مِيْثَاقِهٖ وَيَقْطَعُوْنَ مَآ اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖٓ اَنْ يُّوْصَلَ (البقرہ2:27)

(فاسق وہ ہیں) جو اللہ کے عہد کو پختہ کرنے کے بعد توڑتے ہیں اور اسے کاٹتے ہیں جس کا اللہ نے حکم دیا ہے کہ ملایا جائے۔

مسلم میں آتا ہے وہ قوم اللہ کی رحمت سے محروم رہتی ہے۔ جس میں کوئی قاطع رحم ہوتا ہے اور اس کو دنیا میں ہی قطع رحم کی سزا مل جاتی ہے (ادب المفرد)

رسول کریم ﷺ نے فرمایا جو شخص چاہتا ہے کہ اس کے رزق میں فراخی پیدا ہو اس کو صلہ رحمی کرنا چاہیے بعض روایات میں ہے کہ جو شخص چاہتا ہے کہ اس کی عمر میں اضافہ ہو اس کو صلہ رحمی کرنا چاہے حضرت جبیر بن مطعم کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا کہ جو صلہ رحمی نہ کرے گا وہ جنت میں داخل نہ ہوگا (بخاری باب اثم القاطع)

اسلام نے حقوق العباد کی ادائیگی اور صلہ رحمی پر بہت زور دیا ہے۔ ان کی بجا آوری سے ہی معاشرہ میں امن قائم ہوتا ہے۔ معترض کا یہ کہنا کہ اسلام نے ماں باپ بھائی اور دوستوں سے جدا کرنے کی تعلیم دی ہے۔ بالکل جہالت اور اسلام سے لاعلمی ہے اسلام ہی وہ مذہب ہے جس نے یہ تعلیم دی ہے کہ تمام لوگ ایک نفس سے پیدا ہوئے۔ گویا ایک عالمگیر اخوت کی تعلیم دیتا ہے ارشاد الٰہی ہے۔

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِيْرًا وَّنِسَآءً وَّاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِيْ تَسَآءَلُوْنَ بِهٖ وَالْاَرْحَامَ (النساء4:1)

اپنے رب کا تقوی اختیار کرو جس نے تم کو ایک جان (اصل) سے پیدا کیا اور اس سے اس کا جوڑا پیدا کیا اور ان دونوں سے بہت سے مرد اور عورتیں پھیلائیں اور اللہ کے (حقوق کی) جس کے ذریعے سے تم ایک دوسرے سے سوال کرتے ہو۔ اور رحموں کی نگہداشت کرو۔

تمام انسانوں کو ایک اصل کی فروع قرار دینے والا مذہب ماں باپ بھائی اور دوستوں کو جدا کرنے کی تعلیم کیسے دے سکتا ہے۔ سب حقوق سے بڑھ کر اللہ کا حق ہے۔ اللہ تعالیٰ نے زیر اعتراض آیت میں یہ بیان کیا ہے جب اللہ کی خاطر دنیا کی تمام نعمتوں کو خواہ وہ پیارے والدین ہوں خواہ دیگر اعزو اقارب اور مال دولت قربان کرنے کا وقت آ جائے ان سب چیزوں کو خدا کی خاطر قربان کر دینا چاہے۔ یہاں سب چیزوں پر اللہ اور اس کے دین کو مقدم رکھا ہے۔ اللہ کی خاطر سب کچھ قربان کر دینے کے مواقع کبھی کبھی آتے ہیں۔ اس وقت انسان کا امتحان ہوتا ہے کہ آیا وہ خدا کی خاطر سب کچھ قربان کرنے کو تیار ہے۔ مسلمانوں نے خدا کی خاطر اپنا سب کچھ قربان کر دیا۔ اسی قربانی کی وجہ سے مسلمان تھوڑے ہی عرصہ میں بام عروج تک پہنچ گئے۔ یہاں صرف دین کو دنیا پر مقدم رکھنے کی تعلیم دی ہے۔ اسی کا نام قربانی ہے۔ اسی قربانی کا صلہ دنیا میں قومی ترقی اور آخرت میں جنت اور خدا کی رضا کا حصول ہے۔

جزو ثالث اعتراض کیا خدا لڑائی کے بغیر ایمان قائم نہیں کر سکتا؟

خدا تو ایمان کو لڑائی کے بغیر ہی قائم کرتا ہے مگر ایمان کے دشمن لڑائی کے بغیر ایمان قائم ہونے نہیں دیتے تھے۔ صرف ان سے لڑائی کی اجازت دی گئی ہے۔ جو مسلمانوں سے صرف اس وجہ سے لڑ رہے تھے کہ وہ ایمان لے آئے تھے اور ایمان پر قائم رہنا چاہتے تھے۔

اور ایمان کے دشمن ان کو ایمان سے ہٹانا چاہتے تھے قرآن مجید کی آیات پر غور کرو قَاتِلُوا فِي سَبِيلِ اللّٰهِ الَّذِينَ يُقَاتِلُونَكُمْ اللہ کی راہ میں ان لوگوں سے جنگ کرو جو تم سے لڑتے ہیں۔

دوسری جگہ آتا ہے قَاتِلُوا الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ یعنی ان کافروں سے جنگ کرو جو اسلام کو مٹانا چاہتے ہیں۔

دونوں آیات میں قاتلو الفظ آیا ہے جو باب مفاعلہ ہے جو اشتراک کے معنی دیتا ہے۔ یعنی جو لوگ تم سے لڑنے کے لئے آئے ہیں اور تم سے جنگ کرنا چاہتے ہیں ان سے لڑو اقْتُلُوا کا لفظ نہیں آیا بلکہ مسلمانوں سے لڑنے والوں کے خلاف لڑائی کا حکم ہے یہ دفاعی جنگیں تھیں جو مسلمانوں پر تھوپی گئیں اور مسلمانوں نے حکم الٰہی کے تحت مقاتلین سے لڑائی لڑی۔ چونکہ مسلمان حق پر تھے اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے ان کی مدد کی۔ اور مسلمان کامیاب رہے

جزو رابع: معترض نے یہ اعتراض اٹھایا ہے اگر اللہ تعالیٰ پہلے مسلمانوں کی فرشتوں کے ذریعے مدد کرتا تھا اب کیوں نہیں کرتا۔

اللہ اپنے قانون اور سنت کا محافظ ہے جو شخص یا قوم اللہ تعالیٰ کے قانون اور سنت کی پاسداری کرتی ہے اللہ تعالیٰ ان کی فرشتوں کے ذریعے مدد کرتا ہے۔ الٰہی قوانین اور اصولوں میں سے ایک اصول اور قانون بیان کر دیا ہے وہ یہ ہے اللہ کے دین کو مقدم رکھنا اور اللہ کی رضا اور اس کے دین کی خاطر تمام مادی چیزوں کو قربان کر دینا۔ اسی اصول پر معترض نے اعتراض بھی کیا ہے مسلمانوں نے خدا کے دین کی خاطر اپنے مال و متاع اور اعزہ اقربا سب قربان کر کے مدینہ آ گئے۔ پھر ان پر لڑائیاں تھوپ دی گئیں اور دین کو مٹانے کے لئے کوشش کی۔ تو اللہ تعالیٰ نے دین کے محافظین کی مدد کی مسلمان حق پر تھے۔ خدا کے دین کی سربلندی کے لئے لڑ رہے تھے۔ تو اللہ تعالیٰ نے دین کے محافظین کی مدد کی۔

معترض دور حاضر کے مسلمانوں کے متعلق کہتا ہے کہ اب اللہ ان کی مدد کیوں نہیں کرتا تو بڑی واضح بات ہے۔ دور حاضر کے مسلمان ان اصولوں پر کاربند نہیں۔ جو قوموں کی ترقی کے لئے وضع کئے گئے ہیں کیا دور حاضر میں خدا کی رضا کی خاطر مسلمانوں نے دین کو دنیا پر مقدم کیا ہے۔ یہ ایک بڑی حقیقت ہے کہ مسلمان دین کی سربلندی اور تبلیغ سے غافل ہیں اور تکفیر بازی میں مبتلا ہیں مخالف عقیدہ امام کے پیچھے نماز پڑھنا پسند نہیں کرتے۔ فروعی مسائل کی وجہ سے باہم گردست و گریباں ہیں۔ دین کی اصلی روح سے دور ہیں قرآن مجید کی تعلیم سے مجموعی طور پر غافل ہیں اس لئے یہ ایک لازمی امر ہے کہ اللہ دور حاضر کے مسلمانوں کی مدد نہیں کرتا۔ اللہ کا مدد نہ کرنا بھی اس کا قانون ہے۔ وہ اپنے قانون اور سنت کے مطابق دور حاضر کے مسلمانوں کی مدد نہیں کرے گا۔

قرآن مجید میں اللہ کی مدد حاصل کرنے کے اصول مذکور ہیں جب مسلمان ان اصولوں پر گامزن ہوں گے تو اللہ کے فرشتے نازل ہوں گے۔

☆......☆

کیا مسلمان خدا کی پولیس ہے؟

اعتراض: کیا مسلمان ہی خدا کی پولیس بن گئے ہیں کہ وہ اپنے ہاتھ سے یا مسلمانوں کے ہاتھ سے غیر مذہب والوں کو گرفتار کرتا ہے کیا دوسرے کروڑوں آدمی خدا کو ناپسند ہیں؟ اور مسلمانوں کے گناہ گار بھی پسند؟ اگر ایسا حال ہے تو اندھیر نگری چوپٹ راجا کی مثال صادق آئے گی۔ تعجب ہے کہ عقل مند مسلمان بھی اس بے بنیاد اور نامعقول مذہب کے قائل میں (ستیارتھ پرکاش اعتراض 83)

جواب۔ یہ اعتراض حسب ذیل آیت پر کیا گیا ہے قُلْ هَلْ تَرَبَّصُوْنَ بِنَا اِلَّاۤ اِحْدَى الْحُسْنَيَيْنِ وَنَحْنُ نَتَرَبَّصُ بِكُمْ اَنْ يُّصِيْبَكُمُ اللّٰهُ بِعَذَابٍ مِّنْ عِنْدِهٖۤ اَوْ بِاَيْدِيْنَا فَتَرَبَّصُوْۤا اِنَّا مَعَكُمْ مُّتَرَبِّصُوْنَ (التوبہ 52:9) کہ تم ہمارے حق میں دو بھلائیوں میں سے ہی ایک کا انتظار کرتے ہو۔ اور ہم تمہارے حق میں انتظار کرتے ہیں کہ اللہ تم پر کوئی عذاب اپنی طرف لائے یا ہمارے ہاتھوں سے سو انتظار کرو ہم بھی تمہارے ساتھ انتظار کرنے والے ہیں۔

زیر اعتراض آیت میں کہیں ذکر نہیں۔ مسلمان ہی خدا کی پولیس ہیں۔ نہ یہ کہ

2۔ مسلمانوں کے سوا دوسرے کروڑوں خدا کو ناپسند ہیں اور نہ یہ کہ مسلمان گناہ گار بھی خدا کو پسند ہیں۔ یہ تینوں اعتراض معترض کے اپنے ذہن کی اختراع۔ اور خود تراشیدہ ہیں۔

زیر اعتراض آیت میں منافقوں کا ذکر ہے۔ جو بظاہر مسلمانوں کے ساتھ ملے رہتے تھے اور اندرونی طور پر عدوان اسلام کے ساتھ ساز باز اور تعلقات رکھتے تھے سوامی جی نے بدنیتی سے آیت کا نصف حصہ چھوڑ دیا ہے۔ جس میں یہ ذکر تھا کہ منافق لوگ ہر حالت میں نقصان اٹھائیں گے اور مسلمانوں کی دو حالتیں ہیں وہ دونوں حالتیں مسلمانوں کے لئے بھلائی اور اچھائی کا موجب ہیں اگر راہ حق میں مارے جائیں تو شہید ہیں اگر کامیاب ہوں تو غازی اور فاتح کیونکہ مسلمان حق اور دین کی سربلندی کے لئے لڑ رہے تھے۔ ان کے سامنے متاع دنیا نہیں تھا۔ اس لئے ان کا مارا جانا ان کے لئے بھلائی ہے جب کہ منافقوں کے لئے عذاب اس لئے اگر مسلمان راہ خدا میں مارے جائیں تو بھی منافقوں کو کوئی فائدہ نہیں اگر مسلمان کامیاب ہو جائیں تو تب بھی منافقوں کو کوئی فائدہ حاصل نہیں تھا۔ یہ ضرور ہے کہ وہ اپنی بداعمالیوں کی وجہ سے ہر صورت میں سزا پائیں گے۔ خواہ ان کو عذاب مسلمانوں کے ہاتھوں پہنچے یا کسی دوسری صورت میں ان کو سزا ملے۔

اللہ نے تکریم و تحریم کا ایک عمدہ اصول مقرر کر دیا ہے وہ یہ ہے اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰىكُمْ (الحجرات 13.49) یعنی اللہ کے نزدیک سب سے زیادہ قابل تکریم وہ شخص ہے جو سب سے زیادہ تقویٰ اختیار کرنے والا ہے اسلام نے کہیں بھی یہ ذکر نہیں کیا کہ اللہ کو مسلمان پسند ہیں خواہ وہ گناہ گار ہی کیوں نہ ہوں۔ اسی لئے اچھا انجام صرف متقیوں کا ہی قرار دیا ہے۔ ارشاد الٰہی ہے وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِيْنَ (طٰہ 32:20) اچھا انجام تقویٰ اختیار کرنے والوں کے لئے ہے۔

اگر ایک مسلمان تقویٰ اختیار نہیں کرتا اور ناپاک زندگی بسر کرتا ہے تو وہ اللہ کو ناپسندیدہ ہے۔ وہ اپنے گناہوں کی سزا پائے گا

الزامی جواب: اسلام کے نزدیک تو سب لوگ برابر ہیں ہاں وہ لوگ جو تقویٰ کی باریک راہوں پر چلتے ہیں وہ اس کے نزدیک مکرم و محترم ہیں یہ تکریم اور تحریم تقویٰ کی وجہ سے ہے صرف محض دائرہ اسلام میں داخل ہونے کی وجہ سے نہیں۔ جب ہندو ادب کا مطالعہ کیا جائے تو

برہمن اللہ کی پولیس نظر آتے ہیں۔ سب خدائی مراعات اسی نسل کو حاصل ہیں چنانچہ منو میں ہے ''نہایت مصیبت میں گرفتار ہونے پر بھی راجا کبھی برہمنوں پر غصہ نہ کرے۔ کیونکہ اگر برہمن غضب ناک ہو راجہ کی فوج اور سواریوں کو فوراً فنا کر دیتے ہیں۔ جن براہمنوں نے غضب ناک ہو کر ہر چیز بھسم کر دینے والی آگ بنائی اور سمندر کو کھاری کر دیا اور تپدق کے مارے ہوئے چاند کو پھر صحیح سالم کر دیا ایسے برہمنوں کو غضب ناک کر کے کون فنا نہ ہوگا۔ برہمن جو دنیا اور آخرت کو خلق کر سکتے ہیں اور دیوتاؤں کا دیوتا پن چھین سکتے ہیں ایسے برہمنوں کو غضب ناک کر کے کون ترقی پا سکتا ہے برہمن جن کے سہارے جہاں اور سب دیوتا ہمیشہ قائم ہیں اور دید ہی جن کی دولت ہے کون زندگی کی تمنا کرنے والا ان کی دل آزاری کرے گا شاستر کے حکم کے مطابق آگ جلائی ہوئی یا بغیر حکم جلائی ہوئی جیسے اعلیٰ دیوتا ہے ویسے ہی برہمن عالم یا جاہل ہو اعلیٰ دیوتا ہے جیسے آگ مرگھٹ میں بھڑکنے پر بھی ناپاک نہیں ہوتی بلکہ یگیوں میں روشن ہونے پر ترقی پاتی ہے ایسے ہی برہمن خواہ سب بدکاریاں کریں تو بھی وہ سر بسر پوجا کے قابل ہیں کیونکہ برہمن اعلیٰ دیوتا روپ ہے (منو ادھیاء 9 شلوک 313-319) ہندو دھرم میں برہمن کو یہ اعزاز حاصل ہے خواہ وہ بدکار ہے خواہ جاہل ہے وہ ایشور کو عزیز ہے زمین میں جو کچھ ہے وہ برہمن ہے ان کو کسی قسم کی اذیت دینا اپنے آپ کو فنا کرنے کے مترادف ہے ہندو ادب کی رو سے تو برہمن ہی اللہ تعالیٰ کی پولیس ہے۔

☆......☆

1۔ اسلام مطلب براری کے لئے مرد و زن کو لالچ دیتا ہے

2۔ اسلام کا خدا ٹھٹھا مخول کرتا ہے۔

اعتراض: یہ خدا کے نام پر مرد و زن کو اپنے مطلب کے لئے لالچ دیتا ہے اور اگر ایسا نہ کیا جاتا تو کوئی محمد صاحب کے جال میں نہ پھنستا ایسا ہی دوسرے مذہب والے بھی کیا کرتے ہیں انسان آپس میں ٹھٹھا کیا کرتے ہیں لیکن خدا کا کسی کے ساتھ ٹھٹھا کرنا ہنسی کی بات ہے یہ قران ہے یا بچوں کا کھیل۔ (ستیارتھ پرکاش اعتراض نمبر 84)

جواب۔ حسب ذیل آیات کو ہدف تنقید بنایا گیا۔

وَعَدَ اللّٰهُ الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا وَمَسٰكِنَ طَيِّبَةً فِيْ جَنّٰتِ عَدْنٍ وَرِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰهِ اَكْبَرُ ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ (التوبہ 9:72)

اللہ نے مومن مردوں اور مومن عورتوں سے باغوں کا وعدہ کیا ہے جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں انہیں میں رہیں گے۔ اور ہمیشگی کے باغوں میں پاکیزہ رہنے کی جگہ کا۔ اور اللہ کی رضا سب سے بڑھ کر (نعمت) ہے یہی بڑی کامیابی ہے۔

اس اعتراض کے بھی دو اجزا ہیں ایک مرد و زن کو جنت کا وعدہ دینا دوم اللہ کا ٹھٹھا مخول کرنا۔

جز و اول۔ آیت میں مومن مرد اور مومن عورت کو جنت کا لالچ نہیں دیا گیا بلکہ ایمان اور اعمال صالحہ کا بدلہ اور انعام کا ذکر ہے۔ قرآن مجید میں کئی مقامات پر اس بات کا ذکر کیا ہے کہ جو لوگ ایمان اور اعمال صالحہ بجا لاتے ہیں ان کا بدلہ بہشت اور جنت ہے جس میں نہریں بہتی

ہوں گی اور ہر قسم کے پھل ہوں گے اور اس بہشت میں ہر قسم کی نعماء ہوں گی۔ جو مومن چاہے اس کو مل جائے گا یہ لالچ نہیں۔ اعمال صالحہ کا بدلہ ہے قرآن مجید میں ہے۔

مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَلَاخَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَاهُمْ يَحْزَنُوْنَ (بقرہ 63:2)

جو اللہ اور آخری دن پر ایمان لائے اور نیک کام بجالائے ان کے لئے ان کے رب کے پاس اجر ہے ان کو نہ کوئی خوف لاحق ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔

دوسری جگہ آتا ہے وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ (بقرہ 23:2) اور وہ لوگ جو ایمان لائے اور اعمال صالحہ بجالائے وہی لوگ جنت کے وارث ہوں گے۔ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔

پس مذکورہ آیات سے یہ بات عیاں ہے کہ بہشت ایمان اور اعمال کا بدلہ ہے۔ تاریخ بھی یہ بتاتی ہے جو شخص بھی دائرہ اسلام میں داخل ہوتا تھا۔ وہ تمام گناہوں کو ترک کر کے نیکی کا راستہ اختیار کر لیتا۔ اللہ تعالیٰ نے ان اعمال صالحہ کے بدلے صرف آخرت میں ہی جنت نہیں دے گا۔ بلکہ اس دنیا میں بھی جنت کا وارث بنائے گا اہل ایمان عرب سے نکل کر عراق شام مصر کی زرخیز زمینوں کے وارث بنے۔ مسلمانوں کی جنت اسی دنیا سے شروع ہو گئی تھی۔ لہٰذا اللہ کا یہ قانون اور سنت ہے کہ اعمال حسنہ کا بدلہ بہتر شکل میں دنیا ہے وہ بہتر شکل قرآن مجید کی اصطلاح میں جنت ہے۔ یہ اللہ کی طرف سے انعام ہے۔ جو صالحین کو دیا جاتا ہے۔ نیک لوگوں کو جنت دینے کا وعدہ صرف اسلام میں ہی نہیں ہندو دھرم کے ادب میں بھی نیک لوگوں کو سورگ ملنے کا وعدہ ہے (دیکھو اتھر وید کا کانڈ 4)

نیک اعمال کے بالمقابل بد اعمالیوں کا نتیجہ دوزخ ہے۔ گویا جنت کی نعماء اور دوزخ کا عذاب انسان کے اپنے اعمال صالحہ اور اعمال سیئہ کی شکلیں اور نتائج ہیں۔ جن کو انسان اس دنیا میں دیکھنا شروع کر دیتا ہے کہ اچھے کام کا پھل میٹھا پاتا ہے اور بُرے کام کا پھل کڑوا۔ مادی اور روحانی ترقی اور تنزل کا راز اعمال صالحہ اور اعمال سیّہ میں ہے۔ جنت ترقی اور عروج کی علامت ہے اور دوزخ تنزل اور ادبار کی نشانی ہے۔ جو شخص ترقی کے راستہ پر چلنا چاہتا ہے وہ اعمال صالحہ بجالائے اور جو شخص تنزل اور ادبار کی اتھاہ کی گہرائیوں میں گرنا چاہتا ہے وہ اعمال سیّہ اختیار کرے۔ یہ تو اللہ تعالیٰ نے ترقی اور تنزل کے راستے متعین کر رکھے ہیں جس کو معترض نے لالچ اور طمع قرار دیا ہے۔

جزو ثانی: سَخِرَ اللّٰهُ مِنْهُمْ کا صحیح مفہوم) منافق مسلمانوں سے تمسخر کرتے تھے۔ چونکہ مسلمان حق پر اور منافق باطل پر تھے۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے ان کے اس مذاق اور ٹھٹھے کو ان پر ہی لوٹا دیا ہے جرم کے بدلے میں جو دیا جاتا ہے وہ اس کی سزا ہوتی ہے۔ پس سخر اللہ منھم کا صحیح مفہوم یہ ہے کہ اللہ ان کے تمسخر کے بدلے ان کو سزا دے گا۔ یہ قرآن مجید کا مخصوص طرز بیان ہے۔ مثلاً قرآن مجید میں آتا ہے کہ کفار نے مکر کیا تو اس کے ساتھ ہی یہ آتا ہے۔ کہ اللہ نے بھی مکر کیا۔ یعنی اگر کفار نے مسلمانوں کو نقصان پہنچانے کے لئے منصوبہ گھڑ لیا ہے تو اللہ ان کا منصوبہ ان پر لوٹا دے گا یعنی ناکام بنا دے گا۔ اور منصوبہ کی سزا دے گا۔ گویا اللہ کے مکر سے مراد کفار کے منصوبہ کو ناکام بنانا اور سزا دینا ہے اسی طرح اللہ کے تمسخر سے مراد منافقوں کے ٹھٹھے مخول کی سزا مراد ہے۔ پس سخر اللہ منھم کے معنی ہیں جازھُم علی سخریتھم ان کی ہنسی مخول کا ان کو بدلہ دے عربی زبان میں یہ بھی قاعدہ ہے کہ کسی کے ایک فعل پر جو سزا دی جائے اس کو اس فعل کے الفاظ میں ادا کیا جاتا ہے ابن جریر کہتے ہیں کہ جب ایک فقرہ جواب کے طور پر ہو تو اس سے مراد فی الواقع وہ فعل نہیں ہوتا بلکہ دوسرے کے کسی فعل کی سزا ہوتی ہے۔ پس زیر اعتراض آیت میں منافقوں کے تمسخر کے مقابل میں اللہ کے ساتھ لفظ تمسخر آیا ہے تو اس کا عربی قاعدہ کے مطابق یہ مفہوم ہوگا کہ اللہ ان کے تمسخر کی سزا دے گا۔

مومنوں کا جان مال خرید لیا ہے (خوب سوداگری ہے)

اعتراض: ۔واہ جی واہ محمد صاحب آپ نے تو گوکلئے گوسائیوں کی ہمسری کرلی۔ یہ گوسائیں بھی اپنے معتقدوں کا مال اڑا کر انہیں پاک بنایا کرتے تھے۔ واہ اللہ میاں آپ نے بھی بڑی سوداگری شروع کی ہے کہ مسلمانوں کے ہاتھوں غریبوں اور عاجزوں کی جان لینا نفع سمجھ رکھا ہے اور مسلمانوں کو اس کے ثواب کے عوض بہشت عطا کرنے سے انہیں اپنی رحمت اور انصاف کا خوب ثبوت دیا ہے بزرگوں اور داناؤں کے نزدیک اب آپ کی کیا وقعت رہی ہے۔ آپ نے تو اپنے خدا کو بٹہ لگا دیا ہے (ستیارتھ کاش اعتراض نمبر 86)

یہاں بنیادی طور پر یہ گذارش کر دینا مناسب سمجھتا ہوں۔ معترضین کے اس قسم کے تمام اعتراضات عربی زبان کی باریکیوں کو نہ سمجھنے کی وجہ ہیں وہ عبارت جو معترضین اپنی کم علمی اور عربی زبان کی باریکیوں کو نہ سمجھنے کی وجہ سے قابل اعتراض سمجھتے ہیں۔ ایک عربی دان اسی عبارت کو ایک اعجاز سمجھتا ہے اور اس کو پڑھ کر وجد میں آجاتا ہے۔

معترض نے جن آیات کو ہدف تنقید بنایا وہ یہ ہیں خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَكِّيهِمْ بِهَا وَصَلِّ عَلَيْهِمْ اِنَّ صَلٰوتَكَ سَكَنٌ لَّهُمْ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ (103:9) ان کے مالوں سے زکوۃ لے تا کہ اس سے تو انہیں پاک اور صاف کرے۔ اور ان کے لئے دعا کر کیونکہ تیری دعائیں ان کے لئے ذریعہ تسکین ہیں اور اللہ سننے والا جاننے والا ہے وِاِنَّ اللّٰـهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ وَ اَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ يُقَاتِلُوْنَ فِي سَبِيْلِ اللّٰهِ فَيَقْتُلُوْنَ وَيُقْتَلُوْنَ (التوبۃ 111:9) اللہ نے مومنوں سے ان کی جانیں اور ان کے مال خرید لئے ہیں اس کے بدلے میں ان کے لئے جنت ہے وہ اللہ کی راہ میں جنگ کرتے ہیں سو وہ مارتے ہیں اور مرتے ہیں

آیت نمبر 103 میں زکوۃ اور خیرات لینے کا حکم ہے۔ دنیا کا کوئی مذہب نہیں جس نے خیرات کرنے کا حکم نہ دیا ہو۔ ہر مذہب نے خیرات کو معاشرہ کے لئے بہترین عمل قرار دیا ہے۔ اسی خیرات سے معاشرے کے غریب لوگوں کی ضروریات زندگی پوری ہوتی ہیں خیرات امراء اور غرباء کے درمیان محبت اور اخوت کا ذریعہ بنتا ہے اسلام نے انفاق فی سبیل اللہ کی بہت تاکید کی ہے اور یہ عمل قوموں کی ترقی کا ذریعہ ہے۔

وید میں آتا ہے" جو لوگ صدقہ دیتے ہیں وے سورگ (بہشت) میں بلند مقام پاتے ہیں۔ گھوڑا دینے والے سورج کے ساتھ رہتے ہیں سونا دینے والے غیر فانی ہو جاتے ہیں کپڑا دینے والے چاند کے پاس جاتے ہیں سبھی لمبی عمر پاتے ہیں جو سب سے پہلے صدقہ دے کر برہمن کو خوش کرتے ہیں وے ہی رشی اور برہما کہے جاتے ہیں.................وے ہی خدا کے تین حصوں کو جانتے ہیں.................
صدقہ دینے والوں کی موت نہیں ہوتی وے دیوتا (فرشتے) ہو جاتے ہیں......... پہلے تو صدقہ دینے والا خوشبودار یونی (قالب) پاتا ہے اور نہایت خوبصورت لباس والی بیوی پاتا ہے اور خیرات کرنے والا کشیدہ شراب پاتے ہیں اور ان کو فتح کرتے ہیں جوان پر نا قابل شکست حملہ کرتے ہیں دینے والے کو تیز رفتار گھوڑا آراستہ کر کے دیا جاتا ہے ان کے لئے خوبصورت عورت سنگار کر کے اس کے وصل کی منتظر رہتی ہے اس کا گھر نیلوفر کے پھولوں والی جھیل کی مانند ہوتا ہے۔ دیوتاؤں کے محلات کی طرح آراستہ اور پیراستہ ہوتا ہے خوبصورت سواری کے گھوڑے صدقہ دینے والے کو لے جاتے ہیں اور اسی کے لئے رتھ خراماں ہوتی ہے جنگ میں دیوتا صدقہ دینے والے کی مدد کرتا ہے جنگ میں داتا دشمنوں کو جیتتا ہے (رگ وید منڈل 10 سوکت 107 منتر 11,10,9,8,6,2)

بائبل میں آتا ہے ''اور زمین کی پیداوار کا سارا عشر خواہ وہ زمین کے بیج کا ہو یا درخت کے پھل کا ہو خداوند کا ہے اور خداوند کے لئے پاک ہے اور اگر کوئی اپنے عشر سے چھڑانا چاہے تو اس کا پانچواں حصہ اس میں اور ملا کر اسے چھڑائے اور گائے بیل اور بھیڑ بکری یا جو جانور چرواہے کی لاٹھی کے نیچے سے گزرتا ہے ان کا عشر یعنی دس پیچھے ایک جانور خداوند کے لئے ٹھہرے (احبار 31,30,27)

گنتی میں ہے ''تو اپنے غلے میں سے جو سال بہ سال تیرے کھیتوں میں پیدا ہو عشر ادا کرنا (22,14)

انجیل میں ہے اگر کوئی دولت مند ہیکل کے خزانہ میں اپنی زکوۃ کی بڑی رقم ڈالے اور اس مقابلہ میں کوئی غریب بیوہ خلوص دل سے دو دمڑی ڈالے تو اس کی زکوۃ کا رتبہ اس دولت مند کی زکوٰۃ سے کہیں بڑھ کر ہے'' (لوقا 1:21)

اسلام نے صدقہ کا نتیجہ ان دو الفاظ میں بیان کیا ہے تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَكِّيهِم (تطهر اور تزکیہ)

یعنی جو گناہ کر چکے ہیں ان سے پاک ہوں گے اور آئندہ نیکیوں میں ترقی کریں گے۔

جز ثانی:۔ (مومنوں کا جان و مال خرید لینے کا مطلب)

اب رہا خدا کی سوداگری معترض نے سوداگری کا مفہوم آیت کے لفظ اَشْتَریٰ سے اخذ کیا ہے اور دھوکا کھایا ہے اِشْتَرا ہر اس معاملہ پر بولا جاتا ہے جس سے کچھ حاصل ہو۔ قرآن مجید میں آتا ہے يَشْتَرُونَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا بِالْاٰخِرَةِ وہ آخرت کے بدلے دنیا کی زندگی کو خرید لیتے ہیں یعنی مطلب یہ ہے کہ آخرت کی بجائے دنیا کی زندگی کو ہی مطلوب و مقصود زندگی سمجھ لیتے ہیں ایک اور جگہ فرمایا اشْتَرَوُا الضَّلٰلَةَ بِالْهُدٰى (البقرہ 16:2) انہوں نے ہدایت دے کر گمراہی خریدی۔ اس کا مطلب یہ ہے کفار نے ہدایت اختیار نہ کی بلکہ گمراہی کا راستہ اختیار کیا ہدایت کی بجائے گمراہی کا رستہ اختیار کرنے کو لفظ اَشْتَریٰ سے ظاہر کیا ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کا مومنوں کی جان اور مال خرید لینے کا مطلب یہ ہے کہ انہوں نے خدا پر ایمان لا کر اپنی جان اور مال خدا کے راہ میں قربان کر دینے کا اقرار کر لیا ہے اس کے بدلے میں اللہ تعالیٰ انہیں بہشت کی نعمتوں سے نوازے گا۔

اس آیت میں مسلمانوں کی جانی اور مالی قربانی کا ذکر ہے۔ مسلمان جو جان و مال اللہ کی راہ میں قربان کر رہے ہیں وہ اللہ تعالیٰ کے خریدے ہوئے ہیں جب مسلمان رسول کریم ﷺ کے دست مبارک پر بیعت کرتے تھے وہ بیعت جان و مال کی قربانی کی ہوتی تھی۔ اللہ تعالیٰ کہتا ہے کہ اس خرید کے بدلے ان کو جنت دی جائے گی۔ سوداگری نہیں ہے۔ بلکہ اللہ کی رضا کی خاطر ہر چیز کو قربان کر دینے کی تعلیم ہے تو میں وہی ترقی کرتی ہیں جو اللہ کی رضا کو ہر چیز پر مقدم رکھتی ہیں۔ رام چندر جی اور کرشن جی مہاراج نے حق کی خاطر جو لڑائیاں لڑی تھیں ان کے ساتھ جن لوگوں نے لڑائیوں میں حصہ لیا تھا۔ انہوں نے بھی اسی عہد کے مطابق میدان جنگ میں مال و دولت کی قربانیاں دی تھیں انہوں نے بھی اللہ کی خاطر اپنے آپ کو بیچ دیا ہوا تھا اور اللہ نے خرید لیا ہوا تھا اور وہ بہشت کے مستحق ٹھہرے یہ اللہ کی سوداگری نہیں بلکہ امن کی خاطر جان و مال قربان کرنے کی ترغیب ہے۔

سوامی جی نے لفظ اشترا کو سمجھا ہی نہیں اللہ کی خرید کا مطلب یہ ہے کہ ہر شخص کو اللہ کی خوشنودگی کے حصول کے لئے ہر قیمتی چیز قربان کر دینی چاہیے کیونکہ وہ انسان کی اپنی نہیں بلکہ عطا کردہ ہے قرآن مجید میں نہایت عمدہ پیرائے ہیں جان اور مال کی قربانی کو لفظ اشترا سے واضح کر دیا۔

سوامی دیانند جی نے غلط بیانی سے بھی کام لیا ہے لکھا ہے مسلمانوں کے ہاتھوں غریبوں اور عاجزوں کی جان لینا ہی نفع سمجھ رکھا ہے یہ معترض کی اپنی ذہنی اختراع اور سراسر جھوٹ ہے اسلام کہیں بھی غریبوں اور عاجزوں کی جان لینے کی تعلیم نہیں دیتا بلکہ ہر شخص کی جان و مال کی حفاظت کی ضمانت دیتا ہے ارشاد الٰہی ہے مَنْ قَتَلَ نَفْسًا بِغَيْرِ نَفْسٍ اَوْ فَسَادٍ فِي الْاَرْضِ فَكَاَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيعًا

(المائدہ 32:5) کسی کی ناحق جان لینا یا زمین میں فساد پھیلانا قتل عام کی طرح ہے۔

دوسری جگہ آتا ہے وَلَا تَقۡتُلُوا النَّفۡسَ الَّتِي حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالۡحَقِّ (بنی اسرائیل 33:17) اور بغیر حق وانصاف کے کسی کی جان نہ لی جائے رسول کریم ﷺ نے فرمایا اِنَّ دِمَاءَکُمۡ وَاَمۡوَالَکُمۡ وَاَعۡرَاضَکُمۡ حَرَامٌ کَحُرۡمَةِ يَوۡمِکُمۡ هٰذَا (بخاری کتاب الحج) تمہاری جانیں اور تمہارے مال اور تمہاری ابروئیں ویسی ہی حرمت رکھتی ہیں جیسے آج کے دن کی حرمت ہے (یعنی حج کے دن کی) دنیا میں اسلام ہی ایک ایسا دین ہے جو جان مال اور ابرو کی حفاظت کی تعلیم دیتا ہے۔ اسلام کے حقوق انسانی کی پہلی دفعہ ہی جان ومال اور ابرو کی حفاظت ہے۔

الزامی جواب:۔ وید میں دھرم کے بدلے حکومت کا لالچ دیا گیا ہے" ایشور کہتا ہے۔ اے لوگو! میں سب کا رکھوالہ اور پیدا کرنے والا ایشور مذہبی اوصاف عمل اور خصلت رکھنے والوں کے لئے زمین کی حکومت دیتا ہوں میں دینے والے شخص کے لئے بارش حاصل کراؤں" (رگ وید منڈل 4 سوکت 27 منتر 2)

کیا دھرم کے بدلہ میں زمین کی حکومت کا لالچ اور ایشور کو مال دینے کے بدلے میں بارش دلانے کا چکمہ نہیں۔

☆......☆
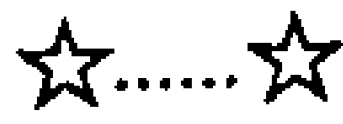
اسلام محسن کشی کی تعلیم دیتا ہے

اعتراض:۔ اس آیت میں محسن کشی کی تعلیم دی گئی ہے کیونکہ خدا حکم دیتا ہے کہ پڑوسیوں اور غلاموں سے لڑائی کرو اور موقعہ پا کر انہیں مار ڈالو۔ ان باتوں پر غور کر کے اب بھی اگر مسلمان قرآن سے کنارہ کش ہو کر راہ راست پر آویں تو بہت اچھا ہے (ستیارتھ پرکاش 87)

جواب: حسب ذیل آیات پر اعتراض کیا گیا ہے۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا قَاتِلُوا الَّذِيۡنَ يَلُوۡنَكُمۡ مِّنَ الۡكُفَّارِ وَلۡيَجِدُوۡا فِيۡكُمۡ غِلۡظَةً ؕ وَاعۡلَمُوۡۤا اَنَّ اللّٰهَ مَعَ الۡمُتَّقِيۡنَ (التوبۃ 123:9) اے لوگو! جو ایمان لائے ہو ان کافروں سے جنگ کرو جو تمہارے قریب ہیں اور چاہیے کہ وہ تم میں شدت پائیں اور جان لو کہ اللہ متقیوں کے ساتھ ہے۔

اَوَلَا يَرَوۡنَ اَنَّهُمۡ يُفۡتَنُوۡنَ فِىۡ كُلِّ عَامٍ مَّرَّةً اَوۡ مَرَّتَيۡنِ ثُمَّ لَا يَتُوۡبُوۡنَ وَلَا هُمۡ يَذَّكَّرُوۡنَ (التوبۃ 126:9) اور کیا دیکھتے نہیں کہ وہ ہر سال ایک بار یا دو بار آزمائے جاتے ہیں پھر بھی توبہ نہیں کرتے اور نہ نصیحت حاصل کرتے ہیں۔

یہ جہاد پر ایک طرح سے اعتراض ہے۔ اگر صرف ایک لفظ قَاتِلُوا پر غور کر لیا جائے تو ہر قسم کے شکوک وشبہات دور ہو جاتے ہیں لفظ قَاتِلُوا" باب مفاعلہ ہے جس میں اشتراک پایا جاتا ہے جس کا مطلب واضح ہے کہ جب دوسرا شخص جنگ کرے تو اس سے جنگ کرو اسی جنگ کا نام دفاعی جنگ ہے۔ یعنی جب مخالف دشمن فوجی تیاری کے ساتھ حملہ آور ہو۔

تو اس کا مقابلہ کرو۔ دنیا کا کون سا قانون دفاع سے روکتا ہے۔ مسلمانوں کو اس وقت ہتھیار اٹھانے کی اجازت دی گئی تھی۔ جب ان کا وجود خطرے میں پڑ گیا تھا۔ ارشاد الٰہی ہے اُذِنَ لِلَّذِيْنَ يُقَاتَلُوْنَ بِاَنَّهُمْ ظُلِمُوْا (سورۃ الحج 39:22) ان لوگوں کو اجازت دی گئی ہے جن سے لڑائی کی جاتی ہے۔ اس کے بعد اسلام نے لڑائی کا ایک اصول مقرر کر دیا ہے کہ صرف انہی لوگوں سے لڑائی لڑی جائے جو جارح ہیں جو مسلمانوں کے ساتھ لڑائی کرتے ہیں۔ ارشاد الٰہی ہے وَقَاتِلُوْا فِي سَبِيْلِ اللّٰهِ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَكُمْ وَلَا تَعْتَدُوْا (البقرہ 190:2) اللہ کی راہ میں ان لوگوں سے جنگ کرو۔ جو تم سے جنگ کرتے ہیں اور زیادتی نہ کرو۔

جنگ کے ساتھ یہ بھی تعلیم دے دی اگر دشمن صلح کی طرف مائل ہو جائے تو پھر صلح کر لینی چاہیے۔ ارشاد الٰہی ہے وَاِنْ جَنَحُوْا لِلسَّلْمِ فَاجْنَحْ لَهَا (سورۃ الانفال 61:8) اور اگر وہ صلح کی طرف جھکیں تو اس طرح جھک جاؤ لہٰذا مسلمانوں کی جنگیں دفاعی ہیں ان کا مقصد قیام امن اور مذہبی آزادی کی بحالی تھی۔

معترض نے اَلَّذِيْنَ يَلُوْنَكُمْ مِنَ الْكُفَّارِ پر اعتراض کیا ہے یعنی جو لوگ ہمسایہ میں ہیں ان کو قتل کرو۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مسلمانوں کو تکلیفیں انہی لوگوں سے پہنچتی تھیں جو قریب تھے دور کے رہنے والوں نے کیا دکھ دینا تھا۔

معترض نے اپنے اعتراض میں محسن کش پڑوسیوں اور غلاموں سے لڑائی لڑنے کا الزام لگایا ہے یہ الزام سراسر غلط اور بدنیتی پر مبنی ہے اسلام تو پڑوسیوں اور غلاموں کے ساتھ بہتر سلوک کرنے کا حکم دیتا ہے ارشاد الٰہی ہے وَالْجَارِ ذِي الْقُرْبٰى وَالْجَارِ الْجُنُبِ وَالصَّاحِبِ بِالْجَنْبِ (النساء 36:4) اللہ تعالیٰ نے قریبی پڑوسی اور دور کے پڑوسی اور پہلو والے ساتھی کے ساتھ نیکی کا حکم دیا ہے۔ رسول کریم ﷺ فرماتے ہیں جو شخص خدا اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتا ہے اس کو چاہیے کہ وہ اپنے پڑوسی کو ایذا نہ دے (بخاری باب مَنْ كَانَ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَيَوْمِ الْآخِرَةِ فَلَا يُؤْذِي جَارَهُ) یہ ہے تعلیم پڑوسی کے متعلق باقی رہا غلام اسلام وہ دین ہے جس نے غلاموں کی آزادی کی تعلیم دی ہے۔ حتیٰ کہ بیت المال میں غلاموں کی آزادی کے لئے ایک مستقل مد مقرر دی ہے۔

لہٰذا معترض نے اسلام پر یہ اعتراض کر کے اپنی کم علمی اور اسلام کی تعلیم سے عدم واقفیت کا ثبوت دیا ہے جس قرآن کی آیت پر اعتراض کیا ہے۔ اسی قرآن مجید میں پڑوسیوں اور غلاموں کے حقوق مقرر کئے ہیں۔ وہ حقوق ہیں جو کسی مذہب میں نہیں پائے جاتے۔

الزامی جواب :- اس کے برعکس جب ہندو دھرم کا مطالعہ کیا جائے تو وہ وہاں شودروں غلاموں اور پڑوسیوں پر ظلم و جور کرنے کی تعلیم ملتی ہے۔

1۔ دھرم کے مخالفوں کو زندہ آگ میں جلا دو (یجروید ادھیاء 13 منتر 12)

2۔ دشمنوں کے کھیتوں کو اجاڑ دو (یجروید ادھیاء 13 منتر 13)

3۔اپنے مخالفوں کو درندوں سے پھڑوا ڈالو(یجروید 19,17,15)
4۔''جائز اور ناجائز طریق سے ہلاک کردو''(یجروید 28:1)
شودر کے متعلق یہ تعلیم ہے''شودر جس عضو سے برہمن کی ہتک کرے وہی عضو اس کا کاٹ دیا جائے اگر برہمن کے برابر بیٹھ جائے تو کمر پر داغ لگا کر چوتڑ کٹوا کر ملک سے باہر نکال دیا جائے(منو 2:381;اتھر 6:11:5:21:22:19)
''شودر کو نیک صلاح نہ دینی چاہیے۔(منو 4:79 رگ وید 8:70:11,2:12:4 وغیرہ)
آریوں کی تہذیب اس سے ظاہر ہوتی ہے کہ انہوں نے اپنے پڑوسی ممالک کو دسیو ملیچھ راکشس اور اناریہ کا خطاب دیا ہے۔

☆......☆

کیا خدا صرف مسلمانوں کا ہے۔اور مسلمانوں کے علاوہ دوسروں کو ہدایت نہیں کرتا

اعتراض : کیا خدا مسلمان کا ہی ہے دوسروں کا نہیں؟اور ایک وہ یک طرفہ ڈگری دینے والا ہے اگر مسلمانوں سے مراد ایمان دار ہیں تو ان کے لئے ہدایت کی ضرورت ہی نہیں اگر خدا مسلمانوں کے علاوہ دوسرے لوگوں کو ہدایت نہیں کرتا تو اس کا علم کس کام کا ہے(ستیارتھ پرکاش 89)

جواب : معترض نے سورۃ یونس کی آیت 57 کے چند الفاظ لے کر اعتراض کیا ہے جب کہ بقیہ آیت کو چھوڑ دیا ہے۔اگر مکمل آیت کو سامنے رکھا جائے تو اعتراض خود بخود دور ہو جاتا ہے۔ارشاد الٰہی ہے يَآيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَتْكُمْ مَّوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَشِفَآءٌ لِّمَا فِي الصُّدُوْرِ وَهُدًى وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ (یونس 57:10) اے لوگو!تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے نصیحت آ گئی ہے اور اس کے لئے شفا جو سینوں میں ہے اور مومنوں کے لئے ہدایت اور رحمت ہے۔

معترض نے صرف وَهُدًى وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ'' کے الفاظ لے کر اعتراض کر دیا ہے۔کہ ہدایت صرف مسلمانوں کے لئے ہے دوسروں کے لئے نہیں۔جب کہ یہ آیت يَآيُّهَا النَّاسُ (اے لوگو) سے شروع ہوتی ہے دنیا کے تمام لوگوں کو خطاب کیا ہے۔کہ ان کے پاس موعظۃ (نصیحت) آ گئی ہے۔اس پر عمل کرنا چاہیے۔یہ نصیحت دل کی روحانی بیماریوں کے لئے شفا ہے۔آخر میں بیان کیا جو لوگ اس موعظۃ (نصیحت) پر ایمان لے آتے ہیں اور اس پر عمل کرتے ہیں تو یہ موعظۃ (نصیحت) ان کے لئے ہدایت اور رحمت کا باعث ہے۔

اس آیت سے اللہ تعالیٰ کی کوئی طرف داری ظاہر نہیں ہوتی۔بلکہ دنیا کے تمام لوگوں کو نصیحت پر ایمان لانے اور اس پر عمل کرنے کی دعوت ہے قرآن مجید کی سورۃ فاتحہ لفظ رب العالمین سے شروع ہوتی ہے یعنی تمام جہانوں کا پالنے والا۔پھر قرآن مجید کو هُدًى لِّلنَّاسِ قرار دیا ہے یعنی تمام لوگوں کے لئے ہدایت ہے پھر رسول کریم ﷺ کی ذات کو رحمۃ للعالمین قرار دیا ہے۔

سوامی دیانند جی نے خود اپنی تصنیف میں اس بات کا ذکر کیا ہے کہ اس کتاب سے غیر متعصب شخص فائدہ اٹھا سکتا ہے سوامی جی رقمطراز ہیں''ان چودہ سملاسوں کو جو شخص تعصب چھوڑ کر انصاف کی نظر سے دیکھے گا۔اس کے اتما (دل) میں سچے معنوں کی روشنی سے راحت پیدا ہوگی۔اور جو شخص ضد و تعصب سے دیکھے سنے گا اس پر اس کتاب کا مطلب ٹھیک ٹھیک واضح ہونا بہت مشکل ہے(ستیارتھ پرکاش صفحہ 363 سملاس 10 نمبر 35)

زیر اعتراض آیت میں یہی بیان کیا گیا ہے اللہ کی طرف سے موعظہ (نصیحت) آ چکی ہے یہ موعظہ انہی لوگوں کے لئے باعث رحمت ہے جو اس پر ایمان لاتے ہیں۔موعظۃ صرف مسلمانوں کے لئے ہی نہیں کہ سب لوگوں کے لئے ہے لیکن فائدہ وہی اٹھاتے ہیں جو اس پر ایمان لاتے ہیں اور اس کی تعلیم کے مطابق عمل کرتے ہیں۔

پچاس ہزار برس کا ایک دن ۔ مردوں کا قبروں سے نکل کر دوڑ پڑنا (عجیب قسم کی تعلیم ہے)

اعتراض : جب پچاس ہزار برس کا دن ہے تو پچاس ہزار برس کی رات بھی ہوگی ۔ اگر اس قدر بڑی رات نہیں تو اتنا بڑا دن بھی نہیں ہوگا ۔ پچاس ہزار برسوں تک خدا فرشتے اور اعمال ناموں والے کھڑے رہیں گے بیٹھے رہیں گے، جاگتے رہیں گے ہر حالت میں بیمار ہو کر مر جائیں گے ۔ کیا قبروں میں نکل کر مردے خدا کی کچہری کی طرف دوڑیں گے اور سمن کیا ان کے پاس قبروں میں ہی پہنچیں گے؟ اور نیک اور بد سب قسم کے لوگ قبروں میں تا روز قیامت کیوں دورہ سپرد رہیں گے؟ اور آج کل خدا کی کچہری بند ہوگی ۔ اور خدا اور فرشتے بیکار بیٹھے ہوں گے ایسی ایسی باتیں سوائے جنگلی آدمیوں کے کوئی نہیں مان سکتا (ستیارتھ پرکاش اعتراض 146)

جواب:۔ یہ اعتراض سورۃ المعارج کی آیت 4,43 پر کیا گیا

یہ آیت 4: تَعۡرُجُ الۡمَلٰٓئِكَةُ وَالرُّوۡحُ اِلَيۡهِ فِىۡ يَوۡمٍ كَانَ مِقۡدَارُهٗ خَمۡسِيۡنَ اَلۡفَ سَنَةٍ (المعارج :۴)

فرشتے اور روح اس کی طرف چڑھتے ہیں ایک دن میں جس کا اندازہ پچاس سال ہے۔

آیت 43: يَوۡمَ يَخۡرُجُوۡنَ مِنَ الۡاَجۡدَاثِ سِرَاعًا كَاَنَّهُمۡ اِلٰى نُصُبٍ يُّوۡفِضُوۡنَ (المعارج :۴۳)

جس دن قبروں سے نکل پڑیں گے دوڑتے ہوئے گویا کہ وہ کسی نشان کی طرف دوڑے جا رہے ہیں۔

تمام مذاہب میں ہزاروں اور لاکھوں برس کے دن کا محاورہ موجود ہے اس دن میں راتیں بھی شامل ہیں۔ ہندو تعلیمات میں برہم دِوس اور برہم راتری (برھما کا دن اور رات) اربوں برس کہلاتا ہے اگر یہ سچ ہے تو پچاس ہزار برس کے برابر خدا کا ایک دن کیوں نہیں ہوسکتا عربی زبان میں یوم سے مطلق زمانہ مراد ہے خواہ 12 گھنٹے کا ہو۔ یا ایک لمحہ کا یا لاکھوں برس کا ہو یہ محاورہ اردو میں بھی ہے۔ مفہوم متعین کرنے کے لئے اس زبان کے محاورے کو سامنے رکھنا چاہیے پھر مفہوم متعین کرنا چاہیے قرآن عربی زبان میں نازل ہوا۔ اس کی کسی آیت کا مفہوم متعین کرنے سے پہلے عربی لغت کا لحاظ کرنا پڑے گا آیت کا مفہوم یہ ہے کہ خدا کا ایک دن تمہارے پچاس ہزار برس کے برابر ہوتا ہے کوئی دن لاکھ برس کا کوئی پچاس ہزار برس کا ڈارون کی اورجن اف سپیشیز (Darwins Origin of species) کو آپ نے پڑھا ہوتا یا سنا ہوتا تو آپ کو معلوم ہو جاتا کہ یہ زمین بھی لاکھوں برسوں کے مختلف دنوں میں بنی ہے اور ان دنوں کو طبقات الارض کے دن (Geologic time) کہا جاتا ہے۔

آیت مذکورہ میں انسانی روحانی ترقی کا ذکر کیا گیا ہے عالم روحانی میں مابعد الموت انسان نیکی کے فرشتوں کے ساتھ ایک دن

میں اتنی ترقی کرے گا جتنا اس نے عالم سفلی میں پچاس ہزار میں عروج حاصل کیا۔ زیر اعتراض آیت میں انسانی روحانی ترقی کا ذکر ہے۔ وہ روحانی ترقی اس تیزی کے ساتھ ہوگی اس روحانی ترقی کا ایک دن سفلی دنیا کے پچاس ہزار کے برابر ہوگا۔ گویا مابعد الموت نیک آدمیوں کے روحانی مدارج کا ذکر ہے۔ آیت قرآنی میں روح سے مراد روحانی اور نیک لوگ ہیں جو اللہ کی روح یعنی کلام سے زندہ ہوئے۔ اس آیت میں نیک لوگوں کے لئے ایک بشارت ہے وہ مرنے کے بعد اس دنیا کی روحانی ترقی سے بڑھ کر روحانی ترقی کریں گے۔ معترض اس معرفت کے نکتہ کو نہیں سمجھ پایا۔ قرآن مجید ایمان اور اعمال صالحہ کے حاملین کو مختلف صورتوں میں بشارتیں دیتا ہے۔ کہ ان کے اعمال ان کے اس دنیا تک محدود نہیں بلکہ بعد الموت بھی وہ روحانی ترقی کرتے رہیں گے اور خدا کا قرب حاصل کریں گے۔ اور اپنے نیک اعمال کی مختلف شکلوں میں لذتیں پائیں گے۔ ان کے نیک اعمال ہی جنت کی مختلف نعمتوں کی شکل اختیار کریں گے۔

زیر اعتراض آیت کا دوسرا مفہوم یہ ہے۔ اللہ کے ایک دن کے کام اتنے ہیں کہ تم سب مخلوق مل کر ہزار سال بلکہ پچاس ہزار برس تک بھی کرنا چاہو تو تم ان کو سرانجام نہ دے سکو گے اس آیت کے وہی معنی ہیں جو کن نیکون'' کے ہیں اس آیت میں اللہ کی قدرت کاملہ کا اظہار کیا گیا ہے۔

مُردوں کا قبروں سے نکل کر دوڑنا:

اس آیت کے ایک معنی یہ بھی ہیں کہ مُردے اپنے قبروں سے نکل کر اللہ کے حضور جمع ہوں گے ان کا حساب کتاب ہوگا۔ ہر روح اپنے کردہ عمل کی جزا و سزا پائے گی۔ تمام مذاہب اس نظریہ کے حامی ہیں۔ مُردوں کا قبروں سے نکلنا پھر خدا کے سامنے حاضر ہو کر اپنے اعمال کا حساب کتاب دینے کی نوعیت اور کیفیت کیا ہوگی۔ سب باتیں غیب سے تعلق رکھتی ہیں۔ ہر شخص اتنا ہی جانتا ہے جتنا ایک نبی یا صاحب کشف نے انسان کو بتایا نبی بھی حالت کشف میں اس اسرار کا کچھ حصہ پاتا ہے اور لوگوں کو آگاہ کرتا ہے یہ غیبی رموز ہیں۔ جن کا انسانی علم سے تعلق نہیں جو آسمانی کتب نے بتایا ہے اس حد تک انسان کو محدود رہنا چاہیے۔ ہر علم کا ماہر ہوتا ہے۔ امور غیبیہ کا تعلق اللہ تعالیٰ سے ہے اللہ تعالیٰ امور غیبیہ سے جتنا چاہے اپنے نبی کو بتا دیتا ہے۔ اور نبی اس علم کو لوگوں تک پہنچا دیتا ہے۔ جو شخص اپنے آپ کو صاحب علم جان کر امور غیبیہ کی طرف بڑھے گا وہ ٹھوکر کھائے گا۔ ہمیں جان لینا چاہئے کہ ایک دن مردے قبروں سے نکل کر خدا کے حضور جمع ہوں گے اور اپنے کردہ اعمال کی جزا و سزا پائیں گے۔ یہی تمام انبیاء کی تعلیم ہے کوئی شخص اپنے دنیاوی علم کے زور سے مُردوں کا قبروں سے نکلنے کی کیفیت اور نوعیت کو بیان نہیں کر سکتا امور غیبیہ علوم ظاہری کی حدود سے باہر ہیں یہ ظاہری علوم امور غیبیہ کی کہنہ تک نہیں پہنچ سکتے جس فلاسفر نے اپنے علم کے زعم میں امور غیبیہ کو بیان کرنے کی کوشش کی ہے اس نے ٹھوکر کھائی ہے امور غیبیہ کو کچھ جاننے کے لئے صرف آسمانی کتب ہیں خصوصاً قرآن مجید یا کسی حد تک رسول کریمﷺ کی احادیث جن میں خدا سے علم پا کر کسی امر غیب کی وضاحت کی گئی ہے۔

مُردوں کا قبر سے نکل کر بھاگنے کا دوسرا مفہوم:۔ عرب مُردہ حالت میں قبروں میں پڑے ہوئے ہیں ایک دن آئے گا جب خدا کے کلام (روح) کا ان پر اثر پڑے گا وہ مُردے زندہ ہو جائیں گے اور حضرت محمد مصطفٰےﷺ کی طرف بھاگیں گے۔ وہی مردہ قوم رسول کریمﷺ کی قوت قدسیہ سے زندہ ہو جائے گی یہ نظارہ تاریخ نے ہمارے سامنے پیش کیا ہے۔

☆......☆

روحوں کو خدا نے پیدا کیا تو وہ دائمی اور غیر فانی نہیں ہو سکتی جو چیز پیدا ہو گی وہ ضرور فنا ہو گی۔

اعتراض :۔ روحوں کو خدا نے پیدا کیا تو وہ دائمی اور غیر فانی کبھی نہیں ہو سکتیں پھر بہشت میں ہمیشہ کیوں کر رہ سکتی ہیں جو چیز پیدا ہوتی ہے وہ برباد بھی ضرور ہو جاتی ہے اور خدا آسمانوں کو اوپر نیچے کیسے پیدا کر سکتا ہے کیونکہ آسمان یعنی آکاش بے شکل سب جگہ پھیلا ہوا ہے اگر آسمان سے مراد کچھ اور لیتے ہو تو ایک چیز کا نام سے دوسرے کو موسوم کرنا درست نہیں اگر آسمان ایک دوسرے کے اوپر تہ بہ تہ ہیں تو ان کے بیچ میں چاند اور سورج کبھی نہیں رہ سکتے جن دو آسمانوں کے بیچ میں رکھے گئے ہیں وہ ہی روشن ہونے چاہئیں باقی سب تاریک رہنے چاہئیں اصل میں یوں نہیں ہے پس سات آسمانوں کی بات لغو ہے (ستیارتھ پرکاش اعتراض 147)

جواب:۔ یہ اعتراض سورۃ نوح کی آیت 14 تا 16 پر کیا گیا ہے۔

قرآن مجید میں آتا ہے وَقَدْ خَلَقَكُمْ اَطْوَارًا (نوح 14:71) اس نے تمہیں مختلف حالات سے گزار کر پیدا کیا:

☆......☆

انسان کا چھ (6) مختلف مراتب سے گزرنا اور مسئلہ ارتقاء

اس آیت میں روح کے پیدا کرنے کا ذکر نہیں بلکہ انسان کی پیدائش اور اس کا مختلف حالات سے گزرنے کے متعلق ذکر ہے۔ یہ حالات مختلفہ وہی ہیں جن کو قرآن مجید میں مختلف جگہوں اور مقامات پر بیان کیا گیا ہے مثلاً پہلے مٹی کی حالت پھر اس سے کئی حالتوں میں تبدیل ہو کر یعنی نبات کی حالت میں سے گزر کر پھر نطفہ کی شکل پھر مادر رحم میں مختلف ادوار میں سے گزر کر بچے کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ اس آیت میں انسانی پیدائش کے مختلف مراحل کا ذکر ہے جس پر سائنس نے مہر صدق ثبت کر دی ہے کسی کو نہ اعتراض۔ ہے نہ انکار قرآن مجید کا کمال یہ ہے کہ اس نے 1400 سال سے انسان کی ارتقائی پیدائش کا ذکر کر دیا ہے۔ یہ ارتقائی عمل ظاہر کرتا ہے کہ اُمّی نبی کو علیم وخبیر ہستی نے ہی اس باریک علم کی اطلاع دی ہے۔

دوسرا جزو: معترض نے یہ اعتراض کیا ہے جو چیز خلق ہو گی وہ فنا بھی ہو گی چونکہ روح خدا کی تخلیق ہے لہٰذا وہ ضرور فنا ہو گی وہ ہمیشہ بہشت میں کیسے رہے گی۔ سوامی دیانند جی اللہ تعالیٰ کی صفات سے بالکل بے خبر ہے۔ اللہ تعالیٰ کی ایک صفت خلق ہے۔ اس صفت کے تحت تخلیق کرتا ہے۔ اور فنا کرنا بھی اللہ کی صفت ہے جب اس کا ظہور ہوتا ہے تو چیز فنا ہو جاتی ہے۔ وہ چیز اس وقت فنا ہوتی ہے جب صفت فنا ظہور میں آئے۔ جب صفت فنا ظہور میں نہیں آتی تو کوئی چیز فنا نہیں ہوتی۔ لہذا جب روح صفت خلق کے ذریعہ پیدا ہو گئی۔ اس وقت تک وہ فنا نہیں ہو گی

جب تک اس پر صفت فنا کا اطلاق نہ ہو۔ اللہ کے قانون کے مطابق روح پر صفت فنا کا ظہور نہیں ہوگا لہٰذا روح پر فنا نہیں ہے یہ قاعدہ غلط ہے جو چیز پیدا ہوگی وہ ضرور فنا ہوگی۔ فنا وہی چیز ہوگی جس پر اللہ کی صفت فنا وارد ہو۔ لہٰذا سوامی جی کا کلیہ ہی بے بنیاد اور غلط ہے۔

آسمانوں اور ستاروں کے درجات طبقات:

سما (آسمان) علو اور بلندی کا نام ہے اور اس کے مختلف طبقے مختلف ہیئات اور مختلف اثرات ہیں کسی طبقے میں سورج چاند ہیں کسی طبقہ میں شہاب ثاقب ہیں کسی طبقہ میں بارش بنتی ہے کسی میں اولے اور برف بنتی ہے۔ کسی طبقہ میں پرندے اڑتے پھرتے ہیں۔

علماء سائنس نے سماء (آسمان) کو مختلف طبقات میں تقسیم کیا سورج چاند اپنے اپنے طبقہ میں کام کر رہے ہیں قرآن مجید ہی وہ کتاب ہے جس نے سائنس کی نئی راہیں کھولی ہیں۔ اس امی عربی نبی کا ایک علمی احسان ہے کہ اس نے دنیا کی توجہ علم ہیئت کی طرف دلائی ہے آج دنیا اس نتیجہ پر پہنچی ہے جس کی اطلاع قرآن مجید نے دی تھی ہر قرآن مجید کی صداقت پر ایک واضح اور روشن دلیل ہے۔

☆......☆

مسلمان مشرک ہیں۔ محمد (ﷺ) کو خدا کا شریک ٹھہراتے ہیں

اعتراض:۔ وَاَنَّ الْمَسَاجِدَ لِلّٰهِ فَلَا تَدْعُوْا مَعَ اللّٰهِ اَحَدًا مسجدیں اللہ کے واسطے ہیں پس اللہ کے سوا کسی کو مت پکارو (الجن) اگر یہ سچ ہے تو مسلمان اپنے کلمہ لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ میں محمد کو خدا کا شریک کیوں گردانتے ہیں تو قرآن کے خلاف ہے اگر تمہارا کلمہ درست ہے تو قرآن کی مندرجہ بالا آیت غلط ماننی پڑے گی اگر مسجدیں خدا کا گھر ہیں تو مسلمانوں کے بت پرست ہونے میں ذرا شک نہیں رہا۔ پورانکوں اور جینیوں کی طرح جو اپنے مندروں کو خدا کا گھر مانتے ہیں مسلمان بھی اپنی مسجدوں کو خدا کا گھر تصور کرتے ہیں اس لئے ان کے مانند یہ بھی بت پرست ہیں۔

(ستیارتھ پرکاش اعتراض 148)

جواب: یہ اعتراض سورۃ الجن کی آیت 18 پر کیا گیا ہے۔ معترض کی خدمت میں یہ عرض ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر نبی کو سب سے پہلے توحید کا پیغام دیا پھر اس کی عبادت کا۔ یعنی اللہ کو ایک مان کر اس کی عبادت کی جائے تمام انبیاء علیھم السلام کی تعلیم کا محور ہی توحید باری تعالیٰ ہے ارشاد الٰہی ہے۔

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا نُوْحِيْٓ اِلَيْهِ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا فَاعْبُدُوْنِ (الانبیاء 25:21)

اور تجھ سے پہلے ہم نے کوئی رسول نہیں بھیجا مگر اس کی طرف ہم یہی وحی کرتے تھے کہ میرے سوائے کوئی معبود نہیں سو میری عبادت کرو۔

رسول کریم ﷺ کے متعلق آتا ہے۔ قُلْ اِنَّمَآ اَدْعُوْا رَبِّيْ وَلَآ اُشْرِكُ بِهٖٓ اَحَدًا (الجن 20:72) کہہ میں صرف اپنے رب کو پکارتا ہوں اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہیں کرتا۔

مذکورہ آیت میں رسول کریم ﷺ ایک خدا کا اعلان کر رہے ہیں صرف اللہ کی ذات ہے جس کو آپ دن رات پکارتے ہیں اور اسی کے سامنے سجدہ ریز رہتے ہیں۔ جب کفار رسول کریم ﷺ کو ایک خدا کی عبادت کرتے ہوئے دیکھتے تو آپ ﷺ پر لپک پڑتے مارتے

پیٹتے۔ارشادالٰہی ہے وَّاَنَّهٗ لَمَّا قَامَ عَبْدُ اللّٰهِ يَدْعُوْهُ كَادُوْا يَكُوْنُوْنَ عَلَيْهِ لِبَدًا(الجن 19:72)اور جب اللہ کا بندہ (رسول کریم ﷺ) اسے (خدا) کو پکارتا ہوا اٹھا تو قریب تھا کہ اس پر ہجوم کر کے اسے ماردیں۔

کفار مکہ کو رسول کریم ﷺ سے سب سے بڑی دشمنی کی وجہ توحید باری تعالیٰ کی تعلیم اور بتوں کی پرستش کا ابطال تھی آپ ﷺ کے چچا ابو طالب کے پاس بھی یہی شکایت کرنے گئے تھے کہ آپ اپنے بھتیجے کو سمجھائیں کہ وہ ہمارے بتوں کو برا بھلا کہنا چھوڑ دے۔ساتھ دھمکی بھی دی۔تو رسول کریم ﷺ کا جواب تو اریخ میں درج ہے آپ نے فرمایا اگر یہ لوگ میرے دائیں ہاتھ پر سورج اور بائیں پر چاند رکھ دیں تو میں اس پیغام (توحید) کو نہیں چھوڑ سکتا۔کفار نے مسلمانوں پر تکالیف اور مصائب اسی لئے ڈھائے تھے کہ وہ ایک خدا کی عبادت کرتے تھے۔یہاں تک کہ مسلمانوں کو صرف ایک خدا ماننے کی سزا میں اپنے گھر بار چھوڑنے پڑے۔اس موحد قوم کو مشرک کہنا پرلے درجہ کی لاعلمی اور ناسمجھی ہے۔

کلمہ توحید میں رسول کریم ﷺ کا ذکر:

کلمہ توحید میں رسول کریم ﷺ کے ذکر کو مورد الزام اور ہدف اعتراض بنایا ہے۔اس کلمہ توحید میں رسول کریم ﷺ کو توحید میں شریک نہیں ٹھہرایا گیا بلکہ محمد ﷺ کو خدا کا خادم اور پیغمبر توحید بیان کیا گیا ہے۔یعنی رسول کریم ﷺ کی وہ ذات ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے توحید کا پیغام دے کر بھیجا ہے۔کلمہ توحید میں اللہ مخدوم ہے اور محمد مصطفےٰ ﷺ خادم۔کیا مخدوم اور خادم برابر ہو سکتے ہیں کلمہ توحید میں محمد ﷺ کو رسول اللہ کہہ کر پکارا ہے یعنی محمد رسول اللہ ہیں یعنی اللہ کے ایلچی۔پس کلمہ توحید (لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ) خالص توحید کا کلمہ ہے۔اس میں حضرت محمد مصطفےٰ ﷺ کو خدا کا بندہ اور اس کا رسول قرار دیا گیا ہے۔ایک رسول کا یہی مقام ہے۔

الزامی جواب:۔ ہندو دھرم کی کتب وید شرک کی تعلیم سے پُر ہیں۔ویدوں میں دیوتاؤں کی تعداد مختلف ہے یجروید میں لکھا ہے کہ دیوتا کل 33 ہیں 11 زمین پر 11 آسمان پر 11 اوپر جنت میں رگوید منڈل 3 سوکت 9 منتر میں لکھا ہے کہ کل دیوتا 3340 ہیں رگ وید کے بیان کے مطابق 3339 دیوتاؤں نے مل کر اگ دیوتا کو گھی سے سینچا۔اور اس کے پاس گئے۔پس 3339 میں ایک اضافہ ہوا تو 3340 دیوتا بن گئے۔چنانچہ رگ وید منڈل 10 سوکت 52 منتر 6 میں واضح الفاظ میں لکھا ہے کہ کل دیوتا 3340 ہیں۔

بلحاظ جائے رہائش دیوتاؤں کی تین اقسام ہیں پرتھوی ستھانی (زمین میں رہائش والے) مدھیہ ستھانی (فضا میں مقیم) دیوستھانی (آسمان میں رہنے والے دیوتا) مثلاً اگنی۔اندر سوریہ

دیوتاؤں کی یہ کثرت شرک فی ذات الٰہی ہے۔ہندو روح مادہ آکاش اور زمانہ کو خدا کے برابر ازلی ابدی مانتے ہیں۔یہ شرک فی الصفات ہے اسی طرح اگ ہوا، پانی دریا پہاڑ زمین سورج اور چاند کی عبادت کرنا شرک فی عبادت ہے گویا ہندو شرک فی الذات، صفات اور عبادت میں مبتلا ہیں یہ مسلمانوں کو مشرک کہنے سے پہلے اپنے مذہب کو شرک سے تو پاک کریں۔

☆......☆

سورج اور چاند کیسے اکٹھے ہو سکتے ہیں؟

اعتراض: جُمِعَ الشَّمْسُ وَالْقَمَرُ (سورۃ القیامۃ) سورج اور چاند اکٹھے کردئے جائیں گے۔ بھلا کبھی سورج اور جاند اکٹھے ہو سکتے ہیں یہ کس قدر بے سمجھی ہے اور سورج چاند کا اکٹھا ہونا کس مطلب کے لئے ہے اور نظام شمسی کے دوسرے کروں کو اکٹھا نہ کرے کی وجہ کیا ہے؟ کیا ایسی ناممکن باتیں خدا کی طرف سے ہو سکتی ہیں سوائے جہلا کے کون ایسی باتیں کہہ سکتا ہے؟ (ستیارۃ پرکاس اعتراض 149)

جواب: یہ اعتراض سورۃ القیامتہ کی آیت 9 پر کیا گیا ہے۔ اس آیت کا تعلق علم ہیت سے ہے جس کو معترض سمجھ ہی نہیں۔

سورج اور چاند کا جمع ہونا:۔ اس آیت سے قبل خسف قمر کا ذکر ہے خسف قمر سے مراد اگر گرہن لیا جائے تو جُمِعَ الشَّمْسُ وَالْقَمَرُ سے سورج گرہن اور چاند گرہن کا اکٹھا واقع ہونا لیا جائے گا چنانچہ یہ اجتماع 1893 میں ہو چکا ہے۔ لہٰذا اعتراض خود بخود باطل ہو جاتا ہے۔

دوسرا مفہوم:۔ سورج اور چاند دونوں کے جمع ہونے کا مطلب یہ ہے کہ دونوں ایک حالت میں ہو جائیں گے چاند اس وقت تک تاریک نہیں ہوسکتا جب تک سورج روشن ہے۔ چاند ایک وقت زمین کی طرح سورج کا ایک ٹکڑا تھا مگر آہستہ آہستہ ٹھنڈا ہو کر مردہ اور تاریک ہو گیا۔ اب وہ سورج کے نور سے روشن ہے قرآن مجید فرماتا ہے کہ اسی طرح سورج بھی ایک وقت ٹھنڈا ہو جائے گا۔ گویا دونوں ایک حالت اور کیفیت میں ہو جائیں گے۔ یہ قیامت کی علامت ہے جب سورج اور چاند ایک حالت میں ٹھنڈے ہو جائیں گے۔ تو دنیا پر تباہی آجائے گی۔ یہی سائنس کی موجود تحقیق کہہ رہی ہے۔ یہ موجودہ سائنسی تحقیق کے عین مطابق ہے جس کو معترض بنظر استعجاب دیکھ رہا ہے۔

اس آیت میں سورج اور چاند کی بچاری قوموں کو یہ بتایا ہے کہ نظام شمسی بھی حالت تغیر میں ہے جو چیز حالت تغیر میں ہو وہ معبود نہیں ہوسکتی۔

لہٰذا سورج اور چاند معبود نہیں بن سکتے۔ اسی لئے دوسری جگہ اللہ تعالیٰ نے سورج اور چاند کی عبادت سے منع فرمایا ہے ارشاد الٰہی ہے لَا تَسْجُدُوْا لِلشَّمْسِ وَلَا لِلْقَمَرِ وَاسْجُدُوْا لِلّٰہِ الَّذِیْ خَلَقَهُنَّ سورج کو سجدہ نہ کرو اور نہ چاند کی عبادت کرو جس نے ان کو پیدا کیا ہے اسی کو سجدہ کرو آیت زیر اعتراض میں سورج اور چاند کا اکٹھا ہونے کا ذکر ہے۔ جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ دونوں حالت تغیر میں ہیں۔ لہٰذا جو چیز متغیر ہوگی وہ معبود نہیں بن سکتی۔

☆......☆

حوروں اور غلمان پر اعتراض

اعتراض: کیوں حضرت موتیوں کے رنگ والے لڑکے کس لئے وہاں ہیں؟ کیا نوجوان خدمت گار اور عورتیں بہشتیوں کی سیری کے لئے کافی نہیں ہیں؟ اس خلاف وضع فطرت گناہ عظیم کی بنا یہی قرآن کا قول ہو تو کیا تعجب ہے؟ اور بہشت میں خادم اور مخدوم کا رشتہ ایک کو آرام دہ اور دوسرے کو تکلیف دہ ہے کیا وجہ کہ یہ طرف داری روا رکھی گئی ہے اور خدا جب خود ساقی بنے گا تو بہشتیوں کا گویا خادم ہوگا ایسی صورت میں خدا کی عظمت کہاں رہے گی؟ بہشت میں حمل ہوتا ہے اور بچے بھی پیدا ہوتے ہیں یا نہیں اگر نہیں ہوتے تو مرد و زن کی صحبت رائیگاں گئی۔ اور اگر ہوتے ہیں تو ان کی روحیں کہاں سے آئیں؟ اور بغیر خدا پرستی کے بہشت میں کیوں پیدا ہو گئے؟ اور انہیں بغیر ایمان لانے اور خدا کی عبادت کرنے کے بہشت مفت کیوں مل گئی؟ اس سے تو خدا کے انصاف میں فرق آئے گا (ستیارتھ پرکاش اعتراض 150)

جواب: ۔اعتراض سورۃ الدھر کی آیات 19 تا 21 پر کیا گیا ہے۔

حور غلمان اور دیگر بہشت کی نعمتوں پر تفصیلی بحث سیرت سید البشر حصہ دوم کے باب ایمان بالآخرۃ اور حصہ سوم میں گزر چکی ہے بہشت کی نعماء کی نوعیت اور کیفیت کا ذکر کیا گیا ہے۔ سلسلہ کلام کو جاری رکھنے کے لئے یہاں صرف یہ عرض کرنا ضروری ہے کہ بہشت میں حور اور غلمان کی ایک تشریح یہ بھی ہے امید ہے اس سے معترض کو جواب مل جائے گا۔ قرآن مجید میں مومن مردوں مومنہ عورتوں اور ان کی معصوم اولاد کو بہشت میں حوریں اور غلمان کہا گیا ہے۔ کیا ایک نیک پاک مومنہ عورت کو حور کہنا گناہ ہے اور کیا یہ بات قابل اعتراض ہے اسی طرح ایک مومن مرد کا بچہ بچپن میں معصومیت کی حالت میں فوت ہو جاتا ہے اس کو غلما نکہہ دیا جائے تو کیا برائی ہے۔ حور اور غلمان پاکیزگی کی علامت ہیں جس کو معترض نہیں سمجھ سکا۔ اس دنیا کی بود و باش اور دوسری دنیا کی بود و باش میں کوئی مماثلت نہیں۔ دوسری دنیا کی بود و باش کی کیا کیفیت ہوگی۔ بہشت میں بہشتیوں کو جو نعمتیں میسر آئیں گی ان کی کیفیت اور نوعیت کیا ہوگی وہ اللہ ہی جانتا ہے۔ صرف بہشت کی نعمتوں کے نام میں اشتراک اس دنیا کی نعمتوں کے ساتھ پایا جاتا ہے۔ لیکن جنت کی نعمتوں کی نوعیت اور کیفیت جاننا انسانی عقل سے باہر ہے۔ ہمیں اتنا ہی علم ہے جتنا رسول کریم ﷺ نے کشفی نظارے سے دیکھ کر بتایا ہے۔ یا قرآن یا دیگر کتب سماوی نے وضاحت کی ہے۔

بہشت کی نعمتوں کا ذکر ہر آسمانی کتاب میں کسی نہ کسی رنگ میں پایا جاتا ہے۔ ہر نبی نے یہ بتایا ہے کہ اللہ تعالیٰ قیامت کے دن لوگوں کو اپنی نعمتوں سے نوازے گا۔ قرآن مجید نے بھی اسی موضوع کو باحسن طریق بیان کر دیا ہے۔ بہشت کی نعمتوں کا ذکر صرف قرآن مجید نے ہی نہیں کیا ہر نبی اور ہر آسمانی کتاب نے ذکر کیا ہے۔ اصطلاحیں الگ الگ ہو سکتی ہیں لیکن موضوع کی نوعیت ایک ہی ہے۔ اعتراض کیسا۔

الزامی جواب:

جب ویدوں کا مطالعہ کیا جائے تو وہاں جن گندھروں لمبے لمبے بالوں والے گانے بجانے والے خوبصورت لونڈوں (غلمان) کا ذکر آتا ہے جو انسان دیوتا اور اپسراؤں کی طرح ایک الگ مخلوق ہے جن کے ننھے گھڑے گھڑے کے برابر بتائے گئے ہیں (اتھروید کانڈ 8 سوکت 6 منتر 14) جن کے ساتھ حسب الارشاد اتھروید 15 گندھرویئہ مدنتے ''ان گندھروں کے ساتھ لالہ لوگ لطف اندوز ہوں گے۔

اتھروید کانڈ 4 سوکت 34 منتر 2 میں بہشتی پنڈتوں کو سواستریوں (بیویوں) کے جھنڈ ملنے کا وعدہ موجود ہے۔

سوامی جی کے سوقیانہ طرز نگارش کی وجہ سے ان کو ویدوں کی راہ دکھائی ہے ورنہ جی نہیں چاہتا تھا کہ وید کے تہذیب سے گرے ہوئے منتروں کا ذکر کیا جائے قرآن مجید میں کہیں یہ ذکر نہیں کہ بہشت میں اللہ تعالیٰ ساقی ہوگا۔قرآن مجید میں صرف اللہ کی نعمتوں کا ذکر ہے ایسا ہی جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی صفت رحمانیت کے تحت انسان کے لئے اس دنیا میں ہر چیز پیدا کر دی ہے۔ان نعمتوں میں پانی بھی ہے کیا جب ہم پانی پی رہے ہوتے ہیں تو کیا اللہ پلا رہا ہوتا ہے۔انسان اس نعمت سے فائدہ اٹھا رہا ہوتا ہے ایسے ہی دوسری دنیا میں بہشتیوں کے لئے اللہ تعالیٰ ہر قسم کی نعمتیں پیدا کر دے گا۔انسان ان سے لطف اندوز ہوگا۔اس دنیا کی نعمتیں بھی اسی نے دی ہیں اور آخرت میں بھی اسی کی نعمتیں ہوں گی سب مذاہب کا اس پر اتفاق ہے قرآن کی رو سے جنت میں خادم ومخدوم کا کوئی رشتہ نہیں اور نہ جنت میں حمل اور اولاد پیدا ہونے کا ذکر ہے۔یہ سب باتیں سوامی جی کی اپنی ذہنی اختراع ہے۔

☆......☆
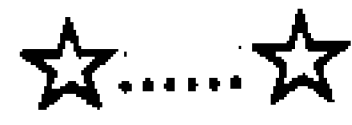
جنت اور دوزخ کی نعماء اور سزائیں، شیطان خدا کی سلطنت کے لئے خطرہ ہے

اعتراض :۔اگر اعمال کے مطابق بدلہ دیا جائے گا تو ہمیشہ بہشت میں رہنے والی حوروں، فرشتوں اور موتیوں کے سے لڑکوں کو کن اعمال کے مطابق ہمیشہ کا بہشت ملے گا۔جب بہشتی پیالے بھر بھر کر شراب پیئیں گے تو مست ہو کر کیوں نہ آپس میں لڑیں گے روح یہاں الگ فرشتے کا نام ہے۔جو سب فرشتوں سے بڑا ہے۔ کیا خدا روح اور فرشتوں کو صف بستہ کھڑے کر کے ان کی پلٹنیں بنائے گا۔اور ساری پلٹن کو سزا دلوائے گا۔ اور خدا اس وقت کھڑا ہوگا یا بیٹھا ہوا؟ اگر خدا اپنی پلٹن سے قیامت تک شیطان کو گرفتار کرے تو اس کی سلطنت بے خطر ہو جائے۔اور اس بہادرانہ کام کرنے سے اس کی خدائی کا اظہار ہو سکتا ہے (سیتارتھ پرکاش اعتراض 151)

جواب:۔ سورۃ النباء کی آیات 38,34,26 پر اعتراض کیا گیا ہے۔

قرآن مجید میں سزا کے متعلق حکیمانہ اصول:

ارشاد الٰہی ہے جَزَآءً وِّفَاقًا (النباء 26:78) اعمال کے مطابق بدلہ ہوگا۔یعنی جس قسم کی روحانی بیماری ہوگی ویسے ہی اس کا

علاج ہوگا۔ اگر بیماری کا علاج گرم پانی ہے تو اس کی بیماری کا علاج گرم پانی سے کیا جائے گا۔ اگر بیماری کا علاج ٹھنڈا پانی ہے۔ تو ٹھنڈے پانی سے کیا جائے گا۔ قرآن مجید میں دوزخیوں کی مختلف سزاؤں کا ذکر ہے۔ دراصل وہ سزائیں اس روحانی بیماریوں کے علاج ہیں اس دنیا میں ہم دیکھتے ہیں کہ ہسپتال میں مختلف قسم کی بیماریوں کے مریض آتے ہیں ان کے علاج بھی بیماری کے مطابق کئے جاتے ہیں۔ بخل مرض کا علاج الگ ہے۔ تکبر کا علاج الگ ہے۔ ظلم کا علاج الگ ہے علیٰ ھذا القیاس جس قسم کی بیماری ہوگی اسی قسم کا علاج ہوگا۔ اسی طرح مختلف نیک اعمال کا بدلہ مختلف شکلوں میں ملے گا۔ سخاوت کا الگ شکل میں شجاعت کا الگ شکل میں اور ہمدردی اور پیار کا الگ شکل میں۔ الغرض اعمال کی جزا وسزا کا ایک حکیمانہ اصول ہے۔ جس کا ذکر صرف قرآن مجید میں ملتا ہے اور یہی صحیح ہے۔

بہشت خدا کا فضل ہے (معترض نے لاعلمی کی بناء پہ اعتراض کر دیا ہے بہشت میں رہنے والی حوروں، فرشتوں اور موتیوں کے سے لڑکوں کو کن اعمال کے مطابق ہمشہ کا بہشت ملے گا۔ اسلام کی فلاسفی یہ ہے کہ جنت کسی عمل کے ذریعے نہیں ملتی۔ یہ اللہ کے فضل سے ملتی ہے اس پر مفصل بحث کی جا چکی ہے۔

جنت میں پاک پیالہ (کاسادھاقا) پینے کو ملے گا۔ اس کی ساتھ ہی یہ تعریف کر دی گئی اور آپ کے وہم کو رو بھی کر دیا گیا ہے فرمایا لَا یَسْمَعُوْنَ فِیْهَا لَغْوًا وَّلَا كِذّٰبًا) وہ جنت میں کوئی لغو اور جھوٹ نہیں سنیں گے بہشت کی شراب کا یہی خاصہ ہے۔

روح اور ملائکہ کا صف بستہ ہونا:

روح اور فرشتوں کا صف بستہ کھڑے ہونا مومنوں کی روحانی ترقی کی طرف اشارہ ہے۔ کہ جس طرح اس دنیا میں روح اور فرشتے انسان کی روحانی ترقی کا ذریعہ ہیں۔ فرشتے انسان کو نیک تحریکات کرتے ہیں۔ انسان ان پر عمل کر کے روحانی مدارج طے کرتا ہے اسی طرح روح اور فرشتے بہشتیوں کی روحانی ترقی کے لئے صف بستہ ہوں گے۔ بتایا گیا ہے بہشت میں بھی انسان روحانی ترقی کرتا رہے گا۔

اسلام کا خدا نہ کھڑا ہوتا ہے نہ بیٹھتا ہے۔ وہ ایک ایسی غیر مرئی ذات ہے جس کا انسان تصور بھی نہیں کر سکتا۔

الزامی جواب:

جب ہندو دھرم کے ادب کا مطالعہ کیا جائے تو وہاں مختلف گناہوں کے مرتکبین کو مختلف سزائیں دیئے جانے کا ذکر ہے خوشبو کے چور کو چھچھوندر (منو12:65) دھان کے چور کو چوہا (منو12:62) پرلے درجے کے سیاہ کار کو مچھلی (منو12:42) متوسط درجے کے گناہ گار کو سور (43:12) اعلیٰ درجے کے پاپی کو خوبصورت مرغ (44:12) بنا دیا جاتا ہے گویا منو میں مختلف قسم کے گناہ گاروں کو مختلف جونوں میں ڈھالا گیا ہے اگر گناہوں کی مناسبت سے ان جونوں کا مطالعہ کیا جائے تو گناہ اور سزا میں کوئی ربط اور تعلق نہیں مثلاً اعلیٰ درجہ کے گنا گار کو خوبصورت مرغ بنانے میں کیا تعلق ہے اسی طرح متوسط درجہ کے پاپی کو سور بنا دینے میں کیا مناسبت ہے۔ بہر حال ہندو دھرم کے قانون کی کتاب میں مختلف گناہ گاروں کی مختلف قسم کی جونوں کا ذکر ہے۔ الغرض ہر آسمانی کتاب میں مختلف گناہوں کی مختلف سزاؤں کا ذکر ہے اسلام نے اسی موضوع کو ایک حکیمانہ انداز میں بیان کیا ہے جس کو معترض سمجھ نہیں پایا۔

ویدک اپنشد میں ایشور کی انسانی صفات:

اسلام کا خدا تمام انسانی صفات سے پاک ہے وہ صفات اعلیٰ کا مالک ہے۔ وہی صفات اس دنیا میں جلوہ افگن ہیں۔ ان صفات کے سہارے تمام کائنات قائم ہے البتہ ویدوں کے مطالعہ سے یہ واضح ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ انسانی صفات کا مالک ہے چنانچہ رگ وید منڈل اسوکت 25 منتر 10 اور 12 میں ہے ورن حسب معمول اپنے لوگوں میں بیٹھتا ہے۔ وہ نہایت دانا سب پر حکومت کرنے کو بیٹھا ورن پر ماتما

سونے کا لباس پہن کر اپنا مضبوط بدن ڈھانکتے ہیں۔اس کے سپاہی اس کے گرد بیٹھے ہیں۔"

اتھر وید کانڈ 15 سوکت 3 منتر 2,1 میں ہے وہ برس بھر اوپر کھڑا رہا اسے دیوتاؤں نے کہا ورا تیہ (خدایا) کیوں تو کھڑا ہے۔اس نے کہا میرے لئے ایک چوکی لاؤ اس کے لئے وے ایک چوکی لائے۔

ویدک کا راکشسوں سے مقابلہ:

سوامی جی نے اپنی لاعلمی کا اظہار کرتے ہوئے لکھا ہے اگر خدا اپنی پلٹن سے قیامت تک شیطان گرفتار کر لیتا تو تو اس کی سلطنت بے خطر ہو جاتی۔یعنی اسلام کا خدا شیطان کو گرفتار نہ کر سکا۔اسلام کے نزدیک اللہ تعالیٰ کی سلطنت کو کسی شیطان سے کوئی خطرہ نہیں شیطانی قوتیں جو دنیا میں کام کر رہی ہیں وہ انسان کی روحانی ترقی کا ذریعہ ہیں شیطانی قوتوں کے مقابل پر ملکوتی قوتیں بھی ہیں یہ دونوں قوتیں انسان سے تعلق رکھتی ہیں۔ان کا خدا کی سلطنت سے کوئی سروکار نہیں یہی قوتیں انسان کی ترقی اور پستی کا ذریعہ ہیں۔جب انسان ملکوتی قوتوں کی پیروی کرتا ہے تو انسان ترقی کے راستہ پر گامزن ہو جاتا ہے اس کے برعکس جب انسان شیطانی قوتوں کی پیروی کرتا ہے تو وہ پستی کی راہ اختیار کر لیتا ہے۔اللہ تعالیٰ نے انبیاء علیھم السلام کی معرفت دونوں قوتوں کے متعلق مطلع کر دیا ہے اس کے ساتھ نور عقل سے بھی نوازا ہے کہ وہ عقل کے نور سے دیکھ لے کہ آیا وہ راہ مستقیم پر ہے یا راہ ضلالت پر۔ان دونوں قوتوں کے درمیان انسان زندگی بسر کر رہا ہے انسان کو اختیار ہے کہ جس راستہ پر چاہے گامزن ہو جائے۔اس پر کوئی جبر نہیں ان قوتوں کے مطابق عمل کی جزا و سزا ہے۔اگر انسان نے ملکوتی قوت کے مطابق عمل کیا ہے تو وہ جزا پائے گا۔اگر شیطانی اور طاغوتی قوت کے مطابق عمل کیا ہے تو سزا۔معترض نے شیطان کی تخلیق کے مسئلہ کو سمجھا نہیں۔

جب ویدوں کا مطالعہ کرتے ہیں تو ویدوں کا ایشور راکشسوں کے مقابل بے بس نظر آتا ہے۔وید میں اندر (آریوں کا خدا) کہتا ہے میں راکشسوں کو مٹی کے برتنوں کی طرح پھوڑتا ہوں۔مگر راکشس، ملیچھ، اسر اور انار یہ دن بدن بڑھتے ہی چلے گئے۔اندر کی سلطنت بے خطر تو کیا ہوتی الٹی برباد ہوتی چلی گئی۔اور اندر کی راجیہ بھومی (ہندوستان) پر گئو خوروں کا قبضہ ہو جانے سے اس کے دل کا ناسور بد سے بدتر ہوتا چلا گیا مگر یہ آریہ ورت کا شور بیر اندر ان راکشسوں کا کچھ نہ بگاڑ سکا۔

آریوں کے اندر نے راکشسوں کو تباہ و برباد کرنے کا جو دعویٰ کیا تھا۔اس میں بری طرح ناکام و نامراد رہا۔اس کے بالمقابل جب اسلام کے خدا کو دیکھتے ہیں۔کہ کس طرح اسلام کے دشمنوں کو ناکام و نامراد کیا۔رسول کریم ﷺ کئی سال طاغوتی طاقتوں سے نبرد آزما رہے آخر کار 8 ہجری کو دشمنوں پر کامل فتح پائی اور طاغوتی طاقتیں زیر ہوئیں حق غالب آ گیا اور باطل مغلوب شیطانی قوتیں خدا کی سلطنت کا کچھ بھی بگاڑ نہ سکیں۔

سورج کا لپیٹا جانا تاروں کا گدلا ہونا کیسے ممکن ہے؟

اعتراض: **یہ بڑی بے سمجھی کی بات ہے کہ گول شکل والا سورج کا کرہ لپیٹا جاوے گا۔اور تارے گدلے کیونکر ہو جائیں گے اور پہاڑ بے جان ہو کر کیسے رواں دواں ہوں گے۔اور آسمان کیا کوئی جانور ہے کہ اس کی کھال اتاری دی جائے گی (ستیارتھ پرکاش اعتراض 152)**

جواب: ۔یہ اعتراض سورۃ التکویر آیات 1 تا 3 پر کیا گیا ہے۔اِذَا الشَّمْسُ كُوِّرَتْ [۱] وَإِذَا النُّجُومُ انْكَدَرَتْ [۲] وَإِذَا

الْجِبَالُ سُيِّرَتْ (التکویر 81:1-3) جب سورج لپیٹ لیا جائے گا اور جب تارے جھڑ جائیں گے اور جب پہاڑ چلائے جائیں گے۔

وَاِذَا السَّمَآءُ كُشِطَتْ (11) جب آسمان کی کھال اتاری جائے گی مذکور آیات کے کئی مفاہیم ہیں جو معترض کی نظر سے محض لاعلمی کی وجہ سے اوجھل تھے۔ چند ایک مفاہیم کا ذکر کیا جاتا ہے۔

سورج کا لپیٹا جانا ستاروں کا ماند پڑ جانا۔

سورج کا لپٹا جانا ستاروں کا ماند پڑ جانا محاورہ کے طور پر استعمال ہوا ہے۔

یہ محاورہ صرف عربی زبان میں ہی نہیں بلکہ تمام زبانوں میں مستعمل ہے۔ چنانچہ بائبل کی کتب یسعیاہ 34:1 تا 4) یوایل کی کتاب 31:2، 15:3، 2:2 اور 10:2، یسعیا 9:13، 10 اور 19:60، حزقیل 7:32، 8۔ عاموس 20:5، 9:8، صفیاہ 15:1 انجیل متی 29:24، مرقس 24:13، لوقا 25:21، مکاشفات 22:21 میں سب مقامات پر اس محاورہ اور قیامت خیز نشانات کا ذکر ہے۔ سورج کی تکویر اور ستاروں کا جھڑ جانا مجاز کے طور پر نظام روحانی میں ایک خلل واقع کی طرف اشارہ ہے۔ مراد یہ ہے جب دین کا سورج لپیٹ لیا جاتا ہے اور دین کی روح سے غفلت برتی جاتی ہے۔ اور علماء دین، دین سے راہنمائی لینا چھوڑ دیتے ہیں اور ان پر دنیاداری کا غلبہ ہو جاتا ہے راہ مستقیم سے بھٹک جاتے ہیں تو نظام روحانی کی صف لپیٹ لی جاتی ہے۔ تو اس وقت دنیا میں فساد برپا ہو جاتا ہے حدیث شریف میں بھی صحابہ کو نجوم سے تشبیہ دی ہے ''صحابی کالنجوم'' میرے صحابہ ستاروں کی طرح ہیں۔

تو آیت نمبر 1، 2 میں سورج کی تکویر اور ستاروں کے جھڑ جانے سے مراد روحانی زندگی کی موت ہے۔ روحانی زندگی علماء ربانی کے ساتھ وابستہ ہے جب علماء ربانی کی جگہ علماء سوء لے لیں تو روحانی زندگی ختم ہو جاتی ہے۔

آیت نمبر 3 وَاِذَا الْجِبَالُ سُيِّرَتْ اور جب پہاڑ چلائے جائیں گے جبال، جبل کی جمع ہے یعنی پہاڑ یہ لفظ عظیم انسانوں پر بولا جاتا ہے فراء کا قول ہے اَلْجَبَلُ سَيِّدُالْقَوْمِ وَعَالِمُهُمْ یعنی قوم کے سردار اور ان کے عالم کو جبال کہا جاتا ہے طاقت ور آدمی کے لئے کہا جاتا ہے فلان جَبَلٌ مِنَ الْجِبَالِ وہ شخص پہاڑوں میں سے پہاڑ ہے۔ اب مذکورہ آیات کا مطلب واضح ہو جاتا ہے جب علماء ربانی ختم ہو جائیں گے تو لازمی طور پر ان کی جگہ دنیادار طاقت ور آدمی ہی جگہ لیں گے۔ جب دنیا سے دین کی روشنی ختم ہو جائے۔ تو لازمی طور پر اس کی جگہ دنیاداری آئے گی۔ دین کی روشنی سے خالی دنیا زمین میں ایک فساد ہے۔

ان آیات کو دور حاضر پر چسپاں کریں۔ تو قرآن مجید کی صداقت واضح ہو جاتی ہے آج دنیا میں اسی وجہ سے فساد برپا ہے۔ دنیا دین کی روح کے غافل ہو چکی ہے دور حاضر میں دین کو جس غلط انداز میں بیان کیا جا رہا ہے۔ اس کا دین کی روح سے دور کا بھی واسطہ نہیں۔ آج سے چودہ سو سال پہلے قرآن مجید نے دنیا کو تنبیہ کر دی تھی کہ جب بھی مسلمان دین سے غافل ہو جائیں گے دین سے روشنی لینا چھوڑ دیں گے۔ اور علماء سوء پیدا ہو جائیں گے۔ تو دنیا میں فساد برپا ہو جائے گا۔ اور طاقت ور قومیں حرکت میں آ جائیں گی۔ اور کمزور ملکوں پر جھپٹ پڑیں گی ان آیات میں اس دور کا پورا نقشہ ہے۔

پس ایک مفہوم یہ کہ دنیا میں ایک وقت ایسا بھی آئے گا جب روحانی نظام تباہ و برباد ہو جائے گا۔

دوسرا مفہوم قیامت کبری کے متعلق ہے۔ جب موجودہ نظام کائنات بالکل درہم برہم ہو جائے گا۔ تو قیامت کبری واقع ہو جائے گی۔ سورج کی تکویر اور ستاروں کا جھڑ جانا نظام کائنات کی بربادی پر دلالت کرتا ہے۔ اور یہ قیامت کی نشانی ہے۔ یعنی قرب قیامت میں سورج چاند اور ستارے وغیرہ سب لپیٹ لئے جائیں گے۔ سائنس بھی یہی کہتی ہے چنانچہ سٹیوارٹ اور ٹیگل کی کتاب دی اَن سین یونیورس کے صفحہ 91 پر لکھا ہے ''ہمارے نظام کی زمین اور دوسرے ستارے آہستہ آہستہ سورج کے قریب ہوتے جاتے ہیں اور بالآخر اس کے اندر

غرق ہو جائیں گے اور اس وقت یہ مرکزی سورج تمام کائنات کو اپنے اندر لپیٹ لے گا۔

(The unseen universe by stewart and Tail page 91)

اس کے بعد سورج بھی خود سرد ہو جائے گا۔ چنانچہ لارڈ کلون کا ایک حوالہ اس کے متعلق لا کرنے ایلیمنٹری لیسنز ان اسٹرالوجی میں۔ صفحہ 67 پر نقل کیا ہے ایک وقت آئے گا جب سورج تمام ستارگان کو اپنے میں لپیٹ کر ایک سرد سیاہ گیند کی طرح وسیع فضاء میں حرکت کرے گا۔

جان نارمن لاکر اپنی تصنیف سولر فزکس کے صفحہ 93 پر لکھتا ہے۔

اس کائنات کی فنا کے دو طریق ہو سکتے ہیں یا تو تمام چیزیں کھینچ کر سورج میں جذب ہو جائیں یا کائنات اپنی جگہ پر رہے مگر سورج ٹھنڈا اور سیاہ ہو جائے اور باقی اشیاء بھی سرد ہو کر فنا ہو جائیں گی۔

مذکورہ آیات کے ظاہری معنی مراد لئے جائیں تو یہ آیات قیامت کبریٰ پر دلالت کرتی ہیں اگر مجازاً معنی مراد لئے جائیں تو روحانی نظام کا ختم ہونا مراد ہے۔

☆......☆
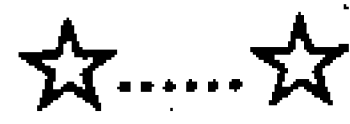
آسمان کے پھٹنے ستاروں کے گرنے دریا کے بننے پر اعتراض

اعتراض:۔ بہت خوب قرآن مجید کے فلاسفر مصنف! آسمان کیوں کر پھٹ سکتا ہے اور ستارے کیوں کر گر سکتے ہیں اور دریا کیا لکڑی ہیں کہ چیرے جائیں گے۔ اور قبریں کیا مردے ہیں کہ جلائے جاہیں گے؟ یہ سب باتیں لڑکوں کی سی ہیں (ستیارتھ پرکاش اعتراض 153)

جواب:۔ یہ اعتراض سورۃ الانفطار (82) آیات 1-4 پر کیا گیا ہے۔

قرآن مجید ہر لحاظ سے بے نظیر کتاب ہے۔ جب سے نازل ہونا شروع ہوئی اس وقت سے اس کا یہ دعویٰ ہے کہ فصاحت وبلاغت کے اعتبار سے، قوت تاثیر، عدم اختلاف، کمال علوم معجزات تصرفات خارجیہ، قوت دلائل، غیب کی خبروں کی اطلاع کے لحاظ سے ایک بے مثل کتاب ہے۔ قرآن مجید کے نزول کے وقت عرب ادبا اور فصحاو نے تو قرآن مجید کی کسی آیت پر ادبی لحاظ سے اعتراض نہیں کیا تھا۔ سوامی جی کو یہ آیات لڑکوں سی معلوم ہوتی ہیں حقیقت یہ ہے سوامی جی عربی زبان سے نابلد ہیں اس وجہ سے وہ عربی محاورات سے لطف اندوز نہیں ہو رہے۔ سورۃ انفطار کی پہلی چار آیات میں قیامت کبری یا روحانی انقلاب کا ذکر کیا ہے۔ قیامت کبریٰ کے وقت ایک عظیم انقلاب برپا ہوگا آسمان پھٹ جائے گا ستارے گرنا شروع ہو جائیں گے دریا اپنے کناروں سے باہر آ جائیں گے تمام دنیا تہ وبالا ہو جائے گی۔ اور دنیا کی صف لپیٹ لی جائے۔ اور دنیا پر فنا طاری ہو جائے گی۔ تو قبروں سے مردے نکالے جائیں گے۔ ان کا حساب کتاب ہوگا۔ قیامت کبری کا ذکر دنیا کی تمام کتابوں میں پایا جاتا ہے۔ قرآن مجید نے کوئی نیا تصور نہیں دیا پہلے انبیاء علیھم السلام کے تصور آخرت کو اجاگر کیا ہے۔ لہٰذا کوئی اعتراض کی بات نہیں قیامت کبریٰ زمین کے تہ وبالا ہونے کا نام ہی ہے۔

دوسرا مفہوم:۔ مذکورہ آیات میں استعارہ ہے وَإِذَا السَّمَآءُ انْفَطَرَتْ جب آسمان پھٹ جائے گا آسمان کے پھٹنے سے مراد بارش کا نزول ہے مراد روحانی بارش ہے وَإِذَا الْكَوَاكِبُ انْتَثَرَتْ (جب ستارے پھیل جائیں گے) ستاروں کے پھیلنے سے مراد مبلغ اسلام کا

اشاعت اسلام کے لئے زمین میں پھیل جانا وَاِذَا الْبِحَارُ فُجِّرَتْ (جب دریا پھاڑے جائیں گے) سے مراد اسلامی علوم کے دریا کا بہنا ہے یعنی ایک دور آئے گا جب قرآنی علوم کے دریا بہائے جائیں گے وَاِذَا الْقُبُوْرُ بُعْثِرَتْ (جب قبریں کھودی جائیں گی) سے مراد یہ ہے کہ جب آسمان سے روحانی بارش ہوگی۔ مبلغین اسلام دنیا کے کونے کونے میں پھیل جائیں گے۔ اور علوم اسلام کے دریا بہادیں گے تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا۔ روحانی مردہ قومیں دائرہ اسلام میں داخل ہو جائیں گے۔ اسلام تمام دنیا میں غالب آ جائے گا۔ ان آیات میں غلبہ اسلام کی پیشگوئی بیان کی گئی ہے۔ قرآن مجید خدا کی کتاب ہے یہ پیشگوئی پوری ہوگی۔

☆......☆

صاحب قرآن علم ہیئت سے ناواقف تھا

اعتراض: مصنف قرآن کو علم ہیئت سے مطلق واقفیت نہ تھی۔ ورنہ آسمان کو ایک قلعہ کی مانند برجوں والا کیوں کہتا؟ اگر راسوں کا نام برج ہے تو اور برج کیوں نہیں ہیں؟ اس لئے یہ برج نہیں ہیں بلکہ ستارے یعنی کُرے ہیں کیا قرآن خدا کے پاس محفوظ ہے اگر قرآن کلام اللہ ہے تو خدا بھی علم وعقل سے خالی ہوگا (ستیارتھ کا س اعتراض 154)

وَالسَّمَآءِ ذَاتِ الْبُرُوْجِ (1) ستاروں والا آسمان گواہ ہے۔
وَفِي لَوْحٍ مَّحْفُوْظٍ (محفوظ تختی میں)

آسمان کا ذات بروج ہونے سے مراد آسمان کا ستاروں والا ہونا ہے ستارے روشنی کا باعث ہیں۔ قدیم دور میں رات کو سفر کرنے والے ان ستاروں سے راہنمائی حاصل کرتے تھے۔ اسی وجہ سے عربی زبان میں ستارے سے مراد صاحب علم مراد ہے رسول کریم ﷺ نے بھی صحابہ کو نجوم سے تشبیہ دی تھی۔ ستاروں والے آسمان کو گواہ کے طور پر پیش کیا ہے جس طرح رات کی تاریکی میں آسمان کے ستارے روشنی کا باعث بن جاتے ہیں ایسے ہی عرب کی زمین رسول کریم ﷺ کے صحابہ کی قوت قدسیہ سے روشن ہو جائے گی۔ پھر یہ روشنی تمام دنیا میں پھیل جائے گی۔ یہ وہ قرآن مجید کے معارف ہیں جو معترضین کی نظروں سے اوجھل ہیں اس آیت میں ستاروں والے آسمان کو گواہ ٹھہرا کر اسلام کی روحانی روشنی کے پھیلنے کی اطلاع دی ہے۔

آیت 22 میں قرآن مجید کے محفوظ رہنے کی پیشگوئی ہے۔ قرآن مجید کا محفوظ ہونا اور محفوظ رہنا خود پیشگوئی کی صداقت پر دلیل ہے دنیا میں صرف ایک ہی کتاب ہے وہ ہے قرآن مجید جو لفظاً و معناً محفوظ چلی آ رہی ہے۔

وید کی حفاظت کا کوئی وعدہ نہیں ایک وید کے آہستہ آہستہ 1131 وید ہو گئے اور پھر گم ہوتے ہوئے چند ایک رہ گئے وہ بھی محرف اور مبدل۔ کوئی ہندو یہ دعویٰ نہیں کرسکتا کہ وید محفوظ کتاب ہے۔

☆......☆

اسلام کا خدا مکار ہے

اعتراض: کیا خدا بھی مکار ہے اور کیا چوری کے عوض چوری اور جھوٹ کے عوض جھوٹ ہے کہ خدا مکر کے عوض مکر کرتا ہے اگر کوئی چور کسی شریف کے گھر چوری کرے تو کیا اس شریف کو بھی چاہیے کہ چور کے گھر جا کر چوری کرے؟ واہ قرآن کے مصنف صاحب خوب مسئلہ نکالا۔ (ستیارتھ پرکاش، اعتراض 155)

جواب: یہ اعتراض سورۃ الطارق کی آیت 15، 16 پر کیا ہے اِنَّهُمْ يَكِيدُونَ كَيْدًا [۱۵] وَّاَكِيْدُ كَيْدًا یہ بھی ایک تدبیر میں لگے ہوئے ہیں اور میں بھی تدبیر کر رہا ہوں۔

اللہ کے مکر پر بحث سیرت سید البشر کے حصہ سوم میں کی جا چکی ہے جب یہ لفظ اللہ کے ساتھ استعمال ہوتا ہے تو عربی کے لحاظ سے اس کے کیا معنی ہیں اسلام پر مخالفین کی طرف سے یہ اعتراض کثرت سے کیا گیا ہے کہ اسلام کا خدا مکار اور فریبی ہے۔

سوامی جی نے اسی اعتراض کو دہرایا ہے۔ چونکہ یہ اعتراض سورۃ الطارق کے ضمن میں کیا گیا ہے اس وجہ سے اس سورۃ کے مضمون کو سامنے رکھ کر اعتراض کا جواب دیا جا رہا ہے۔

اس سورۃ کا نام طارق ہے طارق رات کے وقت آنے والے کو کہتے ہیں مراد یہ ہے نبی کریم ﷺ کا ظلمت اور ضلالت کے وقت دنیا میں ظاہر ہونا اور اس ظلمت اور اندھیرے کو دور کرنا۔ زیر اعتراض آیات میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ دشمنان اسلام رسول کریم ﷺ کی لائی ہوئی روشنی کو مٹانے کی کوشش کریں گے ہر تدبیر بروئے کار لائیں گے۔ ایذاؤں کے ساتھ، ہر قسم کا طمع دے کر، قتل کے منصوبے بنا کر، جلا وطن کر کے اپنی عسکری قوت کے ساتھ جدوجہد کریں گے ان کی ہر تدبیر سوء کو اللہ تعالیٰ اپنی حکمت اور تدبیر سے ناکام و نامراد بنا دے گا۔ آخر کار وہ روشن ستارہ یعنی رسول کریم ﷺ کامیاب و کامران ہو جائے گا۔ اکید کیدا میں پیشگوئی ہے۔ یہ سورۃ مکی ہے مکی دور کے پُر مصائب اور پُر خطر لمحات میں یہ پیشگوئی کی جا رہی ہے آخر کار فتح مکہ پر اللہ تعالیٰ کی تدبیر کامیاب ہوئی۔ اسلام کی روشنی کی چارسو پھیلنے کی راہیں وا ہوئیں اسلام تمام دنیا میں پھیلنے لگا یہ ہے اللہ کی تدبیر۔ ایک روحانی انقلاب کی پیشگوئی ہے جو پوری ہوئی۔

خدا فرشتوں کو اپنے ساتھ لئے پھرتا ہے

اعتراض:۔ کیا خدا اسی طرح اپنے صف بستہ فرشتوں کو لے کر پھرا کرتا ہے جس طرح جرنیل اپنی فوج کو اور دوزخ کے لانے کی خوب کہی کیا وہ ہنڈیا ہے کہ ایک جگہ سے اٹھا کر دوسری جگہ پر لے جایا جائے اگر وہ اس قدر چھوٹا ہے تو بے شمار قیدی اس میں کیوں کر سما سکیں گے (ستیارتھ پرکاش اعتراض 156)

جواب:۔ یہ اعتراض سورۃ الفجر کی آیات 22، 23 پر کیا گیا ہے اور لاعلمی کا اظہار کیا گیا ہے ارشاد والٰہی ہے وَّجَآءَ رَبُّكَ وَالْمَلَكُ صَفًّا صَفًّا وَجِایْٓءَ يَوْمَئِذٍ بِجَهَنَّمَ الخ (23:22) اور تیرا رب آئے گا اور فرشتے قطاروں کی قطاریں اور اس دن دوزخ لائی

جائے گی اس سورۃ میں انسان کی روحانی ترقی کا ذکر ہے۔ پھر قوم عاد، ارم ذات العماد ثمود اور فرعون کا ذکر کیا جنہوں نے احکام الہیہ کو توڑا۔ طاغوتی راستہ اختیار کیا۔ وہ لوگ تباہ و برباد ہو گئے۔ پھر ان لوگوں کا ذکر کیا جو مساکین کے حقوق کو پس پشت ڈال دیتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان مجرموں کو سزا دینے کے وقت بھی اپنی صفت ربوبیت کے ساتھ آئے گا۔ لفظ ربوبیت (رب) میں یہ بتایا گیا ہے کہ ان مجرموں کو عذاب دینے کا مقصد ہلاکت و بربادی نہیں بلکہ ان کی روحانی بیماریوں کی اصلاح ہے۔ روحانی ترقی والے عالم (آخرت) میں ان کو ترقی کرنے کے قابل بنا تا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے قہر وجلال کی صفت بیان نہیں کی بلکہ اپنی صفت ربوبیت کا ذکر کیا ہے۔ قیامت کے دن مجرموں کو سزا دینے کا یہ فلسفہ ہے۔ اس سزا میں بھی اللہ کی رحمت اور ربوبیت کا اظہار ہے کہ دوزخ کی سزا روحانی بیماریوں کے علاج کے لئے ہے جب وہ ان روحانی بیماریوں سے شفا پا جائیں گے تو خدا اپنی صفت ربوبیت کے تحت وہاں نکال لے گا۔

جہنم کا لایا جانا:

یہ بھی اسلام کے علم کلام کا ایک اہم مسئلہ ہے جس کو معترضین نہیں سمجھے ہر مجرم کے ساتھ جہنم ساتھ لائی جائے گی۔ وہ اس کے اپنے کردہ گناہوں کی آگ سے تیار کی گئی ہے جب مجرم گناہ گار آئے گا تو اس کی جہنم اس کے ساتھ ہوگی۔ یہ وہ باریک نکتہ ہے جس کو معترضین نہیں سمجھتے یہ کلامی مسائل ہیں۔ جن پر متکلمین خصوصاً صوفیاء کرام نے بحثیں کی ہیں جہنم انسان کے اپنے گناہوں کی پیداوار ہے۔ وہ کہیں باہر سے نہیں آتی بعینہٖ جب اس دنیا میں ایک شخص کسی مرض میں مبتلا ہوتا ہے تو وہ بیماری اصول صحت کو ترک کرنے کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے اس بیماری میں ہی جسمانی تکالیف پوشیدہ ہوتی ہیں۔ وہ تکالیف باہر سے نہیں آتیں بلکہ انسان نے خود پیدا کی ہیں جب علاج سے بیماری دور ہو جاتی ہے تو جسمانی تکلیف بھی خود بخود دور ہو جاتی ہے۔ یہی حال روحانی امراض کا ہے یہ وہ باریک نکتہ ہے جس کو سوامی جی اور دیگر معترضین سمجھ نہیں سکے دوزخ کی نوعیت اور کیفیت نہ سمجھنے کی وجہ سے معترض نے ہنڈیا سے تشبیہ دے کر اسلام کی سزا کی فلاسفی کا مذاق اڑایا ہے۔

الزامی جواب: اسلام کا خدا اس طرح دیوتاؤں کی فوج کے ساتھ نہیں پھرتا جس طرح ویدوں کا ایشور (خدا) پھرتا ہے چنانچہ رگ وید منڈل اسوکت 25 منتر 13 میں ہے" ورن (پرماتما) سونے کا لباس پہن کر اپنے مضبوط بدن کو ڈھانکتا ہے اس کے سپاہی اس کے گرد بیٹھے ہیں۔

منڈل 7 سوکت 87 منتر 3 میں ہے۔

"ورن کے سپاہی خوبصورت آسمان اور زمین کو اچھی طرح دیکھتے ہیں"

وید میں تو ہندو دھرم کے ایشور کا راکشسوں سے جنگ کرنے کا ذکر ہے۔ اور ایشور راکشسوں کے مقابل پڑا کام رہتا ہے حوالہ پہلے گزر چکا ہے۔

دوزخ کا تنگ ہونا:

سوامی جی نے اپنی جہالت اور لاعلمی کی وجہ سے یہ اعتراض کر دیا ہے" اگر وہ اس قدر چھوٹا ہے تو بے شمار قیدی اس میں کیونکہ سما سکیں گے۔ اسلام میں دوزخ کا جو تصور پیش کیا ہے اس کو مختصر الفاظ میں اوپر بیان کر دیا گیا ہے۔ سیرت سید البشر کے حصہ دوم میں ایمان بالاخرت کے باب میں تفصیلاً بحث گزر چکی ہے۔ (اعادہ کی ضرورت نہیں)

اسلام کے خدا کی دوزخ اتنی وسیع ہے کہ اس میں ہر قیدی سما سکے گا اسلام کے بیان کردہ دوزخ میں قیدیوں (مجرموں) کے نہ سما سکنے کا کہیں ذکر نہیں ہے اسلام کا خدا ایک قادر ہے۔ ہاں ویدک ایشور (خدا) اس قدر کمزور اور کم ہمت ہے کہ اسے مکتی خانہ بنانے کی قدرت نہیں اس لئے اس میں ارواح کی بھیڑ بھاڑ اور ہجوم ہو جانے کے خوف سے ہمیشہ کی مکتی (نجات) نہیں دیتا بلکہ مجرموں (گناگاروں) کو مختلف جونوں میں ڈھالتا رہتا ہے۔ اور نجات نہیں دیتا۔ تاکہ ویدک ایشور کے مکتی خانہ میں جگہ تنگ نہ ہو جائے۔ اسلام کے دوزخ اور جنت کی یہ کیفیت نہیں معترض کو پہلے اپنے بیان کردہ مضمون میعادی مکتی کے دلائل پر غور کر لینا چاہئے تھا۔ جو ستیارتھ پرکاش میں بیان کیا گیا ہے۔

☆......☆

حضرت صالح کی اونٹنی پر اعتراض

اعتراض: کیا خدا بھی اونٹی پر چڑھ کر سیر کیا کرتا ہے؟ ورنہ اونٹنی اس نے کس مطلب کے لئے رکھی ہوئی ہے؟ اور بغیر قیامت کے اپنے قانون کے خلاف ان پر ہلاکت کیوں ڈالی؟ اور ہلاکت ڈالنے سے انہیں ان کے گناہوں کی سزا مل گئی پھر قیامت کے دن انصاف کا ہونا غلط ثابت ہو گیا۔ بار بار اونٹنی کا ذکر ہونے سے معلوم ہوتا ہے کہ ملک عرب میں سوائے اونٹ اونٹنی کے اور سواری کے جانور کم ہیں اور قرآن کا مصنف بھی عرب کا باشندہ ہے (ستیارتھ پرکاش اعتراض 157)

جواب:۔ یہ اعتراض سورۃ الشمس کی آیات 13، 14 پر کیا گیا ہے۔

ارشاد الٰہی ہے فَقَالَ لَهُمْ رَسُولُ اللّٰهِ نَاقَةَ اللّٰهِ وَسُقْيٰهَا [۱۳] فَكَذَّبُوْهُ فَعَقَرُوْهَا ۵ فَدَمْدَمَ عَلَيْهِمْ رَبُّهُمْ بِذَنْبِهِمْ فَسَوّٰهَا (14) تو اللہ کے رسول نے انہیں کہا اللہ کی اونٹنی اور اس کے پانی سے اسے نہ روکو مگر انہوں نے اسے جھٹلایا پھر اس اونٹنی کو مار ڈالا تو اللہ تعالیٰ نے ان کے گناہ کی وجہ سے ان پر عذاب بھیجا پھر اسے برابر کر دیا۔

اونٹنی حضرت صالح کا نشان تھا۔ حضرت صالح کی قوم بت پرست تھی۔ انہوں نے بت پرستی سے منع کر کے ایک خدا کی عبادت کی طرف بلایا۔ اللہ تعالیٰ کے احکام کے مطابق زندگی بسر کرنے کی تلقین کی۔ لیکن قوم اپنے اباء اجداد کی پیروی پر قائم رہے۔ نہ بت پرستی چھوڑی اور نہ احکام الٰہیہ پر عمل کیا مزید براں حضرت صالح کو ایذاؤں کا نشانہ بنایا۔ حضرت صالح نے ہر طرح سے سمجھانے کی کوشش کی لیکن قوم نے ایک نہ سنی۔ اور وہ حضرت صالح کے دشمن بن گئے عام چراگاہوں میں قوم صالح کے جانور چرتے بھرتے تھے۔ لیکن حضرت صالح کی اونٹنی کو چرنے اور پانی پینے سے روک دیا۔ عربوں میں جانوروں کو چراگاہوں میں چھوڑنے کا عام رواج تھا۔ تاریخوں سے تو یہ بھی واضح ہے کہ اونٹ کے علاوہ دوسرے جانور گھوڑے دنبے وغیرہ بھی آزادی سے چرنے کے لئے چھوڑ دیئے جاتے تھے۔

اللہ جس کو چاہے اپنی نشانی ٹھہرائے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی حضرت صالح کی سچائی ظاہر کرنے کے لئے ان کی اونٹنی کو ایک نشانی قرار دے دیا اور کہا جو اس اونٹنی کو چرنے پھرنے اور مختلف گھاٹ سے پینے پانی پینے سے روکے گا وہ اللہ کے عذاب کا مورد ہوگا۔ چنانچہ حضرت صالح کی قوم نے اونٹنی کو مار ڈالا اس کے نتیجہ میں قوم صالح اللہ کے عذاب کے نیچے آ گئی اور وہ تباہ ہو گئی۔ یہ ایک تاریخی واقعہ ہے۔ تمام تاریخیں اس بات پر گواہ ہیں کہ قوم صالح کی تباہی کی وجہ اونٹنی کو ذبح کرنا تھا اور قرآن مجید میں جو بھی تاریخی واقعہ بیان کیا جاتا ہے اس

میں ایک سبق ہوتا ہے۔

اس واقعہ میں عرب قوم کو یہ بتایا ہے کہ جو قوم نبی کو جھٹلاتی ہے اور اس کے پیغام پر عمل نہیں کرتی خدا کے نشانوں کی تضحیک کرتی ہے وہ قوم تباہ و برباد ہو جاتی ہے۔ عرب قوم کو بتایا ہے کہ حضرت صالح کی قوم بت پرست تھی۔ ان کے بتوں نے ان کی کوئی مدد نہیں کی خدا کی نشانی جھٹلانے سے وہ قوم تباہ و برباد ہوگئی۔ رسول کریم ﷺ کو جھٹلانا چھوڑ دو۔ تمہاری حالت بھی صالح کی قوم کی طرح ہو جائے گی اور تم تباہ و برباد ہو جاؤ گے۔ یہ ہے حضرت صالح کی اونٹنی کا قصہ جس پر سوامی جی نے رنگ امیزی کی ہے۔ قرآن مجید میں کہیں بھی یہ ذکر نہیں کہ اللہ تعالیٰ اونٹنی پر سواری کرتا ہے۔ قرآن مجید میں ایک تاریخی واقعہ کو بیان کیا ہے جس میں عرب قوم کے لئے ایک سبق دیا تھا۔ کہ بت کچھ نہیں کرتے سب کچھ اللہ توانا کے ہاتھ میں ہے۔ قرآن مجید میں ایک اونٹنی کا ذکر آ گیا ہے وہ بھی ایک نصیحت کے لئے تو کون سی اعتراض کی بات ہے کیا وید میں گنگا۔ جمنا پنجاب کے پانچ دریاؤں نقارہ جنگ اوکھلی موسل کا ذکر نہیں وید میں گائے کا کثرت سے ذکر آتا ہے اتھر دوید میں ایک پورا سوکت ''برہم گولی'' (خدا کی یا برہمن کی گائے) کا ہے۔ اس میں لکھا ہے برہمن کی گائے چھین لینے یا اس کو کھا جانے سے راجہ اس کے خاندان اس کے ملک اور اس کے لشکروں پر کیا مصائب آتے ہیں۔

پھر وید میں لکھا ہے برہمن کی گائے سانپ ہے جو خطرناک زہر سے بھرا پڑا ہے اور اوپر چمڑا مڑھا ہوا ہے وہ ذائقہ میں تلخ ہے وہ کسی کو نہ کھانی چاہیے۔ وتیو یہ برہمن کی گائے کھانے سے ہلاک کر دئے گئے برہمن کی گائے کی آواز تیر کا نوک ہے اس کی زبان کمان کی تانت ہے اس کا گلا شعلہ زن تیروں کا ترکش ہے اس کے ساتھ برہمن منکروں کو چیر ڈالتا ہے خدا کے چلائے ہوئے تیر کے ساتھ ان کے دلوں کو چھیل دیتا ہے۔

سوامی جی کو قرآن مجید میں ایک اونٹی پر اعتراض ہے وید میں ہر برہمن کی گائے خدا کی گائے ہے جو دنیا کے مصائب کا سبب ہے۔ دیکھو اتھر وید کانڈ 5 سوکت 19,18 اور کانڈ 12 کا سوکت 5 جن میں ایک سو سے زائد منتروں میں گائے کے معجزات کا ذکر ہے۔

اسلام کا خدا نیچ چپڑاسیوں کا کام کرتا ہے

اعتراض:۔ نیچ چپڑاسیوں کا کام یعنی گھسیٹنے سے بھی خدا نہ بچ سکا کیا کبھی چوٹی بھی جھوٹی اور خطا کار ہو سکتی ہے دوزخ کا فرشتہ یا جیل خانہ کا داروغہ طلب کرنا انسان کا کام ہے یا خدا کا؟ (سیتارتھ پرکاش اعتراض 158)

جواب:۔ یہ اعتراض سورۃ العلق کی آیات 15 تا 18 پر کیا گیا ہے ارشاد الٰہی ہے كَلَّا لَئِنْ لَّمْ يَنْتَهِ لَنَسْفَعًۢا بِالنَّاصِيَةِ [۱۵] نَاصِيَةٍ كَاذِبَةٍ خَاطِئَةٍ [۱۶] فَلْيَدْعُ نَادِيَه سَنَدْعُ الزَّبَانِيَةَ (15-18) نہیں اگر وہ نہ رکے گا تو ہم اسے پیشانی کے بالوں سے پکڑ کر گھسیٹیں گے جھوٹی خطا کار پیشانی سے سو وہ اپنے اہل مجلس (ساتھیوں) کو بلا لے۔ ہم بھی بہادروں کو بلالیں گے۔

سورۃ العلق میں دو گروہوں کا ذکر کیا گیا ہے ایک وہ گروہ ہے جو اللہ سے لو لگاتا ہے اس کے احکام کے مطابق زندگی بسر کرتا ہے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے یہ لوگ کامیاب و کامران ہوں گے دوسرا گروہ وہ ہے جو حق کو جھٹلاتا ہے اور اللہ سے انحراف کرتا ہے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ہم چوٹی کے ساتھ پکڑ کر گھسیٹیں گے اور اس کی چوٹی جھوٹی ہے مراد اس کا ذلیل کرنا ہے۔ دوسرے معنی ناصیۃ القوم سے مراد سید القوم (قوم کے سردار) بھی ہیں۔ ان آیات میں نہایت خوبصورت الفاظ کے ساتھ اعدائے حق کی ناکامی و نامرادی کا ذکر کیا ہے بالوں کو پکڑ کر گھسیٹنا کسی

کو ذلیل وخوار کرنے کا ایک طریقہ ہے ہر زبان میں کسی کو ذلیل کرنے کے لئے بولا جاتا ہے وید میں بھی یہ محاورہ استعمال ہوا ہے" جو تیرے اے ورن (دیوتا) تین گنا سات سات (ستر) ہاتھ لمبے پھندے ہیں تو ان کے ساتھ جھوٹ بولنے والوں کو گھسیٹتا ہے جو سچ بولنے والے ہیں ان کو آزاد کر دیتا ہے (اتھروید کانڈ 4 سوکت 16 منتر 6)

اس منتر میں واضح طور پر جھوٹ بولنے والوں کے متعلق لکھا ہے کہ ورن ان کے بالوں کو پکڑ کر گھسیٹے گا۔ کیا ورن چیڑاسی بن گیا ہے۔ اس منتر میں جھوٹ بولنے والوں کی ذلت کا ذکر کیا گیا ہے جو جھوٹ بولتے ہیں وہ ذلیل وخوار ہو جاتے ہیں۔

رہا سوال دوزخ کے فرشتوں کو بلانا۔ یہ اللہ کے کارندے ہیں اللہ تعالیٰ اپنے ان کارندوں کی معرفت نظام کائنات چلا رہا ہے۔ حکم خدا کا ہوتا ہے اس حکم کو نافذ کرنے والے کارندے ہوتے ہیں خدا کی بادشاہت اسی اصول پر چل رہی ہے۔ اس دنیا میں بھی حکمران اسی اصول پر کام کرتے ہیں حکمران آئین کے مطابق حکم دیتے ہیں۔ اور کارندے ان احکام کو نافذ کرتے ہیں۔

☆......☆
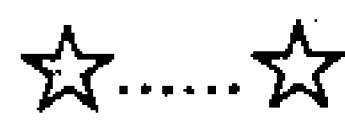
اگر سارا قرآن مجید لیلۃ القدر میں اترا ہے تو پھر فلاں آیت فلاں موقع پر نازل ہوئی کیوں کر صحیح ہوسکتا ہے۔

اعتراض: ۔ اگر ایک رات میں قرآن اترا تو یہ بات کہ فلاں آیت فلاں وقت میں اور فلاں آیت فلاں وقت میں اتری کیوں کر صحیح ہوسکتی ہے اور رات اندھیری ہوتی ہے اس کے متعلق پوچھنا پچھانا کیا ہے پہلے اس بات کا ذکر ہو چکا ہے کہ اوپر نیچے کچھ نہیں ہوسکتا۔ اور یہاں لکھا ہے کہ فرشتے اور پاک روح خدا کے حکم سے دنیا کا انتظام کرنے کے لئے آتے ہیں پس ظاہر ہے کہ محمدی خدا انسان کی طرح ایک خاص جگہ مقیم ہے اس سے پہلے تو خدا فرشتے اور پیغمبر کا ذکر آتا تھا اب چوتھے پاک روح کا ذکر کیسے آ گیا۔ نہ معلوم اس پاک روح سے کیا مراد ہے کہیں اس سے عیسائیوں کی روح القدس تو مراد نہیں؟ کیا تم مسئلہ تثلیث کے بھی قائل ہو؟ اگر کہو نہیں تو کیا پاک روح کو خدا سے الگ مانتے ہو؟ پھر بتاؤ خدا فرشتے اور پیغمبر کو پاک روح کہنا درست ہے یا نہیں؟ اگر یہ بھی پاک روح ہیں پھر کسی خاص وجود کو پاک روح کیوں کہتے ہو (ستیارتھ پرکاش اعتراض 159)

جواب: ایک طویل عبارت میں سورۃ القدر پر اعتراض کیا گیا ہے۔

لیلۃ القدر میں نزول قرآن:

معترض نے اپنی لاعلمی اور ادبی رموز کو نہ جاننے کی وجہ سے یہ اعتراض اٹھایا ہے جب قرآن مجید لیلۃ القدر میں نازل ہو گیا تو پھر یہ کہا جاتا ہے کہ فلاں آیت فلاں وقت نازل ہوئی اور فلاں آیت فلاں وقت نازل یہ کیوں کر صحیح ہو سکتا ہے۔ معترض کو یہ جان لینا چاہیے تھا کہ بعض اوقات جز بول کر کل مراد لیا جاتا ہے اور کبھی کل بول کر جز مراد لے لیا جاتا ہے۔ مثلاً یہ کہا جائے کہ زید نے اپنے کان میں انگلی ڈالی تو کان میں انگلی کا صرف پورا (جز) جاتا ہے۔ پوری انگلی نہیں۔ کل بول کر مراد جز لیا ہے۔ یہی اصول یہاں بیان کیا گیا ہے قرآن کا لفظ بول

کر وہ آیات مراد لی گئی ہیں جن کا نزول لیلۃ القدر میں ہوا تھا مراد نزول قرآن ہے یعنی لیلۃ القدر میں قرآن مجید کی آیات کا نزول شروع ہوا۔ اگر یہ کہا جائے کہ سوامی جی نے آج وید پڑھا تو اس سے مراد یہ نہیں ہوتا کہ سوامی جی نے تمام وید پڑھا بلکہ مراد یہی ہوتا ہے کہ وید کا ایک حصہ بڑھا۔ اب لفظ وید بول کر وید کا ایک حصہ مراد لیا ہے یہ ہر زبان کا طرز ادا ہے جس کو معترض نے سمجھا ہی نہیں۔ قرآن مجید میں ایک دوسری جگہ بھی کل سے مراد جز لی گئی ہے ارشاد الٰہی ہے۔ یَجْعَلُوْنَ اَصَابِعَهُمْ فِیْ اٰذَانِهِمْ مِنَ الصَّوَاعِقِ حَذَرَ الْمَوْتِ۔ (بقرہ 18:2)

ہولناک آوازوں سے انگلیاں موت کے ڈر سے اپنے کانوں میں ڈالتے ہیں۔ کانوں میں انگلی نہیں ڈالی تھی بلکہ انگلی کا پورا، پورے کو انگلی کہا گیا ہے۔ یہ زبانوں کا طرز بیان ہے۔

قرآن مجید کے نزول والی رات کو لیلۃ القدر اس وجہ سے کہا گیا ہے۔ اس رات ایک دائمی پیغام الٰہی نازل ہونا شروع ہوا۔ جو انسان کی روحانی اور مادی ترقی کا ضامن تھا۔ اس نزول کے ساتھ مردہ دل زندہ ہو گئے۔ اخوت اور امن اور رواداری کا پیغام ملا۔ گمراہی اور ضلالت کی تاریک رات کا خاتمہ ہوا۔ یہی وہ مبارک رات ہے جس میں فرشتے اور روح اپنے رب کے اذن سے امر خیر لے کر آئے تھے۔ جس نے تمام دنیا کو سلامتی کا پیغام دیا۔ اس سورۃ میں نہ تثلیث کا ذکر ہے اور نہ کسی شرک کا۔

روح سے مراد:

قرآن مجید میں روح مختلف معانی میں استعمال ہوا ہے۔ یہاں روح سے مراد حضرت جبرائیل علیہ السلام ہیں فرشتوں اور جبرائیل کے نزول کا مطلب یہ ہے کہ ان کے نزول سے مومنوں کو عروج حاصل ہوتا ہے گویا فرشتوں اور روح کا وجود مومنوں کی روحانی زندگی کا سبب ہے استعارہ کے طور پر پاک چیز کو روح بھی کہا جاتا ہے۔

☆......☆
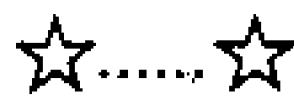
بانی اسلام صلی اللہ علیہ وسلم پر اعتراضات اور ان کے جوابات

جب اسلام پر اعتراضات کے جوابات لکھنا شروع کئے تو اس وقت میرے سامنے اس موضوع کی گہرائی اور گیرائی سامنے نہ تھی جوں جوں لکھتا چلا گیا تو اہم کلامی مسائل کی وسعت سامنے آتی چلی گئی۔ مستشرقین اور مخالفین نے صرف اسلام کی تعلیم پر اعتراض نہیں کئے بلکہ قرآن مجید رسول کریم ﷺ کی سیرت سنت وحدیث اور فقہ کو بھی ہدف تنقید بنایا ہے۔ اب ان اعتراضات کے جوابات دیئے جاتے ہیں جو رسول کریم ﷺ کی ذات بابرکات سے تعلق رکھتے ہیں ان اعتراضات کو پڑھ کر معترضین کے مبلغ علم اور تاریخی تحقیق کا بخوبی علم ہو جاتا ہے کہ کس بغض اور عناد کے شکار ہیں اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ دور حاضر میں کچھ انصاف پسند مستشرق بھی ہیں جنہوں نے ایک حد تک انصاف کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا اور رسول کریم ﷺ کی ذات سے کچھ انصاف کیا ہے۔ ان چند منصف مستشرقین کا ذکر اس کتاب کیا گیا ہے تمام لایعنی اعتراضات کے جوابات تو نہیں دیئے جاتے صرف اہم اور بار بار کئے جانے والے اعتراضات کو سامنے رکھا جائے گا۔ ما توفیقی الا باللہ۔

رسول کریم ﷺ بتوں کی پوجا کیا کرتے تھے

اعتراض: مستشرق زیڈ ایف برڈلی نے سیرت رسول ﷺ پر کتاب لکھی ہے وہ لکھتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ بتوں کی عبادت کرتے تھے دلیل یہ دیتے ہیں کہ آپ کے حصہ میں ان بنی ہاشم کی وراثت آئی تھی جو کعبہ کے بتوں کے محافظ تھے:۔(اسلام اور مستشرقین حصہ دوم 184 مرتبہ سید مصباح الدین عبدالرحمٰن)

جواب:۔اس اعتراض سے بڑھ کر اور کیا جہالت اور لاعلمی ہوسکتی ہے کہ رسول کریم ﷺ کی نسبت یہ کہنا کہ وہ بتوں کی پوجا کیا کرتے تھے۔ جب رسول کریم ﷺ نے دعویٰ نبوت کیا تو اس دعوی کی بنیاد ہی توحید اور شرک کا رد تھا رسول کریم ﷺ اور ان کے صحابہ مصائب اور ایذاؤں کا تختہ مشق ہی توحید اور رد شرک کی وجہ سے بنے تھے۔ آپ ﷺ کے وعظ کا مرکزی نقطہ ہی یہ تھا کہ صرف ایک خدا کی عبادت کرو۔ اور بتوں کی پوجا چھوڑ دو۔

اور کفار اسی وعظ سے باز رکھنے کے لئے آپ ﷺ کے چچا ابو طالب کے پاس گئے کہ اپنے بھتیجے کو ہمارے بتوں کو بُرا بھلا کہنے سے باز رکھیں پھر دھمکی بھی دی اس کے جواب میں رسول کریم ﷺ کے وہ جملے تاریخوں میں محفوظ ہے آپ ﷺ نے فرمایا ہے چچا اگر یہ لوگ میرے دائیں ہاتھ پر سورج اور بائیں ہاتھ پر چاند بھی رکھ دیں تو میں توحید کی تبلیغ سے باز نہیں آ سکتا۔ توحید کی تبلیغ کی سزا میں آپ کو ہجرت کرنے پڑی۔ جنگیں لڑیں پھر فتح مکہ کر کے بیت اللہ کو بتوں کی غلاظت سے پاک کیا۔ جس شخص کی زندگی کا ہر لحہ توحید کے عطر سے معطر ہو اس پر بت پرستی کا الزام لگانا دماغ میں خلل کے سوا اور کیا ہوسکتا۔

پھر جب قرآن مجید کی ورق گردانی کرتے ہیں۔ تو یہ کتاب بھی پہلا سبق توحید کا دیتی ہے اور اس کتاب کا مرکزی محور ہی توحید اور رد شرک ہے ارشاد الٰہی ہے شَهِدَ اللّٰهُ اَنَّهٗ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ وَالْمَلٰٓئِكَةُ وَاُولُوا الْعِلْمِ قَآئِمًاۢ بِالْقِسْطِ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ (العمران 18:3) اللہ گواہی دیتا ہے کہ اس کے سوا کوئی معبود نہیں اور فرشتے اور صاحب علم بھی انصاف پر قائم ہو کر اس کے سوا کوئی معبود نہیں وہ غالب حکمت والا ہے۔

اَللّٰهُ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْحَيُّ الْقَيُّوْمُ (البقرہ 255:2) اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں وہ زندہ اور قائم رہنے والا ہے۔

وَاِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِيْمُ (البقرہ 162:2) تمہارا معبود ایک ہی معبود ہے اس کے سوا کوئی معبود نہیں وہ رحمان اور رحیم ہے۔

فَاعْلَمْ اَنَّهٗ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ (محمد 19:48) پس جان لے کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں۔

قرآن مجید میں توحید پر جامع مانع الفاظ میں ایک پوری سورۃ اخلاص ہے

قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ ۝ اَللّٰهُ الصَّمَدُ ۝ لَمْ يَلِدْ ۙ وَلَمْ يُوْلَدْ ۝ وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ ۝ (اخلاص) کہہ دیجئے کہ وہ اللہ ایک ہے اللہ بے نیاز ہے نہ وہ کسی کا باپ ہے اور نہ بیٹا اور کوئی بھی اس کا ہمسر نہیں۔

حدیث میں اسلام کی عمارت کے پانچ ستونوں میں پہلا ستون لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ (اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں۔) قرار دیا ہے۔

قرآن مجید نے صرف توحید کے ہر پہلو کو ہی اجاگر نہیں کیا بلکہ شرک کے ہر پہلو کو بھی رد کیا ہے ارشاد الٰہی ہے اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهٖ شَيْـًٔا وَّلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ (ال عمران 64:3) کہ ہم اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کریں اور نہ

اس کے ساتھ کسی کو شریک بنائیں اور نہ ہم میں سے کوئی کسی کو اللہ کے سوا رب بنائے

اس آیت میں شرک کی تین صورتیں بیان کر کے ان کی نفی کی گئی ہے۔

اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کی جائے۔

خدا کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرایا جائے

کسی دوسرے کو اپنا رب نہ ٹھہرایا جائے

شرک کی چوتھی صورت سورۃ فرقان میں بیان ہوئی ہے کہ انسان اپنی خواہشات کو معبود نہ بنائے۔ ارشاد الٰہی ہے اَرَءَیْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰـھَهٗ ھَوٰهُ (الفرقان43:25) کیا تو نے اسے دیکھا جو اپنی خواہشات کو معبود بناتا ہے رسول کریم ﷺ نے اللہ تعالیٰ سے الہام پا کر دیگر مذاہب کے باطل عقائد تثلیث اور ابنیت کو بھی رد کیا ہے ارشاد الٰہی ہے وَلَا تَقُوْلُوْا ثَلٰثَةٌ اِنْتَهُوْا خَيْرٌ لَّكُمْ (النساء171:4) مت کہو تین (خدا) ہیں اس (باطل) عقیدہ سے رک جاؤ تمہارے لئے بہتر ہے۔

ابنیّت کے رد میں ارشاد الٰہی ہے مَا يَنْبَغِي لِلرَّحْمٰنِ وَلَدًا (مریم92:19)

خدائے رحمان کی شان نہیں کہ وہ بیٹا بنائے۔

الغرض شرک کا کوئی ایسا پہلو نہیں جس کا رد قرآن مجید میں نہ پایا جاتا ہے۔

لہٰذا یہ اعتراض تاریخی حقائق اور قرآنی تعلیم کے منافی ہے کوئی شخص بھی تاریخ کی روشنی اور اسلام کی تعلیم کی رو سے مبنی بر صداقت تسلیم نہیں کر سکتا۔

☆......☆

رسول کریم ﷺ بحیرا راہب اور ورقہ بن نوفل سے متاثر تھے

اعتراض:۔ آپ ﷺ نے اپنے دور دراز کے متعدد سفروں میں راہبوں اور سوق عکاظ میں واعظوں سے مواد اور معلومات فراہم کیں برڈلی نے بحیرا راہب اور ورقہ بن نوفل وغیرہ سے بھی آپ کے متاثر ہونے کا ذکر کیا ہے (اسلام اور مستشرقین حصہ دوم 184) برطانوی مستشرق منٹگمری واٹ بھی اس خیال کا حامی معلوم ہوتا ہے محمد آیٹ مکہ 93

جواب:۔ تاریخوں سے صرف یہ واضح ہوتا ہے کہ جب رسول کریم ﷺ کی عمر بارہ سال کی تھی تو آپؐ اپنے چچا ابو طالب کے ساتھ سفر تجارت میں شریک ہوئے اور بحیرا راہب کے ساتھ ملاقات ہوئی۔ تاریخ میں کہیں بھی یہ ذکر نہیں پایا جاتا کہ آپ ﷺ نے بحیرا راہب سے کچھ سیکھا یا بحیرا راہب نے آپ کو انجیل یا عیسائیت کی تعلیم سکھائی۔ صرف ملاقات کا ذکر ہے۔ چند گھنٹوں یا چند دنوں کی ملاقات میں ایک بچہ دوسرے سے کیا سیکھ سکتا ہے۔

لیکن جب رسول کریم ﷺ نے دعویٰ نبوت کیا تو ان کی تعلیم میں عیسائیت کے باطل عقائد کا رد موجود ہے۔ آپ ﷺ نے تثلیث، کفارہ مسیح اور الوہیت مسیح کا بطلال کیا۔ گویا رسول کریم ﷺ کے عقائد اس دور کے عیسائیت کے عقائد کے منافی اور ضد تھے عیسائیت

شرک کی دلدل میں پھنسی ہوئی تھی جب کہ رسول کریم ﷺ لوگوں کو شرک کی دلدل سے نکال رہے تھے۔ اسی طرح ورقہ بن نوفل کی شاگردی کا الزام بھی باطل ہے تاریخوں سے کہیں بھی یہ ثابت نہیں کہ رسول کریم ﷺ نے روقہ کی صحبت اختیار کی مستشرقین اپنی ذہنی اختراع سے رسول کریم ﷺ پر الزام تراشی تو کرتے ہیں لیکن مستند تاریخی حوالہ نہیں دیتے بروڈلی نے یہاں تک لکھ دیا کہ رسول کریم ﷺ نے شام یمن فلسطین ایران اور ایشیا نے کوچک کی سیاحت کی لیکن مستند تاریخی حوالہ نہیں دیا۔ تاریخ سے صرف یہ ثابت ہے کہ رسول کریم ﷺ بچپن میں اپنے چچا کے ساتھ بارہ سال کی عمر میں شریک سفر تجارت ہوئے۔ اس کے بعد جوانی میں ایک دو بار حضرت خدیجہ کا مال تجارت لے کر شام کی طرف گئے۔ ان اسفار میں کہیں بھی یہ ذکر نہیں ملتا کہ آپ راہبوں کی مجلس میں گئے۔ اور مذہبی معلومات حاصل کیں۔ اس طرح سوق عکاز میں جا کر معلومات کا حاصل کرنا بھی صرف ذہنی اختراع ہے۔ رسول کریم ﷺ کی روحانی بلند خیالی اور تقدس کو داغدار کرنا مقصود ہے اگر قرآن مجید کا بنظر تعمق مطالعہ کیا جائے۔ تو یہ بات کھل کر سامنے آ جاتی ہے کہ آپ نے اپنے دور کے باطل نظریات رسومات اور عقائد کا رد کیا۔ توحید کا سبق دیا ایک خدا کی عبادت کے تصور کو اجاگر کیا۔ پامال شدہ حقوق انسانی کو بحال کیا۔ معاشی استیصال کا رد کیا اس دور کے تصور حکمرانی کو باطل قرار دے کر عوام کی حکمرانی کا نظریہ پیش کیا۔ الغرض اس دور کے تمام باطل نظریات کو رد کر کے ایک عظیم انقلاب برپا کر دیا۔ آپ ﷺ کے انقلاب کی خوبی یہ ہے کہ باطل رسوم اور نظریات کی جگہ صالح اور پاک نظریات قائم کئے۔ اور اس وقت تک اس دنیا سے نہیں گئے جب تک اپنے پاکیزہ نظریات کو عملی شکل نہیں دے دی۔

مستشرقین بحیرا راہب اور ورقہ بن نوفل کی صحبت سے مستفیض ہونے ذکر کرتے ہیں۔ لیکن تفصیل نہیں دیتے کہ وہ کون سے عقائد اور نظریات ہیں جو آپ نے ان کی صحبت سے سیکھے۔ کارلائل اور دیگر مستشرقین عیسائیت اور یہودیت کو اسلام کا ماخذ قرار دیتے ہیں لیکن وہ بھول جاتے ہیں موجودہ انجیل و تورات کا قرآن مجید کی تعلیم سے کتنا تضاد ہے۔ بائیبل انبیاء پر فحش قسم کے الزامات عائد کرتی ہے جب کہ قرآن مجید انبیاء علیہم السلام کو معصوم عن الخطا قرار دیتا ہے۔ اسی کتاب میں کارلائل کے اس اعتراض کا مفصل جواب لکھا جا چکا ہے۔ بحیرا راہب اور ورقہ بن نوفل کی صحبت سے فیض یاب ہوتا یا اسلام کو عیسائیت کی بگڑی ہوئی شکل قرار دینا ایک ہی سکہ کے دو رخ ہیں۔

☆......☆
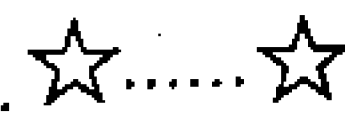
رسول کریم ﷺ کو اپنی نبوت میں شک تھا

اعتراض : محمد ﷺ کا اپنی نبوت اور قرآن مجید کے کلام ہونے پر متشکی ہونا جیسا کہ سورۃ بقرہ اور سورۃ انعام میں درج ہے فلا تکونن من الممترین اس سے ثابت ہوتا ہے کہ محمد ﷺ اپنے دل میں جانتے تھے کہ وہ پیغمبر خدا نہیں اگر وہ پیغمبر خدا ہوتے یا انہوں نے کبھی بھی اپنا کوئی معجزہ کیا ہوتا یا معراج ہوا ہوتا یا جبرائیل علیہ السلام قرآن لائے ہوتے وہ کبھی اپنی نبوت پر متشکی نہ ہوتے اس سے ان کا قرآن مجید پر اور اپنی نبوت پر متشکی ہونا صاف صاف ثابت ہوتا ہے اور نہ وہ رسول اللہ ہیں (مئی 1889 میں مشہور عیسائی پادری مناد عبداللہ جیمز نے انجمن حمایت اسلام کو تین اہم سوال بھجوائے تھے یہ پہلا اعتراض ہے)

معترض نے بقرہ کی آیت 147 اَلْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ فَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُمْتَرِيْنَ (یہ حق تیرے رب کی طرف سے ہے پس ہرگز جھگڑے والوں میں سے نہ ہو) کی بناء پر کیا ہے۔

الممترین مریۃ کسی امر میں تر دو کو کہتے ہیں ۔ اس آیت کے سیاق وسباق سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اس جگہ نبوت یا قرآن مجید کا کوئی ذکر نہیں صرف تحویل قبلہ کا ذکر ہے یعنی اب بیت المقدس کی طرف نہیں بلکہ کعبہ کی طرف منہ کر کے نماز ادا کرنا ہی حق ہے جو ابتداء سے مقرر ہو چکا ہے پہلی کتب میں بھی بطور پیشگوئی درج ہے ۔ فَلَا تَكُونَن مِن الممترین میں خطاب اہل کتاب (یعنی یہود اور عیسائیوں) کو ہے کہ وہ شک میں نہ پڑیں ۔ کہ پہلے بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نماز پڑھنے کا حکم ہے اب بیت اللہ کی طرف ، اہل کتاب کو مخاطب کیا ہے وہ کسی تر دد میں نہ پڑیں یہی حق ہے یہی ان کی کتب میں درج ہے جیسا کہ یوحنا 4:21 ۔ 24 میں ہے ۔ یسوع نے اس سے کہا اے عورت میری بات کو یقین رکھ وہ گھڑی آتی ہے جس میں تم نہ اس پہاڑ پر نہ یروشلم میں باپ کی پرستش کرو گے ۔ یہ الفاظ تحویل کعبہ کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ ایک وقت وہ بھی آئے گا ۔ کہ باپ (خدا) کی پرستش یروشلم (بیت المقدس) میں نہیں ہوگی ۔

ولا تکومن من الممترین میں خطاب اہل کتاب کی طرف ہے کہ وہ شک میں نہ پڑیں ۔ کہ جھگڑے کو چھوڑ کر حق کو تسلیم کر لیں یا یہ خطاب عام ہے یعنی سب لوگ مراد ہیں ۔ کیونکہ بعض شکی مزاج کے لوگ بھی ہوتے ہیں جو کسی واقعہ کو دیکھ کر تر دد میں پڑ جاتے ہیں ان کو مخاطب کیا گیا ہے تحویل قبلہ حق ہے ۔ اب اس بارہ میں لوگوں کو کسی قسم کا شک نہیں کرنا چاہیے ۔ بس مذکورہ آیت میں کسی نبوت کا ذکر نہیں جس میں رسول کریم ﷺ کو یہ کہا جا رہا ہے کہ وہ کسی شک میں نہ پڑیں ۔ آیت کا سیاق وسباق ظاہر کرتا ہے کہ یہ آیت تحویل قبلہ کے متعلق ہے ۔ شکی مزاج لوگوں کو مخاطب کیا گیا ہے کہ اس بارہ میں تر دو نہ کریں ۔

دوسری آیت جو معترض نے اپنے دعویٰ کی تائید میں پیش کی ہے وہ یہ ہے غَيْرَ اللّٰهِ اَبْتَغِي حَكَمًا وَّهُوَ الَّذِي اَنْزَلَ اِلَيْكُمُ الْكِتَابَ مُفَصَّلاً وَالَّذِينَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتَابَ يَعْلَمُوْنَ اَنَّهٗ مُنَزَّلٌ مِّنْ رَّبِّكَ بِالْحَقِّ فَلَاتَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُمْتَرِيْنَ یعنی کیا بجز اللہ کے میں کوئی اور حَکَم طلب کروں اور وہ وہی ہے جس نے مفصل کتاب تم پر اتاری اور جن لوگوں کو ہم نے کتاب (قرآن) دی ہے (یعنی جن کو ہم نے قرآن کا علم دیا ہے) وہ خوب جانتے ہیں کہ یہ کتاب اللہ کی طرف سے ہے ۔ اے مخالفو تم شک کرنے والوں میں مت بنو ۔

یہ آیت ظاہر کرتی ہے اس آیت میں مخاطب وہ ہیں جو یقین کے مقام تک نہیں پہنچے تھے ۔ اس آیت کا آغاز ہی رسول کریم ﷺ کے اس قول سے ہوتا ہے کہ میں بجز خدا کے کوئی دوسرا حَکَم جو مجھ میں اور تم میں فیصلہ کرے مقرر نہیں کر سکتا ۔ کیونکہ اللہ کی وہی ذات ہے جس نے مفصل کتاب نازل کی سو جن کو اس کتاب کا علم دیا گیا ہے وہ اس کو من جانب اللہ جانتے ہیں ۔ لیکن جو لوگ یقین کے درجے پر نہیں پہنچے ان کو مخاطب کیا گیا ہے وہ تر دد اور شک میں نہ پڑیں یہ کتاب من جانب اللہ برہان ہے میرے اور تمہارے درمیان حَکَم (فیصلہ کرنے والا) صرف اللہ ہے وہی فیصلہ کرے گا اس آیت سے قطعاً ظاہر نہیں ہوتا کہ شک کرنے والوں میں رسول کریم ﷺ کی ذات ہے ۔ یہ قول ہی رسول کریم ﷺ کا ہے ۔

پس ظاہر ہوا رسول کریم ﷺ خود شک کرنے والے نہیں بلکہ تر دد کرنے والوں کو دلائل اور براہین سے منع فرماتے ہیں کہ وہ شک کرنے والے مت بنیں واحد کا صیغہ کیوں استعمال ہوا ہے ۔ اس کا جواب یہ ہے کہ وحدت سے سے مراد وحدت جنسی ہے جو جماعت کا حکم رکھتی ہے ۔ اگر قرآن مجید کا مطالعہ کیا جائے تو یہ عام محاورہ ہے کہ اکثر حق بات پر جماعت کو فرد واحد کی صورت میں مخاطب کیا گیا ہے مثلاً قرآن مجید میں آتا ہے فَلَا تَقُلْ لَّهُمَا اُفٍّ وَّلَا تَنْهَرْهُمَا وَ قُلْ لَّهُمَا قَوْلاً كَرِيمًا وَاخْفِضْ لَهُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ مِنَ الرَّحْمَةِ وَقُلْ رَّبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيَانِي صَغِيْرًا ۔

اس آیت میں فَلَا تَقُلْ وَلَا اتَنْهَرْهُمَا ۔ قُلْ لَهُمَا ۔ واخفِضْ قُلْ واحد مخاطب کے صیغے ہیں یہاں ایک مخاطب

مراد نہیں بلکہ تمام جماعت ہے کہ اے پڑھنے والو! کہ تم والدین کو اف تک نہ کہو اور نہ تم ان کو ڈانٹو اور ان سے اچھی کریمانہ بات کہو۔ اور تذلل اور رحمت سے ان کے سامنے بازو جھکا دو اور ان کے لئے دعا کرو کہ اے اللہ ان پر رحم فرما۔ جیسا کہ انہوں نے مجھے بچپن میں پالا تھا۔

صیغہ واحد ہے لیکن مراد جماعت ہے ایسا ہی زیر اعتراض آیات میں صیغہ واحد ہے لیکن مراد جماعت ہے کہ وہ شک میں نہ پڑیں۔

قرآن مجید عجیب معجز نما کتاب ہے جس آیت پر معترضین اعتراض کرتے ہیں۔ جب غور سے دیکھا جائے وہیں اللہ کی حکمتوں کے خزانے اور اسرار و رموز پائے جاتے ہیں۔ کس خوبصورتی کے ساتھ متردد اور شکی مزاج لوگوں کو شک کرنے سے روکا گیا ہے۔

☆......☆

رسول کریم ﷺ خلوت پسند نہ تھے۔ پُر خور تھے

اعتراض:۔ مستشرق لامانس لکھتا ہے کہ نبی کریم ﷺ خلوت کو ناپسند کرتے تھے (اسلام اور مستشرقین ص170)

منٹگمری واٹ لکھتا ہے کہ اپنے گھر والوں کے ساتھ یا ان کے بغیر محمد کا غار حرا میں آمد و رفت کوئی ناممکن بات نہیں کہ موسم گرما میں شہر مکہ کی سخت گرمی کی وجہ سے جو لوگ طائف نہیں گئے تھے۔ وہ غار حرا میں چلے جاتے ہوں۔ ہو سکتا ہے کہ وہ یہودی اور عیسائی راہبوں کے اثر کی وجہ سے وہاں گئے ہوں۔ یا ہو سکتا ہے کہ خود محمد ﷺ کے ذاتی تجربہ نے ان میں بقائے دوام اور حیات جاودانی کی ارزو امنگ اور رغبت پیدا کی ہو'' (155)

جواب: مستشرقین رسول کریم ﷺ کی زندگی کے ہر واقعہ کو رنگ امیزی اور اپنی ذہنی اختراع کا لباس پہنانے کی کوشش کرتے ہیں۔ رسول کریم ﷺ کی عہد شباب میں خلوت میں عبادت کو مشکوک بنانے کی کوشش کی ہے تاکہ کسی قاری پر خلوت میں آپ کی عبادت گزاری کا کوئی اثر نہ پڑے لامانس نے تو بالکل حقائق اور تاریخی واقعات کے برعکس یہ لکھ دیا ہے کہ رسول کریم ﷺ خلوت ناپسند کرتے تھے۔ دراصل رسول کریم ﷺ کا عہد جوانی میں غار حراء میں جا کر عبادت کرنے کا انکار ہے اور قاری پر یہ ظاہر کرنا مقصود ہے کہ آپ خلوت کو پسند کرتے ہی نہیں تھے۔ اور منٹگمری واٹ نے اپنی مشہور کتاب ''محمد ایٹ مکہ'' میں غار حرا میں جانے کی مختلف توجیہیں بیان کرنا شروع کر دی ہیں۔ رسول کریم ﷺ کا غار حرا میں جا کر عبادت کرنے کی اہمیت کو گرانا مقصود ہے۔

یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ حضرت خدیجہ سے شادی کے بعد غار حرا میں جا کر عبادت الٰہی میں مشغول رہنا آپ ﷺ کا معمول بن چکا تھا۔ زاد ساتھ لے جاتے۔ خلوت میں عبادت الٰہی میں مصروف رہتے۔ جوانی میں عبادت الٰہی میں مصروف رہنے سے آپ کی طبعی کیفیت کا اظہار ہوتا ہے۔ کہ جوانی میں ہی آپ خدا کی محبت میں گم رہنے کو پسند کرتے تھے۔ اسی میں سارے جہاں کی لذت محسوس کرتے تھے ان کا اوڑھنا بچھونا ہی یاد الٰہی تھا۔ مستشرقین کو رسول کریم ﷺ کی یہ طبعی کیفیت ناپسند اور ناگوار ہے۔ لامانس نے آپ کی خلوت پسندی سے انکار کر دیا جب کہ مشہور مستشرق منٹگمری واٹ نے رسول کریم ﷺ کی اس طبعی عادت کی اہمیت کو گرانے کے لئے مختلف قسم کی توجیہات بیان کرنا شروع کر دیں۔

تاریخ یہ بتاتی ہے کہ تمام انبیاء علیہم السلام نبوت کا خلعت پہننے سے قبل اپنے قلب کے دریچہ کو خدا کا نور حاصل کرنے کے لئے وار کھتے تھے۔ یادالٰہی ان کی روح کی غذا ہوتی تھی۔ اس غذا سے ان کی روحانی تربیت ہوتی تھی۔ جب خدا کے ہاتھوں روحانی تربیت اپنے کمال کو پہنچ جاتی تو اللہ تعالیٰ اپنی صفت رحمانیت کے تحت اپنے تربیت یافتہ بندے کو خلعت نبوت سے نوازتا۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم بھی اسی راستہ سے گزرے جہاں سے پہلے انبیاء علیہم السلام گزرے تھے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اسی رنگ میں روحانی تربیت ہوئی۔ جس رنگ میں پہلے انبیاء کی ہوئی تھی خلوت میں جا کر عبادت الٰہی میں مصروف رہنا روحانی تربیت کے مراحل تھے۔

نیند کا غلبہ:

لامانس لکھتا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر نیند کا غلبہ رہتا تھا۔ (176) یہ بھی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تنقیص ہے۔ جس شخص پر نیند کا غلبہ رہتا ہو۔ وہ اللہ کی یاد سے غافل رہتا ہے۔ لامانس کا بتانا یہ مقصود ہے۔ کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا یادالٰہی کی طرف قطعاً کوئی دھیان نہیں ہوتا تھا۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر نیند کا غلبہ رہتا تھا اس کی تاریخی شہادت کیا ہے؟ کسی تاریخ میں کہیں بھی یہ شہادت نہیں ملے گی۔ یہ لایعنی بات مستشرق کی اپنی ذہنی اختراع ہے۔ قرآن مجید اس کے برخلاف یہ گواہی دیتا ہے اِنَّ رَبَّكَ يَعْلَمُ اَنَّكَ تَقُوْمُ اَدْنٰى مِنْ ثُلُثَيِ الَّيْلِ وَنِصْفَهٗ وَثُلُثَهٗ (المزمل 20:73) بے شک آپ کا رب جانتا ہے کہ آپ دو تہائی رات سے بھی کم اور آدھی رات اور تہائی رات کے وقت اٹھتے ہیں یہ مسلمہ تاریخی حقیقت ہے جس کو کوئی شخص نہیں جھٹلاتا کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم شب بیدار تھے اپنی تاریک راتوں کو یادالٰہی سے منور کرتے رات کی تہجد آپ کا معمول تھا رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جو روحانی انقلاب برپا کیا تھا۔ وہ رات کی دعاؤں کا ہی نتیجہ تھا۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا پرخور ہونا:

یہ بھی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی پاکیزہ شخصیت کو گہنے کی کوشش کرنا ہے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا پُرخور ہونا کجا آپ کی راتیں بھوک میں کٹتی تھیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے گھروں میں کئی کئی دن چولھوں میں آگ نہیں جلتی تھی کئی مواقع آئے کہ آپ نے اپنے گھر کا خورد نوش سوالیوں میں تقسیم کر دیا۔ اور آپ نے اور اپنے اہل خانہ نے رات بھوک سے بسر کی۔ یہ تمام تاریخی واقعات تاریخ میں درج ہیں پُرخوری کے واقعات کسی تاریخ میں درج نہیں۔

☆......☆

آغاز میں آپ کا دعویٰ عالمگیریت نہ تھا

اعتراض:۔ میور اور ولہازون دونوں کا یہ دعویٰ ہے کہ آغاز میں اسلام کے عالمگیر ہونے کا تصور نہیں تھا۔ افاقیت کا تصور بعد کی پیداوار ہے۔

جواب: آرنلڈ نے اپنی کتاب دعوت اسلام میں اسی طرح نولدیکی گولڈزیہر اور سخاد نے اس خیال کا رد کیا ہے۔ اگر قرآن کا مطالعہ کیا جائے تو مکی سورتوں میں ہی اسلام کے آفاقی اور عالمگیر ہونے کا ذکر موجود ہے چند آیات کا ذکر کیا جاتا ہے۔

وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ (انبیاء:107) اے نبی ہم نے آپ کو تمام دنیا والوں کے لئے رحمت بنا کر بھیجا ہے۔ وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا (سبا:9) اور ہم نے آپ کو تمام انسانوں کے لئے بشیر و نذیر بنا کر بھیجا ہے۔

تَبٰرَكَ الَّذِیْ نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلٰی عَبْدِهٖ لِیَكُوْنَ لِلْعٰلَمِیْنَ نَذِیْرًا (فرقان:1) بڑی عالی شان ذات ہے جس نے یہ فیصلہ کی کتاب اپنے بندہ پر نازل کی تا کہ وہ تمام دنیا جہانوں والوں کے لئے ڈرانے والا ہو۔

قُلْ لَّآ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَیْهِ اَجْرًا اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٰی لِلْعٰلَمِیْنَ (انعام:9) کہہ دیجئے کہ میں تم سے اس پر معاوضہ نہیں چاہتا یہ تو صرف تمام جہان والوں کے لئے نصیحت ہے۔

اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ لِّلْعٰلَمِیْنَ (ص:87) یہ قرآن تو جہاں والوں کے لئے ایک نصیحت ہے۔

الغرض قران مجید کی سورۃ مکی میں وہ آیات موجود ہیں جو رسول کریم ﷺ کے دعویٰ عالمگیریت کو واضح کرتی ہیں

☆......☆
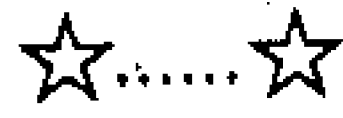
آپ ﷺ ضال تھے

اعتراض: ۔ عام پادری اور مخالفین قرآن مجید کی اس آیت سے وَوَجَدَكَ ضَآلًّا فَهَدٰی (الضحیٰ 7:93) (تجھے گمراہ پایا پس اس (خدا) نے ہدایت کی) سے یہ استدلال کرتے ہیں کہ جب آپ خود ہی گمراہ تھے دوسروں کو کیا ہدایت دینی ہے۔

جواب ۔ معترضین عربی زبان کے اسرار و رموز سے ناواقف ہیں یہ اعتراض بھی لاعلمی اور ناسمجھی کا نتیجہ ہے۔ قرآن مجید میں حضرت یعقوب کے متعلق ان کے بیٹوں کا قول کا ذکر ہے۔ اِنَّكَ لَفِیْ ضَلٰلِكَ الْقَدِیْمِ یعنی تو حضرت یوسف کی محبت میں ابھی تک وارفتہ ہے آیت کا مطلب یہ ہے کہ نبوت سے قبل آپ اللہ کی محبت میں اور حصول قرب کے لئے وارفتہ ہو گئے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے اس تڑپ اور وارفتگی کو دیکھ کر تجھے راستہ بتا دیا۔

دوسرے معنی:

تجھے لوگوں کی گمراہی نے پریشان کر رکھا تھا۔ یہ کیسے راہ راست پر آئیں گے۔ اللہ تعالیٰ نے اس پریشانی اور ذہنی کوفت اور لوگوں کو راہ ہدایت پر چلانے کی شدید خواہش کو دیکھا تو تجھے ہدایت کی نعمت سے نوازا۔

جب رسول کریم ﷺ مقام ضالّ (مقام عشق) کی انتہا تک پہنچ گئے تو اللہ تعالیٰ نے اپنے بندے حضرت محمد مصطفےٰ ﷺ پر اپنی ہدایت کے راستے کھول دیئے یہاں ضالّ مقام مدح پر استعمال ہوا ہے مقام ذم پر نہیں۔ یہی قرآن مجید اعجاز ہے کہ اس کے الفاظ میں اسرار و رموز کا بہتا ہوا دریا پایا جاتا ہے۔

تیسرا مفہوم:

کتب مقدسہ کا محاورہ ہے کہ مورث اعلیٰ کا نام لے کر قوم کو مخاطب کیا جاتا ہے یعقوب کو جیسی اس کی روشیں ہیں سزا دے گا (12 باب 2 ہوسیع۔ یعقوب کو اس کا گناہ اور اسرائیل کو اس کی خطا جتاؤں میکہ 3 باب 8

یہ عہد عتیق کا محاورہ ہے اس طرح عہد جدید میں اسی رنگ میں محاورہ استعمال ہوا ہے زیر اعتراض آیت وَجَدَكَ ضَآلًّا فَهَدٰی میں اللہ تعالیٰ نے رسول کریم ﷺ کو مخاطب کر کے مراد امت لی ہے یعنی تیری امت کو گمراہ پایا پھر ان کو ہدایت دی وَجَدَكَ ضَآلًّا سے مراد

امت کی گمراہی ہے نا کہ رسول کریم ﷺ کی اس میں کوئی شک نہیں رسول کریم ﷺ کی قوم گمراہی کی انتہا تک پہنچ چکی تھی۔ تو اللہ تعالیٰ نے رسول کریم ﷺ کی معرفت ہدایت کی نعمت سے نوازا

قرآن مجید میں یہ عام محاورہ ہے کہ مخاطب رسول کریم ﷺ ہوتے ہیں لیکن مخاطب امت ہوتی ہے۔

☆......☆

اللہ تعالیٰ نے رسول کریم ﷺ کے اگلے پچھلے گناہ بخش

اعتراض: معترضین اور پادریوں کی طرف سے اس آیت پر بھی بکثرت اعتراض کیا جاتا ہے لِيَغْفِرَ لَكَ اللّٰهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْۢبِكَ وَمَا تَاَخَّرَ خدا نے تیرے پہلے اور پچھلے گناہ معاف کر دے۔ معلوم ہوا محمد صاحب گناہ کرتے تھے (معاذ باللہ)

جواب۔

رسول کریم ﷺ کے غفر ذنب سے مراد:

زیر اعتراض آیت کا تعلق فتح مبین یعنی صلح حدیبیہ سے ہے۔ اس آیت اس لئے یہ کہنا کہ اللہ تعالیٰ تیرے اگلے پچھلے گناہ بخش دے گا صحیح نہیں گناہوں کی مغفرت صلح یا کسی فتح سے تعلق نہیں رکھتی۔ فتح مبین کے نتیجہ میں چار باتیں بیان کی گئی ہیں۔ غفر ذنب اتمام نعمت ہدایت اور نصرت اگر غفر ذنب سے مراد گناہوں کی بخشش مراد لی جائے تو اس کا باقی باتوں سے کوئی تعلق نہیں بنتا۔ اس کے علاوہ قرآن مجید میں کہیں بھی آپ سے گناہوں کا سرزد ہونے کا ذکر نہیں بلکہ روحانی مراتب عالیہ کا ذکر ہے۔ دعویٰ نبوت سے پہلے بھی آپ لوگوں میں امین کے نام سے مشہور تھے۔ لہٰذا زیر اعتراض آیت کے معنی گناہوں کی بخشش مراد لینا صریحاً غلط ہے۔ یہاں ذنب سے مراد دوسرے کے زعم میں رسول کریم ﷺ کے ذنوب ہیں یا وہ ذنوب جو دوسرے آپ ﷺ کی طرف منسوب کرتے تھے انہی کا تعلق صلح حدیبیہ سے تھا۔ صلح حدیبیہ سے پہلے رسول کریم ﷺ کی طرف مختلف قسم کے ذنوب منسوب کرتے تھے ایسے ہی جیسا کہ آج کل مستشرقین اور مخالفین رسول کریم ﷺ کی طرف منسوب کر رہے ہیں اب صلح ہوئی ہے مسلمانوں اور مشرکوں کو میل ملاپ بڑھ جائے گا۔ مشرکین خود دیکھ لیں گے کہ جو غلط باتیں رسول کریم ﷺ کی طرف منسوب کی جاتی تھیں غلط ہیں اس طرح رسول کریم ﷺ کی ذات منسوب کردہ غلط باتوں سے پاک صاف ہو جائے گی سو ایسا ہی ہوا۔ صلح کے بعد مسلمانوں اور مشرکوں کا میل جول بڑھا تو وہ رسول کریم ﷺ کے اخلاق عالیہ کے گرویدہ ہو گئے اور وہ لوگ جوق در جوق دائرہ اسلام میں داخل ہونے لگے۔ اسی صلح کے نتیجہ میں فتح مکہ ہوا۔ یہی اتمام نعمت ہے جو غفر ذنب کے بعد بیان کی گئی ہے۔ اور یہ غفر ذنب کی وضاحت کی گئی ہے وہ قرآنی محاورہ کے مطابق کی گئی ہے۔ بعض اضافتیں حقیقی اضافتیں نہیں ہوتیں۔ مثلاً قرآن مجید میں آتا ہے اِنِّىْۤ اُرِيْدُ اَنْ تَبُوْٓاَ بِاِثْمِىْ وَاِثْمِكَ فَتَكُوْنَ مِنْ اَصْحٰبِ النَّارِ (المائدہ 29:5) میں چاہتا ہوں کہ تو میرے (خلاف) گناہ اور اپنے گناہ کی سزا پائے اِثمی سے مراد ہابیل کا گناہ نہیں ہے بلکہ جو گناہ ہابیل کی طرف منسوب کیا گیا تھا وہ مراد ہے کیونکہ اس سے پہلے ہابیل کو متقی قرار دیا گیا ہے۔ ارشاد الٰہی ہے اِنَّمَا يَتَقَبَّلُ اللّٰهُ مِنَ الْمُتَّقِيْنَ (المائدہ 27:5) اور اللہ صرف متقیوں سے قبول کرتا ہے۔ لہٰذا اِثمی سے مراد وہ گناہ ہے جو غلط طور پر ہابیل کی طرف منسوب کیا گیا۔ جس کی بناء پر اسے قتل کیا گیا۔ اسی طرح سورۃ النحل میں آتا ہے اَيْنَ شُرَكَآءِىَ (27)

میں معنی میرے شریک نہیں بلکہ مراد ہے وہ شریک ہیں جنہیں آپ کی طرف منسوب کیا جاتا تھا۔ دوسرا مفہوم فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِينًا سے مراد علوم الہیہ سے انشراح صدر ہو جانا۔ جب اللہ تعالیٰ کی طرف سے علوم نازل ہوتے ہیں تو اس وقت تمام بہیمی طاقتیں دب جاتی ہیں۔ صرف ملکوتی طاقتوں کا ہی ظہور ہوتا ہے تو مذکورہ آیات کا یہ مفہوم ہے کہ جب ہم (اللہ تعالیٰ) نے آپ ﷺ پر آسمانی علوم کے دریا بہائے تو آسمانی بادشاہت کے اسرار کھول دئے۔ تو اس کے نتیجہ میں تمام بہیمی قوتیں سرد پڑ گیں بہیمی قوتوں کا لفظ ذنب سے تعبیر کیا ہے کیونکہ گناہ ان ہی قوتوں سے سرزد ہوتے ہیں تو اللہ تعالیٰ فرما رہا ہے کہ اے محمد ﷺ جب اللہ تعالیٰ نے آسمانی روحانی علوم کی بارش کی آسمانی بادشاہت کے رموز کھول دے۔ تو اس نتیجہ میں تیری بہیمی طاقتیں بالکل سرد پڑ گیں۔

بہیمی قوتوں کے بالکل سرد پڑ جانے کو غفر سے تعبیر کیا ہے ان آیات میں رسول کریم ﷺ کی روحانی علوشان کا ذکر کیا گیا ہے۔

تیسرا مفہوم:

مغفرت سے مراد عصمت اور حفاظت ہے یعنی اللہ تعالیٰ آپ کو ہمیشہ گناہوں سے محفوظ رکھے گا۔ المراد بالمغفرت الحفظ وَالعصمة ازلاً ابداً) (روح البیان)

چوتھا مفہوم:

ذنبک میں ایک مضاف پوشیدہ ہے جیسے لک سے ظاہر ہے۔ یعنی تمہاری وجہ سے تمہاری امت کے گناہ معاف کئے۔

یہ آسمانی کتب کا محاورہ ہے مخاطب تو نبی ہوتا ہے لیکن مراد امت ہوتی ہے قرآن مجید میں آتا ہے فَلَا تَقُلْ لَّهُمَآ اُفٍّ (تو انہیں اف بھی نہ کہہ) اس آیت میں رسول کریم ﷺ کو اللہ تعالیٰ نے مخاطب کیا ہے اس وقت تو رسول کریم ﷺ کے والدین ہی فوت ہو چکے تھے لہذا فَلَا تَقُلْ میں تمام امت مراد ہے یہ حکم تمام امت کو ہے۔

عہد عتیق میں ہے یعقوب کو جیسی اس کی روشیں ہیں سزا دے گا (12 باب 2 ہوشیع) یہاں یعقوب سے مراد یعقوب کی اپنی ذات مراد نہیں بلکہ اس کی قوم مراد ہے کہ اس کی قوم کی غلط روش کی وجہ سے سزا دی جائے گی۔

کتب مقدسہ کا یہ محاورہ ہے کہ مورث اعلیٰ کا نام لے کر قوم کو مخاطب کیا جاتا ہے پس ذَنْبِكَ سے مراد امت کے گناہ مراد ہیں۔

فَاسْتَغْفِرْ لِذَنْبِكَ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ (محمد 19:47) اپنے قصور کے لئے حفاظت مانگ اور مومن مردوں اور مومن عورتوں کے لئے۔

استغفار کا مادہ غفر ہے جس کے معنی ہیں الباس مَایصونه من الدنس (مفردات) امام راغب یعنی اس کا پہنا دینا جو اسے میل کچیل سے یا برائی سے یا معیوب ہونے سے بچا رکھے اسی لئے کہتے ہیں اغفر ثوبک فی الوعا یعنی اپنے لباس کو صندوق میں محفوظ رکھ پس غفر کے اصل معنی بروئے لغت محفوظ رکھنا ہے اس استغفار کے معنی حفاظت چاہنا۔ لسان العرب میں ہے کہ غفر کے معنی ہیں تغطیہ یعنی ستر ڈھانک لینا غَفَرَ اللّٰهُ ذُنُوبَه کے معنی ہیں اللہ نے گناہوں کو ڈھانپ لیا اور مغفر خود کو کہتے ہیں جو حفاظت کا ذریعہ ہے۔

قرآن مجید میں لفظ استغفار دو پہلوؤں میں استعمال ہوا ہے ایک گناہوں سے بچنا۔ دوسرا کردہ گناہوں کے بداثرات اور نتائج بچنا پہلا استغفار مقربین کا ہے۔ جب خدا کا مقرب بندہ (اس میں نبی بھی شامل ہیں) خدا کی محبت کے اتھاہ سمندر میں غرق ہو کر اپنی بہیمی قوتوں کو ٹھنڈا کرنے کی درخواست کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس استغفار کے نتیجہ میں اپنے مقرب بندے کے تمام بہیمی قویٰ کو اس طرح پردہ میں ڈال دیتا ہے ان سے کسی قسم کا گناہ سرزد ہوتا ہی نہیں ان کی بہیمی قوتیں یوں دب جاتی ہیں جیسے ہے ہی نہیں۔ یہ استغفار مقربین کا ہے۔ انہی

میں تمام انبیاء علیھم السلام شامل ہیں گویا نبیوں کا استغفار بھی قوتوں کا ملفوف اور پردوں میں دبے رہنے کی التجا ہے جب ایک گناہ گار شخص اپنے کردہ گناہ کی بخشش کے لئے استانہ الوہیت پر گرتا ہے آہ وزاری اور الحاح وتضرع سے اللہ تعالیٰ سے اپنے کردہ گناہ کی معافی طلب کرتا ہے۔تو اللہ تعالیٰ اپنی رحمت کی چادر میں اس گناہ گار کو ڈھانپ لیتا ہے۔گویا گناہ گار شخص کی دُعا اپنے کردہ گناہوں کے بداثرات اور بدانجام سے بچنے کی درخواست ہے۔

بس قرآن مجید میں لفظ استغفار دو معنوں میں استعمال ہوا ہے نبیوں کے استغفار کا مفہوم الگ ہے،اور گناہ گار بندوں کے استغفار کا مفہوم الگ نبی کے استغفار سے مراد گناہوں سے حفاظت ہے جب کہ گناہ گاروں کے استغفار سے مراد گناہوں کی سزا سے بچنا ہے دونوں میں زمین آسمان کا فرق ہے۔معترض نے رسول کریم ﷺ کے استغفار کو گناہوں کی سزا سے بچنا مراد لے لیا ہے جو سراسر قرآنی محاورہ کے خلاف ہے۔بلکہ نبی کے استغفار سے مراد بشری قوتوں پر ستر اور تقطیہڈ النا مراد ہے یعنی بشری قوتیں پردہ میں ملفوف رہیں اور خدا کے فضل سے ان کا کبھی بھی ظہور نہ ہو رسول کریم ﷺ کے ایک فرمان کا یہی مطلب ہے آپ نے فرمایا میرا شیطان مسلمان ہو چکا ہے یعنی میری بشری قوتوں پر پردہ پڑ چکا ہے ان سے کوئی بھی گناہ سرزد نہیں ہوسکتا۔

☆......☆

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے تین مواقع پر جھوٹ بولنے کی اجازت دی

اعتراض: اہل اسلام کی مستند کتابوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ آنحضرتؐ نے مسلمانوں کو تین موقعوں پر جھوٹ بولنے کی اجازت دے دی۔اسماء بنت یزید کہتی ہیں کہ رسول اللہؐ نے فرمایا جھوٹ بولنا صرف تین موقعوں پر جائز ہے ایک تو مرد کا جھوٹ اپنی بیوی کو خوش کرنے کے لیے دوسرے لڑائی میں جھوٹ بولنے تیسرے لوگوں میں صلح کرانے کے لیے جھوٹ بولنا (ترمذی)

جواب: یہ اعتراض علم حدیث واسماء الرجال سے لاعلمی کا نتیجہ ہے ترمذی خود فرماتے ہیں اِلا من حدیث خیثم علامہ طحاوی مشکل الاثار جلد 4 ص 91,90 پر لکھتے ہیں هُوَ رَجُلٌ مَطْعُونٌ فِي رِوَايَةِ مَنْسُوبٍ اِلَى سُوءِ الحِفْظِ وہ آدمی یعنی ابن خیثم سوء حفظ کی وجہ سے روایت میں معتبر نہیں۔

وہ شخص جو بعثت سے قبل امین کے نام سے مشہور ہو دشمن بھی آپ کو سچا اور صادق کہتے ہوں۔کیا وہ اپنے ماننے والوں کو کسی موقع پر جھوٹ بولنے کی تلقین کرسکتا ہے؟ سب سے زیادہ وعید قرآن اور حدیث میں جھوٹ بولنے پر آئی ہے اور جھوٹے کو لعنتی کہا ہے۔لہذا یہ حدیث وضعی ہے۔حدیث کے صحیح پرکھنے کا معیار قرآن مجید ہے چونکہ یہ حدیث قرآن مجید کی بنیادی تعلیم کے منافی ہے لہذا یہ حدیث بالکل وضعی ہے۔

☆......☆
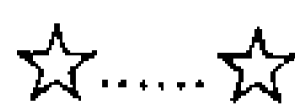
حضرت زینب سے شادی اور مخالفین کی رنگ آمیزی

اعتراض: حضرت زینب سے شادی کو اعتراض کے طور پر متعدد مستشرقین اور مخالفین نے بیان کیا ہے ستیارتھ پرکاش کے مصنف سوامی دیانند جی نے اعتراض 130 دھرم پال نے ترک اسلام میں اعتراض 103 اور ابن وراق نے اپنی کتاب (Why I am not a Muslim)

میں مسلمان کیوں نہیں) کے صفحہ 87 پر دہرایا ہے کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اپنے منہ بولے بیٹے حضرت زید کی جورو حضرت زینب پر عاشق ہو گئے تھے۔ ان سے طلاق دلوا کر خود شادی کر لی (نعوذ باللہ) نیز میور، درمنگھم، واشنگٹن ارونگ (Irving) وغیرہ نے بھی اپنی کتب میں اس اعتراض کو دہرایا ہے۔

جواب: زینب بنت امیم رشتہ میں آپ کی پھوپھی کی بیٹی تھی آپ نے خود نکاح حضرت زیدؓ سے کرایا تھا۔ وہ ایک آزاد کردہ غلام تھے حضرت زینب اعلیٰ خاندان قریش میں سے تھیں۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم ادنیٰ اور اعلیٰ خاندانوں کے افراد میں شادی کرا کے نسلی اور خاندانی تفوت کو دور کرنا اور مساوات بین الناس کا سبق دینا چاہتے تھے۔ لیکن یہ شادی دیر تک نہ چل سکی اور حضرت زینب کا آپس میں نباہ نہ ہو سکا آخر کار انہوں نے طلاق دے دی۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا زینب سے نکاح کی وجوہ:

حضرت زید کے طلاق دینے کے بعد رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت زینب سے نکاح کر لیا اس کی دو وجوہ تھیں ایک یہ کہ حضرت زید آپ کے منہ بولے بیٹے تھے عرب کے رواج کے مطابق منہ بولے بیٹے کی مطلقہ بیوی سے شادی کرنا ناجائز تھا عرب کی اس غلط رسم کو ختم کرنے کے لیے آپ نے حضرت زینب سے شادی کی۔ کیونکہ منہ کے ساتھ کسی کو بیٹا کہنے سے وہ حقیقی بیٹا نہیں بن جاتا نہ کسی کو بھائی کہنے سے وہ حقیقی رشتہ اخوت میں آ جاتا ہے نہ کسی کو باپ کہنے سے وہ باپ بن جاتا ہے یہ محبت کے الفاظ ہیں یہ الفاظ بولنے سے کوئی ایک دوسرے کا حقیقی رشتہ دار نہیں بن جاتا۔ متبنی کی بیوی سے شادی نہ کرنے کی رسم کو باطل قرار دینے کے لیے اللہ کے حکم سے شادی کر لی اور آپ نے اپنے عملی نمونہ سے اس رسم کو ختم کیا۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ آپ نے مطلقہ عورتوں کی عزت افزائی کے طور پر نکاح کیا تھا کیونکہ مطلقہ عورت کے نام پر عموماً داغ سا لگ جاتا ہے اس وجہ سے بڑے لوگ مطلقہ عورت سے شادی نہیں کرتے مطلقہ عورت معاشرہ میں ایک حقیر قسم کا فرد شمار کیا جاتا ہے اور تھا۔ ایک مطلقہ عورت سے شادی کر کے آپ نے عملی طور پر یہ ثابت کیا کہ کسی وجہ سے اگر کسی عورت کو طلاق ہو جاتی ہے تو وہ معاشرہ کا کوئی ناکارہ فرد نہیں بن جاتا۔ امت کو یہ سبق دینا مقصود تھا کہ مطلقہ عورت بھی ویسے ہی معزز رہتی ہے جیسے طلاق سے قبل تھی۔ مطلقہ عورت سے شادی کر کے کئی قسم کی معاشرتی بیماریوں اور برائیوں سے نکلنے کی راہ نکالی۔ یہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک بڑا احسان ہے جس کو معترضین نے ہدف تنقید بنا لیا ہے بنیادی بات یہ ہے کہ متبنی حقیقی بیٹا نہیں ہے۔

اس کے علاوہ یہ بھی مسلمہ تاریخی حقیقت ہے کہ کسی مذہب میں بھی متبنی کی مطلقہ بیوی سے شادی کرنے کی ممانعت نہیں اور دین اسلام میں بھی نہیں جب ہر مذہب سے متبنی کی مطلقہ بیوی سے شادی کی اجازت ہے تو اعتراض کیسا۔

جھوٹے قصے:

اس نکاح کے متعلق بلاتحقیق قصے لکھے گئے ہیں جس کو مستشرقین نے خوب اچھالا ہے کہ زید نے طلاق اس لیے دی تھی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارادہ حضرت زینب سے نکاح کا تھا بعض نے یہ لغو تفصیلات بڑھائی ہیں کہ آپؐ نے حضرت زید کی غیر حاضری میں ان کے گھر گئے وہاں حضرت زینب کے حسن و جمال کو دیکھ کر نکاح کا ارادہ کر لیا تو حضرت زیدؓ نے آپؐ کے اس ارادے کو بھانپ کر طلاق دے دی نعوذ باللہ من ھذا الخرافات۔

اگر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا منشا خود نکاح کرنے کا تھا تو آپؐ حضرت زید کو طلاق دینے سے کیوں روکتے اگر یہ کہا جائے کہ لوگوں کے خوف سے تو اتق اللہ کی ہدایت کس طرح موزوں تھی نعوذ باللہ خود تو خلاف تقوی کام کریں مرید کو تقوی کی تلقین کریں اگر ایسا ہوتا تو حضرت زیدؓ ایک لحہ کے لیے بھی آپ کی بیعت میں نہیں رہ سکتے تھے۔

یہ بات اور بھی زیادہ لغو ہے کہ آپؐ نے زینب کو دیکھ لیا تھا حضرت زینب آپ کی رشتہ دار تھیں حضرت زید سے نکاح کرنے سے قبل ایک دفعہ نہیں بلکہ ہزاروں دفعہ دیکھا ہوگا زینبؓ اور اس کا بھائی خود بھی چاہتے تھے کہ آپؐ شادی کر لیں آپؐ نے انکار کر دیا تھا اور حضرت زید سے شادی کرا دی کنوار پن میں تو نہ ہی فریفتہ ہوئے اور نہ ہی نکاح کرنا قبول کیا۔ حضرت زید سے شادی ہو چکنے کے بعد حسن و جمال آنکھوں کو بھا گیا اور نکاح کرنے کا ارادہ کر لیا یہ تمام مفتریات ہیں اسے مطلقہ ہونے کی حالت میں اپنے نکاح میں لانا سوائے کسی مجبوری کے نہیں ہو سکتا۔ وہ وجوہ اوپر بیان ہو چکی ہیں سب سے اہم وجہ عرب کی باطل رسم کو ختم کرنا مقصود تھا۔

کسی کے کردار کو جانچنا ہو تو اس کے عہد جوانی کو دیکھنا چاہیے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا عہد جوانی پاکیزگی کا عہد ہے۔ کسی شخص نے بھی آپ کی ذات پر الزام نہیں لگایا۔ جب آپ ادھیڑ عمر کو پہنچ گئے۔ پھر عورتوں کی طرف رغبت ہوئی یہ سب ذہنی اختراعات اور مفتریات ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ جس طرح آپؐ کا بچپن اور عہد شباب بے داغ تھا۔ اسی طرح ادھیڑ عمر اور بڑھاپا بھی بے عیب تھا۔ تاریخ یہ بھی بتاتی ہے کہ کوئی مرید بھی آپ کے کردار کی وجہ سے آپؐ سے منحرف نہیں ہوا نہ تاریخ سے یہ ظاہر ہے کہ کسی مرید نے آپؐ کے کردار پر انگشت نمائی کی ہو۔ یہ تاریخ کی گواہی آپ کی پاکیزگی پر دلالت کرتی ہے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے کردار کو جس زاویے سے بھی دیکھیں وہ بے عیب نظر آتا ہے۔

کثرت ازواج پر اعتراض

اعتراض: کثرت ازواج پر متعدد مخالفین اور مستشرقین نے اعتراض کیا ہے۔ سوامی دیانند نے ستیارتھ پرکاش کے چودھویں باب کے اعتراض 143 دھرم پال نے اپنی کتاب ترک اسلام میں اعتراض 101 ابن وراق نے اپنی کتاب Why I·am not a Muslim (میں مسلمان کیوں نہیں) کے صفحہ 87 اور منٹگمری واٹ نے Mohammad at Madina (محمد ایٹ مدینہ) کے صفحات 397-394 پر کثرت ازواج کو ہدف تنقید بنایا ہے۔ جس طرح اسلام پر لوٹ مار قتل و غارت (جہاد کے غلط تصور) کا کثرت سے اعتراض کیا جاتا ہے اسی طرح مخالفین نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی کثرت ازواج پر اعتراض کیا ہے۔

جواب: دنیا کے تمام مذاہب ایک سے زیادہ بیویاں کرنے کی تائید میں ہیں ان کے بڑے بڑے مقدس راہنماں کی زندگیوں میں ایک

سے زائد عورتوں سے شادی کرنے کی مثالیں پائی جاتی ہیں۔

ہندو مذہب رگ وید انوکا۔ 17 سکت 10 (116) میں بہت سی کنواریوں کی اجازت صاف صاف ہوتی ہے۔ لہٰذا رگ وید کے نزدیک تعدادِ ازدواج کی اجازت ہے اور تحدید بھی نہیں پائی جاتی۔

1- مہاراجہ دسرت کی تین بیویاں تھیں پٹ رانی کوشلا والدہ رام چندر جی۔ رانی سمترا، والدہ چھمن جی، رانی کیکئی والدہ بھرت جی۔

2- سری کرشن جی کی سینکڑوں بیویاں تھیں اور کرشن جی مہاراج کو سوامی جی نے خود زیادہ بیویوں کی وجہ سے استریئن (زیادہ بیویوں والا) لکھا ہے راجا پانڈو کی دو بیویاں تھیں والدہ یدھشٹر دھیم سین ارجن مادری، والدہ نکل وسہدیو۔ راجا شنتن کی دو بیویاں تھیں گنگا والدہ بھیکم سیتہ وتی والدہ چترانگدا بچھتر ایرج کی دو بیویاں اور ایک لونڈی تھی امیکا، والدہ۔ دھرتراشت پسر بیاس جی، امبایکا، والدہ پانڈو پسر بیاس جی لونڈی، والدہ بدر پسر بیاس جی، یا گولیکیہ رشی۔ مہارشی وشوامتر، جناب اندر، وشسشٹ رشی وغیرہ۔ سب کی ایک سے زیادہ بیویاں ہیں۔

کتس رشی اپنے متعلق راجہ کے دان کی تعریف کرتا ہوا وید میں کہتا ہے پروکتس کے بیٹے ترسد سیو نے مجھے پچاس کنواریاں کا دان دیا ہے" (رگوید منڈل 8 سوکت 19 منتر 36) تشریح کے لیے دیکھو نرکت 15:4۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام جن کی بزرگی کا اعتراف نصف دنیا سے زیادہ کو ہے ان کی تین بیویاں تھیں، سیدہ ہاجرہ کتاب پیدائش 16/4 والدہ حضرت اسماعیل علیہ السلام سیدہ سارہ کتاب پیدائش 18/15 والدہ حضرت اسحاق علیہ السلام، قتورہ خاتون جن کا ذکر پیدائش 25/1 میں موجود ہے والدہ زمران، یقسان، مدان، مدیان، اسباق، سوخ حضرت یعقوب کی چار بیویاں تھیں لیاہ کتاب پیدائش 29/23 والدہ روبن سمعون لاوی یہودہ اشکار زبلون، 2- زلفہ کتاب پیدائش 29/34 والدہ جد اشر۔ 3 بی بی راخیل کتاب پیدائش 29/28 والدہ یوسف علیہ السلام اور بن یامین۔ 3- بلہہ کتاب پیدائش 29/29 والدہ دان نفتال

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی چار بیویاں تھیں 1- سفورہ (صفورہ) خاتون کتاب خروج 2/31 والدہ جیرسوم۔ الیزر 2- حبشیہ 3 ایک اور بیوی جس کے باپ کا نام قینی تھا قاضیوں 4/16 ایک اور بیوی جس کے باپ کا نام حباب تھا قاضیوں 4/16 کنیزیں نامعلوم، جنگی اسیروں میں حسب منشا خواتین کو کنیز بنانے کی اجازت تھی (گنتی باب 1,12 استثناء باب 10,21 تا 13۔

حضرت داؤد علیہ السلام دس بیویاں تھیں شویمت ابیشاگ (سلاطین باب 1-3) میکل، اخنوعیم (سموئیل باب 19-11، باب 27-2، یزرعیلی، ابجیل، معکہ (سموئیل باب 2-2، باب 2-3، حجیت ابیطال، عجلا (سموئیل باب 4,2 تا 5، دسویں کا نام معلوم نہیں بہت سی ایسی تھیں جن کی تفصیل نہیں ملتی (سموئیل باب 5-13) ان کے علاوہ حرم تھیں۔

حضرت سلیمان کی بیویاں سات سو تھیں سلاطین باب 11-3 حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی زندگی کا ایک بڑا حصہ پردہ کتمان میں ہے۔ ان کی ازدواجی زندگی کا علم نہیں ہوتا لیکن ان کے تجرد سے یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ وہ تعدادِ ازدواج کو ناپسند کرتے تھے انجیل متی باب 25 میں انہوں نے ایک تمثیل بیان فرمائی جس میں ایک دولہا سے پانچ کنواریوں کی شادی کا ذکر پایا جاتا ہے جب کہ بقیہ پانچ اپنی غفلت کی وجہ سے اس دولہا سے محروم رہ گئیں (ملاحظہ ہو درس 1 تا 12)۔ کتاب حزقی ایل باب 23 میں ایک اور طویل تمثیل بیان ہوئی جس میں خود یہوواہ دو بہنوں اہولہ اور اہولیبہ کو اقتشالاً اپنی بیویاں قرار دیتا ہے مذکورہ بحث سے یہ واضح ہوجاتا ہے یک زوجگی کا حکم کسی نبی نے نہیں دیا جسٹنین قیصر روم نے وحدت زوج کو ملکی قانون بنایا پھر یہ قانون مذہبی رنگ اختیار کرگیا یہ اب کلیسا نے اس بدعت پر زیادہ زور دیا ہے۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کے چار حصے:

شادی کے لحاظ سے آپ کی عمر کو چار حصوں میں منقسم کیا جاسکتا ہے پہلا حصہ وہ ہے کہ جب آپؐ نے تجرد کی زندگی بسر کی۔ یہ پچیس سال کی عمر تک ہے دوسرا حصہ وہ ہے جب آپؐ نے ایک بیوی سے شادی کی یہ پچیس سال سے پچپن سال کی عمر تک ہے تیسرا حصہ وہ ہے جب آپ نے کئی ازواج سے شادی کی۔ یہ پچپن سے ساٹھ سال تک ہے آخری حصہ ساٹھ سال سے لے کر وفات تک ہے اس حصہ عمر میں آپ نے کوئی شادی نہیں کی۔

مجردانہ زندگی:

پہلے پچیس سال مجردانہ زندگی کے ہیں یہی وہ وقت ہوتا ہے جب جذبات حیوانیہ میں اشتعال ہوتا ہے ان پر قابو پانا اور حکمرانی کرنا مشکل ترین کام ہوتا ہے خصوصاً گرم ممالک میں جہاں بلوغت کی عمر جلد آجاتی ہے یہی وہ عمر کا دور ہے جب آپ کی عفیف اور پاک زندگی کی وجہ سے قوم کی طرف سے "الامین" کا خطاب ملا تھا یہ خطاب ظاہر کرتا ہے کہ جہاں آپؐ میں دوسرے تمام اخلاق حمیدہ اکمل طور پر پائے جاتے تھے وہاں آپ عفت اور پاکیزگی کے وصف سے بھی احسن طور پر متصف تھے سر ولیم میور جو مخالفانہ نقطہ نگاہ سے آپ کی زندگی کے حالات لکھتا ہے وہ بھی لکھتا ہے کہ تمام راوی اس بات پر متفق ہیں کہ "جوانی میں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم حیا، پاکیزگی اور نیک چلنی کی صفات سے جو مکہ میں شاذو نادر ہی پائی جاتی تھیں متصف تھے"۔

عمر کا یہ حصہ ظاہر کرتا ہے کہ آپؐ اپنے جذبات حیوانیہ پر حاکم تھے یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ اس وقت عرب سوسائٹی کی عام حالت ایسی تھی کہ بدکاری ان کا دن رات کا مشغلہ تھا کوئی شخص بھی اس گناہ پر مطعون نہ ہوتا تھا بلکہ مرد اور عورت کے ناجائز تعلقات پر اشعار میں اعلانیہ فخر کیا جاتا تھا۔

ایک بیوی سے نکاح کی حالت:

آپ کی عمر پچیس سال کی تھی جب آپؐ نے حضرت خدیجہ سے شادی کر لی جس کی عمر چالیس سال کی تھی حضرت خدیجہ کی وفات تک آپؐ نے کوئی شادی نہیں کی۔ ان کی وفات کے بعد آپؐ نے حضرت عائشہ سے نکاح کیا۔ چونکہ وہ نابالغ تھیں اور جب تک وہ بالغ نہ ہوں آپ کو مجرد ہی رہنا تھا اس لیے ایک معمر بی بی حضرت سودہ نام سے آپ نے شادی کی جو ایک مخلص صحابی کی بیوہ تھیں جنہوں نے قریش مکہ کی ایذاؤں سے تنگ آ کر حبشہ کی طرف ہجرت کی تھی۔ یہ معمر بی بی تین سال مکہ میں اور دو سال مدینہ میں آپؐ کے گھر میں رہیں۔

حضرت عائشہ کا رخصتانہ ہجرت کے دوسرے سال ہوا۔

عرب میں ایک آدمی کے لیے تین چار شادیاں کرنا معمولی بات تھی تعدد ازدواج صرف امراء تک محدود نہ تھی بلکہ غرباء میں بھی عام رواج تھا ایک تو وجہ یہ تھی کہ عرب میں اکثر خانہ جنگی رہتی تھی جس کی وجہ سے مردوں کی تعداد کم ہو گئی تھی۔

دوسرے عورتیں محنت مزدوری کر کے خاوند کی مزدوری بڑھانے کا موجب ہوتی تھیں اس وجہ سے اگر مرد کو دوسری شادی کرنے کی خواہش ہوتی تو کوئی امر مانع نہ تھا۔

ایک دفعہ قریش نے خود یہ پیش کش کی تھی کہ آپ کو سردار بنانے کو تیار ہیں اور مال و دولت سے آپ کا گھر بھر دیتے ہیں عرب کی حسین سے حسین عورت سے شادی کرانے کو تیار ہیں لیکن آپ توحید کی منادی سے رک جائیں لیکن آپؐ نے انکار کر دیا۔

آپؐ کے وہ صحابہ جنہوں نے آپؐ کے لیے اپنی جائیدادیں گھر بار رشتے دار چھوڑ دیئے تھے کیا وہ آپ کی خواہش کے مطابق اپنی

لڑکی کی شادی آپؐ سے کرنے کو تیار نہ تھے دراصل جب تک آپؐ کو متعدد شادیاں کرنے کی ضرورت پیش نہ آئی اس وقت تک اس بات کو صحیح سمجھتے تھے کہ ایک مرد کا ایک شادی کرنا ہی اصل قانون ہے۔

متعدد شادیاں:

متعدد شادیاں آپؐ نے زندگی کے تیسرے دور میں کی ہیں یہ دور پچپن سے ساٹھ سال تک کا ہے جو شخص پچیس سال تک عفیفانہ زندگی بسر کرتا ہے پھر ایک شادی کر کے دوسری شادی کی طرف مائل تک نہیں ہوتا جب کہ لوگ حسین سے حسین عورت سے شادی کرانے کی پیش کش کرتے ہیں آپؐ ان کی پیش کش کی طرف توجہ تک نہیں کرتا وہ پچپن سال کے بعد جب کہ بڑھاپے کے آثار ظاہر ہو چکے ہوتے ہیں اپنی خواہش کے مطابق کیوں کر متعدد شادیاں کرے گا۔

جب ہم واقعات پر نظر ڈالتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ متعدد شادیوں کا زمانہ اقوام عرب کے ساتھ جنگ کرنے کا زمانہ ہے یعنی 2 ہجری سے لے کر 8 ہجری کا زمانہ ہے جب اقوام عرب سے لڑائیوں کا سلسلہ بند ہو جاتا ہے تو آپ کوئی شادی نہیں کرتے پھر یہ وہ زمانہ ہے جب کہ دشمن مسلمانوں کی مٹھی بھر جماعت کو ہستی سے نیست و نابود کرنے پر تلا ہوا ہے کبھی ایک قبیلہ کی طرف سے یہ خبر ملتی ہے کہ وہ حملہ کی تیاریاں کر رہا ہے کبھی دوسرے قبیلہ کی طرف سے یہ خبر سنائی دیتی ہے کہ وہ مدینہ پر حملہ آور ہونا چاہتا ہے۔ مسلمان دن رات مسلح ہو کر شہر کا پہرہ دیتے رہتے ہیں کبھی تنگ آ کر کہتے ہیں اے اللہ کے رسول ہم دن رات زرہ لگائے اور ہتھیار پہنے تھک گئے ہیں تو آپؐ جواب دیتے کہ یہ زمانہ بھی ختم ہو جائے گا۔

آپ کو دن رات یہی فکر رہتی ہے کہ کس طرح مٹھی بھر مسلمانوں کی حفاظت کا سامان کیا جائے پھر آپ کو صرف بیرونی دشمنوں کا ہی خطرہ نہیں ہے بلکہ شہر کے اندر یہود اور منافق بھی مسلمانوں کو گزند پہنچانے کے منصوبے تیار کرتے رہتے ہیں ان حالات میں تو ایک عیاش بھی رنگ رلیاں اور عیش وعشرت بھول جاتا ہے چہ جائیکہ ایک مسلمہ پاک باز انسان اپنے حیوانی جذبات کا غلام بن کر رنگ رلیوں میں مصروف ہو جائے۔

جب آپؐ کے دن ان تفکرات اور خدشات میں گزرتے ہیں تو کیا آپؐ رات کے وقت عیش وطرب کی محفل جما سکتے ہیں؟ اسی زمانہ کی شہادت ہے کہ آپؐ رات کو تہجد کے لیے کھڑے ہوتے ہیں تو لمبے قیام سے پاؤں متورم ہو جاتے ہیں اب غور کا مقام ہے آپ کب عیش وعشرت میں اپنے ہاتھ رنگتے ہیں دن تو مسلمانوں کو پند ونصائح نماز پڑھانے اور دشمنوں سے بچاؤ کی تدابیر کو سوچنے میں گزر جاتا ہے جب لڑائی کا موقع آتا ہے تو آپ بنفس نفیس مزدوروں کی طرح کام کرنے میں مشغول ہو جاتے ہیں۔

رات بارگاہ الٰہی میں قیام کے ساتھ گزر جاتی ہے ان حالات کے اندر کوئی شخص آپؐ کے متعلق عیش وعشرت کا وہم بھی دل میں نہیں لاسکتا ہاں وہی شخص جس کی آنکھوں پر تعصب کی پٹی ہو دل میں بغض وعناد کی آگ ہو اور کان حقیقت پسندی سے ناآشنا ہوں۔

پس بڑھاپے میں آپ کا شادیاں کرنا اور صرف جنگ کے زمانہ تک کرنا صاف بتاتا ہے کہ تعدد ازدواج کا جنگ سے ضرور تعلق ہے اب ظاہر ہے کہ لڑائی میں مرد مارے جاتے ہیں عورتوں کی تعداد بڑھ جاتی ہے ضروری ہے کہ عورتوں کی خبر گیری اور اخلاق حسنہ کے زیور سے پیراستہ رکھنے کے لیے متعدد شادیاں کی جائیں۔

پس ایک تو آپ نے بیواؤں پر رحم اور خبر گیری کے لیے نکاح پر نکاح کیے باسورتھ سمتھ ایک عیسائی مصنف نے بھی اس بات کا اعتراف کیا ہے وہ لکھتا ہے "یہ یاد رکھنا چاہیے کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بہت نکاحوں کی جہاں دیگر وجوہ ہوسکتی ہیں یہ معقول وجہ بھی ہوسکتی ہے کہ آپؐ نے یہ نکاح ان بیبیوں پر رحم کھا کر کیے جو بے کسی اور بے یار ومددگار ہوگئی تھیں یہ عورتیں قریباً سب کی سب بیوہ ہی تھیں اور

ان کے حسن و دولت کا کوئی شہرہ نہ تھا بلکہ بات اس کے بالکل برعکس تھی۔

دوسرے تجرد کی زندگی سے طرح طرح کی اخلاقی کمزوریاں پیدا ہو جاتی ہیں جذبہ شہوانی ایک فطری جذبہ ہے اگر اس کو زائل نہیں کیا جاتا جذبات کو روکنا صحت کے لیے مضر ہے ان حالات خاصہ میں تعدد ازدواج کے سوا کوئی چارہ نہیں اور عورتوں کو نکاح میں لاکر معاشرہ کو بدکاری سے بچایا جاسکتا ہے۔

جنگ عظیم کے بعد یورپ میں یہی صورت حال پیدا ہو گئی تھی عورتوں کی تعداد مردوں سے زیادہ ہو گئی تو تعدد ازدواج کے اصول کو نہ ماننے کی وجہ سے عیسائی ممالک میں بدکاری کی کثرت ہو گئی اور لوگ قسم قسم کی خطرناک بیماریوں میں مبتلا ہو گئے۔ افسوس اس امر پر ہے کہ یورپ کے فلاسفروں کی نظر میں ایک مرد کی دو بیویاں کا ہونا سب سے بڑا جرم ہے لیکن عورتیں جذبہ حیوانی کی تسکین یا معاشی تنگی کی وجہ سے اپنے جوہر عفت کو بیچیں اور لاکھوں کی تعداد میں بدکاری کی وجہ سے بچے پیدا ہوں۔ جن کی خبر گیری کرنے والا کوئی نہ ہو تو اس پر ان معترضین کا دل نہیں کڑھتا۔

چوتھا زمانہ:

یہ دور ساٹھ سال سے وفات تک کا زمانہ ہے جب ملک عرب میں جنگ کا خاتمہ ہو چکا تھا عیش و عشرت کے لیے مناسب وقت تھا لیکن آپؐ نے اس دور میں کسی صورت سے شادی نہیں کی۔ اگر آپؐ نفسانی خواہشات کے تحت شادیاں کرتے ہوتے تو اب نفس امارہ کی شہوانی ہوس کی تسکین کے لیے موزوں ترین وقت تھا ملک کے بادشاہ تھے۔ دشمن کی طاقت کا عصا ٹوٹ چکا تھا لیکن آپؐ نے ایسا نہیں کیا کیونکہ تعدد ازدواج کی ضرورت ختم ہو چکی تھی۔

آپ کی سادہ اور فقیرانہ زندگی بھی اس بات پر شاہد ہے کہ آپ کو عیش و عشرت اور رنگ رلیوں سے دور کا بھی واسطہ نہ تھا لباس سادہ موٹا پیوند لگا ہوا ہوتا اور ضروریات کے لیے نہایت ہی مختصر سامان رکھتے گھر میں کئی کئی دن تک کھانا نہیں پکتا کھجوروں پر ہی وقت گزرتا رہتا اگر آپؐ دولت کے خواہاں ہوتے تو بیت المال سے جس قدر چاہتے لے سکتے تھے عیاشی اور سادگی اور دنیا سے بے رغبتی ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتی۔

بیویوں کو سامان زینت دینے سے انکار:

دنیا میں یہ دیکھا جاتا ہے کہ عیاش آدمی اپنی بیوی کی ہر ضرورت کو پورا کرنے کو تیار رہتا ہے خاص طور پر سامان زینت کی ضرورت کو لیکن اس کے برعکس رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ نمونہ ہے کہ جب مدینہ میں مال غنیمت آنا شروع ہوتا ہے تو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بیویوں کے دل میں یہ خواہش پیدا ہوتی ہے کہ ہم بھی حصہ رسدی مال سے فائدہ کیوں نہ اٹھائیں آپ کی خدمت میں درخواست کرتی ہیں تو خدا کا نبی خدا سے وحی پاکر یہ کہتا ہے "اے نبی! اپنی بیویوں سے کہہ دو کہ اگر تمہارا مقصد دنیا کی زندگی اور اس کی زینت ہے تو آؤ میں تمہیں سامان دوں اور اچھی طرح رخصت کردوں (الاحزاب 28:33)

کیا شہوات نفسانی کا بندہ یہ بات کہہ سکتا ہے کہ اگر سامان زینت چاہتی ہو تو گھر سے نکل جاؤ۔

تعدد ازدواج کی غرض:

متعدد نکاحوں کی غرض قرآن مجید میں یہ بیان کی ہے وَاِنْ كُنْتُنَّ تُرِدْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَالدَّارَ الْاٰخِرَةَ فَاِنَّ اللّٰهَ اَعَدَّ لِلْمُحْسِنٰتِ مِنْكُنَّ اَجْرًا عَظِيْمًا (29:33) وَاذْكُرْنَ مَا يُتْلٰى فِيْ بُيُوْتِكُنَّ مِنْ اٰيٰتِ اللّٰهِ وَالْحِكْمَةِ (احزاب 33 : 34) اور اگر تمہاری غرض اللہ اور اس رسول اور آخرت کا گھر ہے تو اللہ تعالیٰ نے تم میں سے نیکی کرنے والیوں کے لیے بڑا اجر رکھا ہے اور یاد کرو وہ جو اللہ

کی آیات اور دانائی کی باتوں سے تمہارے گھروں پڑھا جاتا ہے۔

ان آیات کریمہ میں ازواج مطہرات کے آپ کی زوجیت میں آنے کی غرض کو بیان کیا گیا ہے کہ وہ اللہ اور اس کے رسول کی باتیں پھیلائیں کیا مقدس مقصد ہے؟ جب کہ عام لوگ شادی صرف سکون قلب کے لیے کرتے ہیں لیکن رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی غرض اس سے بہت بلند ہے اور وہ یہ ہے عورتوں سے متعلقہ مسائل جن کو آپ کھول کر عورتوں سے بیان نہیں کر سکتے تھے وہ ازواج مطہرات دوسروں کو سکھائیں۔

متعدد نکاحوں کی ضرورت:

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم ایک عالمگیر تعلیم لے کر آئے تھے اس عالمگیر تعلیم میں ان تمام ضروریات کا پورا کرنے کا سامان موجود ہونا چاہیے تھا۔ بعض اوقات مرد کو ایسی ضرورتیں پیش آجاتی ہیں جن کی وجہ سے اسے نکاح ثانی کرنا پڑتا ہے مثلاً بیوی بانجھ ہو یا عورت کسی بیماری میں مبتلا ہو جائے۔ تو مرد کو دوسری شادی کرنا لازم ہو جاتا ہے۔

ملکی مصلحت:

بعض اوقات ملکی مصلحت کا تقاضا بھی یہی ہوتا ہے مثلاً جب جویریہؓ سے شادی کی تو مسلمانوں نے اس قبیلہ کے تمام اسیروں کو آزاد کر دیا اور وہ لوگ جو عداوت اور بغض کی جس آگ میں جل رہے تھے اس رشتہ نے اس آگ کو بجھا دیا دشمنی دوستی میں ڈھل گئی۔ اسی طرح بعض اور شادیوں سے بھی خاطر خواہ اچھے نتائج نکلے اور ملکی مسائل کے حل کرنے میں مدد ملی۔

مطلقہ عورتوں کی عزت افزائی:

ہر معاشرہ میں مطلقہ عورتوں کو وقعت کی نظر سے نہیں دیکھا جاتا ہے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مطلقہ عورت سے بھی شادی کی۔ ان کی عزت افزائی کی اور اپنے عملی نمونہ سے واضح کر دیا کہ اگر کوئی عورت کسی خاص مجبوری کی وجہ سے خلع لے لیتی ہے یا مرد طلاق دے دیتا ہے تو اس کی وجہ سے اس کے نام پر کوئی داغ نہیں آجاتا بلکہ وہ بھی معاشرہ کا ایک اچھا فرد ہے۔

غیر قوموں کی عورتوں سے شادی کرنا:

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے عقد میں قریش عورتیں بھی تھیں غیر قریشی بھی حضرت صفیہ بنی اسرائیل میں سے تھی مگر پھر بھی عرب کی تھیں لیکن آپ نے غیر قوم کی عورت سے شادی کر کے عملی نمونہ سے بتا دیا کہ آپ دوسری قوموں کی بھی ویسے ہی عزت کرتے ہیں جیسا کہ اپنی قوم عرب کی اور اپنی قوم کو سبق دیا کہ اگر وہ غیر قوم سے شادی کریں تو ان سے ویسا ہی برتاؤ کرنا چاہیے جیسا کہ اپنی قوم کی عورت سے کرتے ہیں۔

تعداد ازواج کی تحدید:

اسلام سے قبل نہ کسی مذہب میں نکاحوں کی حد بندی تھی اور نہ عرب معاشرہ میں کوئی حد بندی تھی جتنی کوئی چاہتا اپنے حلقہ عقد میں عورتیں لے آتا۔ لونڈیاں ان کے علاوہ تھیں اسلام کو یہ خصوصیت حاصل ہے کہ اس نے چار کی حد بندی کر دی اللہ تعالیٰ نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو چار کی حد بندی سے بعض مصلحتوں کی وجہ سے مستثنیٰ قرار دیا۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج مطہرات کی تعداد پر تمام سیرت نگاروں اور مورخین کا اتفاق ہے کہ بارہ تھیں منٹگمری واٹ نے ایک موضوعہ روایت پر بنیاد رکھ کر چھبیس خواتین کے نام گنوائے ہیں (Mohammad at Medina) (PP 394 - 397) جو تاریخی لحاظ سے غلط ہے۔

رسول کریم ﷺ پر ایک لونڈی کو پاک کرنے کا الزام (نعوذ باللہ)

اعتراض: سوامی دیانند جی نے اعتراض 143 میں تعدد ازدواج کو ہدف تنقید بنایا ہے وہاں کچھ اور بھی لغو باتوں کو دہرایا ہے۔ رقمطراز ہے۔ مندرجہ بالا آیتوں میں سے پہلی کے متعلق دو روایتیں ہیں محمد صاحب کو شہد کا شوق تھا ان کی بہت سی بیویاں تھیں ان میں سے ایک کے گھر شہد چاٹتے دیر لگ گئی یہ امر اور بیویوں کو ناگوار گزرا اس پر ان کے کہنے سننے سے محمد صاحب نے قسم کھائی کہ پھر شہد کا استعمال نہ کروں گا۔

(2) ایک رات وہ باری کے مطابق کسی بیوی کے ہاں گئے اتفاقاً وہ اپنے میکے گئی ہوئی تھی۔ (اس کی غیر حاضری میں) پیغمبر صاحب نے ایک لونڈی کو بلا کر پاک کیا۔ بیوی اس معاملہ کی خبر پا کر ناراض ہوگئی۔ تب محمد صاحب نے قسم کھائی کہ میں آئندہ ایسا نہ کروں گا اور بیوی سے بھی کہا کہ تم یہ بات کسی پر مت ظاہر کرنا بیوی نے یہ بات مان لی۔ لیکن انہوں نے خود دوسری بیوی کے پاس جا کر کل ماجرا بیان کر دیا اس پر یہ آیت خدا نے اتاری کہ جس چیز کو ہم نے تیرے اوپر حلال کیا اسے تو حرام کیوں کرتا ہے اب جائے غور ہے کہ کبھی خدا بھی کسی کے خانگی معاملات میں دخل دے سکتا ہے اور محمد صاحب کا چال چلن اس بات سے ہی ظاہر ہے کہ اس کی بہت بیویاں تھیں کیا جس کی بہت سی بیویاں ہوں وہ خدا پرست یا پیغمبر ہو سکتا ہے اور جو ایک بیوی کی رعایت کر کے اسے عزیز رکھے اور دوسری کی بے قدری کرے وہ ادھرمی ہے یا نہیں جو باوجود بہت سی بیویاں ہونے کے ان سے سیر نہ ہو کر لونڈی سے ناجائز تعلق کرے اس کے نزدیک حیا عزت کا پاس اور دھرم کیوں کر پھٹک سکتا ہے۔ (اعتراض 143)

جواب: یہ لمبا چوڑا اعتراض سورۃ التحریم 66 کی پہلی پانچ آیات پر کیا ہے ان آیات میں نہ تو شہد چاٹنے اور نہ ہی کسی لونڈی کو پاک کرنے کا ذکر ہے یہاں ایلاء کا ذکر ہے یعنی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ازواج مطہرات کا دنیاوی جاہ و جمال اور مال و منال کی طرف رغبت اور میلان دیکھ کر ان کے پاس نہ جانے کی قسم کھائی۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا مقصد تھا کہ ان کی بیبیاں رضا الٰہی کے حصول کی طرف راغب ہوں۔ ازواج کا مطالبہ مال و منال تھا یہ مطالبہ حصول رضائے الٰہی کے خلاف تھا۔ پس واضح ہو گیا آپ کا اپنے آپ کو ایک حلال چیز سے روکنا محض دوسروں کی خیر خواہی تھا۔ آپ یہی چاہتے تھے کہ جن لوگوں کا آپ سے رشتہ ہے۔ ان کی زندگی کا مقصد صرف حصول رضا الٰہی ہو۔ اس ایلا (مدت معینہ کے لیے بیبیوں کا اپنے اوپر حرام قرار دے لینا) پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا لِمَ تُحَرِّمُ مَا اَحَلَّ اللّٰہُ اسے تو کیوں حرام کرتا ہے جو اللہ تعالیٰ نے حلال قرار دیا ہے۔

اس آیت میں بھی اللہ تعالیٰ کی محبت جھلکتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے نہ چاہا کہ اس کا بندہ اپنے اوپر حلال چیز کو حرام قرار دے لے کہ اس کی بیویاں مال غنیمت سے مال و منال کا مطالبہ کیوں کر رہی ہیں سوامی جی نے جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات پر لونڈی کو پاک کرنے کا الزام لگایا ہے وہ ایک بیہودہ اور لغو قصہ ہے۔ جس کی کوئی اصلیت نہیں۔

ایک بیوی کا راز کی بات دوسری بیوی کو بتانا:

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے راز کی بات ایک بیوی کو کہی اس نے وہ بات دوسری بیویوں کو بتادی۔ اس آیت میں گھریلو زندگی کو بہتر بنانے کے متعلق یہ تعلیم دی ہے کہ اگر خاوند اپنی ایک بیوی کو کوئی بات بتائے تو امانت کا یہ تقاضا ہے کہ وہ بیوی کسی دوسرے کو نہ بتائے راز کی بات ظاہر کرنے سے گھریلو زندگی تلخ بھی ہوسکتی ہے۔ جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو راز افشا کرنے کا علم ہوگیا تو آپ نے درشتی سے کام نہیں لیا۔ بلکہ محبت سے سلجھایا۔ دوسری طرف مسلمانوں کو یہ سبق دیا کہ وہ بھی اپنی بیویوں سے حسن سلوک میں آپ کے نقش قدم پر چلیں۔

اعتراض 143 کا بقیہ حصہ یہ ہے کہ محمد صاحب سے کوئی ان کی بیوی ناخوش ہوگئی ہوگی اسے دھمکی دینے کے لیے محمدی خدا نے یہ آیت اتاردی کہ اگر تو نافرمانی کرے گی تو محمد صاحب کا خدا تجھ سے اچھی بیویاں دے گا کہ جنہوں نے مرد سے صحبت نہ کی ہو۔

جواب: یہ اعتراض اس آیت پر کیا ہے۔

عَسٰى رَبُّهٗۤ اِنْ طَلَّقَكُنَّ اَنْ يُّبْدِلَهٗۤ اَزْوَاجًا خَيْرًا مِّنْكُنَّ مُسْلِمٰتٍ مُّؤْمِنٰتٍ قٰنِتٰتٍ تٰٓئِبٰتٍ عٰبِدٰتٍ سٰٓئِحٰتٍ ثَيِّبٰتٍ وَّاَبْكَارًا (التحریم 5:66)

اگر تمہیں طلاق دے دے مسلم، مومن، فرمان بردار توبہ کرنے والیاں، عبادت کرنے والیاں روزے رکھنے والیاں بیوہ اور کنواریاں۔

یہاں کسی بیوی کی ناراضگی کا ذکر نہیں۔ یہ آیت بھی ایلاء سے تعلق رکھتی ہے۔ اللہ تعالیٰ ازواج مطہرات سے مخاطب ہے کہ اگر رسول تمہیں طلاق دے دے تو ان کو ایسی بیویاں دے دے گا۔ جن کے اوصاف قرآنی آیت میں بیان کیے گئے ہیں۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایلا ازواج کا دنیاوی مال ومنال کی طرف رغبت کی وجہ سے کیا تھا۔

اِنْ كُنْتُنَّ تُرِدْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا وَزِيْنَتَهَا فَتَعَالَيْنَ اُمَتِّعْكُنَّ وَاُسَرِّحْكُنَّ سَرَاحًا جَمِيْلًا (الاحزاب 28:33)

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اگر رسول تمہیں طلاق دے دے تو اسے اور بیبیاں ان اوصاف کی دے دے گا۔ تاریخ یہ بتاتی ہے کہ ازواج مطہرات نے اللہ اور اس کے رسول کو اختیار کرلیا۔ انہوں نے دنیاوی مال پر لات ماردی اور رسول کریم صلعم کے گھر میں رہنا ہی پسند کرلیا۔ یہ کسی ناراض بیوی کو دھمکی نہیں بلکہ اس آیت کا تعلق بھی ایلا سے ہے۔

الزامی جواب: سوامی جی حسب عادت اس اعتراض میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر فحش الزام تراشی سے بھی باز نہیں آیا۔ اس وجہ سے قارئین کو ہندو دھرم کی حیا باختہ تعلیم سے آگاہ کیا جاتا ہے۔ ہندو دھرم کے مسئلہ نیوگ پر اس کتاب میں کئی بار ذکر آچکا ہے۔ یہاں بھی تکرار کردیتے ہیں نیوگ ہندو دھرم کی معاشرتی زندگی کا اہم مسئلہ ہے۔ نیوگ یہ ہے کہ خاوند اپنی جورو کو حصول اولاد کے لیے کسی غیر مرد سے صحبت صحیحہ کرنے کو کہتا ہے۔ جورو اپنے خاوند کی مرضی اور ہدایت کے مطابق اپنے پسند کے نوجوان سے اولاد کے لیے صحبت کرتی ہے۔ سوامی جی دیانند سیتارتھ پرکاش کے صفحہ 138 پر رقمطراز ہے اگر شادی شدہ مرد دھرم کی خاطر غیر ملک میں گیا ہو تو بیاہی عورت 8 برس، اگر علم و نیک نامی کے لیے گیا ہو۔ تو چھ برس اور دولت کمانے کے لیے گیا ہو تو تین برس تک انتظار کر کے نیوگ کے ذریعے اولاد پیدا کرے۔ جب شادی شدہ خاوند واپس آئے تب نیوگ شدہ خاوند سے قطع تعلق ہو جائے۔ یہ ہے ہندو دھرم کا مقبولہ عقیدہ۔ اسلام کے نزدیک نیوگ کھلی کھلی بدکاری کا نام ہے۔ ویدوں میں ایک بیوی کے بہت سے خاوند، اتھروکانڈ 14 سوکت 2 منتر 4,3 میں ہے بطور اصول ہر عورت کے تین خاوند دیوتاؤں میں سے ہوتے ہیں۔ پہلا خاوند سوم کہلاتا ہے۔ دوسرا گندھرو اور تیسرا اگنی اور چوتھا انسان ہوتا ہے۔

اتھروید کے مذکورہ حوالہ کے منتر 17 میں عورت کو خاوند کے چھوٹے بھائی (دیور) کی خواہش کرنے والی (دیوری کاما) کہا گیا ہے۔ نرکت میں دیور کے معنی ہی دوسرا خاوند لکھے ہیں۔ یہ بھی ظاہر ہے کہ خاوند کا چھوٹا بھائی (دیور) ایک ہی ہونا ضروری نہیں ایک شخص کے کئی چھوٹے بھائی ہو سکتے ہیں وہ سب بڑے بھائی کی بیوی کے دیور (خاوند) کہلائیں گے۔ اور وہ عورت حسب الحکم وید دیوری کاما (دیور کو چاہنے والی) سب دیوروں کو چاہنے والی ہوگی اور ان سے صحبت صحیحہ کی خواہش مند ہوگی وید کی رو سے بڑے بھائی کی جورو سب بھائیوں کی جورو ہے۔

ویدوں کے رشی اور مصنف کے پیدا ہونے کا قصہ:

ویدوں کے مہرشی وشوامتر کے پاس گالو منی تعلیم حاصل کرتے تھے۔ فارغ التحصیل ہونے پر وشوامتر نے تعلیم دینے کے عوض 800 (آٹھ سو) سیاہ گوش گھوڑے طلب کیے۔ گالو نے کہا میرے پاس نہیں ہیں استاد نے کہا جہاں سے ملیں لا کر مجھے دو اور میرا قرضہ (حق استادی) ادا کرو۔ گالو مجبور ہو کر تلاش کے لیے نکلا اس زمانہ میں راجہ پیاتی سخاوت میں بہت مشہور تھا۔ جس کے پاس کوئی سوامی جاتا خالی ہاتھ نہ لوٹتا تھا۔ گالو اس کے پاس گیا۔ سوال پورا کرنے پر اصرار کیا۔ راجہ نے معذرت کی اور کہا اس کے عوض تم میری حسینہ لڑکی مادھوی نام لے جاؤ۔ بڑے بڑے راجہ اس کے طلب گار ہیں۔ گالو نے قبول کرلیا۔ اور اس لڑکی کو پہلے راجہ ہر کیشو کے پاس لے گیا۔ راجہ نے اسے قبول کیا اور 200 سیاہ گوش گھوڑے معاوضہ میں دے دیئے اور اس لڑکی سے ایک بیٹا سومنا نام پیدا ہوا۔ اس کے بعد گالو اس لڑکی کو دِووداس ایک راجہ کے پاس لے گیا اس نے بھی 200 سیاہ گوش گھوڑے دے کر اس لڑکی سے ایک بیٹا پرتردن نام حاصل کرلیا۔ پھر گالو اسے راجہ اُشی نر کے پاس لے گیا۔ اس نے بھی 200 گھوڑوں کے عوض اس لڑکی سے ایک بیٹا شوی نام حاصل کرلیا۔ اس کے بعد گالو چھ سو سیاہ گوش گھوڑے لے کر مہرشی وشوامتر کے پاس پہنچا۔ مہرشی نے مادھوی کو دیکھا تو کہا کہ تو پہلے ہی اس ہیرے کو میرے پاس کیوں نہ لے آیا۔ کہ میں 800 گھوڑوں کے بدلہ میں چار بیٹے اس سے پیدا کر لیتا۔ اس کے بعد مہرشی جی نے 200 گھوڑے اس کی قیمت لگا کر اس سے ایک بیٹا اشٹک نام پیدا کرلیا۔ اس کے بعد مادھوری کا پھر سوئمبر ہوا مگر کوئی قابل بر میسر نہ ہوا۔ تو وہ جنگل میں مجرد رہ کر تپسیا (ریاضت) کرنے لگی۔ بعض لوگوں کے خیال میں جس طرح دروپتی کے پانچ بھائی خاوند تھے اسی طرح مادھوری کے بھی پانچ خاوند تھے جن سے ویدوں کے بڑے رشی اور مصنف پیدا ہوئے۔

1۔ اشٹک ولد وشوامتر رگ وید منڈل 10 سوکت 104 کا مصنف ہے۔
2۔ پرتردن بن دِووداس رگ وید منڈل 9 سوکت 96 کا شاعر ہے۔
3۔ شوی خلف راجہ اُشی نر رگ وید منڈل 10 سوکت 179 کا گویا ہے۔
4۔ وسومن ابن ہر کیشور گوید منڈل 10 سوکت 179 منتر 3 کا کرتا دھرتا ہے۔

ہندو دھرم میں کسی عورت کے ایک سے زیادہ خاوند ہونے معیوب نہ سمجھا جاتا تھا۔ دروپتی کے والد درو پد کو جب اپنی بیٹی کے پانچ خاوند ہونے پر افسوس ہوا تو مہامنی ویاس جی نے یہ کہہ کر اس کی غلط فہمی دور کردی کہ اے درو پد تو افسوس مت کر کیونکہ ایک عورت کے متعدد خاوند ہونا عین ویدک دھرم ہے۔

(یہ مواد عبدالحق ودیارتھی کی کتاب آئینہ حق نما صفحہ 391,390 سے معمولی لفظی تبدیلی کے ساتھ لیا گیا ہیں)

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اپنی بیٹی کو نجات نہ دلا سکے

اعتراض: رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اپنی بیٹی کو نجات نہیں دلا سکیں گے۔ پادریوں کی طرف سے یہ عام اعتراض کیا جاتا ہے کہ حدیث میں آتا ہے کہ حضرت محمد صاحب نے اپنی بیٹی فاطمہ کو کہا تھا اے بیٹی فاطمہ! تو اپنے اعمال کی خود ذمہ دار ہے قیامت کو میں سفارش نہیں کروں گا جب بیٹی کو صاف جواب دیا تو باقی کے مسلمان تو بڑے دور کے ہیں۔

جواب: مسئلہ نجات پر معترضین نے مختلف طریقوں سے اسلام پر اعتراض کیے ہیں اسی کتاب میں تفصیلاً بحث کی جا چکی ہے۔ اسلام کا نجات کے متعلق نقطہ نظر یہ ہے کہ نجات محض اللہ کے فضل پر موقوف ہے۔ ایمان اور اعمال صالحہ اللہ کے فضل کو محض جذب کرنے کا ذریعہ ہیں۔ اعادہ کی ضرورت نہیں۔

مذکورہ اعتراض رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تنقیص نہیں کرتا بلکہ اس میں آپ کی فضیلت کا اعتراف ہے۔ کہ آپ وہ نبی ہیں جو اپنے قریبی رشتہ دار کو بھی یہی کہتے ہیں۔ کہ قیامت کے دن نجات کے لیے میری رشتہ داری کام نہیں آئے گی۔ بلکہ آپ کے اعمال ہی کام آئیں گے اس دن کوئی دوسرا کسی کے اعمال کا بوجھ نہیں اٹھائے گا۔ ہر شخص اپنے اعمال کا خود ہی ذمہ دار ہوگا۔ قرآن مجید میں آتا ہے:

لَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰی

یعنی ایک کا بوجھ دوسرا نہیں اٹھائے گا۔

دراصل رسول کریم صلعم نے اپنی بیٹی کو اسی آیت کی روشنی میں یہ تنبیہ کی کہ قیامت کے دن وہ اپنے اعمال کی خود ذمہ دار ہو گی محمد (صلعم) کی بیٹی کے ناطے اس کی بخشش نہیں ہو گی۔ کتنی پیاری تعلیم ہے اور مسلمانوں کو اعمال صالحہ بجالانے کی تلقین ہے نبی کی بعثت کی غرض ہی یہ ہوتی ہے کہ اپنے پیروکاروں کو اعمال صالحہ بجالانے کی تلقین کرے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو تو اپنے عزیزوں اور رشتے داروں کو ڈرانے اور راہ راست پر چلنے کی خاص طور پر ہدایت کی گئی ہے قرآن مجید میں آتا ہے:

وَاَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ

اپنے قریبی رشتے داروں کو ڈراؤ (کہ وہ اعمال صالحہ بجالائیں)

پھر اس حکم کے تحت اپنے قریبیوں کو ایک دعوت پر جمع کر کے ڈرایا۔ اللہ کا نبی، اللہ کی وحی کا پابند ہوتا ہے۔ اگر رسول کا رشتہ ناطہ ہی بخشش اور نجات کا باعث ہو تو پھر انذار کا کیا فائدہ لہٰذا اسلام میں نجات رشتہ داری پر موقوف نہیں۔ اسی وجہ سے اسلام عیسائیوں کے عقیدہ کفارہ کو باطل قرار دیتا ہے کہ جس کی رو سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام عیسائیوں کے گناہوں کا بوجھ اٹھا کر مصلوب ہو گئے۔ اسلام کے نزدیک ہر شخص کو اپنے ہی اعمال کا بوجھ اٹھانا ہوگا۔ یہی عقیدہ عقل سلیم کے مطابق ہے۔ جب کوئی دوسرا شخص کسی شخص کے گناہوں کا بوجھ اٹھائے گا تو پھر نیک کام کون کرے گا۔ ہر شخص دوسرے سہارے کی وجہ سے کہ وہ قیامت کے دن اس کے گناہوں کا بوجھ اٹھائے گا گناہوں کی دلدل میں دھنستا چلا جائے گا۔ جس غرض کے لیے نبی آتا ہے وہ غرض ہی فوت ہو جاتی ہے۔ عیسائیوں کا دوسروں کے گناہوں کا بوجھ اٹھانے کا عقیدہ باطل ہے۔ اعمال صالحہ بجالانے سے روکتا اور بد اعمال کی ترغیب دیتا ہے۔

رسول کریم ﷺ مرگی زدہ اور مجنون تھے

اعتراض: رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم مرگی زدہ اور مجنون تھے۔(نعوذ باللہ)(متعدد)

جواب: یہ اعتراض صرف ایک مخالف کا ہی نہیں بلکہ کثیر مخالفین نے یہ کیا ہے۔

مرگی زدہ ہونا:

یہ الزام رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا رنگ حالت وحی میں غیر معمولی طور پر متغیر ہونے کی وجہ سے کیا گیا ہے۔ احادیث میں یہ ذکر ہے جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی نازل ہوتی تھی۔ تو ان کی حالت متغیر ہو جاتی تھی۔ اس متغیر حالت کو مخالفین نے مرگی کہا ہے۔

حالت وحی میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ سے ہم کلام ہونے کے لیے ایک دوسرے عالم میں منتقل ہوتے تھے چونکہ یہ انتقال حالت بیداری میں ہوتا تھا۔ عالم مادی سے عالم روحانی میں منتقل ہونے کی وجہ سے آپ کے چہرے پر تغیر رونما ہو جاتا تھا حقیقت میں یہ حالت وہی شخص محسوس کر سکتا ہے جو اس حالت میں گزرا ہو۔ یہ ایک مسلمہ امر ہے کہ ایک حالت سے دوسری حالت میں منتقل ہونے کی وجہ سے چہرہ پر تغیر آنا لازمی ہے۔ اس حالت کو مرگی سے تعبیر کرنا سراسر نادانی اور لاعلمی ہے۔ ایک عام مثال دیتا ہوں کہ ایک شخص عام حالت میں بیٹھا ہوا ہو۔ اچانک اس کو کوئی اچھی خبر یا بری خبر دے دی جائے تو اس شخص کے چہرہ کی حالت بدل جائے گی۔ خوشی کی خبر سے تو چہرہ کھل جائے گا۔ اگر بُری خبر ہے تو چہرہ مرجھا جائے گا۔ حالت بدلنے کی وجہ یہ ہے کہ انسان ایک حالت سے دوسری حالت میں داخل ہوا ہے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب حالت وحی میں آتے تھے۔ پہلی حالت بدل جاتی تھی آپ دوسری حالت میں آ جاتے تھے۔ اس تبدیلی کی وجہ سے آپ کے چہرہ کی حالت متغیر ہو جاتی تھی۔ حالت وحی میں آنا کوئی معمولی تبدیلی نہیں ہوتی تھی بلکہ دوسرے عالم میں منتقل ہوتے تھے۔ جب وحی آتی تو سخت سردی کے دن میں آپ ﷺ کی پیشانی مبارک پر پسینہ آ جاتا تھا۔ سورہ مزمل میں اس وحی کو **قَوْلًا ثَقِيلًا** (5:73) (بھاری بوجھ) کہا ہے۔ ایک حدیث میں حضرت زید بن ثابت کے متعلق آتا ہے کہ انہوں نے کہا قریب تھا کہ میری ران کچلی جاتی جس کے اوپر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ران تھی اس حالت میں وحی کا نزول شروع ہوا۔ یعنی وحی کا اتنا دباؤ تھا کہ حضرت زید یوں محسوس کر رہے تھے کہ ان کی ران کچلی جا رہی ہے۔ جب وحی کا دباؤ دوسرا شخص یہ محسوس کر رہا ہے۔ تو جس شخص پر نازل ہو رہی ہے وہ کیا محسوس نہ کرے گا؟ یا اس کے چہرہ پر کوئی آثار نمایاں نہ ہوں گے۔ الغرض وحی کا اتنا دباؤ تھا کہ جس کی وجہ سے رسول کریم صلعم کا رنگ متغیر ہو جاتا تھا۔ آپ ﷺ کی حالت کا متغیر ہو جانا اس بات کی بھی دلیل ہے۔ کہ یہ کوئی فرضی بات نہ تھی۔

سر ولیم میور اپنی کتاب "لائف آف محمد" میں لکھتا ہے "وحی کی جو حالت محمد پر طاری ہوتی تھی اس کی غلط توجیہ کرنا علمی اور سائنسی لحاظ سے ایک فاش غلطی ہے کیونکہ جب مرگی کے مرض کا دورہ پڑتا ہے تو اس دوران میں قوت حافظہ سرے سے کام کرنا چھوڑ دیتی ہے اور مریض کو کچھ یاد نہیں رہتا کہ اس دوران اس پر کیا گزری کیونکہ اس حالت میں فکر و شعور ماند پڑ جاتے ہیں یہ وہ باتیں ہیں جو اس مرض کے بارے میں سائنس کی مدد سے معلوم ہیں۔ لیکن ان میں سے ایک بات بھی رسول عربی کو اثنائے وحی عارض نہیں ہوتی تھی بلکہ اس دوران میں ان کے پورے حواس بطور احسن کام کرتے تھے اور پھر وحی نازل ہوتی تھی۔ (بحوالہ تاریخ القرآن محمد حسین علی الصغیر ص 21)

مجنون ہونا:

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو مجنون کہنا یہ صرف آپ ﷺ پر ہی الزام نہیں لگایا گیا بلکہ اس سے پہلے آپ کے مثیل حضرت موسیٰ

پر بھی یہ الزام عائد کیا گیا تھا۔ اور ان کو مجنون کہا گیا تھا۔ ارشاد الٰہی ہے۔

قَالَ اِنَّ رَسُوْلَكُمُ الَّذِیْٓ اُرْسِلَ اِلَیْكُمْ لَمَجْنُوْنٌ (الشعراء 27:26)

فرعون نے کہا تمہارا رسول جو تمہاری طرف بھیجا گیا ہے یقیناً مجنون ہے۔ لہٰذا یہ الزام صرف آپ کی ذات پر عائد نہیں کیا گیا بلکہ پہلے عظیم الشان نبی حضرت موسیٰ کو بھی مجنون کہا گیا ہے۔

تاریخی واقعات کی روشنی میں الزامات کا جائزہ:

جب تاریخی واقعات کا جائزہ لیا جاتا ہے تو ان کی روشنی میں صرف مذکورہ الزامات رد ہی نہیں ہوتے بلکہ آپ ﷺ کی شخصیت ایک نابغہ روزگار کے طور پر سامنے آتی ہے۔ جس کی مثال دنیا میں نہیں ملتی۔

امت یا قوم کی تشکیل:

یہ ایک تاریخی مسلمہ حقیقت ہے کہ کوئی مرگی زدہ یا مجنوں امت کی تشکیل نہیں کر سکتا۔ امت کا تشکیل کرنا کسی حکیم دانا اور نابغہ روزگار کا کام ہوتا ہے۔ جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم چالیس سال کے ہوئے۔ مقام نبوت پر فائز کیے گئے۔ تو سب سے پہلے اپنی بیوی حضرت خدیجہ کو خدا کا پیغام پہنچایا تو وہ آپ ﷺ کے اخلاق عالیہ کو سامنے رکھتے ہوئے آپ پر ایمان لے آئیں بعد ازاں ورقہ بن نوفل کے پاس گئے تو انہوں نے اس پیغام کو حق سمجھ کر قبول کر لیا۔ پھر حضرت ابوبکر الغرض آہستہ آہستہ پیروکاروں کی تعداد بڑھنے لگی۔ آپ ﷺ کے نظریات اور عقائد اہل عرب سے متضاد تھے۔ عرب شرک کی دلدل میں دھنسے ہوئے تھے۔ بتوں کے پوجاری تھے۔ جب کہ آپ توحید کے علمبردار اور ایک خدا کی عبادت کی تعلیم دیتے تھے۔ عرب ہر برائی میں لذت محسوس کرتے تھے۔ جب کہ آپ ﷺ برائی کو خدا سے دوری کا سبب سمجھتے تھے۔ نیک اعمال بجا لانے کی تلقین کرتے تھے۔ عرب غصب و نہب قتل اور غارت گری کے عادی تھے۔ جب کہ آپ ﷺ انسانیت سے محبت اور شفقت کے داعی تھے۔ عرب حقوق انسانی کو پامال کرتے تھے۔ اور آپؐ نے معاشرہ کے تمام عناصر کے حقوق وفرائض متعین کیے۔ رسول کریم صلعم سے ان متضاد نظریات اور عقائد کی وجہ سے عرب آپؐ کے دشمن بن گئے آپ ﷺ اور آپ کے پیروکاروں کو مصائب اور ایذاؤں کا سامنا کرنا پڑا۔ مخالفت کا ایک طوفان اٹھ کھڑا ہوا۔ مخالفت یہاں تک بڑھی کہ آپ ﷺ نے اپنے پیروکاروں کو حبشہ ہجرت کرنے کا ارشاد فرمایا۔ مخالفت کا طوفان بڑھتا چلا گیا تھا۔ اس کے ساتھ پیروکاروں کی تعداد میں بھی اضافہ ہوتا چلا گیا آخر کار آپؐ اور آپ کے صحابہ نے مدینہ ہجرت کی۔ اہل مدینہ نے آپ ﷺ کو اپنا حاکم اعلیٰ بنا لیا۔ اور مدنی ریاست کی بنیاد پڑ گئی۔ تمام عرب نے اس مدنی ریاست کو ختم کرنے کے لیے کئی حملے کیے۔ لیکن ان کے تمام منصوبے ناکام ہوئے اور آپ کی امت بڑھتی چلی گئی۔ آخر کار 8 ہجری کو فتح مکہ کے دن آپ تمام عرب پر غالب آ گئے۔ کن کن ناگوار مصائب اور ایذاؤں سے گزرنا پڑا۔ حکمت، دانائی اور بہادری سے نامساعد حالات کا مقابلہ کیا۔ آخر کار کامیابی سے ہم کنار ہوئے۔ کیا تاریخ میں کسی مرگی زدہ اور مجنون کی اس قسم کی کامیابی کی مثال ملتی ہے۔ نامساعد حالات میں اپنی قوم کو کامیابی سے ہمکنار کرنا ایک حکیم اور نابغہ روزگار کا کام ہے پھر اس کے ساتھ اللہ کی تائید اور نصرت بھی شامل حال ہو۔ الغرض جو آپ کو کامیابی حاصل ہوئی اس کی نظیر نہیں ملتی۔ یہ تاریخی کامیابی مخالفین کے اعتراض کو رد کرتی ہے۔ آج حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی امت تمام دنیا میں بکھری پڑی ہے۔ دن رات آپ ﷺ پر درود بھیج رہی ہے۔ امت محمدیہ کا قائم ہونا اور رہنا اس بات کی دلیل ہے کہ آپ ﷺ سچے نبی تھے۔

عظیم انقلاب:

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے وقت تمام عرب قتل و غارت، غصب و نہب زنا، فساد بادہ نوشی چوری چکاری اور ڈاکے جیسے اخلاق سیئہ میں مبتلا تھے۔ آپ نے اپنی قوت قدسیہ سے اس بگڑی ہوئی قوم کو باکردار با اخلاق اور باخدا قوم بنا دیا۔ صحرا کے ریت کی طرح منتشر تھے۔ اس متفرق قوم کو اتحاد اور اتفاق کی سلک میں منسلک کر دیا۔ اس سے بڑھ کر کیا معجزہ ہو سکتا ہے۔ اور کیا کارنامہ۔ قرآن مجید میں آتا ہے۔

وَاذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَآءً فَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖٓ اِخْوَانًا

یاد کرو اللہ کے اس احسان کو جو اس نے تم پر کیا جب تم آپس میں دشمن تھے پس اس نے تمہارے دلوں میں الفت ڈال دی۔ اس کے فضل سے تم بھائی بھائی بن گئے۔

کیا برائیوں میں مبتلا قوم کو باکردار بنانا اور منتشر قوم کو ایک اتحاد کی لڑی میں پرونا ایک مرگی زدہ اور مجنون کا کام ہے؟ جو عظیم انقلاب رسول کریم صلعم کی قوت قدسیہ کے ذریعے رونما ہوا۔ دنیا کی تاریخ اس قسم کا انقلاب دکھانے سے قاصر ہے تاریخ بتاتی ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حواری مشکلات کے وقت آپ کا ساتھ چھوڑ گئے اور آپ پر لعنت بھی بھیجی اور آپ کے منہ پر تھوکا بھی۔ جب کہ حضرت موسیٰ کی قوم نے لڑنے سے انکار کر دیا اور حضرت موسیٰ علیہ السلام موعودہ ارض پر قبضہ نہ کر سکے۔ اور ان کی قوم بنی اسرائیل چالیس سال تک ویرانوں میں گھومتی پھرتی رہی لیکن محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی قوم اور امت نے آپ کے لیے مال اور جانیں قربان کیں۔ آخر کار آپ کی قیادت میں ایک فاتح قوم بن کر ابھری۔

کیا یہ مرگی زدہ اور مجنون کا کام ہے؟ ایک عظیم انقلاب برپا کرنا ایک دانا حکیم اور نابغہ روزگار کا کام ہے۔ نہ کہ مرگی زدہ اور مجنون کا۔

حکیمانہ تعلیم:

آپ ﷺ نے جو حکیمانہ تعلیم دی وہ مُنَزَّل من اللہ ہونے پر دلالت کرتی ہے اس تعلیم کا ہر پہلو حکمت سے پُر ہے جس شخص پر وہ حکیمانہ تعلیم نازل ہوئی وہ خود کتنا حکیم دانا اور نابغہ روزگار ہوگا۔ آپ ﷺ کی تعلیم کے تین پہلو ہیں۔ (1) عقائد (2) عبادات (3) معاملات۔ عقائد میں اللہ پر ایمان نبیوں پر ایمان، سماوی کتب پر ایمان، ملائکہ پر ایمان اور آخرت پر ایمان، عبادات (نماز روزہ زکوٰۃ صاحب نصاب پر) حج (جو صاحب استطاعت ہو) معاملات میں اخلاقی، معاشرتی، سیاسی اور اقتصادی امور پر تفصیلی اور بنیادی بحث کی گئی ہے الغرض زندگی کا کوئی پہلو نہیں جس کے متعلق آپ ﷺ نے تعلیم نہ دی ہو۔ مزید براں آپ ﷺ کا وجود زندگی کے ہر شعبہ میں کامل نمونہ ہے۔ کیا دنیا میں کوئی ایسا مرگی زدہ ہے؟ جس نے انسانوں کے لیے ضابطہ حیات دیا ہو۔ پھر اس کا نمونہ بھی زندگی کے تمام پہلوؤں کے لیے ہو۔ عقل سلیم یہی کہتی ہے کہ یہ کسی مجنون اور مرگی زدہ کا کام نہیں۔ انسانوں کو ایک نیا مکمل ضابطہ حیات دینے والی صرف ایک ہستی ہے وہ ہے حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی جس نے خدا سے ہدایت پا کر قرآن مجید جیسی کتاب دی۔ جس میں انسانی زندگی کے تمام پہلوؤں کے لیے روشنی ملتی ہے۔ تا قیامت انسانوں کے لیے ہدایت کا موجب ہوگی۔ اے اعتراض کرنے والے یاد رکھیے کہ محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کا دل و دماغ خدا کے نور سے منور تھا۔ وہ اسی نور سے سوچتے تھے اللہ کے نور سے دیکھنے والا۔ اللہ کے نور سے سوچنے والا کبھی مجنون نہیں ہو سکتا۔

حکیمانہ کلام اور ادعیہ:

جب آپ ﷺ کے حکیمانہ کلام اور ادعیہ پر غور کیا جائے تو انسان ورطہ حیرت میں ڈوب جاتا ہے کہ یہ شخص علم و حکمت کی کس بلندی سے بول رہا ہے۔ صرف نمونہ کے لیے چند آپ کے جوامع الکلم پیش کیے جاتے ہیں۔ پھر قاری غور کرے کیا یہ کسی مرگی زدہ یا مجنوں کے ہیں؟ یا کسی دانا، حکیم اور نابغہ روزگار کے ہیں آپ فرماتے ہیں۔

خَيْرُ الْاُمُوْرِ الْوَسْطُ

بہترین معاملہ میانہ روی ہے۔

رَاسُ الْحِكْمَةِ مَخَافَةُ اللّٰهِ

دانائی کی بنیاد خدا کا خوف ہے۔

اِنَّ الصِّدْقَ يُنْجِيْ وَالْكِذْبَ يُهْلِكُ

بے شک سچ نجات ہے اور جھوٹ ہلاک کرتا ہے۔

اِنَّ الْحَدِيْدَ بِالْحَدِيْدِ يُفْلَحُ

بے شک لوہے کو لوہے سے کاٹا جاتا ہے۔

اَلْحِكْمَةُ ضَالَّةُ الْمُؤْمِنِ

حکمت اور دانائی مومن کی گمشدہ چیز ہے۔

اَلْمَرْءُ مَعَ مَنْ اَحَبَّ

آدمی اس شخص کے ساتھ ہوگا جس سے وہ محبت کرتا ہے۔

اَلْمُسْلِمُ اَخٌ لِمُسْلِمٍ

مسلمان مسلمان کا بھائی ہے۔

اَلْخَلْقُ عَيَالُ اللّٰهِ

مخلوق اللہ کی عیال ہے۔

مَاعَالَ مَنِ اقْتَصَدَ

وہ محتاج نہ ہوا جس نے میانہ روی اختیار کی۔

اَلْمَرْءُ بِاَصْغَرَيْهِ قَلْبِهٖ وَلِسَانِهٖ

آدمی کی قدر و قیمت دو چھوٹی چیزوں سے ہے اس کا دل اور اس کی زبان۔

مذکورہ بالا تمام جوامع الکلم اپنے اندر معارف اور معانی اور صداقتوں کا خزانہ لیے ہوئے ہیں الفاظ کتنے سادہ ہیں اور وہ اپنے اندر معانی کا سمندر لیے ہوئے ہیں ان کلمات کے متعلق بھی یہ کہا جا سکتا ہے۔ کہ اگر سمندر سیاہی بن جائے اور درخت اقلام تو جوامع الکلم کے معارف کا کوئی احاطہ نہیں کر سکتا۔

مذکورہ کلمات نبوی کو دیکھ کر کون کہہ سکتا ہے؟ کہ آپ مرگی زدہ یا مجنون ہیں۔

آپ ﷺ کی ادعیہ پر کئی کتب تصنیف کی گئی ہیں۔ یہاں ان سب کا احاطہ کرنا باعث طوالت ہے صرف نمونہ کے طور پر ایک دعا تحریر کی جاتی ہے۔

اَللّٰهُمَّ اَلِّفْ عَلَى الْخَيْرِ بَيْنَ قُلُوْبِنَا وَاَصْلِحْ ذَاتَ بَيْنِنَا وَاهْدِنَا سُبُلَ السَّلَامِ وَنَجِّنَا مِنَ الظُّلُمَاتِ اِلَى النُّوْرِ وَجَنِّبْنَا الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ وَبَارِكْ لَنَا فِيْ اَسْمَاعِنَا وَاَبْصَارِنَا وَقُلُوْبِنَا وَاَزْوَاجِنَا وَذُرِّيَّاتِنَا وَتُبْ عَلَيْنَا اِنَّكَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ وَاجْعَلْنَا شَاكِرِيْنَ لِنِعْمَتِكَ قَابِلِيْهَا وَاَتِمَّهَا عَلَيْنَا (ابوداود)

اے اللہ خیر اور بھلائی پر ہمارے دلوں کو جوڑ دے۔ اور ہمارے باہمی تعلقات کو درست کر دے اور ہمیں سلامتی کی راہوں پر چلا اور ہمیں اندھیروں سے نکال کر روشنی کی فضا میں لا اور ظاہر و باطن کی ساری گندگیوں سے ہمیں بچا اور دور رکھ اور ہمارے کانوں ہماری آنکھوں اور ہماری بیویوں اور ہماری نسل میں برکت دے اور ہم پر عنایت فرما تو بڑا عنایت فرمانے والا اور مہربان ہے اور ہمیں تو اپنی نعمتوں کا شکر ادا کرنے والا اور شایان شان طریقے پر ان کا استقبال کرنے والا بنا اور نعمتوں کا ہم پر اتمام فرما۔ یعنی اپنی نعمتیں بھرپور عطا فرما۔

اس دعا کا ایک ایک لفظ حکمت کے موتیوں سے بھرا ہوا ہے۔ یہ دعا ظاہر کرتی ہے کہ یہ شخص صرف حکیم ہی نہیں بلکہ خدا کی محبت میں گم ہے۔

قرآن مجید:

قرآن مجید انسانوں کے لیے مکمل ضابطہ حیات رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب مطہرہ پر نازل ہوا۔ جس شخص کے دل پر حکمت سے پُر ایسی کتاب نازل ہو وہ دل و دماغ نہ مرگی جیسی موذی بیماری کا شکار ہو سکتا ہے اور نہ جنون میں مبتلا ہو سکتا ہے۔ یہی وہ کتاب ہے جس کے متعلق اب تک یہ چیلنج موجود ہے۔

قُلْ لَّئِنِ اجْتَمَعَتِ الْاِنْسُ وَالْجِنُّ عَلٰۤى اَنْ يَّاْتُوْا بِمِثْلِ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لَا يَاْتُوْنَ بِمِثْلِهٖ وَلَوْ كَانَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ ظَهِيْرًا (بنی اسرائیل 17:88)

کہہ دے اگر انس و جن جمع ہو جائیں اور کوشش کریں کہ اس قرآن کی مثل بنا لائیں تو وہ ہرگز اس کی مثل نہ بنا لا سکیں گے خواہ وہ ایک دوسرے کے مددگار بن جائیں۔

یہ وہ چیلنج ہے جو آج تک پورا نہیں ہوا۔ کمال یہ ہے کہ کسی نے مقابلہ کے لیے قلم تک نہیں اٹھایا۔ یہ کتاب اپنی فصاحت و بلاغت کے ساتھ انسانی زندگی کے تمام شعبوں کی راہنمائی کرتی ہے۔ اس کی وضاحت اور تشریح کے لیے ہر دور میں کوششیں کی جاتی ہیں۔ علماء ربانی اپنے علم کے مطابق آیات قرآنی کی شرح کرتے رہتے ہیں۔ جو تفاسیر اور شروح لکھی جا چکی ہیں ان کا احاطہ کرنا ناممکن ہے۔ یہ سعی بلیغ ہر دور میں جاری ہے اور جاری رہے گی۔ اب صرف مسلمان ہی اس کوشش میں شامل نہیں بلکہ غیر مسلم بھی اس کار خیر میں شریک ہو گئے ہیں۔ اس قسم کی لازوال کتاب لانے والے کو مرگی زدہ اور مجنون کہنا اپنے جنون کا اظہار ہے۔

مذکورہ تاریخی حقائق کی روشنی میں یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ یہ ناپاک الزام محض ذہنی مرض اور تعصب کا نتیجہ ہے۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اپنی پہلی وحی کی حقیقت کو نہ سمجھ سکے۔

فترت الوحی کے دوران خودکشی کی کوشش کی

اعتراض: نزول سے لے کر فترت الوحی تک کے واقعات پر معترضین اور مستشرقین نے مختلف قسم کی قیاس ارائیاں اور الزام تراشیاں کی ہیں۔(ا) جب پہلی دفعہ جبرائیل علیہ السلام آپ پر وحی لے کر نمودار ہوا تو آپ ﷺ یہ سمجھ نہ سکے کہ آیا وہ روحانی حالت ہے یا نعوذ باللہ شیطانی خیال کہانت یا وہم یا شاعر کا کوئی فکر ہے۔ رابرٹ سپنسر نے اپنی کتاب

The Truth about Muhammad

(محمد صلعم کے متعلق سچائی) میں رقمطراز ہے۔

Muhammad conld not at first indentify the source of dreams or "The Truth" that descended up on him.

محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) آغاز میں اپنے خواب یا "سچائی" کے مصدر کے متعلق کچھ سمجھ نہ سکا۔ (صفحہ 41)
دوسرا اہم یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ فترت الوحی کے دوران محمد (مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم) نے خودکشی کا ارادہ کیا۔ (رابرٹ سپنسر صفحہ 42)

جواب: یہ دونوں گمان یا اعتراض واقعات کی گہرائی تک رسائی نہ ہونے کی وجہ سے کیے گئے ہیں۔ جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر غار حرا میں پہلی دفعہ فرشتہ حضرت جبرائیل وحی لے کر آیا۔ آپ ﷺ سے کہا۔ اِقْرَأْ تو آپ ﷺ نے فرمایا: مَا اَنَا بِقَارِیٍ میں پڑھنا نہیں جانتا تو فرشتہ نے زور سے دبایا اس طرح تین دفعہ کیا چوتھی بار کہا۔ اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَ خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ اِقْرَاْ وَرَبُّكَ الْاَكْرَمُ الَّذِیْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ یَعْلَمْ (العلق 5:96) (اپنے رب کے نام سے پڑھ جس نے پیدا کیا انسان کو ایک لوتھڑے سے پیدا کیا پڑھ اور ترا رب سب سے بڑھ کر بزرگی والا ہے جس نے قلم کے ذریعے علم سکھایا اور انسان کو وہ باتیں سکھائیں جن کو وہ نہیں جانتا تھا) اس پیغام ربانی کے بعد رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم گھر لوٹے اور حضرت خدیجہ سے واقعہ نزول بیان کیا۔ پھر فرمایا: لَقَدْ خَشِیْتُ عَلٰی نَفْسِی (مجھے اپنے نفس پر خوف ہے) ان الفاظ کو غلط مفہوم پہنایا گیا ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو خوف ہوا کہ شاید یہ خدا کی طرف سے نہ ہو۔ یعنی نعوذ باللہ شیطانی خیال ہو وغیرہ۔ یہ خطرناک غلطی ہے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کے فرشتہ جبرائیل ہونے کا یقین کامل تھا۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو پہلے سے ہی سچی خوابیں آتی تھیں۔ جو پوری ہوتی تھیں۔ وحی خفی (وحی ولایت) آنے کا تو پہلے سے ہی تجربہ تھا۔ آپ ﷺ کا دل یقین سے پُر تھا۔ پھر وحی ولایت (وحی خفی) سے بلند وحی وحی نبوت اور عظیم الشان کیفیت کا اظہار ہوا۔ تو یہ آپ ﷺ کے دل میں وہم بھی نہیں آسکتا تھا کہ یہ اللہ کی طرف سے نہیں پس خَشِیْتُ عَلٰی نَفْسِی یا تو فرشتہ کی ملاقات کی طرف اشارہ ہے

کہ اس نے اس قدر دبا اور بھینچا کہ میں ڈر گیا۔ کہ میری جان ہی نہ نکل جائے۔ اور وہاں بھی لفظ بلغ منی الجھدی آئے ہیں یا مراد یہ ہے کہ وحی کا رعب اس قدر تھا کہ آپ نے فرمایا کہ اس رعب کی وجہ سے جان ہی نہ نکل جائے۔ ایک مراد یہ بھی ہے کہ میں ڈرتا ہوں کہ صلاح عالم کے کام میں دشمنوں کی دشمنی کی وجہ سے میری جان ہی نہ جاتی رہے یا میں ڈرتا ہوں کہ اس کا بوجھ اٹھا سکوں یا نہ اٹھا سکوں۔ دونوں کی نظیر حضرت موسیٰ علیہ السلام کے حالات میں ملتی ہے جب اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ کو خلعت نبوت سے نوازا اور کہا پیغام لے کر فرعون کے پاس جا تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا۔ فَاَخَافُ اَنْ يَّقْتُلُوْنِ (الشعراء 14:26) میں ڈرتا ہوں کہ مجھے قتل کر دیں۔ پھر اہم ذمہ داری کو نبھانے کے لیے اپنے بھائی ہارون کو شریک نبوت کی درخواست کی تو اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی التجا اور درخواست پر حضرت ہارون کو بھی خلعت نبوت سے نواز دیا تا کہ دونوں بھائی فرائض نبوت کو احسن طریقہ سے انجام دے سکیں۔ جب کسی کو خلعت نبوت سے نوازا جاتا ہے تو فطری طور پر فرض کی ادائیگی کا خوف دل میں طاری ہوتا ہے۔ تو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس فطری قوت کا اظہار ان الفاظ میں کیا ہے۔ خَشِيْتُ عَلٰى نَفْسِي (مجھے اپنی جان پر ڈر ہے) نبوت کی حقیقت کو نہ سمجھنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

پس خَشِيْتُ عَلٰى نَفْسِي میں یا تو فرشتے کا زور سے دبانے یا وحی کے رعب کی طرف اشارہ ہے کہ فرشتے نے اس زور سے دبایا تو یوں محسوس کیا کہ میری جان نکلی جا رہی ہے اسی طرح جب وحی نبوت نازل ہوتی ہے اس کا بھی اتنا دباؤ ہوتا ہے کہ مہبط وحی اس قدر شدید دباؤ محسوس کرتا ہے۔ جیسے حضرت زید بن ثابت کی حدیث ظاہر کرتی ہے کہ ایک دفعہ رسول کریم صلعم پر وحی نازل ہوئی تو اس حالت میں رسول کریم ﷺ کی ران کے نیچے میری ران تھی حضرت زید کہتے ہیں کہ میں نے اتنا دباؤ محسوس کیا اور یوں معلوم ہوا کہ میری ران کچلی جا رہی ہے۔ یہ وحی کا دباؤ ہے۔ وہی شخص جان سکتا ہے جس پر یہ حالت وارد ہوئی ہو۔ دوسرا نہیں جان سکتا اسی وجہ سے معترضین نے خَشِيْتُ عَلٰى نَفْسِي کے معنی سمجھنے میں غلطی کھائی ہے۔

دوسرا اعتراض: رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پہاڑوں پر چلے جاتے تھے اور اپنے آپ کو گرا دینے کا ارادہ کر لیتے دفعتہً جبرائیل سامنے آجاتے اور کہتے اے محمد تم واقعی نبی ہو یہ حدیث اصول روایت کے بناء پر صحیح نہیں کیونکہ یہ روایت امام زہری کے بلاغات میں سے ہے۔ یعنی اس کا سلسلہ سند زہری تک ختم ہو جاتا ہے وہ تابعین میں سے نہیں تھے انہوں نے کسی ایسے صحابی کا ذکر نہیں کیا جس نے یہ کہا ہو۔ کہ اس نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا ہو کہ وہ اپنے آپ کو ہلاک کرنے پر تلے ہوئے ہوں۔ ایسے عظیم الشان واقعہ کے لیے سند مقطوع کافی نہیں اگر کسی نے دیکھا بھی ہو تو ایک عام واقعہ ہے کہ آپ ﷺ اکثر غار حرا میں عبادت الٰہی کے لیے جایا کرتے تھے پہاڑ پر جاتا دیکھ کر یہ گمان کر لینا کہ آپ اپنے آپ کو ہلاک کرنے کے لیے پہاڑ پر گئے ہیں سراسر خلاف عقل اور باطل خیال ہے۔

☆......☆

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو کوئی معجزہ نہیں ملا

اعتراض: محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو کبھی بھی معجزہ نہ ملا۔ جیسا کہ سورۃ عنکبوت میں درج ہے (عربی ترجمہ کا) اور کہتے ہیں کیوں نہ اتریں اس پر کچھ نشانیاں (یعنی کوئی ایک بھی) کیونکہ لا نافیہ اس آیت میں جو کہ جنس پر داخل ہے کل جنس کی نفی کرتا ہے) اس کے رب سے اور سورۃ بنی اسرائیل میں بھی اور ہم نے موقوف کیں نشانیاں بھیجنی کہ اگلوں نے ان کو جھٹلایا اس سے صاف ظاہر ہے خدا نے کوئی معجزہ نہیں دیا حقیقت میں اگر کوئی ایک معجزہ ملتا تو وہ نبوت اور قرآن پر متشکی نہ ہوتے۔

(ایک عیسائی مناد عبداللہ جیمز)

جواب: پادری صاحب نے انجمن حمایت اسلام لاہور کو تین اعتراضات بھجوائے۔ یہ تیسرا اعتراض تھا۔ مذکورہ آیات کی روشنی میں معترضین نے اپنی غلط فہمی اور لاعلمی کی وجہ سے یہ اعتراض کیا کہ محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی معجزہ صادر نہیں ہوا پہلے زیر اعتراض آیات کی وضاحت کی جائے گی۔ پھر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے چند معجزات (آیات) قلمبند کیے جائیں گے۔

وَقَالُوْا لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْهِ اٰيٰتٌ مِّنْ رَّبِّهٖ قُلْ اِنَّمَا الْاٰيٰتُ عِنْدَ اللّٰهِ وَاِنَّمَآ اَنَا نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ [۵۰] اَوَلَمْ يَكْفِهِمْ اَنَّآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ يُتْلٰى عَلَيْهِمْ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَرَحْمَةً وَّذِكْرٰى لِقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ (العنکبوت 29:51,50)

اور کہتے ہیں اس پر اپنے رب کی طرف سے نشان کیوں نہ اتارے گئے۔ کہ نشان صرف اللہ کے پاس ہیں اور میں صرف کھلم کھلا ڈرانے والا ہوں کیا ان کے لیے یہ کافی نہیں کہ ہم نے تیری طرف کتاب اتاری جو اس پر پڑھی جاتی ہے یقیناً اس میں ان لوگوں کے لیے رحمت اور نصیحت ہے جو ایمان لاتے ہیں۔

وَيَسْتَعْجِلُوْنَكَ بِالْعَذَابِ وَلَوْلَآ اَجَلٌ مُّسَمًّى لَّجَآءَهُمُ الْعَذَابُ وَلَيَاْتِيَنَّهُمْ بَغْتَةً وَّهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ

(53:29)

اور تجھ سے عذاب کے لیے جلدی کر رہے ہیں اگر ایک وقت مقرر نہ ہوتا تو عذاب ان پر آچکا ہوتا اور وہ اس پر اچانک آجائے گا۔ اور انہیں خبر بھی نہ ہوگی۔

ان آیات میں کہیں بھی معجزات (آیات) کا انکار نہیں پایا جاتا۔ یہ آیات ظاہر کرتی ہیں کہ کفار نے عذاب اور ہلاکت کا نشان طلب کیا۔ سو اول انہیں کہا گیا کہ انہیں ایک زندگی بخش نشان دیا گیا ہے یعنی قرآن مجید۔ وہ تمہیں ہلاک کرنا نہیں چاہتا بلکہ تمہیں حیات بخشتا ہے اگر تم عذاب ہی مانگتے ہو تو وہ بھی جلد آجائے گا۔ اور تمہیں ہلاکت سے دوچار کر دے گا۔

معترض کا یہ بھی گمان ہے کہ اس آیت میں لانفی جنس کا ہے جو تمام معجزات کی نفی کرتا ہے یہ بھی گمان صرف ونحو سے ناواقفیت کی وجہ سے ہے۔ یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ نفی کا اثر اس حد تک محدود ہوتا ہے جو متکلم کے ارادہ میں متعین ہوتی ہے خواہ وہ ارادہ تصریحاً بیان کیا گیا ہے۔ یا اشارتاً مثلاً کوئی یہ کہے کہ اب سردی کا نام ونشان مٹ گیا ہے۔ تو یہ ظاہر ہے کہ متکلم نے اپنے علاقہ کی حالت موجودہ کے مطابق کہا ہے۔ گو اس نے اس کا نام نہیں لیا اس کلام سے یہ سمجھ لینا کہ اس سے اس کی مراد یہ ہے کہ کوہستانی ملکوں سے بھی سردی ختم ہوگئی ہے اور ہر جگہ تیز دھوپ پڑنا شروع ہوگئی ہے۔ غلط ہوگا۔ زیر اعتراض آیت میں ان معجزات (آیات) کی نفی کی گئی ہے جو وہ مانگتے تھے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے کفار کی طرف سے نشان مانگنے کے سوالات قرآن مجید میں صرف ایک دو جگہ نہیں بلکہ کئی مقامات پر درج ہیں جب تمام

مقامات کے سوالات کو یکجا کر کے دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ کفار مکہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے تین قسم کے نشانات مانگتے تھے۔ (۱) وہ نشان جو عذاب کی شکل میں فقط اپنے اقتراح سے کفار مکہ نے طلب کیے تھے۔(۲) وہ نشان جو عذاب کی شکل میں یا مقدمہ عذاب کی صورت میں پہلی امتوں پر وارد ہو چکے تھے (۳) وہ نشان جس سے پردہ غیبی اٹھ جائے۔ جس کا اٹھ جانا ایمان بالغیب کے منافی ہے۔ سو عذاب کے نشان مانگنے کے متعلق قرآن مجید میں یہی جواب ہے کہ تم منتظر رہو، عذاب آنے والا ہے۔ دوسری قسم کے عذاب سے جو پہلی امتوں پر وارد ہوئے تھے جس کی پہلے تکذیب کی گئی ہے۔ انکار کر دیا گیا ہے تیسری قسم کا نشان دکھانے سے بکلی انکار کیا گیا ہے۔ یہ ظاہر ہے اس قسم کے نشان طلب کرنے پر انکار ہی تھا۔ مثلاً کفار کہتے ہم تب ایمان لائیں گے کہ جب ہم ایسا نشان دیکھیں کہ زمین سے آسمان تک ایک سیڑھی رکھی جائے تو ہمارے سامنے اس سیڑھی کے ذریعے زمین سے آسمان پر چڑھ جائے اور وہاں سے ایسی کتاب لائے جس کو ہم پڑھیں۔ پڑھیں بھی اپنے ہاتھ میں لے کر۔

مکہ کی زمین جہاں ہمیشہ پانی کی تکلیف ہوتی ہے شام وعراق کے ملکوں کی طرح نہریں اور چشمے جاری ہو جائیں۔

جس قدر ابتداء سے آج تک ہمارے بزرگ مر چکے ہیں سب زندہ ہو جائیں اور اس میں قصی بن کلاب بھی ہو۔ کیونکہ وہ بڑھا ہمیشہ سچ بولتا تھا۔ اس سے ہم پوچھیں گے تیرا دعویٰ حق ہے یا باطل۔ اس قسم کے خود تراشیدہ قسم کے نشانات طلب کرتے تھے۔ جن کا انکار لازمی تھا۔

اس قسم کے نشانات کی نفی صرف رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے وقت ہی نہیں ہوئی بلکہ مسیح کے کلام میں یہ نفی پائی جاتی ہے۔ فریسیوں نے مسیح سے نشانات طلب کیے۔ اس نے آہ کھینچ کر کہا اس زمانے کے لوگ کیوں نشان چاہتے ہیں میں تم سے سچ کہتا ہوں اس زمانے کے لوگوں کو کوئی نشان دیا نہ جائے گا۔ (مرقس 8 باب 11)۔ حضرت مسیح علیہ السلام نے نشان دکھانے سے صاف انکار کر دیا ہے۔ کیا یہاں لانفی جنس نہیں ہے۔

دوم: دلیل انکار معجزات پر قرآن مجید میں آتا ہے۔

وَمَا مَنَعَنَآ اَنْ نُّرْسِلَ بِالْاٰیٰتِ اِلَّآ اَنْ کَذَّبَ بِهَا الْاَوَّلُوْنَ ۚ وَاٰتَیْنَا ثَمُوْدَ النَّاقَةَ مُبْصِرَةً فَظَلَمُوْا بِهَا ۚ وَمَا نُرْسِلُ بِالْاٰیٰتِ اِلَّا تَخْوِیْفًا (بنی اسرائیل 59:17)

اور ہمیں کسی چیز نے نہیں روکا کہ نشان بھیجتے رہیں مگر یہ (ہوا) کہ پہلے انہیں جھٹلاتے رہے اور ہم نے ثمود کو اونٹنی روشن نشان کے طور پر دی۔ سو انہوں نے اس پر ظلم کیا اور ہم نشان صرف ڈرانے کو بھیجتے ہیں۔

قرآن مجید کا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ نشان دو قسم کے ہوتے ہیں نشان تخویف وتعذیب جن کو قہری نشان بھی کہا جاتا ہے۔ دوم نشان تبشیر جن کو نشان رحمت بھی کہا جا سکتا ہے۔ تخویف کے نشان سخت دل کافروں نافرمانوں اور فرعونی طبیعت والوں کے لیے ظاہر ہوتے ہیں اور نشان تبشیر مومنوں کے لیے ظاہر ہوتے ہیں اور ان کے دلوں کو تسکین واطمینان دیتے ہیں اور مومنوں کی روحانی ترقی کا ذریعہ ہوتے ہیں۔

زیر اعتراض آیت میں تخویفی نشان کا ذکر ہے اس آیت میں لفظ الایات آیا ہے جو دو کلموں سے بنا ہے۔ ایک الْ اور دوسرا آیات جو آیت کی جمع ہے۔ عربی قواعد میں الْ کبھی خاص کے لیے آتا ہے اور کبھی کل کے معنی میں اگر لفظ الْ کے خاص معنی لیے جائیں تو آیت کا مطلب یہ ہوگا۔ ہمیں ان خاص نشانوں کے بھیجنے سے (جنہیں منکر طلب کرتے ہیں) کوئی امر مانع نہیں مگر یہ کہ ان نشانوں کو اگلوں نے جھٹلایا۔

اس کے بعد آیت بھی ان معنوں کی تائید کرتی ہے جس کا مطلب ہے کہ ثمود کی قوم نے ایک نشان مانگا پھر انہوں نے انکار کر دیا

اور اس نشان پر ظلم کیا۔

اس قسم کی نفی صرف رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں ہی نہیں ہوئی۔ پہلے نبی بھی انکار کرتے رہے فریسیوں نے مسیح سے نشانات طلب کیے اس نے اہ کھینچ کر کہا اس زمانے کے لوگ کیوں نشان چاہتے ہیں میں تم سے سچ کہتا ہوں اس زمانے کے لوگوں کو کوئی نشان نہیں دیا جائے گا۔ (مرقس 8 باب 11)

دوم: اگر الٰی کے معنی کل لیے جائیں تو یہ معنی ہوں گے۔ ہمیں کل معجزات بھیجنے میں کوئی امر مانع نہیں ہوا مگر اگلوں کا ان معجزات کا جھٹلانا۔ یعنی جس قدر معجزات اللہ کی قدرت میں ہیں وہ سب کے سب نہیں ظاہر کیے گئے۔

صحیح مفہوم:

زیر اعتراض آیت کے صحیح معنی یہی ہوں گے کہ جو بعض نشانات پہلے کفار دیکھ چکے اور ان کی تکذیب کر چکے ہیں ان کا دوبارہ بھیجنا عبث ہے جیسا کہ قرینہ بھی انہی معنوں پر دلالت کرتا ہے یعنی اس موقعہ پر جو ناقہ ثمود کا ذکر کیا گیا ہے۔ یہ واضح قرینہ ہے کہ اس جگہ گزشتہ اور رد کردہ نشانات کا ذکر ہے جو تخویف کے نشانوں میں سے تھے۔

زیر اعتراض آیت میں کلی طور پر معجزہ کی نفی نہیں کی گئی۔ بلکہ مخصوص تخویفی نشانات کی نفی کی گئی ہے۔ مثال کے طور پر کوئی یہ کہے کہ میں نے سارا مال بکر کو نہیں دیا تو اس سے صاف ثابت ہوتا ہے کہ مال کا کچھ حصہ بکر کو دیا گیا ہے۔ تو زیر اعتراض کا یہ مفہوم ہوگا کہ بعض خاص نشان ہم نے نہیں بھیجے تو بعض کا بھیجنا ثابت ہوتا ہے لہٰذا کلی طور پر معجزات بھیجنے کی نفی نہیں کی گئی صرف بعض تخویفی نشانات بھیجنے کی نفی کی گئی ہے یعنی نشانوں کی خاص قسم کی نفی ہے۔

نشانی (معجزہ) دیکھ کر ساحر کہا:

قرآن مجید سے یہ بھی واضح ہوتا ہے جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے خارق عادت معجزہ دکھایا تو اس معجزہ کو دیکھ کر آپ ﷺ کو ساحر کہا۔ قرآن مجید میں آتا ہے۔ وَاِنْ يَّرَوْا اٰيَةً يُّعْرِضُوْا وَيَقُوْلُوْا سِحْرٌ مُّسْتَمِرٌّ (القمر 2:54) (اور اگر کوئی نشان دیکھیں تو منہ پھیر لیتے ہیں اور کہتے ہیں زبردست جادو ہے) اگر آپ پر کلی طور پر آیات (معجزے) آئی ہی نہیں تو آپ ﷺ کو جادوگر کیوں کہا گیا ہے۔ قرآن مجید ظاہر کرتا ہے کہ کفار، آپ ﷺ کو جادوگر (ساحر) خارق عادت معجزات دیکھ کر کہا کرتے تھے۔ دوسری جگہ آتا ہے۔ وَاِذَا رَاَوْا اٰيَةً يَّسْتَسْخِرُوْنَ وَقَالُوْٓا اِنْ هٰذَآ اِلَّا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ (الصّٰفّٰت 14:37) جب کوئی نشان دیکھتے ہنسی اڑاتے اور کہتے یہ کچھ نہیں مگر کھلا جادو ہے۔

لہٰذا جس جس جگہ پر قرآن میں کفار کی طرف سے یہ اعتراض کیا گیا ہے کہ اس پیغمبر پر نشانی کیوں نہیں اترتی۔ ساتھ ہی یہ بتا دیا گیا ہے کہ ان کا مطلب یہ ہے کہ جو نشانیاں وہ مانگتے ہیں ان میں سے کوئی نشانی کیوں نہیں اترتی۔ کلی طور پر نشانیوں کی نفی نہیں کی گئی۔ بلکہ مخصوص نشانیوں کی نفی کی گئی ہے اور قرآن سے ہی یہ واضح ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے خارق عادت معجزے دکھائے تو ان کی بناء پر آپ ﷺ کو ساحر کہا گیا۔ لہٰذا معترضین کا اعتراض لاعلمی پر مبنی ہے۔

چند معجزات:

زیر اعتراض آیات کی وضاحت کے بعد رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے چند معجزات بھی قلمبند کیے جاتے ہیں۔ گو سیرت سید البشر کے حصہ اول میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزات پر ایک مستقل باب بھی ہے لیکن قارئین کی سہولت اور سلسلہ کلام کو جاری رکھتے ہوئے اختصار کے ساتھ چند معجزات درج کیے جاتے ہیں۔

پہلا معجزہ

آپ کی پیدائش اور آپ کا وجود باجود:

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی پیدائش اور آپ ﷺ کا وجود بابرکت ہی ایک عظیم الشان معجزہ ہے۔ اسیبسینا کے حبشی بادشاہ ہمیشہ حجاز کو عسکری کارروائیوں کا نشانہ بنایا کرتے تھے اور رسول کریم صلعم کی پیدائش کے سال ابرہہ نے بیت اللہ کو منہدم کرنے کے لیے حملہ کیا۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے وجود کی برکت سے ابرہہ اور اس کا لشکر چیچک اور مولوں کے حملوں سے تباہ و برباد ہو گیا اور آپ ﷺ کے وجود کی برکت تا قیامت جاری رہے گی۔ کہ حجاز پر کوئی غیر مسلم قوم غلبہ حاصل نہیں کر پائے گی۔ یاجوج قوم نے اٹھارہویں اور انیسویں صدی میں اسلامی ممالک کو زیر کیا لیکن ہزار خواہش کے باوجود مکہ اور مدینہ ان کی یلغار سے محفوظ رہا اور تا قیامت محفوظ رہے گا۔ دنیا کی کوئی طاقت حجاز پر غلبہ حاصل نہیں کر سکتی یہ محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے وجود باجود کا معجزہ ہے۔ جو آپؐ کے وجود نے اپنی قوم حجاز کو ہمیشہ کے لیے آزادی کا تحفہ دے دیا ہے۔ مکہ اور مدینہ ایسی چھاؤنیاں ہیں جہاں فرشتے پہرہ دے رہے ہیں۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا پیدا ہونا حجاز کے لیے کتنی خوش نصیبی ہے کہ دنیا کا کوئی بادشاہ اس پر مسلط نہیں ہو سکتا۔ اے دل و دماغ رکھنے والو! اس معجزہ پر غور کرو۔ یہ معجزہ صرف رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات کے ساتھ ہی تعلق رکھتا ہے کیا دنیا میں کوئی ایسا شخص گزرا ہے جس نے ہمیشہ کے لیے اپنی قوم کو آزادی کا تحفہ دیا ہو۔

دوسرا معجزہ

پیدائش سے لے کر چالیس سال کی عمر:

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا وجود ہی ایک معجزہ ہے۔ دوسرے معجزہ میں صرف چالیس سال کی عمر تک کا بطور معجزہ جائزہ لیا جائے گا۔ جب محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم پیدا ہوئے تو عرب ہر قسم کی گمراہی میں پھنسا ہوا تھا۔ عرب سورج چاند ستارے حجر شجر بھوت پریت مورتیوں کے سامنے سجدہ ریز تھے۔ غصب و نہب چوری چکاری، قتل و غارت، زنا، قمار بازی، دھوکہ دہی، اور حقوق انسانی کی پامالی ان کا مشغلہ تھا۔ معمولی معمولی بات پر برسوں تک قبائل میں لڑائی جاری رہتی۔ اس متعفن اور معصیت آلود مسموم فضا میں آپ ﷺ تمام برائیوں سے دور ہی نہیں رہے بلکہ تمام اخلاق حسنہ پر کاربند رہے۔ حضرت خدیجہ کی وہ شہادت جو انہوں نے نبوت کی پہلی وحی کے موقع دی تھی کافی ہے کہ آپ ﷺ کس قسم کے اخلاق فاضلہ کے حامل تھے۔ عرب مشرک ہوں مگر آپ ﷺ موحد، لوگ زانی ہوں آپ عفیف، اور پاک دامن، لوگ قتل و غارت کے عادی ہوں آپ امن کے داعی اور محبت کے پرچارک، لوگ حقوق انسانی کو پامال کر رہے ہوں اور آپ حقوق انسانی کی بحالی کے لیے کوشاں ہوں۔ الغرض چالیس سال کی عمر تک ہر قسم کی برائی سے دور رہے اور ہر نیکی اور بھلائی کو اپنا شعار بنایا اس قسم کے متعفن گناہ آلود فضا میں ہر قسم کی برائی سے بچنا کیا معجزہ نہیں؟ پھر جب خلعت نبوت سے نوازے جاتے ہیں تو آپ ﷺ نے اپنی صداقت کے لیے اپنی پہلی عمر بطور معجزہ پیش کی۔ اور آپ ﷺ نے امین اور صادق کا لقب پایا تھا۔ چالیس سال تک ہر برائی سے بچے رہنا کیا یہ خرق عادت نہیں۔ انبیاء علیہم السلام کے علاوہ کوئی ہے جو ہر قسم کی برائی سے بچے رہنے کا دعویٰ کر سکے۔ اسی خرق عادت معجزہ کی وجہ سے آپ انبیاء علیہم السلام کی فہرست میں آتے ہیں یہ معجزہ صرف نبیوں کے لیے مخصوص ہے دوسرا کوئی شخص معصوم ہونے کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔

تیسرا معجزہ

قرآن مجید:

جو کلام آپ ﷺ پر نازل ہوا۔ یعنی قرآن مجید وہ دائمی معجزہ ہے۔ قرآن مجید اپنی فصاحت و بلاغت، دینی معارف مادی علوم، قوت تاثیر، مکمل ضابطہ حیات، تحریف و تبدل سے محفوظ رہنے کے لحاظ سے ہدایت کے لحاظ سے عدم اختلاف کے لحاظ سے غیب کی خبروں کا اعلان کرنے کے لحاظ سے معجزہ ہے۔ اور اس قسم کی کتاب کوئی بنا نہیں سکتا۔ ارشاد الٰہی ہے۔

لَئِنِ اجْتَمَعَتِ الْاِنْسُ وَالْجِنُّ عَلٰٓی اَنْ یَّاْتُوْا بِمِثْلِ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لَا یَاْتُوْنَ بِمِثْلِهٖ وَلَوْ كَانَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ ظَهِیْرًا (بنی اسرائیل 89:17)

یعنی کہو اگر انسان اور جن اس بات پر اکٹھے ہو جائیں کہ اس قرآن کی مثل بنا لائیں تو اس کی مانند نہ لا سکیں گے۔ اگرچہ وہ ایک دوسرے کے مددگار ہوں۔

باسورتھ سمتھ رقمطراز ہے کہ یہ ایک ہی معجزہ تھا جس کا محمد کو دعویٰ تھا وہ اس کو مستقل معجزہ کہتے تھے فی الحقیقت یہ ایک ہی معجزہ تھا۔ (لائف آف محمد ص 290)

یہ ایک اُمی کا دعویٰ ہے کہ کوئی اس کتاب کی مانند کوئی کتاب لائے پھر کسی مخالف نے تکذیب نہیں کی۔ نہ کوئی اس کتاب کی مانند لانے کو کھڑا ہوا۔ یہ معجزہ دائمی ہے ہر دور کے لئے ہے۔ کسی کا بھی مقابلہ کے لیے نہ آنا۔ یہ زبردست دلیل ہے کہ قرآن مجید ایک معجزہ ہے۔

چوتھا معجزہ

حفاظت قرآن:

ارشاد الٰہی ہے۔

اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ (حجر 9:15)

ہم نے ہی یہ نصیحت (قرآن) اتاری اور ہم ہی اس کی حفاظت کریں۔

دنیا کا کوئی مذہب نہیں جس کی کتاب اپنے ہادی کی زبان میں بعینہ اسی طرح محفوظ ہو جس طرح نازل ہوئی ہو۔ یہ فخر صرف قرآن مجید کو ہی حاصل ہے کہ وہ ویسے ہی محفوظ چلی آ رہی ہے۔ جس طرح رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں تھی سر ولیم میور اپنی کتاب لائف آف محمد میں رقمطراز ہے۔ ''ہم نہایت مضبوط قیاسات کی بناء پر کہہ سکتے۔ ہیں کہ ہر ایک آیت جو قرآن میں ہے وہ اصلی ہے اور جو محمد (مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم) کی غیر مصرف تصنیف ہے۔ (ص 562)

پانچواں معجزہ

جنگ بدر:

یہ لڑائی صرف مسلمانوں کے ایک چھوٹے سے گروہ کا ایک بڑے مسلح گروہ پر غالب آنے کی وجہ سے معجزہ ہی نہیں بلکہ یہ جنگ اس وجہ سے معجزہ ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کفار کی شکست اور ان پر وبال آنے کی خبر پہلے ہی دی تھی کہہ دیا تھا کہ عدوان اسلام کی فنا کا ابتدائی زمانہ سال بھر کے بعد شروع ہونے والا ہے جب میں مکہ سے چلا جاؤں گا اس کے ایک سال بعد دشمنوں پر ہلاکت آئے گی اور

یہی خبر کتب مقدسہ میں درج ہے۔ایک طرف یہ جنگ کتب مقدسہ کی تصدیق تھی۔

دوم: رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سچائی پر مہر ثبت کرتی ہے۔

کتب سابقہ میں اس کا ذکر یسعیاہ نبی میں ہے۔

خداوند نے مجھ کو یوں فرمایا ہنوز ایک برس ہاں مزدور کے سے ٹھیک ایک برس میں قیدار کی ساری حشمت جاتی رہے گی اور تیر اندازوں کے جو باقی رہے قیدار کے بہادر لوگ گھٹ جائیں گے۔(یسعیاہ 21 باب 16-17)

جنگ بدر کیسا واضح نشان ہے۔قیدار عرب میں کون ہیں کیا یہ قریش ہی نہیں کیا بدر ہیں ان کے بہادر مارے نہیں گئے۔

چھٹا معجزہ

فتح مکہ:

جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بے بسی کے عالم میں مکہ سے ہجرت کی۔اس بے بسی کے عالم میں اللہ تعالیٰ یہ خبر دیتا ہے۔

اِنَّ الَّذِیْ فَرَضَ عَلَیْكَ الْقُرْاٰنَ لَرَآدُّكَ اِلٰی مَعَادٍ

وہ ذات جس نے تجھ پر قرآن فرض کیا ہے وہ تجھے تیرے معاد (مکہ، وطن) کی طرف ضرور لوٹائے گا۔

ہجرت کے آٹھ سال بعد رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم فاتحانہ رنگ میں اسی معاد (مکہ) میں داخل ہوتے ہیں جہاں سے نکالے گئے تھے۔یہ اس بے بسی کے دور کی پیشگوئی ہے۔جس بے بسی کی حالت میں نکالے گئے تھے اس حالت میں کون کہہ سکتا تھا کہ وہ ضرور واپس آئے گا۔اس وقت قادر توانا علیم وخبیر کے یہ الفاظ تھے۔جو اپنی پوری شان کے ساتھ پورے ہوئے۔فتح مکہ کی پیشگوئی بھی کتب مقدسہ میں پائی جاتی ہے۔تورات میں آتا ہے" خداوند سینا سے آیا۔سعیر سے ان پر طلوع ہوا۔فاران ہی کے پہاڑ سے وہ جلوہ گر ہوا۔دس ہزار قدوسیوں کے ساتھ آیا اور اس کے داہنے ہاتھ میں ایک آتشی شریعت ان کے لیے تھی۔(استثناء 33:2)

عرب کے قدیم جغرافیہ نگار اور بعض مسیحی علماء کی تحقیقات سے یہ ثابت ہے کہ" فاران" مکہ معظمہ کے پہاڑوں کا نام ہے۔

حقوق نبی نے اس پیشگوئی کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا:" خدا جنوب سے اور وہ جو جدوس ہے کہ فاران سے آیا (حبقوق 3:9)

دس ہزار قدوسیوں کی معیت نہ صرف فاران کے جائے وقوع کے متعلق فیصلہ کر دیتی ہے بلکہ پیشگوئی کے اصل مصداق کی ناقابل تردید شہادت ہے دنیا کی تاریخ میں دس ہزار قدوسی فتح مکہ کے وقت صرف رسول کریم ﷺ کے ساتھ ثابت ہیں۔

کیا فتح مکہ معجزہ نہیں؟ بے بسی کی حالت میں یہ پیش گوئی کر دی گئی تھی۔کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم ایک دن اپنے معاد (مکہ) کی طرف ضرور لوٹے گا۔دوسرا اس پیشگوئی کا ذکر کتب مقدسہ میں بھی واضح الفاظ میں ہے۔

ساتواں معجزہ

روحانی انقلاب:

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا عظیم الشان معجزہ وہ روحانی انقلاب ہے جو آپ ﷺ کی قوت قدسیہ کے ذریعے عرب میں آیا۔وہ قوم جو ہر قسم کی برائیوں میں مبتلا تھی ریت کے ذروں کی طرح منتشر تھی۔ایک دوسرے کی دشمن تھی۔دوسروں کی نظر میں حقیر و ذلیل سمجھی جاتی تھی شرک کی دلدل میں پھنسی ہوئی تھی۔بتوں کی پجاری تھی۔وہی قوم موحد بنی خدائے واحد کے آستانہ پر سجدہ ریز ہوئی بلکہ سیسہ پلائی ہوئی قوم بن گئی تمام برائیوں کو ترک کر دیا۔ایک دوسرے کے بھائی بھائی بن گئے۔اور دنیا کی معزز قوم بن گئی یہ عظیم انقلاب کیا معجزہ نہیں؟ دنیا

میں کوئی ایسا شخص نہیں جس نے اس قسم کا معجزہ دکھایا ہو۔

آٹھواں معجزہ

مقام صدیقیت: (مقام ولایت)

یہ ایک ایسا روحانی معجزہ ہے جو صرف امت مسلمہ کے ساتھ مختص ہے وہ یہ ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی سے ایک شخص مقام صدیقیت (ولایت) تک پہنچ جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس روحانی مقام عالیہ پر فائز شخص سے مکالمہ مخاطبہ کرتا ہے اس کی دعائیں سنتا ہے۔ اس پر معارف الٰہیہ کھلتے ہیں وہ روحانی مردوں کو زندگی بخشتا ہے۔ یہ وہ معجزہ ہے۔ جو صرف آپ کی کامل پیروی سے ظاہر ہوتا ہے۔ دنیا کا کوئی مذہب نہیں جس کا پیروکار یہ دعویٰ کرے کہ اللہ تعالیٰ اس سے مکالمہ مخاطبہ ہوتا ہے۔ اسلام کی تاریخ یہ بتاتی ہے کہ اسلام میں ہزاروں لوگ ایسے ہو گزرے ہیں جن کا یہ دعویٰ تھا کہ اللہ ان سے ہم کلام ہوتا ہے یہ ہم کلامی وحی ولایت کہلاتی ہے۔ ارشاد الٰہی ہے۔

لَهُمُ الْبُشْرٰى فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِي الْاٰخِرَةِ لَا تَبْدِيْلَ لِكَلِمٰتِ اللّٰهِ ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ (64) وَلَا يَحْزُنْكَ قَوْلُهُمْ اِنَّ الْعِزَّةَ لِلّٰهِ جَمِيْعًا هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ (یونس 65:10)

ان کے لیے دنیا کی زندگی میں اور آخرت میں خوشخبری ہے اللہ کی باتیں تبدیل نہیں ہو سکتیں۔ یہ بڑی بھاری کامیابی ہے۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی فرمایا انقطع الوحی وَلَمْ يَبْقَ اِلَّا الْمبشْرات یعنی وحی نبوت ختم ہو چکی ہے اب صرف مبشرات (بشریٰ) باقی رہ گئے ہیں وہ مبشرات کیا ہیں وہ وحی ولایت ہے۔ وحی ولایت کا اجرا صرف رسول کریم صلعم کی پیروی کے مختص ہے۔

رسول کریم کا یہ معجزہ تا قیامت جاری وساری رہے گا۔ رسول کریم صلعم کی اس معجزانہ فضیلت میں کوئی دوسرا نبی شامل نہیں۔

صرف نمونہ کے طور پر آٹھ معجزات پر بحث کی گئی ہے وہ معجزات جو صحابہ کی شہادت سے ثابت ہیں وہ تین ہزار ہیں اور پیشگوئیاں تو شاید دس ہزار سے بھی زیادہ ہیں۔

☆......☆

(۱) رسول کریم غیب کا علم نہیں رکھتے تھے۔

(۲) سورج کا دلدل میں غروب ہونا خلاف عقل ہے۔

اعتراض: اگر محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) پیغمبر ہوتے تو اس وقت کے سوالوں کے جواب میں لاچار ہو کر یہ نہ کہتے کہ خدا کو معلوم یعنی مجھ کو معلوم نہیں اور اصحاب کہف کی بابت ان کی تعداد میں غلط بیانی نہ کرتے اور یہ نہ کہتے کہ سورج دلدل میں چھپتا ہے یا غرق ہوتا ہے حالانکہ سورج زمین سے تو کروڑ حصہ بڑا ہے۔ وہ کس طرح دلدل میں چھپتا ہے۔ (عیسائی مناد عبداللہ جیمز کا اعتراض جو موصوف نے انجمن حمایت اسلام کو بھیجا تھا) نیز دھرم پال نے بھی اپنی کتاب ترک اسلام میں اعتراض 29 میں لکھا ہے کہ ذوالقرنین نے مغرب میں جا کر دیکھا کہ سورج دلدل میں غروب ہوتا ہے۔

جواب: رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا عالم غیب نہ ہونا:

معترض کی یہ غلط فہمی ہے کہ نبی عالم غیب ہوتا ہے چونکہ محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم عالم غیب نہ تھے اس لیے وہ پیغمبر نہ تھے۔ نبی کی یہ ہرگز نشانی نہیں کہ وہ اللہ تعالیٰ کی طرح مخفی باتوں کا علم رکھتا ہے۔ عالم الغیب ہونا صرف اللہ تعالیٰ کی خصوصیت ہے۔ جب سے سلسلہ انبیاء علیہم السلام شروع ہوا ہے یہی عقیدہ چلا آ رہا ہے کہ عالم الغیب صرف اللہ کی ہی ذات ہے ہاں اللہ تعالیٰ اپنی مخصوص حکمت سے کبھی نبی یا ولی پر اسرار غیبیہ کا پردہ کھول دے یہ اللہ تعالیٰ کی سنت مستمرہ ہے کہ وہ مخصوص حالات میں کچھ مخصوص غیب کی خبریں اپنے برگزیدہ بندوں کو بتا دیتا ہے۔ اسی سنت کے تحت اللہ تعالیٰ نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر غیب کی خبریں کھولیں۔ الغرض کوئی نبی بھی عالم الغیب نہیں ہوتا۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم بھی عالم غیب نہیں تھے۔ عالم غیب ہونا کسی برحق نبی کی علامت نہیں اگر کوئی عالم غیب ہونے کا دعویٰ کرتا ہے تو وہ گویا اللہ کی صفت میں شریک ہونے کا دعویٰ کر رہا ہے۔

جب انجیل کا مطالعہ کریں تو مسیح علیہ السلام اپنی لاعلمی کا اقرار کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اس دن اور اس گھڑی کی بابت سوا باپ کے نہ تو فرشتے جو آسمان پر ہیں نہ بیٹا کوئی جانتا (مرقس باب 13 آیت 32)

پھر فرماتے ہیں کہ میں آپ سے کچھ نہیں کرتا (یعنی کچھ نہیں کر سکتا مگر جو میرے باپ نے سکھایا۔ وہ باتیں کہتا ہوں۔ کسی کو راست بازوں کے مرتبہ تک پہنچانا میرے اختیار میں نہیں مجھے کیوں نیک کہتا ہے نیک کوئی نہیں مگر ایک یعنی خدا (مرقس باب 10 آیت 17)

الغرض کسی نبی نے با اقتدار اور عالم الغیب ہونے کا دعویٰ نہیں یہ صرف اللہ تعالیٰ کے ساتھ مختص ہے اگر کوئی بندہ اس صفت میں شریک ہو جائے تو خالق اور مخلوق میں فرق مٹ جاتا ہے بندہ خدا کی صفت میں شریک ہو گیا۔ یہ بات ممتنع اور محال ہے۔ یہ دنیا میں وقوع پذیر نہیں ہو سکتی۔ کبھی بھی بندہ عالم غیب نہیں ہو سکے گا۔ لہٰذا معترض کا اعتراض صرف لاعلمی پر ہی مبنی نہیں بلکہ جہالت کا اظہار ہے۔

دوسرا اعتراض یا غلط فہمی:

معترض نے دوسری غلط فہمی یہ پیش کی ہے یعنی یہ کہ اصحاب کہف کی تعداد کی بابت قرآن مجید میں غلط بیانی ہے۔ سوال یہ ہے اگر قرآن مجید کا بیان غلط ہے تو اس کے مقابل پر صحیح کون سا بیان ہے اس کی صحت پر کون سے دلائل ہیں معترض نے قرآن مجید کے بیان کے مقابل کوئی بزعم خویش صحیح بیان پیش نہیں کیا۔ اس کے علاوہ مزید کیا بیان کیا جائے جب قرآن مجید کے بیان کے مقابل پر کوئی بیان پیش ہی نہیں کیا گیا۔ تو قرآن کا بیان کیسے غلط ہو سکتا ہے؟ غلط اس وقت کہا جا سکتا ہے جب تاریخی حقایق کی روشنی میں صحیح تعداد بیان کی جائے۔

تیسری غلط فہمی دلدل میں سورج کا غروب ہونا:

ذوالقرنین اپنی سلطنت کی دور کی سرحدوں کی (بحیرہ خضر) کی طرف جاتا ہے وہاں سورج کسی پہاڑ یا آبادی یا درختوں کی اوٹ میں چھپتا نظر نہیں آتا تھا۔ بلکہ دلدل میں غروب ہوتا نظر آتا تھا۔ یعنی جہاں تک نظر جاتی تھی وہاں دلدل ہی دلدل تھی وہاں سورج غروب ہوتا نظر آتا ہے۔

یہ تو عام روزمرہ کا مشاہدہ ہے کوئی کشتی بان یا جہاز ران سمندر میں سفر کرتا ہے تو وہ سورج کو پانی سے طلوع ہوتے اور پانی میں ہی غروب ہوتے دیکھتا ہے۔ کیا وہ جب یہ کہتا ہے کہ اس نے سورج کو پانی سے طلوع ہوتے اور پانی میں ہی غروب ہوتے دیکھا ہے غلط ہوگا۔ یہ عام روزمرہ کا مشاہدہ ہے کہ ایک آدمی دور کسی جنگل میں چلا جاتا ہے تو وہ سورج کو درختوں کے پیچھے چھپتا ہوا نظر آئے گا۔ جب وہ یہ کہے گا کہ اس نے سورج کو درختوں کے پیچھے چھپتا ہوا دیکھا یہ مجازی کلام ہوگا یہ نہیں کہ ہم علم ہیئت کی کتابیں لے کر بیٹھ جائیں تو دیکھیں آیا سورج درختوں کے پیچھے چھپ سکتا ہے۔ ہم ہر روز بول چال میں صدہا مجازات و استعارات استعمال کرتے ہیں۔ مجاز اور استعارہ ادب کا حسن ہے۔ ہر زبان کے ادب میں مجازات اور استعارات استعمال ہوتے ہیں اس طرح سماوی کتب بھی مجازات سے پُر ہیں خصوصاً انجیل میں تو بے شمار مجازات اور استعارات پائے جاتے ہیں۔ مثال کے طور پر صرف ایک پیش کرتا ہوں متی اور مرقس میں ہے کہ ”مسیح کو اس وقت آسمان سے خلق اللہ کی عدالت کے لیے اترتا دیکھو گے جب سورج اندھیرا ہو جائے گا اور چاند اپنی روشنی نہیں دے گا اور ستارے زمین پر گریں“ اگر حضرت مسیح کے اس فرمان کو علم ہیئت کی روشنی میں جائزہ لیں تو بالکل غلط ثابت ہوتا ہے جب سورج اندھیرا ہو جائے گا چاند اپنی روشنی کھو بیٹھے گا ستارے گرنا شروع ہو جائیں تو کیا دنیا میں کوئی آدم زاد زندہ رہ سکتا ہے۔ تو پھر حضرت مسیح خلق اللہ کی عدالت کے لئے کیسے اترتے نظر آئیں گے خلق اللہ تو ستارہ گرنے سے ہی تباہ و برباد ہو چکی ہوگی۔ الغرض ہر کتاب میں مجازات ہوتے ہیں۔ معترض نے خود اعتراف کیا ہے مجازات سے تعلق رکھتا ہے اگر مجازات کی روشنی میں دیکھا جائے تو غلط فہمی دور ہو جاتی ہے۔

☆......☆

ہجرت حبشہ مسلمانوں میں باہمی اختلافات کی وجہ سے ہوئی

اعتراض: ہجرت حبشہ کی اصل وجہ اسلام کی نوخیز امت کے اندرونی معاملات میں فکری حیثیت سے بڑی تفریق پیدا ہو گئی تھی۔ (محمد ایٹ مکہ ص 189,182)

جواب: منٹگمری نے سیرت نبوی پر دو حصوں میں کتاب لکھی ہے محمد ایٹ مکہ اور محمد ایٹ مدینہ۔ دور حاضر میں یہ کتاب کافی شہرت رکھتی ہے۔ مصنف نے اسلام اور حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیثیت کو کم کرنے کے لیے تاریخی واقعات کو اپنے نظریات اور مفروضات کا

جامہ پہنانے کی کوشش کی ہے۔ ہجرت حبشہ کو بھی اپنے مفروضہ کا لباس پہنایا ہے۔ حقیقی اسباب کو نظر انداز کر دیا ہے پہلے پانچ اسباب بیان کرتا ہے۔ (۱) ظالمانہ دباؤ سے بچ نکلنے کی کوشش (۲) ارتداد کے خطرہ سے دور ہو جانے کی خواہش (۳) تجارتی دلچسپوں کو برقرار رکھنے کا جذبہ (۴) حبشہ کے باشندوں سے جنگی امداد کے حصول کے لیے۔

ان چاروں اسباب کو رد کرتے ہوئے اور ان پر اپنی بے اطمینانی کا اظہار کرتے ہوئے لکھتا ہے اس خیال کو رد کر دینا بڑا مشکل ہے کہ ہجرت حبشہ کی پانچویں وجہ ہی لازمی طور پر اطمینان بخش ہے یعنی یہ بات اسلام کی نوخیز امت کے اندرونی معاملات میں فکری حیثیت سے بڑی تفریق پیدا ہو گئی تھی۔ (محمد ایٹ مکہ ص189,182)

اپنے مفروضہ کو ثابت کرنے کے لیے حبشہ میں خالد بن سعید کے طویل قیام کو دلیل کے طور پر پیش کرتا ہے کہ ان کو محمد ﷺ کی سیاست سے اختلاف تھا وہ اسلام کی بڑھتی ہوئی سیاسی نوعیت سے متفق نہیں تھے محمد کی نبوت کی وجہ سے وہ ان کے سیاسی کردار کی اہمیت سے بھی اختلاف رکھتے تھے۔ خالد کو رسالت کے سیاسی پہلوؤں کا لحاظ و اہتمام ہوتا تو وہ محمد کے ساتھ اپنے اختلاف کو نظر انداز کر کے 7ھ سے پہلے ہی مکہ واپس آجاتے۔ (محمد ایٹ مکہ ص162)

واٹ نے چند واقعات سے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ مسلمانوں میں اختلاف رائے پیدا ہو گیا تھا اس کے نزدیک یہ اختلاف خاص طور پر حضرت ابوبکر سے تھا۔ جن کو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے نزدیک خاص مقام حاصل تھا۔ اس اختلاف کو سامنے رکھ کر حضرت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوبکر کے مخالفوں کو حبشہ کی طرف ہجرت کا مشورہ دیا تھا منٹگمری واٹ کی دلیل کا سب سے بڑا رد تو حضرت عثمان اور حضرت طلحہ کا مہاجرین میں شامل ہونا ہے یہ اصحاب تو حضرت ابوبکر کے رفقاء میں سے تھے۔

دوم: حضرت جعفر بھی تھے واٹ کی دلیل کا رد قریش کا مہاجروں کو واپس لانے کے لیے وہ سفارت ہے۔ اور عبداللہ بن ربیعہ اور عمرو بن العاص کو اس سفارت کے لیے منتخب کیا گیا بڑے بڑے قیمتی تحفے ساتھ لیے۔ پہلے درباریوں سے ملے ان کو پیش کیے اور کہا کہ ان نادان لوگوں نے ایک نیا مذہب ایجاد کیا ہے جو عیسائیت کے بھی مخالف ہیں ان کی تائید حاصل کی۔ چنانچہ اگلے دن یہ سفرا دربار میں پہنچے درخواست کی کہ مہاجرین ہمارے مجرم ہیں ان کو واپس کیا جائے۔ چنانچہ دربار میں مسلمانوں کو بلایا گیا اس موقعہ پر حضرت جعفر نے جو تقریر کی جو تمام تواریخ میں درج ہے کہ اس کا ایک ایک لفظ واٹ کے استدلال کو رد کرتا ہے۔ حضرت جعفر نے بھرے دربار میں کہا۔

"اے بادشاہ ہم ایک جاہل قوم تھے جو بتوں کو پوجتے مردار کھاتے بے حیائی کا کام کرتے اقرباء کے حقوق ادا نہ کرتے ہمسایوں سے برا سلوک کرتے اور ہم میں سے مضبوط کمزور کو کھا جاتا تھا یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے ہماری طرف ایک رسول مبعوث کیا۔ جس کے نسب صدق امانت اور پرہیز گاری کو ہم خوب جانتے تھے اس نے ہم کو بلایا کہ خدا کو ایک مانیں اس کی عبادت کریں پتھروں اور بتوں کی پرستش کو چھوڑ دیں اور اس نے ہم کو کہا کہ ہم سچ بولیں امانت ادا کریں۔ صلہ رحمی کریں۔ ہمسایوں سے نیک سلوک کریں۔ یتیم کا مال نہ کھائیں حرام باتوں اور خون ریزیوں سے بچیں عفیف عورتوں پر بدنامی کا داغ نہ لگائیں نماز پڑھیں۔ روزے رکھیں زکوٰۃ دیں پس ہم اس پر ایمان لائے اور اس کی پیروی کی اور اس کی باتوں کو جانا اس پر ہماری قوم نے ہم پر ظلم شروع کر دیئے اور ہم کو دکھ دیا کہ ہم اپنا دین ترک کر دیں اور بت پرستی کی طرف لوٹ آئیں پس جب ان کا ظلم انتہا کو پہنچ گیا تو ہم آپ کے ملک کی طرف نکل آئے ہم امید رکھتے ہیں کہ آپ کے ہاں ہم پر ظلم نہیں ہوں گے۔ (سیرت ابن ہشام جلد اول ص116) یہ تقریر واضح کرتی ہے کہ ہجرت کی وجہ کفار کے مظالم تھے جو مسلمانوں پر ڈھائے جاتے تھے۔

کفار کے مظالم کی وجہ سے صرف مہاجرین حبشہ نے ہی ہجرت نہیں کی بلکہ حضرت ابوبکر ہجرت کرنے پر مجبور ہو گئے تھے مگر ایک

قبیلہ کے سردار نے ان کو اپنی پناہ میں لے لیا تھا (بلاذری انساب ج 1 ص 206,205)
سیرت کی کسی کتاب میں بھی کسی صحابی کا رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے اختلاف کا ذکر نہیں پایا جاتا۔ دراصل مستشرقین کے ذہنوں میں حواریوں کے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ساتھ وہ توہین آمیز سلوک اور واقعات ہیں جو اناجیل میں پائے جاتے ہیں یہوداہ اسکریوطی نے تیس روپے کی رقم لے کر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو گرفتار کروا دیا تھا۔ (یوحنا باب 13 آیت 27,26)
پطرس کو حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے مخاطب ہو کر کہا۔ ''اے شیطان میرے سامنے سے دور ہو جا۔'' (مرقس باب 18 و آیت 23)
پطرس نے بھی اپنے آقا سے غداری کی اور لعنت بھیج کر یہ کہا کہ وہ اس شخص (عیسی علیہ السلام) کو نہیں جانتا۔ (مرقس باب 14 آیت 71)
ان حوالہ جات سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حواریوں کی ایمانی حالت ظاہر ہو جاتی ہے۔ اسی خفت کو مٹانے کے لیے مستشرقین رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کو غلط رنگ میں بیان کرتے ہیں اگر واٹ حضرت جعفر کی تقریر کو ہی سامنے رکھ لیتا تو اس کو ہجرت کا حقیقی سبب معلوم ہو جاتا کہ مہاجرین حبشہ نے محض کفار کے مظالم کی وجہ سے ہجرت کی تھی۔ نہ کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم یا حضرت ابوبکر سے اختلاف کی وجہ سے۔

☆......☆

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کعبہ میں رکھے بتوں کی تنقیص نہیں کی

اعتراض: رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کعبہ میں رکھے بتوں کی پوجا پر براہ راست تنقید کبھی نہیں کی۔ البتہ مکہ کے اطراف میں جو مورتیاں نصب تھیں آپ نے ان کو نام زد کر کے تنقیدی باتیں کہیں۔ اس لئے مکہ میں آپ کی مخالفت کی بنیادی وجہ یہ نہیں تھی کہ مکہ کے لوگوں کو اسلام قبول کرنے پر یہ اندیشہ تھا کہ اس کے نتیجہ میں گرد و پیش کے عرب زیارت کعبہ کا سفر بند کر دیں گے اور مکہ کی تجارت تباہ ہو جائے گی۔
قرآن مجید میں کعبہ کے بتوں پر کوئی تنقید نہیں کی گئی۔ (محمد آیت مکہ 214,213)

جواب: واٹ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے عقیدہ توحید کو کمزور کر کے دکھانا چاہتا ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے صرف مکہ کے اردگرد کے قبائل کے بتوں کو ہدف تنقید بنا لیا تھا۔ اہل مکہ کی مخالفت کی وجہ بتوں کی تنقیص نہ تھی بلکہ وہ اس وجہ سے دائرہ اسلام میں داخل نہیں ہو رہے تھے کہ ان کے ایمان لانے سے مکہ کے اردگرد کے قبائل زیارت کعبہ کے لیے نہیں آئیں گے تو ان کی تجارت پر زد پڑے گی۔
یہ بھی حقائق سے منافی واٹ کا ذہنی مفروضہ ہے اور ذہنی اختراع ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ دین اسلام کی بنیاد ہی توحید ہے۔ جس کا آغاز بعثت کے وقت سے ہی کر دیا تھا۔ توحید کی تبلیغ اور بتوں کا رد اس شدت سے کیا کہ مکہ میں مخالفت کا ایک طوفان اٹھ کھڑا ہوا۔ بتوں کی مخالفت کو روکنے کے لیے ابو طالب سے سفارت شروع ہوئی اور ان سے کہا۔ کہ وہ اپنے بھتیجے کو سمجھائیں کہ وہ ان کے بتوں کو برا بھلا کہنا چھوڑ دے۔ پھر تیسری سفارت ہوئی اور سفارتی وفد نے ابو طالب سے کہا کہ آپ اپنے بھتیجے کو بتوں کی مذمت سے منع کر لیں۔ اب ہمارا صبر کا پیمانہ لبریز ہو چکا ہے ہم آپ سے جنگ کریں گے تاکہ معاملہ ختم ہو جائے ابو طالب نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو بلا کر قریش کے وفد کا

دھمکی آمیز پیغام پہنچایا تو آپ نے جو الفاظ کہے تاریخ میں محفوظ ہیں آپ ﷺ نے فرمایا: ''اے میرے چچا اگر کفار مکہ میرے دائیں ہاتھ پر سورج اور بائیں ہاتھ پر چاند رکھ دیں اور کہیں کہ اس امر (توحید اور ردشرک) کو چھوڑ دوں۔ مجھے منظور نہ ہوگا اگر مجھے اس راہ میں ہلاکت نظر آئے تو میں پیچھے نہیں ہٹوں گا۔''

جب تیسری سفارت کاری کارگر ثابت نہ ہوئی تو پھر ہر قسم کی ترغیبات دیں کہ آپ ﷺ ان کے معبودوں اور ان کے دین کی عیب جوئی نہ کریں لیکن آپ باز نہ آئے۔

تاریخ یہ بتاتی ہے کہ سفارت کاری کا مرکزی موضوع ہی بتوں کو برا بھلا کہنا چھوڑ دیا جائے اگر رسول کریم صلعم کے پیغام میں مکہ کے بتوں کا رد اور تنقیص نہیں تھی تو وہ ابوطالب کے پاس یہ پیغام کیوں لے کر جاتے کہ اپنے بھتیجے کو ان کے بتوں کو برا بھلا کہنے سے روکیں۔

واٹ نے محض رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تبلیغ عقیدہ توحید کی اہمیت کو کم کرنے کے لیے یہ مفروضہ گھڑا ہے کہ آپ ﷺ نے کعبہ میں رکھے ہوئے بتوں کی تنقیص نہیں کی۔

قریش کے منصوبہ سے انکار:

تمام سیرت کی کتب میں یہ واقعہ درج ہے ہجرت مدینہ سے کچھ پہلے مکہ کے دارالندوہ میں قریش مکہ کا اجتماع ہوا جس میں آپ ﷺ کو قتل کرنے کا منصوبہ بنایا گیا۔ لیکن واٹ کہتا ہے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو قتل کر دیئے جانے پر اتفاق نہیں ہوا تھا اور یہ مفروضہ گھڑا کہ اس اجتماعی مشورہ کے بعد محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر سنگ باری ہوئی تھی (محمد آیٹ مکہ ص 237) قتل کرنے کے منصوبہ کے متعلق اتنے مضبوط تاریخی شواہد موجود ہیں۔ ان کی موجودگی میں واٹ کے مفروضہ کی اہمیت ختم ہو جاتی ہے۔ ایک تو ہر مشہور اور متداول سیرت کی کتاب میں قتل کا منصوبہ درج ہے تمام مورخین کا منصوبہ قتل پر متفق ہونا اس بات کی واضح دلیل ہے کہ یہ واقعہ صحیح ہے کہ واقعی آپؐ کے قتل کا منصوبہ بنایا گیا۔ دوم جن لوگوں نے یہ منصوبہ بنایا جو بعد میں دائرہ اسلام میں داخل ہو گئے تھے کسی نے اس واقعہ کی تردید نہیں کی۔

اس قسم کے تاریخی واقعات سے انکار کرنے سے مستشرقین کی ذہنیت ظاہر ہو جاتی ہے۔ ویسے بھی تاریخی اصول کے خلاف ہے۔ جس واقعہ پر تمام مورخین متفق ہوں اس سے انکار، حق کو جھٹلانے کے مترادف ہے اس قسم کے تاریخی واقعات کو کسی مستشرق نے محض تعصب اور جہالت کی وجہ سے انکار کیا ہے تو ان کو اعتراضات کی فہرست میں نہیں لاؤں گا۔ صرف ان اعتراضات پر بحث کی جائے گی جن سے اسلام کی سچائی پر زد پڑتی ہے۔

مستشرقین کی تحقیق کے متعلق یہ بنیادی بات یاد رکھنی چاہیے کہ وہ اپنے مفروضہ کی ظن اور تخیل شاذ اور ضعیف روایات پر بنیاد رکھتے ہیں اور ثقہ روایات پر شک وشبہ کے پردے ڈالتے ہیں۔

☆......☆

مکی تجارتی قافلوں پر حملہ لوٹ مار کے لیے تھا

اعتراض: مکی تجارتی قافلوں سے تعارض مہاجرین کی خوشحالی کے لیے لوٹ مار تھی۔ (جی۔ ای۔ وان گریو نے باؤم "کلاسیکل اسلام" صفحہ 35) گریو نے باؤم رقمطراز ہے۔

"To accomplish his main task and unite a population torn asendur Mohammad needed the hormonious cooporation of Muhajiran with the Medinian halper Ansar. This in turn required the economic independence by raid on Meccan caravans."

اپنے اصل نصب العین کے حصول اور ایک منتشر آبادی کو متحد کرنے کے لیے (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) کو مہاجرین اور انصار کے مابین ایک اہم آہنگ تعاون چاہتے تھے۔ نتیجتاً اس کے لیے مکی (تجارتی) قافلوں پر حملوں کے ذریعے حاصل کردہ دولت (مہاجرین) کی معاشی خودمختاری کی ضرورت تھی۔

جواب: یہ اعتراض تقریباً تمام مستشرقین اور مخالفین اسلام نے مختلف انداز اور مختلف شکلوں میں کیا ہے کہ اسلام لوٹ مار غصب ونہب، قتل وغارت کا مذہب ہے۔ یہ اعتراض اسلام کے تصور جہاد کو غلط سمجھ کر کیا گیا ہے ہر مخالف نے اپنے اپنے انداز میں اعتراض کیا ہے اس کتاب میں مختلف مقامات پر جس رنگ میں اعتراض کیا گیا ہے اس کا جواب دیا گیا ہے خصوصاً اسلام کے تصور جہاد کو قرآن اور حدیث کی روشنی میں اجاگر کیا گیا ہے۔ یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ اسلام کی تمام جنگیں دفاعی تھیں۔ دوم اسلام ہی وہ مذہب ہے۔ جس نے قدیم جنگوں کی مذموم اور بدرسوم کو ختم کیا اور بے جا خون گرانے سے روکا اور انسانیت کی تکریم وتحریم کی تعلیم دی۔

مذکورہ اعتراض میں مہاجرین کی معاشی بحالی کے لیے مکہ کے تجارتی قافلوں پر لوٹ مار کے لیے حملوں کا الزام لگایا گیا ہے یہاں صرف تجارتی قافلوں کی آئینی حیثیت پر بحث کی جائے گی۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کے اندر یکجہتی اور یگانگت پیدا کرنے اور مہاجرین کی بحالی کے لیے مہاجرین اور انصار کے درمیان مواخات پیدا کر دی۔

اس سے یہ مراد نہیں لی جاسکتی مہاجرین انصار کے دست نگر تھے۔ انصار زراعت پیشہ تھے۔ وہ اپنے پیشہ میں رہے اور مہاجرین تجارت پیشہ تھے۔ مدینہ آنے کے بعد اکثر مہاجرین اپنے پیشہ تجارت سے منسلک رہے چنانچہ حضرت ابوبکر، حضرت عمر اور حضرت عثمان کے تجارتی مشاغل کا ذکر متعدد کتب میں ملتا ہے۔ حضرت دحیہ کلبی، حضرت زید بن حارثہ اور حضرت عبدالرحمٰن بن عوف کاروان تجارت لے کر شام جایا کرتے تھے مہاجرین جن کی معیشت کا گریونے باؤم نے تذکرہ کیا ہے تعداد میں کل نوے ہیں ان میں سے بیشتر تجارت کرتے تھے اور کچھ مزدوری کرتے تھے ممکن ہے کچھ قلیل تعداد انصار کی دست نگر ہو لیکن اس قلیل تعداد کے لیے قافلوں پر حملہ کرنا خلاف عقل ہے۔ لہٰذا مہاجرین قافلوں کی لوٹ مار کے محتاج ہی نہ تھے۔ لہٰذا گریونے باؤم کا مفروضہ غلط ہے۔

دوسری دلیل

عرب دستور:

قبل از اسلام عرب کا یہ دستور تھا کہ وہ اپنے تجارتی قافلوں کے لیے علاقے سے حفاظت طلب کرتے جس کے لیے مناسب معاوضہ دیا جاتا تھا۔ (واٹ محمد ایٹ مکہ صفحہ 2,1)

ہر علاقے کا قبیلہ خودمختار تھا جو اپنے حلیفوں کو اپنے علاقے سے تجارتی کاروانوں کو بحفاظت گزر جانے کی اجازت دیتا تھا۔ علاقہ کے قبیلہ سے اجازت عرب کے حکمرانوں کو بھی لینی پڑتی تھی۔ چنانچہ حیرہ کے عرب حکمران نعمان بن منذر نے سوق عکاظ میں اپنا تجارتی کارواں بھیجنا چاہا تو بنی کنانہ اور بنی قیس سے مدد چاہی کہ تم میں سے ایسا کون سا بہادر ہے جو بہادری کے ساتھ میرے کارواں کو عکاظ تک لے جائے اور اس کی حفاظت کا ذمہ دار ہو۔ میں اس کی خدمت کا معاوضہ ادا کروں گا۔ (سیرۃ ابن ہشام اردو) قبیلہ کنانہ کے ایک شخص براض نے یہ ذمہ داری قبول کرنے کی خواہش کا اظہار کیا اس کے مقابلے میں ایک دوسرا شخص عروہ کھڑا ہو گیا اس نے نہ صرف بنی کنانہ بلکہ پورے عرب کے علاقے سے قافلے کو بحفاظت لے جانے کی ذمہ داری قبول کی۔ عروہ بنی قیس سے تعلق رکھتا تھا نعمان نے عروہ کی پیش کش منظور کر کے قافلہ اس کی نگرانی میں روانہ کر دیا بنی کنانہ نے عروہ کو قتل کر کے تجارتی قافلہ پر قبضہ کر لیا اس کے نتیجہ میں جنگ فجار چھڑ گئی یہ واقعہ بعثت نبوی سے بیس تیس سال پہلے کا ہے اس واقعے سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ ہر علاقے پر قبیلہ کا اقتدار مسلّم تھا۔ کسی قبیلے کے علاقے سے دوسرے قبیلہ کا تجارتی قافلہ بغیر اجازت نہیں گزر سکتا تھا۔ دوم اس اجازت کے عوض معاوضہ ادا کرنا پڑتا تھا گویا تجارتی قافلوں کو دوسرے قبائل کے علاقوں سے گزرنے کی راہ داری لینی ضروری تھی۔

مدنی ریاست:

ہجرت کے بعد جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ پہنچے تو ان کو مدنی ریاست کا حاکم اعلیٰ تسلیم کر لیا گیا تھا۔ مدنی ریاست کی حدود دور تک پھیل گئی تھیں۔ یہاں تک کہ شام کی طرف جانے والے تجارتی قافلوں کی گزرگاہ بھی مدنی ریاست میں شامل تھی۔ مکی تجارتی قافلوں کے لیے عرب دستور کے مطابق دوم آج کل کے بین الاقوامی قانون کی رو سے یہ ضروری تھا کہ وہ مدنی ریاست سے راہ داری حاصل کرتا۔ اہل مکہ تجارتی قافلوں کے لیے اجازت لینا تو کجا وہ مدنی ریاست کو تباہ کرنے کے منصوبے بنا رہے تھے اور مدینہ پر حملے شروع کر دیئے تھے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ملکی معلومات حاصل کرنے کے لیے سرایا اور طلایا مختلف سمتوں میں بھیجنے شروع کر دیئے تھے اور کوئی سمگلر یا غیر قانونی تجارتی قافلہ مدنی ریاست سے گزرنا نہ پائے۔ ریاستی رٹ قائم کرنا ہر ریاست کا کام ہے۔ لہٰذا ملکی تجارتی قافلوں کا مدنی ریاست سے گزرنا کسی طرح بھی جائز نہ تھا۔ سرایا اور طلایا یا فوجی دستے تجارتی قافلوں پر لوٹ مار کے لیے حملہ نہیں کرتے تھے بلکہ ریاستی رٹ قائم کرنے کے لیے مزاحمت کرتے تھے۔ مکی تجارت قافلوں کو کوئی قانونی حق حاصل نہیں تھا کہ وہ مدنی ریاست سے بغیر اجازت گزریں۔ اگر وہ گزریں گے تو اس دور کے عرب کے دستور اور اس دور کے بین الاقوامی قانون کی خلاف ورزی ہے۔ لہٰذا فوجی دستے مکہ کے تجارتی قافلوں پر لوٹ مار کے لیے حملہ نہیں کرتے تھے۔ بلکہ اپنی گزرگاہوں کی حفاظت کرتے تھے کہ کوئی ناجائز ان گزرگاہوں سے نہ گزرے۔ رومن امپائر میں مال تجارت کی درآمد اور برآمد پر محصول وصول کیا جاتا تھا۔ محصول کی ادائیگی اور حصول اجازت کے بغیر کسی ملک کی گزرگاہ سے گزرنا غیر قانونی تھا مکی تجارتی قافلوں کا گزرنا تو اس لحاظ سے بھی غیر آئینی تھا کہ مکہ اور مدنی ریاست کے درمیان جنگیں جاری تھیں کوئی ملک بھی متحارب ملک کو اپنی سرحدوں کے اندر سے گزرنے کی اجازت نہیں دے سکتا۔ پھر یہ کیوں کر ممکن ہے مدنی ریاست مکہ کے

تجارتی قافلوں کو گزرنے کی اجازت دیتا۔ تجارتی قافلوں کی روک قانونی تھی۔ اس کو لوٹ مار کا نام نہیں دیا جا سکتا۔

☆......☆

محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) موقع پرست انسان تھا (نعوذ باللہ)

اعتراض: رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم موقع پرست تھے ویبر (Weber) نے لکھا ہے۔

"Mohammad was an apportunist and that the Original adherents to Islam were motivated solely in terms of prospects of booty and conquest. (Quoted by Bry an s. tuner; weber and Islam P23)

محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) (نعوذ باللہ) ایک موقع پرست انسان تھے اور اسلام کے ابتدائی ماننے والے صرف اور صرف لوٹ مار اور فتوحات کے لالچ میں ان کے ساتھ شامل ہوتے تھے۔

جواب: یہ اعتراض بھی اسی اعتراض کی ایک دوسری شکل ہے کہ اسلام لوٹ مار اور قتل و غارت کا مذہب ہے جو جہاد کے غلط تصور سے استنباط کیا گیا ہے چونکہ اس اعتراض کی شکل دوسری ہے گو روح وہی اس کا جواب اسی شکل کو مدنظر رکھ کر دیا جاتا ہے۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کو تین حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

(۱) نبوت سے قبل کی چالیس سالہ زندگی۔ (۲) بعثت کے بعد کی مکی زندگی۔ (۳) ہجرت کے بعد مدنی زندگی۔ اگر تینوں ادوار کا جائزہ لیا جائے تو اعتراض کا بودا پن خود واضح ہو جاتا ہے۔ بعثت سے قبل کی چالیس سالہ زندگی ہر عیب سے پاک نظر آتی ہے۔ اعلیٰ اخلاق کا حامل ہونے کی وجہ سے اپنی قوم سے امین اور صادق کا لقب پایا۔ اگر قوم میں اختلاف پیدا ہو جائے تو آپ ﷺ کی ثالثی کو پسند کرتے ہیں۔ غریبوں کے ہمدرد، مہمان نواز، غم گسار، مقروضوں کا بوجھ اٹھانے والے۔ انسانوں سے محبت کرنے والے تھے۔ جب حضرت خدیجہ سے شادی ہوگئی۔ بیوی کی دولت کی وجہ سے فارغ البال ہوگئے۔ تو عیش و آرام کی زندگی کی طرف مائل نہیں ہوئے بلکہ خدا کی عبادت کے لیے غار حرا میں گوشہ نشین ہوگئے۔ اگر آپ ﷺ دنیا دار ہوتے تو بیوی کے مال سے خوب دنیاوی لطف اٹھاتے لیکن سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر غار حرا کو اپنا مسکن بنا لیا۔ دنیاوی لذائذ سے منہ موڑ کر صرف خدا کی عبادت کے لیے غار حرا کو اپنا گھر بنا لینا ہی ظاہر کرتا ہے کہ آپ موقعہ پرست نہ تھے کیا کسی موقعہ پرست کی کوئی مثال ہے کہ جب دولت اس کے گھر کی لونڈی ہو جائے۔ تو وہ اس سے منہ موڑ کر عبادت الٰہی میں منہمک ہو جائے۔

دوسرا دور:

یہ دور خلعت نبوت ملنے کے بعد شروع ہوتا ہے۔ اس دور میں ایک موقعہ وہ بھی آتا ہے جب کفار مکہ کا ایک وفد ابو طالب کے پاس جاتا ہے۔ آپ کو اپنا قائد تسلیم کرنے کو تیار ہو جاتا ہے۔ مال و دولت دینے اور حسین ترین عورت سے شادی کی ترغیب دیتے ہیں لیکن آپ نے انکار کر دیا اور خدا کا پیغام لوگوں تک پہنچانے پر مصر رہے۔ اگر آپ موقعہ پرست انسان ہوتے تو اہل عرب کی قیادت اور دولت کو قبول کر لیتے اور خوش حالی کی زندگی بسر کرتے لیکن آپ نے قیادت اور دولت قبول کرنے کی بجائے کفار کی ایذاؤں اور مصائب کا سامنا

کرنے کو ترجیح دی۔ قیادت اور دولت کو چھوڑ کر اپنے پیغام حق کی خاطر ایذاؤں اور مصائب کو ترجیح دینا کسی موقعہ پرست کا کام نہیں۔

معترض نے یہ اعتراض بھی اٹھایا ہے کہ سابقون الاولون محض مال غنیمت کے طمع اور لالچ پر دائرہ اسلام میں داخل ہوئے تھے۔ سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ پہلے ایمان لانے والوں کو مصائب کی اندھیری رات میں یہ کیوں کر خیال پیدا ہوسکتا تھا کہ ایک دن ان کا مرشد بادشاہ بنے گا۔ فتوحات کرے گا پھر ان کو مال غنیمت ملے گا۔ سابقون الاولون تو کفار کے مصائب کا تختہ مشق بنے ہوئے ہیں۔ جن جن ایذاؤں سے بے بس مظلوم صحابہ گزر رہے تھے ان کو پڑھ کر انسان کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں خباب بن ارت کو دہکتے ہوئے انگاروں پر لٹایا گیا حضرت بلال حبشی کو تپتی ہوئی ریت پر چت لٹا کر ایک شخص ان کی چھاتی پر چڑھ جاتا تھا تاکہ کروٹ نہ لے سکیں اس وقت ان کی زبان سے احدٌ احدٌ کے الفاظ نکلتے تھے۔ اس طرح عمار کو تپتی ہوئی ریت پر لٹا دیا جاتا ساتھ سخت ایذائیں دی جاتیں تو وہ بے ہوش ہو جاتے تھے۔ حضرت سمیہ حضرت عمار کی والدہ ماجدہ کو ابوجہل نے شہید کر دیا جب صہیب رومی دائرہ اسلام میں داخل ہوئے تو قریش ان کو اس قدر ایذائیں دیتے تو ان کے حواس مختل ہو جاتے تھے۔ یہی حال حضرت ابوفکیہہ کا تھا۔ یہ لوگ غربا اور غلاموں میں شمار ہوتے ہیں جو امراء اور صاحب حیثیت لوگ تھے مثلاً حضرت ابوبکر حضرت عثمان حضرت طلحہ وغیرہ یہ لوگ بھی ایذاؤں سے بچ نہ سکے۔ کفار کی ایذاؤں سے بچنے کے لیے مسلمانوں کو حبشہ ہجرت کرنی پڑی وہاں بھی کفار نے پیچھا کیا۔ حتیٰ کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو قتل کرنے کا منصوبہ بنایا گیا تو آپ ﷺ ہجرت کر گئے۔ کیا مکی زندگی میں آپؐ نے اپنے پیروکاروں کو کبھی یہ طمع دیا تھا کہ ان کو مان لو۔ اس کے بدلے میں ان کو دنیاوی فوائد حاصل ہوں گے۔ دنیاوی فوائد کے حصول کے لیے ایمان لانے والے کبھی بھی اس قسم کے مصائب اور ایذاؤں کو برداشت نہیں کر سکتے۔ الغرض نہ کبھی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایمان لانے کے لیے کسی کو دنیاوی نفع کا لالچ دیا۔ نہ کسی صحابی نے دنیاوی فائدہ کے حصول کے لیے اسلام قبول کیا۔ رسول کریم صلعم کا پیغام یہ تھا کہ ایک خدا کو مانو اور نیک اعمال بجا لا کر اس کی رضا حاصل کرو اور صحابہ محض حصول رضا الٰہی کے لیے رسول کریم صلعم پر ایمان لائے۔

تیسرا دور:

ہجرت کے بعد تیسرا دور مدنی زندگی شروع ہوتا ہے جب آپ ﷺ مدینہ پہنچے تو آپ ﷺ کو حاکم اعلیٰ منتخب کر لیا گیا اب آپ ﷺ ایک چھوٹی سی سلطنت کے حاکم اعلیٰ بن گئے۔ تاریخ بتاتی ہے کہ کفار مکہ نے ہجرت کرنے کے بعد بھی تباہ و برباد کرنے کا ارادہ کر لیا۔ تاریخوں میں وہ دھمکی آمیز خط جو عبداللہ بن ابی سلول کے نام کفار مکہ نے بھیجا تھا موجود ہے۔ کہ محمد اور اس کے ساتھیوں کو مدینہ سے نکال دو۔ ورنہ ہم تمہیں تباہ و برباد کر دیں گے۔ پھر مختلف طریقوں سے چھیڑ چھاڑ شروع کر دی۔ پھر حملوں کا آغاز کر دیا۔ باقاعدہ جنگوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم ایک ریاست کے حاکم اعلیٰ تھے ان پر ملکی سرحدوں اور عوام کے مال و جان کی حفاظت لازم ہو گئی تھی۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تمام جنگیں دفاعی تھیں۔ کہیں بھی حصول مال غنیمت کے لیے چڑھائی نہیں کی۔ رہا معاملہ یہود کا وہ مدنی ریاست کے باشندے تھے۔ میثاق مدینہ کی رو سے بھی مدنی ریاست کی سرحدوں کی حفاظت تمام فریق پر تھی لیکن یہود نے ہر لڑائی کے موقع پر غداری کی۔ ان کی غداری کی وجہ سے مدینہ سے جلاوطن کر دیا گیا۔ اس پر الگ بحث ہوگی۔ مدنی زندگی میں بھی باوجود ریاست کا حاکم اعلیٰ ہونے کے فقیرانہ زندگی بسر کی عیش و تنعم کا نام و نشان نہیں کئی کئی دن ازواج کے گھروں میں چولہا روشن نہیں ہوتا تھا۔ صرف کھجور اور پانی پر گزارہ کر لیا جاتا تھا۔ پیوند لگے ہوئے کپڑے پہنے جاتے ہیں اس قسم کا گزران اور طریقہ رہائش کسی موقعہ پرست کا نہیں ہوسکتا۔ کیا تاریخ میں کوئی ایسا موقع پرست ملتا ہے جس نے بے بسی کی اتھاہ گہرائیوں میں زندگی شروع کی پھر کامیاب ترین شخص کی حیثیت سے اس دنیا

سے گیا ہو، تاریخ بتاتی ہے کہ موقع پرست انسان کبھی بھی کامیاب زندگی حاصل نہیں کرسکتا اور نہ عروج حاصل کرسکتا ہے نہ کوئی دوسرا شخص موقع پرست کا ساتھ دیتا ہے۔ یہ تمام حقائق ظاہر کرتے ہیں کہ آپ ﷺ سچے مخلص اور ایمان دار شخص تھے جبکہ آپ ﷺ کے صحابہ نے کسی لالچ اور طمع کی وجہ سے آپ کو قبول نہیں کیا بلکہ رضا الٰہی کے حصول کے لیے آپ پر ایمان لائے۔ آپ کے تینوں ادوار کا بنظر عمیق جائزہ لیا جائے تو کہیں بھی موقعہ پرستی کا شائبہ نظر نہیں آتا۔

☆......☆

مسلمان نکلتے وقت یہ تصور بھی نہ کرتے ہوں گے کہ جنگ درپیش ہے (جنگ بدر کے متعلق)

اعتراض: مسلمان نکلتے وقت یہ تصور بھی نہ کرتے ہوں گے کہ جنگ درپیش ہے اگر انہیں معلوم ہوتا تو شاید حیلوں بہانوں سے اس جنگ کو ٹال جاتے جب انہیں قریش کی آمد کا علم ہوا تو وہ اس قدر قریب تھے کہ بھاگنے کی گنجائش بھی نہ تھی۔ (منٹگمری واٹ۔ محمد ایٹ مدینہ ص 12)

جواب: متعصب مستشرقین کی یہ عادت ہے کہ وہ تاریخ اسلام کے کسی اہم واقعہ کی اہمیت کو کم کرنے کی کوشش کرتے ہیں بدر جنگ میں مسلمانوں نے جس جان فشانی اور بہادری کا ثبوت دیا اور جس کے نتیجہ میں مسلمانوں کو فتح مبین حاصل ہو۔ اس کی اس اہمیت کو کم کرنے کے لیے واٹ یہ لکھتا ہے کہ اگر انہیں معلوم ہوتا تو شاید حیلوں بہانوں سے اس جنگ کو ٹال جاتے۔ واٹ کے یہ الفاظ حقائق کے منافی ہیں۔ مسلمان جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی قیادت میں مدینہ سے باہر نکلے تو وہ خوب جانتے تھے کہ قریش سے جنگ کرنے جارہے ہیں۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے میدان جنگ کی طرف نکلنے سے پہلے صحابہ سے مشاورت کی۔ اس مشاورت سے واضح ہوجاتا ہے کہ صحابہ کو یقینی علم تھا کہ جنگ ان کے درپیش ہے۔

مشاورت کی روئیداد:

جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو قریش کے لشکر کشی کا علم ہوا تو آپ ﷺ نے تمام صحابہ کو مشورہ کے لیے جمع کیا۔ سب سے پہلے حضرت ابوبکر اور حضرت عمر نے اپنی رائے پیش کی۔ ان کے بعد حضرت مقداد اٹھے اور جانثاری کا اظہار ان الفاظ میں کیا۔

''یارسول اللہ ﷺ احکام خداوندی کی تعمیل فرمایئے ہماری طرف سے دل میں خدشہ نہ لایئے ہم موسیٰ کی قوم کی طرح یہ نہیں کہیں گے کہ آپ اور آپ کا خدا جا کر لڑیں ہم لوگ آپ ﷺ کے دائیں سے بائیں سے سامنے سے اور پیچھے سے لڑیں گے ان کی اس جان نثارانہ تقریر سے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا چہرہ مبارک چمک اٹھا۔

اب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان لوگوں کی طرف اشارہ کیا۔ جنہوں نے بیعت عقبہ کبریٰ کے موقع پر وعدہ کیا تھا۔ کہ اگر کوئی دشمن مدینہ پر حملہ آور ہوا تو وہ دشمن کا مقابلہ کریں گے۔ لیکن مدینہ سے باہر جا کر مقابلہ کرنے کا عہد نہیں کیا تھا جب انصار کو محسوس ہوا کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا اشارہ ان کی طرف ہے تو حضرت سعد بن معاذ نے عرض کی انلك تريدنا يا رسول الله کیا آپ کا یہ

اشارہ ہماری طرف ہے تب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ہاں...... میرا اشارہ تمہاری طرف ہے۔

سعد بن معاذ کا اظہار وفاداری:

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے جواب میں حضرت سعد نے کہا'' ہم آپ کی رسالت پر ایمان لے آئے ہیں ہم نے آپ ﷺ کی تصدیق کی ہم نے قرآن مجید کی توثیق کی۔ آپ ﷺ کی اطاعت کاملہ پر پختہ عہد کیا۔ آپ ﷺ احکام خداوندی کی تسلیم میں ہماری طرف سے ذرا بھی دل میں خدشہ نہ لائیے اس خدا کی قسم جس نے آپ کو رسول بنا کر مبعوث کیا ہے اگر آپ سمندر میں قدم رکھیں گے تو ہم بلا خوف وخطر اس میں کود پڑیں گے ہم میں سے کوئی فرد پیچھے نہ رہے گا۔ نہ ہم دشمن کا مقابلہ کرنے میں تامل کریں گے۔ ہم میدان حرب میں صابر اور لڑائی میں ثابت قدم ہیں امید ہے کہ ہماری وجہ سے اللہ تعالیٰ آپ کے دل کو ٹھنڈا رکھے۔ بہتر یہ ہے آپ دشمن کو گھیرے کے لیے جلدی کوچ فرمایئے۔ (حیات محمد ص 335)

حضرت سعد کی تقریر سن کر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے چہرہ مبارک پر خوشی کے آثار نمودار ہو گئے۔

سِيْرُوْا وَابْشِرُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ وَ عَدَنِيْ اِحْدَى الطَّآئِفَتَيْنِ

اب کوچ کرو خدا کی طرف سے یہ بشارت سنو کہ اللہ نے دشمن کے دو گروہوں میں سے ایک پر نصرت کا وعدہ کیا ہے۔

پھر فرمایا:

وَاللّٰهِ كَاَنِّيْ اَنْظُرُ اِلٰى مَصَارِعِ الْقَوْمِ

خدا کی قسم مکہ والوں میں سے ایک ایک کا مقتل میری آنکھوں کے سامنے ہے۔

میدان جنگ کی طرف نکلنے سے پہلے یہ مشاورت تھی۔ جس سے واضح ہوتا ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کفار سے دفاعی جنگ لڑنے کا مشورہ لے رہے ہیں اور صحابہ کفار سے جان نثاری سے لڑنے کا وعدہ کر رہے ہیں۔ صحابہ کو معلوم تھا کہ وہ کفار سے لڑنے کے لیے جا رہے ہیں۔ لہٰذا واٹ کا مفروضہ بالکل غلط ہے کہ انہیں معلوم ہوتا تو شاید حیلوں بہانوں سے اس جنگ کو ٹال جاتے۔ جب انہیں قریش کی آمد کا علم ہوا تو وہ اس قدر قریب تھے کہ بھاگنے کی گنجائش بھی نہ تھی۔ واٹ کی اپنی ذہنی اختراع ہے کہ مسلمانوں کو مجبوراً جنگ لڑنی پڑی۔ مشاورت میں صحابہ اپنی وفاداری اور جانیں قربان کرنے کا اظہار کر رہے ہیں۔ دوم رسول کریم صلعم اپنی فتح کی خوشخبری دے رہے ہیں اور کفار کے روساء کے قتل گاہوں کی نشان دہی کر رہے ہیں لیکن واٹ اپنی ذہنی اختراع سے یہ بیان کر رہے ہیں کہ مسلمانوں کو مجبوراً لڑائی لڑنی پڑی۔ کیونکہ وہ گھیرے میں آ چکے تھے اب وہ بھاگ نہیں سکتے تھے۔ یہ مفروضہ بالکل باطل حقائق کے منافی ہے۔

دوم:

واٹ نے آگے چل کر خود ہی اپنے مفروضہ کا ردان الفاظ میں کر دیا'' محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے پانی پر قبضہ کر کے دشمن کو مجبور کر دیا کہ وہ ان کی مرضی کے مطابق جنگ لڑے قریش پر چھاپہ نہیں مارا گیا۔ انہیں اس موقف میں رکھا گیا کہ وہ جنگ کرنے پر مجبور ہوں۔ (صفحہ 12)

جب مسلمان قریش کے نرغے میں پھنسے ہوئے تھے۔ مسلمان مجبوری کی حالت میں لڑ رہے تھے۔ ان کو راہ فرار نہیں ملی۔ وہ کفار کو پانی پر قبضہ کر کے لڑائی کے لیے کیسے مجبور کر سکتے تھے۔ کہ وہ ان کی مرضی کے مطابق جنگ کریں۔ حقیقت یہ ہے کہ مسلمان نہ تو نرغے میں آئے ہوئے تھے نہ یہ حقیقت ہے کہ وہ راہ فرار چاہتے تھے نہ یہ حقیقت ہے کہ مسلمان لڑائی لڑنے پر مجبور تھے یہ سب باتیں حقائق کے منافی ہیں۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک سوچی سمجھی سکیم کے تحت پانی پر قبضہ کیا۔ یہی عسکری حکمت تھی پھر میدان جنگ میں ایسے حصہ پر پڑاؤ ڈالا۔ جو فوجی نقل و حرکت کے لحاظ سے بہتر تھا۔ یہ عسکری داؤ پیچ اس وقت ہوتے ہیں۔ جب فوج لڑائی کا ارادہ رکھتی ہو۔ رسول کریم صلعم کا پانی پر قبضہ کر لینا اور عسکری لحاظ سے بہتر جگہ پر فوجی پڑاؤ قائم کرنا۔ یہ ظاہر کرتا ہے کہ رسول کریم صلعم کفار مکہ سے لڑنے کے لیے آئے تھے۔

☆......☆

جنگ احد میں مسلمانوں کو عبرت ناک شکست ہوئی

اعتراض : جنگ احد کے بارے میں مستشرقین اور مخالفین کا انداز فکر یہ ہے کہ اس جنگ میں مسلمانوں کو عبرت ناک شکست سے دو چار ہونا پڑا یہ کہ اس شکست سے مسلمانوں کا عقیدہ متزلزل ہو گیا تھا۔ جب اللہ نے فتح کا وعدہ کر لیا تھا تو یہ شکست کیوں ہوئی؟

جواب : یہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم یا اسلام یا قرآن پر کوئی اعتراض نہیں کہ آیا جنگ احد میں مسلمانوں کو شکست ہوئی یا فتح صرف اس لڑائی میں مسلمانوں کی شکست قرار دینا محض غلط فہمی اور نا سمجھی ہے آیئے تجزیہ کریں کہ آیا جنگ احد میں مسلمانوں کو شکست ہوئی تھی یا فتح۔

قریش کی مخالفت کی وجوہ:

قریش مکہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ ﷺ کی تحریک کو بالکل مٹا دینا چاہتے تھے۔ جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم مکہ میں تھے تو بھی شمع رسالت کو بجھانے کی پوری کوشش کی گئی لیکن نا کام رہے جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہجرت کر کے مدینہ میں آ گئے تو اسی عزم کے ساتھ مدینہ پر حملے کرنے شروع کر دیئے۔ پہلا حملہ جنگ بدر کے نام سے مشہور ہے۔ کفار کو عبرت ناک شکست ہوئی۔ دوسرا حملہ جنگ احد ہے جب لڑائی کا آغاز ہوا تو مسلمانوں کے حملہ سے کفار کے پاؤں اکھڑ گئے لیکن اپنی غلطی سے پچاس تیر اندازوں نے درہ کو چھوڑ دیا تو کفار نے موقع پا کر عقب سے مسلمانوں پر حملہ کر دیا۔ مسلمان افراتفری میں سنبھل نہ سکے۔ مسلمانوں کے ستر آدمی شہید ہوئے اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم بھی زخمی ہوئے۔ جب مسلمانوں کی منتشر فوج اکٹھی ہوئی اور ایک ضابطہ میں آ گئی۔ تو میدان جنگ پر قبضہ کر لیا۔ اور قریش مکہ نے میدان جنگ چھوڑ کر جانے میں عافیت محسوس کی۔ کسی فوج کی کامیابی اس وقت سمجھی جاتی ہے جب وہ فوج اپنے مقصد میں کامیاب ہو کیا کفار کی فوج نے تحریک اسلام کو نقصان پہنچایا؟ یا مدینہ پر غلبہ حاصل کر لیا یا تجارت کی شاہراہ اپنے لیے محفوظ کر لی؟ صرف مخالف فوج کے زیادہ جنگجوؤں کو مارنا کامیابی نہیں کہلاتی۔ گو اس جنگ میں مسلمانوں کی شہادتیں زیادہ ہوئیں۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ مسلمانوں کو شکست ہو گئی تھی۔ جب مسلمانوں کی منتشر فوج اکٹھی ہوئی تو قریش مکہ نے میدان جنگ کو چھوڑ کر راہ فرار اختیار کر لی اور مسلمان فوج نے حمراء الاسد تک قریش فوج کا تعاقب کیا۔ کیا شکست خوردہ فوج نے بھی فاتح قوم کا تعاقب کیا ہے۔

پس مخالفین کا محض جنگجوؤں کا زیادہ مارا جانے کی وجہ سے مسلمانوں کو شکست خوردہ قرار دینا محض غلط فہمی ہے۔ اس لڑائی میں مسلمان ہی فاتح تھے جنہوں نے قریشی فوج کا دور فاصلہ تک تعاقب بھی کیا پھر رات تک میدان جنگ میں ٹھہرے رہے اپنے خیموں میں آگ جلائی۔ تا کہ دشمن کو علم ہو جائے کہ مسلمان میدان جنگ پر قابض ہیں اپنے شہداء کی تجہیز تکفین کی سارے کام انجام دے کر واپس مدینہ ہوئے۔

☆......☆

بنوقینقاع بنونضیر کی جلاوطنی اور بنوقریظہ کے جنگ جوؤں کا قتل

بنوقینقاع اور بنونضیر کی مدینہ سے جلاوطنی خصوصاً بنوقریظہ کے جنگجوؤں کا قتل مستشرقین کا ہدف تنقید ہے۔

اعتراض: تقریباً تمام مستشرقین اور مخالفین نے بنوقینقاع اور بنونضیر کی جلاوطنی اور بنوقریظہ کے جنگجوؤں کا قتل ہدف تنقید بنایا ہے۔

جواب: اسلام پر دیگر اہم اعتراضات میں سے ایک یہ بھی اعتراض ہے۔ بعض مسلمان محققین نے بنوقریظہ کے واقعہ کا بالکل انکار کر دیا ہے مثلاً ڈبلیو۔این عرفات نے اپنے آرٹیکل

"New Light on the story of Banu Qurayza and the Jews of Madina" Journal of the Royal Asiatic Society of Great Britain and Ireland 1976,100-1207)

تینوں یہودی قبائل کی جلاوطنی۔ دوم بنوقریظہ کے جنگجوؤں کا قتل ایک تاریخی حقیقت ہے۔ دیکھنا صرف یہ ہے یہودی قبائل کی جلاوطنی خصوصاً بنوقریظہ کے جنگجوؤں کا قتل کن عوامل کی وجہ سے ہوا ہے۔ آیا ان کا اخراج ملکی آئین کے مطابق تھا یا نہیں۔ جن عوامل اور وجوہ کی وجہ سے اخراج کی سزا ہوئی ہے۔ وہ تاریخ کی روشنی میں صحیح ہے یا نہیں۔ یہاں ان عوامل اور وجوہ کو بیان کیا جائے گا جن کی وجہ سے یہود کو مدینہ سے نکالا گیا اور بنوقریظہ کے نوجوانوں کو قتل کیا گیا۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب مدنی ریاست کے حاکم اعلیٰ مقرر کیے گئے تو آپ ﷺ نے ریاست میں امن قائم رکھنے اور ملکی معاملات ایک آئین کے مطابق سرانجام دینے کے لیے میثاق مدینہ جاری کیا۔ جس میں یہود قبائل بھی شامل تھے۔ اس آئینی دستاویز کی رو سے تمام باشندگان ریاست کی جان مال اور عزت محفوظ ہر قسم کی مذہبی آزادی۔ تمام فریق پر مدنی ریاست کی سرحدوں کی مشترکہ دفاع لازم ہو گیا۔ اور مدنی ریاست کے دشمنوں سے دوستی نہیں رکھیں گے۔ کوئی شخص کسی مجرم کی حمایت نہ کرے گا وہ کیسا ہی قریب وعزیز ہو۔ ساکنان مدنی ریاست میں جو تنازعات ہوں گے ان کا تصفیہ رسول اللہ کریں گے۔

تاریخ اس بات پر شاہد ہے کہ یہود نے ملکی آئین (میثاق مدینہ) کو توڑا اور خلاف ورزیاں کیں ان خلاف ورزیوں کا جائزہ لیا جا رہا ہے۔

بنوقینقاع کا اخراج:

سب سے پہلے بنوقینقاع نے عہد شکنی کی ابن ہشام وطبری نے ابن اسحاق کی روایت سے عاصم بن قتادہ انصاری کی روایت نقل کی ہے کہ بنوقینقاع پہلے یہود تھے جنہوں نے اس معاہدہ کو جو ان میں اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم میں تھا توڑا تھا بدر اور احد کے درمیانی زمانہ میں ان سے لڑائی ہوئی۔ واقعہ یہ ہے کہ انصار کی ایک نقاب پوش عورت بنوقینقاع کے محلہ میں گئی ایک بدخصلت یہود نے اپنی ہوس دید بجھانے کے لیے اس عورت کو بے نقاب کر دیا۔ اور مسلمان عورت نے واویلا کیا ایک مسلمان یہ دیکھ کر آگے بڑھا اور یہودی کو قتل کر دیا۔ دوسرے یہودیوں نے اس مسلمان کو شہید کر دیا۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو جب یہ خبر پہنچی تو آپ ﷺ ان کے پاس تشریف لے گئے اور فرمایا "اگر تم لوگوں نے مسلمانوں کی ایذا رسانی سے ہاتھ نہ روکا اور صلح کے معاہدہ پر عمل نہ کیا تو تمہارے ساتھ وہی سلوک ہو گا جو قریش کے

ساتھ ہوا۔"

وہ بولے اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) آپ دھوکے میں نہ رہیں تم نے ایسی قوم سے مقابلہ کیا تھا۔ جو فن حرب سے نا آشنا تھی بخدا اگر ہمارے ساتھ سابقہ پڑا تو ہم دکھلا دیں گے کہ لڑائی اس کا نام ہے۔

یہ بنو قینقاع کی طرف سے کھلم کھلا اعلان جنگ تھا۔ اس اعلان جنگ اور نقض عہد کی وجہ سے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم 20 ماہ شوال 2 ھ میں صحابہ کو لے کر بنو قینقاع کے قلعوں کی طرف بڑھے۔ اور محاصرہ کر لیا۔ یہودی پندرہ دن کے سخت محاصرہ کے بعد اس پر راضی ہوئے کہ جو فیصلہ رسول کریم صلعم کریں وہ منظور ہے۔ آپ ﷺ نے پہلے سخت سزا تجویز فرمائی مگر آپ ﷺ کا جبلی رحم ان کے سزا دینے پر غالب آ گیا اور عبداللہ بن ابی نے بھی سفارش کی اس لیے وہ مدینہ سے جلاوطن کر دیئے گئے اور وہ لوگ ذراعات بستی میں جو شام کے علاقے میں ہے آباد ہو گئے۔

بنو نضیر کی جلاوطنی:

کعب بن اشرف بنو نضیر کا سردار تھا۔ وہ بڑا شعلہ نوا شاعر تھا۔ میثاق مدینہ کے برخلاف غزوہ بدر کے بعد قریش مکہ کے پاس پہنچا اور ان کو مقتولان بدر کے نام پر بہت طیش دلایا اور وعدہ کیا کہ ہم تمہاری مدد کریں گے تم مدینہ پر حملہ کرو۔ اور اپنی سحر انگیز تقریر سے قریش کو انتقام پر آمادہ کیا آخر قریش کعب بن اشرف کی تقریروں سے متاثر ہو کر مدینہ پر حملہ آور ہوئے۔ مدینہ سے تین میل کے فاصلہ پر جبل احد کے پاس لڑائی ہوئی کعب بن اشرف اپنی اس قسم باغیانہ روش کی وجہ سے مارا گیا۔ بنو نضیر کے دلوں میں اس کے قتل کا بہت رنج تھا۔ مزید براں یہ ہوا کہ ابو براء نام عامری رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اس نے آپؐ سے کہا کہ اس کے ساتھ چند لوگوں کو بھیجا جائے وہ نجد میں جا کر میری قوم کو اسلام کی دعوت دیں۔ آپؐ نے ستر قاری اس کے ہمراہ بھیج دیئے منذر بن عمروان کا قائد تھا جب وہ اپنے ملک میں پہنچا تو صحابہ کرام نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا خط عامر عامری اہل نجد کے رئیس کے پاس پہنچایا۔ یہ عامر ابو براء کا بھتیجا تھا۔ اس نے سفیر کو قتل کر دیا اور عصیہ اور رعل قبیلوں کی مدد سے تمام قاریوں کو شہید کر دیا۔ صرف دو آدمی بچ گئے ایک زخمی تھا اور دوسرا قید کیا گیا۔ قیدی کا نام عمرو بن امیہ تھا۔ وہ مضری قوم سے تھا۔ اس کو عامر بن طفیل نے اپنی ماں کے کسی کفارے میں آزاد کر دیا وہ قیدی عمرو بن امیہ آزاد ہو کر مدینہ آ رہا تھا راستہ میں دو عامری مل گئے۔ یہ دونوں عامری اگرچہ اس قوم سے تعلق رکھتے تھے جنہوں نے غداری سے ستر آدمیوں کو مع ایلچی شہید کیا تھا۔ لیکن یہ دونوں عامری بخلاف اپنی قوم کے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہم عہد تھے اور عمرو اس عہد سے ناواقف تھا عمرو نے موقعہ پر ان دونوں کو قتل کر دیا جب یہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو علم ہوا تو آپؐ نے یہ فیصلہ کیا کہ ان دونوں مقتولوں کا خون بہا دیا جائے۔ میثاق مدینہ کی رو سے یہودیوں کو بھی اس خون بہا کے چندے میں شریک ہونا ضروری تھا۔ آپؐ یہودی کے پاس تشریف لے گئے دونوں مقتولین کے وارث بنو نضیر کے دوست تھے اور انہیں کو خون بہا کی رقم دی جانی تھی۔ رسول کریم ﷺ کو بنو نضیر کی شرکت کا پورا یقین تھا۔ جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم بنو نضیر کے محلے میں تشریف لے گئے تو انہوں نے خون بہا میں شریک ہونے انکار کر دیا اس وقت ایک منصوبہ بنایا ایک یہودی عمرو بن حجاش کو کوٹھے پر چڑھا دیا تا کہ اوپر سے پتھر لڑھکا کر آپ کو ہلاک کر دے زرقانی نے لکھا ہے کہ ایک یہودیہ عورت نے اپنے مسلمان بھائی کے ذریعے آپ ﷺ کو یہود کے منصوبہ کی اطلاع دے دی۔ اس لیے بنو نضیر کا محاصرہ کیا گیا۔ آخر چھ دن کے بعد انہوں نے صلح چاہی۔ مگر عبداللہ بن ابی منافق نے اپنی امداد کا چکما دیا۔ باغی پھر مقابلہ کے لیے ڈٹ گئے۔ پھر محاصرہ کیا گیا۔ یہود پندرہ دن تک قلعہ بند رہے اور مقابلہ کی تاب نہ لا کر اس بات پر راضی ہو گئے کہ وہ مدینہ چھوڑ کر چلا جاتے ہیں اور ان کو مال و اسباب اونٹوں پر لے جانے

کی اجازت ہو۔ چنانچہ وہ گھروں کو چھوڑ کر نکل گئے اور خیبر میں جا کر آباد ہو گئے۔

بنو قریظہ کا اخراج اور قتل:

غزوہ خندق وقوع میں آنے سے پہلے حی بن اخطب یہودی بنونضیر کی جلا وطنی کے بعد قریش کے پاس گیا ان کو مدینہ پر حملہ کرنے کے لیے آمادہ کیا کنانہ ابوالحقیق کے پوتے نے غطفانیوں کو اکسایا اور وعدہ کیا۔ خیبر کی آمدنی سے نصف آمدنی دوں گا۔ اگر مدینہ پر حملہ کرو۔ سلام بن مشکم، ابن ابوالحقیق حیی، کنانہ اور بنونضیر مکہ پہنچے اور مدینہ پر حملہ آور ہونے کو کہا جب عرب کے تمام احزاب اسلام کے استیصال کے لیے مدینے پہنچے تو حیی بن اخطب یہودی کعب بن اسد کے پاس پہنچا۔ پہلے تو کعب نے حیی کو گھر میں داخل ہونے کی اجازت نہ دی۔ اور کہا ہمارا اور مسلمانوں کا باہم معاہدہ اور اتحاد ہے۔ بنوقینقاع اور بنونضیر کی بدعہدی اور آئین شکنی کا انجام اس کے سامنے تھا مگر حیی نے کہا تمام احزاب عرب اور قریش نے مدینہ کا محاصرہ کر لیا ہوا ہے اور سب کا یہ عہد ہے کہ جب تک اسلام کا استیصال نہ کر لیں گے واپس نہ جائیں گے۔ کعب نے پہلے تو حیی کو بہت ٹالا اور کہا محمد راست گو اور عہد کا پکا ہے۔ یہ مناسب نہیں کہ ہم اس کے ساتھ بدعہدی کریں۔ آخر کار حیی کے پھسلانے اور احزاب کی کثرت کو دیکھ کر باغی بن گیا۔ عین جنگ کے وقت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو بنوقریظہ کی بدعہدی کی خبر پہنچی۔ آپؐ نے خبر کی تحقیق کے لیے آدمی روانہ فرمائے اور کہا ان لوگوں کی فہمائش کرو کہ عہد پر قائم رہیں اس کے جواب میں کہا گیا کہ کون سے معاہدے کی بات کی جا رہی ہے کس کے ساتھ ہوا۔ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کون ہیں ان کے نام سے بھی ہم واقف نہیں ہیں۔ (میور لائف آف محمد حصہ سوم ص 259)

اس گفتگو کے بعد غداری کا کوئی شک وشبہ نہ رہا۔ بنوقریظہ نے عملی رنگ میں علم بغاوت بلند کر دیا تھا یہود کا ایک باغی گروہ حضرت حسان بن ثابت شاعر نبوی کے قلعہ تک جا پہنچا تھا جہاں عورتیں اور بچے مقیم تھے۔ ایک باغی قلعے کی دیوار تک آ پہنچا حضرت صفیہ بنت عبدالمطلب نے اس کو مارا۔

کفار نے ایک ماہ تک محاصرہ جاری رکھا۔ اس اثناء میں شوال کا مہینہ ختم ہو چلا اور ذی قعدہ قریب آ گیا جو شہر حرم کا آغاز تھا جس میں قریش مذہباً لڑائی نہیں کرتے تھے موسم خراب آ گیا۔ بارش آندھی سردی اور قلت رسد وغیرہ سے محاصرین کے پائے ثبات میں لغزش آ گئی آخر ابوسفیان اپنے ساتھیوں کے ہمراہ مکہ روانہ اور دوسرے قبائل یکے بعد دیگرے چلتے بنے۔

محاصرہ اٹھ جانے کے بعد رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بنوقریظہ کا محاصرہ کر لیا ایک ماہ کے بعد ہتھیار ڈال دیئے اور آپ کی خدمت میں درخواست دی کہ حضرت سعد بن معاذ جو فیصلہ کریں گے وہ منظور ہے سعد نے تورات کے مطابق فیصلہ دیا۔ (1) بنوقریظہ کے جنگ جو مرد قتل کر دیئے جائیں۔ (2) عورتیں اور بچے مملوک بنائے جائیں۔ (3) مال واسباب غنیمت قرار دیا جائے یہی وہی فیصلہ ہے جو یہود اپنے دشمن کے حق میں دیا کرتے تھے۔ توریت میں ہے کہ جب محاصرہ تک نوبت پہنچ جائے اور ''خداوند تیرا خدا اسے تیرے قبضے میں کر دیوے تو وہاں کے ہر ایک مرد کو تلوار کی دھار سے قتل کر۔ مگر عورتوں اور لڑکوں اور مواشی کو اور جو کچھ اس شہر میں ہو اس کا سارا لوٹ اپنے لیے لے۔ (استثناء 14,13:20)

یہ فیصلہ انہی کی تجویز کردہ ثالث کا تھا اور تورات کی تعلیم کے مطابق تھا اس فیصلہ پر عمل کیا گیا۔

تجزیہ: بنوقینقاع

بنوقینقاع نے بدامنی پھیلائی ساتھ بدعہدی اور غداری بھی کی اور حکومت کو جنگ کی دھمکی دے دی اور ریاست کی رٹ قبول

کرنے سے انکار کر دیا۔ کیا اس قبیلے کو صرف جلاوطن کر دینا ظلم ہے یا عدل۔ دنیا کے کسی قانون پر اس سزا کو پرکھا جائے تو یہ سزا جائز اور آئین کے مطابق ہو گی۔

بنونضیر:

اس کے سردار میثاق مدینہ کی خلاف ورزی کرتے ہوئے مدنی ریاست کے دشمنوں سے صرف تعلق ہی قائم نہیں رکھتے تھے۔ بلکہ مدنی ریاست پر حملہ کرنے کی ترغیب بھی دیتے تھے اور حملہ کرواتے تھے۔ میثاق مدینہ کو رد کرتے ہوئے خون بہا میں شریک نہیں ہوئے اور سربراہ مملکت کے فیصلے کو رد کر دیا تھا اور آپ ﷺ کو قتل کرنے کا منصوبہ بھی بنالیا۔ کیا یہ قبیلہ رحم کے قابل ہے۔ جو ملک کے آئین کی خلاف ورزی کرے اور سربراہ مملکت کو قتل کرنے کا منصوبہ بنائے۔

بنوقریظہ:

بنوقریظہ کے جنگجوؤں کے قتل سے گو فطرتی طور پر رحم کا جذبہ دل میں ابھرتا ہے۔ لیکن رحم کے باعث عدل کو چھوڑنا اور جرائم کی سزا سے درگزر کرنا ملک میں فساد کا ذریعہ ہے۔ تاریخی شواہد سے واضح ہے کہ بنوقریظہ نے غداری کی۔ غداری بھی اس وقت کی جب مسلمان چاروں طرف سے دشمن سے گھرے ہوئے تھے۔ جب ان کا محاصرہ کیا گیا تو یہود نے خود سعد بن معاذ کو اپنا حکم تجویز کیا۔ ان کی تجویز پر رسول کریم ﷺ نے سعد کو حکم بنایا۔ انہوں نے تورات کی تعلیم کے مطابق فیصلہ دیا۔ یہود دشمنوں سے وہی سلوک کیا کرتے تھے جو سعد نے اپنے فیصلہ میں سنایا ہے۔ حضرت داؤد علیہ السلام کے متعلق لکھا ہے۔

''اس نے ربہ پر چڑھائی کی اور فتح کر لیا اور اس نے ان لوگوں کو جو اس میں تھے باہر نکال کر آروں اور لوہے کی گاہین اور آہنی کلہاڑوں سے روندا اور اینٹوں کے جلتے پژادوں میں سے گزارا اور اس نے بنی عمون کے تمام شہروں سے یہی کیا۔ (سموئیل دوم 31:12)

بہر حال مسلمانوں کا حکم قریظہ کی نسبت گرامول کے حکم سے بہت کم تھا۔ جس کے بموجب آئر لینڈ میں شہر ورڈ ہیڈا کے سب باشندے بلاتفریق موت کے گھاٹ اتار دیئے۔

کارلائل لکھتا ہے سچ ہے شریر کا سو مرتبہ قتل ہونا بہتر ہے کہ وہ بے گناہوں کو اغوا کرے۔

اسلام کا یہ فعل حضرت داؤد کی سزا سے بہت نرم تھا حضرت داؤد نے تو جیتے آدمی جلتے پژادوں میں جلا دیئے تھے۔

الغرض یہود کے تینوں قبائل حکومت کے باغی تھے انہوں نے ریاست کی رٹ کو چیلنج کیا تھا اور ریاست میں فساد برپا کیا تھا۔ ان کو جو سزا دی گئی۔ وہ آئین کے مطابق تھی اور عدل پر مبنی تھی۔

غداری کی سزا رومی قانون سے لے کر برطانوی قانون تک ہر دور میں موت رہی ہے برطانیہ کے قتل ایکٹ 1965 کی رو سے موت کی سزا منسوخ کر دی گئی لیکن غداری کے جرم پر سزائے موت میں کوئی تبدیلی نہیں کی گئی۔

غداری کیا ہے:

امریکی قانون کی رو سے ریاست کے خلاف جنگ، دشمنوں سے وفاداری، دشمنوں کو کسی قسم کی مدد یا سہولت بہم پہنچانا غداری کی تعریف میں آتا انگلینڈ میں 1348ء کے قانون میں بغاوت اور غداری کی جو تعریف کی گئی ہے اس کی رو سے بادشاہ کے دشمنوں سے وفاداری، دشمنوں کو مدد یا سہولت بہم پہنچانا غداری کی تعریف میں کرتا ہے۔

Encyclopedia Britanica artical treason vol,11, P 197.

انسائیکلو پیڈیا میں غداری کی اور بھی تعریفیں بیان کی گئی ہیں صرف دو کا اندراج کیا ہے ان تعریفوں کو سامنے رکھ کر مدینہ کے یہودیوں کے کردار کا جائزہ لیں۔ تو صاف تاریخی شواہد سے واضح ہو جائے گا۔ کہ وہ ریاست کے غدار اور باغی تھے۔

☆......☆

حضرت عائشہ کی رخصتی 9 برس میں ہوئی

اعتراض: عام مستشرقین نے حضرت عائشہ کی منگنی اور رخصتی کم عمری میں یعنی بالترتیب 9,6 سال قرار دے کر ہدف تنقید بنایا ہے۔ یہ اعتراض صرف مستشرقین کا ہی نہیں بلکہ تمام مخالفین نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات پر عائد کیا ہے۔

جواب: اس اعتراض کی بنیاد بعض مسلمان مورخین اور محققین کی غلط تحقیق اور روایت پر ہے۔ جنہوں نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حضرت عائشہ سے سگائی 6 سال کی عمر اور رخصتی 9 سال کی عمر قرار دی ہے۔ یہ تاریخی غلطی کیوں کر ہوئی۔ مجھے اس سے بحث نہیں۔ جب تاریخی واقعات کو کھنگالا جائے تو واضح ہو جاتا ہے۔ کہ سگائی اور رخصتی کی مذکورہ عمریں صحیح نہیں۔

تاریخ کی روشنی میں:

جب تاریخ کی روشنی میں حضرت عائشہ کی سگائی کے وقت کی عمر کا جائزہ لیا جائے تو تقریباً 10 سال معلوم ہوتی ہے۔ گرم ممالک میں یہ بلوغت کے قریب کی عمر ہے۔ ابن جریر طبری رقمطراز ہے۔ زمانہ جاہلیت میں ابوبکر نے دو خواتین سے شادی کی۔ پہلی خاتون فتیلہ بنت عبدالعزی تھیں جس سے عبداللہ اور اسماء پیدا ہوئے پھر ام رومان سے شادی کی۔ جس سے عبدالرحمٰن اور عائشہ پیدا ہوئے اور چاروں اسلام سے پہلے پیدا ہوئے۔ فَکُلّ ھٰؤُلَآءِ الْاَرْبَعَۃُ مِنْ اَوْلَادِہٖ وُلِدُوا مِنْ زَوْجَتِہِ اللتین سَمَّیْنَاھُمَا فِی الجَاھِلِیَّۃِ (جلد 4 ص 50) یعنی ابوبکر کی اولاد میں چاروں زمانہ جاہلیت میں ان دونوں بیبیوں سے پیدا ہوئے جن کا ہم نے ذکر کیا ہے۔ حضرت ابوبکر کی ام رومان سے شادی 28 سال کی عمر میں ہوئی۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم حضرت ابوبکر سے دو سال بڑے تھے اگر ام رومان کے بطن سے دونوں بچے (عبدالرحمٰن اور عائشہؓ) شادی کے ابتدائی پانچ سال میں یکے بعد دیگر پیدا ہوئے ہوں تو عبدالرحمٰن سے چھوٹی حضرت عائشہ یقیناً بعثت نبوی سے قبل پانچ چھ سال پیدا ہوئیں۔ ابن جریر یہی لکھتا ہے کہ چاروں بچوں کی پیدائش بعثت نبوی سے پہلے ہوئی۔ اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر 35,34 سال کے قریب تھی۔ تاریخ یہ بھی بتاتی ہے کہ عبدالرحمٰن جنگ بدر میں مسلمانوں کے خلاف لڑے تھے اگر ان کی عمر 22,21 سال کی بھی ہو تو ان کی پیدائش بعثت سے نو یا دس سال پہلے ہوئی۔ اگر عام رویت کے مطابق حضرت عائشہ 5 بعثت نبوی میں پیدا ہوئیں۔ تو وہ عبدالرحمٰن سے چودہ پندرہ سال چھوٹی تھیں۔ تاریخ سے کوئی شہادت نہیں ملتی۔ جس سے یہ ظاہر ہو کہ حضرت عائشہ اپنے بھائی عبدالرحمٰن سے چودہ پندرہ سال چھوٹی تھیں جبکہ ابن جریر یہ لکھتے ہیں کہ حضرت ابوبکر کے چاروں بچے بعثت نبوی سے پہلے پیدا ہوئے۔ تو حضرت عائشہ کی پیدائش بھی بعثت نبوی سے پہلے ہی تسلیم کرنی پڑے گی۔ بعثت کے پانچویں سال والی عمر پیدائش بالبداہت غلط ہے۔

علامہ ابن کثیر:

مشہور مورخ ابن کثیر اپنی تصنیف البدایہ والنہایہ میں حضرت اسماء کے بارے میں لکھتے ہیں۔

''اسماء 73ھ میں ایک سو سال کی عمر میں فوت ہوئیں وہ اپنی بہن عائشہ سے دس سال بڑی تھیں وھی اکبر من اختھا عائشہ بعشر سنین (جلد 8 ص 346) اب اگر 73ھ میں حضرت اسماء کی عمر ایک سو سال تھی۔ تو ہجرت کے آغاز میں ان کی عمر 28,27 سال ہو گی۔ اس صورت میں ان سے دس سال چھوٹی حضرت عائشہ کی عمر ہجرت کے وقت 18,17 ہوئی اس سے 13 سالہ مکی دور نبوت منہا کیجیے تو بعثت نبوی کے وقت ان کی عمر چار پانچ سال ہوئی۔ اس طرح حضرت عائشہ 2 ہجری میں رخصتی کے وقت اٹھارہ انیس سال کی تھیں۔

شیخ ولی الدین مصنف مشکوۃ المصابیح اپنی کتاب اکمال فی اسماء الرجال میں لکھتے ہیں ''کہ رخصتی کے وقت سیدہ عائشہ کی عمر اٹھارہ انیس سال سے کم نہ تھی۔ اس لحاظ سے یہ مورخ بھی ابن کثیر کا ہم خیال ہے۔

تیسری شہادت:۔ حضرت عائشہ کی وفات کے وقت عمر سرسٹھ سال تھی تو حضرت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی چالیس سالہ عمر نکال دیجیے۔ تو آپ ﷺ کی وفات کے وقت حضرت عائشہ کی عمر 27 سال بنتی ہے۔

آپ ﷺ کا دور نبوت 23 سال تھا 27 سال میں سے 23 منہا کیجیے تو بعثت کے وقت حضرت عائشہ کی چار سال ہوئی۔

چوتھی شہادت:

سورۃ القمر اور حضرت عائشہ کی عمر:

صحیح بخاری کتاب التفسیر میں حضرت عائشہ سے روایت ہے لَقَدْ أُنْزِلَتْ عَلٰی مُحَمَّدٍ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِمَكَّةَ وَإِنِّي الْجَارِيَةُ بَلِ السَّاعَةُ مَوْعِدُهُمْ وَالسَّاعَةُ أَدْهٰى وَأَمَرُّ یعنی میں لڑکی تھی کہ مکہ میں رسول کریم صلعم پر سورہ القمر کی آیت بل الساعۃ الخ نازل ہوئی۔ تمام مفسرین اس بات پر متفق ہیں کہ سورۃ شورہ القمر بعثت نبوی سے چار پانچ سال بعد نازل ہوئی۔ یہ روایت بھی حضرت عائشہ کی عمر پیدائش ظاہر کر دیتی ہے کہ نزول سورۃ القمر کے وقت آپ کی عمر کم سے کم چار یا پانچ سال ضرور ہوگی۔ پھر لفظ جاریۃ بھی ظاہر کرتا ہے کہ جاریۃ کا لفظ چار پانچ سال کی عمر کے بچے بچی پر بولا جاتا ہے۔ روایات سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عائشہ مکہ کی لڑکیوں کے ساتھ کھیلتی کودتی اور سورۃ القمر کی آیات بھی پڑھتی تھیں یعنی آپ عمر کے اس حصہ میں ضرور تھیں جب کوئی ذہین بچہ قرآن کی آیات یاد کر لیتا ہے آپ اس وقت بالکل کم سن یعنی ایک دو سال کی نہیں تھیں جس عمر میں بچہ کے یاد کرنا تو کجا بول بھی نہیں سکتا تھا۔ الغرض سورۃ القمر کا نزول بھی حضرت عائشہ کی عمر پیدائش ظاہر کرتا ہے کہ حضرت سیدہ عائشہ بعثت سے قبل پیدا ہوئیں۔

ان تمام تاریخی حقائق کی روشنی میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ منگنی کے وقت حضرت عائشہ کی عمر 6 سال اور رخصتی کے وقت عمر 9 سال تھی بالبداہت غلط ہے۔ محقق اور مورخ شیخ ولی الدین مصنف مشکوۃ المصابیح کی تحقیق اٹھارہ سے انیس سال ہی صحیح معلوم ہوتی ہے۔

درایت کی روشنی میں:

جب درایت کی روشنی میں 6 سال کی عمر میں منگنی اور 9 سال کی عمر میں رخصتی کا جائزہ لیں تو عقل سلیم اس روایت کو غلط قرار دیتی ہے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو گھریلو معاملات میں دیکھ بھال اور مزید براں عورتوں کو مسائل سے آگاہ کرنے کے لیے بھی بیوی کی ضرورت تھی اور اپنے لیے ایک جیون ساتھی کی ضرورت تھی۔ عورتوں کے مسائل عورتیں ہی بہتر رنگ میں بیان کر سکتی ہیں نہ عورتیں مرد کو اپنے نسوانی مسائل کھل کر بیان کر سکتی ہیں اور نہ مرد کھل کر جواب دے سکتا ہے۔ ان اغراض کے لیے ایک بیوی کی ضرورت تھی۔ حضرت خولہ کی تجویز پر حضرت عائشہ سے سگائی ہوئی۔ یہ بھی بات یاد رکھنی چاہیے حضرت ابوبکر حضرت عائشہ کی منگنی حضرت جبیر بن مطعم کے بیٹے سے کر چکے تھے جب حضرت ابوبکر کو یہ پیغام پہنچا تو انہوں نے پہلی منگنی منسوخ کر کے رسول کریم صلعم کے ساتھ کر دی اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ منگنی

کے وقت حضرت عائشہ کی عمر 6 سال اور رخصتی کے وقت عمر 9 سال تھی۔ تو جس مقصد کے لیے شادی کرنی تھی وہ مقصد ہی پورا نہیں ہوتا۔ نہ تو حضرت عائشہ اپنی کم سنی کی وجہ سے آپ کی غم گسار بن سکتی تھی۔ نہ گھر کے معاملات کی دیکھ بھال کرسکتی تھیں اور نہ عورتوں کو نسوانی مسائل سے آگاہ کرسکتی تھیں۔ اس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ حضرت عائشہ کی عمر اس حد تک پہنچ چکی تھی۔ جو رسول کریم صلعم کے گھریلو معاملات کو سلجھانے اور دیکھ بھال کرنے اور عورتوں کے مسائل کو سمجھانے کے قابل تھیں اسی وجہ سے حضرت ابوبکر نے شادی کرنے میں کوئی تامل نہ کیا اور نہ حضرت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ذہن یہ بات آئی کہ حضرت عائشہ ان کی دینی اور گھریلو ضروریات کو پورا نہیں کرسکتی۔ عقل سلیم ہی یہ تسلیم نہیں کرتی کہ اتنی کم سن بچی رسول کریم صلعم اپنے گھر میں لاتے۔ کم سن بچی سے مزید مسائل تو پیدا ہو سکتے ہیں مسائل حل نہیں ہو سکتے۔

ان تاریخ حقائق کی روشنی میں یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ 6 سال منگنی اور 9 سال رخصتی کی عمر کی روایت غلط ہے۔

☆......☆

محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے مکی دور میں مذہب کی اشاعت کے لیے کوشش کی جب کہ مدنی دور میں مذہب کو پس پشت ڈال دیا۔

اعتراض: محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) قیصر کا مقہور بن کر اپنی پیغمبرانہ پیغام پر اپنے خون سے مہر صدق ثبت کرتے یہ محمد ﷺ کی بدنصیبی تھی کہ انہوں نے مفاہمت کی راہ اختیار کی اور خود عرب کے قیصر بن کر اپنے پیغمبرانہ پیغام کو گراوٹ سے ہم کنار کیا۔ (ٹائن بی مطالعہ تاریخ جلد 111 صفحہ 470)

ٹائن بی کے الفاظ درج کیے جاتے ہیں۔

Instead of sealing his prophetic message with his blood by becoming Caesar's victim, it was Mohammad ironic Lesting to compromise and debase his prophetic message by becoming a Arabian Caesar him self."

جواب: خواہ کتنا ہی بڑا آدمی ہو۔ وہ اپنے ماحول خصوصاً مذہبی بندھنوں سے آزاد نہیں ہوتا۔ ٹائن بی کی بھی یہی حالت نظر آتی ہے۔ وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی شخصیت اور ان کے مذہبی نظریات سے الگ نہیں ہو سکے۔ چونکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام منصب حکمرانی پر فائز نہیں ہوئے۔ اس لیے ان کے نزدیک کسی نبی کا منصب حکمرانی پر فائز ہونا منصب نبوت کے خلاف ہے۔ گویا نبوت اور ریاست دو الگ شعبے ہیں۔ ریاست میں پیغام خداوندی (نبوت) کو شامل کرنا نبوت کی گراوٹ ہے۔

دوم:

چوتھی صدی عیسوی میں عیسائیت مظلومیت کے دور سے نکل کر غالب مذہب بن گئی۔ پہلا رومی بادشاہ ہے جس نے عیسائیت اختیار کرنے کے بعد 325ء میں مذہب تثلیث کو سرکاری مذہب قرار دیا قسطنطین سے گریگوری تک 312ء سے 539ء تک کے عرصہ میں

عیسائی مذہب سلطنت روما پر غالب آچکا تھا۔ اس کے بعد کلیسا مختلف ادوار میں گزرتا رہا جس کا ذکر کرنا باعث طوالت ہے آخر کار 184ھ سے لے کر 928ھ/ 1521ء کا وہ عہد ہے جس میں پوپ اور شہنشاہ کی وہ خانہ جنگی ہے جو ایک لمبا عرصہ تک جاری رہی پھر 1294ء/ 693ھ تا 1517ء/ 923ھ کا وہ عہد ہے جس میں پاپائیت کا ستارہ زوال میں آ گیا۔ کلیسا کے مظالم اور علم دشمنی کی وجہ سے بادشاہ مجبور ہوئے کہ مذہب کو سیاست سے الگ کر دیا جائے۔

تبصرہ:

جب ایک لمبا عرصہ مذہبی طبقہ ریاست پر غالب رہا لیکن بقول ٹائن بی اس مذہبی طبقہ نے عیسائیت کو گراوٹ سے ہم کنار کیا تھا پاپائیت (عیسائیت یا مذہب) کو اس وقت ریاست سے الگ کیا جب ان کے مظالم انتہا کو پہنچ گئے معاشرہ میں فساد برپا ہو گیا تھا۔ سلطنتوں میں سیاسی استحکام برباد ہو گیا۔ آخر وقت آن پہنچا۔ عوام کی طاقت سے حکمرانوں نے مذہب کو سیاست سے الگ کر دیا علیحدگی کی وجہ مذہب کی خرابی نہیں بلکہ مذہب کے ٹھیکے داروں نے مذہب کے نام ایک طوفان بدتمیزی پیدا کر دیا تھا۔ امن قائم رکھنے کے لیے ریاست (سیاست) کو مذہب سے الگ کرنا پڑا۔ اس جدگانہ تصور کی آڑ میں مستشرقین اور ٹائن بی جیسے ثقہ معتبر اور نابغہ روزگار نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر نکتہ چینی کی ہے۔ عیسائی علماء اور مفکرین نبوت کے دائرکار کو بہت تنگ کرتے ہیں۔ اس سے شعبہ حکمرانوں کو خارج کرتے ہیں۔ جب عہد نامہ قدیم کا مطالعہ کریں تو مذہب اور سیاست بیک وقت مجتمع نظر آتے ہیں۔ حضرت موسیٰ نے ارض موعودہ میں داخل ہو کر حکمران بنا چاہا یہ الگ بات ہے کہ ارض موعودہ میں داخل نہ ہو سکے اور حکمرانی حاصل کر نہ سکے۔ ان کے علاوہ حضرت داؤد حضرت سلیمان حضرت یوسف، کتاب سموئیل، کتاب سلاطین کتاب تواریخ اور کتاب قضۃ کے تمام اہم کردار مذہب اور سیاست میں حصہ لیتے ہیں۔ کسی کے متعلق یہ نہیں کہا جا سکتا کہ انہوں نے مذہب کو پس پشت ڈال کر سیاست اختیار کر لی اور مذہب کو گراوٹ سے ہم کنار کر دیا۔ ان نبیوں کا وجود ظاہر کرتا ہے کہ مذہب اور سیاست دو الگ الگ شعبے نہیں بلکہ ضرورت پر دونوں کو جمع کیا جا سکتا ہے۔ حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم وہ نبی ہیں جن کو نبوت کے ساتھ بادشاہت بھی دی گئی۔ جنہوں نے خدا سے علم پا کر ایسے ایسے حکمرانی کے اصول مقرر کیے۔ جن پر ایک حکمران گامزن ہو کر عوام کو پرامن اور خوشحال زندگی دے سکتا ہے اس لحاظ سے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم حکمرانوں کے لیے بھی نمونے ہیں اگر آپ منصب حکمرانی پر فائز نہ ہوتے تو آپ حکمرانوں کے لیے نمونہ نہیں بن سکتے تھے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وہ ذات ہے جو زندگی کے ہر شعبہ سے تعلق رکھنے والے کے لیے ایک کامل نمونہ ہے یہی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خصوصیت ہے۔ الغرض کسی نبی کا منصب حکمرانی پر فائز ہونا دین کو گراوٹ سے ہم کنار کرنا نہیں بلکہ حکمرانوں کے لیے نمونہ کا ذریعہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے بعض انبیاء کو محض اس لیے حکمران بھی بنایا۔ تاکہ دوسرے حکمرانوں کے لیے نمونہ بنیں جس طرح زندگی کے مختلف شعبے نور نبوت سے ہدایت حاصل کرتے ہیں اسی طرح حکمرانی کا شعبہ بھی نور نبوت سے اصول حکمرانی سیکھتا ہے۔ کوئی نبی حکمران بنے گا تبھی وہ حکمرانوں کو اصول حکمرانی سکھائے گا۔ گویا نبی کا حکمران بنا دیگر حکمرانوں کو اصول حکمرانی سکھانے کے لیے ہے۔

☆......☆

روسی مستشرقین، اسلام اور محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم

روس میں کمیونسٹ انقلاب کے بعد رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور اسلام کے بارہ میں ایک نیا نظریہ پیدا ہوا ہے وہ سیرت کے واقعات کی مادی جدلی تعبیر کرتے ہیں۔ روسی مستشرقین سے ہمارا اختلاف تحریک اسلام کی مادی جدلی تعبیر نہیں ہے۔ اس اختلاف کا معاملہ بعد میں آتا ہے۔ ہمارا ان سے بنیادی اختلاف یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے وجود کے ہی منکر ہیں۔ جب وہ خدا کے ہی منکر ہیں تو پھر وہ اللہ کے دین کی جس رنگ میں چاہیں تعبیر کرتے پھریں اس لیے میں پہلے بنیادی مسئلہ وجود باری کا تعالیٰ کا لیتا ہوں۔ صرف دو دلائل وجود باری تعالیٰ کے متعلق رقم کرتا ہوں۔

قرآن مجید:

قرآن مجید وہ کتاب ہے جو وجود باری تعالیٰ پر بین دلیل ہے۔ قرآن مجید نے من جانب اللہ ہونے کی یہ دلیل دی ہے کہ یہ وہ معجزہ ہے کہ کوئی شخص اس قسم کی کتاب نہیں بنا سکتا۔ قرآن مجید میں آتا ہے۔

قُلْ لَّئِنِ اجْتَمَعَتِ الْاِنْسُ وَالْجِنُّ عَلٰٓى اَنْ يَّاْتُوْا بِمِثْلِ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لَا يَاْتُوْنَ بِمِثْلِهٖ وَلَوْ كَانَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ ظَهِيْرًا (اسرائیل 88:17)

کہہ دے اگر انس و جن جمع ہو جائیں اور کوشش کریں کہ اس قرآن کی مثل بنا لائیں تو وہ ہرگز اس کی مانند نہ بنا لا سکیں گے خواہ وہ ایک دوسرے کے مددگار بن جائیں۔

قرآن مجید اپنی فصاحت و بلاغت کے لحاظ سے، علمی لحاظ سے، امور محتاج الاصلاح کے لحاظ سے، قوت تاثیر کے لحاظ سے، عدم اختلاف کے لحاظ سے غیب کی خبروں کا اعلان کرنے کے لحاظ سے قوت دلائل کے لحاظ سے معجزات تصرفات خارجیہ کے لحاظ سے کامل ضابطہ حیات انسانی کے لحاظ سے ہمیشہ محفوظ رہنے کے لحاظ سے معجزہ ہے کوئی شخص بھی ایسا نہیں گزرا جس نے یہ بھی کہا ہو کہ وہ اس قسم کی کتاب بنا سکتا ہے۔ بنا کر لانا تو دور کی بات ہے کسی نے بنانے کا ارادہ تک نہیں کیا عہد رسولؐ میں بے شمار عرب فصحاء و بلغاء تھے جن کو اپنی فصاحت و بلاغت پر یقین تھا لیکن کسی نے بھی اس چیلنج کو قبول نہیں کیا یہ چیلنج صرف عہد رسولؐ تک ہی نہیں ہے بلکہ قیامت تک ہے۔ یہ کتنا تصرف الٰہیہ ہے کہ کوئی اس چیلنج کو قبول نہیں کرتا یہ قرآن مجید خدا کی ہستی پر واضح دلیل ہے۔ اس معجزہ کی وہ مادی تعبیر کیا کریں گے۔

دوم:

دوسرا معجزہ بیت اللہ کا وجود ہے۔ بیت اللہ کے متعلق پیشگوئی ہے کہ کوئی غیر مسلم اس پر قابض نہیں ہو سکتا۔ میرا یہ دعویٰ ہے کہ یاجوج ماجوج (روسی اور انگریز) دونوں بیت اللہ پر قبضہ کرنے کی کوشش کر لیں تو کامیاب نہیں ہو سکیں گے۔ باوجودیکہ وہاں کے حکمران کی یہ

طاقت نہیں کہ وہ یاجوج ماجوج کے لشکر قاہرہ کا مقابلہ کر سکے۔ بیت اللہ، اللہ کے فرشتوں کی حفاظت میں ہے۔ وہ اس کی حفاظت کریں گے۔ یہ تمام غیر مسلم دنیا کے لیے کھلا چیلنج ہے۔ کہ وہ اس خطہ مقدسہ پر کبھی بھی غالب نہیں آسکیں گے۔ مسلمانوں کے ہر ملک پر غیر مسلم قبضہ کر سکتے ہیں لیکن نہیں کر سکتے تو بیت اللہ پر۔ بیت اللہ کے تقدس کی وجہ سے تمام حجاز غیر مسلموں کی یلغار سے محفوظ ہو گیا ہے اس سے بڑھ کر زندہ معجزہ کیا ہو سکتا ہے؟ اس سے بڑھ کر زندہ خدا کا چہرہ ظاہر کرنے کے لیے کیا نشانی ہو سکتی ہے؟ روسی مستشرقین جو چاہیں اسلام اور واقعات نبوی کی مادی تعبیر کریں لیکن قرآن مجید نے اللہ تعالیٰ کی ہستی پر جو دلائل دیئے ہیں پہلے ان کا رد کریں جب وہ رد کر لیں گے۔ تو پھر ہم مادی تعبیر کا جواب بھی دے دیں گے۔ ہمارا روسی مستشرقین پر یہ ادھار ہے کہ وہ قرآن مجید کے ان دلائل کا رد لکھیں جو ہستی باری تعالیٰ کو ظاہر کر رہے ہیں پہلے بنیادی مسئلہ کا حل ہونا چاہیے بعد میں ثانوی حیثیت کے مسائل کو حل کر لیں گے۔

☆......☆

قرآن مجید پر اعتراضات اور اُن کے جوابات

قرآن مجید میں غیر زبانوں کے الفاظ ہیں

اعتراض: ابن وراق نے اپنی کتاب Why I am not a Muslim (میں مسلمان کیوں نہیں) کے صفحہ 51,50 پر مستشرقین زویمر اور گیگر geiger کے حوالہ سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ اسلام یہودیت سے بہت متاثر ہے اس کی ایک دلیل یہ دی ہے کہ قرآن مجید میں غیر زبانوں کے الفاظ ہیں۔ پھر چودہ الفاظ کی لسٹ بھی دی ہے اور لکھتا ہے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اپنی مادری زبان میں کچھ خیالات بیان کرنے کے قابل نہ تھے۔ اس لیے قرآن مجید میں ارامی اور سریانی زبان کے الفاظ بہت پائے جاتے ہیں۔ یہ بات ظاہر کرتی ہے کہ خیالات بھی مستعار لیے ہیں۔

Evidently Muhammad was inable to express certain concepts in his native Arabic, since the koran also a great many Aramaic and Syriac words indicating extensive borrowing of ideas.

ابن وراق نے چودہ الفاظ کی ایک لسٹ دی ہے۔

تابوت، تورات، جنت عدن، جہنم، احبار، درس، ربانی، سکینت، طاغوت، فرقان، ماویٰ، مثانی، ملکوت۔

جواب: عربی زبان کی یہ خصوصیت کہ اس زبان کے مادہ اور الفاظ ابتداء سے آج تک اپنی اصل شکل اور صورت میں محفوظ ہیں اور عربی زبان میں اتنے مادے ہیں۔ جن سے اپنے خیالات کی وضاحت کے لیے الفاظ بنائے جا سکتے ہیں۔ کسی دوسری زبان سے کوئی لفظ مستعار لینا ہی نہیں پڑتا۔

دوم: جس مادہ سے ماضی مضارع اور امر وغیرہ کے صیغے بنتے ہیں کہ وہ لفظ یقینی طور پر عربی ہے کیونکہ کسی زبان میں اس میٹر (وزن) پر فعل ماضی مضارع اور امر وغیرہ بنانے کا طریقہ نہیں پھر ماضی مضارع اور امر وغیرہ کی گردانیں ہیں۔ جن میں واحد تثنیہ اور جمع۔ غائب حاضر اور متکلم کے صیغے بیان کیے جاتے ہیں۔ یہ طریقہ کسی زبان میں نہیں۔ اگر مذکورہ لسٹ کے الفاظ اپنے مادہ (روٹس) کے ساتھ عربی زبان میں ملتے ہیں تو لازمی طور پر یہ کہا جائے گا کہ یہ الفاظ عربی کے ہیں۔ ماضی مضارع اور امر وغیرہ کے صیغے مختلف شکلوں میں صرف عربی زبان کے ہی ہوتے ہیں۔ دوم ایسے الفاظ جن کے مادہ نہیں ہیں۔ وہ جامد ہیں۔ وہ بھی عربی لغات میں محفوظ ہیں۔ ماہرین نے ان جامد الفاظ کو بھی عربی کے الفاظ قرار دے کر وضاحت کی۔ کسی ماہر لغت نے ان الفاظ کو غیر عربی کے الفاظ نہیں کہا۔ سوم جو الفاظ غیر عربی کے ہیں۔ ماہرین لغت ان کو معرب کی فہرست میں لے آئے ہیں۔ یہاں صرف یہ دیکھنا ہے کہ جن الفاظ کو غیر عربی کہا گیا ہے ان کی کیا نوعیت ہے آیا وہ غیر عربی ہیں یا عربی۔

تابوت:

(البقرہ 248:2) توب سے مشتق ہے۔ تاب، یتوب، توبۃ، بار بار لوٹنا التابوت کے مشہور معنی صندوق کے ہیں۔ کیونکہ اس میں چیزیں لوٹ لوٹ کر آتی ہیں۔ دوسرا قول ہے کہ تابوت کے معنی پسلیاں اور جو کچھ اس کے اندر آ گیا ہے۔ جیسے دل وغیرہ اور صندوق پر بھی اس کا اطلاق ہوتا ہے (تاج العروس) لسان العرب میں تابوت کے معنی قلب یعنی دل دیئے ہیں اور ایک مثل نقل کی ہے۔ مَا اَوْدَعْتُ تَابُوتِی شَیْئاً فَفَقَدْتَہُ میں نے اپنے تابوت یعنی دل کے سپرد کبھی کوئی شے نہیں کی۔ جسے گم کر دیا ہو۔ مفردات امام راغب میں یہ قول منقول ہے۔ کہ تابوت سے مراد قلب اور سکینت ہے۔ اور جو اس میں علم ہے اور لکھا ہے کہ قلب کو سفط العلم کہا گیا ہے۔ یعنی علم کا ڈبہ، اور اسے حکمت کا گھر اور اس کا برتن اور اس کا صندوق کہا ہے قلب کا نام تابوت رکھا جانے کی وجہ سے حضرت عمرؓ نے ابن مسعود کے متعلق کہا ہے کہ وہ ایک برتن ہے جو علم سے بھرا ہوا ہے۔ (لسان العرب، دی عربک انگلش لیکسی کان، مفردات امام راغب بیضاوی) التابوت کا مادہ توب یہ توب عربی روٹ ہے۔ لہٰذا یہ لفظ خالص عربی ہے۔ پھر اہل عرب نے لفظ التابوت کو اس کے حقیقی معنی کو ملحوظ رکھ کر مختلف مفاہیم میں استعمال کیا ہے۔ جب تابوت کو قلب کے معنی میں استعمال کیا ہے تو تابوت (توب) اور قلب کے معنی میں یکسانیت پائی جاتی ہے۔ قلب کے اصلی معنی ہیں ایک چیز کا ایک صورت سے دوسری صورت کی طرف پھیرنا۔ (امام راغب) قلب دل کو کہا جاتا ہے اس لیے کہ وہ خون کو پھیرتا ہے یا اس لیے کہ خیالات کو پھیرتا ہے دیکھیے قلب۔ اور توب کے معنی میں کتنی یکسانیت ہے۔ اسی یکسانیت کی وجہ سے اہل عرب نے التابوت کے معنی قلب کیے ہیں۔ اہل عرب مفہوم یا معنی متعین کرتے وقت مادہ کے اصلی مفہوم سے کبھی الگ نہیں ہوتے۔ مذکورہ بحث سے یہ واضح ہو جاتا ہے التابوت عربی زبان کا ہے۔ اگر یہ لفظ غیر عربی ہوتا تو عربی زبان میں اس کا مادہ نہ ہوتا۔ کسی ماہر لغت نے اس لفظ کو معرب قرار نہیں دیا۔

تورات:

تورات اس مجموعہ وحی کا نام ہے جو حضرت موسیٰ پر نازل ہوتی۔ یہ لفظ عبرانی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ یہ لفظ دونوں زبانوں میں ملتا جلتا ہے۔ رسول کریم صلعم کی بعثت سے قبل یہ لفظ عرب میں مستعمل تھا۔ یہ لفظ اپنے مادہ کے لحاظ سے مختلف شکلوں میں رائج تھا۔ اہل لغت کے نزدیک توریت وری سے مشتق ہے اور کوفیوں کے نزدیک اصل میں تَفْعَلَۃ وزن پر ہے اور بصریوں کے نزدیک فوعل کے وزن پر جس کا اصل وَوَراہ تھا۔ اور وَت سے بدل گئی۔ (مفردات امام راغب) وری کے معنی وری الزند سے آگ نکالنا ہیں۔ قرآن شریف میں بھی آتا ہے النار التی تورون (الواقعہ 71:56) اور وَرَاثَتُ کے معنی ہیں سترت ہیں یعنی ایک چیز کو چھپا دیا۔

جس سے ہے لباساً یواری سواتکم (الاعراف 26:7) حتی تورات بالحجاب (ص 32:38) پس توریت کو توریت یا تو اس لیے کہا جاتا ہے کہ وہ پتھر سے آگ نکالنے کی مثال ہے یعنی بڑی مشقت سے اس سے روشنی پیدا ہوتی ہے۔ یا اس لیے اس میں بعض مضامین مخفی حالت میں ہیں جیسا جزا و سزا کا مسئلہ ہے۔ تورات میں اس مسئلہ پر زیادہ روشنی نہیں ڈالی گئی۔

مذکورہ بحث سے یہ واضح ہو جاتا ہے لفظ تورات کا مادہ عربی زبان میں پایا جاتا ہے۔ قرآن مجید میں وہ مادہ مختلف شکلوں میں استعمال ہوا ہے۔ تورات کے مادہ (روٹ) کا عربی زبان میں پایا جانا یہ ظاہر کرتا ہے یہ لفظ عربی کا ہے اگر عبرانی میں بھی پایا جاتا ہے تو یہ زبانیں ایک خطہ کی ہیں۔ ایک لفظ کا دوسری زبان میں پایا جانا کوئی حیرانی کی بات نہیں۔ یہ کہنا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے یہ لفظ مستعار لیا ہے غلط ہے رسول کریم صلعم کی بعثت سے قبل ہی یہ لفظ عربی بول چال میں استعمال ہوتا تھا۔

جنت عدن:

یہ دو الفاظ ہیں مضاف اور مضاف الیہ۔ جنت، جن سے مشتق ہے جن کے معنی ہیں کسی چیز کا حواس ظاہری سے مخفی رکھنا۔ (مفردات امام راغب) اور جنت اس باغ کو کہتے ہیں جس کے درختوں نے اس کی زمین کو ڈھانپ لیا ہو۔ مفردات لفظ جنت صرف باغ کے معنی میں قرآن مجید میں استعمال ہوا ہے۔ بہشت کے لیے بھی یہ لفظ استعمال ہوا ہے۔

جَنَّ، جَنَانًا، جُنُوْن، جَنَّ یَجُنُّ عربی زبان میں جس مادہ میں ج، ن کے حروف آ جائیں تو ان میں پوشیدگی اور خفاء کا مفہوم پایا جائے گا اصطلاحی لحاظ سے جنت وہ مقام ہے جو انسانی حواس سے مخفی ہو۔ عموماً باغ اور بہشت کے معنی میں آتا ہے۔

عدن:

عَدَنَ، یَعْدِنُ، یَعْدُنُ، عَدْنًا عَدَنَ بِمَکَانِ کے معنی ہیں اِسْتَقَرَّ یعنی مکان میں استقرار پکڑا۔ جنات عدن وہ باغ ہیں جہاں ہمیشہ استقرار ہوگا۔ ان سے نکالے نہیں جائیں گے۔ اسی سے معدن ہے (مفرادت امام راغب) عدنتُ البلد کے معنی ہیں میں شہر میں ٹھہر گیا۔

دونوں الفاظ کے مادے (روٹس) ظاہر کرتے ہیں کہ یہ الفاظ عربی کے ہیں اگر یہ الفاظ غیر عربی ہوتے تو عربی زبان میں ان کے مادے نہ ہوتے جن الفاظ کے ماضی مضارع امر اور مختلف صیغے ہوتے ہیں وہ الفاظ غیر عربی نہیں ہو سکتے لہٰذا یہ دونوں الفاظ عربی ہیں۔

جہنم:

دوزخ، سزا کی وہ جگہ جو تاریک اور کم یاب والی ہو۔ جو اپنے رہائشیوں کے چہرہ کو بدنما بنادیتی ہے ہو (لسان العرب، تاج العروس، مفردات امام راغب، دی عربک انگلش لیکسی کان محیط) تمام ماہرین لغت العربی نے اس لفظ کے معنی بیان کئے ہیں۔ اور عربی لفظ قرار دیا ہے کسی نے معرب قرار نہیں دیا بعض ماہرین لغت کے لحاظ سے یہ لفظ عربی ہے جو آخرت کی آگ پر اپنی گہرائی کی وجہ سے بولا جاتا ہے جھنام اور جہنم گہرے کنواں پر بولا جاتا ہے جو اس میں گرتا ہے تباہ ہو جاتا ہے بعض ماہرین لغت کے اعتبار سے جھم سے مشق ہے اور بعض کے نزدیک جھن سے جھم اور جھن دونوں مادوں کے اختلاط سے یہ لفظ بنا ہو۔ قرآن مجید میں آتا ہے۔ فَحَسْبُهٗ جَهَنَّمُ (206:2) پس جہنم ان کے لئے کافی ہے۔

احبار:

جَبْرٌ کی جمع ہے عالم آدمی (یہود کے علماء کو احبار کہا جاتا ہے)

احبار۔ حَبَرَ سے مشتق ہے حَبَرَ یَحْبُرُ حَبْرًا حِبْر کے معنی سیاہی ہیں۔ (لسان العرب) اثر مستحسن یعنی خوب صورت نقش۔ تحبیر کے معنی خوبصورت بنانا ہیں اس سے حِبْر بمعنی عالم ہیں حسن کا قول ہے۔ ربانی سے مراد علمائے انجیل اور احبار سے مراد علمائے توریت ہیں۔ قرآن مجید میں آتا ہے۔

لَوْلَا یَنْهٰهُمُ الرَّبّٰنِیُّوْنَ وَالْاَحْبَارُ عَنْ قَوْلِهِمُ الْاِثْمَ (المائدہ 63:5)

کیوں ان کو مشائخ اور علماء گناہ کی بات کہنے سے نہیں روکتے۔

الاحبار کا ماخذ عربی لفظ حبر ہے۔ غیر عربی لفظ کا مادہ عربی نہیں ہو سکتا اور نہ اس لفظ کے ماضی مضارع اور دیگر صیغے بن سکتے ہیں۔ یہود نے یہ لفظ اپنے علماء کے لیے عربی سے ہی اخذ کیا ہے نہ کہ عربی نے عبرانی یا سریانی سے۔

دَرَسَ:

دَرَسَ یَدْرُسُ، درسٌ (دُروس) دَرَسَ الدَّار کے معنی ہیں بقی اثرھا (مفردات امام راغب) یعنی اس کا اثر باقی رہا۔ قرآن مجید میں آتا ہے۔ وَبِمَا کُنتُمْ تَدْرُسُوْنَ (ال عمران 3:79) اور اس لیے کہ تم اسے پڑھتے ہو۔ یہ لفظ قرأت کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ دھیان، غور و فکر اور پوری توجہ سے پڑھنے پر بولا جاتا ہے لفظ درس مختلف شکلوں میں قرآن مجید میں تقریباً 8 دفعہ آیا ہے۔

جیسا کہ عربی زبان کی یہ خصوصیت ہے ایک لفظ مختلف معانی میں استعمال ہوتا ہے لفظ درست بھی مختلف معانی میں استعمال ہوا ہے مثلاً دَرَسَ الثَّوب کپڑا پرانا اور تار تار ہو گیا۔ دَرَسَ الْکِتَابُ کتاب پرانی ہو گی۔ دَرَسَتِ الْمَرْأَةُ عورت بالغ ہو گی (جب عورت کو حیض آئے)

کیا غیر زبان کا لفظ بھی دوسری زبان میں آ کر کئی معنوں میں استعمال ہو سکتا ہے غیر زبان کا لفظ اسی معنی میں استعمال ہو گا جو وہ اپنی اصل زبان میں رکھتا ہے۔

ربانی:

ربانی کی جمع ربّٰنِیُّوْن ہے۔ یا یہ لفظ ربان کی طرف منسوب ہے عطشان، سکران آتا ہے یا رب کی طرف منسوب ہے اگر رب کو مصدر تربیت کرنے کے معنی میں لیا جائے۔ تو ربانی وہ عالم ہو گا جو علم کو نشو و نما دیتا ہے اَلَّذِی یُرَبُّ بِالْعِلْم یا جو علم کے ساتھ تربیت کرتا ہے۔ اَلَّذِی یَرُبُّ نَفْسَهٗ بِالْعِلْم (مفردات امام راغب) امام راغب کہتے ہیں یہ دونوں ایک دوسرے کو متلازم ہیں یعنی جو شخص اپنے نفس کی تربیت علم سے کرتا ہے۔ وہ کسی دوسرے کی بھی نشو و نما کرتا ہے ایسا ہی اس کے برعکس۔

بعض کے نزدیک رب کی طرف منسوب ہے جب اس سے مراد اللہ ہو۔ اور یہ اس طرح ہے جیسے ایک شخص کے متعلق کہہ دیا جاتا ہے الٰہی (امام راغب) یعنی اللہ کی طرف منسوب اور اس سے مراد یہ ہو گی مقبلاً اِلَی مَعْرِفَةِ الِالٰه وَطَاعَتِهٖ (تفسیر غرائب القرآن) یعنی اللہ کی معرفت اور طاعت کی طرف بڑھنے والا (تفسیر غرائب القرآن) یعنی اللہ کی معرفت اور طاعت کی طرف بڑھنے والا اس لیے ربانی سے مراد بعض نے اہل علم لیا ہے یا فقیہہ، بعض نے عالم حکیم متقی۔ حضرت علیؓ کا قول ہے اَنَا رَبَّانِی هٰذِهِ الْاُمَّةِ میں اس امت کا ربانی ہوں۔ جب حضرت ابن عباس فوت ہوئے تو ابن حنفیہ نے کہامات ربانی ھذہ الامۃ بخاری میں ہے الذی یربی الناس بصغار العلم قبل کبارہا یعنی ربانی وہ فقیہہ ہے جو لوگوں کو علم کی آسان باتیں اس کی مشکل باتوں سے پہلے سکھاتا ہے عیسائی اپنے علماء کو ربانی کہتے تھے۔ ارشاد الٰہی ہے۔ وَلٰکِنْ کُوْنُوْا رَبّٰنِیّٖنَ تم ربانی ہو جاؤ۔ دوسری جگہ آتا ہے۔ وَکَاَیِّنْ مِنْ نَبِیٍّ قٰتَلَ مَعَهٗ رِبِّیُّوْنَ اور کتنے ہی نبی ہو گزرے ہیں جن کے ساتھ بہت سے ربانی لوگ لڑے امام راغب کے نزدیک ربی اور ربانی کے ایک ہی معنی ہیں۔ لفظ ربانی کی ساخت دیکھیے پھر ماہرین لغت نے جو اس لفظ کا روٹس بیان کیے ہیں اس پر غور کیجیے کیا یہ روٹس عربی ہے سرانی یا عبرانی زبانوں میں یہ روٹس نہیں ملتے۔

سبت:

سبت کے اصل معنی قطع (کاٹنا) ہے (امام راغب) اصطلاح میں ایک خاص دن تھا یہودیوں کو ہفتہ میں ایک دن یعنی شنبہ کو کاروبار بند رکھنے کا حکم تھا اس لیے وہ دن کاروبار کے قطع ہونے کی وجہ سے سبت کہلایا سَبَتَ یَسْبِتُ آرام کرنا، کام سے الگ ہو جانا۔

قرآن مجید میں آتا ہے وَيَوْمَ لَا يَسْبِتُوْنَ (الاعراف 163:7) جس دن وہ آرام نہ کرتے تھے۔ سبت نہ مناتے تھے۔ سَبَتَ رَاسَهٗ اس نے اپنا سر مونڈھا مَارَاَيْنَا الشَّمْسَ سَبْتًا ہم نے سورج کو ایک ہفتہ تک نہیں دیکھا۔ یہ لفظ زمانہ کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے۔ مثلاً اَقَمْتُ سَبْتًا میں ایک لمبا عرصہ کے لیے ٹھہرا۔ قرآن مجید میں آرام کے معنی میں یہ لفظ آیا ہے۔ ارشاد الٰہی ہے۔ وَجَعَلْنَا نَوْمَكُمْ سُبَاتًا ہم نے تمہاری نیند کو آرام کا ذریعہ بنایا ہے۔ یہود نے آرام والے دن کو اصطلاح کے طور پر سبت کہا۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ یہ لفظ یہود کے مذہبی ادب سے اخذ کیا گیا ہے۔ یہ لفظ اپنے مادہ کے لحاظ سے عربی لفظ ہے غیر زبان (عجمی زبان) کے لفظ کا عربی مادہ نہیں ہوتا۔ لہٰذا سبت عربی لفظ ہے۔

سکینت:

سَكَنَ سے مشتق ہے۔ سَكَنَ يَسْكُنُ سُكُوْن۔ حرکت کے بعد کسی چیز کے ٹھہر جانے کو سکون کہتے ہیں پس سکینت اطمینان قلب ہے۔ یا مرعوب نہ ہونا۔ سکینت اس حالت کا نام بھی ہے جب انسان کا میلان شہوات کی طرف سے رک جائے مادہ سکون سے (سکن) سے قرآن مجید میں مختلف شکلوں میں الفاظ آتے ہیں مثلاً مسکین، مسکن مسکنۃ، سکینۃ، سکونۃ، سکین وغیرہ قرآن مجید میں آتا ہے۔ فِيْهِ سَكِيْنَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ (البقرہ 248:2) جس میں تمہارے رب کی طرف سے سکون ہے۔ جب سکینۃ کے مادہ (روٹ) سے قرآن مجید میں مختلف شکلوں میں 69 الفاظ آئے ہیں پھر یہ کیوں کر کہا جا سکتا ہے کہ یہ لفظ ''سکینۃ'' غیر عربی ہے لسان العرب، تاج العروس، مفردات امام راغب دی عربک انگلش لیکسی کان جیسی مشہور لغات میں اس لفظ کی وضاحت کی گئی ہے کسی نے بھی اس لفظ کو غیر عربی نہیں کہا۔

طاغوت:

طغی سے مشتق ہے جس کے معنی ہیں حد سے گزرنا لَمَّا طَغَى الْمَاءُ (الحاقۃ 11:69) طَغَى يَطْغِيْ طُغْيَانٌ طِغْيَانٌ اور طَغْيٌ نافرمانی میں حد سے گزرنا طاغوت اس مادہ سے وزن فعلوت پر ہے اس سے مراد ہر سرکش اور ہر معبود جو اللہ کے سوا ہے واحد اور جمع میں استعمال ہوتا ہے ساحر کاہن اور نیکی کے راستے سے پھیرنے والے کو طاغوت کہا جاتا ہے۔ (مفردات امام راغب) بعض نے کاہن بعض نے ساحر، بعض نے باطل معبود اور بعض نے اصنام یعنی بت معنی لیے ہیں دراصل گمراہی کی طرف لے جانے والی طاقتیں طاغوت کے مفہوم میں آتی ہیں۔ قرآن مجید میں آتا ہے۔ اَلَّذِيْنَ كَفَرُوْا اَوْلِيٰٓـئُهُمُ الطَّاغُوْتُ يُخْرِجُوْنَهُمْ مِّنَ النُّوْرِ اِلَى الظُّلُمٰتِ (البقرہ 257:2) اور جو کافر ہیں ان کے دوست طاغوت (شیطان) ہیں اور انہیں روشنی سے نکال کر اندھیرے کی طرف لے جاتے ہیں۔ کسی ماہر لغت نے اس لفظ کو غیر عربی قرار نہیں دیا مختلف اقوال کی روشنی میں اس لفظ (طاغوت) کی تشریح کی ہے۔ دیکھیے مزید وضاحت کے لیے لسان العرب تاج العروس، مفردات امام راغب، دی عربک انگلش لیکسی کان۔ مادہ کے لحاظ سے یہ لفظ عربی ہے قرآن مجید نے سرکش اور باغی قوتوں کو مختلف الفاظ میں بیان کیا ہے۔ ان میں سے ایک لفظ طاغوت ہے۔

فرقان:

یہ لفظ فَرَقَ سے مشتق ہے۔ يَفْرُقُ اور يَفْرِقُ مضارع ہے۔ فرق اور فرقان مصدر ہیں فرق دو چیزوں کو الگ الگ کرنے کا نام ہے کہا جاتا ہے فَرَقَ بَيْنَ الشَّيْئَيْنِ اس نے دو چیزوں کو الگ الگ کر دیا۔

حق اور باطل میں فرق کو بھی کہا جاتا ہے۔ (مفردات امام راغب) فرق عام ہے قرآن مجید میں غزوہ بدر کو بھی فرقان کہا گیا ہے يَوْمَ الْفُرْقَانِ يَوْمَ الْتَقَى الْجَمْعَانِ (الانفال 41:8) خود قرآن کو بھی فرقان کہا گیا ہے تَبَارَكَ الَّذِيْ نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلٰى عَبْدِهٖ

(الفرقان 1:25) موسیٰ کو جو معجزات دیئے گئے تھے ان کو بھی فرقان کہا گیا ہے۔ وَاِذْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ وَالْفُرْقَانَ (البقرہ 53:2) یہاں فرقان سے مراد وہ معجزات ہیں جو موسیٰ علیہ السلام کو دیئے گئے تھے۔ تورات کا نام بھی فرقان ہے وہ نور بھی مراد ہے۔ جس سے انبیاء حق اور باطل میں فرق کرتے ہیں۔ مومن کا وہ نور جو حق اور باطل میں فرق کرتا ہے اس کو فرقان کہا گیا ہے۔ ارشاد الٰہی ہے۔ اِنْ تَتَّقُوا اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّكُمْ فُرْقَانًا (الانفال 29:8) فرقان کا مادہ (روٹ) مختلف صورتوں میں 78 دفعہ استعمال ہوا ہے لہٰذا فرقان بھی اپنے مادہ (روٹ) کے لحاظ سے عربی ہے۔

ماویٰ:۔ اس کا مادہ اَوی ہے۔ اَوَی یا وِی مصدر اُوِیًا اور اِوَاءٌ ہے۔ جس کے معنی ہیں پناہ لینا۔ ماویٰ کے معنی ٹھکانہ ہے قرآن مجید میں جہنم اور جنت دونوں کے ٹھکانے پر استعمال ہوا ہے۔ قرآن مجید ہے وَمَا وٰهُمُ النَّارُ (ال عمران 151:3) ان کا ٹھکانہ آگ ہے وَمَاوٰهُ جَهَنَّمُ (ال عمران 162:3) اور اس کا ٹھکانہ دوزخ ہے عِنْدَهَا جَنَّةُ الْمَاْوٰى (15:53) اس کے پاس جنت ہے جو اصل ٹھکانہ ہے تمام ماہرین لغت نے اس لفظ کو عربی قرار دے کر اس کی وضاحت کی ہے کسی نے بھی اس لفظ کو غیر عربی لفظ نہیں کہا۔ دیکھیے لسان العرب، تاج العروس مفردات امام راغب۔

یہ لفظ اپنے مادہ کے لحاظ سے کافی مختلف شکلوں میں استعمال ہوا ہے۔

مثانی:

اس کی اصل ثنی ہے ثنی یثنی دہرا کرنا، دوگنا کرنا۔ ثنی الارض اس نے زمین کو کاشتکاری کے لیے الٹ پلٹ کیا۔ ثانی عطفہ (9:28) اپنی کروٹ موڑ کر۔ ثناء حمد کو بھی کہتے ہیں اس لیے اس کا بار بار ذکر کیا جاتا ہے۔ مثانی مثناۃ کی جمع ہے قرآن کی سورتوں کو کہا گیا ہے اس لیے وہ بار بار دہرائی جاتی ہیں۔ یعنی ہمیشہ پڑھی جاتی ہیں ایک جگہ قرآن کو بھی مثانی کہا گیا۔ اَللّٰهُ نَزَّلَ اَحْسَنَ الْحَدِيْثِ كِتٰبًا مُّتَشَابِهًا مَّثَانِيَ (الزمر 23:39) قرآن مجید کو مثانی اس وجہ سے کہا گیا ہے اس کے فوائد بار بار اور سر نو تازہ ہوتے رہتے ہیں المثانی سے مراد سورہ فاتحہ بھی ہے کیونکہ یہ سورت نماز میں بار بار دہرائی جاتی ہے۔ مثانی کا مادہ قرآن مجید میں مختلف شکلوں میں تقریباً 29 دفعہ آیا ہے لہٰذا یہ لفظ عربی ہے غیر عربی (عبرانی وسریانی) الفاظ علم صرف کے لحاظ سے مختلف شکلیں اختیار نہیں کرتے۔ جب عربی مادہ فعل ماضی کی شکل میں ہو۔ تو اس کے 14 صیغے بن جاتے اسی طرح مضارع میں بھی 14 صیغے یہ صرف عربی زبان کی خصوصیت ہے۔ اگر کوئی لفظ ماضی اور مضارع میں 14,14 صیغے مختلف صورتیں اختیار کریں تو وہ لفظ عربی ہے۔

ملکوت:

اس کا مادہ مَلَكٌ ہے مَلَكَ يَمْلِكُ مَلْكًا، مُلْكًا مِلْكًا ملک کے معنی ہیں جس شے میں تصرف حاصل ہو۔ حکم کے ساتھ اس کے ضبط میں (مفردات امام راغب) لسان العرب میں ملک اور ملکوت کے معنی ایک ہی دیئے ہیں جب اللہ کی طرف مضاف ہو۔ سلطانہ و عظمتہ' یعنی اللہ تعالیٰ کا تسلط اور اس کی عظمت۔ قرآن مجید میں آتا ہے۔ مَلَكُوْتُ كُلِّ شَيْءٍ (88:23) اس کے ہاتھ میں ہر چیز کی حکومت ہے۔

قرآن مجید میں اس لفظ (ملکوت) کا مادہ (روٹ) مختلف شکلوں میں 207 دفعہ استعمال ہوا ہے۔ یہ اللہ کی صفت ہے اللہ کی جتنی صفات قرآن مجید میں استعمال ہوتی ہیں ان تمام کا مادہ (روٹ) عربی زبان ہے۔ کسی دوسری زبان سے مستعار نہیں لیا گیا۔

یہ ایک حقیقت ہے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے قبل عربوں کا اپنے اردگرد کے ممالک شام مصر وغیرہ کے ساتھ تجارتی

تعلقات کی وجہ سے میل ملاپ تھا۔ دوم ارامی اور سریانی اور عربی ایک ہی خاندان کی زبانیں ہیں۔ ان وجوہ سے غیر عربی الفاظ عربی زبان میں داخل ہوئے۔ عربوں نے ان الفاظ کو نحو کی اصطلاح میں ''معرب'' کی فہرست میں شامل کر دیا ہے یعنی یہ وہ الفظ ہیں جو دوسری زبان سے عربی میں داخل ہوئے ہیں۔ اس کے باوجود قرآن مجید وہ کتاب ہے جس میں غیر عربی کا ایک لفظ بھی نہیں اسی وجہ سے یہ کہا گیا ہے کہ ہم نے قرآن مجید کو عربی مبین میں نازل کیا ہے۔ امام شافعی، ابوعبیدہ اور ابن اوس قرآن مجید میں غیر عربی الفاظ کے استعمال کی سختی سے تردید کرتے ہیں۔ اگر یہ تسلیم بھی کر لیا جائے تب بھی یہ واضح ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے قبل وہ الفاظ عربوں کی عام بول چال اور اشعار میں استعمال ہوتے تھے اور معرب بن چکے تھے یعنی وہ عربی کا حصہ بن چکے تھے۔ لیکن میں حتمی طور پر اس بات کا قائل ہوں کہ قرآن مجید میں ایک لفظ بھی ایسا نہیں ہے جو غیر عربی ہے جیسا کہ ابن وراق نے 14 الفاظ بیان کیے ہیں۔ میں نے ان الفاظ کے روٹس سے یہ واضح کیا ہے کہ وہ الفاظ اپنی اصلیت کے لحاظ سے عربی ہیں۔ ان الفاظ کے بارے میں جو مختلف شکلوں میں قرآن مجید میں استعمال ہوئے ہیں۔ کسی زبان میں بھی الفاظ کے مادے افعال کی مختلف شکلیں اختیار نہیں کرتے۔ پھر مادہ سے مختلف الفاظ کی تخلیق کی جاتی ہے۔

جزو ثانی:

الفاظ کی مماثلت:

عربی، ارامی، سریانی عبرانی زبانوں میں کئی الفاظ مماثلت رکھتے ہیں۔ اس سے مستشرقین اور مخالفین نے یہ اعتراض اٹھایا ہے کہ محمدؐ نے الفاظ کے ساتھ خیالات بھی دوسری زبانوں سے مستعار لیے ہیں۔

جیسا کہ پہلے یہ وضاحت کی جا چکی ہے کہ قرآن مجید میں ایک لفظ بھی غیر عربی نہیں۔ ہاں عربی زبان میں رسول کریم صلعم کی بعثت سے قبل غیر عربی الفاظ داخل ہوئے تھے۔ وہ عربی زبان کا حصہ بن چکے تھے اور عام بول چال اور اشعار میں استعمال ہوئے تھے۔ وہ معرب الفاظ کی فہرست میں داخل ہوں گے۔

مماثل الفاظ کی فہرست:

شارٹر انسائیکلو پیڈیا آف اسلام میں قرآن کے مختلف الفاظ اور اصطلاحات کو بیرونی الفاظ اور اصطلاحات کی حیثیت سے پیش کیا گیا ہے۔

Shorter Encyclopedia of Islamic artical Quran PP 273,274

ارامی زبان: اللہ، الاہا، امت، امۃ، سجدہ، سکد، کرسی، کرسیا، مدینہ، مدینہ، مسجد مسلا، ملت، ملا

عبرانی زبان:

امت، امۃ، آیت اوت، جبروت، جبروت، جہنم گہنم، صدقہ، صداقہ، صلوٰۃ صلوتا، عاشورا، عاشور، قرآن کریانہ قربان، قوربان، کروبیوں، کروبین، ملت، ملّہ، مہر موہار، نبی، نابی۔

سریانی زبان:

دجال، دگالے یا دغالے، فرقان، فرکانا، مہر، مہرہ۔

حبشی زبان:

سجدہ، مسگاہ، منافق، منافق۔

فارسی زبان:

برزخ، فرخ

سامی زبان: ملائک۔ ملک

(ماخوذ از اسلام پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم اور مستشرقین مغرب کا انداز فکر مصنفہ ڈاکٹر عبدالقادر جیلانی ص 227)

ان کا استدلال یہ ہے کہ جس مذہب کے پاس اپنے الفاظ نہیں وہ تصورات سے بھی بیگانہ ہوتا ہے چونکہ مذکورہ الفاظ دوسری زبانوں سے مستعار لیے ہیں اس لیے سارے خیالات تصورات ارکین عبادات وغیرہ ان مذاہب سے مستعار ہیں۔ اللہ قرآن، صلوۃ، سجدہ ملائکہ مسجد آیت اور قربان، تمام الفاظ کے مادہ (روٹس) عربی زبان میں پائے جاتے ہیں پھر مختلف شکلوں میں استعمال بھی ہوتے ہیں۔ قاعدہ کلیہ ہے۔ عربی لفظ کا مادہ ہو۔ پھر وہ مختلف شکلوں میں استعمال ہوتا ہو۔ وہ عربی کا لفظ ہے۔ مثال کے طور پر صرف لفظ صلوٰۃ کی وضاحت کی جاتی ہے۔ الصلوٰۃ کا مادہ صلی ہے آگ کے جلانے پر بھی بولا جاتا ہے اور آگ میں داخل ہونے پر بھی يَصْلَى النَّارَ الْكُبْرٰى، يَصْلَوْنَ سَعِيراً صلوٰۃ کے معنی دعا، برکت دینا ہے۔ صلیت علیه کے معنی ہیں دعوت لہ یعنی میں نے اس نے دعا کی۔ یہ لفظ قرآن مجید اپنے مادہ کے لحاظ سے تقریباً 99 دفعہ استعمال ہوا ہے۔ لیکن اسلام میں الصلوٰۃ ایک خاص ہیئت عبادت کا نام ہے۔ جو رسول کریم صلعم نے اللہ سے وحی پا کر سکھائی جو تواتر کے ساتھ امت مسلمہ میں رائج ہے الغرض تمام الفاظ کے مادے ہیں جو عربی میں محفوظ آ رہے ہیں ماہرین لغت نے ان مادوں کی وضاحت کر دی ہے۔ لہٰذا یہ الفاظ عربی ہیں۔

دوسری توجیہ:

مذکورہ زبانیں ایک ہی خاندان سے تعلق رکھتی ہیں 5200 قبل مسیح تا 1500 قبل مسیح جو قومیں شام فلسطین عراق، عرب، فنیشیہ اور مصر میں آباد تھیں ان کی زبان میں مماثلت پائی جاتی ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ تمام اقوام جو بابلی امنوری کلدی، اموری، عبیری، عربی اور مصری کہلاتی ہیں۔ سب کی سب ایک نسل سامی سے تعلق رکھتی ہیں مورخین کی موجودہ تحقیق کی رو سے ان کا مسکن خطہ عرب تھا۔ یہ اقوام ترک وطن کر کے اردگرد کے مختلف ممالک میں آباد ہو گئیں۔ یہ تمام اقوام ایک خطہ سے نقل مکانی کر کے دوسرے علاقوں میں گئی ہیں۔ وہ زبان بھی اس خطہ میں اپنے ساتھ لے کر گئیں۔ مرور زمانہ سے زبانوں میں اختلاف پیدا ہوتا گیا لیکن کئی الفاظ پرانی زبان کے محفوظ بھی رہے۔ ان تمام اقوام کا پہلے ایک علاقہ میں آباد ہونا پھر دوسرے علاقوں میں منتقل ہو جانا یہ ظاہر کرتا ہے کہ ان کی زبان میں بعض الفاظ کا اشتراک لازمی ہے۔ ان تمام زبانوں کا اصل ماخذ عربی ہے جو اپنے مادوں کے لحاظ سے محفوظ چلی آ رہی ہے۔ لہٰذا یہ اشتراک یہ ظاہر نہیں کرتا کہ عربی نے دوسری زبانوں کے الفاظ مستعار لیے ہیں۔ بلکہ عربی زبان کے الفاظ دوسری زبانوں میں پائے جاتے ہیں۔

تیسری توجیہ:

صرف سامی خاندان کی زبانوں میں ہی الفاظ کی مماثلت پائی نہیں جاتی بلکہ عربی الفاظ دنیا کی مختلف زبانوں میں ملتے ہیں۔ نمونہ کے طور پر چند الفاظ بیان کیے جاتے ہیں تا کہ معلوم ہو سکے کہ عربی اور دوسری زبانوں کے مادوں اور الفاظ ہیں صوری اور معنوی مشارکت اور مجانست کتنی ہے اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ عربی زبان ہی دوسری زبانوں کا ماخذ ہے۔

رگ وید دنیا میں سب سے زیادہ قدیم لٹریچر کی کتاب ہے اس کا آغاز ہی اگنی (بمعنی آگ) سے ہوا ہے۔ یہ لفظ عربی مادہ آج سے ماخوذ ہے جس کے معنی آگ کا بھڑکنا ہے اگ اور آج ایک ہی ہیں انگریزی لفظ ہسٹری (تاریخ) سٹوری (کہانی) لاطینی ہسٹوریکس عربی لفظ سطر سے ماخوذ ہیں جس کے معنی لکھنا ہے۔ پھر اس کے خاص معنی تاریخ اور قصہ کہانی کا لکھنا ہے پھر اس مادہ سے اسطورہ ماخوذ ہے جس کے معنی فسانہ اور قصے کہانی کے ہیں دیکھیے ان الفاظ میں کتنی مشارکت اور مجانست ہے۔

عبرانی لفظ کوپھر (Kophor) بمعنی ڈھانکنا انگریزی لفظ کور (Cover) بمعنی ڈھکنا عربی زبان کے لفظ کفر سے ماخوذ ہے جس کے معنی ڈھانپنا ہے جرمنیک مادے قپ (بمعنی پکڑنا) برگ (بمعنی توڑنا) لیوق (بمعنی چمکنا) شک (کاٹنا) ویڈ (دیکھنا) مد (پیائش) بالترتیب عربی مادوں قبض (پکڑنا) فرق (توڑنا) الاق (بجلی کا چمکنا) شق (کاٹنا) بداء (ظاہر ہونا دکھلانا) مد (پیانہ) سے ماخوذہ ہیں۔ ان سب الفاظ میں کتنی صوری اور معنوی مشارکت پائی جاتی ہے۔ انگریزی لفظ ماسٹر (آقا نگران) عربی لفظ مُسَیْطِر (نگران) سے ماخوذ ہے اس طرح ایبیوز (گالی دینا) عربی الفاظ بذاء (گالی دینا) اَبْذَاء (کسی پر الزام لگانا) سے مشتق ہے۔

ریفیوض (Refuse) (انکار کرنا) عربی لفظ رفض (انکار کرنا، ترک کرنا) سے ماخوذ ہے۔

انٹیق (Antique) (قدیم) عربی زبان عتیق سے ماخوذ ہے۔ انجائے (Enjoy) (فائدہ اٹھانا خوشی ہیں) عربی لفظ اَنْتَجَعْ (پھولنا پھیلنا) اور نجع (فائدہ اٹھانا) سے ماخوذ ہے۔

انفیوز (Infuse) کسی چیز کا نفوذ کر جانا عربی زبان کے الفاظ انفذ یا نفذ سے مشتق ہے جس کے معنی ہیں کسی چیز میں نفوذ کرنا مینٹل (Mantle) (تولیہ) عربی لفظ مندیل (تولیہ) سے ماخوذ ہے اسٹیم (Esteam) اسٹیمٹ (Estimate) (قیمت لگانا اندازہ لگانا) عربی لفظ سے ماخوذ ہے۔

مین (Mean) کمینہ عربی لفظ مہین (کمینہ) سے ماخوذ ہے سورج سراج سے، ہوا ہوا سے دھکا دق سے گانا غنا سے آسمان سماء سے سوٹا سوط سے سیدھا سدید سے ماخوذ ہیں۔

اگر تمام زبانوں کا مطالعہ کیا جائے تو صاف معلوم ہو جائے گا کہ ہر زبان میں بے شمار الفاظ ہیں جو عربی سے لیے گئے ہیں چنانچہ اخبار الاندلس کا مصنف ایس پی سکاٹ تسلیم کرتا ہے انگریزی زبان کے سب سے زیادہ روزمرہ کی اصطلاحات بغیر تبدیلی کے عربی زبان سے لی ہوئی ہیں اب تک ہماری زبان میں موجود ہیں فرنچ زبان کے اکثر الفاظ عربی زبان سے ماخوذ ہیں۔ سپینی زبان کو تو بگڑی ہوئی عربی کہا جاتا ہے۔ زبان اطالیہ پر جو اثر صقلیہ کے مسلمانوں نے ڈالا صاف طور پر ظاہر ہے۔

تمام ماہرین لغت اس بات پر متفق ہیں کہ عربی زبان وہ زبان ہے جو ہمیشہ محفوظ چلی آتی ہے عربی زبان میں جو حجاز میں بولی جاتی ہے ہمیشہ سے محفوظ چلی آئی ہے۔

بقول پروفیسر وٹنی یہ زبان تو اپنی شکل وصورت میں اس دن بھی حجاز میں بولی جاتی تھی جب حضرت موسیٰ علیہ السلام ارض موعودہ کی تلاش میں اسرائیلیوں کو ہمراہ لے کر عرب کے ریگستانوں سے گزرے۔

جب یہ ثابت ہو گیا کہ عربی زبان ہی وہ زبان ہے جو اپنے مادوں کے لحاظ سے محفوظ زبان ہے۔ اور تمام تغیرات سے پاک ہے۔ نیز مادوں کے لحاظ سے بھی سب سے زیادہ زرخیز زبان ہے۔ ان مادوں سے کئی کئی مزید الفاظ تخلیق کیے جا سکتے ہیں۔ لہٰذا عربی اور دیگر زبانوں کے الفاظ کی مماثلت کی وجہ سے یہ کہنا کہ یہ الفاظ عربی زبان نے دوسری زبانوں سے مستعار لیے ہیں علمی لغزش ہے۔ حقیقت میں دوسری زبانوں نے عربی سے اخذ کیے ہیں کیونکہ عربی زبان کے مادے تو محفوظ ہیں اور تمام الفاظ اپنے مادوں سے تخلیق ہوئے۔

چوتھی توجیہ:

زبان کی تشکیل اور تخلیق کے بارے میں مختلف نظریئے ہیں ان پر بحث کرنا باعث طوالت ہے۔ ایک نظریہ یہ بھی ہے کہ زبان الہامی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے زبان سکھائی۔ پھر سوال پیدا ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلے کون سی زبان سکھائی۔ بعض محققین کی یہ تحقیق ہے عربی وہ زبان ہے جو الہامی زبان ہے اور تمام زبانوں کی ماں ہے۔ اس موضوع پر سیرت سید البشر حصہ سوم میں زیر عنوان ''قرآن مجید عربی زبان میں کیوں نازل کیا گیا'' بحث کر چکا ہوں اعادہ کی ضرورت نہیں۔

☆......☆

قرآن مجید بے ربط کتاب ہے

اعتراض: پیچیدہ بے ربط تکرار والی اور غیر فصیح کتاب ہے۔

Thomas Carlyle; On Heros, Heroship and Heroic in the history PP 64.65

جواب: کارلائل نے جہاں قرآن مجید کو پیچیدہ، بے ربط، تکرار والی اور غیر فصیح کتاب بیان کیا ہے ساتھ ہی اس کے متضاد یہ لکھ دیا ہے۔ ''اس کا اصل حسن عربی زبان میں ہے اور چونکہ ہم عربی سے نابلد ہیں اس لیے اس کے حسن اور خوبیوں کا ادراک نہیں کر سکتے حقیقت یہ ہے کہ اہل زبان یا اس زبان کا کوئی ماہر ہی زبان کے حسن اور رعنائی سے آگاہ ہو سکتا ہے۔ انگریزی سے نابلد شخص سیکسپیئر کے ڈراموں کی زبان کے حسن اور فنی خوبیوں اور فصاحت و بلاغت سے آشنا نہیں ہو سکتا۔ جب وہی ڈرامہ ماہر لغت انگریزی یا اہل زبان کے سامنے پڑھا جائے تو وہ سر دھننے لگ جاتا ہے اسی طرح غالب کے کلام کی فصاحت و بلاغت، خوبی اور رعنائی ماہر لغت اردو ہی جان سکتا ہے۔ جو لغت، قواعد اور علم معانی سے نا آشنا ہے۔ وہ غالب کے کلام سے لطف اندوز نہیں ہو سکتا یہی تمام زبانوں کے متعلق قاعدہ کلیہ ہے وہی شخص زبان کے حسن پر آگاہی حاصل کر سکتا ہے جو اس زبان کی باریکیوں سے آشنا ہوتا ہے اگر کارلائل قرآن مجید کو غیر فصیح گنجلک پُر پیچ اور تکرار والی کتاب کہتا ہے تو اس کی وجہ واضح ہے کہ عربی زبان کے رموز کو نہیں جانتا۔ جس کا خود اس نے اعتراف کیا ہے۔ اس اصولی جواب کے بعد نزول قران کے دور کے چند فصحاء و بلغاء کے خیالات بھی بیان کرتا ہوں آخر کار قران مجید نے خود بے مثل کتاب ہونے کا دعویٰ کیا ہے۔ اس کی کچھ حقیقت ہے پھر آج تک کوئی شخص اس کی مثل کتاب نہیں بنا سکا۔

عتبہ بن ربیعہ کا خراج تحسین:

مسلمانوں کی تعداد روز بروز بڑھتی جا رہی تھی دوسری طرف مخالفت کی آگ تیز ہوتی جا رہی تھی۔ تو ایک روز مکہ کا ممتاز رئیس اور دانشور عتبہ بن ربیعہ قریش کے روساء سے مشورہ کر کے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا تو مخالفت کی آگ کو ختم کرنے کے لیے چند تجاویز پیش کیں کہ ''تم نے نبوت کا دعویٰ اگر اس لیے کیا ہے کہ اس ذریعے سے بہت سی دولت اکٹھی کر کے مکہ کے مال دار ترین شخص بن جاؤ یا اس سے تمہارا مقصد سرداری حاصل کرنا ہے یا تم بادشاہ بننا چاہتے ہو (اے میرے بھتیجے) یہ سب چیزیں ہم خود تمہارے لیے مہیا کر سکتے ہیں یعنی اتنا مال و دولت دے دیں گے کہ تم مکہ کے امیر ترین شخص ہو جاؤ گے اپنا سردار بنا لیں گے اگر خواہش کرو گے تو تمہیں

بادشاہت بھی دلوا دیں گے لیکن اگر ان میں سے کوئی بات نہیں اور تم پر جن یا آسیب کا سایہ ہے تو کسی اچھے حکیم کو بلا کر ہم اپنے خرچ پر تمہارا علاج کرائیں گے یہاں تک کہ تم بالکل تندرست ہو جاؤ گے۔"

عتبہ کی گفتگو کے جواب میں آپ ﷺ نے سورہ حم سجدہ کی ابتدائی آیات مقام سجدہ تک تلاوت فرمائیں اور فرمایا اے ابو ولید تم نے اپنی باتوں کا جواب سن لیا۔ اب تمہیں اپنے معاملہ کا اختیار ہے۔

عتبہ قرآنی آیات کو سن کر ورطہ حیرت میں ڈوب گیا اور بدلے ہوئے ذہن کے ساتھ دوسرے سرداروں کے پاس گیا اور کہا۔

"اے سرداران قریش! میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ (محمد ﷺ سے) ایسی باتیں سن کر آ رہا ہوں جو اس سے پہلے کبھی نہیں سنی تھیں۔ (محمد کا کلام) یعنی قرآن نہ تو شاعری ہے نہ یہ کاہنوں کی سی باتیں ہیں، نہ یہ سحر ہے اے سرداران قریش تم میری بات مان لو۔ اور محمد ﷺ کو اللہ کے حال پر چھوڑ دو جو باتیں میں اس سے سن کر آیا ہوں۔ انہیں دنیا میں پھیلنے سے کوئی روک نہیں سکے گا۔ اس لیے تم ان کی مخالفت نہ کرو۔ (السیرۃ النبویۃ لابن ہشام الجزء الاول ص 314,313)

قرآن مجید کی فصاحت کا یہ حال ہے کہ دشمن بھی سن کر اس کی عظمت کے سامنے سرنگوں ہو جاتا ہے۔

نصر بن حارث کا خراج تحسین:

نصر بن حارث مکہ کا سردار حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا شدید دشمن تھا۔ ایک دن اس نے خالی الذہن ہو کر قرآن مجید سنا تو اس کے دل کی حالت ہی بدل گئی ایک روز قریش کی مجلس میں اچانک کھڑا ہو گیا تو یوں گویا ہوا۔ "اے معشر قریش! تم میں ایک امر عظیم نازل ہوا ہے۔ جسے دور کرنے کی تم لاکھ کوشش کرو، کامیاب نہیں ہو سکتے۔ (یہ امر عظیم محمد کا معاملہ ہے) کہ جب وہ تمہارے درمیان ایک نوجوان کی حیثیت سے زندگی گزار رہا تھا تو تم اسے صادق اور امانت دار کہتے تھے۔ لیکن جب وہ پختہ عمر کو پہنچا اور تمہارے پاس وہ چیز (قرآن) لایا۔ (جسے تم ناپسند کرتے ہو) تو تم نے کہنا شروع کر دیا کہ یہ ساحر ہے۔ خدا کی قسم محمد ہرگز جادوگر نہیں ہم نے جادوگروں کو دیکھا ہے ان کے جادو کرنے کے عمل اور جادہ کرتے ہوئے جو وہ بول پڑھتے ہیں ہم نے ان کا بھی مشاہدہ کیا ہے پھر تم نے کہا کہ یہ کاہن ہے تو خدا کی قسم محمد ﷺ کاہن بھی نہیں ہو سکتا، ہم کاہنوں کو جانتے ہیں، ان کی حالت اور ان کی کہانت کے طور طریقوں سے خوب واقف ہیں پھر تم نے کہا کہ محمد شاعر ہے تو خدا کی قسم شعر کی مختلف اصناف، اس کی بحور مثلاً "ہزج" اور "رجز" وغیرہ سے بھی بخوبی واقف ہیں (اس لئے محمد ﷺ شاعر نہیں ہو سکتا) پھر تم نے کہا کہ محمد جنوں کے مرض میں مبتلا ہے تو خدا کی قسم وہ مجنوں بھی نہیں کیونکہ جس شخص پر آسیب وغیرہ کا سایہ ہو۔ اس کی ساری علامات کا ہمیں علم ہے پس اے جماعت قریش تم اپنے بارے میں غور و فکر سے کام لو۔ خدا کی قسم تمہارے پاس (قرآن کی صورت میں) ایک امر عظیم آیا ہے۔ (السیرۃ النبویہ لابن ہشام الجزء اول ص 320)

خالد بن عقبہ:

خالد بن عقبہ رسول کریم صلعم کی خدمت میں حاضر ہوا عرض کی اے محمد ﷺ! مجھے قرآن سے کچھ سناؤ۔ آپؐ نے سورۃ النمل کی چند آیات سنائیں خالد قرآن سے اتنا متاثر ہوا ہے پکار اٹھا "اے محمدؐ ایک بار پھر پڑھو" حضور ﷺ نے پھر تلاوت کی تو اس وقت برجستہ قرآن مجید کی تعریف میں یہ اشعار پڑھے۔

وَاللّٰہِ اِنَّ لَہٗ لَحَلَاوَۃٌ   وَاِنَّ عَلَیْہِ لَطَلَاوَۃٌ

وَاِنَّ اَوَّلَـہٗ لَـمُغْدَقٌ   وَاِنَّ آخِرَہٗ لَمُثْمِرٌ

وَمَا يَقُوْلُ هٰذَا الْبَشَر (اسد الغابہ جلد ثانی ص 90 مولفہ ابن اثیر) یعنی خدا کی قسم اس کلام (قرآن) کی عجیب شیرینی ہے اور یہ اپنی تیرو تازگی میں بھی عجیب تر ہے اس کا آغاز سرابی ہے اور اس کا آخر پھلوں کی کثرت ہے۔

لبید کی ترک شعر گوئی:

لبید زمانہ جاہلیت کا بہت بڑا شاعر تھا جب وہ دائرہ اسلام میں داخل ہوا۔ وہ قرآن مجید کی فصاحت و بلاعت سے اتنا مسحور ہو چکا تھا اس نے شعر گوئی ترک کر دی ایک روز حضرت عمر نے اس سے خواہش ظاہر کی کہ اپنا کلام سنایئے تو اس نے جواب دیا۔

''جب سے مجھے اللہ تعالیٰ نے سورۃ بقر اور سورۃ ال عمران کا علم عطا کیا ہے اس کے بعد میں نے شعر کہنا ترک کر دیا۔ (اسد الغابہ فی معرفۃ الصحابہ مولفہ ابن اثیر جلد چہارم ص 246)

قرآن مجید کی فصاحت و بلاغت پر ایک شہادت نہیں۔ ہزاروں شہادتیں ہیں جن سے قرآن مجید کی فصاحت و بلاعت کا اظہار ہوتا ہے طوالت کے خوف سے صرف چند شہادتوں پر ہی اکتفا کیا ہے۔

تکرار:

قرآن مجید نے خود ہی اس کا جواب قرآن مجید میں بیان کر دیا ہے اور تکرار کی حکمت بھی بیان کر دی ہے۔ ارشاد الٰہی ہے۔

وَكَذٰلِكَ نُصَرِّفُ الْاٰيٰتِ وَلِيَقُوْلُوْا دَرَسْتَ وَلِنُبَيِّنَهٗ لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ (الانعام 105:6)

اور اسی طرح ہم باتوں کو بار بار بیان کرتے ہیں اور تاکہ وہ کہیں تو نے خوب پڑھا ہے اور تاکہ ہم اسے ان لوگوں کے لیے کھول کر بیان کریں جو جانتے ہیں۔

دوسری جگہ آتا ہے۔

وَلَقَدْ صَرَّفْنَا فِيْ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لِيَذَّكَّرُوْا وَمَا يَزِيْدُهُمْ اِلَّا نُفُوْرًا (بنی اسرائیل 41:17)

اور یقیناً ہم نے اس قرآن میں طرح طرح کے پیرائے اختیار کیے تاکہ وہ نصیحت حاصل کریں۔ اور یہ بات (بھی) ان کی نفرت ہی بڑھاتی ہے۔

بار بار اور مختلف پیرایوں میں کسی مضمون کے بیان کرنے کی غرض بیان کر دی کہ کسی طرح سے لوگ سمجھ جائیں ایک شخص ایک پیرایہ بیان سے فائدہ اٹھاتا ہے دوسرا شخص کسی دوسرے پیرایہ سے لہٰذا ایک مضمون کا مختلف پیرایوں میں بیان کرنا لوگوں کو سمجھانا مقصود ہے۔ تکرار سے مسئلہ کو ذہنوں میں بٹھانا مقصود ہے۔ مضمون کی اہمیت کی وجہ سے اس کو بار بار بیان کیا جاتا ہے۔ مثلاً قرآن مجید میں صلوٰۃ (نماز) کا ذکر بار بار آیا ہے۔ یہ نماز کی اہمیت واضح کرنے کے لیے تکرار کی گئی ہے۔

تکرار سے نتائج اور فوائد الگ الگ ہوتے ہیں۔ نماز کا تکرار ہے ہر تکرار میں نماز کے مختلف پہلوؤں کو اجاگر کیا گیا ہے اس لیے بعض مفسرین نے قرآن مجید میں تکرار تسلیم ہی نہیں کی۔ اُن کا یہ استدلال ہے۔ جہاں کسی موضوع کا تکرار ہے تو وہاں اس موضوع کا کوئی دوسرا پہلو نمایاں کیا گیا ہے۔ کیونکہ یہ ایک ہی مضمون کو دوسرے پہلو کو بیان کرنے کے لیے بیان کیا گیا ہے۔ لہٰذا وہ تکرار کے زمرے میں نہیں آتا۔

الزامی جواب:

اگر انجیل کا مطالعہ کیا جائے تو ایک ہی بات کو کئی کئی بار دہرایا گیا ہے۔ مثال کے طور پر ''خدا کی بادشاہت'' یا ''آسمان کی

بادشاہت" چاروں (ا) ناجیل میں بادشاہت کا ذکر متواتر سے کیا گیا ہے۔

خدا کی بادشاہی:

"خدا کی بادشاہی تمہاری ہے۔" (لوقا انجیل باب 6 آیت 21)

"لیکن جو خدا کی بادشاہی میں چھوٹا ہے۔" (لوقا 28:7)

"خدا کی بادشاہی کی خوش خبری سناتا ہوا۔" (لوقا 1:8)

"خدا کی بادشاہی کی منادی۔" (لوقا 2:9)

"خدا کی بادشاہی کی منادی۔" (لوقا 2:9)

"خدا کی بادشاہی کی خبر پھیلا۔" (لوقا 61:9)

"خدا کی بادشاہی تمہارے نزدیک آ پہنچی ہے۔" (لوقا 9:10)

"خدا کی بادشاہی نزدیک آ پہنچی ہے۔ (لوقا 12:10)

"خدا کی بادشاہت کی خوشخبری دی جاتی ہے۔" (لوقا 16:15)

گمشدہ بھیڑیں:

"(صرف) اسرائیل کے گھرانے کی کھوئی ہوئی بھیڑوں کے پاس جانا۔" (متی 6:10)

"میں اسرائیل کے گھرانے کی کھوئی ہوئی بھیڑوں کے سوا اور کسی کے پاس نہیں بھیجا گیا۔" (متی 24:15)

"میری بھیڑیں میری آواز سنتی ہیں اور میں انہیں جانتا ہوں اور وہ میرے پیچھے پیچھے چلتی ہیں۔" (یوحنا 27:10)

☆......☆

قرآن اور شعراء عرب کے دواوین میں مطابقت

اعتراض: قرآن عرب شعراء کے دیوان کے مطابقت رکھتا ہے۔ (نولڈیکے ڈکشنری آف اسلام صفحہ 487,486) کلائن (Klien)

The Religion of Islam P4

جواب: قرآن مجید اور عرب شعراء کے دوانین میں کسی رنگ میں مطابقت نہیں ہے۔ قرآن مجید سورۃ (بڑا حصہ) آیت (چھوٹا حصہ) فاصلہ (آخری حرف) میں تقسیم ہے ایک سورت کئی آیات پر مشتمل ہے۔ پھر آیت کا دوسری آیت کے درمیان ایک فاصلہ ہے۔ جبکہ شعراء کا کلام (دیوان) قصیدہ (بڑا حصہ) بیت (چھوٹا حصہ) قافیہ (آخری حصہ) پر مشتمل ہے۔ لہٰذا کوئی مطابقت نہیں۔

☆......☆

موجودہ قرآن مجید میں بعض فقرے ناقص اور ٹوٹے ہوئے ہیں

اعتراض: حضرت عثمان والے نسخے مکمل نہیں تھے۔ کیونکہ ان میں بعض فقرے ایسے پائے جاتے ہیں جو کھلے طور پر ناقص اور ادھورے ہیں اور بتا رہے ہیں کہ ان کی عبارتوں کا کچھ حصہ جس سے ان تکمیل ہوتی تھی۔ ضائع ہو گیا ہے۔ (انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا)

دلیل اول:

جواب: سیرت سید البشر حصہ دوم زیر عنوان ''اسلامی تعلیمات کے ماخذ'' میں قرآن مجید کی تدوین اور حفاظت پر لکھتے ہوئے مضبوط اور قطعیۃ الدلالت شہادتوں سے یہ واضح کیا ہے کہ قرآن ہر پہلو سے محفوظ کتاب ہے۔ نہ اس میں کچھ کم کیا گیا ہے اور نہ کچھ بڑھایا گیا ہے۔ جن الفاظ میں وحی نازل ہوتی حکم خداوندی سے اس کی ترتیب دی جاتی لکھوا دی جاتی تھی۔ بے شمار صحابہ ان کو یاد کر لیتے تھے۔ گویا قرآن مجید عہد رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم میں تحریری شکل میں بھی محفوظ ہو گیا تھا۔ اس لیے یہ کہنا کہ حضرت عثمان والا نسخہ نامکمل ہے۔ اس میں بعض فقرے ایسے پائے جاتے ہیں جو کھلے طور پر ناقص اور ادھورے ہیں بلا دلیل اعتراض ہے۔ جس میں کوئی وزن نہیں۔

دلیل دوم:

اگر قرآن مجید کا کوئی فقرہ کسی ایک شخص کی نظر میں ادھورا دکھائی دیتا ہے۔ تو اس سے یہ نتیجہ نکالنا کہ اصل فقرہ ضرور کچھ اور ہو گا۔ اور اس کا کچھ حصہ ضائع ہو گیا ہو گا۔ یہ لایعنی مفروضہ ہے۔ اس مفروضہ کے رد میں میں پھر پہلی دلیل دہراتا ہوں کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جو وحی قرآن صحابہ کو سکھائی انہوں نے اس کو حفظ یاد کر لیا۔ اور اس کے ساتھ اس کو احاطہ تحریر میں لایا گیا۔ اب جو چیز سینوں میں محفوظ ہو۔ اور احاطہ تحریر میں لائی گئی ہو۔ تو وہ کلام ادھورا کیسے رہ سکتا ہے لہٰذا کسی شخص کو کوئی قرآنی فقرہ مکمل معلوم نہیں ہوتا اس لیے کہ اس کا کچھ حصہ ضائع ہو گیا ہو گا تاریخی شہادت کے خلاف ہے اور محض مفروضہ پر عمارت تعمیر کی گئی ہے۔ معترضین نے جن فقروں کو ادھورا اور نامکمل کہا ہے دراصل ان کی عربی زبان سے ناواقفیت کی وجہ ہے۔ جہاں کمال فصاحت و بلاغت کسی فقرہ میں پائی جاتی ہے۔ وہ ان کی عدم واقفیت کا نتیجہ ہے۔ بعض آیات کا باہمی تعلق، بڑا باریک اور گہرا ہوتا ہے۔ جو عربی زبان سے ناواقف ہے۔ اس کو سمجھ نہیں پاتے دوم قرآنی رموز اور اسرار سے ناآشنا ہے تو سطحی نظر رکھنے والا شخص اپنی کم علمی کی وجہ سے فقرہ کو ادھورا ہی کہہ دے گا۔ علماء کرام نے ربط آیات اور ربط سور پر بہت کام کیا۔ یہ ایک بڑا ادقیق علمی مسئلہ ہے بہرحال معترض کا اعتراض محض عربی زبان کی ناواقفیت کی بناء پر کیا ہے۔

قرآن مجید میں کوئی فقرہ ادھورا اور نامکمل نہیں۔

دلیل سوم:

معترض اسی بات کی تائید میں کہ بعض فقرے ناقص پائے جاتے ہیں انسائیکلوپیڈیا میں لکھتا ہے کہ چند چھوٹے چھوٹے اور الگ الگ ٹکڑے اب تک ایسے پائے جاتے ہیں جو اصل میں قرآن کا حصہ تھے مگر زید نے ان کو شامل نہیں کیا۔ چند احادیث کا ذکر کیا ہے ان احادیث کی صحت پر بعد میں بحث آئے گی۔ معترض ان احادیث کو لا کر یہ ثابت کرنا چاہتا ہے کہ جو فقرے ناقص پائے جاتے ہیں انہیں کے ٹکڑے اب تک احادیث میں موجود چلے آ رہے ہیں۔ معترض نے یہ بات بھی مفروضہ پر قائم کی ہے معترض کو اپنے دعویٰ کو مضبوط کرنے

کے لیے یہ ضروری تھا کہ وہ مزعومہ ادھورے فقرہ کو کسی حدیث میں بیان کردہ فقرہ سے ملا کر یہ ثابت کر دیتا ہے کہ ادھورا فقرہ حدیث کے اس فقرہ سے مکمل ہو گیا ہے لیکن معترض نے نہ ادھورے فقرہ کو کسی حدیث کے ٹکڑے سے ملا کر مکمل کیا ہے نہ یہ نشان دہی کی ہے کہ اگر اس مزعومہ ادھورے فقرہ کو حدیث کے ساتھ ٹکڑے ملا دیا جائے تو نامکمل فقرہ مکمل بن جائے گا۔ احادیث کے جو ٹکڑے بیان کیے جاتے ہیں ان کے لیے قرآن مجید میں کہیں بھی جگہ بنتی نظر نہیں آتی۔ یہ معترض کا کام ہے کہ وہ حدیثوں کے ٹکڑوں کو قرآن میں کسی جگہ رکھے اور بتائے حدیث کا یہ ٹکڑا اس جگہ کا ہے۔ الغرض معترض کی بنیاد محض مفروضہ پر ہے کوئی حقیقت نہیں نہ کوئی دلیل ہے۔ بغیر دلیل کے اعتراض کیا ہے۔

دلیل چہارم:

قرآن مجید کے بعض حصے گم ہو گئے تو اس کی تائید میں یہ دلیل دیتے ہیں کہ حضرت عثمان نے سوائے ان صحیفوں کے جو اپنی نگرانی میں تیار کرائے تھے باقی تمام صحائف جلا دیئے تھے ان کی نقلیں شائع نہ ہونے دیں۔ نیز بعض احادیث میں یہ ذکر ہے کہ بعض عبارتیں اصل میں قرآن مجید میں پائی جاتی تھیں جواب اس میں داخل نہیں اور بعض فقرے موجودہ قرآن میں ناقص ہیں اور کہ شیعہ اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ وہ حصے جو حضرت علی کے فضائل سے متعلق تھے وہ قرآن سے نکال دیئے گئے ہیں۔ اس مفروضہ کے متعلق پہلی بات یہ ہے کہ جب حضرت عثمانؓ نے صحائف تیار کرا کے مختلف اقالیم میں بھیجے اور دوسرے نسخوں کو جلانے کا حکم دیا تو اس کے بعد وہ اختلاف جو صحیفہ عثمانی اور دیگر صحائف میں بتائے جاتے ہیں یا تو موجود رہے یا نابود ہو گئے۔ اگر ایسے اختلاف صحف عثمانی کی اشاعت سے رک گئے تھے پھر وہ روایات جن میں یہ ذکر پایا جاتا ہے کہ فلاں عبارت قرآن مجید میں داخل تھی لیکن غلط ثابت ہوتی ہے۔ اگر ایسے اختلاف بعد میں بھی محفوظ چلے آئے تو یہ سوال اٹھتا ہے کہ ایسے نسخے قرآن مجید کے دنیا سے کیوں نابود ہو گئے۔ اگر وہ حضرت عثمان کے دور حکومت میں وہ شائع نہیں ہو سکتے تھے جب ان کا دور حکومت ختم ہو گیا اور حضرت علی خلیفہ منتخب ہو گئے۔ وہ ان حصوں کو جو حضرت عثمان کے تیار کردہ صحیفہ میں موجود نہیں وہ درج کر دیتے۔ کوئی امر مانع نہیں تھا۔ تاریخ اس بات پر شاہد ہے کہ حضرت علیؓ نے حضرت عثمانؓ کے تیار کردہ صحیفہ میں کوئی تغیر و تبدل نہیں کیا یہ بات ظاہر کرتی ہے کہ حضرت علیؓ کو بھی صحیفہ عثمانی سے کلی طور پر اتفاق تھا۔

ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ آیا جو حدیثوں میں عبارتیں پائی جاتی ہیں کیا وہ گم شدہ قرآن کے حصص ہیں۔ پہلی بات تو یہ ہے جو چیز ہی گم ہو گئی۔ نابود ہو گئی۔ اس کا وجود ہی نہیں رہا۔ تو وہ حدیث میں کیوں کر موجود ہو سکتی ہے۔

دوم: اگر یہ مان لیا جائے کہ گم شدہ حصص احادیث میں ہی ہیں تو پھر حدیث والے حصوں کو قرآن مجید میں اصل جگہ رکھ کر بتایا جائے کہ قرآن مجید کا ناقص ٹکڑا حدیث کے اس ٹکڑے سے مکمل ہو گیا ہے لیکن معترض نے ایسا نہیں کیا کہ حدیث کا ٹکڑا لے کر قرآن مجید کے ناقص ٹکڑے سے ملا دیا ہو۔ آخر حدیث کے ٹکڑے جو قرآن مجید کے گم شدہ ٹکڑے کہا جاتا ہے کہاں رکھے جائیں۔ الغرض یہ بات دلائل قاطعہ سے ثابت ہے کہ قرآن مجید وہ کتاب ہے۔ نہ اس میں کچھ کم ہوا ہے اور نہ اس میں کچھ بڑھایا گیا ہے۔ معترض کا یہ اعتراض کہ قرآن مجید غیر محفوظ کتاب ہے بالکل باطل ہے۔

دلیل پنجم:

علمائے اہل تشیع کا مذہب:

یہ نظریہ کہ قرآن مجید میں بعض آیات ایسی تھیں جن میں حضرت علیؓ کی فضیلت اور خلافت کی تائید ہوتی تھی حضرت عثمانؓ نے نکلوا دیں اس نظریہ کو اکابر علما مفسرین نے لغو اور بیہودہ قرار دے کر رد کر دیا ہے۔ چنانچہ ممتاز شیعہ عالم اور مجتہد علامہ سید علی نقی مرحوم نے فرقہ شیعہ

کا نظریہ حفاظت قران کھل کر بیان کیا ہے۔ رقمطراز ہیں۔

''جب لڑائیوں میں حفاظ قرآن کی کثیر تعداد قتل ہوگئی۔ اور خوف پیدا ہوا کہ کہیں حاملان قرآن کے قتل ہونے کے سبب قرآن کا کثیر حصہ تلف نہ ہو جائے تو اس وقت جمع قرآن کی ضرورت محسوس کی گئی۔ اور اس خدمت کو زید بن ثابت کے سپرد کیا گیا جو رسالت مآب کے آخری زمانے کے صحابہ میں سے ایک فرد تھے۔ انہوں نے بڑی جان فشانی وعرق ریزی کے ساتھ مختلف صحابہ کرام سے متفرق اجزا سے جو پتھر، چمڑے لیف خرما (کھجور کی چھال مرتب) وغیرہ پر تھے۔ نیز ان (حفاظ صحابہ مولف) سے دریافت کر کے ان کے محفوظات کی مدد سے قرآن مجید جمع کیا۔ اس میں یقیناً کوئی فروگذاشت اور کمی نہیں تھی۔ سوائے اس کے کہ وہ ترتیب نزول کے مطابق نہ تھا۔'' (مقدمہ تفسیر القرآن ص96، ادارہ علمیہ پاکستان لاہور)

مولانا اس کے بعد اہل تشیع کے مسلک کی یوں وضاحت کرتے ہیں۔

''ہم نے بار بار اعلان کیا اور پھر اعلان کرتے ہیں کہ ہم اسی دونوں دفتیوں کے درمیان والے قرآن میں جو مسلمانوں کے ہاتھوں میں موجود ہے کسی قسم کا شبہ نہیں رکھتے اور ہم اس کو کلام الٰہی رسول کا اعجاز اور اسلام کی سچائی کا نشان اور تمام مسلمانوں کے لیے لازم العمل اور واجب الاتباع سمجھتے ہیں۔ (تفسیر القرآن ص22)

اس کے بعد ایک اور عالم شیعہ ملا محسن المعروف فیض الکاشانی کے خیالات درج کیے جاتے ہیں۔ ترجمہ ''ہمارے ساتھیوں میں سے بعض لوگوں نے روایت کیا ہے کہ قرآن میں تغیر وتبدیل کیا گیا ہے اور اس میں کمی کی گئی ہے (مگر) ہمارے اکابر کا یہ مذہب نہیں بلکہ اس کے برعکس ہے۔ قرآن تو اعجاز نبوت ہے اور تمام دینی احکام کا سرچشمہ، مسلمان علماء نے اس کی حفاظت اس حد تک کی ہے کہ اس پر جو اعراب لگائے گئے ہیں اور اس کی قراتوں اور اس کی آیات کے بارے میں جو اختلافی آرا ظاہر کی گئی ہیں ان سب پر عبور حاصل کر لیا ہے گویا کوئی امر ان کی نظر سے پوشیدہ نہیں رہا۔''

پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ اس قدر احتیاط اور اس قدر نگرانی اور حفاظت کے اس قدر صحیح ترین انتظامات کے باوجود قرآن حکیم میں کوئی تغیر وتبدل ہوا ہو یا کوئی کمی ہوئی ہو (کتاب الصافی فی تفسیر القرآن مولفہ محمد بن المرتضیٰ محسن الملقب فیض الکاشانی الجزء الاول ص35,34)

آگے چل کر رقم طراز ہے۔

''یہی قرآن رسول کریم ﷺ کے عہد مبارک میں ہی اس صورت میں جمع ہو چکا تھا۔ جس صورت میں آج موجود ہے اس کے لیے یہ دلیل کافی ہے کہ یہی قرآن عہد رسالت میں پڑھا جاتا تھا اور حفظ کیا جاتا تھا۔ اصحاب رسول کی ایک جماعت میں سے بعض اصحاب جیسے عبداللہ بن مسعود اور ابی بن کعب نے کئی بار رسول اقدس کے سامنے اسے ختم کیا ان امور پر تھوڑا سا بھی غور وفکر کرنے سے واضح ہو جاتا ہے کہ قرآن (حضور اقدس کے زمانے میں ہی) مرتب ہو چکا تھا۔ وہ بکھرا ہوا اور متفرق ہرگز نہیں تھا۔ یہ بات ذہن میں رکھنی چاہیے کہ فرقہ امامیہ میں سے جن لوگوں نے اس کی مخالف رائے ظاہر کی ہے اس کی کوئی حقیقت نہیں کیونکہ ان کی بنیاد کمزور حدیثوں پر ہے۔ (کتاب الصافی فی تفسیر القرآن الجز الاول ص35,34)

☆......☆

ابن مسعود اور ابی بن کعب کے نسخہ ہائے قرآن عثمانی صحف سے مختلف ہیں

اعتراض: ''ابن مسعود کے مصحف میں پہلی سورۃ یعنی فاتحہ اور ایک سو تیرہویں اور ایک سو چودھویں سورتیں یعنی معوذتین نہیں لکھی گئیں اس کے برخلاف ابی نے اپنے مصحف میں دو دعائیہ فقرے زیادہ لکھ رکھے تھے۔ جن کو ہم (حضرت) محمد (مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم) کے سمجھ سکتے ہیں یہ بات آسانی سے سمجھ آسکتی ہے کہ اس قسم کے اختلافات ہوں گے کہ آیا ایسے دعائیہ جملے قرآن شریف کا جزو ہیں یا نہیں ان دونوں صحیفوں کی بعض قراتیں جو صحف عثمانی کی قراتوں سے مختلف ہیں محفوظ رہی ہیں اور ان کے پرانے اختلافات قرأت کی بھی ایک بڑی تعداد محفوظ ہو کر ہم تک پہنچی ہے ان میں سے ایک کثیر حصہ قراتوں کا ایسا ہے جو موجودہ قراتوں سے بہت کم درجہ کا ہے لیکن بعض قراتیں ایسی بھی ہیں جو مروجہ قرأت کے ہم پلہ ہیں اور چند ایک ایسی ہیں جن کو موجودہ قرأت پر ترجیح دی جاسکتی ہے۔'' (انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا)

پہلی دلیل:

جواب: مضمون نگار کا اعتراف کہ مصحف عثمانی ہی اصل ہے۔ مذکورہ اعتراض کا رد معترض کے اپنے ہی تحریر کردہ مضمون میں پایا جاتا ہے وہ خود اس بات کا اعتراف کرتا ہے کہ مصحف عثمانی ہی اصل ہے رقمطراز ہے۔ ''خصوصیت سے ہمیں اُبی کے نسخہ کے متعلق کچھ اطلاع ملتی ہے جو فہرست اس کی سورتوں کی دی گئی ہے اگر وہ صحیح ہے تو یہ ماننا پڑے گا کہ اُبی کے مصحف کی بنا بھی انہیں اصل مصحف پر ہوگی جو حضرت زید نے جمع کیے تھے۔ یہی بات ابن مسعود کے مصحف پر بھی صادق آتی ہے۔ اور اس کی فہرست مضامین سے بھی جو ہم تک پہنچی ہے یہ معلوم ہوتا ہے کہ لمبی سورتوں یعنی طوال کو پہلے رکھنے کے اصول پر ابن مسعود نے زید سے بھی بڑھ کر عمل کیا ہے۔''

مزید لکھتا ہے۔ ''اصل قرآن شریف وہی ہے جو عثمانی مصحفوں اور ان کی نقلوں میں موجود ہے۔'' یہ نتیجہ اپنے دلائل کی روشنی میں نکالتا ہے۔ الغرض معترض نے اپنے اعتراض کا رد خود یہ کہہ کر دیا ہے کہ مصحف عثمانی ہی اصل ہے دوم اُبی اور ابن مسعود کی بناء انہیں اصل مصحف پر ہوگی جو حضرت زید نے جمع کیے تھے حقیقت یہ ہے کہ قرآن مجید رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے وقت میں ہی جمع ہو چکا تھا۔ اسی بناء پر اُبی اور ابن مسعود کے مجموعے تیار ہوئے صحف عثمانی کے ساتھ مطابقت اسی وجہ سے تھی۔

دلیل دوم:

مخالفین نے حضرت عثمان پر بے شمار الزامات لگائے یہاں تک انہوں نے انہیں قتل (شہید) کر دیا ان الزامات میں یہ کہیں الزام نظر نہیں آتا کہ آپ نے قرآن مجید میں ردوبدل کیا ہے۔ قرآن مجید کسی ایک شخص کی ملکیت نہیں تھی یا صرف ایک شخص کے پاس ہی نہیں یا ایک ہی حافظ قرآن نہ تھا بلکہ ہزاروں حافظ تھے۔ بے شمار لوگوں کے پاس تحریری نسخے بھی تھے۔ اگر حضرت عثمانؓ نے ردوبدل کیا ہوتا تو

مخالفین سب سے پہلا الزام یہ لگاتے کہ اس نے قرآن مجید میں ردو بدل کیا ہے۔ صحابہ کا اس قسم کا اعتراض نہ کرنا یہ ثابت کرتا ہے کہ قرآن مجید کا وہ صحیفہ صحیح ہے جو حضرت عثمانؓ نے تیار کیا تھا۔

دلیل سوم:

معترض: کے اعتراض کے دو جزو ہیں ایک جزو یہ ہے۔

(۱) ابن مسعود کے مصحف میں معوذتین اور فاتحہ نہ لکھی گئی تھیں اور اُبی کے صحیفہ میں دو دعائیہ فقرے زائد لکھے ہوئے تھے دوم قرأتوں میں اختلاف تھا ان دونوں اختلاف پر غور کرنا ہے۔

پہلے اُبی کے صحیفہ کے متعلق لکھا جاتا ہے۔ پہلے یہ دیکھنا ہے کہ معترض نے جلال الدین سیوطی کی کتاب اتقان کی روایت پر رکھی ہے اس روایت کا صحت کے اعتبار سے کیا مقام ہے۔ اس حدیث کا مقام متعین کرنے کے لیے شاہ عبدالعزیز دہلوی کی کتاب عجالہ نافعہ کا حوالہ دیا جاتا ہے۔ جس سے معلوم ہو جائے گا کہ محدثین نے اس حدیث کو صحت کے لحاظ سے کیا مقام دیا ہے۔ شاہ صاحب احادیث کو چار طبقات میں تقسیم کرتے ہیں طبقہ اول میں جو سب سے زیادہ معتبر ہے وہ موطا امام مالک بخاری اور مسلم کو کہتے ہیں دوسرے طبقہ میں ابوداؤد ترمذی ونسائی کو رکھا ہے اور ان کو بلحاظ اعتبار کے طبقہ اول سے کم درجہ کی تسلیم کیا گیا ہے تیسرے طبقہ میں ایسی کتابیں رکھی گئی ہیں جن کی عام طور پر مقبولیت نہیں ہوئی۔ نہ قابل سند مانا گیا ہے بعض احادیث پر راویوں کے ثقہ ہونے پر اور ان کی راست گوئی پر بھی جرح کی گئی ہے اس طبقہ میں طبرانی طحاوی، بیہقی مستدرک حاکم مسند ابن ماجہ مسند دارمی اور چند کتابوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ سب سے آخری طبقہ احادیث کا چوتھا ہے جس کے متعلق شاہ صاحب لکھتے ہیں "طبقہ رابعہ احادیثے کہ نام ونشان اُنہا درقرون سابقہ معلوم نبود ومتاخراں انہارا روایت کردہ اند پس حال انہا از دوشق خالی نیست یا سلف تفحص کردند وانہارا اصلی نیافتہ اندنا مشغول برروایت انہا وعلی کل تقدیر ایں احادیث قابل اعتماد نیستند و مایہ تصانیف شیخ جلال الدین سیوطی ورسائل ونوادر خود ہمیں کتابہاست۔ یعنی چوتھے درجے کی حدیثیں وہ ہیں۔ جن کا گزشتہ قرون میں کہیں نام ونشان نہیں پایا جاتا اور متاخرین نے ہی ان کو روایت کیا ہے پس وہ احادیث دو حال سے خالی نہیں ہیں یا تو پہلے لوگوں نے خوب تحقیق ٹھیک کی اور ان احادیث کو اصلی نہ پایا اس لیے ان کی روایت نہ کی۔ یا اگر انہوں نے ان کو پایا تو ان میں ایسی قدح وعلت دیکھی کہ سب نے ان روایات کو چھوڑ دیا۔ دونوں صورتوں میں یہ احادیث نا قابل اعتبار ہیں شیخ جلال الدین سیوطی کی تصانیف میں کل پونجی اپنے رسائل اور نوادر میں اسی قسم کی کتابیں ہیں۔

جلال الدین سیوطی کی کتب میں بیان کردہ احادیث کی یہ صورت ہے کہ ان کی صحت پر کہاں تک اعتماد کیا جا سکتا ہے یہ روایات محض محدثین کے نزدیک بالکل نا قابل اعتبار ہیں۔ یا تو وضعی ہیں یا ایسی کمزور ہیں جن پر کسی محدث نے بھی اعتبار نہیں کیا۔ ان روایات کو طبقہ اول کی احادیث سے کچھ تائید نہیں ملتی۔

دلیل چہارم:

معتبر روایات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اُبی بن کعب بھی قرآن مجید کو جمع کرنے والی مجلس کا رکن تھے۔ جس کے سپرد حضرت عثمان نے یہ کام کیا تھا اس طرح ایسی روایات بھی ملتی ہیں جن سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ حضرت ابوبکر کے وقت بھی قرآن جمع کرنے والی مجلس کے رکن تھے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے ان کا اپنا تیار کردہ نسخہ قرآن حضرت عثمان کے تیار کردہ صحائف کے متضاد نہیں ہو سکتا۔

دلیل پنجم:

اب ہم دو دعائیہ فقروں پر بحث کرتے ہیں۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ تاریخ سے کہیں بھی یہ ثابت نہیں ہوتا کہ اُبی بن کعب ان دو دعائیہ فقروں کو قرآن مجید کا حصہ سمجھتے تھے۔ اس دور کے دینی ادب میں یہ بھی دیکھنے میں آیا ہے۔ قرآن مجید کے متن یا حاشیہ میں ہی کسی لفظ کے معنی لکھ دیئے اگر کسی صحابی نے متن میں معنی لکھے ہیں تو وہ قرآن کا حصہ نہیں ہو سکتے۔ میں نے پہلے حوالوں کے ساتھ بحث کر چکا ہوں۔ لہٰذا صحیفہ اُبی بن کعب میں وہ دو دعائیہ فقرے قرآن کا جزو ہونے کی وجہ سے نہیں لکھے۔ محض حصول برکت کے لیے تحریر کیے ہوں گے جیسا کہ پہلے میں نے یہ عرض کیا ہے کہ تاریخ سے یہ کہیں بھی ثابت نہیں ہوتا کہ انہوں نے یہ کہا ہو کہ یہ فقرے قرآن مجید کا جزو ہیں اگر اُبی کے صحیفہ میں دو دعائیہ فقرے ہیں۔ تو اس سے یہ ہرگز ثابت نہیں ہوتا کہ وہ قرآن مجید کا جزو ہیں اگر اُبی کا بھی یہ خیال تسلیم کر لیا جائے تو پھر بھی کوئی اعتراض کی بات نہیں ایک طرف اُبی بن کعب دوسری طرف ہزار ہا صحابہ۔ کیا معترض کے پاس کسی ایک صحابی کا نام بھی ہے جس نے اُبی کے خیال کی تائید کی ہو ایک آدمی کی گواہی ہزار ہا صحابہ کی شہادت کے مقابل کوئی حیثیت نہیں رکھتی۔ کہ اُبی تو دو دعائیہ فقروں کو قرآن کا جزو سمجھیں جبکہ ہزار ہا صحابہ کو اس کا علم بھی نہ ہو۔ قرآن مجید کی ہر آیت نزول کے وقت ہی صحابہ اور کفار کے درمیان شائع ہو جاتی۔ کیا یہ ممکن ہے دو دعائیہ فقرے صرف اُبی تک پہنچے ہوں دوسرے صحابہ تک نہ پہنچے ہوں۔ یہ اختلاف حضرت عثمان کے ساتھ نہ تھا۔ بلکہ تمام صحابہ کے ساتھ تھا۔ تاریخ میں کہیں بھی یہ ذکر نہیں کہ اُبی نے ان دو دعائیہ فقروں کے بارے میں دیگر صحابہ سے اختلاف کیا ہو۔

دلیل ششم:

روایات سے یہ بات بھی واضح ہوتی ہے کہ جب حضرت عثمان نے ذاتی قرآنی نسخوں کو جلانے کا حکم دیا تو حضرت اُبی بن کعب نے اپنا نسخہ جلا دیا۔ اور اپنے نسخہ کو جلا کر حضرت عثمان کے قرآنی نسخے کی صحت کو تسلیم کر لیا۔ دوم کبھی یہ اعتراض نہ کیا کہ اس میں تو دو دعائیہ فقرے کیوں نہیں۔ حضرت عثمان کے قرآنی نسخے کو صحیح سمجھا۔

حفد اور خلع:

اتقان سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ یہ دو جملے جن کو حفد اور خلفع کی سورتوں کے نام سے نامزد کیا گیا ہے۔ دعائے قنوت کے دو حصے ہیں وہ اس طرح پر ہیں۔

اَللّٰھُمَّ اِنَّا نَسْتَعِینُکَ وَ نَسْتَغْفِرُکَ وَ نُثْنِی عَلَیْکَ الْخَیْرَ وَ نَخْلَعُ وَ نَتْرُکُ مَنْ یَّفْجُرُکَ۔

دوسرا فقرہ:

اَللّٰھُمَّ اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَ لَکَ نُصَلِّی وَ نَسْجُدُ وَ اِلَیْکَ نَسْعٰی وَ نَحْفِدُ وَ نَرْجُو رَحْمَتَکَ وَ نَخْشٰی عَذَابَکَ اِنَّ عَذَابَکَ بِالْکُفَّارِ مُلْحِقٌ۔

یہ وہی دعائے قنوت ہے جس کو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کو سکھائی اور کسی نے بھی اس دعا کو قرآن مجید کا حصہ نہیں سمجھا۔ دعائے قنوت کی اور بھی بعض صورتیں احادیث میں آئی ہیں۔ درج ذیل دعا بہت مشہور ہے۔

اَللّٰھُمَّ اھْدِنِی مَنْ ھَدَیْتَ وَ عَافِنِی فِی مَنْ عَافَیْتَ و تَوَلَّنِی فِی مَنْ تَوَلَّیْتَ وَ بَارِکْ لِی فِیمَا اَعْطَیْتَ وَ قِنِی شَرَّ مَا قَضَیْتَ فَاِنَّکَ تَقْضِی وَلَا یُقْضٰی عَلَیْکَ اِنَّہٗ لَایَذِلُّ مَن وَّالَیْتَ وَلَایَعِزُّ مَنْ عَادَیْتَ تَبَارَکْتَ رَبَّنَا وَ تَعَالَیْتَ

(مشکوۃ باب الوتر)

یہ واضح ہے دعائے قنوت کی دو صورتیں احادیث میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہیں قرآن سے ان کا کوئی تعلق نہیں۔ عہد رسول کریم ﷺ سے لے کر اب تک مسلمان نماز میں پڑھتے چلے آرہے ہیں کسی ایک نے بھی ان دعاؤں کو قرآن مجید کا جزو نہیں سمجھا سب مسلمان رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے فرامین سمجھتے آرہے ہیں۔ عہد رسول کے صحابہ یہی کہتے تھے کہ رسول کریم صلعم نے یہ دعائیں سکھائیں۔ کسی نے بھی ان ادعیہ کو قرآن کا حصہ نہیں سمجھا۔ صرف اُبی کے صحیفہ میں درج ہونے سے یہ ثابت نہیں ہو جاتا کہ یہ ادعیہ قرآن کا حصہ ہیں اس کے لیے صحابہ میں سے اُبی کی تائید بھی ضروری ہے۔ لیکن معترض کے پاس کوئی شہادت موجود نہیں۔ قرآن مجید صرف حضرت زید بن ثابت اکیلے نے جمع نہیں کیا ان کے ساتھ دیگر معتبر صحابہ بھی شامل تھے۔ کیا کسی کے پاس بھی یہ شہادت موجود نہ تھی۔ دو دعائیہ فقرے قرآن کا حصہ ہیں۔ تمام غافل اور بے خبر تھے۔ یہ عقل سلیم کے ہی خلاف ہے کہ جمع قرآن کرنے والے تمام ارکان اس سے بے خبر ہوں۔

ابن مسعود کا اختلاف:

ابن مسعود کی طرف یہ بات منسوب ہے کہ وہ معوذتین کو اپنے مصحف میں نہ لکھتے تھے اس کے بارے میں بخاری میں یہ حدیث ہے کتاب التفسیر میں آتی ہے۔

عَن ذَرٍ قَالَ سَالْتُ اُبَیَّ بْنِ کَعْب قُلْتُ اَبَا الْمُنذر اَنَّ اخَاکَ ابن مَسْعُودٍ یَقُولُ کَذَا وَ کَذَا فَقَالَ اَنِّی سَالْتُ رَسولَ اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم فَقَالَ لِی قِیلَ لِی فُقُلْتُ قَال نَحْنَ نَقُولُ کَمَا قَالَ رَسُولُ اللّٰہ

اور دوسری روایت یہ ہے۔

عن زر بن حنیش قال سالت ابی بن کعب عن المعوذ تین فقال سالت النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم فقال قیل لی قلت نحن نقول کما قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم

زر کہتے ہیں میں نے اُبی بن کعب سے پوچھا کہ ابن مسعود معوذتین کے بارے میں ایسا ایسا کہتے ہیں انہوں نے کہا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا۔ آپ نے فرمایا مجھے ایسا ہی کہا گیا ہے سو میں نے بتا دیا ہے۔ انہوں نے کہا پس ہم وہی کہتے ہیں جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کہا۔

یہاں ابہام ہے۔ یہ معلوم نہیں ہوتا کہ ابن مسعود معوذتین کے بارے میں کیا کہتے تھے آیا وہ واقعی اپنے صحیفہ میں نہ لکھتے تھے۔ تو کس وجہ سے۔ یہ بھی ممکن ہے وہ اسے کلام الٰہی ہی سمجھتے ہوں لیکن یہ کہتے ہوں کہ ان کا لکھنا قرآن مجید میں ثابت نہیں یا اور کچھ کہتے ہوں۔ بہر حال حدیث میں کوئی وضاحت نہیں۔ ہاں یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس کا جواب اُبی بن کعب نے یہ دیا کہ انہوں نے خود رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا اور آپ کا جواب کیا تھا۔ یہ اسی سے معلوم ہو جائے گا کہ اُبی ان سورتوں کو قرآن مجید کا جزو ہی سمجھتے تھے اور اپنے مصحف میں لکھتے تھے یہی جواب ان کو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے ملا تھا بظاہر حدیث کے الفاظ سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مجھے یہ دونوں سورتیں وحی کی گئی ہیں میں نے لوگوں تک پہنچا دیا۔

مذکورہ حدیث سے کم اعتبار والی حدیث سے یہ واضح ہوتا ہے کہ ابن مسعود اپنے صحیفہ میں ان سورتوں میں نہ لکھتے تھے چنانچہ ایک روایت مسند بن احمد میں ہے ان عبداللّٰہ بن مسعود کان لایکتب المعوذتین فی مصحفہ وہ ایک اور روایت میں ہے کان عبداللّٰہ بن مسعود یحك المعوذ تین عن مصاحفہ و یقول انھما یسامن کتاب اللّٰہ یعنی عبداللہ بن مسعود معوذتین کو اپنے

مصاحف سے کھرچ ڈالتے تھے اور کہتے تھے کہ وہ کتاب اللہ میں سے نہیں ہیں لیکن اتقان میں امام نووی اور امام ابن حزم کی یہ شہادت موجود ہے کہ یہ ابن مسعود پر جھوٹ ہے۔ اگر یہ صحیح بھی مان لیا جائے تو یہ معلوم ہوتا ہے یہ ان کا بعد کا خیال ہے لکھنے کے بعد کھرچتے لیکن بزاز کہتے ہیں لم تتابع ابن مسعود علی ذالك احد من اصحابه و قد صح عن النبی صلی الله علیه وسلم انه قرأهما فی الصلوٰة۔

ایک بھی صحابی نے ابن مسعود کی اس بات میں پیروی نہیں کی اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ ثابت ہے کہ آپ نے معوذتین کو نماز میں پڑھا۔ صرف دوسرے صحابہ نے ہی ابن مسعود کی تائید نہیں کی بلکہ خود ابی نے بھی مخالفت کی۔ اور اپنے علم کی بناء پر کہ انہوں نے رسول کریم صلعم سے دریافت کیا اور رسول کریم صلعم نے ان کو جزو قرآن قرار دیا تھا۔

کتب حدیث میں واضح لکھا ہوا ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم معوذتین کو نماز میں سورہ فاتحہ کے بعد پڑھا کرتے تھے۔ ایک صحابی کی روایت ہے کہ:

اِنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَرَاَ الْمُعَوِّ ذَتین وَ قَالَ لَہٗ اِذَا اَنْتَ صَلَّیْتَ فَاقْرَأْ بِہِمَا

مذکورہ بحث سے دو باتیں واضح ہوتی ہیں کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے معوذتین کو قرآن مجید کا جزو قرار دیا۔ دوم ان دونوں سورتوں کو نماز میں سورہ فاتحہ کے بعد پڑھا بھی کرتے تھے۔ سورہ فاتحہ کے بعد قرآن مجید کے اجزاء ہی پڑھے جاتے تھے۔ قرآن مجید کے اجزاء کے علاوہ گودعائیہ فقرے نہیں پڑھا جاتے تھے۔ ابن مسعود کیوں نہ لکھتے تھے یا کھرچ دیتے تھے اس پر بحث کرنا لاحاصل ہے۔ جب کہ امام نووی اور امام ابن حزم جیسے علماء نے یہ کہہ دیا ہے کہ یہ ابن مسعود پر افتراء ہے۔ جب حدیث سے یہ ثابت ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے معوذتین کو قرآن مجید کا جزو قرار دیا ہے پھر کسی اور دلیل کی ضرورت ہی نہیں تھی مسلمانوں کا تعامل یہ ظاہر کرتا ہے کہ وہ نسلاً بعد نسل معوذتین کو قرآن مجید کا ہی حصہ سمجھ رہے ہیں۔

غیر مسلموں کی شہادت:

سرولیم میور اپنی تصنیف ''لائف آف محمد'' میں لکھتا ہے۔ ''اس بات کی تسلی بخش اور قابل اطمینان اندرونی اور بیرونی شہادت موجود ہے کہ قرآن اس وقت بھی ٹھیک اسی شکل وصورت میں محفوظ و مامون ہے جس حالت میں (حضرت) محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے دنیا کے سامنے پیش کیا۔ (دیباچہ لائف آف محمد ص 25)

جرمن کے مشہور مستشرقین نولڈ یکی نے لکھا ہے۔

''یورپ کے جن مصنفین نے اب تک اس امر کی زبردست کوشش کی ہے کہ قرآن میں تحریف ثابت کریں وہ اپنی سعی اور جدوجہد میں حیرت انگیز طور پر ناکام ثابت ہوئے ہیں۔ (انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا زیر لفظ قرآن)

قرأتوں کے اختلاف پر سیرت سید البشر کے حصہ دوم میں بحث کی جا چکی ہے۔ اعادہ کی ضرورت نہیں۔

☆......☆

منسوخ حصے قرآن مجید میں داخل کر دیئے گئے ہوں گے

اعتراض: ایک اعتراض یہ بھی ہے کہ بعض حصوں کو ہمیشہ کے لیے قرآن مجید میں داخل کرنے کا منشا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا نہ ہوگا۔ اور نہ تھا یا بعض حصے منسوخ ہو گئے ہوں گے اور ممکن ہے کہ زید نے ان امور پر اطلاع نہ پانے کی وجہ سے ان کو قرآن مجید میں داخل کر دیا ہو۔

جواب: یہ اعتراض بھی محض مفروضہ پر ہے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ حضرت زید اکیلے جمع کرنے والے نہ تھے۔ ان کے ساتھ معتبر صحابہ بھی تھے۔ سب مل کر تحریری مواد اور حفاظ کے تعاون سے قرآن مجید کی تدوین کرتے تھے۔ جب تک تحریری کی تائید حافظ اور حافظ کی تائید کوئی تحریر نہ کرتی اس وقت تک وہ ان آیات کو قرآن میں شامل نہ کرتے۔ اس لیے حضرت زید نے کہا تھا کہ میں تحریروں اور آدمیوں کے سینوں سے قرآن شریف کو اکٹھا کرنے لگا۔ قرآن مجید رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں احاطہ تحریر میں آ گیا تھا۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر جب کوئی آیت یا آیات یا کوئی سورۃ نازل ہوتی کاتبین وحی کو بلاتے اور فرماتے کہ اس آیت یا آیات یا سورۃ کو فلاں مقام پر لکھ دو۔ دوم: کئی صحابہ نے قرآن مجید کو یاد کیا۔ پھر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو سنایا بھی۔ جب قرآن مجید تحریر اور سینوں میں محفوظ ہو چکا تھا۔ تو پھر غلطی کا کوئی امکان نہیں رہتا اس کے علاوہ صرف حضرت زید اکیلے ہی جمع نہیں کر رہے تھے۔ بلکہ معتبر صحابہ کی ایک کمیٹی تشکیل دی گئی تھی اس کمیٹی کے سربراہ حضرت زید تھے سب اراکین کے اتفاق رائے سے قرآن جمع کیا گیا اگر صرف زید ہوتے تو ممکن ہے کہ غلطی سے کمی بیشی ہو جاتی۔ حضرت ابوبکر نے ایسا طریقہ اختیار کیا جس سے غلطی کا کوئی امکان باقی ہی نہیں رہتا۔

قرآن مجید کا کوئی حصہ منسوخ نہیں۔ مسلمانوں کے لیے تمام قرآن واجب العمل ہے۔

سیدالبشر کے تیسرے حصہ میں نسخ قرآن پر بحث ہو چکی ہے۔

☆......☆

عہد رسول میں بعض عبارتیں پڑھی جاتی تھیں بعد میں نہیں پڑھی گئیں

اعتراض: بعض احادیث سے یہ واضح ہوتا ہے کہ عہد رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم میں بعض عبارتیں پڑھی جاتی تھیں جو بعد میں ساقط ہو گئیں جس سے موجودہ قرآن ناقص ہونے کا نتیجہ اخذ کیا جاتا ہے۔

معترضین چند احادیث بیان کرتے ہیں جن سے قرآن مجید کے ناقص ہونے کا نتیجہ نکالتے ہیں وہ احادیث حسب ذیل ہیں۔

(۱) صحیح مسلم کتاب الزکوۃ میں ابوالاسود سے یہ روایت ہے کہ ابوموسیٰ اشعری نے بصرہ میں حسب ذیل الفاظ قرا کی جماعت کے سامنے بیان کیے۔

انا کنا نقرأ سورة نشبهها فی الطول والشدة ببراء ة فانسیتها غیرانی قد حفظت عنها لوکان لابن ادم وادیان من مال لاتبغی وادیا ثالثا ولا یملاء جوف ابن ادم الا التراب و کنا نقراء سورة کنا نشبهها باحدی السبحات فانسیتها غیرانی قد حفظت منها یایها الذین امنوا لم تقولون مالا تفعلون فتکتب شهاده فی اعناقکم فتسئلون عنها یوم القیمة۔

(۲) مسلم کتاب الرضاع میں حضرت عائشہ سے حسب ذیل روایت ہے۔

عن عائشة انها قالت کان فیما انزل من القران عشر رضعات معلومات ثم نسخن بخمس معلومات فتو فی رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلم و هی فیما یقراء من القرآن۔

(۳) مسلم کتاب الحدود میں حسب ذیل روایت ہے۔

عن عبداللّٰہ بن عباس رضی اللّٰہ عنهما یقول قال عمر بن الخطاب رضی اللّٰہ عنه و هو جالس علی منبر رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلم ان اللّٰہ بعث محمداً صلی اللّٰہ علیه وسلم بالحق و انزل علیه الکتاب و کان مما انزل اللّٰہ علیه أیة الرجم قراناها و وعینا ها و عقلناها فرجم رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلم و رجمناه بعده فاخشی ان طال بالناس زمان ان یقول قائل مانجد الرجم فی کتاب اللّٰہ تعالیٰ فیضلو بترک فریضة انزل اللّٰہ و ان الرجم فی کتاب اللّٰہ حق علی من زنا اذا احصن من الرجال والنساء اذا قامت البینة او کان الحمل او الاعتراف اور ایسا ہی سنن ابی داؤد کتاب الحدود باب الرجم میں یہ روایت ہے عن عبداللّٰہ بن عباس انّ عُمَرَ یعنی ابن الخطاب رضی اللّٰہ تعالیٰ عنه خطب فقال فالرجم حق علی من زنا من الرجال والنساء اذا کان محصناً اذا قامت البینة او کان حمل او اعتراف و ایم اللّٰہ لولا ان یقول الناس زاد عمر فی کتاب اللّٰہ عزوجل لکتبتها۔

(۴) عن عائشة قالت کانت سورة الاحزاب تقراء فی زمن النبی صلی اللّٰہ علیه وسلم مائتی ایات فلما کتب عثمان المصاحف لم نقدر منها الا ماهو الان۔ (کتاب الاتقاق جلد 2 ص 30)

(۵) عن مالک ان اولها لما سقط سقط معه البسمله فقد ثبت انها کانت تعدل البقرة لصرلها و فی مصحف ابن مسعود مائة اثنتا عشرة سورة لانه لم یکتب المعوذ تین و فی مصحف ابی ستة لانه کتب فی اخر سورة الحفد والخلع (اتقان جلد اول صفحه 68)

جواب: حدیث پرکھنے کا طریقہ:

محدثین نے صحیح، غیر صحیح۔ معتبر یا غیر معتبر حدیث جانچنے کے طریقے بیان کیے۔ اگر ان طرق کو مدنظر رکھا جائے تو حدیث صحیح غیر صحیح

سے معتبر غیر معتبر سے الگ ہو جائے گی۔ پہلا طریقہ یہ ہے کہ جن کتب کو محدثین نے زیادہ معتبر گردانا ہے اور جن کی احادیث کو زیادہ صحیح قرار دیا ہے ان احادیث کو مقدم رکھا جائے دوسری احادیث کو ان کی روشنی میں جانچا جائے مثلاً صحیح بخاری کو سب محدث اصح الکتب بعد کتاب اللہ قرار دیتے ہیں۔ لہٰذا صحیح بخاری کی حدیث کو مقدم رکھا جائے گا۔ اگر کوئی حدیث جانچنی بھی ہو تو اس کتاب کی حدیث کی روشنی میں جانچی جائے گی۔

دوم:

سند کے راوی کی ثقاہت مدنظر رکھی جائے گی۔ جس حدیث کے راوی زیادہ ثقہ ہیں وہ حدیث مقدم ہو گی۔ سوم محدثین نے حدیثوں کے مدارج بیان کیے ہیں جن کا ذکر پہلے کیا جا چکا ہے۔ یہ دیکھنا ہو گا کہ زیر بحث حدیث کس درجہ کی کتب میں ہے۔ اگر چوتھے درجے کی کتب کی حدیث ہے پھر وہ اعلیٰ درجے کی کتب کی حدیث سے متضاد ہے تو اعلیٰ درجے کی حدیث کو فوقیت دی جائے گی۔ چہارم اگر کوئی حدیث قرآن مجید سے متعارض ہے تو حدیث کو رد کر دیا جائے گا پنجم عملی تواتر کس حدیث کو صحیح قرار دیتا ہے۔ یعنی کسی حدیث پر مسلمانوں کا عمل تواتر سے چلا آ رہا ہے تو وہ حدیث قابل اعتماد ہو گی۔ یہ وہ چند اصول ہیں جن کی روشنی میں صحیح اور غیر صحیح حدیث جانچی جاتی ہے۔

یورپین نے ان اصولوں کو چھوڑ کر ان حدیثوں سے استدلال کیا ہے جو کمزور ہیں یا وضعی ہیں۔ محض اعتراض کی خاطر۔ مگر علمی لحاظ سے یہ طریقہ غلط ہے مستشرقین کو اپنے اصول وضع نہیں کرنے چاہئیں بلکہ حدیث کے صحیح یا غیر صحیح جانچنے کے لیے انہی اصولوں کو سامنے رکھنا پڑے گا۔ جو محدثین نے بیان کیے ہیں جو حدیث محدث وضعی قرار دے چکے ہیں تو وہ روایت وضعی ہی تصور کی جائے گی وہ محض کسی مستشرق کے کہنے سے صحیح قرار نہیں دی جا سکتی۔ اب مذکورہ اصولوں کی روشنی میں مذکورہ احادیث کا جائزہ لیتے ہیں۔

پہلی حدیث ابو موسیٰ کی:

پہلی حدیث میں حضرت ابو موسیٰ کے خطبہ کا ذکر ہے جو انہوں نے قراء بصرہ کے سامنے دیا جس کا ماحصل یہ ہے کہ وہ یعنی ابو موسیٰ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دوسرے صحابہ دو سورتیں پڑھا کرتے تھے جن میں سے اب صرف ایک ایک فقرہ ہی یاد رہ گیا ہے اور پہلی سورۃ کے فقرہ کا مضمون یہ ہے کہ اگر ابن آدم کے لیے مال کی دو وادیاں ہوتیں تو وہ ایک تیسری وادی کی تلاش کرتا اور ابن آدم کے پیٹ کو سوائے مٹی کے کوئی دوسری چیز نہیں بھر سکتی اور دوسری سورت کے فقرہ کا یہ مضمون ہے۔ اے ایمان والو تم وہ بات کیوں کہتے ہو جو کرتے نہیں اس کی شہادت تمہارے خلاف لکھی جائے گی اور قیامت کے دن تم سے اس کے بارے میں پوچھا جائے گا۔

حدیث کے مردود ہونے کے دلائل:

اس روایت کے راوی سوید بن سعید ہیں جن کے متعلق ذہبی میزان الاعتدال میں رقمطراز ہیں بعض لوگوں نے جن میں مسلم بھی ہیں اس کی روایت کو لیا ہے لیکن اکثر نے اس کی روایت کو مردود قرار دیا ہے۔ اس بات پر سب متفق ہیں کہ وہ بہت ہی ضعیف العمر تھا اور آخر کار اندھا ہو گیا۔ امام بخاری کے اس کے متعلق یہ الفاظ لکھے ہیں آنہٗ ضعیف جدا۔ بعض کا یہ گمان تھا کہ وہ اس کا میلان شیعہ کی طرف تھا۔ ابن حبان کہتے ہیں کہ ان پر زندیق ہونے کا بھی الزام تھا۔ جس حدیث کا راوی غیر ثقہ ہو۔ متہم بالزندقہ بھی ہو۔ تو اس روایت کو مردود ہی کہا جائے گا۔

دوسری دلیل:

کتاب مسلم میں اسی مضمون کی چار اور روایات بھی درج ہیں۔ جن میں یہ ذکر ہے کہ وہ الفاظ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہیں

چنانچہ مسلم کتاب الزکوۃ باب لوان لابن ادم وادیین لابتغی ثالثاً سب سے پہلی روایت یہ ہے۔

حد ثنا یحیی بن یحیی و سعید بن منصور و قتیبہ بن سعید قال یحییٰ انا و قال الاخران ثنا ابو عوانۃ عن قتادۃ عن انس قال قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم لو کان لابن اٰدم وادیان من مال لابتغی وادیاً ثالثاً و لا یملا جوف ابن اٰدم الا التراب۔ و یتوب اللّٰہ علی من تاب۔

یعنی یحییٰ بن یحییٰ اور سعید بن منصور اور قتیبہ بن سعید نے حضرت انس سے یہ روایت مسلم کو پہنچائی کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر آدمی کے لیے دو وادیاں بھی مال کی ہوتیں تو بھی وہ تیسری کی خواہش کرتا اور آدمی کے پیٹ کو سوائے مٹی کے کوئی چیز نہیں بھر سکتی اور جو شخص خدا کی طرف رجوع کرتا ہے خدا بھی اس پر رجوع برحمت کرتا ہے۔

اس حدیث میں وہی الفاظ لوکان لابن ادم کے ہیں۔لیکن یہ الفاظ رسول کریم صلعم کے فرمودہ ہیں۔قرآن مجید کا جزو قرار نہیں دیا پھر تینوں راویوں میں سے سعید بن منصور اور یحییٰ بن یحییٰ دونوں کو ذہبی نے اپنی تصنیف میزان الاعتدال میں صریح الفاظ میں ثقہ قرار دیا ہے۔اس حدیث کی روشنی میں سوید بن سعید والی حدیث کا جائزہ لیا جائے۔تو واضح ہو جائے گا یہ سوید والی حدیث مردود حدیث ہے۔ایک حدیث کا راوی غیر ثقہ جب کہ دوسری حدیث کے راوی ثقہ ہیں۔تو زیر بحث حدیث مردود ہی ٹھہرتی ہے۔مزید براں تین اور حدیثیں اس مضمون کی مسلم میں بیان کی گئی ہیں ان سب میں الفاظ ''لوکان لابن ادم الخ رسول کریم صلعم کے فرمودہ ہیں۔اب سوید بن سعید کی حدیث کو بنیاد قرار دے کر قرآن مجید پر عدم صحت کا اعتراض کرنا صریحاً لاعلمی اور جہالت ہے۔

تیسری دلیل:

امام مسلم خود بھی پہلے وہ چار حدیثیں بیان کرتا ہے جن میں وہ الفاظ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمودہ ہیں اور قرآن مجید کا جزو قرار نہیں دیئے گئے۔جس حدیث میں جزو قرار دیئے گئے ہیں پانچویں نمبر پر درج کی ہے۔حضرت امام بخاری اپنے دیباچہ میں اس بات کا اقرار کرتے ہیں کہ وہ پہلے وہ حدیث درج کرتے ہیں جو راویوں کی ثقاہت کے لحاظ سے اول درجے کی ہو پھر درجہ بدرجہ۔اب امام مسلم نے پہلے وہ چار احادیث درج کی ہیں جو درجہ ثقاہت کے لحاظ سے بڑھ کر تھیں آخر میں وہ حدیث درج کی جو ثقاہت کے لحاظ سے سب سے کم درجہ رکھتی تھی۔گویا امام مسلم نے بھی اس حدیث کو ثقاہت کے لحاظ سے گرا ہوا پایا ہے امام صاحب لکھتے ہیں۔''تو ان کے بعد اس قسم کی حدیثیں لاتے ہیں جن کی سندوں میں بعض ایسے راوی بھی ہیں جو حفظ اور اتقان میں پہلے راریوں کی طرح نہیں''ان الفاظ سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ خود امام صاحب نے بھی حدیث زیر بحث کو کوئی وقعت نہیں دی۔

چوتھی دلیل:

حدیث میں الفاظ آتے ہیں کنا نقراء سورۃ ہم ایک سورۃ پڑھا کرتے تھے ان الفاظ کی رو سے صرف ابو موسیٰ اشعری ہی اکیلے ایسے آدمی نہ تھے جن کو وہ سورہ یاد ہو۔ان کے علاوہ اور بھی بہت سے صحابہ تھے اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کیا دوسرے تمام صحابہ بھی اس سورۃ کو بھول گئے۔اگر ابو موسیٰ اشعری بھول گئے تھے تو دوسرے صحابہ یاد دلا دیتے۔

دوم:

حضرت ابو موسیٰ اشعری دوسرے صحابہ سے اپنی بھول کو یادداشت میں تبدیل کر سکتے تھے۔نہ تو ابو موسیٰ اشعری نے بھولی ہوئی سورت کو کسی سے یاد کیا اور نہ دوسروں نے حضرت ابو موسیٰ کی بھولی ہوئی سورت کو بیان کیا۔لہٰذا یہ عقل سلیم کے ہی خلاف ہے۔ایک آدمی تو

بھول گیا تو اس کے ساتھ دوسرے لوگ بھی بھول جائیں۔ جب حضرت ابوبکر اور حضرت عثمان کے دور میں قرآن مجید مرتب ہوا تو کسی صحابی نے اس قرآن سے اختلاف نہیں کیا۔ اس لیے یہ بلا تردد کہا جا سکتا ہے کہ عثمانی صحیفہ پر تمام صحابہ کا اتفاق تھا کہ یہ وہ مجموعہ وحی ہے جو رسول کریم صلعم پر نازل ہوئی۔ اور پھر اس کو حضرت ابوبکر کے فرمان پر حضرت زید نے دیگر صحابہ کے تعاون سے جمع کیا۔ دلائل قاطعہ سے یہ بات ثابت ہے کہ زیر بحث حدیث مردود ہے۔

دوسری حدیث:

دوسری حدیث حضرت عائشہ کی ہے انہوں نے بیان کیا تھا کہ قرآن مجید میں ایک آیت تھی جس میں صراحت سے یہ ذکر تھا کہ دس بار دودھ چوسنے سے حرمت رضاعت ثابت ہوتی ہے اور یہ حکم بعد میں منسوخ ہو گیا اور اس کی بجائے ایک اور حکم نازل ہوا جس میں دس بار کی بجائے پانچ بار دودھ چوسنا حرمت رضاعت کے لیے کافی سمجھا گیا اور یہ آخری حکم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات تک قرآن میں پڑھا جاتا تھا۔

دلیل اول:

جواب: محدثین نے ایک اصول مقرر کیا ہے کہ اگر کسی حدیث میں کسی ایسے واقعہ کا ذکر ہے جس کی اطلاع اور شہرت عام ہونی چاہیے مگر وہ لوگ جن کو اس کا علم ہونا چاہیے تھا۔ اس واقعہ کے متعلق کوئی اطلاع نہ دیں یا لاعلمی کا اظہار کریں تو وہ حدیث وضعی ہے۔

اس اصول کی روشنی میں اس حدیث کو لیتے ہیں۔ حکم رضاعت ایک ایسا مسئلہ ہے جس کا تمام صحابہ کو علم ہونا چاہیے تھا۔ اس مسئلہ کے متعلق کثرت سے روایات بیان کی ہوتیں کیونکہ عرب میں رضاعت کا عام رواج تھا۔ پھر حضرت عائشہ فرماتی ہیں کہ یہ آیت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں پڑھی جاتی تھی جو آیت عہد رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم میں پڑھی جاتی ہو اس کے متعلق علم تو ہر صحابی کو ہونا چاہیے تھا۔ اب جب قرآن مجید کی تدوین عہد ابوبکر میں ہونے لگی تو عام اعلان ہوا کہ جس کے پاس بھی قرآن مجید کا کوئی حصہ موجود ہے وہ حضرت زید اور ان کی مجلس کو دے دے اس عام اعلان کے باوجود حضرت عائشہ نے نہ تو اپنے والد صاحب کو اس آیت سے آگاہ کیا نہ حضرت زید کو پھر جب قرآن دوسری دفعہ حضرت عثمان کے عہد میں قریشی لہجہ میں کتابی شکل میں مدون ہوا تو پھر بھی حضرت عائشہ نے یہ ذکر نہ کیا کہ فلاں آیت جو رسول کریم صلعم کے عہد میں پڑھی جاتی تھی موجود نہیں۔ پھر کسی دوسرے صحابی نے بھی اس بات کا ذکر نہیں کیا۔ پھر حضرت عائشہ نہ تو حضرت زید سے ذکر کرتی ہیں اور نہ اپنے باپ حضرت ابوبکر سے۔ ذکر کرتی ہیں تو عمرہ سے۔ پھر عمرہ کو بھی کئی سال بعد مزید براں امام مسلم نے خود ہی دیگر روایات سے اس روایت کو جھوٹے ہونے کی شہادت دے دی۔ ان روایات سے یہ واضح ہوتا ہے کہ کسی صحابی کو ایسی کسی آیت کی خبر نہ تھی۔

پس حضرت عائشہ کے علاوہ کسی صحابیہ کا اس موضوع سے متعلق کوئی روایت بیان نہ کرنا یہ واضح کرتا ہے کہ یہ حدیث وضعی ہے۔
جو آیت عہد رسول کریم ﷺ میں پڑھی جاتی ہو۔ عام لوگوں نے سنا ہو لیکن راوی صرف ایک ہو۔ کیوں کر یہ بات قابل قبول ہو سکتی ہے؟

دوم:

اگر قرآن مجید میں آیت درج ہو اور تمام صحابہ اس کو پڑھتے بھی ہوں تو پھر وہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے رضاعت کے متعلق سوال کیوں کرتے تھے حکم تو قرآن مجید میں درج ہے صحابہ پڑھتے ہیں سنتے ہیں۔ حکم میں کوئی ابہام بھی نہیں صحابہ کا رسول کریم صلعم سے رضاعت کے متعلق سوالات کرنا اس بات کی دلیل ہے کہ اس قسم کا کوئی حکم قرآن مجید میں نہیں۔

حضرت عمر کی روایت رجم:

حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ یہ آیت پڑھی جاتی اور یاد کی جاتی تھی اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خود اور ان کے بعد خلفاء راشدین رضی اللہ عنہم اجمعین اس پر عمل کرتے اور اس کے مطابق حکم کیا کرتے تھے۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ جمع قرآن میں حضرت عمرؓ کا بہت دخل تھا انہی کے اصرار پر حضرت ابوبکر جمع قرآن کی طرف مائل ہوئے تھے۔ اگر کوئی آیت رجم کی قرآن مجید میں ہوتی تو وہ حضرت زید کو ضرور بتاتے۔ صرف وہ آیت حضرت عمر ہی نہیں جانتے تھے بلکہ دیگر صحابہ بھی جانتے تھے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پر عمل بھی کیا۔ حضرت زید کے تیار کردہ صحیفہ میں درج نہ ہونا اس بات کی دلیل ہے یہ مفروضہ وضعی ہے۔ جس میں کوئی صداقت نہیں دعویٰ یہ کیا جا رہا ہے کہ قرآن مجید میں بھی پڑھی جاتی تھی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حکم پر عمل بھی کیا۔ روایت صرف حضرت عمرؓ کی ملتی ہے اور کسی اور صحابی کی نہیں ملتی۔ لہٰذا یہ حدیث مردود وضعی اور غیر مقبول ہے۔

پانچویں اور چھٹی حدیث:

امام سیوطی کی اتقان والی ہیں۔ اتقان میں درج شدہ احادیث پر پہلے بحث کر آئے ہیں۔ محدثین نے ان کو مردود قرار دے دیا ہے۔ مزید زیر بحث بھی لا چکے ہیں اس لیے یہاں ان کو زیر بحث نہیں لاتے۔ ان کے مردود ہونے کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ راوی صرف ایک ہے۔ ایک کے علاوہ کسی دوسرے صحابی نے تائید نہیں کی۔

حضرت عائشہ ایک آیت کے گم ہو جانے کا ذکر کرتی ہیں لیکن اپنی تائید میں کسی صحابی کی گواہی پیش نہیں کرتیں۔ جہاں ابن مسعود ایک امر بیان کرتے ہیں اور اُبی اور دوسرے تمام صحابی اس کی تردید کرتے ہیں اگر اُبی کوئی امر بیان کرتے ہیں تو ابن مسعود اور دوسرے ہزار ہا صحابہ اس کی تردید کرتے ہیں۔ صرف ایک شخص کی روایت ہے پھر ہزارہا دیگر صحابہ اس کا رد بھی کرتے ہیں اس لیے صرف ایک آدمی کی شہادت پر اعتراض کی بنیاد بنا کر قرآن مجید کی صحت کو ہدف تنقید بنانا اصول تاریخ کے منافی ہے۔

پانچواں اعتراض:

یہ ہے کہ مسلمانوں میں بعض فرقے ایسے موجود ہیں (جن سے معترض کی مراد فرقہ شیعہ ہے) جو اس بات کو جانتے ہیں کہ قرآن مجید محفوظ نہیں رہا۔ بلکہ ناقص ہے اور اس میں بعض حصے نکال دیئے گئے ہیں۔

شیعہ علماء کا موقف پہلے بیان کیا جا چکا ہے۔ کہ شیعہ موجودہ قرآن مجید کو وہی قرآن سمجھتے ہیں جو عہد رسول میں موجود تھا۔ اس میں کسی قسم کا تغیر و تبدل نہیں کیا گیا۔

منگانا کا اعتراض (قدیم نسخوں کے الفاظ وحروف موجودہ نسخوں کے الفاظ وحروف میں اختلاف:

منگانا نے ایک اعتراض یہ کیا ہے کہ اس کو بعض اوراق قدیم نسخہ جات قرآنی کے ایسے دستیاب ہوئے ہیں جن سے موجودہ نسخہ جات سے کسی لفظ یا حرف کا اختلاف پایا جاتا ہے۔

جواب: عام قاعدہ ہے کہ تھوڑے تھوڑے فاصلہ پر لہجہ اور تلفظ میں فرق پڑ جاتا ہے اس طبعی قاعدہ کی رو سے عرب کے مختلف قبائل کے لہجہ تلفظ میں فرق تھا۔ لہٰذا تحریر پر بھی اثر پڑتا تھا۔ مثلاً بنو تمیم ہمزہ ابتداء کو عین کر دیتے تھے۔ جیسے اسلم کو عسلم بنو قضاعہ ی کو ج کر دیتے تھے۔ تمیمی کو تمیج۔ بنو سعد ع کو ن بولتے تھے اعطی کو انطی قریش کی زبان میں ہائے مضارع کو فتحہ یا ضمہ ہوتا ہے ان کے علاوہ دیگر قبائل کسرہ کر دیتے تھے جیسے یفعل یِفعل مشہور صحابی عبداللہ بن مسعود حتی کی بجائے عتی پڑھا کرتے تھے اور عتی ہی لکھا کرتے تھے۔ ابن مسعود اسی لفظ کی قرأت

قبیلہ ہذیل کے مطابق عتی کرتے تھے۔لفظ تابوت غیر قریش تابوہ لکھتے اور بولتے۔جب قرآن جمع ہوا تو قرآن مجید قریش کے لہجہ اور تلفظ میں لکھا گیا۔کسی نسخہ میں کسی لفظ یا حرف کے اختلاف سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ قرآن مجید محفوظ کتاب نہیں آغاز نزول قرآن پر رسول کریم صلعم نے اپنے اپنے لہجہ اور تلفظ میں قرآن لکھنے اور پڑھنے کی اجازت دے دی تھی لیکن جب قرآن جمع کیا گیا۔اسی لہجہ اور تلفظ میں لکھا گیا جس میں قرآن مجید نازل ہوا تھا یعنی قریش کی زبان میں۔

(۲) جو حصص قرآن مجید کے دستیاب ہوئے ہیں ان پر علاوہ قرآن کے اور تحریرات بھی ہیں۔قدیم زمانہ میں جب سامان نوشت کم یاب ہوتا تھا تو اکثر پرانی قلمی کتاب پر دوسری ضروری تحریروں کا اندراج کر دیا جاتا تھا تو ایک ہی وقت میں مختلف کتابیں ہوتی تھیں کیمبرج کے مذکورہ اوراق میں تین مختلف کتابیں مختلف زمانہ کی لکھی ہوئی ہیں۔قرآنی الفاظ نرم پتھر سے مٹائے گئے ہیں۔ان تحریروں کی موجودگی سے قرآن مجید کی عدم صحت پر کوئی فرق نہیں پڑتا۔

(۳) ڈاکٹر منگانا نے ثابت کیا ہے کہ اوراق مذکور تین یا زائد ماخذوں سے حاصل کیے گئے ہیں جن سے بعض ماخذ اس وقت سے پہلے کے ہیں جب حضرت زید بن ثابت نے مروجہ نسخہ قرآن کو ترتیب دیا تھا۔ڈاکٹر منگانا نے موجودہ قرآن سے پینتیس اختلافات پائے ہیں اور چار ایسی آیتیں ہیں جو موجودہ قرآن میں نہیں۔حضرت زید بن ثابت نے دو ماخذوں سے قرآن مجید کو مرتب کیا۔تحریر دوم حافظہ تحریر حافظہ کی تائید کرتی تھی اور حافظہ تحریر کی تائید کرتا تھا۔ڈاکٹر منگانا لکھتا ہے اوراق مذکور تین یا زائد ماخذوں سے حاصل کیے گئے ہیں لیکن ڈاکٹر صاحب نے ان ماخذوں کا ذکر نہیں کیا۔لہٰذا ڈاکٹر صاحب نے صرف دعویٰ کیا ہے اس کی کوئی وضاحت نہیں کہ وہ کون سے ماخذ تھے۔

منگانا کے مسودہ قرآن پر دوسرے رنگ میں اصولی بحث:

(۱) قرآن مجید کے مختلف مسودات میں اختلاف دکھانے کے لیے صرف یہی کافی نہیں کہ ایک مسودہ میں ایک لفظ اور طرح پر لکھا ہوا ہے دوسرے میں دوسری طرح پر۔اس قسم کے اختلافات آج کے نسخہ ہائے قرآن میں بھی پائے جاسکتے ہیں۔جو کاتب کی غلطی کا نتیجہ ہو سکتے ہیں۔پچھلے زمانے کے کاتبوں سے بھی غلطی سرزد ہوسکتی تھی۔اسی وجہ سے تو حضرت عثمان نے تدوین قرآن کے لیے حضرت زید بن ثابت کی نگرانی میں ایک بورڈ تشکیل دیا جس نے بڑی محنت شاقہ کے بعد ایک نسخہ قرآن تدوین کیا۔جو ہر لحاظ سے صحیح تھا۔اس کی کاپیاں بنا کر مختلف مراکز میں رکھ دی گئیں تاکہ لوگ اپنے نسخوں کی سرکاری نسخہ سے تصحیح کرلیں یا اس کے مطابق لکھیں۔حضرت عثمان کے نسخہ کی تکمیل سے قبل مختلف لوگوں کے پاس قرآنی نسخے تھے وہ ایک شخص کی محنت کا ثمرہ تھے۔غلطی کا امکان تھا۔ان مختلف نسخوں کی طرز تحریر میں اختلاف ہو سکتا تھا۔جیسا کہ پہلے ذکر کیا ہے کہ عربوں کے مختلف قبائل میں بولنے اور لکھنے میں اختلاف تھا۔اسی اختلاف کو مٹانے کے لیے سرکاری سطح پر قرآن کی تدوین کی گئی۔صحابہ کے بعد کے ادوار میں بھی کاتب سے غلطی کا امکان ہے۔کاتبوں کی غلطیوں کی وجہ سے یہ کہنا کہ قرآن مجید کے نسخوں میں اختلاف ہے۔مثلاً ایک کاتب نے قمن کی جگہ ضمن لکھ دیا ہے تو یہ اس بات کا ثبوت نہیں کہ قرآن مجید میں جو ضمن لکھا ہے وہ ہی صحیح ہے۔قمن کی جگہ ضمن لکھنا کاتب کی غلطی ہے۔لہٰذا قرآن مجید میں اس قسم کا اختلاف ہے۔اس قسم کی کاتبوں سے غلطیاں ہوسکتی ہیں۔یہ قرآن مجید میں بعض جگہ قُل الف مد کے ساتھ لکھا ہوا ہے اگر اس کی جگہ کسی کاتب نے ''قال'' لکھ دیا تو اختلاف نہیں کیا جاسکتا۔

حدیث پر اعتراضات
اور
جوابات

حدیث وضعی ہیں

اعتراض : حدیثیں وضعی ہیں دوسری صدی میں پیغمبر اسلام (صلی اللہ علیہ وسلم) کی عظمت بڑھانے یا قرآنی مباحث کی تشریح کے لیے وضع کی گئیں۔

حدیث کے ادب کو مجروح کرنے کے لیے صرف کلین مستشرق نے ہی کوشش نہیں کی بلکہ مشہور مستشرق سپرنگر نے 1851 میں سیرت رسول پر تین جلدوں پر کتاب لکھی اس میں حدیث کے ادب پر جرح کی گئی اور گولڈزیہر کو قابل اعتبار ٹھہرانے کی کوشش کی بعدازاں ولیم میور نے 1861ء میں سیرت رسول پر کتاب لکھی۔ جس نے بہت شہرت پائی۔ اس میں اعتراضات کو مزید بڑھایا لیکن جرمن کے مستشرق گولڈ زیہر اور پروفیسر شاخت (J.Schacht) نے حدیث کے ادب کے غیر معتبر ٹھہرانے کے لیے مزید سعی کی۔

اور اعتراضات کے سلسلہ میں آگے بڑھایا۔ حدیث کے مختلف پہلوں پر اعتراضات کیے سب سے مرکزی اعتراض یہ ہے کہ حدیث رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کی وضعی تخلیق ہے۔ جو نا قابل اعتبار ہے۔ گیلام نے اپنی تصنیف میں تحریر کیا ہے کہ جب تک پیغمبر زندہ رہے تھے وہ تمام دینی اور دنیوی امور میں واحد راہنما تھے کہا جاسکتا ہے کہ حدیث اور روایت اصطلاحی معنوں میں آپ کی وفات کے بعد شروع ہوئی۔

جواب: اسلام کے دو ہی اہم ماخذ ہیں قرآن اور حدیث مستشرقین نے قرآن کے مقام کو گرانے کے لیے اس کے متن کی حفاظت پر ہی اعتراض نہیں کیے بلکہ قرآن کے اندر معانی کو بھی ہدف تنقید بنایا ہے اور قرآن مجید پر دونوں اقسام کے اعتراضات کا جواب دینے کی کوشش کی ہے۔ یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ قرآن کے معانی پر جو سوالات اٹھائے گئے ہیں وہ لاعلمی اور جہالت پر مبنی ہیں۔

دوم:

قرآن مجید کو غیر محفوظ کتاب قرار دینے کی جو کوشش کی گئی ہے اس کا جواب بھی تاریخی حقائق کی روشنی میں دیا ہے اور تاریخی حقائق کی روشنی میں ثابت کیا ہے قرآن جو اس وقت مسلمانوں کے ہاتھ میں ہے محفوظ اور غیر مبتدل ہے۔

مستشرقین نے اسلام کے دوسرے ماخذ یعنی حدیث کو ہدف جرح بنایا ہے ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ کہ یہ ماخذ قابل یقین نہیں اور بعد کی تخلیق ہے۔ یہاں اہم بنیادی اعتراضات کے جوابات درج کیے جاتے ہیں۔

پہلا اعتراض: یہ ہے کہ حدیث وضعی دینی ادب ہے۔ جو رسول کریم صلعم کی وفات کے بعد تخلیق ہوا۔ اس بنیادی اور مرکزی اعتراض کو مختلف مستشرقین نے مختلف انداز میں بیان کیا ہے۔

یہ اعتراض تاریخی حقائق کے منافی ہے۔ آغاز سے حدیث کی حفاظت کے لیے تین طریقے اختیار کیے گئے۔ (۱) تحریر (۲) زبانی یاد کرنا پھر دوسروں تک پہنچانا۔ (۳) رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان پر تواتر سے عمل۔ یعنی صحابہ رسول کریم صلعم کے فرمان کو اپنے عمل میں لے آتے۔ فرمودات کی حفاظت کے یہی بہترین طریقے ہیں وہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمودات اور فرامین کو میسر آ گئے تھے۔

قارئین کے سامنے اختصار کے ساتھ یہ بیان کیا جائے گا۔ کہ عہد رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم میں ہی صحابہ نے احادیث نبوی کو قلمبند کرنا شروع کر دیا تھا۔ دوم: صحابہ نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان کے مطابق آپؐ کے فرامین کو تمام صحابہ تک پہنچا دیا۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد ہی مجموعہ فرامین واحادیث مختلف تاریخی مراحل طے کرتا ہوا دوسری اور تیسری صدی میں کتابی شکل میں آ گیا۔ ان تاریخی مراحل میں طبعی تسلسل تھا۔ اس کتاب کے حصہ دوم میں اسلامی تعلیمات کے مآخذ کے تحت تدوین حدیث پر بحث گزر چکی ہے اس کی تلخیص یہاں بیان کی جاتی ہے تاکہ سلسلہ کلام بھی جاری رہے اور مستشرقین کے مرکزی اعتراض کا جواب میں آ جائے۔

تدوین حدیث کے ادوار:

پہلا دور:

حدیث کی حفاظت اور تدوین کی اساس رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ میں ابلاغ (دوسروں تک زبانی پہنچانا) اور کتابت پر رکھ دی گئی تھی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

الا لیبلغ الشاھد الغائب فلعل من یبلغه ان یکون اوعی له من بعض سمعه (بخاری شریف جلد 2 ص 53)

حاضر غائب کو میری باتیں پہنچا دے بعض وہ لوگ جن تک میرا کلام پہنچایا جائے ہوسکتا ہے وہ ان لوگوں سے زیادہ محفوظ رکھنے والے ہوں۔ جنہوں نے مجھ سے سنا۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں وفد عبدالقیس آیا۔ آپؐ نے ان کے سامنے نماز روزہ اور زکوٰۃ وغیرہ کے احکام بیان فرمائے۔ اور فرمایا:

احفظوا واخبروا من وراء کم

یعنی اسے یاد کرو اور جنہیں تم نے پیچھے چھوڑا ان کو اس کی خبر دو۔

ایک اور موقع پر ابلاغ حدیث کی ترغیب دیتے ہوئے فرمایا۔

نضر الله عبدا سمع مقالتی فحفظها ووعاھا۔ واداھا کما سمع (مشکوٰۃ المصابیح ص 28)

اللہ تعالیٰ اس بندے کو خوش وخرم رکھے جس نے میری باتوں کو سنا اور یاد کر کے محفوظ رکھا جس طرح سنا اسی طرح دوسروں کو پہنچا دیا۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حدیث کی نشر واشاعت کے لیے لکھنے کا بھی ارشاد فرمایا تھا۔ حضرت عبداللہ بن عمرو کا بیان ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ علم کو مقید کر لو۔ حضرت عبداللہ نے عرض کیا۔ یا رسول اللہ مقید کرنے کا کیا مطلب ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا لکھنا۔ (مجمع الزوائد ص 152)

سنن ابی داؤد میں حضرت عبداللہ بن عمرو کی روایت ہے کہ میں جو کچھ حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے سنتا تھا لکھ لیتا تھا۔ تاکہ میں اس کو یاد رکھ سکوں۔

حضرت ابو ہریرہ کی روایت ہے کہ مجھ سے زیادہ حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کو کوئی محفوظ نہیں رکھتا تھا سوائے عبداللہ بن عمرو کے کیونکہ وہ لکھ لیا کرتا تھا اور میں نہیں لکھتا تھا۔ (بخاری 39:3)

عہد نبوی کا تحریری سرمایہ:

عہد نبوی میں حدیث کے تحریری سرمایہ کو تین حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

(۱) احادیث کا وہ ذخیرہ جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے احاطہ تحریر میں لایا گیا۔

(۲) وہ ذخیرہ جو صحابہ کرام نے قلمبند کیا پھر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں تصحیح کی غرض سے پیش کیا۔

(۳) وہ ذخیرہ جو صحابہ نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے سن کر یا صحابہ کرام سے پوچھ کر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ میں ہی لکھ لیا تھا تینوں قسم کے تحریری سرمایہ کے متعلق مختصراً یہاں بیان کیا جاتا ہے۔

عبداللہ بن حکیم سے روایت ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک تحریر ہمارے قبیلہ جہینہ کے پاس پہنچی جس میں مختلف احادیث تھیں اور ان میں یہ حدیث بھی تھی کہ مردہ جانوروں کی کھال اور پٹھے بغیر دباغت کے کام میں نہ لاؤ۔ (ترمذی جلد 1 ص 206)

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک تحریر لکھوا کر عمر بن حزم کے ذریعہ اہل یمن کے پاس بھیجی اس میں فرائض سنن اور خون بہا کے متعلق مسائل تھے۔ (شرح معانی الاثار طحاوی جلد 2 ص 417)

فتح مکہ کے دن رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے خطبہ ارشاد فرمایا اس کے متعلق حضرت ابو ہریرہ کی روایت ہے کہ ابوشاہ نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ یہ خطبہ میرے لیے لکھوا دیا جائے چنانچہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام کو حکم دیا کہ یہ خطبہ ان کو لکھ دیا جائے۔ (ابوداؤد جلد 3 باب کتابت العلم ص 357)

حضرت وائل بن حجر مدینہ حاضر ہو کر دائرہ اسلام میں داخل ہوئے اور کچھ عرصہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر رہے جب گھر واپس جانے لگے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک صحیفہ لکھوا کر دیا جس میں نماز، روزہ، شراب سود کے احکام تھے۔ (طبرانی صغیر ص 242,241)

حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی روایت ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی زندگی کے آخری ایام میں اپنے عاملوں کے پاس بھیجنے کے لیے کتاب الصدقہ تحریر کروائی تھی لیکن وہ ابھی بھیجی نہیں گئی تھی کہ آپ کا انتقال ہو گیا آپ کی وفات کے بعد حضرت ابوبکرؓ نے وہ کتاب عاملوں کے پاس بھیجی تھی اس کتاب میں جانوروں کی زکوٰۃ کے متعلق مسائل تھے۔ (ترمذی جلد 1 ص 79)

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے عرب وعجم کے بادشاہوں اور امراء کو تبلیغی خطوط لکھے جن کا ذکر احادیث میں موجود ہے ایک خط مقوقس شاہ مصر کو لکھوا کر بھیجا گیا تھا۔ یہ خط مصر کے آثار قدیمہ کی کھدائی میں برآمد ہوا تھا وہ آج بھی مصر میں موجود ہے اس کی عبارت کتب احادیث کی روایت سے حیرت انگیز مطابقت رکھتی ہے۔

حضرت انس بن مالک کے پاس ایک لکھا ہوا احادیث کا مجموعہ تھا حضرت معبد بن خالد کی روایت ہے کہ جب احادیث کے متعلق ہم لوگ حضرت انس سے زیادہ استفسار کرتے حضرت انس ایک چونگا نکال لاتے اور فرماتے یہ وہ احادیث ہیں جنہیں میں نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے سن کر لکھا۔ اور پھر آپ ﷺ کی خدمت میں تصدیق اور توثیق کے لیے پیش کی تھیں۔

صحابہ کرامؓ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت اقدس میں بیٹھ جاتے اور حدیثیں لکھ لیتے تھے حضرت عبداللہ بن عمرو کی روایت

ہے بینما نحن حول رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نکتب (دارمی ص 68) ہم سب لوگ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے گرد بیٹھ جاتے اور حدیث لکھ لیتے تھے۔

حضرت عبداللہ بن عمرو فرماتے ہیں کہ جو کچھ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے سنتا تھا لکھ لیا کرتا تھا۔ (ابوداؤد جلد 3 ص 356)

حضرت عبداللہ بن عمروؓ نے اسی تحریری مجموعہ احادیث کا نام صادقہ رکھا تھا آپ فرمایا کرتے تھے۔

قاما الصادقة صحيفة كتبتها من رسول الله صلى الله عليه وسلم

یعنی صادقہ وہ مجموعہ احادیث ہے جس کو میں نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے سن کر لکھا تھا۔

یرغبنی فی الحیوة الا الصادقة یعنی مجھے دنیا میں صادقہ سب چیزوں سے زیادہ محبوب ہے۔

حضرت رافع بن خدیج سے روایت ہے کہ ہم نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا یا رسول اللہ! ہم لوگ آپؐ سے بہت سی باتیں سنتے ہیں اور ان کو لکھ لیتے ہیں اس کے متعلق آپ کا کیا ارشاد ہے؟ تو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب دیا لکھا کرو۔ اس میں کوئی مضائقہ نہیں۔ (کنز العمال جلد 5 ص 223 مجمع الزوائد جلد 1 ص 60)

حضرت علیؓ کے پاس ایک لکھا ہوا صحیفہ تھا۔ اس میں خون بہا اسیروں کی رہائی، زکوٰۃ اور دوسرے موضوع سے متعلق احادیث تھیں۔ (بخاری شریف باب کتابت العلم ص 33)۔

اور حضرت علی فرمایا کرتے تھے۔

ما كتبنا عن رسول الله صلى الله عليه وسلم الا القرآن و ما فى هذه الصحيفة۔

یعنی ہم نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی چیز نہیں لکھی مگر قرآن کریم اور جو کچھ اس صحیفہ میں ہے۔

حضرت حسن بن عمر کا بیان ہے کہ میں نے حضرت ابو ہریرہ کے سامنے ایک حدیث بیان کی انہوں نے اس کا انکار کر دیا میں نے کہا یہ حدیث تو میں نے آپ ﷺ سے سنی ہے حضرت ابو ہریرہ نے جواب دیا اگر تم نے مجھ سے سنی ہوگی تو وہ میرے پاس لکھی ہوئی ہوگی۔ میرا ہاتھ پکڑ کر اپنے گھر لے گئے اور مجھ کو رسول کریم صلعم کی احادیث کی بہت سی کتابیں دکھائیں تلاش سے میری بیان کردہ حدیث ان کتابوں میں مل گئی۔ تو حضرت ابو ہریرہؓ نے کہا۔ کیا میں نے تم سے نہیں کہا تھا کہ اگر وہ حدیث میں نے روایت کی ہے تو میرے پاس لکھی ہوئی ہوگی؟ (فتح الباری جلد 1 ص 148)

ان تاریخی شواہد سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال کی حفاظت تحریری صورت میں آپ ﷺ کے عہد میں شروع ہوگئی تھی۔

دوم:

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم عبادات، زکوٰۃ، صدقات اور دیگر عائلی اور معاشرتی احکام بیان فرماتے تھے۔ ان پر عمل شروع ہو جاتا۔ وہ عمل تواتر سے اب تک قائم ہے نسلاً بعد نسل مسلمانوں میں جاری و ساری ہے کہیں بھی انقطاع نہیں ہوا۔ رسول کریم صلعم کے فرمودات آپ کی زندگی میں احاطہ تحریر میں بھی آگئے۔ ان پر عمل بھی شروع ہو گیا۔ تو ضائع ہونے کا امکان بہت کم ہے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد کا تحریری مواد ہی مستشرقین کے اعتراض کا کافی جواب ہے کہ آپ کی احادیث آپ کی زندگی میں ہی قلمبند ہونا شروع ہوگئی تھیں۔

دوسرا دور:

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد دوسرا دور شروع ہوتا ہے اس دور میں احادیث کی کتابت اور عام شہرت اور ابلاغ شروع ہو گیا صحابہ کرام کے تحریری مجموعوں سے دوسرے لوگوں نے لکھنا شروع کر دیا۔ اور خلفاء نے جو بھی کوئی فیصلہ کرنا ہوتا تھا وہ قرآن اور فرمان رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف رجوع کرتے تھے۔ اس طرح حدیث ایک ہاتھ سے نکل کر عوام کا سرمایہ بن جاتی تھی۔

حضرت ابو ہریرہ کے متعلق بشیر بن نہیسک کا بیان ہے میں حضرت ابو ہریرہ سے حدیث کی کتابیں مانگ کر نقل کر لیا کرتا تھا۔ پھر انہیں سناتا تھا اور عرض کرتا کہ ان حدیثوں کو آپؓ نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے؟ جواب دیتے ہاں۔ (دارمی ص 68)

حضرت عکرمہ روایت کرتے ہیں کہ جس زمانہ میں حضرت عبداللہ بن عباس کی بینائی کمزور ہو گئی تھی اور وہ خود پڑھ نہیں سکتے تھے اس زمانہ میں طائف کے کچھ لوگ حضرت ابن عباسؓ کے پاس لکھے ہوئے حدیث کے چند نسخے لے کر پہنچے تو حضرت ابن عباسؓ نے کہا کہ تم خود سناؤ اور تمہارا سنانا اور میرا پڑھنا جواز روایت کے لیے دونوں یکساں ہیں۔ (ترمذی جلد 2 ص 338، طحاوی جلد 2 ص 384)

اسی خیال کی تائید دارمی کی اس روایت سے ہوتی ہے کہ سعید بن جبیر، ابن عباس کے پاس بیٹھ کر صحیفوں میں حدیثیں لکھتے تھے۔ (دارمی 69)

حضرت انسؓ نے اپنے بچوں کو مخاطب کر کے کہا یا بنی قیدوا ھذا العلم اے میرے بچو! اس علم کو لکھ لو۔ (دارمی ص 68)

خلفاء راشدین کے پاس ہر روز مختلف قسم کے مقدمے آتے تو خلفاء راشدین فیصلہ کرنے کے لیے قرآن اور احادیث نبوی کی طرف رجوع کرتے اس طرح حدیث ایک سینہ سے نکل کر منظر عام پر آ کر شہرت پکڑ جاتی اور فیصلہ کا جز بن جاتی۔

قبیصہ کی روایت ہے کہ ایک فوت شدہ شخص کی دادی حضرت ابو بکرؓ کے پاس آئی اور ورثہ سے حق کا دعویٰ کیا۔ حضرت ابو بکرؓ نے فرمایا کہ نہ اللہ کی کتاب سے اور نہ سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے آپ کو حق ملتا ہے لیکن جب دوسروں سے پوچھا تو مغیرہ نے گواہی دی کہ حضرت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے دادی کو چھٹا حصہ دیا تھا۔ حضرت ابو بکر نے ان سے گواہ طلب کیا۔ محمد بن مسلمہ نے مغیرہ کے بیان کی تصدیق کی اس بناء پر حضرت ابو بکر نے دادی کے حق میں فیصلہ کر دیا۔

حدیث کے درس و تدریس کا سلسلہ بڑے بڑے صحابہ کے گھروں پر جاری ہو گیا۔ حضرت ابو ہریرہؓ کے آٹھ ہزار شاگرد تھے، حضرت عبداللہ بن عباس حضرت عبداللہ بن عمر، حضرت عبداللہ بن عمرو اور حضرت انس بن مالک کے گھر درس گاہیں بنے ہوئے تھے۔

صحابہ کرام نے ایک ایک حدیث سننے کے لیے سینکڑوں میل سفر اختیار کیے جابر بن عبداللہ نے مدینہ سے شام تک محض ایک حدیث سننے کے لیے سفر اختیار کیا۔ (فتح الباری ابوالفضل شہاب الدین جلد 1 ص 158)

دوسرا دور پہلے دور کا تسلسل ہے۔ مکتوبہ احادیث درس و تدریس کا سبب بن گئیں۔ دوم: مکتوبہ احادیث کے مزید نسخے تیار ہونے لگے۔ مقدمات میں جو احادیث ایک صحابی کے سینہ میں محفوظ تھیں۔ اب مقدمہ کے فیصلہ کا جزو بن گئیں۔ اور عوام کے علم میں آ گئیں۔ سب سے اہم بات یہ ہے بڑے صحابہ کے گھر حدیث کی تدریس کے لیے درس گاہیں بن گئے۔ تو اس طرح پہلے دور کی نسبت احادیث کو عام چرچا ہو گیا۔

تیسرا دور:

تیسرا دور تابعین کا دور ہے۔ اکابر تابعین نے احادیث کی تدریس کے لیے درس گاہیں قائم کر دیں۔ تمام لوگ درس گاہوں کی

طرف رجوع کرتے حدیث کے جواہر پاروں سے جھولیاں بھر بھر کر واپس وطنوں کو لوٹتے تھے۔

اس دور میں لکھنے کا عام رواج ہو چکا تھا۔لوگ درس گاہوں میں جاتے اور حدیثوں کو لکھ لیتے تھے۔

حضرت عمر بن عبدالعزیز نے مدینہ کے گورنر ابو بکر بن محمد بن عمر بن حزم کو لکھا کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی جو حدیث ہے اس کو لکھ لیا کرو میں ڈرتا ہوں کہ کہیں علم مٹ نہ جائے اور علما فنا نہ ہو جائیں مجالس قائم کریں۔تاکہ جو شخص نہیں جانتا وہ بھی جانے۔(بخاری کتاب العلم کیف یقبض العلم)

پہلا دور دوسرے مرحلہ سے گزر کر تیسرے مرحلہ میں داخل ہوا ہے دوسرے دور سے زیادہ احادیث کی اشاعت شروع ہوگئی۔ مزید برآں حدیث کی حفاظت کے لیے سرکاری سطح پر بھی بندوبست ہو گیا۔

چوتھا دور:

اس دور میں احادیث کے تحریری مجموعے منظر عام پر آنا شروع ہو گئے۔سب سے پہلے جس شخص نے حدیث کی کتاب لکھی وہ امام عبدالملک بن عبدالعزیز ابن جریج (م 150ھ) ہیں۔بعض کے نزدیک ربیع بن صبیح (م 160ھ) نے سب سے پہلے حدیث کی کتاب لکھی ایک اور روایت کی رو سے سعید بن عروبہ (م 156ھ) نے۔ان محدثین کی سن وفات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ احادیث کا کتابی صورت میں لکھا جانا دوسری صدی کے نصف کے قریب قریب ہو چکا تھا۔

ان محدثین کے علاوہ حسب ذیل محدثین نے علم حدیث کی خدمت سرانجام دی۔مدینہ میں محمد بن اسحاق (م 151ھ) امام مالک بن انس (م 179ھ) کوفہ میں سفیان ثوری (م 161ھ) شام میں امام اوزاعی (م 156ھ) یمن میں معمر (م 153ھ) خراسان میں عبداللہ بن المبارک (م 181ھ) مصر میں لیث بن ثابت (م 175ھ) اب پہلا دور مرحلہ دار چوتھے دور میں داخل ہوتا ہے پہلے دور کا منتشر بکھرا ہوا علمی خزانہ کتابی شکل میں آنا شروع ہو گیا۔

پانچواں دور:

پانچواں دور علم حدیث کا سنہری دور کہلاتا ہے جس میں احادیث کی کتابی صورت میں تدوین کی تکمیل ہوئی۔اہل سنت والجماعت کی چھ معتبر کتب حدیث اسی دور میں مرتب ہوئیں۔الجامع الصحیح مصنفہ محمد بن اسماعیل بخاری (م 256ھ) صحیح مسلم مرتبہ حافظ مسلم بن الحجاج (م 261ھ) سنن ابی داؤد مرتبہ ابو داؤد سلیمان بن الاشعث (م 275ھ) جامع ترمذی مرتبہ مولفہ حافظ ابو عیسیٰ محمد بن عیسیٰ (م 279ھ) سنن ابن ماجہ مولفہ حافظ ابو عبداللہ محمد بن یزید قزوینی (م 273ھ) نسائی مولفہ (ابو عبدالرحمن احمد بن شعیب ام 302ھ)

یہ کہنا کہ احادیث دو تین سو سال بعد احاطہ تحریر میں آئیں بالبداہت تاریخی حقائق کے منافی ہے پہلے دور کا حدیث کا خزانہ مرحلہ دار تسلسل کے چلتا ہوا پانچویں دور میں کتابی شکل اختیار کر گیا تھا۔

احادیث کا عملی اور نظری حصہ:

موضوعات کے اعتبار سے احادیث کو دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔عملی اور نظری۔عملی حصہ میں عبادات صلوٰۃ، روزہ، زکوٰۃ، حج، اخلاقیات، معاشرتی امور، سیاسی امور، میراث وغیرہ ہیں۔مذکورہ امور کے متعلق رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جو ارشادات فرمائے۔ آپؐ کے حیات مبارکہ میں ہی ان پر عمل شروع ہو گیا۔اور تواتر کے ساتھ عمل جاری رہا۔جب دوسری تیسری صدی میں احادیث مرتب ہوئیں۔وہی عملی شکل اختیار کر جانے والی حدیثیں تحریر میں آ گئیں۔ان میں وضعی حدیث ہونے کا کیا اندیشہ ہو سکتا ہے؟ جو مسلمانوں کے عمل

کا حصہ بن چکی تھیں انہیں کو محدث احاطہ تحریر میں لے آئے۔ لہٰذا یہ حصہ وضعی نہیں ہو سکتا باقی رہا نظریاتی حصہ جس میں پیشگوئیاں قرآن مجید کی آیات کی تفسیر مابعد الطبیعاتی مسائل وغیرہ۔ جب اس قسم کے مسائل پر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے تو ایک صحابی نہیں سن رہا ہوتا تھا کئی صحابہ سن رہے ہوتے تھے۔

دوم: رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا طریقہ یہ تھا کہ مسئلہ کو مختلف انداز میں کئی دفعہ دہراتے تاکہ صحابہ کے ذہن نشین ہو جائے۔ ان مسائل کو صحابہ نے خوب یاد رکھا اور بعض صحابہ عہد رسول میں لکھ بھی لیتے تھے۔ جب حدیث کی تدوین کا پانچواں مرحلہ آیا تو یاداشتوں اور تحریری مواد کی مدد سے نظریاتی موضوعات کو بھی لکھ لیا گیا۔ تو نظریاتی مسائل کے متعلق بھی کوئی من گھڑت حدیث بنانا ایک مشکل امر تھا۔ لہٰذا محدثین نے اس حصہ کو بھی بڑی احتیاط سے منضبط کیا۔

وضعی حدیث کے روکنے کا طریقہ:

دوسری تیسری صدی ہجری میں جب محدثین نے محسوس کیا کہ من گھڑت حدیث وضع کرنے کا رجحان پایا جاتا ہے تو انہوں نے حق اور باطل میں تمیز کرنے کے لیے اصول وضع کیے وہ اصول ''سند'' اور ''متن'' حدیث کے متعلق تھے جو علم الروایۃ اور علم الدرایۃ کے نام سے مشہور ہیں۔ علم الروایہ میں سلسلہ روایت اور ضبط حدیث پر بحث ہوتی ہے اور علم الدرایۃ میں حدیث کے متن اور مضمون پر گفتگو کی جاتی ہے یہ اس قسم کے اصول تھے۔ جن سے حق اور باطل میں تمیز کرنے میں کوئی مشکل کام ہی نہ رہا۔

مذکورہ بحث کی روشنی میں: یہ بات واضح ثابت ہو جاتی ہے ایک تو دوسری اور تیسری صدی ہجری میں مرتبہ مجموعہ احادیث وہی ہیں جو عہد رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم میں احاطہ تحریر میں آ چکی تھیں۔

دوم: صحابہ نے فرمودات نبوی پر عمل بھی شروع کر دیا تھا۔ جو حدیث احاطہ تحریر میں آئی وہ صرف ایک صحابی کی میراث نہ تھی بلکہ کئی صحابہ نے اس حدیث کو سنا تھا۔ اسی علمی خزانہ کو دوسری تیسری صدی ہجری میں کتابی شکل دی گئی پھر وضعی حدیث کا رجحان دیکھا تو محدثین نے حق اور باطل میں تمیز کرنے کے لیے اصول مقرر کر دیئے۔ ان حقائق کی روشنی میں دو باتیں واضح ہو جاتی ہیں ایک تو تدوین حدیث کی بنیاد رسول کریم صلعم کے عہد میں پڑ گئی تھی۔ وہ مرحلہ وار آگے بڑھتی چلی گئی آخر کار دوسری تیسری صدی میں پایہ تکمیل تک پہنچ گئی۔ دوم علماء کے اصولوں کی روشنی میں اصل اور وضعی حدیث میں تمیز کرنا آسان ہو گیا۔ اگر کوئی حدیث کتب حدیث میں درج ہو بھی گئی تو محدثین اور شارحین نے بھی سند اور متن کے بارے میں وضع کردہ اصولوں کی روشنی میں اس حدیث کا درجہ بالکل کم کر دیا یعنی ضعیف اور غریب کے درجہ میں لے آئے۔ لہٰذا مستشرقین کا مرکزی اعتراض تاریخی حقائق کے منافی ہے۔

☆......☆

حدیثیں سیاسی اور معاشرتی ارتقاء کا نتیجہ ہیں

اعتراض: احادیث قدیم اسلامی معاشرے میں سیاسی اور معاشرتی ارتقاء کا نتیجہ ہیں۔

جواب: آغاز سے ہی اسلامی معاشرہ کی بنیاد دو باتوں پر تھی قرآن سنت وحدیث۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں۔

اِنّی تَرَکْتُ فِیْکُمْ اَمْرَیْنِ اِنْ تَمَسَّکْتُم بھما لَنْ تَضِلُّوْا کِتَابَ اللّٰہِ وَ سُنَّتِی

یعنی میں نے تمہارے درمیان دو چیزیں چھوڑ چلا ہوں جب تک تم انہیں تھامے رہو گے گمراہ نہیں ہو گے۔ وہ اللہ کی کتاب اور میری سنت ہے۔ (مشکوٰۃ المصابیح ص 1)

گویا اسلامی معاشرہ کی بنیاد عہد رسولؐ سے قرآن مجید اور سنت اور حدیث پر رکھی گئی۔ اسی بنیاد پر اسلامی معاشرہ کی اٹھان تھی اس پر آگے بڑھ رہا تھا۔ تو اسلامی معاشرہ کے ارتقاء کے لیے وضعی احادیث کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ سیاسی، معاشرتی، اقتصادی اور دینی مسائل کے حل کی جب ضرورت پڑتی تو قرآن مجید اور حدیث کی روشنی میں حل کر لیے جاتے تھے۔ قرآن مجید میں تمام مسائل کا حل موجود ہے۔ قرآن مجید کی وضاحت اور تشریح رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کر دی اور اس کی تشہیر کر دی گئی۔ اسلامی تعلیم کو مسلمانوں نے اپنے عمل کا جزو بنا لیا۔ لہٰذا مسلمانوں کو احادیث وضع کرنے کی ضرورت ہی نہیں۔ مزید براں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے خود بھی قرآن اور حدیث کی روشنی میں نئے مسائل کو حل کرنے کے لیے اجتہاد کی اجازت دے دی تھی۔ جب مسلمان اجتہاد سے اپنے مسائل کو حل کر سکتے تھے تو ان کو اپنے مسائل کے حل کے لیے حدیثیں وضع کرنے کی کیا ضرورت تھی۔

☆......☆

صحابہ نے بھی حدیثیں وضع کیں

اعتراض: احادیث محض متاخرین ہی نے وضع نہیں کیں بلکہ صحابہ اور تابعین نے بھی وضع کیں۔

جواب: حدیث کی کسی کتاب میں ایک بھی ایسی حدیث نہیں ملتی۔ جس سے یہ ظاہر ہو کہ صحابی نے یہ حدیث وضع کی ہے۔ یہ الزام کسی صحابی پر نہیں۔ تمام محدثین نے تمام صحابہ کو عدول قرار دیا ہے۔ کہ کسی صحابی سے بھی کوئی جھوٹ ثابت نہیں۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جھوٹی بات منسوب کرنے والے کے لیے وعید بیان فرمائی حدیث میں آتا ہے۔

فَمَنْ کذب علی متعمدًا فلیتبوا مقعدہ من النار (ترمذی)

جو شخص مجھ پر عمداً جھوٹ بنائے وہ اپنی جگہ جہنم میں بنائے گا۔ اس وعید کے بعد کسی صحابی سے یہ توقع کرنا کہ اس نے جھوٹی حدیث وضع کی۔ یہ صحابہ پر صریحاً الزام ہے۔ جن لوگوں نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خاطر اپنے مال گھر بار رشتے دار چھوڑ دیئے اور اپنی جانیں قربان کر دیں۔ کیا وہ آپ کی طرف غلط بات منسوب کر سکتے ہیں۔ گولڈ زیہر جیسے اسلام دشمن، حق وصداقت کے بیری ہی بلا دلیل اعتراض کر سکتے ہیں۔

باقی رہا تابعین کا معاملہ تمام محدثین نے تابعی راوی کے دین اور کردار کی خوب چھان پھٹک کی۔ ان کے حالات زندگی معلوم کرنے کے بعد ہی حدیث اخذ کرنے یا نہ کرنے کا فیصلہ کرتے۔ حدیث اخذ کرتے وقت تمام اصولوں کو سامنے رکھا جاتا تھا۔ جو محدثین نے

بنائے تھے۔سب سے اہم اصول رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے خود فرمادیا حدیث میں آتا ہے۔

ماجاء کم عنی فاعرضوہٗ علی کتاب اللّٰہ فما وافقہ فانا قلتہٗ و خلفہٗ فلم اقلہ (رسالہ الشافعی صفحہ 62)

یعنی جو کچھ میں کہوں اسے اللہ کی کتاب (قرآن) پر پرکھ لو۔جو قرآن کے موافق ہو وہ میں نے کہا اور جو قرآن کے خلاف ہو وہ میں نے نہیں کہا۔لہٰذا معترض نے ایسا اعتراض کیا جو بلا دلیل ہے۔اس کے پاس کوئی تاریخی سند نہیں ہے۔محض مفروضہ ہے۔

☆......☆

مختلف فرقوں کے افراد نے حدیثیں وضع کیں

اعتراض: اسلام میں مختلف فرقوں کے افراد نے اپنے فرقوں کی تائید میں احادیث وضع کر کے ان کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کی طرف منسوب کر دیا۔

جواب: علماء اور محدثین اس بات کے معترف ہیں کہ بعض اہل فرقہ نے اپنے فرقہ کے متعلق حدیثیں وضع کیں۔لیکن تمام وضعی احادیث اور وضع کرنے والوں کو محدثین نے خود واضح کر دیا۔یہ باتیں کتب جرح و تعدیل اور موضوعات میں درج ہیں۔جیسے نصب الرایہ۔محدثین نے حق اور باطل میں تمیز کر دی اور وہ کتب حدیث کے علمی خزانہ میں صحت کا درجہ نہ پاسکیں۔نہ کسی محدث نے ان کی سند کو درجہ قبولیت دیا۔بعض احادیث میں اختلاف پایا جاتا ہے اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ احادیث وضع کی گئی ہیں۔اختلافات عقائد، امور دین میں نہیں ہیں۔بلکہ فروعات میں ہیں۔رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے آسانی پیدا کرنے کے لیے ایک فعل کو مختلف طریقوں سے انجام دیا جس نے جس طریقے کو دیکھا اس نے ویسے ہی بیان کر دیا۔تو ایک فعل دو یا کئی اور طریقوں سے ادا کرنے کی وجہ سے اختلاف پیدا ہو گیا۔یہ اختلاف فردعات میں ہے۔لہٰذا وہ اختلاف نہیں بلکہ ایک فعل کو مختلف طریقوں سے انجام دینے کی تعلیم ہے۔اس میں سہولت کو مد نظر رکھا گیا ہے۔کتب فقہ میں خصوصاً اس قسم کے اختلاف پائے جاتے ہیں مثلاً ہاتھ کھول کر نماز پڑھنا یا نہ پڑھنا۔رفع یدین وغیرہ۔اس قسم کے اختلافات ہیں۔حقیقت میں یہ اختلاف نہیں ہے جس طریقے سے بھی رسول کریم صلعم نے کوئی فعل سرانجام دیا۔اس کو اختیار کیا جا سکتا ہے۔

☆......☆

محدثین کا دائرہ تنقید سند ہے

اعتراض: محدثین کے ہاں تنقید کا دائرہ سمٹ کر سند تک محدود ہو گیا اس سے بہت سی غیر صحیح احادیث ان کے نقد کے بعد بھی صحیح قرار پا گئی ہیں۔ (غاستوں ویت)

جواب: یہ اعتراض بھی حقیقت پر مبنی نہیں۔ محدثین حدیث کی پرکھ سند اور متن دونوں کو سامنے رکھ کر کرتے تھے۔ اسی لیے علوم حدیث کے دو بنیادی علم ہیں۔ علم الروایۃ اور علم الدرایۃ۔ علم الروایۃ میں سلسلہ روایت اور ضبط حدیث پر بحث ہوتی ہے۔ جب کہ علم الدرایۃ میں حدیث کے متن اور مضمون پر گفتگو ہوتی ہے۔ دونوں کو برابر کی حیثیت دیتے تھے۔

جب ایک منصف مزاج انسان ان مباحث کو دیکھتا ہے جو محدثین نے حدیث کے بارے میں لکھے ہیں تو اسے معلوم ہوگا کہ سند حدیث کے ساتھ ساتھ متن حدیث کی بھی بہت چھان پھٹک کی گئی اور اس پر بہت غور و خوض کر کے لکھا گیا۔ بلکہ یہ ایک الگ علم ہے جس پر محدثین نے گفتگو کی ہے محدثین سند اور متن دونوں کو دیکھ کر ہی احادیث کا فیصلہ کرتے تھے اگر کوئی شخص صحیح حدیث کی تاریخ پڑھے تو اس میں شاذ اور علت کا لفظ موجود ہے جو کہ نقد متن بھی ہے اور نقد سند بھی۔ اسی طرح کوئی حدیث حسن لذاتہ سے صحیح لغیرہ کے درجہ پر جاتی ہے تو اس میں متن کو بھی سند کے ساتھ زیر غور لایا جاتا ہے اس لیے علماء حدیث نے حسن اسناد یا صحیح الاسناد اور حدیث حسن میں فرق کیا ہے کیونکہ کبھی حسن الاسناد متن کے بغیر ہوتی ہے اسی طرح سے مقلوب کی دو قسمیں ہیں مقلوب متن اور مقلوب سند اس طرح سے موضوع حدیث کو جاننے کے لیے متن کو بھی سامنے رکھنا ہوتا ہے اس کا ذکر بہت سی کتب حدیث میں موجود ہے۔

(المنار المنیف فی الصحیح والضعیف لابن القیم و معرفة علوم الحدیث لا حاکم ص 62 بحواله علوم الحدیث ص 923)

(مصنفہ ڈاکٹر عبدالرؤف نے ظفر ڈائریکٹر سیرت چیئر اسلامیہ یونیورسٹی بہاولپور)

حدیث کے متن کے پرکھنے کے لیے اعلیٰ کسوٹی تو موجود ہے وہ ہے قرآن مجید کسی حدیث کو پرکھنے کے لیے فوراً اس کسوٹی پر پرکھا جا سکتا ہے۔ سند کو پرکھنے کے لیے مشکل کام تھا۔ ہر راوی کے کردار اور دین کی پرکھ کی جاتی۔ اس لیے بظاہر یہ معلوم ہوتا تھا کہ محدثین سند کی طرف زیادہ توجہ دیتے تھے۔ یہ سوچ قطعاً غلط ہے محدثین نے حدیث کی صحت کے لیے متن اور سند دونوں کو برابر کی حیثیت دی ہے۔ تمام علماء امت کا اس بات پر اتفاق ہے۔

☆......☆

علماء نے وہ حدیثیں وضع کیں جن سے حکام کی مخالفت ہوتی تھی

اعتراض: علمائے اسلام نے ایسی احادیث وضع کیں جن سے حکام کی مخالفت ہوتی تھی۔

جواب: جن علماء اور محدثین نے تدوین حدیث کا کام کیا ہے ان کی اور خلفاء بنوامیہ کے درمیان کوئی مخاصمت نہ تھی۔ محدثین کے حالات زندگی تواریخ میں موجود ہیں۔ حدیث کے مختلف مراکز تھے۔ تمام محدث دین کی خدمت سمجھتے ہوئے اپنا کام سرانجام دے رہے تھے۔ انہیں اپنے کام سے واسطہ تھا۔ پھر کسی محدث کی کتاب میں اموی خلیفہ کی مخالفت میں کوئی حدیث درج نہیں۔ کسی تاریخ کی کتاب میں کسی محدث کی جانب داری کا ذکر موجود نہیں۔ خلفاء بنی امیہ شیعان علی اور خوارج میں جو اسباب مخالفت پائے جاتے تھے ان پر تاریخوں میں بحثیں موجود ہیں لیکن محدث تدوین حدیث کے کام میں مصروف تھے۔ اگر کسی محدث کا اموی خلیفہ سے اختلاف ہوا ہے۔ وہ کسی حدیث کی بناء پر نہیں بلکہ خلیفہ کی ذات کی وجہ سے ہوا ہے۔ محدثین کو بنوامیہ کے خلفاء کے خلاف حدیثیں وضع کرنے کی ضرورت کیا تھی؟ اگر انہوں نے وضع کی ہیں تو وہ کتب حدیث میں تو پائی نہیں جاتیں۔ پھر وضع کرنے کا مقصد کیا؟ یہ اعتراض کسی تاریخی حقیقت پر مبنی نہیں محض مفروضہ ہے۔

☆......☆

مسلمان حکمرانوں نے احادیث وضع کیں

اعتراض: مسلمانوں حکمرانوں نے اپنے سیاسی افکار کی تائید اور متقی افراد کو خاموش کرنے کے لیے احادیث وضع کیں۔

جواب: یہ اعتراض بلا دلیل ہے کتب احادیث میں ایک حدیث بھی نہیں پائی جاتی۔ جس کو کسی اموی خلیفہ نے روایت کیا ہو۔ اگر حکمرانوں نے اپنے سیاسی افکار کی تائید میں احادیث وضع کیں۔ وہ کہاں گئیں؟ کتب حدیث میں تو درج نہیں۔ اسی طرح کتب حدیث میں ایسی کوئی روایت نہیں پائی جاتی جس سے یہ ثابت ہو کہ حکمرانوں نے متقی اور زاہد لوگوں کو خاموش کرنے کے لیے وضع کی ہوں۔ متقی اور زاہد شخص کو کس بناء پر خاموش کرنا مقصود تھا۔ یہ تو گولڈ زیہر اور دیگر مستشرقین کی محض ذہنی اختراع ہے۔ حقیقت کچھ بھی نہیں۔ جب حکمرانوں کی روایت کردہ کوئی حدیث ہے ہی نہیں تو اعتراض کیسا۔

☆......☆

امیر معاویہ نے مغیرہ بن شعبہ کو حضرت علی کی تائید میں احادیث کو ضائع کرنے کا حکم دیا۔

اعتراض :حضرت معاویہ بن ابی سفیان نے حضرت مغیرہ بن شعبہ کو ایسی احادیث ضائع کرنے کا حکم دیا جو حضرت علی کی تائید کرتی تھیں اور ان احادیث کو پھیلانے کا حکم دیا جو ان کی حکومت کی تائید میں تھیں۔

جواب :اس اعتراض کی تائید کسی تاریخی حقیقت سے نہیں ہوتی۔تاریخ میں کوئی ایک مثال نہیں ملتی کہ امیر معاویہ نے حضرت مغیرہ سے یہ کہا ہو۔کہ حضرت علیؓ کے خلاف اور حضرت عثمان کے حق میں احادیث وضع کریں۔اسی طرح کتب حدیث میں کوئی ایسی روایت نہیں ملتی جو حضرت مغیرہ نے حکومت اموی کی تائید میں بیان کی ہو۔کتب رجال میں حضرت مغیرہ کے حالات ملتے ہیں۔ان کے حالات سے معترض کے اعتراض کی تائید نہیں ہوتی۔نہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ امیر معاویہ نے حضرت علیؓ کی تائید والی حدیثوں کو ضائع کیا یہ اعتراض بھی مفروضہ پر ہے۔اور ذہنی اختراع ہے۔خلفاء بنو امیہ نے محدثین سے کوئی تعرض نہیں کیا۔خلفاء اپنی طرز پر حکومت کرتے تھے اور محدث اپنا کام تدوین حدیث انجام دیتے تھے تاریخ صرف یہ بتاتی ہے کہ امویوں اور ہاشمیوں میں سیاسی تنازع تھا۔اس تنازع کا محدثین کے کام پر ہرگز کوئی اثر نہیں تھا۔

☆......☆

اعتراض:عبدالملک بن مروان نے قبۃ الصخرہ کے گرد طواف کا حکم دیا۔(Muslim Studies)

جواب :یہ اعتراض بالبداہت تاریخی حقائق سے دور ہے گولڈزیہر نے یہ اعتراض یعقوبی سے نقل کیا ہے۔(تاریخی یعقوب 8,7/3) یعقوبی اہل تشیع تھا۔اس نے اس قسم کی غلط اور بے بنیاد باتوں کی اشاعت کی ہے کسی مورخ نے اس کی تائید نہیں کی۔بلکہ ابن الاثیر اور ابن کثیر نے یہ لکھا ہے کہ قبۃ الصخرہ کو عبدالملک کے بعد اس کے بیٹے ولید بن عبدالملک نے بنایا اس سے ہی قصہ کا باطل ہونا واضح ہو جاتا ہے۔
(ابن الاثیر 135/4، ابن کثیر البدایہ والنہایہ ص168)

تاریخ اسی امر پر شاہد ہے کہ خلفاء بنو امیہ نے کسی دینی رسوم اور امور کی نفی نہیں کی۔شعائر اللہ کی تعظیم کرتے تھے عبادات بجا لاتے تھے حج کے مناسک اسی طرح ادا کرتے تھے۔جس طرح عہد رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم میں رائج تھے۔امام ابن تیمیہ نے لکھا ہے کہ صحابہ اور تابعین میں سے کوئی بھی قبۃ الصخرہ کی تعظیم و تکریم نہیں کرتا تھا۔(فتاویٰ ابن تیمیہ 12/27)

یہ کوئی معمولی امر نہیں تھا کہ علماء اور محدثین خاموش رہتے۔لہٰذا یہ اعتراض بھی بلا دلیل اور تاریخی حقیقت کے منافی ہے۔

☆......☆

زہری نے حدیث وضع کی

اعتراض: امام زہری نے یہ حدیث وضع کی۔

لا تشدو الرجال الا الی ثلثة مساجد۔

جواب: محدثین کے نزدیک یہ حدیث صحیح ہے۔ امام زہری نے عبدالملک کے کہنے پر وضع نہیں کی۔ تین مساجد سے مراد بیت اللہ، مسجد نبوی اور مسجد اقصیٰ ہیں۔ یہ تینوں مساجد انبیاء کی یادگاریں ہیں۔ ان کی طرف سفر کرنا باعث ثواب ہے۔

☆......☆

امام زہری کا اموی حکمرانوں کی خواہش کے مطابق حدیث وضع کرنا

اعتراض: امام زہری اموی حکمرانوں کی خواہش کے مطابق احادیث وضع کرتے تھے۔

جواب: اعتراض بلا دلیل ہے۔ کسی ایسی حدیث کا حوالہ نہیں دیا کہ فلاں فلاں حدیث اموی حکمرانوں کی خواہش پر وضع کی گئی تھیں۔

دوم: دوسرے محدثین نے ان احادیث کو قبولیت کی سند بھی دی ہو امام زہری کی سیرت میں اس کا کوئی نشان نہیں ملتا۔

گولڈ زیہر نے تدوین حدیث پر اسی قسم کے اعتراضات کیے ہیں۔ الفاظ میں فرق ہے نوعیت وہی ہے جس کا جواب دیا جا چکا ہے اس مستشرق کے اعتراضات کا خاکہ درج کر دیا جاتا ہے۔ قارئین خود دیکھ لیں کہ اس کے اعتراضات کے جوابات دیئے جا چکے ہیں۔

(۱) حدیث نبوی کی تخلیق مسلمانوں کے دینی سیاسی معاشرتی تنازعات کے نتیجہ میں ہوئی۔ جو پہلی اور دوسری صدی میں ہوئے۔

(۲) وضع حدیث کا سبب اموی خلفاء اور علمائے دین کے مابین عداوت تھی علماء مدینہ نے انتقاماً حدیثیں وضع کرنا شروع کر دیں۔

(۳) علماء نے دہریت، لادینیت کا مقابلہ کرنے کے لیے حدیثیں وضع کیں۔

(۴) علمائے مدینہ نے اہل بیت کے فضائل میں حدیثیں وضع کیں۔

(۵) خلفاء امیہ نے اپنے نظریات پھیلانے کے لیے حدیثیں وضع کیں یا علماء کو ترغیب دی۔

(۶) بانیاں فقہی مذاہب نے حدیثیں وضع کیں۔

(۷) امیہ خلفاء نے امام زہری کو حدیثیں وضع کرنے کا حکم دیا تھا۔ (دراسات مسلم، Muslim Studies)

مذکورہ اعتراضات کی نوعیت وہی ہے جن کا جواب دیا جا چکا ہے اختصار کے ساتھ جواباً یہ عرض ہے کہ کتب احادیث میں عقائد، عبادات (نماز، روزہ، زکوٰۃ، حج (مناسک حج) اخلاق، علم، فوجداری اور دیوانی امور قرآن مجید کی آیات کی تفسیر اور پیشگوئیاں بیان کی گئی ہیں۔ گولڈ زیہر کی تحقیق کے مطابق جن اسباب کے تحت احادیث وضع کی گئیں وہ کن کتب حدیث میں مذکور ہیں؟ کیا ان واضعین نے مذکورہ موضوعات پر وہ حدیثیں وضع کی تھیں؟ کتب احادیث میں نہ تو اموی خلفاء کی وضع کردہ حدیثیں مذکور ہیں۔ نہ ان دینی فرقوں کے بانیوں یا پیروکاروں کی حدیثیں کتب احادیث میں نظر آتی ہیں اور نہ محدثین نے قبول کیا ہے۔ یہ یاد رکھنا چاہیے کہ اگر گولڈ زیہر کے بیان کردہ اسباب کے تحت حدیثیں وضع ہوئیں تو ان حدیثوں کے موضوعات ہی الگ ہونے تھے کیا انہوں نے عقائد عبادات اور اخلاق وغیرہ قسم کے

موضوعات پر حدیثیں وضع کرنی تھیں؟ کتب احادیث میں تو وہ حدیثیں درج ہیں جو اسلامی ضابطہ حیات سے تعلق رکھتی ہیں۔ جن پر عمل عہد رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم میں شروع ہو گیا تھا۔ وضع حدیث کا سب سے بڑا اعتراض خلفاء بنی امیہ پر لگایا جاتا ہے کیا کسی حدیث کی کتاب میں بنوامیہ کی حکومت کی مدح میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی کوئی حدیث درج ہے؟

محدثین نے متن اور سند کی صحت کے لیے ایسے کڑے اصول مقرر کر دیئے تھے ان اصولوں کی روشنی میں کوئی حدیث سند قبولیت نہیں پا سکتی تھی۔ اگر کسی بشری کمزوری کی وجہ سے کوئی وضعی حدیث کسی حدیث کی کتاب میں درج ہو بھی گئی ہے تو پھر بھی محدثین نے اس حدیث کے متن اور سند پر جرح کر کے اس کو مردود اور کمزور حدیث قرار دے دیا ہے۔ اب بھی گولڈ زیہر جیسے مستشرق کسی حدیث کی بناء پر اسلام پر اعتراض کرتے ہیں۔ تو اس کا جواب اس زیر بحث حدیث کی سند اور متن کو محدثین کے بیان کردہ اصولوں کی روشنی میں جرح کر کے دیا جاتا ہے۔ لہٰذا حدیث کی کتب میں جن موضوعات پر حدیثیں جمع کی گئی ہیں۔ وہی ظاہر کرتی ہیں کہ وہ حدیثیں واضعین کی نہیں بلکہ ان کا سرچشمہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات ہے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمودات ہی تاریخی مراحل طے کرتے ہوئے سلسلہ وار مولفین کتب احادیث تک پہنچے اور مزید چھان پھٹک کر کے ان کو کتابی شکل دے دی۔

نوٹ: ثانوی اعتراضات ڈاکٹر عبدالروف ظفر کی کتاب علوم حدیث (ص 919,918) سے اخذ کیے ہیں ان کے جوابات لکھتے ہوئے بھی ان کے خیالات عالیہ کو سامنے رکھا ہے۔ گولڈ زیہر کے اعتراضات کے جوابات ڈاکٹر صاحب نے نمبر وار ایک ایک کر کے دیئے ہیں خاکسار نے تمام اعتراضات کی مجموعی نوعیت کو سامنے رکھ کر ایک ہی قسم کا جواب دے دیا ہے۔ گولڈ زیہر کے اعتراضات کی نوعیت کوئی الگ نہیں۔ بیان کردہ ثانوی اعتراضات جیسی ہے، ثانوی اعتراضات کے جوابات درج کر دیئے ہیں۔

☆......☆

سلسلہ اسانید ناقص اور وضع کردہ ہے

اعتراض: اکثر مستشرقین کی رائے میں سند کا آغاز دوسری صدی کے اواخر یا تیسری صدی ہجری کے آغاز میں ہوا۔ لیکن ہورووٹز (Horovitz) اور رابسن اسناد حدیث کا آغاز پہلی صدی سے تسلیم کرتے ہیں۔

شاخت کہتا ہے کہ احادیث کی اسانید کا ایک بڑا حصہ ناقص ہے اور یہ سب کو معلوم ہے کہ اسانید تیسری صدی ہجری کے نصف ثانی میں مکمل شکل میں مرتب ہوئیں ان اسانید سے زیادہ اعتنا نہیں کیا گیا بلکہ جو طبقہ اپنی رایوں کو متقدمین سے منسوب کرنا چاہتا وہ ان میں سے چند شخصیتوں کا انتخاب کر لیتا پھر ان کو اسانید میں شامل کر دیتا۔ (اورتجنس صفحہ 164,163)

گویا شاخت کے نزدیک احادیث کا سلسلہ اسانید وضع کردہ ناقص ہے۔

جواب: سند کے ساتھ حدیث (روایت) قبول کرنے کا رواج عہد خلفاء راشدین میں پڑ گیا تھا۔ عہد رسول کریم صلعم میں اس کی ضرورت نہیں تھی کیونکہ روایت بیان کرنے والے موجود تھے۔ جب خلفاء کا دور مسعود آیا تو روایت کو قبول کرنے کے لیے راوی سے، کسی دوسرے صحابی کی گواہی بھی طلب کی گئی۔ اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ روایت کو قبول کرنے کے لئے اسانید کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔ قبیصہ کی روایت ہے کہ فوت شدہ شخص کی دادی حضرت ابوبکر کے پاس آئیں اور ورثہ سے حق کا دعویٰ کیا۔ حضرت ابوبکرؓ نے فرمایا کہ نہ اللہ کی کتب سے اور نہ سنت رسول ﷺ سے آپ کو حق ملتا ہے۔ لیکن جب دوسروں سے اس کے متعلق دریافت کیا گیا تو مغیرہ نے گواہی دی۔ کہ حضرت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے دادی کو چھٹا حصہ دیا تھا۔ حضرت ابوبکرؓ نے ان سے گواہ طلب کیا اس پر محمد بن مسلمہ نے مغیرہ کے بیان کی تصدیق کی۔ اس بناء پر حضرت ابوبکرؓ نے دادی کے حق میں فیصلہ کر دیا۔ (ترمذی 9:27)

اس واقعہ سے واضح ہو جاتا ہے کہ اسناد کا سلسلہ عہد خلفاء راشدین سے شروع ہو گیا تھا۔ کسی حدیث کو قبول کرنے کے لیے دوسرے کسی صحابی کی گواہی طلب کی جاتی تھی۔ بعد میں یہی سلسلہ ترقی کرتا کرتا باقاعدہ عملی شکل اختیار کر گیا۔ اور علم الروایۃ کے نام سے مشہور ہوا۔ کسی روایت (حدیث) سے اپنی پسند کا سلسلہ رواۃ جوڑ نہیں دیا جاتا تھا۔ بلکہ وہ حدیث انہی راویوں کی طرف منسوب ہوتی تھی۔ جو اس حدیث کو بیان کرنے والے ہوتے تھے حقیقت یہ ہے کہ صحابہ کرام نے حدیث کو رسول کریم صلعم سے روایت کیا پھر صحابہ بھی حدیث کو سند کے ساتھ بیان کرتے پھر تابعین ان صحابہ کے واسطے سے آگے بیان کرتے تھے اس طرح راویوں کا سلسلہ جاری ہو جاتا۔ مثلاً

حدثنا ابراهيم بن يعقوب حدثنا زيد بن الحباب حدثنا ميمون ابو عبدالله حدثنا ثابت البناني قال قال انس بن مالك ثابتُ! خُذْ عني فانك لن تاخذ عن احد و اوثق مني اني اخذته عن رسول الله واخذه رسول الله عن جبرئيل اخذه جبرئيل عن الله عزوجل (ترمذی حدیث نمبر 3831 ص 867)

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد خود صحابہ نے ایک ایک حدیث سننے کے لیے سینکڑوں میل لمبے سفر اختیار کیے جابر بن عبداللہ نے مدینہ سے شام تک محض ایک حدیث کی سماعت کے لیے سفر اختیار کیا۔ (فتح الباری ابوالفضل شہاب الدین جلد اول ص 158)
اسی طرح جب حدیث تدوین کے آخری مرحلہ میں پہنچی۔ تو حدیث کے مرتبہ اور قبولیت کے لیے راویوں کی چھان پھٹک کی۔ تو ایک نیا علم اسما

الرجال وجود میں آ گیا۔ اپنی پسند کی سند کسی حدیث کے ساتھ جوڑنے سے علم اسماء الرجال وجود میں نہیں آ سکتا۔ علم اسماء الرجال کا وجود میں آنا ظاہر کرتا ہے کہ سلسلہ اسانید تھا۔ راویوں کے کردار کی چھان پھٹک کے لیے محدثین کو محنت شاقہ کرنا پڑی۔ نہ کوئی حدیث غلط سند کے ساتھ جوڑی جا سکتی تھی اور نہ کوئی غلط سند کسی حدیث کے ساتھ منسلک کی جا سکتی تھی۔ اصل سند ہی اصل حدیث کے ساتھ منسلک ہوتی اور اسی طرح اصل حدیث ہی اصل سند کے ساتھ جڑی ہوتی۔ ایک اہم واقعہ خطیب بغدادی کے زمانہ میں پیش آیا۔ بعض یہود نے قائم باللہ کے وزیر اعظم ابوالقاسم کے سامنے 447ھ میں ایک خط پیش کیا جس کے متعلق یہ کہا گیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا خط ہے اور حضرت علیؓ نے تحریر کیا تھا اس خط میں یہ لکھا گیا کہ یہود سے جزیہ ساقط ہو گیا ہے۔ جسے خطیب بغدادی نے دلائل سے غلط ثابت کر دیا۔ (الاعلان بالتوبیخ لمن ذم التاریخ ص10)

عام مسلمان بھی جب کسی عالم دین سے کوئی مسئلہ پوچھتا تو عالم دین سے بھی سند ضرور طلب کرتا۔ ایک اعرابی سفیان بن عینیہ کے پاس آیا اور پوچھنے لگا۔ آپ حج کرنے والی عورت کے متعلق کیا کہتے ہیں جو بیت اللہ کے طواف سے پہلے حیض کی حالت میں ہو گئی؟ سفیان نے جواب دیا وہ سب مناسک حج ادا کرے جو عام حاجی کرتے ہیں صرف بیت اللہ کا طواف نہ کرے اعرابی نے کہا ان کے پاس سند ہے انہوں نے کہا ہاں مجھے عبدالرحمٰن بن قاسم نے اپنے باپ سے بیان کیا انہوں نے حضرت عائشہ سے بیان کیا۔ اعرابی کہنے لگا آپ نے اچھا نمونہ بیان کیا اور صحیح پہنچایا اللہ آپ کی صحیح راہنمائی کرے۔ (الکفایہ فی علم الروایہ ص404,403)

اس واقعہ سے ظاہر ہو جاتا ہے کہ ایک عام مسلمان بھی کوئی حدیث بغیر سند کے قبول نہ کرتا تھا۔ گویا حدیث کی اسانید کا سلسلہ ابتداء سے شروع ہو گیا تھا اور وہ سلسلہ وار بڑھتا رہا۔ جس طرح لوگ روایت کو یاد رکھ سکتے تھے اسی طرح سند کو بھی یاد رکھتے۔ گویا سند اور روایت لازم و ملزوم ہو گئے۔

☆......☆

بغیر سوچے فرضی شخصیتوں کو سند میں داخل کرنا

اعتراض: شاخت نے یہ اعتراض کیا ہے کہ "اسانید میں بغیر سوچے سمجھے فرضی شخصیتوں کو داخل کر دیا۔" پھر مثال کے طور پر "موطا" کی ایک حدیث کی مثال دیتے ہیں کہ امام مالک نافعؒ اور حضرت ابن عمر سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ضب (گوہ) کے متعلق دریافت کیا تو آپ ﷺ نے فرمایا میں نہ اس کو کھاتا ہوں نہ اسے حرام قرار دیتا ہوں۔ (کتاب الام ج7 ص 149)

(۲) عبداللہ بن دینار نے حضرت عبداللہ بن عمر سے ایسی ہی حدیث روایت کی ہے۔ (کتاب الام ج7 ص149)

(۳) امام مالک نے عبداللہ بن دینار اور حضرت عبداللہ بن عمر سے یہ روایت نقل کی ہے کہ ایک شخص نے رسول اللہ کو آواز دی پھر کہا کہ اے اللہ کے رسول ضب (گوہ) کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔ میں نہ اس کو کھانے والا ہوں نہ اس کو حرام کہنے والا ہوں۔ (شیبا220)

شاخت کا اعتراض یہ ہے کہ امام مالک ایک بار تو عبداللہ بن دینار اور حضرت ابن عمر کے سلسلہ سے روایت کرتے ہیں دوسری بار اسی روایت کو نافع اور حضرت ابن عمر کے سلسلہ سے نقل کرتے ہیں۔ تو شاخت کہتا ہے کہ امام مالک اپنے شیوخ کے ناموں کے ذکر میں محتاط نہیں تھے بلکہ انہوں نے بھی وہی کیا جو دوسرے محدثین کا عمل تھا۔ یعنی وہ لوگ حسب مرضی اپنے سلسلہ اسناد میں فرضی لوگوں کے ناموں میں شامل کر دیتے تھے۔

پہلے نافع اور عبداللہ بن دینار کے بارے میں یہ عرض ہے کہ دونوں نافع اور ابن دینار عبداللہ بن عمر کے آزاد کردہ غلام تھے ایک ہی سرچشمہ سے سیراب ہوئے تھے امام مالک نے ضب والی حدیث نافع اور حضرت ابن عمر سے روایت کی ہے اور وہی حدیث عبداللہ بن دینار اور ابن عمر سے روایت کی ہے۔ دونوں راوی حضرت عبداللہ بن عمر کے آزاد کردہ غلام ہیں۔ حضرت امام مالک نے اس حدیث کو نافع اور ابن دینار دونوں شیوخ سے سنا۔ پھر وہ روایت کبھی ابن دینار کے نام سے اور وہی روایت کبھی نافع کے نام سے روایت کر دی۔ اس روایت کو دو شیوخ بیان کرنے والے ہیں۔ انہی دو شیوخ کے نام سے حضرت امام مالک نے وہ روایت بیان کر دی۔ اس روایت کے سلسلہ سند میں اپنی پسند اور ناموں کے ذکر میں غیر محتاطی کی کون سی بات ہے۔ امام مالک کے پاس اس حدیث کے دو اسناد ہیں انہوں نے دونوں سندوں کے ساتھ بیان کر دیا۔ دونوں کا مضمون ایک ہی ہے کوئی اختلاف نہیں۔ پھر ایک اور حدیث جویریہ ابن اسماء نے بھی اسی سلسلہ سے یہ روایت نقل کی۔ یحیٰی بن یحیٰی امام شیبانی اور امام شافعی امام مالک سے عبداللہ بن دینار کی حدیث کے راوی ہیں پھر امام شافعی امام مالک سے نافع والی حدیث کو بھی روایت کرتے ہیں ایک اور جگہ سفیان بن عینیہ عبداللہ بن دینار کی حدیث کے راوی ہیں ان تمام روایات کی موجودگی کے بعد شاخت یہ کہہ سکتے ہیں کہ امام مالک نے کبھی ایک ہی حدیث کو نافع سے منسوب کیا اور کبھی دینار سے۔ اس طرح امام مالک کے علم کی

کم مائیگی بے پرواہی اور حسب منشاء محدثین کے ناموں کا انتخاب جیسی باتیں ظاہر ہوتی ہیں۔اس سے حضرت امام مالک کے علم کی سطحیت ظاہر نہیں ہوتی بلکہ شاخت اس اعتراض سے علم حدیث کے متعلق اپنی کم علمی کا اظہار کر رہا ہے۔علم تدوین حدیث کا یہ اہم اصول ہے جن واسطوں اور سلسلہ رواۃ سے کوئی حدیث ملے۔تو اس کا الگ الگ سلسلہ رواۃ سے ذکر کر دیا جاتا ہے حدیث ایک ہی ہوتی ہے لیکن سلسلے رواۃ الگ الگ۔حضرت امام مالک نے ضب (گوہ) والی حدیث دو مختلف سلسلہ رواۃ سے بیان کر دی ہے۔تمام محدثین کا یہ طریقہ تھا۔پھر حضرت امام مالک کے علاوہ کئی اور بھی محدثین نے نافع اور ابن دینار کے واسطہ سے وہ حدیث بیان کی ہے۔

☆......☆

اسلامی فقہ
پر
اعتراضات اور جوابات

مستشرقین نے جہاں قرآن، حدیث اور تعلیمات اسلام کو ہدف تنقید بنایا ہے۔ اور بے وقعت بنانے کی کوشش کی ہے وہاں اسلامی قانون پر اعتراضات کیے ہیں۔ یہاں چند اہم اور بنیادی اعتراضات کے جوابات درج کیے جاتے ہیں۔

☆......☆

شریعت دین کے دائرے سے خارج ہے

اعتراض: قانون یعنی شریعت بڑی حد تک دین کے دائرہ سے خارج ہے۔(شاخت انٹروڈکشن ٹو اسلامک لا) ایک جگہ وہ لکھتا ہے "اسلام کی پہلی صدی کے بڑے حصہ میں اس فقہ اسلامی کا وجود ہی نہیں جو نبی کریم ﷺ کے عہد میں موجود تھا۔اور جو فقہ اس وقت رائج تھی وہ دین کے دائرہ سے باہر کی چیز تھی۔

جواب: شاخت کا یہ اعتراض بالکل لاعلمی اور اسلامی فقہ کی ہمہ گیری اور وسعت سے ناواقفیت کا نتیجہ ہے۔اسلامی فقہ کا بنیادی ماخذ ہی قرآن مجید ہے۔شاخت کے اعتراض کے رد میں چند قرآنی آیات درج کی جاتی ہیں۔جن سے واضح ہو جائے گا قانون سازی قرآن مجید کے دائرہ میں شامل ہے۔

ارشادات الٰہی ہے۔

وَمَنْ لَّمْ یَحْکُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰہُ فَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الْکٰفِرُوْنَ (المائدہ 44:5)

جو شخص اس کے مطابق فیصلہ نہ کرے جو اللہ نے اتارا ہے تو وہی کافر ہے۔

وَمَنْ لَّمْ یَحْکُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰہُ فَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الظّٰلِمُوْنَ (المائدہ 45:5)

جو شخص اس (قرآن) کے مطابق فیصلہ نہ کرے جو اللہ نے اتارا ہے تو وہی ظالم ہیں۔

وَمَنْ لَّمْ یَحْکُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰہُ فَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الْفٰسِقُوْنَ (المائدہ 47:5)

اور جو اس کے مطابق فیصلہ نہ کرے۔جو اللہ نے اتارا ہے تو وہی نافرمان ہے۔

یہ تینوں آیات ظاہر کرتی ہیں۔کہ مسلمانوں کے تمام معاملات کا حکم قرآن مجید ہے اور قرآن مجید کی روشنی میں ہی تمام فیصلے کرنے کا حکم ہے جو شخص انحراف کرتا ہے تو اس کو کافر، ظالم اور فاسق قرار دیا ہے۔

اِنَّآ اَنْزَلْنَآ اِلَیْکَ الْکِتٰبَ بِالْحَقِّ لِتَحْکُمَ بَیْنَ النَّاسِ بِمَآ اَرٰىکَ (النساء 105:4)

یقیناً ہم نے تیری طرف حق کے ساتھ کتاب اتاری ہے تا کہ تو لوگوں کے درمیان اس کے مطابق فیصلہ کرے جو اللہ نے تجھے علم دیا ہے۔

وَھٰذَا کِتٰبٌ اَنْزَلْنٰہُ مُبٰرَکٌ فَاتَّبِعُوْہُ وَاتَّقُوْا لَعَلَّکُمْ تُرْحَمُوْنَ (انعام 155:6)

اور یہ کتاب جس کو ہم نے اتارا ہے برکت دی گئی ہے سو اس کی پیروی کرو اور تقویٰ کرو تا کہ تم پر رحم کیا جائے اس آیت میں قرآن مجید کے احکام کی پیروی کی تعلیم دی گئی ہے۔

نَزَّلْنَا عَلَیْکَ الْکِتٰبَ تِبْیَانًا لِّکُلِّ شَیْءٍ (النحل 89:16)

یعنی ہم نے تم پر ایک ایسی کتاب نازل کی ہے جو تمام چیزوں کو واضح بیان کرتی ہے۔

اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِي وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا (المائدہ 3:5)

آج میں نے تمہارا دین مکمل کر دیا ہے اور اپنی نعمت کو پورا کر دیا ہے تمہارا دین اسلام ٹھہرا کر راضی ہوا ہوں۔

مذکورہ آیات سے مندرجہ ذیل باتیں ثابت ہوتی ہیں۔

(۱) قرآن مجید ایک مکمل ضابطہ حیات ہے۔ اس میں ہر چیز کی وضاحت موجود ہے۔

(۲) مسلمانوں کی زندگی کے تمام امور قرآنی تعلیم کے مطابق انجام پاتے ہیں اور احکام خداوندی کی بجا آوری ضروری ہے۔

(۲) جو لوگ احکام خداوندی کے مطابق زندگی بسر نہیں کریں گے وہ کافر ظالم اور فاسق ہیں۔

جب قرآن مجید کا مطالعہ کیا جائے۔ تو زندگی کے تمام امور کے متعلق احکام پاتے ہیں۔

اسلامی فقہ دین اور دنیا دونوں پر حاوی اور مشتمل ہے۔ عبادات اور اخلاق پر ہر پہلو سے بحث کی گئی ہے کوئی پہلو تشنہ نہیں چھوڑا۔ دنیاوی معاملات میں عائلی، دیوانی، فوجداری معاشی اور ریاستی امور کے متعلق واضح تعلیم بیان کی گئی ہے۔ یہاں تک کہ ایک مملکت کے دوسری مملکتوں کے ساتھ تعلقات کی نوعیت اور حقوق و فرائض پر بحث بھی موجود ہے۔ قرآن مجید میں صرف احکام ہی موجود نہیں بلکہ احکام کے استخراج کے اصول اور فقہی کلیات بھی بیان کر دیئے گئے ہیں۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد حکمرانی میں صیغہ عدالت ایک اہم ترین باب ہے۔ مرکزی طور پر آپ خود قاضی القضاۃ تھے فوری انصاف کے لیے مختلف علاقوں میں با قاعدہ طور پر قاضیوں کا تقرر کیا جاتا تھا۔ ان قضاہ میں حضرت عمر بن الخطاب حضرت عثمان بن عفان حضرت علی حضرت عبداللہ بن مسعود، حضرت ابی بن کعب، حضرت زید بن ثابت حضرت ابو موسیٰ اشعری جیسے بلند پایہ صحابہ کے نام نمایاں ہیں۔ پھر یہ ہدایت فرمائی۔

اِقْضِ بِكِتَابِ اللّٰهِ وَ بِسُنَّةٍ اِذَا وَجَدْ تَهُمَا فَاِذَا لَمْ تَجِدِ الْحُكْمَ اجْتَهِدْ

کتاب اور سنت کے مطابق فیصلہ کرو اگر نہ پاؤ تو اجتہاد کرو۔

تمام آئمہ قانون اس بات پر متفق ہیں کہ قرآن مجید اور سنت رسول اسلامی قانون کا ماخذ ہیں۔ دوم زمانہ کے نئے حالات اور نئے مسائل کو حل کرنے کے لیے اجتہاد بھی کیا جا سکتا ہے۔

قرآن مجید میں نظام عدلیہ کے متعلق ہر پہلو پر مکمل احکام پائے جاتے ہیں۔ انہی احکام پر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلامی قانون کی بنیاد کھڑی کی۔ پھر مرحلہ وار زمانہ کے تقاضوں کے مطابق اسلامی فقہ میں وسعت پیدا ہوتی گئی۔ اسلامی روح کو سامنے رکھ کر فقہاء نے اپنے اپنے زمانہ کے مسائل کو حل کیا۔ کسی فقہی نے اسلامی اصولوں خصوصاً قرآن اور سنت سے انحراف نہیں کیا۔ جو فقہ عہد رسول ﷺ میں رائج تھی بعد کے ادوار میں اسی فقہ کو آگے بڑھایا گیا تھا لہٰذا شاخت کا اعتراض محض مفروضہ ہے۔ اس میں کوئی حقیقت نہیں۔

☆......☆

محدثین اور فقہا کے درمیان حدیث کے بارے میں اویزش اور تصادم

اعتراض: اہل کلام کے ساتھ ساتھ فقہاء کے تمام طبقات نے حدیث کی سختی سے مخالفت کی اور اس کا مقصد یہ تھا کہ حدیث ان کی فقہ میں زیادہ موثر اور دخیل عنصر نہ بن سکے۔ (اوریجنس ص 57 شاخت)

جواب: شاخت کا یہ دعویٰ ہے کہ فقہاء اسلام احادیث نبوی کے شدت کے ساتھ مخالف تھے۔ جب فقہاء اسلام کے فقہی ادب کا مطالعہ کیا جائے تو شاخت کا دعویٰ باطل ہو جاتا ہے۔ حضرت معاذ بن جبل سے مروی ہے کہ جب مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یمن بھیجا تو فرمایا اگر تمہارے سامنے کوئی فیصلہ پیش آ جائے تو کس طرح فیصلہ کرو گے انہوں نے جواب دیا جو کتاب اللہ میں ہے میں اس کے مطابق فیصلہ کروں گا آپ ﷺ نے فرمایا اگر کتاب اللہ میں نہ ہو تو انہوں نے جواب دیا جو رسول اللہ نے فیصلہ کیا۔ اس کے مطابق فیصلہ کروں گا آپؐ نے فرمایا: وہ معاملہ اس میں بھی نہ ہو۔ تو پھر کیا کرو گے انہوں نے کہا میں اپنی رائے سے اجتہاد کروں گا اور کوتاہی نہ کروں گا۔ (سنن ابی داؤد کتاب الاقضیہ باب الاجتہاد والرائی فی القضاء 303/33) یہ حدیث ظاہر کرتی ہے کہ عہد رسول سے ہی فقہا اور قاضی اپنے فیصلوں میں حدیث نبوی کو سامنے رکھتے اور ان کے مطابق فیصلے کرتے۔

علامہ سیوطی نے اپنی کتاب تاریخ الخلفاء میں لکھا ہے جب کوئی مسئلہ حضرت ابو بکر کے سامنے پیش ہوتا تو پہلے کتاب اللہ میں تفحص کرتے اگر وہاں سے مسئلہ کا حل نہ ملتا تو سنت رسول کی طرف رجوع کرتے۔ اگر وہاں سے نہ ملتا تو صحابہ کو جمع کرتے اگر کسی کو سنت رسول کا علم ہوتا تو وہ بتا دیتا آپ خدا کا شکر بجالاتے اگر صحابہ میں سے کسی کو بھی سنت کا علم نہ ہوتا تو پھر بہترین اشخاص کا انتخاب کرتے اور ان سے رائے لیتے اور کثرت رائے سے فیصلہ صادر کرتے۔ (تاریخ الخلفاء ص 40)

حضرت ابو بکر نے فیصلہ صادر کرنے میں وہی راستہ اختیار کیا جو عہد رسول میں تھا۔ یعنی اپنے فیصلوں کی بنیاد حدیث پر رکھتے تھے حضرت عبداللہ بن مسعود عہد اول کے بہت بڑے فقہی ہیں۔ انہوں نے کہا۔ ''تم میں سے جس کے سامنے کوئی مقدمہ آئے تو کتاب کے مطابق اس کا فیصلہ کرے اگر کتاب اللہ میں نہ پائے تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کے مطابق اس مقدمہ کا فیصلہ کر دے اگر کوئی ایسا مسئلہ آ جائے جس کے بارے میں کتاب اللہ میں کچھ نہ ہو اور نہ ہی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بارے میں فیصلہ صادر فرمایا ہو تو صالحین کی آرا کے مطابق فیصلہ دے اگر اس معاملہ میں کتاب اللہ سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صالحین سے کوئی فیصلہ نہ ملے تو اپنی رائے سے اجتہاد کرے۔ (اعلام الموقعین 51/1)

صدر اول کے تمام مشہور فقہی کا بھی یہی مسلک ہے۔ قانون کا اصل ماخذ قرآن مجید اور سنت رسول ہے۔

اختصار سے کام لیتے ہوئے صرف چند اہم فقہاء کا حدیث کے بارے میں مسلک بیان کیا جاتا ہے۔ جس پر شاخت کو اعتراض ہے کہ ان کی محدثین سے اویزش تھی۔

امام ابوحنیفہ اور حدیث نبوی:

آپ فرماتے ہیں لو لا السنّة ما فهم احدٌ منا القرآن (قواعد التحدیث ص 21 بحوالہ مقدمہ المیزان الشعرانی ص 62) اگر سنت کا وجود نہ ہوتا تو ہم سب سے کوئی بھی قرآن کا فہم حاصل نہ کر سکتا۔

اياكم والقول في دين الله بالرائے عليكم باتباع السنة فمن خرج عنها ضل (قواعد التحدیث ص 23)

اللہ کے دین کے معاملہ میں (اپنی) رائے سے بچو اور سنت کی پیروی کرو اپنے اوپر لازم کر لو۔ جو سنت کے دائرے سے نکلا وہ گمراہ ہوا۔

لم تزل الناس في صلاح مادام منهم من يطلب الحديث فاذا طلبوا العلم بلا حديث فسدوا (قواعد التحدیث ص 23)

لوگ خیر و بھلائی سے ہم کنار ہوں گے جب تک ان میں حدیث کے طالب موجود رہیں گے جب وہ حدیث کو چھوڑ کر (اور) علم طلب کریں گے تو فساد کا نشانہ بن جائیں گے۔

اذا صح الحديث فهو مذهبي صحیح حدیث ہی میرا مسلک ہے۔(ابن عابدین فی الحاشیہ ج 1 ص 63)

اذا قلت قولا يخالف كتاب الله و حديث لرسول فاتركوا قولي (کتاب مذکور ص 50)

جب میں کوئی ایسی بات بیان کروں جو کتاب اللہ اور حدیث رسول کے خلاف ہو تو میری بات کو چھوڑ دو۔

كذب والله وافترى علينا من يقول اننا نقدم القياس على النص و هل محتاج بعد النص الى القياس (المیزان للشعرانی ص 51)

جو شخص یہ کہتا ہے ہم کتاب اور سنت کی نصوص پر قیاس کو ترجیح دیتے ہیں خدا کی قسم وہ ہم پر جھوٹ باندھتا ہے نص مل جانے کے بعد کسی قیاس کی ضرورت باقی کیا رہ جاتی ہے۔

امام مالک اور حدیث نبوی:

انما انا بشر اخطى واصيب فانظروا في راى فكل ما وافق الكتاب والسنة فخذوه و كل مالم يوافق والسنة فاتركوه (جامع اہل العلم ابن عبداللہ)

میں تو ایک انسان ہوں غلط اور صحیح دونوں قسم کے فتوے دے سکتا ہوں۔ میری رائے میں غور کرو اگر کتاب اور سنت کے مطابق ہو تو اسے قبول کر لو ورنہ رد کر دو۔

”ہر شخص کی بات کو اختیار بھی کیا جا سکتا ہے اور چھوڑا بھی جا سکتا ہے سوائے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم (آپ ﷺ کے ہر قول کو ماننا پڑے گا)۔“ (اصول الاحکام ابن حزم ج 6 ص 135)

امام شافعی اور حدیث نبوی:

اجمع المسلمون علی ان من استبان له سنة عن رسول الله علیه وسلم لم یحل له ان یدعها یقول احد (اعلام الموقعین ج2 ص361)

تمام مسلمانوں کا اس پر اجماع ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت سامنے آجائے پھر اس بات کی کوئی گنجائش نہیں رہتی کہ اس کو کسی امتی کے قول کی بناء پر چھوڑ دیا جائے۔

احمد بن حنبل اور حدیث نبوی:

من رد حدیث رسول الله صلی الله علیه وسلم فهو علی شفاهلكة (کتاب المناقب لابن الجوزی ص86)

یعنی جس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث کو رد کیا وہ ہلاکت کے کنارے پر پہنچ گیا۔

مشہور فقہاء کا مسلک حدیث وسنت کے بارے میں بیان کر دیا گیا ہے۔ تمام فقہاء اپنے فیصلوں کی بنیاد حدیث نبوی پر ہی رکھتے تھے اور اپنے فیصلوں کا ماخذ اقوال رسول کو تسلیم کرتے تھے اور اس سے انحراف باعث ہلاکت اور تباہی مانتے تھے ان فقہاء کے مسالک کو نظر انداز کر کے یہ اعتراض کرنا کہ محدثین اور فقہاء کے درمیان آویزش تھی۔ فقہا احادیث کو تسلیم نہیں کرتے تھے محض اسلامی فقہ سے لاعلمی ہے۔ محدث اور فقیہہ کے درمیان کسی حدیث کے قبول یا رد کرتے میں تو اختلاف ہوسکتا ہے لیکن اسلامی قانون میں بطور ماخذ ہونے پر محدثین اور فقہاء میں ہرگز کوئی اختلاف نہیں۔ تمام فقہاء حدیث کو اسلامی قانون کا ماخذ تسلیم کرتے تھے پھر اپنے فیصلوں کی اسی ماخذ پر بنیادی رکھتے تھے۔

☆......☆

اسلامی قانون روما قانون سے ماخوذ ہے

اعتراض : گوالڈزیہر (Gold ziher) ایمیلیوبسی (Emilio Bussi) مستشرقین کی یہ رائے ہے کہ چند معمولی ردوبدل اور ترمیمات کے باوجود قانون اسلامی دراصل روما کے قانون ہی کی توسیع ہے۔

مشہور مصنف (Lee) لکھتا ہے ''قانون محمدی دراصل قانون روما کا وہ قالب ہے جس کی صورت میں رومن قانون عرب سلطنت کے سیاسی حالات کی مطابقت سے ممالک مشرقی میں اپنایا گیا اور نافذ ہوا اس کے سوا یہ اسلامی قانون اور کسی چیز کا نام نہیں۔ (ہسٹاریکل جیورس پروڈینس)

جواب : اگر ہر دو ضابطہ قوانین (رومی اور اسلامی) کا مطالعہ کیا جائے۔ تو واضح ہو جائے گا کہ دونوں ضابطہ قوانین میں بُعد المشر قین ہے مثلاً عورتوں کے حقوق، غلاموں کی رہائی، حکومتی امور (خصوصاً شورائی اور جمہوری نظام جانشینی) تقسیم دولت، متبنی بنانے، قرض کی ادائیگی

وراثت قانون شفعہ وغیرہ کے متعلق ان ہر دو قانونی نظاموں کے تقابلی مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ دونوں نظاموں کی بنیادیں اور راہیں الگ الگ ہیں اور یہ واضح ہو جائے گا۔ اسلامی قانون کے اصل میں دو ہی ماخذ ہیں قرآن مجید اور سنت رسول۔ روما قانون کا کہیں بھی نشان نہیں ملتا۔ روما قانون طبقاتی تقسیم پر مبنی ہے جبکہ اسلامی قانون اخوت اور مساوات پر۔ دور اول کے مسلمان فقہاء قانون روما پر لکھی ہوئی کتابوں سے بالکل نا آشنا تھے۔ اگر انہوں نے ان کتب سے فائدہ اٹھایا ہوتا تو ان کتب کا ضرور حوالہ دیتے۔ اسلامی کتب قانون میں کہیں ایک بھی حوالہ نہیں ملتا ہر فقیہہ اپنے فیصلہ میں قرآن مجید اور سنت رسول کو ہی سند ٹھہراتا ہے۔

عرف (رسم ورواج):

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے عرب کی وہ رسوم جو اسلام کی تعلیم سے ٹکراتی نہیں تھیں ان کو قائم رکھا۔ اس اصول کے تحت جب مسلمان کی فتوحات کا دائرہ وسیع ہوا۔ مسلمان بازنطینی علاقوں پر قابض ہوئے۔ تو انہوں نے ان رسوم کو جو اسلامی تعلیم کے منافی نہ تھیں۔ قائم رکھا۔ مثال کے طور پر ایک رسم وہ بھی تھی جو ترکستان میں عام طور پر پائی جاتی تھی اور فقہ حنفی میں ''بیع الوفا'' کے نام سے موجود ہے۔ اسلامی قانون اور روما قانون میں جہاں کہیں بھی مطابقت اور یکسانیت پائی جاتی ہے وہ ان رسوم کی وجہ سے ہے جو اسلام نے مفتوحہ قوموں کی رسوم کو اختیار کر لیا اور آہستہ آہستہ وہ رسوم اسلامی قانون کا ماخذ بن گئیں اسلام نے عرف (رسوم) کو حجت (اسلامی قانون کا ماخذ) اس لیے قرار دیا کہ معاشرہ میں رسم ورواج اور عادات یونہی رواج نہیں پا جاتے ان کے پیچھے عدل وانصاف کا اصول کارفرما ہوتا ہے۔ دنیا کے ہر خطے میں عرف قانون سازی میں بطور ماخذ رہا ہے قدیم یونان میں جنگ وامن کے قواعد ان رسوم اور عادات سے اخذ کیے گئے تھے جنہیں یونان کی ریاستوں نے اپنایا ہوا تھا۔ دور حاضر میں بھی عرف کو قانون سازی میں بہت اہمیت حاصل ہے لہٰذا اسلام نے اول دور میں ہی عرف کو قانون کا ماخذ قرار دے دیا تھا، بعد کے ادوار میں بھی اس اصول کو اختیار رکھا۔ دوسرے مفتوحہ علاقوں کی ان رسوم کو جو اسلامی تعلیمات کے منافی نہ تھیں اور مفتوحہ علاقوں کے قوانین کا حصہ تھیں ان کو فقہاء نے اسلامی قانون کا ماخذ قرار دے لیا۔ تو اسی طرح لازمی تھا کہ اسلامی قانون اور روما کی سلطنت کے قوانین میں مطابقت پائی جائے۔

کریمر نے خصوصاً اس بات پر زور دیا ہے اسلامی قانون پر یہودی روایات اور رسوم کے ذریعہ سے رومن قانون کا اثر پڑا ہے۔ معترض کو پہلی بات یہ یاد رکھنی چاہیے کہ یہودی مذہب اور اسلام دونوں کا سرچشمہ ہدایت ایک ہی ہے یعنی وہ وحی جو اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام اور حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم پر اتاری اس لیے ضروری تھا کہ دونوں مذاہب کے بعض قوانین میں مشابہت اور مطابقت پائی جاتی مسلمان ماہرین قانون نے جہاں عرف (رسوم وعادات) کو اسلامی فقہ کا ماخذ قرار دیا ہے وہاں سابقہ شرائع کو اپنے قوانین کا ماخذ قرار دیا ہے۔ اگر اسلامی قانون کی کہیں یہودی قانون یا رسم سے مطابقت پائی جاتی ہے تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اسلامی قانون روما یا یہودی قانون سے ماخوذ ہے۔

اگر مشابہت اور مطابقت پائی جاتی ہے تو ساتھ اختلافات کی وسعت بھی پائی جاتی ہے۔ مثلاً یہودی قانون کی رو سے ایک شخص اپنی بہن کی بیٹی سے شادی کر سکتا ہے مگر قرآن نے ممنوع اور ناجائز قرار دیا ہے اس طرح کئی مسائل میں وسیع اختلاف ہے۔ اسلام نے مفتوحہ قوموں کی ان رسوم کو ہی اسلامی قانون کا ماخذ قرار دیا ہے جو اسلامی تعلیم کے مطابق تھیں۔

☆......☆

اسلام میں قانونی تعزیرات کا فقدان

اعتراض: فقہ اسلامی میں حدود یا شرعی سزاؤں کے علاوہ دیگر قانونی تعزیرات کو موضوع نہیں بنایا گیا۔
(پروفیسر کولسن کے اسلامی فقہ کے بارے میں خیالات کا خلاصہ تشریعی اسلامی کی تاریخ اور اسلامی فقہ میں تعارض وتضاد)

جواب: پروفیسر کولسن کا یہ خیال ہے کہ فقہ اسلامی کے دائرہ میں قانونی تعزیرات ایک ہمہ گیر نظام کی جہت سے داخل نہیں ہوئیں۔ صرف شرعی سزاؤں تک محدود ہے ایسے جرائم کا تعلق حقوق اللہ سے ہے۔ کولسن کا یہ خیال قرآن مجید پر عدم تدبر کا نتیجہ ہے۔ قرآن مجید انسانی ضابطہ حیات کے اصولوں کی ایک مکمل کتاب ہے۔ قانون کو دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے دیوانی قوانین (لین دین کے قوانین معاشرتی قوانین (منگنی کے احکام، نکاح حق مہر، طلاق، خلع، ایلاء ظہار لعان، عدت، میراث وغیرہ) فوجداری قانون۔

فوجداری قانون بھی دو قسمیں ہیں۔ وہ جرائم جن کی سزا قرآن مجید میں مقرر کر دی گئی ہے۔ تعزیرات کا لفظ (تعزیر کی جمع ہے جس کے معنی ہیں منع کرنا باز رکھنا ملامت کرنا پھر یہ لفظ تنبیہہ اور تادیب کے لیئے بھی استعمال ہونے لگا (فقہ کی اصطلاح میں ان سزاؤں پر استعمال ہوتا ہے جو حاکم وقت کے منشاء پر چھوڑ دی گئی ہو)

قرآن مجید میں تعزیرات کے اصول مقرر کر دیئے ہیں قاضی ان اصولوں کی روشنی میں سزا مقرر کر سکتے ہیں۔ یہی اصول بہتر ہے۔ اسلام میں تعزیری سزا کا قانون عدل وانصاف پر مبنی ہے اور انسانی فطرت کا لحاظ رکھا گیا ہے غیر جانبدارانہ قانونی عدل وانصاف کے ساتھ ساتھ رحم کے تقاضے اور مجرم کی اصلاح کو سامنے رکھتا ہے۔ ارشاد الٰہی ہے۔

وَجَزٰٓؤُا سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا فَمَنْ عَفَا وَاَصْلَحَ فَاَجْرُهٗ عَلَى اللّٰهِ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الظّٰلِمِيْنَ (الشوریٰ 40:42)

بدی کا بدلہ اس کی مثل سزا ہے پھر کوئی معاف کر دے اور اصلاح کرے۔ اس کا اجر اللہ پر ہے۔ وہ ظالموں سے محبت نہیں کرتا۔

دوسری جگہ آتا ہے۔

فَمَنِ اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ فَاعْتَدُوْا عَلَيْهِ بِمِثْلِ مَا اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ (البقرہ 194:2)

پس جو کوئی تم پر زیادتی کرے تم اس کو اس کے مطابق سزا دو جو اس نے تم پر کی ہے۔

پھر فرمایا:

وَاِنْ عَاقَبْتُمْ فَعَاقِبُوْا بِمِثْلِ مَا عُوْقِبْتُمْ بِهٖ وَلَئِنْ صَبَرْتُمْ لَهُوَ خَيْرٌ لِّلصّٰبِرِيْنَ (النحل 126:16)

اگر تم انہیں بدلہ دو تو اتنا دو جتنی تمہیں تکلیف دی گئی ہے اور اگر تم صبر کرو تو وہ صبر کرنے والوں کے لیے بہتر ہے۔

پھر فرمایا:

وَمَنْ عَاقَبَ بِمِثْلِ مَا عُوْقِبَ بِهٖ ثُمَّ بُغِيَ عَلَيْهِ لَيَنْصُرَنَّهُ اللّٰهُ (الحج 60:22)

اور جو اس کی مثل سزا دے جو اسے ایذا دی گئی اور اس پر زیادتی ہوئی ہو تو اللہ ضرور اس کی مدد کرے گا۔

ان آیات سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ سزا کا اصل مقصد انصاف اور اصلاح ہے اگر معاف کر دینے سے اصلاح ہوتی ہو تو معاف کرنا بہتر ہے اگر معاف کرنے سے معاشرہ میں بگاڑ پیدا ہوتا ہو تو سزا دینا بہتر ہے اس لیے قرآن مجید میں دوسری قسم کے جرائم کی سزائیں مقرر نہیں کسی حاکم وقت پر چھوڑ دیا ہے۔ کہ وہ حالات کو سامنے رکھ کر قانون سازی کر لیں۔

جرائم کی سزاؤں کا اس سے بہتر کوئی اور نظام نہیں ہو سکتا۔ اسلام نے جرم کی سزا کا اصول مقرر کر دیا ہے اس کے ساتھ اجتہاد کا دروازہ کھول دیا ہے۔ اجتہاد کر کے قانون سازی کر لی جائے کہ کس کس جرم کی کیا کیا سزا ہونی چاہیے۔ قرآن مجید میں شراب خوری کی کوئی سزا نہیں لیکن حدیث سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ عہد نبوی میں کوئی متعین سزا نہ تھی۔ صرف پٹائی کا حکم صادر فرمایا کرتے تھے کوئی ہاتھ سے مارتا کوئی جوتے سے کوئی کوڑے سے اور کوئی کھجور کی شاخ سے۔ حضرت ابو بکر کے عہد خلافت اور حضرت عمر کے ابتدائی دور میں شراب نوشی کی سزا چالیس کوڑے تھی جب مقدمات زیادہ آنے لگے تو حضرت عمرؓ نے صحابہ کرام کو جمع کیا غور و فکر کے بعد متفقہ طور پر اسی کوڑے طے پائے۔

جرم لواطت کی سزا:

قرآن مجید میں آتا ہے۔

اَللَّذَانِ يَاْتِيٰنِهَا مِنْكُمْ فَاٰذُوْهُمَا

تم میں سے جو دو مرد بے حیائی کا ارتکاب کریں تو ان دونوں کو سزا دو۔ ابو مسلم اصفہانی کے نزدیک یہ آیت جرم لواطت کے متعلق ہے حضرت امام ابو حنیفہ کے نزدیک لواطت میں سزا نہیں دی جائے گی۔ تعزیری سزا ہو گی اسے قید میں ڈالا جائے۔ جب تک وہ توبہ نہ کر لے امام ابو یوسف اور امام محمد کے نزدیک وہ حد کی سزا کا مستوجب ہو گا۔

اگر شادی شدہ ہے تو سنگسار کیا جائے اگر شادی شدہ نہیں تو کوڑے لگائے جائیں۔ اگر اس نے لواطت کا فعل اپنے غلام یا لونڈی یا اپنی بیوی سے کیا ہے تو اس پر اجماع ہے کہ اسے حد کی سزا نہیں ہو گی اگر مرتکب لواطت کا عادی ہے تو امام اسے قتل کر دے۔

گویا لواطت کے بارے میں تین نظریات ہیں۔ امام ابو حنیفہ کے نزدیک ہم جنسی کی سزا تعزیر ہے اصلاح کے لیے قید میں ڈال دیا جائے۔ امام یوسف اور محمد کے نزدیک ہم جنسی کی سزا حد زنا کی طرح ہے۔ صاحب کافی کا قول ہے کہ اگر مجرم عادی ہو تو امام اس کو قتل کر دے خواہ وہ مومن ہے یا غیر مومن صاحب فتح قدیر کا بھی یہی مسلک ہے۔ (کنز العمال ج 3 ص 99)

قرآن مجید کا لفظ فاذوھما (دونوں کو سزا دو) عام ہے کسی قسم کی سزا تجویز نہیں کی اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ حالات کے مطابق حاکم اس جرم کی سزا تجویز کر سکتا ہے۔

حمادیہ میں ہے کہ اگر مرد، مرد کے ساتھ یا مرد عورت کے ساتھ یا عورت عورت کے ساتھ یا مرد خواجہ سرا یا مخنث یا نامرد لڑکے کے

ساتھ چپٹ بازی کرے تو تعزیر ہوتی ہے اس میں حد نہیں۔

پس قرآن مجید نے حکمت بالغہ سے فوجداری جرائم کو دو حصوں میں تقسیم کیا ہے جان مال اور ابرو کی حفاظت کے لیے حدود مقرر کر دی ہیں کیونکہ جان مال اور ابرو کی عدم حفاظت سے معاشرہ میں شدید بگاڑ پیدا ہوتا ہے اس کی اہمیت کو مدنظر رکھ کر اللہ تعالیٰ نے ان کی سزائیں مقرر کر دی ہیں دیگر فوجداری جرائم کی سزا حاکم کی صواب دید پر چھوڑ دی گئی ہے کہ وہ حالات کے مطابق سزا کے متعلق قانون سازی کر لے۔ جیسا کہ لواطت کے مرتکب کے لیے مختلف فقہاء نے اجتہاد سے مختلف سزائیں تجویز کی ہیں۔ اسی طرح شراب نوشی کی سزا مختلف اوقات میں مختلف تجویز کی گئی ہے۔ اس سے بڑھ کر کوئی پُرحکمت نظام تعزیر نہیں ہو سکتا۔ حالات کے مطابق سزائیں مقرر کی جانی چاہئیں۔

تنفیذ سزا کے متعلق تمام ائمہ فقہاء کا یہ اتفاق ہے کہ سزا کی تنفیذ اور اجرا کا حق صرف ریاست (حکومت) کو ہے۔ کسی جرم کی سزا کی تنفیذ کرنے کے لیے کوئی فرد قانون کو اپنے ہاتھ میں نہیں لے سکتا۔ اگر کوئی شخص کسی جرم کو اپنے طور پر سزا دینا چاہے وہ خود مجرم ہوگا۔ قانون کے مطابق سزا کی تنفیذ کا حق صرف حکومت کو ہے۔ امن اور حقوق انسانی کی بحالی اور استحکام کے لیے اسلام نے ایک مکمل ضابطہ قانون دیا ہے۔ جس کی مثال دنیا کے دوسرے ضابطہ ہائے قانون میں نہیں ملتی اسلام پہلا وہ دین ہے جس نے حقوق انسانی کا ایک چارٹر دیا پھر اس چارٹر پر عمل بھی کیا۔

☆......☆

وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ

سیرت سید البشر ﷺ

حصہ چہارم

پروفیسر چودھری غلام رسول چیمہ